ماہِ نو

# ماہِ نو

جلد دوم

## چالیس سالہ مخزن

ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان

فن و ثقافت

# علی امام

فیض احمد فیض

علی امام اور ان کے فن سے میری آشنائی بہت پرانی ہے۔ اس کی ابتداء اُن دنوں میں ہوئی جب علی امام جلوت میں مزدور تنظیموں میں کام کیا کرتے تھے اور خلوت میں چپکے چپکے تصویریں بنایا کرتے تھے۔ جب ان کا یہ راز افشا ہوا اور ہم نے لاہور آرٹس کونسل میں ان کی پہلی نمائش منعقد کی تو صاحبِ ذوق لوگ ایک ہی نظر میں قائل ہو گئے کہ ہمارے نوجوان مصوروں کی صف میں ایک بہت ہی ہونہار شخصیت کا اضافہ ہوا ہے اور مجھے مسرت ہے کہ علی امام نے اپنے مدّاحوں کو مایوس نہیں۔ علی امام کے ابتدائی دور کی تصویریں یوں تو قریب قریب خالص عکاسانہ (REPRESENTATIONAL) اسٹائل میں تھیں، گلیاں، محلے، بسیں اور ٹرامیں، مزدور اور مچھیرے، لیکن ان میں سے ہر عکس مصور کی نزاکتِ نگاہ، خلوصِ دل اور بلاغتِ فن کا غماز تھا۔ بعد میں علی امام کی مصوری نے کئی رنگ بدلے، لیکن یہ سب خوبیاں جب سے اب تک ان کے مُوقلم کی یکساں رفیق ہیں۔ اس پہلی نمائش کے فوراً ہی بعد، علی امام شوقیہ نقش و نگار بنانے والوں کی صف سے نکل کر مستند مصوروں کی صف میں شامل ہوئے اور شعوری اور اکتسابی طور سے اپنے فنِ جمیل کی اشکالی یا FORMAL باریکیوں کی ٹوہ لگانے میں کھو گئے۔ اس دور میں انہوں نے خطوط کی ترکیب اور کمپوزیشن کے تجریدی اجزاء کو نمایاں کرنے کے لئے تغیرات کو اپنا موضوع بنایا لیکن مری اور بہاولپور کے یہ محل اور گھروندے، مقامات و مناظر بھی، محض کاغذی نقوش نہیں ہیں، ان کے خطوط میں بھی وہی حرکت اور ان کے رنگوں میں بھی وہی آنچ ہے جو ان کی ابتدائی تصویروں میں تھی۔ اس دور کے بعد علی امام یورپ چلے گئے اور اب ان کا فن تجرباتی منزلیں طے کر کے پختگی کے دور میں ہے لیکن ان کی نئی تصویروں میں ان کی پوری فنکارانہ زندگی کا پرتو شامل ہے۔ ان تصاویر میں دھندلے رنگوں اور باریک خطوط سے ایک عجیب موہومیت کی سی فضا محسوس ہوتی ہے جو سادگی و پرکاری کا بہت ہی ماہرانہ مظہر ہے ان تصاویر کے نظارے سے دل و نگاہ پر" اندیشہ ہائے دُور دراز" کے کئی دریچے وا ہوتے ہیں۔

جولائی ۶۷ء

# مغلیہ مصوری - ایک تعارف

فیضی رحمین

برِّصغیر پاک و ہند میں مسلم فتوحات کی وجہ سے وہی نتائج پیدا ہوئے جو عہدِ وسطیٰ کے یورپ میں تحریکِ نشاۃ الثانیہ کے سبب رونما ہوتے تھے۔ مسلمانوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اگر وہ اپنی تعمیرات کا آغاز وسیع پیمانے پر کرتے تھے تو ان مہتم بالشان عمارتوں کی تکمیل اسی طرح کرتے تھے جس طرح مرصع کار بڑی عرق ریزی سے جڑاؤ زیورات تیار کرتے ہیں۔ مسلمانوں نے تعمیرات کے علاوہ موسیقی پر بھی کافی توجہ دی اور اس برِّصغیر کے قدیم آلات موسیقی میں نئے نئے آلات کا اضافہ کیا۔ نئے نئے راگ مرتب کئے اور اس فن میں ایسی روح پھونکی جس نے اسے قدیم، گلا گھونٹ دینے والی روایات کے بندھنوں سے نجات دلا کر اس قابل بنا دیا کہ وہ انتہائی بلندیوں پر پرواز کر سکے۔ فنِ مصوری پر بھی مسلمانوں کے بہت احسانات ہیں۔ انہوں نے اس فن میں ایسی روح بھر دی کہ اس سے مصوری کے بڑے بڑے شاہکار بروئے کار آئے بالخصوص چھوٹی تصویروں کے تو انہوں نے ایسے ایسے نمونے چھوڑے ہیں جو رہتی دنیا تک صفحۂ ہستی پر یادگار رہیں گے۔ جب وہ اس برِّصغیر میں آئے تو مصوری ایک قالبِ بے جان تھی۔ انہوں نے اس میں زندگی کی روح پھونکی۔

مصوری کے سلسلے میں مسلمانوں کی سرگرمیوں کا سرا اس زمانے سے ملتا ہے جب خوشنویسوں نے قرآن مجید کے الہامی پیغام کی تقدیس اور محبت سے سرشار ہو کر آیاتِ ربانی کو لہروں کی طرح پیچ و خم کھاتی ہوئی سطروں کے سانچے میں ڈھالا اور اس طرح تحریر میں بھی مصور نغمہ کی کیفیت پیدا کر دی۔ اس کے بعد جب وہ تجریدی صورت گری کے جملہ امکانات کو پورا کر کے اسے درجۂ کمال تک پہنچا چکے تو خطاطی کے ماہرین نے متن کے اردگرد حسین و جمیل بیل بوٹے اور نقش و نگار بنانے شروع کئے۔ پہلے پہل مخطوطات میں ان بیل بوٹوں کا دائرہ اقلیدسی اشکال اور پھول پتیوں تک محدود رہا اور بعد میں درخت، تتلیاں، پرندے اور جانور وغیرہ تزئین و آرائش کے لئے کام میں لائے گئے۔ چپکے چپکے انسانی صورتیں بھی کچھ ہچکچاتی، جھینپتی ہوئی ان میں داخل ہو گئیں۔ لیکن میکانی شبیہوں کے طور پر، جن میں سب کے چہرے مہرے ایک جیسے اور حرکات و سکنات بالکل جامد اور رسمی ہوتی تھیں۔

مصوری کے اس حد تک پہنچ جانے پر یہ ایک قدرتی بات تھی کہ خطاط کے جمالیاتی احساس کا مادۂ فطری ان تمام خارجی قیود کو توڑ کر آگے بڑھے جو اسے نفسِ موضوع یعنی متن کے حُسنِ کتابت تک محدود رکھتے تھے اور اپنے جوہر اور پیرایوں میں دکھائے۔ چنانچہ مصوری ایک جُداگانہ فن کے طور پر ظہور میں آئی اور اس کو رواجِ عام حاصل ہوا۔

ایران میں جب خاندانِ صفویہ کا دورِ حکومت تھا تو مصوری کمال کے بہت ہی اعلیٰ درجے کو پہنچی۔ یہ مصوری درحقیقت فنِ خطاطی ہی کی ایک ترقی یافتہ صورت تھی چنانچہ بہزاد اور مانی نے اس کے کتنے ہی زندۂ جاوید نقوش یادگار چھوڑے ہیں۔

تقریباً اسی زمانے میں مغل شہنشاہ برِّصغیر پاک و ہند میں آئے۔ بابر اپنے ہمراہ دیگر درباریوں کے علاوہ ایرانی مصوری کے چند ماہر فنکار بھی

لایا تھا۔ پہلے تو اس مختصر گروہ نے تھوڑا سا اثر پیدا کیا۔ یہ ایک لہر تھی جس نے سطح پر تھوڑی سی ہلچل پیدا کی۔ ابتدائی کوششیں فاتح کو خوش کرنے کے لئے معمولی قسم کی نقالی پر مشتمل تھیں لیکن بعد میں نئے انداز نے اس قدر زور پکڑا کہ قدیم روایات اس میں بالکل جذب ہو کر رہ گئیں چنانچہ اس دو سو سال کے عرصہ میں جب برصغیر پاک و ہند پر مغلوں کا تسلط رہا مصوروں کی بہت ہی قدر و منزلت کی جاتی رہی چونکہ مغل بادشاہوں نے مصوری میں ذاتی طور پر دلچسپی لی اور فنکاروں کو اس طرح نوازا کہ آج تک ان کی عنایت کے قصے زبان زد عام ہیں اس لئے ان کے زمانے میں مصوری کو بہت فروغ حاصل تھا۔

ہمایوں اور اکبر کو مصوری سے اس قدر لگاؤ تھا کہ انہوں نے اوائل عمر میں باقاعدہ مصوری کا درس لیا۔ اکبر مصوری کو ایک طرح کی عبادت خیال کرتا تھا۔ اُس کا قول ہے "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصور میں خدا کو پہچاننے کا خاص ملکہ ہے۔" جب جہانگیر تخت نشین ہوا تو گارڈن ساوٴمن کے الفاظ میں "ہندوستانی مصوری کا زمانہ عروج اور اُسے پایۂ کمال کو پہنچانے والا شخص دونوں آپہنچے۔" قانونِ قدرت کے مطابق "جو پھول کھلتا ہے وہ بالآخر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاتا ہے۔" چنانچہ جہانگیر کے بعد مغلیہ مصوری کی بہار بھی ختم ہونے لگی۔ شاہجہان اپنے خوابوں کو سنگ مرمر میں ڈھالنے میں اس قدر محو تھا کہ مصوروں کی حیثیت میں فرق آگیا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں بعض مصوروں نے تملق آمیز پیرائے میں بادشاہ کی شخصیت کو دعوام سے پیش کر کے اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن فن کی حقیقی روح ان فنکاروں کے ساتھ پرواز کر گئی جو دربار شاہی کو چھوڑ کر مختلف صوبجات کے شہروں میں منتشر ہو گئے تھے۔ اس کے بعد بھی مصوری کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن اس میں سابقہ محیر العقول شان و شوکت کا عشر عشیر بھی نہ تھا۔

بعد کے سیاسی اور معاشرتی انحطاط کے زمانے میں مصوری کی وہ قدر دانی نہیں رہی۔ ۱۸۵۷ء کے آشوب میں وہ مرقعے جو خاندان مغلیہ کے لئے باعثِ فخر تھے یا تو ضائع ہو گئے یا لوٹ لئے گئے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ معمولی سپاہیوں نے مصوری کے کئی شاہکار ایک ایک روپے میں فروخت کئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس سرزمین میں جہاں مصوری کے ان شاہکاروں نے جنم لیا تھا ان کا ایک نمائندہ مجموعہ بھی موجود نہیں پھر بھی دنیا کے مختلف حصوں میں ان کے جو متفرق نمونے موجود ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ مغلوں کے عہد میں مصوری کس درجہ کمال کو پہنچ چکی تھی۔

جہاں تک نفس موضوع کا تعلق ہے مغلیہ تصاویر خالصتاً مجازی ہیں۔ ان کا موضوع ہے مغلیہ دربار چونکہ مصور اس زمانے میں بادشاہوں کے زیرِ سرپرستی کام کرتے تھے اس لئے وہ اپنی تصاویر میں دربار کے مناظر، شاہی شکار، صید افگنی، پالتو جانوروں، پھولوں، کھیل کود اور محلات وغیرہ ہی کا نقشہ پیش کرتے تھے۔ بعض تصاویر ایسی بھی ہیں جو کسی قصے مثلاً داستانِ امیر حمزہ یا تاریخی واقعہ کی تشریح کرتی ہیں جیسا کہ "اکبر نامہ" میں دکھائی دیتا ہے۔

مغلیہ دور کے مصور پھول اور پودے اس خوب صورتی سے بناتے تھے کہ ان پر اصل کا گمان ہوتا تھا۔ اسی طرح جانوروں اور پرندوں کی تصاویر میں ایسی نفاست پیدا کرتے تھے کہ ان میں ایک رومانی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ پھر ایسی خوش اسلوبی سے کام لیتے تھے کہ چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بھی چھوٹنے نہ پاتی تھی۔ یہ خصوصیات عہد جہانگیر کے باکمال مصور منصور کے یہاں جسے جہانگیر "نادر العصر" کے نام سے یاد کرتا تھا خاص طور پر نمایاں ہیں۔

مغلیہ مصوری کی امتیازی خصوصیات خطوط، رنگ اور شدید توانائی، اس عہد کے چھوٹے سے چھوٹے فن پارے میں بھی موجود ہیں۔ مغل فنکار رنگوں کے استعمال میں کوئی ضبط اور قید نہیں جانتے تھے۔ وہ جو رنگ چاہتے کام میں لاتے۔ ان کے یہاں دھیمے سنہرے اور روپہلے سے لے کر نیلے، سرخ، سیاہ، زرد، سبز غرض ہر طرح کے رنگ موجود ہیں اور یہ سب اس قدر شوخ اور چمکدار ہیں کہ بعض مورخ سمجھتے ہیں انہیں لعل و جواہر پیس کر بنایا گیا ہے۔ شاید ایسا ہی ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ اکبر کے عہد میں ایک پورا کارخانہ مصوروں کے کام میں آنے والے رنگ تیار کرنے کے لئے مخصوص تھا۔

رنگوں کا استعمال مغلیہ مصوری کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ یہ رنگ ایک دوسرے میں گھل مل نہیں جاتے بلکہ واضح نظر آتے ہیں، الگ الگ دکھائی دیتے ہیں اور ان کی یکجائی اور ہم آہنگی سے تصویر میں بڑی دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے تصویر میں بجائے رنگوں کے ایک دلچسپ نظم تیار کی گئی ہے۔

مغل مصوروں نے خط کھینچنے میں انتہائی احتیاط اور بڑے صبر سے کام لیا ہے مگر اس کاوش کے باوجود ان کی تصاویر محض کٹھ پتلیاں نہیں ہیں بلکہ ان کی زندگی میں پائی جاتی ہے۔ مغل مصوروں کے ہاں خصوصیت کے ساتھ اور مشرقی مصوروں کے ہاں عموماً تصویر میں منظر کشی اوپر سے نیچے کی طرف ہوتی ہے۔ پیش منظر عام طور پر کسی قدر ڈھلوان دکھایا جاتا ہے اور اس میں نیچے سے اوپر کی طرف عمارات، زینے، سیڑھیاں، زمین کے قطعے، اور ٹیلے وغیرہ بنا کر فاصلے کا احساس پیدا کیا جاتا ہے۔ مصوّر یہ مختلف شکلیں اس چابکدستی سے جمع کر دیتے ہیں کہ نظر خود بخود ایک سطح سے دوسری سطح پر پہنچ جاتی ہے، ایک اور بات یہ ہے کہ ان کی تصویریں نہ محض پتلیاں ہوتی ہیں نہ حقیقت کی ہو بہو عکاسی کرتی ہیں ان میں روشنی اور سائے کا خیال نہیں کیا جاتا۔

مغلیہ مصوری کی یہ خصوصیت تمام تر خطاطی کا نتیجہ ہے مغلیہ دور کے مصوروں کے نزدیک خوب صورتی، شکل، وضع اور تناسب میں ہے نہ کہ قدرت کی نقالی میں۔ چونکہ ان کے تخیل پر مذہب کا اثر ہے اس لئے ان کے نزدیک یہ عالم بے بود ایک غیر فانی ہستی کا مظہر ہے اور بس، حقیقت کا ادراک صرف شعور اور احساس سے کیا جا سکتا ہے کیونکہ شعور مادی اصلیت کو سراپا معقول بنا دیتا ہے۔ اس لئے اس کی صحیح عکاسی لامحالہ عقلی پیرایہ ہی اختیار کرے گی جس طرح ریاضی داں دنیائے شہود کی اصلیت کا انکشاف علامات کے ذریعہ کرتا ہے جہاں ریاضی داں اپنے مشاہدات کی کیفیت صور و اشکال سے ظاہر کرتا ہے وہاں مصوّر اپنے محسوسات کو ہیئت کے پردے میں جلوہ گر کرتا ہے۔ مادی شکل جس کا عکس نے ادراک کیا ہو مصوّر کے شعور میں سے گزر کر اس کی شخصیت کا اثر قبول کرتی ہے اور اس طرح معقول کو محسوس بنا کر انفرادی وضع عطا کرتی ہے۔

جب یورپ میں تعبیری خاکہ کشی سے گریز کرنے والے پہلے مصوّر یواں گریس نے یہ کہا تھا کہ جمال دو بُعدوں میں بنا ہوا ایک تجریدی نقش ہے تو وہ دراصل وہی نظریہ پیش کر رہا تھا جسے مغلیہ دبستان کے مصوروں نے عملی جامہ پہنایا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک گنوار لڑکا ایک بہت بڑے یونانی فلسفی کے پاس آیا اور دعویٰ کیا کہ وہ بلبل کے چہکنے کی پوری طرح نقل اُتار سکتا ہے۔ فلسفی نے جھٹ جواب دیا کہ وہ بلبل کے چہکنے کی ہو بہو نقل کی بجائے اصلی چہکنے ہی کو سننا پسند کرے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فن کو قدرت کی اندھا دھند نقالی سے کچھ زیادہ ہونا چاہیئے۔ یہی "کچھ زیادہ" ریفائل کی معروف "دوشیزاؤں" یعنی (MADONNAS) میں پایا جاتا ہے اور ایک جدید نقاد راجر فرائی کے الفاظ میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب فنکار روزمرہ زندگی کے عوائد اور حوائج کی طرف عملی صورت میں اعتنا سے دامن چھڑا کر ایک آزاد فضا میں دم لیتا ہے اور اپنی روح کو نیرنگ حوادث اور رسوم و قیود کی گرفت سے رہا کر کے ایک نہایت بے ہمہ اور وارستہ زندگی بسر کرتا ہے۔ مغل مصوروں نے مکانی تناسب، ہیئت کی آرائشی وحدت اور چابکدستی میں یہی خصوصیت پیدا کی جیسا کہ ان کے موجودہ بچے کھچے شاہکاروں سے ظاہر ہے یعنی انہوں نے قدرت کا تجریدی تصور پیش کیا ہے اور اس کی تشریح گوناگوں الوان کی ترکیب و آمیزش اور ہم آہنگی سے کی ہے۔

مغلیہ مصوری ایک حیرت انگیز ماضی کی خبر دیتی ہے۔ یہ اس ثقافتی میراث کا ایک اہم جزو ہے جو پاکستان کو ایک طرف دورِ کہن اور آثار صنادید پر فخر کرنے کی دعوت دیتی ہے تو دوسری طرف مستقبل میں اہم تر کارنامے سر انجام دینے کی نوید دیتی ہے۔

جولائی ۵۱ء

# چغتائی (خود شبیہ)

عبدالرحمٰن چغتائی

آرٹسٹ جب اپنی پہلی تصویر بناتا ہے تو وہ اس کی پیدائش کا پہلا دن ہوتا ہے۔ اس عقیدے کی رو سے میری پیدائش کا سال ۱۹۱۹ء ہوتا ہے اور یہی سال میرے مستقبل کی فال ہے جب میری بنائی ہوئی تصویریں ۱۹۲۰ء میں پہلی بار پنجاب فائن آرٹ سوسائٹی لاہور کی نمائش میں پیش ہوئیں تو ایکا ایکی ایک طوفان امڈ آیا۔ تنقید اور نکتہ چینی کی شکل میں مختلف ذہنیتوں نے جو مظاہرہ کیا وہ میرے اور میرے آرٹ کے لئے ایک روشن اور نیک فال ثابت ہوئی۔ یہ نمائش ہوئی۔ یہ نمائش جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، ہندوستانی اور مغربی آرٹ اور آرٹسٹوں کی ایک نمائندہ نمائش تھی۔ یہ پہلی جنگ عظیم کے بعد کی بات ہے جب مشرق میں بھی بیداری کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ ہر فرد اور قوم ترقی کے زینے طے کرنے کی فکر میں تھی۔ ہندوستان میں یہ زمانہ جدید ہندوستانی اور بنگالی تحریک کے عروج کا زمانہ تھا۔ جس نے ہر اہلِ نظر کو مسحور کر رکھا تھا گو اس سے پہلے پنجاب علوم و فنون کا گہوارہ رہ چکا تھا۔

ہمسایہ قوم کو چھوڑ مجھے ایسے حالات کا بھی مقابلہ کرنا پڑا جن کے تصور سے دکھ ہوتا ہے اور میرا فن اتفاقات کا کرشمہ نہیں، یہ پکا پکایا ہاتھ نہیں آیا۔ یہ اعتماد تحمّل اور محنت کا پھل ہے۔ آج میرے آرٹ، میری ٹکنیک کو بین الاقوامی درجہ حاصل ہے اور میری تصویریں دنیا کے ہر حصے میں موجود ہیں۔

جب میرے آرٹ نے جنم لیا، میرے اپنے ملک اور میری اپنی قوم میں ایسے اسباب موجود تھے جو ایک آرٹسٹ کی سلامتی کے لئے سدِ راہ ہو سکتے ہیں خصوصیت سے وہ قوم سے وہ قوم جس کا میں فرد تھا اسے اس وقت آرٹ کی صلاحیتوں سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ اگرچہ وہ علوم و فنون، ذوقِ نظر اور ہنر پروری کے تمام ذرائع سے مالا مال تھی۔ جب پہلی بار میری بنائی ہوئی تصویر "موڈرن ریویو" کلکتہ میں شائع ہوئی تو مجھے برما، سیلون، پشاور، ہندوستان یہاں تک کہ افریقہ سے خطوط آئے تھے کہ کوئی مسلمان آرٹسٹ اس میدان میں بھی نظر آیا ہے میرے عزیز دوست جو میری اس کوشش کو قومی نقطۂ نگاہ سے نیک فال خیال کرتے ہیں اس فکر میں مبتلا تھے کہ میں اس بڑھتی چڑھتی دنیا میں اپنے مستقبل کا ساتھ بھی دے سکوں گا یا نہیں۔

شروع سے لے کر آج تک ایک گروہ کسی نہ کسی صورت میری جد و جہد کا پیچھا کرتا چلا آیا ہے۔ اس نے ہمیشہ میرے آرٹ اور میرے مدّعا کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے اور اس کی یہی کوشش رہی کہ ہے کہ میں دل برداشتہ ہو کر اپنے برش اور رنگوں سے ہمیشہ کے لئے کنارہ کشی اختیار کر لوں، مگر باوجود ہزار شکست اور تخریبی حالات کے میں اس شاہراہ پہ برابر گامزن ہوں جس کو میں نے پوری شد و مد سے سرگرم عمل رہنے کے لئے انتخاب کیا تھا جو کچھ تھا اور جو کچھ ہے وہ کوئی معجزہ نہیں۔ یہ تمام تر اسی بات کا نتیجہ

ہے کہ زندگی کی دشواریوں سے دوچار ہو کر اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کیا جائے اور جوشِ حیات کو کبھی سرد نہ ہونے دیا جائے، چاہے سرفرازی حاصل ہو یا نہ ہو۔

آرٹ کے سلسلہ میں میرے دل میں ایک ہی جذبہ کارفرما رہا ہے جو آج بھی میرے فنّی شعور کا جزوِ اعظم ہے یہ کہ آرٹ محض آرٹسٹ کی ذاتی لذتوں اور خوشیوں کا ذریعہ نہیں، اس میں انسان اور انسانیت کا بھی حصّہ ہے اور یہ وہ عالمگیر جذبہ ہے جس سے کائنات پھلتی پھولتی ہے۔ "مرقعِ چغتائی" کی اشاعت مسلمانوں کو آرٹ کی طرف توجہ دلانے میں بہت معاون ثابت ہوئی۔ چنانچہ میرا اعتماد، میری جدوجہد میری قوم کے کام آئی۔ مسلمانوں نے آرٹ کی اہمیت اور اس کی ضرورت کا احساس بڑی شدت سے محسوس کیا۔ میری کوشش اور ہمت نے ہمسایہ قوم کو بھی میری صلاحیتوں کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا اور میرا آرٹ دیکھتے دیکھتے ہر ہندوستانی کے دل میں گھر کر گیا۔ یہاں تک کہ جدید ہندوستانی آرٹ کے بانی ڈاکٹر ابندرناتھ ٹیگور اور تمام بنگال کو میرے فن سے مرعوب ہوتے ہوئے اعتراف کرنا پڑا کہ چغتائی کو رنگوں کے امتزاج اور خطوط پر غیر فانی قدرت حاصل ہے۔

اکثر لوگ خیال کرتے ہیں کہ بنگال کی جدید تحریک سے وابستہ رہا ہوں۔ یا میں ان میں سے کسی استاد کا پیرو یا پروردہ ہوں۔ میں نہ تو بنگال اس غرض سے گیا ہوں نہ مجھے کسی کی شاگردی کی سعادت حاصل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب میرے آرٹ نے جنم لیا اس وقت جدید ہندوستانی آرٹ کی تحریک اپنے پورے شباب پر تھی اس تحریک میں میں نے بھی اپنی بساط بھر حصہ لیا ہے اور آج جدید ہندوستانی آرٹ کی تحریک میرے آرٹ کے وجود کے بغیر مکمل نہیں کہلا سکتی۔ میری آدھی سے زیادہ تصویریں ہندوستانی عجائب گھروں اور ریاستوں کی زینت ہیں اور ان لوگوں کے پاس موجود ہیں جو آرٹ کے دلدادہ ہیں۔ میرے فن، میرے عمل، میری تصویروں اور تحریروں میں اس مقصد کو ہمیشہ دخل رہا ہے جس سے انسانیت پھلتی پھولتی ہے۔ میں یہ سب کچھ اس لئے تحریر نہیں کر رہا کہ میں کوئی بڑا آدمی ہوں اور میری بھی کوئی غیر معمولی شخصیت ہے بلکہ اس لئے کہ قدرت ایک ادنیٰ درجے کے آدمی سے بھی کام لینے کے اسباب کس طرح پیدا کر لیتی ہے جب میرے آرٹ کی ابتدا ہوئی تو مغل ایرانی آرٹ کو چھوڑ پورے مشرق پر ایسا ادبار چھایا ہوا تھا اور کسی کو یہ بھی یاد نہ تھا کہ آج سے صدیوں پہلے انسان کو آرٹ کی ضرورت تھی یا آرٹ ہماری زندگی کا ایک حصہ بھی رہا ہے۔ ہمارے قدیم فنکاروں نے آرٹ اور زندگی کے تعلقات کو گہرا بنا دیا تھا، زندگی کے ہر لمحہ پر ان کا فن غالب اور نمایاں تھا۔ فطری رجحانات ہی کے سبب مجھ میں جمالیاتی تصور پرورش پا رہا تھا۔ میں نے اپنی روایات اپنی تہذیب کو اپنے فن کا جزوِ اعظم بنایا ہے اور مشرقی آرٹ، مشرقی ثقافت اور مشرقی روح کو پورے انہماک سے اپنایا ہے۔ میرے فن سے مشرقی آرٹ میں ایک نئے باب کا افتتاح ہوا ہے۔ میرا فن ایسے سانچوں میں ڈھل گیا ہے کہ قدیم استاد چاہے بہزاد، رضا عباسی، میرک مہدی، عبدالصمد، میر علی اور فرخ بیگ کیوں نہ ہوں، اگر میرا آرٹ دیکھیں تو یہ نہ کہیں گے کہ ہم جہاں آرٹ کو چھوڑ گئے تھے وہیں کا وہیں رُکا پڑا ہے، وہ ضرور اس بات کا اعتراف کریں گے کہ تقاضوں کے مطابق اس کے آرٹ نے بھی وقت کا ساتھ دیا ہے وہ تسلیم کریں گے کہ مشرقی آرٹ، خصوصیت سے ایرانی اور مغل آرٹ کئی منزلیں طے کر کے کہاں سے کہاں آ پہنچا ہے میرے فن کی انفرادیت نے دوست دشمن دونوں کو آرٹ کی طرف توجہ دلائی ہے اور آرٹ کے رجحانات کو سمجھنے میں مدد دی۔ میں اپنے فطری رجحانات کی بناء پر مشرقی واقع ہوا ہوں اور جس مشرقیت کا میں ترجمان ہوں، اس کا بڑی شدت سے لوگوں کو احساس دلاتا ہے۔ مغربی آرٹ کے معیار کو بلند اور جامع بنانے میں مغربی آرٹ اور اس کی تاریخ کا بھی جی بھر کر مطالعہ کیا ہے اور کوشش

کی ہے کہ مشرقی آرٹ میں وہ تمام صلاحیتیں سمو دوں جو وقت کی ضرورت اور معاشرے کا تقاضا ہیں۔ اس سلسلے میں میں نے دو دفعہ یورپ کا سفر بھی کیا ہے میں یورپ سے مشرقی کی حیثیت سے واپس آیا ہوں۔ جہاں تک مغرب نے ہماری مشرقی خوبیوں کو اپنانے اور تہذیب کا حصہ بنانے میں سرگرمی دکھائی ہے۔ میں نے بھی اپنی مشرقیت کو جِلا دینے میں کمی نہیں کی۔ مجھے دکھ ہوتا ہے کہ بعض فنکار حدِ اعتدال سے تجاوز کر گئے ہیں اور تلاش اور کوشش کی قوت سے گریز کرنے لگے۔ کسی نقاد، شاعر اور آرٹسٹ کو جرأت نہیں کہ وہ برملا کہہ سکے کہ ہمارے برسراقتدار آنے کے طریق ہماری قوم اور ہمارے معاشرے کے لئے کس قدر مفید ہیں۔

بعض کا خیال ہے کہ چغتائی ایک ماضی پرست آرٹسٹ ہے جو میرے زیادہ قریب ہیں، مجھے ایک جدید ترقی پسند آرٹسٹ خیال کرتے ہیں۔ وہ ایک آرٹ جو اپنے نام و نسب، اپنی معاشرت، اپنی طرزِ نگارش سے پکارا جائے وہ آرٹ اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے معاشرے کی نمائندگی کرتا ہے اور اس کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر جاپانی، چینی، فرانسیسی، جرمن اور اطالوی آرٹ۔ آرٹ کیا ہے، تو یہ میرے خیال میں یہ وہی حقیقت ہے جو ایک فن کار کو دوسروں سے بلند کرتی ہے اور نئے کردار کی تخلیق کرتی ہے، میری تصویر کی بندش نئی ہے رنگ اور خطوں کا انداز نیا ہے، مرکزی خیال و شعور اور ان کا جمالیاتی تصور نیا ہے۔ میری طرزِ نگارش اور اسلوب مشرق و مغرب کے امتیاز کو اجاگر کرتا ہے۔ میری نئی راہیں، نئے تقاضے مشرق کی عظمت کا باعث اور مغرب پرستی کے خلاف جہاد ہیں جس طرح مغرب کے قدیم و جدید فنکاروں نے اپنی تہذیب و تمدن کا ثبوت بہم پہنچایا ہے اس طرح میرے فن نے بھی مشرقی تہذیب اور روایات کی نمائندگی کی ہے جس زندگی کا اقبال خواہاں تھا، جس نظر سے وہ زندگی اور اس کی اقدار کو دیکھتا تھا، میں نے بھی اُسی سوز و ساز اور زندگی کو رنگوں اور خطوں میں دیکھا اور دکھایا ہے۔ میری مصوری میں ایسے کردار بھی نظر آئیں گے جن کو دیکھ کر اقبالؔ کے اشعار خود بخود لبوں پر کھیلنے لگیں گے، کچھ ایسی صورتیں بھی نظر آئیں گی جن سے ہماری عظمت اور شوکت یاد آئے گی مغرب پرستی کے خلاف اقبالؔ نے تمام عمر جہاد کیا ہے۔ میری جہاد کا تعلق بھی اسی بت پرستی اور تقلید سے ہے جس نے ہماری صلاحیتوں کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا ہے۔ مغرب پرستی نے ہمارے خد و خال ہی کو مسخ نہیں کیا بلکہ ہمارے نظریئے کو بھی بدل ڈالا ہے۔ میری مشرقیت نے ایک ایسی انفرادیت کو جنم دیا ہے جس کا مرکزی تصور اپنی سلامتی، اپنی صلاحیتوں اور اپنے جذبۂ حیات کو از سرِ نو وجود دینا ہے اس لئے میرے کرداروں کے خد و خال، رنگ روپ، میری طرزِ نگارش، نقش و نگار سب مشرقی امتیاز کے حامل ہیں۔ ان میں زندگی، زندگی کا سوز، مشرقی خون کی حدت، سخت کوشی، مقصد آفرینی اور ماضی کی عظمت و شوکت مضمر ہے۔ خدا کی بخشش کو اس بنا پر نظر انداز کر دینا کہ مغرب کی نقالی سے تحسین اور سرفرازی حاصل ہو گی کوئی اہم مقصد پورا نہیں کرتا۔ اقبالؔ نے ایسی ماؤں اور بچوں کی آرزو کی ہے جو سر بکف مجاہدانہ زندگی کی تلخیوں سے لذت آشنا اور جلال و جمال کے مظہر ہوں۔ ایسے مشرقی جنہیں انتخاب و اختیار پر قابو حاصل ہو۔ یہی میری تخلیق کا مقصد اور حاصل ہے کہ ہر فرد زندگی کے ترجمان اور زندگی کی سرمستیوں سے سرشار پیمانہ بردارِ حقائق کا متلاشی ہو۔ اگر موجودہ آرٹ کے انتشار کو دماغی خلل کہہ کر پکارا جائے تو میرے نزدیک یہ خللِ اعصابی ہی نہیں، زندگی سے فرار اور احساسِ کمتری کا وہ سبب ہے جس سے نشو و نما رک جاتی ہے اور انسان اپنے مقصد سے بھٹک جاتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں ابھی تک ہمارے ہاں کوئی تجریدی اضافہ نہیں ہوا۔ کسی ایسے آرٹ نے جنم نہیں لیا جس کی بنا پر آرٹ چھوڑ کر اس گھٹیا آرٹ کی نقّالی میں لگ جاؤں جسے مغرب پرستی اور مغربی آرٹ کی صحیح تقلید بھی نہیں کہا جا سکتا۔ مغرب پرستی کی بدعت اور نقالی کو میں سوائے فرار اور کمزوری کے اور کچھ نہیں سمجھتا کیونکہ اس میں بدحالی اور بے راہ روی کے سوا کچھ نہیں۔ اس نے کسی انفرادیت کو ابھرنے

نہیں دیا اور نہ کوئی فرد کوئی ایسی راہ تلاش کر سکا ہے جس میں قومی کردار یا کسی عالمی تحریک کو پنپنے کا موقع ملا ہو۔ ہماری رجعت پسندی، ترقی پسندی اور دوسرے نعرے محض مطالعہ کی کمی کا نتیجہ ہے۔ بعض لوگ جب میری بنی ہوئی بابر، جہانگیر یا اورنگ زیب کی کوئی تصویر دیکھ پاتے ہیں تو مجھ کو قدامت پسند یا مشرق زدہ کہنے پر اتر آتے ہیں اور نہیں جانتے کہ مغرب کے جدید سے جدید آرٹ نے بھی بی بی مریم اور حضرت مسیحؑ کی تصویریں بنائی ہیں اور ان آرٹسٹوں نے بائیبل کے واقعات کو بڑی اہمیت دی ہے۔ یورپین عیسائی آرٹ کے مقابلے میں مغلوں کا آرٹ کل کی بات ہے۔ ان کی تصویروں میں نہ کوئی مذہبی تبلیغ ہے اور نہ کسی رہبانیت کا تسلسل۔ صرف کرداروں کی تشکیل اور عظمت و شوکت کا اظہار ہے۔ ہو سکتا ہے میں ضرورت سے زیادہ مشرقی نظر آتا ہوں مگر میں سمجھتا ہوں کہ مشرقی کہلانے ہی میں ہماری نجات ہے کیونکہ وہ قوم جس کے آرٹ کا نام و نسب، اس کی خصوصیت، اس کی طرز نگارش اور تکنیک اپنے ملک، اپنی قوم اور اپنے معاشرے سے وابستہ نہیں، اس کے آرٹ کا نہ کوئی حال ہے نہ مستقبل۔

میری مشرقیت نے ایک ایسی انفرادی تحریک اور مرکزی خیال کو جنم دیا ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ میری مشرقیت، تکنیک، میرا فن، طرز نگارش صدیوں تک ملک اور اس کے فن کاروں کی رہبری کرتے رہیں گے، اور انہیں زندہ ملکوں کے دوش بدوش کھڑا ہونے کی جرأت دلاتے رہیں گے۔ میں نے ایک ایسی ثقافت و معاشرت کی ترجمانی کی ہے۔ جس کی زندگی کا مجھ کو حق پہنچتا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ تقلیدی دائرے سے نکل کر اور قدیم و جدید کے تقاضوں سے بلند ہو کر ایک ایسی شاہراہ تلاش کروں جس سے ہمارا تمدن، ہماری تہذیب ایک ایسے وسیع مقام پر جمع ہوں جہاں روایتی تعلق منقطع نہ ہو۔ تعین مقاصد کے لئے اس حقیقت کا معلوم کرنا از حد ضروری ہے کہ آخر ہم کیوں اندھا دھند مغربی آرٹ کو ذریعۂ نجات سمجھ بیٹھے ہیں جس کی پشت پناہ گنتی کے آرٹسٹ ہیں اور ہم خود ایسے ملک اور ایسے آرٹ کے علمبردار ہیں جس کی طرف ان ملکوں کے باشندوں اور آرٹسٹوں کو دیکھنے کی فرصت بھی نہیں۔ ان کے نزدیک اس کی کچھ اہمیت ہی نہیں۔ آرٹ کا نظریۂ فن برائے زندگی یا فن برائے فن زندہ قوموں کی بصیرت کا کرشمہ ہے۔ ہماری سابقہ بدحالی اور غلامی نے ہماری صلاحیتوں کو چھوڑ، فن کا جو بھی مقصد ہو اسے مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ اہل ذوق کو اتنا موقع بھی میسر نہیں کہ وہ ذوقِ نظر سے کوئی فرق مراتب محسوس کر سکیں کیونکہ ہمارے آرٹسٹوں کا تعلق نہ تو ہماری شعوری زندگی سے ہے اور نہ اس جوہر سے جس سے تغیر اور انفرادیت کی شکل مرتب ہوتی ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ آرٹسٹ کی صلاحیتوں کے شناسا اس کے زمانے ہی میں پیدا ہوں۔ جب کبھی ایسا فنکار کے ہاتھ آ جائے اور وقت مردِ زیرک (GENIUS) کا ساتھ دے اور اسے جاننے اور پرکھنے کی فضا اس کی زندگی ہی میں پیدا ہو جائے تو اس کی تخلیق میں اس کی قوم اور اس کے افراد کے تقاضوں کا بھی بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ فن کار کے عمل اور فرض میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہوتی اور وہ بغیر کسی رکاوٹ کے نئے نئے راستے متعین کرنے اور عوام و خواص کو قریب تر لانے میں منہمک رہتا ہے۔ اس لئے بھی کہ تخلیق اور عمل میں اپنے معاشرے اور روایات کی ترجمانی ضروری ہوتی ہے۔ میرا تخلیقی سرمایہ، میری خود اعتمادی کا ثبوت ہے اگر میں رائج وقت تجریدی آرٹ سے پیدا ہونے والی بے راہ روی اور انتشار کی پیروی کرتا اور بغاوت نہ کرتا تو میرا آرٹ بھی سطحی صورت اختیار کر لیتا اور کبھی دعوے سے نہ کہا جا سکتا کہ ہماری تہذیب، ہمارے آرٹ کا

پس منظر کس قدر جامع اور پختہ ہے۔

نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہونے کو آیا ہے کہ اس برصغیر کی جدید مصوری کا احیا ہوا تھا۔ اگرچہ اس کی تہہ میں انگریزی سیاست کا ہاتھ کارفرما تھا۔ مگر اس میں وہ خلوص بھی تھا جس سے مقامی مصوروں کی صلاحیتیں اجاگر ہوئیں اور یہاں کا جدید آرٹ دیکھتے دیکھتے دنیا کی نگاہوں کا مرکز بن گیا اور وہ تحریک اپنی روایات اور اپنے نام سے پکاری جانے لگی مغربی نقادوں اور مبصروں کو بھی اس کے وجود اور انفرادیت کو تسلیم کرنا پڑا۔ اس کا محض یہ سبب تھا کہ کسی تجریدی آرٹ، کسی مغربی تحریک کی پیروی کا اس سے تعلق نہ تھا۔ برصغیر کے جدید آرٹ میں حصہ لیتے ہوئے مجھے پچیس سال سے زیادہ عرصہ ہونے کو آیا ہے۔ میں نے اپنے ہمعصروں کے دوش بدوش اس جدید تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور پرخلوص جدوجہد اور فرائض کی رو سے ایک قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے جس کا بڑے خوش آئند الفاظ میں دوست دشمن سب نے اعتراف کیا ہے یہاں تک کہ برصغیر کی جدید مصوری کی تاریخ میرے نام کے بغیر نامکمل سمجھی جاتی ہے۔ یہاں کا واحد آرٹسٹ ہوں جس کے متعلق زیادہ سے زیادہ لے دے ہوئی ہے اور جس پر سب سے زیادہ لکھا گیا ہے میرے اسلوب کو ایک مستقل دبستان کی حیثیت حاصل ہے۔ امید ہے اس سے ہماری مصوری کا وجود زندہ اور تابندہ رہے گا جو تقریباً تین سو سال سے اپنی راہیں کھو چکی تھی۔ اقبال نے جب پہلا شعر یا غزل لکھی ہوگی۔ اس کے سامنے "ضربِ کلیم"۔ "پیامِ مشرق"، "زبورِ عجم" یا "جاوید نامہ" کا تصور نہیں تھا۔ میں نے بھی جب پہلی تصویر، پہلا اسکیچ بنایا تھا، اس وقت آج کی مصوری اور آج کی طرزِ نگارش پیشِ نظر نہ تھی۔ ہم پیکاسو، گوگن، براک اور وان گوغ بننے کا خواہشمند نہیں۔ ہماری بقا کا راز ہمارے اپنے تقاضوں میں ہے تم بھی بہزاد، برگ، رضا عباسی، میر علی، عبدالصمد، فرخ بیگ اور نادرالعصر منصور جیسے عظیم استادوں کے اندر ان امکانات کی تلاش کریں۔ جیسا کہ مغربی آرٹسٹوں نے اپنے آرٹسٹوں کے اندر رہ کر اور اپنے تقاضوں کی تلاش کر کے اپنے آرٹ کے وقار کو بلند کیا ہے۔

میرے آرٹ پر مختلف دور آتے رہے ہیں اور ہر دور میں میں نے اپنی انفرادیت کا ثبوت دیا ہے اور آج تک رنگ، برش اور پنسل کو اپنے ہاتھ سے نہیں رکھ دیا۔ میرے مطالعہ کا مرکز ایرانی مغل، راجپوت، اور بدھ آرٹ رہا ہے میں نے وقت کی ضرورت کے تحت مغربی آرٹ کا بھی جی بھر کر مطالعہ کیا ہے، اپنے مطالعہ کو جلا دینے کی خاطر دو دفعہ یورپ بھی ہو آیا ہوں لیکن اپنی صلاحیتوں اور انفرادیت کو کسی کا مقلد اور پیرو نہیں ہونے دیا۔ میں نے شاہین صفت لوگ، مجاہد، قلندر اور ایسی ایسی محبوب ماؤں اور عورتوں کے کردار پیش کئے ہیں جو ہمارے کلچر اور ثقافتی قدروں کی عظمت اور شوکت کی ضامن ہیں۔

میری کندہ کاری نے، جس کی ٹکنیک مغربی ہے، مشرقی آرٹ میں ایک عظیم اضافہ کیا ہے اور مغرب بھی اس کی دلکشی اور انفرادیت سے متاثر ہے۔

# شاکر علی

ڈاکٹر محمد اجمل

جب میں یہ سوچتا ہوں کہ شاکر علی مرحوم سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی تھی تو وہ موقع یاد نہیں آتا۔ اسی طرح جب میں نے یہ غور کرنے کی کوشش کی اس سے آخری ملاقات کب ہوئی تھی تو ذہن میں دھندلے خاکے بنتے رہے۔ اس ملاقات کا کوئی واضح نقش نہیں بنتا۔ اپنی اس معذوری پر دل کو بہت دکھ ہوا۔ پھر یہ خیال آیا کہ غالباً دوستی کے بعض رشتے ازلی اور ابدی ہوتے ہیں۔ ان کی ابتدا اور انتہا دونوں موہوم ہوتی ہیں۔ شاکر علی کے ساتھ میری دوستی کی بھی یہی حالت تھی۔ یہ مجھے یاد ہے کہ شاکر علی سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۴۹ء لندن میں ہوئی تھی۔ یہ بھی مجھے یاد ہے کہ ڈاکٹر مقبول احمد اور مسعود کے توسط سے ہوئی تھی۔ لیکن بہت جلدی واسطے پیچھے رہ گئے اور بلاواسطہ ہم دوست بن گئے۔ شاکر علی کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی معصومیت اور بے تکلفی تھی۔ جو صرف غالباً صحیح اور فطری فنکاروں میں ہوتی ہے۔ جب وہ سلیڈ سکول میں پڑھتے تھے تو اکثر مجھے اپنے کمرے میں لے جاتے کہ میں ان کی نئی تصویر دیکھوں۔ جب وہ مجھے تصویر دکھاتے تو ان کے چہرے پر خوشی کی ایک سرخ موج دوڑ جاتی، اور آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو جاتی۔ بعض اوقات میں تعریف کے ساتھ کوئی تنقیدی فقرہ بھی کہہ دیتا تو وہ کہتے، یار کہتے تو تم ٹھیک ہو لیکن یہ مجھے اس طرح اچھی لگتی ہے۔ ایک مرتبہ ہمارے ایک مشترکہ دوست سٹیفنے بڈ نے میری موجودگی میں ان کی ایک تصویر پر بڑی شدید تنقید کی کی "جہاں جہاں تم نے BLAK اور GRAY رنگ لگائے ہیں وہ غلط معلوم ہوتی ہے"۔ شاکر یہ تنقید چپکے سے سنتے رہے، بعد میں جب وہ چلا گیا تو کہنے لگا "بے وقوف بکتا ہے"۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت پر وجدان کی صفت حاوی تھی۔ وہ اپنے وجدان پر بے جا عقلی تنقید نہیں کرتے تھے اور اسے ایک لاحاصل سی بات سمجھتے تھے۔ ان سے پوچھئے کہ فن کیا ہوتا ہے؟ فن کار کیا ہوتا ہے تو ان کے ماتھے پر پسینہ آ جاتا اور وہ کوئی جواب نہ دیتے یا یہ کہہ دیتے "یار مجھے نہیں معلوم"۔

جنگِ عظیم کے فوراً بعد برطانیہ کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں بحث و تمحیص، نظریاتی مکالمے اور بسا اوقات فکری مجادلہ بہت عام ہو گئے تھے۔ سلیڈ سکول میں بھی یہ معرکے ہوئے۔ میں یونیورسٹی کالج لندن میں پڑھتا تھا، جس کی فضا فکری ہنگاموں سے گونجتی رہتی تھی۔ شاکر اور میں ان ہنگاموں میں شامل ہوتے۔ شاکر خاموشی سے اور میں بسیار گوئی سے، ایک مرتبہ جیسے ہی ایک مباحثے کے بعد میں نے شاکر سے پوچھا "یار تمہارا کیا خیال ہے کوئی ٹھیک کہہ رہا تھا" تو وہ بڑے جوش سے کہنے لگے "یار! بڑا مزا آیا، بڑا اچھا ہنگامہ تھا اور یار وہ نیلی آنکھوں والی لڑکی کون تھی، بہت چہکتی تھی"۔

شاکر کی قوتِ فکر وجدان میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ اکثر مباحثوں کو لاحاصل سمجھتے تھے۔ یہ مقام اکثر لوگوں کو تصوف کی ریاضتوں کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ شاکر طبعاً الفاظ کے گورکھ دھندوں میں اُلجھنے سے گریز کرتے تھے۔ انہیں غالباً یہ احساس تھا کہ لفظی تنقید بازی سے وجدان مرجھا جاتا ہے۔

شاکر ایک خوش مزاج انسان تھے بات بات پر بڑے زور سے افوہ کہتے اور خوب ہنستے تھے لیکن جب کبھی اور ایسی کیفیات ان پر کئی دفعہ آئیں احساسِ الم نے ان کی شخصیت کو اپنی کڑی گرفت میں لیا تو میرے دل میں ان سے ایک خاص قسم کی، مادرانہ قسم کی ہمدردی اور شفقت کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس کے ساتھ یہ بھی احساس ہوا کہ ان کی مدد کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ اپنی مدد خود اپنے فن کے ذریعے کرے گا۔ یہ بظاہر اداس اور غم زدہ انسان باطن میں ایک عظیم فن کار ہے اور باطن کا تخلیقی چشمہ پھوٹے گا۔ چنانچہ میں اسے نصیحت بہت کم کرتا تھا۔ لندن میں ایک مرتبہ ہم دونوں پر فاقوں کی نوبت آئی ان پر اس لئے کہ ان کے والد نے بھوپال سے پیسے نہیں بھیجے تھے۔ مجھ پر اس لئے کہ میرا واحد ذریعہ آمدنی بی بی سی میں کام تھا اور بی بی سی نے ایک مہینے مجھے کام نہیں دیا۔ شاکر بہت پریشان ہوا اور اپنے والد کے متعلق کچھ خفگی کا اظہار کیا۔ میں نے کہا، یار دیکھو خدا نے تمہیں یہ نعمت ادا کی ہے کہ تم اس حالت میں کسی سے خفا تو ہو سکتے ہو۔ میری طرف دیکھو کہ سوائے اس کے کسی سے خفا نہیں ہو سکتا، اور چونکہ خدا کو خدا مانا ہے اس لئے اس سے بھی خفا ہونے کو جی نہیں چاہتا۔ شاکر چپ ہو گیا۔ میں نے کہا، یوں تو انقلابی بنتے ہو، کیوں نہ کسی ہوٹل میں DISH WASHING کریں۔ شاکر نے کچھ سوچ کر کہا "افوہ یار ابھی کریں اچھا تجربہ ہوگا، یار ہم تو انقلابی بن گئے"۔

۱۹۵۲ء میں جب میں لندن سے کراچی آیا تو شاکر کے ہاں ایک روز ٹھہرا، جب میں اس کے ہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ لوگوں کا ہجوم ہے، شاکر کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ میں نے کہا یہ مجمع کیوں لگا رکھا ہے۔ کہنے لگا، یار تمہارے آنے کی خوشی میں دوستوں کو اکٹھا کر لیا ہے۔ رات کے ایک دو بجے تک خوب گہما گہمی رہی اور گپ شپ رہی۔ جب اس کے دوست چلے گئے تو میں نے کہا "شاکر مجھے تمہارے دوستوں میں سے ایک دو پسند نہیں آئے"۔

کہنے لگا یار تم بہت گہرا دیکھتے ہو۔ ویسے سبھی اچھے ہیں"۔ دوسرے دن میں لاہور چلا آیا۔

کوئی پانچ چھ ماہ بعد شاکر کا مجھے ایک خط ملا، خط کیا تھا؟ ایک دردناک چیخ جسے سن کر میں لرز گیا۔ تھوڑی دیر میں میرا غم غصے میں تبدیل ہو گیا اور میں نے شاکر کو لکھا کہ جب تعلقات باطل ہو جائیں تو انہیں توڑ دینا چاہیئے، کسی اور شخص کو چاہے کہ وہ کتنا محبوب ہو کھو دینا، اپنے آپ کو کھو دینے سے بہتر ہے"۔

شاکر نے تعلقات توڑ لیے اور لاہور چلا آیا۔ لاہور میں وہ بہت اداس اور محزوں تھا پھر اس نے تصویریں بنانا شروع کیں، ماں اور بچے کی۔ اس موضوع کی تکرار تھی اور اس عمل سے وہ دوبارہ زندہ ہو گیا۔ وہ پارہ پارہ ہو چکا تھا لیکن تخلیق کے فن نے اس کے اجزاء کو پھر یکجا کر دیا۔ اس طرح اس کا تخلیقی عمل جاری رہا۔ پھر کئی سال کے بعد میں نے دیکھا کہ شاکر کے جذبات میں پھر رنگ آگیا اور وہ RILKE پڑھنے لگا۔ یہ وہی RILKE جس نے LON SALOMT سے کامیاب عشق کیا تھا۔ LON RILKE سے عمر میں خاصی بڑی تھی اور بہت جلد ان کے جذبات سرد ہو گئے تھے۔ RILKE کے زیرِ اثر اس نے کئی تصویریں بنائیں اور اسی معصومیت اور دوست نوازی کے ساتھ کہتا رہا۔ یار کچھ تصویریں بنائی ہیں، چلو دکھاؤں بہت اچھی ہیں لیکن تھوڑے عرصے کے بعد یہ رنگ بھی زائل ہو گیا اور شاکر پھر شکستہ ہو کر پھر یکجا ہو گیا۔

شاکر کے ساتھ دوستی کے آخری دور میں وہ مجھ سے اسی وقت ملتا جب وہ بہت اُداس اور ملول ہوتا۔ جس دن یہ خبر آئی کہ مشرقی پاکستان چلا گیا تو وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پہر دن میرے پاس بیٹھا رہا۔ سر نیہوڑے سر ہاتھوں میں لئے، کم گو اور کبھی کبھی کہہ اٹھتا تھا۔ یار یہ کیا ہو گیا، یار اب کیا ہوگا۔ میں خود بھی نہیں سمجھتا تھا کہ کیا ہو گیا، لیکن میں بولتا رہا کہ شاید اسی طرح میرے خیالات میں کچھ صفائی آجائے۔

کہانی بہت لمبی ہے اس کے لئے ایک کتاب چاہیئے میرے دل میں مستقل یہ خلش رہی کہ میں اس کی نمازِ جنازہ میں شریک نہ ہو سکا۔ وہ فریضہ میں آج ادا کر رہا ہوں اور شاکر سے کہتا ہوں کہ یار تو ایک عظیم فن کار تو تھا لیکن ایک اچھا اور پیارا دوست بھی تھا، تیرے چلے جانے سے زندگی کی محفلوں کا لطف آدھا رہ گیا۔

(جنوری ۷۸ء)

# چغتائی اور زین العابدین

بیگم صوفیہ کمال

اللہ تعالیٰ کی تخلیقات میں انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہے۔ دنیا کی ہر چیز خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، انسانی ضرورت اور تسکینِ ذوق کے لیے پیدا کی گئی ہے جس کا وہ ہمیشہ خواہاں رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود بھی قرآن شریف میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس رنگ برنگی دنیا کے حُسن کی جان بوقلمونی ہے، اور اس حسن کی کوئی انتہا نہیں۔ اگرچہ یہ دنیا غیر حقیقی اور آنی جانی ہے پھر بھی انسان اس کی دل آویزیوں سے مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ذہین انسانوں کے دل میں گوناگوں ہنگامی تصورات ایک سیمابی جال بُنتے رہتے ہیں۔ انسان کی نظروں کے سامنے جو چیز آتی ہے اسے دوبارہ دیکھنے یا اپنے عزیزوں کو دکھلانے کا شوق انسان کو شاعر اور فنکار بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے خیالوں اور خوابوں کو پائیدار بنانے کے لئے انہیں شعروں کے سانچے میں ڈھالتا ہے اور موقلم سے کام لیتا ہے۔

صدیاں گذر جانے کے باوجود جدید دور میں بھی آرٹ کے متعلق ویسے ہی رجحانات پائے جاتے ہیں جو کبھی "غار نشینوں" میں پائے جاتے تھے۔ اگرچہ ان کے خیالات میں پختگی اور لطافت نہ تھی تاہم ان کی خواہش اور فطری تقاضا یہی تھا کہ وہ ذوقی تسکین کے لیے اپنے خیالات کو مکمل و مرتب شکل میں پیش کریں۔ اس لئے یہ لوگ اپنے افکار کو پتھروں پر کندہ کر کے انھیں فنی وضع عطا کرتے تھے اور لمحاتِ فرصت میں لطف اندوز ہونے کے لیے محفوظ رکھ چھوڑتے تھے۔ قدیم اور جدید عہد کے درمیان صدہا سال کا فصل ہے لیکن فنونِ لطیفہ کی روش بالکل وہی ہے۔

از منۂ وسطیٰ کے بعد مغل فن کا شاندار دور آیا جس نے سنگ تراشی، مصوری اور عمارت گری میں غیر فانی نقوش یادگار چھوڑے ہیں۔ ان کا ذکر فنونِ لطیفہ کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا، اگرچہ آجکل اس دور کی سنگ تراشی، مصوری اور فنِ تعمیر کا رواج نہیں رہا لیکن نامور مصور عبدالرحمٰن چغتائی نے اپنے مشاقانہ خطوط اور رنگوں کے حسین امتزاج سے اس کی امتیازی خصوصیات کو برقرار رکھا ہے ماہرینِ فن اس کی تصاویر "بلبل" "ماں" "عید کا چاند" "دو ہرنوں کا جوڑا" وغیرہ کو بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور حق تو یہ ہے کہ بنگال کے اربابِ فن میں ان کا تذکرہ بجائے خود ایک دل خوش کُن بات ہے کیونکہ اس سے چغتائی کے فن میں غیر معمولی دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔ دوسرے لوگوں سے قطع نظر آج کل کے ایک جدید فنکار زین العابدین نے اپنی ایک تقریر میں چغتائی کے فن کی عظمت تسلیم کرتے ہوئے اسے خراجِ تحسین ادا کیا۔

ہم لوگ بہت خوش نصیب ہیں کہ ہم مشرق کے دو مایۂ ناز فنکاروں کے تخلیقی کارناموں کو بیک وقت مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ ان کے سن و سال میں کافی فرق ہے۔ ایک کا آفتابِ کمال چڑھ چکا ہے اور دوسرے کا چڑھ رہا ہے۔ ابھی ان دونوں کے مخصوص کمالات پر نقد و نظر قبل از وقت ہے پھر بھی ہم دیکھ سکتے ہیں کہ یہ دونوں کن امور میں امتیاز رکھتے ہیں۔

چغتائی کی شہرت بڑی حد تک نہایت عمدہ خطوط کھینچنے اور رنگوں کو بڑی قدرت کے ساتھ آمیز کرنے پر مبنی ہے۔ وہ مغلیہ دور کے بڑے بڑے واقعات اس کی شان و شوکت اور فنونِ لطیفہ یعنی سنگ تراشی، مصوری اور تعمیرات کو نمایاں کرنے میں یدِطولیٰ رکھتا ہے لیکن اس کی تاریخی اصلیت اور مخصوص انفرادیت اچھوتی ہی مبنی ہے کیونکہ مصوّر کو اپنے فن پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ اس کے اپنے فن کے مزاج اور منفرد اصولوں نے اسے یہ تحریک دلائی ہے کہ وہ اپنے مخصوص فنّی جوہروں ہی کی پیروی کرے۔ اس نے صرف اشیاء کی تصویریں ہی نہیں کھینچیں بلکہ انھیں غیر فانی بھی بنا دیا ہے اور اپنی مصوری کے کمال سے ان میں زندگی اور لطافت کی روح بھر دی ہے چغتائی کی قوتِ مشاہدہ اور جدید فنّی وضع بھی قابلِ ستائش ہے۔ اس کے نقوش کی کیفیت بالکل زمانۂ قدیم کے مرصع زیورات کی طرح ہے جو آج کل کے زیورات کے مقابلے میں زیادہ بھاری تھے اور نسوانی حسُن کو چار چاند لگا دیتے تھے یعنی جو اشیاء پیش کی گئی ہیں ان کی وضع قطع ڈیل ڈول وہی ہے لیکن وہ جِلا پاکر ایک نئے رنگ میں ظاہر ہو رہی ہے۔ بلاشبہ اس کا فن ذاتی جوہروں کے انکشاف، پُرسکون فضا اور شاندار آب و رنگ کی وجہ سے کمال کے انتہائی درجے کو پہنچ گیا ہے۔ بالخصوص جب ہم اس کے نئے اسلوب کا موازنہ پچھلی صدی کے فنی نقوش سے کرتے ہیں جن کے توازن اور آہنگ کو اس نے برقرار رکھا ہے۔

جب چغتائی اپنے کمال کے انتہائی عروج کو پہنچا ہوا تھا اس وقت زین العابدین ایک کم عمر لڑکا تھا اور اس کی پُرفسوں سُرمگیں آنکھیں تخلیق کے پُراسرار لمحوں میں سے گزر رہی تھیں۔ اس کا فنّی شعور اسے ترغیب دلا رہا تھا کہ وہ اپنی نگاہوں کو بلندی پر مرکوز کئے انتہائی وابستگی اور جوش و خروش کے ساتھ اپنی کم عمری اور دوسری دشواریوں سے نبرد آزما ہو۔ اس کے دل و دماغ میں حیرت، خوبصورتی اور سوز و گداز کا جو بھی احساس تھا وہ اسے جامۂ تصویر پر رنگوں اور شکلوں میں منتقل کر کے چلتی پھرتی، جیتی جاگتی وضع عطا کرنا چاہتا تھا تاکہ یہ ہنر و فن کا غیر فانی نمونہ بن کر اہلِ نظر کے سامنے آئے۔ اب بھی وہ انتہائی ذوق و شوق اور انہماک کے ساتھ بڑی نفاست اور چابک دستی سے تصویروں پر تصویریں بنائے جا رہا ہے۔ وہ جو کچھ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اس کے خواب و خیال کی دنیا میں تصویروں کا روپ دھار کر آتا ہے اور وہ اسے بڑے شوق سے پیش کرتا ہے۔ اس نے اپنی ہیولائی کیفیتوں کو رنگ و روپ کی شکل میں جلوہ گر کر کے اور بھی خوش آئند اور پُرکیف بنا دیا ہے اور اس طرح اپنی شہرت ایک فنکار کی حیثیت سے قائم کی ہے۔

زین العابدین مشرقی بنگال کا ایک نوجوان فنکار ہے جس کے اردگرد ایک بہت ہی دلفریب اور مسحور کن فضا مسکراتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس کا ماحول ایک سرسبز و شاداب سرزمین کا ماحول ہے جس میں چاروں طرف بھرپور دریا مستی کے عالم میں موجزن دکھائی دیتے ہیں، اناج سے پُر ہری بھری کھیتیاں، دیہاتی منڈیوں میں لوگوں کا ہجوم اور برسات کے موسم میں دریا کو پار کرنے کے لیے ملاّحوں کا انتظار کرنے والے لوگوں کا جمگھٹ، یہ ہے اس کا سہانا آس پاس۔ وہ گرمیوں کے موسم کی طوفانی فضا کا دلدادہ ہے۔ بر کھارت کی اکتا دینے والی یکسانیت سے محبت رکھتا ہے۔ خزاں کی دھندلی دھندلی سپاٹ فضا اور جمے ہوئے افق کا رسیا ہے اور جاڑوں کی شاموں اور بہار کی راتوں سے عشق رکھتا ہے۔ طوفانوں، قحطوں، وباؤں اور غربت کی تندی و تیزی اور مفلوک الحالی، درماندہ لوگوں کی بیچارگی، شدید دکھ، بیکسی اور مظلومی، یہ سب اسے ایک پُردرد انسان کی حیثیت سے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بنظرِ غائر دیکھنے سے باز نہیں رکھ سکتے۔ اس کی تصاویر محض تصاویر ہی نہیں ہیں بلکہ ابنائے جنس کے دلی محبت سے بھرپور مرقعات ہیں۔ اس کی تصاویر جو اس کے فنّی بلوغ سے تعلق رکھتی ہیں حقیقت سے بہت ہی واضح اور انتہائی شدت سے محسوس کئے ہوئے نقوش ہیں۔ کیا انھیں دیکھ کر یہ احساس نہیں ہوتا کہ آخر یہ جور و ظلم، یہ بھوک ننگ، اور درد ناک بیکسی کب تک باقی رہے گی؟ کیا یہ نقوش محض خیالی ہیں؟ محض خواب ہیں؟ نہیں! یہ انسان کا سوکھا سڑا پنجر، یہ کرتے

یہ کتا اور یہ مری ہوئی ماں کے سینے پر بھوکا بچہ جو اس کی چھاتیاں چوس رہا ہے ! ہاں 'ہاں یہ حقیقت ہے - ایک نہایت ہی کڑی حقیقت کی ہو بہو تصویر ! یقیناً اس کا مصوّر غیر فانی ہے اور اس کا موقلم بھی جس سے اس نے قحط زدہ بنگال کا یہ بھیانک نقشہ پیش کیا ہے۔ اگر ہم زین العابدین کی تصاویر میں سے ہمدردی اور حُبِّ نوعِ انسان کا عنصر نکال دیں تو بھی اس کے نقوش کی سحر آفرینی اور دلکشی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی - وہ موقلم جس نے تندرست سنتھال عورتوں کے سیدھے سادھے چہروں کی عکاسی کی ، ایک بہت عظیم الشان موقلم تھا - اس کا "گلدستہ" ، "پالتو جانوروں کا جوڑا" اور "چڑیا کے بچے" یہ سب ہمیں حیرت زدہ اور ششدر کئے بغیر نہیں رہ سکتے - اسی سے چغتائی اور زین العابدین کے فن کا فرق بھی ظاہر ہوتا ہے - چغتائی کی نگاہ تیز بیں اور شوخ تخیل ایک خود نگر اور متوازن فنکار کے شعور کی عکاسی کرتے ہیں - اس کی تصاویر کو دیکھ کر ایک کیف طاری ہو جاتا ہے - روح مطمئن اور سرشار ہو جاتی ہے اور ایک پُرسکون ، آسودہ ، ہموار ، صاف اور سلجھی ہوئی فضا سے ایسی تسکین ہوتی ہے کہ انسان پر نشہ کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔

زین العابدین کی تصاویر کو مختلف قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے - اس کی مناظرِ قدرت کی تصاویر انسان کو دنیا سے غافل کر کے اس کی نظر کہیں دور ایک نامعلوم دنیا پر مرکوز کر دیتی ہیں - جھونپڑیوں اور گھروں کی تصویریں گھریلو فضا پیدا کرتی ہیں - اور انہیں دیکھ کر انسان کا ذہن گرہست کی طرف منتقل ہو جاتا ہے - کشتی ، منتظر مسافر ، مچھیرا اور ڈونگا ، یہ تمام تصویریں نہایت قابلِ تعریف ہیں - گویا ہم ان سب کو جانتے پہچانتے ہیں اور انہیں اپنے کام میں مگن پاتے ہیں - یہ سب ہمارے ہیں - یہ سب مرد اور عورتیں ! ان مانوس چہروں اور فضا سے ہمارے دل کا ایک ایک تار جھنجھنا اٹھتا ہے اور اس میں ایک لطیف نغمگی کی مسحور کن گونج پیدا ہوتی ہے - اس کے برعکس جب اسی مصوّر کا موقلم ہمارے دکھ اور مصیبت کے زمانوں کی عکاسی کرتا ہے تو ساری فضا میں درد کی ایک روح دوڑی ہوئی نظر آتی ہے اور ہمارے دلوں میں بے اختیار ایک چبھن پیدا ہوتی ہے - ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کیا ہماری غریبی ، کمتری ، پسماندگی ، بے بسی ، بیچارگی خدا کی دَین ہے یا ہماری ناتوانی اور درماندگی کی منہ بولتی تصویر - ہم ایک مصیبت کی ماری روح کو دیکھتے ہیں جو دکھ درد کے مارے کراہ رہی ہے اور اسے دیکھ کر ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ ہے ہماری بپتا ! نہ کچھ کھانے کو ہے نہ پہننے کو اور ہم دن بدن رینگتے رینگتے ، کراہتے کراہتے موت کی طرف بڑھے چلے جاتے ہیں ! کتنا بھیانک کتنا دل ہلا دینے والا ، کتنا دردناک ہے یہ سین ! ہم اپنی آنکھوں کے سامنے ایک بھیانک اصلیت کو جلوہ گر پاتے ہیں ، مل اس پُرآشوب منظر کو دیکھ کر دہشت زدہ ، سرگشتہ لرزہ براندام ہو جاتا ہے - صاحبِ فن کا شعور ہمیں یہ دردناک منظر پیش کر کے تحریک دلاتا ہے کہ آؤ ہم اس درد ، دکھ اور بے کسی کا قلع قمع کر دیں اور آگے بڑھتے چلے جائیں - ہم زندگی کی کایا پلٹ دیں - ہم ایک نئی ذہنی بیداری اور نشاۃ الثانیہ کے نقیب ہیں - ہماری جدوجہد سے ایک نئی سحر اُفقِ ہستی پر نمودار ہو - بلاشبہ موت کا جُرعہ بہت نوشیں ہے لیکن ناانصافی اور تشدد کے سامنے سپر انداز ہو جانا بھی انتہائی بزدلی ہے - وہ دیکھو کوڑے کرکٹ کے کنستر جو امیروں کے کھانے کے ٹکڑوں سے بھرے پڑے ہیں - ان کے ساتھ ہی ساتھ ہم بھوک سے مرتے ہوئے لوگوں کا ہجوم پاتے ہیں جو کتوں اور کوؤں سے ایک آدھ لقمہ چھین کر اپنے پیٹ کی آگ بجھاتے ہیں - آہ ! انسان اس بیسویں صدی میں بھی اس طرح جانوروں کے لگ بھگ ہو جائے جب سائنس اور علوم معارف ترقی کے اس درجے تک پہونچ چکے ہیں - جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے مصوّر نے کس قدر مشاہدے سے کام لے کر دھرتی اور قدرت کا یہ بھیانک منظر پیش کر دیا ہے تو اس کی عظمت کے تصوّر سے ہمارے دل کس طرح

سینوں میں بلیوں اچھلنے لگتے ہیں۔

زین العابدین کے کارٹون بھی اتنے ہی بلند اہم اور بے مثال ہیں۔ وہ اپنے مختلف قسم کے کارٹونوں سے بچوں میں بہت جلد مقبول اور مانوس ہو جاتا ہے۔ بچے جو خوبصورت چیزوں کے دلدادہ ہوتے ہیں اس کے کارٹونوں کو دیکھ کر بہت ہی خوش اور محظوظ ہوتے ہیں۔ اس نے اپنے ایک مضمون بعنوان "رنگ، موقلم اور میں" میں اپنے لڑکپن کا جو خاکہ پیش کیا ہے آج بھی بچوں کی دنیا میں بہت سراہا جاتا ہے۔ یہ تو ہمارے بڑوں کے چہروں پر بھی مسکراہٹ پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کی نکتہ آفریں تصاویر نے خوش ذوق اور ظرافت پسند لوگوں کی دلچسپی میں بہت اضافہ کیا ہے۔

تو یہ ہے زین العابدین کی تصاویر کی مختصر کیفیت۔ اب فن کے ماہرین آئیں۔ اس درجہ بدرجہ ترقی کرنے والے فن کے مختلف نمونوں پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ ان میں سے کونسا بلند پایہ، شاندار، خوبصورت اور دلفریب ہے۔ یہاں میری بصیرت تو کام نہیں کرتی۔

مجھے معلوم نہیں کہ چغتائی نے بھی کوئی کارٹون بنایا ہے یا نہیں۔ اگر بنایا بھی ہے تو میری نظر سے نہیں گذرا۔ میں نے صرف زین العابدین کو تصویریں بناتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ بڑی آسانی اور بے تکلفی سے دوسروں کے ساتھ ہنسی خوشی بات چیت کرتے ہوئے تصویر پر تصویر بنائے جاتا ہے۔ اس کے لیے یہ کام کس قدر آسان ہے۔ اس سلسلے میں مجھے یاد آیا کہ جب ہم کلکتہ میں آریہ روڈ پر رہتے تھے تو وہ ولزلی اسٹریٹ پر رہا کرتا تھا۔ ہر شام ہمارے ہاں آتا اور ٹرام میں چھوٹے چھوٹے ٹکٹوں پر جو تصویریں بنایا کرتا تھا۔ وہ میرے بچے کو تحفے کے طور پر دے دیتا تھا۔ میرے بچے کو یہ تصویریں اس قدر پسند تھیں کہ وہ ان کے بنانے والے کو دل سے چاہنے لگا۔ کتنی حیرانی کی بات ہے! میرا بچہ اس سے اس قدر محبت کرتا تھا کہ جب بھی وہ اس کے زانو پر بیٹھتا وہ اپنا چھوٹا سا ہاتھ اس کی جیب میں ڈال دیتا تاکہ اس میں کوئی تصویر یا ایسی ہی کوئی اور چیز ہو تو اسے ہتھیا لے! ایک دن زین العابدین نے جیب سے ایک ٹرام کا ٹکٹ نکالا اور قلم لے کر ایسی آسانی اور بے تکلفی سے تصویر بنانی شروع کر دی کہ منٹ بھر میں ایک تصویر تیار ہو گئی۔ اگر کوئی بچے سے یہ تصویر چھیننے لگتا تو وہ جھنجھلا اٹھتا اور کہتا کہ یہ میری ہیں۔ اب ہم اس سے یہ چیزیں لیتے تو کیسے؟ پھر بھی بچے نے جو کچھ ہمیں آپ ہی دے دیا ہے، ہمارے لئے زین العابدین کا ایک بیش بہا خزانہ بن گیا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح وہ معمولی کوشش کے ساتھ ٹرام کے ٹکٹ پر تصویر دیتا ہے۔ اس کی قوت واقعی حیرت انگیز ہے چونکہ مجھے کسی اور مصور سے ملنے اور تصویر بناتے ہوئے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ اس لئے میں نہیں کہہ سکتی کہ ان کی تصویر کشی کی رفتار کتنی تیز ہے۔

چغتائی نے ہمیں جو تحفہ دیا ہے وہ احساس کی تیزی، خواب نما کیفیت، حیرت انگیز قوت مشاہدہ اور تخلیق کی حسن کاری ہے اس نے ہمارے دل و دماغ میں ایک ارتعاشی کیفیت پیدا کی ہے۔ اس کے نقوش میں ہم نئے فن کا قدیم روایات سے امتزاج پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اس کی تصاویر کو محض اس لیے نہیں دیکھتے کہ انہیں عام طور پر سراہا جاتا ہے۔ زین العابدین کی بصیرت بہت گہری، اس کی نظر بہت وسیع اور کیفیات بہت متنوع ہیں۔ اس نے صرف ہمارے دلوں کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ ان میں ایک تھرتھری اور جنبش بھی پیدا کر دی ہے اور ہمارے احساس کو شدت سے بیدار کر کے ہمیں زیادہ توانا بنا دیا ہے۔ ہم کتنے ہی واقعات کو جو ہماری آنکھوں کے سامنے سے گذرتے ہیں فراموش کر دیتے ہیں بلکہ انہیں سرے سے دیکھتے ہی نہیں۔ لیکن زین العابدین کی تیز نظر انھیں بھانپ لیتی ہے، اور اپنے تجربہ کار، چابکدست ہاتھوں سے انہیں فن کی صورت میں جلوہ گر کرتا

ہے، وہ اپنے موضوعات سے محبت رکھتا ہے اور اپنے دوستوں اور عزیزوں کو دکھاتا ہے۔ اس کے بعد ہماری کُند نگاہیں ان کا مشاہدہ کرتی ہیں اور یہ سب دل پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ زین العابدین کی اپج حیرت انگیز ہے۔ اس کے موقلم میں کتنی قدرت ہے کہ وہ بھانت بھانت کے لوگوں کو اپنا بنا لیتا ہے۔ اس کی قدرت میں کوئی کسر کوئی جھجک نہیں۔ خدا نے اسے ایک خاص جوہر عطا کیا ہے جس سے ہمارے ملک و ملت کو بہت فیض پہونچا ہے۔ اسی سے چغتائی اور زین العابدین میں فرق ظاہر ہوتا ہے۔ ایک ایسا قدرتی چشمہ ہے جو پیاسوں اور تھکے ماندوں کی تسکین کرتا ہے اور دوسرا ایک دریائے رواں دواں جو صحراؤں اور اجاڑ سرزمینوں کو سیراب کرتے ہوئے قدرت کو حیاتِ تازہ عطا کرتا ہے اور اس کی پیاس اور بھوک دور کرتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ یہ جواں سال مصور، بلکون شیشے کی طرح زندگی کی شعاعوں کے قوسِ قزحی جلوے پردۂ تصویر پر بکھیرتا ہے اور چشمِ تماشا کو اپنی رنگا رنگی اور بوقلمونی سے حیران کر دیتا ہے۔

اپریل ۱۹۵۳ء

جدید ادب کے متعلق اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے
کہ جب معاشرہ ادب کے لئے سب سے بڑا محرک ہے تو
آج کے ادب میں اس محرک کی نمائندگی کا دعویٰ
کئے جانے کے باوجود، اس کے خدوخال کہاں گم
ہو جاتے ہیں؟ اس سوال کا جواب نہ مختصر دیا جا سکتا
ہے اور نہ چند سطروں میں پوری بات کہی جا سکتی ہے، پھر
بھی یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ ہر چند آج کے ادیب
اپنے معاشرتی احوال سے بے خبر نہیں ہیں، لیکن اپنے آپ کو
منفرد بنانے کے لئے انہوں نے وسائل کے ایسے
ترکیبی تانے بانے بُن رکھے ہیں کہ اصل بات تو
دب جاتی ہے اور صرف وسائل باقی رہ جاتا ہے

چالیس سالہ مخزن

عکس تحریر پروفیسر عتیق احمد

# بشیر موجد

احمد ندیم قاسمی

لاھور کے نواح میں مغل پورہ کے مشرق کی طرف، فتح گڑھ نام کا ایک گاؤں ہے جس کی گلیوں میں، بیسویں صدی کی کی تیسری دہائی میں، ایک سانولا سلونا خوبصورت بچہ حیران پھرتا تھا کہ جب وہ گاؤں کے دوسرے بچوں سے بالکل مختلف انداز میں سوچتا ہے تو وہ ایسا کیوں سوچتا ہے آخر مدرسے میں سبق پڑھنے اور گھر میں آکر اسے رٹنے کے علاوہ اس کے اندر کچھ اور بھی کام کرنے کا ابال سا کیوں اٹھتا رہتا ہے۔ ماں باپ تھے کہ ان کا لاڈلا بشیر احمد، جو سارے گاؤں میں سب سے باتمیز اور مؤدّب بچہ ہے، ہر وقت کھویا کھویا کیوں رہتا ہے اور گھر سے باہر کھیتوں میں گھومنے سے، رہٹ کی آواز سننے سے اور نہر کے کنارے بیٹھ کر لہریں گننے سے اسے کون سا سکون میسّر آتا ہے۔

مگر پھر ایک دن یوں ہوا کہ جب بشیر گھر لوٹا تو اس کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ وہ خلافِ معمول چہک رہا تھا اور گھر میں یوں اچھلتا کودتا پھرتا تھا جیسے خوشیوں کا کوئی پوشیدہ خزانہ اس کے ہاتھ لگ گیا ہے۔

دراصل آج وہ فتح گڑھ کے نواح مغلوں کا وہ پرانا باغ دیکھ آیا تھا جس کی چار دیواری پر مغل ذہن کے تزئین کار دل نے خوبصورت اقلیدسی شکلوں میں اپنے فن کا اظہار کیا تھا۔ ان نقش و نگار نے اس بچے کی پوری توجہ کو سمیٹ لیا تھا۔ دوسرے دن وہ نقوش کو اپنے ننھے منے ہاتھوں سے کاغذ پر منتقل کرنے باغ میں پہنچا۔ پھر اسے نقوش کو (TRACE) کرنے کا فن بھی آگیا۔ مغلوں کے باغ سے نمٹ کر وہ فتح گڑھ کے آس پاس بکھرے ہوئے پرانے مقبروں میں دیگر نقوش کی تلاش میں پہنچا۔ اس کے بعد شالامار باغ میں داخل ہوا۔ شاہی قلعے کی آرائش کاری سے چونکا۔ شاہی مسجد کے بیل بوٹے دیکھے۔ مقبرۂ جہانگیر کی تزئین کے ایک ایک رُخ کا جائزہ لیا۔ ان عمارتوں کی شاید ہی کوئی بیل، کوئی پھول، کوئی اقلیدسی شکل، کوئی تحریر ایسی ہو جسے اس نے کاغذ پر منتقل نہ کر لیا ہو۔ ورق در ورق اس نے ان نقوش کے خاکوں کا ایک انبار جمع کر لیا اور روحانی لحاظ سے بہت امیر ہو گیا۔ خود آسودگی کے احساس نے اس کی شخصیت میں مزید جاذبیت پیدا کر دی تھی اور اب وہ فتح گڑھ کی گلیوں میں یوں گھومتا تھا جیسے بادشاہ اپنی سلطنتوں میں گھوما کرتے تھے آخر اس نے رنگ و خط کی اتنی دولت اپنے ہاں منتقل کر رکھی تھی جو گاؤں بھر میں اور کسی کے پاس نہیں تھی۔

ایک صاحب نے بشیر کا یہ شوق دیکھا تو اسے باغبانپورہ میں پروفیسر عبدالرحمٰن اعجاز کے ہاں لے گئے جن کے پاس دُنیا بھر کے بڑے بڑے مصوّروں کے شاہکار جمع رہتے تھے بشیر کو ایک پینٹنگ میں کتنے بہت سے معنی جمع نظر آتے تھے مگر پانچویں جماعت میں پڑھنے والا ایک بچہ ان بکھرے ہوئے معانی کو سمیٹنے کی سکت کہاں سے لاتا۔ بس اتنا ہوا کہ جب فتح گڑھ کا لڑکا

باغبانپورہ کے اس فن دوست کے ہاں سے اٹھا تو اس کے اندر "موجد" بیدار ہو چکا تھا۔ پھر ایک اور ہمدرد موجد کو ریلوے کے محکمے میں لے آئے اور اسے بورڈ نویس کی حیثیت سے ملازم کرا دیا۔ وہاں ایک اُستاد عنایت اللہ تھے جو بورڈ بھی لکھتے تھے مگر ساتھ ہی کاغذ اور شیشے پر دلفریب نقاشی بھی کرتے تھے۔ موجد کو تخلیقی اظہار کا ایک اور ذریعہ ہاتھ لگا اور اس ضمن میں خوب مشق بہم پہنچائی مگر جب وہ اس فن کی تکمیل کر چکا تو خود کو کچھ اور کرنے کے لئے بے تاب پایا۔

تب وہ بیڈن روڈ پر نفیس بلڈنگ کے ایک پینٹر کے ہاں اٹھ آیا اور یہی پینٹر بعد میں اسے آرٹسٹ سرفراز کے ہاں لے گیا۔ یہاں پہنچ کر موجد نے زاویۂ نگاہ میں وسعت پیدا ہوئی۔ فن کے افق جو ہر وقت اسے چار طرف سے اور بہت قریب سے گھیرے رہتے تھے، حدِ نظر تک ہٹ گئے اور زندگی کے تنوع اور اس کی حقیقتوں کے اظہار کے ذرائع گوناگوں ہو گئے۔ احسان دانش، صلاح الدین احمد، عبدالحمید عدم اور تاجور نجیب آبادی کے سے اہلِ قلم سے اسے وہیں تعارف حاصل ہوا۔ عبدالرحمٰن چغتائی، استاد اللہ بخش اور سوبھا سنگھ سے اس کی ملاقات وہیں ہوئی۔ یہ اکابر جب آرٹسٹ سرفراز کے ہاں جمع ہوتے تھے تو ننھا موجد اس محفل میں بیٹھ کر اپنے آپ کو دُنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا تھا۔ وہ ان کی چھوٹی چھوٹی خدمات انجام دے کر اپنے لئے بڑی خوشیوں کے ڈھیر جمع کر لیتا تھا۔ وہ ان کے لئے کبھی چائے لا رہا ہے۔ کبھی پان لا رہا ہے کبھی سگریٹ لا رہا ہے اور آس پاس سے گزرتے ہوئے لڑکوں پر ترس کھا رہا ہے کہ یہ بے چارے بدنصیب علم و فن کی اتنی بڑی شخصیتوں سے دور رہ کر کتنے خسارے میں جا رہے ہیں۔ موجد کو شعر کہنے کا شوق بھی انہی محفلوں میں شرکت کرنے سے پیدا ہوا اور احسان دانش نے اس کا تخلص موجد تجویز کیا۔ چند غزلیں بھی لکھیں اور احسان صاحب سے اصلاح بھی لی مگر اس امر کا اندازہ شاید احسان صاحب کو بھی نہیں تھا کہ موجد مستقبل کے ایک شاعر کے تخلص کی بجائے دراصل مستقبل کے ایک آرٹسٹ کا خوبصورت نام ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد نے اپنے رسالے "ادبی دُنیا" کا دفتر بھی وہیں سرفراز صاحب کے سٹوڈیو میں کھول رکھا تھا۔ جہاں ہر وقت نئی سے نئی کتابیں موجود رہتی تھیں۔ یہاں موجد کے مطالعے کے شوق کا آغاز ہوا۔ اسے یاد ہے کہ ادبی دُنیا کے ذخیرہ کتب میں اس نے جو سب سے پہلی ادبی کتاب پڑھی، وہ ممتاز مفتی کے افسانوں کا مجموعہ "اَن کہی" تھا۔

آرٹسٹ سرفراز کے ایک عزیز لاہور کے چار ذہین لڑکوں کو اپنے ساتھ بمبئی لے جانا چاہتے تھے۔ بمبئی برصغیر کی فلمی سرگرمیوں کا مرکز تھا اور ویسے بھی بمبئی کے ساتھ بعض ایسی پراسرار و خوفناک خصوصیات وابستہ تھیں کہ موجد کو اپنا گاؤں چھوڑ کر بمبئی روانہ ہونے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرتے ہیں زیادہ دیر نہ لگی۔ وہ والدین کو بتائے بغیر گاؤں سے بھاگا مگر اس وقت تین دن گزرے تھے۔ شاید ۱۷ راگست ۱۹۴۷ء کو جب یہ چاروں لڑکے اپنے "رہنما" کے ہمراہ لاہور ریلوے سٹیشن پر پہنچے تو ٹھیک اس وقت امرتسر کی طرف سے ایک ریل گاڑی لاہور پہنچی۔ یہ گاڑی تھی جس کے مسافر راستے میں ذبح کر دیئے گئے تھے۔ ڈبوں کے فرش لاشوں سے اٹے پڑے تھے۔ دروازوں میں سے خون رس رس کر پائدانوں پر ٹپک رہا تھا اور جو مسافر کٹی ہوئی حالت میں بھی زندہ تھے، ان کی چیخوں کی زد میں آ کر لاہور ریلوے سٹیشن کی آہنی چھت جیسے اپنا سینہ کوٹ رہی تھی۔ موجد ابھی لڑکا تھا۔ اس کی صرف مسیں بھیگی تھیں۔ اس نے قتل و غارت کی کہانیاں سنی اور پڑھی ضرور تھیں مگر ایک بھی لاش کبھی نہیں دیکھی تھی اور اس وقت اس کی آنکھوں کے سامنے خون میں نہائی ہوئی بیسیوں لاشیں گاڑی میں سے اتاری جا رہی تھیں۔ وہ پہلے ہکا بکا کھڑا رہا۔ پھر بلک بلک کر رونے لگا اور ریلوے سٹیشن سے بھاگ نکلا۔ اس کے تینوں ساتھیوں پر بھی کم و بیش یہی عالم طاری تھا چنانچہ وہ بھی موجد کے ساتھ تھے اور ان کا نگران

کے تعاقب میں تھا۔ رڑکے کے گھر سے بھاگے ہوئے تھے۔ اس لئے واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا چنانچہ وہ جلد ہی اپنے نگران کی باتیں کان دھر کر سننے لگے تھے۔ اس نے بمبئی جانے کا ارادہ منسوخ کر دیا تھا اور اب انہیں کراچی لئے جا رہا تھا اور بتا رہا تھا کہ کراچی کو ایک چھوٹا سا صاف ستھرا بمبئی سمجھ لو۔

نگران کو کراچی پہنچتے ہی ایک معقول جگہ مل گئی جہاں اس نے اپنے کاروبار میں موجد کو ۲۵ فیصد کا حصہ دار بنا لیا۔ موجد کی محنت اور لگن سے کاروبار خوب چمکا۔ انہی دنوں اپنی والدہ کی علالت کی خبر سن کر اسے فتح گڑھ آنا پڑا۔ واپس کراچی جا کر جب اس نے اپنے دفتر میں داخل ہونا چاہا تو اسے مطلع کیا گیا کہ وہ دفتر میں داخل نہیں ہو سکتا، پروپرائٹر صاحب نے اس کی غیر حاضری میں اس کا پتہ کاٹ دیا تھا۔ موجد کی لوحِ خلوص پر چوٹوں کے ان گنت نشانات ہیں، ان میں سب سے پہلی چوٹ یہی تھی جس نے اس کے قدم اکھیڑ دیئے۔ اب اس کا ٹھکانا کراچی کی سڑکیں تھیں وہ پٹڑیوں پر سوتا اور کئی دن کے فاقے کاٹے۔ چنانچہ اسے دق کا مرض لاحق ہو گیا مگر ایک معروف کمرشل آرٹسٹ اور مصوری کے ایک اچھے اُستاد ہنجرا نے اس موقعہ پر اس کی دستگیری کی۔ وہ خود ایک اشتہاری فرم میں ملازم تھے۔ موجد کو بھی وہاں کام دلا دیا اور موجد والدہ کے انتقال تک اس فرم سے وابستہ رہا۔ ہنجرا کے اس عزیز سلوک نے انسانیت پر اس کا اعتماد بحال کیا جو اب تک ناقابلِ شکست ہو چکا ہے مگر آج بھی جب اس کے خلوص پر کوئی زد پڑتی ہے تو اس کے چہرے پر اس بچے کی سی زخمی معصومیت طاری ہو جاتی ہے جسے استاد نے بغیر کسی قصور کے بید مارے ہوں۔ اس دوران میں رحمین نیغی اور عطیہ فیضی کے ہاں بھی اس کی رسائی ہو گئی اور علم و فن کی ان عظیم شخصیات اور ان کے ہاں جمع نوادر کے خزانوں سے اس نے جی بھر کر کسب فیض کیا۔

والدہ کے انتقال پر وہ واپس لاہور آ گیا۔ وہ جو فن کی خاطر گھر سے بھاگا تھا، اب گھر والوں کا سہارا بننے کی تگ و دو میں مصروف ہو گیا احسان دانش کے توسط سے اس نے ثاقب زیروی کے ہفت روزہ لاہور کے اوّلین پرچے کا سرورق ڈیزائن کیا۔ ساتھ ہی بورڈ نویسی شروع کی دی۔ میکلوڈ روڈ پر ایک صاحب نے ڈیزائننگ پر رکھا مگر ان کا بھی کام جم گیا تو انہوں نے بھی اپنی جبینوں کے نیچے طوطے کی آنکھیں لگا لیں۔

کراچی میں جب اسے اس طرح کا حادثہ پیش آیا تھا تو وہ اس شہر کی سڑکوں پر نکل گیا تھا مگر لاہور اس کا اپنا شہر تھا اس لئے ایک اجنبی کی طرح وہ اپنے آپ کو یہاں کی سڑکوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ایسا کرتا تو پکڑا جاتا، چنانچہ وہ واپس کراچی پہنچا اور وہاں ایک فرم کا آرڈر لے کر اندرونِ سندھ اشتہاری بورڈ لکھتا رہا اور ان پر انسانی چہرے اور مثل اسلوب کے نقش و نگار ابھارتا رہا۔ اس جدوجہد میں وہ ایک بار پھر بیمار ہو گیا۔ وہ جونہی بیمار ہوتا تھا، لاہور اس کی طرف اپنی باہیں پھیلا دیتا، سو وہ حسب سابق لاہور پہنچا صحت یاب ہوا ایک بار پھر بورڈ نویسی سے ایک نئی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اسی دوران میں وہ کمرشل ڈیزائننگ کی طرف متوجہ ہوا یہ انہی دنوں کا واقعہ ہے جب زوبی آرٹسٹ نے اسے اطلاع دی کہ عبدالرحمن چغتائی کو ایک (PEN DRAWING) کرنے والے کی ضرورت ہے یوں موجد چغتائی کے ہاں پہنچا۔ چغتائی ڈرائنگ کا کام اس کے سپرد کر دیتے تھے۔ وہ گھر آ کر یہ ڈرائنگ مکمل کرتا تھا اور دوسرے روز ایک نئی ڈرائنگ لینے پہنچ جاتا تھا۔ دراصل یہ کام اس نے لالچ میں شروع کیا کہ رنگ اور خط کے اس اعجاز نگار کے قرب سے اسے فائن آرٹ کے بعض سربستہ راز معلوم ہوں گے اور وہ چغتائی کی رہنمائی میں اپنے اندر چھپے ہوئے فائن آرٹسٹ کو اپنی انگلی کے نہاں خانے سے باہر نکالے گا مگر چغتائی نے صرف اپنے کام سے کام رکھا۔ یہ فن مصوری کی بدنصیبی ہے کہ چغتائی اپنے فن کے سلسلے میں بے انتہا خفا سے کام لیتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے معترف تو بے شمار ہیں مگر ان کا کوئی مقلد شاید ایک بھی نہیں۔

موجد کہتا ہے کہ چغتائی کے مقابلے میں اُستاد اللہ بخش کا مزاج سراسر مختلف ہے۔ چغتائی کو شاید ہی کسی نے رنگ گھولتے خط لگاتے اور تصویر بناتے دیکھا ہو مگر استاد اللہ بخش کا یہ عالم ہے کہ اگر وہ تصویر بنا رہے ہیں اور آرٹ کا کوئی رسیا ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا ہے تو نہ تو وہ اپنا ہاتھ روکیں گے اور نہ کینوس کو اُٹھا کر رکھ دیں گے۔ وہ تصویر بناتے رہیں گے۔ موجد سالہا سال سے استاد اللہ بخش کے ہاں باقاعدگی سے جاتا ہے اور ایک بڑے آرٹسٹ کے تخلیقی ہالے میں بیٹھ کر وہ اپنے اندر جو کچھ ایک محسوس کرتا ہے۔ وہ اُستاد اللہ بخش سے جو بھی سوال پوچھتا ہے اس کا مفصل اور تسلی بخش جواب پاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ استاد اللہ بخش اپنے فن کے اسرار کھولنے اور بانٹنے پر ہر وقت تیار رہتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ ان کی روایت نئی نسل میں منتقل ہو رہی ہے اور ان کا تہذیبی ورثہ ضائع نہیں جا رہا ہے۔

موجد بچپن سے ایسے آزمائشی حالات میں سے گزرا ہے اور ان حالات کا تسلسل اتنے بہت سے برسوں پر پھیلا ہوا ہے کہ ہم اس سے یہ شکایت کرنے میں حق بجانب نہیں ہوں گے کہ وہ کمرشل آرٹ ہی کا ہو کر کیوں رہ گیا اور اپنے شاداب ذہن اور زرخیز تخیل سے اپنے ملک کے فائن آرٹ کو اب تک کیوں محروم رکھا۔ ہم یہ شکایت اس لئے بھی نہیں کر سکتے کہ موجد اس ضمن میں خود اپنے آپ سے بھی شاکی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کی بیشتر زندگی آرٹ کے ذریعے روٹی کمانے میں گزاری اور ہمارے معاشرے میں فی الحال کمرشل آرٹ ہی میں آرٹسٹ کے لئے دو وقت کی روٹی مہیا کرنے کی گنجائش ہے اب وہ ایک حد تک ادھر سے مطمئن ہوا ہے تو فائن کام کرنے کے متعدد منصوبے پرانے ارادوں کے گرد و غبار کی تہیں جھاڑ کر، زیر عمل آنے کے لئے اس کے ذہن میں ابھر رہے ہیں۔ وہ اس کار قلم سحرکاری پر آمادہ نظر آتا ہے۔ اس نے متعدد پینٹنگز مکمل کر رکھی ہیں، مگر وہ کہتا ہے کہ جب تک میں ان کی تعداد میں معتدبہ اضافہ نہیں کر لیتا اور خود میرا ذہن ہر اگلی پینٹنگ کو گذشتہ پینٹنگ سے بہتر قرار نہیں دیتا، میں اپنے فائن آرٹ کی نمائش سے گریز کروں گا۔

دراصل موجد کاتا اور لے دوڑی" کا قائل ہی نہیں ہے۔ اس کی پوری زندگی صبر آزما جد و جہد میں گزری ہے مگر یہ ساری جدوجہد آرٹ ہی کے حوالے سے ہوئی ہے لہذا وہ فن کی دُنیا میں لمبی یا اُونچی چھلانگ لگا کر داخل نہیں ہوا بلکہ تدریجی انداز میں آگے بڑھا ہے اس لئے رنگوں اور خطوں کے جو اسرار اسے معلوم ہیں اور وہ جس بے ساختگی کے ساتھ موقلم کی ایک جنبش سے ایک جہانِ معنی کی تخلیق کرنے پر قادر ہے، وہ کچھ اسی کا ایک حصہ ہے یا پھر اتکا دکا ان آرٹسٹوں کا جنہوں نے فن کتابوں کی بجائے براہِ راست زندگی سے سیکھا ہے۔

ان پینٹنگز کے علاوہ اس کے پیشِ نظر یہ منصوبہ بھی ہے کہ وہ فنونِ لطیفہ سے متعلق بڑی بڑی ور نامور شخصیت کی پورٹریٹ گیلری بنائے گا۔ اس نے متعدد شاعروں، ادیبوں مصوروں اور موسیقاروں کے پورٹریٹ تیار بھی کر لئے ہیں مگر وہ اس وقت تک انکو منظرِ عام پر نہیں لانا چاہتا جب تک اس کا یہ منصوبہ مکمل نہیں ہو جاتا یا تکمیل کے قریب نہیں پہنچ جاتا۔

اس کی تمنا ہے کہ وہ مسلمانانِ برصغیر کی تحریکِ آزادی اور اگست ۱۹۴۷ء سے بعد کے ہجرت و آبادی کے مناظر اور کیفیات کو پینٹ کرے، اس سلسلے میں اس نے بہت سا لٹریچر جمع کر رکھا ہے اور بڑی بڑی کینوسز پر وہ ان واقعات کو رنگ و خط کی صورت میں منتقل کر دینا چاہتا ہے جنہوں نے ہماری تاریخ کی صورت پذیری میں نمایاں کردار ادا کیا۔

موجد نے مختلف اسالیب میں تجربات کئے ہیں مگر اس کا دعوی ہے کہ آرٹسٹ اپنے گرد تجرید اور مکعبیت اور تاثریت وغیرہ کے ہزار خول چڑھا لے آخر کار اسے سیدھی سادی زندگی ہی کی طرف لوٹنا ہے کہ آرٹسٹ کی انسپیریشن کا واحد منبع یہی حقیقت پسندی اور

صداقت پسندی ہے۔ عام زندگی میں بھی موجد صداقت پسند کھرا آدمی ہے اور کھرا آدمی جھوٹ نہیں بولتا چنانچہ اس کی رائے کے مطابق آرٹ میں "ریلزم" کے سوا باقی "ازم" جھوٹ ہیں۔ جھوٹ اگر سخت لفظ ہے تو پینترہ کہہ لیجئے۔ چالاکی کہہ لیجیئے مگر بہرحال یہ "ازم" سچائی سے گریز کے اشتہار ہیں، اور سچائی چاہے کتنی ہی تلخ ہو، انسانی زندگی کا امرت رس جو ہر آرٹ کی جان ہے یہی صداقت اور حقیقت ہے کیمرہ موجد کے نزدیک حقیقت کے اظہار کا ایک مشینی ذریعہ ہے جو نہ آنکھوں میں روح کی گہرائیاں دکھا سکتا ہے نہ نیم وا ہونٹوں میں رکی ہوئی چیخوں کو آواز دے سکتا ہے۔ آرٹسٹ کا کام وہیں سے شروع ہوتا ہے جہاں فوٹوگرافر اپنا کام ختم کرتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ پاکستانی آرٹ کی دنیا میں یہ جو حقیقت کی طرف مراجعت کی ایک تحریک چلنے لگی ہے تو یہ مراجعت موجد کے سے آرٹسٹوں کی خود اعتمادی کا معجزہ ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ کسی پینترے بازی اور چالاکی کے بغیر حقیقت کا کھرا اظہار بہت ہی مشکل فن ہے اور ناصر کاظمی اس بارے میں شاعری کے حوالے سے کتنی حق بات کہہ گیا ہے کہ:

کہتے ہیں غزل قافیہ پیمائی ہے ناصر یہ قافیہ پیمائی ذرا کر کے تو دیکھو

میرا یقین ہے کہ جو سچا شاعر ہوتا ہے وہ اندر سے مصور بھی ضرور ہوتا ہے۔ جو سچا مصور ہوتا ہے، وہ اندر سے شاعر بھی ضرور ہوتا ہے۔ اسی طرح موسیقار بھی آواز کی شاعری کرتا ہے اور رنگ راگنیوں سے تصویریں بناتا ہے۔ تمام فنونِ لطیفہ ایک دوسرے کے ساتھ محض وابستہ نہیں ہیں ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔ موجد نے شاعری بھی کی (اگرچہ اس کی شاعری کی یادگار اس کا تخلص رہ گیا) اس نے گایا بھی ہے ایک موسیقار عاشق علی خان (مشہور اُستاد عاشق علی خان نہیں) سے موسیقی کے سبق بھی لئے ہیں۔ ریڈیو میں ٹسٹ بھی دیا ہے اور کامیاب بھی رہا ہے مگر جس روز اس کا پہلا گانا براڈ کاسٹ ہونا تھا وہ کسی نجی کام میں ایسا الجھا کہ ریڈیو سٹیشن نہ پہنچ سکا۔ پہنچ جاتا تو ممکن ہے اب تک گا رہا ہوتا۔ وہ اب گاتا نہیں ہے صرف گنگناتا ہے۔ مگر صرف اچھا شعر گنگناتا ہے کہ موجد صحیح معنوں میں شعر فہم ہے فنونِ لطیفہ کے باہمی ارتباط کی حقیقت پیشِ نظر ہو تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں رہ جاتی۔ موجد کے حلقۂ احباب میں اسی لئے تو شاعروں اور موسیقاروں کی اکثریت رہی ہے۔

آرٹسٹوں میں اُستاد اللہ بخش، عبدالرحمٰن چغتائی، سوبھا سنگھ، شاکر علی اور زوبی سے اس کی ملاقاتیں رہی ہیں مگر اس کا اسلوب اس کا اپنا اسلوب ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم اسے استاد اللہ بخش سے متاثر کہہ سکتے ہیں۔ مگر اس تاثر میں بھی اس کی اپنی قد آور انفرادیت نمایاں رہتی ہے وہ روغنی اور آبی دونوں قسم کے رنگوں کو مساوی مہارت سے استعمال میں لاتا ہے اور کہتا ہے کہ روغنی رنگوں کے اپنے امکانات ہیں جن سے ہر آرٹسٹ کو بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیئے اور آبی رنگ کے اپنے آفاق ہیں جن پر ہر آرٹسٹ کو مشق اور ریاضت سے حاوی ہونا چاہیئے۔

انسانی چہرے موجد کا خاص موضوع ہیں۔ لینڈ سکیپ سے بھی اسے رغبت ہے مگر اس کا جینیئس انسانی چہروں کو پینٹ کرنے ہی سے کھلتا اور پھیلتا ہے موجد چہروں کے محض پنسل یا پن سکیچ بنا کر بھی متعلقہ موضوع کی پوری شخصیت کا اظہار کر دیتا ہے۔ رسالہ فنون کے مدیر کی حیثیت سے مجھے فخر ہے کہ میں نے موجد کے بنائے ہوئے ساحر سے راجندر سنگھ بیدی تک کے پن سکیچ شائع کئے ہیں اور فرانس اور ہندوستان سے مجھے ان سکیچز کی اصل بھجوانے کی بیسیوں فرمائشیں آ چکی ہیں۔ فنون کے حوالے سے میں اس امر کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جب یہ رسالہ (شروع ۱۹۶۳ میں) شائع ہونا شروع ہوا ہے، ایک کے سوا اس کے سبھی شماروں کے سرورق موجد ہی نے ڈیزائن کئے ہیں (وہ ایک سرورق، جو موجد کا نہیں تھا، چغتائی کا تھا) اور فنون کے ٹائٹلز تے علک اور عصر رواں

کی کیسی کیسی نازک کیفیات کو کس کس حُسن اور ذہانت سے قارئین کے ذہنوں تک منتقل کیا ہے، اس کے بارے میں نہ موجد کو کچھ کہنا ہے اور نہ مجھے۔ ان کی تحسین آئندہ کے تہذیبی مؤرخ کے حوالے ہے۔

موجد کو اپنے بارے میں کوئی دعویٰ نہیں ہے وہ بڑ بولا نہیں ہے جیسا کہ مصور اور شاعر اور موسیقار عموماً ہوتے ہیں۔ وہ حیرت انگیز لگن کے ساتھ کام کرنے والا مصور ہے اور اتنی شدید لگن اس کے مزاج کا ایک حصہ ہے وہ اپنے دوستوں سے محبت بھی اسی لگن سے کرتا ہے اور اپنے دشمنوں سے نفرت بھی اسی لگن سے کرتا ہے دوستوں کے حوالے سے وہ سر پا خلوص اور خدمت گزار ہے۔ دشمنوں کے سلسلے میں وہ آرٹسٹ ہو کر بھی ہاتھا پائی سے گریز نہیں کرتا۔ اس کے ہاتھ شاید اسی لئے اتنے لمبے ہیں۔ ہاتھ ملایئے تو خلوص کی حدت سے تپ رہے ہوتے ہیں۔ ہاتھ جھٹکیئے تو دو تلوار بن کر اٹھتے ہیں اور ان میں مُوقلم تھما دیجئے تو انسان بہت بڑی تخلیق، انسانی محنت بہت بڑی قوت اور انسانی زندگی بہت بڑی نعمت نظر آنے لگتی ہے۔

جولائی ۷۷ء

ہم اپنے بچپن میں گیم کھیلا کرتے
تھے اس کا نام Monopoly
تھا میں اس کھیل کو کو بڑے
انہماک اور مہارت سے کھیلتی تھی
نہیں معلوم کہ سبب تھا کہ اسی
وقت سے ملکیت Monopolisation
کا لفظ میرے لئے بے معنی اور بے
حقیقت ہوتا گیا ۔

الطاف فاطمہ
۲۲/۱

عکس تحریر الطاف فاطمہ

# لکیروں کی زبان

زین العابدین / الطاف گوہر

ایک دفعہ مجھے خیال آیا کہ وائلن بجانا سیکھوں۔

کسی کہانی میں مَیں نے پڑھا تھا کہ ایک فن کار دیوار پر اپنی تصویر لٹکا کر اسے دیکھ دیکھ کر وائلن بجایا کرتا تھا۔ یہ ترکیب مجھے بہت پسند آئی۔

ایک پرانا وائلن لیا اور کئی دن تک خوب مشق ہوتی رہی۔

پھر کسی نے صلاح دی: "وائلن سے ستار بہتر ہے، آخر اپنے دیس کا ساز ہے۔" میں نے سوچا چلو ستار ہی سہی۔

ستار کے تار سے انگلی کٹی۔

اب میں نے "الیشراج" شروع کیا۔

جب وہ ہو چکا تو ایک دوست نے سمجھایا: "زین العابدین، کن باتوں میں پڑے ہو، تمہارا کام مصوری ہے، بس وہی کرو۔"

میں نے سوچا ٹھیک ہی کہتا ہے۔ مصوری ہی میں میری نجات ہے۔ تصویر کی لکیروں اور رنگوں میں جو کچھ میں کہہ سکتا ہوں اور کسی طرح نہ کہہ سکوں گا۔

---

یورپ سے لوٹ کے آیا تو جو دیکھا تھا دوستوں کو سناتا رہا۔ تنگ آ کر انہوں نے کہا کہ بھائی جو کچھ کہنا ہے ایک بار لکھ کیوں نہ ڈالو، مگر لکھنا تو فن ہی دوسرا ہے۔ میں تحریر کی زبان ہی سے ناآشنا ہوں، تھوڑی بہت زبان جو میں جانتا ہوں وہ تصویر کی زبان ہے۔ اسی زبان کا ایک واقعہ سنیئے۔

---

یہ واقعہ اسپین میں ہوا۔ اسپین کے گلی کوچوں میں گھومنے پھرنے کی جس چیز نے مجھے ہمت دلائی وہ لکیروں کی زبان تھی جس کی مدد سے میں نے انگریزی جاننے والے لوگوں سے راہ و رسم پیدا کی، اور کھانے پینے، چلنے پھرنے کا ایک انوکھا طریقہ نکالا۔ اسپین کا سارا قصہ کہنا ممکن نہیں۔ طالب علمی ہی کے زمانے سے مجھے اسپین جانے کا شوق تھا: الحمرا، اور قرطبہ کی مسجد، کمالِ فن کے وہ نمونے دیکھنے کی مجھے بڑی خواہش تھی، لندن پہنچ کر میں نے جاننے والوں سے اسپین کے بارے میں جو معلومات حاصل کیں اس سے آتشِ شوق اور بھڑکی۔ پیرس پہنچ کر اتنا کچھ سنا کہ سارا اسپین آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا، بس ایک جانا باقی تھا۔ دوستوں نے ہدایات دینے اور پتے بتانے میں کسر نہ کی۔ کون سی گیلری کہاں ہے؟ کون سا مجموعۂ تصاویر کس کا ہے؟ اور اسپین کا انگور سبحان اللہ، تربوز ایسا میٹھا کہ کیا کہیئے۔ جنگلی بھینسوں کا مقابلہ ضرور دیکھنا اور ہسپانوی حسینہ کا

رقص تو خیر دیکھوگے ہی، وغیرہ وغیرہ۔

---

پانچ چھ مہینے پیرس رہنے کے بعد اسپین کا سفر طے ہوا۔ اسپین میں جہاں جہاں مجھے جانا تھا، سب کا انتظام ایک ایجنسی کے ذریعے کر لیا کئی دن بھاگ دوڑ کے بعد ریل کا پاس بھی مل گیا۔ "پاس" پر لگانے کے لئے فوٹو درکار تھا۔ "پاس" کیا پورا پاسپورٹ تھا۔ پاس کی کتاب... سفر کے لیے راستے کے مختلف اسٹیشنوں کے نمبروں سے بھری پڑی تھی۔ جہاں آپ کو جانا ہو ریل کا افسر پاس پر سے وہ نمبر کاٹ کر آپ کو ایک ٹکٹ دیدے گا، اپنا پاس تھا تھرڈ کلاس کا ... پیسہ خرچ آیا تھا مگر ... قصے نہ جانے دیجئے۔

---

یہ سب کچھ ہو چکا تو اطمینان کا سانس لیا مگر ... خیال آتے ہی بیٹھے دم سادھ لیا۔ بات چیت کروں گا کس زبان میں؟ چپ رہوں کا تو کب تک، سنا تھا اسپین میں انگریزی جاننے والے خال خال ہیں، فرانسیسی جاننے والے بہت ہیں، مگر اپنی جانب دانت بھینچ بھینچ کر جس قسم کی فرانسیسی بولتے تھے اس سے کام چلانا ممکن نظر نہ آتا تھا، پیرس میں تو خیر لفظوں سے نہ سہی ہاتھوں کے پرزور اشاروں سے بات بن جاتی تھی مگر اسپین میں تو پہلے کسی آدمی کو ڈھونڈنا ہوگا جو فرانسیسی جانتا ہو۔

---

اللہ کا نام لیا اور روانہ ہو گیا۔ ایک تو گرمی، اس پر بھیڑ، آخری جنگ کے زمانہ میں کلکتے سے گھر آتے ہوئے ریل گاڑی میں جو بھیڑ دیکھا کرتا تھا وہ بھول گیا۔ گاڑی کے برآمدے تک میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، اس پر بھی لوگ تھے کہ دھڑا دھڑ گھسے چلے آرہے تھے۔ میں نے سوچا بچ گیا تو خیریت نہیں۔ ایک کونے میں دبک گیا۔ بیٹھا رہا کہ کھڑا یہ یاد نہیں، ہر لحاظ سے یہ گمان ہوتا تھا کہ ابھی ... ہو جاتے ...۔ مردوں میں بلسوں اور سوٹ کیسوں کے کونے چبھ رہے تھے اگر کیا مجال کہ آہ تک سنائی دی ہو۔ میں حیران تھا۔ جی چاہتا تھا تھوڑی سی گھٹن جاتی تو اچھا ہے کچھ تو ہو، جو لوگ گاڑی میں گھسے چلے آرہے تھے، ان کی طرف گھور گھور کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا "خدا کے لئے مت آؤ۔ جگہ نہیں ہے اور گاڑی دیکھو..." مگر منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔ تھک ہار کر اپنے آپ کو سمجھایا کہ میں نے آخر کوئی گاڑی بھر کا ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا۔ بعض ایسے بھی تھے جو نچلے درجہ میں جگہ نہ پا کر کھسکتے کھسکتے اوپر والے ڈبوں کی طرف بڑھتے جارہے تھے، مجھے خیال آیا کہ یہ بھی کچھ ہم لوگوں سے کم استاد نہیں ہیں، یہ سوچ رہا تھا کہ ٹکٹ چیکر نازل ہوا اور میرے ٹکٹ پر دستخط کرنے کے بعد اشارے سے مجھے اپنے ساتھ اوپر والے درجے میں چلنے کو کہا، کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ میں خاموش کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد چیکر پھر آیا، اور اپنی تیز کلامی سے رعب جھاڑنے، میں حیران تھا کہ نجانے کیا بک رہا ہے۔ اتنے میں اس نے میرا بکس اٹھایا اور گاڑی کے برآمدے کی طرف بڑھا۔ اتنی گرمی اور اس قدر بھیڑ۔ اس پر یہ ایک نیا عذاب آیا۔ شک ہوا شاید ٹکٹ غلط ہو، بیوقوفوں کی طرح چیکر کے پیچھے پیچھے چلنے لگا، فرانسیسی کے جو دو چار لفظ آتے تھے ان میں سے کوئی بھی صورت حال کے اظہار کے لئے موزوں نہ تھا مجبوراً کہنا شروع کیا: "ایلسکیو رے موا، سلو ویلے، موسیے" چیکر نے اشاروں میں ہزار تسلی دی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں مگر یقین نہ آیا۔

---

نیا شہر، چھوٹا سا۔ گائیڈ بک نکال، سوچا پہلے محل اور قلعہ دیکھوں گا کتاب کھولی تو ایک کم خرچ اور پر آسائش رہائش گاہ کے پتہ پر نظر پڑی جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا وہ جگہ کچھ ایسی اچھی نہ تھی، قلعہ دیکھنے سے پہلے کیوں نہ قیام گاہ بدل لوں، مگر سوال یہ تھا کہ کس سے کہوں۔ کیسے پوچھوں کس

راہ گیر سے پوچھ کر بیوقوف بننے کی مجھ میں ہمت نہ تھی، سوچا کسی پولس والے سے پوچھوں گا، لندن میں پولس والا سب کا دوست اور رہبر ہوتا ہے پیرس میں معاملہ اس کے بالکل برعکس۔ ذرا سی بات پوچھیے، اس قدر تفصیل سے جواب دیتا ہے کہ سنتے سنتے سر چکرا جائے۔ اب یہ فکر ہوئی کہ معقول صورت پولیس والا نظر آئے تو اس سے پوچھوں۔ تصویر کشی میں انسان کے چہرے کے متعلق میں نے جتنا علم حاصل کیا تھا، سب صرف کر ڈالا اور ایک ٹریفک پولیس مین کے پاس پہنچا۔ بڑے ڈھیلے ڈھالے انداز سے آواز میں جس قدر مٹھاس ہو سکتی تھی پیدا کی اور انتہائی فرانسیسی لہجے میں بولا "ایکسکیوزے موا، کیا آپ فرانسیسی جانتے ہیں؟" آواز حلق سے زیادہ ناک سے نکلی، پولیس مین مرعوب ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اس کا واسطہ شاید فرانسیسی زبان کے کسی عالم سے پڑا ہے، بغیر دم لئے ایک جوابی تقریر کرنے لگا، یک لفظ سمجھ میں نہ آیا۔ اسکے میں نے پینترا بدل کر پوچھا "کیا آپ انگریزی جانتے ہیں" اس کے چہرے پر اُداسی چھا گئی اور بڑے مغموم طریقے پر سر ہلا کر اس نے کہا "نہیں"۔ اس کے بعد اس نے ہاتھ ہلا ہلا کر طرح طرح کے اشاروں سے میری مدد فرمانی چاہی مگر میں نے کچھ سمجھنے کی کوشش کئے بغیر شکریہ ادا کیا اور کان لپیٹ کر راہ گیروں کے ہجوم میں ایک طرف چل دیا۔

مجھے خیال آیا کہ ملتان میں ملک ملک کے سیاح کان گھاٹ سے گیندے کی مالا پہنے ماتھے پر ٹیکا لگا کر آرٹ اسکول کے سامنے جادو گھر دیکھنے آیا کرتے تھے اور ہم لوگ ان کی ہیئت کو دیکھ دیکھ کر ہنسا کرتے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے لوگ، اسی طرح مجھ پر ہنس رہے ہوں۔ سخت پشیمان ہوا کہ کیوں نہ فرانسیسی زبان سیکھ لی سیکھ لیتا تو آج یہ حالت نہ ہوتی۔ فرانس کے باہر بھی کچھ تو وہ زبان کام آتی۔ اب نہ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرنا پڑے تصویروں کی گیلری میں البتہ چند لمحوں کے لئے زبان کی الجھن میرے دل سے محو ہو جاتی مگر جونہی گیلری سے نکلتا اسی مسئلے کا سامنا ہوتا۔ ابھی تک معاملہ صرف راستہ پوچھنے تک ہی محدود تھا کھانے کے لئے ریستوران میں کیا ہوگا؟ یہ خیال آتے ہی دم نکل گیا۔

---

یک طریقہ ڈھونڈ نکالا۔ دور سے پہلے ریستوران کا انداز اور وہاں کے لوگوں کا مزاج بھانپ لیتا اور جب ریستوران منتخب کر لیتا تو پھر حتی الامکان ریستوران کے اندر نہ جاتا باہر برآمدے میں جہاں لوگ کم ہوتے کسی خالی میز کے قریب رک جاتا اور پھر چپکے سے وہاں بیٹھ رہتا۔ ہوٹل کے اندر جاتا تو لوگ میرے بادامی رنگ اور ہاتھ کے اشاروں سے مدعائے دل بیان کرنے کے طریقے پر حیران ہوتے۔ ایک دن ایسے ہی ایک ہوٹل کے برآمدے میں ایک خالی میز پر بیٹھ گیا۔ کوئی ویٹر نظر نہ آتا تھا، اور کسی کو بلانے کی مجھ میں تاب نہ تھی۔ اتنے میں دیکھا کہ سامنے کی میز پر ایک صاحب بھنی ہوئی مچھلی سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ اب مجھ سے کسی طرح رہا نہ گیا۔ وطن کی یاد نے درد بھی تڑپایا۔ سوچا ویٹر کے آتے ہی اُسے سامنے کی طرف اشارہ کر کے سمجھا دوں گا کہ وہی لے آؤ وہی کہ جس کو آنکھیں ترس گئی تھیں۔ مگر ویٹر تھا کہ آنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ وہ صاحب کھا پی کر میرے سامنے سے چلے گئے اور مچھلی کی خالی پلیٹ میرا منہ چڑاتی رہی، ایک ویٹر آیا بھی تو خالی برتن اُٹھا کر میری طرف توجہ کئے بغیر غائب ہو گیا۔ دس پندرہ منٹ اور گذر گئے تو ایک ویٹر آیا، اور میرے سامنے آ کر کچھ انداز سے ٹھہر گیا جیسے کہہ رہا ہو "جلدی کہو، کیا چاہتے ہو، اندر بھی بہت سے لوگ ہیں"۔ میں نے ہاتھ اور انگلیوں کے اشاروں سے نہ جانے کتنی مچھلیاں بنا بنا کر اسے سمجھانا چاہا، اور جب اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تو سامنے والی میز کی طرف ہاتھ کر کے چلایا "موسیو، وہی، وہی"۔

ویٹر میرا منہ دیکھنے لگا، کچھ بولا بھی مگر میری سمجھ میں خاک نہ آیا۔ بڑی جانفشانی کے باوجود بھی جب یہ مشکل حل ہوتی نظر نہ آئی تو میں نے سوچا دفع بھی کرو، مگر ویٹر کہاں چھوڑنے والا تھا۔ اسے شاید خیال ہوا کہ اگر مجھے کھانے کو نہ ملا تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔

اس نے اشارہ سے مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ یہ سب مصیبت چنگڑی کی چاٹ کی وجہ سے نازل ہوئی بچپن میں جب بھی ملتان جاتے تو اماں خوب سمجھا بجھا کے بھیجتیں کہ وہاں جا کر انڈہ نہ مانگنا۔ کیلا نہ کھانا، مگر یہ نہ بتایا تھا کہ اسپین جا کر چنگڑی نہ مانگ بیٹھنا، مجبور!

چلا ویٹر کے پیچھے پیچھے۔ وہ مجھے لوگوں کے بیچ میں سے نکالتا ہوا باورچی خانہ میں لے گیا۔

باورچی خانہ دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ صاف ستھرا اور کشادہ، عورتیں کام کر رہی تھیں۔ ویٹر ان سے کچھ کہہ رہا تھا اور میں مجرموں کی طرح اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ ویٹر کی بات سن کر عورتیں ہنسنے لگیں۔ پھر بڑی باقاعدگی سے انہوں نے ایک ایک کرکے مجھے مختلف چیزیں دکھانا شروع کیں اور میں بھی نہایت آرام سے نہیں نہیں کہتا گیا۔

وہ پریشان ہوگئے اور ان کی پریشانی دیکھ کر مجھے سخت شرم آئی۔ میں نے کئی دفعہ جانا چاہا، مگر وہ جانے بھی تو نہ دیتے تھے جیسے فیصلہ کر چکے ہوں کہ میرے دل کی بات مان کر چھوڑیں گے۔

اتنے میں جھنگڑی مچھلی نظر آئی تو میں خوشی کے مارے بے اختیار چلا اٹھا۔ انہیں کسی قدر حیرت ہوئی مگر پھر وہ بھی خوب ہنسے کہ ذرا سی بات کے لئے اتنا ہنگامہ ہوا، انہیں کیا معلوم کہ اتنی سی چیز میں میرے لئے کتنی مسرتیں تھیں۔

سر جھکا کر میں نے ان سب کا شکریہ ادا کیا۔

ویٹر کے ساتھ اپنی میز پر پہنچ کر مجھے یوں لگا جیسے ریستوران کے سب لوگ مجھ پر ہنس رہے ہوں اور شاید کئی دن تک ایک بادامی رنگ کے آدمی کا یہ قصہ سنا کر ہنستے رہیں گے۔

بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا کہ باورچی خانے میں عورتیں بھی دل کھول کر ہنس رہی ہوں گی۔ اتنے میں ویٹر پلیٹ میں جھنگڑی مچھلی کا بھجا لے آیا اور مجھے یوں لگا جیسے جھنگڑی مچھلی بھی ہنس رہی ہو۔

کھانا جا رہا تھا مگر دل کو یہ خیال ستا رہا تھا کہ رات کے کھانے کا کیا ہوگا؟ اتنے میں ایک ایسی بات ذہن میں آئی جیسے چودہ طبق روشن ہوگئے۔

میں نے فیصلہ کیا کہ رات کا کھانا بھی اسی ہوٹل میں کھاؤں گا اور لوگوں کے بیچ میں بیٹھ کر۔

رات کے وقت میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ ویٹر میرے پاس آیا۔ دبی دبی ہنسی اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی

اس کے آتے ہی میں نے اُسے پنسل دکھائی اور میز پر سے اپنا سکیچ پیڈ اٹھایا۔

سادے کاغذ پر ایک طرف میں نے اُبلنے، اور دوسری طرف بھوننے کی تصویر بنائی اور پھر ایک بڑی سی گائے کی تصویر سادی۔ ویٹر کی آسانی کے لئے میں نے گائے کی پچھلی ٹانگ کی ران کو تیر کے نشان سے اس تصویر سے ملایا جو چیزوں کو بھوننے کے لئے بنائی تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں میں نے گائے کی بڑی تصویریں بنائی تھیں۔ کھیتوں میں جاتی ہوئی، گھر میں بندھی ہوئی، کھلیان سے ذرا سی چھیڑ کر بھاگتی ہوئی۔ مگر ویٹر کے لئے جو گائے میں نے بنائی تھی، اس کی بات ہی کچھ اور تھی۔

اس کے بعد ایک ایک کرکے انڈا، مرغی، گوبھی اور جس چیز کی بھی ضرورت تھی اس کی تصویر بناتا گیا۔ میں نے سر اٹھا کر ویٹر کی طرف نہ دیکھا مگر چاروں طرف طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ لوگ کرسیاں کھینچ کھینچ کر میرے قریب آ رہے تھے، تھوڑی ہی دیر میں میرے گرد جمگھٹ سا لگ گیا۔ سب حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

میں نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور کہا: پاکستان! اتنے میں ہجوم میں کسی نے صاف انگریزی میں کہا: معاف کیجئے۔ کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟

یہ کہہ کر انہوں نے سب لوگوں سے میرا تعارف کرایا اور بڑی شفقت سے مسکراتے رہے۔

کچھ دیر کے بعد ویٹر میرا کھانا لے آیا۔ کھانا منگوانے کے لئے جو تصویریں میں نے بنائی تھیں وہ لوگ ادھر ادھر لئے پھر رہے تھے۔

جن صاحب نے دوسروں سے میرا تعارف کرایا تھا، انہوں نے مجھے اپنے گھر پر دعوت دی، وہاں کے دوسرے فنکاروں سے ملانے کے لئے
اس کے بعد میرا معمول یہ تھا کہ گھر سے نکلتا تو سکیچ پیڈ اور پنسل ساتھ لیتا۔ ہوٹل میں پہنچ کر تصویروں کی مدد سے کسی انگریزی داں کو ڈھونڈ نکالتا اور پھر اس کی مدد سے فنکاروں اور دوسرے لوگوں سے ملتا۔

اسپین کے سفر میں لکیروں کی زبان ہی میری زبان تھی اور اسی کی مدد سے میں نے سب کام نکال لئے۔

اگست ۵۵ء

منظومات

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اُردو داں بلوچ شعرا جو قدیم و جدید بلوچی [illegible]
اور غزلوں کا اُردو میں منظوم ترجمہ کیا کرتے ہیں موجودہ علمی و ادبی ماحول سے بہت زیادہ
متاثر ہیں۔ اِس لئے ترجموں میں اپنی طرف سے ایسی بے جوڑ باتیں کہہ دیتے ہیں جن کا اصل
بلوچی شعر میں کوئی وجود نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں ہمارے شعرائے کرام اپنی برتری جتلانے کے

لئے بالکل ہمارے انداز بیان اختیار کر لیتے ہیں جو "شیدی بلوچی [illegible]" نامی ایک ڈرامے
میں محترم [illegible] نے اختیار کیا ہے جس میں، بی بکر وغیرہ کے ہیرے اور جواہرات،
زرق برق ریشمی ملبوسات اور محلات کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے جیسے کہ اُس دور کے
بلوچ کالے خیموں میں رہنے والے خانہ بدوش گلہ بان نہیں تھے بلکہ مغل بادشاہوں
اور قاچار شہنشاہوں کی طرح گولے موتیوں سے لدے ہوئے، چین و بلغار کے ریشمی
ملبوسات زیب تن کئے، شاہی محلات میں رہتے تھے اور جن کے اِرد گرد
خدام و حشم کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اِس قسم کے ترجموں اور تحریروں
سے ہم بلوچی کی کوئی خدمت نہیں کرتے بلکہ اُلٹا جگ ہنسائی کا باعث بنتے ہیں۔

عکس تحریر گل خان نصیر

# کوہاری کا فن

سید عابد علی

پاکستان میں روغنی ٹائل، چینی چڑھائے مٹی کے برتن اور دوسرے آرائشی ظروف بنانے کا فن بہت قدیم ہے۔ اس فن کے نادر نمونے خاص طور پر آبدار روغنی ٹائلوں اور کاشی کاری سے مزین اینٹوں اور ٹکڑوں وغیرہ میں نظر آتے ہیں۔ فن کے ان شہ پاروں کا دیدار فن تعمیر کی عجوبۂ روزگار عمارات جیسے مسجد وزیر خاں لاہور، مقبرہ شاہ یوسف گردیزی ملتان اور جامع مسجد ٹھٹھ وغیرہ میں کیا جا سکتا ہے۔

آپ جامع مسجد ٹھٹھ کی بلند و بالا محراب تلے کھڑے ہو جائیے۔ یہاں چلچلاتی دوپہر میں بھی نخلستانوں کا سا خنک اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ ک ذرا اپنی نگاہوں کو ماحول کی پُر تقدیس روشنی سے ہم آہنگ ہونے دیجئے اور پھر چھت کی طرف نظریں اٹھائیے تو چھت پر بنے ہوئے ستاروں کے دریچے، اور محرابیں تین سو سال پرانے ٹائلوں کی نیلگوں روشنی میں آسمان پر جھلملاتے سچ مچ کے تاروں کی طرح روشن نظر آئیں گے۔ اس گوشۂ مسجد میں آپ کو ایک ٹائل بھی ایسا نظر نہیں آئے گا، جس کی آب و تاب ذرا بھی ماند پڑی ہو۔ یہ اسی طرح دائم و قائم چمک دمک لیے فنکاروں کی مشتاق انگلیوں کے کمال کا نمونہ بنے ہوئے ہیں، جیسے اول دن تھے۔ یہ چمکیلے اور خوشنما ٹائل بڑی تعداد میں سندھ کی قدیم عمارتوں میں استعمال کئے گئے ہیں سندھ سے مقابلتاً کم ملتان اور لاہور کی عمارات میں استعمال ہوئے ہیں۔

روغنی ٹائلوں پر نقش و نگار بنانے کا فن، کاشی کاری کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ سب سے پہلے اس فن کو ایران کے شہر کاشان کے لوگوں نے پروان چڑھایا۔ اس وقت اس فن کے نادر نمونے اصفہان کی قدیم عمارات میں سب سے زیادہ نظر آتے ہیں۔ اصفہان عمارات میں جو ٹائل استعمال ہوئے ہیں، ان میں فن کا مظاہرہ پھول پتیوں یا پھر کچھ اقلیدسی ڈیزائنوں اور اشکال میں کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس لاہور کے قلعے کے ٹائلوں میں جن پر ایک ضخیم اور باتصویر کتاب سو برس قبل مسٹر جے ووگل صاحب لکھ چکے ہیں، بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ ان ٹائلوں میں شاہجہان کے زمانے کی ثقافتی و سماجی مناظر کی خوبی سے تصویر کشی کی گئی ہے۔ مرد عورتیں، چرند، پرند، پھول بوٹے سب کچھ ہی موجود ہے۔ ان ٹائلوں میں بے شمار رنگ استعمال کئے گئے ہیں۔

قدیم انداز کی ٹائل سازی کا فن اب تقریباً معدوم ہو چکا ہے۔ اس کے گراں قدر نمونے اب صرف قدیم عمارات ہی میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اب سے تقریباً سو برس پیشتر انگریزوں نے اس قدیم فن کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوششیں کی تھیں۔ انہوں نے خاص طور پر ہالہ اور ملتان کے کاریگروں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مرتبانوں، گلدانوں، چینیوں اور پیالوں پر نقش و نگار بنائیں۔ اس سرپرستی کے نتیجے میں اس فن میں زندگی کے کچھ آثار پیدا ہوئے۔ انگریزوں کے جانے کے بعد یہ فن پھر دم توڑنے لگا اور ان ظروف کی قدر و قیمت اور مانگ خاصی کم ہو گئی، لیکن چونکہ اس صنعت کے کاریگروں کے لئے روزی کا ذریعہ یہی فن تھا، اس لئے انہوں نے اسے برقرار رکھنے کے لئے مسجدوں، مقبروں اور رہائشی مکانات میں لگائے جانے والے ٹائلوں پر فن کا مظاہرہ شروع کر دیا اور یوں پھر اس فن میں لوگوں کو دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اب ایک دفعہ پھر ہالہ، خیرپور، ملتان، گجرات اور پشاور کے کاریگروں

کے کام کی مانگ بڑھ گئی ہے۔

مشرقی پاکستان میں مٹی کے ظروف پر روغن اور چینی چڑھانے کا فن کسی اہمیت کا حامل نہیں البتہ مٹی کے سادہ برتن ہر گاؤں اور دیہات میں مغربی پاکستان کی طرح بنائے جاتے ہیں، لیکن وہاں بھی کچھ گاؤں اور قصبے برہمن باڑیا وغیرہ ہیں جہاں کمہاروں کے کچھ قدیم خاندان آباد ہیں، وقت نے ان لوگوں میں کچھ نہ کچھ تبدیلی پیدا کی ہے اور یہ لوگ بھی اب پیالوں، پلیٹوں اور مرتبانوں پر مختلف قسم کے نقوش اور تصویریں بنانے لگے ہیں۔ کچھ کمہار چمکیلے روغن وغیرہ لگا کر انہیں پکاتے بھی ہیں۔

چینی چڑھانے اور روغنی برتن بنانے کا فن بہرحال پاکستان میں ایک دیسی صنعت کی حیثیت ہی سے زندہ ہے جس میں فن اور تکنیک کی کوئی قابلِ لحاظ بلندی نظر نہیں آتی۔ غریب کمہاروں اور کوزہ گروں کی نہ فنی معلومات ہی بلند ہیں اور نہ ان کی دسترس میں اعلیٰ قسم کی مٹیاں، ولایتی روغن اور جدید قسم کی بھٹیاں ہیں۔ وہ بالعموم اپنے باپ دادا کی آزمودہ قدیم بھٹیوں ہی سے کام لیتے ہیں اور جدید سائنسی طریق کے بجائے اندازے اور نظر پر بھروسہ کرتے ہیں چونکہ یہ لوگ آرٹسٹ نہیں ہوتے اس لئے پھیر پھیر کر پرانے نمونوں ہی کی لوٹ پھیر کرتے رہتے ہیں۔

چینی چڑھانے اور پکانے کے فن کو ترقی دینے کی کوششیں تقریباً دو سو برس سے ہو رہی ہیں۔ اس سلسلے میں لاہور کے نیشنل کالج آف آرٹس کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ابتداء میں اس کالج کا نام میو اسکول آف آرٹس تھا۔ بعد میں بڑھتے بڑھتے اس نے ایک کالج کی حیثیت اختیار کر لی اس ادارے نے مٹی کے برتن اور دوسری چیزیں بنانے اور ان پر چینی چڑھانے کے فن کو فروغ دینے کے لئے شروع میں پرانے اہلِ حرفہ فنکار ملازم رکھے مگر یہ کاریگر شاید استادی کے باسٹھویں داؤں کو چھپا لینے کے قائل تھے۔ انہوں نے اس فن کی تکنیک کو سربستہ راز ہی بنائے رکھا اور اپنے شاگردوں کو اس کی ہوا تک نہ لگنے دی۔ اور غالباً اسی سبب سے اس ادارے میں اس فن کی ترقی کے امکانات واضح انداز میں روشن نہ ہو سکے۔

مشرقی پاکستان میں بھی ایک ایسا ہی ادارہ، یعنی نیشنل کالج آف آرٹس ہے۔ یہاں بھی اس میدان میں کوششیں کی جا رہی ہیں، لیکن اب تک اس ادارے نے ایسے ظروف زیادہ تعداد میں نہیں پیش کئے جو فنی نقطۂ نگاہ سے قابلِ توجہ ہوں۔

چینی چڑھے ٹائل، مجسمے اور دوسرے ظروف کے فروغ کے سلسلے میں ایک تاریخی اہمیت کا واقعہ مسعود کوہاری کی وہ نمائش ہے جو پاکستان آرٹس کونسل میں منعقد ہوئی تھی۔ کوہاری نے اس نمائش میں ایک سو تیس ٹائل اور پچھتر دوسرے ظروف جیسے مرتبان، گلدان، مجسمے وغیرہ پیش کئے تھے۔ ان ظروف اور ٹائلوں پر جواں سال فنکار کی انگلیوں نے وہ نقش تراشے اور اس کے موقلم نے ایسی دلکش تصاویر بنائی تھیں کہ شائقین نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ نمائش کے عرصے میں نمائش ہال روزانہ پُرشوق تماشائیوں سے کھچا کھچ بھر جاتا اور زور و شور کی خریداری اور داد و تحسین کی بارش نے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس فن کی قدردانی ہمارے ملک میں تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

دیکھنے والے تو اپنی پسند و ناپسند دو فقروں میں بیان کر دیتے ہیں لیکن کم ہی لوگوں کو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فن کی بلندیوں تک پہنچنے کے لئے کیسے کیسے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے اور فن پارے میں خونِ جگر کی آمیزش کیونکر ہوتی ہے۔ مسعود کوہاری کو قبولِ عام کی سندیں یونہی کھیل کود میں حاصل نہیں ہو گئی ہے انہیں عروسِ فن کا آنچل تھامنے کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔

کوہاری ۱۹۳۰ء میں بمبئی میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم کم و بیش اسی انداز پر ہوئی جیسی عام طور پر پاکستانی گھروں میں ہوتی ہے لیکن بعد کی زندگی میں انہوں نے آرٹ کو ایک محبوب شغل کے طور پر اپنا لیا، کوہاری نے آرٹ کی تھوڑی سی تعلیم بھی حاصل کی مگر ان کے فن کی دنیا میں داخل ہونے کے سلسلے میں امریکی مرکزِ اطلاعات اور پاکستان آرٹس کونسل کراچی کی حوصلہ افزائی کو بہت دخل تھا۔ یہ ادارے ان کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں بڑے ممد و معاون ثابت ہوئے اور یہیں ان کی تخلیقات کسوٹی پر رکھی گئیں اور جب ان کا کھرا کھوٹا آنک لیا گیا تو قبولِ عام کے دروازے

اُن پر کھل گئے۔ اپنی اس بڑھتی ہوئی حوصلہ افزائی سے تقویت پا کر انہوں نے پٹ فن کی نمائشیں مختلف مقامات پر کیں۔ کوہاری کو مجسمہ سازی کے فن سے ہمیشہ بڑا لگاؤ رہا ہے۔ ۱۹۶۴ء میں حیدرآباد کی ایک نمائش میں انہوں نے لکڑی سے تراشے ہوئے بڑے بڑے مجسمے پیش کئے اور پھر گُندھی ہوئی مٹی کے پیکر تراشنا شروع کئے اور ان اصنام کو لے کر جب وہ انہیں پکانے کمہاروں کے پاس پہنچے تو انہیں بڑی مایوسی ہوئی۔ اس نوعمر آذر کی زندگی میں یہی وہ اہم موڑ تھا جہاں سے حصولِ کمال کی لگن لے فن کی جنوں خیز وادیوں میں مجنوں بنا کر لے گئی جہاں وہ مدت تک سرگرداں رہا۔

کوہاری کمہاروں اور کوزہ گروں سے براہ راست تعلق پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن بڑے مرحلے تک اس فن کے دورن پردہ رازان پر آشکار نہ ہو سکے۔ شوق و تجسس میں وہ ہالہ کے کوزہ گروں اور ٹائل بنانے والوں کے پاس پہنچے لیکن ان کاریگروں نے ایسی سرد مہری برتی کہ کوہاری کو ان سے گھلنے ملنے اور حصولِ فن کی کوئی راہ نظر نہ آئی۔ وہ بڑے دل شکستہ ہوئے لیکن طلبِ صادق نے آخر راستہ بنا ہی دیا۔ ان کے ایک دوست نے نہیں سیہون کے ایک بوڑھے کاریگر سے متعارف کرا دیا۔ یہ بزرگ اس زمانے میں جامع مسجد ٹھٹھہ کے ٹائلوں کی مرمت کا کام کر رہا تھا۔ اس پیر مرد نے نوجوان فنکار کے فن کو دلچسپی سے دیکھا اور شفقت سے پیش آیا۔ کوہاری نے اس کو بہت غنیمت جانا اور بڑی احتیاط سے اس ضعیف کاری گر کا قرب حاصل کر لیا اور جب چچا بھتیجے جیسے تعلقات استوار ہو گئے تو بوڑھے نے فن کے بہت سے راز اگل دیئے جو کوہاری کے لئے بڑے مفید ثابت ہوئے۔ آتشِ شوق نے سیہون میں انہیں کچھ زیادہ عرصے نہ ٹھہرنے دیا اور وہ کچھ عرصے کے لئے لاہور چلے گئے۔ جہاں ان کی ملاقات بیرونی ممالک کے کچھ ماہرینِ فن سے ہو گئی اور ان ماہرین نے کسی پردہ داری کے بغیر انہیں اس فن کے اہم گر بتائے جن میں بنے بنائے ٹائلوں پر روغن چڑھانا، خاص روغنوں کو خوبی سے استعمال کرنا اور انہیں اونچے درجے کی آنچ میں پکانے کے رموز شامل تھے۔

جب انہیں رنگ و روغن، چمک اور بنائی کے گر معلوم ہو گئے تو انہیں محسوس ہوا کہ کاغذ پر تصویریں پینٹ کرنے سے یہ کہیں زیادہ آسان ہے کہ بنے بنائے ٹائلوں کی چکنی سطح پر تصویریں بنائی جائیں اور انہیں ڈھائی سو ڈگری سنٹی گریڈ تک کی حرارت میں پکا لیا جائے۔

کوہاری نے مٹی کے ظروف اور روغنی ٹائل بنانے کے فن کا مظاہرہ پہلی بار مارچ ۱۹۶۷ء میں کیا۔ اسی سال اپریل کے مہینے میں لاہور میں ان کی بنائی ہوئی چیزوں کی نمائش منعقد ہوئی۔ ان نمائشوں میں انہوں نے ایسے شاہکار پیش کئے کہ جن لوگوں کو اس فن سے تھوڑی بہت شُد بُد تھی وہ بھی ان کی تخلیقات کو دیکھ کر اندازہ نہ کر سکے کہ یہ رنگ پختہ اور پکے ہوئے ہیں۔ وہ بہت دیر تک یہی سمجھا کئے کہ یہ پینٹنگ ہے اور کچھ نے تو برملا ان کے منہ پر یہ بھی کہہ دیا کہ آپ سرامک آرٹ کا مظاہرہ نہیں کر رہے پینٹنگ کر رہے ہیں۔ اس قسم کی تنقید نے انہیں دل برداشتہ کرنے کی بجائے ان کے ذوقِ جستجو کو مزید چمکایا اور انہوں نے اپنی ضرورت کے رنگ و روغن اور ٹائل بنانے کی سر توڑ کوششیں شروع کر دیں۔

چینی چڑھانے کی مزید باریکیوں کو سمجھنے کے لئے وہ لاہور سے چالیس میل دور گوجرانوالہ گئے۔ امید کے خلاف یہاں کے کاری گر بڑے ہی پر خلوص اور دوست نواز ثابت ہوئے اور پھر جب وہ مزید تلاش و تجسس میں سیالکوٹ پہنچے تو وہاں بھی ان کو دوستانہ ماحول ملا لیکن بات تو یہ تھی کہ دوستی کے وسیع ساگر میں فن کے نکتے کہیں بکھرے نہیں پڑے ملے۔ کسی کو فن حاصل کرنے کے لئے خلوص و تعلقِ خاطر پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اور اس راہ کو کوہاری نے بڑے تدبر اور حکمت سے تلاش کیا، چھوٹے چھوٹے راز معلوم کرنے کے لئے انہیں کاریگروں کو متواتر تحائف دینے پڑے، اور ان سے برادرانہ تعلقات استوار کرنے پڑے۔ ایسے کہ رفتہ رفتہ وہ کمہار برادری کا ایک فرد بن گئے، اور ان کے ساتھ بھی رہنے لگے کمہاروں کی بستیوں میں رہ کر انہوں نے ایک نئی زندگی دریافت کی اور انہیں اندازہ ہوا کہ غریب کمہاروں کی زندگی کتنی کٹھن ہوتی ہے خاندان کے ایک ایک فرد کو کسی نہ کسی کام میں کولہو کے بیل کی طرح جُتا رہنا پڑتا ہے اور یک پیشے سے کہیں زیادہ یہ فن ان کی زندگی بن جاتا ہے۔

کوجر نو دسے کے کو کڑاتے جاڑوں میں صبح صبح پاؤں اور ہاتھوں سے مٹی کو مدھنے کا ذرا تصور ہی کیجئے تو بدن میں کپکپی پیدا ہو جائے گی پھر ذرا

دوزخ کی طرح دہکتی بھٹیوں کا تصور کیجئے جن کے سامنے بیٹھ کر غریب کمہاروں کو آنچ کی مسلسل تپشیں لینی پڑتی ہیں اور تاؤ قائم رکھنے کے لئے متواتر ایندھن جھونکنا پڑتا ہے۔

کمہاروں کی بستیوں میں رہ کر کوزہ گری کو نئے نئے تجربات حاصل ہوئے سخت کوش زندگی کو انہوں نے ہنسی خوشی برداشت کیا۔ اس تجرباتی دور کی یادیں آج بھی ان کے دل میں چراغوں کی طرح روشن ہیں۔ دراصل یہی تجربات اور مشاہدات ان کے فن کی اساس ہیں جن کا مظاہرہ انہوں نے کراچی آرٹس کونسل میں کیا تھا۔

کراچی میں ۶ مارچ ۱۹۶۸ء کو کوزہ گری کے فن کی نمائش پاکستان آرٹس کونسل میں ہوئی اس موقع پر ہر طبقے کے لوگوں نے ان کے فن سے دلچسپی اور پسندیدگی کا مظاہرہ کیا۔ نمائش ہال میں ہر طرف ٹائل بکھرے ہوتے تھے اور دیواریں بھی ان سے خالی نہ تھیں۔ کچھ کو لکڑیوں کے اسٹینڈوں پر قرینے سے ترتیب دیا گیا تھا۔ مرتبان، گلدان اور مجسمے بھی مناسب طریقے پر رکھے گئے تھے۔ مرتبان مختلف شکلوں کے تھے۔ ان پر سیدھے سادے اور قدیم کلاسیکی ڈیزائن نظر آرہے تھے۔ کچھ مرتبان دیکھنے میں نہایت بھدے اور بھونڈے تھے اور کچھ خوب صورت اور سڈول تھے، کچھ کی سطح نہایت ہموار تھی، کچھ پر بھدے اور کھردرے ڈیزائن بنائے گئے تھے، اور ڈیزائن کو صرف ہیئت ہی سے واضح نہیں کیا گیا تھا بلکہ رنگوں کی آب و تاب اور شیڈز سے بھی انہیں نمایاں کیا گیا تھا۔

نمائش ہال میں دوسری جانب ٹائل تھے جو اپنے مخصوص رنگوں میں جگ مگ کر رہے تھے اور ان پر روشنی منعکس ہونے سے شعاعیں سی نکلتی معلوم ہو رہی تھیں۔ کچھ ٹائلوں اور مرتبانوں کی سطح پر عورتوں کی تصویریں تھیں ان میں رنگ اس انداز سے استعمال کئے گئے تھے کہ وہ متحرک اور جاندار معلوم ہو رہی تھیں۔ ان تصویروں اور اشکال کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ یہ نوجوان فنکار کے تخیل و تصور کی ایسی دنیا تھی جو سماجی شعور سے پوری طرح واقف تھا۔ فنکار نے ان ظروف کو تین مختلف حصوں میں تقسیم کیا تھا، پہلے حصے میں جنگ کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں سے متعلق تصاویر تھیں۔ دوسرے حصے کی تصویروں میں امن پسندی کے جذبات و احساسات کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ تیسرے حصے کی تصاویر میں کراچی کی عام زندگی کو پیش کیا گیا تھا۔

تکنیکی نقطۂ نظر سے اس نمائش کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک حصے میں وہ ظروف آتے ہیں جو تیز آنچ میں پکائے گئے اور دوسرے حصے میں وہ جو ہلکی آنچ میں پکائے گئے ہیں۔ تیز آنچ ایک ہزار ڈگری سنٹی گریڈ سے پندرہ سو سینٹی گریڈ تک ہے اور ہلکی آنچ سات سو سینٹی گریڈ سے لے کر ایک ہزار سینٹی گریڈ تک ہے وہ جنہیں ہلکی آنچ میں پکایا گیا تھا، ان میں رنگوں کا تنوع زیادہ تھا مگر تیز آنچ کے پکے برتنوں میں رنگوں کی تیزی کم ہوگئی تھی کوزہ گری کے بنائے ہوتے ظروف و تصاویر میں کالا، سرمئی، گہرا نیلا وغیرہ رنگ زیادہ نظر آتے ہیں۔

فنی نقطۂ نظر سے ان ٹائلوں کو ہم چار حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ ٹائلوں کی پہلی قسم تو وہ ہے جنہیں بہت زیادہ رنگ و روغن سے مزین کیا گیا، دوسرے لفظوں میں انہیں ضرورت سے زیادہ پینٹ کیا گیا ہے۔ بالعموم اس قسم کے بنے بنائے ٹائل باہر سے درآمد کئے ہوئے ہیں رنگ و روغن بھی بیرونی ہیں۔ ان ٹائلوں کو بہت ہلکی آنچ میں پکایا گیا ہے۔ اس نمائش میں اس کا صرف ایک نمونہ رکھا گیا جس میں چار ٹائلوں کو ملا کر ان پر ایک منظر پیش کیا گیا تھا۔

دوسری قسم ان ٹائلوں کی ہے جو خود ساختہ ہیں انہیں بھی ہلکی آنچ پر پکایا گیا تھا، رنگوں کا استعمال ان میں بہت زیادہ تھا ان ٹائلوں میں تصویریں نہایت ہموار ہیں اور ایسی لگتی ہیں جیسے کاغذ پر پینٹ کی گئی ہوں، رنگوں میں مختلف شیڈز کے امتزاج سے ایک مخصوص تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ رنگ بہت زیادہ گاڑھے استعمال کئے گئے ہیں۔ کچھ ٹائلوں میں صرف سر دکھائے گئے ہیں۔ یہ ایک رُخی تصاویر ہیں جیسے سکوں یا تمغوں پر دکھائی جاتی ہیں۔

ان میں ایک یا دو رنگوں کا استعمال ہوا ہے اس کے پس منظر میں عموماً صوفیانہ رنگ استعمال کیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا قسم کے ٹائلوں کو بنا کر کوہاری کو نا لبا یہ احساس ہوا کہ وہ ان کے ذریعے اپنے فن کا بھرپور انداز میں مظاہرہ کرنے سے قاصر رہا ہے۔ اس لئے اس نے ایک تیسرے قسم کے ٹائل بنائے۔ ان میں تصویروں کو ابھارنے کے بجائے گہرائی میں لائنیں کندہ کر کے بنایا گیا ہے۔ یہ لائنیں اس قدر گہری ہیں کہ تصویروں کے ساتھ ساتھ ٹائلوں کی اندرونی سفید سطح پر بھی نظر آتی ہے تصویر کو مختلف حصوں میں انہیں لائنوں کے ذریعے تقسیم کیا گیا ہے۔ اس قسم کی تکنیک میں عام طور پر تجریدی آرٹ بنایا گیا ہے اور تصویر کو مختلف حصوں میں بانٹا گیا۔ بعض بعض ٹائلوں میں حیرت انگیز تاثر پیدا ہو گیا ہے۔ کوہاری کا کہنا ہے کہ یہ گہری لائنیں رنگین حصوں میں استعمال ہونے والے بعض رنگوں کو تیز آنچ میں پھیل کر بہہ جانے سے محفوظ رکھتی ہیں بہرحال گہری سفید رنگیں ایک اچھا تاثر پیش کرتی ہیں۔ یہ تصاویر اس کی وجہ سے بالکل فوٹو نیگیٹو معلوم ہوتی ہیں۔

دوسری مثالیں ان ٹائلوں کی ہیں جن کی سطح پر اس نے پہلے گہرے رنگوں کا استعمال کیا اور پھر ان رنگوں کو دور کیا۔ اس عمل سے رنگ صرف گہری لائنوں میں رہ گیا اور پھر ابھرے ہوئے حصوں کو اس نے رنگوں سے رنگ دیا اب یہ گہری گہری لائنیں بالکل فریم کی طرح لگتی ہیں جیسے کسی فریم میں کوئی تصویر آویزاں ہو اس سے کہیں زیادہ تاثر ان تصویروں میں پیدا ہو گیا ہے جن میں مونوگرم استعمال کیا گیا ہے اور ٹائلوں اور جھریوں میں کوئی دوسرا رنگ استعمال کیا گیا ہے۔ کچھ ٹائلوں میں ان دھاریوں کو سفید چھوڑ دیا گیا تھا اور ان کے اندر ہی نیلی یا سنہری چمک پیدا کی گئی ہے جیسا کہ گھوڑوں وغیرہ کی تصویروں میں نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں تصویر کی کندہ لکیروں کے بجائے تصاویر کی سطح کو کسی قدر اندر دھنسا دیا گیا ہے اور ان کے اندر جو تصاویر ہیں ان کو ابھار یا گہرائی لئے ہوئے بنایا گیا ہے۔ اس اپچ نے انہیں بڑی دلکشی عطا کی ہے اور یہ عجیب و غریب انداز اختیار کر گئی ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے کسی ایک طرف سے تیز روشنی پھینکی جائے تو وہ جس سطح پر گرتی ہے اس کا منظر عجب انداز سے اجاگر ہوتا ہے بالکل یہی تاثر اس قسم کی تصاویر کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے اس سلسلے میں کوہاری نے ایک تیسری تکنیک کا استعمال بھی کیا ہے جس میں تصویر کی مکمل سطح یا کسی کسی جگہ کو مختلف گہرے رنگوں سے رنگا ہے۔ صرف گہری کھدی ہوئی لائنوں کو بغیر رنگے چھوڑ دیا ہے۔ اس تکنیک کو خاص طور پر جنگ اور جنگ سے متعلق تصاویر میں اپنایا ہے۔

چوتھی قسم وہ ہے جس میں اس نے ایک بالکل متضاد تکنیک استعمال کی ہے اور ظروف پر عورتوں کے علاوہ دوسری چیزوں کی بھی تصاویر بنائی ہیں۔ اس میں اس نے تصویروں کو نہ ابھار کر بنایا ہے نہ کھود کر۔ اس میں تصویروں کی آؤٹ لائن میں لائنوں کا استعمال نہیں ہے بلکہ دھبوں کا استعمال اندرونی تصاویر کے نقوش ابھارنے کے لئے ہوا ہے۔ ان تصویروں کا پس منظر گہری لائنوں کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں اصل تصویر کو بے رنگ بھی چھوڑ دیا گیا ہے۔ جہاں پس منظر ہموار اور یکساں ہے وہاں اسے کسی قدر گہرائی لئے ہوئے بنایا گیا ہے۔ اس قسم کے نقوش اور تصاویر میں یونانی آرٹ پیش کیا گیا ہے۔

کوہاری نے تابناکی چمک دمک دینے کے سلسلے میں کچھ بڑے دلچسپ تجربات کئے ہیں شاید کچھ جگہ کو اس نے ٹیڑھا میڑھا درکر کے ہو دکھایا ہے اس قسم کی فنکاری خاص طور پر جاپانی ظروف میں جلوہ گر ہوئی ہے۔

کوہاری نے عورتوں کی تصویریں بڑے اچھوتے تخیل سے بنائی ہیں۔ ان کے چہرے گول مٹول، بڑی بڑی آنکھیں اور ہونٹ بھاری، چہروں پر حیا داری اور شرمیلا پن ہے۔ اپنے لباس اور انداز سے یہ گاؤں کی سیدھی سادی عورتیں ہیں۔ ہمارے فنکار کی نظر دیہاتی زندگی پر بڑی گہری ہے جہاں کہیں بھی وہ دیہاتی عورتوں کو دکھاتا ہے وہاں بڑا گہرا تاثر پیدا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ جب وہ تجریدی آرٹ کا کوئی بھی شاہکار تراشتا ہے تو وہ انہی جانے پہچانے معصوم نقوش کی مدد سے ابھرتا ہے۔

اس کی دوسری پسندیدہ تصاویر وہ ہیں جن کے ذریعے اس نے یونانی حسن کو پیش کیا ہے۔ یہ بھی نازک نازک عورتوں کی نیم عریاں تصاویر ہیں

جن کے پیروں کو ایک خاص انداز میں لپٹا لپٹایا دکھایا گیا ہے۔

تیسری قسم میں وہ پہاڑی پینٹنگز آتی ہیں جن میں راجکماریاں بیٹھی ہوتی ہیں، اور ان کے ہاتھوں میں چڑیاں ہیں اور بعض موسیقی کے کسی ساز کے آگے بیٹھی دکھائی گئی ہیں۔ ان تصویروں میں کشادہ اور جاندار آنکھیں ایک خاص تأثر کو اُجاگر کر دیتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ ٹکٹکی باندھے کسی خاص چیز کو دیکھ رہی ہیں۔

ٹائلوں اور مرتبانوں کے علاوہ کوہاٹی نے چار ستونوں کو بھی آراستہ کیا تھا جن پر اوپر نیچے دائروں کی شکل میں مختلف تصاویر اور مناظر پیش کئے گئے ہیں۔ یہ تصاویر بڑی سچی اور جیتی جاگتی ہیں خاص طور پر وہ تصاویر جن میں کراچی کی شہری زندگی کے متعلق منظر پیش کئے گئے ہیں بے پناہ تأثر رکھتی ہیں۔ اسی طرح جنگ کے کالم کے تحت جو تصاویر ہیں ان میں تو دراصل نوجوان فنکار نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے یہ جنگ کی تباہ کاریوں اور ہولناکیوں کے جیتے جاگتے نمونے ہیں جن کا وجود میں آنا ہر جنگ کے بعد ناگزیر ہے۔

یہ بات ذرا کھٹکتی ہے کہ ہمارے فنکار نے ایک تصویر یا کسی ایک منظر کے لئے پورے ستون کو استعمال نہیں کیا بلکہ مختلف مناظر کے لئے ایک ستون مقرر کیا ہے اور مختلف النوع تصاویر کو دائروں سے علیحدہ کیا ہے۔ اس عمل سے کسی ایک منظر یا تصویر کا بھرپور تأثر مترشح نہیں ہوسکا کوہاٹی ایک اُبھرتے ہوئے فنکار ہیں اور مستقبل میں ان سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں ان کا فن ارتقائی منازل طے کر رہا ہے وقت گزرنے پر ان کی اشکال میں اور زیادہ جان پیدا ہو جائے گی۔

حیرت انگیز فن کا مظاہرہ انہوں نے ۶ مارچ ۱۹۶۸ء کو پاکستان آرٹ کونسل کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی نمائش میں کیا تھا۔ امید ہے مستقبل کی نمائشوں میں وہ اس سے بھی بہتر نمونے پیش کر سکیں گے۔

چالیس سالہ مخزن

(ستمبر ۶۹ء)

کاسۂ سر بن گیا ہے کشکول جب
کس لہو میں ڈوبتی گئی دستِ طلب
کون سا جیسے بدلیں گے ہتھیار اب
در در کہاں سر چھپاتے پھریں گے نخمی
شہر میں اب نہیں کوئی بھی اجنبی
منو بھائی

عکسِ تحریر منو بھائی

# جدید مصوری

فرید احمد

ہربرٹ ریڈ کی رائے میں جدید مصوری کا ایک پہلو ایسا ہے جس کے بارے میں سب کو اتفاق ہے اور وہ ہے۔ اس کی پیچیدگی۔ چنانچہ کوئی شخص بھی کسی ایک جدید دبستان یا روایت کو سامنے رکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ جدید مصوری کا اصل نمونہ ہے اور باقی سب اس سے کسی نہ کسی طرح ماخوذ ہیں یا غلط ہیں۔ مصوری میں جدید انقلاب درحقیقت کوئی انقلاب نہیں۔ یعنی اس سے نہ کوئی کایا پلٹ ہوئی ہے اور نہ کوئی بازگشت۔ بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک شکست و ریخت، ایک ترقی معکوس رونما ہوئی ہے۔ اور بعض کی رائے میں ایک سلسلہ درہم برہم ہو گیا ہے۔ جدید مصوری کا تنوع دراصل نیرنگیوں کا مجموعہ ہے۔ ہم اس کی مختلف صورتوں کو کسی ایک نظریئے کے تحت نہیں لا سکتے۔

مغربی مصوری کی سرکردہ روایت، جسے ہم سہولت کی بنا پر مکتبی روایت کہہ سکتے ہیں، چودھویں صدی عیسوی میں شروع ہوئی۔ اس کے بارے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی بنیاد عینی مشاہدے پر تھی۔ جیسا کہ راجر فرائی نے کہا ہے "مصور سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ اس کے ترسیمات نہ صرف جذبات کو اپنے آہنگ سے متاثر کریں بلکہ یہ دنیائے آب و گل سے بھی پوری پوری مطابقت رکھتے ہوں" یہ صرف دو ہی صورتوں میں ممکن ہے یا ہم کسی حقیقی منظر کو ہو بہو پیش کر دیں یا ان قوانین کے مطابق جن کی ہماری نظر قدرتی طور پہ پیروی کرتی ہے، تصویر تیار کریں۔

جدید مصوری اس رسمی تصور کے خلاف بغاوت کا نتیجہ ہے۔ مثال کے طور پہ جاپان سے جو تصاویر یورپ میں منتقل ہوئی تھیں انہوں نے انیسویں صدی کے پہلے عشرے میں فرانس کی تمام "ما بعد التاثری" تحریک پہ جو اثر ڈالا وہ ان تصاویر کی تعداد اور نوعیت کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ ارباب فن نے فوراً محسوس کر لیا کہ مصوری حقیقی مناظر کی من و عن عکاسی سے بالکل بالاتر بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی یہ ممکن ہے کہ تصویر حقیقی دنیا کے ساتھ کچھ بعید سی مناسبت رکھتی ہو۔

ان جدید مصوروں میں سے جو پہلے پہل جاپانی تصاویر سے اثر پذیر ہوئے ایک پال گوگان تھا اور یہ وہ اثر تھا جو مصوری کے آئندہ رجحان کے لئے فیصلہ کن ثابت ہوا۔

۱۸۸۸ء میں پونٹ ایون کے مقام پہ پال گوگان کی ملاقات ایک اور مصور پال سی رو سیر سے ہوئی جو اس وقت ایک فنکار کی حیثیت سے کچھ ایسا مشہور نہیں تھا لیکن اس نے فی الفور گوگان کے فن پاروں کی تازگی، جاذبیت اور توانائی محسوس کر لی۔ چنانچہ اس نے اس کی خصوصیات کی تشریح شروع کر دی۔ اس نے گوگان کے کام اور گفتگو کی بنا پر جو نظریہ مرتب کیا بہت جلد تاثریت کے نظریئے سے بالکل جداگانہ حیثیت اختیار کر گیا۔ اس نظریئے کا جسے مشرقی روایات کا جواز حاصل تھا۔ اور جس کی تشکیل سی رو سیر نے گوگان کے فن کی بنا پر کی تھی بعد میں وان گوگ کے فن پہ بھی اطلاق کر دیا گیا۔ اس طرح پانچ سو سال سے مصوری کی جو روایات چلی آتی تھیں وہ علی الاعلان ترک کر دی گئیں۔ اب یہ تصور پاش پاش ہو گیا کہ مصوری کی بنیاد لازماً قدرت کی من و عن عکاسی پہ ہونی چاہیئے۔ بلکہ یہ قرار پایا کہ فن کار کا مقصود سطحی مشاہدات کی تہ میں کوئی ایسی مجازی علامت

دریافت کرتا ہے جو حقیقت کی زیادہ پُرمعنی عکاسی کرے بہ نسبت اس من وعن نقالی کے جو صرف ظاہری ہیئت سے سروکار رکھتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جدید اور قدیم مصوری میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ جدید مصوری میں ظاہری نگارش کی بجائے علامت پر زور دیا گیا ہے۔ گوگاں کا قول ہے کہ موسیقی کی طرح مصوری میں بھی انسان کو ترسیم کی بجائے ایماء و اشارہ پر توجہ دینی چاہیئے۔

جدید مصوری میں جن تین نظریوں کا غلبہ ہے ان میں سے ایک کی نمائندگی ہنری متیس کرتا ہے۔ ۱۹۰۸ء میں متیس نے کہا تھا کہ:

"جہاں تک میری مصوری کا تعلق ہے اظہار اس جذبے میں نہیں ہوتا جو کسی تصویر کے چہرے میں جھلکتا ہے اور نہ کسی پُرہیجان حرکت سے ظاہر ہوتا ہے بلکہ یہ میری تصویر کے نظم و ترتیب سے نمایاں ہوتا ہے۔ یعنی پیکروں کی نشست، ان کے اردگرد خالی جگہ اور باہمی تناسب یہ سب چیزیں اس میں اپنا اپنا اثر پیدا کرتی ہیں۔"

جب ہم متیس کی کسی تصویر پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں صرف اس کے مرکزی نقطے ہی پر توجہ مرکوز کرنی چاہیئے، پھر باقی ساری تصویر جو بادی النظر میں بالکل بے ربط اور بے ہنگم معلوم ہوتی ہے۔ نہایت مربوط اور ہم آہنگ دکھائی دے گی۔ ہم اس کے معنی کا وضاحت سے مشاہدہ کر سکیں گے اور اس میں پورا پورا تناسب پائیں گے۔ رنگ اس سے پہلے کبھی اس قدر خالص شبت، یا ارتعاش انگیز نہ تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے جدید مغربی مصوری میں رنگوں کے خوشگوار امتزاج کی وہی خاصیتیں روشناس کی ہیں جو قدیم ایرانی تصاویر اور قرونِ وسطیٰ کے رنگدار شیشوں کی روح درواں تھیں۔ رنگوں کا یہ جادو متیس کے تخلیقی وجدان کی صداقت کا آخری اظہار ہے۔ اس کی تصاویر کا موازنہ بجا طور پر بچوں کے کھینچے ہوئے نقوش سے کیا گیا ہے کیونکہ ان دونوں میں اس احساس کی عکاسی کی گئی ہے جو منطق سے ماورا ہے اور جس میں ایک نگاہِ پاک بیں کا سرور و کیف مضمر ہے۔

ایک اور مصور جس نے گذشتہ پچاس سال مغربی مصوری پر بہت اہم اثر ڈالا ہے۔ ایک اسکنڈے نیویائی فنکار ایڈورڈ منک ہے جس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ جرمنی میں بسر کیا اور وہاں مصوروں کے ایک دبستان پر جو بروک دبستان کے نام سے موسوم ہے، اثر ڈالا۔ یہی دبستان ہے جس سے جرمنی کی کہیں زیادہ وسیع تحریک جس کا نام "اظہاریت" (EXPRESSIONISM) ہے ظہور میں آئی۔ منک کی ابتدائی تصاویر میں ڈرامائی قدروں کے ساتھ بہت لگاؤ نظر آتا ہے۔ چنانچہ "بیمار بچہ" اور "متوفی ماں" جیسے عنوانات ان کی نوعیت بخوبی ظاہر کرتے ہیں۔ مصوری میں جذباتی وحدت اور انسانی احساسات پر زیادہ زور دینا وہ خصوصیت ہے جو منک کی بدولت جرمنی کی تحریک "اظہاریت" کو میسر آئی۔ اس کے علاوہ اس نے ایک تکنیکی اثر بھی ڈالا۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ منک نے خطوط کی بجائے رنگوں کے دروبست پر زیادہ زور دیا ہے۔ اور جرمنی کے جدید مصوروں نے اس سلسلہ میں زیادہ تر اسی کی پیروی کی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ منک نے یہ کوشش بھی کی ہے کہ خطوط یا ترسیمات کے ذریعہ اظہارِ معنی کی کمیوں کو دور کرے اور انہیں ہر طرح تمام مجبوریوں کے باوجود، وجدانی اور نفسیاتی قدروں کا آئینہ دار بنائے۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، وہ دبستان جس کو ہم نے بروک دبستان قرار دیا ہے۔ زیادہ تر منک ہی سے متاثر ہوا۔ اس کی بنیاد تین ارباب فن نے ۱۹۰۵ء میں بمقام ڈریسڈن ڈالی تھی۔ ان میں سب سے بڑا کرچز تھا جس نے افریقہ اور پالی نیشیا کی وحشی قوموں کے فن سے گہرا اثر قبول کیا تھا۔ اس اجنبی فن نے جو فرانس اور جرمنی کی جدید فنی تحریکات میں بدرجۂ غایت کار فرما ہوا ہے، سب سے پہلے بروک دبستان ہی کی بدولت تقویت پائی۔ ڈریسڈن کے دبستان پر دوسرا بڑا اثر ونسنٹ وان گوخ کا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وان گوخ نے فرانس کی بہ نسبت جرمنی کی فنی تحریکات پر کہیں زیادہ گہرا اثر ڈالا۔ پہلے قدیم قوموں کے فن، پھر وان گوخ اور سب سے آخر منک کی مصوری نے جرمنی کے اولین فنی دبستان کی تشکیل کی۔

دو نظریئے ایسے ہیں جو مغربی مصوری کے باقی تمام مظاہر کا احاطہ کر سکتے ہیں۔ ایک نظریۂ تجرید (ABSTRACTIONISM) ہے اور دوسرا نظریۂ تسریت (AUTO MATISM) پہلے نظریہ کا تعلق ہیئت کے کلاسی نظریئے سے ہے اور مکعبیت (CUBISM) کے

بعض حامیوں نے بھی برملا نوکلاسی ہونے کا دعویٰ کیا ہے جس میں وہ یقیناً حق بجانب ہیں۔ یہ شرب مغربی تحریکِ تجرید کا اولین مظہر ہے۔
قدرتی طور پر تجریدی فن کے نظریہ کا بہترین اظہار افلاطون ہی میں دکھائی دیتا ہے جس نے صدہا سال پہلے مندرجہ ذیل الفاظ میں تجریدی نظریہ کی پیش قدمی کی تھی:۔

" اشکال کے حسن سے میرا مدعا وہ نہیں جو اکثر لوگوں کے ذہن میں جاگزیں ہے۔ یعنی زندہ چیزوں یا تصاویر کی اشکال۔ بلکہ میرا مطلب ہے مستقیم یا خمدار خطوط، سطحی اور ٹھوس اجسام جو ان خطوط سے خرادوں، پیمانوں، اور گنیوں کی مدد سے تیار کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ میرا مدعا یہ ہے کہ یہ چیزیں محض اضافی طور پر ہی خوبصورت نہیں ہیں۔ بالفاظِ دیگر ان کا فن ان کے استعمال، مقصد یا باہمی تعلق پر موقوف نہیں بلکہ یہ ہمیشہ طبعی اور مطلق طور پر خوبصورت ہیں۔"

افلاطون کے بعد ہم سیزان کی طرف آتے ہیں جس نے نہ صرف انیسویں صدی کے عام طور پر رائج فنی تصور سے انحراف کیا بلکہ تاثریت سے، جس کو اس کے عہد میں ایک انقلابی مشرب تصور کیا جاتا تھا، سرگردانی کی۔ سیزان نے ہیئت کو خود اشیاء کے اجسام میں تلاش کیا اور بڑی شد و مد اور ذوق و شوق سے یہ کوشش کی کہ قدرتی اشیا اور مناظر میں جو صورتیں مضمر ہیں انہیں بروئے کار لایا جائے۔ اس سے سطوں، جسموں اور خاکوں پر زیادہ توجہ لازم آتی تھی جس کی وجہ سے اس کی مصوری میں اقلیدسی اشکال زیادہ نمایاں ہوگئیں۔ چنانچہ سیزان نے خود ہی کہا ہے کہ " اگر قدرت کی تحلیل کی جائے تو ہمیں بیلن، قرص اور مخروط نظر آئیں گے۔" یہ الفاظ افلاطون کے "سطوں اور جسموں" کی طرف اشارے سے کس قدر قریب ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم نظریۂ تجرید پر نظر ڈالیں جو سیزان کے فنی مسلک پر مبنی ہے۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم فن کی ایک اور قسم کا ذکر کریں جس کی بہت سی تاریخی مثالیں ہیں۔ اس نوع کا بالعموم تجرید سے التباس کیا جاتا ہے اور یقیناً تجریدی فن کی جدید ترقیات اس نظریئے سے بھی اسی قدر متاثر ہیں جتنی کہ سیزان کے اسلوب نگارش سے۔ میرا مطلب اس قسم کے فن سے ہے جسے اقلیدسی یا وصفی کہتے ہیں۔ یہ فن جو یونانی آرٹ کے ابتدائی عہد، بازنطینی، اسکینڈے نیویا اور ابتدائی گوتھک اور وحشی اقوام کے آرٹ کی مختلف اقسام میں نظر آتا ہے۔ سیزان کے فن کے برعکس اس نوع کی خاصیت یہ ہے کہ یہ کسی اعتبار سے بھی عضویاتی نہیں۔ ایک ایسے فن کے متعلق جس نے اس قدر مختلف زمانوں اور جگہوں میں اس قدر مختلف صورتیں اختیار کیں ہوں کوئی جامع بات کہنا بہت دشوار ہے۔ لیکن اس کی ماہیت پر غور کیا جائے تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ نظریہ تجرید نظم و آہنگ کی خاطر اشیاء کے قدرتی خد و خال کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔

سی زان کے اسلوب سے اشکال میں جو دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اقلیدسی وضع کی مصوری میں دوبارہ دلچسپی پیدا ہوئی۔ خاص طور پر بازنطینی اور وحشی اقوام کے آرٹ میں۔ دنیائے فن میں اس کا مجموعی نتیجہ دبستان مکعبیت کا ظہور تھا۔ فرانس میں اس کے نمائندہ گرایو، اوزن فان، ہیمن، دے لوتے، مارکوسیس، دے ژنگر، براک، گلیزس اور میگر تھے اور جرمنی میں مارک، فی نگر اور پونسٹر۔ فرانس میں پکاسو نے کچھ عرصہ سب سے زیادہ اثر ڈالا۔ جرمنی میں کال دنسکی نے اپنی تحریرات اور تصاویر دونوں سے ارباب فن کی قیادت کی۔ ہتیس اور دی رین دونوں اسی انداز میں مصوری کرتے رہے۔

مگر ہم یہ سوال پوچھ سکتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں میکانی یا اقلیدسی اشکال کی طرف یہ رجحان کیوں پیدا ہوا۔ اس کے جواب میں ان قدروں کا سراغ مل جائے گا جو اس تاثر کی تہ میں پوشیدہ ہیں۔ ہربرٹ ریڈ کے نزدیک اس کے دو جواب ہیں۔ ایک بہت واضح ہے اور دوسرے میں اجتماعی نفسیات کے بہت پیچیدہ مسئلے پیدا ہوتے ہیں۔ میکانی اشکال کی مقبولیت کی بدیہی وجہ ہمارے ماحول میں مشینوں اور مصنوعات کی بے انتہا کثرت ہے۔ جن کی ہستی اور مقدار میں معرف کے اعتبار سے ایک خاص قسم کی عملی اکملیت پائی جاتی ہے جس کو لامحالہ خوبصورتی سے موسوم کرنا پڑے گا۔ قدیم اقلیدسی مصوری مشہ

کیلٹک اور جدید مصوری میں غالباً سب سے اہم فرق یہی ہے کہ قدیم مصوری معاشرہ کے کسی روحانی میلان کا نتیجہ تھی اور یہ عمل بالکل غیر شعوری تھا۔ اس کے برعکس جدید مصوری تمام تر عقلی رجحان کا نتیجہ ہے اور صرف عقل ہی اس کی داد دے سکتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جدید مصور معاشرہ کے ساتھ کوئی تعلق محسوس نہیں کرتے اور اس کی زندگی میں کوئی ضروری یا مثبت فرض انجام نہیں دیتے۔ اس لئے وہ اپنے حال کی دنیا میں ڈوب کر صرف اپنی نفسی کیفیات ہی کی عکاسی کرتے ہیں اور اپنے آپ کو انہی تک محدود کر کے اظہار کو ابلاغ بنانے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔

یہاں تک ہم نے نظریۂ تجرید کا ذکر کیا ہے۔ اب اس جائزہ کو مکمل بنانے کے لئے ہم دوسرے نظریئے کی طرف آتے ہیں۔ جسے ہربرٹ ریڈ نے "تجریدیوں" کی بجائے "قسریوں" سے وابستہ کیا ہے غالباً وہ تکنیک کے اعتبار سے تجریدی اور نفسِ مضمون کے اعتبار سے قسری ہے دراصل مصور کی حیثیت سے پکاسو کے کتنے ہی پہلو ہیں۔ وہ مکعبیت کے بانیوں میں سے ایک تھا۔ اور کبھی کبھار ترسیمی اسلوب کی طرف بھی نکل جاتا ہے۔ لیکن اس کا سب سے نمائندہ اور مستقل انداز داخلی ہے۔

پکاسو اور اس کے دبستان کو سمجھنے کے لئے ہمیں وجدانی اور عقلی مشاہدہ میں امتیاز کرنا پڑے گا۔ پکاسو نے ایک بار کہا تھا۔

"دیکھتا ہوں کچھ تو اوروں کو دکھانے کے لئے" یعنی میرے ذہن میں اچانک جو میرے پیدا ہوتے ہیں انہیں جامۂ تصویر پہنا کر پیش کر دینا مجھے پہلے ہی سے یہ علم نہیں ہوتا کہ میں تصویر میں کیا پیش کروں گا۔ اور نہ یہ خبر ہوتی ہے کہ میں کون سے رنگ برتوں گا۔ جب میں تصویر کشی کرتا ہوں۔ تو یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتا کہ کیا تصویر بنے گی۔ میں ایسا محسوس کرتا ہوں گویا میں ایک خلا میں چھلانگ لگا رہا ہوں۔ مجھے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ میں پھر سے زمین پر پاؤں کے بل کھڑا ہوں گا۔ یا نہیں۔ میں بہت دیر بعد یہ اندازہ لگا سکتا ہوں کہ میرے کام کا نتیجہ کیا ہوگا"

یہاں مصور اپنی تمام وجدانی قوتوں کو اپنے باطن پر مرکوز کر دیتا ہے۔ جس میں اس کی داخلی کیفیتیں اس کے خواب اور تخیلات مضمر ہیں۔ وہ مشاہدہ کی جگہ وجدان، تجزیہ کی بجائے ترکیب اور اصلیت کی بجائے ماورائیت پیدا کرتا ہے۔ اگر ہم ینگ کا اجتماعی شعور کا نظریہ قبول کر لیں تو یہ ممکن ہے کہ پکاسو جیسا فنکار ان بنیادی تخیلات کو ظاہر کر سکے جو اس کا مخصوص سرمایہ ہیں۔

پکاسو اپنے آپ کو تجریدی قسم کی اجتماعی تمثیلات تک محدود نہیں رکھتا۔ لیکن دوسری قسم کی تمثیلیت جو محسوس قسم کی تمثیلات کو کام میں لاتی ہے۔ اس کے صحیح نمائندے اس نوع کے مصور ہیں جنہیں (SUR E ALISTS) کہتے ہیں۔ ان کے پیشرو ایک اور قسم کے مصور تھے جن کو "دادائی" کہا جاتا ہے لیکن ان کی مصوری محض ایک مذاق تھی بلکہ یہ زندگی کے المیہ سے تنگ آئے ہوئے لوگوں کی ایک لایعنی حرکت تھی جس میں سوائے اوچھے پن کے اور کچھ نہ تھا۔ یہ دبستان ۱۹۱۶ء میں بمقام زیورخ قائم ہوا اور ۱۹۲۲ء میں پیرس میں ختم ہو گیا۔ ۱۹۲۴ء میں اس کی خاکستر سے سوریلسٹ تحریک نے جنم لیا اور اس کے صحیح خدوخال شاعر آندرے بریٹن کے منشور سے نمایاں ہوئے۔ ایک تحریک کی حیثیت سے سوریلزم صرف ٹھوس فنون تک ہی محدود نہیں بلکہ اس میں شاعری، ڈراما، نفسیات اور فلسفہ بھی شامل ہیں جیسا کہ اس لفظ سے ظاہر ہے۔ اس دبستان کا نظریہ یہ ہے کہ دنیائے محسوسات سے کہیں زیادہ حقیقی ایک اور دنیا بھی ہے جو نفس لاشعور میں موجود ہے اگرچہ سوریلسٹ لاطری آمون کو اپنا استاد تسلیم کرتے ہیں اور ہیگل کے فلسفہ سے اپنے نظریئے کی مابعد الطبیعیاتی تائید کے جویا ہیں پھر بھی یہ امر مشتبہ ہے کہ فرائیڈ کے بغیر ان کا ظہور ممکن تھا یا نہیں۔ دراصل وہی اس دبستان کا حقیقی بانی ہے کیونکہ جس طرح فرائیڈ نے حیات کی پیچیدگیوں کی کلید خوابوں میں دریافت کی ہے اسی طرح سوریلسٹوں کے لئے بھی فیضان کا بہترین سرچشمہ یہی ہے صرف یہی نہیں کہ وہ خوابوں کو تصاویر کی شکل میں پیش کرتا ہے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ کوئی ایسا ذریعہ کام میں لائے جس سے نفس لاشعور کے مدفون ذخیرہ تک رسائی حاصل ہو اور پھر ان تمام عناصر کو بڑی آزادی سے زیادہ شعوری محاکات بلکہ عادی قسم کے فنون کے صوری عناصر کے ساتھ ملایا جائے سوریلزم محض ایک لاشعوری فن ہی نہیں، یہ ایک ایسا فن ہے جس کی کوئی حد نہیں اور اس کا عقیدہ یہ ہے کہ نفس لاشعور میں کتنے ہی مستور خزانے ہیں اور ہم ان

خزانوں کو حاصل کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم اپنے نفس کو آزاد چھوڑ دیں، اپنے فکر کو جیسے وہ چاہے کام کرنے دیں۔

ایک تحریک کی حیثیت سے سوریلزم باقی تمام معاصر تحریکوں سے مختلف ہے اور اس نے فن کے تمام روایتی طریقوں کو بالکل ترک کر دیا ہے۔ اس کے سرکردہ نمائندوں میکس ارنسٹ، جوان میرو، سلواڈور ڈالی اور ایک اور فنکار آندرے میسوں جس نے بعد میں ایک مسلک سے کنارہ کشی اختیار کر لی، سب اُسی رجحان کے آئینہ دار ہیں جسے عقل یا شعور کی شکست و ریخت قرار دیا جا سکتا ہے اور جو تمثیلیت کا ایک پہلو ہے۔

اس کے بعد جدید مصوری کا ایک ہی پہلو باقی رہ جاتا ہے جس سے ہماری تمام انواع کی فہرست پوری ہو جاتی ہے۔ یہ بھی ایک تمثیلی مشرب ہے لیکن ان معنوں میں نہیں جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں اور نہ یہ کسی طرح عینی مشاہدے کی عکاسی پر مشتمل ہے۔ یہ محض ایک تخیلی سیمب ہے اور اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ ایسی صنف ادب کے ذیل میں آتی ہے تو اسے ادبی قرار دینے میں بھی کوئی ہرج نہیں اور نہ وہ اس حقیقت سے شرمسار ہے۔ یہ مصوری قدروں سے بیگانہ نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی ٹھوس فن ان سے بیگانہ نہیں ہو سکتا اگر وہ یہ چاہے کہ وہ ہمارے ذوقِ دید میں خلل نہ پیدا کرے۔ لیکن اس صنف کا صوری عنصر کسی اور عنصر کے ماتحت نہیں۔ یہ تمام تر تصور ہے۔

پال کلی اس قسم کی مصوری کا سب سے بڑا نمائندہ ہے۔ اس کی دنیا ایک طلسمی دنیا ہے۔ ایک ذہنی پرستان، اس دُنیا میں بھوت پریت بھی ہیں اور چھلاوے بھی، ہندسی ٹھکنے بھی ہیں اور غناتی شطونگڑے بھی۔ پرستانی بھی ہیں اور موہوم چرند پرند بھی۔

اس بحث کے اختتام پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے، کہ آیا مصوری کے ان تمام نمونوں میں کوئی عنصر مشترک بھی ہے۔ جسے تمام حقیقی فنکاروں کی امتیازی خصوصیت قرار دیا جا سکے، کیمرہ ہمیں صرف اشیاء کی ظاہری شکل و صورت ہی پیش کر سکتا ہے۔ اخلاقی احساسات صرف ارباب فن ہی تک محدود نہیں اور محض صوری تناسب اور روابط کا احساس اور طلسمی دنیا کا تصور فنکاروں کے علاوہ اور لوگوں میں بھی پایا جاتا ہے لیکن ہربرٹ ریڈ کہتا ہے کہ ان تمام مضامین کو ادا کرنے کی اہلیت: یہ ہے۔ ارباب فن کا طرۂ امتیاز اور ادائیگی مضامین سے اس کا مطلب ہے خیالی تصورات کو مجازی شکل میں پیش کرنا۔ یعنی وارداتِ قلب اور ان مادی ذرائع میں ربط و آہنگ پیدا کرنا جن کی بدولت صاحب فن اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتا ہے۔ یہ اہلیت محض صنّاعی سے کہیں بلند تر ہے۔ کیونکہ کئی ادنیٰ فنکار بھی بہت عمدہ صنّاع ہوتے ہیں۔ یہ وہ مادہ ہے جو انسان کو صناعی کی مدد سے انکشافات میں مدد دیتا ہے گویا یہ فکر اور عمل میں ایک پُراسرار آہنگ ہے۔ کاغذ پر پنسل اور لوح پر مُوقلم رکھنا ایک ایسا عمل بن جاتا ہے جسے کروچے وجدان قرار دیتا ہے اور اس عمل میں اس لمحے میں فنکار کی شخصیت بلکہ اس کا سارا باطنی وجود آشکار ہو جاتا ہے۔

(مارچ ۵۳ء)

[illegible]

عطا

عکسِ تحریر عطا شاد

# ایک چوبی تمثال گر شاھد سجاد

سحر انصاری

چوب خشک اگر منبر نہیں بنتی تو دار بن جاتی ہے اور کبھی کبھی وجود کے صحرا میں واماندہ ہو کر فریاد کرتی ہے کہ لگا کے آگ مجھے قافلہ روانہ ہوا اور جب یہی بے جان، ساکت و صامت لکڑی ایک فنکار کی دسترس میں آجاتی ہے تو اس پر ابھرنے والے خطوط اور اس میں بکھرنے والے جذبوں سے جیتے جاگتے پیکروں کی تخلیق معرض وجود میں آجاتی ہے۔ جب سخت کے سینے کو کھرچ کھرچ کر جو نقش کندہ کئے جاتے ہیں ان میں احساس کی توانائی زیادہ بھرپور نظر آتی ہے۔

روغنی رنگوں سے کینوس پر تجریدی اشکال بنانے والے نوجوان مصور شاہد نے جب ایک دن مجھے بتایا کہ اس نے برش اور کینوس کو ترک کر کے لکڑی اور آہنی سلائیوں اور سلاخوں کو اپنا لیا ہے تو مجھے حیرت ہوئی اور پھر اس نے مجھے اپنی چوب کاری کا ایک نمونہ دکھایا جس کے خطوط بہت تیکھے تھے اور جس میں تاثریت کا رجحان غالب تھا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ نوجوان مصور شاہد کا وجدانی عمل دو ابعادی کینوس سے مطمئن نہیں ہے، اسے "تیسری بعد" کی ضرورت تھی اور شاہد کی جستجو پسند طبیعت اور مہم جو فطرت نے اس کے اظہار کے لئے چوب کاری کو منتخب کر لیا۔

فن کاروں کے بارے میں عام طور پر مشہور ہے کہ وہ لا اُبالی پن یا زندگی کی غیر ذمہ دارانہ روش اختیار کر کے جیتے جی ایک روایت بن جانا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے ایسا ہوتا ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس عمل میں تصنع یا شعوری کوشش کا دخل نہیں ہوتا ہے اس لئے کہ ایک سچا فن کار مرتب ذہن اور منظم زندگی کا آدمی نہیں ہو سکتا۔ اس کے احساسات اور طریق اظہار میں منطقی تسلسل کے بجائے وجدانی بہاؤ پایا جاتا ہے۔ یہی وصف شاید اسے زندگی میں ایک روایت بھی بنا دیتا ہے اور اسی کے زیر اثر فنکار کی زندگی اور نقطۂ نظر میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ شاہد کی زندگی اپنی پوری سچائی کے ساتھ سود و زیاں کے تمام تصورات سے آزاد ہے۔ وہ فطری فن کار اور بنیادی طور پر ایک مہم جو انسان ہے جو بظاہر اپنی دزدیدہ نگاہوں اور سادہ لوح تبسم کے ساتھ کوئی بھاری بھرکم تاثر نہیں چھوڑتا لیکن جس کے موقلم یا آہنی سلائی سے ابھرے ہوئے نقش اپنے میں انجذاب کی بے پناہ صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کے دیکھنے والے کو تخلیق کی نسبت سے اس کے خالق سے ایک سچا لگاؤ محسوس ہونے لگتا ہے۔ اس وقت شاہد کا فن اور اس کی شخصیت ایک ہو جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ اس کے ایک کامیاب فنکار ہونے کی دلیل ہے۔ کیونکہ فن کار کی اس سے بڑی کوئی اور کامیابی نہیں ہو سکتی کہ اسے اس کی تخلیق کے آئینے میں پہچانا جائے۔

درمیانہ قد، گٹھے ہوئے جسم، سیاہ ڈاڑھی اور منتشر بالوں والا یہ نوجوان فنکار یورپ، مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے تمام اہم ممالک کا سفر کر چکا ہے اور اس نے زندگی کا براہ راست تجربہ حاصل کیا ہے۔ اس کی فنکارانہ بصیرت اکتسابی نہیں ہے۔ وہ فطری طور پر فنکار ہے اور اس کا فن اور تخلیق کی آگ اپنا بھرپور اظہار چاہتے ہیں۔ یہی آگ اسے شہر شہر دیس دیس لئے پھرتی ہے۔

تخلیق کے اسی سفر میں ایک دن وہ جزائر بالی جا پہنچا۔ یہاں کی مٹی، یہاں کے درخت، یہاں کا آسمان اور یہاں کا سمندر اسے دنیا کے تمام مناظر سے بالکل مختلف معلوم ہوا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے مصوری نے کاغذ اور کینوس کو چھوڑ کر فطرت کا روپ دھار لیا ہے، اسے پورا جزیرہ

ایک ہمہ رنگ تصویر معلوم ہوتی جس میں وقت کا ایک تسلسلِ معلق جاری وساری تھا۔ دبئی میں اس نے چوبی نقاشی کے کچھ نمونے دیکھے جن کی سادگی اور پرکاری نے اسے خاصا متاثر کیا۔ اس کے بعد شاہد نے فرانس کے بعض آرٹ میوزیموں میں چوبی نقاشی کے قدیم و جدید نمونے دیکھے اور وہیں سے اس کے ذہن میں ایک تبدیلی کا آغاز ہو گیا لیکن وہ اس تبدیلی سے بے خبر رہا۔ اور اس کے ذہن کی تمام تمثالیں روغنی رنگوں اور برش کی مدد سے کینوس پر منتقل ہوتی رہیں۔

پھر شاید لاشعور میں چوبی نقاشی اختیار کرنے کا عمل مکمل ہو گیا اور اس نے چوبی تختوں اور آہنی اوزاروں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

شاہد کے فن میں مجھے بعض ایسی خصوصیات نظر آئیں جو آج کے بیشتر فنکاروں سے مختلف اور اس کے اپنے فن کے بنیادی عناصر ہیں۔ ایک تو یہ اس کی تمام علامتیں ازمنۂ قدیم سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کا محور انسانی اشکال ہیں۔ انسان جو نہ صنعتی عہد سے تعلق رکھتے ہیں اور نہ غیر سائنسی زمانے سے وہ بنیادی طور پر انسان بلکہ انسانِ محض ہیں ان کے جسم پر کوئی لباس بھی نہیں ہوتا ہے میں نے ایک دن شاہد سے دریافت کیا کہ تم اپنے کسی پیکر کو لباس نہیں پہناتے۔ ایسا کیوں ہے؟ حالانکہ کسی بھی ثقافتی پس منظر کو ظاہر کرنے کے لئے لباس بہت ضروری ہوتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ وہ کسی بھی علاقائی یا جغرافیائی ماحول کا پابند نہیں ہے اور نہ یہ چاہتا ہے کہ انسان کے فطری جسم کو کسی خاص لباس میں مقید کر کے انسانی جسم کے ان خطوں اور قوسوں کو نظر بند کر دیا جائے جن کی اپنی ایک الگ زبان ہے اور اسی لئے میں ان کی قوت گویائی سلب نہیں کرتا۔ اس اعتبار سے مجھے وہ غالب کا ہم خیال اور ہم نوا نظر آیا کہ وہ بھی انسان کو ہر لباس میں ننگِ وجود سمجھتا ہے۔

شاہد کے ان نقوش میں ایک خاص بات یہ ہے کہ برہنہ ہونے کے باوجود ان میں برہنگی یا ننگے پن کا عنصر شامل نہیں ہے بس وجود اپنی اکائی بن کر سامنے آتا ہے۔ شاہد نے لازماں اور لامکاں عرصۂ حیات میں رہنے والے ان پیکروں کو کچھ اس طرح اُبھارا ہے کہ ان میں انسانی زندگی کے وہ تمام جذبے نظر آجاتے ہیں جنھیں تاریخی ادوار اور تہذیبی اقدار میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا یعنی عرفانِ ذات، محبت، نفرت، وصل و ہجر، ممتا، محرومی، مسرت تنہائی کا احساس، بقا کا جذبہ، فنا کا غم اور آفریدہ و ناآفریدہ مخلوقات کے شبیہی امکانات جو ذہنی سفر میں فنکار کے گام بہ گام رہتے ہیں۔

شاہد کے چوبی نقوش میں مصر اور بابل کے قدیم نقوش کی مماثلت پائی جاتی ہے بالخصوص اعضا کے کھچاؤ اور درازی کی تکنیک جو ہم عصر شعور میں جذب ہو کر نکھر آئی ہے۔

علاوہ بریں شاہد کے تمام چوبی نقوش میں سکوت اور انجماد کا وہی احساس پایا جاتا ہے جو ہیلنی یونان کے سنگین مجسموں اور سکونی کائنات پر یقین رکھنے والے قدیم فنکاروں کے مرقعوں کا خاص وصف ہے۔ اس کے تمام پیکر بالوجود ساکت و صامت نظر آتے ہیں۔ البتہ تاثریت کی تکنیک کے سبب احساس کی ایک رو اپنی پوری حرکت اور توانائی کے ساتھ جاری و ساری نظر آتی ہے جس سے جذبے کی نوعیت اپنا بھرپور تاثر مرتب کرتی ہے تاہم مجموعی تاثر روحانی اور مابعد الطبیعاتی نوعیت کا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر گندھارا آرٹ کے بطل گوتم کا چہرہ جو شاہد نے بڑی فنکاری کے ساتھ صفحۂ چوب پر منقش کیا ہے۔ اس میں گوتم کی ذات کی وہ ساری ماورائیت سمٹ آئی ہے جو صرف احساس اور تاثر کے مابین رہتی ہے۔ آنکھوں میں وہی ابدی سکوت اور ہونٹوں پر وہی پُرسکون لافانی تبسم، اور چہرے کا مجموعی تحمل جو حیات کے زہر کو پینے اور غموں کی تلخی کو رگ و پے میں سمو لینے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ ماورائیت کے اثباتی نقطۂ نظر نے شاہد کے اس چوبی نقش کے خطوط کو منفی ہونے سے بچا لیا ہے اور یہی اس کے فن کی کامیابی ہے۔

شاہد کے ایک اور چوبی نقش کا ذکر بھی یہاں مناسب ہوگا۔ وہ ہے "مریدؔ"۔ یہ مُرید ایک شخص، ایک ذات نہیں بلکہ ایک انسانی چہرے کے ذریعے اس پورے ادارے کی نمائندگی کی گئی ہے جو کسی نظریۂ حیات یا کسی پیغمبر یا نجات دہندہ کے اتباع سے عبارت ہوتا ہے۔ اس میں

ان دیکھی صداقت پر یاں اور بیروں کا اندھا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نقش میں نظر آنے والی انسانی شکل میں آنکھیں ظاہر نہیں کی گئی ہیں۔ جو جبر پر حلامیت کی دلیل ہے۔

شاہد کی چوبی نقاشی کے ایک اور نمونے سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں۔ وہ ہے "اندھا بیٹا"۔ اس تمثیل کے دو کردار ہیں، ایک ماں اور دوسرا اس کا اندھا بیٹا جو اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر چل رہا ہے۔ اس نقش میں ماں کی مامتا، احساسِ محرومی، شومیٔ قسمت کی شکایت اور پھر تقدیر کے جبر سے پیدا ہونے والی قناعت اور صبر کا عکس خاص طور پہ قابلِ ذکر ہے جو ماں کی آنکھ اور چہرے کے ایک ایک خط سے نمایاں ہے۔ اندھا بیٹا اپنی محرومی سے بے خبر اپنی معصومیت سے سرشار اور ماں کا ہاتھ تھامنے کی وجہ سے تحفظ کے جذبے سے مطمئن نظر آتا ہے۔ یہ دو کردار فطرت کے جبر اور اس کے ردِ عمل کا بہترین اظہار ہیں۔

تکنیک کے اعتبار سے بھی یہ چوبی نقش بہت منفرد ہے۔ اس کے پیکر تین تہوں پر مشتمل ہیں۔ جسم کے سب سے زیادہ ابھرے ہوئے حصے کو سب سے زیادہ گہرائی سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد دوسری تہہ اور تیسری تہہ سے اعضا کا بتدریج ابھار پیدا کیا گیا ہے۔ عمق سے ابھار پیدا کرنے کی یہ تکنیک بلاشبہ شاہد کی انفرادیت، اختراع پسندی اور فنکارانہ صلاحیتوں کی مظہر ہے۔

شاہد کے فن میں فرد کا ذاتی غم مسائل اور آفاقیت کی ردا اوڑھے ہوئے نظر آتا ہے اگرچہ بظاہر اس کے نقوش و اشکال میں کوئی ردا، کوئی پوشاک اور کوئی لباس نظر نہیں آتا۔

شاہد کا تخلیقی عمل ایک سفر پر روانہ ہوا ہے۔ اسے ابھی منزل نہیں ملی ہے مگر منزل کی روشنیاں اسے اپنی جانب کھینچ رہی ہیں۔ وہ سنگِ میل کو چھوتا ہوا گزر رہا ہے اور اس میں "بہ سینہ می سپرم رہ اگرچہ پا خفتست" کی بھی ہمت پائی جاتی ہے۔ اسی وصف کی روشنی میں اس کے تابناک مستقبل کی اُمید بھی مضمر ہے۔

جون ۹۶ء

ہمارے ہاں تحقیق کو زوال کا سبب یہ ہے کہ
ہم جب جذبات [illegible] کو لیتے ہیں۔
اور تنقید کو گروہ بندی [illegible]
سے ملا دیا ہے۔ ہمارا کردار [illegible]
تحقیق اور تنقید میں جھلک رہا ہے۔

[illegible]

عکسِ تحریر ڈاکٹر احسن اختر

# استاد اللہ بخش

انور سجاد

**استاد** اللہ بخش کا مصوری میں سفر ایک تنہا آدمی کا سفر ہے۔

ایک لڑکا جس کے دل میں کسی سہاراجے کے لیے کسی بہت بڑے مصور کی پینٹنگ کو ٹرانسپورٹ ہوتے دیکھ کر مصور بن کر نام پیدا کرنے کی خواہش پیدا ہوئی جس نے ریل کے ڈبے رنگنے سے لے کر بورڈ نویسی، بمبئی میں فلموں اور پھر آغا حشر کے ناٹک کے لیے پردوں پر منظر کشی کی۔ بغیر کسی سہارے بغیر کسی (صحیح معنوں میں) استاد کے وہ اپنے ارادوں، تصورات، انگلیوں اور برش کی قوتوں کے بل بوتے پر استاد اللہ بخش بن گیا۔

ہندوستانی مصوری کو کسمپرسی کی حالت میں دیکھ کر محظوظ ہونے اور لارڈ میکالے کی نو آبادیاتی تعلیمی ثقافتی پالیسی پر عمل پیرا ہونے کے بعد انیسویں صدی کے آخر میں سامراجیوں کو (NATIVES) کو مصوری سکھانے کا شوق چرایا۔ جاگیردارانہ نظام کہ جو مغل، راجپوت مصوری کی سرپرستی کرتا تھا تیزی سے زوال پذیر تھا۔ ہندوستانی مصوری راجستھان اور پنجاب میں آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ ۱۸۷۰ء تک تو یہ صورت، حالتِ نزع تک پہنچ گئی۔ فتح کے بعد انگریز کی تہذیب نے یہاں کے شرفا کو عمومی طور پر اور ان کی مصوری کی تکنیک نے یہاں کے شرفا مصوروں کو خاص طور پر بہت متاثر کیا تھا۔ پرانا نظام آخری ہچکی لے کر ختم ہوا اور ساتھ ہی ہندوستانی مصوری بھی۔

۱۸۵۲ء میں کمپنی بہادر کی طرف سے میکالے کی پالیسی کی سرچارلس ٹریولین نے سامراجی پالیسی کے اعلیٰ ہتھیار کے طور پر وضاحت کی تھی:

"انقلاب کو روکنے کے لئے ہمارے پاس واحد ذریعہ یہ ہے کہ ہم مقامی باشندوں کو یورپی برتری کی طرف مائل کر دیں یوں وہ اپنی روایات کے حوالے سے اپنی آزادی کی خواہش اور مقصد کو بھول جائیں گے۔ ہم یہ کوئی نیا تجربہ نہیں کریں گے بلکہ رومنوں نے رومی فن اور ادب سکھا کر اپنے فاتحوں کو مفتوحوں کے لئے مثالی بنا دیا تھا نہ کہ ان کا مخالف، میرے خیال میں ہندوستانی بھی جلد ہی ہمارے لئے وہی بن جائیں گے جو ہم رومنوں کے لئے بن گئے تھے۔"

۱۸۷۰ء تک ٹریولین کی امیدیں بر آئیں۔ بنگال اور بمبئی اور کسی حد تک شمالی ہندوستان میں ایک نیا متوسط طبقہ پیدا ہو چکا تھا جو کہ انگریز کا نقال تھا اور جسے اظہارِ خیال کے ہندوستانی ذرائع سے نفرت ہو چکی تھی۔ ۱۸۹۶ء میں رابندر ناتھ ٹیگور کی تحریروں نے کسی حد تک بعض بنگالی دانشوروں کو ان کی اپنی زبان اور اپنے ادب کی شناخت کا احساس دلایا تھا لیکن انگریزی اقدار، سیاسی اور سماجی عزت کے حصول کے لئے اتنی اہم سمجھی جاتی تھیں کہ ۱۹۱۷ء ہی میں سی آر داس کو کہنا پڑا: "ہم نے خود کو اپنے لوگوں کے لئے اجنبی بنا لیا۔ ہم اپنے دلوں کے آئیڈیلز کو بھول گئے۔ انگریز کی نقالی میں دیوالیے ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم کلبوں کو مندروں کی جگہ دے رہے ہیں۔ یتیم خانوں کے لئے لاٹریاں نکالتے ہیں۔ ہم اپنے قومی اور صحت مند کھیلوں کی جگہ ہر قسم کا بدیسی کھیل برآمد کر رہے ہیں۔ ہم لباس میں، خیال میں، احساس میں، ثقافت میں دوغلے، دو نسلے ہو گئے ہیں حتیٰ کہ ہماری دیوانہ وار خواہش یہ بھی ہے کہ ہم اپنے لہو میں دو نسلے ہو جائیں۔"

لارڈ نیپئر نے ۱۸۷۱ء میں ایک ہمدرد سرپرست کے روپ میں، مدارس کی، دیسی عیسائی ادبی سنگت کے ایک اجلاس میں ہندوستانی مصوروں کو زبردست مشورہ دیا کہ ہندوستانی مصوروں کو چاہیئے کہ وہ مقامی شرفا کے پورٹریٹ بنائیں۔ پھول، پرندوں، جانوروں کی تصویریں بنائیں، گاؤں کے گھروندوں، جوہڑوں میں اترتی میرٹھیوں اور دوشیزاؤں کے جسموں سے پٹے گیلے کپڑوں سے جھانکتے جسموں کو پینٹ کریں۔ وغیرہ، تو جب ایک یورپی مصور (پورٹریٹ پینٹر) تھیوڈور جینسن ٹراونکور میں آیا۔ "راجہ روی ورما نے اس سے پوری طرح استفادہ کیا، اور یوں پہلی مرتبہ ایک ہندوستانی مصور نے تیل کے رنگ میں تصویر ور وہ بھی پورٹریٹ بنائی (بعد میں ۸۔۱۸۷۴ء کے دوران لاٹ صاحب نیپئر نے مدراس میں مصوری کی نمائشیں بھی منعقد کرائیں۔ جس میں روی ورما کو دو مرتبہ گولڈ میڈل ملا پہلی تصویر کا موضوع اور نام تھا "غسل کرتی عورت" اور دوسری تصویر تھی "دشینت کے نام شکنتلا کا محبت نامہ"۔

تب ہندوستان میں انگریزی آرٹ سکولوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ کلکتہ، بمبئی، مدراس اور لاہور میں آرٹ سکولوں میں انگریز نے اپنے حساب سے اپنے استعمال کے لئے مصور پیدا کرنے شروع کر دیئے تھے۔ (جنہوں نے بعد میں بعض انگریز کلبوں اور اسمبلی کی عمارتوں کی آرائش و تزئین بھی کی۔

۱۸۹۶ء میں ای۔ بی۔ ہیول کے کلکتہ میں آنے کے باوجود و دنسلی خواہشات کے مالک ہندوستانی مصوروں نے انگریز کی نقالی کو مقدم سمجھا۔ ہیول، مصوری میں ہندوستانی روایت (اجنتا، مغل، راجستھان، پنجاب) اور ہندوستانی، ہندو اساطیری موضوعات پر زور دیتا تھا اور کہتا تھا کہ دراصل یہی ہندوستانی مصوری کے منبع ہیں۔ اگرچہ اس انگریز کی پالیسی انگریز راج کی پالیسی سے متصادم تھی لیکن وہ خلوصِ دل سے اپنے مالکوں کی مخالفت کے باوجود ہندوستانی مصور پر زور دیتا تھا کہ وہ اپنے ماخذ کی اور رجوع کرے۔ گگنندر ناتھ ٹیگور اور ابنندر ناتھ ٹیگور بالآخر ہیول کی ریٹائرمنٹ (۱۹۰۵ء) تک اس کے قائل ہو چکے تھے اور (بشکریہ ہیول) یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ انہیں واقعی ایک نئے قومی اسلوب کو جنم دینا چاہیئے۔ ہیول نے ماضی سے مدد حاصل کرنے پر زور دے کر، دو بہت بڑے کام کئے۔ اول یہ کہ اس سے مصوری کے واحد قومی منبع کی تجدید ہوئی اور دوسرے، اگرچہ سوراج اس وقت ناممکن تھا۔ لیکن یہ، حال کو ترک کرنے کا واحد طریقہ تھا کہ اس مراجعت سے آزادی کی طرف بھی ایک قدم اٹھتا تھا۔ اس کے باوجود کہ تاریخی موضوعات بہت طاقتور تھے، لیکن ان مصوروں کی سوراج سے ناامیدی، یاس، خوف اور تشویش، ان کے رنگوں پر چھائے ہوئے تھے۔

۱۹۰۵ء کے بعد اس زمانے کی نوجوان نسل نے — ابنندر ناتھ ٹیگور کی تقلید کی۔ کٹھنے رنگ اور حسرت بھری جذباتیت ان کا خاصا تھے اور اپنے گرو کی طرح کہ جسے ہیول کی جگہ کلکتہ سکول آف آرٹ کا پرنسپل مقرر کر دیا گیا تھا، ان میں سے بعض کو بھی مختلف سکولوں میں پرنسپل بنا دیا گیا اسیت کمار لکھنؤ، سمرندر ناتھ گپتا لاہور میں، دیوی پرشاد رائے چوہدری مدراس میں اور دونوں اکیل (برادران) یعنی سردار اور برداد دہلی میں اور نندلال بوس کو شانتی نکیتن میں میوزیم اور آرٹ سکول کا انچارج مقرر کیا گیا۔ اگرچہ ان سب کی تصویروں میں باریکیوں اور تفاصیل کی نوعیت مختلف تھی۔ پر سب کا اسلوب ابنندر ناتھ ٹیگور کا ہی اگلہ سلئے تھا۔ مغل مصوری اور اجنتا کے فریسکوز کا امتزاج نیم (MINIATURE) نیم (MONUMENTAL) ان سب لوگوں کی مصوری کو جدید مصوری کہا جاتا تھا پر ہندوستانی قوم پرست نقاد ان سے خوش نہیں تھے۔ کومر سوامی اور خاص طور پر ادتی گنگولی تو اس سلسلے میں بہت ہی تلخ تھے کہ ہندوستانی مصوری کی تجدید کے یہ مظاہر ان کے نزدیک بہت ناکام تھے (اپنے دو نسلے پن کی وجہ سے)، ان کی تصویریں کھوکھلی اور کنکنی تھیں۔ یہ تحریک شعوری کوشش تھی کہ ہندوستان کے قدیم فن نے ضرورتِ اظہارِ خیال کے تحت جنم لیا تھا۔ دریہ ان قدیم مصوروں کے تجربے اور قلبی واردات کا مظہر تھا اسی لئے گہرائی اور خوبصورتی خالص تھی نہ کہ ان "جدید مصوروں" کی طرح بناوٹی۔

۲۵-۱۹۰۰ء کے دوران ہندوستانی مصوری کی بیرونی دنیا سے آشنا ہو رہے تھے اور بعض تو یورپ سے مشاہدہ بھی کر آتے تھے۔ خاص طور پر فرانس کے مصوری کے عجائب گھروں اور آرٹ سکولوں سے استفادہ بھی کر کے لوٹے تھے۔ ابندر کا بھائی گوگنیندر ناتھ ٹیگور (۱۹۳۸-۱۸۶۷ء) کیوب ازم میں تجربات کر رہا تھا۔ جیومیٹریکل ڈیزائن اور اسلوب کے حوالے سے اس کی تصویریں پکاسو، دریک سے مختلف نہیں بلکہ بہت ہی کمزور اور بہت ہی غیر ہندوستانی ہیں کوئی بھی معاشرہ کتنا بھی جدید در کاسموپولیٹن کیوں نہ ہو پھر بھی اپنا ایک مخصوص قومی مزاج ضرور رکھتا ہے۔ یہی مزاج جس نے جدید فرانس کو جدید اٹلی سے اور جدید اٹلی سے جدید ہندوستان کو تمیز کر رکھا تھا کہ ہم اپنی ذہنی آب و ہوا سے کبھی فرار نہیں پا سکتے۔ یہ سوچی نہیں سکتا کہ کسی بھی ملک کا فن چاہے اس کا اثر کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو، کسی دوسرے ملک کا فنکار اسے من و عن قبول کرے۔ زیادہ سے زیادہ ایسے اثرات کو کسی دوا کے انجکشن سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو کہ ہم عصروں کے لئے عارضی محرک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پر یہ ایسے دھچکے ہونے چاہئیں کہ جنہیں خون میں رچ بس جانا چاہیئے نہ کہ ان انجکشنوں کو نشے کے انجکشن بنا لینا چاہیئے۔ (سر ہربرٹ ریڈ) یہ وہی استعمال ہے کہ جو پکاسو نے اپنی تصویروں کو نئی توانائی دینے کے لئے افریقی آرٹ کو کیا تھا۔

اپنی روایت کے دھاگوں کو چن کر انہیں مضبوط بنا کر ان ہی سے ہمیں اپنی مصوری کے تانے بانے بننے ہوں گے کہ جن میں ہندوستان کی جدید سوچ کے نمونے بنے جا سکیں۔ غیر ملکی نمونوں کو نقل کرنے کی بجائے یہی طریق کار بہتر ہے۔ فن اگر قومی نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ (تشوں،

یہ تو تھی ڈبلیو جی۔ آر۔ چرکی، "ہندوستان اور ماڈرن آرٹ" کے مطابق (خاص طور پر اس تاریخی پس منظر کے دوسرے حوالوں سے بھی ہندوستانی مصوری کی اس وقت کی صورتِ حال جسے میں نے انتہائی اختصار سے اس لئے پیش کیا ہے کہ ان تین بڑے مصوروں میں سے ایک کا مختصر جائزہ لے سکوں کہ جو پاکستان کی آزادی کے وقت پاکستانی تھے۔ چغتائی کہ جو اجنتا کے حوالے سے (بنگال سکول کی روایت کے مطابق) مغل مصوری کی روایت سے بندھے تھے اور اب (PRE RAPHAELITES) کے انداز کی جانب سفر کر رہے تھے۔ حاجی شریف کہ جو (MINIATURE) مصوری کی زندہ مثال تھے، اور یہ۔ اور استاد اللہ بخش۔

فن کبھی خلاء میں جنم نہیں لیتا۔ یہ مجموعی طور پر، نہ کھلنے والے بندھنوں سے معاشرے کے ساتھ گندھا ہوتا ہے۔ ہندوستان کو سورج کی منزل کی طرف لے جانے کے لئے وسیع تر بنیادوں کی ضرورت تھی۔ اس لئے بیسویں صدی کی دوسری تیسری دہائی میں کسان کو گمنامی سے نکال کر مرکزی حیثیت میں لایا گیا۔ شہر پر گاؤں کو فوقیت دے کر گاؤں کو آسمان پر چڑھایا گیا کہ "محنت، محنت، محنت، بھوک، ننگ، افلاس، بیماری، غم، موت —— یہ ہے ہندوستانی کسان کی مختصر اور رنجیدہ زندگی کا خلاصہ" (ہیوم) جس نے ہندوستان کے ذہین، حساس اور سوچنے والے فنکار کو متاثر کیا۔ شہری ہندوستانی کی بجائے اب یہ دیہاتی ہندوستانی تھا کہ جو اب "ماڈرن انڈیا" کی تجسیم تھا۔ اس شعور سے ہندوستانی مصوری میں ایک نئی جہت نے جنم لیا۔ جس کا نام تھا، امرتا شیرگل، سکھ باپ اور ہنگرین ماں کی بیٹی۔

"جونہی میں نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا، موضوعاتی اور روحانی طور پر ہی نہیں بلکہ تکنیکی ایکسپریشن کے حوالے سے بھی، تو میری مصوری میں ایک بنیادی تبدیلی آ گئی اور میرا فن بنیادی طور پر ہندوستانی صورت اختیار کر گیا۔ مجھے اپنے فنکارانہ مشن کا تب احساس ہوا ہندوستانی عوام کی زندگی غربت خاص طور پر دیہاتیوں کی، خاموشی اور بے پناہ توکل عجز اور صبر۔ ان کے نوکیلے اور بے ہدف توے جسم، اپنی بدصورتی میں بھی پراسرار طریقے سے خوبصورت، مجھے اس تاثر کو کینوس پر منتقل کرنا ہے، جو ان کی اداس آنکھیں مجھ پر چھوڑتی ہیں۔" (امرتا شیرگل)

امرتا شیرگل کی تصاویر کی سادگی، چہروں کا تاثر، خاص انداز میں دیکھنے کی جرأت (سیزاں) منطقہ حارہ کے سورج کے دو رنگ ... جو بیشتر ہندوستانی مصوروں کو نظر نہیں آتے تھے۔ ان کے حوالے سے امرتا نے بڑی کامیابی سے ہندوستانی دیہات اور دیہاتی کی تصویر ...

پر منتقل کیا استاد اللہ بخش کے پنجاب کو بھی۔

میں نے ہندوستانی مصوری کے اس دور تک جتنے بھی پہلوؤں کا مربوط طریقے سے احاطہ کیا ہے، اس کو اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ وہی زمانہ تھا جب استاد اللہ بخش تھیٹر، فلم کے پردوں پر "سینیریاں پینٹ" کرنے کے بعد ہندو دیو مالا کو تصویروں میں منتقل کر کے نام پیدا کر رہے تھے اور پھر کسی کی بات پر اپنے پنجابی پن کا احساس ہونے کے بعد انہوں نے یکسر تمام موضوعات سے قطع تعلق کر کے پنجابی ہونے کے باعث اپنے پنجاب کے ساتھ ناطہ استوار کرنے اور اس سے مکمل طور پر وابستہ رہنے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن استاد کی نظر امرتا شیر گل کی نظر نہ تھی۔ ان کے قلب کی واردات امرتا کے قلب کی واردات نہ تھی۔ اور ان کا ردعمل امرتا کا ردعمل نہ تھا اور ان کی تعلیم بورڈ نویسوں اور "پینٹروں" کی مرہونِ منت تھی یا اپنی لگن، مشق محنت اور یکسوئی کی۔ پنجاب کو بہت قریب سے دیکھنے کے باوجود (یا قریب سے دیکھنے کے باعث) انہوں نے پنجاب کو "آئیڈیلائز" کیا کہ امرتا کی درشتی اور (SOCIAL COMMENT) کے برعکس ان کی مصوری کلی طور پر تصوراتی فضا کی حامل ہے۔ شاید اسی لئے ان کی تصویروں میں تمام چہرے یکسانیت کا شکار اور کسی قسم کے بھی تاثرات سے عاری یعنی سپاٹ دکھائی دیتے ہیں۔ ہیر اور سوہنی، رانجھے اور مہینوال میں لباس (DRESS) اور LOCALE کی تفریق کے علاوہ کوئی فرق نہیں۔ عام طور پر ان کی تصویروں میں لباس کے اندر گوشت پوست کے جسم کے احساس کے بجائے یوں لگتا ہے جیسے ان کے لباس میں بڑی احتیاط سے ہوا بھر دی گئی ہے اور روحوں کو انتہائی سرد رنگوں میں تحلیل کر دیا گیا ہے۔ اس سے اگرچہ ایک نیم خوابی نیم خوابیدہ کیفیت تو بنتی ہے لیکن مجموعی طور پر تصویریں دھڑکتی سنائی نہیں دیتیں۔ جیسے کہ ایسے "REALIST PAINTERS" سے توقع کی جاسکتی ہے۔ درخت، ندیاں، پہاڑ، جنگل جیسے کسی نشے، کیف و سرور میں، حتیٰ کہ بھینسیں بھی جیسے اسی نشے کے رنگوں سے گھڑی گئی ہیں۔

استاد کو اپنے قول کے مطابق اپنی تصویروں میں "GROUPINGS" پیش کرنے کا بہت شوق تھا۔ اگرچہ ڈیزائن کے اعتبار سے یہ "GROUPINGS" دلچسپ اور ساخت کے اعتبار سے یونانی ترتیبوں سے زیادہ قریب دکھائی دیتی ہیں لیکن ان تصویروں کے تمام حسن، نیم خوابی، نیم خوابیدہ کیفیات اور پُراسرار سرد رنگوں کے باوجود مجھے یہ تصویریں ان کے ہیر رانجھا سے لے کر ان کے لینڈ اسکیپ تک حیاتِ جامد (یعنی STILL LIFE) محسوس ہوتی ہیں۔

بدبخت جوئیل میڈسن نے ۱۹۲۴ء میں رابندر ناتھ ٹیگور سے کہا تھا۔۔۔ تم میں سے کوئی بھی یہاں کے چمکتے گرم سورج کی روشنی کو کیوں نہیں اپنی تصویروں میں منتقل کرتا! ابندر ناتھ نے جواب دیا تھا۔۔ اس لئے کہ ہم ہندوستانی، سورج کو دیکھ نہیں پاتے بالفرض اگر تمہاری نظریں نیلے شفاف آسمان کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔ ہندوستان میں کوئی مسکراہٹ نہیں۔ ہم اپنی روحوں میں تاریکی لے کر چلتے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں اگر وہ یہ سوال استاد اللہ بخش سے کرتا تو یہ کیا جواب دیتے۔ پر اتنا کیا کم ہے کہ ایک شخص نے اپنا رشتہ اپنے علاقے سے استوار کیا اور خود کو اس کے ساتھ باندھ لیا۔ جیسے کیسے بھی سہی، اس نے پنجاب میں (LIVE) کرنے کی کوشش تو کی، چاہے کسی انداز میں سہی، ہم تو اتنے فراخ دل واقع ہوئے ہیں کہ فلموں کو ایک گانے پر تو کیا محض ایک مکالمے پر بھی ہٹ کرا دیتے ہیں۔

تھوڑے کو بہت جان لینے کے باوجود بعض وقت یہ جاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ استاد یا تو اپنے ماحول اور فضا سے انتہائی بے خبر تھے اور یا پھر وہ اتنے باخبر تھے کہ وہ اس سے بھاگ کر اپنی سراب بھری رومانوی دنیا ہی میں رہنا چاہتے تھے۔ یا تو ان کا مطالعہ اور مشاہدہ اتنا کوتاہ اور ان کی سمجھ اتنی کم تھی کہ انہیں پتہ نہیں تھا یا سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ عصری دنیا میں کسی بھی حوالے سے کسی میدان میں کیا ہو رہا ہے، مصوری کے موضوع اور اسالیب کیا کیا نئی صورتیں اختیار کر رہے ہیں اور یا وہ اتنے عام تھے، ان کا مشاہدہ اتنا عمیق تھا اور ان کی سمجھ میں اتنا زیادہ آرہا تھا کہ انہوں نے ان تمام "لوازمات" کو شعوری سطح پر رد کر کے اپنے (COCOON) ہی میں گھومتے رہنے کو ترجیح دی کہ کسی قسم کے خارجی عوامل کسی حوالے سے بھی ان کی مصوری

کی اپچ (ORIGINALITY) اور خالص پن (PURITY) پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ شاید اسی لئے ان کا فن بتدریج زوال سے پنجاب کی طرف سے تو ہو گیا لیکن ان کی سوچ میں ارتقا کی کوئی صورت نظر آتی ہے نہ ان کے اسلوب میں "نشوونما"۔

استاد اللہ بخش کی وفات کے ساتھ پاکستان میں مصوری کا ایک سکول بھی ختم ہو گیا۔ کئی شاگردوں کے باوجود اس سکول کا ایک ہی استاد تھا اور اس کا نام تھا استاد اللہ بخش اور کئی شاگردوں کے باوجود شاگرد بھی ایک ہی تھا اور اس کا نام بھی استاد اللہ بخش تھا۔

تو یوں استاد اللہ بخش کا مصوری میں سفر، ایک تنہا آدمی کا سفر ہے۔

دسمبر ۷۸ء

عکسِ تحریر مجتبیٰ حسین

# مَیں اور میرا فن

غلام رسول

جب ہوش سنبھالا، تو اپنے آپ کو ایسے ماحول میں پایا۔ جو کہ نہ شہر کے پاس تھا اور نہ گاؤں کے قریب۔ درمیان میں ایسی جگہوں کو ملٹری ڈیری فارمز کے نام سے پکارا جاتا تھا، یہ ایسی جگہ پر واقع ہوتے ہیں کہ گاؤں تک بھی رسائی ہو اور فوجی چھاؤنی بھی قریب ہو۔ والد ماجد اسی محکمہ سے تعلق رکھتے تھے۔ دن رات کا مشاہدہ سرسبز کھیت، فصلوں کے بونے اور کاٹنے کے نظارے، کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسان، گائیں بھینس، بیل گاڑیاں گویا کہ ہر وہ چیز جاندار ہو یا غیر جاندار، جس کا تعلق کسان، گاؤں اور کھیت سے ہو مشاہدہ میں آیا اس طرح فطرت کا قریب سے مطالعہ کا موقع ملا

خوبصورت نظارے، ہرے بھرے کھیت خزاں بہار موسمی تغیر و تبدیل سورج کی گرمی۔ گندم کے کھیت، چاند، چاند سے مکھڑے، رنگ برنگ چمکتے ہوئے آنچلوں میں لپٹے ہوئے کھیتوں میں اپنے ساتھیوں کا ہاتھ بٹاتے ہوئے فصلیں کاٹتے ڈھول کی تھاپ پر ناچتے بغرضیکہ یہ وہ مناظر تھے، جو آہستہ آہستہ بچپن میں میرے ذہن میں سماتے گئے۔

خوبصورتی دیکھتا، جی چاہتا کہ اس کو اپنے پاس رکھوں، ممکن نہ تھا، کاغذ پنسل کام آئے اور پھر آہستہ آہستہ رنگ بھی۔ شوق بھی بچپن سے تھا۔ رنگ آنکھوں اور ذہن میں جذب ہو کر رہ جاتے رات کو نیند نہ آتی۔ اور سوچتا رہتا کہ کب ان کو میں اپنے پاس محفوظ کر سکوں گا۔ رات دن یہی بھوت سوار رہتا۔ ڈرائنگ اور رنگوں کے استعمال کی مشق جاری رہتی۔

۱۹۵۷ء میں اوکاڑہ کے اس ماحول سے جس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں نکل کر اسلامیہ کالج فیصل آباد آ گیا تاکہ سائنسی فضا میں تعلیم حاصل کر سکوں کہ یہ والدین کا شوق تھا اور ہمارا شوق تصویریں بنانے کا۔ سائنس فضا میں ۳ ماہ سے زیادہ عرصہ نہ پڑھ سکا۔ اور مجبوراً آرٹس میں آ گیا کالج میں فنونِ لطیفہ کی تعلیم کا بندوبست نہ تھا۔ لہٰذا گھر پر ہی مشق جاری رکھی۔ ایف اے کیا اور ۱۹۶۰ء کے آخر میں لاہور چلا آیا۔ تاکہ باقاعدہ تربیت۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ فنونِ لطیفہ میں حاصل کر سکوں۔ وہاں پر بہت مہربان اور شفیق اُستاد ملے جن کی کاوشوں سے میرا یہ شوق پورا ہوتا نظر آیا۔ ۱۹۶۲ء میں بی۔ اے فنونِ لطیفہ کے ساتھ اور ۱۹۶۴ء میں ایم اے کیا۔ ایک سال تک لارنس کالج جو کہ PINEHILLS کالج کے نام سے موسوم ہے فن کی تربیت دی۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں شعبۂ فنونِ لطیفہ، پنجاب یونیورسٹی میں لیکچرر مقرر ہوا اس دوران میں نے مصوری کی بہت زیادہ مشق کی۔ یورپین مصوروں کی تخلیقات کا بغور مطالعہ کیا کئی نمائشیں لاہور، پنڈی، مری اور کراچی میں ہوئیں۔ یہ میری مصوری کا پہلا دور تھا، جو روایتی اور تاثراتی مصوری کا ایک امتزاج تھا اور وہ مشاہدات جو بچپن میں کوشش کرتا تھا کہ کس طرح محفوظ کر لوں اب ان کو باقاعدہ میں کینوس پر رنگوں میں پیش کرنے لگا۔ شہر میں رہتے ہوئے بھی اور وہ بھی لاہور، جس کا ثقافتی ورثہ تاریخی اور عظیم ہے۔ میں ان یادوں کو اپنے ذہن سے نہ مٹا سکا اور گاؤں کے مناظر کو ہی موضوعِ برش بناتا رہا۔

ستمبر ۱۹۶۹ء میں مزید تعلیم کے لئے امریکہ چلا گیا۔ اور تین سال تک خوب جی لگا کر کام کیا۔ ایم۔ اے اور ایم۔ ایف۔ اے بالترتیب کیا۔ واپس لاہور آیا اور یونیورسٹی میں پڑھانا شروع کر دیا۔ امریکہ میں قیام کے دوران مجھے کئی نامور فنکاروں سے ملنے کا موقع ملا۔ ان کا کام دیکھا۔ یورپ اور امریکہ کی بیشتر

آرٹ گیلریاں دیکھیں، اساتذہ سے استفادہ کیا۔ جدید دور کے تقاضوں کے مطابق اپنے فن کو پرکھا۔

جاپانی پرنٹس گوگان کی تصاویر، مغل مصوری MINIATURE اور بہزاد کے کام کا بغور مطالعہ کیا۔ موضوع میرے پاس پہلے ہی تھا۔ بچپن کی یادیں، اپنی زمین، اپنے لوگ، ان سب کو اکٹھا کر کے ایک اسلوب بنایا جس میں FLAT رنگ کا استعمال بکثرت کیا تاکہ تصویر دیکھنے والے کے ذہن پر منعکس ہو کر رہ جائے۔ اسی اسلوب کی وجہ سے ملکی اور غیر ملکی فن کے نقادوں سے داد پائی۔ پچھلے سال جرمنی، رومانیہ میں نمائشیں کیں۔

عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ فن کے نئے اُفق اُجاگر ہوتے ہیں۔ رنگوں کے استعمال میں چابکدستی سے کام لینا میرا شوق ہے اور پھر پاکستان ایک ایسا ملک ہے جو کہ مختلف رنگوں کے لامتناہی خزانوں سے بھرا پڑا ہے۔ میری تصاویر میں سبز رنگ غالب رہا۔ یہ میرا رنگ ہے۔ یہ وہ رنگ ہے جس کا فنونِ لطیفہ کی تاریخ کو اگر پرکھا جائے تو بہت کم استعمال ہوا ہے۔ یورپین اور دیگر ممالک کے مصوروں نے اس کو وہ اہمیت نہیں دی جو کہ اس کا اصل مقام ہے میں نے ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۶ء تک اس کا بکثرت استعمال کیا۔ اس رنگ میں بھی وہی طاقت اور تمام خوبیاں ہیں جو کہ نیلے، سُرخ، گلابی وغیرہ میں ہیں۔

اب زرد رنگ کا استعمال بڑھ رہا ہے۔ رنگ بذاتِ خود کچھ نہیں ہوتے ان کا امتزاج اور ٹھیک استعمال ہی نہیں جان اور تنوع بخشتا ہے۔ رنگ، ہر رنگ میری کمزوری ہے دیکھتا ہوں تو فوراً چاہتا ہوں کہ کینوس پر منتقل کر دوں۔

ماں کے پیٹ سے چرایا یہ شوقِ مصوری، یہ دیوانگی دن بدن بڑھ رہی ہے اور پھر اقبال کا یہ شعر ؎

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت  ؛  معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

یہی شوق ملک سے باہر بھی لے جاتا ہے۔ مگر اپنی زمین کی کشش اور بچپن کی وہ یادیں جن کو میں کس حد تک کینوس پر لے آیا ہوں۔ اب بھی مجبور کر دیتی ہیں کہ چلو وہاں چلو ـــــ وہاں بھی تبدیلیاں ہو رہی ہیں نئے کھیت، نئے نظارے، نئے چہرے پاکستانی مصوروں کے لئے دعوتِ فکر ہیں ـــ

اکتوبر ۷۸ء

دل میں جھانکو مرے اگر تو کھلے
دامنِ تار تار کچھ بھی نہیں
آ لگیں دو لگیں کو مل بیٹھیں
سانس کا اعتبار کچھ بھی نہیں
کون ہم سے ملے کہ پاس اپنے
بجز دلِ داغدار کچھ بھی نہیں
کیسی بستی ہے خواب کی شہرت
کوئی زنداں نہ دار کچھ بھی نہیں

شہرت بخاری

عکسِ تحریر شہرت بخاری

# انور جلال شمزا

ذوالفقار تابش

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد مصوروں کی جس نسل نے مصوری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اور اس فن میں نام پیدا کیا ان میں انور جلال شمزا ایک اہم نام ہے۔ ایسا نام جس نے مصوری کو پوری سنجیدگی، مکمل شعور اور وابستگی کے ساتھ اپنایا اور اسے ذمہ داری کے ساتھ آخری سانس تک اپنائے رکھا۔ جوانی کے چند سالوں کے علاوہ مصوری شمزا کا ایک کُل وقتی ذریعۂ اظہار رہا۔

شمزا ہمارے ان مصوروں میں سے ہیں جو پانچویں دہائی کے ساتھ ہی مصوری کے اُفق پر نمودار ہوئے۔ یہ وہ دَور ہے جب عبدالرحمٰن چغتائی، اُستاد اللہ بخش، زبیدہ آغا، فیضی رحیمن جیسے مصور تو بزرگوں میں شمار ہوتے تھے جب کہ احمد پرویز، معین نجمی، آذر زوبی، قطب شیخ، انور جلال شمزا، ایس صفدر، رضیہ فیروز، مریم شاہ، راحیل اکبر جاوید اور حنیف رامے۔ یہ تمام لوگ نئی تجریدی مصوری کے حوالے سے ایک طرف تو نئے اُسلوب سے لوگوں کو متعارف اور مانوس کرنے کی سعی کر رہے تھے اور دوسری طرف مصوری کے میدان میں اپنا نام بنانے کی جُدوجہد میں مصروف تھے۔

پانچویں دہائی کے آخر تک انور جلال شمزا کا نام مصوری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے کوئی نیا اور نامانوس نام نہیں رہا تھا۔ اس عہد میں نوجوان شمزا کے مصوری میں نت نئے تجربے لوگوں کو چونکانے کا سامان ہوتے تھے۔ مثلاً مجھے یاد ہے ان دنوں شمزا نے ایک تصویر بنائی تھی، جس پر بڑی لے دے ہوئی تھی۔ عنوان تھا "مرزا" یہ "صاحباں" والے مرزا کے موضوع پر شمزا نے تجریدی خیال آرائی کی تھی کہ ایک چہرہ تھا، آدھا کالا، آدھا سفید۔ غالباً "پین اینڈ انک" کی بنائی ہوئی شمزا کی یہ تصویر اپنے ٹریٹمنٹ کے باعث بہت سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی اور اس کی تفہیم کی حسبِ توفیق کوشش بھی کی گئی۔ پھر انہی دنوں شمزا کی "نیوڈ" تصاویر کا بھی تذکرہ رہا اگرچہ تجریدی سٹائل کی یہ نیوڈز کسی بھی طرح نیوڈز معلوم نہ ہوتی تھی کیونکہ نیوڈ کا لوگوں کے ذہنوں میں اس وقت تک جو مفہوم تھا شمزا کی تصویریں اس سے یکسر مختلف تھیں۔

شمزا کا تعلق لاہور سے تھا۔ لاہور کے گلی کوچے، مکان، لوگ، درو دیوار، محرابیں، عمارتیں اور یہاں کی روایات اُسے بہت محبوب تھیں چنانچہ اس کی مصوری اپنے تجریدی اسلوب کے باوجود انہی عناصر سے مرتب ہو کر آگے بڑھی اور پروان چڑھی بلکہ مجھے کہنے دیجئے کہ شمزا کی مصوری کا آغاز بھی یہیں سے ہوا اور اس کا انجام بھی — لیکن اس بات کی وضاحت میں آگے چل کر کروں گا جب اس کے تازہ ترین کام پر بات ہو گی جو ابھی ایک ڈیڑھ ماہ پہلے مرحوم کی بیوی میری نے الحمرا آرٹ کونسل میں نمائش کے لئے پیش کیا۔

شمزا نے اظہار کے لئے تجریدی مصوری کے اُسلوب کو اپنایا مگر اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں اس کی چند خصوصیتیں ایسی ہیں جو اسے دوسروں سے الگ کرتی ہیں۔ پہلی خصوصیت تو اس کی یہ ہے کہ تجریدیت کے شوق میں اس نے اپنی مصوری کو دیکھنے والے کے لئے گورکھ دھندا بنانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اس کی تصویریں دیکھ کر صاف پتہ چلتا ہے کہ اس کا مسئلہ "اظہار" ہے۔ وہ واقعی کچھ کہنا چاہتا ہے کچھ

بتانا چاہتا ہے۔ اس کے دل و دماغ میں کچھ انوکھی باتیں ہیں جو وہ دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس کی تصویریں اپنے مفہوم کو اپنے ہی تک محدود رکھنے کی بجائے دیکھنے والے پر بھی بیان کرتی ہیں ـــــ اظہار کا یہی وہ مسئلہ تھا جس نے چوتھی اور پانچویں دہائی میں شمزا سے کہانیاں اور ناول بھی لکھائے اور اس کا رُخ شاعری کی طرف بھی موڑا۔ اس دَور میں لکھی ہوئی شمزا کے یہ ناول، ڈرامے اور کہانیاں ممکن ہے آج ہمیں زیادہ پسند نہ آئیں یا وہ ہمارے آج کے ادبی معیاروں پر پوری نہ اتریں لیکن ان دنوں شمزا کی کتابیں زندہ پتا، قصہ کہانی، جینئس، سوتے جاگتے اور اکیلا آدمی، جب شائع ہوئیں تو لوگوں نے ان کتابوں کو پڑھا بھی اور ان پر ادبی حلقوں میں بات بھی چلی۔

ان تحریروں کو اب بھی اگر دیکھا جائے تو یہ پتا چلتا ہے کہ کوئی کچھ کہنے، بولنے اور کلام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ لوگ جن کے پاس کہنے کے لیے کچھ ہوتا ہے ان میں سے بعض پر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب وہ جلدی سے اسے باہر نکالنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ اظہار کے ایک سے زیادہ ذرائع بھی اختیار کرتے ہیں۔ شمزا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ منٹو سے بہت متاثر تھا۔ ممکن ہے اس نے منٹو ہی کے تتبع میں لکھنا شروع کیا ہو لیکن معلوم ہوتا ہے کہ چند برسوں ہی میں اسے پتا چل گیا کہ فکشن کی اقلیمیں اور شاعری اس کے لئے نہیں ہیں اور یوں اس نے اپنی ساری توجہ مصوری کی طرف مبذول کر دی۔

ویسے شمزا کے زمانے کے آرٹسٹوں کی اس نسل کا ایک دلچسپ مطالعہ سامنے آتا ہے کہ شمزا کے ساتھ ساتھ راحیل اکبر جاوید، آذر زوبی، حنیف رامے اور کئی دوسرے مصوروں نے ان دنوں مصوری کے ساتھ ادب اور شعر کو بھی اظہار کا ذریعہ بنایا۔ شاکر علی نے جو ذرا بعد میں پاکستان آئے۔ اپنی تخلیقی زندگی کا آغاز کہانیاں لکھنے سے کیا تھا۔ کئی مصوروں نے ڈرامہ، فلم اور تھیٹر میں بھی عملی حصّہ لیا۔ خود شمزا نے ریڈیائی اور سٹیج ڈرامے لکھے اور ان میں کام بھی کیا۔ فلم کے ساتھ اس کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ وہ فلمی ہیرو بننے کے خواب بھی دیکھ چکا تھا۔ خوبرو آدمی تھا اس لئے اس کے خواب کچھ بے جا بھی نہیں تھے۔

اس دور کے فنکاروں کی شعر و ادب سے دلچسپی سے ایک اندازہ تو ضرور ہوتا ہے کہ تقسیم سے پہلے اور اس کے فوراً بعد لاہور کی فضا پر حکمرانی ادب اور شعر ہی کی تھی بلکہ شعر سے بھی زیادہ فکشن کی تھی۔ اس لئے دوسرے فنونِ لطیفہ سے متعلق نوجوانوں کا اس فضا سے بچ نکلنا ممکن نہ تھا چنانچہ شمزا اور دوسرے کئی مصوروں کی تحریریں اسی گہری تاثر پذیری کی نشاندہی کرتی ہیں۔

شمزا کی بیقراری اسے بہت جلد، بالکل نوجوانی ہی میں یہاں سے انگلستان لے گئی۔ آپ دیکھئے کہ ۱۹۴۷ء میں تو شمزا میو سکول آف آرٹ لاہور سے ڈپلوما حاصل کرتا ہے اور ۱۹۵۸ء میں انگلستان پہنچ کر شادی بھی کر لیتا ہے۔ اس کے بعد اس کا سارا کیریر انگلستان ہی میں بنا ہے۔ وہیں اس نے مصوری کی مزید تعلیم حاصل کی۔ وہیں اس نے عمر بھر مصوری کی تعلیم دی۔ وہیں اس کی دو بچیاں تصویر (بڑی بیٹی) اور حنا (چھوٹی بیٹی) پیدا ہوئیں۔ وہیں اُس نے زندگی گزاری اور وہیں زندگی کا آخری سانس لیا۔

شمزا کا سارا تخلیقی کام اس بات کا گواہ ہے کہ اسے اپنے کلچر سے گہری دلچسپی تھی اور اس کا سارا تخلیقی سفر انہی ثقافتی مظاہر کے ساتھ رہا ہے۔ اس کی تصویروں میں درخت، مکان، محرابیں، دروازے، گنبد، مینار، اینٹوں کی دیواریں، پتنگیں، تتلیاں، گلیاں اور بازار ہیں۔ یہ سارے مظاہر شمزا کے بچپن اور جوانی کے مشاہدے اور تجربے کا حصّہ بنے۔ انہی سے اس کے خواب اور خیال عبارت ہوئے اور انہی پر اس نے اپنی تخلیقی زندگی کی اساس رکھی۔ اس کا درمیانی اور آخری عمر کا کام دیکھ کر یہ بھی صاف پتہ چلتا ہے کہ انگلستان میں بیٹھ کر جب اُس نے پوری مسلم ثقافت اور اس کی مصوری، خطاطی، تعمیرات، قالین بافی، ظروف سازی، کچی کاری، کشیدہ کاری، نقاشی اور کتابوں کی تزئین کے فنون کو پڑھا، دیکھا اور گہری نظر سے ان کا مشاہدہ کیا تو یہ سب چیزیں اس کے تخلیقی شعور کا حصّہ بن گئے اور اس نے ان مسلم فنون کو اپنے

فن میں ذریعۂ اظہار کے لئے بطور بنیادی عناصر کے استعمال کرنا شروع کر دیا چنانچہ شمزا کے اس دور کے کام میں یوں لگتا ہے جیسے وہ اپنے روحانی اور ثقافتی ورثے کی دریافت اور بازیافت کے لئے نکلا ہے۔

شمزا نے اپنی زندگی انگلستان میں گزاری، لیکن اس کا دل یوں لگتا ہے جیسے یہیں اٹکا رہا۔ اس عرصے میں اس نے ایک بار اپنے وطن آکر یہیں رہنے اور بودوباش اختیار کرنے کی کوشش بھی کی لیکن ایسا نہ ہو سکا اور اسے پھر واپس انگلستان جانا پڑا۔

برسوں کی اس دوری نے اُسے روحانی، قلبی طور پر اپنے وطن سے بے حد قریب کر دیا۔ لگتا ہے جیسے عمر کے آخری برسوں میں وطن کی یاد اُسے ستانے لگی تھی اور HOME SICKNESS اُس کا ایک جذباتی مسئلہ بن گئی تھی۔ اس کے آخری دور کے کام پر ایک نظر ڈالیں تو یہ HOME SICKNESS اس کے رنگوں، لکیروں، موضوعات اور فنی رویے میں صاف جھلکتی ہی نہیں بلکہ بولتی ہوئی نظر آتی ہے۔

شمزا کی آخری نمائش میں رکھی گئی ڈیڑھ سو سے زائد تصویریں تو بنائی ہی اس لئے گئی تھیں کہ شمزا خود انہیں وطن لانا اور اپنے ہم وطنوں کو اپنا تخلیقی کام دکھانا چاہتا تھا چنانچہ ان تصویروں کا سائز بھی مختصر ہے اور یہ اس طرح کے میٹریل پر خاص طور پر بنائی گئی ہیں کہ تصاویر کو آسانی سے لایا، لے جایا جا سکے۔

شمزا کے دل میں یہ خیال یقیناً عمر بھر جاگزیں رہا ہوگا کہ اس نے زندگی، وطن، اپنی مٹی اور اپنی ثقافت، تاریخ اور فنون سے جو کچھ حاصل کیا ہے اس کے جواب میں شاید اسے زیادہ کچھ واپس نہیں دے سکا۔ اس لئے اب اپنی تخلیقی زندگی کے آخری برسوں میں اسے اپنی تخلیق کا حاصل اپنے ہم وطنوں کے سامنے ضرور پیش کرنا چاہیئے چنانچہ "ROOTS" سیریز کے تحت بنائی گئی تصویروں پر اُس نے قریب قریب دو برس مسلسل کام کیا۔ لیکن اسے یہ تصویریں اپنے ساتھ لانے اور اپنے ہم وطنوں کو دکھانے کا موقع نہ ملا کہ اب سے ایک برس پہلے ۱۸ جنوری ۱۹۸۵ء کو سٹیفورڈ (انگلستان) کے ایک بنک میں ایک چیک پر دستخط کرتے ہوئے دل کا دورہ پڑنے سے وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ شمزا کی بیوی "میری شمزا" جو خود بھی ایک آرٹسٹ ہیں، شمزا کی آرزو کے احترام میں یہ تصویریں خود اپنے ساتھ پاکستان لے کر آئیں اور یہاں شمزا کے ہم وطنوں کو اُن کا فن دیکھنے کا موقع فراہم کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نے مرحوم شوہر کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے انہیں قریب قریب سبھی اخراجات خود ہی برداشت کرنے پڑے حتیٰ کہ اپنے دفتر سے چھٹی بھی بغیر تنخواہ کے لینی پڑی۔ پاکستان کے ثقافتی ادارے "میری شمزا" کی صرف یہ مدد کر سکے کہ انہیں تصویریں سجانے کے لئے جگہ دی اور اندرونِ ملک ان کی ٹرانسپورٹ کا بندوبست کیا۔

شمزا کے کریڈٹ پر بے شمار اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک تصاویر کی نمائشیں ہیں۔ ان میں مشترکہ شو بھی ہیں اور "ون مین" شو بھی شامل ہیں۔ یہ نمائشیں دنیا کے ان تقریباً تمام بڑے شہروں میں منعقد ہوئیں جنہیں مصوری اور آرٹ سے کوئی بھی علاقہ ہے لیکن شمزا کی یادگار نمائش اس کی آخری نمائش ہی کہلائے گی، وہ نمائش جو اس نے اپنے "شہر" کے لئے تیار کی لیکن اس میں خود شریک ہونے سے محروم رہا۔ حالانکہ اس کی سب سے بڑی آرزو یہی نمائش تھی۔ اس بات کی گواہی اس کی بیوی نے بھی دی ہے۔

"...THEY REFLECT A SORT OF HOME SICKNESS"

یہی ہوم سکنس اسے کشاں کشاں وطن لا رہی تھی لیکن بیچ میں موت حائل ہو گئی۔

میرا خیال ہے کہ یہ "ہوم سکنس" شمزا میں کافی عرصے سے چل آ رہی تھی لیکن اس نے ایک مثبت اور تعمیری انداز میں اسے اپنے مسلم ورثے اور پاکستانی کلچر کو "دریافت" (DISCOVER) کرنے اور ان کی تخلیقِ نو (RE-CREATION) پر مائل کیا تھا۔ تاہم اس بات کو میں ایک بار دہرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ شمزا میں اپنے مشرقی فنون اور ثقافتی ورثے کا شعور اور اس کے ساتھ گہری شیفتگی شروع ہی سے قائم ہے

جس نے وقت کے ساتھ ترقی کی اور اس کے فن پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ چنانچہ لندن میں اپنے زمانۂ تعلیم میں جب وہ دائروں، قوسوں، مربعوں اور ان کے امتزاج کی مختلف VARIATIONS پر مبنی تصاویر بنا رہا تھا تو اس کے اُستاد اینڈریو فورج (ANDREW FORGE) نے اسے ایک دلچسپ لیکن محدود امکانات کا حامل قرار دیا۔ اینڈریو نے اس وقت دراصل صحیح اندازہ نہیں لگایا کہ شمزا کے ان تجربوں کا پس منظر کیا ہے۔ اس کے پیچھے صدیوں کا جو بڑا ثقافتی اور فنی ورثہ موجود تھا اس میں نقطوں، قوسوں، دائروں اور مربعوں کا ایک بے پناہ وسیع اور لامحدود جہاں پھیلا ہوا ہے۔ چنانچہ آنے والے وقت میں شمزا نے ان لامحدود امکانات کو ثابت بھی کیا اور حسب توفیق اس سے استفادہ بھی کیا۔

شمزا کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اُس نے مصوری میں بہت تجربے کئے اور نت نئے امکانات کی تلاش جاری رکھی۔ مجھے اس کی سب سے بڑی خوبی یہ نظر آتی ہے کہ اُس نے جدید آرٹ کو بالکل اسی طرح من وعن قبول کرنے اور بے شمار دوسرے مصوروں کی طرح محض مغربی مصوری کی نقالی یا تجریدی سٹائل کو اپنا کر ایک معمولی درجے کی چربہ سازی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ مغرب کی جدید اور تجریدی مصوری سے متاثر ضرور تھا، لیکن اس نے اسے برتا اپنے طریقے سے بالکل اسی طرح جیسے کہ ادب میں ہم نے ناول، افسانے اور نظم سے کام لیا ہے۔ چنانچہ شمزا کے موضوع اور متن اس کے اپنے ہیں جو اس کے اپنے ثقافتی ورثے کی دین ہے جبکہ ہیئت اور ٹیکنیک اس نے جدید مصوری سے ل ہے۔

شمزا کا آخری دَور کا کام جو ہمیں "میری شمزا" کی مہربانی سے دیکھنے کا موقع ملا۔ کئی اعتبار سے بڑا اہم ہے اور خصوصی توجہ چاہتا ہے۔ ان تصویروں میں قطع نظر ان کے سائز اور میڈیم کے، جو باتیں فوراً دیکھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔ ان میں ایک تو ان کے موضوعات ہیں اور دوسرا ٹریٹمنٹ۔ تیسرے ان تصاویر کے عناصر ترکیبی۔ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے کوئی بہت عام سی چیز یا بہت ہی روزمرہ کی بات یا واقعہ، کبھی ایک بہت بڑے تخلیقی کام کی بنیاد بن جاتے ہیں۔ شمزا جس سوسائٹی میں رہتا تھا، جس سرزمین پر اُس نے عمر گزاری تھی، اسے احساس تھا کہ وہ اس کی اپنی نہیں۔ اسے اپنی مٹی کا بھی پتا تھا اور اپنی روایات اور ثقافت کا بھی گہرا اور مکمل شعور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ گھر کے وسیع لان میں اُگنے والے پھولوں، پودوں اور جھاڑیوں کو دیکھتا اور اپنے باغبانی کے شوق میں ان کی جڑوں کو دیکھتا ہوگا اور اُسے یہ نظر آتا ہوگا کہ کوئی بھی پروان چڑھنے والے پیڑ کی جڑیں اس کی پرورش، بڑھوتری، زندگی اور اس کے ارتقا کے لئے کتنی ضروری ہیں اور پھر یہ کہ جڑوں کی اہمیت کیا ہے تو یقیناً وہ سوچتا ہوگا کہ میں کون ہوں، میری جڑیں کہاں ہیں اور میں اپنی زندگی میں جو پھلا پھولا اور بارور، باثمر ہُوا ہوں تو سب کچھ مجھے کس روایت، کس کلچر، کس تاریخ، کس مٹی اور کس دھرتی سے ملا ہے۔ ان تصاویر کی سیریز جو "ROOTS" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ بات خاص طور پر بے حد واضح ہو کر سامنے آئی ہے۔ خود ROOTS کا لفظ بے حد اہمیت رکھتا ہے اور مصور کے تخلیقی شعور کی طرف بے حد اہم اشارہ کرتا ہے۔ ROOTS سیریز کی تقریباً تمام تر تصاویر میں یہ ٹیکنیک برتی گئی ہے کہ ایک تصویر کے نچلے حصے یا اس کے زمینی حصے GROUND میں کوئی قرآنی آیت یا اس کا ٹکڑا یا متقدس اسماء تحریر کئے گئے ہیں، اور ان میں سے اُگتے ہوئے شجر، پودے، جھاڑیاں اور پھول دکھائے گئے ہیں۔ کہیں کہیں یہ انداز اختیار کیا گیا ہے کہ جڑیں ہی اسماء اور آیات پر مشتمل ہیں اور اُن سے اُگتے ہوئے پودے اور درخت بھی۔ کہیں برقی لہروں کو مددگار پیٹرن کے طور پر برتا گیا ہے۔ یہ تصویریں انتہائی سنجیدہ رنگوں سے بنائی گئی ہیں اور مصور کے ذہن اور روح کی اس تلاش، جستجو، اس کی دریافت کے سفر اور پھر اس کے نتائج کی غمازی کرتی ہیں۔ چنانچہ اس کی کومٹ منٹ کا اندازہ بآسانی ہو جاتا ہے کہ شمزا اپنی ذات اور وجود کی جڑیں کہاں پیوست دیکھتا ہے اور اس کے حوالے سے اپنی نشوونما اور اپنے وجود اور

زندگی کی بقا کہاں پاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس کے فنی اور تخلیقی سفر کی معراج ہے۔

لاہور شمزا کا شہر تھا۔ اس کے زمین و آسمان اور یہاں کی ثقافتی زندگی اس کی خوشبو اور رونقیں اس کے وجود کا حصہ تھا اور یوں لگتا ہے ان کے ہجر میں وہ اپنے آخری چند برسوں میں بہت بیتاب تھا۔ ۱۹۸۰ء سے لے کر ۱۹۸۴ء تک کے عرصے میں اس کی بنائی ہوئی تصویریں، ان کے موضوع اور عنوان، اس کی بیقراری اور اس کی "ہوم سکنیس" کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ROOTS کے علاوہ اس دور میں اس کی بنائی ہوئی تصویروں کے عنوان دیکھیے۔ ان میں سے ہر موضوع پر ایک آدھ نہیں متعدد تصویریں بنائی گئی ہیں۔ عنوان ہیں، مسجد، گھر، کنبہ، ملاقات، شہر کی دیوار، نامۂ محبت، پتنگیں، پرندے، انارکلی، نظم، چمن، بارش، سیب کا درخت۔ یہ سب موضوعات ہمیں کچھ بتاتے ہیں، کچھ کہتے ہیں۔ ان کے بنانے والے کے دل و دماغ، اس کی وابستگی اور اس کی محبت اور رشتوں کا پتا دیتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ شمزا کے بدن کی مٹی اب بول رہی تھی اور کالے کوسوں کے فاصلوں کے باوجود اس کی دھرتی اسے آواز دیتی تھی اور وہ اس آواز کو سنتا تھا۔ یہاں کا صاف، نیلا، کھلا آسمان اس کے خوابوں میں جاگتا اور یہاں کے پرندے، بارشیں، گنبد اور گھر اس کے خیالوں میں زندہ ہوتے اور اُسے بلاتے تھے۔ شمزا نے کبھی ان کو جھٹلانے کی کوشش نہیں کی ایک مصوّر کے طور پر اس نے ان بلاووں کا جواب دیا — تصویروں کی شکل میں۔

جنوری، فروری ۱۹۸۶ء

خواب و خوشبو کا یہ موسم
دلِ بیمار کو راس آتا ہے
درد کا نور سرِ شام اُترتا ہے جب آنکھوں میں تو پھر
ایسا لگتا ہے کہ تم جیسا کوئی
زینۂ شب سے اُتر کر مرے پاس آتا ہے

ابوحامد

عکسِ تحریر: ایوب خاور

# منصور راہی

حسن عباس رضا

معاشی، سماجی اور سیاسی شعور ـــــ صنعتی انقلاب کی کوکھ سے جنم لینے والے مسائل ـــــ بھوک اور ایٹمی تابکاری کے اثرات کے پس منظر میں کینوس پر فن پارے تخلیق کرنے والا مصور منصور راہی اس وقت پاکستان ہی نہیں بلکہ تیسری دنیا کے ممالک کا ایک نمائندہ مصور ہے۔ بنیادی طور پر آبی رنگوں سے شہ پارے تخلیق کرنے والے اس مصور نے نہ صرف مصوری کے مروجہ اسالیب میں بلکہ ان سے ہٹ کر برش اور چاقو کی مدد سے تصاویر کو نئی جہتوں سے آشنا کیا۔

آج کے عہد میں اکثر مصوروں کا اسلوب نگاہ اپنی شناخت کرنا ہے یعنی اپنی ذات میں پنہاں دنیا کی تلاش اور اپنا اظہار کرنے کی جدوجہد میں مصروف عمل ہونا ہے۔ دوسرے الفاظ میں زندگی کے خارجی اور داخلی تضادات پر بھاری آتا ہے۔ اس کے برعکس منصور راہی نے اپنی ذات کی شکست و ریخت کو تو پینٹنگز کا موضوع بنایا ہی ہے مگر اس نے ارد گرد کی معاشی، سماجی اور سیاسی صورت حال اور ان کی گرد سے اُٹھنے والے طوفانوں اور اثرات کو بھی کینوس پر منتقل کیا ہے۔ ممتاز مصور صادقین نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ منصور راہی کی ڈرائنگ اتنی مضبوط اور PERFECT ہے کہ وہ جس موضوع کو بھی کینوس پر منتقل کرتا ہے وہ اپنا بھرپور تاثر چھوڑے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ منصور راہی کی تصاویر دیکھنے والوں کو ایک نئی بصیرت کا ادراک ہوتا ہے۔

منصور راہی اپنے فنی کیریئر کو سات حصوں پر مشتمل قرار دیتا ہے۔ یعنی پہلا دور کیسر تعلیمی، جس میں مصور اپنی پسند کے احساسات دکھانے کے لئے خاکہ بناتا ہے۔ میڈیم کا چناؤ کرتا ہے اس کے بعد کیوبزم میں تجرباتی حیثیت کو پینٹ کرتا ہے۔ چوتھے فیز PHASE میں انسانی جسم کے خطوط، اشکال اور زاویوں کو تین سمتی فنون میں دکھانے کی کوشش اور سہ سمتی مصوری کے اجزائے ترکیبی کے درمیان واقع تعلق کو سمجھنے کی کوشش، شفاف رنگوں کی گہرائی، ساخت، ہیئت اور اشیاء کے فاصلوں کا مطالعہ ـــــ انہی حوالوں اور ضابطوں کو منصور راہی اپنی تصاویر تخلیق کرنے میں استعمال کرتا، یا ان کی رہنمائی حاصل کرتا ہے۔

منصور راہی ۱۹۳۹ء میں مالدہ (مشرقی بنگال) میں پیدا ہوا، ۱۹۴۷ء میں مشرقی پاکستان ہجرت کی، ڈھاکہ گورنمنٹ کالج فار آرٹس اینڈ کرافٹس سے ۱۹۶۲ء میں اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ منصور راہی کی خوش قسمتی ہے کہ اسے زین العابدین اور کبریا جیسے عظیم مصوروں سے تربیت لینے اور فنی باریکیاں سیکھنے کا موقع ملا، اور آج بھی جب ناقد منصور راہی کی تصویروں پر زین العابدین کی چھاپ یا اثر کا ذکر کرتے ہیں تو منصور راہی کوئی وضاحتی بیان جاری نہیں کرتا بلکہ وہ خوش ہوتا ہے کہ اس کی تصویروں سے استاد زین العابدین کے فن کی خوشبو آ رہی ہے ـــــ اور یہی وہ اثر اور رنگ ہے جو انسانی زندگی کے دُکھ، قحط، بھوک، افلاس، ایٹمی ہتھیاروں کا خوف، طوفان، سیلاب، بے گھر مہاجرین جیسے موضوعات اور سیریز پر بنائی گئی منصور راہی کی تصویروں میں جھلکتا ہے ـــــ اس کے باوجود منصور راہی اس وقت پاکستان کا واحد مصور ہے جس کا اپنا مکتبۂ فکر اور اسلوب ہے۔ بقول منصور راہی!

"اگر مصور کا اسلوب ہر دور میں بدلتا ہے اور ہر بار وہ کسی نئے اسلوب کا سہارا لے کر آگے بڑھے تو یہ مصوری کی اصطلاح میں کوئی خوبی کی بات نہیں۔ خوبی تو یہ ہے کہ مختلف ادوار میں ماحول، زمانے اور حالات کا بھی بھرپور اثر مصوری کو ایک نئی نہج عطا کرے مگر اسلوب وہی ایک ہو، جو مصور کی پہچان ہو۔ فن پارے پر مصور کا نام نہ بھی لکھا ہو تو خود فن پارہ بتائے کہ میں کس کے خونِ جگر کا عکس ہوں۔"

اور بلا ریب منصور راہی کی پینٹنگز خود بولتی اور اپنی شناخت کراتی ہیں۔

منصور راہی نے عالمی، سیاسی اور عوامی مسائل پر موضوعاتی فن پارے تخلیق کر کے بے شک فن مصوری کے میدان میں بہت بڑا کام کیا ہے۔ "عالمی غذائی بحران"

"بے سہارا لوگ" اور ایٹمی جنگ کا خوف" جیسے عنوانات کی تصویری سیریز اقوام عالم کے ضمیر کو جھنجوڑنے اور کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں ـــــ اور یہی وجہ ہے کہ منصور راہی آج بھی استحصال، سامراجیت، جنگ بازی، اسلحہ سازی اور غربت وجہالت پھیلانے والی باطل قوتوں کے خلاف اپنے فنی محاذ پر جدوجہد میں مصروف ہے۔

منصور راہی اور اس کی اہلیہ ہاجرہ منصور اور رابعہ زبیری نے مل کر نہ صرف کراچی آرٹ سکول کو پاکستان کا پہلا آرٹ سکول بنایا بلکہ اسے پاکستان کے قابلِ ذکر اور مستند ادارے کے طور پر بھی متعارف کرایا۔ دیکھا گیا ہے کہ آرٹ سکول عموماً آرٹسٹ پیدا نہیں کرتے بلکہ فن دیکھنا سکھاتے ہیں تاکہ مستقبل کے آرٹسٹ کی نگاہ میں حسن کی تمام تر نزاکتیں اور باریکیاں اتر آئیں۔ مگر منصور راہی کے اس سکول سے آرٹسٹ بصیرت کی روشنی کے ساتھ ساتھ فن کی مشعل لے کر بھی مصوری کی بے چراغ گلیوں میں اتر آئے ہیں۔ منصور راہی کے مکتبۂ فکر اور اسلوب کے طالب علموں نے بھی منصور کے فن اور اس کی روایت کو آگے بڑھایا، ان میں مشکور رضا اور عبدالحئی قابلِ ذکر ہیں۔

رواں وقت کے دھارے کے ہمراہ کئی عالمی اور قومی موضوعات منصور راہی کی سوچ اور فنی چابکدستی کے ساتھ کینوس پر اترتے آرہے ہیں اور اترتے آئیں گے کہ یہی ایک جینوئن مصور کی پہچان اور یہی اس کا منصب ہے۔

اگست ۸۶ء

میں برہنہ فرش پر
جنگلی دیوار پر
قمقموں کی روشنی
دور تک سایوں کا رقص
تیرگی میں مضمحل سی کچھ صدائیں
دور سے آتی ہوئی بچے کی چیخ
نل سے پانی بہہ رہا ہے
ایک لمحے بھی ہوا کے ساتھ اندر آ گئے
کمرے میں بادل کچھ نیلے
اک سرے سے دوسرے تک
اب پریشاں گھومتے ہیں

بلراج کومل

عکسِ تحریر بلراج کومل

# پاکستانی موسیقی

شاہد احمد دہلوی

علوم وفنون میں عموماً اور فنونِ لطیفہ میں خصوصاً سرزمینِ پاکستان صدیوں سے پیش پیش چلی آتی ہے۔ وہ علاقہ جو اب مغربی پاکستان کہلاتا ہے، برِ عظیم میں داخل ہونے والی ترقی یافتہ قوموں کی آماجگاہ بنا رہا ہے۔ اس کی گود میں عظیم تہذیبیں پلتی رہیں۔ فاتحوں اور فرماں رواؤں نے اسی علاقہ کو اپنا وطنِ ثانی بنایا۔ تہذیب وتمدن کی جو قلمیں وہ اپنے ساتھ لائے تھے وہ یہاں خوب پھلیں پھولیں۔ اُن میں طرح طرح کے بیل بوٹے، رنگ برنگ پھول کھلے اور اُن کی خوشبو سے مشامِ جاں معطر ہو گئی۔

محمد بن قاسم کے ساتھ علاقۂ سندھ میں مسلمان آئے اور اپنی ترقی یافتہ تہذیب ساتھ لائے۔ ریگستانِ سندھ اُن کے دم قدم سے سرسبز وشاداب ہو گیا۔ سندھ کے میروں نے علوم وفنون کی سرپرستی کی اور صدیوں کے شاندار ورثہ میں معتد بہ اضافہ ہو گیا۔ خیبر اور ایران وتوران سے آنے والے مسلمانوں نے سرحد اور پنجاب کو ایک نیا رُوپ دیا۔ مغلوں نے آگرہ اور دلّی کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور برِ عظیم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اُن کی برکتیں پھیل چلی گئیں۔ ہمارا ملک انہی برکتوں کا امین ہے۔

یوں تو سارے ہی فنونِ لطیفہ میں مسلمان بادشاہوں کی سرپرستی اور مسلمان فن کاروں کی ذہانت کی بدولت نئی نئی راہیں کھلتی گئیں اور فنون میں اختراعات وایجادات ہوتی گئیں مگر سب سے زیادہ نمایاں ترقی ہماری موسیقی نے کی۔ ہند وپاکستان کی موجودہ تمام موسیقی مسلمانوں ہی کی ساختہ پرداختہ ہے۔ برِ عظیم کے علاقوں کی موسیقی مقامی لوک گیتوں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ مسلمان فنکاروں نے اپنی عربی وعجمی موسیقی کو موجودہ موسیقی کے قالب میں ڈھال دیا اور اُسے ایک علمی صورت دی۔ آج اسی ہزار سالہ موسیقی کا ایک سرسری جائزہ ہمیں لینا ہے۔

عربوں نے اپنی موسیقی کے لئے وہی سات بنیادی سُر مقرر کئے جنہیں قدیم یونانیوں نے اساس قرار دیا تھا۔ اس کا بانی فیثاغورث بتایا جاتا ہے۔ یہی سات سُر یعنی سا رے گا ما پا دھا اور نی ساری دُنیا کے گانے بجانے کے بنیادی سُر ہیں۔ فیثاغورث کے وضع کئے ہوئے سات سُروں کی سپتک یورپی بلکہ عالمی موسیقی کا ہارڈ اسکیل کہلاتی ہے۔ اس سپتک کے تمام سُر شُدھ (یعنی پاک) ہوتے ہیں۔ ہماری موسیقی میں ہارڈ اسکیل یا تمام شُدھ سُروں کی سپتک کو بلاول اسکیل کہتے ہیں۔ ان سات بنیادی سُروں کے قائم کئے جانے کے بعد پانچ درمیانی سُر دریافت کرکے بڑھائے گئے اور OCTAVE یا سپتک میں بارہ سُر اس ترتیب سے قائم ہوئے۔

سا رے رے گا گا ما ما پا دھا دھا نی نی

یعنی سا اور پا کے علاوہ باقی پانچ سُروں کی دو دو شکلیں بن گئیں۔ سا اور شُدھ رکھب کے درمیان ایک اور سُر قائم کیا گیا اور اس کا نام کومل یا ملائم یا اُتری رکھب رکھا گیا ہے۔ اس طرح شُدھ رکھب اور شُدھ گندھار کے درمیان کومل گندھار قائم ہوئی۔ شُدھ گندھار اور شُدھ مدھم کے درمیان کوئی سُر قائم نہیں ہوتا۔ بلکہ شُدھ مدھم اور پنچم کے درمیان ایک تیور یا چڑھی کا مدھم سُر قائم کیا گیا ہے۔ پنچم اور شُدھ دھیوت کے

درمیان کومل دھیوت اور شدھ دھیوت اور شدھ نکھاد کے درمیان کومل نکھاد قائم کی گئی۔ ان بارہ سُروں کی اب تین قسمیں ہوگئیں۔

سا اور پا قایم۔ یعنی ان کے اُتر سے چڑھے رُوپ نہیں ہوتے۔

رے گا ما دھا اور نی کے دو دو رُوپ یعنی کومل اور شُدھ جنہیں تیور بھی کہتے ہیں، سوائے مدھم کے کہ شدھ مدھم دراصل کومل ہوتی ہے اور اس کے بعد کی مدھم تیور یا چڑھی یا کڑی کہلاتی ہے۔ اس لحاظ سے ایک سپتک میں دو قایم، پانچ کومل اور پانچ تیور سُر یعنی کُل بارہ سُر ہوتے ہیں۔ ان بارہ سُروں کے مختلف مجموعوں سے راگ ترتیب دئے جاتے ہیں۔ اگر صرف سات سُروں کے مجموعے بنائے جائیں تو COMBINATION کے حسابی قاعدے سے پانچ ہزار چالیس راگ بنتے ہیں مگر تمام مجموعے چونکہ خوش آہنگ نہیں بنتے اس لئے ان کی تعداد بڑی حد تک گھٹ جاتی ہے اور برتاوے میں جو راگ آتے ہیں ان کی تعداد دو سو سے زیادہ نہیں ہے مگر ہمارے ہاں ایسے اُستاد ہیں جنہیں اس سے زیادہ راگ یاد ہیں۔ اُستاد بندو خاں سارنگی نواز کو پانسو راگ یاد تھے۔

راگ چند خوش آہنگ سُروں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ پانچ سُر سے کم کے راگ کو راگ نہیں مانا گیا ہے مگر ہماری موسیقی میں چار بلکہ تین سُر کے راگ بھی موجود ہیں۔ مثلاً مالسری جو صرف سا گا پا ہی میں گایا جاتا ہے۔

نظریاتی طور پر راگ انسانی مزاج کی کسی کیفیت کو پیش کرتا ہے۔ اسی نظریہ کے تحت "رس" کا نظریہ وجود میں آیا، مثلاً شانت رس، شرنگار رس، بھیانک رس، ہانسیا رس وغیرہ یعنی ایسے راگ جنہیں سُن کر سکون حاصل ہو، تعیش و لذت کا تصور پیدا ہو، خوف معلوم ہو، ہنسی آنے لگے وغیرہ۔ اس طرح کے نو رس مانے گئے ہیں جو سُننے والوں میں مختلف جذبات بیدار کرتے ہیں، یا کسی مزاجی کیفیت کو اُبھارتے ہیں۔

پرانی تقسیم کے مطابق چھ راگ اور تیس یا چھتیس راگنیاں مقرر کی گئی تھیں پھر اُن کی بھارجائیں اور پُتر بھی بنائے گئے تھے مگر اس تقسیم میں اختلافات بہت تھے۔ کسی نے چھ راگ کچھ مقرر کئے تو کسی اور نے کچھ اور ہی چھ راگ مقرر کر دیئے۔ اس لحاظ سے یہ تقسیم بالکل بے اصول تھی۔ دوسرے ان راگوں کے ساتھ جو راگنیاں وغیرہ بنائی گئی تھیں اُن کا راگوں سے کسی قسم کا میل ہی نہ تھا۔ کوئی ساٹھ سال اُدھر پٹنہ کے ایک رئیس محمد رضا نے تمام راگوں کو دس ٹھاٹھوں پر تقسیم کیا اور ان ٹھاٹھوں کے تحت اُن تمام راگ راگنیوں کو تقسیم کیا جو سُروں کی مشابہت و مماثلت رکھتی تھیں۔ یہ طریقہ اُصولی ہے اور منطقی بھی مگر قدامت پسندی اور روایت پرستی نے اسے سالہا سال تک رائج نہ ہونے دیا اور پرانی تقسیم ہی پر عمل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ بمبئی کے ایک وکیل بھات کھنڈے نے اسی اُصول کا پرچار کیا اور کتابیں لکھ کر اسے عوام میں رائج کر گیا۔ یہ وہی بھات کھنڈے ہے جس کے نام سے آجکل لکھنؤ میں موسیقی کی بھات کھنڈے یونیورسٹی قائم ہو گئی ہے۔

محمد رضا اور بھات کھنڈے نے پہلے دس راگوں کے ٹھاٹ HEADS قائم کئے ہیں اور پھر ان لوگوں کے سُروں سے میل کھاتے ہوئے راگ اور راگنیاں ان ٹھاٹھوں کے تحت مرتب کی ہیں۔ ان کی جدید تقسیم یہ ہے۔

(۱) کلیان ٹھاٹھ :۔ اس کے سب سُر تیور ہیں۔ اس میں جو راگ راگنیاں شامل ہیں، یہ ہیں : ایمن۔ شدھ کلیان۔ بھوپ کلیان۔ ہمیر۔ کیدارا۔ چھایا نٹ۔ کامود۔ شام کلیان۔ ہنڈول۔ گونڈ سارنگ۔ مالسری۔ یمنی بلاول۔ چندر کانت۔ ساونی کلیان۔ جیت کلیان۔

(۲) بلاول ٹھاٹھ :۔ اس کے سب سُر شدھ ہیں۔ اس میں یہ راگ راگنیاں ہیں :۔ بلاول۔ بہاگ، بھاگرڑا۔ ریسکار۔ پہاڑی۔ ککبھ۔ شنکرا۔ نٹ۔ مانڈ۔ سرپردا۔ الیا۔ گُن کلی۔ سُکل۔ نٹ بلاولی۔ ہنس دھن۔ چاساکھ۔ ہیم۔ درگا۔ نور وچکار ملوہا کیدار۔ دیوگری۔ جلدھر کیدارا۔ پٹ منجری۔

(۳) کھماج ٹھاٹھ :۔ اس کی رکھب، گندھار، مدھم اور دھیوت شُدھ ہے اور نکھادیں دونوں لگتی ہیں۔ اس میں یہ راگ شامل ہیں :۔

کھماج ۔ جھنجھوٹی ۔ سورٹھ ۔ دیس کھماوتی ۔ تلنگ ۔ درگا ۔ راگیری ۔ جے جے ونتی ۔ گوڈ ملار ۔ نٹ ملار ۔ تلک کامود ۔ بڈہنس ۔ کھار ۔ نارنا

(۴) **بھیروں ٹھاٹھ** :۔ اس کی رکھب ، گندھار اور دھیوت کومل ہیں ۔ مدھم شدھ اور نکھاد تیور ہے ۔ راگ راگنیاں اس میں یہ ہیں ۔
بھیروں کا لنگڑا ۔ میگھ رنجنی ۔ سوراشٹر ۔ جوگیا ۔ رام کلی ۔ پربھاوتی ۔ تبھاس گوری ۔ ست پنچم ۔ سادیری ۔ بنگال بھیروں ۔ شیومت بھیروں ۔
گن کلی ۔ بیچ ۔ اہیر بھیروں ۔ زیلیت دیس گونڈ ۔

(۵) **بھیروِیں ٹھاٹھ** :۔ اس کے سب سُر کومل ہیں ۔ راگ راگنیاں یہ ہیں :۔ بھیروِیں ۔ مالکوس ۔ اساوری ۔ دھناسری ۔ بھوپال ۔ زنکو ۔
موٹکی ۔ سدھ سادنت ۔ بسنت کھاری ۔ بلاس خانی ۔

(۶) **اساوری ٹھاٹھ** :۔ اس کی رکھب تیور ، گندھار اور دھیوت کومل ۔ مدھم شدھ ۔ راگ راگنیاں یہ ہیں :۔ اساوری ۔ جونپوری ۔ دیسی ۔
اڈانہ ۔ سندھو ۔ کوسی ۔ درباری ۔ دیسی ۔ کھٹ ۔ ابھیری ۔

(۷) **ٹوڈی ٹھاٹھ** :۔ اس کی رکھب ، گندھار اور دھیوت کومل ہے ۔ مدھم تیور ، اور نکھاد شدھ ہے ۔ راگ راگنیاں یہ ہیں ۔ ٹوڈی ، گوجری
میاں کی ٹوڈی ۔ ملتانی ۔ بہادری ٹوڈی ۔

(۸) **پوربی ٹھاٹھ** :۔ اس کی رکھب اور دھیوت کومل ہے ۔ گندھار ، مدھم اور نکھاد تیور ہے ۔ راگ راگنیاں یہ ہیں :۔ پوربی ۔ گوری ۔ ردا
ببھاس ۔ دیپک ۔ ترہبنی ۔ مالوی ۔ سری راگ ۔ جیت سری ۔ بسنت ۔ پرج ۔ دھناسری ۔ پوریا دھناسری ۔ ہنس نارائن ۔

(۹) **ماروا ٹھاٹھ** :۔ اس کی رکھب کومل اور گندھار ، مدھم ، دھیوت اور نکھاد تیور ہیں ۔ راگ راگنیاں یہ ہیں :۔ ماروا ۔ پوریا ۔ سوہنی
براری ۔ جیت ۔ بھکار ۔ بھٹیار ۔ بھاس ۔ ساج گری ۔ مالی گورا ۔ پنچم ۔

(۱۰) **کافی ٹھاٹھ** :۔ رکھب اور مدھم شدھ ہیں ۔ گندھار اور نکھاد کومل ، اور دھیوت تیور ہے ۔ راگ راگنیاں یہ ہیں :۔ سیندورا ۔
دھنانی ۔ بھیم پلاسی ۔ بہار ۔ مدھ ماد ۔ باگیسری ۔ حسینی کانہرا ۔ میگھ ملار ۔ رام داسی ملار ۔ میاں کی ملار ۔ سوہا ۔ نیلامبری ۔ سُوہو ۔
بردیپکی ۔ شہانہ ۔ دیو ساکھ ۔ ہنس کنکنی ۔ بندرابنی ۔ پیلو کوسی کانہرا ۔ نائکی کانہرا ۔ میاں کی سارنگ ۔ سگھرئی ۔ شدھ سارنگ ۔ برداون
سارنگ ۔ سری رنجنی ۔ لنکہ دہن ۔

ہماری کلاسیکل موسیقی ایک نہایت دقیق فن ہے ۔ ان بارہ بنیادی سروں کے علاوہ بھی درمیانی چھوٹے سُر ہوتے ہیں جنہیں سُرتیاں
( MICROTONES ) کہتے ہیں ۔ یہ سُرتیاں ہمارے گانے بجانے میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ ہمارے راگ راگنیاں اسی وقت پورا
لطف دکھاتی ہیں جب مقررہ بنیادی سُروں کو گھلا ملا کر بنایا جائے اور مفید صوت کو برتا جائے یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ سُرتیوں کو برتا
جائے ۔ بعض لوگ کے چند ۔ مقررہ بنیادی سُروں سے ہٹے ہوتے ہوتے ہیں اور ان کا صحیح مقام کسی سُرتی پر ہوتا ہے ۔ مثلاً ، بارہ کی گندھار ، اور
دھیوت پرانی تقسیم کے مطابق پوری سپتک کو بائیس سُروں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ اس طرح :۔

سا رے گا ما پا دھا نی

۴ ۳ ۲ ۴ ۴ ۳ ۲ = ۲۲

مگر موجودہ سائنس کے ترقی یافتہ دور میں یہ تقسیم غلط ثابت ہو چکی ہے ایک سُر سے دوسرے سُر تک جانے میں نظریاتی طور پر بیسیوں
مقام ہو سکتے ہیں موجودہ زمانے میں صرف تین سُرتیوں کا تسلیم کیا گیا ہے جنہیں کوئی انسانی تمیز کر سکتا ہے ۔ اس معیار سے اگر ہم اپنی سپتک
کو سُرتیوں میں تقسیم کریں تو اس کا بھی دارومدار انفرادی صلاحیت پر ہوگا کیونکہ ہر شخص کی صلاحیت کم و بیش کا نہ ہوتی ہے

تک امتیاز کر سکے گا اور کوئی دس بارہ تک۔ تاہم سا اور پا چونکہ قائم سُر ہیں اُن کو چھوڑنے کے بعد بقیہ دس سُروں کے لیے کم سے کم چار چار سُرتیوں کی گنجائش رکھنی چاہیئے۔ یوں ان دس سُروں کی سُرتیوں کی تعداد چالیس ٹھہرتی ہے۔ ان میں دو سُرتیاں سا اور پا کی شامل کر لی جائیں تو کل تعداد بیالیس سرتیوں کی ایک سپتک میں ہوگی۔

سُروں کی نزاکتوں اور لطافتوں کے علاوہ ہماری کلاسیکی موسیقی میں بڑی ترقی یافتہ صورت تال اور لَے کی ہے۔ عالمی موسیقی میں دو چار تالوں کے علاوہ اور کوئی تال نہیں ہے مگر ہمارے ہاں بے شمار تالیں ہیں۔ مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ اور ان تالوں اور ٹھیکوں کو بھی ماتروں اور رتیوں سے تقسیم کیا گیا ہے۔ دربارِ اکبر کے عظیم فنکار، میاں تانسین نے ۹۶ تالیں گانے بجانے کے لئے انتخاب کی تھیں مگر فی زمانہ ہماری سہل پسندی کی وجہ سے تقریباً بارہ تالیں عام رواج میں ہیں اور اُستادوں کے برتاوے میں بیس بائیس۔ ان میں بھی بعض تالیں مخصوص طریقوں سے وابستہ ہیں۔ مثلاً چوتالہ اور دھمار، دھرپد اور ہوری سے۔ جھومرا اور تلواڑا، خیال سے۔ دیپ چندی اور پنجابی ٹھمری سے۔ دادرا اور کہروا، دادرے غزل اور گیت سے۔

ہماری موسیقی مجموعہ ہے ترکیبوں (FORMS) کا۔ مختلف زمانوں میں مختلف طریقے یا ڈھنگ ایجاد ہوتے اور رواج پاتے رہے۔ ان کے نام یہ ہیں :۔ (۱) الاپ (۲) دُھرپد (۳) خیال (۴) ٹپّہ (۵) ٹھمری (۶) دادرا (۷) قوّالی (۸) غزل (۹) گیت اور (۱۰) لوک گیت۔

(۱) الاپ :۔ الاپ گونگا گانا ہے۔ جب انسان خوش ہوتا ہے تو وہ گنگنانے لگتا ہے۔ یا جب اُسے کوئی بڑا غم لاحق ہوتا ہے تو وہ واویلا کرنے لگتا ہے۔ اس کیفیت میں صرف کوئی دُھن ہوتی ہے، الفاظ نہیں ہوتے۔ اس بے لفظ کے گانے کو فنی شکل دے کر اس کا نام الاپ رکھا گیا۔ اور اس کے لئے چند بے معنی بول بھی مقرر کر دیئے گئے تاکہ سُننے والوں کے لئے محض آ آ اجیرن نہ ہونے پائے۔ مثلاً اے، تی، نا، نوم، توم وغیرہ۔ الاپ میں راگ کے سُروں کو وضاحت سے پیش کیا جاتا ہے، سُروں کی بڑھت بتدریج کی جاتی ہے۔ گانے کی رفتار (TEMPO) سست سے شروع ہوتی ہے پھر اوسط اور پھر تیز۔ الاپ میں چونکہ بول اور تال کی قید نہیں ہوتی۔ صرف سُر اور "لَے" ہوتی ہے۔ اس لئے راگ کی مکمل پاکیزگی صرف اسی طریقے میں ظاہر ہوتی ہے۔ گانے والے اور سُننے والے دونوں کی توجہ خالص راگ کی طرف لگی رہتی ہے۔ بول اور تال ہوتے تو اُن کی طرف بھی دھیان جاتا۔

(۲) دُھرپد :۔ جب گانے میں الفاظ داخل ہوئے تو تال اور لَے کی قید سے کلام موزوں وجود میں آیا اور ترقی پا کر دھورو، چھند، پد، کبت اور دوہا کہلایا۔ موسیقی نے جب ترقی کی تو گانے میں شاعری بھی داخل ہو گئی۔ مجلسوں اور درباروں میں پہنچنے کے بعد فنی خوبیوں میں اضافہ ہونے لگا۔ عام گانوں نے خاص خاص رُوپ دھارنے شروع کر دئے چنانچہ دھورو اور پد کے امتزاج سے "دُھرپد" پیدا ہوا اور اگلے زمانے کے اُستادوں نے اس کے علمی اصول مقرر کئے۔ دُھرپد کے چار تُک یا حصے ہوتے ہیں : استھائی، انترہ، سنچائی اور ابھوگ۔ اس کے لئے تالیں بھی مخصوص ہیں۔ مثلاً چوتالہ، سُول فاختہ، جھپ تالہ وغیرہ۔ دُھرپد ایک خاص قسم کا مردانہ گانا ہے جس میں حمد و ثنا اور شجاعت کے کارنامے یا دیوتاؤں کی توصیف کی جاتی ہے۔ جب دُھرپد جھپ تال میں گایا جاتا ہے تو "سادرہ" کہلاتا ہے اور جب دھمار میں گایا جاتا ہے تو "ہوری" کہلاتا ہے۔ دُھرپد کی ترقی اکبرِ اعظم کے زمانے میں ہوئی۔ تانسین، بلاس خاں، رنگ خاں، لعل خاں وغیرہ نے اسے چار چاند لگائے۔ شاہ جہاں کے دَورِ سلطنت تک دُھرپد کا عروج رہا۔ سورج خاں، چاند خاں اور کم و بیش دو سو موسیقاروں نے اس صنعت میں اپنے اپنے کمالات شامل کئے۔

(۳) خیال :۔ پندرھویں صدی میں جونپور کے شاہانِ شرقیہ میں سے سلطان حسین شرقی نے ایک نئے ڈھنگ کا گانا ایجاد کیا اور اس کا

نام "خیال" رکھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی میں حضرت امیر خسروؒ نے منجملہ دیگر اختراعات کے "خیال" بھی ایجاد کیا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ طریقہ امیر خسرو ہی نے وضع کیا ہو مگر خیال کی ترویج و ترقی کا سہرا سلطان حسین شرقی ہی کے سر ہے۔ خیال کو شروع میں دُھرپد ہی کے کینڈے پر بنایا گیا تھا۔ اس کے بھی وہی چار تُک یا حصے رکھے گئے تھے جو دُھرپد کے ہوتے ہیں۔ بعد میں صرف استھائی اور انترہ باقی رہ گیا اور سنچائی اور ابھوگ کو خارج کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ دُھرپد اور خیال میں نمایاں فرق تانوں کا رکھا گیا۔ دُھرپد میں تانیں نہیں ہوتیں۔ تان کی صرف ایک شکل دُھرپد میں ہوتی ہے اور وہ گمک کہلاتی ہے۔ فن کاروں کا کہنا ہے کہ یہ تان ناف کے زور سے لی جاتی ہے یعنی دُھرپد پیٹ کا زور لگا کر گایا جاتا ہے۔ خیال میں سینکڑوں قسم کی تانیں ہوتی ہیں جن سے گانے کی خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔ خیال کا گانا سینہ کا گانا کہلاتا ہے۔ خیال کے لیئے نئی نئی تالیں وضع کی گئیں اور ان کی تعداد اتنی بڑھی کہ شمار سے باہر ہو گئی۔ آجکل رواج میں صرف دس بارہ تالیں ہیں۔ خیال کے عروج کا زمانہ محمد شاہ بادشاہِ دہلی کا زمانہ ہے۔ ایجاد ہو جانے کے باوجود خیال کا چراغ تین سو سال تک دُھرپد کے آگے نہ جل سکا۔ آخر محمد شاہ کے دو درباری فن کاروں نے خیال کو اتنا فروغ دیا کہ دُھرپد ماند پڑ گیا۔ شاہ سدا رنگ اور شاہ ادا رنگ کی بنائی ہوئی چیزیں آج بھی فخر کے ساتھ گائی جاتی ہیں، بلکہ راگ کی صداقت میں بطور سند پیش کی جاتی ہیں۔ مغل شہنشاہوں کی سرپرستی آخر تک جاری رہی، یہاں تک کہ بہادر شاہ ظفر آخری تاجدارِ دہلی نے بھی، جو فی الحقیقت نام ہی کے بادشاہ رہ گئے تھے، بے شمار موسیقاروں کو اپنے دربار سے وابستہ کر رکھا تھا۔ اُن میں تان رس خاں نے وہ شہرت پائی کہ برِ عظیم کا بیشتر شمالی علاقہ اُنہی کے حلقۂ تلمذ میں داخل سمجھا جاتا ہے۔ خود بادشاہ بھی خیال ٹھمریاں بناتے تھے اور ان میں تخلص شوخ رنگ کرتے تھے۔

(۴) ٹپہ :۔ ہماری کلاسیکل موسیقی نے عوامی گیتوں ہی سے ترقی کر کے اعلیٰ شکل پائی ہے۔ پنجاب کے عوامی گانوں میں سے ایک کا نام "ٹپہ" کہلاتا ہے۔ یہ ساربانوں کا گانا تھا جسے ترقی دے کر میاں شوری نے کلاسیکل درجہ دیا۔ یہ تیز تانوں کا گانا ہوتا ہے۔ جس کا ہر بول تان میں بندھا ہوتا ہے۔ دربارِ اودھ نے میاں شوری اور ٹپّہ کی سرپرستی کی، اور ایک زمانے میں ٹپّہ کی ہردلعزیزی کے آگے خیال کا رنگ بھی پھیکا پڑ گیا تھا مگر ٹپّہ چونکہ ایک چھوٹا سا خوشنما تانوں کا گلدستہ ہوتا ہے اس لئے خیال کی عظمت کے آگے زیادہ فروغ نہ پا سکا۔ اگر خیال کو پوری آتش بازی سے تشبیہہ دی جائے تو ٹپّہ کو ہم صرف ایک پھلجڑی کہہ سکتے ہیں۔

(۵) ٹھمری :۔ دربارِ شاہانِ اودھ میں جب مردانگی کو زوال اور نسوانیت کو عروج ہُوا اور بادشاہ اور رعایا کے اعصاب پر عورت سوار ہو گئی تو ٹھمری نے جنم لیا۔ ساخت تو ٹھمری کی بھی خیال ہی کی طرح کی ہے یعنی اس میں بھی استھائی اور انترہ ہوتا ہے، مگر اس کے گانے کا ڈھنگ جُداگانہ ہے۔ ٹھمری خالصتاً عورتوں کا گانا ہے۔ اس میں ایک خاص قسم کا لوچ ہوتا ہے۔ ہر بول، بنا کر، نہ صرف گایا جاتا ہے بلکہ اس کے ساتھ بھاؤ بھی بتایا جاتا ہے، یعنی بول کی تصویر ہاتھوں، آنکھوں، ابروؤں اور اُوپر کے دھڑ کی نازک جنبشوں سے پیش کی جاتی ہے، اُن کی وجہ سے ٹھمری گانے کا لطف ہزار گُنا زیادہ ہو جاتا ہے۔ ایک ہی بول کو طرح طرح سے (ILLUSTRATE.) کیا جاتا ہے، اور نئی سے نئی تعبیریں کی جاتی ہیں۔ عورتوں کی دیکھا دیکھی مردوں نے بھی ٹھمریاں گانی شروع کر دیں مگر چونکہ نرت بھاؤ بتانے کی گنجائش مردوں کے لئے نہیں تھی اس لئے اچھے فنکاروں نے اس میں یہ کمال پیدا کیا کہ محض آواز کے مختلف اندازوں سے اس کمی کو پورا کر دیا۔ لَے بھی اس کی ایسی رکھی جس میں لوچ لچک ہو، مثلاً چاچر یا پنجابی وغیرہ۔ بول ایسے بنائے گئے جن سے جسمانی لذت کا احساس ہو۔

(۶) **دادرا**: یہ پوربی زبان کا گانا ہے جس کی لے برابر کی رکھی گئی یعنی تال' دادرا یا کہروا۔ منظر کشی یا شاعری میں بھی دیہاتی ماحول کو پیش نظر رکھا گیا۔ جسمانی لذت کا عنصر اس میں بھی ہے۔ ٹھمری اور دادرے کے لئے راگ بھی مخصوص ہیں۔ یہ دونوں طریقے پورب سے وابستہ ہیں اور ہماری نیم کلاسیکی موسیقی (SEMICLASSICAL) میں شمار کئے جاتے ہیں۔

(۷) **قوالی**: خاص مسلمانوں کا گانا ہے جو اہلِ فارس کے ساتھ ہندوستان میں رائج ہوا۔ امیر خسروؒ نے اسے ایک نیا انداز دیا اور ہمارے صوفیائے کرام نے قوالی کو تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب کا ذریعہ قرار دیا۔ امیر خسروؒ کو موجودہ موسیقی کا بابا آدم سمجھنا چاہیئے۔ امیر خسروؒ ایک عجیب و غریب (GENIUS) تھے۔ ان کی شخصیت پہلودار تھی۔ انہوں نے گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا، سات بادشاہوں کے مشیر و وزیر رہے۔ پانچ لاکھ شعر فارسی میں کہے اور "طوطیٔ ہند" کہلاتے۔ اردو زبان کے مؤسس بھی خسروؒ ہی ہیں۔ ان کی پہیلیاں کہہ مکرنیاں، دو سخنے اور لطیفے آج تک زبان زدِ خلائق ہیں۔ علاء الدین خلجی کے دربار میں جب اُن کا مقابلہ جگت گرو نایک گوپال سے ہوا تو اُسے نیچا دکھانے کے لئے انہوں نے دھرپد کے مقابلے میں طرح طرح کی اختراعیں اُسے سنائیں۔ نایک گوپال ان کی موسیقانہ ذہانت کو دیکھ کر اتنا مرعوب ہوا کہ اُن کا شاگرد ہو گیا۔ امیر خسرو کی اُن اختراعات میں سے قول، قلبانہ، نقش، گل، ہوا، بسیط، سوہلہ، ترانہ، تروٹ اور منڈھا اب بھی ہماری موسیقی کی مایۂ ناز (FORMS) سمجھی جاتی ہیں۔ قول ہی سے قوال اور قوالی کے الفاظ مشتق ہیں۔ بعد میں قوالی ایک مخصوص قسم کا گانا بن گیا جس میں متصوفانہ کلام گایا جانے لگا اور الفاظ اور مصرعوں کی تکرار سے تاثر پیدا کیا جانے لگا۔ اہلِ دل پر اس گانے کا اتنا اثر ہوتا ہے کہ ان پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے بلکہ اکثر تواجد میں جان تن سے جدا بھی ہو گئی، جیسا کہ روایت ہے کہ ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را — ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

پر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ پر تین دن تک حال کی کیفیت طاری رہی اور اسی شعر پر آخر اُن کا مرغِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔

قوالی [illegible] کا نہیں بلکہ قوالی [illegible] ہوتا ہے جس میں آٹھ دس تن تار شریک ہوتے ہیں۔ ڈھولک کی تھاپ اور تالیوں کی ضرب سے روح میں عجیب کیفیت پیدا ہوتی ہے اور الفاظ کی تکرار سے ایک سماں بندھ جاتا ہے۔ آجکل قوالی میں متصوفانہ کلام کے علاوہ عاشقانہ غزلیں بھی گائی جاتی ہیں۔

(۸) **غزل**: غزل سرائی بھی ملکِ فارس سے ہمارے ملک میں مسلمانوں کے ساتھ آئی۔ فارسی شاعری کے تتبع میں اُردو شاعری میں بھی غزل کا رواج ہوا اور یہ صنفِ شعر اتنی مقبولِ خاص و عام ہوئی کہ مشاعروں کی مجلسیں اور غزل سرائی کی محفلیں سجنے لگیں۔ ہماری مجلسی زندگی میں مجرے کا دستور بھی غزل ہی سے ہوا۔ مجرے میں ایک طائفہ ہوتا ہے جس میں مُغنّیہ گاتی ناچتی اور رنگت بھاؤ دکھاتی ہے۔ اس کے ساتھ اس کے سفردا ہوتے ہیں جن میں دو سارنگی نواز، ایک طبلہ نواز اور ایک مجیرے بجانے والا ضرور ہوتا ہے۔ بعد کے زمانے میں حسبِ ضرورت اور ساز بجانے بھی شریک کر لئے گئے۔

(۹) **گیت**: گیت یوں تو پیدائش سے موت تک ہر زمانے اور ہر موقع پر گائے جانے کا رواج چلا آتا ہے لیکن انہیں فروغ تھیٹر سے ہوا اور اس سے زیادہ فلم سے اور فلمی گیتوں نے تو اب اتنی ترقی کر لی ہے کہ ان میں مغربی دھنیں بھی حسبِ گنجائش داخل ہونے لگیں۔ اس زمانے میں کہ فاصلوں کی طنابیں کھنچ گئی ہیں ترکی، مصری، عربی، ایرانی، تورانی موسیقی کے انداز بھی ہماری موسیقی میں

گھلتے ملتے جاتے ہیں۔ مغربی سازوں نے بھی ہماری فلمی موسیقی میں جگہ پالی ہے۔ مغربی دھنیں مثلاً رمبا اور سمبا نے مقبولیت حاصل کرنی شروع کر دی ہے۔

(۱۰) **لوک گیت** یہ یا عوامی گیت ہمارے دیہاتوں کی وسیع آبادی کے گیت ہیں جن میں دیہاتی زندگی اور قدرتی مناظر کا دل دھڑکتا ہے۔ یہ گیت اگرچہ فنی لطافتوں سے عاری ہوتے ہیں مگر اُن کی سادگی میں وہ لطف ہوتا ہے جو ہماری ترقی یافتہ پُرکاری میں بھی کم ہوتا ہے۔ سرحد کا ٹپہ، لوبھا۔ پنجاب کا ماہیا، ہیر، مرزا صاحباں، سندھ کا رانو، کوہیاری اور جموں کی پہاڑی وغیرہ اتنی دلکش دھنیں ہیں کہ ہمارے مجلسی راگ جو صدیوں سے نکھرتے چلے آ رہے ہیں اُن کے آگے پھیکے پڑ جاتے ہیں اور ہاں یہ ہم ہمیں نہ بھولنا چاہیئے کہ ہماری ترقی یافتہ موسیقی کی جڑ انہی لوک گیتوں میں ہے۔ یہی لوک گیت اس شاندار عمارت کی بنیاد ہیں جسے ہم پاکستانی موسیقی کا محل کہتے ہیں۔ یہ وہ کھڑ ہے جس میں سے قیمتی پتھر نکالے جاتے ہیں اور علم و فن کی سان پر چڑھا کر موسیقی کے وہ جواہر تراشے جاتے ہیں جو ہماری کلاسیکی موسیقی کے رتن سمجھے جاتے ہیں۔

ہماری موسیقی کی ایک اور ایسی خصوصیت ہے جو شاید دنیا کی کسی اور موسیقی میں نہ پائی جاتی ہو۔ ہماری موسیقی میں گھرانے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ گھرانے کسی بڑے استاد کی وجہ سے قائم ہوئے۔ مثلاً دلّی والوں کا گھرانہ، آگرہ والوں کا گھرانہ، گوالیار والوں کا گھرانہ، پٹیالہ والوں کا گھرانہ، تل ونڈی والوں کا گھرانہ، کولھا والوں کا گھرانہ، کرانہ والوں کا گھرانہ، بہرام خاں کا گھرانہ۔ ان گھرانوں کو (SCHOOLS OF MUSIC) سمجھئے۔ ان گھرانوں کے افراد اور شاگرد چونکہ ایک اُستاد سے سیکھتے ہیں یا اُستاد کے شاگردوں سے سیکھتے ہیں اس لئے ان کے گانے کے اُسلوب یا اسٹائل دوسرے گھرانے والوں سے یکسر جُدا ہوتے ہیں۔ ہر فن کار کسی نہ کسی بڑے گھرانے سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متعلق ہوتا ہے۔

جب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فلاں آرٹسٹ آگرہ والوں کے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے تو اس کے گانے کا ڈھنگ فوراً ذہن میں آجاتا ہے۔ راگ اور تال میں تو کوئی فرق ڈال ہی نہیں سکتا۔ صرف اس کی ادائیگی (EXECUTION) اور اس کے پیش کرنے کے انداز ——— (TREATMENT) میں بیّن فرق دکھائی دے گا۔ اس کی بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہماری موسیقی لکھی نہیں جاتی یا اگر لکھی جاتی بھی ہے تو اس کی صحیح ادائیگی صرف اُستادوں ہی سے سیکھی جا سکتی ہے۔ ہماری موسیقی کتابوں سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔ یہ علم و فن صدیوں سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس لئے جو فن کار بھی تیار ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی گھرانے کی گائیکی گاتا ہے۔ دلّی چونکہ ہمیشہ دارالسلطنت رہی اس لئے دربار میں نامی گانے بجانے والے کھنچ کر آ گئے تھے۔ دلّی کا سب سے بڑا آخری فنکار تانّ رس خاں ہے جس کا شاگرد در شاگرد تقریباً سارا شمالی برِّعظیم ہے۔ آگرہ کے گھرانے میں آفتابِ موسیقی اُستاد فیاض خاں جیسا گائیک پیدا ہُوا۔ جسے جیتے جی بعض لوگوں نے تہادیو کا رُوپ سمجھا۔ پاکستان میں اس گھرانے کے سپوت اُستاد اسد علی خاں ہیں۔ گوالیار والوں میں بدّھو خاں نے نام پیدا کیا اور تان رس خاں دلّی والے کے مقابلے میں گاتے۔ پٹیالہ والوں کا گھرانہ فتح علی اور علی بخش کی گائیکی سے مشہور ہُوا جو اپنے گانے کی تیاری کی وجہ سے جرنیل اور کرنیل کہلاتے۔ اسی گھرانے سے عاشق علی خاں، بڑے غلام علی خاں اور رفیق غزنوی جیسے زبردست گائیک وابستہ ہیں۔ تل ونڈی والوں کا گھرانہ دھرپدیوں کا گھرانہ تھا۔ افسوس کہ اب اس گھرانہ کا کوئی قابلِ ذکر فرد باقی نہیں۔ کولھاپور کے گھرانے کے کرتا دھرتا اُستاد اللہ دیئے خاں تھے جن کے سینکڑوں شاگرد اُن کے نام کو روشن کر رہے ہیں۔ کرانہ والوں میں دو نامی گویے پیدا ہُوئے ایک عبدالکریم خاں اور دوسرے عبدالوحید خاں۔ عبدالکریم خاں جتنے خوش آواز تھے اُتنے ہی بد گُو اُستاد عبدالوحید خاں تھے مگر انہوں نے ریاض سے اپنی گائیکی ایسی تیار کی تھی کہ آج اُن کے نام سے اُن کے گھرانے کا نام قائم ہے۔ اسی گھرانے کی دو یادگاریں ہیرا بائی بڑودکر اور روشن آرا ہیں۔ روشن آرا وہ مغنیّہ ہے جس پر مومن خاں کا یہ شعر صادق

آتا ہے سو

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک        شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

پاکستان کو روشن آرا بیگم پر فخر ہے کہ پورے ہندوستان و پاکستان میں اُن کا جواب نہیں ہے۔ بہرام خاں کا گھرانہ دھرپدیوں کا گھرانہ ہے۔ اس کے دو بڑے فن کار اللہ بندے اور ذاکر الدین تھے۔ ان کے بعد نصیر الدین خاں نے بہت کمال اور نام پیدا کیا۔ آجکل رحیم الدین خاں، حسین الدین خاں اور اُن کے بھتیجے نصیر معین الدین اور نصیر امین الدین اس گھرانے کی یادگار ہیں۔ رامپور والوں میں مشتاق حسین خاں، اشتیاق حسین خاں اور سخاوت حسین خاں نے خوب شہرت پائی۔ دلّی کے گائیکوں میں اُستاد چاند خاں، اُستاد رمضان خاں اور اُستاد اُمراؤ خاں نے اچھا نام پایا۔ اُمراؤ خاں اُستاد بندو خاں سارنگی نواز کے بیٹے ہیں اور اپنے باپ کی طرح سارنگی بجانے میں بھی انہوں نے کمال حاصل کیا ہے۔ سندھ میں اُستاد مبارک علی خاں اور اُستاد اُمید علی خاں کے دم سے ہدو، ہسو خاں کی گائیکی زندہ و تابندہ ہے۔

پاکستان میں کلاسیکی اور ہلکی موسیقی کے بے شمار فن کار ہیں۔ ہم نے طوالت سے بچنے کے لئے صرف مُشتے نمونہ از خروارے گنتی کے نام پیش کئے ہیں۔

گلوئی موسیقی کے علاوہ سازی موسیقی میں بھی مسلمان فن کار ہی پیش اور پیش پیش رہے ہیں۔ ان میں سے چند کے نام ہم سازوں کے ساتھ ساتھ لیں گے۔

ہمارے ہاں گانے بجانے کی نوعیت عالمی موسیقی سے کچھ علیحدہ ہی رہی ہے۔ ہمارے ہاں ایک ہی فنکار گاتا ہے یا کوئی ساز بجاتا ہے۔ ٹولیاں بنا کر کلاسیکی موسیقی نہیں گائی جاتی اور نہ آرکسٹرا کا ہمارے ہاں رواج رہا ہے مگر اب ریڈیو کی وجہ سے آرکسٹرا بھی تیار ہو گیا۔ دراصل ہماری موسیقی کا مزاج ہی اتنا نرم و نازک ہے کہ اس میں زیادہ شور کی گنجائش نہیں ہے۔ ساز ہمارے ہاں ہمیشہ سے اکیلے بجتے چلے آئے ہیں۔ سازوں کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ غالباً اس کمی کی وجہ ہماری قدامت پسندی اور روایت پرستی بھی ہے۔ ہمارے فن کار اسے بُرا سمجھتے ہیں کہ اگلے اُستادوں نے جو کچھ چھوڑا ہے اس پر کچھ بڑھایا جائے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارا کلاسیکی فن جامد (STATIC) ہو کر رہ گیا ہے مگر اس سے یہ فائدہ ضرور ہُوا کہ راگ راگنیاں اپنی صحیح شکل میں قائم رہیں۔ اگر ان میں تحریف کی اجازت ہوتی (جسے موسیقار جدت سمجھتے ہیں) تو آج ہماری کلاسیکی موسیقی کی شکل مسخ ہو چکی ہوتی۔ ہماری کلاسیکی موسیقی ایک ساکت و جامد فن ہوتے ہوئے بھی ایک عظیم فن ہے، اور اس کی عظمت کا یہ ثبوت کیا کم ہے کہ آپ جب بھی کوئی راگ سُنتے ہیں وہ نیا لُطف دیتا ہے حالانکہ وہ راگ آپ کا ہزاروں دفعہ کا سُنا ہُوا ہوتا ہے۔ آجکل کے فلمی گانوں نے بے انتہا جدت طرازیوں اور دلپذیریوں کے باوجود کوئی مستقل حیثیت اختیار نہیں کی۔ ان کی حیثیت وقتی اور بہت کم عمر ہوتی ہے۔ وہ فلمی گانا جو بچے بچے کی زبان پر ہوتا ہے چند مہینے بعد ایسا فراموش ہو جاتا ہے گویا کبھی اس کا وجود ہی نہیں تھا۔ اسی سے ان کی موسیقانہ بے بضاعتی ظاہر ہے۔

ہمارے سازوں میں سب سے پُرانا ساز "قانون" ہے۔ کہتے ہیں کہ اسے فیثا غورث نے ایجاد کیا تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ یہ ساز اس سرزمین پر آیا۔ اسے چھوٹی چھوٹی چوبوں سے بجایا جاتا ہے۔

بین یہاں کا پُرانا ساز ہے۔ اس کی کئی قسمیں ہیں مگر اس صدی میں عبدالعزیز خاں نے جو وچتر بین اختراع کی وہ اُن تمام پرانی بینوں پر فوقیت لے گئی۔ وچتر بین شیشے کے بٹے سے بجائی جاتی ہے۔ اس کی آواز نہایت شیریں اور واضح ہوتی ہے۔ نادر بین، سرسوتی بین اور مدراسی بین اس وچتر بین کے آگے ہیچ ہوتی جا رہی ہیں۔ آجکل اُستاد حبیب علی خاں اور محمد شریف پونچھ والے بڑی بین بجانے

میں منفرد سمجھے جاتے ہیں۔ رفیق غزنوی نے بھی بڑا بین بجانے میں اچھا نام پیدا کیا ہے۔

قدیم ہندوستان کی بین میں پردے ڈال کر امیر خسروؒ نے ستار ایجاد کیا تھا۔ ابتدا میں اس کے صرف تین تار تھے، جس کی وجہ سے اس کا نام سہ تار رکھا جو بعد کو ستار ہو گیا اور اس میں بیسیوں تار باج کے طربوں کے لگ گئے۔ نسبتاً آسان اور خوش آواز ہونے کی وجہ سے ستار نے بین کے مقابلے میں بہت جلد مقبولیت حاصل کر لی۔ زمانۂ حال میں عنایت خاں اور ولایت خاں نے ستار بجانے میں کمال حاصل کیا۔ آج بے شمار اچھے ستار بجانے والے موجود ہیں، جن میں محمد شریف اور کبیر خاں کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ سراج احمد قریشی نے ستار اور رباب ملا کر ایک نیا ساز ایجاد کیا ہے جس کا نام انہوں نے فردوسِ بہار رکھا ہے۔

رباب دراصل صوبۂ سرحد کا باجا ہے مگر ہمارے فن کاروں نے اس میں طرح طرح کی اختراعیں کر کے اسے ایک کلاسیکی ساز بنا دیا۔ اس کی ترقی یافتہ شکل سرود ہے جس کے نامی فنکار اُستاد علاؤالدین خاں، اُستاد علی اکبر اور اُستاد حافظ علی خاں ہیں۔ یہ ساز یورپی ساز مینڈولن اور گٹار کے مقابلے میں زیادہ خوش آواز ہوتا ہے۔

گز سے بجائے جانے والے سازوں میں ہمارا قدیم ترین ساز سارنگی ہے۔ یہ نہایت مشکل ساز ہے۔ یہ گھسنے سے بجتی ہے۔ تانت کے پہلو میں ناخن ملا کر رکھے جاتے ہیں اور ان کے گھسانے سے سُر اترتے چڑھتے ہیں۔ صدیوں تک یہ ساز ایک ہی شکل میں رہا۔ قدوقامت میں البتہ بڑا چھوٹا ہوتا رہا مگر اس صدی میں دلی والے اُستاد بندو خاں سارنگی نواز نے اس ساز کی ہیئت میں تبدیلی کی اور طرح طرح کی سارنگیاں بنا کر تجربے کئے۔ آخر میں انہوں نے موٹے بانس کی سارنگیاں اپنے لئے بنوائی تھیں اور اُن پر تانت کے بدلے فولاد کے تار چڑھائے تھے۔ اسے بھی بجانے کا اُصول تو وہی پرانا تھا مگر اس کی آواز میں نمایاں فرق آگیا تھا۔ بجانے کے طریقے میں بھی اُستاد بندو خاں نے جدتیں کی تھیں۔ انہوں نے سارنگی میں دوسرے سازوں کا باج بھی داخل کیا تھا۔ مثلاً رباب، دلربا، بین، طبلہ، سب کے نقشے اپنے بانس میں اُتار لئے تھے۔ وہ گھسنے سے بھی سارنگی بجاتے تھے اور اُنگلیوں کی ضرب (TAPPING) سے بھی۔ بندو خاں صاحب نے سارنگی کو سورنگی بنا دیا تھا اور اس کے بجانے میں ایسا کمال پیدا کیا تھا کہ ایسا باکمال فن کار صدیوں سے پیدا نہیں ہوا تھا۔ اب بھی جس ڈھنگ سے وہ سارنگی بجاتے تھے وہ ڈھنگ صرف اُن کے بیٹے اور جانشین اُستاد امراؤ خاں کو آتا ہے۔ اُستاد بندو خاں سارنگی کے جادوگر کہلاتے تھے۔ افسوس کہ حال ہی میں کراچی میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ فلوسا خاں، حامد حسین اور نتھو خاں پاکستان کے مایہ ناز سارنگی نواز ہیں۔

دلربا، ستار اور سارنگی کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ اس کا زیادہ رواج مشرقی پاکستان کی طرف ہے مگر آسان ہونے کی وجہ سے یہاں بھی اس کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ ستار کی طرح اس میں پردے ہوتے ہیں مگر مضراب کے بدلے اسے گز سے بجایا جاتا ہے۔ اسے اسراج بھی کہتے ہیں۔ اس کے اُستاد بھائی لال ہیں۔

پھونک سے بجائے جانے والے سازوں میں سب سے قدیم ساز شہنائی ہے جو دراصل سینائی ہے کیونکہ اس کے موجد حکیم بوعلی سینا تھے۔ یہ نفیری کی شکل کا ساز ہے جس کا بجانا مشکل ہے۔ بجانے کا اُصول وہی ہے جو معمولی بانسری کا۔ بسم اللہ خاں نے شہنائی بجانے میں کمال حاصل کیا ہے۔

ضرب سے بجائے جانے والے سازوں میں جل ترنگ ایک عجیب ساز ہے۔ اسے امیر خسروؒ کی اختراع بتایا جاتا ہے۔ بیس بائیس چینی کے پیالے اس طرح نیم دائرہ بنا کر رکھے جاتے ہیں کہ ان کا قدوقامت کم ہوتا جاتا ہے پھر اُن میں پانی ڈال ڈال کر اُن کے سُر سپتک کے حساب سے قائم کئے جاتے ہیں۔ دونوں ہاتھوں میں دو چوبیں لے کر پیالے کی لگر پر مارنے سے سُر کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ ان پیالوں کو

اس طرح بجایا جاتا ہے کہ ان سے ہر دُھن پیدا ہو سکتی ہے۔ پیالوں اور پانی کی دُشواری سے بچنے کے لئے نل ترنگ اور لکڑ ترنگ وغیرہ بھی ایجاد کئے گئے ہیں۔

تال کے سازوں میں ہمارے ہاں کئی ساز ہیں۔ سب سے قدیم ڈھول جو آجکل بھی منادی کرنے کے لئے دیہاتوں میں بجایا جاتا ہے۔ اس کے بعد نوبت نقارہ ہے جو محلاتِ شاہی اور رئیسوں، امیروں کی ڈیوڑھیوں پر بجتا تھا اور جلوسوں میں بھی پیش پیش رہتا تھا۔ مجلسی سازوں میں قدیم ساز پکھاوج یا مردنگ ہے جو ڈھول کی شکل ہوتی ہے مگر اس کے درمیانی تسموں میں گٹّے چڑھے ہوتے ہیں۔ ان سے پکھاوج کو سُر میں ملایا جاتا ہے۔ پکھاوج کو بیچ میں سے کاٹ کر امیر خسرو نے طبلہ بایاں بنایا جو طبلہ کی جوڑی کہلاتی ہے۔ ان میں ایک دایاں لکڑی کا ہوتا ہے جس کے تسموں میں گٹّے چڑھے ہوتے ہیں اور دوسرا بایاں ہوتا ہے تانبے کا یا مٹی کا۔ دایاں طبلہ سُر میں ملایا جاتا ہے اور بایاں گمک پیدا کرتا ہے۔ نوبت نقارہ، ڈھول تاشہ، پکھاوج مردنگ، سب کے بول علیٰحدہ ہوتے ہیں۔ امیر خسروؒ نے طبلہ کے بول سب سے الگ مقرر کئے ہیں۔ مثلاً پکھاوج کے بول ہیں کڑان، دھا وغیرہ تو طبلہ کے ترکٹ اور دھرکٹ۔ پھر اسے بجانے کا اصول بھی علیٰحدہ مقرر کیا۔ پکھاوج پوری ہتھیلی سے بجائی جاتی ہے، طبلہ صرف اُنگلیوں کے پوروں سے۔ پکھاوج کے بول کھلے کہلاتے ہیں اور طبلہ کے بند۔ ڈھولک بھی امیر خسروؒ کی ایجاد بتائی جاتی ہے۔ اس کی درمیانی ڈوریاں چھلّوں سے کَسی جاتی ہیں۔ اس کے بول بھی تال کے دوسرے سازوں سے الگ مقرر کئے گئے ہیں۔ ڈھولک قوال کا خاص ساز ہے۔ قوالوں کی چونکہ ٹولی ہوتی ہے اس لئے طبلہ کی چاشنٹ چٹکی اُن کی آواز میں دب جاتی ہے۔ لہٰذا ڈھولک کی تھاپ پھیکی رکھی گئی۔ قوالی کے ٹھیکے بھی الگ مقرر کئے گئے اور یہ ٹھیکے کھلے ہاتھ سے بجائے جاتے ہیں۔

سرحد اور سندھ کے بعض ساز مخصوص ہیں۔ مثلاً سارندہ اور طنبورہ۔ سارندہ ایک طرح کی چھوٹی سارنگی ہوتی ہے جس کی پسلیاں چوڑی اور پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ نیچے کھال منڈھی ہوتی ہے اور اُوپر پسلیوں کا منہ کھلا ہوا ہوتا ہے۔ یہ کھلا ہوا منہ گراموفون کے ہارن کی طرح آواز کو بڑھا کر خارج کرتا ہے۔ سارندہ گز سے بجایا جاتا ہے اور اس کی آواز بڑی تیز ہوتی ہے چونکہ اس کا میدان اُنگلیوں کی دوڑ کے لئے مناسب نہیں ہوتا اس لئے اس میں سارنگی یا وائلن کی طرح تیاری نہیں پیدا کی جاسکتی۔ صرف گز کے (STROKES) ہی اس میں لگائے جا سکتے ہیں۔ سارندہ عموماً عوامی گانوں کے ساتھ بجایا جاتا ہے۔ اس لئے اس میں تیاری کی ویسے بھی ضرورت نہیں ہے۔ طنبورہ ایک طرح کا ابتدائی (PRIMITIVE) رُباب ہوتا ہے جو تال کا کام بھی دیتا ہے اور سُر کی آس بھی دیتا ہے۔ اس طنبورے کو ہماری موسیقی کے کلاسیکی طنبورے سے کوئی نسبت نہیں۔ کلاسیکی طنبورے میں صرف چار تار ہوتے ہیں اور اُنہیں مقررہ سُروں میں ملا لیا جاتا ہے۔ ان تاروں کو مضراب سے چھیڑا جاتا ہے تاکہ گانے یا بجانے کی بُنیاد قائم رہے۔ یہ صرف "ڈرون انسٹرومینٹ" (DRONE INSTRUMENT) ہوتا ہے اسے تانپورہ بھی کہتے ہیں۔

جدید یا آجکل کی موسیقی میں، خصوصاً فلمی اور ریڈیائی موسیقی میں یورپی ساز بھی آرکسٹرا اور ہلکی موسیقی میں شامل کئے گئے ہیں۔ ان سے بڑے خوشگوار اضافے ہو رہے ہیں۔ یورپی سازوں میں سیکسوفون، کلارنٹ، کارنٹ، چیلو اور ڈبل بیس عمومیت حاصل کر چکے ہیں۔ فلمی موسیقی میں پورا یورپی آرکسٹرا لیا جانے لگا ہے۔ اس سے مشرقی موسیقی کا مزاج بدل کر مغربی موسیقی سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس زمانے میں اس کی ضرورت بھی تھی کیونکہ ہماری کلاسیکی موسیقی جامد و ساکن ہو کر محدود ہو گئی ہے۔ کلاسیکی موسیقی کے طرفداروں کو شاید موجودہ موسیقی کے رُجحانات پسند نہ آئیں مگر اس میں شک نہیں کہ جب فن کی ترقی کا سوال آئے گا تو وہ اس بدعت کو بھی گوارہ کر لیں گے۔ اس وجہ سے بھی کہ جدید موسیقی سے ہماری قدیم موسیقی کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا اور جدید و قدیم میں تو ہمیشہ سے اختلاف چلا آتا ہے اور آئندہ بھی چلتا رہے گا، اور اختلافِ رائے کوئی ایسی بُری چیز نہیں۔

اگست ۱۹۵۶ء

# سلطان حسین شرقی

رشید ملک

"حسینی بیاجس کی سلطنت چند روزہ تھی اور جسے زندگی میں کبھی امن نصیب نہیں ہوا شہر میں ڈوب کر زندہ رہا" (قرۃ العین حیدر: آگ کا دریا)

تاریخ کا یہ عجیب اتفاق ہے کہ سلطان حسین شاہ شرقی خاندان کا آخری تاجدار تھا۔ جیسے مالوہ کا باز بہادر، گجرات کا بہادر شاہ اور اودھ کا واجد علی شاہ اودھ ان چاروں نے موسیقی کی دنیا میں ایسے نقوش چھوڑے ہیں جو اب بھی درخشندہ و تابندہ ہیں۔

"۱۴۵۸ء میں شرقیہ سلطنت ہند میں تہذیب کا عظیم الشان مرکز بن چکی تھی۔ جونپور شیراز ہند کہلاتا تھا۔

اس سلطنت کو قائم ہوئے ابھی ستر سال گزرے تھے۔ صاحبقراں کے حملے کے بعد کی گڑبڑ سے فائدہ اٹھا کر ملک الشرق خواجہ جہاں نے اس کی بنیاد ڈالی۔ اس کے سلاطین اپنے آپ کو غیر ملکی نہیں گردانتے تھے۔ دکن کے بادشاہوں کی مانند ان کی حکومت بھی خالص ہندی حکومت تھی انہوں نے خوبصورت عمارتیں بنوائیں تھیں گلاب کے باغ لگائے تھے۔ دور دور سے اہل علم آکر جونپور میں جمع ہو رہے تھے" (قرۃ العین حیدر: آگ کا دریا)

یہ وہ زمانہ تھا جب ۱۴۵۸ء میں سلطان حسین اپنی والدہ راج بی بی کی مدد سے جونپور کی سلطنت کے تخت پر بیٹھا۔ یہ سلطنت اسے اپنے باپ محمود شاہ سے ورثے میں ملی تھی۔ اس کی حدود بنگال کی مغربی سرحد سے لے کر آگرہ تک اور ہمالیہ سے لے کر جنوب میں مالوہ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ دہلی میں اس وقت سلطان بہلول لودھی حکمران تھا۔ لیکن سلطان حسین دہلی اور آگرہ کے علاقوں کو اپنی بیگم کی وراثت خیال کرتا تھا جو سید خاندان کے آخری بادشاہ سلطان علاؤالدین عالم شاہ کی بیٹی تھی۔



سلطان حسین کی زندگی اس کی والدہ راج بی بی اور اس کی بیگم بی بی خونزہ کی شخصیتوں سے خاصی متاثر تھی۔ ماں کی مدد سے وہ تخت پر بیٹھا اور بیوی کے ابھارنے پر اس نے دو لودھیوں سے پنجہ آزمائی کی۔ ۱۴۸۳ء کی جنگ میں سلطنت کا خاصا علاقہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور وہ اپنی قلمرو کے مشرقی علاقے تک محدود ہو کر رہ گیا۔

میدانِ کارزار میں اور اس کے باہر تانپورہ ہمیشہ اس کا رفیق رہا اور گوشہ نشینی میں بھی تانپورہ ہی اس کا مونس و غم خوار رہا تا آنکہ بہلول لودھی کے بیٹے سکندر لودھی نے اسے اس گوشے سے بھی نکال باہر کیا۔ سکندر لودھی اور سلطان حسین میں قدرِ مشترک موسیقی تھی (سکندر لودھی کے زمانے میں موسیقی پر ایک نہایت اہم کتاب وجود میں آئی۔ اس کتاب کا نام ہے "لہجات سکندر شاہی"۔ اس کا ایک نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری میں اور ایک نسخہ مدراس یونیورسٹی لائبریری کے مخطوطات سیکشن میں محفوظ ہے۔ ان میں سے ایک کی عکسی نقل ہارورڈ یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے) لیکن یہ قدرِ مشترک بھی ان دونوں بادشاہوں کی ہوسِ ملک گیری پر غالب نہ آسکی۔ آخر سلطان حسین کو بنگال میں پناہ لینا پڑی۔ بنگال کے والی علاؤالدین حسین شاہ نے بہار میں ایک گاؤں اسے گزارے کے لئے دے دیا۔ اس زمانے میں بھی تانپورہ اس کا مونس و غم خوار رہا تا آخر ۱۵۰۵ء میں اس نے گوڑ میں ہی اس دنیائے فانی سے کوچ کیا لیکن

اس کے تانپورے کی گونج اب بھی برصغیر پاک و ہند کے گوشے گوشے میں سنائی دیتی ہے۔

سلطان حسین شرقی کشمیر کے سلطان زین العابدین اور بنگال کے سلطان علاءالدین حسین شاہ کی طرح ہندوستان کے ان معدودے چند فرمانرواؤں میں سے تھا جنہوں نے علم و فن کی سرپرستی میں بہت دلچسپی لی۔ میدانِ کارزار کے ہنگاموں کے بعد اس کا بیشتر وقت کتاب بینی اور راگداری میں گزرتا۔ قدیم کتابوں کا کھوج لگاتا اور ان کی تشریحات اور ترجمے تیار کرانا بھی اسے انتہائی مرغوب تھا حتیٰ کہ جہانبانی اور فرمانروائی۔ کتابوں کی تلاش جستجو کے لئے اس

نے ایک عرب ابوالمنصور کمال الدین کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ یہ عرب بھی سلطان حسین کی زندگی میں اتنی ہی اہمیت رکھتا تھا جتنا اس کا تانپورہ ابوالمنصور کمال الدین کی وساطت سے اس نے اپنی قلمرو میں پھیلے ہوئے سنگھوں سے ہندی علوم وفنون کے تانبے پتروں اور کتابوں کو اکٹھا کیا اور ان کے تراجم اور تشریحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ اپنے تانپورہ کی مدد سے وہ موسیقی کے طلسمات کے پردے بھی اٹھاتا رہا یہی اس کے دو محبوب مشاغل تھے اور انہی کی بنا پر وہ اپنی زندگی کی تمام ترناکامیوں کے باوجود آج بھی زندہ ہے۔

مختلف تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے زمانے میں موسیقی کی اقلیم کا بادشاہ تھا اس کی طبیعت خاصی جدت پسند واقع ہوئی تھی۔ کچھ تذکرے اسے "نایک" کا درجہ دیتے ہیں اور کچھ "گندھروی" کا۔ لیکن اگر غیر جانبداری سے اس کی ان کاوشوں کا جائزہ لیا جائے جو اس نے موسیقی کے سلسلے میں کیں تو اس کا درجہ ان روایتی درجوں سے کہیں ارفع و اعلیٰ نظر آتا ہے۔

ہندو طرزِ زندگی کی جامدیت ایک مسلمہ امر ہے۔ ہندو ذہن کی افتاد کچھ ایسی ہے کہ جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہے اس کی جزئیات تک پیچ کر دم لیتا ہے اس طرح تفصیلات کا ایک ایسا نظام وجود میں آجاتا ہے جس میں ترمیم و تنسیخ یا رد و بدل کی قطعی گنجائش نہیں رہتی اور تمام امور ایک آہنی شکنجے کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سالہا سال سے اور باوجود اس بات کے کہ زمانے کے ہر موڑ پر ہندوستانی تہذیب میں تازہ وارادت کا پیوند لگتا رہا، ہندو ذہن اپنی تمام جدت پسندیوں کے باوجود آج بھی اسی آہنی شکنجے کی گرفت میں ہے۔ ویدوں کے پڑھنے کے طریقے آج بھی وہی ہیں جو صدیوں پہلے تھے اور جو قوانین ان کے پڑھنے کے لئے اس زمانے میں مرتب ہوئے تھے ان میں آج بھی کوئی رد و بدل نہ ہو سکا۔ اسی طرح جب رقص کی طرف دھیان دیا تو ہاتھ پاؤں، گردن، آنکھ اور جسم کے باقی اعضا کی حرکت کے لئے قوانین بنا کر ایک آہنی ضابطہ ترتیب دے دیا اور اگر موسیقی کی طرف متوجہ ہوئے تو شروتیوں سے لے کر دھر وپد سے ۲۶۴ مختلف اصناف وضع کر ڈالیں۔ انسانوں کے ان وضع کردہ ضابطوں اور قوانین کو رشیوں اور ــــ کی طرف منسوب کر کے ہندوؤں نے ان قوانین جمالیات کو الہامی درجہ دے دیا جس میں رد و بدل کرنا انسان کے بس کی بات نہیں رہتی

سنگیت رتناکر (۱۲۱۰ــ۱۲۴۷ء) سے لے کر مغل بادشاہ محمد شاہ کے عہد تک موسیقی کی اس وقت تک جو صنف پہلے پہل ابھری وہ دھروپد تھی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے اگر دھروپد کی گرفت ذرا ڈھیلی پڑی تو ۱۲۵۶ء میں راجہ مان والئ گوالیار نے اس کی زبان تبدیل کر دی۔ یعنی بجائے کرناٹک کی زبانوں کے اب دھروپد شمالی ہند کی مختلف زبانوں میں خصوصاً گوالیاری زبان میں تصنیف ہونا شروع ہو گئے نتیجے کے طور پر کتاب "مانکتوہل" تیار ہوئی۔

یہ تھا وہ پس منظر ہندو پاک موسیقی کا جب سلطان حسین شرقی نے عنانِ اقتدار سنبھالی سلطان کی جدت پسند طبیعت نے دھروپد کی یکسانیت اور شدید انضباط سے بغاوت کی اور نئی طرحوں کی تلاش میں سرگرم ہوا جس کا نتیجہ شاید "چٹکلا" یا "خیال" کے روپ میں ہوا لیکن اس موضوع پر محققین ابھی تحقیق کر رہے ہیں اور حتمی طور پر ابھی تک یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خیال کا ظہور سلطان حسین شرقی کے زمانے میں ہوا یا اس سے پہلے۔ قوالی کا رواج تو حضرت معین الدین چشتی کے زمانے سے پہلے سے ہی ہو چکا تھا لیکن موسیقی کا یہ اسلوب صرف مسلمانوں تک ہی محدود رہا۔ ہندوؤں نے اسے قبول نہ کیا اور ضرورت اس امر کی تھی کہ ایسا اسلوب تیار کیا جائے جو دونوں قوموں کو جو اس فن میں مختلف روایات کی حامل تھیں قابلِ قبول ہو۔ اسی تیج پر جو کاوشیں ہوئیں۔ ان کا نتیجہ خیال کی صورت میں ظاہر ہوا۔ لیکن بہت دیر بعد۔

واجد علی شاہ والیٔ اودھ اپنی تصنیف "صوت المبارک" میں حضرت امیر خسرو کو خیال کا موجد قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے وہ کوئی سند نہیں دیتے۔ کچھ لوگ خیال کی اختراع کا سہرا سلطان حسین شرقی کے سر باندھتے ہیں لیکن اس کے لئے بھی ابھی شہادت درکار ہے۔

کسی فن میں اچانک ایجاد یا اختراع کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔ فن ایک قوم کے معاشرہ کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جس طرح معاشرہ ارتقاء کے قوانین کا پابند ہوتا ہے اسی طرح فن پر بھی ارتقاء کے قوانین کی پابندی لازم ہوتی ہے۔ جو تبدیلیاں فن کی صورت یا اس کے CONTENT میں ہوتی ہیں وہ بتدریج ظہور میں آتی ہیں یہ بیچ کسی زمانے میں بویا جاتا ہے کسی اور زمانے میں حاصل یاور ہوتا ہے۔ یہی صورتِ حال موسیقی میں پائی جاتی ہے ہم خیال کو امیر خسرو یا سلطان حسین شرقی سے منسوب کر کے ایک طفلانہ جذبہ حبّ القوم اور ایک بچگانہ احساسِ افتخار کی تسکین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

موسیقی میں دوسری اور یقینی شرقی خاندان کے اس آخری چشم و چراغ سے منسوب کی جاتی ہیں۔ وہ کئی راگوں کے مرکبات تیار کرنا ہے۔ ان کو اختراع کہہ لیجئے یا ایجادات یہ راگ جو ان کے نام سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ شیام راگ کے بارہ مختلف روپ ہیں جن کے نام یہ ہیں:

گوڑ شیام۔ ملار شیام۔ بھوپال شیام۔ کنسر شیام۔ مربو (؟) شیام پوربی۔ شیام رام شیام میگھ شیام۔ بسنت شیام۔ براری شیام۔ گونڈ شیام۔ کرائی شیام

لیکن اب یہ بھولی بسری بات معلوم ہوتے ہیں ان میں سوائے ایک یا دو کے ہماری موسیقی میں کوئی بھی مروج نہیں۔

ان کے علاوہ سیف خان فقیر اللہ اپنی کتاب "راگ درپن" (۱۶۶۴ء) میں کچھ راگوں کو بھی ان کے نام سے منسوب کرتا ہے۔ یہ ہیں حسینی کانہڑا اور حسینی ٹوڈی اگرچہ مصدقہ شہادت تو دستیاب نہیں ہو سکی لیکن اس روایت کے پیش نظر جو موسیقی میں چلی آتی ہے یہ دونوں راگ کسی حسین سے ہی منسوب کئے جا سکتے ہیں اور اغلب ہے کہ یہ سلطان حسین شرقی ہی ہو۔ مشہور و معروف راگ جونپوری کو بھی سلطان حسین شرقی سے ہی منسوب کیا جاتا ہے لیکن یہ راگ اپنے نام کی وجہ سے علاقائی نسبت رکھتا ہے اور سلطان حسین شرقی سے اسے منسوب کرنے کی ہمیں کوئی شہادت دستیاب ہوتی۔ سلطان کے زمانے میں لکھی گئی سنسکرت کی کتابوں میں، ان کے بعد اور ان سے پہلے لکھی گئی کتابوں میں اس راگ کا ذکر نہیں۔ ہمارے پاس واحد ایک کتاب ہے سیف خان فقیر اللہ کی "راگ درپن" ہے لیکن وہ بھی اس قدر کہتی ہے کہ "اساوری میں جونپوری کو ملا کر اسے جونپوری اساوری کا نام دیا اور بسنت میں جونپوری ٹوڈی کو ضم کر کے اسے جونپوری بسنت کا نام دیا" یہ راگ شاید مروج نہیں ہو سکے اس لئے سنسکرت کتابوں میں ہمیں ان کا بھی کوئی نام و نشان نہیں ملتا۔

(جولائی ۱۹۸۷ء)

ہے تیرا ہی در مرجعِ آشفتہ مزاجاں
لے جائیں کہاں تیرے سوا دامنِ صد چاک

دیکھا تو نظر آتا ہے بے برگ و نوا ابر
محتاج ہے گلزار بہاراں کی رگِ تاک

خاکپائے غلامانِ رسالت مآب
کلیم عثمانی

عکس تحریر کلیم عثمانی

# تال کے ساز اور اُستاد جہانگیر خاں

ادیب سہیل

جس طرح عورت اور سنگار لازم و ملزوم ہیں اُسی طرح راگ اور تال بھی شانہ بشانہ ہی بھلے لگتے ہیں۔ دونوں الگ رہ کر ادھورے معلوم ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھے تو جا سکتے ہیں ـــ لیکن حُسن کمال کا احساس پیدا نہیں کر سکتے۔ شاید اسی لئے تال کو راگ کا زیور بھی کہا گیا ہے۔

گرنتھوں میں ۲، اقسام کے تالوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جو اس دور میں مستعمل نہیں۔ موجودہ دور میں صرف تیرہ چودہ تالوں کا رواج ہے ـــــ (روپک، تیورا، سول فاختہ، جھپ تال، چوتال، اڑا چوتالہ، جھومرا، فرودست، تلواڑہ، سواری، تیتالہ، چانچر، دھمار، اکتالہ وغیرہ) تال کے چند مخصوص ساز جو ہمارے موسیقار برتتے ہیں، ان میں پکھاوج، طبلہ، ڈھولک اور نقارہ ہیں۔ کلاسیکی راگوں میں پکھاوج اور طبلے کا چلن عام ہے دُھرپد کو پکھاوج زیب دیتا ہے، خیال اور ٹھمری میں طبلہ سے چار چاند لگ جاتے ہیں۔ البتہ شہنائی کے لئے نقارہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

دنیائے موسیقی میں یہ تصور عام ہے کہ اس کے موجد حضرت امیر خسروؔ ہیں۔ جو درست معلوم نہیں ہوتا ـــ اس سلسلے میں گرامی رشید ملک نے اپنی کتاب "حضرت امیر خسرو کا علم موسیقی" میں بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔

ایک طبقے میں یہ خیال بھی عام ہے کہ طبلے کے موجد دہلی گھرانے کے ایک بزرگ خان صاحب جان نثار خان عرف سُدھار خان تھے۔ ان کے بیٹوں یا ابتدائی وارثوں میں خان صاحب مکھو خاں اور بخشو جی کا نام آتا ہے۔ اس خاندان کے ایک طبلہ نواز واجد حسین خاں (مقیم کراچی) کی اطلاع کے مطابق دونوں بزرگ سدھار خاں کے صاحبزادے تھے۔ پھر یہ سلسلۂ نسب مشہور زمانہ نتھے خان طبلہ نواز، خانصاحب اللہ دیے خاں پکھاوجی نہروالے اور اُستاد نتھو خاں طبلہ نواز (رامپور) سے ہوتا ہوا خاں صاحب گامی خاں کے بھائی منو خاں طبلہ نواز (بھارت) اور داماد واجد حسین خاں طبلہ نواز کراچی تک پہنچا۔

معدن الموسیقی میں بھی بخشو اور مکھو خاں نامی دو مشہور طبلہ نوازوں کی خبر فراہم کی گئی ہے اور یہ دونوں بزرگ مذکورہ کتاب کے مصنف کے سامنے فوت ہوئے تھے ـــ مصنف کا زمانہ وہی ہے جو واجد علی شاہ کے لکھنؤ میں قیام کا زمانہ تھا۔

"طبلہ میں اوّل بخشو دھاڑی اس طور کے باج کا اُستاد ہوا۔ اُس کے بیٹے مموّ اور سلاری خاں، گت پرن میں لاجواب تھے ـــ اس زمانے میں قدیم باج کا ایک طبلہ نواز مکھو خاں ساکن دہلی بڑا اُستاد تھا ـــ اور نجو شاگرد بخشو سب پر سبقت لے گیا۔ ۔ ۔ ۔"

معدن الموسیقی میں ایک بہت اچھے طبلہ نواز خلیفہ تاج خان کا نام بھی آتا ہے۔ اس کے متعلق یہ اطلاع پہنچائی گئی ہے کہ وہ کدا (؟) سنگھ (رستم ہند) پکھاوجی سے علم موسیقی میں بڑھ کر تھا۔ اس کا بیٹا ناصر خاں طبلہ نواز رامپور دربار سے منسلک رہا ـــ اسی کتاب میں راگ درپن ـــ (مصنف فقیر اللہ) کے حوالے سے سنگیت کے جن ماہرین کا ذکر کیا گیا ہے۔ اُس میں تال کے ساز کا ہم بجانے والوں میں پکھاوجیوں زمان اللہ پکھاوجی اور فیروز ڈھاری پکھاوجی۔ بہور والے، کا ذکر تو ملتا ہے۔ لیکن کسی طبلہ نواز کا تذکرہ نظر نہیں آتا ـــ اگر اُس زمانے میں طبلے کا چلن ہوتا۔ تو جہاں راگ درپن کے حوالے سے

معدن الموسیقی کے مصنف نے پکھاوجیوں کا ذکر کیا ہے وہاں طبلہ نوازوں کا ذکر بھی ضرور کرتے۔ ان باتوں سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ طبلے کا رواج مغل شہنشاہ شاہ جہاں کے دور کے بعد کسی وقت ہوا ہوگا۔

تال ساز طبلے کا سرسری تعارف کرانے کے بعد میں اس طبلہ نواز کے بارے میں بات کرنا چاہوں گا جو میرا آج کا موضوع ہیں اور جنہیں برصغیر پاکستان و ہند کے شائقین اُستاد جہانگیر خاں کے نام سے جانتے ہوں گے۔

اُستاد جہانگیر خاں صاحب (مقام بنارس سال پیدائش ۱۸۶۴ء) نے ایک سو تیرہ برس کی عمر پائی اور ساٹھ برس تک سامعین کے سامنے اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کرتے رہے۔۔۔ ناقدینِ فن کا کہنا ہے کہ اُن کے باج میں مہارت معیار اور مٹھاس یکجا ہو گئے ہیں۔۔۔ بنارس وطن اور لکھنؤ میں تعلیم کرنے کے ناتے ان کا تعلق یوں تو پورب باج سے تھا لیکن یہ تینوں باج پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔۔۔ اور تنہا طبلہ بجانے میں "لگی اور چہ باغ" میں لاثانی تھے (یہ طرز عنقا ہے اور کم لوگوں کے علم میں ہے)۔

اُستاد جہانگیر خاں صاحب نے ابتدأ طبلہ نوازی کی تعلیم اپنے والد احمد خاں سے حاصل کی۔ پھر آگے کی تعلیم کے لئے وہ کئی اُستادوں کے آستانے تک گئے۔ اُن کے اُستادوں میں دو بزرگ طبلہ نوازوں کے نام آتے ہیں۔ ایک عظیم آباد کے اُستاد مبارک خاں اور دوسرے لکھنؤ کے خلیفہ عابد حسین تھے۔ خلیفہ عابد حسین کے متعلق موسیقی کے ایک مشہور ناقد ڈی۔ پی۔ مکرجی کا یہ جملہ اُن کی بڑائی پر صاد ہے۔" جہاں تک ضبط کا تعلق ہے خلیفہ عابد حسین کے ہم عصروں میں کوئی بھی ان سے بہتر نہیں تھا"۔

آگرہ گھرانے کے ایک نامور فرزند اُستاد ولایت حسین خاں نے اپنے پسندیدہ اور ماہر طبلہ نوازوں میں خلیفہ عابد حسین کا ذکر کیا ہے۔ تعجب ہے کہ ان دونوں صاحبانِ فن نے خلیفہ کے علاوہ اور بھی دوسرے نامور طبلہ نوازوں بالخصوص احمد جان خاں تھرکوا اور کنٹھے مہاراج، بیرو مصرا، الٰہی لال حبیب، کرامت، ہیرو گنگولی، مظفر خاں وغیرہ کے بارے میں تو لکھا ہے لیکن اُستاد جہانگیر خاں اُن سے نظر انداز ہو گئے۔

اُستاد جہانگیر خاں کے ورثے میں خلیفہ عابد حسین کا فن آیا تھا۔۔۔ اس میں مزید رنگ آمیزی عظیم آباد کے اُستاد مبارک خاں کے باج سے ہوئی تھی۔ ایک سنگم میں دو دھاروں کے اس ملاپ نے جہانگیر خاں صاحب کے فن میں ایک تیسری صورت پیدا کر دی تھی۔ جو دوسرے طبلہ نوازوں سے باج کے معاملے میں مشترک ہوتے ہوئے بھی اپنی پہچان الگ کراتی تھی۔

اُستاد جہانگیر خاں کے باج کی یہی وہ صفات تھیں جن کی وجہ سے ان کے فن کے خوشہ چینوں میں بلا تفریق مذہب و ملت سینکڑوں کی تعداد نظر آتی ہے۔ محتاط اندازے کے مطابق ان کے شاگردوں کی تعداد چار سو تک پہنچتی ہے۔ ان کے مشہور شاگردوں میں اُستاد عبدالحفیظ، اُستاد محبوب خاں، ناراین، مہادیو اندورکر، دین خاں اور مجدار وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

اُستاد جہانگیر خاں کی فنی عظمت کا اُن کے وطن بھارت میں دل کھول کر اعتراف کیا گیا۔ یہ پہلے طبلہ نواز تھے جنہیں ۱۹۵۹ء میں صدارتی انعام سے نوازا گیا۔ اسی سال انہیں گراں قدر خدمات کے صلے میں سنگیت ناٹک اکادمی کی طرف سے "پرا کھہ وادک" کا اعزاز دیا گیا۔ فن کے اعتراف و احترام کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا، اندرا سنگیت یونیورسٹی، خیر گڑھ کی طرف سے انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا ہوئی۔ یہ اعزاز و احترام کی جانب یقینی بہت اہم قدم ہے۔ پڑوسی ملک میں اعترافِ فن کی یہ بہت اچھی مثال ہے۔ میں یہاں یورپ کی مثال اس لئے نہیں دیتا کہ یورپی ممالک عزت و احترام کی منزل سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔ وہاں موسیقی اور موسیقار فنونِ لطیفہ کے دوسرے شعبہ جات کے ماہرین کے شانہ بشانہ ہیں اور معاشرہ میں بہت باوقار ہیں۔

پاکستان کا تیس سالہ دور ماہرینِ فن سے خالی نہیں رہا، پکھاوج اور طبلہ کے عظیم اُستاد میاں قادر بخش اور اُستاد اللہ دتہ بہاری پور والے، تان رس خاں

کے پوتے سردار خان، صاحبِ عصر سارنگی نواز، اُستاد بندو خاں یہیں تھے۔ اُستاد کریم بخش پیرنا (طبلہ نواز) فیروز نظامی اور اُستاد امانت علی اور ان کے والد اختر حسین خان کا انتقال چند برسوں کی بات ہے۔ ملکۂ موسیقی روشن آرا، اُستاد رمضان خاں، خورشید انور، قاضی ظہور الحق، شوکت حسین (طبلہ نواز) اُستاد ملنگ خاں کے بیٹے اُستاد فیاض (طبلہ نواز) اور میاں قادر بخش کے صاحبزادے طالب حسین (طبلہ نواز) اور شام چوراسی والے سلامت علی، نزاکت علی خیال، اُستاد کبیر خاں (ستار نواز)، اُستاد شریف خاں پونچھ والے (ستار نواز)، اُستاد فتح علی خاں (ستار نواز) اور اُستاد مجھو خاں (ستار نواز) ہم میں موجود ہیں۔

احترام و اعترافِ فن کے لئے، اور چراغ سے چراغ جلتے رہنے کے عمل کو بہ حُسن و خوبی جاری رکھنے کی خاطر معاشرے میں اس فنِ لطیف و شریف کے اصل مقام کو بحال کرنا ہوگا، یہ کام ادبی انجمنیں بخوبی انجام دے سکتی ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ اپنی ماہانہ، پندرہ روزہ، ہفتہ وار نشستوں کو صرف شعر و شاعری، افسانہ اور تنقید تک محدود نہ رکھیں۔ اس کے سٹیج پر صرف شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ شام نہ منائی جائے بلکہ ان کے دروازے موسیقاروں، مصوروں اور رقاصوں پر کھولے جائیں۔ کبھی ان کے ساتھ بھی شام منانے کا اہتمام کیا جائے۔ موسیقی، مصوری اور رقص کے موضوع پر بھی مضامین پڑھے جائیں۔ اس طرح ان کے اندر یہ اعتماد بحال کیا جائے کہ شاعر اور ادیب ان سے کوئی بہت اونچی یا مختلف شے نہیں ہیں اور اگر ان میں اگر کوئی فرق ہے تو بس فنونِ لطیفہ کے شعبوں کے انتخاب کا ہے۔ جنگ ہو یا امن دونوں صورتوں میں بندوق، قلم اور ساز یکساں احترام کے طالب ہیں۔

اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہوئے، تو تہذیبی و ثقافتی سرگرمیوں میں اتحاد و اشتراک پیدا ہوگا۔ آپس میں تبادلۂ خیال کے مواقع فراہم ہونگے۔ کسی موضوع پر سر جوڑ کر سوچنے کی عادت کو فروغ حاصل ہوگا۔ اس اشتراکِ عمل کے نتیجے میں ہم تہذیبی سطح پر ایک "ہشاش بشاش" معاشرے پر اس وقت مجھے بنگال کے عالمی شہرت رکھنے والے مصور زین العابدین کی باتیں یاد آتی جا رہی ہیں۔ وہ جب میکسیکو اور دیگر غیر ممالک کے دورے سے واپس لوٹے تو انہوں نے اپنی فضا میں ایک عجب حبس محسوس کیا اور کہنے لگے میکسیکو وغیرہ میں وہاں کہیں گیا۔ مجھے ایک ہشاش بشاش معاشرے کا احساس ہوا۔ مزدور ہو یا دفتری، ہر طبقے کے مطابق وہاں تفریحی وسائل مشاغل موجود ہیں۔ ہر آدمی اپنے اپنے کام سے فارغ ہو جانے کے بعد من پسند تفریح کے لئے آزاد ہے۔ ہم عجیب دوری کا شکار ہیں۔ اس میں حکماء کے اقوال کے مطالعہ سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جس ملک، جس قوم اور جس معاشرے میں فنونِ لطیفہ کا متوازن فروغ رُک جائے ان سے ان کا دیس نکالا کر دیا جائے تو وہ ملک قوم اور وہ معاشرہ آخر کار بنجر ہو جاتا ہے اور درندگی اور شقاوت کے خصائل فروغ پانے لگتے ہیں۔ اور حلم، آشتی اور نرمی پر تولنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

(اپریل ۷۹ء)

مصوری میں سیمیٹری کا رتبہ در حقیقت تشارک کے کھرا ہے جس میں رنگ کی یکجائی
کے ذریعے ایک جذبِ عشق کی تجسیم کا ترجمان ہے جو کہ مصور کے اپنے ماحول سے
راست رابطے کے نتیجے میں عقلی، جذبی اور بدنی سطحوں پر یکجا تشکیل ہوتا ہے۔ خالد احمد

عکسِ تحریر خالد احمد

# پاکستان میں فنِ تعمیر کا ارتقا

ڈاکٹر احمد نبی خان

پاکستان دنیا کے سیاسی نقشے پر چند سال اوپر ربع صدی پہلے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کی حیثیت سے اُبھرا۔ قوموں کی تاریخ میں تیس تینتیس سال کا عرصہ اتنا زیادہ عرصہ نہیں ہوتا۔ جس میں ان کی سماجی اور ثقافتی روایات کی امتیازی حیثیت صحیح معنوں میں تشکیل پا سکے۔ لیکن بعض حالات میں بعض قومیں اور بعض ممالک یہ روایات و امتیازات ثقافتی ورثے کے طور پر بھی حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ پاکستان سیاسی اعتبار سے ایک جدید ملک ہی اس کا ثقافتی ورثہ نہ صرف بہت قدیم ہے بلکہ بہت اہم بھی اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ قدیم پاکستان نے دنیا کے قدیم ترین ملکوں کے شانہ بشانہ اس سماجی، ثقافتی مذہبی اور سیاسی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا ہے جس سے وہ صدیوں سے گزرتے چلے آئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس خطۂ زمین نے جسے آج ہم پاکستان کہتے ہیں اپنی تاریخ کا آغاز اس وقت کیا جب حضرت انسان نے جہد للبقا کی کوشش شروع کی آج سے تقریباً پانچ لاکھ سال پہلے اپنی ضروریات حاصل کرنے کے لیے پتھر کے اوزار بنانا سیکھے اور ان کی مدد سے جانوروں کا شکار کیا اور پودوں کی جڑیں کھود کھود کر نکالیں کہ ان سے اپنے پیٹ کی آگ بجھا سکے۔ انہیں پتھروں کی شکست و ریخت کے نتیجے میں آگ کی ایجاد ہوئی۔ انسانی جدوجہد کے یہ مراحل ہمارے ہاں ان علاقوں میں ظہور پذیر ہوئے جنہیں آج وادیٔ سوان اور پوٹھوار کا علاقہ کہا جاتا ہے یہ انسان یا تو پہاڑوں کے قدرتی یا خود بنائے ہوئے غاروں میں رہتے تھے یا پھر درختوں کی شاخوں پر بسیرا کرتے تھے

آثار قدیمہ کی تحقیق و تفتیش کے آغاز سے پہلے اس صدی کے آغاز تک برِصغیر ہندو پاکستان کی تاریخ کا آغاز آریاؤں کی آمد سے تعبیر کیا جاتا تھا چنانچہ آریاؤں کی ابتدائی مذہبی کتابوں نے جو تفصیل یہاں کے اصل باشندوں کی پیش کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ غیر تہذیب یافتہ، جاہل اور بدصورت لوگ تھے۔ جن کی نہ کوئی تہذیب تھی نہ کوئی تمدن اور تہذیب و تمدن کا یہاں پر فروغ کرنے والے یہ بیرونی حملہ آور ہی تھے۔ لیکن ماہرینِ آثار قدیمہ نے ہڑپہ اور موہن جو دارو جیسے شہروں کی دریافت اور کھدائی کر کے اس تصور کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ ماہرین کی یہ دریافت اتنی اہم اور معرکہ آرا تھی کہ اس نے برِصغیر کو قدیم دنیا کی صف میں لا کھڑا کیا اور مصر اور میسوپوٹامیہ کی قدیم تہذیبوں کے ساتھ وادیٔ سندھ کی تہذیب کا بھی شمار ہوا۔ عام اندازے کے مطابق پانچ ہزار سال پرانے بتلائے جاتے ہیں۔ یہ تہذیب موجودہ پاکستان کے تقریباً تین چوتھائی حصے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس کے بے شمار مراکز دیہات قصبات اور چھوٹے بڑے شہروں کی صورت میں موجود تھے مدت ہوئی یہ شہر انسانی آبادیوں سے خالی ہو گئے اور ان کی بے شمار عمارتیں رفتہ رفتہ مٹی میں دفن ہو گئیں۔ ان کھنڈرات کو ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے خاص انداز سے کھود کر نکالا۔ ان عمارتوں کے باقی حصوں کو دیکھ کر موہنجو دارو سے برآمد ہوتے ہیں۔ ماہرین نہ صرف حیران بلکہ رطب اللسان ہیں کہ اس قدر مکمل نظامِ تعمیرات اور اس قدر ترقی یافتہ شہری منصوبہ بندی اس دور میں کیسے ممکن تھی۔ مکانات کی باقاعدہ مرتب قطاریں دو منزلہ سہ منزلہ مکانات و محلات۔ حمام اور غسل خانے

حوض اور کنوئیں، ضرورت کے مطابق سیدھی اور مرتب چوڑی سڑکیں اور کشادہ گلیاں اور ان پر مستزاد اینٹوں سے ڈھکی ہوئی نالیاں اس شہری نظام کی خصوصیات ہیں۔ اس باقاعدگی اور ترتیب کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ اس دور میں غالباً میونسپل کارپوریشن جیسا فعال اور ذمہ دار کوئی ادارہ ہوگا جو اس قسم کی مدنی روایات اور پابندیوں کا خیال رکھتا ہوگا۔ یہ طرزِ تعمیر مکمل طور پر اینٹوں کا طرزِ تعمیر کہلاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ میدانی علاقوں میں مٹی پانی اور جنگلات کی کثرت نے اس قسم کے طرزِ تعمیر کو جنم دیا۔ وادیٔ سندھ کے معمار نے پکی ہوئی اینٹ کے سارے امکانات کو استعمال کیا ہے کہ اینٹ ہر قسم کی ضرورت پورا کرتی ہے اور جس سائز اور جس شکل میں ضرورت ہو بنائی جا سکتی ہے۔ ان لاکھوں کروڑوں اینٹوں کو مٹی کے گارے سے چنا گیا ہے اور مہارت کا عالم یہ ہے کہ گہری بنیادوں سے لے کر عمارت کی چوٹی تک جو بعض حالتوں میں تیس سے چالیس فٹ تک ہے، ترتیب میں کوئی فرق یا نقص نہیں آیا۔

وادیٔ سندھ کی تہذیب کے بڑے بڑے شہر فصیلوں کے اندر آباد تھے اور فصیل پکی اینٹوں سے اور بعض حالتوں میں کچی اینٹوں سے بنائی گئی تھیں۔ جن کے ساتھ باقاعدہ بڑے دروازے تھے۔ بڑے بڑے شہروں میں آج بھی مکانات کی بیس سے تیس فٹ اونچی دیواریں اپنی سلامتی بلندی، وسعت اور اپنے مکینوں کی خوش حالی اور ذوق شوق کی داستانیں سنا رہی ہیں۔

## گندھارا طرزِ تعمیر

مادرِ تاریخ عہد کے یہ عظیم عماراتی کارنامے کوئی دو ہزار سال تک قدیم دنیا کو محوِ حیرت کرتے رہے۔ اندازہ ہے کہ ۱۵۰۰ ق م سے ۱۲۰۰ ق م کے درمیانی عرصے میں فنِ تعمیر کے یہ بے بہا نمونے قدرتی آفات اور انسانی بے رحمی کی نذر ہو گئے کہ صرف آہستہ آہستہ موسم کی تبدیلی واقع ہوئی اور دریاؤں کے رخ بھی تبدیل ہونے لگے۔ اس پر مستزاد بیرونی حملوں نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اکثر محققین نے اس تہذیب کو صفحۂ ہستی سے مٹانے اور یہاں کی خوشحالی کو موت کی خاموشی میں تبدیل کرنے کی ذمہ داری آریائی حملہ آوروں پر عائد کی ہے۔ لیکن ایک بڑی تعجب کی بات یہ ہے کہ ان حملہ آوروں نے موہن جو دارو اور ہڑپہ کے اس عظیم الشان طرزِ تعمیر سے کچھ نہ سیکھا۔ کم از کم ان کے باقیات سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ آریاؤں کے تعمیرات کے جو نمونے آج منظرِ عام پر آئے ہیں۔ وہ بس یوں ہی سے ہیں اور بس ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔

پانچویں صدی قبل مسیح کے آغاز میں سرزمینِ پاکستان پر بدھ مذہب کی عمل داری کے آثار ملتے ہیں۔ بدھ مذہب کے ماننے والے اپنی روایاتی امن پسندی اور مذہبی اقدار کے احترام کے لیے مشہور ہیں۔ انہوں نے شہر بسائے تو ان میں مخصوص عبادت گاہیں بھی تعمیر کیں۔ چنانچہ ٹیکسلا، سوات، چارسدہ، تخت باہی وغیرہ کے کھنڈرات اس بات کی پوری نشاندہی کرتے ہیں۔ سکندرِ اعظم اور بعد کے آنے والے حملہ آور یونانی اور رومی طرزِ معاشرت کے بہت سے پہلوؤں کو اس سرزمین میں متعارف کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ بات پھر خرافات کی آتی ہے کہ یہ سارے شہر اور سارے مذہبی مقامات اپنی سخت جانی اور پائیداری کے باوجود فطرت کے تقاضوں اور انسانی مظالم کی نذر ہو گئے۔

ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی مساعی سے سرزمینِ پاکستان کے بہت سے حصوں میں بدھ مذہب کے آثار زیرِ زمین سے بالائے زمین لائے گئے ہیں۔ ان میں ٹیکسلا اور سوات سب سے زیادہ اہم ہیں۔ ٹیکسلا یکے بعد دیگرے تین دفعہ بسایا گیا۔ ایک شہر وہ ہے جو تقریباً پانچ سو قبل مسیح میں بسایا گیا تھا۔ یہ شہر قدیم ہندوستان کی مقامی روایات کے سارے عوامل کی عکاسی کرتا ہے جہاں کی گلیاں تنگ و تاریک اور مکانات کی ساخت معمولی اور بے ترتیب ہے۔ مقامی پہاڑوں سے حاصل کئے گئے پتھروں کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں سے مٹی کے گارے سے یہ

مکانات بنائے گئے ہیں۔ ان میں نہ وہ شان و شوکت ہے اور نہ وہ ترتیب جو ہمیں ایک ہزار سال پہلے کی عمارت ہی موہنجوڈارو میں ملتی ہے۔ ٹیکسلا کا یہ قدیم شہر آج بھڑ ماؤنڈ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

باختری یونانیوں کا عہد حکمرانی اس خطۂ زمین پر پہلی صدی قبل مسیح اور پہلی صدی عیسوی کی بات ہے ٹیکسلا پہلے اس خاندان کی یورشوں کی آماجگاہ رہا۔ لیکن بعد میں اسے اپنا صدر مقام بنا لیا۔ بھڑ ماؤنڈ یہ قدیم شہر نئے فاتحین کی ضرورتوں کے لئے کافی نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی جو تمرا نالے کی دوسری جانب سرکپ مقام پر باقاعدہ فصیل کے اندر بنایا گیا تھا۔ سرکپ تمدنی زندگی کے بھرپور آثار کی عکاسی کرتا ہے جہاں شہر کی منصوبہ بندی اور عمارات کی ساخت یونان و روم کے طرز تعمیر سے بڑی مماثلت رکھتی ہے۔ سیدھی سیدھی سڑکیں اور گلیاں متوازی اور ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گزرتی ہیں۔ سڑکوں اور گلیوں کے اس جال نے پورے شہر کو باقاعدہ مختلف حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ جن میں تجارتی مرکز، بازار، دکانیں رہائشی مکانات، عبادت گاہیں، محلات اور انتظامی امور سے متعلق عمارات ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں رہائشی عمارات سے زیادہ توجہ، محنت اور پیسہ مذہبی عمارات پر صرف کی جاتی تھیں چنانچہ ٹیکسلا میں بنے ہوئے اسٹوپہ اور خانقاہیں بدھ مذہب کے طرز تعمیر کی بہترین نمائندگی کرتی ہیں۔ بدھ مذہب میں مُردوں کی راکھ دفن کرکے اس پر اسٹوپہ بنانے کا رواج تھا۔ جس کا آغاز مہاتما بدھ کی باقیات سے ہوتا ہے۔ ابتدا تو ظاہر ہے کہ سادہ اور معمولی تھی لیکن جب بدھ مذہب کو شاہانہ سرپرستی حاصل ہوئی تو اس میں بہت سی باریکیاں آموجود ہوئیں اور ان کو فن تعمیر کا باقاعدہ ایک طرز بنا یا گیا۔ جسے ہم گندھارا طرز تعمیر کہتے ہیں۔ جہاں اگر ایک طرف اسٹوپہ کی تعمیر اور تزئین و آرائش کے باقاعدہ اصول وضوابط مرتب کئے گئے تو دوسری طرف خانقاہوں کو محلات کی شکل دی گئی۔ جن میں مذہبی زندگی کو خوش اسلوبی اور فراغت سے بسر کرنے کے سارے سامان موجود تھے بدھ مذہب کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے والے قیام کرتے تھے یا بدھ مذہب کے عقیدت مند یاترا کے لئے آیا کرتے تھے۔

یہ خانقاہیں بڑے اہتمام سے سرسبز و شاداب پہاڑوں کی چوٹیوں پر بنائی جاتی تھیں۔ جن میں رہائشی حجرے، غسل خانے، باورچی خانے، طعام خانے، حوض اور طہارت خانے بنائے جاتے تھے۔ مذہبی تعلیم و تربیت کے لئے بڑے بڑے ہال اور کمرے مخصوص ہوتے تھے دیواروں اور مناسب جگہوں پر محرابی طاق ہوتے تھے جن میں مہاتما بدھ کی مورتیاں رکھی جاتی تھیں۔ یہ عمارتیں پتھر کے تراشے ہوئے بلاکوں سے بنائی جاتی تھیں۔ چنائی کا یہ تزئینی انداز گندھارا طرز تعمیر کا بڑا خوبصورت حصہ ہے اور اپنے اندر تدریجی ارتقا کی ایک داستان سموئے ہوئے ہے۔ ابتدا میں یہ طرز معمولی چھوٹے بڑے پتھروں کی بے ربط چنائی سے تعبیر تھا۔ جسے ماہرین نے "روبل طرز" کی بے ربط چنائی کہا ہے لیکن بعد میں پتھر کے انہیں بلاکوں کو تراش کر ان سے اس ترتیب اور عمدگی سے چنائی کی گئی کہ نئے ڈیزائن مرتب ہوئے ان نئے ڈیزائنوں کو "ایشلر نما" اور "ایشلر" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان عمارتوں کی چھتیں لکڑی کی کڑیوں اور تختوں سے بنائی گئی تھیں۔ جو لکڑی ہی کے ستونوں پر ایستادہ تھیں۔

گندھارا معماروں نے اسٹوپہ کی تعمیر و تزئین پر خانقاہوں سے زیادہ توجہ صرف کی اور اس صنفِ معماری کے عروج و ارتقاء کے مختلف مراحل کی تکمیل کے لئے یونانی اور رومی اسالیب سے بھی استفادہ کیا۔ اسٹوپہ کی عمارت کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا اور ان سب حصوں میں پلیٹ فارم اور "ڈرم" اور قبہ بہت اہم تھے۔ قبہ پر سات چھتریاں آویزاں تھیں جو سات آسمانوں سے تعبیر تھیں۔ پلیٹ فارم کے چاروں اطراف کو مختلف سائز کی مہاتما بدھ اور دوسرے بتوں کی مورتیوں سے بھی مزین کیا جاتا تھا جسے گندھارا آرٹ کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ سب پتھروں میں بھی بنے ہیں۔ چونے اور مٹی میں بھی۔ جن کی ساخت پر بیرونی اثرات خاصے نمایاں ہیں۔

لیکن یہ اثرات جلد ہی مقامی اثرات و عوامل کے سامنے ماند پڑنے لگتے ہیں اور آرٹ کے ان شاہپاروں میں حسن پوری طرح نمایاں ہونے لگتا ہے۔

## اسلامی اسالیبِ تعمیر کا آغاز و ارتقاء

آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں اس برصغیر میں مسلمان فاتحین کی آمد شروع ہوتی ہے۔ ۷۱۲-۷۱۱ عیسوی میں محمد بن قاسم نے دیبل سے لے کر ملتان تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ اور یوں برصغیر میں اسلامی حکومت کی داغ بیل پڑی۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی اور سب سے پہلی ضرورت ظاہر ہے کہ اہتمامِ صوم و صلوٰۃ تھی۔ اور اس کے لئے مساجد کا قیام ناگزیر۔ چنانچہ اس عہد اور بعد کے مسلمان مورخین اس بات کا خاص طور سے ذکر کرتے ہیں کہ محمد بن قاسم نے اپنے مفتوحہ شہروں میں سب سے پہلے مسجد کی تعمیر کا اہتمام کیا۔ محمد بن قاسم کی بنوائی ہوئی کوئی مسجد اب موجود نہیں۔ لیکن جو آثار ہمیں بھنبور یعنی دیبل اور منصورہ میں مسجدوں کے ملے ہیں، ان سے اس دور کے طرزِ تعمیر پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ دونوں مسجدیں برصغیر ہندو پاکستان میں تعمیر شدہ اولین مسجدوں میں سے بھنبور کی مسجد ۱۰۹ ہجری یا ۷۲۷ء میں یعنی محمد بن قاسم کی فتوحات کے پندرہ سولہ برس بعد بنی۔ اس چھوٹی سی مسجد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں محراب نہیں بنی تھی۔ یہ بات بڑی دلچسپ اور اہم ہے کہا جاتا ہے کہ مسجد میں باقاعدہ محراب کی شکل بعد میں متعارف ہوئی۔ یہ مسجد پتھر سے بنائی گئی تھی۔ لیکن چھت لکڑی کی تھی اور لکڑی کے ستونوں پر ایستادہ تھی جب کہ فرش چوکور اینٹوں کا تھا۔ بعد کی تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ عرب گورنر ابن ہارون کے عہد میں یہ مسجد تعمیر ہوئی۔

منصورہ کی مسجد دیبل کی مسجد سے زیادہ وسیع و عریض تھی اور اس کو زیادہ اہتمام سے بنایا گیا تھا یہ مسجد گو اینٹوں سے بنی تھی۔ لیکن حسبِ دستور چھت اور ستون لکڑی کے تھے اور آرائش تک لکڑی کا منقش کام تھا۔ منصورہ کی مسجد سے اب تک کے دریافت شدہ کتبوں میں سے کوئی بھی تاریخی کتبہ نہیں لیکن دلچسپ امر یہ ہے کہ اس مسجد کے خرابات میں محراب کے آثار موجود ہیں مورخین فنِ تعمیر کے بیانات کے مطابق چونکہ محراب کا آغاز اموی خلیفہ ولید اوّل کے عہدِ خلافت میں ہوا۔ خود منصورہ بلاذری کے مطابق ۷۲۷ء یا اس کے دو ایک سال بعد آباد ہوا۔ ظاہر ہے کہ عمر بن القاسم نے شہر کے ساتھ مسجد بھی تعمیر کی ہو گی لیکن تاریخی حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی مرمت و توسیع کا کام ۷۵۲ء میں موسیٰ بن کعب تمیمی کے ہاتھوں انجام پایا۔ قیاس ہے کہ مسجد کے موجودہ کھنڈرات جو کھدائی سے برآمد ہوئے ہیں، اسی بعد کے عہد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مسجد کے ساتھ اس زمانے کی روایات کے مطابق ماذنہ بھی کے آثار بھی برآمد ہوئے ہیں۔

ان مساجد کے علاوہ عرب عہد کی چند اور عمارات کے نمونے بھی بھنبور اور منصورہ میں ملے ہیں۔ ان میں سے اہم ترین بھنبور کی فصیل کے بعض حصے ہیں جن کا تعلق بنی اُمیّہ اور بنی عباس کے عہدِ خلافت سے ہے بھنبور کا شہر دو حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک وسیع و عریض قلعہ بند شہر جس کے چاروں طرف فصیل تھی، دوسرے میدانی شہر جہاں صنعت کار اور دوسرے طبقوں کے لوگ آباد تھے۔ آج بھی یہ فصیل ۱۹ فٹ تک کی بلندی میں موجود ہے۔ جس کے ساتھ مختلف فاصلوں پر بیشن بنائے گئے ہیں۔ بھنبور کے سارے شہر کی تعمیر میں پتھر کا استعمال ہوا ہے۔ شہر کے اندر مختلف قطعات میں رہائشی مکانات، محلات، بازار، مسجد اور دوسری عمارات ہیں۔ ایک مندر بھی ملا ہے جو مسجد کے قریب ہی کسی دور میں بنایا گیا تھا۔ گھارو نامی کریک کے ساتھ سیڑھیاں اور ایک پلیٹ فارم سمندری پانی تک بنائے گئے ہیں یہ مقام بندرگاہ کا وہ حصہ معلوم ہوتا ہے جہاں جہاز اور کشتیاں لنگر انداز ہوتے تھے۔

منصورہ کا شہر خالصتاً اینٹوں کا شہر تھا اور بھنبور کی طرح قلعہ بند جہاں بڑے بڑے بازار اور محلات تھے۔ دلچسپ ترین امر یہ ہے کہ مسجد کے آثار میں سے نسخ میں لکھے ہوئے قرآن پاک کے وہ نسخے بھی ملے جو آگ میں جلے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ منصورہ کی مسجد میں اتفاقاً آگ لگنے سے شہید ہوئی اور مسجد میں تلاوت کے لئے یہ قرآن کے نسخے بھی اس آگ کی نذر ہو گئے۔ منصورہ اپنے زمانہ میں عرب دنیا کا اہم شہر تھا کہ اس عہد کے تقریباً تمام مورخین اور جغرافیہ نویس اس کا ذکر کرتے ہیں۔ اس شہر کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی بعض سڑکیں دو سو فٹ تک چوڑی تھیں اور شہر میں آمدورفت کے لیے فصیل میں آٹھ سے زیادہ دروازے تھے۔

## وسطی ایشائی طرزِ تعمیر کے اثرات

برصغیر میں مسلمانوں کی آمد فتوحات اور قیام یہاں کے معاشرے میں ایک زبردست مذہبی، معاشرتی اور سماجی تبدیلیوں کے محرک ہوئے نہ صرف یہ کہ مقامی لوگ کثرت سے مشرف بہ اسلام ہوئے بلکہ عربی مسلمانوں کی بستیاں اپنے ساتھ وہ جزئیات خصوصیات بھی لائیں جو یہاں کے اپنے رہنے والوں کے لئے نئی اور انوکھی تھیں۔ رفتہ رفتہ اسلام کے زیرِ اثر جو معاشرہ وجود میں آیا خاص طور پہ ان علاقوں میں جہاں اب پاکستان کا حصہ ہیں، وہ اگر خالصتاً عربی یا وسطی ایشائی نہیں تھا۔ تو مقامی معاشرے سے متمیز ضرور تھا۔ چنانچہ اس خطے کا معاشرہ اپنی ترقی و بہبود کے لئے آریائی تہذیب سے متاثر ہونے کی بجائے اسلامی مرکزوں سے مستفیض و مستعد ہونے لگا اور ایک وقت وہ آیا کہ سرزمین حجاز کے علاوہ بغداد و سمرنا، سمرقند و بخارا اور دمشق و ترمذ کے علمی مرکز سے وابستگی کے بغیر مسلمانِ برصغیر کے لئے تحصیلِ علم کی تکمیل ممکن تصور نہیں ہوتی تھی۔ پھر محمود غزنوی کے پے در پے سترہ حملوں نے اس ابہام و تفہیم کو اور آگے بڑھایا۔ ایران و عرب اور وسطی ایشیا سے تجارتی قافلوں کی آمدورفت بھی روزانہ کا معمول بن گئی۔ ان مرکزوں کے تاجر تجارت کی خاطر ملتان، دیبا پور اور چھاور ہ پور آتے، اپنا مال فروخت کرتے اور یہاں کا مال لے کر واپس چلے جاتے۔ محمود غزنوی کے بعد شہاب الدین محمد غوری کی فتوحات اور قطب الدین ایبک اور ناصر الدین قباچہ کی سلطنتیں ان روایات اور رشتوں کو مرتب اور استوار کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوئیں۔ ناصر الدین قباچہ پورے بائیس برس ملتان اور اُوچ کے علاقوں میں علم و ادب کی سرپرستی کرتا رہا۔ اس کا روبار باہر سے آنے ہوئے بے شمار عالموں، ادیبوں، سیاسی شخصیتوں، معزول شہزادوں اور فنکاروں کا ملجا و ماویٰ رہا۔ بارھویں اور تیرھویں صدی منگولوں کی یورشیں اسلامی تہذیب و تمدن کی تباہی کا سبب بنیں تو برصغیر کی محفوظ و مامون فضا ان اجڑنے والوں کو پناہ دینے لگی اور ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں یہ تارکینِ وطن وسطی ایشیا اور ایران کے مختلف مرکزوں سے اٹھ کر اُوچ، دیپال پور، ملتان میں آبسے۔ اس دور میں عام طور سے درۂ بولان ہندوستان میں داخلے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ ان مقامات کو ایک قسم کی بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

پھر اس دور کے صوفیائے کرام بالخصوص سہروردیہ سلسلے کا وہ بزرگ خانوادہ جس کے سرخیل حضرت بہاؤالدین ذکریاؒ ہیں اس علاقے میں اسلام کی اشاعت کا موجب بنا۔ ان بزرگوں کی تعلیمات سے ایک منزہ معاشرہ وجود میں آیا۔ اسی معاشرے نے فنِ تعمیر کو ایک نیا اسلوب بھی دیا۔ جسے ملتان کا اسلوبِ تعمیر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ اسلوب خالصتاً وسطی ایشائی فنِ تعمیر سے مستعار اور متاثر تھا اور اس کی ساری جزئیات کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھا۔ گو اُس کے ابتدائی نمونے ہمیں بلوچستان کے شہر بیلا یا آج کے بہاولپور کے رحیم یار خاں اور آوم واہان میں ملتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے کی مہتم بالشان ابتدا خود حضرت بہاء الحقؒ کے مزار سے ہوتی ہے اور

انتہا انہیں کے بزرگ پوتے۔ حضرت رکن عالمؒ کے مزارِ ذیشان سے پاکستان کے اسلامی فنِ تعمیر کے اسلامی اسلوب میں بہاالحقؒ کے مزار کو وہی حیثیت حاصل ہے، جو وسطی ایشیا کی اسلوبِ تعمیر میں سامانیوں کے مقبرے کو حاصل ہے اور مزارِ رکنِ عالمؒ کی حیثیت یہاں وہی ہے جو گورِ امیر اور تاج محل کو یہاں یہ بات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ اس قسم کے مزارات کی تعمیر کی روایت برصغیر میں اس عہد سے پہلے کہیں اور کبھی نہیں تھی۔ یہ مزارات ان بزرگ صوفیائے کرام نے اپنی زندگی میں اپنی آخری آرام گاہ کے طور پر تعمیر کرائے تھے اور پختہ اینٹ سے بنے ہیں۔ ان کی تقسیم عام طور سے تین طبقوں میں ہے۔ ڈھلوار، دیواریں، ہشتم بالشان گنبد، لکڑی کے شہتروں سے بنے ہوئے دیواروں کے قالب اور بیرونی سطح پر مختلف سائز کی سادہ یا روغنی رنگدار اینٹوں کی تزئین، اس طرزِ تعمیر کی نمایاں خصوصیات ہیں یہ تزئین اور سجاوٹ بعض اوقات اقلیدسی شکلوں میں ہے۔ یا گل بوٹے ہیں یا پھر قرآنی آیات، جو لکڑی پر کندہ بھی ہیں۔ مزارِ رکنِ عالمؒ اس طرز کا شاہکار ہے جہاں اس قسم کی تزئین کے نمونے اپنے انتہائے کمال پر ملتے ہیں۔

ملتان کے علاوہ اس فنِ تعمیر کے مراکز ہیں اُوچ، سہون، دیپالپور، سیت پور، (مظفر گڑھ) شیر گڑھ دائرہ دین پناہ، ڈیرہ غازی خاں، ڈیرہ اسماعیل خاں جلال پور (جہلم) خاصے اہم ہیں کہ ان مقامات پر اس اسلوب کے بہت سے مزارات بنائے گئے۔ گویا پاکستان کے اور کچھ نہیں تو تین چوتھائی حصے پر اس طرزِ تعمیر کی حکمرانی تھی۔ حیران کن اور دلچسپ بات یہ ہے کہ رکن عالمؒ کے مزارِ ذیشان کا اسلوب اس قدر دیرپا اور ہمہ گیر ثابت ہوا کہ ماہ و سال کی تبدیلیاں اس کی مقبولیت کو کسی طرح بھی متاثر نہ کر سکیں حتیٰ کہ مغل دور کا طرزِ تعمیر بھی خاصے عرصے تک اپنی پوری باریکیوں اور رعنائیوں کے باوجود اس طرز پر حاوی نہ آسکا اور مدتوں تک اس سرزمین پر ایسے مزارات بنتے رہے جو رکن عالم کے مزار سے متاثر ہی نہیں، اس کی سراسر نقل معلوم ہوتے تھے چنانچہ ملتان ہی میں سلطان علی اکبر کا مقبرہ دائرہ دین پناہ میں حضرت عبدالوہابؒ کا مقبرہ جلال پور شریف میں پیر غلام حیدر شاہ کا مقبرہ اسی طرزِ تعمیر کی مقبولیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ موخر الذکر ۱۳۰۴ھ کی تعمیر ہے۔ یعنی اب سے کوئی پچپن برس پہلے۔

## سندھ کا اسلامی طرزِ تعمیر

سندھ باب الاسلام ہے اور سندھ ہی اسلامی فنِ تعمیر کا مرکزِ آغاز۔ بھنبور اور منصورہ کی عمارتوں کا ذکر ہو چکا۔ بعد کے عہد میں بھی سندھ میں واقع تہذیب و ثقافت کے مرکزوں نے اپنی دیرینہ روایت کو برقرار رکھا اور ایک مخصوص و متمیز طرز کی ترویج یہاں ہوئی۔ ان مرکزوں میں اہم ترین ٹھٹھہ کا قدیم تاریخی شہر ہے خاص طور پر اس کا وسیع ترین تاریخی قبرستان جسے مکلی کا قبرستان کہتے ہیں۔ یہاں مساجد و مقابر کی شکل میں اسلامی فنِ تعمیر کے بہت سے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ جن کا تعلق چودہویں صدی سے اٹھارویں صدی تک ہے بیشتر مزارات مقامی حکمرانوں، امراء شعراء وغیرہ کے ہیں۔ ان عمارات کو طرزِ تعمیر کے اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی خشتی عمارات اور سنگی عمارات۔ خشتی عمارات کی بنیادیں بھی ازارہ تک پتھر کی ہیں۔ یہ اینٹیں نہایت اہتمام اور عمدگی سے بنائی گئی ہیں ان عمارات کی بیرونی اور اندرونی سطح کو روغنی ٹائلوں اور اینٹوں سے مزین کیا گیا ہے۔ خشتی عمارات میں داب گران مسجد (۱۵۸۸ء) شاہجہانی مسجد (۱۶۴۴ء۔ ۴۷) مقبرہ جانی بیگ ترخان (۱۶۰۱ء) مقبرہ دیوان شرفا خان (۱۶۳۸ء) مقبرہ سلطان ابراہیم (۱۵۳۸ء) اس نوعیت کے بہترین نمونے ہیں۔ جانی بیگ سندھ کا آخری خود مختار حکمران تھا۔ اس کا مقبرہ خشتی مقابر میں خاصا اہم مقام رکھتا ہے خاص طور سے اس کا روغنی اینٹوں کا کام واقعی لاجواب ہے اور سندھی صناعی کا عمدہ نمونہ ہے۔ مقبرہ کو ایک چبوترے پر بنایا گیا ہے۔ جسے زرد پتھر سے مزین کیا گیا ہے۔ مغربی جانب پتھر ہی کی بنائی ہوئی منقش محراب ہے۔ مقبرے کا پلان ہشت پہلو ہے بعض جگہوں پر عربی کے

کتبے بھی پتھر پر کندہ کر کے نصب کئے گئے ہیں۔ کچھ کتبے روغنی اینٹوں پر بھی ہیں۔ اس کے علاوہ مکلی کے قبرستان کی بنی ہوئی عمارتوں میں شرفا خان کا مقبرہ (۱۶۳۸ء) سارے مقبروں میں سب سے زیادہ محفوظ رہا ہے۔ تعمیراتی اعتبار سے مربع شکل کی عمارت ہے جس کو ایرانی طرز کے گنبد سے مزین کیا گیا ہے چاروں کونوں پر چار مینار ہیں جن کے اندر سیڑھیاں بنائی ہیں جو مقبرے کی چھت تک جاتی ہیں۔ مقبرے کی دیواریں سرخ اینٹوں کی ہیں اور اینٹوں کے درمیان مصالحے کو روغنی اینٹوں سے لیس کیا گیا ہے جو مقبرے کی خوبصورتی کو چار چاند لگاتا ہے۔ گنبد کے اندرونی سطح کو بھی روغنی اینٹوں سے سجایا گیا ہے تیسرا قابل ذکر مقبرہ سلطان ابراہیم کا ہے سلطان ابراہیم، عیسٰی خان ترخان کا لڑکا تھا۔ اور ۱۵۵۸ء میں فوت ہوا پلان اس مقبرے کا ہشت پہلو ہے۔ جس پر مخروطی انداز کا گنبد بنایا گیا ہے مقبرے کے آٹھوں پہلو محرابی طبقوں سے مزین ہیں جنہیں سطح سے کچھ اندر کی طرف بنایا گیا ہے شمالی اور جنوبی پہلوؤں میں دروازے ہیں۔ قرآنی آیات مناسب مقامات پر آویزاں ہیں۔

ٹھٹھہ کی سنگی عمارات اپنے نقش و نگار کی وجہ سے خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کا ثانی اگر کہیں مل سکتا ہے تو صرف فتح پور سیکری کی عمارات ہی ہیں۔ جن کا عہد تعمیر اکبر کا زمانہ ہے۔ تکنیکی اعتبار سے یہ نقوش دو طرح کے ہیں۔ ایک طرز تو وہ ہے جسے فیلگری نمونہ کہا گیا ہے جس میں نقوش خاصے ابھرے ہوتے ہیں اور ان کی زمین دبی ہوتی ہے دوسری طرز اس کے برعکس ہے یعنی زمین ابھری ہوئی اور نقوش اس زمین میں جذب شدہ ان دونوں طرز کے بہترین نمونے ٹھٹھہ کی سنگی عمارات میں ملتے ہیں۔ یہ باقاعدہ مقابر میں بھی ہیں اور علیحدہ علیحدہ قبروں کے تعویذ کی شکل میں بھی جن کو باقاعدہ چبوتروں پر بنایا گیا ہے۔ نقوش کی شکل بعض جگہ اقلیدی ہے اور بعض جگہ پھول پتیوں کی شکل میں۔ لیکن اکثر جگہ قرآنی آیات اور تاریخی تفصیلات بھی اسی تکنیک میں درج ہیں یہ واقعی فن کی معراج ہیں۔ کہیں طغرا ہے اور کہیں نسخ و نستعلیق۔ جو نہ صرف فن کار کی فن کارانہ صلاحیتوں کی غماز ہیں بلکہ ان سرپرستوں اور قدردانوں کی سرپرستی اور قدردانی کی بھی عکاس ہیں جنہوں نے ایسی بہترین مثال قائم کی۔ قبروں کے تعویذوں کے پتھروں کی سطح کو مختلف حصوں میں اس مقصد کے لئے تقسیم کیا گیا۔ بارڈر بیلوں سے آراستہ ہے اور اندرونی حصے کے مختلف سائز اور شکلوں سے پینل کتبوں کے لئے مخصوص ہیں۔ بعض میں تو فارسی کے کلاسیکی شعرا سعدؔی، حافظؔ، نظامؔی، رومؔی کے اشعار درج کئے گئے ہیں اور پھر ان شخصیتوں کے نام تاریخِ وفات اور دوسری معلومات دی گئی ہیں جو ان قبروں میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ ان قبروں میں سے بعض قبروں کو سائبان نما چھتریوں سے مزین کیا گیا ہے کہ مکلی کے قبرستان کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ جسے بعد میں چوکھنڈی کے قبرستان میں بھی بعض قبروں کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔ یہ چھتریاں پتھر کے منقش ستونوں پر ایستادہ ہیں۔ یہ ستون کہیں بارہ ہیں اور کہیں آٹھ ان ستونوں پر چھتری ہے جس کی بیرونی شکل گنبد نما ہے۔ جسے کاربینگ انداز میں تعمیر کیا گیا ہے۔

سنگی عمارتوں میں نظام الدین کا عالی شان مقبرہ قابل ذکر ہے۔ جام خاندان کے اس حکمران نے جنوبی سندھ پر ۱۴۶۱ء سے لیکر ۱۵۰۹ء تک حکومت کی۔ اس کے مقبرے پر پتھر میں جو تزئینی کام کیا گیا ہے۔ اس کی خوبصورتی اور رعنائی کا جواب نہیں۔ پھول پتیوں کی بیلیں ہیں جو بڑی ترتیب سے ساری سطح پر مزین کی گئی ہیں۔ اس مقبرے کی ساخت اور تزئین میں ہمیں گجراتی طرز تعمیر کی نمایاں جھلک ملتی ہے۔ ان کے ساتھ ہی اس پر قرآنی آیات ثلث خط میں بڑی چابکدستی اور مہارت سے کندہ کی گئی ہیں۔

اس مقبرے کے علاوہ، مبارک خان کا مقبرہ (م ۱۴۹۰ء) طغرل بیگ کا مقبرہ (م ۱۶۷۹ء) آہنسہ بائی کا مقبرہ اور پھر ترخان حکمرانوں، شہزادوں اور امیروں کے مقبرے بھی طرز تعمیر کے بہترین نمونے ہیں۔ ان میں جان بابا اور عیسٰی خان ترخان کے مقبروں کا

اٹھان اور طرزِ تزئین ہمیں پھر فتح پور سیکری کی تعمیراتی زیب و زینت کی یاد دلاتی ہے۔ غرض کہ سندھ کا طرزِ تعمیر اپنی انفرادیت کے اعتبار سے پاکستان کے فنِ تعمیر کا ایک اہم حصّہ ہے۔

## شاہانِ مغلیہ کی شاہانہ عمارتیں

ملتان، سندھ اور بلوچستان میں اسلامی فنِ تعمیر کو بلاشبہ عروج حاصل ہوا۔ لیکن اس عروج کو مزید تکمیل و ترقی کے مراحل سے مغل حکمرانوں کے دور میں روشناس کیا گیا اور جس کے بہترین نمونے پاکستان کی سرزمین پر پاکستان ثقافتی دارالسلطنت تھا۔ ظہیر الدین محمد بابر نے اپنے لڑکے کامران مرزا کو ۱۵۲۶ء میں لاہور کی حکومت سونپی۔ کامران مرزا کم و بیش دس سال لاہور کے سیاہ و سفید کا مالک رہا۔ اس طویل دورِ اقتدار کی یادگار ایک بارہ دری ہے جو اس نے ایک وسیع و عریض باغ کے درمیان میں تعمیر کی تھی۔ یہ باغ دریائے راوی کے کنارے آباد تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ باغ ختم ہو گیا اور بارہ دری دریا کے کنارے سے دریا کے درمیان آ گئی اور پھر اس کا آدھا حصّہ بھی دریا برد ہو گیا۔ مغلیہ طرزِ تعمیر کے ابتدائی دور کی آج یہ خستہ و شکستہ عمارت تاریخی اور تعمیری دونوں اختیارات سے اہم ہے۔ لاہور میں یہ وہ بارہ دری ہے جو ایک حوض کے درمیان میں بنائی گئی۔ یہ حوض بہت وسیع و عریض تھا اور جس کے چاروں طرف نہریں تھیں اور ان میں فوارے نصب تھے۔ اس طرز کی مزید دو عمارات آج ہمیں معلوم ہیں۔ ایک شیخوپورہ میں ہرن مینار کے ساتھ کی بارہ دری اور دوسرے لاہور کی وہ بارہ دری جس میں دارا شکوہ کی بیوی نادرہ بیگم مدفون ہے۔ موخر الذکر بارہ دری اغلباً دارا شکوہ کے عہد میں تعمیر ہوئی اور حضرت میاں میرؒ کے مزار کے قریب واقع تھی۔ بعد میں نادرہ بیگم کو اس بارہ دری میں دفن کیا گیا۔

فنِ تعمیر کی صحیح معنوں میں سرپرستی اکبر کے عہد سے شروع ہوتی ہے۔ شہنشاہ اکبر لاہور میں ۱۴ سال تک مقیم رہا۔ یہی وہ عہد ہے جب کہ لاہور کو "دارالسلطنت" کا درجہ دیا گیا۔ بادشاہ نے قدیم نیم پختہ اور مٹی گارے سے بنے ہوئے قلعہ کی جگہ پختہ قلعہ تعمیر کیا اور ضرورت کے مطابق محلات تعمیر کرائے آج اکبری عہد کی عمارات قلعہ میں بہت کم رہ گئی ہیں لیکن جو باقی ہیں اُن سے اس عہد کے فنِ تعمیر کی بڑی حد تک نمائندگی ہوتی ہے خیال ہے کہ قلعہ کے دیوانِ عام و خاص کے علاوہ زنانہ محلات جیسے عرفِ عام میں آج جہانگیری احاطہ کہتے ہیں اکبری دور کی یادگار ہے یا زیادہ سے زیادہ وہ اختتام کو جہانگیر کے عہد میں پہنچا۔

خود جہانگیر کے عہد کی عمارات بھی لاہور میں کچھ زیادہ نہیں، قلعہ کے وہ حصّے جنہیں مکاتیب خانہ اور دالانِ سنگِ مرمر کہتے ہیں۔ اس دور کی یادگار ہیں۔ مکاتیب خانہ اصل میں جہانگیری محلات کی ڈیوڑھی تھی۔ جہاں محل میں داخل ہونے والے مہمانوں کو خوش آمدید کہا جاتا تھا۔ یہ محلات عہدِ شاہجہانی میں تعمیر ہونے والے محلات کے سلسلے میں شکست و ریخت کی نذر ہو گئے جس کے زمانے میں دیوانِ خاص، شیش محل، شاہ برج، نولکھا وغیرہ جیسی نفیس عمارتیں بنیں۔ فنِ تعمیر میں شاہجہان کا بے پناہ شغف ان عمارات کے خدوخال میں بہت نمایاں ہے یہ وہ دور ہے جس میں سرخ پتھر کی جگہ شفاف سنگِ مرمر نے لے لی اور عام اور بے ہنگم محرابوں کی جگہ خوبصورت محرابیں بنائی گئیں۔ سنگِ مرمر کی شفاف سطح کو رنگ برنگ کے قیمتی اور نیم قیمتی پتھروں کے ذریعے نت نئے ڈیزائن سے مرصع کیا گیا اور پچی کاری کے نفیس ترین مثال شیش محل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہجہان نے اپنی چہیتی بیگم ممتاز محل کے لئے یہ شاہی محل ۱۶۳۱ء میں بنانے کا حکم دیا کہ جب بھی ممتاز محل لاہور میں مقیم ہو تو اسی محل میں قیام کرے۔ وقت کے بہترین معمار و مصور اس کی تعمیر و تزئین کے لئے مقرر کئے گئے اور خود آصف خاں اور نواب وزیر خاں اس

پنجاب
مصور۔ استاد اللہ بخش

عورتیں اور گھڑے — عمل: زین العابدین

گھر

عمل :- زبیدہ آغا

August '68
سرمد
عمل :- صادقین

رنگ

عکس :- گل جی

کمپوزیشن
عمل :- احمد پرویز

ایک منظر — عمل: ایس۔ صفدر

خطاطی

عکس: حنیف رامے
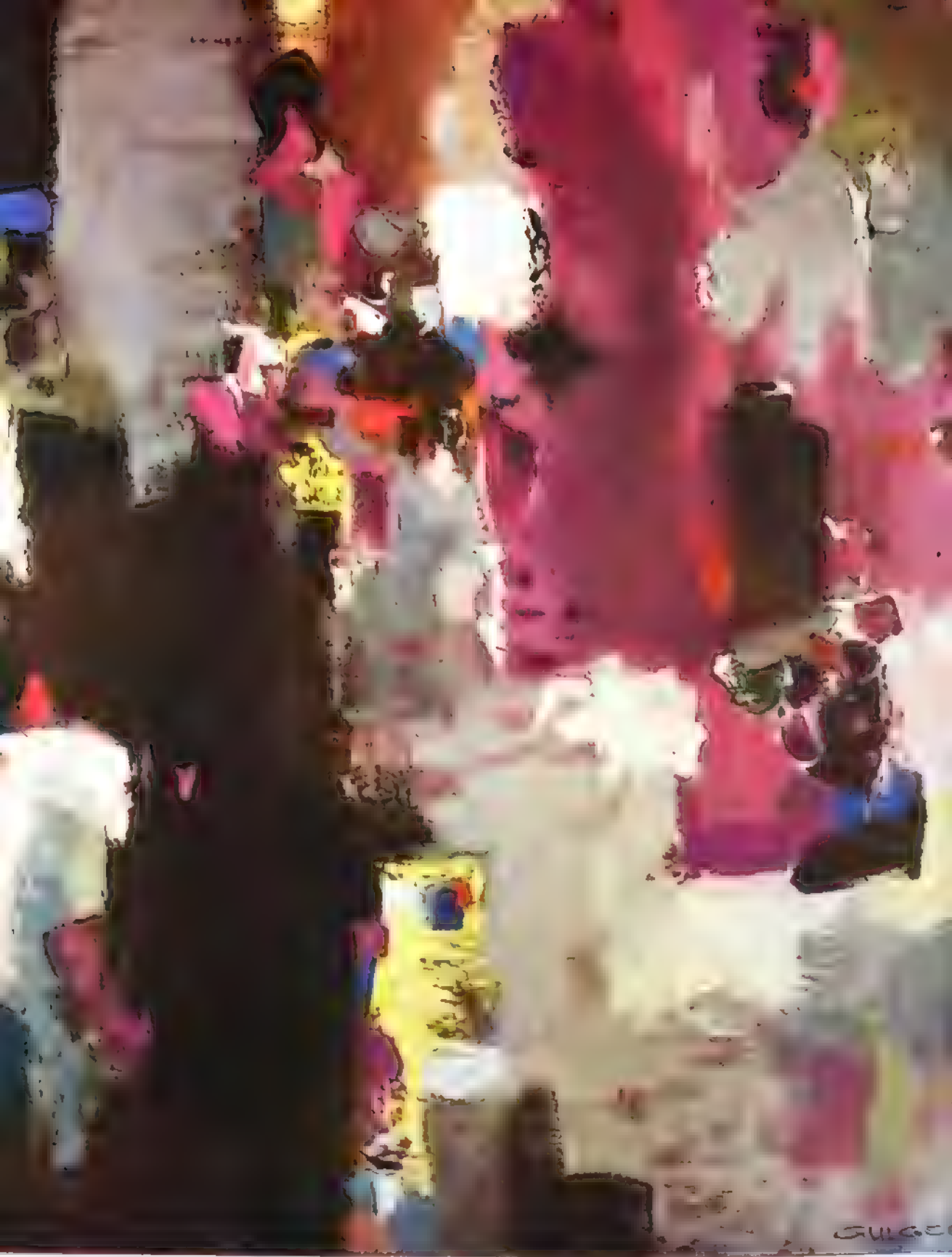
اہم عمارت کی تعمیر کی نگرانی کے لیے مقرر کئے گئے اور جب یہ شاہی محل جسے شاہ برج کا نام دیا گیا تو دنیا نے دیکھا کہ مغل طرزِ تعمیر کا تیسرا عجوبہ معرضِ وجود میں آ گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ممتاز محل کو یہ عجوبۂ عالم دیکھنے کا موقع نصیب نہ ہوا کہ وہ خود ۱۶۳۱ء میں وفات پا چکی تھی۔ بہرحال پچی کاری کا نازک ترین قیمتی ترین نمونہ وہ پویلین ہے جسے نولکھا کا نام یوں دیا گیا کہ اس کی تعمیر پر اس وقت ۹ لاکھ روپے کا خرچ آیا۔ پچی کاری کے علاوہ شاہجہانی محلات میں سنگِ مرمر کی جالیاں بھی استعمال کی گئی ہیں جو اپنا جواب آپ ہیں۔ پھر سنگِ مرمر کے فرش پر بھی اقلیدی اور پھول پتیوں کا کام رنگین پتھروں سے کیا گیا ہے اور باہر کی دیوار کا رُخ روغنی اینٹوں کو مختلف نمونوں اور حصوں میں کاٹ کر ترتیب سے جوڑا گیا ہے اور اس طریقے سے ان گنت ڈیزائن پیدا کئے گئے ہیں۔ تزئین و آرائش کا یہ اہتمام مغل طرزِ آرائش میں اور کہیں نہیں ملتا۔ جہاں انسانوں، جانوروں اور مافوق الفطرت حشرات کی شبیہیں بڑی چابکدستی سے بنائی گئی ہیں۔ شیش محل کے زیرِ زمین محلات بھی دیدنی ہیں۔ جنہیں سرد خانے کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ آبِ رواں کی بے شمار کارفرمائیاں اپنی پوری رعنائیوں سے ان محلات میں جلوہ گر ہیں جو ماحول کو پرسکون، خوشگوار اور ترو تازہ رکھنے میں مدد کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں بنایا ہوا عالمگیری دروازہ قلعے کی عمارات کی آخری اہم عمارت ہے جو مغلیہ عہدِ حکومت میں تعمیر ہوئیں۔ قلعہ کی فصیل میں جو عہدِ اکبری کی یادگار ہے دو دروازے ہیں مشرقی اور مغربی۔ اورنگ زیب کے عہد میں جب بادشاہی مسجد تعمیر ہوئی تو بادشاہ نے قلعہ کے مغربی دروازے کو نہ صرف تبدیل کر دیا کہ بادشاہی مسجد کے عین مقابل ہو بلکہ اس کو مزید تزئین و آرائش اور دوسری ترمیمات سے بھی نوازا۔ چنانچہ یہ پُرشکوہ دروازہ مغلیہ طرزِ تعمیر کا ایک عمدہ نمونہ ہے دروازے کے دونوں طرف مینار ہیں جنہیں چونے کے پلاسٹر سے سجایا گیا ہے۔ دروازے کے اندر ایک ہال ہے جس کے ساتھ تہ در تہ کمرے بنائے گئے ہیں۔

قلعہ کے باہر کی اہم ترین عمارات زیادہ تر عہدِ جہانگیری اور عہدِ شاہجہانی کی یادگار ہیں۔ بیگم شاہی مسجد ۱۶۱۴ء، مسجد وزیر خاں (۱۶۳۴ء) دائی انگہ کی مسجد (۱۶۳۵) شالیمار باغ (۱۶۴۲) مقبرہ آصف خاں (۱۶۴۱) مقبرہ نور جہاں (۱۶۴۵) چوبرجی (۱۶۴۶) گلابی باغ (۱۶۵۵) علی مردان خان کا مقبرہ (۱۶۷۴)۔

بیگم شاہی مسجد کو مریم زمانی مسجد بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی تعمیر شہنشاہ جہانگیر کی والدہ مریم زمانی بیگم کے حکم سے ۱۶۱۴ء میں ہوئی۔ مغلیہ عہد کی موجودہ مسجدوں میں سب سے پہلی تاریخی مسجد ہے۔ جو قلعہ شاہی کے مشرقی دروازے کے بالکل مقابل آج کی سڑک کے اس پار واقع ہے۔ اس مسجد کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے تینوں گنبد دوہرے غلافی ہیں۔ دوسرے مسجد کے ایوان کی اندرونی سطح نایاب فریسکو کے کام سے مزین ہے۔ اتنا خوبصورت فریسکو کا کام اس سے پہلے کہیں اور نہیں ملتا۔ اسی طرح انارکلی کا مقبرہ مغلیہ عہد کی ایک دلچسپ رومانی داستان سے وابستہ ہے۔ گو اس داستان کا تاریخی حقیقت سے کوئی تعلق نہیں لیکن مقبرے کی عمارت خود قابلِ ذکر اور اہم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شہنشاہ جہانگیر کے حکم سے یہ مقبرہ ۱۶۱۵ء میں بنایا گیا۔ قبر کے سنگِ مرمر کے تعویذ پر "مجنوں سلیم اکبر" اور تاریخِ تعمیر درج ہے۔ فارسی کا شعر جو اس واقعے سے تعبیر بتایا جاتا ہے۔ بڑا دلچسپ ہے۔

آہ اگر من باز بینم روی یارِ خویش را　　تا قیامت شکر گویم کردگارِ خویش را

مورخوں کی باریک بین تحقیق نے اسے صاحب جمال کا مقبرہ بتایا ہے جو جہانگیر کی بیگمات میں سے تھی اور جس کا انتقال لاہور میں ۱۰۰۸ ہجری میں ہوا۔ مقبروں کے اس ذکر میں یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ تیموری عہد میں مقابر کو ایک نفیس اور خوشگوار

شکل دیدی گئی کہ انہیں باقاعدہ باغات میں بنایا گیا۔ اس طرز کی ابتدا تو ہمایوں کے مقبرے سے ہوتی ہے کہ اس کی ایرانی بیگم نے [illegible] کا مقبرہ ایرانی طرزِ تعمیر سے مشابہ بنایا۔ یہ روایت بعد میں اس قدر مقبول ہوئی کہ مغل عہد کا ہر قابلِ ذکر مقبرہ اسی طرح بنایا گیا کہ مقبرے کی حیثیت کے ساتھ ساتھ باغ کی حیثیت بھی مسلّم ہو گئی جسے نہروں، فواروں وغیرہ سے مزین کیا گیا۔ اس مقبرے پر آفاتِ انسانی نے اپنا پورا غضب ڈھایا ہے۔ رنجیت سنگھ کے عہدِ پُرآشوب میں اسے ایک فرانسیسی جنرل کی رہائش گاہ بنایا گیا پھر کھڑک سنگھ جو رنجیت سنگھ کا لڑکا تھا۔ اس مقبرے میں مقیم رہا۔ اسی دوران زیرِ زمین ہال میں قبر کو کھود کر مدفون کی ہڈیاں کہیں باہر کسی گڑھے میں دفن کر دی گئیں اور قبر کا تعویذ مقبرے کے ایک کونے میں رکھ دیا گیا۔ اس مقبرے کو انگریزوں کے عہد میں گرجا کے طور پر بھی استعمال کیا گیا۔ آج اس بدقسمت مقبرے میں حکومت پنجاب کا ریکارڈ آفس ہے اس مقبرے کی خوبی یہ ہے کہ اس کا گنبد دہرا غلافی ہے۔ مقبرہ ایک باغ کے اندر بنایا گیا تھا۔ جو اب ختم ہو چکا ہے۔

شہنشاہ جہانگیر کا مقبرہ تزئین و آرائش اور جاہ و جمال کا مرقع ہے اور مغل دور کی عمارات میں خوبصورتی اور رعنائی کے اعتبار سے تاج محل کے بعد اس کا شمار ہوتا ہے۔ بادشاہ کی وصیت کے مطابق نورجہاں بیگم کے ذاتی باغ "باغِ دلکشا" میں دفن اس شاندار اور پُرشکوہ مقبرے کی تعمیر میں پورے دس سال کا عرصہ (۱۰۲۷ ہجری) صرف ہوا اور مغلیہ عہد کے مقبول ترین طرزِ آرائش سے مزین کیا گیا جن میں سنگِ مرمر میں پچی کاری، روغنی اینٹوں اور ٹکڑوں کا کام، فریسکو مصوری، خشت کاری وغیرہ سب کچھ موجود ہے۔ مقبرے پر گو گنبد نہیں ہے لیکن اس کی کو چار بلند و بالا میناروں سے پورا کیا گیا ہے جو چاروں کونوں پر بنائے گئے ہیں اور جن پر گنگا جمنی کا کام سنگِ بادل سنگِ موسیٰ اور سنگِ کٹھو سے کیا گیا ہے۔ میناروں کے اندر سیڑھیاں ہیں جو آخری حد تک جاتی ہیں۔ چھت پر مربع شکل کا ایک چبوترہ ہے۔ سنگِ مرمر اور سنگِ موسیٰ اور سنگِ بادل سے آراستہ اس چبوترے کے چاروں طرف کی جالی اور درمیان میں ایک تعویذ سنگِ مرمر کا تھا جو سکھ اٹھا کر لے گئے اب صرف اس کا نشان درمیان میں باقی ہے۔ مقبرہ مربع شکل کے چار فٹ اونچے چبوترے پر چاردیواری کے اندر ایک وسیع و عریض باغ کے درمیان ہے۔ باغ میں حوض اور نہریں ہیں۔ جو پورے باغ کو بتیس مربع حصوں میں تقسیم کرتی ہیں اور جن میں انواع و اقسام کے پھلوں اور پھولوں کے درخت اور پودے لگائے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں اس سے زیادہ خوبصورت و مرصع عمارت مغلوں کے دور کی اور کوئی نہیں ہے خاص طور سے جہانگیر کی قبر کا سنگِ مرمر کا تعویذ جس پر مختلف رنگین قیمتی پتھروں سے بیش قیمت کام کیا گیا ہے۔

مقبرہ جہانگیر کے قریب ہی اکبری سرائے، مسجد آصف خان کا مقبرہ اور نورجہاں کا مقبرہ واقع ہیں۔ موخر الذکر دونوں مقابر مروجہ اسلوبِ تعمیر کے عمدہ نمونے تو ہیں ہی سامانِ عبرت بھی ہیں۔ دونوں مقبرے سکھوں کی دست برد سے نہ بچ سکے۔ جو ان مقبروں میں استعمال پتھر اکھاڑ اکھاڑ کر لے گئے۔ آصف خان کا مقبرہ فنِ تعمیر کا ایک اہم شاہکار ہے۔ ایرانی فنِ تعمیر سے بہت مشابہ ہے خاص طور پر اس کا گنبد جو دو غلافی ہے اور ہشت پہلو پلان پر ایک اُونچے پلیٹ فارم پر بنایا گیا ہے۔ مقبرے کو حسبِ معمول چہار دیواری سے آراستہ ایک باغ میں بنایا گیا ہے اور ہشت پہلو پلیٹ فارم کے ہر دوسرے پہلو پر حوض اور فوارے بنائے گئے تھے۔ باغ میں نہریں بھی تھیں۔ بیرونی سطح کی تزئین میں پتھروں کی تزئین تو سکھوں کی تخت و تاراج کی نذر ہو گئی لیکن روغنی اینٹوں اور پھول پتیوں کی آرائش اور گنبد کے اندرونی سطح پر نایاب قسم کے آہک سازی کے نمونے قابلِ دید ہیں۔ اس قسم کی زینت یہیں صرف علی مردان خان کے مقبرے میں ملتی ہے جس کی حالت بھی سکھوں کے ہاتھوں تباہی

کے بعد اچھی نہیں ہے۔

مغلیہ عہد کے چند موجودہ مقبروں کے اس مختصر تعارف کے بعد مغلوں کے دور میں تعمیر شدہ چند اہم باغات کا ذکر بھی ضروری ہے باغات سے شغف اور دلچسپی تیموری بادشاہوں کا فطرتی خاصہ رہی ہے بابر ہندوستان میں آمد کے موقع پر جس بات کی تمام طور سے شکایت کرتا ہے وہ یہاں باغات کی کمی تھی وہ فطرت کی رعنائیوں اور چشموں اور نہروں کا بڑا دلدادہ تھا۔ اس نے اپنے مختصر دورِ حکومت میں کئی باغات کی بنیاد رکھی جن میں تختِ بابری کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے۔ بابر کے بیٹے مرزا کامران کے لاہور کے باغ کا ذکر ابھی ہوا۔ اکبر کے عہد میں فرودگاہِ شاہانِ مغلیہ کی بنیاد پڑی جو واہ اور حسن ابدال کے درمیان واقع ہے اور جسے جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانوں میں مزید وسعت دی گئی۔ راجہ مان سنگھ کی بنائی ہوئی بارہ دری کے بارے میں جہانگیر اپنی تزک میں رطب اللسان ہے کہ یہ ایک قدرتی چشمے کے اوپر بنائی گئی ہے جس میں رنگ برنگ مچھلیاں ہیں اور جہاں اس نے ایک مرتبہ مچھلیوں کا شکار بھی کھیلا اور پھر پکڑی ہوئی مچھلیوں کی ناک میں موتی پرو کر دوبارہ چشمے میں چھوڑ دیں۔ یہ قدرتی چشمے ان مقامات پر اکثر رواں دواں ہیں چنانچہ غالباً جہانگیر یا پھر شاہ جہاں کے عہد میں شالیمار لاہور کے انداز میں اس جگہ چہار دیواری کے اندر ایک باغ بنوایا گیا۔ مرکزی حیثیت ایک نئی بارہ دری کو دی گئی۔ جس کے سامنے میں ایک وسیع تالاب تعمیر کیا گیا دو مربع تختے میں پھلدار درخت اگائے گئے۔ تیموری شہنشاہوں کی نفاستِ ذوق نے یہاں بھی کرشمہ دکھایا ہے۔ سارے حصوں کو تختوں میں تقسیم کیا گیا۔ نہریں بنوائیں۔ آبشار بنائے اور فواروں سے مزین کیا گیا۔ افسوس کہ بعد کے آنے والوں نے مغل طرز تعمیر کے اس بے نظیر نمونے کی حفاظت نہیں کی اور اپنے وقت کا یہ نفیس و عالیشان شاہی باغ کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا ہے۔ نشانات و کھنڈرات بہرحال بتا رہے ہیں کہ عمارت یقیناً عظیم تھی کہ جگہ جگہ چودریاں اور بارہ دریاں تھیں اور پھر مرکزی بارہ دری کے ساتھ جو غسلخانے کا اہتمام ہے۔ اس کا جواب آج پاکستان میں کسی جگہ موجود نہیں۔ بالائے زمین کی نفیس عمارتیں تو دستِ بردِ زمانہ کی نذر ہو گئیں۔ لیکن زیرِ زمین کھود کر جو باقیات اجاگر کئے گئے ہیں۔ حوض نما غسل خانے، گرم و سرد حمام، لباس تبدیل کرنے کے لئے کمرے اور پھر ان غسل خانوں کے نیچے تہ خانے جن میں گرم پانی کرنے کا انتظام تھا۔ یہ ساری عمارات نقش و نگار والے پتھروں اور فریسکو نقاشی سے مزین تھیں۔ باغ کے جو چہار دیواری سے محفوظ تھی غالباً مشرقی اور مغربی دو دروازے تھے جن میں سے غربی دروازہ آج بھی زبانِ حال سے اپنی کھوئی ہوئی شان کی داستان سنا رہا ہے۔

شاہ جہاں کی یادگار عمارات میں شالامار کا ذکر دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی تین طبقوں پر منقسم یہ شاہی تفریح گاہ ۱۶۴۳ء میں تعمیر ہوئی۔ آبِ رواں کی نہروں فواروں اور چشموں سے آراستہ اور سبزہ زاروں سے مزین اس باغ کے درمیان بارہ دریاں، خواب گاہیں، حمام غسل خانے بنائے گئے تھے۔ باغ فیصل میں داخلہ مشرقی اور مغربی دروازوں سے تھا۔ جو نچلے طبقے میں کھلتے تھے۔ موجودہ دروازہ تو انگریزوں کے عہد میں شاہ جہانی خواب گاہ کو کھول کر اس وقت نکالا گیا جب کہ موجودہ سڑک باغ کے سامنے سے گزاری گئی۔ نچلے طبقے میں اہتمام یہ تھا کہ سارے کے سارے پھلوں کے درخت لگائے گئے تھے۔ جسے فیض بخش کا نام دیا گیا۔ جب کہ وسطی طبقے میں پانی کا وسیع و عریض حوض، فوارے، بارہ دریاں، شاہی حمام۔ ساون بھادوں کی عمارتیں ہیں۔ تیسرے طبقے میں بارہ دریاں، شاہی خواب گاہیں وغیرہ ہیں۔ ان دونوں طبقوں کو ملا کر فرح بخش کا نام دیا گیا تھا کہ یہاں خوشبودار پھولوں کے پودے اور تختے تھے۔ نہروں کے ساتھ ساتھ پکی اینٹوں سے بنے ہوئے اقلیدسی شکل سے مرصع فرش ہیں۔ جب کہ عمارتوں کو فریسکو نقاشی اور روغنی اینٹوں کی مرصع کاری سے مزین کیا گیا تھا۔ سنگِ مرمر کے ایک آبشار کو سب سے بلند طبقے کے درمیان بنایا گیا ہے۔

شاہجہان کے عہد میں اسی قسم کے تین منطقہ باغات جنہیں شالامار کہا گیا بنائے گئے ایک لاہور میں دوسرا کشمیر میں تیسرا دہلی میں، اتفاق اور خوش قسمتی سے صرف لاہور کا باغ ہی اپنی اصلی حالت میں اب تک موجود ہے اور طرزِ تعمیر کے اعتبار سے خاص اہمیت کا حامل. تفریح گاہوں میں شاہی شکار گاہوں میں ہرن مینار اور بارہ دری عہدِ جہانگیری اور شاہجہانی دور کی یادگار ہیں. یہ عمارات لاہور سے ۲۰ میل کے فاصلے پر شیخو پورہ میں واقع ہیں. خود شیخوپورہ عہدِ اکبری میں آباد ہوا اور اکبر بادشاہ نے اپنے چہیتے بیٹے سلیم کے نام پر اس کا نام رکھا جسے وہ پیارے شیخو بابا کہا کرتا تھا. شیخو پورے کی یہ شکار گاہ جہانگیر کے عہد میں تعمیر ہوئی. ہرن مینار نور بس کے ایک پسندیدہ ہرن کی یادگار کے طور پر بنایا گیا تھا اور بارہ دری ایک وسیع و عریض حوض کے درمیان بنی ہے. تقریباً سو فٹ بلند و بالا مینار کے اندر سے سیڑھیاں جاتی ہیں جو آخری منزل تک پہنچاتی ہیں. یہاں سے گرد و نواح کا نظارہ جو آج بھی ایک گنجان جنگل کی صورت میں ہے. بڑی خوبی سے کیا جا سکتا ہے اور شکار کیا جا سکتا ہے. حوض کے چاروں کونوں پر چہار دریاں بنی ہیں اور چاروں طرف درمیان میں ایک ڈھلوان ہے. جہاں جانور پانی پینے کے لیے آتے تھے حوض میں پانی خاص نہروں کے ذریعے لایا جاتا تھا جو تین حصوں میں تقسیم ہیں. اہتمام یہ کیا گیا ہے کہ پانی کے ساتھ ریت مٹی حوض کے اندر نہ آنے پائے یہ اہتمام اب باقی نہیں رہا. چنانچہ حوض کی خاصی سطح مٹی سے بھر چکی ہے ایک کازوے کے ذریعے ہم بارہ دری تک پہنچتے ہیں جو تین منزلہ ہے اور بڑی خوبصورت نقاشی سے سجائی گئی ہے. نیچے کی منزل میں آٹھ دالان والا کمرہ درمیان میں ہے اور اس کے اطراف میں ایک گیلری اس انداز میں گھومتی ہے. جہانگیر کے بعد شاہجہان نے اس بارہ دری اپنی پسند کی ترامیم کرائی ہیں. یہ شکار گاہ جہانگیر اور شاہجہانوں کے زمانوں میں بہت مقبول رہی اور جب بھی مغل بادشاہ کشمیر کو جاتے ہوئے اس طرف سے گزرتے تو اکثر یہاں سیر و تفریح اور شکار کے لیے قیام کیا کرتے تھے۔

عہدِ شیر شاہی بھی اپنی تعمیرات کی خصوصیات کے لئے قابلِ ذکر ہے. شیر شاہ نے جہلم میں ۱۵۳۹ء میں رہتاس کا قلعہ تعمیر کیا. اس کی سڑک اعظم اور اس پر سرائے اور باؤلیاں بھی قابلِ ذکر ہیں. چنانچہ واہ کی لوسر باؤلی اسی سے منسوب ہے. اس کے علاوہ اٹک کا قلعہ اکبری عہد میں (۱۵۸۱ء) بنا جس کے نواح میں بیگم کی سرائے نورجہاں سے منسوب ہے. یہاں اور بھی چند عمارات ہیں. جن کا تعلق عہد شاہجہانی سے ہے۔

پاکستان کے پانچ ہزار سالہ فنِ تعمیر کا یہ مختصر ترین جائزہ ہے. جو اُوپر چند صفحات میں پیش کیا گیا. عہد بعہد کی ترقی جو ان نمونوں سے واضح ہوتی ہے. اس بات کا ثبوت ہے کہ اس میدان میں بھی انسان نے اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور اینٹ اور گارے کے معمولی اور چھوٹے چھوٹے مکانات سے لے کر مشکل ترین اور بلند ترین محلات انہیں صلاحیتوں اور تجربوں کی نمائندگی کرتے ہیں. یہاں یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ ما قبل تاریخ سے لے کر مغلیہ عہد تک فن تعمیر کے جتنے بھی اسالیب سرزمینِ پاکستان پر مروّج ہوئے ان کے تقریباً تمام خصوصیات و جزئیات ہندوستان سے کم اور وسطی ایشیا اور ایرانی شاہکاروں سے زیادہ مستعار تھے. چنانچہ خواہ وہ موہن جو داڑو کی عمارت یا ہڑپہ کے بازار و محلات یا تخت باہی کے معابد اور خانقاہیں ہوں یا بھنبور (دیبل) و منصورہ کے فصیل و محلات ملتان، اچھ اور دیپال پور کے ذیشان مقابر لاہور کی مساجد و شاہی محلات ہوں یا ٹھٹھہ کے مقابر، ان سب کے بنیادی تصورات انہیں خارجی اثرات و عوامل کے مرہونِ منت ہیں گویا پاکستانی فنِ تعمیر اسی افہام و تفہیم کا مظہر ہے. جس کے سوتے وسطی ایشیا اور ایران سے نکلتے ہیں۔

ستمبر ۷۹ء

# اُردو میں ڈرامہ نگاری

امتیاز علی تاج

انسان میں تماشہ دیکھنے کا شوق اور ڈرامے سے دلچسپی قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی ہے۔ اس کے اس شوق اور دلچسپی کا مظاہرہ روزمرہ کی زندگی میں عموماً ہوتا رہتا ہے۔ کہیں مداری کی ڈگڈگی سنائی دے جاتی، بازی گر سڑک کے کنارے اپنا سامان جما رہا ہو، پاؤں پھسل کر کوئی راہ گیر گر پڑے، کبھی چلتے ہوئے مکان میں سے کسی عورت کی چیخ پکار کی آواز آ رہی ہو، پل بھر میں وہاں تماشائیوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔ دوکاندار دکان چھوڑ کر چلا آتا ہے۔ سائیکل سوار سائیکل سے اتر کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اسکول جاتے ہوئے بچے ماسٹر کی بید کی پرواہ نہ کرتے ہوئے رک جاتے ہیں۔ جہاں کہیں کسی حادثہ یا منظر میں کوئی ڈرامائی عناصر موجود ہوں ایک ہجوم کی صورت میں ہم بے اختیار اسے دیکھنے کے لئے اکٹھے ہو جاتے ہیں اس میں شہری اور دیہاتی، امیر اور غریب یا بوڑھے اور بچے کی کوئی قید نہیں کیونکہ ڈرامے سے دلچسپی انسان کی فطرت میں شامل ہے۔

یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ڈرامے کا آغاز کب اور کس صورت میں ہوا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ڈرامے کی ابتدا زمانہ قدیم میں رقص و سرود کی ان محفلوں سے ہوئی جو کسی قبیلے کی فتح یا مذہبی تہوار کے موقعوں پر منعقد ہوتی تھیں۔ اس کے بعد اہل فارس اور اہل مصر کے ہاں صحن کی چار دیواری میں دیوتاؤں کی پرستش کی خاطر یا مردہ کو دفنانے کی رسوم کے سلسلے میں اسی قسم کے چھوٹے چھوٹے کھیل کھیلے جاتے کا ثبوت ملتا ہے لیکن اس ڈرامائی ادب اور تھیٹر کا آغاز جس سے ہم آشنا ہیں قریباً پانچ سو سال قبل از مسیح ہوتا ہے۔ جبکہ یونان میں، ایتھنز کے شہریوں کے سامنے مشہور ڈرامانویس ایس کلس کا لکھا ہوا کھیل SUPPLIANT THE کھیلا گیا۔ اس کھیل کا مسودہ آج بھی ہمارے پاس محفوظ ہے۔ ایس کلس کے علاوہ یونان کے دوسرے ڈرامہ نویسوں نے جس میں سوفاکلیس یوریپڈیس اور ارسٹافینس کے نام قابل ذکر ہیں۔ دنیا کے ڈرامائی ادب میں قابل قدر اضافہ کیا یونان کے بعد اہل یورپ نے یونان کے دوسرے فنون کے ساتھ ڈرامے اور تھیٹر کو نہ صرف اپنایا بلکہ ادبی لحاظ سے اور فنی طور پر درجہ کمال تک پہنچا دیا اور مارلو، شیکسپیر، مولیئر، ابسن، برنارڈ شا جیسے ڈرامہ نویس اور کین، گیرک، اروِنگ اور سارہ برنہارٹ جیسے فنکار پیدا کئے زمانۂ حال میں روس اور امریکہ میں بھی ڈرامے کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

گورکی، چیخوف اور یوجین اونیل کا دنیا کے بڑے بڑے ڈرامانویسوں میں شمار ہوتا ہے۔

اہل مغرب کے ڈرامائی سرمائے اور اس صنف میں ان کے کمالات کو دیکھ کر جب ہم اپنے ادب کی تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھتے ہیں تو اردو کا دامن قابل قدر ڈراموں سے بالکل خالی نظر آتا ہے۔ میرے خیال میں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو ڈرامے کا آغاز غلط طریقے سے ہوا۔ اگر اس کا آغاز اندر سبھا کے راگ ناٹک کی بجائے معاشری یا کم از کم کسی دوسرے ایسے ڈرامے سے ہوتا جس میں موسیقی زیادہ دخل نہ رکھتی تو غالباً ہمارے ڈرامہ اور تھیٹر کی تاریخ بہت مختلف ہوتی۔ واجد علی شاہ کے زمانہ میں اندر سبھا کا راگ ناٹک لکھے جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے لئے ایسے ایکٹروں کی ضرورت پڑ گئی جو گانے بجانے کے فن میں مہارت رکھتے تھے۔ گانے بجانے والا

طبقۂ عوام کے لئے تفریح کا سامان بہم پہنچانے کے باعث اس زمانہ کے ثقہ اور تعلیمیافتہ حضرات میں عام طور پر پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھا جاتا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ ڈراما اور تھیٹر ایک مخصوص جماعت کے ہاتھ میں چلے گئے اور دوسری طرف تمام ثقہ اور تعلیمیافتہ حضرات نے ادب اور تمدن کی ان اصناف کو ناشائستہ اصناف سمجھ کر اس سے مکمل طور پر مقاطعہ کر لیا۔

اگر ہمارے ڈرامہ اور تھیٹر کا آغاز مثلاً اِبسن کے کسی ڈراما کے ترجمہ سے ہوتا اور اس میں ہمارا کوئی ہم معاشری مسئلہ پوری ٹریجیڈی کے ساتھ لوگوں کے سامنے آتا تو غالباً سر سید کے زمانہ میں ڈراما اور اسٹیج کو معاشری مسائل کی طرف توجہ دلانے کا ایک اہم ذریعہ قرار دے دیا جاتا اور بہت ممکن ہے کہ سر سیدؔ کی جماعت میں جس طرح ڈاکٹر نذیر احمد نے ناول کی تصنیف میں قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ اسی طرح کوئی نہ کوئی تعلیمیافتہ شخص ڈراما کی طرف بھی متوجہ ہوتا۔ اور اسٹیج کا تجربہ نہ رکھنے کے باعث خواہ زیادہ پختہ چیزیں نہ لکھ سکتا تاہم ڈراما کا ممتاز مقام قائم کر دینے میں ضرور کامیاب ہو جاتا۔

اندر سبھا کے راگ ناٹک کا طرز فکر اور اندازِ تحریر لکھنوی مثنویوں سے بہت زیادہ مشابہ ہے۔ انحطاط کے اس زمانہ میں جب ہندوستان میں اسلامی سلطنت مٹ رہی تھی۔ حوصلے گر چکے تھے ہمتیں پست تھیں۔ ہر طرف مجبوری و معذوری اور افسردگی و اضمحلال کا دور دورہ تھا لوگ زندگی کی تلخ کلامی بھلانے کے لئے خود فراموشی کے آرزومند تھے چنانچہ ناٹک کے اس تفریحی دور میں علاوہ مثنوی کے انداز کی ایک کہانی کے خود فراموشی کے اور بہت سے سامان بھی مہیا کر دئے گئے۔ ایکٹر، ایکٹرسیں زرق برق لباس اور پھر ان پر مستزاد موسیقی۔ امانت لکھنوی نے "اندر سبھا" کی کہانی سوچنے میں زیادہ تر ملحوظ یہی بات رکھی کہ رقص و سرود کی محفل جمنے کی کوئی مناسب صورت تماشے میں نکل آئے۔

اس زمانہ کی خصوصیات کا خیال کیا جائے تو "اندر سبھا" میں امانت نے جو زبان استعمال کی ہے وہ سادہ، شستہ اور اسٹیج کے لئے کئی اعتبار سے موزوں و مناسب ہے۔ یہی وجہ تھی کہ لکھے جانے کے ساٹھ ستر برس بعد تک جب کسی تھیٹر کمپنی میں چند اچھے گانے والے ایکٹر جمع ہو جاتے تھے، یہ کھیل ضرور تیار کر لیا جاتا تھا۔

"اندر سبھا" کی کامیابی کے تھوڑے ہی عرصے بعد ناٹک کا کاروبار بمبئی کے چند پارسیوں نے سنبھال لیا۔ ان لوگوں نے تھیٹر کی خدمت تو ضرور کی لیکن اردو ڈراما کے ذخیرۂ ادب میں کوئی قابل قدر اضافہ نہ کر سکے۔ ان ناٹک کمپنیوں میں ڈراما نویسی کرنے کے لئے اس وقت کوئی ایسے مصنف موجود نہ تھے۔ جو ڈرامہ کی الف بے بھی جانتے ہوں نہ کسی کی نظر سے کوئی ڈرامائی ادب گزرا تھا، نہ کسی میں طباعی کا جوہر موجود تھا نامور شاعروں کے اس جدید طریقۂ اظہار سے کوئی خاص دلچسپی پیدا نہ ہو سکی۔ چنانچہ زیادہ تر ادنےٰ درجے کے شاعر والے نے اپنی خدمات پارسی ناٹک کمپنیوں کے لئے پیش کیں۔ ان کے لئے ڈراما کا کوئی نمونہ اگر تھا تو امانت کی اندر سبھا یا اس کی بعض ترمیم شدہ شکلیں۔

اس زمانہ کے ڈراما نویس بہت سے ہیں۔ مگر ان میں کثیر التصنیف حافظ عبداللہ، رونق بنارسی، ظریف اور مرزا نظیر بیگ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں کوئی نمایاں خصوصیت نظر نہیں آتی۔ ان کی کہانیاں اس زمانہ کی مشہور داستانوں سے ماخوذ ہیں۔ واقعات انوکھے ضرور ہیں مگر نوعیت کے اعتبار سے ایسے نہیں کہ ڈراما کی صورت اختیار کر کے اسٹیج پر لطف دے سکیں۔ تقریباً سب کے سب ڈرامے خالص کاروباری نقطۂ نظر سے لکھے ہیں۔ ان کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ تماشائیوں کی ضیافتِ طبع کا سامان مہیا کرنے والی چیزیں بہم پہنچائی جائیں۔ اندر سبھا کی ڈگر کو کہیں چھوڑا بھی گیا ہے تو صرف اس خیال سے کہ عام تماشائی زیادہ ارزانی پسند نظر آتا تھا۔

ان داستانی انداز کے راگ ناٹکوں کی یکساں روش سے پہلا نمایاں اختلاف مہدی حسن صاحب احسنؔ لکھنوی کے ڈراموں میں ملتا ہے۔ احسنؔ صاحب نے بہت سے ڈرامے لکھے جن میں سے بعض انگریزی ڈراموں سے ماخوذ ہیں اور بعض طبعزاد ہیں۔

میری دانست میں ان کی تصنیفات میں سے زیادہ اہمیت ان ڈراموں کو حاصل ہے جو انگریزی سے ماخوذ ہیں۔ یہ اس لئے کہ یہ انگریزی ڈرامے بُرے بھلے طور پر جیسے بھی اردو میں اپنائے گئے ان کے ذریعے ہماری زبان کم از کم پلاٹ کی صحیح تعمیر سے تو روشناس ہوئی۔ احسن کے ڈرامے پُرانے راگ ناٹکوں سے نمایاں طور پر مختلف اور زیادہ دلچسپ اور مؤثر تھے ان کا پلاٹ ڈراما کا پلاٹ تھا کردار نگاری میں حقیقت کی جھلک نظر آتی تھی۔ زبان مقابلتاً بے تکلف تھی اور ان میں ایکٹروں کے لئے ایکٹ کرنے کی گنجائش موجود تھی۔

اس قسم کے ڈراموں کی کامیابی نے ڈراما نویسوں کو انگریزی کے دوسرے ڈرامے اردو میں منتقل کرنے پر زیادہ متوجہ کیا۔

احسن کی ڈراما نویسی کے ابتدائی زمانہ میں ان ہی کے ایک معصر نے ڈراما کو نامناسب وضع سے پاک اور زندگی کے قریب کرنے کی ایک ایسی کوشش کی جو کئی اعتبار سے بہت ممتاز اور نمایاں نظر آتی ہے۔

یہ ڈراما نویس طالب بنارسی ہیں۔ ان کے ڈراما "لیل و نہار" کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اردو کے پہلے ڈراموں کی طرح اس کا تعلق بادشاہوں اور نوابوں کی رومانوی زندگی سے نہیں بلکہ متمول شخص کے خاندانی واقعات سے ہے۔ اور وہ سب واقعات اس نوع کے ہیں جن میں کوئی بھی انوکھی یا عجوبہ بات نہیں معلوم ہوتی ہے۔ ان کی طبیعت میں اس زمانہ کے رومانوی ڈراما کے خلاف ردِّ عمل پیدا ہوا۔ اور انہوں نے پوری کوشش کی کہ "لیل و نہار" کو اس قسم کے تمام اثرات سے پاک رکھیں۔

اردو کے سب سے مشہور ڈراما نویس آغا محمد شاہ حشر کاشمیری مرحوم گو طالب اور احسن کے معصر تھے، لیکن ان کی ڈراما نویسی نے اپنے لئے ایک ایسا راستہ تجویز کیا جو بالکل جدا تھا اور عام تماشائیوں نے اس زمانہ میں اس قدر پسند کیا کہ تھیٹر کی دنیا حشر کا کلمہ پڑھنے لگی۔ جس زمانہ میں طالب اور احسن ڈراما کو سادگی اور واقعیت کی طرف لا رہے تھے آغا صاحب نے، جنہیں تھیٹر کی بحیثیت پیشہ ور ڈراما نویس کے ملازمت کرلینے سے پہلے مذہبی مناظروں سے بے حد دلچسپی تھی، ڈراموں میں خطابت کی بلند آہنگ روح پھونکنا شروع کردی۔ جو شاعر اور فطرت شناس دقیق مذہبی مسائل کی بحث میں عوام کو بے اختیار کر کے داد لیتا تھا اس کی جودتِ طبع کو افسانے اور ڈرامے کا میدان ملا تو اس نے تھیٹر کے سٹیج پر قیامت برپا کردی۔ اس کی نثر کے ایک ایک فقرے اور نظم کے ایک ایک شعر میں ایسی خطیبانہ قوت تھی کہ لوگ سُن کر ایک وارفتگی کے عالم میں سر دُھنتے اور تالیاں پیٹتے تھے۔

حشر کے نزدیک ڈراما صرف زندگی کے جوشیلے لمحات میں ہے وہ ان اسباب سے کچھ تعلق نہیں رکھنا چاہتے جو زندگی میں بتدریج نشو و نما پاتے اور کردار کی فطرت کی لطافت کو رفتہ رفتہ کھول کر جمال افروز کرتے ہیں۔ وہ ڈراما کے افسانے میں سے صرف ہنگامے کے مقامات چُننے اور اپنی قادر الکلامی کا سارا زور صرف ان ہی پر صرف کر ڈالتے ہیں۔

حشر نے آخری زمانہ میں جو ڈرامے لکھے وہ اندازِ تحریر کی ندرت اور ادبی دلآویزیوں کے اعتبار سے زیادہ قابل قدر ہیں۔ ان میں کردار مقابلتاً زیادہ پختہ ہیں۔ سٹیج کی فہم بھی زیادہ بڑھ چکی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان میں ناصحانہ انداز بھی بہت بڑھ گیا ہے

جہاں تک پیشہ ور ڈراما نویسوں کا تعلق ہے وہ حشر کے ساتھ ختم ہو گئے۔ ان کے بعد ہمارے ہاں ڈرامے ان لوگوں نے لکھے جن کا تعلق کسی تھیٹریکل کمپنی سے نہ تھا بلکہ جو ڈرامے سے شوقیہ لگاؤ رکھتے تھے۔ شوقیہ ڈراما لکھنے والوں نے موضوع اہم لئے اور زبان سادہ کی۔ مگر ان ڈراموں میں وہ عملی تجربہ مفقود نظر آتا ہے۔ جو ڈراما کو سٹیج پر دلآویزی و دلکشی بخشتا ہے۔

اردو کے ڈرامائی ادب کے اس سرسری جائزہ سے یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ ہماری زبان ڈراما میں اتنی خوش نصیب واقع نہیں ہوئی جتنی کہ دوسرے ادب میں ہے۔ اس کے علاوہ اس سرسری جائزے سے یہ دکھانا بھی مقصود تھا کہ ان غلطیوں اور خامیوں کا احساس ہو جائے جن

کی وجہ سے آج تک ہمارے ہاں تھیٹر محض ایک ادنیٰ تفریح کی حیثیت اختیار کئے رہا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہمارے ہاں تھیٹر کے مقبول نہ ہونے کی بڑی وجہ فلموں کی مقبولیت ہے اگر اس سے یہ مراد ہے کہ تھیٹر اور فلم دونوں ایک ساتھ کامیاب نہیں ہو سکتے تو ان کا خیال غلط ہے یورپ اور امریکہ میں لاکھوں سینما گھر ہوں گے لیکن ان کے ساتھ ساتھ ہزاروں تھیٹر بھی ہیں جو کسی طرح بھی نامقبول قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ فنی حیثیت سے تھیٹر کا درجہ فلم سے بلند ہے۔ ہمارے ہاں اگر آج تک کوئی قومی تھیٹر قائم نہیں ہوا تو اس کی بڑی وجوہ دو ہیں۔ اوّل تو آج سے چند سال پہلے یعنی قیام پاکستان سے پیشتر کسی قومی ادارے کے قائم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس وقت تک قوم کا کوئی اپنا آزادانہ وجود ہی نہ تھا اور پھر غلامی سیاسی ہو یا اقتصادی ایک ایسا زہر ہے جس سے فنون لطیفہ اور زندگی کی قدروں کو پرکھنے اور ان سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیتیں مفقود ہو جاتی ہیں۔ دوسرے ہمارے ہاں تھیٹر ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں رہا جو اس کی فنی حیثیت اور امکانات سے واقفیت نہ رکھتے تھے یا جنہیں کوئی عملی تجربہ حاصل نہ تھا۔

اب حالات بدل چکے ہیں۔ یہی وہ وقت ہے جب ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے کہ دوسرے قومی اداروں کے ساتھ ساتھ ہمارا ایک قومی تھیٹر بھی ہو، جس کے ذریعے ہم عوام کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مسائل کی طرف متوجہ کر سکیں۔

جون ۱۹۵۲ء

آخر اک پیرایۂ حرفِ وفا میرا بھی ہے — اس بھری بستی میں کوئی ہمنوا میرا بھی ہے
آستیں تو آستیں ہیں جانِ دشمن پر سہی — رو پڑا اس دکھ سے میں یہ سانحہ میرا بھی ہے
میں نے تشنہ ہمرہوں کو دے دیا سب آبِ مشک — یہ نہ سوچا پیاس کتنا مسئلہ میرا بھی ہے
دشتِ تنہائی کہاں اب دشتِ تنہائی رہا — خوش تھا میں یہ سوچ کر اک راستہ میرا بھی ہے
ارضِ جاں پر گو یہ صاحب حق تمہارا ہی نہیں — یہ ہوا و روشنی کا سلسلہ میرا بھی ہے
مجھ سے قطعِ صلح کا اعلان تم نے کر دیا — توڑ دوں سب عہد اب یہ فیصلہ میرا بھی ہے

اب گرفتِ سنگ میں ہیں سادہ پوشی کے بھی رنگ
ڈر رہا ہوں میں کہ یہ رنگِ قبا میرا بھی ہے

محشر بدایونی

عکس تحریر محشر بدایونی

ہوئے۔ ان ڈراموں میں گریش چندر گھوش نے انگریزوں کی چال بازیوں، جوڑ توڑ اور فتنہ انگیزیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی تھی۔ اس میں انگریزوں اور سراج الدولہ سے جنگ کے حالات کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیا تھا۔ ڈرامے میں ایسی کوئی بات نہیں لکھی گئی ہے جس سے مسلمانوں کی روایتی ہیبت اور شجاعت پر کسی طرح کوئی حرف آئے۔ پورے ڈرامے میں مسلمانوں کی بہادری اور شجاعت کی داستان بڑے اچھے انداز میں موجود ہے۔ یہ دونوں ڈرامے ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں مقبول ہیں۔ گریش چندر کے زمانے میں امرت لال بوس۔ من موہن گھوش اور کالی پرسنا سنہا نے بھی بعض ڈرامے لکھے۔ مگر گریش چندر کے آگے اُن کا چراغ نہ جل سکا۔ بیسویں صدی۔ گریش چندر کے زمانے سے ہی بیسویں صدی کا آغاز ہوتا ہے یہ صدی بنگالی ڈراموں کے لئے بہت مبارک ثابت ہوئی اس میں دیجیندر لال رائے اور رابندر ناتھ ٹیگور نے فن ڈرامہ نگاری کو چار چاند لگا دیے۔ ان دونوں نے نت نئے تجربے کر کے بنگالی ڈراموں کو حیات جاوید بخش دی۔

لال رائے نے بنگالی ڈراموں میں سب سے دلچسپ تجربہ یہ کیا کہ انگریزی کے "اوپیرا" کی طرح بنگالی میں بھی ناچ گانا اور دلچسپ مکالموں کو خوبصورتی سے ترتیب دے کر بنگالی اوپیرا کی بنیاد ڈالی۔ بنگالی ڈراموں میں اُن کے اس نئے تجربے کو بہت پسند کیا گیا۔ ان کی اس قسم کی پہلی کوشش "شنگھل وجے" یعنی فتح لنکا" ہے۔ بنگالی اوپیرا کے لئے انہوں نے موضوع تو بہت پرانا چنا تھا، لیکن اسے پیش بالکل ہی نئے انداز سے کیا۔ دیجیندر لال رائے نے ٹیگور کی کئی نظموں کو ڈرامے کی شکل میں ترتیب دے کر اسٹیج پر پیش کیا وہ بنگالی ادیبوں میں شاید پہلے اور آخری شخص ہیں جس نے بنگالی زبان کی شاعری میں پیروڈی کو رواج دینا چاہا۔ انہوں نے اس سلسلہ میں سب سے پہلے ٹیگور کی نظموں کی پیروڈی کی، لیکن تھوڑے ہی دنوں میں یہ سلسلہ ختم کر کے جتنی نظموں کی بھی پیروڈی کی ہے وہ اب تک بنگالی زبان میں اچھی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں اور بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ دیجیندر لال رائے نے انگریزی کے کئی ڈراموں کو بنگالی میں منتقل کرنے کی بھی کوشش کی، لیکن یہ کوشش اچھی نظر سے نہیں دیکھی گئی۔ اسی لئے انہوں نے بنگالی زبان میں اوریجنل ڈراموں کے لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

بنگالی زبان میں آج تک ٹیگور سے زیادہ متنوع علوم و فنون کا ماہر کوئی بھی نہیں گذرا ہے۔ انہوں نے ہر علم و فن میں اپنی کوئی نہ کوئی یادگار چھوڑی ہے۔ جب ڈرامے کی طرف توجہ دی تو اس فن کو واقعی چار چاند لگا دیئے۔ انہوں نے جدید و قدیم کے امتزاج سے ایک بالکل ہی نئی چیز پیدا کی۔ بنگالی ڈراموں میں اوپیرا اور علامتی ڈرامے اُن کی خاص اختراع ہیں۔ اگرچہ دیجیندر لال رائے نے بنگالی اوپیرا کی بنیاد ڈالی تھی، لیکن انہوں نے اپنے زور قلم سے بنگالی اوپیرا کو دوام بخش دیا۔ اُن کے بنگالی اوپیرا میں "چنڈالیکا" یا چندر لیکھا، "تاش ردیش" یا تاش کا ملک، اور چیرانگدا بہت مشہور ہیں۔ چیرانگدا ایک لڑکی کا نام ہے علامتی ڈراموں میں "ڈاک گھر"، "اچلا آئتن" یا "مقررہ جگہ"، "رکت کربی" اور "راجا" نے بہت شہرت حاصل کی ہے۔ موخر الذکر ڈرامے میں انہوں نے استعارے ہی استعارے میں اس زمانے کی سیاست پر بہترین طنز کی ہے۔

ٹیگور ہی کے زمانے میں ایک اور ڈرامہ نگار بنو پھول نامی اُبھرا اور دیکھتے ہی دیکھتے بنگالی ڈراموں کا صدر نشین بن گیا۔ انہوں نے پہلے ناول لکھنا شروع کیا اور ناول نگاری میں بڑا نام پیدا کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈرامہ نگاری کی طرف بھی توجہ دی۔ بجائے قصے کہانیوں کے اپنے زمانے کے مشہور اشخاص کو چن لیا اور اُن کی زندگی کو ڈرامے کی شکل میں پیش کر دیا۔ اُن کے اس قسم کے ڈراموں میں مائیکل، مدھو سُدن، ودیا ساگر اور رابندر ناتھ ٹیگور بہت مشہور ڈرامے ہیں۔ بنو پھول نے بنگالی ڈرامہ نگاری میں یہ تجربہ کر کے دوسروں کے لئے راستہ کھول دیا۔ انہوں نے ایک اور دلچسپ تجربہ یہ کیا کہ ناول، قصے، کہانی، نظم اور بعض واقعات کو ملا کر ڈرامے کی شکل میں ترتیب دیا بنگالی میں یہ بالکل نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ یہ طریقہ زیادہ مقبول نہ ہو سکا۔ کیونکہ یہ دوسروں کی بس بات نہ تھی۔ بنو پھول ان دنوں بھاگل پور میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لیکن کبھی نہ کبھی کچھ نہ کچھ لکھ بھی دیتے ہیں۔

جس زمانے میں رابندر ناتھ ٹیگور اور رتو پھول کا طوطی بول رہا تھا اسی زمانے میں میدان جنگ سے ایک تازہ و زندہ ہی آگ اور خون کے نغمے الاپتا ہوا بنگالی ادب کے افق پر نمودار ہوا اس کی گھن گرج سے ادبی فضا کانپ اٹھی، اس کی شاعری کا لوہا سب نے مان لیا۔ جب اس کی شاعری کا سکہ جم گیا تو اس نے نثر کی طرف توجہ دی۔ چنانچہ کئی ناول اور ڈرامے لکھے جس طرح نذرل کی شاعری نے مقبولیت حاصل کی اسی طرح ان کے ناول اور ڈرامے بھی کافی مقبول ہوئے۔ اپنے ڈراموں میں قاضی صاحب نے کوئی الگ راہ نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ عام رواج کے مطابق ڈرامے لکھے۔

اسی زمانے میں کوی شہادت حسین نے "عبداللہ" اور "انارکلی" نامی ڈرامے لکھ کر لوگوں کو چونکا دیا۔ ان کی اشاعت سے پہلے وہ بنگلا زبان کے صرف شاعر ہی مانے جاتے تھے، لیکن ڈرامانگاری کی ابتدا کر کے اس میں بھی اپنا ایک خاص مقام پیدا کر لیا۔ تقسیم کے بعد ڈھاکہ آگئے تھے۔ یہاں وہ ریڈیو پاکستان سے متعلق ہوگئے انہوں نے ریڈیو کے لئے کئی اچھے ڈرامے تصنیف کئے۔ موت نے اُن کو مہلت نہ دی ورنہ اُن سے بڑی توقعات تھیں۔

ملک کے تقسیم ہونے کے بعد مشرقی پاکستان کے نوجوان ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں نے ڈرامے پر پہلے سے زیادہ توجہ کی۔ ملک کے جدید رجحانات اور احساسات نئی تخلیقات کی ضرورت ہے چنانچہ جہاں اُن کی شاعری، افسانہ نگاری اور ادب نے ایک نیا موڑ لیا وہیں ڈرامانگاری بھی ایک نئے دور میں داخل ہوگئی۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک برابر مشرقی پاکستان میں بنگالی ڈراموں میں نت نئے تجربے کئے جارہے ہیں۔ نئے اور پرانے ادیب پاکستان کے حالات کے مطابق نئی نئی تخلیقات میں مصروف ہیں۔ ابراہیم خاں اور کبیر الدین جیسے بوڑھے ادیب بھی اب پرانا راستہ چھوڑ کر نئے تجربوں میں مصروف ہیں۔ تقسیم کے بعد پہلی مرتبہ بعض ڈراموں میں اسلامی کلچر اور اسلامی ثقافت کی جھلک نظر آئی لیکن اب تو مشرقی پاکستان میں جس قدر ڈرامے لکھے جارہے ہیں وہ پچھلے بنگالی ڈراموں سے بالکل ہی الگ انداز کے ہیں۔

تقسیم کے فوراً بعد تو پھول کی طرح ابوالفضل نے ایک ڈرامہ "قائداعظم" لکھا، اس میں انہوں نے تفصیل سے قائداعظم کے حالات زندگی اور کارناموں خصوصاً قیام پاکستان کے لئے ان کی کوششوں کو ڈرامے کی شکل میں پیش کیا ہے۔

شوکت عثمانی نے سماجی اور معاشرتی حالات پر طنزیہ انداز میں ڈرامے لکھ کر بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے۔ اُن کے ایک ڈرامہ "کانکور منی" یعنی کنکروں کے بادشاہ کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے اس میں انہوں نے ایک حاجی صاحب کی کہانی بیان کی ہے جو حج سے واپسی پر عرب سے بہت کنکر پتھر ساتھ لائے تھے اور انہی کنکروں کو پیس کر آٹے اور چاول میں ملا کر فروخت کیا کرتے تھے۔ جب اُن کے گاہک ان سے یہ شکایت کیا کرتے تھے کہ چاول اور آٹے میں کنکر ملا ہوا ہے تو وہ یہ کہہ دیا کرتے کہ یہ کنکر عرب کے ہیں۔ اس لئے اسے تبرک سمجھ کر کھا جاؤ یہ پیٹ میں پہنچتے ہی ہضم ہوجائیں گے، ان کنکروں کے کھانے سے بدن میں طاقت آتی ہے اور بھوک بہت لگتی ہے جس زمانے میں شوکت عثمانی کا یہ ڈرامہ شائع ہوا تھا اُس وقت نفع خوروں کی صورتیں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں، اگر اُن کا بس چلتا تو شاید وہ شوکت عثمانی کو آٹے کی چکی میں پیس دیتے۔ شوکت عثمانی کا یہ ڈرامہ آج بھی ہر جگہ مقبول ہے۔

نورالمومن ڈھاکہ یونیورسٹی میں قانون پڑھاتے ہیں، لیکن ڈرامہ نویسی اور ایکٹنگ اُن کی گھٹی میں پڑی ہے انہوں نے بنگلا زبان کے ڈراموں میں ایک بالکل ہی نئی چیز ایجاد کی ہے۔ ان میں صرف ایک ہی کردار ہوتا ہے جسے یہ مختلف انداز سے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ دوسرے شخص کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ ان کے ڈرامے کا کردار کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ وہ سب سے ملتا جلتا ہے شہروں اور بازاروں کے چکر لگاتا ہے لیکن کسی سے بات نہیں کرتا۔ وہ خود ہی بولتا ہے اور خود ہی اپنے آپ سے سوال جواب کر لیتا ہے۔ ڈرامہ نگاری میں یہ تجربہ بالکل نیا ہے نورالمومن صاحب نے

چند سال پہلے بی بی سی لندن سے 'بنگالی پروگرام' 'انجمن' میں اپنے اس قسم کے ڈرامے پیش کر کے ساری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ اب بھی ریڈیو پاکستان ڈھاکہ سے اُن کے اس قسم کے ڈرامے نشر ہوتے رہتے ہیں۔

بنگلہ زبان کے نامور نقاد، شاعر اور ادیب سید علی احسن نے بھی بنگلہ زبان کے ڈراموں میں ایک دلچسپ اور کامیاب تجربہ کیا ہے انہوں نے ایک نئی ڈرامائی صنف ایجاد کی ہے جس کا نام انہوں نے "نوحہ" رکھا ہے۔ اِن ڈراموں کے مرکزی کردار مردہ روحیں ہوتی ہیں اسٹیج پر پس منظر میں روحیں دھندلی دھندلی نظر آتی ہیں اور روحیں آپس میں کچھ اس طرح باتیں کرتی ہیں کہ ساری باتیں مل کر افسانہ اور پھر افسانہ ڈرامے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مردہ روحیں پس منظر میں برابر موجود رہتی ہیں اور وہ جو کچھ باتیں کرتی ہیں عملی شکل میں اسٹیج پر ظاہر ہوتی رہتی ہیں ان کے اس قسم کے ڈراموں میں "قربانی" اور "زہرہ مشتری" بہت مشہور ہیں۔

عسکر ابن شیخ نے اپنے ڈراموں کا موضوع مشرقی پاکستان کو بنایا ہے۔ اُن کے ڈراموں کے کردار ہمیشہ مشرقی پاکستان کے ہی ہوتے ہیں۔ اُن کا ایک ڈرامہ "ستیومیر" اور دوسرا "پدما" یعنی دریائے پدما بہت مقبول ہیں۔

مذکورہ بالا ادیبوں کے علاوہ اب بنگلہ زبان کے ادیبوں اور شاعروں کی بہت بڑی تعداد بنگلہ زبان کو اپنی ڈرامائی تخلیقات سے مالا مال کر رہی ہے۔ یہاں بنگلہ زبان کی ڈرامہ نگاری ابھی تک تجرباتی دور میں ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تجربات کب تک اور کہاں تک جاری رہیں گے۔ لیکن یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ نت نئے تجربے جلد ہی بنگلہ زبان کے ڈراموں کو بلند سے بلند مقامات تک پہنچا دینگے۔

اگست ۵۶ء

کیسی شام میرے جلو میں تھا کوئی خواب وسعتِ شہر کا
کیسی صبح میرے وجود پر یہ زمین لوگوں نے تنگ کی

غلام حسین ساجد

عکس تحریر غلام حسین ساجد

# ہمارے یہاں ڈرامہ کیوں نہیں

محمد حسن عسکری

آج سے چار سال پہلے اپنی جہالت کے سہارے میں ڈرامہ کے متعلق بہت سی باتیں بڑے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا لیکن ان چار سال تک یونانی رومی، فرانسیسی ٹریجیڈی پڑھانے کے بعد یہ حال ہوا ہے کہ میں ڈرامہ اور خصوصاً ٹریجیڈی کی کوئی ایسی تعریف پیش نہیں کر سکتا جو ان سب چیزوں پر حاوی ہو جنہیں ڈراما یا ٹریجیڈی کہہ دیا جاتا ہے۔ ڈرامے کی ایک عام تعریف یہ ہے کہ اس میں کسی عمل کا نقشہ کھینچا جاتا ہے لیکن ہر تہذیب عمل کا ایک الگ تصور رکھتی ہے، پھر اس تصور کی بنیاد ہوتی ہے انسانی تقدیر اور زمان و مکان کے اس تصور پر، جو کسی قوم کا مابہ الامتیاز ہوتا ہے چونکہ یہ اقدار محض نظریاتی حیثیت نہیں رکھتیں، بلکہ قوم کے پورے تجربے سے پیدا ہوتی ہیں، اس لئے اشپنگلر کے نزدیک تو ایک تہذیب دوسری تہذیب کی اقدار اپنا ہی نہیں سکتی اور نہ اقدار کے ذریعے وجود میں آنے والے فنون کو سمجھ سکتی ہے۔ مغربی تہذیب کے مختلف ادوار میں لوگ یونانی ڈرامے کے اصولوں کے مطابق لکھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، لیکن اشپنگلر کے خیال میں یونانی ڈرامے اور مغربی ڈرامے کے درمیان صرف ایک چیز مشترک ہے —— لفظ "ڈراما" اس نظریے کی رو سے سوفوکلیز اور شیکسپیر کے ڈرامے پڑھنے کے طریقے بالکل مختلف ہوں گے، مثلاً شیکسپیر کے کرداروں کی شخصیت ہمارے سامنے تشکیل پاتی ہے اور ان کی خرابی کی صورت بھی اسی تعمیر میں مضمر ہوتی ہے اس کے برخلاف یونانیوں کے کردار بنے بنائے اور مکمل صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں اور ان کی صورت خارجی ذرائع ہوتی ہے یعنی عمل کا مطلب ان دو قسم کے ڈراموں میں بالکل مختلف ہے۔ اب اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہیں کہ یونان میں، یا عہد الزبتھ کے انگلستان میں ڈراما کیوں پیدا ہوا، تو اس کی وجوہات بالکل مختلف ہوں گی، یعنی جس چیز کو ہم جلدی میں ڈرامہ کہہ دیتے ہیں وہ ہر تہذیب میں مختلف قسم کا ہوگا، اور اس کے وجود میں آنے کی اندرونی ضروریات بھی مختلف ہوں گی اور عمل کا تصور بھی بالکل الگ ہوگا غرض یونانی اور مغربی ڈراما کی پیدائش اور نشو و نما کی جو توجیہ عام طور سے کی جاتی ہے وہ ہمارے معاشرے اور اس کے فنون پر عائد نہیں ہو سکے گی۔

اشپنگلر کے اس نظریئے کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ تہذیبی اثرات کوئی چیز نہیں، ہر تہذیب بذات خود ایک مکمل شخصیت رکھتی ہے جس کا دوسری تہذیبوں سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا یہاں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ بات ٹھیک ہے تو پھر اشپنگلر نے دوسری تہذیبوں کو کیسے سمجھا اور ان کے متعلق کوئی رائے دینے کی جرأت کیسے کی؟ اس نظریئے میں یہ بہت بڑی کمزوری ہے۔ اچھا اب مختلف تہذیبوں کے فنون کے تقابلی مطالعے کو چھوڑیئے، صرف ایک معاشرے کے ڈرامائی فن کو دیکھئے کہ اس کے سمجھنے میں کیسی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ جن لوگوں نے مغربی ڈرامہ کے متعلق سوچا ہے ان میں سے بہت سوں کا خیال ہے کہ ڈراما قوت ارادی کا کھیل ہے جب تک یہ عنصر برسرکار نہ آئے ڈراما پیدا نہیں ہوتا، خصوصاً ٹریجیڈی۔ ڈی ایچ لارنس نے کہا ہے کہ اگر ٹریجیڈی کا ہیرو پوری کائنات کی طاقتوں کے خلاف جد و جہد میں مصروف نظر نہ آئے تو اس کی حالت یہ ہوتی ہے جیسے کوئی مینڈک گاڑی کے نیچے آ کے پس جائے میں مانتا ہوں کہ شیکسپیر کی ٹریجیڈی ہی نہیں، بلکہ یونانی ٹریجیڈی کو کھینچ کھانچ کے اس طرح پڑھا جا سکتا ہے اس کے برخلاف ولسن نائٹ اور بعض دوسرے لوگوں کی رائے ہے کہ قوت ارادی کے تصور کے ذریعے ٹریجیڈی کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا اور یہ بات انہوں نے شیکسپیر

کے سلسلے میں کہی ہے۔ یعنی ایک ہی ڈرامانگار کو دو، تین مختلف طریقوں سے پڑھا جا سکتا ہے کہ زمین اور آسمان کا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ نقادوں سے قطع نظر آج کل کے بعض بڑے ڈرامانگاروں کو لیجئے "کوکتو" نے تو اپنے "ایڈیپس" والے ڈراما میں کائنات کے نظام ہی کو مشین سے تشبیہ دی ہے جس کے اندر آ کے آدمی پسا چلا جاتا ہے۔ "ژاں آنوئی" کے "انیٹی گنی" میں یہ بات اور بھی واضح ہو گئی ہے۔ یہاں کورس کے شروع میں ہی کہہ دیا ہے کہ اگر تمہارا نام انیٹی گنی ہے تو پھر تم کوشش کے باوجود ٹریجیڈی سے نہیں بچ سکتیں۔ اس ساری بحث کا مطلب یہ ہے کہ جتنے جھگڑے ڈراما پر غور کرتے ہوئے پیدا ہوتے ہیں اتنے شاید کسی بھی صنف کے معاملے میں پیدا نہیں ہوتے حالانکہ اس موضوع پر لوگ افلاطون کے وقت سے لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ اب یہ دیکھئے ناکہ آخر کسی معاشرے میں ڈرامے کی پیدائش کا کیا معیار مقرر کریں؟ کیا ڈراما اس وقت وجود میں آتا ہے جب معاشرہ انسان کی قوت ارادی پر یقین رکھتا ہو؟ یا اس وقت کہ جب یہ عقیدہ ترک کر دیا گیا ہو؟

اچھا، اب ایک اور سوال سامنے آتا ہے۔ ڈراما اور مذہبی عقائد کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ ایک خیال یہ ہے کہ ڈرامے کے لیے عیسوی معاشرے سے بہتر ماحول ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ عیسائی کا سب سے بڑا فرض ہے اندرونی اور بیرونی ترغیبات سے لڑنا، اپنے آپ کو ابتدائی گناہ کے اثرات سے پاک کرنا، اور اپنی نجات کی دھن میں لگے رہنا۔ اس لیے چیسٹرٹن تو کہتا ہے کہ سچے عیسائی کی پوری زندگی ہی ایک ڈراما ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرا خیال یہ ہے کہ عیسوی معاشرہ ٹریجیڈی پیدا کر ہی نہیں سکتا، کیونکہ عیسوی عقیدے کے مطابق نجات کا انحصار ہے خدا کی مرضی پر ہے وہ اپنی رحمت سے جسے چاہے معاف کر سکتا ہے، اس لئے انسان کی زندگی میں ٹریجیڈی کا تصور کرنا تک گناہ ٹھہرتا ہے۔ "آرنلڈ ٹرینڈ" کہتا ہے کہ عیسائی کے لیے تو اصل ڈراما مرنے کے بعد شروع ہوتا ہے، زمین کی زندگی سے عیسائیوں کو اتنی شدید دلچسپی ہی نہیں جو اس کے بارے میں ڈراما تخلیق کر سکیں، اس لیے عیسوی ڈراما لکھنے کی کوشش شرمندۂ تعبیر ہو ہی نہیں سکتی۔ اس ناکامی کی مثال ٹرینڈ کے نزدیک "کلوڈیل" کے ڈرامے ہیں۔ ٹرینڈ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ توحید پرست معاشرہ ڈرامائی جذبات سے بیگانہ ہوتا ہے، کیونکہ وہ جبلتوں کی رنگارنگی کو قبول نہیں کرتا، ڈراما کے لیے تو یونان کی سرزمین موزوں تھی۔ یہاں ہر جبلت کے لیے ایک دیوتا مقرر تھا، انہیں جبلتوں کے بے لگام تصادم سے ڈرامائی جذبات پیدا ہوتے تھے۔ ٹرینڈ نے دوسرا معیار یہ قائم کیا ہے کہ ڈراما اس معاشرے میں ترقی پاتا ہے جہاں انسان دیوتا بن سکے اور دیوتا انسان یہ چیز عیسوی معاشرے میں ناممکن ہے، لہٰذا عیسوی مذہب کی ترقی اور ڈرامائی فن کا زوال لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔

مذہب اور ڈراما کے تعلق پر یہ دو قسم کے خیالات میں نے آپ کے سامنے پیش کر دیئے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ یہ نظریات ہمارے معاشرے پر بھی ضرور عائد ہوں گے میں تو صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ ڈرامائی فن کی بحث کتنی مشکل چیز ہے، اور یہاں ابتدائی معیار قائم کرنا بھی کتنا دشوار ہے۔ اب اصل مسئلے کی طرف آیئے، ہمارے یہاں ڈراما کیوں نہیں ہے؟ اس سوال کا جواب بعض لوگ تو یہ دیتے ہیں کہ ہر نسل چند نسلوں سے اندرونی مناسبت رکھتی ہے سامی نسلیں اور ان سے متاثر ہونے والی تہذیبیں ڈراما کے فن سے بیگانہ ہیں۔ پورے سامی ادب میں صرف "غزل الغزلات" ایک ایسی چیز ہے جو ڈراما سے کچھ مشابہت رکھتی ہے، پتہ نہیں، جواب ٹھیک ہے یا غلط، بہرحال اس پر بحث میں بعض ایسے جھگڑے پیش آتے ہیں کہ میں ان میں الجھنا نہیں چاہتا۔ اس لئے میں تو صرف اتنی بات پر غور کروں گا کہ ہمارے موجودہ ادب میں ڈراما ترقی کیوں نہیں کر سکا۔

اب تک میں نے پورا زور اس بات پر صرف کیا ہے کہ اس بحث میں بنیادی معیار قائم کرنا مشکل کام ہے لیکن کسی نہ کسی معیار کے بغیر بحث آگے چل ہی نہیں سکتی۔ اشپنگلر کے جیسے مابعد الطبیعاتی یا تجریدی معیار تو میں فی الحال قبول نہیں کروں گا کیونکہ انہیں رد کرنا بھی اتنا ہی آسان ہے۔ میں تو کوئی ایسا معیار چاہتا ہوں جو ہر قسم کی تہذیبوں اور اقدار پر عائد ہو سکے۔ وقت، عمل، انسانی تقدیر کے تصورات تو ہر مذہب میں مختلف ہو سکتے ہیں لیکن جو چیز سب میں مشترک ہے وہ ہے ایک سر دو ہاتھ، دو پیر یعنی جسم اور جسمانی عوامل سے پیدا ہونے والے ذہنی عوامل اس لیے میرا بنیادی معیار تو نفسیاتی ہوگا۔ اتنی

بات تو سبھی فلسفہ یہ مانتے ہیں کہ ڈراما عمل کی تصویر کشی ہے۔ عمل کا تصور ہر مذہب میں جداگانہ ہوتا ہے تو ہونے دیکھئے۔ ایک عمل ہر معاشرے کے افراد میں مشترک ہے جس کی تین شکلیں ہیں۔

۱۔ جسم کے اندر "ہوا اور رنگوں" کی حرکت

۲۔ جسم کے اندر سے باہر فضا کی طرف "ہوا اور رنگوں" کا بہاؤ

۳۔ فضا میں سے جسم کے اندر "ہوا اور رنگوں" کا آنا۔ یہ ہمارے جسم کا بنیادی عمل ہے، اور انسانی شعور کا کام ہے اس عمل کی آگہی حاصل کرنا۔ فلسفی لوگ اس چیز کو خود آگاہی، کائنات کا شعور، یا عرفان وغیرہ کہتے ہیں۔ ہم ڈرامے کے نزدیک انسانی زندگی کا سب سے بڑا اور سب سے بنیادی ڈراما یہی ہے۔ ڈراما وہی فرد یا معاشرہ تخلیق کر سکتا ہے جو اپنے اندر اس عمل کو محسوس کرنے کی ہمت رکھتا ہو۔

یہی ہمت ہمارے آج کل کے ادب میں نظر نہیں آتی۔ کبھی تو ہمارے ادب سیاسی نظریات کے پیچھے چھپتے ہیں کبھی جذبات پرستی کے پیچھے۔ کبھی ادبی نظریات کے پیچھے۔ یوں تو ہمارے نقاد کہتے ہیں کہ ۱۹۳۶ء کے بعد ہمارے ادب میں صاف گوئی نے فروغ پایا اور ادیبوں نے نشتر کے کچوکے پھوڑوں کو چیرا، لیکن اپنے آپ سے اور اپنے معاشرے سے آگاہی حاصل کرنے کی یہ کوشش کبھی اتنی گہرائی حاصل نہیں کر سکی کہ دو چار حوالوں سے زیادہ اس کی گرفت میں آ سکیں۔ پھر ہمارے ادیبوں نے "کیا ہو رہا ہے؟" اور "کیسے ہو رہا ہے؟" کو پوری طرح سمجھے بغیر "کیوں ہو رہا ہے" کی فکر شروع کر دی۔ یہاں سیاسی نظریوں، اور خصوصاً سیاسی لوگوں نے انہیں سہارا دیا اور بعد میں تو بالکل ہی اپنے قبضے میں کر لیا۔ ادیبوں کا کام تھا آگاہی حاصل کرنا، اس کے بجائے انہوں نے دوسروں کے کام اپنے ذمے لے لئے۔ چار پانچ سال سے سیاست بازی کے بجائے جذبات پرستی کا زور ہو رہا ہے، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اپنے جذبات کو دیکھے اور سمجھے بغیر انہیں کوئی مروجہ اور مقبول نام دے دیا جائے۔ یہ تو آگاہی کے فریضے سے ایک بڑا فرار ہے۔ اسی طرح ادبی نظریات بھی بعض لوگوں کے کام آ رہے ہیں۔ ادبی نظریات کی ضرورت تو اس وقت پیش آتی ہے جب آپ کو اپنے تجربے کی آگہی حاصل ہو اور آپ اس آگہی کو خارجی شکل دینا چاہتے ہوں۔ اس کے بغیر ادبی نظریات آگاہی سے بچنے کا ایک بہانہ بن جاتے ہیں۔

بعض صورتوں میں ادب کے لئے ادبی نظریات سیاست سے بھی زیادہ مہلک ثابت ہوتے ہیں اور ادب سے بچ نکلنے کا سب سے اچھا طریقہ خود ادب ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں یہ بھی ہو رہا ہے جب ہمارے افسانے تک میں تو آگاہی کا اتنا فقدان ہو تو پھر ڈراما کہاں سے آئے؟ جب ہم اپنے اندر اور اپنے معاشرے کے اندر طاقتوں کی باہمی لڑائی اور سماجی اقدار سے ان کے تصادم کو دیکھنے اور سمجھنے کی ہمت ہی نہ رکھتے ہوں تو ڈراما تو دور کی بات ہے، اچھی غنائی شاعری تک نہیں کر سکتے۔ اگر ہمارے ادب میں ڈراما نظر نہیں آتا تو اس میں تخلیقی صلاحیت کی کمی یا زیادتی کا سوال نہیں۔ یہ ہمارے ادیبوں کی شخصیت کی کمزوری ہے۔ اگر یہ صنف ہمارے ادب میں نہ ہوتی تو بھی کوئی بات نہ تھی، ہمارے یہاں تو ڈرامائی احساس ہی نہیں ملتا۔ ڈرامے کو اسٹیج کی غیر موجودگی نے نہیں مارا، ہم خود اپنی ہستی کو ایک اسٹیج سمجھنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ ہماری پبلک اس فن سے بے نیاز ہو یا نہ ہو، ہم خود اپنے آپ سے گھبراتے ہیں۔

ٹیرس نے کہا ہے کہ ڈراما پیدا کرنے کے لئے معاشرے میں یہ احساس ہونا چاہئے کہ انسان دیوتا بن سکتا ہے۔ اس فقرے میں نفسیاتی حقیقت یہ ہے کہ جسم کے اندر "ہوا اور رنگوں" کی رفتار بدلنے کے ساتھ آدمی کی شخصیت میں بھی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں، یہ قوت اندر سے آدمی کو بدلنے، کچھ اور بننے پر مجبور کرتی رہتی ہے۔ یہ ڈرامائی عمل ہر وقت جاری رہتا ہے اور اسی کے ذریعے آدمی کی شخصیت نشوونما پاتی ہے۔ ہمارے ادب میں آدمی کی قلب ماہیت کا تو ذکر ہی کیا، تبدیلی کا احساس بھی عام طور سے نہیں ملتا۔ ہمارے افسانے یہ تو بتا دیتے ہیں کہ آدمی کیسا ہے، لیکن یہ کبھی نہیں کہتے کہ وہ کیا بن رہا ہے۔ "بننے" کا احساس تو ہمارے ادیبوں کو حاصل ہی نہیں۔

غالباً اسی وجہ سے ہمارے یہاں افسانہ اتنا مقبول ہے اور ناول کمیاب ہے کیونکہ چھوٹے ناول میں بھی... کرداروں کے اندر کبھی نہ کسی قسم کی تبدیلی تو دکھانا ہی پڑتی ہے۔ پھر ڈراما کا تو معاملہ ہی اور ہے، یہاں تو ایک لمحے کے اندر تبدیلیاں ہیرو پر ٹوٹ پڑتی ہیں اور چشم زدن میں کچھ سے کچھ بن جاتا ہے ایسے لمحوں سے دوچار ہونے کی طاقت ہمارے ادیبوں میں نہیں، وہ تو قناعت پسند واقع ہوئے ہیں، جو کچھ ہیں وہی رہنا چاہتے ہیں، شخصیت کے انجماد ہی میں مگن ہیں، بلکہ اسی انجماد سے لذت حاصل کرتے ہیں، نہ دیوتا بننے کی ہمت رکھتے ہیں نہ جانور بننے کی ایسے لوگ انسان بھی نہیں بنتے، اردو کے ادیب البتہ بنے رہ سکتے ہیں۔ مگر ڈراما تو ہے ہی تبدیلی کا مطالعہ۔ جو لوگ تبدیلی کا خواب تک نہ دیکھ سکیں وہ ڈراما کیسے لکھ سکتے ہیں؟ بس یہ شکایت کر سکتے ہیں کہ ہمارے یہاں اسٹیج نہیں۔ ورنہ یہاں بھی دو چار شیکسپیئر ہوتے۔ حالانکہ شیکسپیئر وہ بنتا ہے جسے ہر قدم ایک ڈرامے کا ہیرو نظر آئے۔

پھر ہمارے افسانہ نگار ہوں یا شاعر، افسردگی کو ادب سمجھتے ہیں۔ افسانہ لکھیں یا نظم اپنے اضمحلال کی چسکیاں لیتے ہیں۔ اس اضمحلال کے پیچھے جو ہولناک جنگ ہو رہی ہے اسے دیکھنے کی تاب نہیں رکھتے۔ افسردگی کے شیرے میں اس بری طرح پھنسے ہیں کہ اس سے باہر نکل کر اپنی کیفیت کا جائزہ نہیں لے سکتے۔ اپنی جذباتی حالت سے اتنی علیحدگی بھی میسر نہ ہو تو ڈرامائی احساس کہاں سے آئے؟ یہ تو اسی آدمی کے بس کی بات ہے جو اپنی اندرونی مہوش کو کبھی کبھی اس طرح دیکھ سکے جیسے لڑکے سڑک پہ کتوں کی لڑائی دیکھا کرتے ہیں۔ یہ بے تعلقی بذات خود اپنے اندر ایک ڈرامائی کشمکش رکھتی ہے لیکن ہمارے ادیبوں کو ہر قسم کی کشمکش گراں گزرتی ہے وہ تو اپنی ایک ادبی جنت میں رہتے ہیں، اور جنت میں کوئی ڈراما نہیں ہوتا۔

(اپریل ۷۷ء)

[illegible]

[illegible]

ستارہ طاہر

عکسِ تحریر ستارہ طاہر

# سرخ فیتہ

قدرت اللہ شہاب

## کردار

سیکرٹری

جائنٹ سیکرٹری

ڈپٹی سیکرٹری

انڈر سیکرٹری

اسسٹنٹ سیکرٹری

سپرنٹنڈنٹ

مقام : کانفرنس روم

وقت : صبح دس بجے

**سیکرٹری** :۔ میرے خیال میں کارروائی شروع ہونی چاہیئے۔ ویل، سپرنٹنڈنٹ صاحب آپ کیس کو وضاحت سے بیان فرمایئے۔

**سپرنٹنڈنٹ** :۔ یس سر۔ یس سر۔ جناب کو غالباً یاد ہوگا کہ جب ٹائپسٹ کلرک مس سلیمہ کی تقرری زیرِ غور تھی، تو خاکسار نے بصد ادب و احترام عرض کیا تھا کہ شاید یہ تجربہ مہنگا پڑے۔ ذاتی طور پر یہ تابعدار آزادئ نسواں کا مخالف نہیں، بلکہ میں نے ہفتہ وار "جلترنگ" اور ماہنامہ "پروانہ" میں حقوقِ نسواں پر بڑے معرکہ کے مضامین لکھے ہیں۔ اگر جناب والا ارشاد فرمائیں تو ان کے تراشے پیش کروں؟ اتفاق سے میری جیب میں چلے آئے ہیں۔

**جائنٹ سیکرٹری** :۔ یہ بات موضوع سے دور ہے۔ آپ محض کیس بیان کیجیئے۔

**سپرنٹنڈنٹ** :۔ یس سر۔ جی ہاں۔ میں گزارش کر رہا تھا، کہ ذاتی طور پر خاکسار آزادئ نسواں کا مخالف نہیں۔ لیکن اصولی طور پر دولتِ خداداد پاکستان میں......

**سیکرٹری** :۔ آپ اصولی بحثوں سے برکنار رہنے کی کوشش کیجیئے۔ ہم صرف کیس سننا چاہتے ہیں۔

**اسسٹنٹ سیکرٹری** :۔ اور جناب اس کے علاوہ سرکاری ملازمتوں میں عورتوں کا تناسب بحوالہ سرکلر نمبر ۲۵۲۳۴ الف مورخہ ۱۹؍دسمبر ۱۹۴۷ء مقرر ہو چکا ہے۔ اب اس موضوع پر کسی قسم کی اصولی بحث کرنا غیر مناسب ہے۔ گر جناب ضروری خیال فرمائیں، تو سرکلر مذکورہ پیش کیا جائے۔

انڈر سیکرٹری :۔ میرے خیال میں سرکلر پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ایسا اہم سرکلر تو سب کو ازبر ہونا چاہیئے۔ افسوس تو یہ ہے کہ حکومت کے احکام پر مناسب عمل نہیں کیا جاتا۔ ورنہ اب تک دفتروں میں حسین چہروں .... میرا مطلب ہے، صنفِ نازک کو اپنا جائز حصہ مل چکا ہوتا۔ جناب، میں سمجھتا ہوں کہ پیشِ نظر کیس کی سماعت کے وقت مس سلیمہ کو بھی اس میٹنگ میں موجود ہونا چاہیئے۔ اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو اُسے بُلا بھیجا جائے؟

ڈپٹی سیکرٹری :۔ انڈر سیکرٹری کی رائے نہایت معقول ہے۔ قانونی لحاظ سے اس کیس سے متعلقہ سب لوگوں کو یہاں موجود ہونے کا حق پہنچتا ہے۔

جائنٹ سیکرٹری :۔ یہ دلیل بعید از موضوع ہے، ہم ایک محکمانہ معاملے پر غور کر رہے ہیں اور محکمانہ کارروائیاں عدالتی اصولوں کی پابند نہیں ہیں۔

سیکرٹری :۔ میرا رجحان بھی جائنٹ سیکرٹری کی رائے سے متفق ہونے کی طرف آمادہ ہے۔ ویل، سپرنٹنڈنٹ صاحب، بیان جاری رکھیئے۔

سپرنٹنڈنٹ :۔ جناب، غلام گذارش کر رہا تھا کہ خاکسار کی متوا بنہ گذارشات کے باوجود مس سلیمہ کی تقرری منظور ہو گئی، تو میں نے عرض کی تھی کہ کم از کم اسے میرے سیکشن میں تعینات نہ کیا جائے۔ حضور جانتے ہیں کہ میرے سیکشن میں پہلے ہی عجیب عجیب مخبوط عناصر بھرے ہوتے ہیں، جو کام کی نسبت باتیں اور جھگڑے زیادہ کرتے ہیں مثلاً ناصر علی تیرا جو ہونے کو تو بل کلرک ہے، لیکن اندر ہی اندر شاعر بھی ہے اور ناقدوں پرانی نظموں کی مشق کرنے کا عادی ہے۔ کبھی ہتھوڑے پر نظم، کبھی درانتی پر غزل، کبھی سڑک کوٹنے والے انجن کی شان میں قصیدہ۔ اللہ، اللہ! یہ بھی کیا زمانہ آیا ہے حضور! ورنہ شاعری جیسی صنفِ لطیف کو ان بھونڈے مضامین سے کیا واسطہ؟ وہ مرزا اسد اللہ غالب نے فرمایا ہے

ع۔ آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں ....

جائنٹ سیکرٹری :۔ براہِ مہربانی آپ شاعری سے ہٹ کر کیس پر رہیئے۔

سیکرٹری :۔ مجھے اس بات سے قطعی اتفاق ہے۔ ویل؟

سپرنٹنڈنٹ :۔ اور جناب میرے سیکشن میں ناصر علی تیر کے علاوہ، وہ خبطی، سودائی نصرت اللہ خیال بھی ہے، جو اپنے آپ کو دورِ حاضر کا بہترین نثر نگار سمجھتا ہے۔ اور ....

انڈر سیکرٹری :۔ میرے خیال میں آپ اپنے سیکشن کا تجزیہ کرنے کی بجائے مس سلیمہ کے متعلق باتیں کرتے جائیں تو بہتر ہوگا۔

ڈپٹی سیکرٹری :۔ انڈر سیکرٹری کا مطلب ہے کہ آپ اپنی گفتگو کو کیس کے موضوع سے بہت دور نہ جانے دیجئے۔ مجھے اس خیال سے پورا اتفاق ہے۔

سپرنٹنڈنٹ :۔ جی ہاں۔ بے شک۔ میں عرض کر رہا تھا کہ میرے سیکشن میں پہلے ہی سے مخلوط العناصر کی کھچڑی پکی ہوئی تھی۔ اس پر طُرہ یہ، کہ مس سلیمہ کی بھی پوسٹنگ ہوئی تو اسی سیکشن میں۔ میرے ناچیز خیال میں تنظیمی لحاظ سے یہ ایک غلطی تھی۔

اسسٹنٹ سیکرٹری :۔ حکومت کے منظور شدہ احکامات پر نکتہ چینی کرنے سے سپرنٹنڈنٹ کو باز رہنا چاہیئے۔

سپرنٹنڈنٹ :۔ جی ہاں، بہت خوب۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ چنانچہ جنابِ عالی، مس سلیمہ کے آنے پر میرے سیکشن میں گڑبڑ اور بھی زیادہ بڑھ گئی۔ اور باوجودیکہ .....

اسسٹنٹ سیکرٹری :۔ کیا مطلب؟ یعنی کہ آپ کے سیکشن میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ موجود تھی؟ تنظیمی لحاظ سے یہ اتہام قابلِ غور ہے۔

**انڈر سیکرٹری** :- میرے خیال میں سپرنٹنڈنٹ صاحب کو ایڈمنسٹریشن کا خاطر خواہ تجربہ نہیں۔ کسی سیکشن میں [illegible] کا تجربہ ہو چہ جائیکہ گزیٹڈ اور بھی حیثیت سے ہو۔

**ڈپٹی سیکرٹری** :- سپرنٹنڈنٹ صاحب، یہ فرمایئے کہ آپ اس پوسٹ پہ کب سے مقرر ہیں۔ اور آپ کو سروس کے کیسے تجربات کب ہیں!

**سپرنٹنڈنٹ** :- جی حضور، میں معافی کا خواستگار ہوں۔ دراصل میری گذارش کا مقصد یہ تھا ...

**ڈپٹی سیکرٹری** :- آپ اپنا مطلب چھوڑیئے اور فی الحال میرے سوالوں کا جواب دیجئے۔

**سپرنٹنڈنٹ** :- جناب عالی، خاکسار نے ۱۹۲۵ء میں آگرہ یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ حسن اتفاق سے [illegible] ان مسٹر [illegible] آئین صاحب بہادر سپرنٹنڈنٹ ہوئے [illegible] حکومت [illegible] صاحبہ کے ہمراہ تاج محل کی زیارت کرنے آگرہ تشریف لائے۔ خدائے ذوالجلال دونوں کو غریق رحمت کرے۔ [illegible] کے اونٹ تھے [illegible] عین تاج محل کے باہر ان کے تانگے کا گھوڑا بدک گیا۔ میں کلو پنواڑی کی دکان کے سامنے بیٹھا بیڑی سلگا رہا تھا۔ ان دنوں کلو پنواڑی کی دکان تاج محل کے عین سامنے واقع ...

**جائنٹ سیکرٹری** :- مجھے شک ہے کہ انتظامی نااہلیت کے علاوہ اس سپرنٹنڈنٹ کو ضرورت سے زیادہ باتیں کرنے کا بھی مرض ہے یہ دونوں نہایت سنگین نقائص ہیں۔ اگر ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی بنیادوں کو اس قسم کی نااہلیت اور باتونیت پر استوار کیا جا سکتا ہے، تو یقیناً ہم جنت الحمقا میں رہتے ہیں۔ میرے خیال میں اس سپرنٹنڈنٹ کی اہلیت کا جائزہ لینے کے لئے مکمل انکوائری کی ضرورت ہے۔

**سیکرٹری** :- مجھے اس رائے سے حرف بحرف اتفاق ہے۔ نااہلیت کو دیدہ دانستہ برداشت کرنا قومی غداری کے مترادف ہے۔ ویل، سپرنٹنڈنٹ صاحب آپ جا سکتے ہیں۔ یہ فائل یہیں چھوڑتے جایئے۔

(سپرنٹنڈنٹ جاتا ہے)

**سیکرٹری** :- میرے خیال میں اس سپرنٹنڈنٹ کے کام، تجربے اور دیگر کوالی فیکیشنز کا جائزہ لینے کے بعد میرے پاس ایک مفصل نوٹ پیش ہونا چاہیئے۔

**جائنٹ سیکرٹری** :- (ڈپٹی سیکرٹری سے) آپ اس کام پر اپنی خاص توجہ صرف کیجئے۔

**ڈپٹی سیکرٹری** :- (انڈر سیکرٹری سے) آپ اس انکوائری کو اپنی ذاتی نگرانی میں نہایت انضباط کے ساتھ منعقد کریں۔

**انڈر سیکرٹری** :- (اسسٹنٹ سیکرٹری سے) اگر اس معاملے میں آپ کو میری مدد کی ضرورت پڑے، تو بلا تکلف مجھے بتا دیجئے گا۔

**اسسٹنٹ سیکرٹری** :- بہت خوب۔ کیا اب میں مس سلیمہ کا کیس آگے بیان کیا جائے؟

**انڈر سیکرٹری** :- شاید یہ بہتر ہوگا کہ سپرنٹنڈنٹ کی غیر موجودگی میں کیس پر روشنی ڈالنے کے لئے مس سلیمہ کو یہاں بلا لیا جائے۔

**جائنٹ سیکرٹری** :- جیسا کہ فیصلہ ہو چکا ہے۔ مس سلیمہ کو اس میٹنگ میں بلانے کے لئے کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ اسسٹنٹ سیکرٹری خود ہی کیس پر روشنی ڈال سکتا ہے۔

**سیکرٹری** :- میں جائنٹ سیکرٹری کی رائے کے ساتھ اپنے اتفاق کو دہراتا ہوں۔ ویل، ویل۔ کیس بیان ہو۔

**اسسٹنٹ سیکرٹری** :- جناب شکایت کا لب لباب یہ ہے کہ بل کلرک ناصر علی میر، جو اندر ہی اندر شاعر بھی ہے دفتر میں بیٹھ کر اپنی نظمیں گنگنانے کا عادی ہے، اس کی ایک نظم پر سپرنٹنڈنٹ صاحب کو شدید اعتراض ہے ان کا خیال ہے کہ اس نظم کے پڑھنے میں مس

سلیمہ کی طرف رومانی اشارات ہیں اور یہ ایک اخلاقی جرم ہے۔ دوسرے حصّے میں حکومت پر حملہ ہے، جو ایک قانونی جرم ہے۔ اور اس کے علاوہ ایک ادبی جرم یہ ہے کہ نظم سر سے پاؤں تک بے قافیہ و بے ردیف ہے۔

ڈپٹی سیکرٹری :۔ جہاں تک سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ادبی اعتراضات کا تعلق ہے، انہیں موضوعِ بحث سے الگ رکھنا چاہیئے۔

انڈر سیکرٹری :۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اس سلیمہ کے متعلق رومانی اشارات منظوم کرنا بھی کوئی جرم نہیں۔ البتہ اگر مس سلیمہ کو خود کوئی وجہِ شکایت ہو تو دوسری بات ہے۔ اس لئے شروع ہی سے میرا یہ خیال رہا ہے کہ مس سلیمہ کی رائے معلوم کرنے کے لئے اُسے اس میٹنگ میں بلانا ضرور بہ مناسب ہوگا۔

جائنٹ سیکرٹری :۔ مجھے افسوس ہے ہم پیش از مرگ واویلا کر رہے ہیں۔ نظم سننے سے پہلے اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا ایک مہمل سی بات ہے۔

سیکرٹری :۔ بالکل ٹھیک۔ میری رائے کا پلّہ بھی اسی طرف جھکنے کی طرف مائل ہے۔ ویل، اسسٹنٹ سیکرٹری صاحب، آپ نظم بیان فرمایئے۔

اسسٹنٹ سیکرٹری :۔ جناب، نظم کا عنوان ہے "سُرخ فیتہ" عرض کیا ہے :۔

تُو نے جب کھایا پان !

تیرے ہونٹوں پہ لگا فیتہ سُرخ

جانِ جاں

جانِ جہاں

تیری آنکھوں میں گلابی ڈورے

تیرے گالوں پہ وہ غازے کی بہار

تیرے حلقوم کی شہ رگ میں مچلتا سا، چھلکتا سا، لپکتا سا ہوا گرم لہو

تیری شلوار پہ ریشم کا ربن

تیرے پُرپیچ غرارے پہ گلابی سی عنابی سی کشیدہ کاری

ہیہات !

تجھ پہ موقوف ہے کیا ؟

جانِ جاں ـــــ جانِ جہاں

سُرخ فیتے میں بندھی رہتی ہے سرکار میری !

اس میں حاکم بھی ہیں محکوم بھی ہیں

(خاکم بدہن !)

اس میں ظالم بھی ہیں مظلوم بھی ہیں

اس کے ہر پیچ میں پوشیدہ ہے اک دار و رسن

اس کے پھندے میں لٹکتی ہے، مٹکتی ہے، جھکتی ہے ادا پھانسی کی
جس میں سر ڈال کے آہ
مر گئی قاتل میری!

انڈر سیکرٹری :۔ واہ وا، واہ وا، سبحان اللہ، کیا خوب کہا ہے ظالم نے، واہ وا۔

ڈپٹی سیکرٹری :۔ بہت خوب، بہت خوب، جیسے ن۔م۔راشد کا کلام۔

انڈر سیکرٹری :۔ میرے خیال میں فیض کا رنگ بھی غالب ہے ۔ تیری آنکھوں میں گلابی ڈورے ۔ تیرے گالوں پہ وہ غازے کی بہار۔ واہ وا، واہ وا۔

ڈپٹی سیکرٹری :۔ کچھ کچھ میراجی کا اثر بھی نمایاں ہے ۔ تیرے حلقوم کی شہ رگ میں مچلتا سا، چھلکتا سا، لہکتا سا ہوا گرم لہو۔ آہا۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

جائنٹ سیکرٹری :۔ کیا آپ صاحبان داد دے چکے؟

انڈر سیکرٹری :۔ راجی صاحب، ہم کیا اور ہماری داد کیا۔ میں نے کہا۔ آپ نے غور فرمایا، کہ ہمارے دفاتر کی گدڑیوں میں کیسے کیسے لعل پوشیدہ ہیں مجھے یقین ہے کہ جب تک حکومت خود ان گنج ہائے گرانمایہ کو تلاش کرکے ......

جائنٹ سیکرٹری :۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ محکمانہ کارروائی مجلسِ مشاعرہ کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔

سیکرٹری :۔ میں خود یہی محسوس کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ صاحبان، ہمیں سنجیدگی کا دامن پکڑنا چاہیئے۔ اس کے بغیر امورِ سلطنت بعنوان شائستہ طے نہیں کئے جا سکتے۔

انڈر سیکرٹری ۔ ڈپٹی سیکرٹری :۔ بہت خوب، جناب۔

سیکرٹری :۔ ویل، اسسٹنٹ سیکرٹری صاحب!

اسسٹنٹ سیکرٹری :۔ جناب سپرنٹنڈنٹ صاحب کو شکایت ہے، کہ اس نظم کے پہلے آٹھ مصرعوں میں مس سلیمہ پر اشارات ہیں، اور باقی حصے میں سرکار والا مدار کے نظام کارکردگی کی شان میں گستاخی ہے۔

انڈر سیکرٹری :۔ کیا اس نظم میں کسی جگہ مس سلیمہ کا نام آیا ہے؟

اسسٹنٹ سیکرٹری :۔ جی نہیں، تو۔

انڈر سیکرٹری :۔ اس صورت میں یہ شکایت بے بنیاد ہے۔

ڈپٹی سیکرٹری :۔ اور اگر مس سلیمہ کو یہ خوش فہمی ہے کہ نظموں میں اس کے سوا اور کسی خوب صورت لڑکی کا ذکر نہیں ہو سکتا، تو اس وہم کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں۔

انڈر سیکرٹری :۔ اس کے علاوہ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ اشارہ مس سلیمہ کی طرف ہے تو پہلے ہمیں ان امور پر تحقیقات کرنا ہوں گی کہ کیا وہ پان کھاتی ہے؟ کیا پان کھانے کے بعد اُس کے ہونٹوں پر سُرخ فیتے سے لہرانے لگتے ہیں؟ کیا اس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے ہیں؟ کیا اُس کے گالوں پہ غازے کی بہار ہوتی ہے؟ کیا وہ ایسی شلوار پہنتی ہے جس کے پائنچوں پہ سُرخ ربن لگا ہو؟ کیا اُسکے عزار سے پر سُرخ ریشم کے پھول ہوتے ہیں؟ ...... جناب عالی، میں بصد ادب و احترام گذارش کروں گا کہ جب تک ہم مس سلیمہ کو سامنے

جب تک ان امور کا مفصل جائزہ نہ لیں، ہماری تجویز پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی کہ کم از کم انصاف کا تقاضا تو یہی ہے۔

**ڈپٹی سیکرٹری** :۔ بالکل درست۔ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہمارے دفاتر میں مس سلیمہ کے علاوہ دو ایک ایسی لڑکیاں ہوں جو پان کھاتی ہوں، گالوں پر غازے کی بہار ہو۔ جن کی آنکھوں میں گلابی ڈورے ہوں۔

**جائنٹ سیکرٹری** :۔ مجھے اس نکتے سے معقولیت کی بو آتی ہے۔

**سیکرٹری** :۔ میرا خیال ہے کہ میں بھی یہی سونگھ رہا ہوں۔

**انڈر سیکرٹری** :۔ جناب، اس صورت میں یہ تجویز پیش کرنے کی جرأت کروں گا کہ مزید نگرانی کے لئے ایک بین الوزارتی میٹنگ کی جائے اور اس میں سب محکموں میں کام کرنے والی لڑکیوں کو بھی طلب کیا جائے۔

**جائنٹ سیکرٹری** :۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ابھی چنداں ضرورت نہیں، لیکن جناب، جو خیال مجھے پریشان کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ نظم مس سلیمہ الیاس اور منسٹر صاحب کے متعلق ہے تو ہم کس قسم کا ایکشن لینے کے مجاز ہوں گے؟

**اسسٹنٹ سیکرٹری** :۔ جناب۔ کیس کے اس پہلو پر ابھی غور نہیں کیا گیا۔ میرا خیال ہے کہ انکوائری مکمل ہونے کے بعد ایکشن تجویز کرنا کوئی مشکل کام نہ ہوگا۔

**سیکرٹری** :۔ بہت خوب! آپ گاڑی کو گھوڑے کے آگے باندھتے ہیں۔ تو کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ اس کیس پر ابتدائی کارروائی کا ذمہ دار کون ہے؟

**اسسٹنٹ سیکرٹری** :۔ جناب، ابتدائی کارروائی اس خاکسار نے مکمل کی تھی۔

**سیکرٹری** :۔ مجھے نہایت افسوس سے یہ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ آپ نے اس قسم کا مبہم اور ناپختہ کیس ایجنڈا پر لا کر ہم سب کا وقت ضائع کیا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ حکومت کے قیمتی وقت کو یوں ضائع کر کے آپ ملک اور قوم کی خدمت سرانجام فرما رہے ہیں تو بیشک آپ کسی شدید مجرمانہ غلط فہمی میں ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ ہمیں آپ کی صلاحیتوں کا از سر نو جائزہ لینا ہوگا۔ اسسٹنٹ سیکرٹری صاحب، آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ یہ فائل یہیں چھوڑتے جائیے۔

(اسسٹنٹ سیکرٹری جاتا ہے)

**سیکرٹری** :۔ (جائنٹ سیکرٹری سے) آپ، اسسٹنٹ سیکرٹری کی صلاحیتوں کا بغور جائزہ لے کر مجھے ایک تفصیلی نوٹ عطا فرمائیں، تو مشکور ہوں گا۔

**جائنٹ سیکرٹری** :۔ (ڈپٹی سیکرٹری سے) آپ اس کام پر اپنی خاص توجہ صرف کیجئے۔

**ڈپٹی سیکرٹری** :۔ (انڈر سیکرٹری سے) اگر آپ کو کسی پوائنٹ پر میری مدد کی ضرورت محسوس ہو، تو بلا تکلف فرما دیجئے گا۔

**انڈر سیکرٹری** :۔ بہت خوب، جناب۔ کیا اب مس سلیمہ کا کیس مزید بیان کیا جائے؟

**جائنٹ سیکرٹری** :۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ناپختہ کیس محض تضیعِ اوقات ہے۔ میری رائے میں اسے داخل دفتر کر دینا چاہیئے۔

**سیکرٹری** :۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میری رائے کا پلہ بھی اس تجویز کے حق میں جھکاؤ کی طرف مائل ہونے پر آمادہ ہے .....''

(اگست ۵۰ء)

# شہنائی

مرزا ادیب

## پہلا منظر

منظر۔ ایک چھوٹا سا سادہ کمرہ۔ دیواریں ہر قسم کی آرائش سے بے نیاز ہیں صرف ایک دیوار پر کلاک لٹک رہا ہے اور اس کے نیچے تھوڑے سے فاصلے پر ایک پرانا کیلنڈر نظر آرہا ہے۔ کلاک والی دیوار میں ایک دروازہ جو شہ نشین میں کھلتا ہے۔ اس دروازے کے بالکل سامنے ایک اور دروازہ ہے جس کی دوسری طرف ہال کمرہ ہے۔ اندر باہر جانے کے لئے یہی دروازہ کام دیتا ہے۔ اس دروازے پر ہلکے نیلے رنگ کا پردہ لہرا رہا ہے۔ ان دروازوں کے علاوہ کلاک والی دیوار میں ایک کھڑکی بھی ہے جس وقت پردہ اٹھتا ہے۔ ہم ناہید کو ایک صوفے میں بیٹھے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ناہید پچیس سال کی ایک خوبصورت اندھی لڑکی ہے جس کے چہرے کے ابھرے ابھرے نقوش سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر وقت اپنے تصورات میں غرق رہتی ہے۔

شام کی تاریکی کمرے میں پھیل رہی ہے ۔۔۔ ناہید کے سامنے تاریکی گہری ہوتی جارہی ہے۔

دور سے شہنائی کی آواز آنے لگتی ہے ۔۔ جیسے جیسے یہ آواز بلند ہوتی جاتی ہے ۔۔۔ ناہید کا اضطراب بڑھتا جاتا ہے۔ کئی لمحے گزر جاتے ہیں اسی اثنا میں سٹیج پر ناہید کے سوا اور کچھ بھی نظر نہیں آتا ۔۔ یکایک سٹیج کے نیم تاریک حصے سے ایک سایہ بڑھتا ہوا ناہید کی طرف آنے لگتا ہے۔ یہ سایہ ناہید کے پاس پہنچ کر ایک خوبصورت نوجوان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لباس ہلکے نیلے رنگ کا ہے ۔۔۔ یہ جاوید ہے۔ جاوید ایک عجیب ذوق و شوق کے عالم میں ناہید کی طرف دیکھنے لگتا ہے ۔۔۔ شہنائی کی بہت مدہم آواز ایک گراؤنڈ میں جاری رہتی ہے ۔۔۔ اور جب تک جاوید سٹیج پر رہتا ہے ۔۔۔ جاری رہتی ہے ۔۔۔ ہال کے والے دروازے سے روشنی ناہید اور جاوید پر پڑ رہی ہے)

ناہید۔ (فرط اضطراب سے کھڑے ہو کر) کون ۔۔۔ جاوید؟؟

جاوید۔ ہاں۔ ناہید!

ناہید۔ آہی گئے آخر کار۔

جاوید۔ آخر کار کیوں ۔۔۔؟ کل بھی تو آیا تھا ۔۔۔ شام کے وقت یہیں تو تھا۔

ناہید۔ ضرور یہیں تھے۔ میں نے کب انکار کیا ہے؟ مگر کل اور آج کے درمیان ۔۔۔ وقت کا یہ مختصر سا حصہ نہ جانے کتنا طویل عرصہ بن گیا تھا۔

جاوید۔ جب میں آیا تو تم کچھ اداس تھیں۔

ناہید۔ تنہا جو تھی۔

جاوید۔ چھوٹی بہن کہاں ہے؟

ناہید۔ اپنی ایک سہیلی کے ہاں گئی ہے۔ شادی ہے وہاں۔ نہیں جاتی تھی میں نے مجبور کر کے بھیجا۔

جاوید۔ کتنی محبت ہے تم دونوں بہنوں میں۔

ناہید۔ دنیا میں شاید ہی کسی بہن کو اپنی بہن سے اتنی محبت ہوگی جتنی سعیدہ کو مجھ سے ہے۔ میں اندھی ہوں۔ بیکس اور مجبور مگر وہ سائے کی طرح میرے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ اگر وہ نہ ہوتی تو ماں باپ کے فوت ہونے کے بعد ۔۔۔ میرے لئے زندہ رہنے کا کیا سہارا تھا؟

جاوید۔ اگر سعیدہ نہ ہوتی تو شاید تم ۔۔۔

ناہید۔ یقیناً زندہ رہنے سے انکار کر دیتی۔ ہر وقت چاروں طرف پھیلے ہوئے گہرے اندھیرے میں سانس لینا ۔۔۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے

جاوید۔ کس وقت واپس آئے گی؟

ناہید۔ شام کے بعد واپس آجائے گی۔

جاوید۔ شام کے بعد واپس آئے گی ۔۔۔ شام ہوگئی ہے۔

ناہید۔ جاوید! وہ آئے تو تم یہیں رہو۔ میری خوشی سعیدہ کی خوشی ہے۔

جاوید۔ یہ نہیں ہوسکتا ناہید!

ناہید۔ سعیدہ کو تمہارے متعلق بتاتی ہوں تو وہ تمہارے وجود سے انکار کر دیتی ہے کہتی ہے باجی! تمہیں عجیب قسم کا وہم ہو گیا ہے ۔۔۔ بھلا یہاں کون آسکتا ہے ۔۔۔ کسے یہاں آنے کی ہمت ہے۔

جاوید۔ وہ جو کچھ سمجھنا چاہتی ہے سمجھنے دو۔

ناہید۔ یہ درست ہے تاہم اس کی موجودگی میں یہیں رہو تو کیا حرج ہے۔ وہ بہن ہی تو ہے۔

جاوید۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکتی۔

ناہید۔ اچھا یونہی سہی۔ تم مخالفت کرو تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ ابھی تک کھڑے کیوں ہو بیٹھ جاؤ نا۔

جاوید۔ تم بھی بیٹھ جاؤ۔

(دونوں کھڑکی کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں)

ناہید۔ ستارے نکل آئے ہیں؟

جاوید۔ ابھی ابھی سورج غروب ہوا ہے۔ فضا کی وسعتوں میں کہیں کہیں ننھے ستارے شبنم کے قطروں کی طرح چمک رہے ہیں۔

ناہید۔ میں شبنم کے قطروں کو دیکھنے سے محروم ہوں۔ مگر جب باغ میں کسی درخت کی شاخ کو چھوتی ہوں۔ تو میرے دل و دماغ میں ایک قسم کی ٹھنڈک کا احساس ہونے لگتا ہے۔ شبنم کتنی پیاری چیز ہے (ایک دم ٹھٹک کر) جاوید!

جاوید۔ کیوں ناہید!

ناہید۔ جب سعیدہ باتیں کرتی ہے ۔۔۔ تو بعض باتیں میں بالکل نہیں سہہ سکتی

مگر تم جو کچھ کہتے ہو مجھے اپنے دل کی گہرائیوں میں گونجتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

جاوید۔ میں ہر وقت تمہارے دل کی گہرائیوں میں جھانکتا رہتا ہوں۔

ناہید۔ ایک اور مصیبت بھی ہے۔

جاوید۔ کیا؟

ناہید۔ جب تم میرے پاس ہوتے ہو تو مجھے محسوس ہوتا ہے ہم کبھی جدا نہیں ہوئے تھے — مگر جب تم چلے جاتے ہو تو مجھے یقین ہونے لگتا ہے جیسے تم مجھے چھوڑ کر کسی دوسری دنیا میں چلے گئے ہو — اور اب کبھی واپس نہ آؤ گے۔

جاوید۔ حالانکہ میں تم سے کبھی جدا نہیں ہوتا۔

ناہید۔ سچ ہماری ساتویں ملاقات ہے شاید۔

جاوید۔ ہاں ساتویں۔

ناہید۔ اور ہم کس قدر بے تکلف ہو گئے ہیں۔

جاوید۔ ہم میں تکلف ہو ہی نہیں سکتا۔ تکلف اجنبیت کی علامت ہے اور ہم میں ذرہ بھر اجنبیت نہیں۔

ناہید۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔

جاوید۔ ہم دونوں ایک طرح سوچتے ہیں — ایک ہی قسم کی باتیں کرتے ہیں — اور ایک ہی زاویئے سے چیزوں کو پرکھتے ہیں — اور ہم ایک ہی طرح دیکھتے بھی ہیں۔

ناہید۔ میری آنکھیں نہیں ہیں —؟

جاوید۔ میں جو کچھ دیکھتا ہوں — وہ تم بھی دیکھتی ہو — اس نیلے آسمان کے نیچے بسنے والی دنیا میں نہیں بلکہ اس دنیا میں جو تمہارے دل کے اندر ہے — جو تمہارے سینے کے اندر چھپی ہوئی ہے۔ جسے تمہارے تصورات نے اپنی گود میں آباد کر رکھا ہے — یہی میری دنیا ہے — یہی تمہاری دنیا ہے — اگر میری آنکھیں نہیں تو کیا ہوا — اگر تمہاری آنکھیں نہیں تو کیا ہوا — ہم — تم دونوں ایک ہیں — اور ہمیشہ ایک رہیں گے!

ناہید۔ ہم ایک ہیں — یہ الفاظ کتنے میٹھے — کس قدر خوبصورت ہیں — جاوید! جب تم سے ملاقات نہیں ہوئی تھی تو میری زندگی ایک تنگ و تاریک غار تھی۔ جس کی فضا میں دور سے آتی ہوئی آوازوں کی گونج کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ تم آئے تو ان آوازوں کو زندگی مل گئی — حرارت اور گرمی مل گئی۔ جب میں نے پہلے پہل تمہاری آواز سنی تو یہ آواز مجھے بالکل آشنا معلوم ہوئی — جیسے یہ آواز مدت سے میری روح میں تیر رہی ہے — مدت سے میرے سینے میں خون کی گردش کے ساتھ دوڑ رہی ہے — اور جانتے ہو کیا ہوا؟

جاوید۔ سب کچھ جانتا ہوں۔

ناہید۔ یہ آواز سنتے ہی میرے ذہن میں ایک شکل بھی ابھر آئی — یہ شکل بھی میرے لئے ایک اجنبی نہیں تھی؟

جاوید۔ اجنبی کیونکر ہو سکتی تھی؟

ناہید۔ تم شاید یہ سن کر ہنس پڑو گے کہ میں تمہیں کبھی کبھی وہی شہنائی بجانے والا شہزادہ سمجھ لیتی ہوں۔

جاوید۔ مجھے معلوم ہے۔

ناہید۔ جب میں بچی تھی تو میری نانی نے مجھے ایک کہانی سنائی تھی — کسی ظالم دیو نے ایک شہزادی کو ایک غار میں بند کر رکھا تھا۔ ایک شہزادے کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ شہنائی بجانے والے کا بھیس بدل کر وہاں جا پہنچا۔ دیو نے شہنائی کی آواز سنی تو اس قدر خوش ہوا کہ اس نے شہزادے کو اپنے گھر میں نوکر رکھ لیا۔ ایک دن شہزادے نے دیو کی عدم موجودگی میں شہزادی کو اس تنگ و تاریک غار سے باہر نکالا اور اسے اپنے وطن لے گیا —! یہ شہنائی بجانے والے شہزادے کی کہانی ہے۔ اور اس کہانی نے مجھے بید متاثر کیا تھا۔

جاوید۔ یہ کہانی مجھے بھی معلوم ہے۔

ناہید۔ ایک بات مجھے پریشان کر دیتی تھی۔ میں سوچتی تھی شہزادے کا وطن کہاں تھا۔ آخر ایک دن میں نے اپنی نانی سے پوچھ لیا۔ نانی نے جواب دیا۔ افق کے اس پار ایک خوبصورت ملک ہے۔ شہنائی بجانے والا شہزادہ وہیں رہتا ہے۔ اسکے بعد میں اسی شہزادے کے خیالات میں غرق رہنے لگی۔ تم آئے تو مجھے محسوس ہوا تم وہی شہنائی بجانے والے شہزادے ہو اور افق کے پار سے آئے ہو۔

(شہنائی کی آواز بلند ہوتی ہے — اور پھر دو تین لمحوں کے بعد مدھم ہو جاتی ہے)

جاوید۔ میں نہ کبھی افق کے پار رہتا تھا — اور نہ وہاں سے آیا ہوں!

ناہید۔ تو پھر کہاں سے آئے ہو۔

جاوید۔ میں یہیں تھا — یہیں رہونگا۔

ناہید۔ مگر سعیدہ تمہارے وجود کو صرف وہم کہتی ہے۔

جاوید۔ وہ جو چاہے کہے — کوئی اُسے روک نہیں سکتا۔ اب کافی وقت ہو گیا ہے۔ مجھے جانا چاہئے۔ (کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے)۔

ناہید۔ نہیں ابھی نہیں۔

جاوید۔ تمہاری بہن آ رہی ہے — میں اسکے پاؤں کی آہٹ سن رہا ہوں۔

ناہید۔ وہ ابھی اپنی سہیلی کے گھر میں ہے۔

جاوید۔ نہیں وہ اپنے گھر سے کچھ دور ہے — میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ وہ تمہارے لئے مٹھائی لئے ہوئے آ رہی ہے — اب وہ دروازے پر پہنچ گئی۔

ناہید۔ وہ دوسرے کمرے سے مجھے آواز دے گی۔

جاوید۔ اب میں جاتا ہوں۔

ناہید۔ تو کب آؤ گے؟

جاوید۔ کل — یہیں — اسی کمرے میں۔

ناہید۔ جاوید۔

(جاوید سٹیج کے تاریک حصے میں چلا جاتا ہے۔ شہنائی کی آواز بند ہو جاتی ہے باہر سے سعیدہ کی آواز آتی ہے۔ باجی! اور اسکے ساتھ کمرے کے دروازوں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ کمرے میں کوئی آتا ہوا دکھائی دیتا ہے — ایک دو لمحوں کے بعد کمرے کا برقی لیمپ روشن ہو جاتا ہے۔ اب سارے کمرے میں روشنی پھیلی ہوئی ہے۔

ناہید صوفے پر پڑی ہے اور سعیدہ پاس کھڑی اس کی طرف متفکرانہ دیکھ رہی ہے۔ سعیدہ انیس سال کی ایک معصوم صورت لڑکی ہے)

سعیدہ۔ باجی! سو گئی تھیں آپ

ناہید۔ نہیں تو۔

سعیدہ۔ تو کیا کر رہی تھیں — لیجئے مٹھائی کھائیے۔ رشیدہ نے بھیجی ہے آپ کے لئے۔

ناہید۔ اس وقت تو جی نہیں چاہتا۔

(سعیدہ مٹھائی میز کے اوپر رکھ دیتی ہے)

سعیدہ۔ تو آپ کیا کر رہی تھیں۔

ناہید۔ باتیں کر رہی تھی۔

سیدہ:- کریمن ہے — وہ تو یہاں نہیں ہے۔

ناہید:- کریمن سے نہیں —

سیدہ:- تو پھر کس سے۔

ناہید:- جاوید سے

سیدہ:- پھر وہی وہم باجی! میں نے اس کریمن کم بخت سے کہا بھی تھا کہ آپ کو تنہا نہ چھوڑے، نہ جانے کہاں دفان ہو گئی تھی

ناہید:- میں نے جھوٹ نہیں کہا سیدہ — ابھی تک اس کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے — ابھی تک اس کے الفاظ میری روح کو گدگدا رہے ہیں۔

سیدہ:- اس قسم کی باتیں آپ پہلے بھی کہہ چکی ہیں — یہ سپنا ہے یا وہم ہے۔

ناہید:- یہ سپنا یا وہم نہیں ہے۔

سیدہ:- تو پھر کیا ہے؟

ناہید:- حقیقت۔

سیدہ:- باجی! اس کمرے میں کون آ سکتا تھا، ساتھ والے کمرے میں کریمن موجود رہی، کوئی آتا تو مجھے معلوم نہ ہوتا — اور شہ نشین پر کوئی کیونکر پہنچ سکتا ہے۔

ناہید:- میں سچ کہتی ہوں سیدہ، میں پہلے بھی کئی بار اس سے باتیں کر چکی ہوں۔ آج بھی تمہارے آنے سے پہلے اسی سے باتیں کر رہی تھی۔ تم نہیں مانتیں تو نہ مانو۔ تمہارے ماننے یا نہ ماننے سے حقیقت بدل نہیں سکتی۔

سیدہ:- تو وہ گیا کدھر ہے؟

ناہید:- یہ میں نہیں جانتی۔

سیدہ:- باجی! بعض اوقات آپ ایسی باتیں کرتی ہیں کہ سخت حیرت ہونے لگتی ہے۔

ناہید:- جب تم گھر کی طرف آ رہی تھیں تو وہ کھڑکی سے تمہیں دیکھ رہا تھا — اس نے بتایا تھا کہ اب تم گھر کے بالکل قریب آ گئی ہو — اب تم دروازے میں داخل ہو رہی ہو — تم آئیں تو وہ چلا گیا۔

سیدہ:- آخر باجی! یہ تو بتائیے! وہ ہے کون؟

ناہید:- جاوید۔

سیدہ:- یہ نام تو پہلے بھی آپ سنا چکی ہیں۔

ناہید:- اور کیا بتاؤں؟ — اس کی شکل — ؟

سیدہ:- آپ نے اس کی شکل کیونکر دیکھی ہو گی باجی! (آواز میں افسوس اور حسرت کی آمیزش) کاش آپ دیکھ سکتیں!

ناہید:- سیدہ! یاد ہے ایک مرتبہ تم مجھے ایک نمائش گاہ میں لے گئی تھیں۔ وہاں تم نے مجھے ایک مجسمہ دکھایا تھا اور کہا تھا یہ ایک مشہور مجسمہ ساز کی تخلیق ہے — جب میں نے اس مجسمے کے چہرے پر اپنی انگلیاں پھیری تھیں تو اس کا ایک ایک نقش میرے ذہن میں محفوظ ہونے لگا تھا۔

سیدہ:- ہاں یہ مجسمہ آپ خرید لائی تھیں — اور صبح شام اسے اپنی بے نور آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کرتی رہتی تھیں — افسوس یہ مجسمہ گر کر ٹوٹ گیا تھا۔

ناہید:- ٹوٹ گیا تھا — جاوید کو میں نہیں دیکھ سکی — مگر محسوس ہوتا ہے مجسمے کے جو نقوش میرے ذہن میں ثبت تھے ان میں زندگی کی حرارت دوڑنے لگی ہے — وہی چہرہ — بالکل وہی چہرہ۔

سیدہ:- باجی!

ناہید:- کیوں؟

سیدہ:- تو اسکے لئے اس وہم کو دل سے نکال دیں — ایسا نہ ہو یہ وہم کہیں بیماری بن جائے — آپ زندگی کو روگ لگا بیٹھیں۔

ناہید:- نہیں ایسا نہیں ہو گا۔

سیدہ:- میں نے کئی بار آپ سے کہا ہے اپنی سہیلیوں سے ملا کریں — لوگوں سے باتیں کیا کریں لیکن آپ کچھ سنتی ہی نہیں۔ جب دیکھو اس منحوس کمرے میں بند ہیں — سر جھکائے کچھ سوچ رہی ہیں۔

ناہید:- لوگوں کی باتیں سُنکر بہت جلد گھبرا جاتی ہوں۔

سیدہ:- آپ باتیں کریں تو سہی — پہلے ہی سوچ رکھا ہے کہ لوگوں کی باتیں سنکر گھبرا جائیں گی — چلئے ذرا ہوا خوری کو چلئے نا۔

ناہید:- بہتر (سیدہ بہن کا ہاتھ پکڑ کر دروازے میں سے جانے لگتی ہے۔ دروازے پر پہنچ کر بجلی کا بٹن دبا دیتی ہے۔ سٹیج پر تاریکی پھیل جاتی ہے — چند لمحے سٹیج پر مکمل تاریکی چھائی رہتی ہے — کلاک تین بجاتا ہے — سٹیج پر ایک دم روشنی پھیل جاتی ہے — یہ خوابگاہ ہے۔ ٹیبل پر برقی لیمپ روشن ہے۔ ناہید سر جھکائے پلنگ پر بیٹھی ہے۔ سیدہ بہن کی طرف مضطرب نگاہوں سے دیکھ رہی ہے)۔

سیدہ:- باجی! رات کے تین بج گئے اور آپ جاگ رہی ہیں۔

ناہید:- تین بج گئے۔ تم کیوں جاگ اٹھیں۔

سیدہ:- میں سو رہی تھی — یکایک خیال آیا آپ جاگ رہی ہیں۔ آنکھ کھل گئی۔ لیمپ جلا کر دیکھا — واقعی آپ بیٹھی ہیں۔

ناہید:- ابھی ابھی جاگی ہوں۔

سیدہ:- کیوں باجی!

ناہید:- آنکھ کھل گئی۔

سیدہ:- آپ کچھ سوچ رہی ہیں۔

ناہید:- میری وجہ سے تمہیں کس قدر تکلیف ہو رہی ہے۔

سیدہ:- مجھے کیا تکلیف ہو گی باجی! سوچتی ہوں آپ کا وہم کہیں بیماری نہ بن جائے۔

ناہید:- میں نے عہد کر لیا ہے سیدہ۔

سیدہ:- کس بات کا عہد۔

ناہید:- تم ٹھیک ہی کہتی ہو — واقعی جاوید کا آنا — اور باتیں کرنا — صرف وہم ہے — یا سپنا۔

سیدہ:- (آواز میں مسرت کا ارتعاش) باجی!

ناہید:- اور میں نے عہد کر لیا ہے کہ اس وہم کو دل سے نکال دوں گی۔

سیدہ:- بہت اچھا کریں گی باجی آپ!

ناہید:- تم جو کہتی رہتی ہو ہر وقت —

سیدہ:- اسلئے کہتی رہتی ہوں کہ آپ خواہ مخواہ اپنے آپ کو روگ لگا رہی ہیں — اس منحوس کمرے میں بھی نہ جائیے۔

ناہید:- نہیں جاؤں گی — اب اس قصے ہی کو چھوڑ دو —

سیدہ:- بہتر باجی!

ناہید:- نیند نہیں آتی۔

سیدہ:- تو باتیں کرتے ہیں۔

ناہید:- اس وقت میرا جی چاہتا ہے کوئی کہانی سُنوں۔

سیدہ:- کہانی سناؤں — وہی کہانی سناتی ہوں جسے بچپن میں آپ بڑے شوق سے سنا کرتی تھیں۔ شہنائی بجانے والے شہزادے کی کہانی — ایک دیو نے —

ناہید:- سیدہ!

سعیدہ۔ کیوں باجی ؟

(دور سے شہنائی کی آواز آنے لگتی ہے)

ناہید۔ یہ کہانی نہ سناؤ ــــ بند کر دو یہ کہانی۔

سعیدہ۔ اچھا ــ مگر کیوں ــ ؟

ناہید۔ کیوں ــــ ؟ میں کیا بتاؤں ــ چلو سو رہیں۔ نیند آ جائے گی۔

سعیدہ۔ باجی !

ناہید۔ آ جائے گی نیند ــ تم بھی لیٹ جاؤ۔ بتی بجھا دو

(سٹیج پر پھر تاریکی پھیل جاتی ہے)

(وہی کمرہ جو پہلے منظر میں دکھایا گیا ہے۔ ناہید اور سعیدہ کھڑکی کے پاس کھڑی ہیں۔ تیز ہوا کے جھونکوں سے کھڑکی کے پٹ بار بار ٹکرا رہے ہیں۔ ناہید اپنی بے نور آنکھوں سے فضا کی تاریک وسعتوں کو گھورنے کی کوشش کر رہی ہے)

ناہید۔ اُف کس قدر تیز ہوا ہے۔

سعیدہ۔ ہاں باجی !

ناہید۔ فضا میں اندھیرا ہوگا ــ !

سعیدہ۔ اندھیرا ہی اندھیرا ہے ــ افق کے وسیع غاروں سے تاریکی کے گہرے بادل امنڈے چلے آ رہے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے اس خوفناک تاریکی کے سینے سے کسی چاند کسی سورج کی روشنی نہیں پھوٹے گی ــــ چلو باجی ! دوسرے کمرے میں چلیں !

ناہید۔ تم جاؤ ! میں یہیں کھڑی رہوں گی۔

سعیدہ۔ آپ نے تو کہا تھا میں کبھی اس کمرے میں نہیں آؤں گی۔

ناہید۔ خود بخود چلی آئی ــــ یہ معلوم ہی نہ ہو سکا میں یہاں پہنچ گئی ہوں۔

سعیدہ۔ تو پھر چلو۔

ناہید۔ تھوڑی دیر تک یہیں رہتی ہوں ــــ عجیب کیفیت ہے اس وقت دل کی ــ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس منجمد آلود اندھیارے کو اپنی انگلیوں سے چھو رہی ہوں۔ اندھیرے کے کثیف بادل آتے ہیں۔ اندھیر کل دماغ کو چھو کر پھر واپس چلے جاتے ہیں۔ مگر افق ہمیشہ تاریک نہیں رہے گا ــــ روشنی ضرور پھوٹے گی۔ شاید چند لمحوں کے بعد ــــ کچھ دیر کے بعد۔ مجھے آنے والی روشنی کا احساس ہو رہا ہے۔

سعیدہ۔ مگر باجی ! یہاں کھڑکی کے پاس ٹھہرئیے نہیں ہوا تیز ہے ــــ آپ پہلے ہی کافی کمزور ہیں۔

ناہید۔ میری فکر نہ کرو سعیدہ ! تم جاؤ۔ دیکھو تو کریمن باورچی خانے میں کیا کر رہی ہے آج تم نے رشیدہ کو کھانے پر بلا رکھا ہے ! (وقفہ) خاموش کیوں ہو گئی ہو۔

سعیدہ۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے !

ناہید۔ وہ کیوں ــــ ؟ سعیدہ !!

سعیدہ۔ کوئی خاص بات تو نہیں ــــ

ناہید۔ پھر بھی ــــ !

سعیدہ۔ رات میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔

ناہید۔ خواب ؟

سعیدہ۔ ہاں باجی !

ناہید۔ کونسا خواب۔ کہو۔

سعیدہ۔ رات میں نے خواب میں دیکھا کہ سخت آندھی چل رہی ہے۔ ہمارے گھر کے سامنے جو پیپل کا درخت ہے اس کے پتے شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہیں یہاں تک کہ ایک شاخ پر صرف دو پتے باقی رہ گئے ہیں ان میں سے بھی ایک پتہ ٹوٹ جاتا ہے ــــ یہ دیکھ کر میں کانپ اٹھی ــ اور بیدار ہو گئی۔

ناہید۔ تم تو مجھے وہی کہا کرتی تھیں ــ اور اب خود ــــ

سعیدہ۔ (الفاظ کاٹ کر) مگر باجی ! نہ جانے میرا دل صبح سے کیوں بیٹھا جا رہا ہے۔

ناہید۔ اپنے دل کو قابو میں رکھو ــ اور جاؤ باورچی خانے میں کھانے کی نگرانی کرو۔

سعیدہ۔ آپ بھی چلو باجی ! مجھے ڈر ہے کہ آپ پھر وہی خواب نہ دیکھنے لگیں ــ جاوید ــــ

ناہید۔ (الفاظ کاٹ کر) میرے جانے کی کیا ضرورت ہے ــــ اور جاوید ــ میں وعدہ کر چکی ہوں کہ اب کبھی اس بات کا ذکر تک نہیں کروں گی۔

سعیدہ۔ پھر بھی آپ سے الگ ہونے کو جی نہیں چاہتا ــــ

ناہید۔ تم ہمیشہ کے لئے الگ نہیں ہو رہیں۔ میں وہیں آ جاؤں گی۔ یونہی گھبرا رہی ہے پاگل !

سعیدہ۔ آپ آ جائیں گی اُدھر

ناہید۔ تم چلو تو سہی

سعیدہ۔ اچھا میں جاتی ہوں ــــ

(سعیدہ کمرے سے نکل جاتی ہے ــ دور سے شہنائی کی آواز)

ناہید۔ وہ آ رہا ہے ــــ پھر آ رہا ہے۔ مگر میں نہیں ملوں گی ــ میں نہیں یہاں ٹھہروں گی۔

(شہنائی کی آواز بلند ہو رہی ہے ــ آندھی کا شور برپا ہے)

نہیں میں اسے دل سے نکال چکی ــــ اب میرے اور اس کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے ــ وہ ایک خواب تھا جو بھول چکا ہے ــ ایک واہمہ تھا جو مٹ چکا ہے ــ میں اس کمرے میں نہیں ٹھہروں گی ــــ

(دروازے کی طرف جانے لگتی ہے جاوید آ گیا ہے)

جاوید۔ ناہید !

ناہید۔ (دروازے پر رک کر) تم پھر آ گئے

جاوید۔ تم نے بلایا میں آ گیا۔

ناہید۔ میں نے تمہیں نہیں بلایا ــــ میں اب تمہیں نہیں بلا سکتی۔

جاوید۔ اگر تم نہ بلاتیں تو میں ہرگز نہ آتا۔

ناہید۔ تو اب چلے جاؤ۔

جاوید۔ چلا جاؤں ــ ایک بار کہہ دو میں چلا جاؤں گا۔

ناہید۔ چلے جاؤ ــ (رک رک کر) تمہیں ۔ چلے جانا چاہئے۔

(جاوید ایک طرف ہٹ کر خاموش کھڑا رہتا ہے)

جاوید۔ میں چلا جاؤں ــــ ؟

ناہید۔ ہاں ــ مگر نہیں ذرا ٹھہرو۔ شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔

جاوید۔ مجھے جانے دو۔ لیکن یہ سن لو۔ تم مجھے اپنی زندگی سے دور نہیں کر سکتیں۔

ناہید۔ کوشش کروں گی۔

جاوید۔ ہزار کوشش کرو یہ تمہاری طاقت سے باہر ہے ــــ میں تیرہ سال سے تمہارے تصورات کے دھندلکے میں زندگی کی شاہراہ پر تمہارے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ ایک دن تم میرا دامن پکڑ کر مجھے اپنی زندگی میں لے آئیں ــ میں آ گیا۔ اب تم چاہتی ہو میں پھر واپس چلا جاؤں ــــ اگر میں چلا گیا تو تم ایک خزاں زدہ پتے کی طرح زندگی کی شاخ سے گر پڑو گی ــ !

ناہید۔ شاخ پر دو ہی پتے رہ گئے ہیں ــــ ان میں سے ایک پتہ ٹوٹ گیا تو ــــ اُف میرے اللہ آج کیا ہوگا ــــ آج کیا ہونے والا ہے۔

جاوید۔ ناہید! میں ایک مجسمہ نہیں ہوں۔ جسے تو توڑ دو گی ۔۔ میں اس مجسمے کی روح ہوں ۔۔ اور یہ روح مجسمہ ساز کی نہیں تمہاری تخلیق ہے ۔۔ جو ازل اور ابد سے بے نیاز ہے جو وقت اور مقام سے ماوراء ہے ۔۔ جو تمہارے ساتھ ساتھ ہے ۔۔ جو تمہارے ساتھ ساتھ رہے گی!

(طوفان کا شور)

ناہید۔ میں چاہتی تھی کہ تم نہ آؤ ۔۔ اب تم آگئے ہو تو میرے سینے میں ایک تلاطم برپا ہو گیا ہے۔

جاوید۔ تو اب بھی کہہ دو ۔۔ میں چلا جاؤں۔

(طوفانی اثرات)

ناہید۔ (خاموش)

جاوید۔ تم سوچ رہی ہو

ناہید۔ ہاں۔

جاوید۔ تو میں چلا جاؤں۔

(کسی قدر دور سے سعیدہ کی آواز۔ باجی! آئیے نا۔)

ناہید۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ تم جا سکتے ہو ۔۔ تم چلے جاؤ۔

جاوید۔ یہ تمہاری غلطی ہے ۔۔ میں پھر کبھی واپس نہیں آؤنگا۔

ناہید۔ میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے ۔۔ سب کچھ سوچ کر کہہ رہی ہوں۔

(جاوید پیچھے ہٹتا ہوا اسٹیج کے آخری گوشے تک پہنچ جاتا ہے۔ شہنائی کی آواز رک جاتی ہے ۔۔ سعیدہ آتی ہے۔)

سعیدہ۔ باجی! یہ آپ کی آنکھوں میں آنسو۔

ناہید۔ نہیں تو ۔۔

سعیدہ۔ اور آپ ابھی تک کھڑکی کے پاس کھڑی ہیں ۔۔ اس قدر ٹھنڈی ہوا ہے کہ خدا کی پناہ۔ ادھر بیٹھئے چل کر۔

ناہید۔ رشیدہ آئی۔

سعیدہ۔ ابھی نہیں آئیں۔ چلئے ادھر کوچ پر بیٹھیں ۔۔ اُف آپ کا ہاتھ گرم ہے۔

(بہن کا ہاتھ پکڑتی ہے۔ دونوں کھڑکی سے کچھ دور کوچ پر بیٹھ جاتی ہیں)

ناہید۔ طبیعت کچھ ناساز ہے ۔۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سینے میں ایک خلا سا ہو گیا ہے۔ جیسے روح کے اندر سرد تاریکی جم گئی ہے۔

سعیدہ۔ ڈاکٹر کو بلاؤں۔

ناہید۔ نہیں معمولی بخار ہے۔

سعیدہ۔ آپ لیٹ جائیے۔ میں کریمن کو ڈاکٹر کے ہاں بھیجتی ہوں۔

(سعیدہ کمرے سے نکل جاتی ہے۔ شہنائی کی آواز بیک گراؤنڈ میں جاری ہو جاتی ہے)

ناہید۔ (بلند آواز سے) کریمن!

(سعیدہ بھاگتی ہوئی آتی ہے)

سعیدہ۔ کیا ہے باجی!

ناہید۔ وہ کھڑکی بند کر دو ۔۔ دروازہ بند کر دو۔ وہ پھر آ رہا ہے ۔۔ سنتی ہو شہنائی کی آواز۔

سعیدہ۔ کہاں باجی!

(دروازہ اور کھڑکی بند کر دیتی ہے)

ناہید۔ یہ ۔۔ سنو تو۔ صاف آ رہی ہے۔

سعیدہ۔ یہ وہم ہے آپ کا باجی! ۔۔

ناہید۔ یہ آواز میرے کانوں میں کیوں آ رہی ہے ۔۔ کہاں سے آ رہی ہے ۔۔ شاید افق کے اس پار سے ۔۔ اس اجنبی دنیا سے۔ (کھانستی ہے)

سعیدہ۔ خدا کے لئے باجی! اپنی صحت کا خیال کیجئے۔

ناہید۔ (کھانستے ہوئے) اوہ ۔۔ یہ میرا وہم ہے۔ پھر وہی وہم ۔۔

سعیدہ۔ اب آرام کیجئے۔

(شہنائی کی آواز رک جاتی ہے۔ مگر طوفان جاری ہے) ۔۔ (وقفہ)

(سعیدہ اور ڈاکٹر دروازے پر کھڑے ہیں۔)

سعیدہ۔ ڈاکٹر صاحب! یہ کیا بیماری ہے۔

ڈاکٹر۔ میں خود بھی نہیں سمجھ سکا ۔۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بیماری اندر اندر اسے کھائے جا رہی ہے ۔۔ اور یہ بیماری جڑ پکڑ چکی ہے۔

سعیدہ۔ کوئی بیماری تو نہیں تھی ۔۔ ایک وہم ضرور تھا۔

ڈاکٹر۔ کونسا وہم

سعیدہ۔ باجی کا خیال ہے ان سے ایک شخص جاوید ملنے کے لئے آیا کرتا ہے۔

ڈاکٹر۔ خیال کیا مطلب؟

سعیدہ۔ دراصل اس جاوید کا مادی وجود کوئی نہیں ہے۔

ڈاکٹر۔ تمہیں کیونکر معلوم ہوا؟

سعیدہ۔ ایک دن میں نے چھپ کر دیکھا ۔۔ وہ تنہا اس طرح باتیں کر رہی تھیں جیسے کوئی شخص اُن کے سامنے موجود ہو ۔۔ اور بار بار جاوید کا نام لیتی تھیں۔

ڈاکٹر۔ اس وہم سے پہلے ان کی حالت کیا تھی؟

سعیدہ۔ ہر وقت چپ چاپ سر جھکائے کمرے میں بیٹھی رہتی تھیں۔

ڈاکٹر۔ اور کچھ۔

سعیدہ۔ میں نے کہا باجی! اس وہم کو دل سے نکال دیں۔ انہوں نے وعدہ کر لیا۔ اور ۔۔ میں نہیں جانتی انہیں کیا ہو گیا۔

ڈاکٹر۔ حقیقت صاف ہے بیٹی! تمہاری بہن نے اپنے ماحول سے تنگ آ کر اپنے خیالوں کی دنیا میں کسی جاوید کو بلا لیا تھا۔ یہ جاوید اُسکے تصور کی تخلیق تھی۔ اور یہی اسکی زندگی کا سہارا تھا۔

(دوسرے کمرے سے ناہید کی آواز "سعیدہ"۔ ڈاکٹر اور سعیدہ بھاگ کر ادھر جاتے ہیں۔ ناہید پلنگ پر پڑی ہے۔ چہرہ مرجھا چکا ہے۔ پاس کریمن کھڑی ہے۔)

سعیدہ۔ باجی!

ناہید۔ سعیدہ! ۔۔ مجھے جانا ہی چاہئے۔

سعیدہ۔ کہاں باجی!

(شہنائی کی آواز بیک گراؤنڈ میں جاری ہو جاتی ہے)

ناہید۔ افق کے اس پار ۔۔ جہاں سے شہنائی کی آواز آ رہی ہے ۔۔ مجھے جانا ہی چاہئے۔

سعیدہ۔ (روتے ہوئے) باجی!

ناہید۔ مجھے جانا ہی ہوگا ۔۔

(طوفان کا شور اور ۔۔ شہنائی کی آواز کے ساتھ پردہ)

دسمبر ۱۹۳۹ء

# فالتو چیزیں

آغا بابر

## افراد

ایڈمنسٹریٹر، سٹینوگرافر، منیجر، بی اے لڑکی، شہزادہ نوچند، توفیق رؤف، ہوٹل کا منیجر، نازلی، ملازم۔

## پہلا سین

(کمپنی کے آفس کا کمرہ، اعلیٰ فرنیچر، دائیں اور بائیں دو دروازے۔

ایڈمنسٹریٹر:۔ سٹینو، خط ٹائپ ہو چکا؟

سٹینوگرافر:۔ جی!

ایڈمنسٹریٹر:۔ شاباش، ہمیں یاد آیا ایک اور ضروری خط لکھنا ہے۔

سٹینوگرافر:۔ میں نوٹ بک لے آؤں (جاتا ہے)

ایڈمنسٹریٹر:۔ (انتظار میں سیٹی بجاتا ہے) (سٹینو آتا ہے) ہاں، لکھو۔ مائی ڈیئر، تمہارے آخری خط سے معلوم ہوا کہ فیکٹری کو آگ لگ چکی ہے۔ ملبہ اٹھایا جا رہا ہے۔ نقصان خاصا ہوا ہے۔ مگر تم نے آج تک یہ اطلاع نہیں دی کہ ملبہ میں اس کی نعش ملی یا نہیں۔ اگر ملی ہے تو کس شکل و صورت میں ملی۔ اب تمہاری ضرورت ہمیں یہاں محسوس ہو رہی ہے۔ تم اپنا کام ختم کر کے جلد واپس آنے کی کوشش کرو۔ فقط تمہارا خیر اندیش۔

(دروازے پر دستک)

ایڈمنسٹریٹر:۔ یس۔ کم اِن۔

منیجر :۔ (داخل ہو کر) ہیلو سر۔

ایڈمنسٹریٹر:۔ ہیلو منیجر۔ سٹینو جب تک ہم بلائیں نہیں تم نہیں آؤ گے۔

سٹینوگرافر:۔ ویٹ از رائٹ سر۔

ایڈمنسٹریٹر:۔ کہیے منیجر صاحب۔

منیجر :۔ جناب ہمارا کام بہت بڑھ جائے گا۔

ایڈمنسٹریٹر:۔ یقیناً

منیجر :۔ یہ فائل میرا چیف رپورٹر بنا کر لایا ہے۔ بڑی تفصیل سے ہر بات پر اس نے روشنی ڈالی ہے۔ میں نے اپنے ریمارکس لکھ دیئے ہیں۔ یہ

فائل مطالعہ فرمانے کے بعد آپ مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کریں۔

ایڈمنسٹریٹر:۔ کہتا کیا ہے تمہارا چیف رپورٹر؟

منیجر :۔ لب لباب یہ ہے کہ روز بروز انسان دشمنی بڑھ رہی ہے۔ شادیاں دھڑا دھڑ ناکام ہو رہی ہیں۔ بیویاں خاوندوں کو زہر دے رہی ہیں۔ خاوند بیویوں کو قتل کر رہے ہیں۔ اس نے اپنے دعوے کے ثبوت میں اونچے طبقہ کی عورتوں کے اعداد و شمار دیئے ہیں جن میں جرائم بڑھ رہے ہیں۔

ایڈمنسٹریٹر:۔ زندگی کے راستے رکاوٹوں سے بھر رہے ہیں۔

منیجر :۔ جی ہاں۔

ایڈمنسٹریٹر:۔ راستوں سے یہ رکاوٹیں ہٹانے کی ضرورت بڑھ رہی ہے۔

منیجر :۔ جی ہاں۔

ایڈمنسٹریٹر:۔ ہوں۔ ٹھیک ہے، بڑھنے دو۔ اس نے نئے گاہکوں کا کچھ اتہ پتہ دیا ہے؟

منیجر :۔ جی ہاں تین نئے گاہکوں کی تفصیل اس نے دی ہے۔ اس کی یہ بھی تجویز ہے کہ دو چار اور شہروں میں ہمیں اپنا کام شروع کر دینا چاہیے

ایڈمنسٹریٹر:۔ غور کریں گے، ہم فائل کو دیکھنے کے بعد کچھ بتا سکیں گے۔ آپ وہ اخراجات کی فائل بھی لائے ہیں؟

منیجر :۔ جی ہاں۔

ایڈمنسٹریٹر:۔ ہمیں بتایئے شہر میں ان گداگروں کی کیا تعداد ہے جو کمپنی کی طرف سے گاہکوں کا پیچھا کرنے کے کام پر مقرر ہیں؟

منیجر :۔ دو سو۔

ایڈمنسٹریٹر:۔ خرچ؟

منیجر :۔ دو سو۔

ایڈمنسٹریٹر:۔ فیکٹریوں میں ہمارے آدمیوں کی کیا تعداد ہے؟

منیجر :۔ بارہ سو۔

ایڈمنسٹریٹر:۔ ہوں (ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے، ٹیلی فون اٹھا کر) ہیلو۔ ہاں میری گھڑی میں بھی یہی وقت ہے۔ تین منٹ رہتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔

منیجر :۔ کیا پندرہ نمبر فلیٹ سر؟

ایڈمنسٹریٹر:۔ یس پندرہ نمبر فلیٹ (ٹیلی فون آتا ہے) یس۔ آگ لگ گئی؟ میں اس وقت جب ہمارا فائر انجن ادھر سے گذر رہا تھا۔ شاباش۔ موقع پر جا پہنچو۔ جو رپورٹ ہو ہمیں اطلاع دو۔ (منیجر سے کہتا ہے) اطلاع ہے کہ آگ نہیں بجھ رہی۔ آگ کیسے بجھ سکتی ہے؟

منیجر :۔ پانی میں تیل زیادہ تو نہیں ملایا گیا۔

ایڈمنسٹریٹر:۔ نہیں، فائر آفیسر کو ہمارا مستقل حکم ہے کہ جب تک خاص حکم نہ ہو، پانی میں تیل کی مقدار دستور کے مطابق ہی ملی رہے۔ ایک تو فلیٹ ہے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔

منیجر :۔ ہمارا فائر آفیسر بڑا تیز آدمی ہے۔

ایڈمنسٹریٹر:۔ کمپنی میں کون سا آدمی ہے جو تیز نہیں، اپنے کام میں تم کم تیز ہو؟

منیجر :- تھینک یو۔

ایڈمنسٹریٹر :- ریڈیو لگاؤ۔ خبروں کا وقت ہے۔

منیجر :- جی (پاس پڑے ریڈیو کا بٹن گھماتا ہے۔ خبریں سنائی دیتی ہیں) آدم بلڈنگ کے فلیٹ نمبر پندرہ کو آگ لگ جانے کی ابھی خبر آئی ہے۔ اس فلیٹ میں شہزادہ نوچند کی ماں مقیم تھی جو شعلوں میں بری طرح لپٹ گئی۔ راستہ بند پا کر اس نے کھڑکی سے چھلانگ لگا دی، اور جاں بحق ہو گئی۔ فلیٹ کی کوئی چیز نہیں بچی۔ دو فائر انجنوں نے بڑی مشکل سے آگ پر قابو پا لیا۔ آج تاجروں کی تیسری کانفرنس کا جلسہ......

ایڈمنسٹریٹر :- بند کر دو (منیجر ریڈیو بند کر دیتا ہے) یہ بڑھیا کھڑکی سے کیسے کود گئی۔

منیجر :- وہ بڑھیا جو آوارہ شہزادے کا پیچھا کرتے ہوئے ملک ملک پھر سکتی ہے اس سے کوئی بعید نہ تھا۔ مگر ہمارا انتظام تھا کہ وہ وہیں بھسم ہو جائے۔

ایڈمنسٹریٹر :- وہی تو ہم حیران ہیں۔

پی اے لڑکی :- اندر آ سکتی ہوں؟

ایڈمنسٹریٹر :- ہاں

پی اے لڑکی :- کوئی صاحب ملنے آتے ہیں۔ یہ کارڈ ہے ان کا

ایڈمنسٹریٹر :- (پڑھ کر) پرنس نوچند۔ آنے دو۔ (شہزادہ داخل ہوتا ہے، آیئے شہزادہ صاحب۔

شہزادہ :- (نشہ میں ہے) ہم نے خبر سن لی۔ ہم آپ کے بہت ممنون ہیں۔ آپ اس کے دفنانے کا انتظام کریں، یہ لیجئے اپنی خدمات کے لئے چیک۔ میں ابھی ابھی فلائی کر رہا ہوں یہاں سے خدا حافظ۔

ایڈمنسٹریٹر :- کمپنی کو بہت افسوس ہے شہزادہ صاحب کہ مرحومہ کھڑکی سے چھلانگ لگا گئی ورنہ معاملہ آپ سے یہ طے ہوا تھا کہ اس کو وہیں بھسم کر دیا جائے گا۔

شہزادہ :- کوئی بات نہیں۔ مرحومہ بڑی نیک دل تھی۔ فکر نہ کیجئے۔ معاوضہ میں سے ہم نے کچھ رقم کاٹی نہیں بلکہ پانچ سو روپے کا انعام۔ بڑھا دیا ہے۔

ایڈمنسٹریٹر :- اس کی کیا ضرورت تھی شہزادہ صاحب۔ آپ کتنے نیک دل ہیں۔

شہزادہ خدا حافظ۔

ایڈمنسٹریٹر :- رفتنت مبارکباد (شہزادہ چلا جاتا ہے)

منیجر :- آپ کو یاد ہے وہ عورت؟ مجھے شہزادہ نوچند کی شکل دیکھ کر وہ یاد آ گئی ہے۔

ایڈمنسٹریٹر :- کون سی؟

منیجر :- وہی جس نے گذشتہ سال اپنے مکان کو آسیب زدہ ظاہر کرنے کے لئے ہماری کمپنی سے مدد مانگی تھی۔

ایڈمنسٹریٹر :- ہاں ہاں۔ کمپنی کے لئے اگرچہ وہ کام نیا تھا مگر لطف اس وقت آیا جب اسکے خاوند نے مکان کے اندر گرد پولیس کا پہرہ لگا دیا۔

منیجر :- (ہنس کر) آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ اینٹیں کہاں سے آتی تھیں۔

ایڈمنسٹریٹر :- یہ کام کمپنی کے ریکارڈ پر سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

منیجر :۔ واقعی۔ پولیس والے بھی ایک چکر ہم نے پٹنے تھے۔ اینٹیں اس طرح پھینکے کہ معلوم یہی ہوتا کہ بھوت بہت تاؤ میں آیا ہوا ہے۔

ایڈمنسٹریٹر :۔ (ہنسکر) آہاہاہا۔ مجھے خوب یاد ہے (ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے)۔ ہیلو۔ جی ہاں بول رہا ہوں۔ کیا کب ہمارے ٹرک ڈرائیور کو بہت چوٹ آئی ہے۔ ہسپتال میں لے گئے ہیں۔ نیور مائنڈ۔ ہاں ہم ابھی ہسپتال میں جاکر اسے دیکھ آئیں گے۔ شکار تو مر بیانا ۔ بس زیادہ اہم بات تو وہی تھی۔ ہمارے آدمیوں کو جان کی پرواہ نہیں ۔

منیجر :۔ ہمارا ڈرائیور زخمی ہو گیا ہے ۔

ایڈمنسٹریٹر :۔ سیٹھ کی گاڑی بڑی تیزی سے آرہی تھی ۔

منیجر :۔ سات نمبر ڈرائیور تھا۔

ایڈمنسٹریٹر :۔ ہاں

منیجر :۔ کوئی بات نہیں۔ وہ تو ہتھیلی پر جان لئے رکھتا تھا ۔

(دروازہ پر دستک)

ایڈمنسٹریٹر :۔ کم ان

پی اے لڑکی :۔ سر، ہیراز لے کا نفی ڈینشل فائل۔

ایڈمنسٹریٹر :۔ ہیں دے دو (پڑھتا ہے) رفیق رؤف کو کارڈ دیدیا گیا

منیجر :۔ دے دیا گیا گڈ

ایڈمنسٹریٹر :۔ منیجر اب تم اکیلے جاکر ڈرائیور کو ہسپتال میں دیکھ آؤ۔ ہم نہیں جاسکتے ۔ ہمیں توفیق رؤف کے لئے رُکنا پڑے گا۔

منیجر :۔ گڈ لک سر۔

ایڈمنسٹریٹر :۔ گڈ لک (منیجر جاتا ہے) (ایڈمنسٹریٹر فون کرتا ہے) ہیلو سر! کیس نمبر ۲۲۳۔ توفیق رؤف کو کارڈ دیدیا گیا (پھر ٹیلیفون کا دوسرا نمبر ملاتا ہے) جی میں ایڈمنسٹریٹر بول رہا ہوں۔ چیئرمین بورڈ آف ڈائریکٹرز کو مطلع کر دیا گیا ہے۔ آپ کو اطلاع دینی باقی تھی۔ کیس نمبر ۲۲۳۔ توفیق رؤف ۔ جی ہاں ۔ کارڈ دیدیا گیا۔ تھینک یو سر

(پردہ)

## دوسرا سین

(توفیق رؤف کا کمرہ۔ توفیق رؤف کوچ پر یوں لیٹتا ہے جیسے تھکا ہوا ہو۔ دو تپائیاں قریب پڑی ہیں۔ ایک پر ٹیلی فون ہے۔ ایک خالی ہے)

ملازم :۔ (باہر سے) اندر آسکتا ہوں

توفیق :۔ کافی لے کر آئے ہو!

ملازم :۔ جی ہاں

توفیق :۔ لے آؤ۔ یہاں رکھ دو (خالی تپائی پر وہ کافی رکھ دیتا ہے) ان کھڑکیوں کے پردے نیچے گرا دو۔

ملازم :۔ (پردے گرا کر) اور کچھ سرکار؟

توفیق :۔ اور کچھ نہیں۔

ملازم :۔ بیگم صاحبہ ابھی تک نہیں آئیں۔

توفیق :۔ ان کی دعوت ہے کھانا کھا کر آئیں گی، تم جا سکتے ہو؟ صبح جلدی آجایا کرو۔ تم جانتے ہو ہمارے دونوں نوکر چھٹی پر گئے ہوئے ہیں

ملازم :۔ جی ہاں۔ میں تو بڑی صبح آجاتا ہوں۔

توفیق :۔ دیکھو۔ وہ کتاب پڑی ہے سامنے۔ اسے اٹھاؤ (ملازم اٹھاتا ہے) ہاں اسی کو۔ اس کے نیچے ایک کارڈ پڑا ہے۔ چھپا ہوا کارڈ۔
ہاں بھی۔ یہ ہمیں دے جاؤ۔ ٹھیک ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔

ملازم : سلام صاحب (جاتا ہے)

توفیق : سلام۔ (کارڈ پڑھتا ہے) حاشیہ پر یہ سنہری لکیریں۔ یہ موٹا دبیز کاغذ۔ کتنی عمدہ چھپائی ہے۔ اشتہار بازی کی بھی حد ہو گئی۔
(پڑھتا ہے) فالتو چیزیں ٹھکانے لگانے والے ہر قسم کے ذاتی معاملات طے کئے جاتے ہیں۔ مشورہ مفت، کام کی فیس معمولی اور واجبی۔
ہم اپنے کام کے بڑے ماہر ہیں۔ ملاقات کے لئے ٹیلی فون کریں یا خود وقت مقرر کریں (کارڈ پر سے نظریں ہٹا کر) آ۔ ٹیلی فون نمبر
دیا ہوا ہے۔ ہو نہ ہو، یہ لوگ کباڑیے ہوں گے۔ مگر نہیں یہ تو لکھا ہوا ہے فالتو چیزیں ٹھکانے لگانے والے۔ اگر کباڑیے ہوتے تو
کارڈ پر لکھا ہوتا۔ فالتو اور پرانی چیزیں خریدنے والے۔ پھر یہ لوگ ذاتی معاملات سے کیا مراد لیتے ہوں گے؟ کیوں نہ اس وقت ٹیلیفون
کیا جائے۔ شاید کوئی ہو۔ (ٹیلی فون کرتا ہے) ہیلو۔ کون بول رہا ہے۔ ایڈمنسٹریٹر کی پی اے، کیا میں ایڈمنسٹریٹر صاحب سے
بات کر سکتا ہوں۔ تو ٹیلی فون دیجئے ذرا انہیں۔ ہیلو۔ میں کل شام سیر کر کے واپس آ رہا تھا کہ ایک شخص نے مجھے ایک کارڈ دیا جس
پر لکھا ہوا ہے فالتو چیزیں ٹھکانے لگانے والے۔ جی ہاں، میں توفیق بول رہا ہوں۔ آپ کو میرے نام کا کیسے علم ہے۔ مگر آپ
کو کیسے معلوم ہوا کہ میں ہی آپ کو ٹیلی فون کر رہا ہوں۔ میں تو آپ کو جانتا نہیں۔ کمال ہے۔ آپ نے تو مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ ہاں
تو ملاقات کا وقت، جی ہاں سہ پہر کو۔ صبح کے وقت میں نہیں آ سکتا۔ چار بجے کام سے فارغ ہو کر آجاؤں گا۔ جی ہاں چار بجے۔

(پردہ)

(ایڈمنسٹریٹر کا آفس، وہی پہلا سین)

پی اے لڑکی :۔ توفیق رؤف آگئے ہیں۔

ایڈمنسٹریٹر :۔ اندر لے آؤ (پی اے لڑکی چلی جاتی ہے۔ توفیق رؤف داخل ہوتا ہے) ہیلو۔ تشریف رکھئے۔ آپ کچھ پئیں گے؟

توفیق :۔ تھینک یو۔

ایڈمنسٹریٹر :۔ رات آپ ٹیلی فون پر بڑے حیران ہو گئے تھے۔

توفیق :۔ جی ہاں۔ آپ کو میرا اتا پتا کیسے معلوم ہوا۔ میرا نام، میرا پیشہ ......

ایڈمنسٹریٹر :۔ (ہنس کر) ہماری کمپنی کا کام ہی کچھ ایسا ہے کہ اسے ان تمام باتوں سے واقفیت رکھنی پڑتی ہے۔

توفیق :۔ کمپنی کا کام ہی کچھ ایسا ہے۔ کیا کاروبار کرتی ہے آپ کی کمپنی؟

ایڈمنسٹریٹر :۔ ہم فالتو چیزوں کو ٹھکانے لگاتے ہیں۔

**توفیق** :- آپ کباڑی تو ہرگز نہیں ؟

**ایڈمنسٹریٹر** :- جی نہیں۔ ہم انسانوں کو ٹھکانے لگاتے ہیں فالتو اور غیر ضروری انسانوں کو۔ یہ کام بہت آسان ہے۔ اگرچہ یہ بات آپ کو عجیب و غریب نظر آتی ہے مگر ذرا غور کرنے سے حقیقت آپ پر ظاہر ہو جائے گی کہ دنیا میں بہت سے انسان فالتو ہیں مثلاً غیر ضروری خاوند، غیر ضروری بیویاں، غیر ضروری رشتہ دار۔ بیوپار کے ساتھی۔ ہم انہیں راستہ سے ہٹا دیتے ہیں اور اگر آپ اور وضاحت چاہتے ہیں تو یوں کہہ لیجئے کہ ہم دنیا سے ان کا حساب چکا دیتے ہیں۔

**توفیق** :- آپ کا مطلب ہے کہ آپ انہیں مار ڈالتے ہیں۔

**ایڈمنسٹریٹر** :- جی نہیں۔ ہم انہیں راستہ سے ہٹا دیتے ہیں۔

**توفیق** :- مگر صاحب یہ تو بالکل قتل ہے۔

**ایڈمنسٹریٹر** :- جی نہیں۔ یہ فالتو شئے کو ٹھکانے لگانا ہے۔ اگر آپ سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس دنیا میں بعض لوگوں کی ضرورت ہے اور بعض بالکل غیر ضروری ہیں۔ بالکل فضول اور فالتو۔ ہم ایسے لوگوں کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ آج تک ایسے کام اناڑی کرتے رہے ہیں۔ اسی لئے ان میں کوئی نہ کوئی خامی باقی رہ جاتی رہی ہے۔ مگر ہم ماہر ہیں۔ فنی ماہر۔ ہم کسی کام کو اُلجھاتے نہیں۔ ہمارا کام بڑی فنی مہارت سے سرانجام پاتا ہے۔ لہذا اس کے نتائج خطرناک نہیں ہوتے۔ ہم گارنٹی دیتے ہیں اس لئے ہمارا معاوضہ بھی زیادہ ہے۔

**توفیق** :- کیا آپ ہوش و حواس میں ہیں ؟ آپ مجھے کیا بتا رہے ہیں۔ یہ کہ آپ معاوضہ لے کر لوگوں کو قتل کرتے ہیں۔

**ایڈمنسٹریٹر** :- توفیق صاحب۔ میں آپ سے یہ عرض کر رہا ہوں کہ ہم جائز معاوضہ لے کر غیر ضروری لوگوں کو راستہ سے ہٹا دیتے ہیں، اگر آپ کو ہماری خدمات درکار ہیں تو ہم حاضر ہیں۔

**توفیق** :- آپ کا یہ مطلب ہے کہ....

**ایڈمنسٹریٹر** :- مطلب وطلب کچھ نہیں۔ ہم اپنا کام اندازوں سے نہیں کرتے ہمیں ہر بات کو یقین کے ساتھ جاننا پڑتا ہے۔ ہم ہر بات کی تہہ تک پہنچتے ہیں کیونکہ ہمارا کام ہی یہی ہے اور یہ بات جانے بغیر ہمارا بیوپار نہیں چل سکتا کہ آپ کو ہماری خدمات کی ضرورت ہے۔

**توفیق** :- آپ کی کمپنی....

**ایڈمنسٹریٹر** :- ہماری کمپنی پچھلے پانچ سال سے کام کر رہی ہے۔

**توفیق** :- اسی دوران میں آپ نے.....

**ایڈمنسٹریٹر** :- اسی دوران میں ہم نے ۲۵۰ فالتو اشخاص کو ٹھکانے لگایا ہے۔ ان میں اکثریت غیر ضروری خاوندوں اور بیویوں کی ہے جن کے رہنے سے ملک کو کوئی خاص فائدہ نہ تھا۔ ہم اپنے ملک کو تمام فالتو چیزوں سے پاک کر دینا چاہتے ہیں۔ آپ کو ماننا پڑے گا کہ ہم انسانیت کی بہت بڑی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم آپ کو اپنی فائلیں نہیں دکھا سکتے ورنہ آپ ہماری فائلوں کو بہت دلچسپ پاتے۔ ان میں اکثر نام آپ کو جانے پہچانے نظر آتے۔ معلوم ہوتا ہے آپ مجھ سے کوئی سوال دریافت کرنا چاہتے ہیں ؟

**توفیق** :- جی ہاں ایک سوال میرے دماغ میں گھوم رہا ہے۔

**ایڈمنسٹریٹر** :- ہمارے طریقوں کے متعلق۔ یہی نا ؟

توفیق :- جی ہاں

ایڈمنسٹریٹر:- معاف کیجئے ہم اپنے گاہکوں کو ان طریقوں سے آگاہ نہیں کرتے کیونکہ ہمارے طریقے ہی ہمارے کاروبار کے اہم جزو ہیں بہرحال آپ کو یہ بتا دینا کافی ہے کہ ہمارے طریقے مکمل ہیں۔ البتہ اتنا بتلائے دیتا ہوں کہ اکثر انسانوں کو راہ سے ہٹانا ظاہراً بالکل حادثہ معلوم ہوتا ہے آپ نے پچھلے پانچ سال میں کئی حادثات کے متعلق اخبارات میں پڑھا ہوگا۔ کوئی شخص گاڑی کے نیچے آکر کچلا گیا کسی نے مکان کی چھت سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔

توفیق :- جی ہاں

ایڈمنسٹریٹر:- ان حادثات میں اکثر ہمارا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ سڑکوں پر گاڑیوں کی ٹکروں کے واقعات۔ خوراک میں زہر۔ توفیق صاحب آپ حیران نہ ہوں۔ ہمارا اسٹاف بہت بڑا ہے۔ ہمارا خرچ بھی بہت ہے۔ اسی لئے ہم معاوضہ بھی زیادہ لیتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اناڑی اپنا کام بگاڑ دیتا ہے اور پھر وہ اناڑی پنے کے باعث اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ ہم ماہر ہیں۔ یہ ہمارا پیشہ ہے اور ہم ماہر فن ہونے کی وجہ سے زیادہ معاوضہ طلب کرتے ہیں۔

توفیق :- خوب۔ جس شخص نے مجھے آپ کی کمپنی کا کارڈ دیا تھا۔ وہ آپ کا ایجنٹ ہوگا! کیا وہ کارڈ ہر کسی کو دیدیتا ہے

ایڈمنسٹریٹر :- جی نہیں۔ یہ کارڈ خاص خاص لوگوں کو دیئے جاتے ہیں۔

توفیق :- اچھا!

ایڈمنسٹریٹر:- یہ کارڈ صرف ان لوگوں کو دیئے جاتے ہیں جنہیں ہماری خدمات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ ہمارا اسٹاف بہت بڑا ہے جو اپنے کام کا ماہر ہے۔ وہ لوگ تحقیق و تفتیش کے بعد حقائق معلوم کرتے ہیں۔

توفیق :- واقعی؟

ایڈمنسٹریٹر:- جی ہاں ہمیں آپ کے متعلق ایک ایک بات کا علم ہے۔

توفیق :- مگر کیا آپ یہ تمام باتیں مجھے بتا کر کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے؟

ایڈمنسٹریٹر:- جی نہیں۔ یہ خفیہ بات چیت ہے اور پھر آپ ایسے شخص نہیں جو ہمارے اعتبار کو ٹھیس پہنچائیں اور اگر آپ یہ بات باہر جاکر بتا بھی دیں تو آپ کی بات کا یقین کون کرے گا۔ دوسرے ہم ہر بات کا دھیان رکھتے ہیں۔ ہم جزئیات تک کی نگرانی کرتے ہیں۔ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔ آپ اپنی کہیئے۔ آپ بھی کسی کو راستہ سے ہٹانا چاہتے ہیں؟

توفیق :- جی ہاں۔ اپنی بیوی کو۔ کچھ مدت سے ہم میں بہت اختلافات پیدا ہوگئے ہیں۔ میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔

ایڈمنسٹریٹر:- ہمیں آپ کے جذبات سے کوئی کام نہیں۔ بہرحال آپ کا کام ہو جائے گا۔ مگر آپ کب تک چاہتے ہیں؟

توفیق :- جس قدر جلدی ہو سکے، اسی قدر اچھا ہے۔

ایڈمنسٹریٹر:- ایسا ہی ہوگا۔ معاوضہ دس ہزار روپیہ ہوگا۔ پانچ ہزار روپیہ کی ادائیگی فوراً ہی ہو جانی چاہیئے اور باقی پانچ ہزار دفنانے کے ایک ہفتہ بعد۔ اگر آپ تمام رقم ابھی دیدیں تو آپ کو ۵ فیصدی کمیشن مل سکتا ہے۔

توفیق :- آپ ساری رقم ابھی لے لیجئے۔ میں چیک دیئے دیتا ہوں۔ اور ہاں آج کے بعد آپ کی میری ملاقات کی کوئی ضرورت نہیں

ایڈمنسٹریٹر:- آپ ہر طرح سے مطمئن رہیں۔

(پردہ)

## چوتھا سین

(ہوٹل کے مینجر کا آفس)

**مسافر** :- مینجر صاحب آج آپ اپنی سیٹ پر بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔

**مینجر** :- آپ کو یہ سن کر افسوس ہوگا کہ ہوٹل کے مالک کی بیوی کا آج صبح انتقال ہوگیا ہے۔

**مسافر** :- ہیں!

**مینجر** :- میں دو چار منٹ کے لئے ایک ضروری کام سے آیا تھا۔ بس اب جا رہا ہوں۔

**مسافر** :- مگر وہ تو اچھی بھلی تھیں، ہوا کیا؟

**مینجر** :- جی ہاں بالکل اچھی بھلی۔ آج صبح گھر سے نکلی ہیں۔ پرانے چوک سے گھومتے ہوئے موٹر اینٹوں کے ایک ٹرک سے ٹکرا گئی سخت زخمی ہوئیں اور ہسپتال میں جاکر مر گئیں۔

**مسافر** :- توفیق صاحب کو بہت صدمہ پہنچا ہے؟

**مینجر** :- اُن کا حال تو دیکھا نہیں جاتا، عورتوں کی طرح رو رہے ہیں۔

**مسافر** : میں یہاں سے کل صبح صبح خلائی کر رہا ہوں۔ واپسی پر تعزیت کر سکوں گا۔ میری طرف سے آپ اظہارِ افسوس کر دیں۔

**مینجر** :- توفیق صاحب تو کئی روز تک ہوٹل میں نہیں آسکیں گے۔ اس ناگہانی موت کا صدمہ برداشت کرنا بڑے حوصلے کا کام ہے۔

**مسافر** :- بے شک۔

(پردہ)

## پانچواں سین

(ہوٹل کے مینجر کا آفس)

**مینجر** :- آپ دفتر میں ایک دم سے ایسے نازل ہوتی ہیں کہ میں بھونچکا سا رہ جاتا ہوں۔

**نازلی** :- ہمارا نام بھی تو نازلی ہے، مگر ہمارے آنے سے تم نروس کیوں ہو جاتے ہو؟

**مینجر** :- کون کافر نروس ہوتا ہے بیگم صاحب۔ آپ کے آنے سے تو اس ہوٹل میں اُجالا ہو جاتا ہے۔

**نازلی** :- سچ؟

**مینجر** :- کیا مجھے جھوٹ بولنے کی عادت ہے؟

**نازلی** :- اگر تمہیں جھوٹ بولنے کی عادت نہیں تو سچ سچ بتاؤ آج ہوٹل کی آمدنی کتنی ہوئی اور تم مجھے اس میں سے کتنا روپیہ ابھی دے سکتے ہو؟

**مینجر** :- آپ بیروں سے غرض رکھیئے۔ آپ کو بیریاں گننے سے کیا حاصل۔

**نازلی** :- شاباش۔ مجھے ایک پرانی دعوت کا اور کپڑے والے کا بل ادا کرنا ہے۔

**مینجر** :- کل کتنی رقم ہوگی؟

نازلی :۔ سوا دو ہزار سے کام چل جائے گا۔

مینجر :۔ اگر کل کو توفیق صاحب نے مجھے ملازمت سے نکال دیا، تو آپ میرے لئے سفارش کا ایک لفظ بھی نہیں کہیں گی۔

نازلی :۔ ایسا نہ کہو۔

مینجر :۔ آپ بڑی شاہ خرچ ہیں۔

نازلی :۔ یہ دولت کسی نے سینے پر رکھ کر تھوڑی لے جانی ہے۔ پہلی بیوی توفیق کی سب کچھ دھرا دھرایا چھوڑ کر آناً فاناً چل بسی۔ اس چل چلاؤ میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا مینجر۔ میرے بھی تو اولاد نہیں ہوئی۔

مینجر :۔ آپ کیوں دل میلا کرتی ہیں۔ تین سال ہی تو ہوتے ہیں ابھی آپ کی شادی کو۔ اولاد اتنی جلدی تو نہیں ہوا کرتی۔

نازلی :۔ توفیق آدمی بڑا اچھا ہے۔

مینجر :۔ پہلی بیوی کو اس کمرے میں آنے کی کہاں اجازت تھی۔ یہ تو آپ ہی ہیں کہ اس طرح بے باکانہ چلی آتی ہیں اور پھر مجھ سے اگر کہتی ہیں کہ تم نروس ہو جاتے ہو۔

نازلی :۔ آخر یہ کمرہ کیا ہے۔ ایک کمرہ ہے جس کا نام دفتر ہے۔ جس میں تم مینجر بن کر بیٹھتے ہو اور دن بھر جمائیاں لیتے ہو۔

مینجر :۔ جی ہاں جمائیاں لیتا ہوں۔ صبح سے لے کر شام تک سر کھپاتا ہوں۔ سیاہ و سفید میرے سپرد ایسے تو نہیں کر دیا گیا بیگم صاحبہ! اعتبار بڑی مشکل سے پیدا ہوا کرتا ہے اور یہ اعتبار ہی کے بل بوتے پر آپ کے بیسیوں اخراجات کے لئے روپیہ نکل رہا ہے۔

نازلی :۔ تم بڑے وہ ہو؟

مینجر :۔ وہ کیا؟

نازلی :۔ چرب زبان۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑا بڑا مطلب نکالنے والے۔ یہ باہر موٹر کس کی آئی۔ توفیق آ گیا۔ میں چلی۔

(دوسرے دروازے سے چلی جاتی ہے)

توفیق :۔ (ہاتھ میں کاغذات لئے داخل ہوتا ہے۔ بیٹھ کر دو ایک کاغذات دیکھ کر) دیکھو مینجر ہم نے تم پر اعتبار کیا۔ یہ ہماری غلطی تھی اس طرح تمہیں روپیہ خرد برد کرنے کا موقع مل گیا۔

مینجر :۔ آپ کا خیال ہے میں نے روپیہ غبن کیا ہے۔

توفیق :۔ ہم اسے غبن نہیں کہیں گے مگر تم خود ہی بتاؤ، یہ روپیہ آخر گیا کہاں۔ تمہاری حسابات کی کتابوں میں کوئی پتہ نہیں چلتا۔ ہم نے تمہارے ساتھ ہمیشہ نرمی برتی ہے کیونکہ تم ہماری سختی ایک دن بھی برداشت نہیں کر سکو گے۔ اگر تمہارے خلاف ہم غبن کا مقدمہ دائر کر دیں تو چند ہی دن میں تم بڑے گھر کی ہوا کھاتے نظر آؤ گے۔

مینجر :۔ اگر ثابت ہو جائے کہ میں نے غبن کیا ہے

توفیق :۔ اور غبن کے سر سینگ ہوتے ہیں؟ زیادہ باتیں مت بناؤ۔ اپنے گریبان میں منہ ڈالو۔ شرم سے تمہارا سر جھک جانا چاہیئے۔

(پردہ)

## چھٹا سین

(توفیق کا کمرہ۔ ساتھ والے کمرے سے گھڑی کے گیارہ بجنے کی آواز آتی ہے)

توفیق :۔ یہ آواز کہاں سے آرہی کواڑ بجنے کی۔ ارے کوئی ہے؟

ملازم :۔ (دور سے) آیا حضور!

توفیق :۔ یہ کون سی کھڑکی کھلی رہ گئی ہے؟

ملازم :۔ بیگم صاحب کے کمرے کی کھڑکی ہے حضور۔ وہ شاید اندر سے چٹخنی لگانی بھول گئی ہیں۔

توفیق :۔ جاؤ کھڑکی بند کردو۔ چٹخنی لگا کر پردہ کھینچ دو۔

ملازم :۔ بہتر۔

توفیق :۔ نو بج گئے۔ ابھی تک نہیں آئی نازلی (نوکر سے چھوٹی میز الٹ جاتی ہے) ارے۔ یہ کیا گرایا، کیا ٹوٹا (اٹھ کر) یہ میز کیسے اُلٹ گئی

ملازم :۔ میں تیزی سے مڑتے وقت اس سے ٹکرا گیا۔

توفیق :۔ نالائق۔ تمہیں جلدی کیوں پڑی رہتی ہے ہر وقت کی۔ ہٹ جاؤ۔ مت یوں اکٹھی کرو چیزیں۔ سارا دراز اُلٹ گیا ہے۔ ساری چیزیں ان کی بکھر گئی ہیں۔ ایسی خبر لیں گی آکر بیگم صاحبہ کہ یاد کرو گے۔ بھاگ جا۔ ہٹ جا۔ چیزیں ہم اکٹھی کرلیں گے۔ مت ہاتھ لگاؤ تم۔ جاؤ تم کھانا لگاؤ۔

ملازم :۔ جی بہتر۔

توفیق :۔ (چیزوں کو اٹھا اٹھا کر دراز میں رکھتا ہے) حد ہوگئی، بیگم نے بھی کیا زمانہ بھر کی اوٹ پٹانگ چیزیں درازوں میں اکٹھی کر رکھی ہیں کوئی پوچھے بھلا انسان کو ان فالتو اشیا کی کیا ضرورت پڑتی ہے۔ یہ کیا گرا۔ ایں!!! یہ فالتو چیزیں ٹھکانے لگانے والوں کا کارڈ ۔۔۔ ایسا ہی تجارتی چمکیلا کارڈ مجھ تک پہنچایا گیا تھا۔ یہ کارڈ ہرگز فالتو نہیں ہو سکتا۔ میری بیوی کو کیسے پہنچایا گیا۔ یہ کارڈ۔ میری بیوی ۔۔۔ میری۔ بیوی۔ کیا اس وقت تک کمپنی کے ایڈمنسٹریٹر سے مل چکی ہے۔ شاید مل چکی ہو۔ ممکن ہے مجھے اپنے گھر کا کھانا ہلاک کردے ممکن ہے میں کل صبح غبن کے مقدمے کے سلسلہ میں عدالت جاتا ہوا کسی حادثہ کا شکار ہو جاؤں۔ (پسینہ پونچھتا ہے)

ملازم :۔ میں اندر آسکتا ہوں؟

توفیق :۔ ہاں۔ ان درازوں کو میز میں ڈال دو۔ ٹھیک ہے۔

ملازم :۔ حضور کھانا میز پر لگا دیا گیا ہے۔

توفیق :۔ کھانا میز پر سے اٹھا لو۔ ہم نہیں کھائیں گے۔ بازار سے کون سودا لاتا ہے؟

ملازم :۔ خانساماں۔

توفیق :۔ اول؛ خانساماں، بیگم کا چہیتا نوکر۔ تم کیا دیکھ رہے ہو۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔ ہمیں بھوک نہیں ہے۔ سنتے نہیں تم، ہم کھانا نہیں کھائیں گے۔

ملازم :۔ کافی پئیں گے؟

توفیق :۔ نہیں، ہم کافی بھی نہیں پئیں گے۔ تم لوگ اتنے خیر خواہ بننے کی کوشش کیوں کر رہے ہو۔ نکل جاؤ یہاں سے (نوکر جاتا ہے۔ کچھ سوچتا ہے، پھر ٹیلی فون کرتا ہے) ہیلو۔ کیا آپ ٹائی دے ٹریڈرز سے بول رہے ہیں۔ کیا آپ کا کوئی جہاز رت کو جا رہا ہے۔

کہاں ؟ مصر، عراق، شام۔ خوب، کیا ایک سیٹ مل سکتی ہے۔ تھینک یو۔ مصر کے لئے ایک سیٹ دے دیجئے۔ میرا نام توفیق رؤف ہے۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔ (آواز دیتا ہے) بولتے۔

ملازم :۔ حاضر

توفیق :۔ ہماری گاڑی۔ نہیں۔ ایک ٹیکسی لاؤ۔ ہم یہ خط لکھ کر باہر جا رہے ہیں۔

ملازم :۔ بہتر۔

توفیق :۔ (خط لکھتا ہے اور بولتا جاتا ہے) ڈارلنگ! مجھے ایک ضروری کاروبار کے سلسلے میں آناً فاناً مصر جانا پڑ رہا ہے۔ تم سے ملے بغیر جا رہا ہوں۔ میں تھوڑے عرصے کے بعد وہاں سے فرانس چلا جاؤں گا۔ وہاں پہنچ کر تمہیں خط لکھوں گا۔

ملازم :۔ ٹیکسی آگئی حضور۔

توفیق :۔ یہ بکس اس میں رکھو۔ بیگم صاحب آئیں تو ان کو یہ خط دے دینا۔

ملازم :۔ بہتر حضور (جاتا ہے)

(پردہ)

## ساتواں سین

کمپنی کا آفس۔ (ایڈمنسٹریٹر اور ہوٹل کا منیجر بیٹھے ہیں)

ایڈمنسٹریٹر :۔ اب آپ مطمئن رہیں منیجر صاحب۔ ہوٹل اب آپ کا۔ سب کاروبار اب آپ کا ہے۔ آپ کے مالک توفیق رؤف کو ٹھکانے لگا دیا گیا۔ آپ جو چاہتے تھے۔ ہم نے اس کا انتظام کر دیا۔ فالتو چیز راستے سے ہٹا دی گئی۔ آپ کے ذمہ ہماری کمپنی کا پانچ ہزار روپیہ باقی ہے۔

منیجر :۔ جی ہاں۔ یہ لیجئے پانچ ہزار کا چیک۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں ورنہ نجانے غبن کے مقدمے میں میری کیا رسوائی ہوتی۔

ایڈمنسٹریٹر :۔ آپ کو شاید علم نہیں کہ ہماری کمپنی اپنے ہر گاہک کی عزت آبرو کا پورا پورا خیال رکھتی ہے۔ بہرحال میں آپ کو اپنی کمپنی کی طرف سے آپ کی ہونے والی شادی پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

منیجر :۔ میری شادی!

ایڈمنسٹریٹر :۔ میں آپ نظر انتخاب کی داد دیتا ہوں۔ اصل میں مسز توفیق اپنے خاوند سے ہمیشہ رنجیدہ خاطر رہی۔ طبیعت ملنے کی بات ہوتی ہے۔ ان سے نہ ملی آپ سے مل گئی۔ خدا آپ کو خوش و خرم رکھے۔

منیجر :۔ تھینکس سو مچ۔ مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا!

ایڈمنسٹریٹر :۔ ہم اپنا کام اندازوں سے نہیں کرتے۔ ہر بات کی تہہ تک پہنچتے ہیں کیونکہ ہمارا کام ہی یہی ہے اور یہ جانے بغیر کہ کوئی چیز کس حد تک فالتو ہے ہمارا کاروبار نہیں چل سکتا۔

منیجر :۔ مگر اب آپ کی اور میری ملاقات کی ضرورت نہیں۔

ایڈمنسٹریٹر :۔ بالکل نہیں۔ (دونوں ہاتھ ملاتے ہیں) خدا حافظ!

(پردہ)

# ہنی مون

رحمان مذنب

کردار

ڈاکٹر کامل

اجنبی

بڑھیا

ڈاکٹر کامل کا دارالمطالعہ

آخر شب، اسٹیج پر معمولی روشنی ہے۔ سامنے دیوار پر جو گھڑی آویزاں ہے، اس پر ۲ بجے ہیں۔ رفتار تیز ہے۔ ہر طرف کتابوں کی الماریاں رکھی ہوئی ہیں۔ ادھر اُدھر میزیں اور کرسیاں رکھی ہیں، ان پر کتابیں اور کاغذوں کے پلندے دھرے ہیں درمیان میں آرام کرسی پر ڈاکٹر کامل بیٹھا ہے۔ داڑھی اور سر کے بال سفید ہیں داڑھی لمبی اور اُلجھی ہوئی خمیدگی آگئی ہے۔

ڈاکٹر کامل کبھی مسکراتا، کبھی ہنستا، کبھی کھڑا ہوتا، کبھی ٹہلتا اور کبھی ہاتھوں سے اشارے کرتا ہے۔ اس وقت وہ اپنی ذات میں گم ہے۔ برابر کے کمرے میں سے جا کر قدِ آدم آئینہ کھینچ کر لاتا اور اس میں اپنی صورت دیکھنے لگتا ہے، کبھی قہقہے لگاتا اور کبھی افسردہ ہو جاتا ہے۔

ایک نوجوان آئینے کے پیچھے سے نکل کر آتا ہے۔

**ڈاکٹر کامل**:۔ تم، تم کون؟

**اجنبی**:۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مت دیکھو! پہچاننے کی کوشش کرو!

**ڈاکٹر کامل**:۔ میرا، میرا چشمہ کہاں گیا؟

**اجنبی**:۔ یہ لو، یہ رہا تمہارا چشمہ۔

**ڈاکٹر کامل**:۔ یہ، یہ تو کتاب پڑھنے کا ہے۔

**اجنبی**:۔ خوب، دیکھنے کا چشمہ دوسرا ہے۔ گویا، میرا مطلب ہے، تم لوگ .... اس صدی کے .... یہ کون سی صدی کہلاتی ہے؟

**ڈاکٹر کامل**:۔ بیسویں۔

**اجنبی**:۔ ٹھیک، تم لوگ اسے بیسویں صدی کہتے ہو، ویسے تم ابھی حساب میں کچے ہو، تمہاری نسل لاکھوں صدیوں سے اس خرابے میں آباد بلکہ برباد ہے۔ تم نے بس بیس صدیاں رکھ لیں، باقی ہضم کر گئے۔ میری مانو، چند صدیاں اور ہضم کر لو! تمہیں تو تین چار صدیاں بہت ہیں

**ڈاکٹر کامل**:۔ یہ کیسے؟

**اجنبی** :- ایسے — پہلی صدی میں تم پیدا ہوئے، چند دن درختوں پر رہے اور شجر پسند نیم انسان کہلاتے، پھر زمین پر آئے، غاروں میں گھس گئے، پھر چند دن پتھروں سے کھیلتے رہے، ان سے سر پھوڑتے رہے۔ پتھروں پر تصویریں بناتے رہے۔ پھر تم نے زمین جوتنا اور کاتنا سیکھا، تمہیں گانا اور ناچنا بھی آگیا۔ یہ سب چند دن کی بات ہے۔

**ڈاکٹر کامل** :- چند دن کی ؟

**اجنبی** :- ہاں بس چند دن کی۔ ابھی فجر ہی تو ہے۔ صدیوں کے پھیر ہی میں پڑنا ہے تو کہہ لو! دو صدیاں بیت چکیں، تیسری بیت رہی ہے۔

**ڈاکٹر کامل** :- بس ؟

**اجنبی** :- ہاں، اور کیا ؟ تمہیں کہتے ہو تمہارے آباؤ اجداد بربریت پسند تھے، غیر مہذب تھے۔ بس ایک تمہیں مہذب رہ گئے۔ تم نے اپنی ذات کو پہچانا، ایٹم کو پہچانا، اور سوئی ہوئی موت کو جگایا۔ یاد رکھو: تین صدیوں سے آگے نہ بڑھنے پاؤ گے۔ تمہاری یہ تیسری صدی سب سے مختصر ہوگی۔ لو پکڑو دیکھنے کا چشمہ!

**ڈاکٹر کامل** :- تم ہمارے عہد کا مذاق نہ اڑاؤ۔

**اجنبی** :- اپنے چشموں کی خبر لو! ایک سے کتاب پڑھتے ہو، ایک سے دنیا کو دیکھتے ہو، گویا کتاب اور دنیا دو، الگ الگ چیزیں ہیں۔ پھر یہ چشمے! اے روشنی کے سپوت، اے روشنی کے علمبردار! چشمے نہ ہوں تو کتاب اور دنیا تمہارے لئے بیکار ہیں۔

**ڈاکٹر کامل** :- یہ چشمے اسی صدی کی ایجاد ہیں۔

**اجنبی** :- آنکھیں اندھی اور چشمے ایجاد کئے جا رہے ہو۔

(بڑھیا داخل ہوتی ہے۔ گرم چادر میں لپٹی ہوئی۔ اجنبی الماری کے پیچھے غائب ہو جاتا ہے)

**بڑھیا** :- یہ آج اس وقت تم کس سے باتیں کر رہے تھے؟

**ڈاکٹر کامل** :- میں خود ہی باتیں کر رہا تھا، اپنے آپ سے، ہاں اپنے آپ سے۔ بڑی مدت کے بعد۔

**بڑھیا** :- ایسا ہی باتیں کرنے کا شوق تھا تو مجھے بلا لیتے۔

**ڈاکٹر کامل** :- تمہیں نہیں، اس کی ضرورت نہ تھی۔ میں ایک نئی دریافت میں مشغول تھا، تم بے شک جا کر سو رہو۔

**بڑھیا** :- اُف! اس سردی میں . . . . کمرے میں اکیلی پڑی رہوں!

**ڈاکٹر کامل** :- ہاں، کوئی نئی بات نہیں، آج میں بہت بڑی حقیقت دریافت کر رہا ہوں۔

**بڑھیا** :- اُف! کتنی سردی ہے آج اور یہ رات کتنی بھیانک ہے!

**ڈاکٹر کامل** :- (کڑک اور گرج سننے کے بعد) یوں تڑپ اور کراہ رہی ہے، جیسے بچہ جننے کو ہو!

**بڑھیا** :- چائے بناؤں؟

**ڈاکٹر کامل** :- بنا لو۔

(بڑھیا جاتی ہے، ڈاکٹر کامل اُٹھ کر دروازہ بھیڑ دیتا ہے۔ اجنبی پھر نمودار ہوتا ہے)

**اجنبی** :- یہ حال ہے تمہاری محبت کی شادی کا۔ تم شادی کر کے محبت کی مٹی پلید کرتے ہو۔

**ڈاکٹر کامل** :- جہاں محبت ہو وہاں شادی نہ کرنا چاہئے!

**اجنبی** :۔ تمہاری محبوبہ اور تمہاری بیوی، یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں۔ تم انہیں ایک نہیں کر سکتے۔ ان دونوں کو کیوں رکھا ہے۔ جو بہتر ہے اُسے رکھ لو، دوسری کو ختم کردو!

**ڈاکٹر کامل** :۔ یہ دونوں چیزیں اپنی اپنی جگہ ضروری ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی ختم نہیں کیا جاسکتا۔

**اجنبی** :۔ یہ دیکھو، یہ تصویریں گرد آلود ہو رہی ہیں۔ کتنی جلدی تمہاری محبت دھندلا گئی! یہ تصویریں بہار آفریں مناظر کی ہیں۔

**ڈاکٹر کامل** :۔ فکرِ دنیا بھی کوئی چیز ہے۔

**اجنبی** :۔ (ڈاکٹر کو عینک صاف کرتے دیکھ کر) اب عینک بھی دھندلا گئی۔ تم اسے روشنی کی دنیا کہتے ہو جہاں اتنی جلدی تمہاری محبت دُھندلا جاتی ہے، نظر دُھندلا جاتی ہے، عینک دُھندلا جاتی ہے۔

**ڈاکٹر کامل** :۔ (عینک گر جاتی ہے — عینک اٹھاتے ہوئے) شکر ہے ٹوٹی نہیں

**اجنبی** :۔ (قہقہہ لگاکر) کیا کہنے تمہاری لاثانی ایجادکے! یہ دھندلاتی ہی نہیں ٹوٹ بھی جاتی ہے۔ کیسے بودے سہارے ہیں تمہارے! اور وہ اصل سہارا کہاں گیا؟ وہ ضمیر یعنی ضمیرِ عالم جس کے ذریعے انسانیت کی صورت نظر آتی ہے،

**ڈاکٹر کامل** :۔ ضمیر؟ وہ تو موجود ہے۔

**اجنبی** :۔ اس سے حاصل؟ تمہارے تمدن کی روشنیوں نے اسے بھی دُھندلا دیا ہے۔ تمہاری روشنی تمہاری ہر چیز کو دھندلا رہی ہے۔ یہ تمہیں اندھا بنا رہی ہے۔

**ڈاکٹر کامل** :۔ (جھنجھلا اور چلا کر) یہ بکواس ہے!

**اجنبی** :۔ خاموش، خبردار! جو میرے حضور میں گستاخی کی۔ (قہقہہ مار کر) خیر، مضائقہ نہیں بیشک جھنجھلاؤ، چلّاؤ! بیسویں صدی کے پاس جھنجھلاہٹ اور چلانے کے سوا اور کیا ہے؟ تم سے مل کر مجھے خوشی نہیں ہوئی۔

**ڈاکٹر کامل** :۔ تم آج زندگی میں پہلی مرتبہ مل رہے ہو۔

**اجنبی** :۔ ہاں، پچاس سال میں پہلی مرتبہ۔ تم نے مجھے بھلا ہی دیا۔ اپنی عقل پر اتنے نازاں ہوئے اور اپنے روشن ماحول پر اتنے ریجھ گئے کہ مجھے بھول گئے۔ پچاس سال تک میں تمہارے ان اندھیروں میں پڑا رہا جو تمہاری تہذیب کے چراغوں تلے پھیلے ہیں۔

**ڈاکٹر کامل** :۔ یہ تعارف بالکل نامکمل ہے۔

**اجنبی** :۔ تعارف؟ تم انسان اس حد تک اپنی نسل، اپنی برادری اور اپنے آپ سے ناواقف ہو چکے ہو کہ تعارف کے بغیر بات ہی نہیں کرتے۔ او اجنبیوں کی نسل! تجھ میں اتنی بے گانگی کہاں سے آئی؟

**ڈاکٹر کامل** :۔ زمان و مکاں کے فاصلے کچھ کم تو نہیں۔

**اجنبی** :۔ فاصلوں کا یک بہانہ ہے۔ یہ سب تمہاری عینک کی شرارت ہے۔ جس رنگ کی عینک پہنتے ہو، اُسی رنگ کی دنیا دیکھتے ہو۔

**ڈاکٹر کامل** :۔ تم ہم میں سے نہیں، اسی لئے تمہیں ہماری باتیں عجیب لگتی ہیں۔

**اجنبی** :۔ !!!!۔ !!!! تمہاری حالت کتنی قابلِ رحم ہے! اپنی مسخ صورتوں پر نازاں ہو، نادانو! اپنی کھوپڑیوں کو ٹٹولو! تم نے ان میں کتنا بھوسہ کتنی غلاظت اور کتنے امراض بھر لئے ہیں۔ تمہارے نفسیاتی امراض کے بڑے چرچے ہیں۔

**ڈاکٹر کامل** :۔ نفسیاتی امراض؟ یہ تو پرانی جڑ کی ہری شاخیں ہیں۔

اجنبی :۔ واہ، سبحان اللہ! کس خلوص اور محنت سے تم نے پرانی جڑ ہری کی۔ میں کہتا ہوں، تم زہریلے پودے ہو۔

ڈاکٹر کامل :۔ یہ زہر تو ہماری پہلی ماں نے ہماری رگوں میں بھرا۔

اجنبی :۔ (جلال میں آکر) غلط، بالکل غلط! اپنی پہلی ماں پر الزام دھرتے ہو۔ بڑے مؤرخ اور سائنسدان بنتے ہو، لیکن مجھے معلوم ہے تم پرلے درجے کے دروغ گو ہو، تم سچ نہیں اُگلتے، صرف غلاظت اُگلتے ہو، کرتے، اُگلو غلاظت! تمہارے اندر تعفن ہی تعفن ہے۔ خالی کرو غلاظت کے خزانے ورنہ گل سڑ جاؤ گے، تمہاری تاریخ غلاظت کا انبار ہے۔ تم غلاظت کے انبار ہو۔

ڈاکٹر کامل :۔ تم اجنبی ہو، تمہیں کیا خبر!

اجنبی :۔ اجنبی! ہاہاہا، ہاہاہا، ہاہاہا! میں اجنبی ہوں! سنا نہیں، خود تم ہی کہا کرتے ہو آگاہ اپنی ذات سے لیکن بشر نہیں۔ اجنبی تم کہ میں! جو دنیا بھر میں گھومتا پھرے، تمام مخلوقات میں رستا بستا رہے وہ اجنبی ہے یا تم جو زمانے کو چھوڑ کر اس تنگ و تاریک مکان میں اسیر ہو؟

ڈاکٹر کامل :۔ یہ کتابیں میری دنیا ہیں۔!

اجنبی :۔ کس احمق نے زندگی کو ان کتابوں کے لئے بنایا تھا؟ یہ زندگی اتنی مختصر تو نہیں کہ تم اُسے چار دیواری میں سکیڑ کر رکھ دو! تم کیا جانو زندگی کتابوں سے باہر ہے۔ تمہیں اس لئے پیدا کیا تھا کہ زندگی کی وسعتوں کا تجربہ کرو! زندگی کے سارے روپ، سارے رنگ اور سارے جلوے دیکھو، زندگی کو ہر رُخ، ہر پہلو پر کھو، تلخ و شیریں جو اس کے پاس ہے اُسے چکھو، ہر زیر و بم پر چلو، اپنی ذات کو پھیلاؤ، تماشہ بنو، تماشے دیکھو، تم سے کس نے سمٹنے کو کہا؟ تم اجنبی کیوں بنے! نہ اپنی ذات کے اندرون سے واقف ہو نہ بیرون سے۔

ڈاکٹر کامل :۔ ہونہہ!

اجنبی :۔ کتابوں نے تمہیں بزدل بنا دیا، تم سے عمل کی طاقت چھین لی۔ تم نے آتشِ نمرود میں بے خطر کودنے کی صلاحیت گنوا دی۔

ڈاکٹر کامل : ہونہہ!

اجنبی :۔ تمہاری کتابوں میں سچ کم، جھوٹ زیادہ ہے۔ تم اکثر جھوٹ کی خاطر کتابیں لکھتے ہو۔ اس طمطراق سے جو نتیجے مرتب کرتے ہیں۔ وہ جھوٹ کی اُجلی، چمکدار اور روشن صورتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟

ڈاکٹر کامل :۔ مجھے کچھ نہیں کہنا۔

اجنبی :۔ کچھ تو بولو! خیر، تم کیا بولوگے۔ پُرانی جڑ کی بات وہیں رہ گئی۔ یہ ذرا سی جڑ، یہ چھوٹی سی خشتِ اوّل تمہاری کاوشوں کے طفیل ایک نہایت شاندار ایوان میں تبدیل ہو گئی اور اب، ہاہاہا، ہاہاہا! یہ تمہاری دنیا ایک ٹیڑھا ایوان ہے۔ کیا قابلِ تعریف ہیں کارنامے تمہارے!

ڈاکٹر کامل :۔ تم ضرورت سے زیادہ بے باکی دکھا رہے ہو، دنیا کا خوف نہیں تمہیں کیا؟

اجنبی :۔ دنیا کا ضمیر میں ہوں جسے تم بھول گئے۔ بیگانے سسروں کا ڈر ہے، اپنے سسر کا پاس نہیں؟

ڈاکٹر کامل :۔ چُپ ہو جاؤ! وہ چائے لا رہی ہے۔

اجنبی :۔ میں جاتا ہوں۔

(بڑھیا چائے لے کر آتی ہے۔ ایک پیالی اپنے لئے اور ایک ڈاکٹر کامل کے لئے بناتی ہے)

بڑھیا :۔ سوچ کی بات!

ڈاکٹر کامل :۔ ابھی کہاں۔

**بڑھیا** :- کب تک اور سوچوگے ؟

**ڈاکٹر کامل** :- فجر تک ۔

**بڑھیا** :- اُف ؛ تب تک تو میں سردی میں ٹھٹھر کر رہ جاؤں گی ۔

**ڈاکٹر کامل** : یہ ہیٹر لے جاؤ ۔

**بڑھیا** :- تم کیا کروگے ؟

**ڈاکٹر کامل** :- میں گرم کوٹ پہن لیتا ہوں ۔ تم جاکر سورہو ۔ صبح تم سے ملاقات ہوگی ، چائے پینے کے بعد ۔

(بڑھیا لمبی آہ بھرتی اور چلی جاتی ہے ۔ اجنبی آجاتا ہے )

**اجنبی** :- خوب ، ہیٹر اور گرم کوٹ ، ان سے سردی مٹتی ہے ؛ احمق ! محبت دل کی حرارت مانگتی ہے ۔ کیا زندگی ہے عورت کی ! بے چاری نہ مرد کے ساتھ جیتی ہے ، نہ مرد کے ساتھ مرتی ہے ۔

**ڈاکٹر کامل** :- اور وہ جو ستی کی رسم تھی ؟

**اجنبی** :- آج بھی عورتیں ستی ہوتی ہیں ۔ یہ جو ستائی جاتی ہیں ، ستی ہی تو ہوتی ہیں ۔ تم مرد ستا کیوں نہیں ہوتے ؟

**ڈاکٹر کامل** :- ہم کتابوں کے ساتھ ستی ہوتے ہیں ۔

**اجنبی** :- ! ! ! ! معلوم ہوتا ہے تم آئندہ دنیا کی بنیاد کتابوں پر رکھنا چاہتے ہو ۔ تم اس طاعون کو عام کیا چاہتے ہو ۔ جانتے ہو تمہارا کیا حال ہوا ہے ؟

**ڈاکٹر کامل** :- کیا حال ہوا ہے ؟

**اجنبی** :- آتشِ نمرود میں کودنے کی طاقت تم سے چھن گئی ہے ۔ کتابوں نے تمہیں اپنی طرح بے جان کر دیا ہے ۔ تم پر فالج گرا ہے اور پھر وہ بھی بائیں طرف ۔

**ڈاکٹر کامل** :- یہ سب بے کار باتیں ہیں ۔

**اجنبی** :- اگر تم اسی طرح سکڑ سکڑ کر چار دیواری میں بیٹھے رہے ، بڑھانے کی بجائے تم نے اپنا قد گھٹا لیا تو کائنات کی وسعتیں تم پر ہنستی رہیں گی پھر ایک دن تمہارے دائیں حصے پر بھی فالج گر جائے گا ۔

**ڈاکٹر کامل** :- تم علم کے دشمن ہو ۔

**اجنبی** :- تم عقل کے دشمن ہو ۔

**ڈاکٹر کامل** :- کتابوں کے بغیر اس دنیا میں اندھیرا ہوگا ۔

**اجنبی** :- تمہیں ایک گائیڈ بک ملی تھی تاکہ سفر پر نکلنے سے پہلے اُسے ایک نظر دیکھ لو لیکن تم نے سفر کا ارادہ ترک کر دیا ، ور گائیڈ بک کے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑے رہے ۔ تم نے کچھ دیکھا ہی نہیں ، بس گائیڈ بک دیکھی ہے ۔

( بُلانے کی گھنٹی بجتی ہے )

**اجنبی** :- دیکھو کون آیا ہے ؟

**ڈاکٹر کامل** :- دیکھتا ہوں ۔

(ڈاکٹر کامل باہر جاتا ہے، اجنبی کتابیں اُلٹ اُٹھا کر دیکھتا ہے اور ان پر طنزاً ہنستا ہے۔ کتابیں اِدھر اُدھر پھینک دیتا ہے ڈاکٹر کامل نووارد کے ساتھ جھگڑتا ہوا آتا ہے۔ یہ نووارد جس نے دو دو کیمرے لٹکا رکھے ہیں فوٹوگرافر ہے۔ ہاتھ میں ایک پیکٹ ہے۔ ان کے آنے سے پہلے اجنبی کتابیں دیکھ کر چلا جاتا ہے)

**ڈاکٹر کامل** :۔ یہ کتابیں، یہ کیوں بکھریں؟ بڑا بدتمیز ہے وہ! جی چاہتا ہے اسے گولی مار دوں۔

**فوٹوگرافر** :۔ میں کہتا ہوں، مجھے صرف آج معلوم ہوا ہے۔ میں اپنی صاحب کی کتابیں دیکھ رہا تھا، ان میں سے یہ بل ملا اور صندوق کی تہہ میں سے یہ پیکٹ۔

**ڈاکٹر کامل** :۔ غلط، بیس سال پہلے کا کوئی بل مجھ پر واجب الادا نہیں۔

**فوٹوگرافر** :۔ جناب، آپ نے پانچ بڑی بڑی تصویریں کھچوائی تھیں۔ ان میں آپ تھے اور آپ کی بیگم صاحبہ۔

**ڈاکٹر کامل** :۔ ہمیں کچھ یاد نہیں۔

**فوٹوگرافر** :۔ کمال کیا آپ نے، اپنا ہنی مون بھی آپ کو یاد نہیں، زندگی کے اس تاریخی واقعے کو کون بھولتا ہے۔ یہ تصویریں آپ کے ہنی مون کی یادگار ہیں نا؟

**ڈاکٹر کامل** :۔ غلط، بالکل غلط! ہم نے ہنی مون نہیں منایا۔

**فوٹوگرافر** :۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا آپ نے شادی نہیں کی تھی، اور وہ حسینہ آپ کی بیگم نہ تھیں۔

**ڈاکٹر کامل** :۔ چپ ہو جاؤ! ہم تمہیں نہیں پہچانتے، ہم نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا، ہم نے تم سے کوئی تصویریں نہیں اتروائیں۔ ہمیں تصویروں سے دلچسپی نہیں۔

**فوٹوگرافر** :۔ واہ صاحب واہ! حد کر دی آپ نے، دیکھئے یہ آپ کی اور آپ کی بیگم کی تصویریں نہیں؟ (پیکٹ کھولتے ہوئے) آپ سمجھتے ہیں میں جھوٹ بولتا ہوں۔ یہ تصویریں اپنے آپ ہی پیدا ہو گئیں۔

(فوٹوگرافر ایک ایک کر کے تصویریں پیچھے پھینک دیتا ہے)

**ڈاکٹر کامل** :۔ (تصویریں دیکھ کر) یہ تصویریں! کیا، کیا ہم ہی ہیں! آج سے بیس برس پہلے۔ اور وہ اجنبی! وہ میری جوانی تھی، گمشدہ جوانی، بالکل ایسی! (فوٹوگرافر سے) تمہارے خیال میں میں خوبرو اور جوان تھا؟

**فوٹوگرافر** :۔ جناب! مجھے آپ کی خوبروئی اور آبرو سے کوئی سروکار نہیں۔ میں گدھے کی بھی تصویر کھینچنے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ میرا بل ادا کیا جائے۔

**ڈاکٹر کامل** :۔ تم بڑے خود غرض ہو۔ تم کیسے فوٹوگرافر ہو، تمہیں فنونِ لطیفہ سے ذرا مس نہیں۔ بس تمہیں تو بل کی پڑی ہے۔

**فوٹوگرافر** :۔ جناب! جہاں آپ سے بل دبانے والے ہوں گے وہاں فنونِ لطیفہ کی بات بے سود ہے۔

**ڈاکٹر کامل** :۔ ارے میاں! تم تو ناحق خفا ہو رہے ہو، بل مل جائے گا۔

**فوٹوگرافر** :۔ بل جائے گا!

**ڈاکٹر کامل** :۔ ہاں مل جائے گا۔

**فوٹوگرافر** :۔ پھر تو آپ بہت ہی خوبرو تھے، آپ کا رنگ ارغواں کی مانند تھا، اس میں کچھ کچھ سفیدی تھی اور...... ہاں یاد آگیا، میں تو کچھ بھولتا ہی نہیں۔ میرا فن ہی ایسا ہے، ہر چہرہ یاد رکھتا ہوں۔ اُس زمانے میں آپ کی صحت قابلِ رشک تھی۔

**ڈاکٹر کامل** :۔ خوب خوب!

**فوٹوگرافر** :۔ آپ بلا کے ہنس مکھ تھے۔ پھر، پھر ایک اور بات ہے۔

**ڈاکٹر کامل** :۔ (بہ اشتیاق) کیا؟

**فوٹوگرافر** :۔ اُس زمانے میں ہر پہلو سے آپ کی تصویر بہت اچھی آتی۔

**ڈاکٹر کامل** :۔ واہ، کیا حسن تھا، کیا جوانی تھی! وہ زمانہ بھی کیا زمانہ تھا!

**فوٹوگرافر** :۔ لیکن آپ نے تو ہنی مون بھی نہ منایا، آخر آپ نے اس حسن اور اس جوانی سے کیا کیا؟

**ڈاکٹر کامل** :۔ میرا حسن، میری جوانی اس کمرے میں دفن ہے، ان کتابوں کے اوراق میں گم ہے۔

**فوٹوگرافر** :۔ اوہو، آپ کو اسی لئے یہ کتابیں عزیز ہیں۔ جبھی تو آپ اُسے جان سے مارنے پر تُل گئے۔ اُس نے یہ کتابیں بکھیر دی تھیں نا؟

**ڈاکٹر کامل** :۔ ہاں وہ بڑا ہی بے باک تھا۔ وہ کیا..... وہ تو گمشدہ میں تھا

**فوٹوگرافر** :۔ کہاں گیا وہ میں؟

**ڈاکٹر کامل** :۔ یہ تصویریں! ان کی بات کرو! بہت پرانی ہیں یہ! کچھ کچھ دھندلی بھی پڑ گئی ہیں۔

**فوٹوگرافر** :۔ بیس سال میں حسن اور جوانی کتنے گھس جاتے ہیں۔

**ڈاکٹر کامل** :۔ ان تصویروں سے بہت زیادہ۔

(بیگم کی آمد)

**فوٹوگرافر** :۔ لیجئے وہ بھی تشریف لے آئیں۔

**بڑھیا** :۔ ابھی تک سردی نہیں گئی۔ چائے پیو گے؟

**ڈاکٹر کامل** :۔ یہاں پاس آ بیٹھو اور یہ تصویریں دیکھو۔

**فوٹوگرافر** :۔ آداب عرض کرتا ہوں۔

**بڑھیا** :۔ آپ کی تعریف!

**فوٹوگرافر** :۔ ان تصویروں کے خالق۔

**بڑھیا** :۔ یہ لوگ کہاں ہیں!

**فوٹوگرافر** :۔ کیا دونوں ان کتابوں میں گُم نہیں؟

**ڈاکٹر کامل** :۔ نہیں، صرف میں گُم ہوں۔ یہ تو میرے ساتھ صرف اس چار دیواری میں دفن ہیں۔

**بڑھیا** :۔ کیا حاصل ان تصویروں سے؟ انہیں بھی کتابوں کی الماری میں رکھ لو۔

**ڈاکٹر کامل** :۔ واہ، تم نے بھی ایک ہی کہی، کیا ہوا جو ہم جوان نہیں رہے، دل تو جوان ہے۔

**بڑھیا** :۔ ہونہہ! جوان اور تمہارا دل؟ کیا ہوا تمہاری دریافت کا؟

**ڈاکٹر کامل** :۔ دریافت ہو گئی۔

**بڑھیا** :۔ کیا دریافت کیا تم نے؟

ڈاکٹر کامل :- ہم نے ہنی مون نہیں منایا تھا۔

بڑھیا :- ہنی مون نہیں منایا تھا!

ڈاکٹر کامل :- نہیں۔

بڑھیا :- میں تم سے نہ کہتی تھی: ہنی مون مناؤ، ہنی مون مناؤ اور تمہیں اپنے نئے فلسفے اور اپنی نئی کتابوں کی پڑی تھی۔ آج بیس سال بعد تم نے ہنی مون کی دریافت کی، ہونہہ!

فوٹوگرافر :- جناب! یہ بل ادا فرمایئے۔

ڈاکٹر کامل :- ہاں ہاں۔ تمہارا بل لیکن دو سو روپے! یہ کس حساب سے؟

فوٹوگرافر :- یہ تصویریں بہت نادر و نایاب ہیں۔ اُس وقت ان کی قیمت صرف پچاس روپے تھی، لیکن اب تو یہ تاریخی حیثیت اختیار کر چکی ہیں، آپ کو کسی قیمت پر نہیں مل سکتیں۔ دو سو روپے میں تو بالکل سستی ہیں۔

بڑھیا :- اب ان تصویروں کو ہم کیا کریں۔ بیس سال پہلے لاتے تو فائدہ بھی تھا۔

ڈاکٹر کامل :- کوئی مضائقہ نہیں، کوئی مضائقہ نہیں۔ (اُٹھ کر چیک بک نکالتے ہوئے) زندگی جس قدر بیس سال پہلے اہم تھی، آج بھی اتنی ہی اہم ہے۔

بڑھیا :- ہونہہ!

ڈاکٹر کامل :- زندگی ہر مقام، ہر لمحے اور ہر موقع پر زندگی ہوتی ہے، ہم ہنی مون منائیں گے، ہم ہنی مون منائیں گے۔ اُٹھو تیاری کرو۔

(فوٹوگرافر کو چیک دے کر رخصت کرتے ہوئے)

بڑھیا :- یہ آج تمہیں کیا ہوا ہے؟

ڈاکٹر کامل :- ہم پہاڑ پر چلیں گے۔

بڑھیا :- توبہ اس سردی میں، اور پہاڑ پر؟

ڈاکٹر کامل :- بڑا مزہ آئے گا۔ کتابوں میں لکھا ہے، برف کا نظارہ بڑا پُر لطف ہوتا ہے۔

بڑھیا :- اور سردی کا کیا بنے گا؟ ہمارا ہیٹر تو کسی کام کا نہیں۔

ڈاکٹر کامل :- (بڑھیا کو شانوں سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے) دل کی حرارت اس سردی کا مقابلہ کرے گی۔ آؤ، سامان باندھیں۔

(ڈاکٹر کامل اُچھلتا کودتا ہوا ونگ میں جاتا اور بڑھیا کو ہمراہ لے جاتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

ستمبر ۱۹۵۶ء

# تعبیر

جاوید اقبال

منظر : ایک مکان کے اوپر کی منزل پر نیم تاریک آرام گاہ۔ سامنے کی دیوار میں کھلی کھڑکی ہے جس میں سے ابر آلود آسمان اور دور دھند میں لپٹی ہوئی پہاڑیوں پر لوگوں کے گھروں کی روشن بتیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ بائیں دیوار میں دروازہ ہے جو اس کمرے میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔

فرش پر دائیں دیوار کے ساتھ کھڑکی سے ہٹ کر خوبصورت پلنگ پر اجلا بستر بچھا ہے۔ جہاں ایک مرد اوندھے منہ پڑا مدہوش سو رہا ہے۔ پلنگ کے قریب تپائی پر پانی سے بھرا ہوا جگ اور گلاس دھرے ہیں۔ کمرے کے وسط میں آرام کرسی پر کچھ کپڑے بے ترتیبی سے پڑے ہیں۔

رات نصف سے زیادہ گزر چکی ہے۔ ہر طرف سناٹا طاری ہے۔ کبھی کبھار جب اکیسویں کا چاند بادلوں میں سے نکلتا ہے تو کھڑکی کے رستے اس کی ہلکی پھلکی شعاعیں پلنگ پر سوتے ہوئے مرد پر پڑ جاتی ہیں۔ مگر جب چاند بادلوں میں چھپ جاتا ہے تو کمرے کی فضا میں اداس سی تاریکی منڈلانے لگتی ہے۔

چند لمحوں تک چاند کا بادلوں سے جھانکنا اور چھپ جانا جاری رہتا ہے۔ اب بائیں دیوار کا دروازہ آہستہ سے کھلتا ہے۔ ایک عورت داخل ہوتی ہے۔ جس کا چہرہ اور سفید ہاتھ برقعے میں سے نمایاں طور پر دکھائی دے رہے ہیں۔ اس کے ایک ہاتھ میں کوئی چمکتی سی شے ہے۔ جسے اس نے اپنی سیاہ آستین میں چھپا رکھا ہے۔ وہ سنبھل سنبھل کر چلتی ہوئی پلنگ پر سوتے ہوئے مرد کے سرہانے جا کھڑی ہوتی ہے۔ مرد خواب میں کچھ بڑبڑاتا ہے تو اس کی حرکات سے گھبراہٹ کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔ مرد کروٹ بدلتا ہے تو عورت سراسیمگی کے عالم میں کھڑکی کی طرف لپکتی ہے، لیکن اس کی ٹھوکر سے تپائی پر رکھا ہوا شیشے کا گلاس فرش پر گر کر چکنا چور ہو جاتا ہے۔

مرد : (چونک کر) ہا ..... ! ..... کون ___ ؟ (تعجب سے) ارے ___ (آنکھیں ملتے ہوئے) نادرہ تم ___ ؟ اتنی رات گئے ___ آج ___ اتنی مدت بعد ؟ کب آئیں ___ ؟ !! (پلنگ پر بیٹھتے ہوئے) کوئی اطلاع نہیں یہ کوئی ___ عورت خاموش کھڑی کھڑکی سے باہر آسمان کی طرف دیکھ رہی ہے۔ میں نے کہا ___ یہ کھڑکی سے باہر کیا تک رہی ہو ___ ؟ ! (بازو پھیلا کر پیار بھرے لہجے میں) ادھر آؤ۔ (پھر اچانک) یہ ..... یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے ؟ ! (عورت اپنا ہاتھ چھپا لیتی ہے) کیا ہے ___ ؟ ! مجھ سے کیا چھپا رہی ہو ؟ !!

عورت : (بے پرواہی سے) کچھ نہیں۔

مرد : (جمائی لے کر) کتنی بوجھل چاندنی ہے ___ (اٹھتے ہوئے) نادر ___ !!

عورت : (بغیر مڑے) ہوں ___

مرد : (کھڑکی کے قریب آتے ہوئے) میں ابھی ابھی ایک خواب دیکھ رہا تھا۔

عورت : (اسی انداز میں) دیکھ رہے ہو۔

مرد :۔ (ٹھٹک کر) کیوں ؟! (کھسیانی ہنسی کے ساتھ) گھبرا گئیں کیا ___ ؟!

عورت :۔ (پھیکی مسکراہٹ سے) نہیں تو ___

مرد :۔ (قریب آکر) بالکل یہی رات تھی ___ ہلکی سی ___ یاد ہے ___ ؟!!

عورت :۔ (کھوتے ہوتے) ہوں

مرد :۔ (اس کے شانے پر ہاتھ رکھے کھڑکی سے باہر دیکھ کر دھند کے گھوارے میں دور آج بھی لوگوں کے اونگھتے مکانات یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے سمندر میں جہاز کسی ایک ہی سمت بہتے چلے جا رہے ہوں ___ (عورت بے حس کھڑی ہے) تمہارے ہاتھ میں کیا ہے ؟!

عورت :۔ (گھبراہٹ چھپا کر) کچھ بھی نہیں

(چاند بادلوں میں سے نکلتا ہے)

مرد :۔ (عجیب مسرت سے آسمان کی طرف دیکھ کر) لو، چاند بھی نکل آیا اس کی مانند شعاعیں خاموش فضا کی نس نس میں رنگینی ہوتی بڑھ رہی ہیں (پھر شدتِ جذبات سے بے قابو ہو کر عورت کا ہاتھ تھامتے ہوئے) نہیں نہیں ___ وہ چاند نہیں ___ وہ تو سیاہ ریشمی برقعے سے نکلا ہوا تمہارا مرمریں ہاتھ ہے ___ (معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ) کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں ___ ؟!

عورت : (چاند کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے) ہاں ___

مرد :۔ (تعجب سے) تمہارا مرمریں ہاتھ نہیں ___ ؟!

عورت :۔ (کھوتے ہوئے) نہیں ___ ؟!

مرد :۔ (مسکراتے ہوئے) پھر کس کا ہے ___ ؟!

عورت :۔ (حسرت بھرے لہجے میں) وہ ..... وہ تو اس قزاق کا ___ ہاتھ ہے جو کسی معصوم کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے پیش قبض ڈھونڈ رہا ہو ___

(چاند بادلوں میں چھپ جاتا ہے)

مرد :۔ (سنجیدگی سے) نادر ___ !!

عورت :۔ (کھوتے ہوتے) کہو ___ !!

مرد :۔ (اسی انداز میں) تمہاری آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی ___

عورت :۔ (بے پروائی سے) تم کہہ رہے تھے تم نے کوئی خواب دیکھا ہے ___ ؟!

مرد :۔ (خوف زدہ ہو کر) ہاں ___

عورت :۔ (پھیکی ہنسی کے ساتھ) جانتے ہو، اس گھڑی کے خواب سچے ہوا کرتے ہیں ۔

مرد :۔ (اسی انداز میں) اچھا ___ ؟!

عورت :۔ (بناوٹی بے پروائی سے) تم نے دیکھا کیا ___ ؟!!

مرد :۔ (موضوع بدلتے ہوتے) پہلے بتاؤ تم اتنی اداس کیوں ہو ___ ؟! (اسے شانوں سے تھام کر اپنے سامنے کرتے ہوئے) آج تم نے میرے گلے میں اپنی باہیں نہیں ڈالیں ___ (افسردگی سے) تمہاری انگلیاں میرے بالوں میں نہیں الجھیں ___ کیوں ___ ؟!

(دقفہ بعد، باہر جھانک کر) چاند چھپ گیا، تم تاریکی سے کہیں ڈر تو نہیں رہیں ــــ؟!

عورت :۔ (بے پرواہی سے) مجھے اندھیرا اچھا لگتا ہے۔

مرد :۔ (پھر متجسس نگاہوں سے) تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ (التجا کرتے ہوئے) بتادو نا ــــ؟!!

عورت :۔ (پھیکی ہنسی کے ساتھ) کہہ جو دیا کچھ نہیں

مرد :۔ (یک دم خوفزدہ ہو کر) کتنا بھیانک خواب تھا ــــ (پیار بھرے لہجے میں) تم نے اچھا کیا جو مجھے جگا دیا۔

عورت :۔ (بے پرواہی سے) میں نے ــــ؟!

مرد :۔ (اسی انداز میں) ہاں ــــ تمہاری آہٹ نے ــــ

(چاند بادلوں سے پھر نکلتا ہے)

عورت :۔ (باہر دیکھ کر) لو وہ پھر نکلا ــــ

مرد :۔ (مدہوشی کے عالم میں) کیا ــــ؟!

عورت :۔ (بے پرواہی سے) تمہارا چاند ــــ؟!

مرد :۔ (چاند کی طرف دیکھ کر پھر مسرت سے سرشار ہوتے ہوتے) ہاں ــــ آج چاند چاند نہیں لگ رہا ــــ وہ تو کوئی سفید کبوتر ہے جو افلاک کی وسعتوں میں پرواز کر چکنے کے بعد تھک ہار کر اترنے کے لیے اپنے سارے کے گرد منڈلا رہا ہو ــــ تم سوچو گی وہ اپنی منزل کے کتنا قریب ہے ــــ

(چاند چھپ جاتا ہے)

عورت :۔ (کچھ عجیب بے پرواہی سے) وہ ...... وہ خواب کیا تھا ــــ؟!

مرد :۔ (خوفزدہ ہو کر) نہیں نہیں ــــ قسم کھاؤ تم مجھ سے اس خواب کا ذکر نہ کرو گی۔

عورت :۔ (پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ) بھلا یہ بھی کوئی بات ہے ــــ آخر خواب ہی تو ہے ــــ چلو، نہ سناؤ ــــ

مرد :۔ (اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر عجیب انداز میں) میں نے دیکھا، ایک ..... ایک عجیب سی شام ہے ــــ ہماری پی تھکی تھکی شاموں کی طرح نہیں ــــ بلکہ ــــ یہی شام ــــ ایسی شام گویا آسمان پر کسی نے تپتے ہوتے تانبے کا خول چڑھا دیا ہو ــــ (افسردگی سے) اور میں، کسی جھلسے ہوئے شہر کے ویران کھنڈروں میں لڑکھڑاتے قدموں سے بھاگتا چلا جا رہا ہوں، بھاگ رہا ہوں ــــ

عورت :۔ (پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ) دلچسپ ہے۔

مرد :۔ بغیر دھیان دیئے، جاری رکھتے ہوئے) افلاک کے ہموار وسیع فرشوں پر کاجل سی سیاہ شب کی بساط بچھنے لگی ــــ شکستہ ستونوں کے جامد سائے بڑھتے بڑھتے تاریکی میں گھل گئے ــــ دور کہیں جلتی شمعیں ایک ایک کر کے بجھنے لگیں ــــ زمین پر سوتے ہوئے کالے سیاہ غبار نے کروٹ بدلی اور بہت سے اژدھوں کی مانند بل کھاتا ہوا آسمان کی طرف اٹھنے لگا ــــ راستے دشوار ہوتے گئے میں بھاگ رہا ہوں ــــ بھاگ رہا ہوں ــــ

عورت :۔ (طنزاً) تمہیں خوف کس کا تھا ــــ؟!

مرد :۔ (شدتِ جذبات سے) م .... میں نہیں جانتا، میں نہیں جانتا ــــ (اپنے اردگرد دیکھ کر) کتنا اندھیرا ہے، کتنا ــــ (بتی جلانے کے

لیے بڑھتا ہے)

(چاند پھر نکلتا ہے)

عورت :۔ (بے پرواہی سے اس کا بازو تھامتے ہوئے) رہنے دو، چاند نکل آیا ہے۔

مرد :۔ (چاند کی طرف دیکھ کر اطمینان کا سانس لیتے ہوئے) آہ ـــــ تم سمجھو گی وہ کسی فرشتے کے پاؤں کا نقش ہے جو کہکشاں کی دھول پوپل بھر ستانے کے لیے اتر کر آسمان کی طرف اڑ گیا ہو ـــــ (حسرت بھرے لہجے میں) جب کبھی میں اُسے دیکھتا ہوں تو میرے دل کی تنہائی گہرائیوں سے بھی تاریکی رفع ہو جاتی ہے ـــــ مجھے محسوس ہونے لگتا ہے گویا لمحہ بھر کے لیے ساری کی ساری رات سمٹی سمٹاتی چاند کے سینے پر سیاہ داغ بن کے رہ گئی ہے اور چاند کی وسعت نے تمام کائنات کو منور کر دیا ہے ...... آہ مگر لیکن اس احساس کی مدت کتنی قلیل ہوتی ہے ....... پھر وہی سمٹی سمٹائی رات سیاہ مخمل کے تھان کی طرح بکھر جاتی ہے، اور چاند اس پر ٹنکا ہوا چاندی کا ایک محض ننھا سا پھول بن کے رہ جاتا ہے۔

"آخری چند فقروں کی ادائیگی کے دوران میں چاند پھر بادلوں میں چھپ جاتا ہے"۔

مرد :۔ (ٹھوڑی کو انگلی کا سہارا دے کر اس کا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے) نادر ـــــ !!

عورت :۔ (کھوتے ہوئے) ہوں۔

مرد :۔ (شدتِ جذبات سے) زرد چہرے پر تمہاری آنکھیں کتنی روشن ہیں ـــــ

عورت :۔ (اسی انداز میں) جب تم اپنا خواب سنا چکو گے تو میں تمہاری آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال دوں گی ...... تم گمان کرو گے "تم طلائی زنجیروں میں چمکتے ہوئے ستاروں سے کھیل رہے ہو ـــــ

مرد :۔ (ٹھٹھک کر) خواب ـــــ ؟! (خوف زدہ ہو کر) نہیں نہیں ..... خدا مجھے خواب سنانے کے لیے مت کہو۔

عورت :۔ (بہکے انداز میں) جب تم اپنا خواب سنا چکو گے تو میں تمہارے مضبوط بازوؤں کی گرفت اس قمری کی طرح پھڑ پھڑاؤں گی۔ جو جال سے نکلنے کی بیکار کوشش کر رہی ہو ـــــ

مرد :۔ (مغلوب ہو کر) آہ ـــــ کہاں تھا میں ـــــ ؟!

عورت :۔ (طنز بھری مسکراہٹ کے ساتھ) تم بھاگ رہے تھے ...... کسی کا خوف دل میں لیے۔

مرد :۔ (عجیب انداز میں) بھاگ رہا تھا ...... بھاگتے بھاگتے جانے کس طرف نکل گیا ...... دور تاریکی میں مجھے پھیکی سی روشنی نظر پڑی ... (مرتعش لہجے میں) غ .... غور سے دیکھتا ہوں تو شگاف میں رکھے ایک دیے کی ٹمٹماتی ہوئی لو ہے جو کسی بے باک طوائف کی انگلی کے اشارے کی طرح مجھے اپنی طرف آنے کو کہہ رہی ہے ... گرتا پڑتا قریب پہنچتا ہوں ... روشنی ایک شکستہ سی عمارت سے آ رہی ہے۔

عورت :۔ (دلچسپی لیتے ہوئے) تم اندر گئے کیا ؟!

مرد :۔ (اسی انداز میں) ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوتا ہوں اور ساتھ ساتھ اپنے آپ کو تسلیاں دیتا جاتا ہوں کہ یہاں کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں، کوئی بھی نہیں ... اپنے اردگرد دیکھتا ہوں تو مجھے تھوہر کی جھاڑیوں پر پڑے جھلسے ہوئے لاتعداد شہتیر، پتھروں کے انبار اور ..... اور ٹوٹے پھوٹے ستون دکھائی دیتے ہیں .... دیا پرے ٹمٹما رہا ہے .... سوچتا ہوں، کیا یہ کوئی مندر ہے، نہیں .... کسی کا مزار ہے ؟ نہیں ... پھر کیا ہے ؟ منڈا اس قدر روح فرسا ہے کہ دل بے اختیار کوئی چیخ سننے کو چاہتا ہے۔

عورت:۔ (وقفہ بعد) کہو کہو۔۔۔۔؟

مرد :۔ (خوف سے چیختے ہوئے) مجھ سے یہ خواب نہ سنو، مجھ سے۔۔۔۔

(چاند نکلتا ہے)

عورت:۔ (اس کی توجہ مبذول کراتے ہوئے) چاند پھر نکل آیا ہے۔

مرد :۔ (چاند کی طرف دیکھ کر مسرت سے سرشار ہوتے ہوئے) آہ۔۔۔۔ تم قسم کھاؤ گی وہ لکھنوتی خربوزے کی قاش ہے جس کا مزا تمہارے ہونٹوں کے لعاب کی طرح شیریں ہوتا ہے۔

عورت:۔ (بہکے انداز میں) جب تم اپنا خواب سنا چکو گے، تو میں تمہارے چہرے کو اپنے سیاہ بالوں میں چھپا لوں گی۔۔۔۔۔ (سرگوشی کے لہجے میں)۔۔۔ اور تمہارے کپکپاتے ہونٹوں پر اپنے گیلے گیلے لب رکھ دوں گی۔۔۔۔ تم سوچو گے تم ہلکے سنہری رنگ کی شراب پی رہے ہو اور تمہارے منہ سے لگے جام میں تیرتی گلاب کی دو تازہ پنکھڑیاں خود بخود تمہارے ہونٹوں سے الجھ گئی ہیں۔

(چاند چھپ جاتا ہے)

مرد :۔ (افسردگی سے) تم مجھے اذیت پہنچا کر خوش ہوتی ہو۔۔۔۔

عورت:۔ (بناوٹی پیار کے لہجے میں) ام ــــ نہیں ــــ

مرد :۔ (قدرے جرأت سے پھر جاری ہوتے ہوئے) سناٹے سے میرا دم گھٹا جا رہا ہے ــــ سوچتا ہوں، کوئی آواز، کوئی چیخ سنائی دے جاتے۔۔۔۔۔ (پھر خوف زدہ ہو کر) بھاری قدموں کی آہٹ گونجتی ہے (سرگوشی کے لہجے میں) ایک پتھر لڑھکتا ہوا میرے قریب سے نکل جاتا ہے، معاً میری نگاہیں شگافوں بھری گرد آلود دیوار کی طرف اٹھتی ہیں ــــ کسی قوی ہیکل جسم کا دیو قامت سایہ لحظہ بھر کے لیے کانپتا ہے۔ دیے کی پھیکی روشنی میں مجھے ستونوں میں پھنسی ایک سیاہ بھینس دکھائی دیتی ہے جو پچھلی ٹانگوں پر کھڑی اپنے مہیب سر کو سموں سے تھامے مجھے قہر بھری نظروں سے گھور رہی ہے۔۔۔۔۔۔ (نفرت، خوف کے ملے جلے جذبات ہیں۔۔۔۔) اُف، وہ پچکی ہوئی ناک، باہر کی طرف نکلے ہوئے چوڑے چوڑے سفید دانت، ابھرا ہوا پیٹ اور اس پر کھڑے ہوئے دھول میں اٹے بال۔۔۔۔۔ یقین کرو میں نے آج تک کسی بھینس کا اتنا توند پیٹ نہیں دیکھا ــــ (پھر مرتعش لہجے میں) ام۔۔۔۔ مجھے دیکھ کر وہ بھیانک آوازیں ٹکراتی ہے۔ اور پھر ایک۔۔۔۔ چٹان کی طرح مجھ پر آن گرتی ہے۔۔۔۔ اب بولنا چاہتا ہوں، مگر بول نہیں سکتا، چیخنا چاہتا ہوں، مگر چیخ نہیں سکتا۔

عورت:۔ (عجیب انداز میں) پھر ــــ؟!

مرد :۔ (اطمینان کا سانس لیتے ہوئے) بس، اسی تذبذب میں میری آنکھ کھل گئی۔۔۔۔۔ میں نے تمہیں اپنے سرہانے یوں ہی مغموم کھڑے پایا۔ اور۔۔۔۔ اور سچ، مجھے محسوس ہوا جیسے کچھ ہونے کو ہے ــــ

(طویل وقفہ، چاند نکلتا ہے)

مرد :۔ (چاند کی طرف دیکھ کر مسرت سے سرشار ہوتے ہوئے) آہ ــــ چاند نے پھر اپنی سیمیں چلمن سے جھانکا۔۔۔۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا وہ کسی بیمار شہزادی کا پاؤں ہے، اس بیمار شہزادی کا جو کنیزوں کے کندھوں کا سہارا لیے ابھی ابھی بستر میں سے اٹھی ہو تم کہو گی وہ اپنے پاؤں کو دودھ کی دھاروں تلے دھوتے جانے کے لیے بڑھا رہی ہے۔

(چاند چھپ جاتا ہے، وقفہ)

نادر ــــــ !!

عورت :۔ (کھوتے ہوئے) ہوں

مرد :۔ (اسے تھام کر) یہ مایوس سی رات ہم دونوں کے لیے کتنی موزوں ہے۔ (التجا کرتے ہوئے) رہ جاؤ، آج یہیں رہ جاؤ ــــ میں وعدہ کرتا ہوں، تمہیں اب کبھی الگ نہ ہونے دوں گا ــــ کبھی ــــ

عورت :۔ (برہمی سے) چھوڑ دو، مجھے جانا ہے۔

(عورت کچھ دیر کے لیے مرد کے بازوؤں کی گرفت میں پھڑپھڑاتی ہے۔ پھر اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیتی ہے۔ عورت کے بازو اس کی گردن کی طرف غیرارادی طور پر اٹھ جاتے ہیں۔

چاند ابھی تک بادلوں کے پیچھے ہے۔ کمرے کی فضا میں تاریکی منڈلا رہی ہے۔ ہر طرف موت کا سا سکوت طاری ہے۔

چند لمحوں بعد عورت اپنی سیاہ آستین میں سے کچھ نکالتی نظر آتی ہے۔ مرد مدہوشی کے عالم میں ابھی تک اس سے چمٹا ہوا ہے)۔

مرد :۔ نادر! تم نے مجھے بتایا نہیں، تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟!!

عورت :۔ (کھوتے ہوئے) کچھ ۔۔۔ کچھ بھی نہیں

(عورت نے اپنی آستین سے اب کچھ نکال لیا ہے۔ وہ اپنا ہاتھ بلند کرتی ہے اور بجلی ایسی سرعت کے ساتھ مرد کی گردن پر دے مارتی ہے۔ مرد کے ہاتھ شل ہو جاتے ہیں، قدم لڑکھڑا جاتے ہیں۔ عورت یک دم اسے تنہا چھوڑ کر دروازے کی طرف لپکتی ہے اور نیچے اتر جاتی ہے)

مرد :۔ (لڑکھڑاتے قدموں سے اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے، مرتعش لہجے میں) ــــــ یہ ۔۔۔ تم نے کیا کیا، نادر ــــ یہ تم نے ــــ

(کمرے میں کوئی خاص تبدیلی معلوم نہیں ہوتی۔ صرف شیشے کا گلاس نیچے گر کر چکنا چور ہوا پڑا ہے۔ آرام کرسی پر کپڑے بھی اسی بے ترتیبی سے دھرے ہیں اور مرد پلنگ کے قریب فرش پر اوندھے منہ ۔۔۔ مگر ہاں، جب چاند بادلوں کے پیچھے سے نکلتا ہے اور اس کی ماند شعاعیں کھڑکی کے رستے فرش پر پڑتی ہیں تو یوں دکھائی دیتا ہے، جیسے مرد کے ارد گرد کسی نے گلاب کی پنکھڑیوں کا ڈھیر لگا دیا ہو۔ لیکن کیا ان پنکھڑیوں میں مہک ہے؟!!

نومبر ۱۹۴۹ء

ہمارے شہروں میں جو ایسی ہوا چلی ہے
جو دن چڑھے پکارتی ہے
وہ نقطہ ڈھونڈو جو مرگیا ہے

انیس ناگی

عکس تحریر :۔ انیس ناگی

# انتظار گاہ

ادھیڑ عمر آدمی :- ایک معمولی صورت شکل کا عام سا آدمی

قلی :- سرخ رنگ کی وردی میں ملبوس

پہلا آدمی :- درمیانی عمر۔ چھوٹی سی داڑھی۔ شیروانی پاجامہ اور ٹوپی پہنے۔ عینک بھی لگاتا ہے۔

دوسرا آدمی :- بارُعب۔ اُونچے قد و قامت والا قیمتی اور کوٹ مفلر و بریف کیس اور پائپ جو سب اس کی شخصیت کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ گفتگو اور اٹھنے بیٹھنے میں نہایت سلیقہ شعار اور مہذب۔

تیسرا آدمی :- سنہری فریم کا چشمہ، اچھے کپڑے مگر کوٹ بغیر ٹائی کے بھرے بھرے جسم والا۔ عمر میں باقی سب سے بڑا۔

خاتون :- قیمتی شلوار قمیض میں ملبوس، ہاتھ میں پرس، سارے وہ انداز جو رئیس بیگمات کے ہوتے ہیں۔

نوجوان :- بائیس تیئیس برس کی عمر۔ چہرے سے ذہانت نمایاں۔ بڑے بال۔ شلوار قمیض اور کالی واسکٹ پہنے ہوئے۔

ریلوے گارڈ :- نہایت مشفق و مہربان چہرہ جس پر ہر گھڑی مسکراہٹ آنکھوں میں ایک متاثر کرنے والی چمک۔ ریلوے کی وردی میں ملبوس۔

مقام :- ایک ریلوے اسٹیشن کا پلیٹ فارم عقب میں انتظار گاہ کا دروازہ

وقت :- کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا کیا وقت ہے۔

ایک ریلوے اسٹیشن کا پلیٹ فارم۔ درمیان اسٹیج ایک نلکہ۔ دو تین بینچیں اور بائیں جانب سامان کی ایک بڑی لوہے کی ٹرالی۔ دائیں طرف چند بکسوں اور بندھے ہوئے مختلف قسم کے بستروں کا ڈھیر ـــ اسی طرف آخری سرے پر ایک لوہے کا اُونچا کھمبا جس پر بڑا سا کلاک لٹکا ہوا ہے جو بند ہے اور وقت بارہ بج کر دس منٹ دکھا رہا ہے۔

عقب میں ایک انتظار گاہ کا دروازہ جس پر اردو میں انتظار گاہ اور ساتھ ہی انگریزی میں WAITING ROOM جلی حروف میں لکھا ہوا ہے۔ دروازہ کے ساتھ دیوار پر فریم کیا ہوا ایک ہدایت نامہ ہے جس پر موٹے حروف میں "مسافروں کے لئے ضروری ہدایات" کے الفاظ لکھے ہیں۔ نیچے جو ہدایات درج ہیں وہ اتنی باریک لکھائی میں ہیں کہ دور سے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ اسٹیج کے سامنے کی جانب ریل کی پٹڑیاں ہوں گی۔ جب پردہ اُٹھتا ہے تو پہلی بنچ پر سنگی داڑھی اور چھوٹی چھوٹی مونچھوں والے ایک صاحب بیٹھے بڑے انہماک سے اپنے سامنے سے گزرتی ہوئی تیز رفتار ٹرین کو دیکھ رہے ہیں۔ دوسری بنچ پر ایک فربہ اندام ادھیڑ عمر کا آدمی منہ پر اخبار رکھے ٹانگیں آگے کی طرف پھیلائے نیم دراز ہے جیسے سو رہا ہو۔ گزرتی ہوئی ٹرین کا شور اس پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتا۔

ٹرین کی آواز جو پردہ اٹھنے کے ساتھ ہی بہت قریب سے سنائی دے رہی ہوتی ہے رفتہ رفتہ دُور ہوتی جاتی ہے۔ ابھی آواز مکمل طور پر فیڈ آؤٹ نہیں ہوئی کہ اسٹیج کے بائیں جانب سے ایک ادھیڑ عمر آدمی کچھ بوکھلایا سا داخل ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک سوٹ کیس اور ہولڈ آل اٹھائے ایک قلی ہے۔ وہ دونوں اسٹیج کو کراس کرتے ہیں اور بائیں جانب سامان کے ڈھیر کے پاس سے گزرتے ہوئے غائب ہو جاتے ہیں۔ گزرتے ہوئے ادھیڑ عمر آدمی چند لمحوں کے لئے ٹھہرتا ہے اور مُڑ کر قلی سے ہمکلام ہوتا ہے۔

ذرا جلدی میں ہوں۔ آپ نے سُنا ہی ہوگا ٹرین کے آنے کا اعلان ہو چکا ہے۔ مہربانی ایک ایک کرکے بتائیے ــــ پہلے آپ بتائیں ــــ آپ نے جانا کہاں ہے۔

ادھیڑ عمر آدمی :۔ کمال ہے۔ یعنی عجب ہے یہ تیسری ٹرین ہے جو بلا ٹھہرے اس طرح گزر گئی۔ آخر کوئی ٹرین اس اسٹیشن پر ٹھہرتی بھی ہے یا نہیں ــــ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ (اسٹیج پر سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے اپنی بیوی سے مخاطب ہو جو اس کے بچے کے ساتھ پلیٹ فارم کے کنارے کنارے چل رہی ہے۔ ہم انہیں دیکھ نہیں سکتے۔) ارے رے ــــ ہاجرہ۔ منّے کا ہاتھ تھامے رکھو ــــ دیکھو وہ بالکل کنارے پر پہنچ گیا ہے۔ پٹری پر نہ گر جائے ــــ (قلی سے جو اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا ہے) تم کیوں رُک گئے ــــ جلدی جلدی قدم بڑھاؤ ــــ ادھر اسٹال کے پاس سامان رکھ دو جا کر سائے میں جلدی سے ــــ کہیں کوئی اور نہ قبضہ کر لے جگہ پر . . . . (قلی تیزی سے آگے بڑھتا ہے اور وہ خود بھی سامنے کی جانب دیکھتا ہوا اسٹیج کی بائیں جانب آگے بڑھتا جاتا ہے)

ہاجرہ ــــ گود میں اٹھا لو منّے کو ــــ اور اِدھر آ جاؤ ــــ اسٹال کے پاس ــــ کہیں سایہ بھی نہ نکل جائے ہاتھ سے۔ جانے اور کتنی دیر انتظار کرنا ہے ابھی۔

[ جیسے ہی ادھیڑ عمر آدمی اسٹیج کے بائیں جانب نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ اس لمبے اوور کوٹ پہن رکھا ہے اور ہاتھ میں ایک بریف کیس ہے۔ گلے میں گرم مفلر اور منہ میں قیمتی پائپ جس میں سے دھواں نہیں نکل رہا ہے۔ آنے والا درمیان اسٹیج پہ آ کر ٹھہرتا ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھتا ہے اور پھر پہلا بنچ پہ بیٹھے ہوئے آدمی کے قریب آتا ــــ وہ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا جیسے اس کے آنے کا علم ہی نہ ہوا ہو ــــ آنے والا ذرا دیر متذبذب کھڑا رہتا ہے اور پھر اس بنچ پر بڑے تکلف کے ساتھ ذرا سا لگ کر بیٹھ جاتا ہے۔ پہلا آدمی دوسرے آدمی کی طرف دیکھتا ہے۔]

دوسرا آدمی :۔ (اوور کوٹ اور مفلر کو سنبھالتے ہوئے جیسے سردی سے بچاؤ کر رہا ہو) کڑاکے کی سردی ہے۔

پہلا آدمی :۔ (بہت اُونچی آواز میں جیسے بہت زیادہ شور و غل میں بولا جاتا ہے) آپ نے مجھ سے کہا کچھ؟

دوسرا آدمی :۔ (اس کی بلند آوازی پہ نا پسندیدگی کا تاثر دیتا ہے) جی نہیں تو ــــ

پہلا آدمی :۔ (اُونچی آواز میں) جی!

دوسرا آدمی :۔ (بے تعلقی سے) جی کچھ نہیں ــــ

پہلا آدمی :۔ کس قدر شور ہے یہاں۔ کان پڑی آواز سُنائی نہیں دے رہی ہے۔

دوسرا آدمی :۔ شور! (حیرت سے) مجھے تو کوئی شور سنائی نہیں دے رہا ہے۔

پہلا آدمی :۔ (سرک کر قریب آ جاتا ہے) آپ سن سکتے ہیں میری آواز؟

دوسرا آدمی :۔ جی یقیناً۔ بالکل صاف۔ آپ کو چلّانے کی ضرورت نہیں ہے۔

پہلا آدمی :۔ کمال ہے۔ آپ کو شور سنائی نہیں دے رہا!

دوسرا آدمی :۔ میں نے عرض کیا نہ میں بالکل صاف سن سکتا ہوں آپ کو۔ آپ بے شک سرگوشی میں بات کر کے دیکھ لیں۔

پہلا آدمی :۔ (سرگوشی میں) عجیب بات ہے۔

دوسرا آدمی :۔ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔

پہلا آدمی :۔ آپ یقیناً بہرے ہوں گے۔

دوسرا آدمی :۔ (مسکراتے ہوئے) کیوں؟

پہلا آدمی :۔ آپ کو شور سنائی نہیں دے رہا ہے۔

دوسرا آدمی :۔ اگر بہرہ ہوتا تو آپ کی سرگوشیاں کس طرح سن سکتا؟

پہلا آدمی :۔ ممکن ہے آپ دُور کے بہرے ہوں۔

دوسرا آدمی :۔ دُور کا بہرہ ــــ؟ وہ کیا ہوتا ہے۔

پہلا آدمی :- مجھے معلوم نہیں مگر جس طرح دُور اور نزدیک کی بینائی ہوتی ہے، شاید اسی طرح دُور اور نزدیک کی سماعت بھی ہوتی ہو۔

دوسرا آدمی :- یعنی ؟

پہلا آدمی :- یعنی جس طرح بعض لوگوں کی دور کی نظر کمزور ہوتی ہے مگر قریب کی نہیں ـــــ شاید اسی طرح آپ دُور کا شور نہیں سُن سکتے قریب کی آواز سُن سکتے ہوں ــــ ۔ اُف توبہ (کانوں میں انگلیاں دیتا ہے) میرے تو اس شور سے کان پھٹ جائیں گے۔

دوسرا آدمی :- (آہستہ سے) اور میرا دماغ پھٹ جائے گا آپ کی باتوں سے (مفلر اپنے کانوں کو لپیٹتا ہے جیسے سردی لگ رہی ہو)

پہلا آدمی :- دیکھا نا ـــ اب شور سُنا آپ نے ـ تب ہی تو کان بند کر رہے ہیں۔

دوسرا آدمی :- (اونچی آواز میں) میں سردی سے بچنے کے لئے کان بند کر رہا ہوں ـ اتنی یخ ہوا ہے کہ اگر کانوں کے راستے جسم میں پہنچ گئی تو نمونیہ ہو جائیگا۔

پہلا آدمی :- یخ ہوا ـــ ؟ یعنی آپ کا مطلب ہے کہ سردی ہے ــــ ؟

دوسرا آدمی :- آپ کو گرمی لگ رہی ہے۔

پہلا آدمی :- گرمی تو خیر نہیں ــــ بڑا خوشگوار موسم ہے۔ میں تو آپ کو اوور کوٹ میں دیکھ کر یہ سمجھا تھا کہ آپ شاید بیمار ہیں ـ مگر آپ نے جب یخ ہوا کی بات کی تو . . . (معنی خیز نظروں سے اسے دیکھتا ہے) شور آپ کو سنائی نہیں دیتا ــــ سردی آپ کو شدت سے محسوس ہو رہی ہے ـ مجھے تو لگتا ہے کہ شاید آپ . . . (کہتے کہتے رُک جاتا ہے)

دوسرا آدمی :- اور مجھے لگتا ہے کہ شاید آپ ـــــ (بریف کیس اٹھا کر کھڑا ہو جاتا ہے) غلطی میں نے یہاں بیٹھ کر غلطی کی۔

[دوسری بنچ کی جانب چلا جاتا ہے۔ پہلا آدمی اس کی طرف تھوڑی دیر دیکھتا رہتا ہے۔ دوسرا آدمی تیسرے آدمی کے قریب آتا ہے]

دوسرا آدمی :- معاف کیجئے ـ میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔

تیسرا آدمی :- (اسی طرح اخبار منہ پر رکھے نیم دراز ہے) جی ـ شوق سے۔

دوسرا آدمی :- (بیٹھتے ہوئے) شکریہ۔

(پائپ منہ سے لگاتا ہے ـ احساس ہوتا ہے کہ وہ بجھ چکا ہے ـ جیبوں میں ماچس تلاش کرتا ہے مگر نہیں ملتی ـ تیسرے آدمی سے مخاطب ہوتا ہے)

معاف کیجئے ماچس ہو گی آپ کے پاس ؟

تیسرا آدمی :- جی نہیں ـ میں سگریٹ نہیں پیتا۔

دوسرا آدمی :- اچھی بات ہے ـــ دراصل سگریٹ میں بھی نہیں پیتا۔ پہلے پیتا تھا ڈاکٹروں نے سختی سے ممانعت کی ـ اب صرف پائپ پیتا ہوں ـ (وقفہ) معاف کیجئے میں آپ کے آرام میں مخل تو نہیں ہو رہا ہوں۔

تیسرا آدمی :- (اخبار چہرے سے ہٹاتا ہے اور ذرا سیدھا ہو کر بیٹھ جاتا ہے) نہیں نہیں ـــ بلا تکلف گفتگو کیجئے ـ میں اس خاموشی، ورسناٹے سے عاجز آ گیا ہوں ـــــ ایسی خاموشی تو میرے تصور میں بھی نہیں آئی تھی کبھی ـــ وحشت ہو رہی تھی مجھے اس سناٹے سے ـــ آپ بولتے رہیئے ـ شاید آپ کی گفتگو سے ہی یہ وحشت کم ہو کچھ ! (پہلی بار دوسرے آدمی کی طرف دیکھتا ہے)

دوسرا آدمی :- (اُسے دیکھتے ہوئے جیسے کچھ یاد کر رہا ہو) آپ کا چہرہ ــــ آپ کا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگتا ہے۔

تیسرا آدمی :- (سنبھل کر بیٹھتا ہے) آپ ـــ ! (جیسے پہچان گیا ہو) آپ ایچ ـ یو جیلانی ہیں نا ـــ

دوسرا آدمی :- جی ـ جی ہاں ـــ مگر آپ . . .

تیسرا آدمی :- میرا نام ستار بھانڈے والا ہے ـ کئی بار میٹنگوں میں ملاقات ہوئی آپ سے، بس دُور ہی دُور سے ــــــ ایک بار عرفانی صاحب کے ساتھ آپ کے دفتر میں بھی حاضر ہوا تھا۔ ایک چھوٹے سے کام کے سلسلہ میں . . . . اب پہچانے مجھے آپ سر ؟

دوسرا آدمی :- ہاں ہاں ـ یاد آ گیا ـ میں بڑا مصروف تھا اس روز جب آپ عرفانی کے ساتھ تشریف لائے تھے ــــ وہ کام تو ہو گیا تھا نا آپکا ؟

تیسرا آدمی :- جی سر ـــ ہو گیا تھا کام ــــ میں نے عرفانی صاحب کے ہاتھ بعد میں ایک چھوٹی سی چیز بھی بھجوائی تھی ـــ مل گئی تھی نا آپ کو سر ـــ ؟

دوسرا آدمی :۔ وہ ۔۔۔ میرا خیال ہے ۔۔ ہاں ۔۔ مل ہی گئی ہوگی ۔ ۔ ۔ ۔ جی مجھے یاد آیا مل گئی تھی ۔۔۔ آپ کب سے یہاں بیٹھے ہیں؟

تیسرا آدمی :۔ کب سے ؟ کچھ یاد نہیں سر ۔۔۔ اس سناٹے نے میری تو جیسے یادداشت ختم کردی ہے ۔۔۔ آپ کب تشریف لائے؟

دوسرا آدمی :۔ ابھی آ رہا ہوں۔

تیسرا آدمی :۔ مگر یہ آپ کو سوجھی کیا ریل کے سفر کی ۔۔ ؟ (ہنستا ہے) کہیں آپ سر ڈرنے تو نہیں لگے ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہوئے۔

دوسرا آدمی ۔ (مسکرا کر) نہیں بھئی ۔۔ اور اگر ڈریں بھی تو کون سا حکومت ہم کو اجازت دے دے گی ریل سے سفر کرنے کی ۔ سرکاری ملازمت میں یہی دشواری ہے کہ آپ لوگوں کی طرح انسان اپنی مرضی کا مالک نہیں ہوتا۔

تیسرا آدمی :۔ تو پھر سر ۔۔۔ آپ یہاں کس طرح ؟ کسی کو لینے آئے ہیں ؟

دوسرا آدمی :۔ نہیں تو ۔۔۔ (خالی پائپ منہ سے لگاتا ہے) مجھے تو خود کچھ ٹھیک طرح معلوم نہیں ۔ دراصل جانا تو مجھے ہوائی جہاز سے ہی تھا ۔۔ شام کو ائیرپورٹ کے لئے روانہ ہوا ۔۔۔ میں نے شرافت کو راستے میں کہا بھئی کہ احتیاط سے چلاؤ گاڑی آج کل ایکسیڈینٹ بہت ہو رہے ہیں ۔ مگر کم بخت ایک شوقین تیز رفتاری کا ۔۔۔ بڑی سڑک سے موڑ کاٹتے ہوئے سامنے سے ایک ٹرک سے ٹکر ہوئی اور ۔ ۔ ۔ پھر ۔ ۔ ! (سوچتے ہوئے) شاید پلین نکل گیا اسی دیر سویر میں ۔۔ ہاں ! میرے سیکرٹری نے ریل کے ذریعہ ۔ ۔ ۔ ۔ (جیسے کچھ یاد نہیں آ رہا ہو) یا شاید میں نے ہی اس سے کہا کہ (ہنستا ہے) سرکاری افسری میں ایک بڑی قباحت یہ بھی ہے کہ آدمی کو خود کچھ یاد نہیں رہتا ۔ سب کچھ اس کے پرائیویٹ سیکرٹری کی یادداشت میں محفوظ ہوتا ہے ۔ بہرحال یہ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت میں اس انتظارگاہ کے سامنے اس بنچ پر آپ کے ساتھ بیٹھا ہوں ۔۔ اور سفر پر ہوں (ہنستا ہے ۔ تیسرا آدمی بھی اس کی دیکھا دیکھی ہنستا ہے)

تیسرا آدمی :۔ اس کے کچھ فائدے بھی ہیں سر ۔۔ آپ اپنے فیصلوں اور سوچوں کا سارا بوجھ منتقل کر دیتے ہیں اپنے سیکرٹریوں اور ماتحتوں کے ذہن پر ۔۔ ہم تجارت پیشہ لوگوں کے دماغوں میں جو ہر وقت سڑک کوٹنے والا انجن سا چلتا رہتا ہے ۔۔۔ آپ اس سے محفوظ ہیں ۔۔ ہمیں تو نہ جانے کتنی سلیپنگ پلز کھانی پڑتی ہیں ہر رات اس شور کو کم کرنے کے لئے ۔۔

دوسرا آدمی :۔ آپ اکثر ریل سے سفر کرتے ہیں ؟

تیسرا آدمی :۔ جی ہمیشہ تو نہیں سر ۔۔ کام اور مقام پر منحصر ہے ۔ اس بار تو میرا ارادہ لمبا آرام کرنے کا تھا ۔ سوچا تھا سلیپنگ پلز کھا کر آرام سے سو جاؤں گا ائیرکنڈیشنڈ کوچ میں ۔۔۔ پر جانے کیا ہوا ۔۔ شاید اوور ڈوز ہوگیا یا کیا ۔۔۔ ذہن جیسے بالکل سو سا گیا ۔۔ اور ہر طرف سناٹا پھیل گیا ۔ کچھ عجیب وحشت سی ہو رہی ہے ، سر مجھے اس خاموشی اور سکوت سے ۔۔۔ !

پہلا آدمی :۔ (زور سے چلاتا ہے اور ساتھ ہی کانوں پر ہاتھ رکھتا ہے) کوئی بند نہیں کرا سکتا یہ شور ۔۔ ؟

(دونوں پلٹ کر اس کی طرف دیکھتے ہیں ۔ دوسرا آدمی تیسرے آدمی کو اشارہ سے سمجھاتا ہے کہ اس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہے ۔)

تیسرا آدمی :۔ میرا بھی یہی خیال ہے ۔ جب سے میں آیا ہوں اسے اسی طرح کی حرکتیں کرتے دیکھ رہا ہوں ۔۔۔ بھلا کیا ہے ۔۔ اس جان لیوا سکوت اور ناقابلِ برداشت خاموشی میں اسے شور سنائی دے رہا ہے ۔

(دوسرا آدمی اپنے اوورکوٹ کا کالر گلے پر اچھی طرح پھیلاتا ہے ۔)

آپ کو سردی لگ رہی ہے ؟ ۔۔۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی سر ؟

دوسرا آدمی :۔ میں بالکل اچھا ہوں ۔۔۔ سردی ہی غضب کی ہے ۔۔۔ (وقفہ) آپ نے یہ نہیں بتایا آپ کے کاروبار کا کیا حال ہے ۔

تیسرا آدمی :۔ کون سا کاروبار ! کوئی ایک تو نہیں ہے سر ۔۔ آپ کی دعا سے دس بارہ مختلف پروجیکٹس میں ہاتھ ہیں ۔

دوسرا آدمی :۔ پھر بھی کوئی مین لائن تو بہرحال ہوگی ۔

تیسرا آدمی :۔ جی بس ٹیکسٹائل کو سمجھ لیجئے مین لائن ۔۔ مگر اب رفتہ رفتہ اس کام کو کم کر رہے ہیں ہم ۔

دوسرا آدمی :۔ کیوں آخر ؟

تیسرا آدمی :۔ منافع نہیں رہا اس میں زیادہ سر ۔۔ پھر یونینوں نے بڑا تنگ کیا ہے ۔ آئے دن ورکر گڑبڑ کرتے رہتے ہیں ۔ ہر روز نت نئے

مطالبات کی فہرست سامنے آتی ہے۔ منافع کم اور وقت کا ضیاع زیادہ ـــــ اس لئے آپ سمجھ لیں سر کہ ہم تو بس تقریباً وائنڈ اپ ہی کر رہے ہیں۔ حالانکہ ہمیں احساس ہے کہ ملک کو ضرورت ہے اس صنعت کی مگر اب ہم نے ہی تو ٹھیکہ نہیں لیا ناملکی ضروریات کا ــ پہلے تو اپنی ذات کا انٹریسٹ ہوتا ہے ہر انسان کو سر ـــــ آخران ورکرز ان مزدوروں کو کیوں نہیں ہے ملک کا درد جو ہمیں اتنا تنگ کرتے ہیں کہ آج ہم اس بات پر مجبور ہو گئے ؟ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا سر ــ ؟

دوسرا آدمی :۔ ہم تو میں کوئی رائے نہیں دے سکتا اس سلسلہ میں ـــ ہم سرکاری ملازمین کی ٹریننگ کسی اور ہی طرح کی ہوتی ہے ـــ ہم ہمیشہ سرکار کے مفاد میں سوچتے ہیں۔

تیسرا آدمی :۔ اور آپ کا اپنا مفاد ــ ؟

دوسرا آدمی :۔ ہم تو سرکاری آدمی ہیں ـــ تو پھر ہمارا اور سرکار کا مفاد دو الگ چیزیں تو نہ ہوئیں نا۔

تیسرا آدمی :۔ بجا ارشاد فرمایا سر آپ نے ـــــ دوسرے لفظوں میں آپ صرف اپنے مفاد میں سوچتے ہیں چونکہ سرکاری آدمی ہونے کی حیثیت سے وہی حکومت کا مفاد بھی ہوگا ـــــ بہت اچھی منطق ہے سر ـــــ جانے اتنی معمولی سی بات آج سے پہلے میری سمجھ میں کیوں نہیں آئی تھی۔

(ایک خاتون انتظارگاہ کے دروازے سے برآمد ہوتی ہیں وہ بہت پریشان ہیں اور اس طرح چل رہی ہیں جیسے راستہ نظر نہ آرہا ہو۔)

خاتون :۔ اُف میرے خدا ـــ کتنا اندھیرا ہے ـــــ کچھ دکھائی نہیں دے رہا ـــــ یہ کیسا اسٹیشن ہے ـــ (چلتے چلتے گرتے ہوئے بچتی ہے اور پہلی بنچ کے قریب آجاتی ہے۔ پہلا آدمی جلدی سے اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

پہلا آدمی :۔ اِدھر ـــــ اس طرف خاتون ـــــ آپ یہاں بنچ پر تشریف رکھیں۔ یہاں کافی روشنی ہے۔

خاتون :۔ روشنی ـــــ کہاں ہے روشنی ؟ (آہستہ آہستہ آکر بنچ پر بیٹھتی ہے) مجھے تو ہر طرف گہرا اندھیر نظر آرہا ہے۔

پہلا آدمی :۔ آپ غالباً بہت دیر سے اندر ویٹنگ روم میں بیٹھی تھیں۔ وہاں کا اندھیرا آپ کی آنکھوں میں کُھب گیا ہے ـــ آپ یہاں کچھ دیر آنکھیں بند کر کے بیٹھیں اور اعصاب کو سکون دینے کی کوشش کریں۔ اگر اس شور اور ہنگامہ میں ایسا کر سکتی ہیں تو . . .

خاتون :۔ کیسا گھُپ اندھیرا ہے ـــ میں نے ایسی تاریکی اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی ـــ اگر آپ ہاتھ پکڑ کر نہ لاتے تو میں یہاں تک بھی نہ پہنچتی۔

پہلا آدمی :۔ آپ آرام کریں تھوڑی دیر ـــــ تنہا اس بنچ پر دراز رہیں ـــ مکمل سکون ـــــ اور آرام ـــ کی ضرورت ہے آپ کو۔ (آہستہ آہستہ وہاں سے چلتا ہے اور دوسری بنچ کے قریب آجاتا ہے۔ جہاں تیسرا اور دوسرا آدمی بیٹھے غور سے اس خاتون کی طرف دیکھ رہے ہیں۔)

دوسرا آدمی :۔ شکل تو کچھ جانی پہچانی سی لگتی ہے مگر یاد نہیں آرہا کہ کہاں دیکھا ہے ان کو ـــ

پہلا آدمی :۔ لیجئے ان کو نہیں پہچانتے آپ ؟ کمال ہے ـــــ ان کی شخصیت تو سارے ملک میں جانی پہچانی جاتی ہے ـــ مشہور زمانہ سماجی کارکن بیگم . . .

دوسرا آدمی :۔ (بات کاٹ کر) اوہ ہاں ـــــ سمجھ گیا ـــــ بالکل سمجھ گیا۔

تیسرا آدمی :۔ میں نے اخباروں میں تصویر دیکھی ہے ان کی ایک آدھ بار ـــــ

پہلا آدمی :۔ ایک آدھ بار ـــــ ؟ ارے صاحب ان کی تو ہر روز اخبار میں تصویر ہوتی ہے ـــ بلکہ بعض اوقات تو ایک اخبار میں دو دو تین تین تصویریں ہوتی ہیں۔

دوسرا آدمی :۔ پچھلے دنوں جو فیشن شو ہوا تھا۔ وہ بھی غالباً انہوں نے ہی کرایا تھا۔

پہلا آدمی :۔ اجی ایک شو کی بات کرتے ہیں آپ ـــــ ہر قسم اور ہر طرح کا شو یہی کراتی ہیں۔ فیشن شو، بے بی شو، فلاور شو، ڈاگ شو۔

دوسرا آدمی : اور وہ پاسنگ شو قسم کا آدمی ان کا شوہر ہے۔

پہلا آدمی : یہ نہیں تھا ـــ جب ان کی سیاست کا ستارہ زوال پذیر ہوا تو انہوں نے اس سے طلاق لے لی اور ایک بہت بڑے افسر سے شادی کر لی ـــ

تیسرا آدمی : لیکن اس وقت اتنی پریشان حالت میں کیوں ہیں یہ؟

پہلا آدمی : مجھے تو لگتا ہے آنکھوں پر کسی قسم کا اثر ہو گیا ہے ان کی ۔ بار بار یہی کہہ رہی کہ گہرا اندھیرا ہے ہر سمت ـــ

دوسرا آدمی : جس طرح آپ فرما رہے تھے اُس وقت کہ شور ہے ہر طرف ـــ

پہلا آدمی : تو کیا آپ کو ابھی شور کا احساس نہیں ہوا، کمال بات ہے ۔ میرے تو کان پھٹے جا رہے ہیں ۔ الہٰی توبہ (کانوں پر ہاتھ دھرتا ہے) (جانے لگتا ہے ۔ تیسرا آدمی ہاتھ پکڑ کر روکتا ہے)

تیسرا آدمی : کہاں جا رہے ہیں ۔ یہاں تشریف رکھیں ۔ ان کو آرام کرنے دیں۔

خاتون : (آپ ہی آپ) میرے اللہ ـــ تھوڑی سی روشنی ـــ ایک کرن روشنی کی میرے مالک ـــ اف یہ تاریکی ـــ اندھیرا ـــ

پہلا آدمی : مجھے جانے ہی دیں ـــ شاید ان کو کس چیز کی ضرورت ہو۔

تیسرا آدمی : انہیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ آپ نہیں دے سکتے ـــ وہ اس اُجالے میں روشنی کی کرن مانگ رہی ہیں منشی بقاالدین۔

پہلا آدمی : ہائیں ـــ یعنی آپ میرا نام جانتے ہیں۔

تیسرا آدمی : بیس برس آپ کے یتیم خانے کے لئے چیک کاٹتا رہا ہوں آپ کے نام میں . . . .

پہلا آدمی : آپ ـــ ؟ میرا مطلب ہے آپ کی تعریف!

دوسرا آدمی : مشہور صنعتکار اور تاجر سیٹھ ستار بھانڈے والا . . .

تیسرا آدمی : اور آپ ہیں مسٹر ایچ ۔ یو جیلانی ۔ حکومت کے شعبۂ . . . .

پہلا آدمی : ارے سے ان کو کون نہیں جانتا ـــ معاف کیجئے گا حضور ۔ اس وقت بے خیالی میں اگر میں نے کچھ ایسی بات کہدی ہو جو ناگوار خاطر گزری ہو ۔ میرا مدعا ہر گز . . .

دوسرا آدمی : کوئی بات نہیں ہے ـــ آپ جیسے عوامی خدمت گار ـــ خدا ترس اور رفاہ عام کے کارکن کے منہ سے اگر کوئی بات نکل بھی گئی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ۔ ہم سرکاری ملازمین کو تنقید برداشت کرنے کی عادت ہوتی ہے ۔ دراصل ہمیں تربیت ہی کچھ ایسی دی جاتی ہے کہ ہر قسم کی تنقید سن سکیں ۔ مگر کریں وہی جو ملکی مفاد میں ہو۔

پہلا آدمی : جی سمجھتا ہوں میں ـــ ابھی پچھلے دنوں اخباروں میں کافی لے دے ہوئی تھی آپ کے محکمہ کی ـــ آپ کا نام بھی موث کر دیا تھا کمبختوں نے خرد برد اور بے ضابطگی کے سلسلہ میں . . . . میرے پاس بھی آیا تھا ایک نمائندہ کسی اخبار کا کہ آپ کے خلاف بیان دوں۔

تیسرا آدمی : آپ کے پاس آیا تھا ـــ ؟ ان کے خلاف بیان لینے ؟ مگر یہ کیوں؟

پہلا آدمی : ارے صاحب ان اخبار والوں کو سب خبر ہوتی ہے ـــ کچھ عرصہ پہلے جیلانی صاحب نے زمین کا ایک قطعہ ہمیں دینے سے انکار کر دیا تھا ۔ یتیم خانہ عوام الناس کی برانچ کھولنے کے لئے ـــ تو بس ہماری رنجش تھی۔

تیسرا آدمی : اوہ ۔ سمجھا۔

پہلا آدمی : جی تو بس ـــ وہ مجھ سے بیان چاہتے تھے کہ جیلانی صاحب سے وہ قطعہ زمین یتیم خانے کو دینے کی بجائے اپنے ایک داماد کو الاٹ کرا دیا جہاں اب شاپنگ پلازہ زیر تعمیر ہے۔

تیسرا آدمی : چلیئے ۔ یہ تو کوئی رنجش کی بات نہ ہوئی منشی بقاالدین ـــ اس سے پہلے آپ نے بھی تو وہ زمین جو اسپتال کی تعمیر کے لئے

دی گئی تھی۔ آپ کے ادارے کو آپ نے ہماری نئی برتن بنانے والی فیکٹری کے اسٹورز کی تعمیر کے لئے فروخت کر دی تھی۔

پہلا آدمی :۔ (ہنستا ہے) جی۔۔ جی ہاں۔ بس کچھ ایسے ہی تھا۔ اسی لئے تو میں نے بیان ویان دینے سے صاف انکار کر دیا۔ ویسے اس زمین کے سلسلہ میں، تا ہم ضرور عرض کروں گا کہ آپ نے جس موثر انداز میں دلائل دے کر یہ ثابت کیا تھا کہ برتنوں کی فیکٹری کی تعمیر اسپتال سے زیادہ ضروری ہے، وہ کچھ آپ ہی کا حصّہ تھا۔

دوسرا آدمی :۔ تو کیا صرف یہی وجہ تھی زمین ان کے ہاتھ فروخت کرنے کی؟

پہلا آدمی :۔ جی ویسے تو چند ایک وجوہات اور بھی تھیں۔ مگر کاغذ پر جو دلیل درج ہوئی وہ یہی تھی۔

خاتون :۔ (دوسری بنچ پہ بیٹھے بیٹھے) روشنی ۔۔ روشنی ۔۔ کوئی کچھ کرتا کیوں نہیں اس سلسلہ میں۔ آخر اس اسٹیشن کے منتظم کہاں ہیں سب ۔۔

(ایک نوجوان جو شلوار قمیض اور کالی واسکٹ پہنے ہوئے ہے دائیں جانب سے داخل ہوتا ہے۔ وہ بار بار رومال سے اپنی ناک بند کرتا ہے جیسے بو سے بچنا چاہتا ہو۔)

پہلا آدمی :۔ میں دیکھتا ہوں ذرا جا کر۔۔۔ بیگم صاحبہ کچھ زیادہ ہی پریشان معلوم ہوتی ہیں۔

(دوسری بنچ سے چل کر ان کے قریب آتا ہے۔ اب داخل ہونے والا نوجوان بنچ کے سامنے سے گزر رہا ہے)

جی۔ بیگم صاحبہ۔۔

خاتون :۔ میں کہتی ہوں اس بات کی تحقیقات ہونی چاہیئے۔

(نوجوان گزرتے گزرتے تحقیقات کا لفظ سن کر رُک جاتا ہے اور پلٹ کر خاتون کے قریب آتا ہے)

نوجوان :۔ جی محترمہ۔ کیا فرمایا آپ نے تحقیقات؟ کس چیز کی تحقیقات؟

خاتون :۔ اندھیرے کی۔۔۔ معلوم تو ہونا چاہیئے قصور کس کا ہے۔ ریلوے والوں کا۔ یہ بجلی والوں کا ۔۔۔ یہ دونوں محکمے عوام کے پیسے سے چلتے ہیں ۔۔۔ ٹیکس ادا کرتے ہیں ہم اپنی سہولت کے واسطے ۔۔۔ اس طرح من مانی کرنے کی اجازت کسی کو نہیں ملنی چاہیئے۔

نوجوان :۔ (جیب سے پنسل اور چھوٹی سی نوٹ بک نکالتا ہے۔ اور بنچ پر ایک پاؤں رکھ کر آدھا جھک کر کھڑا ہو جاتا ہے) میں سو فیصدا تفاق کرتا ہوں آپ سے۔ ہر ادارہ، ہر پبلک سروس ڈیپارٹمنٹ عوام کے سامنے جوابدہ ہے۔ ہمارا فرض ہونا چاہیئے کہ ان سب من مانی کرنے والوں کو بے نقاب کریں۔ آپ مجھے تفصیلات بتایئے۔ کل صبح روزنامہ جرأت اظہار میں جلی حروف سے یہ خبر شائع ہوگی۔

خاتون :۔ (ذرا سنبھل کر بیٹھتی ہے اور بال درست کرتی ہے اور پرس سے ٹشو پیپر نکال کر ماتھا اور ہونٹ پونچھتی ہے) آپ اخبار سے ہیں۔

نوجوان :۔ جی محترمہ ۔۔۔ روزنامہ جرأت اظہار کا نمائندہ خصوصی۔

پہلا آدمی :۔ ان کو پہچانتے نہیں آپ ۔۔۔ مشہور سماجی کارکن بیگم . . . .

نوجوان :۔ اوہ بیگم صہبائی۔ سابق وزیر . . . .

پہلا آدمی :۔ نہ نہ ۔۔۔ بیگم صہبائی نہیں ۔۔۔ بیگم خان . . . صہبائی صاحب کے وزارت سے الگ ہونے کے بعد انہوں نے حاب۔ خان سے شادی کر لی تھی۔

نوجوان :۔ اوہ معاف کیجئے گا بیگم صاحبہ۔۔ مجھے علم نہیں تھا ۔۔ ہاں تو آپ تحقیقات کے سلسلہ میں فرما رہی تھیں کچھ۔۔؟ کس کی تحقیقات اور کس سلسلہ میں؟

خاتون :۔ (ایک بار پھر بال ٹھیک کرتی ہے) آپ کے ساتھ فوٹوگرافر تو ہوگا نا۔

نوجوان :۔ جی نہیں ۔۔ دراصل میں ڈیوٹی پہ نہیں ہوں۔ میں کافی عرصہ سے اسپتال میں داخل تھا۔ یہ جو ریلوے اسٹیشن کے سامنے

بڑا اسپتال ہے نا اس میں ـــــ (رومال ناک پہ رکھتا ہے)

پہلا آدمی :- تب ہی اتنے بہت دنوں سے آپ کے اخبار کے سٹے سیج میں چونکا دینے والی تلخ و ترش خبریں نہیں چھپ رہی ہیں ـــــ خیریت تو ہے۔ کیا بیماری کا ہے!

نوجوان :- معلوم نہیں ہو سکا اب تک مرض ـــ سچی بات ہے میں تو اس اسپتال سے بہت گھبراتا ہوں۔

خاتون :- اسپتالوں کی حالت تو روز بروز خراب ہی ہوتی جا رہی ہے۔ مگر میں نے سنا ہے اس اسپتال میں تو اچھے اور قابل ڈاکٹر ہیں۔

نوجوان :- جی ہیں تو ـــ مگر وہ اسپتال کے مریضوں کو نہیں دیکھتے۔ ان کا زیادہ وقت پرائیوٹ مریضوں پر صرف ہوتا ہے۔ اسپتال پر توجہ کم ہی ہے۔

پہلا آدمی :- بجا ارشاد فرمایا آپ نے ـ گزشتہ دنوں میرا ایک آپریشن ہونا تھا۔ یقین جانیے جب تھیٹر میں لے کر گئے مجھے ـــــ اور جو میں نے حالت دیکھی وہاں ـــ یقین جانیے میرا تو جیسے وہ زنگ لگے آلات دیکھ کر ہی دم نکل گیا۔

نوجوان :- آپ یتیم خانہ عوام الناس کے مہتمم تو نہیں ہیں۔

پہلا آدمی :- جی ـ خادم کو منشی بقاء الدین کہتے ہیں۔

نوجوان :- ارے ہاں ـ مجھے یاد پڑتا ہے آپ ہی کے آپریشن کے سلسلہ میں ہم نے ایک اسٹوری چھاپی تھی اس اسپتال کے بارے میں ـ اس پر سرکار نے تحقیقات کا حکم بھی دیا تھا ـ مجھے اب یاد نہیں کہ اسٹوری کیا تھی۔ پر تھی کچھ اسپتال کی بے ضابطگیوں کے بارے میں آپ کی موت ـــ اوہ معاف کیجئے گا آپ کے آپریشن کے حوالے سے۔

خاتون :- تو پھر اگر فوٹو گرافر، نہیں ہے اور آپ ڈیوٹی پر بھی نہیں ہیں تو . . . .

نوجوان :- جی کوئی حرج نہیں ـــــ مجھے اسپتال میں دوست ملنے آتے رہتے ہیں۔ میں انہیں فراہم کر دوں گا سارا مواد ـــــ

پہلا آدمی :- آپ تشریف تو رکھیں ـــ

نوجوان :- (بیٹھ جاتا ہے) شکریہ ـــ (ناک پر پھر رومال رکھتا ہے)

پہلا آدمی :- آپ اسپتال میں داخل ہیں تو یہ اسٹیشن پر کیا کر رہے ہیں۔

نوجوان :- بس یونہی ـ دراصل وہاں اس قدر بدبو ہے کہ میرا دم گھٹا جاتا ہے۔ میں کئی دن برداشت کرتا رہا۔ آج موقع پاکر کر کوئی دیکھ نہ رہا ہو ذرا کھلی ہوا میں نکل آیا۔ مگر اس بدبو نے یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑا۔ میں سمجھتا تھا کہ اسپتال میں پھیلی ہوئی ہے بو ـــ مگر لگتا ہے یہ سارا علاقہ ہی اس کی زد میں ہے۔ میرا تو دماغ اڑا جا رہا ہے (پھر ناک پر رومال رکھتا ہے)

خاتون :- بو ـــــ (ناک سکیڑ کر سونگھتی ہے) کیسی بو ـــ ؟

نوجوان :- سڑے ہوئے گوشت کی بو۔

خاتون :- کمال ہے ـــ مجھے تو نہیں آ رہی ـــــ یا شاید لوڈی اسپرے کی وجہ سے (پرس کھول کر ایک پرفیوم کی شیشی نکالتی ہے) لیجئے یہ لگائیے۔ آپ کی ناک میں بس گئی ہے یہ بو۔ اس سے ٹھیک ہو جائے گی۔

(نوجوان شیشی لے کر اسپرے کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر اسپرے کام نہیں کر رہا ہے۔)

پہلا آدمی :- لائیے مجھے دیں (وہ بھی کوشش کرتا ہے مگر ناکام) یہ تو کام نہیں کر رہا ہے بیگم صاحبہ۔

خاتون :- کیسے ؟ (اندھیرے میں جیسے ٹٹول کر ہاتھ بڑھاتی ہے) لائیے مجھے دیں۔

(پہلا آدمی اس کی طرف شیشی بڑھاتا ہے جو لیتے ہوئے خاتون کے ہاتھ سے گر جاتی ہے۔ مگر پکے فرش پر اتنی بلندی سے گرنے کے باوجود ٹوٹتی نہیں)

نوجوان :- کمال ہے ـــــ شیشی ٹوٹی نہیں۔

(پہلا آدمی اور نوجوان دونوں سٹیشنی اٹھانے کے لئے جھکتے ہیں مگر اناؤنسمنٹ کی آواز سُن کر اسی طرح درمیان میں رُک جاتے ہیں۔)

اناؤنسمنٹ کی آواز :- (جیسی ریلوے اسٹیشنوں پر لاؤڈ اسپیکرز سے اعلان ہوتا ہے) آنے والی ایکسپریس اَپ۔ فردوس میل پلیٹ فارم نمبر چار پر پہنچنے والی ہے۔

(دوسری بنچ سے دوسرا آدمی اور کوٹ میں سردی سے سکڑتا پہلی بنچ کے قریب آتا ہے۔)

خاتون :- یہ پلیٹ فارم نمبر چار کہاں ہے۔

پہلا آدمی :- معلوم نہیں۔

دوسرا آدمی :- (قریب آچکا ہے) آپ کو علم ہے یہ پلیٹ فارم جس پر ہم ہیں کون سے نمبر کا ہے۔

نوجوان :- جی نہیں تو ــــ مگر نمبر چار نہیں ہے ــــ چار نمبر غالباً اُس طرف ہے۔

پہلا آدمی :- اوہ ــــ یعنی آپ کا مطلب ہے۔ چار نمبر پلیٹ فارم پر پہنچنے کے لئے اس پُل سے گزرنا ہوگا (ہاتھ سے اسٹیج کے بائیں جانب اشارہ کرتا ہے۔)

نوجوان :- مجھے تو ایسا ہی گمان ہوتا ہے ــــ ویسے ریلوے کے کسی آدمی سے دریافت کرنا پڑے گا۔

دوسرا آدمی :- ریلوے کا تو کوئی آدمی مجھے ابھی تک یہاں نظر ہی نہیں آیا۔

خاتون :- مگر اس اندھیرے میں یہ پل کیسے پار کریں گے ہم۔

دوسرا آدمی :- آپ کا اندھیرا دور نہیں ہوا ابھی تک۔

خاتون :- (ذرا ناگواری سے) یہ کون صاحب ہیں جو اس قدر بے تکلفی سے گفتگو فرما رہے ہیں۔

پہلا آدمی :- اوہ معاف کیجئے گا بیگم خان میں نے تعارف نہیں کرایا آپ کا۔ یہ ہیں جناب ایچ یو جیلانی محکمۂ . . .

نوجوان :- اوہ ــــ مشہور شخصیت ہیں ــــ میں جناب روزنامہ جرأت اظہار کا نمائندہ خصوصی۔

دوسرا آدمی :- اوہ ــــ جرأت اظہار ــــ ابھی ہم آپ ہی کے اخبار کا ذکر کر رہے تھے۔ میں اور سیٹھ بھانڈے والا۔

نوجوان :- تو وہ بھی ہیں۔

دوسرا آدمی :- جی وہ کیا بیٹھے ہیں سامنے (آواز دیتا ہے) سیٹھ صاحب! ادھر تشریف لایئے۔

(سیٹھ اٹھ کر آہستہ آہستہ پہلی بنچ کی طرف آتا ہے)

کچھ اور ڈوز لے لیا ہے انھوں نے ــــ نیند آور گولیوں کا۔

نوجوان :- سیٹھ عبدالستار بھانڈے والا ــــ مجھے تو یہ آج بڑی وی آئی پی قسم کی ٹرین معلوم ہوتی ہے کہ جس سے ایک ساتھ اتنی بہت سی اہم شخصیات سفر کر رہی ہیں۔

خاتون :- خاک وی آئی پی ہے ــــ روشنی تک کا معقول انتظام نہیں ہے۔

تیسرا آدمی :- (جو اب قریب آچکا ہے) بھئی میرا تو دماغ بالکل ہی سوگیا ہے۔ آپ کی آواز اس طرح آرہی تھی جیسے کوئی کوسوں دور سے پکار رہا ہو۔

پہلا آدمی :- خوش قسمت ہیں کہ اس شور اور ہنگامے میں آپ کا ذہن سویا ہوا ہے۔

نوجوان :- آپ کو تو اس سڑے ہوئے گوشت کی بُو کا بھی احساس نہیں ہوگا۔

دوسرا آدمی :- بُو ــــ؟

نوجوان :- جی ہاں ــــ میرا تو دماغ اُڑا جا رہا ہے (ناک پہ رومال رکھتا ہے)

دوسرا آدمی :- مجھے تو سردی کی شدت نے ہر چیز سے بے بہرہ کر دیا ہے۔ آپ کے پاس ماچس ہوگی۔ شاید پائپ ہی کا کش لگا کر کچھ حرارت آئے۔

نوجوان :- جی ہاں۔ لائیٹر ہے میرے پاس۔ (جیب سے نکال کر دیتا ہے) یہ لیجئے۔

(دوسرا آدمی لائیٹر کو جلانے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ نہیں جلتا۔ ایک ٹرین کی آواز فیڈ ان ہوتی ہے جو آکر ڈور کسی پلیٹ فارم پر ٹھہر گئی ہے۔)

دوسرا آدمی :- آپ کے لائیٹر کی گیس ختم ہو گئی ہے غالباً۔

نوجوان :- نہیں۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ اچھا بھلا جلتا ہے۔ لائیے مجھے دیں۔

(نوجوان لائیٹر جلانے کی کوشش کرتا ہے مگر لائیٹر نہیں جلتا۔)

نوجوان :- اس سے پہلے تو کبھی اس لائیٹر نے ایسا نہیں کیا۔

تیسرا آدمی :- ہو جاتا ہے کبھی کبھی — پھر اچھا ہی ہے لائیٹر نہیں جلے گا تو پائپ نہیں جلے گا۔ تمباکو نوشی کون سی ایسی اچھی چیز ہے۔ کیوں صاحب!

دوسرا آدمی :- عادت تو کسی چیز کی بھی اچھی نہیں ہوتی — آپ کچھ بہت بے چین ہیں بیگم صاحبہ۔

خاتون :- میرا دل ہولا جارہا ہے اس تاریکی سے — اور پھر غصہ بھی بہت ہے کہ کوئی پرسانِ حال ہی نہیں ہے۔ جانے کب سے بیٹھی ہوں یہاں — وقت کیا ہوگا۔

پہلا آدمی :- آپ کے پاس ہوگی گھڑی — وقت بتائیے گا۔

دوسرا آدمی :- جی یقیناً — (گھڑی دیکھتا ہے۔ مایوس ہو جاتا ہے) یہ تو بند ہے شاید۔

تیسرا آدمی :- یہ آج کل کی موڈرن کوارٹز سسٹم والی ڈیجٹل گھڑیوں میں یہی تو خرابی ہے کہ اگر بند ہو جائیں تو پھر سب کھیل ختم۔ اسی لئے میں تو جناب CONVENTIONAL قسم کی گھڑی استعمال کرتا ہوں — پائیدار — اور مضبوط (اپنی گھڑی دیکھتا ہے) مگر — یہ بھی بند ہے شائد (کان سے لگا کر سنتا ہے)

نوجوان :- وہ سامنے کلاک لگا ہے — وقت ہے اس وقت بارہ بجکر — مگر یہ بھی شاید بند ہے۔

پہلا آدمی :- جی ہاں — جب سے میں آیا ہوں یہاں تب سے تو بند ہی ہے۔

(دور ریل سیٹی دے کر روانہ ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ اس کی آواز فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے)

خاتون :- یہ کیسا اسٹیشن ہے کوئی انتظام ہی نہیں ہے۔ نہ روشنی — نہ گھڑی —

دوسرا آدمی :- میں اپنے دوست سے جو اس محکمہ کے سربراہ ہیں کہہ کر تحقیقات کراؤں گا اس اسٹیشن والوں کی۔

خاتون :- میں تقریریں کروں گی ان کے خلاف سماجی جلسوں میں۔

نوجوان :- میں اخبار میں ایسی مہم چلاؤں گا کہ . . . .

(دور سے ایک ریلوے گارڈ، وردی میں ملبوس، بغل میں سبز اور سرخ جھنڈیاں دبائے آتا نظر آتا ہے)

تیسرا آدمی :- وہ دیکھئے — ریلوے کا آدمی — اس سے معلوم کرنا چاہیئے۔ آخر ہم کب تک یہاں بیٹھے انتظار کریں گے۔

دوسرا آدمی :- نہ ریل آتی ہے۔ نہ وقت کا اندازہ ہے کچھ — اور سردی ہے کہ . . . .

خاتون :- اس سے بات کرنی چاہیئے۔ اس اندھیرے میں کتنی دیر اور ہم اس طرح بیٹھیں گے یہاں . . .

نوجوان :- ٹھہریئے — میں بات کرتا ہوں جاکر اس سے۔

(بینچ کے پاس سے اٹھ کر گارڈ کے قریب آتا ہے اور اسے روکتا ہے)

سنیئے جناب — یہ آخر کیا قصہ ہے — سارے مسافر پریشان ہیں اور کوئی خبر گیری کرنے والا ہی نہیں ہے — آپ کو معلوم ہونا چاہیئے اس وقت اس پلیٹ فارم پر اس قدر اہم شخصیات موجود ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک نے بھی شکایت کر دی حکام سے تو آپ لوگوں کو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

ریلوے گارڈ :۔ (مسکراتے ہوئے) آپ کی دھمکی کا شکریہ — مگر کسی کو کیا تکلیف پہنچائی ہے ہم نے جو آپ اس طرح . . . .

نوجوان :۔ تکلیف ہی نہیں پہنچائی — ؟ یعنی آپ کو احساس ہی نہیں ہے۔ اس کے باوجود کہ میں نے عرض کیا کہ اس قدر اہم شخصیات . . .

ریلوے گارڈ :۔ معاف کیجئے۔ ہمارے اصول اور ہمارا انتظام اہم اور غیر اہم کی تعریف سے بالاتر ہے۔ ہمارے لئے سب مسافر برابر ہیں۔ اس لئے براہ مہربانی بار بار شخصیات کی اہمیت کا رُعب نہ جمائیں — آپ شکایت بیان فرمائیں۔

نوجوان :۔ (ذرا جزبز ہو کر) میں روزنامہ جرأت اظہار . . . .

ریلوے گارڈ :۔ (نرمی سے فیصلہ کن انداز میں) آپ جو بھی ہوں — ہمیں لوگوں کے نام اور پیشوں سے تعلق نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا ہمارے لئے آپ صرف ایک مسافر ہیں اور اس سفر سے متعلق اگر آپ کو کچھ کہنا ہے تو فرمائیے۔

نوجوان :۔ (کچھ بن نہیں پڑتا) آئیے میرے ساتھ آئیے — خود ان لوگوں سے سنئے۔

(دونوں چل کر پہلی بنچ کے پاس آتے ہیں — اس عرصہ میں پھر ریلوے اناؤنسر کی آواز گونجتی ہے)

اناؤنسمنٹ کی آواز :۔ اٹھائیس ڈاؤن نارا ایکسپریس پلیٹ فارم نمبر سات پر پہنچنے والی ہے۔

نوجوان :۔ میں لے آیا ہوں انہیں۔

(گارڈ کو دیکھ کر پانچوں آدمی ایک ساتھ بولتے ہیں اور دیر تک بولتے رہتے ہیں اس طرح کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا — وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ گارڈ مسکراتا رہتا ہے)

گارڈ :۔ دیکھئے اس طرح اگر آپ سب ایک ساتھ بولتے رہیں گے تو مجھے کچھ بھی معلوم نہ ہو سکے گا۔ میں ذرا جلدی میں ہوں۔ آپ نے سنا ہی ہو گا ٹرین کے آنے کا اعلان ہو چکا ہے۔ براہ مہربانی ایک ایک کر کے بتائیے — پہلے آپ بتائیں۔ آپ نے جانا کہاں ہے؟

دوسرا آدمی :۔ (اس سوال سے پریشان سا ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر تذبذب کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہے) جانا کہاں ہے ؟ کہاں جانا ہے مجھے ؟ . . . سیٹھ ستار . . . آپ کو کہاں جانا ہے ؟

تیسرا آدمی :۔ مجھے تو — (پریشان ہو کر) مجھے تو قطعی یاد نہیں — میرا ذہن سو گیا ہے بالکل — بیگم صاحبہ آپ بتائیں آپ کہاں جا رہی ہیں۔

خاتون :۔ (سوچ کر) نہیں مجھے معلوم نہیں — منشی بقاالدین۔

پہلا آدمی :۔ مذاق کی بات لگتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ میں بھول گیا ہوں کہ کہاں جانا ہے مجھے — ! اور آپ — تو شاید . . .

نوجوان :۔ کچھ بلا ارادہ ہی چلا آیا تھا — DESTINATION کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔

گارڈ :۔ شکایت آپ کو انتظامیہ سے ہے۔ فیصلہ خود آپ کرنے سے قاصر ہیں۔ عجیب بات ہے نا . . . ٹکٹ بھی نہیں ہوں گے آپ کے پاس۔

(پانچوں آدمی بے بسی کا اظہار کرتے ہیں اور کوئی سر ہلا کر۔ کوئی نہیں کہہ کر اور کوئی آنکھ کے اشارے سے کہتا ہے کہ ٹکٹ نہیں ہیں۔)

گارڈ :۔ تو پھر بتائیے میں کیا کر سکتا ہوں آپ کے لئے۔ ٹکٹ تو باہر ملتے ہیں۔ آپ نے نہ منزل کا تعین کیا نہ ٹکٹ خریدا — اب میں کیا کر سکتا ہوں (جانے لگتا ہے)

خاتون :۔ (خوشامدانہ انداز میں) کچھ تو کیجئے — اس اندھیرے کا تو کچھ کیجئے — یہ تاریکی آنکھوں کے راستے میری روح میں اُترتی جا رہی ہے

گارڈ :۔ تاریکی !

دوسرا آدمی :۔ اور یہ سردی — میری ہڈیاں چیخ رہی ہیں اس سردی سے۔

گارڈ :۔ سردی !

پہلا آدمی :۔ شور سے میرے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔

گارڈ :۔ شور !

نوجوان :۔ یہ بدبُو ۔۔ سڑے ہوئے گوشت کی بو ۔ لاوے کی طرح بھک سے میرے جسم کو اڑا دے گی۔

گارڈ :۔ بدبُو ۔۔ !

تیسرا آدمی :۔ سناٹا ۔۔ بیکراں ۔ لامحدود ۔ دہشت ناک سناٹا ۔۔ اس کا کچھ کیجئے خدا کے لئے۔

گارڈ :۔ سناٹا ۔ !

خاتون :۔ کچھ تو کیجئے ۔۔ یہ آپ کا فرض ہے ۔۔ ہم پر رحم کیجئے۔

پہلا آدمی :۔ اس عذاب سے بچائیے ہمیں . . . .

گارڈ :۔ مجھے بہت افسوس ہے میں کچھ نہیں کر سکتا ۔ کچھ بھی نہیں کر سکتا ۔ آپ لوگوں کے لئے ۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔

نوجوان :۔ کیوں ۔ کیوں ممکن نہیں ہے۔

گارڈ :۔ اس لئے کہ آپ جن باتوں کی شکایت کر رہے ہیں ان کا وجود ہی نہیں ۔ نہ یہاں تاریکی ہے، نہ شور، نہ بدبو ہے، نہ سناٹا، نہ سردی ہے نہ . . . .

دوسرا آدمی :۔ تو پھر یہ سب ۔۔ !

گارڈ :۔ یہ سب آپ کے اپنے اندر کی باتیں ہیں ۔ آپ سب الگ الگ اپنے اپنے سایوں میں محصور ہیں . . ۔ حصار کے اندر جو کچھ بھی ہے وہ آپ کے اپنے دائرے کا موسم ہے آپ کے اپنے حصار کا ماحول ہے ۔ میں اُسے نہیں بدل سکتا ۔ کوئی بھی آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔

خاتون :۔ تو کیا ہم اسی طرح ہمیشہ اس تاریکی میں رہیں گے۔

پہلا آدمی :۔ یہ شور کبھی بند نہ ہوگا۔

دوسرا آدمی :۔ مجھے کب تک برداشت کرنا ہوگی یہ جان لیوا سردی۔

گارڈ :۔ (جانے لگتا ہے) معاف کیجئے ۔ میں اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

نوجوان :۔ مگر . . . ایک بات تو بتاتے جائیے ۔۔ ہم کہاں ہیں ؟

تیسرا آدمی :۔ اس اسٹیشن کا نام کیا ہے۔

گارڈ :۔ (اسٹیج کے دائیں جانب اشارہ کرتا ہے) وہ ۔۔ پلیٹ فارم کے آخری سرے پر بڑے پتھر پر جلی حروف میں لکھا ہے ۔۔ (نوجوان سے) پڑھ سکتے ہیں آپ۔

نوجوان :۔ (اسی سمت دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ پڑھتا ہے) عدم آباد جنکشن (ٹرین کی سیٹی کی آواز گونجتی اور پلیٹ فارم پر داخل ہو رہی ہے)

سب :۔ عدم . . . آباد . . . جنکشن۔

(گارڈ جانے لگتا ہے اسٹیج کے سرے پر پہنچتا ہے تو خاتون کی آواز سن کر ٹھہر جاتا ہے۔)

خاتون :۔ سنیئے !

گارڈ :۔ جی !

خاتون :۔ (بہت گڑگڑا کر) آپ ہمارے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے . . . کوئی مشورہ بھی نہیں دے سکتے۔

گارڈ :۔ مجھے افسوس ہے ۔۔ صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ لوگ پلیٹ فارم پر بیٹھنے کی بجائے ۔۔ سامنے انتظار گاہ میں چلے جائیں ۔ وہاں اور بھی بہت سے مسافر ہوں گے ۔ آپ بھی ان کے ساتھ مل کر انتظار کیجئے ۔ اب یہ انتظار ہی آپ کا مقدر ہے۔

(گارڈ باہر چلا جاتا ہے ۔ پانچوں مسافر اٹھتے ہیں اور آہستہ آہستہ قدموں سے انتظار گاہ کے دروازے سے اندر جانے لگتے ہیں پس منظر میں ریل کی آواز ہے ۔ پردہ آہستہ آہستہ گر جاتا ہے ۔)

# بیٹی والے

اصغر بٹ

وقت پچھلا پہر۔ متوسط گھرانے کا ڈرائنگ روم۔ فرش پر دری پچھی۔ آتش دان پر دو مراد آبادی گلدان۔ کاغذ کے پھولوں سے آراستہ آتشدان کے اوپر کسی سگرٹ کمپنی کا اشتہاری کیلنڈر جس پر ایک مغربی حسینہ ہاتھ میں سلگتا ہوا سگرٹ لئے بے حد بشاش نظر آتی ہے۔ بائیں جانب کونے میں لکڑی کے اسٹول پر بجلی کا پنکھا۔ کمرے میں چھ آرام کرسیاں دو سامنے کے رخ، دو دائیں جانب اور دو بائیں جانب درمیاں میں پرانی وضع کی ایک گول میز، ذرا فاصلے پر دو تپائیاں اور بھی، ایک دائیں جانب ایک بائیں جانب۔ ایک دروازہ آتشدان کے برابر بائیں جانب گھر کے اندر کھلتا ہوا۔ دروازے پر سبز رنگ کا سادا سا پردہ۔ بیرونی دروازہ پر جو دائیں دیوار میں ہے مایک چک۔ سامنے کی کرسیوں میں سے ایک پر ایک ادھیڑ عمر آدمی شلوار قمیض پہنے، عینک لگائے، درمیانی گول میز پر چند فائلیں کھولے ان کا مطالعہ کر رہا ہے دو فائلیں میز کے ساتھ ہی نیچے دری پر رکھی ہوئی۔ شکل سے دفتری بابو لگتا ہے

(پردہ اٹھتا ہے تو مرد ہاتھ میں پنسل لئے فائل پر نشان لگا رہا ہے پچھلے دروازے کے پردے کو حرکت ہوتی ہے اور تقریباً پینتیس برس کی عورت داخل ہوتی ہے۔ اس نے بال پیچھے کی طرف کھینچ کے ان کا جوڑا بنا رکھا ہے۔ ریشمی ڈھیلا ڈھالا قمیض، سفید لٹھے کی شلوار پہن رکھی ہے۔ جسم ذرا بھاری، حرکات میں تیزی

عورت:۔ میں نے کہا اب تو چھ بج گئے

مرد:۔ (بدستور فائلوں میں کھویا ہوا) ہوں!

عورت:۔ اور ان لوگوں نے پانچ بجے آنے کو کہا تھا۔

مرد:۔ ہوں۔

عورت:۔ میں نے کہا چھوڑیں ان موٹی فائلوں کو اب۔

مرد:۔ (بغیر نظریں اٹھائے) تو کیا کروں؟

عورت:۔ آپ کو تو کچھ فکر ہی نہیں ہے۔

مرد:۔ فکر کرنے سے کیا ہوگا؟

عورت:۔ آپ کو ان فائلوں سے فرصت ہو تو کوئی آپ سے بات بھی کرے (دائیں جانب کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

مرد:۔ تم بات کرو، میں سن تو رہا ہوں۔

عورت:۔ کیا خاک سن رہے ہیں۔ ہوں۔ ہاں۔ ہوں!! عقل کے انسان بات تھوڑے ہی کر سکتا ہے ایسے میں آپ یہ بتائیں کہ یہ کام دفتر میں نہیں ہو سکتا کیا۔ آخر اسے گھر میں لانے کی ضرورت کیا ہے؟

مرد:۔ سنو بیگم! تم حکومت کے کاموں میں نہیں بولا کرو۔

عورت :۔ واہ حکومت ہمارے ہی گھر سے تو چل رہی گویا۔ حکیم صاحب کا لڑکا بھی تو دفتر میں کام کرتا ہے ہم نے تو نہیں دیکھا ایک روز بھی کام گھر پہ لے کر آیا ہو۔

مرد :۔ تو رہ جائے گا ایل۔ ڈی۔ سی کا ایل۔ ڈی۔ سی۔

عورت :۔ جانے کیا اٹ بٹ اٹ بٹ کئے چلے جا رہے ہیں

مرد :۔ (بے گانہ مسکراہٹ سے) میں نے کہا کلرک ہی رہ جائے گا بیچارہ۔

عورت :۔ اور آپ کو تو وہ گویا اسٹنٹ ہی بنا دیں گے۔

مرد :۔ (ذرا بر فروختہ) ہم کئی بار تم سے کہہ چکے ہیں کہ ہم سپرنٹنڈنٹ ہیں اور کئی اسسٹنٹ ہمارے انڈر میں کام کرتے ہیں۔

عورت : ہماری جانے بلا۔ ہمارے ابا تو ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ اسٹنٹ بڑا افسر ہوتا ہے۔

مرد :۔ (پیشانی پر بل ڈالے) اسٹنٹ ؟ (قہقہہ لگا کر) ارے اسسٹنٹ کمشنر۔ (بیٹی بھی جاہل اور باپ بھی جاہل

عورت :۔ (ذرا غصّے سے) جب رشتہ مانگنے جوتیاں چٹخاتے آتے تھے اس وقت کہا ہوتا نا جاہل کسی کو۔ میرے باوا تو پھر بھی سکتر تھے۔ آپ کے باوانے کونسی ایم۔ اے۔ بی۔ اے کر لی تھی۔

مرد :۔ (حالات بگڑتے دیکھ کر فائیلوں میں پناہ لیتا ہے) اُف! تم کونسی بحث لے بیٹھیں۔ جاؤ، مجھے ذرا کام کرنے دو

عورت :۔ (غصّے سے) نہیں کریں گے کام آپ ؟ کونسی موئی تنخواہ بڑھ جائیگی۔ گھر کے دکھوں بکھیڑے ہیں ہائیں غضب خدا کا۔ لوگوں کے ہاں مرد بھی ہوتے ہیں بیٹھ کر کوئی صلاح مشورہ بھی دیتے ہیں۔ یہ ہیں کہ ان کو اپنی قلم گھسائی سے ہی فرصت نہیں۔ توبہ!

مرد :۔ (صلح جویانہ) تمہیں بتا چکا ہوں کہ میرا نام ترقی کے لئے گیا ہوا ہے۔ اگر اس موقع پر افسر ناراض ہو گیا تو سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا

عورت :۔ ترقی ؟ آپ ہی تو کہہ رہے تھے کہ تنخواہ نہیں بڑھنے کی۔ تو وہ موئی ترقی کیسی ؟

مرد :۔ تمہیں حکومت اور سلطنت کے کام کیا سمجھائیں۔ بس یوں سمجھو کہ ہم گزیٹڈ افسر ہو جائیں گے ۔

عورت :۔ گزے۔ گزے ۔ ۔ ۔ (کوشش کر کے چھوڑ دیتی ہے) یہ کیسے موئے الٹے سیدھے نام رکھ دئے ہیں۔ آج کل کے لوگوں نے پہلے تو سیدھے سیدھے۔ سکتر، ڈپٹی اور لاٹ صاحب تین افسر ہوتے تھے۔ اب یہ گزے لے لو اور آدھا گزے لے لو۔!

مرد :۔ گزے ٹڈ (لفظ ٹڈ کو واضح طور پر دہراتا ہے۔

عورت :۔ لعنت بھیجتی ہوں ان مٹے ٹڈیوں پہ۔ جب پیسے نہیں بڑھیں گے تو مشکل نام رکھ لینے سے پیٹ بھر جائے گا کیا!

مرد :۔ ہمت ہار کر فائیل بند کر دیتا ہے اور عینک اتار کر ہاتھ میں تھام لیتا ہے) اچھا لو ہم چھوڑ دیتے ہیں کام۔ اب بولو۔

عورت :۔ (میاں کو ہتھیار ڈالتے دیکھ کر نرم ہو جاتی ہے) میں کب کہتی ہوں کہ آپ کام نہ کریں۔ سو دفعہ کریں۔ لیکن کسی وقت ہماری بھی تو سنیں۔ آخر لڑکی کا معاملہ ہے۔

مرد :۔ ہاں ہاں بولو۔ ہم سن رہے ہیں۔

عورت :۔ ہائیں اے اور سنو۔ مجھے کوئی رم کتی تھوڑے ہی کہنا ہے۔ اب بتائیں کریں کیا ؟

مرد :۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ آجائیں گے وہ لوگ

عورت : حک آجائیں گے!

مرد۔ عورتوں کے لئے گھنٹہ دو گھنٹہ دیر کر دینا کوئی بڑی بات بھی نہیں۔

عورت:۔ ہم بھی تو آخر گھر سے نکلتے ہیں۔ اتنی دیر ہم سے تو نہیں ہوئی کبھی۔

مرد:۔ توبہ کرو بیگم! چھ گھنٹے تو تم جوتی ڈھونڈنے میں لگا دیا کرتی ہو۔

عورت:۔ اے غضب کرتے ہیں آپ! ہو گئی برسوں میں ایک بار دیر، یونہی ذرسی اور آپ تو گویا میری سوت بن کر بیٹھ گئے

مرد:۔ اچھا بھئی جانے دو۔ میں کہہ رہا تھا کہ ان کے نہ آنے کی وجہ بھی تو آخر کوئی ہو۔!

عورت:۔ وجہ۔! وجہ کوئی نئی ہو گی! وہی وجہ ہے جو ہمیشہ سے۔ بس بے یعنی دیکھنے کو جھکتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ اور پھر جو نکلے ہیں تو انہیں یا زمین کھا گئی یا آسمان اٹھا کر لے گیا۔

مرد:۔ میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ لڑکی کو سامنے نہیں آنے دینا۔

عورت:۔ اے لو!۔ وہ کہیں ہمیں لڑکی دکھاؤ تو ہم کیا کہیں جاؤ ہوا کھاؤ بھلا ایسے بھی کبھی رشتے ناطے ہوتے ہیں! جب کوئی لڑکی دیکھنے آئے گا تو وہ دیکھو کے ہی جائے گا۔

مرد:۔ (اٹھ کر ٹہلتا ہے) بھئی اگر لڑکی اچھی نہ ہو تو کوئی ترکیب لڑانی پڑتی ہے۔

عورت:۔ ایسی بھی نہیں کہ خدانخواستہ کوئی لنگڑی کانی ہو۔ اچھی ہے اچھوں میں اچھی ہے۔ گورا رنگ۔ اچھا جسم۔ مڈل تک پڑھی ہوئی ہیں تو باوا نے اسکول کی شکل تک نہیں دکھائی تھی۔ یہ چھوٹی بیٹی ان کی لاڈلی تھیں اس لئے .....

مرد:۔ دیکھو میں نہیں کہتا کہ وہ بدصورت ہے۔ لیکن جب بیسیوں لوگ دیکھنے کے لئے آ چکے ہیں تو آخر کہیں سے سوال بھی آنا چاہئے تھا نا۔ لڑکی کی عمر پچیس برس تو ہو گئی۔

عورت:۔ کوئی ایک بات ہو تو کچھ حل سوچیں۔ کوئی کہتا ہے لڑکی یتیم ہے۔ کوئی کہتا ہے جہیز کم ہے۔ کوئی کہتا ہے چپٹی ہے۔ کوئی کہتا ہے آنکھیں چھوٹی ہیں۔ اس بچاری میں دنیا بھر کے کیڑے ڈالنے کو تو سب حاضر ہیں۔ کوئی ان سے نہیں کہتا کہ سکتر علم دین کی بیٹی ہے پچیس برس کی ہے تو کیا ہوا۔ آخر ایک زمانے میں ہمارے گھر کا بھی نام تھا۔ بڑے باپ کی بیٹی ہے اور میں بھی تو دنیا میں کوئی ہوں۔ میری چھوٹی بہن ہے۔

مرد۔ آج کل نام کو کون پوچھتا ہے۔! بڑے بڑے ڈپٹیوں کی بیٹیاں بیٹھی رہ جاتی ہیں۔ اور یہ تو پھر بھی سینیٹری انسپکٹر کی بیٹی ہے۔

عورت:۔ ہوتا آج ہمارا باپ زندہ تو آپ کو دکھا دیتی کہ کیسے گھگھیاتے ہوئے لگے رہتے ہیں قطاروں میں۔

مرد:۔ (دوبارہ کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور ٹانگیں سمیٹتا ہے) خیر ایسی بھی تکلیف نہیں ہے، نہیں کہ باوا کی شکل دیکھتے ہی شیر سے بلی ہو جائیں!

عورت:۔ آپ نے تو خود دیکھی ہے ان کی حکومت، شہر کے پچاس مہتروں میں سے تیس تو ہماری گلی کی صفائی میں ہی لگے رہتے تھے اور پھر مارتیل کے کنستر ہمارے ہاں پانی کی طرح لڑھکائے جاتے تھے۔

مرد:۔ (ٹانگیں باندھ کر اٹھتا ہے) انہیں تمہی خصلت کی بدولت تو برخاست ہوئے تھا آخر۔

عورت:۔ اے ہے آپ کو کیا ہو گیا ہے آج تجھے جھاڑ کر ہمارے باوا کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔

مرد۔ میں تو آپ کی بات کا جواب دے رہا ہوں۔

عورت۔ یہ اچھا جواب ہے گود میں بیٹھے داڑھی نوچ لی اور کہا یہ جواب ہے۔ پھر اگر یاد دلاتی ہوں کہ آپ کے باوا کی پرچون کی دکان تھی اور میونسپلٹی میں ان کا چالان ہمارے باوا نے جا کر چھڑا دیا تھا تو آگ لگ جاتی ہے۔

مرد:۔ اس بات پر تو مجھے کبھی آگ نہیں لگتی۔ اگر میرے باوا اس چالان کے سلسلے میں میونسپلٹی کے چکر نہیں کاٹتے تو آپ کے باوا سے ملاقات کیسے ہوتی اور اگر ہمارے باوا اور آپ کے باوا کی ملاقات نہیں ہوتی تو ہمیں یہ چاند ایسی دلہن کیسے ملتی۔ (آکر پیار سے اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتا ہے)

عورت:۔ (ذرا بن کر) ہٹئے۔ شرم کیجئے۔ اتنے لوگ سن رہے ہیں۔

مرد:۔ آخر ہم بھی تو ایک روز لڑکی دیکھنے گئے تھے۔

عورت:۔ (بہ مسرت) اب تو بھول بھی گئیں ساری باتیں۔ ہائے اللہ مجھے کتنی شرم آئی تھی!

مرد:۔ ہماری اماں نے آکر کہا لڑکی ایسی ہے کہ بس لاکھوں میں ایک۔ ایک ایک آنکھ ہے، فجری آم جتنی بڑی۔

عورت:۔ خیر میرے لئے تو اتنے رشتے آئے کہ باوا کو دہلیز پہ لوہے کی پتریاں چڑھانی پڑیں۔ لکڑی گھس گئی تھی۔ وہ ڈپٹی ایک پٹواری ایک کپتان تھا وہ تو بس ایک نقل لو بس۔ بچارے کہتے تھے جو چاہے لکھوالو، لڑکی ہم یہی لیں گے۔ خیر جہاں کا دانہ پانی ہو وہیں انسان پہنچتا ہے۔ آپ کے باوا کی طبیعت ہمارے باوا سے مل گئی اور ہمارے باوا تھے ایسے کہ کوئی دل کو بھا جائے پھر اس کے لئے جان دینے کو تیار ہو جاتے تھے۔

مرد:۔ (پھر سامنے آکر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) بس ایک دفعہ رضیہ کا رشتہ ہو جائے دو۔ ہم بھی یہی کہیں گے کہ ہمارے دل کو وہ لوگ بھا گئے تھے۔

عورت:۔ اے ہے تو میں جھوٹ کہہ رہی تھی کیا؟

مرد:۔ تم تو ہر بات پر بگڑنے لگتی ہو۔

عورت:۔ آپ بات ہی ایسی کرتے ہیں۔ اچھا اب وقت کیا ہو گیا ہوگا؟

مرد:۔ (کلائی کی گھڑی دیکھ کر) سوا چھے۔

عورت:۔ اب اگر آ بھی گئے تو سموسے تو ستیا ناس ہو چکے ہیں۔ وہ تو گرم گرم ہی کھائے جائیں تو مزا دیتے ہیں۔

مرد:۔ دوبارہ گرم کر لینا۔

عورت:۔ پانچ بجے گرم کئے سوا پانچ بجے کئے۔ ساڑھے پانچ بجے کئے۔ اب تو موئے جل کر کوئلہ ہو گئے ہیں اب کیا گرم کروں گی سواڑیلے پر فاتحہ پڑھ کر بیٹھ گئی ہوں

مرد:۔ میں پھر کہتا ہوں کہ تم نے لڑکی دکھا کر گڑبڑ کر دی۔ ورنہ یہ اسامی پکی تھی۔

عورت:۔ پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ میں نے ان سے کہا کہ لڑکی کو کیا دیکھنے کو میری بہن ہے۔ مجھے دیکھ لو۔ مجھ سے بھی اچھی ہے۔ لیکن وہ تھے کہ نہیں ہم دیکھیں گے۔ پھر آخر گئی۔ جہیز کے جوڑوں سے ہلکا جوڑا نکال کر پہنایا۔ لیمپ میں دیکھا تو سو واٹ کا بلب لگا ہوا تھا۔ وہ اتارا اس کی جگہ پانچ کا بلب لگایا۔ لیمپ نیچے رکھ کر ہاتھ پاؤں پر روشنی پڑے، چہرا نظر نہ آئے۔ اب اور کیا کرتی!

مرد:۔ (سوچتے ہوئے) ہاں کارروائی تو ساری ٹھیک تھی معلوم نہیں چوک کہاں ہوئی؟

عورت:۔ یہ موا آپ کا جو دوست ہے۔

مرد:۔ تاجدار

عورت:۔ وہی نامراد۔ دو کوڑی کام کا نہیں۔ اس نے بات ہی پکی نہیں کی۔

مرد:۔ اب بات اور کیسے پکی ہو سکتی ہے۔ بوڑھا آدمی ہے ہمارے دفتر میں اس کی ٹرک گئی ہے اور انور ان کے سامنے چوں نہیں کر سکتا۔

عورت:۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ ایک چوں کیا۔ وہ چوں چوں چوں چوں ہی کئے چلا جا رہا ہے۔

مرد:۔ بھلی مانس تم سمجھتی نہیں۔ نامدار صاحب ہمارے دفتر کے خزانچی ہیں اور خزانچی سے ہر چھوٹے بڑے آدمی کو کام رہتا ہے۔

عورت:۔ تو انور کو بھی ان سے کام رہتا ہے کیا؟

مرد:۔ انور کو تو نہیں لیکن انور کے صاحب کو رہتا ہے۔

عورت:۔ لو انور کے صاحب کو کیا کام ہوگا۔ وہ پیسے والے ہوں گے۔

مرد:۔ اب یہ مت پوچھو۔ ہزار روپیہ تنخواہ تو ہے لیکن موٹر، کوٹھی، نوکر چاکر، اور پھر سب خرچوں کا ایک خرچ بیوی ہے۔

عورت:۔ اے ہے آپ مردوں کو تو کوئی ایسی بیماری ہے کہ دوسری عورت تو پری لگتی ہے لیکن بیوی ہو تو ڈائن۔

مرد:۔ یہ اب تم نے فلسفے کی بات کہہ دی اور ہم لوگوں نے فلسفہ پڑھا نہیں۔ ہمارے استاد نے تو کہا تھا کہ بیٹا اگر تم نے پی۔ یو۔ سی۔ اور ریف آر کا مطلب سمجھ لیا تو دنیا کے سارے سربستہ راز سمجھ لئے۔ خیر تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ انور کا صاحب نامدار صاحب کی مٹھی میں ہے مہینے کی پندرہ تاریخ ہوتی ہے تو انور کے صاحب نامدار صاحب کی مٹھی کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ نامدار صاحب نے تو انور کو رکھوایا ہی تھا

عورت:۔ اگر نامدار صاحب نے اسے رکھوایا تھا اور نامدار صاحب نے کہا کہ میرے دوست محمد حسین کی سالی جیسی لڑکی دنیا کے تختے پر نہیں ملے گی تو پھر میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ انور کی وہ کٹنی ماں اور نگوڑی بہن کہاں مر کر دفن ہو گئی ہیں۔ پانچ بجے کہا تھا آنے کو تو پہنچی کیوں نہیں؟ بیٹوں کی شادی کرنے لگتی ہیں تو دل کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔ اس روز آئی تھی تو غش آگیا تھا کٹنی کو اب آپ ہی بتائیے کہ بیٹا شادی کرے گا۔ یا نہیں کرے گا۔

مرد:۔ یہ سوال ذرا مشکل ہے۔

(دروازے پر دستک)

مرد:۔ (ایک دم اچھل کر) لو وہ آگئے۔

(فائیلیں بغل میں دبائے اندرونی دروازے سے نکل جاتا ہے۔ عورت جلدی جلدی دوپٹے سے پسینہ پونچھتی ہے قمیض کے شکن درست کرتی ہے اور چہرے پر ایک وسیع مسکراہٹ پھیلا کر دائیں جانب دروازے کی طرف بڑھتی ہے اور چٹخنی اٹھاتی ہے۔

باہر سے دوسری عورت کی آواز: السلام علیکم

عورت:۔ آں۔ آپ ہیں۔ وعلیکم اسلام (باوجود کوشش کے اپنی ناامیدی کو نہیں دبا سکی) آئیے۔ اندر آئیے نا۔

باہر سے عورت کی آواز: ابھی آتی ہوں۔ ذرا منور کے ہاں سے ہو آؤں۔

عورت: کیوں۔ وہاں کیا ہے!

دوسری عورت: اس کا بیٹا میٹرک میں پاس ہوا ہے۔ مبارکباد دے آؤں۔ سوچا آپ کے ہاں بھی جھانکتی چلوں۔ اگر آپ گھر پر ہی ہوں تو واپسی پر پھر بیٹھوں۔

عورت:۔ ہاں ہاں۔ ضرور آئیے۔

دوسری عورت: ابھی آتی ہوں۔ پانچ منٹ میں۔ خدا حافظ!

عورت: خدا حافظ!

(چک سے بٹ کر آتی ہے اور آکر سامنے کی ایک کرسی پر دھڑام سے بیٹھ جاتی ہے۔ لمبی آہ بھرتی ہے اور آواز دیتی ہے)

عورت:۔ میں نے کہا...... سنتے ہو...... میں نے کہا۔

اندر سے مرد کی آواز: کیوں؟

عورت:۔ میں نے کہا آجایئے۔ کوئی نہیں ہے۔

(مرد پچھلے دروازے سے دوبارہ داخل ہوتا ہے)

مرد:۔ تو کون تھا؟

عورت: جیری کی ماں۔

مرد:۔ اوہ! میں سمجھا کہ انور کے گھر والے ہیں۔ تو چلی گئی پھر؟

عورت: پڑوس میں گئی ہے۔ ابھی آتی ہے لوٹ کر۔

مرد:۔ چلو اچھا ہے تمہارا جی بہل جائے گا۔ تمہاری تو بڑی سہیلی ہے۔

عورت: سہیلی؟ سہیلی ویلی کیا۔ ہماری بیٹیاں سہیلی ہیں۔ ان کی بیٹی ہمارے ہاں کبھی کھیلنے کو آجاتی ہے اور ماں اسے لینے کو آتی ہے تو تھوڑی بہت بات ہوجاتی ہے۔

مرد: تھوڑی بہت! میں نے دیکھا گھنٹوں گلے شکوے چلتے ہیں کہ تم مہینہ بھر سے نہیں آئیں اور عید کا چاند ہوگئیں اور یہ کہ اوب بیٹھیے نا ذرا دیر۔ نجو حلوائی سے جلیبیاں منگوائی جارہی ہیں اور چائے چل رہی ہے۔ (کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

عورت:۔ اے توبہ! آپ ہی کے گھر کی نیک نامی کے لئے کرتی ہوں۔ ہم بھی بیٹیوں والے ہیں۔ کل کلاں کو دوست لوگ ہی کام آئیں گے۔ رشتے دار کوئی نہیں پوچھتا۔

مرد:۔ تمہیں ابھی سے بیٹیوں کی فکر کیا پڑ گئی۔ ابھی تو ایک پانچ سال کی ہے۔ دوسری تین سال کی ہے۔ ابھی تو ایک عمر پڑی۔

عورت:۔ عمر یونہی گذر بھی جاتی ہے۔

مرد:۔ اچھا میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا کہ تمہاری سہیلی ہے تو پھر ہم کون بولنے والے بیچ میں۔

عورت:۔ میں نے کب کہا ہے کہ میری سہیلی ہے۔ مجھے تو سخت بُری لگتی ہے۔

مرد: بُری لگتی ہے؟

عورت: اُس کے بات کرنے کا انداز مجھے زہر لگتا ہے۔ اپنے گھر والوں کی تعریف کرنے لگے گی تو آسمان پر چڑھا دے گی۔ بس ایسا لگتا ہے کہ اس دنیا میں اگر کوئی لائق لوگ ہیں تو اس کے گھر والے۔ ہم لوگ تو اُن کے پاؤں کی جوتی بھی نہیں۔

مرد:۔ خیر اپنے گھر والوں کی تو سب ہی تعریف کرتے ہیں۔

عورت:۔ واہ! پندرہ برس ہوگئے ہماری شادی کو۔ آج تک کبھی ایک مرتبہ بھی سنا ہے کہ اپنے گھر والوں کی تعریف کی ہو۔ حالانکہ ہم کریں تو کوئی بات بھی ہے۔ ہمارے باوا اسکتر تھے اور ایک دُنیا پرائی کی حکومت تھی۔

مرد:۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے اپنی ہر چیز کی تعریف کرتے ہیں۔

عورت:۔ ہمیں تو بہت برا لگتا ہے۔ اپنے منہ میاں مٹھو۔ کہ ہمارے میاں نے یہ کمال کر دیا اور ہمارے بچے ایسے تمیز والے ہیں اور اس کے
لڑکے اسلم کو تو دیکھا ہے آپ نے کبھی آجاتا ہے تو گھر میں ایک چیخ پکار مچ جاتی ہے اس کو مار اس کی چیز چھین۔

مرد:۔ اس لڑکے کو تو گھر میں گھسنے نہیں دینا چاہئے۔ تمہاری سہیلی کا بیٹا ہے اس لئے چپ ہو رہتا ہوں۔

عورت:۔ مجھے بھی اس سے چڑ ہے۔ لیکن پھر سوچتی ہوں کہ سنا ہے پڑھائی میں اچھا ہے اگر لائق ہو گیا تو آخر ہمارے گھر میں بھی بیٹیاں ہیں۔

مرد:۔ لاحول و لاقوۃ۔ یہاں پل کی خبر نہیں اور تم سوچ رہی ہو برسوں کی باتیں۔ ایسی پھوہڑ ماں ہے تو اس کا بیٹا کیا نکلے گا۔

عورت:۔ پھوہڑ سی پھوہڑ۔ اسے تو کپڑے پہننے تک کا سلیقہ نہیں لیکن خیر بڑوں کے نام اچھے۔ اور یوں تو اسلم میں مار دھاڑ کی بڑی بری عادت
ہے۔ لیکن ہماری سکینہ سے اسے بڑا لگاؤ ہے۔

مرد:۔ ارے چھوڑو بھی اس قصے کو۔ ذرا گھڑی پر وقت دیکھ کر، اب انور کے گھر والے کیا آئیں گے اس وقت۔

عورت:۔ اور جمیری کی ماں آ رہی ہے۔

مرد:۔ تو۔ ؟

عورت:۔ میں اللہ ماری اس سے کہہ چکی ہوں کہ رضیہ کا رشتہ ہو گیا ہے۔

مرد:۔ ہیں یہ تم نے کیسے کہہ دیا ؟

عورت:۔ یہ بھی آپکا قصور ہے۔

مرد:۔ میرا قصور۔ ! وہ کیسے۔ ؟

عورت:۔ آپ ہی نے تو کہا کہ بات پکی ہے۔

مرد:۔ لو اور سنو۔ جب رشتہ ہوا نہیں تو بات منہ سے کیسے نکال دی۔

عورت:۔ بس۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میری بیٹی کے لئے بڑے بڑے افسروں کے رشتے آ رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ یہ کہے گی ہماری لڑکی میں
کوئی نقص ہے جبھی رشتہ نہیں ہو رہا۔ بس غصے میں آ کر کر دی بات میں نے۔

مرد:۔ تو ایسی ڈینگ نہیں مارنی چاہئے تھی تاکہ بعد میں شرمندگی ہو۔

عورت:۔ آپ نہیں سمجھتے۔ میں جب اس کی باتیں سنتی ہوں تو میرا خون کھولنے لگتا ہے بس یہی جی چاہتا ہے وہ کہے کہ ہم نے کوٹھی خریدی ہے
تو میں کہوں ہم نے شہر خرید لیا ہے۔ وہ کہے کہ میں نے نیکلس بنوائی ہے تو میں کہوں کہ میں نے سونے کا برتن بنوایا ہے۔ وہ کہے کہ میں ناچنا
جانتی ہوں تو میں کہوں کہ میں اڑنا جانتی ہوں۔

مرد:۔ سمجھ گیا۔ اس بیماری کو کمزوریٔ دماغ کہتے ہیں۔

عورت:۔ آپ کچھ بھی کہیں۔ ناک پر مکھی بیٹھنے ہم بھی نہیں دیں گے۔

مرد:۔ چاہے ناک کٹ جائے۔

عورت:۔ ناک کٹے میرے دشمنوں کی۔ میری ناک کیوں کٹنے لگی خدانخواستہ (دروازے پر کھٹکا ہوتا ہے)
لو میرے خیال میں وہ آ گئی۔ آپ ذرا اندر چلے جائیں۔

مرد:۔ مجھے اندر قید ہو کر بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں رستے میں گلی میں نکلتا ہوں شاید میر صاحب سے ملاقات ہو جائے۔

عورت :۔ اچھا۔

مرد :۔ (دائیں جانب چلتے ہوئے آہستہ سے) اور تم اس سے جلدی چھٹکارا حاصل کرنا۔

عورت :۔ ہاں۔ ہاں آپ نکلئے تو

(مرد دائیں جانب سے نکل جاتا ہے۔ عورت بھی اس کے پیچھے پیچھے جا کر چک ہٹاتی ہے)

عورت :۔ آئیے نا اندر۔ آئیے۔

برقعے میں لپٹی ہوئی ایک دبلی پتلی ادھیڑ عمر عورت داخل ہوتی ہے۔ کمرے میں داخل ہو کر برقع اتارتی ہے۔ واقعی اسے کپڑے پہننے کا سلیقہ نہیں۔ قمیض ڈھیلی ڈھالی ہے اور ایک مٹے ہوئے جامنی رنگ کی شلوار ہے۔ رنگ گندمی۔ دُبلے چہرے پر ناک سامنے کو نکلی ہوئی اور پھر اس پر عینک۔ شکل سے کسی پرائمری اسکول کی استانی لگتی ہے)

دوسری عورت :۔ گئی تھی وہ لوگ گھر پر نہیں تھے۔

عورت :۔ میں بھی سوچ رہی تھی کہ اتنی جلدی کیسے پلٹ آئیں۔ کہاں گئے ہیں وہ۔

دوسری عورت :۔ نوکر کہہ رہا تھا لڑکے کے پاس ہونے کی خوشی میں پکنک منانے باہر چلے گئے ہیں۔

عورت :۔ بیٹھئے۔ آپ بیٹھی ہی نہیں رہیں — ہائے کتنی پیاری قمیض ہے (قریب آ کر جبیں کی ماں کی قمیض اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھتی ہے)

دوسری عورت :۔ جبیں کے ابا کہہ رہے تھے کہ سارے بازار میں بس ایک ہی قمیض کا ٹکڑا ملا ہے۔

عورت :۔ ان لوگ ہاتھوں ہاتھ لے گئے ہوں گے۔

دوسری عورت :۔ جبیں کے ابا کہہ رہے تھے کہ مل میں سے بن کے اتنا سا نکلا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے بنایا ہی نہیں۔

(لمبی سانس لیکر بائیں جانب کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

عورت :۔ آپ کیا پئیں گی۔ شربت یا چائے

دوسری عورت :۔ جی نہیں کچھ نہیں۔ گھر سے ابھی پی کر آ رہی ہوں۔

عورت :۔ تو ایک پیالی اور سہی۔

دوسری عورت :۔ اصل میں آج جبیں کے ابا بازار سے بہت سا حلوہ سوہن تحفۃً لائے تھے۔ جب چیز خریدتے ہیں تو بس اندھا دھند خریدتے ہیں۔ میں تو مٹھائی کی شوقین نہیں ہوں لیکن سوچا ذرا چکھ لوں۔ واقعی ایسا حلوہ میں نے کبھی نہیں کھایا۔ خالق نے ضرور خاص طور پر ان کے لئے بنایا ہو گا۔ بس تو طبیعت سیری ہو گئی ہے آپ بھی بیٹھ جائیے نا۔

عورت :۔ (بیٹھتے ہوئے) ہم نے بھی آرڈر دے کر سموسے بنوائے تھے لیکن خیر آپ کا جی نہیں چاہ رہا تو پھر سہی۔

دوسری عورت :۔ ہاں سموسے ہیں۔ سموسوں کی اور بات ہے نمکین چیز کھا لیتی ہوں۔

عورت :۔ ابھی لاتی ہوں گرم کر کے۔ (اٹھتی ہے)

دوسری عورت :۔ بیٹھئے جلدی کیا ہے؟

عورت :۔ (بیٹھتے ہوئے) اسلم کو نہیں لائیں ساتھ؟

دوسری عورت :۔ میں نے کہا تھا چلو۔ اپنی کتابوں سے چمٹا بیٹھا تھا۔ کہنے لگا نہیں امی آپ جائیے۔ میرا خیال ہے شرماتا ہے۔

عورت :۔ بڑا اچھا بچہ ہے۔

دوسری عورت :۔ میں تو کہتی ہوں کہ خدا کے لئے ہنسا کھیلا کرو لیکن اس کی عادت ہی نہیں۔ مجال ہے کبھی شرارت کرے یا شور ہی مچائے۔

عورت :۔ میری سکینہ کو بھی تو یہی اللہ کی مار ہے۔ چپ چاپ بیٹھی اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ اس کی استانی نے کہا تھا کہ اسے دو جماعت اگلی ترقی دیتے ہیں۔ اس کے ابا نے منع کر دیا۔

دوسری عورت :۔ ہائے تو بچاری کو پڑھنے دیا ہوتا۔

عورت :۔ نہیں وہ بولے کہ بچہ سال بہ سالی ہی پڑھے تو اس کی بنیاد پکی ہوتی ہے۔ ہمیں کونسی نوکری کرانی ہے۔

دوسری عورت :۔ سچ کہا ہے۔ میری زہرہ ہے نا وہ کہہ رہی کہ میں بی اے کروں گی۔ لیکن اس کے والد کہتے ہیں نہیں۔

عورت :۔ ہائے کیوں۔ وہ تو اس سال بی۔اے کا امتحان دینے والی ہے۔

دوسری عورت :۔ اصل میں لڑکے والے دسمبر میں شادی چاہ رہے ہیں۔ اور امتحان ہے اپریل میں۔

عورت : تو اس کا رشتہ ہو گیا کیا؟

دوسری عورت :۔ ابھی ایک ہفتہ ہوا بات پکی ہو گئی ہے۔

عورت :۔ آپ نے ذکر ہی نہیں کیا۔ ہائے بتایا تو ہوتا۔

دوسری عورت :۔ اصل میں منگنی اور نکاح ایک ساتھ کر رہے ہیں۔ آپ کے ہاں بھی بلاوا آئے گا۔

عورت :۔ اللہ مبارک کرے! بڑی خوشی ہوئی

دوسری عورت :۔ میں تو پریشان ہو گئی ہوں۔ لڑکی کی عمر ہی کیا ہے۔

عورت :۔ اچھا ہے بہن، لڑکیاں اپنے گھر ہی چلی جائیں تو اچھا ہوتا ہے ذمہ داری ہے۔ خدا نے آپ کی یہ ذمہ داری پوری کی۔

دوسری عورت :۔ سچ کہتی ہیں اور ایک لحاظ سے اچھا ہی ہے۔ اتنے لوگ آ رہے تھے۔ رشتہ مانگنے کہ میں تو پریشان ہو گئی تھی۔

عورت :۔ لڑکا کیا کام کرتا ہے ماشاء اللہ؟

دوسری عورت :۔ آڑھت کی دکان ہے۔ بڑے امیر لوگ ہیں۔ اسلم کے والد کہتے ہیں کہ نوکری والوں میں کیا رکھا ہے۔ سوکھی تنخواہ کیا چیز ہوتی ہے۔

عورت :۔ بالکل ٹھیک کہا ہے آپ نے۔ ہم نے بھی یہی سوچ کر رضیہ کے لئے جہاں رشتہ کیا تھا چھوڑ دیا۔

دوسری عورت :۔ ہائیں! چھوڑ دیا۔؟

عورت :۔ وہ آپ کو بتایا تھا نا اس روز کہ سکینہ کے ابا کے دفتر میں ایک لڑکا ہے۔ انہوں نے پوچھ پوچھ کر ہمارا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ میں نے تنگ آ کر ہاں کر دی۔ پھر سوچا کہ رضیہ کا بنے گا کیا۔ سٹینوگرافر کی تنخواہ ہی کیا ہوتی ہے اور پھر جلدی بھی نہیں ہے۔ لڑکی چھوٹی ہے۔ مجھ سے دس برس چھوٹی ہے یہ سمجھ لیجئے

دوسری عورت :۔ آپ کی عمر کیا ہو گی اس وقت؟

عورت :۔ میں تو اپنی عمر سے پہلے بوڑھی لگنے لگی ہوں۔ ویسے اب کے چاند پچیس برس کی ہو جاؤں گی۔

دوسری عورت :۔ نہیں آپ تو ماشاء اللہ جوان لگتی ہیں۔ بوڑھے تو ہم لگتے ہیں۔

عورت :۔ لو آپ بھی کیا بوڑھی ہیں۔ مجھ سے کوئی ایک آدھ سال ہی بڑی ہوں گی۔

دوسری عورت:۔ جب سے بچے جوان ہو گئے ہیں۔ ہم تو اپنی عمر کا ذکر ہی نہیں کرتے۔ کوئی کس کس کو بتایا پھرے کہ ہماری شادی تیرہ برس کی عمر میں ہو گئی تھی

عورت:۔ اجی گولی ماریئے دنیا کو۔ اپنے دل میں تو ہمیں پتہ ہی ہے کہ ہماری عمر کیا ہے۔

دوسری عورت:۔ تو اس حساب سے آپ کی چھوٹی بہن پندرہ برس کی ہوگی۔ ہاں یہ تو کوئی زیادہ عمر نہیں ہے۔

عورت:۔ معلوم نہیں لوگ اپنی عمر کیوں غلط بتاتے ہیں۔ ہم سے تو قرآن پر قسم لے لیجئے جو کبھی یہ بات لوگوں سے چھپائی ہو۔

دوسری عورت:۔ یونہی عورتوں کو خدا کی مار ہے۔ نمازیں پڑھیں گی۔ روزے رکھیں گی لیکن عمر پوچھو تو جھوٹ ہی بولیں گی! اب اس منوری کو لو بیٹے نے

میٹرک پاس کیا ہے اور کہتی ہیں کہ میں بیس برس کی ہوں۔

عورت:۔ لوگوں کے دل میں تو خدا کا خوف نہیں رہا۔

دوسری عورت:۔ مجھے خود ایسی عورتوں سے نفرت ہے۔ منوّر تو ایسی ایسی باتیں کرتی ہے کہ غصے سے خون کھول جاتا ہے۔

عورت:۔ اچھا! میں اسے ایک ہی دفعہ ملی ہوں۔ زیادہ نہیں جانتی۔

دوسری عورت:۔ اتنی ڈینگیں مارے گی، اتنی ڈینگیں مارے گی کہ جی چاہے گا اُٹھ کر بھاگ جائیں۔ بس اُس جیسا کوئی حسین نہیں ہے اس کے بچوں جیسا کوئی

امیر نہیں ہم لوگ ٹھہرے فقیر۔

عورت:۔ میرا تو ایسی عورت سے ملنے کو بالکل جی نہ چاہتا۔ معلوم نہیں آپ کیسے مل لیتی ہیں۔

دوسری عورت:۔ سوچتی ہوں آدمی آدمی کے کام آتا ہے آخر ہم بھی بیٹیوں والے ہیں۔

عورت:۔ تو اس کا کوئی بیٹا جوان بھی ہے؟

دوسری عورت:۔ نہیں سب سے بڑا تو یہی ہے جس نے میٹرک پاس کیا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کبھی کبھی آتا ہے اور مجھ سے بڑی محبت کرتا ہے

"خالہ جی خالہ جی" کہتے کہتے بچارے کا منہ سوکھتا ہے۔

عورت:۔ ماں بہن بزرگوں کے ہاں اچھے۔

دوسری عورت:۔ اللہ بہن خدا لگتی کہوں تو آج کل ماں باپ کو دیکھ کر کون رشتہ کرتا ہے۔ بس لڑکا دیکھتے ہیں۔

عورت:۔ یہ تو سچ ہے۔

دوسری عورت:۔ میری چھوٹی بیٹی ہے نا جمیری وہ ذرا حساب میں کمزور ہے میں کبھی کہتی ہوں کہ وہ اُسے حساب پڑھاتا ہے تو پڑھا دیا کرے۔

دونوں بچے ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔

عورت:۔ اب زمانے کی ہوا بدل رہی ہے اب تو لڑکے کی مرضی سے شادی ہوتی ہے۔ ماں باپ کو کون پوچھتا ہے۔

دوسری عورت:۔ اب میرا اصول ہے کہ اپنی خالہ کی لڑکی پہ جان چھڑکتا ہے میں بھی سوچتی ہوں کہ بہن کی بیٹی ہے آؤں اغیروں کے ہاں شادی کرنے سے خرابی ہی

ہوتی ہے۔

عورت:۔ سرد مہری سے) اللہ ان بچوں کو زندگی دے۔ ہم تو یہی دعا مانگتے ہیں۔ جہاں جی چاہے ان کی شادی کریں۔ جی چاہے۔ رشتہ داروں میں کریں

جی چاہے باہر کریں۔

باہر سے دروازے پر کھٹکا)

عورت:۔ (اُٹھ کر) کون ہے۔

باہر سے اس کے میاں کی آواز آتی ہوئی:۔

عورت:(چک کے پاس جاکر جھانکتی ہے) کیا کوئی چیز چاہیئے آپ کو؟

مرد:۔نہیں ابھی ابھی نامدار صاحب آئے تھے۔ لڑکے والوں کی طرف سے انگوٹھی دے گئے ہیں مبارک ہو!۔

عورت:۔(ایک دم ہشاش بشاش) آپ کو بھی مبارک ہو لڑکے کی ماں کیوں نہیں آئی!

مرد:۔اچانک بیمار ہو گئی۔ میں ذرا نامدار صاحب کو گلی کی نکڑ تک چھوڑ آؤں۔ آتا ہوں۔

عورت:۔اچھا جلدی آجایئے پھر آپ سے کچھ مشورہ بھی کرنا ہے۔ (چک سے انگوٹھی کی ڈبیا لئے ہوئے پلٹتی ہے)

دوسری عورت:بہن مبارک ہو!

عورت:۔آپ کو بھی مبارک ہو!

دوسری عورت:۔یہ رضیہ کے رشتے کی بات ہو رہی تھی نا؟

عورت:۔جی ہاں۔ اللہ نے اپنا فضل کیا ہے اور یہ کام بھی ہو گیا۔ (انگوٹھی کی ڈبیا کھولتی ہے)

دوسری عورت:۔دیکھیں انگوٹھی۔

عورت:۔سکینہ کے ابا کہہ رہے تھے کہ اصل ہیرے کی ہے۔

دوسری عورت:۔کتنے کی ہوگی!

عورت:۔ہزار روپے کی تو ہوگی (برابر بیٹھ جاتی ہے)

دوسری عورت:اب تو کوئی ہزاروں میں ایک ہوتا ہے جو اصلی ہیرے کی انگوٹھی دیتا ہے ہمارے زمانے میں تو سارا زیور ہیرے، زمرد، نیلم کا ہوتا تھا مجھے ماں باپ نے تین سیٹ دیے تھے (ہاتھ میں انگوٹھی لے کر دیکھتی ہے) واقعی اصلی ہیرے کی ہے

عورت:۔(انگوٹھی کو لیکر ڈبیا میں بند کرتی ہے) اللہ رضیہ کے نصیب کرے!

دوسری عورت:آمین! لڑکے کی ماں کیوں نہیں آئی!

عورت:اس کا دل کچھ کمزور ہے اُسے پھر دورہ پڑا ہے۔ لڑکی دیکھنے کے لئے آئی تھی تو یہاں بھی اسی طرح دل کا دورہ پڑا تھا رضیہ بچاری نے بڑی خدمت کی۔ سکینہ کے ابا جاکر ڈاکٹر کو لائے۔ بس اس دن سے وہ بچارے ہمارے نام کا کلمہ پڑھتے ہیں۔

دوسری عورت:۔ہاں بہن آپ کی محبت تو غیروں کو اپنا کر لیتی ہے۔

عورت:اصل بات دل کی سچائی ہوتی ہے۔ اب آپ آتی ہیں تو میں دل سے خوش ہوتی ہوں اس لئے آپ کو بھی اچھا لگتا ہے

دوسری عورت:۔دنیا میں خلوص بڑی چیز ہے۔ ہاں یہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں کہ لڑکا ماشاء اللہ کیا کرتا ہے۔

عورت:بہت کھاتے پیتے لوگ ہیں۔

دوسری عورت:تو کوئی کاروبار ہے اُن کا؟

عورت:۔نہیں لڑکا تو ان کے دفتر میں ملازم ہے۔ لیکن ملازمت تو بس شوقیہ ہے۔ ورنہ ماں باپ کے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔

دوسری عورت:۔(سوچتے ہوئے) ایک اسی دفتر کا لڑکا تھا۔ جس کا رشتہ آپ نے چھوڑ دیا تھا۔ یہ تو اور ہوگا؟

عورت:نہیں وہی ہے۔

دوسری عورت:۔ وہی ہے؟

عورت (پرمسرت) ہم نے تو چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اب لڑکے والے مجبور کر رہے ہیں تو سکینہ کے ابا ہاں کر آئے۔ ایک ہی دفتر میں دشمنی بھی تو مول نہیں لی جا سکتی۔ نوکری کا معاملہ ہے

دوسری عورت:۔ لیکن آپ تو کہہ رہی تھیں کہ لڑکا سیننو گرافر ہے۔

عورت:۔ وہی تو لیکن بس شوقیہ ہے اس کے گھر والے رضیہ کے نام اپنی کوٹھی لکھ کر دیں گے۔

دوسری عورت:۔ ہاں بہن کچھ لکھوا ضرور دینا۔

عورت:۔ وہ تو پہلے ہوگا۔ جب اتنی منت خوشامد سے رشتہ لیا ہے تو خود ہی لکھ کر دیں گے۔ (دروازہ پر کھٹکھٹ)

عورت: کون ہے۔

باہر سے میاں کی آواز: میں ہوں۔

دوسری عورت: (برقعہ اٹھا کر) اچھا بہن میں چلتی ہوں۔ دیر ہو رہی ہے۔

عورت (بے دلی سے) بیٹھئے نا۔ آپ تو آتی ہی کب ہیں!

دوسری عورت: نہیں انشاء اللہ آؤں گی جلدی ہی۔ (برقعہ پہن کر) اچھا خدا حافظ!

عورت: خدا حافظ: (پھاٹک تک چھوڑنے جاتی ہے۔ جیسے ہی وہ باہر نکلتی ہے مرد داخل ہوتا ہے)

عورت: اور کیا کہا تابعدار صاحب نے؟

مرد:۔ وہ یہ کہہ رہے تھے کہ لڑکے والے حق مہر لکھ کر نہیں دیں گے۔

عورت:۔ پھر۔؟

مرد:۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ آپ کو اختیار ہے۔

عورت: ہاں جی لعنت بھیجئے حق مہر پر۔ ہم کوئی لڑکی کو بیچ تھوڑے ہی رہے ہیں۔ بس میاں بیوی خوش رہیں، ہم تو یہی چاہتے ہیں۔

مرد:۔ رضیہ کہاں ہے؟

عورت: ہائے میں مر گئی۔ رضیہ کو تو بتایا ہی نہیں۔ (آواز دیتی ہے)

رضیہ! اے رضیہ!......(درد)

وہ اس قدر شدید زخمی تھا کہ اس کا زندہ رہنا مشکل تھا — اکتوبر ۶۳ء

دراصل ہم نوجوان میں سے ہر شخص آج اس کو اپنا [illegible] سمجھتے۔ زندگی کو دراصل [illegible]

کا آزمائش گاہ سمجھا جاتا ہے۔ [illegible] اسے بچانے کی سارا

تدبیریں کی گئیں — مگر وہ ہمارا ہو نہ سکا — بہت [illegible] کا ساتھ

[illegible] —

[illegible]

عکس تحریر۔ یونس جاوید

# خانے اور تہہ خانے

کمال احمد رضوی

## پہلا منظر

سول لائن میں واقع ایک درمیانے درجے کی کوٹھی کا کمرہ، جو نہایت ہی نفاست اور سلیقے سے آراستہ ہے۔ کمرے میں کوئی قیمتی فرنیچر نہیں، لیکن بید کی کرسیاں اور دیوار کی چھوٹی چھوٹی تپائیاں بڑے سگھڑاپے کے ساتھ کمرے کے وسط میں رکھی ہوئی ہیں، تپائی کے اوپر ہاتھ کے بنے ہوئے جھالردار تپائی پوش بچھے ہیں، کمرے میں دو دروازے ہیں۔ ایک بائیں جانب برآمدے میں کھلتا ہے اور یہ زنان خانے کا راستہ ہے، دوسرا دہنے ہاتھ کے کمرے میں کھلتا ہے۔ سامنے سڑک کے رخ ایک بڑا سا دریچہ جس پر چق پڑی ہے۔

جب پردہ اٹھتا ہے تو مارچ کی ایک چمکیلی اور خوشگوار صبح کا منظر ہے، دریچے سے کمرے کے اندر دھوپ کی روشنی آ رہی ہے۔ امی شال لپیٹے ہوئے بید کی کرسی پر بیٹھی آنچل سے رگڑ رگڑ کر عینک صاف کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ ۵۰ کے لگ بھگ کی خوش شکل عورت ہیں، بال ابھی تک غیر معمولی طور پر سیاہ ہیں، البتہ چہرے کے اوپر چربی کی زیادتی سے منہ ڈھلک گیا ہے، لانبا قد۔ امی کے سامنے بید ہی کی کرسی پر راحت دونوں پاؤں کرسی پر رکھے بننگ میں مصروف ہے۔ تپائی کے اوپر اون کا گولا رکھا ہے جوں جوں راحت تیزی سے بنتی جاتی ہے، گولا بار بار اوپر ادھر ادھر لڑھکتا رہتا ہے۔ راحت ۱۴-۱۵ کے درمیان نہایت سمجھدار لڑکی ہے۔ اکثر نچلے ہونٹ کو دانتوں کے تلے دبائے رہتی ہے۔ یہ عادت اس کی نیلی ٹھوڑی کے اوپر ایک عجیب دلآویز قسم کا خم پیدا کر رہی ہے۔

دریچے کے باہر سے کوٹھی کے احاطے میں ایک تانگے کے داخل ہونے کی آواز، جو لحظہ بلحظہ قریب ہوتی جاتی ہے۔ گھوڑے کی ٹاپ مدھم ہو کر رک جاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد دروازے کی گھنٹی کی کرخت آواز گونجتی ہے۔

**امی** :۔ (عینک کو آنکھوں کے اوپر چڑھاتے ہوئے) راحت، بس ہو بھی چکی بننگ، چلو اندر جاؤ اپنے کمرے میں، کوئی تمہارے ابا کے ملاقاتی معلوم ہوتے ہیں۔ (گھنٹی پھر بجتی ہے، راحت اون کے گولے کو بے دلی سے اٹھاتی ہے)
آنچل تو ٹھیک کر لو، تم سے سنبھلتا ہی نہیں۔ (دوسرے کمرے کی طرف منہ کر کے پکارتی ہے) مجیدن۔ او مجیدن!

**مجیدن کی آواز** :۔ آئی بی بی جی۔

**امی** :۔ (اسی توازن کی آواز کے ساتھ) دیکھو باہر کون ہے، خان بہادر صاحب کا لڑکا آنے والا تھا، اگر وہ آئے ہوں تو انہیں ڈرائنگ روم کھول کر بٹھاؤ۔

**مجیدن کی آواز** :۔ اچھا۔

**راحت** :۔ وہی لڑکا تو نہیں امی، جو امتحان دینے لاہور آیا تھا؟

امی :۔ خان بہادر کو تم نہیں جانتیں ؟ ارے نینی تال والے خان بہادر۔ تم تو ان کی گودوں میں کھیلی ہو۔

راحت :۔ (کرسی پر دوبارہ بیٹھتے ہوئے) اچھا وہ خان بہادر صاحب جن کی فرنچ کٹ داڑھی تھی اور جو موٹا کل۔

امی :۔ (بات کاٹ کر) خیران کا لڑکا ہفتہ بھر یہیں ٹھہرے گا۔ امتحان ختم کرنے کے بعد واپس چلا جائے گا۔ تم ادھر ڈرائینگ روم کی طرف نہ جانا۔ اللہ تمہیں زور زور سے باتیں کرنے کو بھی منع کیا ہے۔ (راحت اون کے گولے اچھالتی اور پھر ہاتھوں میں تھام لیتی ہے۔ اس سے اُس کی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ بلند ہوتی ہے) راحت تمہاری چوڑیاں بھی بہت بجتی ہیں۔ اب تم دودھ پیتی بچی نہیں ہو۔ ذرا دیکھ سے کام لیا کرو۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ والا کمرہ تمہارے کمرے کی پشت پر ہے اس لئے ان باتوں کا اور زیادہ خیال رکھنا ہوگا۔ میں نے وہی کمرہ اس لڑکے کے لئے تجویز کیا ہے۔

راحت :۔ مگر وہ تو آپ کا کمرہ ہے۔

امی :۔ نزہت آج سے تمہارے کمرے میں اٹھ آئے گی۔

(مجیدن اندر داخل ہوتی ہے۔ عام اَن پڑھ عورت ہے، شلوار قمیض پہنے ہوئے)

مجیدن :۔ بی بی جی۔ کوئی جاوید صاحب ہیں، اُن کے ساتھ اُن کا سامان بھی ہے، کہتے ہیں وہ یہیں ٹھہریں گے۔

امی :۔ تم نے ڈرائینگ روم کھول دیا ؟

مجیدن :۔ جی ہاں انہیں وہیں بٹھا رکھا ہے۔

امی :۔ کیا کیا سامان ہے اُن کے ساتھ ؟

مجیدن :۔ ایک سوٹ کیس، ایک بستر، ایک کتابوں سے بھری ہوئی ٹوکری اور ایک تھرموس۔

امی :۔ وہ سارا سامان اس کمرے میں لا کر رکھ دو۔

مجیدن : بہتر (جانے کو مڑتی ہے)

امی :۔ اور سنو

مجیدن :۔ جی

امی :۔ کیا عمر ہوگی ؟ (جلدی سے) جاوید نام بتلایا نا ؟

مجیدن :۔ جی ہاں، تیئس چوبیس کا لگتا ہے۔ بڑا خوب صورت لڑکا ہے بی بی جی۔ راحت بی بی کے قد کا۔

امی :۔ (راحت کی موجودگی کو محسوس کرکے) مجیدن، تیری باتیں بنانے کی عادت کب چھوٹے گی ؟ میں نے عمر پوچھی تھی، حلیہ اور قد نہیں پوچھا تھا۔

مجیدن :۔ (سٹپٹا کر) جی....

امی :۔ اچھا کپڑے کیا پہن رکھے ہیں ؟

مجیدن :۔ بڑے صاحب جیسا کالا سوٹ اور اُسی رنگ کا سر میں ایک کان لگایا ہوا ہے۔

امی :۔ کان !

راحت :۔ (ہنس کر) "ہو" کو کان کہہ رہی ہوگی۔

امّی :۔ اچھا اور ؟

مجیدن :۔ پاتپ بھی دبا رکھا ہے ہونٹوں میں۔ بڑے صاحب کی طرح۔

امّی :۔ اچھا نفاست پڑکا معلوم ہوتا ہے۔ میں نے تو اُسے تب دیکھا تھا جب وہ ذرا سا پھرا کرتا تھا۔ نزہت اور اس کی پیدائش میں ایک ہی رات کا فرق ہے، کتنی ہی دفعہ میری گود میں کھیلا ہے۔ (سانس لے کر) مگر اسے وہ باتیں کیا یاد ہوں گی۔

مجیدن :۔ (چونک کر) اللہ میں تو بھول ہی گئی۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ چچی جان کو سلام کہنا۔

امّی :۔ (لپک کر) اچھا!..... مجیدن تو بھی بڑی لودم عورت ہے۔ کم از کم شربت چائے کو تو پوچھا ہوتا.... جا.... جلدی کر۔ شربت کا گلاس جلدی لے جا۔

مجیدن :۔ اچھا بی بی جی۔

امّی :۔ ہاں سنو، گلاس طشتری میں رکھ کر لے جاتیو.... اور ہاں، ان سے پوچھنا کھانا کس وقت کھاتے ہیں.... اور سنو.... اُن سے کہنا.... اُن کے چچا جان کچہری سے ابھی نہیں لوٹے... آرام سے بیٹھیں اُن کا اپنا گھر ہے

مجیدن :۔ (دروازے پر سے) بہت اچھا بی بی جی.... (چلی جاتی ہے)

راحت :۔ امّی، آپی کالج سے ابھی تک نہیں آئیں ؟

امّی :۔ آجائے گی، تمہیں کیوں فکر پڑی ہے.... یہ اُون کا گولہ تو اُٹھا لو... لڑھکتا لڑھکتا کہاں چلا گیا ہے۔

راحت :۔ اوہ.... (جُھک کر اُون کا گولہ فرش پر سے اٹھا لیتی ہے)

امّی :۔ ساری اُون کو تو میلا کر کے رکھدیا تم ہتھ لڑھکاتی جو پھرتی ہو۔

راحت :۔ ہوں، اسے تو مجّو نے میلا کیا ہے۔ میں نے اب دیکھا ہے۔ گیند بنا کر کھیل رہا تھا گولے کو۔

امّی :۔ اچھا آ لینے دو اُسے ابھی خبر لیتی ہوں۔

(مجیدن سوٹ کیس اُٹھائے اندر داخل ہوتی ہے)

امّی :۔ (ایک طرف اشارہ کر کے) مجیدن، اِدھر اِدھر۔ یہاں رکھو.... بستر کو کھول کر پچھلے کمرے کی مسہری پر لگا دو، اور یہ کتابیں بھی اسی کمرے کے شیلف پر لگا دو۔ (مجیدن سوٹ کیس رکھدی ہے) ارے دکھانا مجیدن ذرا سوٹ کیس.... (مجیدن اٹھا کر سوٹ کیس تپائی پر امّی کے سامنے رکھ دیتی ہے) اس پر تو اس کا نام بھی لکھا ہوا ہے۔ جاوید اختر.... (سوٹ کیس کو کھولتی ہیں) بڑا قیمتی سوٹ کیس معلوم ہوتا ہے۔ بالکل نیا ہی تو لگتا ہے.... اندر کا استر کتنا خوب صورت ہے۔ مخمل ہے۔ یہ ایرو مار کی قمیض، کالر کتنی خوبصورتی سے اسٹیچ کئے ہوتے ہیں (البم اٹھاتی ہے) یہ البم ہے۔ یہ فاؤنٹین پین۔ سیاہی۔ یہ کیمرہ۔ یہ (رُک جاتی ہے، یہ کس کی تصویر ہے۔ ... (چونک کر بکس بند کر دیتی ہے۔ راحت سے) راحت، تم اپنے کمرے میں جاؤ۔

راحت :۔ (بے بس ہو کر) اچھا امّی جان (جیسے، تم کاہے کو ٹھہرنے دو گی۔ جانے لگتی ہے)

امّی :۔ چوڑیاں زور سے نہ بجیں اور چیخ چیخ کر بات کرنے کی بھی ضرورت نہیں، تمہارے کمرے کی تمام آواز ڈرائنگ روم میں سُنائی دیتی ہے۔ اچھا، چلو جاؤ۔

(راحت بُرا سامنہ بنا کر چلی جاتی ہے)

مجیدن :۔ بی بی جی ....

امی :۔ اسوٹ کیس کو دوبارہ کھولتے ہوتے) کیا بات ہے مجیدن ؟

مجیدن :۔ یہ لڑکا آپ کا رشتہ دار ہے۔

امی :۔ ارے، تو خان بہادر کو نہیں جانتی ؟ وہ جو نینی تال میں ہماری کوٹھی کے ساتھ رہتے تھے.... وہی فرنچ کٹ داڑھی والے۔

مجیدن :۔ وہ تو نہیں جو ایک آنکھ کا چشمہ پہنا کرتے تھے ؟

امی :۔ ہاں ہاں وہی، جو مونا کل لگایا کرتے تھے.... ٹھیک وہی....

مجیدن :۔ کیسا خوب صورت لڑکا ہے ان کا، بی بی جی... بڑا فیشن ایبل لگتا ہے۔ انگریزی بال کٹوا رکھے ہیں۔ پیشانی پر ایک بکھری ہوئی لٹ بھلی معلوم ہوتی ہے۔

امی :۔ (تصویر نکال کر) واقعی اس کی پیشانی پر بالوں کی ایک بکھری ہوئی لٹ کتنی اچھی معلوم ہوتی ہے۔

مجیدن :۔ بالکل بالکل، اسی تصویر کی طرح بی بی جی.... دیکھا آپ نے !

امی :۔ پائپ دبانے سے لبوں میں کتنا خوب صورت خم پیدا ہو گیا ہے۔

مجیدن :۔ (امی پر جھکی ہوئی) بالکل اسی طرح۔

امی :۔ اور پیشانی کتنی بلند ہے ؟

مجیدن :۔ اور بی بی جی ناک بھی تو دیکھئے، کیسی ستواں ناک ہے۔

امی :۔ اور آنکھیں کیسی بادامی ہیں (سانس لے کر) کتنی ہی دفعہ میری گود میں کھیلا اور مچلا ہے۔ اور اب — اب کیسا جوان ہو گیا ہے۔ اب وہ مجھے کیا پہچانے گا۔ اُسے تو میری شکل بھی یاد نہ ہوگی۔ سترہ برس ہو گئے ہیں ان باتوں کو۔

مجیدن :۔ ہاں بچپن کی باتیں بھلا اسے کیا یاد ہوں گی۔

امی :۔ (دوبارہ بکس کا جائزہ لیتے ہوئے اتمام ٹائلٹ کوٹی کے استعمال کرتا ہے۔ سینٹ، تیل، پاؤڈر، کریم، صابن، سب کوٹی۔ اور سوٹ کتنا قیمتی معلوم ہوتا ہے۔ ڈریس سوٹ ہے، یہ نائٹ سوٹ۔ معلوم ہوتا ہے خان بہادر صاحب اپنے بچے سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اس دفعہ امتحان پاس کرنے کے بعد وہ اسے ولایت بھیجنے والے ہیں، باپ ہو تو ایسا !

مجیدن :۔ بڑے لوگ ہیں بی بی جی ....

امی :۔ (جلدی سے یاد کر کے) تم نے شربت پلایا مجیدن ؟

مجیدن :۔ (سیدھی کھڑی ہو جاتی ہے) جی ہاں، اور اس کے بعد پان کی گلوریاں بھی پیش کیں ؟

امی :۔ ورق تو لپٹے ہوئے تھے نا !

مجیدن :۔ جی ہاں ! اور کھانے کے بارے میں بھی پوچھا تھا، کہتے تھے، میرے لئے کسی تکلف کی ضرورت نہیں، جس وقت سب لوگ کھانا کھاتے ہیں، میں بھی کھالوں گا۔

امی :۔ کیسی اچھی تربیت دی ہے ماں باپ نے، ذرّہ بھر خود سری نہیں ٹپکتی۔ (بکس کو بند کر کے) اچھا مجیدن، دیکھو، اس تصویر پر رات کا نظر نہ پڑے۔ سنا تم نے ؟

مجیدن :۔ جی (کچھ نہ سمجھتے ہوئے) جی ؟

امی :۔ میرا مطلب ہے تم اس بکس کا خیال رکھنا، اچھا اب تم جا کر کھانا تیار کرو، اور وہاں الماری سے نیا ڈنر سیٹ اور ٹی سیٹ نکال بنا، کھانے کے ساتھ بازار سے تھوڑا سا پھل بھی منگوا لینا، فروٹ سیٹ میں نکال دیتی ہوں....

مجیدن :۔ اچھا بی بی جی... (چلی جاتی ہے)

امی :۔ (پکار کر) مجیدن۔

مجیدن :۔ (دور سے) جی۔

امی :۔ (اسی توازن کی آواز کے ساتھ) گلدان کے لئے تازہ پھول منگواتے ہیں۔

مجیدن :۔ (دور ہی سے) اچھا جی۔

(پردہ گرتا ہے)

## دوسرا منظر

دو دن گذر چکے ہیں، تمام منظر وہی ہے۔ آپی کرسی پر بیٹھی، پاؤں کو تپائی پر پھیلائے بکھیر گر تر، پڑھ رہی ہے۔ عمر کوئی بائیس کے لگ بھگ، صحت مند، چہرے کے نقش موٹے، شلوار اور جمپر پہنے ہوئے، سر پر ایک بڑا سا بھدا جوڑا باندھ رکھا ہے جو اس کے چہرے کی مناسبت سے ذرا نہیں سجتا، سامنے والی کرسی پر راحت نیل کٹر سے بیٹھی ناخن تراش رہی ہے۔

آپی :۔ (رسالے سے نظر اٹھا کر) بھئی راحت، تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ اس دریچے کو بند نہ رکھا کرو۔ دم گھٹتا ہے میرا۔ سردی میں ہی تو دریچے کا لطف ہے۔ انگور کی بیلوں سے چھن چھن کر آتی ہوئی دھوپ ہی میں تو سارا حسن ہے۔

راحت :۔ امی نے دریچہ کھولنے کو منع کیا ہے۔

آپی :۔ وہ تمہاری وجہ سے کہتی ہوں گی۔ مجھے تو کبھی نہ کہا یہ کرو یہ نہ کرو۔ بھئی اگر تم اتنی چھوٹی موئی ہو تو میرے ساتھ گذرا مشکل ہے۔

راحت :۔ جب سے خان بہادر صاحب کا لڑکا آیا ہے، اور قید بڑھ گئی ہے۔

آپی :۔ (کرسی سے اچھل کر) ارے ہاں راحت، میں تو بھول ہی گئی۔ عجیب قسم کا اوٹ پٹانگ آدمی ہے یہ خان بہادر کا لڑکا بھی۔ میں نے ایک دو دفعہ ڈرائنگ روم کے چکر بھی کاٹے لیکن وہ بھلا آدمی یوں کتاب میں آنکھیں گاڑے بیٹھا رہا کہ قدرسی نظر اٹھانے کی بھی توفیق نہ ہوئی

راحت :۔ (اس جرأت پر حیران ہو کر) تو تم ڈرائنگ روم میں بھی چلی گئی تھیں۔

آپی :۔ امی سے نہ کہہ دینا۔ ہاں یوں ہی ذرا جی چاہا کہ دیکھوں، نیا مہمان کیسا ہے۔

راحت :۔ کیسا ہے آپی !

آپی :۔ اچھا خوش شکل لڑکا ہے، پر جانے کیوں لڑکیوں کی طرح جھینپتا ہے۔

راحت :۔ نیک معلوم ہوتا ہے بے چارہ۔

آپی :۔ ارے شروع شروع میں سب نیک ہی ہوتے ہیں، میں جانتی ہوں، ذرا نئے سے پرانے ہوئے، اور وہ پر پرزے نکالتے ہیں کہ توبہ توبہ!

راحت :۔ آپی آہستہ بولو کہیں ڈرائنگ روم میں کوئی سن نہ رہا ہو۔

آپی :۔ گھبراؤ نہیں، میں روشن دان سے دیکھتی ہوں۔ ذرا تپائی دینا مجھے۔

راحت :۔ نہیں آپی، ایسا غضب نہ کرو، کوئی دیکھ لے گا۔

آپی :۔ تُو بھی بڑی بور لڑکی ہے۔ ذرا دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ اچھا چل تو دروازہ بند کر دے، پھر تو کوئی نہیں دیکھے گا؟

راحت :۔ نا بابا مجھے ڈر لگتا ہے۔

آپی :۔ اوہو، لگا دے نا :۔ ڈر کی کیا بات ہے اس میں! تجھے بھی دکھاؤں گی، لے میری بہن شاباش اُسے بازو سے پکڑ کر اُٹھاتی ہے) شاباش!

(راحت دروازہ بند کر دیتی ہے)

راحت :۔ آپی!

آپی :۔ ششش (آپی تپائی کو اُٹھا کر روشندان کی دیوار کے ساتھ لگا دیتی ہے، اور پھر اوپر چڑھ کر آہستہ سے سرگوشی میں راحت سے کہتی ہے) اے راحت!

راحت :۔ (بلی کی طرح سہمی ہوئی) جی آپی!

آپی :۔ اِدھر آنا! دیکھ تو سہی۔

راحت :۔ نہیں نہیں۔ مَیں نہیں آپی!

آپی :۔ ارے بڑا مزہ آئے گا، تجھے کوئی نہ دیکھے گا، تو سب کو دیکھے گی، یہی تو آرٹ ہے۔ شاباش۔ آجا، آجا میری گڑیا (آپی راحت کی اوڑھنی پکڑ کر کھینچتی ہے۔ راحت مجبوراً تپائی کے اوپر چڑھ جاتی ہے) دیکھ، کس اسٹائل سے بیٹھا ہے ظالم۔ ادھر ابا کے سامنے : ہاں ہاں وہی، ابھی صرف پروفائیل میں نظر آ رہا ہے، منہ ادھر گھمائے گا تو پورا چہرہ نظر آئے گا۔ یہ لو، سر بھی گھما دیا۔ اب بیٹھا نشانے پر، وہ کس طرح شرما شرما کر نزاکت سے لقمے توڑ رہا ہے۔ ششش ششش۔ آہستہ آہستہ ذرا باتیں سُن۔ آ رہا ہے نا مزا!

(معاً اسٹیج پر اندھیرا چھا جاتا ہے، جب دوبارہ روشنی ہوتی ہے تو ایک کھانے کی میز کے گرد ابّا، جاوید اور مجّو بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ابّا چالیس کے لگ بھگ عمر کے آدمی ہیں، چشمہ لگائے ہوتے ہیں۔ طبیعت کے سنجیدہ واقع ہوتے ہیں۔ جاوید چوبیس سال کا لڑکا ہے اور شکل و شباہت کرداروں کی پچھلی بات چیت نے پچھلے مکالموں میں تراشی ہے، اسی کی تصویر ہے۔ مجّو پانچ سال کا لڑکا ہے، نیکر اور قمیض پہنے ہوئے۔)

ابّا :۔ (لقمہ چبا چبا کر) خوب ۔ خوب ۔ میاں زمانہ گذر گیا، کتنے انقلاب آئے۔ اب تو وہ باتیں خواب و خیال معلوم ہوتی ہیں کیا زمانہ تھا ہم اور تمہارے خان بہادر اکٹھے اسکول میں پڑھا کرتے تھے، آپس میں کتنی ہی بار جو تم پیزار تک ہوئی، مگر منے میں ہمیشہ خان بہادر ہی پہل کرتے (ہنستے ہیں) شوربا لوٹا، روکھی روٹی کیوں چبا رہے ہو۔

جاوید :۔ (سیدھی پلیٹ میں اس طرح نظریں گڑائے ہوئے، جیسے کتاب پڑھ رہا ہو) شکریہ

ابّا :۔ پھر ہم لوگ تعلیم سے فارغ ہو کر نینی تال آ گئے، اس زمانے میں مجھے اسٹیمر کے ڈوک کا ٹھیکہ مل گیا تھا۔ گنگا میں چلنے والی تمام اسٹیمریں ہماری تھیں۔ اس وقت مجّو پیدا نہ ہوا تھا (مجّو پلیٹ سے آنکھ اُٹھا کر ابّا کی طرف دیکھتا ہے، پھر اُسی تیز رفتاری سے کھانا شروع کر دیتا ہے) اُس وقت تم بالکل بچے تھے، کتنی دفعہ میری گود میں کھیلے ہو۔

جاوید :۔ جی ہاں۔ اُس وقت میں کافی چھوٹا ہوں گا۔

ابّا :۔ (قہقہہ لگا کر) کافی چھوٹا! ارے اس وقت تو تم، کہا نا میری گود میں کھیلتے تھے۔

جاوید :۔ (ندامت کو چھپاتے ہوئے) جی ہاں، بجا فرمایا۔

ابا :۔ اور اب تو وہ باتیں خواب و خیال ہوگئیں، اسٹیمر کے ڈوک کا ٹھیکہ ٹوٹ گیا۔ الہ آباد جا کے دوبارہ بیرسٹری شروع کرنی پڑی۔ اور پھر کہاں میں اور کہاں خان بہادر۔ خط و کتابت کا کچھ دنوں تک سلسلہ جاری رہا، پھر وہ بھی ختم ہوگیا۔ اور بال سفید ہوگئے میاں!

جاوید :۔ اب تو ابا کے بال بھی سفید ہونا شروع ہوگئے ہیں۔

ابا :۔ ہاں، انہیں تو ویسے بھی نزلے کی شکایت رہتی تھی غالباً۔

جاوید :۔ جی ہاں....

ابا :۔ ہاں تو جائیداد ساری ٹرانسفر کرالی؟

جاوید :۔ ساری تو کیا خیر، البتہ اشک شوئی کے برابر ہو ہی گئی

ابا :۔ میں تو، میاں، سب کچھ چھوڑ کر چلا آیا خدا کے بھروسے پر۔ اچھا ان دنوں کار کون سی ہے ان کے پاس؟ میرے وقت میں تو ایک پینیچر قسم کی واکس ہال ہوتی تھی۔

جاوید :۔ ان دنوں تو شیورلیٹ کا نیا ماڈل ہے۔

ابا :۔ (متاثر ہوکر) اچھا، خوب! یہ مرغ تو لو نا صاحبزادے، تم تو شرمارہے ہو۔ بھئی یہ بھی تمہارا ہی گھر ہے، نا آخر (پلیٹ پر بوٹیاں ڈالتے ہیں)

جاوید :۔ جی.... جی.... بجا فرمایا۔

ابا :۔ پیلشن کی بھی تو خاصی رقم ہوگی؟

جاوید :۔ جی ہاں، پانچ چھ سو کے لگ بھگ ہو جاتا ہے۔

ابا :۔ ہاں، شوربا تو لو بھئی (چمچہ بڑھاتے ہیں) ہاں، کیا بتایا، پانچ چھ سو روپے، مجھے بھی تقریباً اتنی ہی آمدنی ہو جاتی ہے، مگر میرے اور اُن کے اخراجات میں زمین آسمان کا فرق ہے، بھئی ان کے بچے ہی کتنے ہیں؟ لے دے کے ایک ناک میں کان تم ایک بیٹا، تمہاری بہنوں کا پتہ نہیں۔ ایک تو ــــ

جاوید :۔ ایک ہی تو ــــ عفت آپا۔

ابا :۔ اب تو ماشاء اللہ خاصی سیانی ہوگئی ہوگی؟

جاوید :۔ جی ہاں۔ مجھ سے دو سال بڑی ہیں۔

ابا :۔ (گھبرا کر) اچھا شادی وادی کا کچھ ہوا؟

جاوید :۔ ابا کہتے ہیں میڈیکل کا امتحان پاس کرلے تو پھر سوچا جائے گا۔ یہ آخری سال ہے۔

ابا :۔ اچھا، ڈاکٹری پڑھا رہے ہیں عفت کو! یہ تو بڑا اچھا کام ہے۔

جاوید :۔ آپ کو تو معلوم ہے ابا کتنے روشن خیال آدمی ہیں۔ انہوں نے ہماری تعلیم پر بے دریغ خرچ کیا۔

ابا :۔ درست ہے۔ درست ہے.... لیکن لڑکی ذات پر ایک طرح سے دیکھا جائے تو اتنا روپیہ خرچ کرنا بھی ایک قسم کی فضول خرچی ہے میری نزہت کو لے لو اصرار کرکے اس سال کالج میں داخل کرایا ہے، تمہاری چچی تو بالکل رضامند نہ ہوتی تھیں، بیٹی ذات ہے، اُسے کون سی ملازمت کرنا ٹھہری! ہمارے تمہارے خاندان میں ایسی کوئی مثال ہے؟

جاوید :۔ بہر حال اس زمانے میں تعلیم کی قدر و قیمت تو آپ کو معلوم ہے کس قدر ہو گئی ہے۔

ابآ :۔ ٹھیک ہے لیکن شریف گھرانوں کی لڑکیاں اس مہمل قسم کی آزادی سے کیا فائدہ اُٹھا سکتی ہیں ؟ اب مجو کو پڑھانے کا وقت آرہا ہے۔
انشاءاللہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلواؤں گا۔

جاوید :۔ (مجو سے) کیوں بھئی مجو، تم کہاں تک پڑھو گے ؟

مجو :۔ (بمشکل کھانے سے منہ کھولتے ہوئے) میں ڈپٹی کلکٹر صاحب بنوں گا۔

جاوید :۔ (ہنس کر) بھئی خوب۔ آپ سے تو ڈرنا چاہیے پھر۔

ابآ :۔ (مجو کو سرزنش کے انداز میں گھور کر) مجو، سالن لیتے وقت رکابی تو قریب کر لیا کرو۔ سارا دسترخوان شوربے سے رنگ کر رکھ دیا۔
(جاوید سے) تعلیم کے بعد تمہارا کیا ارادہ ہے ؟

جاوید :۔ بیرسٹری کا۔

ابآ :۔ سُنا ہے خان بہادر صاحب تمہیں ولایت بھیجنے والے ہیں ؟

جاوید :۔ جی ہاں، اگلے سال تک اُمید ہے۔

ابآ :۔ بھئی یہ فرونٹس تو ہونا ــــ دیکھو میں یک بار پھر واضح کر دوں، یہ بھی تمہارا ہی گھر ہے۔ میں نے ڈرائیور کو تاکید کر دی ہے کہ تمہیں روزانہ یونیورسٹی چھوڑنے اور لانے جایا کرے۔ سیر و تفریح کے لئے بھی ادھر اُدھر جایا کرو۔ ہر وقت پڑھتے ہی رہنا ٹھیک نہیں۔ میں خود امتحان کے زمانے میں بہت کم پڑھتا تھا۔ تو خیر، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ بھی تمہارا ہی گھر ہے، جس چیز کی ضرورت ہو، چچی سے کہہ دیا کرو۔ تمہاری چچی بھی یہی کہہ رہی تھیں۔ (مجو سے) زیادہ انگور نہ کھاؤ مجو، رات بھر تو کھانستا ہے۔

جاوید :۔ مجھے خدانخواستہ یہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں، اور پھر ماشاءاللہ آپ کا مکان تو اتنا آرام دہ اور نفیس ہے۔ بڑے پُرفضا مقام پر واقع ہے۔ دو قدم پر لارنس ہے۔

ابآ :۔ مگر تمہاری نینی تال والی کوٹھی تو اس سے بدرجہا بہتر تھی۔

جاوید :۔ نینی تال کی بات نینی تال کے ساتھ۔

ابآ :۔ ہاں میاں، مکان کے ذکر سے یاد آیا۔ یہاں گلبرگ میں زمین مل رہی ہے، تمہارے ابا یہاں ایک کوٹھی کیوں نہیں بنوا چھوڑتے ؟ نہایت عمدہ جگہ ہے۔ اپنی طرف کے سارے لوگ یکجا ہو جائیں گے۔

جاوید :۔ واقعی مجھے خود، یہ جگہ بہت پسند ہے۔

ابآ :۔ اچھا ٹھہر جاؤ، میں خود خان بہادر صاحب کو خط لکھتا ہوں، خود کوٹھی کا نقشہ انہیں بھجواؤں گا۔ (رُک کر) مگر کراچی میں تو انہیں ایک بڑی عالیشان قسم کی کوٹھی الاٹ ہوئی تھی۔

جاوید :۔ جی نہیں، وہ تو ہم نے پگڑی پر لی ہے، پندرہ ہزار میں۔

ابآ :۔ معاذاللہ ! پندرہ ہزار۔ کیا اندھیر ہے۔

جاوید :۔ جی، اب اس کے بیس ہزار مل رہے ہیں۔

ابآ :۔ کیا لوٹ ہے ؟ پھر تو انہیں یہاں ایک اچھی ذاتی کوٹھی ضرور بنوانی چاہیے۔

جاوید:۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔

ابا :۔ تو پھر میں انہیں خط لکھتا ہوں۔

جاوید:۔ کبھی آپ بھی تشریف لایئے نا، ابا ہمیشہ آپ کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں۔ اماں بھی اکثر آپ کو یاد کرتی ہیں۔

ابا :۔ اب اُن کی صحت تو ٹھیک رہتی ہے نا! بھئی کچھ بات یہ ہے کہ اتنے دور دراز کے سفر پر طبیعت آمادہ نہیں ہوتی، مگر ایک دفعہ خان بہادر سے ملنا ضرور ہے۔ موت حیات کا کیا پتہ۔

جاوید:۔ آپ ضرور تشریف لایئے، یہ تو ہوائی جہاز کا زمانہ ہے۔ ابھی لاہور، ابھی کراچی.....

(اسٹیج پر پھر تاریکی چھا جاتی ہے، جب دوبارہ روشنی ہوتی ہے تو پھر وہی منظر لوٹ آتا ہے۔ دروازے پر زور زور کی کھٹکھٹ سنائی دیتی ہے)

راحت:۔ آپی، ملے آپی۔

آپی :۔ اماں دروازہ کھٹکھٹا رہی ہیں، جلدی کرو، اترو۔

(دونوں اترتی ہیں)

امی :۔ (باہر سے زور سے دروازہ پیٹتی ہوئی) کھولو بھئی نا، کیا کانفرنس ہو رہی ہے اندر۔ راحت! نزہت! تم پر خدا کی سنوار!

(راحت دروازہ کھولنے کو بڑھتی ہے، اتنے میں پردہ گرتا ہے۔)

## تیسرا منظر

(وہی منظر، اسی عرصے میں تین دن مزید گزر چکے ہیں، پردہ اُٹھنے پر تھوڑی دیر کے لئے کمرہ خالی رہتا ہے، پھر راحت اور مجو، لپک کر اندر داخل ہوتے ہیں۔ مجو راحت کی کلائی تھامے ہوئے ہے)

مجو :۔ (راحت کا ہاتھ جھنجھوڑ کر) آپا، جاوید بھائی اپنا سفید کوٹ اور سُرخ مفلر مانگ رہے ہیں۔

راحت:۔ مجو (آہستہ سے) امی کہاں ہیں! اپنے کمرے میں؟

مجو :۔ ہاں۔

راحت:۔ اچھا، پھر تو دروازے پر کھڑا رہ، میں نکالتی ہوں کپڑے، امی آتی دکھائی دیں تو مجھے بتائیو۔

مجو :۔ (اس راز کو سمجھتے ہوئے) اچھا اچھا کھولو بکس۔ میں دیکھتا ہوں۔ پر میں تم سے وہ لال لال والی پنسل لے لوں گا۔

راحت:۔ ہاں بھیا میں دے دوں گی تجھے۔

مجو :۔ (للچا کر) چھوٹی آپا.... وہ .... وہ رومال بھی دے دو گی نا، خوشبودار رومال؟

راحت:۔ اچھا دے دوں گی۔ (بکس کھولتی ہے) مجو، کون سا مفلر مانگا تھا؟

مجو :۔ آپا جی، یہ ٹکٹائی کتنی خوب صورت۔ آہا ہا... تتلی تتلی...

راحت:۔ (مجو کو ہٹاتے ہوئے) لے چھوڑ دے، یہ لے مفلر... اور کیا مانگتے تھے؟

مجو :۔ اور؟.... اور.... ہاں، اور سفید کوٹ۔

راحت:۔ سفید کوٹ۔ سفید کوٹ۔ یہ رہا سفید کوٹ (نکال کر مجو کو دے دیتی ہے) بس؟

مجو :- (بکس میں نظر گاڑ کر) اور کھانسی کی گولیاں ۔ ۔ ۔ ۔ میٹھی میٹھی، کیا نام تھا ۔ ۔ ۔ ۔

راحت :- یہ

مجو :- ہاں ہاں۔ یہی۔

راحت :- کیا انہیں کھانسی ہے ؟

مجو :- ہاں کھانسی ہی تو ۔ ۔ ۔ ۔

راحت :- اچھا لے ۔ ۔ ۔ (چند ٹکیاں نکال کر دیتی ہے)

مجو :- (خوشامد سے) ایک ٹکیہ مجھے بھی دو آپا ؟ صرف ایک ۔

راحت :- یہ لے (اسے بھی ایک ٹکیہ دے دیتی ہے) بس ؛ چل یہاں سے ۔ ۔ ۔ ۔ جلدی دے آ۔

(دوڑ کر چلا جاتا ہے)

(راحت کمرے کے گرد احتیاط سے جائزہ لے کر جاوید کی تصویر نکالتی ہے، پھر اُسے آنچل سے صاف کرکے دریچے کے پاس لے آتی ہے اور دریچے کی نسبتاً صاف روشنی میں بڑے غور سے دیکھنے لگتی ہے۔ دیکھتے دیکھتے یکدم جیسے کھو سی جاتی ہے اور تصویر کو اٹھا کر لبوں کے قریب لے جاتی ہے، جیسے اُسے چومنا چاہتی ہو، جیسے یہ سب خواب میں کر رہی ہو، لیکن اتنے میں کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دیتی ہے۔ راحت جلدی سے تصویر کو پیچھے چھپا لیتی ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے ہوتے ہیں، مجو اندر داخل ہوتا ہے خوشی سے اُس کی آنکھیں چمک رہی ہیں)

مجو :- (لپک کر) دیکھو آپا، دیکھو، کیا چیز دی ہے مجھے جاوید بھائی نے ؛ (ایک ریشمی رومال دکھاتا ہے)

راحت :- دیکھوں مجو ذرا دینا۔

مجو :- (اترا کر) نہیں نہیں، میں نہیں دوں گا، یہ میرے جاوید بھائی نے مجھے دیا ہے ۔

راحت :- (آہستہ سے) لا دیکھوں تو سہی۔ شاباش میرے بھیا۔ (رومال جھپٹ کر لے لیتی ہے) ارے واہ، بڑا ہی عمدہ رومال ہے (پیار سے) مجو وہ خوشبودار رومال لے گا ؛ وہی جو تو ابھی مانگتا تھا ؟

مجو :- (سر ہلا کر) ہاں ۔

راحت :- اور لال والی پنسل ؟

مجو :- ہاں، دونوں چیزیں آپا، دوگی نا ؟

راحت :- دوں گی۔ پر یہ رومال تو مجھے دے دے مجو۔

مجو :- (بسور کر) نہیں نہیں ۔ ۔ ۔ ۔

راحت :- میں تجھے اس کے بدلے رومال اور پنسل کے علاوہ ایک سینٹ کی شیشی بھی دوں گی۔

مجو :- (للچا کر) سینٹ کی شیشی بھی ؟ (بڑی فیاضی کے ساتھ رومال دیتا ہے) تو لے لو۔ لے لو آپا۔

راحت :- شاباش میرا بھیا، پر یہ بات کسی کو کہیو نہیں، ہیں !

مجو :- اچھا۔

راحت :۔ تیرے جاوید بھائی نے یہ تو نہیں پوچھا کہ کپڑے کس نے نکال کر دیئے!

مجو :۔ نہیں تو، کیوں!

راحت :۔ یونہی پوچھ رہی تھی (مجو کی بند مٹھی کو اچانک محسوس کرکے) یہ تیری مٹھی میں کیا ہے مجو؟

مجو :۔ (ہاتھ فوراً پیچھے کرلیتا ہے) مٹھی؟ کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔

راحت :۔ تو نے ٹکیاں نکال لیں؟

مجو :۔ (مجرمانہ انداز میں) ہوں، میں نے کہاں نکالیں۔ یہ تو جاوید بھائی نے دی ہیں۔

راحت :۔ (اس کی مٹھی کھولتے ہوئے) دیکھوں۔۔۔ ایک۔۔۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ جھوٹا!

مجو :۔ اللہ کی قسم انہوں نے خود دی ہیں۔

راحت :۔ اچھا اچھا، قسم مت کھا۔ ہاں تو کیا کر رہے تھے تیرے جاوید بھائی؟

مجو :۔ کرسی پر بیٹھے تھے۔ (بید کی کرسی کے اوپر بیٹھ کر تپائی کے اوپر دونوں ٹانگیں پھیلا دیتا ہے) اس طرح ٹانگیں پھیلائے ہوئے۔ (انگلی کو منہ میں دباکر) اور وہ پائپ پی رہے تھے۔۔۔۔ اور ہاں کچھ گنگنا بھی رہے تھے۔

راحت :۔ (اشتیاق سے) کیسے بھلا!

مجو :۔ (گنگنانے کی کوشش کرتا ہے) یاد نہیں رہا۔

راحت :۔ ہٹ۔ تجھے تو کچھ یاد نہیں رہتا۔

مجو :۔ (کرسی سے اٹھ کر) آپا، آپا آج شام کو جاوید بھائی مجھے پکڑ لے جائیں گے۔

راحت :۔ پکڑ لے جائیں گے۔۔۔۔ مجو، تو میرے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں پوچھتے تھے؟

مجو :۔ اوہوں، میں اُن سے تمہارے بارے میں کچھ پوچھوں؟

راحت :۔ نہیں نہیں۔ میرا مطلب ہے وہ یہ نہیں پوچھتے کہ ان کے کپڑے کون نکال کر دیتا ہے، اُن کی میز کون درست کرتا ہے، ان کی ٹائیوں کو کون پریس کرتا ہے، اس قسم کی کوئی بات جو میرے متعلق ہو!

مجو :۔ وہ ایسی باتیں نہیں کرتے، وہ ہر وقت کتاب پڑھتے رہتے ہیں، بس ہر وقت پڑھتے ہی رہتے ہیں۔

راحت :۔ (خود سے) آج دس تاریخ بھی ہو ہی گئی۔ پرسوں اُن کا امتحان ختم ہو جائے گا۔

مجو :۔ پھر وہ یہاں سے چلے جائیں گے۔

راحت :۔ ہاں شاید پھر کبھی نہ آئیں۔

مجو :۔ آپا میرا جی کرتا ہے وہ ہمیشہ یہیں رہتے، مگر اُن کے ابا، امی اور آپا بھی تو ہوں گے، اسی لئے وہ چلے جائیں گے۔ ہے نا!

راحت :۔ (ڈوب کر) ہوا کے راہی کہاں رُکتے ہیں۔

مجو :۔ میرے جاوید بھائی ولایت بھی جائیں گے آپا، کہتے تھے وہ میرے لئے وہاں سے اتنے بڑے بڑے غبارے لائیں گے (دونوں ہاتھ پھیلا کر بتاتا ہے)

راحت :۔ (مدہوشی کے سے انداز میں) غبارے۔۔۔ ہوا کے راہی۔۔۔ مجھے بھی ایسا لگتا ہے جیسے رنگین اور خوشنما غباروں پر اُڑتی رہوں، اُڑتی رہوں

انجان اور ان دیکھی فضا میں ــ دُور ــ حدِّ نظر سے دُور ــ

مجو :۔ (گھبرا کر) آپا!

راحت:۔ (چونک کر) مجو، تُو نے مجھے کچھ کہا؟

مجو :۔ تم جانے کیا بول رہی تھیں میری سمجھ میں نہ آیا۔

راحت :۔ (مسکرا کر) میں خواب دیکھ رہی تھی، تُو تو بہت پیارا ہے، آ میرے پاس آجا (اسے خوب زور سے چمٹا لیتی ہے، مجو سہم جاتا ہے) مجو تو میرا بھیا ہے نا؟

مجو :۔ ہاں آپا۔

راحت:۔ اور بہنیں پرائی ہوتی ہیں نا؟

مجو :۔ جی!

راحت :۔ میرا ننھا بھیا! (اُسے اور زور سے بھینچ لیتی ہے، پھر چھوڑ دیتی ہے)

مجو :۔ آپا، تم رو رہی ہو؟

راحت:۔ پگلے (ہنس کر) میں کہاں رو رہی ہوں، میں تو ہنس رہی ہوں۔

مجو :۔ (لپٹ جاتا ہے) تم بہت اچھی ہو آپا۔ بہت اچھی۔

راحت :۔ (اُسے ہٹا کر) اچھا مجو، تُو میرا ایک کام کر دے گا؟

مجو :۔ (اپسیج کر) ہاں ہاں، ضرور کر دوں گا آپا۔

راحت :۔ اگر میں ــ اگر میں تجھے ایک خط دوں ــ تو ــ تُو یہ خط اپنے جاوید بھائی کو کس طرح دے گا؟

مجو :۔ (چونک کر) تم جاوید بھائی کو خط لکھو گی؟

راحت: نہیں نہیں، مَیں تو مذاق کر رہی تھی، میرا مطلب ہے، اگر میں لکھوں تو تُو کس طرح لے جا کر دے گا۔ میں لکھوں گی نہیں، ویسے ہی پوچھ رہی ہوں تجھ سے۔

مجو :۔ (کمال معصومیت سے) جیسے آپی کا لفافہ دے آیا تھا۔

راحت :۔ (یکدم ٹھٹھک کر) آپی نے تجھے لفافہ دیا تھا؟

مجو :۔ ہاں، وہ بڑا خوب صورت سا لفافہ تھا، بڑا خوشبو دار سا۔

راحت :۔ تو تُو نے وہ کس طرح دیا انہیں؟

مجو :۔ میں نیکر میں ٹھونس کر لے گیا تھا۔ آپی نے مجھے بہت سا کریم اور پاوڈر بھی دیا تھا۔

راحت :۔ اچھا تو، تُو نے لفافہ جاوید بھائی کو دے دیا؟

مجو :۔ دینے ہی کو تو نکالا تھا کہ ڈر کے مارے میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر گر پڑا۔ انہوں نے خود ہی اٹھا لیا، مگر لفافے کو دیکھ کر مجھے واپس کر دیا۔

راحت :۔ (جس کی پریشانی قدرے کم ہو گئی ہے) واپس دے دیا؟

مجو :۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا یہ خط کس کا ہے۔ میں نے کہا آپ کھول کر پڑھ لیجئے۔

راحت :۔ (اشتیاق اور گھبراہٹ سے) پھر انہوں نے کھول کر پڑھا ہوگا؟

مجو :۔ نہیں، بلکہ مجھے واپس دے دیا اور کہا، دوسروں کا خط نہیں پڑھتے۔

راحت :۔ اچھا تو پھر تُو نے لفافہ آپی کو واپس دے دیا؟

مجو :۔ نہ۔ (جلدی سے) ہاں ہاں دے دیا۔

راحت :۔ یہ نا اور ہاں کیا ہوا؟

مجو :۔ آپا جان.... میں نے ڈر کے مارے آپی کو لفافہ واپس نہیں دیا، انہوں نے کہا تھا، اگر میں خط نہ دوں گا تو وہ سارے کریم اور پاؤڈر چھین لیں گی۔

راحت :۔ اچھا، تو کہاں ہے وہ لفافہ؟

مجو :۔ وہ میں نے چپکے سے پھاڑ کر پھینک دیا

راحت :۔ بے چاری آپا! — تُو نے اس کے ارمانوں کا خون کر دیا۔ شاید اُس کی بے رنگ زندگی میں امید کی کرن بن کر چمکتا۔

مجو :۔ (حیران ہوکر) کیا!

راحت :۔ کیا پتہ، آپی ابھی تک اُس کے جواب کا انتظار کر رہی ہوں، انہوں نے شاید اس کی بنیاد پر اُمیدوں کا محل کھڑا کیا ہو — وہ محل جو تُو نے کچے گھروندوں کی طرح اپنے پاؤں تلے کچل ڈالا!

مجو :۔ (ڈر کر) تو تم آپی سے کہہ دو گی؟

راحت :۔ نہیں، تُو تو بہت معصوم ہے۔ تجھے کیا پتہ، آگ سے کھیلنے سے ہاتھ کس طرح جل جاتا ہے۔ تیرے ہاتھ ابھی بہت ننھے ہیں

مجو :۔ (خوشامد سے) تم بھی خط دو گی آپا؟

راحت :۔ نہیں مجو، میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی، میں تجھے کوئی خط نہ دوں گی۔

مجو :۔ کیوں؟ میں کسی سے نہیں کہوں گا آپا۔

راحت :۔ پگلا، میں تو یونہی کھیل کھیل میں کہہ رہی تھی۔ میں ایک غیر آدمی کو کیوں خط لکھنے لگی، جو مجھے جانتے تک نہیں، جس نے مجھے دیکھا تک نہیں۔

مجو :۔ تم نے جاوید بھائی کو دیکھا ہے؟

راحت :۔ بھلا میں کس طرح دیکھ سکتی ہوں۔

مجو :۔ وہ جو تم بکس کے اندر ابھی تصویر دیکھ رہی تھیں نا، بس وہی ہیں جاوید بھائی۔

راحت :۔ (بن کر) اچھا تو وہ ہیں تیرے جاوید بھائی، مجھے تو اچھے نہیں لگتے۔

مجو :۔ کیوں؟ امی تو کہتی ہیں کہ جاوید بھائی بہت خوب صورت ہیں۔

راحت :۔ امی اور کیا کہتی تھیں؟

مجو :۔ اور..... اور.....

راحت :۔ (بیچ میں ٹوک کر) بس اب تو جھوٹ موٹ باتیں بنانے کی سوچ رہا ہے۔

مجو :۔ نہیں، اللہ قسم، آپا وہ کچھ اور بھی کہتی تھیں، مگر مجھے دیکھ کر چپ ہو گئیں۔

راحت:۔ ہاں، کیوں نہ چپ ہوں، تیری لگائی بجھائی کی عادت جو ٹھہری، یہاں کی بات وہاں اور وہاں کی بات یہاں (پھر رُک کر) اچھا مجو، چل تجھے لال والی پنسل اور رومال دے دوں۔ پر ہاں، یہ باتیں کسی سے نہ کہیو۔

مجو :۔ نہیں نہیں، میں نہیں کہوں گا، کیونکہ پھر امی تمہیں پیٹیں گی نا!

راحت۔ واہ میں کوئی بچی ہوں جو پیٹیں گی، تیری طرح!

مجو :۔ اب تم بڑی ہو گئی ہو نا آپا! اماں بھی یہی کہتی تھیں۔ اس دن ابا سے جب ہی تمہیں نہیں پیٹیں۔ میں بھی بڑا ہو جاؤں گا تو نہیں پیٹیں گی۔ میرا اتنا جی چاہتا ہے بڑا ہونے کو، اتنا جی چاہتا ہے آپا۔

راحت:۔ اچھا اچھا اب چل بھی مجو، باتیں بنانا تو کوئی تجھ سے سیکھے۔ چل اپنی لال والی پنسل اور رومال تو لے لے۔

مجو :۔ (راحت کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اچھالتے ہوئے) ارے لال والی پنسل — ہی ہی۔

(دونوں دروازے کی طرف بڑھتے ہیں کہ اتنے میں پردہ گرتا ہے)

## چوتھا منظر

(منظر تقریباً وہی ہے جو پچھلے تین منظروں میں تھا: البتہ تیسرے اور چوتھے منظر کے درمیان ایک ہفتے کا وقفہ ہے۔ امی جاوید کا بکس ٹھیک کر رہی ہیں۔ دیوار کا کلاک نو بجاتا ہے۔ امی چونک کر آواز دیتی ہے)

امی :۔ مجیدن، جلدی کرو نا، ناشتہ ابھی تک بھجوایا کیوں نہیں؟ گاڑی کا وقت ہو چلا ہے۔

مجیدن کی آواز:۔ ناشتہ جا چکا ہے بی بی جی، میں کافی تیار کر رہی ہوں۔

امی :۔ تانگہ بھی تو لانا ہے اڈے سے۔ کالو تو بیمار پڑی ہے اور سامان بھی تو اٹھا کر لے جاؤ گی۔

مجیدن:۔ (وہیں سے) تانگہ بھی آ چکا ہے۔ سامان ابھی اٹھاتی ہوں آ کر۔

امی :۔ ہاں تو جلدی کرو۔

ابا :۔ کیوں بھئی سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا؟

امی :۔ (منہ لٹکا کر) یہ دونوں صاحب زادیاں تو چین لینے دیں، منہ کھولنا مشکل ہو گیا۔

ابا :۔ کیوں بھئی، تم دونوں نے ناشتہ کر لیا؟

آپی :۔ مجیدن لائے بھی تو کروں ناشتہ۔

امی :۔ مجیدن بھی عین کام ہی کے وقت ہاتھ پاؤں پسار دیتی ہے۔ اب اس وقت جلدی ہے تو گھوڑی کا سوانگ ہی نہیں ہلتا۔ (پکار کر) مجیدن۔ او مجیدن!

مجیدن:۔ (پس منظر سے) آئی آئی بی بی . . . .

امی :۔ (اور زور سے پکار کر) ناشتہ لاؤ لڑکیوں کا۔

آپی :۔ اب یہ آواز تو باہر نہ گئی۔

امی :۔ (ابا سے احتجاج کرتے ہوئے) تم دیکھتے ہو جی، زبان ہلانا مشکل ہو گیا۔

ابا :- (ہنس کر) مجھی میں کچھ نہیں کہتا، یہ تم ماں بیٹیوں کے جھگڑے ہی ایسے ہیں۔

امی :- آپ ہی نے تو دونوں کو بگاڑا ہے۔

(مجیدن ناشتہ لے کر آتی ہے۔ راحت اور نزہت ناشتہ کرنے بیٹھ جاتی ہیں)

مجیدن :- بکس لے جاؤں؟

امی :- ہاں، پہلے ہولڈال میں بستر تو باندھ دو، اور تھرماس میں چائے بھی ڈالنی ہے، ناشتہ دان بھی ٹھیک کرنا ہے۔

مجیدن :- اچھا (بکس اٹھا کر چلی جاتی ہے)

امی :- (ابا سے) گاڑی میں تو ابھی کافی وقت ہوگا؟

ابا :- ہاں، ہاں۔

امی :- کیا کر رہا ہے جاوید!

ابا :- اخبار دیکھ رہا تھا۔

امی :- ہوں... تو کچھ ذکر چھڑا تھا...

ابا :- موقع نہیں آیا۔ اور ویسے بھی میرا خیال ہے، اس معاملے میں خان بہادر سے ذاتی طور پر گفت و شنید بہتر رہے گی۔

امی :- مگر لڑکے کا دل بھی تو ٹٹولنا چاہیے۔ خان بہادر ہیں نئی روشنی کے آدمی، وہ لڑکے کو بھی اتنی ہی آزادی دیں گے۔ ہماری تمہاری طرح وہ اپنے دور سے سو سال پیچھے نہیں چل رہے ہیں۔

ابا :- (لڑکیوں کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے) ہاں یہ تو ٹھیک ہے....

(راحت تولیے سے منہ پونچھتی ہوئی اندر آتی ہے)

امی :- کیوں راحت، منہ دھو چکیں—؟

راحت :- (تولیے کو کرسی پر پھیلا کر) ہاں۔

امی :- خیر، آپی کا کمرہ آج خالی ہو جائے گا، وہ آج اپنے کمرے میں چلی جائے گی۔ اُس کی پڑھائی کا بھی خوب ہی ستیاناس ہوا۔

راحت :- (خاموشی سے بکس کو دیکھتی رہتی ہے۔ (مجو آتا ہے)

امی :- مجو، ارے باپ کو تو بھیج جا کر؟ منہ میں کیا دبائے پھر رہا ہے؟ ندیدہ کہیں کا، سارے لڈو ٹھکو سے جا رہا ہے، اتنی تمیز نہیں کہ مہمان کے سامنے زیادہ نہیں کھاتے۔

مجو :- (منہ میں لڈو بھرے ہوئے) ہوں، ہم نے کہاں بہت کھاتے ہیں۔

امی :- اچھا، جا کر جلدی سے باپ کو بھیج۔ (مجو چلا جاتا ہے)

امی :- (راحت سے) راحت تم بھی آپا کو یہیں بلا کر دونوں اچھی طرح ناشتہ کر لو۔

راحت :- اچھا (پکارتی ہے) آپی جان — آ—

امی :- (بیچ میں ٹوکتے ہوئے چلا کر) یہ کیا بدتمیزی ہے راحت؟ بھلا اتنے زور سے بھی پکارتے ہیں۔ زنانخانے کی آواز باہر جا رہی ہے۔ تم لوگوں سے جوانی سنبھالے نہیں سنبھلتی، توبہ ہے۔

آپی :۔ (اندر داخل ہو کر، امی، اتنا بیچ کر کس پر برس رہی ہو؟ زنانخانے کی گونج باہر جا رہی ہے۔

امی :۔ چلو، میری اور بات ہے۔

آپی :۔ خواہ مخواہ غریب راحت کو جھاڑتی رہتی ہو، دیکھو تو کیسا منہ بن گیا بے چاری کا۔ ننھی بی راحت (چمکار کر) نہیں بھئی تمہیں نہیں۔

راحت :۔ (روتی آواز میں) میری زبان سبھی کو لمبی نظر آتی ہے۔

آپی :۔ مجھے تو نہیں، البتہ اماں کو ضرور نظر آتی ہو گی۔

امی :۔ گھر میں کوئی مہمان ٹھہرا ہو ہے، اتنی تمیز تو ہونی چاہیئے۔ میں تمہارے ہی بھلے کو کہتی ہوں، ہمارے ہاں تو چوڑیوں کی جھنجھناہٹ پر جو تم بیزار ہوتی تھی، شکر کرو کہ تم لوگوں پر اتنی پابندی نہیں ورنہ تمہارا تو دم گھٹ جاتا۔

آپی :۔ تو تم اس تمام جبر کا بدلہ ہم لوگوں سے کیوں لو؟ تھوڑا ہو یا بہت، بدلہ تو ہے۔

امی :۔ تم بڑی بہن ہو، چھوٹی بہن کو تمیز کیا سکھاتیں کہ اُلٹی شہہ دے رہی ہو۔

آپی :۔ میں اس دقیانوسی تمیز داری کی قائل نہیں۔

امی :۔ یہ سب کالج کی ہوا لگنے سے ہوا ہے، اسی لئے منع کرتی تھی تمہارے باپ کو۔

(ابا آتے ہیں)

امی :۔ مطلب یہ ہے کہ نادر موقع ہے ہاتھ سے نکل نہ جائے۔

ابا : جلد بازی بھی تو اچھی نہیں کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ لڑکا دیکھتے ہی منہ میں پانی بھر آیا۔ ذرا بھی ضبط نہ ہوا۔

امی :۔ (راحت اور آپی سے) کیوں بھئی تمہارا ناشتہ ختم ہوا!

راحت :۔ جی ہاں۔

امی :۔ تو جا کر ذرا آپی کا سامان اس کمرے میں ٹھیک ٹھاک کر دو۔ جاؤ نزہت، آج سے تم اسٹڈی شروع کر دو، کا وقت ضائع ہو چکا ہے

(دونوں بہنیں چلی جاتی ہیں)

امی :۔ (اپنی کرسی ابا کے اور قریب کرتی ہوئی، ویسے ایمان سے کہو۔ کیا خوب لڑکا ہے؟

ابا :۔ نہایت نیک اور سلیم الطبع، اس میں شک ہی کیا ہے۔

امی :۔ تو اب نزہت بھی اگلے سال بی اے کر لے گی۔

ابا :۔ (چونک کر) نزہت کی بات شاید خان بہادر کو پسند نہ آتے۔

امی :۔ کیوں، پسند کیوں نہ آئے گی؟

ابا :۔ جانتی ہو اس کی شکل و صورت کچھ اچھی نہیں کہ۔۔۔۔

امی :۔ کہ۔۔۔۔؟

ابا :۔ یعنی جاوید اور اس کا جوڑا نہیں ملتا، جاوید خود حسین لڑکا ہے۔

امی :۔ خوبرو نہ سہی، تعلیم یافتہ تو ہے، اور تعلیم دلوانے کا مقصد بھی کیا تھا۔ اسی نقص کو تو دبانا تھا۔

ابا :۔ تمہارا کیا خیال ہے، راحت کے لئے یہ رشتہ کیسا رہے گا!

امی :۔ خدا تمہاری عقل پر رحم کرے۔ بعض دفعہ تو تم حیران ہی کر دیتے ہو۔ بڑی لڑکی گھر بیٹھی رہے اور چھوٹی کی شادی ہو جائے، دنیا کیا کہے گی؟

ابا :۔ تمہاری مرضی، لیکن نزہت کے سلسلے میں یہ بات چھیڑنی حماقت ہوگی، اُلٹی شرمندگی اٹھانا پڑے گی تم سے ...

امی :۔ کمال کی منطق ہے، آخر اس میں عیب کیا ہے؟

ابا :۔ میں نزہت کے لئے یہ بات چھیڑ کر بیوقوف نہیں بننا چاہتا۔

امی :۔ آخر کیوں؟

ابا :۔ مجھے معلوم ہے، کوئی شخص اندھا بن کر کوئی چیز نہیں لیتا؟

امی :۔ تم سے تو یہ ذکر چھیڑنا ہی بیوقوفی تھی، وقت آنے پر تم ہی کچھ کروگے۔

ابا :۔ کبھی عقل سے بھی کام لو۔

امی :۔ اس کی تو تمہیں ضرورت ہے۔ ورنہ ذرا یہ سوچے کہ اتنے تعلیم یافتہ لڑکے اور یہی جاہل لڑکی جاکر خوش ہو جاتا ہے۔

ابا :۔ خان بہادر بھی تعلیم یافتہ تھے، لیکن ان کی ہوی نپٹ جاہل تھیں، البتہ شکل و صورت میں برابر ہیں بھی ... اور دور کیوں جاؤ، اپنی مثال لو۔ (ہنستے ہیں)

امی :۔ (ان کی ہنسی کو نظر انداز کرکے) اس زمانے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

ابا :۔ اس زمانے میں تعلیم ہی کیا تھی، امی! میں اپنے خاندان کا پہلا گریجویٹ تھا۔

امی :۔ (بجھ کر زہر خندسے) ارے اتنی باتیں کیوں بناتے ہو؟ صاف کیوں نہیں کہتے کہ نزہت کی بات نہیں کروگے۔ قصہ ختم۔

ابا :۔ ہاں بھئی میں مجبور ہوں۔

امی :۔ اور راحت کے معاملے میں مجبور نہیں ہو!

ابا :۔ راحت کے معاملے میں تو پھر بھی کوئی قرینے کی بات معلوم ہوتی ہے۔

امی :۔ کیونکہ جس طرح تم خاندان کے پہلے گریجویٹ ہو اسی طرح راحت بھی تمہارے خاندان کی پہلی حسین وجمیل لڑکی ہے نا

ابا :۔ اب خواہ کچھ بھی کہو....

امی :۔ کچھ بھی نہیں — میں صاف صاف کہتی ہوں کہ اگر نزہت کی بات نہیں کی تو میں راحت کی بھی نہ ہونے دوں گی۔ اچھی طرح سمجھ لو۔

ابا :۔ اگر تمہاری یہی ضد ہے تو یہی سہی، قصہ ختم۔

مجیدن :۔ (پس منظر سے پکارتی ہے) بڑے صاحب! آپ کو باہر بلا رہے ہیں۔

ابا :۔ اچھا تو میں چلتا ہوں، تمہاری طرف سے کوئی دعا سلام؟

امی :۔ چولہے بھاڑ میں جاتے دعا سلام۔

ابا :۔ کچھ خان بہادر صاحب کو کہلوانا ہے!

امی :۔ مجھے کیا پڑی، کہلوانے کی۔

ابا :۔ (لاجواب ہو کر) اچھا تمہاری خوشی۔

مجیدن :- (دور سے) گاڑی کا وقت ہو چلا۔

ابا :- (پکار کر) آیا ۔۔۔۔

( چلا جاتا ہے ، مجو اندر داخل ہوتا ہے )

مجو :- امی ، جاوید بھائی آپ کو سلام کہتے ہیں۔

امی :- ہٹ پرے سے (رُک کر) کیا کہا ، سلام کہتے ہیں۔ (لپک کر) میری طرف سے دعا کہنا ، اور کہنا ، اپنی امی کو بھی میرا سلام پہنچا دیں۔

مجو :- (دروازے کی طرف جاتا ہوا) اچھا۔ (دروازے کے عین قریب ہو کر) اور کچھ ؟

امی :- دفان ہو۔

مجو :- (چیخ کر) اور کیا کہوں ؟ دفان ہو ؟

امی :- (غصے سے جھڑک کر نیچی آواز میں) میں تجھے کہہ رہی ہوں۔ باہر جا کر نہ کہہ دینا ، تیرے کنٹھ میں گھا دَ پھوٹے۔

( نزہت اور راحت آتی ہے )

آپی :- گئے !

امی :- بس جانے ہی والے ہیں ، اب کہ کر ٹے لگاتی پھرنا۔ (راحت سے) راحت تم نے سامان ٹھیک کر لیا ؟

راحت :- جی ہاں۔

امی :- بس ٹھیک ہے ، آنچل ٹھیک کر لو۔

آپی :- گھونگھٹ ہی کاڑھ لو راحت ، مزے میں رہو گی۔ تمہارے لئے اماں سے کہہ کر ایک ڈبیہ بھی بنوا دوں گی۔

امی :- ہر بات میں ٹانگ نہ اڑایا کر و نزہت ذرا شکل کو دیکھو ، سدا جھینکتی رہو گی۔ (تانگے کی گھنٹی کی آواز سنائی دیتی ہے) لو ، تانگہ تیار ، دیکھو ذرا۔ (امی جلدی جلدی سلیپر گھسیٹتی ہوتی باہر نکل جاتی ہیں)

آپی :- (ہنس کر) راحت وہ دیکھ رہی ہو ، سامنے ؟ اماں کس طرح چھپری سے لگی ہوئی باہر دیکھ رہی ہیں ؟

راحت :- (کھوئی کھوئی سی حالت میں) کہاں ؟

آپی :- ارے وہ سامنے ، وہاں۔ میں بھی چلتی ہوں۔

( نزہت بھی چلی جاتی ہے )

راحت :- (جس کی ساکت آنکھیں دریچے پر جمی ہیں ، یکدم خوب آلود لہجہ میں) تانگہ چل پڑا ۔۔ (تانگے کی گھنٹی اور کوٹھی کے احاطے میں بجری کے اوپر پہیوں کے گزرنے کی آوازیں ، راحت خوابیدہ انداز میں انگلی اٹھا کر) اس طرح پہیوں کی آواز ایک دفعہ گونجی تھی اسی طرح بجری کی ننھی ننھی کنکریاں بج اٹھی تھیں۔ (راحت کی انگلی آہستہ آہستہ گر جاتی ہے ، اور تانگے کی گھنٹی کی آخری آواز بہت دُور سے بہت مدھم انداز میں سنائی دیتی ہے) مگر اُس دفعہ تو اُدھر سے اِدھر کی طرف آئی تھی۔ اس دفعہ یہ آواز کدھر سے آ رہی ہے ؟ کدھر جا رہی ہے ۔۔

مجو :- (دوڑتا ہوا اندر داخل ہوتا ہے) ہی ہی ۔۔۔ آ پا ۔۔۔۔

( مجو راحت کے گلے میں لٹک جاتا ہے اور راحت اسے چمٹا لیتی ہے ۔ اتنے میں پردہ گرتا ہے )

( مارچ ۵۶ء )

# سمندر کے نیچے

توفیق الحکیم / امجد اسلام امجد

"یہ درمیانے درجے کے فلیٹ کا ڈرائنگ روم جس میں ایک شادی شدہ جوڑا تنہا رہتا ہے۔ اس کمرے کی ترتیب سے گھر کی سادہ خوش سلیقگی اور خوشحالی کا اندازہ ہوتا ہے۔ کیمرہ ڈرائنگ روم کے درمیان میں پڑے ہوئے میز پر ZOOM ہوتا ہے جہاں ایک بریف کیس پڑا ہے۔ بیمہ ایجنٹ اس بریف کیس سے کچھ کاغذات نکالتا ہے پھر ایک قلم نکال کر شوہر کو...... دیتا ہے۔ قلم کو عقیدت سے چومتا ہے:

**ایجنٹ:۔** آپ میرے اس قلم سے یہاں دستخط فرما دیں۔ یہ بڑا خوش قسمت قلم ہے (کاغذات اور قلم کو دیکھتا ہے) اتفاق سے یہ ایک ہزارویں پالیسی ہے جس پر اس قلم سے دستخط ہو رہے ہیں۔

**شوہر:۔** تو گویا میرے مرنے پر میری بیوی کو پچاس ہزار روپے مل جائیں گے؟

(چٹکی بجاتے ہوئے)

**ایجنٹ:۔** فوراً

(پین سے لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر ایسے انداز میں دیکھتا ہے جیسے اس میں روشنائی نہ ہو)

**شوہر:۔** سیاہی نہیں ہے۔

**ایجنٹ:۔** کیسے نہیں ہے۔ ذرا زور سے ہلائیے، ویسے بائی دی وے، اسے سیاہی نہیں روشنائی کہتے ہیں۔

(شوہر ایجنٹ کی طرف رُخ کرکے ہلاتا ہے۔ ایک دم بہت سی روشنائی ایجنٹ کے کپڑوں پر گرتی ہے)

**ایجنٹ:۔** دیکھا! دیکھا میں نہ کہتا تھا بھرا ہوا ہے۔

**شوہر:۔** مجھے افسوس ہے کہ....

(رومال نکال کر پونچھتے ہوئے)

**ایجنٹ:۔** NEVER MIND آپ دستخط کیجئے۔

(شوہر دستخط کرکے کاغذات ایجنٹ کی طرف بڑھاتا ہے۔ ایجنٹ کچھ کاغذات اُسے واپس کرتا ہے)

**ایجنٹ:۔** آپ کے ریکارڈ کے لئے۔

(شوہر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے، پھر کاغذات موڑ کر جیب میں ڈال لیتا ہے)

**ایجنٹ:۔** مبارک ہو۔

**شوہر:۔** آپ مجھے میری موت کی مبارک باد دے رہے ہیں۔

ایجنٹ:۔ جی نہیں۔ یہ بیمہ پالیسی پر دستخط کرنے کی مبارک باد ہے۔

(پین کو بے چینی سے گھماتا ہے۔ پین رکھتا ہے، اٹھ کر بے قراری سے کمرے میں ٹہلتا ہے)

شوہر:۔ میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ میری بیوی کو اس پالیسی کا علم میری زندگی میں نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ وہ میری موت کا ذکر بھی نہیں سن سکتی۔ دیوانگی کی حد تک چاہتی ہے مجھے۔

ایجنٹ:۔ (مسکراہٹ کے ساتھ) واہ وہ کیا محبت ہے آپ دونوں میں، مجھے تو رشک آتا ہے۔ (میز پر ہاتھ مار کر) ویسے مطمئن رہیئے ہم انہیں کچھ نہیں بتائیں گے۔ رازداری ہمارا پہلا اور آخری اصول ہے۔

شوہر: وہ اس وقت اوپر ہمسایوں کی لڑکی سے گفتگو کر رہی ہے، اگر وہ نیچے آجائے تو اسے یہ مت بتانا کہ تم ایک بیمہ ایجنٹ ہو۔

(سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتا ہے)

ایجنٹ:۔ آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔

شوہر:۔ مجھے تم پر اور تمہاری کمپنی پر بھروسہ ہے کہ میری بیوی میرے مرنے کے بعد عزت آرام اور دولت سے محروم نہیں ہوگی۔

(ایک کاغذ دکھاتے ہوتے)

ایجنٹ:۔ اس معاہدے میں ایک شرط ہے جس کی رو سے آپ اپنی ادا کی ہوئی تمام قسطوں سے محروم ہو جائیں گے اگر آپ کی بیوہ، میرا مطلب ہے آپ کی بیوہ آپ سے پہلے مرے گی۔

(خوفزدہ ہو کر جذباتی انداز میں بولتا ہے)

شوہر:۔ نہیں، نہیں، وہ مجھ سے پہلے نہیں مر سکتی، اس کے بعد یہ زندگی، یہ دولت میرے کس کام کی ہے۔ میں کیوں رقم طلب کرونگا کیوں، کس کام آئے گی میری یہ دولت!

ایجنٹ:۔ میں معافی چاہتا ہوں، میرا مطلب صرف یہ تھا کہ میں معاہدے کی شرط سے آپ کو آگاہ کر دوں۔

شوہر:۔ بس، بس میں اس کی موت کا ذکر بھی سننا نہیں چاہتا۔

(دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتا ہے)

ایجنٹ:۔ اللہ آپ کی بیگم کو لمبی زندگی دے۔

شوہر:۔ یہ بھی دعا کرو کہ میں اس سے پہلے مر جاؤں۔

(دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوتے دعا کے انداز میں)

ایجنٹ:۔ اللہ کرے آپ ان سے پہلے مریں، اور آپ کی مسز بیمے کی رقم پر ہنسی خوشی زندگی بسر کریں (آمین)

(ایجنٹ بریف کیس اٹھا کر چلنے لگتا ہے۔)

شوہر:۔ چلئے THANK YOU، مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو ایک کپ چائے بھی پیش نہیں کر سکا۔ دراصل آج ہمارا ملازم چھٹی پر ہے اور میری بیوی اوپر ہمسایوں کے ہاں گئی ہوئی ہے۔

ایجنٹ:۔ کوئی بات نہیں، چائے پھر کبھی سہی۔

شوہر:۔ بھولنا نہیں، میری بیوی کو اس بات کی خبر نہیں ہونی چاہیئے۔

ایجنٹ :۔ فکر ہی نہ کریں ۔

(کیمرہ فلیٹ کے اندرونی دروازے پر جاتا ہے ، بیوی اندر آتی ہے۔ ایجنٹ بیرونی دروازے پر ہے۔ بریف کیس ہاتھ میں ہے ،

بیوی :۔ ڈاکٹر، آپ ڈاکٹر صاحب ہیں ۔

ایجنٹ :۔ ہیں !

(گھوم کر تیزی سے ایجنٹ کی طرف بڑھتا ہے ، کمرے کے درمیان آتے ہوئے )

شوہر :۔ یہ میری بیوی ہے ۔

ایجنٹ :۔ اوہ ۔ آپ کی بیگم ، کیسے مزاج ہیں ۔

بیوی :۔ اور آپ یقیناً .....

(شوہر گھبرا کر دونوں کے درمیان آتا ہے )

شوہر :۔ ہاں یہ یقیناً . . .

بیوی :۔ ڈاکٹر ہیں ۔

(ایجنٹ گھبرا کر اپنے بریف کیس کی طرف دیکھتا ہے ۔)

ایجنٹ :۔ ڈاکٹر

(ایجنٹ کو گھبرا کر آنکھ مارتے ہوتے )

شوہر :۔ ہاں (بیوی سے) لیکن گھبراؤ نہیں میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں کیوں ڈاکٹر ؟

(جلدی سے سر ہلاتے ہوئے)

ایجنٹ :۔ بالکل .... A ONE

بیوی :۔ میرا خیال ہے ڈاکٹر صاحب غلط فلیٹ میں آگئے ہیں۔ بیمار لڑکی ہمارے اوپر والے فلیٹ میں رہتی ہے ۔ کوئی آدھ گھنٹہ ہوا انہوں نے آپ کو فون کیا تھا ۔

(بیرونی دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)

شوہر :۔ اوپر جائیے ، اوپر

(دروازے کے قریب جاکر رستہ نہ سمجھ سکنے کے انداز میں رکتا ہے )

ایجنٹ :۔ میں ابھی جاتا ہوں ۔

(ایجنٹ اس کی طرف مڑتا ہے )

بیوی :۔ ٹھہریئے صاحب ، لڑکی کو یہ مت بتایئے گا کہ آپ ڈاکٹر ہیں ، وہ خود کو بیمار تسلیم نہیں کرتی ۔ اگر اسے پتہ چلا کہ آپ ڈاکٹر ہیں تو دیا۔ کرسی ورسی دے مارے آپ کو ۔ (سوچتی ہے ) بہتر یہ ہے کہ آپ اُسے اپنے بارے میں کچھ در بتائیں مثلاً یہ کہ آپ ۔ ۔ ۔

ایجنٹ :۔ مثلاً یہ کہ میں ایک بیمہ ایجنٹ ہوں اور ۔۔۔۔

(بات کاٹتے ہوئے)

شوہر :۔ کیا تم کوئی اور پیشہ اختیار نہیں کر سکتے۔

بیوی :۔ نہیں، ٹھیک ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے جو کچھ یہ بننا چاہتے ہیں انہیں بننے دیجئے۔ بس لڑکی کو ان کے ڈاکٹر ہونے کا پتہ نہ چلے۔

(ایجنٹ تیزی سے باہر جاتے ہوئے)

ایجنٹ :۔ مطمئن رہیئے، اُسے پتہ نہیں چلے گا۔

(آواز دے کر روکتی ہے)

بیوی :۔ ڈاکٹر صاحب سنیئے، وہ آپ کو کمرے میں اکیلی سوچوں میں گم ملے گی، پچھلے کچھ دنوں سے وہ لڑکی بہت خطرناک ہو چکی ہے۔ جب کبھی باورچی خانے میں تنہا ہوتی ہے تو ایک چاقو اس کے ہاتھ میں ضرور ہوتا ہے اور اس کی آنکھیں عجیب طرح سے چمکنے لگتی ہیں، ایسے میں اگر نوکر اُسے نظر آجاتے تو وہ اُس پر جھپٹ پڑتی ہے۔ کوئی نوکر ایک ہفتے سے زیادہ اُن کے ہاں نہیں ٹھہرتا۔

(گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے)

ایجنٹ :۔ O! GOD

بیوی :۔ ڈاکٹر صاحب۔ آپ لوگ اس بیماری کو کیا نام دیتے ہیں۔

(بے حد پریشان ہو کر)

ایجنٹ :۔ لے۔ لے ۔۔۔ لے کہتے ہیں۔

(سہارا دیتے ہوئے)

شوہر :۔ میرا خیال ہے لے "نیوراتی مالیا خولیا" کہتے ہیں۔

بیوی :۔ ڈاکٹر کو بتانے دو۔ وہ اپنا پیشہ تم سے زیادہ سمجھتا ہے۔ ہاں تو ڈاکٹر کیا کہتے ہیں اس حالت کو۔

(پریشانی کے انداز میں)

ایجنٹ :۔ اس حالت کو "افسوسناک حالت" کہتے ہیں۔

(قریب آتے ہوئے)

بیوی :۔ I MEAN ، No میڈیکل سائنس اس سلسلے میں کیا کہتی ہے۔ اس کا کچھ علاج وغیرہ ہو سکتا ہے؟

(بے حد پریشان ہو کر)

ایجنٹ :۔ ہاں جی آج کل ہر مرض کی دوا مل جاتی ہے۔ نئی نئی دوائیوں نے انسان کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ یوں سمجھیئے کہ انسانی زندگی کی معیاد تقریباً دوگنی ہو گئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ زندگی کا بیمہ کرتے وقت ہر بیمہ کمپنی یہ بات مدِنظر رکھتی ہے کہ ۔۔۔۔

(بیوی سے بچ کر سرگوشی کے انداز میں ایجنٹ سے)

شوہر :۔ بے وقوف بیمے کا یہاں کیا تعلق ہے۔

ایجنٹ :۔ دیکھئے نا۔ مریض کو دیکھے بغیر میں کیا بتا سکتا ہوں۔

(دروازے کی طرف مڑتا ہے ایجنٹ کو روک کر)

بیوی :۔ تو پھر فوراً اوپر جایئے لیکن ذرا احتیاط کیجئے۔ اُس کی ماں نے ابھی مجھے بتایا تھا کہ اس نے اپنی لڑکی کے کمرے میں پستول قسم کی کوئی چیز دیکھی ہے۔

ایجنٹ :۔ پستول ۔ اوتے ہوتے ۔ اچھا جی خدا حافظ۔

(گھبرا کر جانے کے لئے مڑتا ہے)

شوہر :۔ خدا ہی حافظ۔

بیوی :۔ آپ کو فلیٹ کا پتہ ہے نا، بالکل ہمارے اوپر ہے دروازہ بائیں ہاتھ ہے۔

(جاتا ہے)

ایجنٹ :۔ جی جی ۔ اللہ بیلی ارب راکھا ۔ GOOD BYE

بیوی :۔ دنیا میں کتنے دکھ ہیں، کتنے غم ہیں، لیکن ہمارا گھر، یہ چھوٹی سی جنت ہر طرح کے رنج دام سے آزاد ہے۔

شوہر :۔ تم ٹھیک کہتی ہو، ایک روح دو جسم ہیں۔

(محبت سے اس کا ہاتھ تھپکتے ہوئے)

بیوی :۔ ہاں ۔ ہماری سوچیں کتنی یکساں ہیں۔

شوہر :۔ میں ہمیشہ ڈرتا ہوں کہ کہیں مجھ پر کوئی مصیبت پڑ کر تمہیں تکلیف نہ دے یا تم پر کوئی دکھ آ کر میری جان نہ لے۔

(محبت بھرے انداز میں)

بیوی :۔ اگر کسی مصیبت نے ہماری زندگی میں آنا ہی ہے تو خود کو تم پر قربان کر دوں گی۔

شوہر :۔ ایسا کر کے تم اچھا نہیں کرو گی۔ میری جان۔ تمہیں پتہ ہے تمہارے بغیر میری زندگی بے معنی ہے۔

بیوی :۔ میں جانتی ہوں ہمارے دو جسموں میں ایک روح ہے۔

شوہر :۔ اگر ہمارے بچے ہوتے تو یہ روح کئی جسموں میں ہوتی۔

بیوی :۔ مجھے اُن کے نہ ہونے کا کوئی افسوس نہیں۔

(تیزی سے)

شوہر :۔ اور نہ مجھے ہے۔

بیوی :۔ ہم دونوں کے لئے یہ ایک روح بہت ہے، اگر یہ یک جسم سے نکلے گی تو ....

شوہر :۔ اُسی لمحے دوسرے جسم سے بھی نکل جائے گی۔

بیوی :۔ بس کرو فواد ۔ میری دعا ہے تم زندہ رہو، میرے بعد بھی۔

شوہر :۔ خدا نہ کرے۔

بیوی :۔ ایسا مت کہو۔ مت کہو ایسا

شوہر :۔ میری دعا ہے تم زندہ رہو، میں رہوں نہ رہوں۔

بیوی :۔ خدا نہ کرے۔

(فلیٹ کا دروازہ کھلتا ہے۔ ایک نوجوان اور خوب صورت لڑکی داخل ہوتی ہے)

لڑکی :۔ خدا تم دونوں کی دعائیں سنے گا۔

(شدید حیرت سے)

بیوی :۔ DOLLY

(بیوی سے)

شوہر :۔ کون ہے یہ؟

بیوی :۔ ہمسایوں کی لڑکی۔

(خوفزدہ سرگوشی میں)

شوہر :۔ پاگل والی .....

(لڑکی جیب سے پستول نکالتی ہے)

لڑکی :۔ براہ کرم آپ دونوں یہاں میرے سامنے بیٹھ جائیں اور جو کچھ میں کہتی ہوں غور سے سنیں

(لڑکی پستول گھما کر ان کا نشانہ لیتی ہے۔ دونوں میاں بیوی خوف اور حیرت سے گنگ بیٹھے ہیں، ایک کرسی گھسیٹ کر ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے)

لڑکی :۔ مجھے اپنی قسمت پہ خوش ہو۔ تو دیکھئے کہ مجھے گھر سے نکلتے ہی پہلا دروازہ کھلا ہوا مل گیا۔ میرا مطلب آپ کے دروازے سے ہے مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ دونوں آج اپنے فلیٹ میں تنہا ہیں۔ یہ بھی میرے لئے بہت بہتر ہے۔ میرے خیال میں آپ لوگ میری آمد کا مطلب سمجھ گئے ہوں گے، نہیں۔

(میاں بیوی کچھ بولنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر آواز نہیں نکلتی)

لڑکی :۔ ارے بھئی سیدھی سی بات ہے (پستول گھماتی ہے) میں یہاں قتل کرنے آئی ہوں، تم دونوں میں سے کسی ایک کو۔ کسی ایک کو۔

(کانپتی ہوئی آواز میں)

بیوی :۔ ڈولی۔

لڑکی :۔ مجھے بہت افسوس ہے، واقعی بہت افسوس ہے، لیکن میں مجبور ہوں

(تیز آواز میں)

بیوی :۔ ڈولی۔

لڑکی :۔ مجھے یہ کام کرنا ہے۔ میں قتل کی اس خواہش کو دبا نہیں سکتی۔

(کانپتی ہوئی آواز میں)

بیوی :۔ ہم تمہارے ہمسائے ہیں ڈولی۔ تم میری چھوٹی بہنوں کی طرح ہو۔

لڑکی :۔ میں آپ کو تکلیف دینا نہیں چاہتی۔ (خوفزدہ کرنے کے انداز میں) مجھے اس عمل کے نتائج کا کچھ اندازہ نہیں، لیکن میرے اندر سے

ایک آواز آ رہی ہے۔ مسلسل اور تیز آواز — قتل، قتل اور یہ آواز مجھے پاگل کئے دے رہی ہے، اور جب تک میں کسی کو قتل نہیں کر لوں گی یہ آواز مجھے عذاب میں رکھے گی۔

(MUSIC کا تیز BANG یہاں سے پس منظر میں موت کی موسیقی شروع ہوتی ہے جو آخر تک بجتی ہے)

بیوی :۔ (گڑگڑاتے ہوئے) ڈولی ذرا سوچو

لڑکی :۔ میں نے اچھی طرح اور بار بار سوچا ہے۔

بیوی :۔ اگر تم نے سوچا ہوتا تو اتنا ہولناک جرم کبھی نہ کرتیں

لڑکی :۔ مجھے معلوم ہے یہ جرم ہو سکتا ہے لیکن میں بے بس ہوں۔ میں نے خود کو اس سے باز رکھنے کی بے تحاشا کوشش کی ہے۔ میں نے شدید جدوجہد کی ہے۔ لیکن میں اب ہار گئی ہوں۔ کوئی کوشش مجھے اس بہائے جانے والی خواہش سے باز نہیں رکھ سکی جو مجھے قتل پر اکسا رہی ہے۔ مجھے کسی نہ کسی کو قتل کرنا ہے۔ میں مجبور ہوں

شوہر :۔ (کانپتی ہوئی آواز میں) معاف کرنا خاتون میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

لڑکی :۔ کہئے :

شوہر :۔ تم ایک سمجھ دار لڑکی ہو۔ میری تمہاری سیڑھیوں میں کئی دفعہ ملاقات ہوئی ہے۔ تم ہمیشہ بڑے اخلاق سے پیش آتی رہی ہو۔ کیا تمہیں کچھ بھی یاد نہیں۔

لڑکی :۔ میں اب بھی تمہاری عزت کرتی ہوں

شوہر :۔ اور مارنا بھی چاہتی ہو!

لڑکی :۔ میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں، میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ مجھے آج کسی نہ کسی کو ضرور قتل کرنا ہے ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی میرے اس مرض کا ایک ہی علاج ہے قتل (لفظ قتل پر میوزک کا BANG تیزی سے) صرف ایک قتل۔

شوہر :۔ تم قتل کرنا چاہتی ہو — کسی کو بھی۔

لڑکی :۔ ہاں

شوہر :۔ تو پھر تم نیچے سڑک پر جا کر کسی کو قتل کیوں نہیں کرتیں۔

لڑکی :۔ میں نے بھی یہی سوچا تھا، اس ارادے سے نیچے اتر رہی تھی کہ مجھے تمہارا دروازہ کھلا ہوا مل گیا۔

بیوی :۔ (افسوس کے انداز میں) بدقسمتی ہماری۔

لڑکی :۔ لیکن میرے لئے عین خوش قسمتی ہے۔ اگر میں سڑک پر کسی کو قتل کرنا چاہتی تو شاید وہ بھاگ نکلتا یا شور مچا دیتا اور پبلک اکٹھی ہو جاتی اور میرا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ جاتا۔ بہرحال مجھے خوشی ہے میں اس ہنگامہ آرائی سے بچ گئی اور اسی عمارت میں مجھے میرا شکار مل گیا۔ مجھے امید ہے کہ تم اسے میری مجبوری سمجھ کر مجھے معاف کر دو گے۔ اب مہربانی کر کے موت کے لئے تیار ہو جاؤ (پستول ان کی طرف کرتی ہے۔ میاں بیوی محبت سے ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں اور ہاتھ چہروں کے سامنے کرتے ہیں،

بیوی :۔ ڈولی

شوہر :۔ خدا کے لئے ڈولی۔

لڑکی :- میں تم دونوں کو قتل نہیں کرنا چاہتی ۔ میرے علاج کے لئے ایک جان کی قربانی کافی ہے۔

بیوی :- ڈولی — میری پیاری ڈولی — میں نے تمہیں کبھی کوئی دکھ نہیں دیا۔ تم مجھے میرے کئی رشتہ داروں سے زیادہ عزیز ہو، تم پنی ہی سے پوچھ لو۔ ہم نے آج تک تم لوگوں سے کوئی زیادتی کی ہے ؟

لڑکی :- یہ سب ٹھیک ہے مگر میں کیا کروں ؟

شوہر :- ہم بالکل بے گناہ ہیں اور تم جیسی اچھی لڑکی بے گناہ ہمسایوں کا خون کیسے کر سکتی ہے۔

لڑکی :- بے شک تم بے گناہ ہو، مگر میں تمہیں کسی انتقامی جذبے کے تحت قتل نہیں کر رہی ۔ تم واقعی بہت اچھے اور عمدہ لوگ ہو۔ میرے پاس تمہیں قتل کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ سوائے اس کے کہ میں قتل کرنا چاہتی ہوں ۔ قتل برائے قتل

بیوی :- تم اتنی ظالم نہیں ہو سکتیں۔

لڑکی :- (اطمینان سے) ظالم اور میں، تمہیں معلوم ہے میں ایک بلی کا رونا نہیں سن سکتی ۔

بیوی :- (جلدی سے) یہی تو میں بھی کہتی ہوں ۔ میں نے خود تمہیں دوسروں کی تکلیف پر روتے دیکھا ہے۔

شوہر :- (بیوی کا ہاتھ پکڑتا ہے، کیا تمہاری ماں نے تمہیں کبھی نہیں بتایا کہ ہم ایک دوسرے سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔ (ایک دوسرے کو دیکھ ہنستے ہیں)

لڑکی :- مجھے معلوم ہے ۔

شوہر :- پھر بھی تم ہماری اس چھوٹی سی جنت کو تباہ کرنا چاہتی ہو ؟

لڑکی :- (جھنجلا کر) آخر تم لوگ سمجھتے کیوں نہیں، میرے اندر کی خواہش نے میری منطق کو شل کر دیا ہے۔ مجھے اس وقت دنیا، اس کے باشندوں یا ان کی محبتوں کی پرواہ نہیں (ہذیانی انداز میں بولتی ہے، نہ مجھے رحم، ظلم، نیکی، بدی کا علم ہے۔ مجھے صرف ایک چیز کا علم ہے اور وہ ہے اندر سے اُٹھنے والی وہ آواز جو مجھے مسلسل قتل کرنے کا حکم قتل قتل قتل۔ یہ تیز اور تیکھی آواز برمے کی طرح میرے دماغ میں سوراخ کر رہی ہے اور جب تک میں قتل نہیں کر لوں گی، آواز کے عذاب سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکوں گی۔

شوہر :- (خوف آمیز غصے سے) یہ آواز تمہیں اس منحوس کام کی وجہ نہیں بتاتی۔

لڑکی :- نہیں - یہ صرف حکم دیتی ہے اور مجھے اس کا حکم ماننا پڑے گا۔ اپنے سکون کے لئے، اپنی زندگی کے لئے۔ میں اپنے مسئلے کی بہت وضاحت کر چکی ہوں۔ اب مجھے فائر کرنے کی اجازت دو۔

(خطرے کی موسیقی، میاں بیوی گھبرا کر پیچھے ہٹتے ہیں۔ بیوی روتی ہے)

بیوی :- تو تم باز نہیں آؤ گی۔

لڑکی :- (نشانہ لیتے ہوئے) میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔

شوہر :- (کانپتے اور رکتے ہوئے انگلی سے) ایک منٹ خاتون - ایک منٹ - ایک منٹ ۔

لڑکی :- نہ بحث کرنے کا فائدہ ہوگا، نہ منت خوشامد کا۔ مجھے بہرحال ایک گولی چلانی ہے۔ کس پر چلاؤں، بولو — کس پر۔

(ECHO میں آواز بار بار آتی ہے۔)

بیوی :- (سہم کر) کس پر ؟

لڑکی :۔ ہاں بتاؤ کس پر۔ تم میں سے کس پر گولی چلاؤں ۔ تم ؟ یا تم ۔ تم ؟

شوہر :۔ (کانپتے ہوئے) کیا تم سچ مچ ہم میں سے ایک کا انتخاب کرو گی ؟

لڑکی :۔ (دونوں کو سنجیدگی سے گھورتے ہوئے) ہاں مجھے تم دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے، اور یہ کوئی آسان بات نہیں۔ میں کیسے ایک کا انتخاب کر سکتی ہوں جبکہ تم دونوں ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوئے ہو، تم میں سے کوئی بھاگنے کی کوشش بھی نہیں کرتا کہ میں اُسے گولی مار کر اس مصیبت سے خلاصی پاؤں۔ (سوچتے ہوئے دونوں کی طرف باری باری پستول کرتی ہے) بہر حال میں فیصلہ تم پر چھوڑتی ہوں۔

بیوی :۔ (سسکیاں بھرتے ہوئے) کیا ہم سچ مچ مرنے والے ہیں۔ رحم کرو ڈولی، رحم کرو پلیز

شوہر :۔ تو کیا واقعی تم ہمارے لئے موت کا پیغام لے کر آئی ہو۔

لڑکی :۔ (جیسے اپنے آپ سے باتیں کرتی ہے، جب بھی تم موت کا ذکر کرتے ہو میری قتل کی خواہش تیز تر ہو جاتی ہے، سنو۔ اس آواز کو سنو، یہ مجھے قتل کا حکم دے رہی ہے۔ بولو کس کو۔ کس کو قتل کروں (ایک دم زور سے چیختی ہے۔ خطرناک انداز میں دونوں کو گھورتی ہے بیوی کی طرف اشارہ کرتی ہے) جلدی فیصلہ کرو۔ اچھا تو پھر میرا فیصلہ سنو۔ تم۔ خاتون ۔ تم ۔ آگے آؤ۔ ادھر

بیوی :۔ (گڑگڑاتے ہوئے) نہیں ۔ نہیں ۔ نہیں۔

لڑکی :۔ تم مرنا نہیں چاہتیں۔

بیوی :۔ (جذباتی انداز میں) نہیں ۔ نہیں ۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔

لڑکی :۔ ٹھیک ہے پھر تمہارے شوہر کو مرنا ہوگا، آگے آؤ مسٹر۔

شوہر :۔ (لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں) نہیں ۔ نہیں ۔ خاتون مجھے مت مارو ۔ میں ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔

لڑکی :۔ تم بھی مرنا نہیں چاہتے۔

شوہر :۔ نہیں ۔ قطعاً نہیں۔

لڑکی :۔ تم بھی مرنا نہیں چاہتے اور تم بھی نہیں چاہتیں۔ لیکن ایک نہ ایک کو تو مرنا ہے۔ ٹھیک ہے میں یونہی گولی چلاتی ہوں (پستول سیدھا کرتے ہوئے) جسے لگ جائے، لگ جائے۔

(خوفزدہ ہو کر چیختے ہوئے)

BANG MUSIC

بیوی :۔ نہیں ڈولی نہیں ۔ مجھے مت مارو ، یہ ایک دوہرا قتل ہوگا۔ کیونکہ میں ۔ میں ماں بننے والی ہوں۔

لڑکی :۔ (پستول کا رخ ایک دم نیچے کرتی ہے) اوہ، تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ خدا کا شکر ہے۔ اُس نے تمہیں آخری لمحے میں بچا لیا، یقیناً تمہیں زندہ رہنا چاہیئے، اپنے بچے کے لئے۔ اوہ خدایا۔ میں کتنا بڑا ظلم کرنے والی تھی۔ تم اور تمہارا ہونے والا بچہ دونوں زندہ رہیں گے۔ تمہارا خاوند آگے آئے، چلو مسٹر۔

شوہر :۔ (خوف سے کانپتے ہوئے) مت مارو خاتون، مجھے مت مارو۔

لڑکی :۔ (پستول اُس کی طرف تانتے ہوئے) اب میرے پاس کوئی گنجائش نہیں۔ تمہاری بیوی جیت گئی۔ کیوں کہ وہ ماں بننے والی ہے۔

(پستول تانتی ہے)

شوہر:۔ (خوف سے چیختے ہوئے) یہ جھوٹ بول رہی ہے، خدا کی قسم یہ جھوٹ بول رہی ہے۔

لڑکی:۔ تمہیں یقین ہے کہ تم سچ کہہ رہے ہو؟

شوہر:۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ ڈاکٹروں نے صاف جواب دے دیا ہے کہ یہ کبھی ماں نہیں بن سکتی میں بڑے سے بڑے سپیشلسٹ کو دکھا چکا ہوں۔

لڑکی:۔ (نفرت سے) اتنا بڑا جھوٹ۔

بیوی:۔ (خاوند کی طرف اشارہ کرکے) جھوٹ میں نہیں، یہ بول رہا ہے۔ بکواس کر رہا ہے بالکل۔

شوہر:۔ بکواس میں کر رہا ہوں یا تم کر رہی ہو؟

لڑکی: خاموش: چونکہ کوئی بھی اپنے ساتھی کے لئے گولی کھانے کو تیار نہیں ہے، اس لئے مجھے دو گولیاں چلانی پڑیں گی۔ اگرچہ میرا مسئلہ صرف ایک گولی میں حل ہو سکتا تھا۔

(دونوں خاموش رہتے ہیں، ذرا سے وقفے کے بعد)

شوہر:۔ کیوں نہ ٹاس کر لیا جائے، اگر ہیڈ آگیا تو اسے گولی مار دیں۔ ملا، TA آگئی تو مجھے۔

(شوہر سکہ اچھالنے لگتا ہے، بیوی اُس کے ہاتھ سے سکہ چھینتی ہے)

بیوی:۔ نہیں۔ ہیڈ آئے تو اُسے گولی مارنا ورنہ...

شوہر:۔ مجھے یہ بھی منظور ہے۔

بیوی:۔ مجھے تم پر اعتبار نہیں۔ سکہ مجھے دو۔

(دستک کی آواز۔ کیمرہ کٹ کرکے دروازے پر جاتا ہے۔ بیمہ ایجنٹ اندر آتا ہے)

ایجنٹ:۔ معاف کیجئے، میں اپنا قلم یہاں بھول گیا تھا۔ میرے لئے یہ بڑی جذباتی اہمیت رکھتا ہے، زحمت کی معافی چاہتا ہوں۔

(کیمرہ کٹ کرکے میز پر پڑے قلم کے کلوز اپ لیتا ہے۔ ایجنٹ قلم اٹھاتا ہے۔ بیوی چیختے ہوئے)

بیوی:۔ ڈاکٹر۔ ہمیں بچاؤ ڈاکٹر۔

ایجنٹ:۔ (بات بناتے ہوئے) اوپر والی بیمار لڑکی، وہ اب بالکل ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک۔

(بیوی آنکھ کے اشارے سے لڑکی کی طرف اشارہ کرتی ہے اور سرگوشی میں کہتی ہے)

بیوی:۔ وہ یہ کھڑی ہے۔

یجنٹ کی نظر لڑکی پر پڑتی ہے۔ کھسیانی سی ہنسی ہنس کر لڑکی ایک دم پستول اُس کی طرف کرتی ہے۔ ایجنٹ گھبرا کر پیچھے ہٹتا ہے لڑکی مسکراتی ہے۔ گھبرا کر پیچھے ہٹتے ہوئے)

ایجنٹ:۔ اوہ آپ یہاں ہیں!

لڑکی:۔ خوب، تو تم ڈاکٹر ہو، آجاؤ تم بھی۔

ایجنٹ:۔ خواہ مخواہ۔ یعنی کس سلسلے میں؟

لڑکی:۔ اب تم دو کی جگہ تین ہو گئے ہو اور آسانی سے فیصلہ کر سکتے ہو۔

ایجنٹ :- کیسا فیصلہ ؟

لڑکی :- تم میں سے ایک کو مرنا ہے۔ ابھی، اسی وقت۔

ایجنٹ :- (گھبرا کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے) اوہ خدایا۔

لڑکی :- میرا خیال ہے، تم میں سے جو بھاگنے کی کوشش کرے۔ اُس پر گولی چلا دوں گی۔

ایجنٹ :- (بُت کی طرح بیٹھتے ہوئے، میں بھاگوں گا تو نہیں، لیکن مجھے ذرا قصہ تو سمجھا دیں۔

لڑکی :- زیادہ باتیں نہ کرو، میرے پاس ضائع کرنے کے لئے وقت نہیں ہے۔ جلدی سے فیصلہ کرو۔

(بیوی ہلے جُلے بغیر ایجنٹ سے سرگوشی کرتی ہے)

بیوی :- ڈاکٹر — پلیز کوئی طریقہ سوچو

ایجنٹ :- (اُسی انداز میں) کیسا طریقہ ؟ مرنے کا طریقہ ؟ میں تو آج تک نہیں مرا مجھے تو ڈر لگتا ہے۔

بیوی :- (اسی انداز میں) اسی طرح تو ہم سب مارے جائیں گے۔ کچھ سوچو۔

شوہر :- (بلند آواز میں) یہ ڈاکٹر نہیں ہے، بیمہ ایجنٹ ہے۔

بیوی :- (حیرت سے) کیا یہ ڈاکٹر نہیں ہے۔

ایجنٹ :- (شوہر سے سرگوشی کرتے ہوئے) تم نے تو کہا تھا کہ تمہاری بیوی کو اس کا پتہ نہ چلے وہ تم سے ڈر تم سے بہت محبت کرتے ہو۔

بیوی :- اب وہ میری موت سے خوفزدہ نہیں بلکہ شاید خوش ہی ہو۔ تم شوق سے بتا دو۔

(لڑکی چند لمحے انہیں سختی سے گھورتی ہے، پھر چیختی ہے)

لڑکی :- خاموش ! کیا تم چاہتے ہو کہ میں جھلا کر تم کو قتل کر دوں۔ میں نے کہا ہے میں تم میں سے صرف ایک کو قتل کرنا چاہتی ہوں مقتول کون ہوگا اس کا فیصلہ تمہیں خود کرنا ہے۔ اب تم تین ہو، میں چاہتی ہوں کثریت کی بنا پر فیصلہ کرو، جیسا کہ انصاف کا طریقہ ہے تم میں جو اکثریت فیصلہ کرے گی، میں اسے تسلیم کر لوں گی۔

(میاں بیوی آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں)

شوہر :- یہ ٹھیک ہے۔

بیوی :- یہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہم دونوں متفقہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اس تیسرے کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

لڑکی :- تو ٹھیک ہے۔ میں اکثریت کا فیصلہ تسلیم کرتی ہوں۔

ایجنٹ :- ٹھہریئے۔ اگر میں اپنا قلم واپس لینے نہ آتا تو تم کیا کرتیں؟

لڑکی :- (شوہر اور بیوی کی طرف اشارہ کرکے) میں ان دونوں میں سے کسی ایک کو قتل کرتی۔

ایجنٹ :- تو پھر سمجھ لو کہ میں موجود نہیں ہوں اور تم وہی کرو جو تم نے پہلے سوچا تھا۔

لڑکی :- یہ تو سراسر حماقت ہے کیونکہ تم موجود ہو اور اکثریت کا فیصلہ تمہارے خلاف ہے۔

(بیوی کی طرف اشارہ کرکے)

ایجنٹ :- اکثریت - اس عورت کو علم نہیں کہ اس کے لئے کیا بات بہتر ہے۔ اگر اسے پتہ ہوتا تو یہ میرے ساتھ مل کر اپنے شوہر ہے ...

فیصد دیتی کیونکہ جونہی یہ مرا ، پچاس ہزار روپے کی ۔۔۔۔

شوہر :۔ بکواس بند کرو ۔۔۔۔

لڑکی :۔ ریڈی، مسٹر بیمہ ایجنٹ عرف ڈاکٹر۔

ایجنٹ :۔ رحم ۔ خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو ۔ مجھے اتنی جلدی مت مارو ۔ میرے بیوی بچوں پر رحم کرو ۔ میری بیوی میری موت کی خبر سن کر زندہ درگور ہو جائے گی ۔ اسے مجھ سے بہت ہے ۔ محبت جو میں نے اپنی بیوی کو پہلی دفعہ دیکھ کر محسوس کی تھی ۔ محبت جو زندگی تخلیق کرتی ہے ۔

لڑکی :۔ کیا محبت محبت لگا رکھی ہے ۔ سب فضول باتیں ہیں ۔ (میاں بیوی کی طرف اشارہ کرتی ہے ) ان کو دیکھو دونوں محبت کی انتہا بنے بیٹھے تھے ۔ ان کے خلوص اور وفاداری کے قصے سب کی زبان پر تھے ۔ تم نے دیکھا نہیں کیسے ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو رہے تھے ابھی ۔

بیوی :۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میرا خاوند اس طرح مجھے دھوکا دے گا ۔

شوہر :۔ دھوکا تم نے دیا ہے یا میں نے !

لڑکی :۔ کسی نے کسی کو دھوکا نہیں دیا تم دونوں ایک دوسرے کو دھوکا دے رہے تھے کیونکہ تم میں سے کسی نے اپنی روح کے سمندر میں دور تک جھانک کر نہیں دیکھا تھا کہ اس میں کیا ہے ۔ اس کی چمکدار سطح کے نیچے کیسے گدلے پتھر، ریت ، جھاڑیاں ، پودے ، چٹانیں اور OCTOPUS سوئے ہوئے ہیں ۔ یہ سب مجھے آج ڈاکٹر نے بتایا ہے ۔

بیوی :۔ کیا تم آج ڈاکٹر سے ملی تھیں ۔

لڑکی :۔ ہاں ۔ وہ ایک بہت بڑا ماہر نفسیات ہے ۔ میں نے اس ملاقات کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا ۔ اپنی ماں کو بھی نہیں ۔ میں نے اس سے اس آواز کے بارے میں پوچھا جو مجھے قتل پر اکساتی ہے ۔

بیوی :۔ پھر کیا بتایا اس نے ؟

لڑکی :۔ اس نے مجھے آواز کا حکم ماننے کو کہا ، اس نے کہا ، مجھے اس خواہش کو دبانا نہیں چاہیئے ۔

(سرگوشی میں حیرت سے چیختے ہوئے)

ایجنٹ :۔ اس نے تمہیں قتل کرنے کو کہا ، ناممکن ۔

لڑکی : اس نے کہا اگر میں نے قتل کر دیا تو میں ٹھیک ہو جاؤں گی ۔ اسی نے مجھے یہ پستول بھی دیا ہے ۔

(سخت حیرت سے)

ایجنٹ :۔ ڈاکٹر نے تمہیں یہ پستول دیا قتل کرنے کے لئے ، حیرت ہے ۔

لڑکی :۔ اس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ یہی میرا علاج ہے ۔ مجھے ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کرنا چاہیئے ۔ تمہیں اس سلسلے میں میری مدد کرنی چاہیئے چلو شاباش ، میں تمہاری شکر گزار ہوں گی ۔

(پستول تانتی ہے)

ایجنٹ :۔ شکر گزار ۔ کب ۔ میرے مرنے کے بعد ۔ کیا کہہ رہی ہو ( دونوں ہاتھ اٹھا کر روکتے ہوئے ) تم ٹھہرو ۔ پلیز میری بات سنو ۔ ٹھہرو ۔

لڑکی :۔ میں بہت ٹھہر چکی ہوں ۔ اب مجھے اپنا علاج کرنے دو ، READY ہو جاؤ ۔

(اسی مضبوطی سے پکڑتا ہے)

ایجنٹ :۔ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا، ہم اکٹھے مریں گے۔ میرا کیا قصور ہے! میں یہاں تمہاری زندگی کا بیمہ کرنے آیا تھا اور اب مر رہا ہوں، بغیر اپنی زندگی کا بیمہ کرائے۔ نہیں، ہم تینوں ساتھ مریں گے۔

(بیوی سے)

شوہر :۔ خدا کے لئے مجھے اس سے چھڑاؤ۔

بیوی :۔ میں کیسے چھڑاؤں۔ اُس نے بہت مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے۔

(تینوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں)

شوہر :۔ کچھ کرو، یوں بُت بنی کیا دیکھ رہی ہو۔

(لڑکی چند لمحے پریشانی میں تینوں کو دیکھتی ہے)

لڑکی :۔ میں تم لوگوں پر گولی چلاؤں گی۔ اب جس کو بھی لگے، اس کی قسمت! یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ ONE TWO THREE۔

(تینوں چیخ مار کر گر جاتے ہیں۔ لڑکی سکون کا سانس لیتی ہے، جیسے بوجھ ہلکا ہو گیا ہو)

لڑکی :۔ گولی کسے لگی ہے!

بیوی :۔ مجھے، میں مر رہی ہوں۔

شوہر :۔ میں مر چکا ہوں۔

ایجنٹ :۔ میں ختم ہو چکا ہوں۔

لڑکی :۔ ناممکن۔ قطعاً ناممکن ہے یہ۔ ایک گولی تم تینوں کو قتل نہیں کر سکتی۔ تم میں سے دو یقیناً زندہ ہوں گے۔ پھر چیک کرو۔

(تینوں اٹھ کر اپنے جسموں کو ٹٹولتے ہیں)

لڑکی :۔ یہ تمہارے کپڑوں اور چہروں پر کالا کالا کیا ہے۔

ایجنٹ :۔ شاید بارُود ہے۔

لڑکی :۔ اور گولی، گولی کہاں گئی، کس کے جسم میں ہے وہ۔

شوہر :۔ (اپنے جسم اور کپڑوں کی تلاشی لے کر) اب کیا تم ہمیں اپنی گولی ڈھونڈنے پر بھی مجبور کرو گی۔

بیوی :۔ (پسینہ پونچھتے ہوئے) کہیں خون کا ایک قطرہ نہیں۔

ایجنٹ :۔ (میز سے پستول اٹھا کر اُسے غور سے دیکھتا ہے) پستول میں بارود کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

لڑکی :۔ کیا تمہیں یقین ہے۔

ایجنٹ :۔ (پستول اسے دیتا ہے) لو خود دیکھ لو۔

لڑکی :۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ سب ڈاکٹر کی سکیم تھی۔ بہرحال اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔

ایجنٹ :۔ میرا خیال ہے میں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔ تمہارا بہت بہت شکریہ خاتون۔ اب میں اس وقت تک کسی کے گھر نہیں جاؤں گا، جب تک اپنا بیمہ نہیں کرا لیتا۔

(چلا جاتا ہے)

لڑکی :۔ مجھے افسوس ہے میری وجہ سے آپ کو اتنی تکلیف ہوئی بہرحال میں آپ لوگوں کی بے حد شکر گزار ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے گولی چلانے کے بعد میں بالکل ٹھیک ہو گئی ہوں۔ وہ آواز بھی بند ہو گئی ہے سارا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے AM NARMAL NOW I خدا حافظ بہت بہت شکریہ

شوہر :۔ یہ سب کیا تھا !

بیوی :۔ شاید کوئی ڈراؤنا خواب تھا !

شوہر :۔ ہاں ہاں یقیناً خواب ہی ہوگا۔ ہمیں دنیا کی کوئی طاقت ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی۔

(گولی کی آواز)

لڑکی :۔ اوہ معاف کیجئے ایک بات میں بھول گئی۔ آج میری صحت یابی کی خوشی میں آپ ڈنر میرے گھر کھائیے اور ہاں اجازت ہو تو اس خوشی کے موقع پر باقی پٹاخے بھی چلا لوں۔

(پستول چلتی ہے)

(ستمبر ۱۹۸۰ء)

قدرت اللہ شہاب نے کہا صرف حب الوطنی کا جذبہ کافی نہیں ہے۔ ہمیں جنون پیدا کرنا ہوگا۔ جوشِ جہاد اور شوقِ شہادت۔ اسی میں پاکستان کی سلامتی اور مستقبل کا راز پوشیدہ ہے

ممتاز مفتی

# نظمیں

چالیس سالہ مخزن

## ماآل!

ڈاکٹر تصدق حسین خالد

کھیت سوتے ہیں
فضا میں کرگسوں کا ایک جھنڈ
تیرتا آتا ہے، منڈلاتا ہوا
سوئے زمیں
آنکھ میں تنہائیوں کی وسعتیں

جھونپڑی میں ایک ماں
اک جواں افسردگی
سینۂ عریاں سے لپٹائے ہوئے
ایک جانِ ناتواں

آنکھ پُرنم، ہونٹ لرزاں
"بچی، مری جاں بچی،
جواں ہو،
منتظر ہے تیری قرباں گاہِ امن"

دسمبر ۱۹۵۰ء

## حُسنِ خیال

جوش ملیح آبادی

ذہن میں، پھر، مہک اُٹھا ہے خیال
مثلِ زلفِ عروسِ چہاردہ سال
پھر، بہاروں کی یاد آئی ہے
اوڑھ کر، چادرِ نسیمِ شمال
فکر کے نقشِ پا میں، غلطاں ہیں
حوریانِ بہشت کے خد و خال
پھر، مرے نورِ ذہن کے آگے
طور، پھیلا رہا ہے، دستِ سوال
پھر، میری جیبِ ذوقِ رنگیں ہے
دولتِ رنگ و بو، سے، مالا مال
مجھ سے، آمادۂ بغاوت ہو
روحِ آفاق کی نہیں یہ مجال
خس و خاشاک و سنگ و خشت سے بھی
چُن رہا ہوں، تجلیاتِ جمال
اے سمن چہرہ مُغبچے، بھر دے
آبِ جامد میں، آتشِ سیال
جوش آئی کسے، یہ انگڑائی؟
کہ لچکنے لگی کمانِ ہلال؟

مارچ ۵۸ء

## کیا چاہتا ہوں

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی

زمانے سے مہر و وفا چاہتا ہوں
ذرا دیکھنا کس سے کیا چاہتا ہوں
سنے دل سے دل کی کہوں جس سے باتیں
وہ مونس وہ درد آشنا چاہتا ہوں
نہیں شوخ چشمی یہ جوششِ فنا ہے
کہ تجھ سے تجھے اے خدا چاہتا ہوں
یہ حسنِ طلب بھی ہے کیا ندرت آئیں
جو کوئی نہیں چاہتا، چاہتا ہوں
منور منور درخشاں درخشاں
دل و دیدہ طور آشنا چاہتا ہوں
کہیں میں، کہیں دل، تو پھر کون جانے
وہ کیا چاہتا ہے، میں کیا چاہتا ہوں
مرے ذوق میں ہے لطافت پسندی
نہیں حسن، حسنِ ادا چاہتا ہوں
خودی محو ہونے کو ہے بیخودی میں
کہ اپنے ہی میں گم ہوا چاہتا ہوں
زباں سے زمانے کی بچنے کو کیفی
میں اک کفرِ ایماں نما چاہتا ہوں

اگست ۱۹۴۹ء

ن ۔ م ۔ راشد

# ایران میں اجنبی

## پانچواں قطعہ

(جنگ کے زمانہ میں طہران، پولش مہاجرین سے بھرا پڑا تھا۔ ان میں اکثر و بیشتر عورتیں تھیں، جنہیں پولینڈ کے روس حملہ آور اپنے گھروں سے نکال کر پہلے سائبیریا وغیرہ لے گئے تھے۔ وہ ایک عرصہ تک نہایت حقیر آذوقہ حیات کے بدلے، برفوں میں خندقیں کھودنے کا کام کرتی رہیں، پھر انہیں، روسیوں، نے ایران لا کر آزاد کر دیا۔ ان میں سے اکثر مختلف قوموں کی فوجوں کے پاس، سپاہیوں اور افسروں کی اقامت گاہوں میں کام کرتی تھیں۔ پولینڈ میں انہیں اب کوئی کشش نظر نہ آتی تھی، روس وہ جانا نہیں چاہتی تھیں۔ ایران، تہذیبی نقطۂ نظر سے اُن سے بہت دور تھا، اس لئے ان میں سے اکثر کی انتہائی تمنا یہ ہوتی آتی تھی کہ کسی امریکی سپاہی کے ساتھ لگ کر امریکہ چلی جائیں اور باقی زندگی وہیں گذار دیں۔ "ایران میں اجنبی" کے پانچویں قطعے میں میں نے ایک پولش مہاجر کی ایسی ہی "رخصتی" کو بہانہ بنا کر جنگ کے مہاجرین کے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔

(ن ۔ م ۔ راشد)

یہاں، اس رباطِ سرپل میں یوں تو
رہی ہر ملاقات، تنہائی سخت تر کا ہیولا،
مگر آج کی یہ جدائی
سپاہی کے ہونٹوں پہ ہلکی سی موجِ تبسم بھی اُٹھنے نہ دے گی!

خدا حافظ اے گلعذارِ لہستاں!
مبارک کہ آج تو دنیائے نو کو چلی ہے!
جہاں تیرا ہمسر تجھے آج لے جا رہا ہے،
لہستاں تو بے شک وہاں بھی نہ ہوگا
مگر اس ولایت میں
جو حریت کیش جمہور کی آنکھ کا ہے درخشندہ تارا
تجھے بے حقیقت سہاروں سے
غیروں کی خاطر شب و روز کی اس مشقت سے
کچھ تو ملے گی رہائی!
وہاں تجھ کو آہنگ رنگ و زباں
کچھ تو تسکین دے گا!
اور ان غم سے پامال ہجرت گزینوں کے

بچھے ہوئے قافلے سے
الگ ہو کے منزل کا دھوکا تو ہوگا!
یہ مانا کہ تو شاخسارِ شکستہ ہے
اور شاخسارِ شکستہ رہے گی!
مگر اُس نئی سرزمیں میں
تجھے سبز پتوں کی، شاداب پھولوں کی
اُمید پیدا تو ہوگی!
تجھے کیسے روندا گیا ہے،
تجھے در بدر کیسے راندا گیا ہے،
میں سب جانتا ہوں!
کہ شاکی ہے تو جس الم کی
وہ تنہا کسی کا نہیں ہے،
وہ بڑھتا ہوا آج ذرّے سے عفریت بنتا چلا جا رہا ہے!

تو تازی نہ تھی
تجھ کو فاشی تخیل سے کوئی لگاؤ نہ تھا،
بس ترا جرم یہ تھا

تجھے عافیت کی طلب تھی،
وطن کی محبت بھری سرزمیں کی،
شبِ ماہ، بزمِ طرب، جام و مینا کی
منزل کی آسودگی کی طلب تھی!
طلب تھی سحرگاہ، محبوب کے گرم، راحت سے لبریز
بالش پہ خوابِ گراں کی!
اور اس جرم کی یہ سزا، اے خدا!
سامنے تیری بے بس نگاہوں کے محبوب کی لاش
پھر اجنبی قید میں،
روس کے برف زاروں میں بیگار
روٹی کے شب ماندہ ٹکڑوں کی خاطر!
اور اب سال بھر سے
یہ "فوجی سرائے" میں خدمت گزاری
یہ دریوزہ کوشی،
یہ دو نیم بے مدعا زندگی
جس کا ماضی تو ویراں تھا
آئندہ و حال بھی بے نشاں ہو چکے تھے!
حقیقت کی دنیا تو ہے ہی،
مگر اک خیالوں کی خوابوں کی دنیا بھی ہوتی ہے
جو آخرِ کار بنتی ہے تقدیر کا خطِ جادہ!
مگر انتہائے ستم!
تیرے خوابوں، خیالوں پہ بھی
تو بہ تو یاس
کائی کے مانند جمنے لگی تھی!
کہاں بھول سکتا ہوں
اے عندلیبِ لہستاں!
وہ نغمے، لہستاں کے دہقانی نغمے،
جو "فوجی سرائے" کی بیکار شاموں میں
تیری زباں سے سُنے ہیں!
وہ جن میں سیہ چشم ہندی کی خاطر
لہستاں کی عورت کا دل یوں دھڑکتا ہے،
جیسے وہ ہندی کی مشکیں رعنائیوں تک
پہنچ کر رہے گا
جنہیں سُن کے محسوس ہوتا رہا ہے
وہ رُوحِ شب گرد
جو پے بہ پے وسوسوں میں گھری ہے
دبے پاؤں جس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔
اب آخر شبستانِ مشرق کے
اُجڑے ہوئے آشیانوں کے اُوپر
لگا تار منڈلا رہی ہے!
اسی رُوحِ شب گرد کا
اک کنایہ ہے ہجرت گزینوں کا یہ قافلہ بھی
جو دستِ ستمگر سے
مغرب کی، مشرق کی پہنائیوں میں
بھٹکتا ہوا پھر رہا ہے!

یہاں، اس رباطِ سر پُل میں لیکن
یہی اک سہارا ہے باقی ہمارے لئے بھی
کہ اس اجنبی سرزمیں میں،
یہ سب ساز و ساماں
ہوا کی گذرگاہ میں اک پرکاہ سے بھی ہے کم تر!
بکھر جائے گا جلد،
افسردہ حالوں کا، خانہ بدوشوں کا یہ قافلہ
اور پھر عافیت کی سحر
ان کا نقشِ کفِ پا بنے گی!

مارچ ۱۹۵۰ء

فیض احمد فیض

## نظم

ٹھہر گئی آسماں کی ندیا
وہ جا لگی ہے اُفق کنارے
اُداس رنگوں کی چاند ندیا
اُتر گئے ساحلِ زمیں پر
سبھی کھویّا

تمام تارے
اکھڑ گئی سانس پتیوں کی
چلی گئیں اونگھ میں ہوائیں
گجر بجا حکمِ خامشی کا
تو چپ میں گم ہو گئیں صدائیں
سحر کی گوری کی چھاتیوں سے
ڈھلک گئی تیرگی کی چادر
اور اس بجائے
بکھر گئے اس کے تن بدن پر
نراس تنہائیوں کے سائے
اور اس کو کچھ بھی خبر نہیں ہے
کسی کو کچھ بھی خبر نہیں ہے
کہ دن ڈھلے، شہر سے نکل کر
کدھر کو جانے کا رُخ کیا تھا
نہ کوئی جادہ، نہ کوئی منزل
کسی مسافر کو اب دماغِ سفر نہیں ہے
یہ وقت، زنجیرِ روز و شب کی
کہیں سے ٹوٹی ہوئی کڑی ہے
یہ ماتم وقت کی گھڑی ہے

وہ وقت آئے تو بے ارادہ
میں اجنبی بن کے دیکھتا ہوں
کبھی کبھی اپنے تن بدن سے
اُتار کر ذات کا لبادہ
کہیں سیاہی ملامتوں کی
کہیں پہ گل بوٹے اُلفتوں کے
کہیں لکیریں ہیں آنسوؤں کی
کہیں پہ خونِ جگر کے دھبے
یہ چاک ہے پنجۂ عدد کا
یہ مُہر ہے یارِ مہرباں کی
یہ لعل، لب ہائے مہوشاں کے
یہ تھوک ہے شیخ کی زباں کی
یہ جامۂ روز و شب گزیدہ
مجھے یہ پیراہنِ دریدہ
پسند بھی ناپسند بھی ہے
کبھی یہ فرمانِ جوشِ وحشت
کہ نوچ کر اس کو پھینک ڈالو
کبھی یہ سرگوشیٔ محبت
کہ چوم کر پھر گلے لگا لو،

جون ۷۹ء

## نظم

میں کیا لکھوں کہ جو میرا تمہارا رشتہ ہے
وہ عاشقی کی زباں میں کہیں بھی درج نہیں
لکھا گیا ہے بہت لطفِ وصل و دردِ فراق
مگر یہ کیفیت اپنی رقم نہیں ہے کہیں
یہ اپنا عشق ہم آغوش جس میں ہجر و وصال
یہ اپنا درد کہ ہے کب سے ہمدمِ مہ و سال
اس عشقِ خاص کو ہر ایک سے چھپائے ہوئے
"گزر گیا ہے زمانہ گلے لگائے ہوئے"

جون ۱۹۷۹ء

چالیس سالہ مخزن

فیض احمد فیض

مرے دل مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رُخ نگر نگر کا
کہ سراغ کوئی پائیں
کسی یارِ نامہ بر کا

ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتہ تھا اپنے گھر کا
سرِ کوئے ناشنایاں
ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا
کبھی اُس سے بات کرنا
جو ملا نہ کوئی پُرساں
بہم التفات کرنا

تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے
شبِ غم بُری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا بُرا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا

جولائی ۷۸ء

احمد ندیم قاسمی

## ۱۹۷۷ء

اُدھر سورج اُبھرتا ہے
اِدھر شاموں کے سنّاٹے
شفق میں بھیگ کر
نور و نوا کے منتظر ذہنوں کے صحنوں میں
اُترتے ہیں!
اُدھر مشرق سے سیلابِ تجلّی جب اُفق کے ساحلوں
کو پھاند جاتا ہے
اِدھر مغرب سے تاریکی کے فوّارے، اُبل کر
روشنی کی سب لووں کو چاٹ لیتے ہیں!
اُدھر موسم بدلتا ہے
اِدھر گل تو نہیں کھلتے، مگر پتھر جو یخ تھے، تپنے
لگتے ہیں!
اُدھر پتوں پہ شبنم آئینے بن کر اُترتی ہے
اِدھر ٹوٹے ہوئے ذرّے کا جوہر
اپنے دانتوں میں لیے شہ رگ زمیں کی
دندناتا پھر رہا ہے
جیسے اب جو کچھ بھی ہوگا، صرف اُس کے حکم سے
ہوگا!
اُدھر کے اور اِدھر کے پاٹ میں انسان دب
کر رہ گیا ہے
اور چکی چلنے والی ہے!

جنوری ۷۸ء

ابوالاثر حفیظ جالندھری

# خواب کی باتیں

(۱)

سیرِ چمن کی وہ سحر، یاد ہے خوب یاد ہے
داغ تو دل پہ ہے مگر، لطفِ نگاہ شاد ہے
منظرِ شرق لال لال
منہ پہ ملا ہوا گلال
بادِ صبا کی نرم چال
رقص میں شاخِ ہر نہال
اور مرے دل و جگر، نغمہ و رنگ سر بسر
سیرِ چمن کی وہ سحر
یاد ہے خوب یاد ہے
داغ تو دل پہ ہے مگر، لطفِ نگاہ شاد ہے

(۲)

حدِ نگاہ تک تمام، جزو سے کل ملا ہوا
سُرخ، سفید، نیل فام، تختۂ گل کھلا ہوا
بلبل و گل کی داستاں
حسن کی عشوہ کاریاں
عشق کی آہ و زاریاں
نہرِ چمن رواں دواں
سرو و سمن یہاں وہاں
برگ و ثمر کا انتظام، فطرتِ پختہ کار خام
حدِ نگاہ تک تمام، جزو سے کل ملا ہوا
سُرخ، سفید، نیل فام، تختۂ گل کھلا ہوا

(۳)

ہاں وہ عجیب تھا سماں، درد فزا و پُر سرور
آئی نظر جو ناگہاں، تختۂ گل پہ ایک حور
آہ وہ پیکرِ شباب
ہائے شرارتی حجاب
وائے اشارتی عتاب
(میرا ہی وہم تھا کہ خواب)
(یہ تو کہوں گا میں کہ ہاں، کچھ تو ضرور تھا وہاں)
ہاں وہ عجیب تھا سماں
درد فزا و پُر سرور
آئی نظر جو ناگہاں، تختۂ گل پہ ایک حور

(۴)

جام بدست کائنات، لالہ فروش ہر طرف
حسن پرست شش جہات، دوش بدوش صف بہ صف
موجِ شمیم عطر بیز
فوجِ نسیم تیز تیز
ولولے انبساط خیز
ہو ندیِ گل نشاط ریز
ایک عروس کا جہیز
اور دلہن بس ایک ذات، جس کا جلوس اور برات
جام بدست کائنات
لالہ فروش ہر طرف
حسن پرست شش جہات، دوش بدوش صف بہ صف

(۵)

آنکھ میں بجلیاں مگر، اُن کے اثر سے بے خبر
جنبشِ سر سے بے خبر، سحرِ نظر سے بے خبر
مکر نہیں، ریا نہیں
ظلم نہیں، جفا نہیں
نازشِ ناروا نہیں
سازشِ فتنہ زا نہیں
یہ بھی خبر ذرا نہیں
کس پہ پڑی ہے یہ نظر، برق گری کدھر کدھر
آنکھوں میں بجلیاں مگر
ان کے اثر سے بے خبر
جنبشِ سر سے بے خبر، سحرِ نظر سے بے خبر

(۶)

جب وہ خرامِ ناز سے، ایک روش پہ مڑ گئی
دامنِ گل بھرے ہوئے ہیں، سبز پری تھی اُڑ گئی
لے گئی دولتِ قرار
کر گئی ہوش کو شکار
چھوڑ گئی یہ حالِ زار
آنکھ کو محوِ انتظار
شوخیٔ بے نیاز سے، عشوۂ پاک باز سے
جب وہ خرامِ ناز سے، ایک روش پہ مڑ گئی

جنوری ۵۶ء

چالیس سالہ مخزن

اختر اورینوی

# ابدی رات

سوَن کی شام دلآویز ہے گلنار ہنوز      سیم سیّال کے نغمے بھی ہیں بیدار ہنوز
اب بھی پروائی کی ساون میں بہک آتی ہے      اَب بھی بھیگی ہوئی زلفوں کی مہک آتی ہے
آم کے باغ پہ متوالی گھٹا چھاتی ہے      دھان کے کھیت کو انگڑائی چلی آتی ہے
اب بھی ندی کی لچکتی ہوئی بانہیں ہیں وہی      اَب بھی باغوں میں مچلتی ہوئی راتیں ہیں وہی
سرسراتی ہوئی شاخوں میں ہوا ہے چنچل      لہلہاتا ہوا وادی پہ ہے دھانی مخمل
کوک کوئل کی ہے بے تابِ تمنا اب تک      رقصِ بسمل کی ہے اک ہوک پپیہا اب تک
تاڑ کی اوٹ میں خنداں ہے ابھی تک مہتاب      اب بھی شیشم کی قطاروں پہ ہے شبنم سیماب
اَب بھی پتوں میں ہے کرنوں کی وہ جھل مِل باقی      سرو شاداب چمن میں ہے مثالِ ساقی
نقرئی جام ہے بیلا، تو ہے چمپا زر فام      پھول کا نشہ ہے نغمہ زدہ گلستاں میں تمام
بال کھولے ہوئے سائے ہیں کہ ہے موجِ خمار      فرشِ گلشن پہ ہے کتری ہوئی چاندی کی بہار
چاندنی کھیلتی ہے ریت کے ٹیلوں پہ ہنوز      بانسری بجتی ہے، گھلتی ہے فضائے پُر سوز
پھر بھی منظر میں کمی سی یہ کھٹکتی کیوں ہے؟      شوقِ حیراں کی نگہ آج بھٹکتی کیوں ہے؟
اب بھی ہیں زہرہ وشاں دشمنِ ایماں اَب بھی      اَب بھی زنجیرِ خرد کاکُل پیچاں اَب بھی
اَب بھی بے تاب ہے دامانِ تمنا اَب بھی      اَب بھی بے خواب ہے یہ چشمِ تماشا اَب بھی
سب سہی پر وہ محبت کی نظر ہے خاموش      دل تو ویراں ہے بلا سے ہو گلستاں گل پوش
چاندنی رات جگاتی ہی رہے گی جادوؔ      رین برسات کی جھمکائے گی سیمیں گھنگرو
جب بہار آئے گی، کلیوں کو نکھار آئے گی      شامِ گلبار شفق کو بھی سنوار آئے گی
اس خزاں دیدہ تمنا کی نہیں کوئی بہار      پھول اُلفت کے جو مرجھائے تو پھر خار ہی خار
دل کی تاریک خموشی "ابدی رات" کا سوز      "مرگِ بے حشر" محبت کی ہے پیکاں دل دوز
کارواں عشرتِ فردا کا ہوا بھی او جھل      دامنِ گرد کو پکڑے ہوئے کیوں ہے بے کل
تیز رفتار زمانہ، مرے دل، دور گیا!      اپنے بے درد قدم سے تجھے بس چور گیا!

سوَن کی شام مگر دیکھ ہے گلنار ہنوز

اکتوبر۹۴۹ء

عابد علی عابد

# دو ملاقاتیں اور وقت

(۱)

## پہلی ملاقات

"تھا اس کا دیکھنا ہی سراسر خلافِ عقل
کم بخت جا پڑی ہے ہماری نظر کہاں"

بزمِ دل جلوہ گہِ کاہکشاں ہے ہمدم — سوئے در چشمِ تمنا نگراں ہے ہمدم
اُن کے آنے کی خبر وردِ زباں ہے ہمدم

اس سے پہلے مری نظروں میں تھی دنیا تاریک — مہر و مہتاب تھے بے نور ثریا تاریک
آج پھر کون و مکاں، کون و مکاں ہے ہمدم

شوق ہے محو بہ آرائشِ گیسوئے وفا — ذرّے ذرّے سے مجھے آتی ہے خوشبوئے وفا
ذرہ ذرہ نفسِ مشک فشاں ہے ہمدم

پیہم آتی ہے جو کانوں میں صدائے ساقی — ہے ادھر وجد میں محفل بہ صلائے ساقی
اور ادھر شیشۂ مے رقص کناں ہے ہمدم

(۲)

## دوسری ملاقات

"بے خبر از عشق و از آئینِ عشق
صعوۂ رد کردۂ شاہینِ عشق"

میں الگ مہر بلب ہوں وہ جدا ہے خاموش — کیا کروں عرضِ وفا سازِ وفا ہے خاموش
عشق پر نغمۂ بے سوز گراں ہے ہمدم

جس پہ مرتا تھا وہی حسنِ جنوں خیز ہے یہ　　وہی رخسار وہی زلفِ دل آویز ہے یہ
کیا فسوں کاریٔ نیرنگِ زماں ہے ہمدم
جلوۂ راز کی ہلکی سی جھلک باقی ہے　　نکہتِ ناز کی پھیکی سی مہک باقی ہے
وہ طلسمات کی تصویر کہاں ہے ہمدم
گُلِ اُمید جو تھا زینتِ دامانِ خیال　　اُفقِ دل پہ جو روشن تھی کبھی شمعِ جمال
وقت کے کون سے گھرے میں نہاں ہے ہمدم

(۳)

اور وقت

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں"
وقت ہی غازۂ خوں ہے رُخِ مستی کے لئے　　وقت ہی تیغِ رواں ہے رگِ ہستی کے لئے
وقت ہی مرہمِ عمرِ گذراں ہے ہمدم
پھر تصور نے تراشا ہے نیا آج صنم　　ہائے وہ لعلِ فسوں ساز وہ زلفِ برہم
آج پھر قافلۂ عشق رواں ہے ہمدم
کاش پھر دل کے اُفق پر وہ ستارا نکلے　　کاش پھر وقت کے محمل سے وہ لیلا نکلے
دور ہو کر جو قریبِ رگِ جاں ہے ہمدم
حسن، اتنے ہی پہ راضی کہ ہو مطلوبِ نیاز　　عشق کی راہ کٹھن اس کا سفر دور و دراز
عشق کی منزلِ مقصود کہاں ہے ہمدم

محمد ہادی حسین

## آندھی

آندھی۔ جیسے کسی اَن ہونی بات کی ایک اُڑتی سی خبر،
جس سے دنیا زیر و زبر
جھکڑ۔ جیسے روزِ بد کا جشن منائیں لاکھوں بھوت
انجانی بپتا کے دوت
دھرتی۔ مٹی کا اک ساگر جس میں آٹھا ہے طوفان
دل کے بخار کا اک بحران
مٹی۔ نکلا ہے آکاش کے ظلم و ستم سے آخر کار
دھرتی کے سینے کا غبار
پتے۔ گم گشتہ روحیں آوارہ فضا میں ملتی ہاتھ
حسرت اور افسوس کے ساتھ
طائر۔ نازک دل گھبرا کر ڈھونڈتے پھرتے راہِ گریز
اُف یہ زیست کی رستا خیز!
انسان۔ لاکھوں آندھیوں کے طوفان سینے میں دبائے ہوئے
سر آندھی سے چھپائے ہوئے

فروری ۱۹۴۹ء

قیوم نظر

## روشنیاں

اُجلی اُجلی تیز اور تیکھی
زینت رستے کے کھمبوں کی
دن چھپتے ہی کس انداز سے بولی ہیں
روشنیوں کی روشنیاں ہم جولی ہیں

اُونچی نیچی سطح پہ چمکیں
سب کچھ دیکھیں پھر بھی نہ دیکھیں
جان لے کوئی جیسے بالکل بھولی ہیں
روشنیوں کی روشنیاں ہم جولی ہیں

جتنا جس کے پاس اُجالا
اس نے اپنا حُسن اُچھالا
رات نے ڈھل کر اَب تو زُلفیں کھولی ہیں
روشنیوں کی روشنیاں ہمجولی ہیں

وقت نے کیا صورت بدلی ہے
شب کی سیاہی بہ نکلی ہے
صبح سے پہلے شہر نے گلیاں دھولی ہیں
روشنیوں کی روشنیاں ہمجولی ہیں

دسمبر ۱۹۴۷ء

اختر الایمان

رات کی گود میں ہے صبح کی لاش
ہاں بچھاؤ صفِ ماتم کہ زمیں
پُر سکوں ہو گئی کچھ دیر کو پھر
سورما قوم کی نصرت کے امیں
سوئے ہیں خاک پہ لمبی تانے
غسلِ میت کی ضرورت ہی نہیں
ان کو، یہ سب ہیں شہیدانِ وفا
جن کی میراث چلے گی آگے
ہو گی تکمیلِ زوالِ آدم!

مئی ۱۹۴۸ء

مجید امجد

# زندگی، اے زندگی

(۱)

خرقہ پوش و پابہ گِل
میں کھڑا ہوں تیرے در پر، زندگی
ملتجی و مضمحل
خرقہ پوش و پابہ گِل
اے جہانِ خار و خس کی روشنی
زندگی، اے زندگی!
میں ترے در پر جھکتی چلمنوں کی اوٹ سے
سُن رہا ہوں قہقہوں کے دھیمے دھیمے زمزمے
کھنکھناتی پیالیوں کے شور میں ڈوبے ہوئے
گرم گہری گفتگو کے سلسلے
منقلِ آتش بہ جاں کے متصل!
اور ادھر باہر گلی میں خرقہ پوش و پابہ گِل

میں، کہ اک لمحے کا دل
جس کی ہر دھڑکن میں گونجے دو جہاں کی تیرگی
زندگی، اے زندگی!

(۲)

کتنے سائے محوِ رقص
تیرے در کے پردۂ گل فام پر
کتنے سائے، کتنے عکس
کتنے پیکر محوِ رقص
اور اک تو کہنیاں ٹیکے خمِ ایام پر
ہونٹ رکھ کر جام پر
سُن رہی ہے ناچتی صدیوں کا آہنگِ قدم
جاوداں خوشیوں کی بجتی گھنگرو کے زیر و بم
آنچلوں کی جھجھاہٹ، پائلوں کی چھم چھم
اس طرف باہر سرِ کوئے عدم
ایک طوفاں، ایک سیلِ بیکراں
ڈوبنے کو ہیں مرے شام و سحر کی کشتیاں
اے نگارِ دلستاں!
اپنی نٹ کھٹ انکھڑیوں سے میری جانب جھانک بھی
زندگی، اے زندگی!

مجتبیٰ حسین

# یاد

عشرتِ رفتہ! تجھے یاد تو ہوگی وہ رات!؟
جب ترو تازہ ہوا کے جھونکے
نرم باتوں کی طرح
چاندنی راتوں کی طرح
دل میں پیدا کیا کرتے تھے سکوں اور طرب!
ماضیٔ خوابِ طربناک ذرا یاد تو کر ——!!
ساحلِ بحر پہ موجوں کا ستار
ہلکا ہلکا سا چڑھاؤ اور اُتار
رفتہ رفتہ یہی لہریں —— یہی ہلکی لہریں
اُبھریں افکارِ پریشاں بن کر
برق اور باد کا طوفاں بن کر
اور نازک سا ستار
جن کو موجوں نے بجایا تھا ابھی
دھندلے خوابوں نے سنایا تھا ابھی
ٹوٹ کر ڈوب گیا تہ خانے میں گردابوں کے
اور وہ رات بھی —— وہ عشرتِ رفتہ کی رات
پڑ گئی ماند جو اُبھرا سورج ——
تلخ و سنگین حقائق کی کرن کو لے کر
زندگی کاوشِ انجام نہیں

زندگی صبح نہیں، شام نہیں
یادِ ماضی نہیں، امروز کی دنیا بھی نہیں
خواب اور خواب کی تعبیر سے نفرت ہے اُسے
ہاں مگر عشق کے جذبات سے کھیلے گی ضرور
حسن کے عشوۂ بیباک کو پوجے گی ضرور
اور جب لمحۂ آغاز سنورنے کے لئے
لطفِ یکجائی کے پہلو میں مچلنے کے لئے
خلدِ انجام میں کھو جانے کو
تھرتھراتے ہوئے قدموں سے چلے گا آخر
بس وہیں زندگی اک ضربِ گراں کے مانند
توڑ کر پائے طلب راہ سے ہٹ جائے گی
اور پھر نقشِ قدم کا بھی پتہ
مل سکے گا نہ ملا ہے اب تک
عشرتِ رفتہ! تجھے یاد نہ کرتے اے کاش
ماضیٔ خوابِ طربناک نہ ہوتا اے کاش
—— کس لئے یاد کیا کرتی ہے نسلِ آدم
—— کیوں جیا کرتی ہے نسلِ آدم!؟

ابنِ انشا

# "ایسی راتیں بھی کئی گذری ہیں"

ایسی راتیں بھی کئی گذری ہیں جب تری یاد نہیں آتی ہے
درد پہلو میں مچلتا ہے مگر لب پہ فریاد نہیں آتی ہے
(تاثیر مرحوم)

کہاں گیا تھا پہر دوپہر میں پھر آیا
شبِ فراق کا تارا، رکاب میں لایا
اُداس شام —— ابھی کتنی رات باقی ہے؟
یہ آج کون سی تاریخ تھی مہینے کی
مہ تمام سرِ آسماں اُبھر آیا
مہِ تمام —— ابھی کتنی رات باقی ہے؟
سُنو سُنو وہ کسی دُور کے محلّے میں
ادائے خاص سے ہے پہرہ دار چلّایا
کسی کا نام —— ابھی کتنی رات قی ہے؟
وہ چرچ روڈ کے گھنٹے نے دو بجا بھی دئے
وہ پیپل پھیل چلا نیم کا گھنا سایا
بہ صحن و بام —— ابھی کتنی رات باقی ہے؟

حریفِ مرحلۂ ہفت خواں ہے منزلِ عشق
اسی طرح جو دلِ بے قرار بھر آیا
بہر مقام —— ابھی کتنی رات باقی ہے؟
یہ کس کے پاؤں کی حنا تھی، کس نفس کی مہک
یہ کس کے رُخ کا اُجالا ہوا تھا —— کون آیا
خیالِ خام —— ابھی کتنی رات باقی ہے؟
ستارۂ سرِ مشرق، غبارِ رہ سے ملول
دیارِ دُور سے یاں تک تو کس طرح آیا
بایں خرام —— ابھی کتنی رات باقی ہے؟
اُفق پہ غولِ بیاباں ہو یا سپیدۂ صبح
شبِ فراق، تجھے یاں تک تو پہنچایا
بہ اہتمام —— (ابھی کتنی رات باقی ہے؟)

الطاف گوہر

## آخری شعلہ

روزنِ در سے چلی آتی ہے شام
دن کی ٹھکرائی ہوئی
رات کے سایوں سے ڈرتی ہوئی گھبرائی ہوئی
روزنِ در سے چلی آتی ہے افسردہ خرام
لپٹی جاتی ہے ترے پیرہنِ رنگیں سے
کھیلتی ہے ترے پاؤں سے
ترے پاؤں کی محرابوں سے
اور کس پیار سے چھو کر تری باہوں کو
ترے شانوں کو
بڑھتی جاتی ہے، ڈھلی جاتی ہے
دیکھتے دیکھتے بالوں کی حسیں رات میں سو جائے گی
اجنبی گہرے گھنے سایوں میں کھو جائے گی
تیرے رنگوں سے بھری شام گئی
شام کے ساتھ ترے رنگ گئے
اب گذرتے ہوئے لمحوں میں رہے گا
ترے ہونٹوں کا گداز
لمحہ لمحہ جو تری یاد میں گذرے گا
کہے گا مری تنہائی کا راز
میں گذرتے ہوئے لمحوں کا تماشا کرتے
تیرے بالوں کی حسیں رات میں سو جاؤں گا
اجنبی گہرے گھنے سایوں میں کھو جاؤں گا

جون ۵۶ء

قتیل شفائی

## صفر کی قطار

میں ایک نہیں
تم کہتے ہو تو ایک سہی
پر ساتھ مرے اب چھوٹے چھوٹے صفروں کی
لمبی سی ایک قطار بھی ہے
یہ چھوٹے چھوٹے صفروں کی
لمبی سی ایک قطار بنی ہے
ان گرمیلے قطروں سے
جو قطرے میرے سر سے ٹپکتے خون کے ہیں

تم نے تو مرے سر پہ شاید
یہ سوچ کے پتھر مارا ہے
جو ٹپکا خون مرے سر سے
وہ داغِ جبیں بن جائے گا
یا رزقِ زمیں بن جائے گا
پر میرے خون کا ہر قطرہ وہ صفر تھا
جو ایک کو دس میں
دس کو سو میں
سو کو ہزار میں
اور ہزار کو لاکھ میں ڈھال دیا کرتا ہے
تم جانتے ہو
اس لاکھ سے آگے بھی گنتی چل سکتی ہے
تم گنتے رہو، تم گنتے رہو
میں ایک ہوں یا کچھ اور بھی ہوں
یہ مستقبل بتلائے گا

جولائی ۶۸ء

مختار صدیقی

## خلیج

آج ہر بات میں حالات کے صد رنگ حوالوں
کے جواز
اس طرح میرے ہر اک لمحۂ جانکاہ پہ
میری ہی نفی
میرے ہی بطلانِ مسلسل کی سیاہی پھیریں
جیسے، میں پاؤں تلے ایک کھسکتی ہوئی
دلدل ہوں
جو پیرایۂ ہستی کے لئے موت کا گرداب بنے۔

اب بھی فرسودہ اناؤں کے کٹے فاصلے
حالات کو تابوت کی تقدیر دیے جاتے ہیں
تیرے اور میرے تشخص کے یہی ہیں کہرے
جو تمہیں، تم نہیں ہونے دیتے
جو مجھے میں نہیں بننے دیتے!

تیری اور میری سمجھ اپنی جگہ اتنی اٹل ہیں
کہ خداوندیٔ تقدیر بھی اب ہو گئی ان سے
پسپا!

دونوں کا رنگِ خیال اتنا حقیقی ہے
کہ دونوں کے شب و روز گزر جاتے ہیں
حق سازی میں
حال و آئندہ کا ہر ایک تقاضا بھی
ضرورت بھی
فنا کر دیئے جاتے ہیں
اس ساختہ پرداختہ ہیچ بازی میں!

اور یہ بات، کہ دونوں کو بہم جینا ہے
اور دید کی راہوں پہ بہم زندگی کرنا بھی
مقدر ٹھہرا
مشترک چاندنئے دور کا بننا ٹھہرا
پھر، ہمیشہ کی طرح سے آج بھی آنکھوں سے
ہوئی ہے اوجھل!!!



مصطفیٰ زیدی

## اے نزہتِ مہتاب

سچ یہ ہے کہ وہ غم بھی رہا شاملِ امروز
جس غم میں نہ تخلیق، نہ تعمیر، نہ پرواز
جو گنبدِ آفاق کی ہمراز رہی تھی
دیوار سے ٹکرا کے پلٹ آئی وہ آواز
اب سنگِ تنک مایۂ زنداں بھی نہیں ہیں
آئینۂ زلف و لبِ مژگاں تھے جو الفاظ
جس طبع کے دامن میں تھے اٹھتے ہوئے خورشید
وہ ڈوبتے مہتاب کی کرنوں سے بھی ناراض

اے نزہتِ مہتاب
امروز کہ سڑکوں کے چراغاں میں کٹا تھا
امروز کہ تھا رنگ و رخ و نور کا سیلاب
کچھ اور بھی تھا رنگ و رخ و نور سے آگے
جلتا ہوا آہنگ، سلگتی ہوئی مضراب
صدیوں کے تمدن سے دمکتی ہوئی دیوار
قرنوں کی احادیث سے نکھری ہوئی محراب
اک دل جو روایات کی ہر وضع کا مرکز
اک ذہن جو تحریکِ سماوات میں سیماب
کس طرح یقیں آئے کہ اس ذہن نے اک دفعہ
دانستہ روا رکھے تھے تخریب کے آداب؟!
کس طرح یقیں آئے کہ میں اپنی خوشی میں
تحقیر سے دہراؤں گا فرہاد کے القاب
کس طرح یقیں آئے کہ ہو گی تجھے منظور
توصیفِ شبِ ہجر دلوائے دلِ بے تاب
اے نزہتِ مہتاب

احمد راہی

## تم اور میں ۔ اور ایک عورت

کل جس جگہ پہ چھاؤں گھنی تھی
جہاں پہ ہم دونوں نے وعدہ کیا
کیا تھا — دوبارہ ملنے کا
میں اُس جگہ پہ آیا تھا

— مگر وہاں پر دُھوپ کڑی تھی
تم تو نہ تھیں، لیکن
تم سے ملتی جلتی سی،
جھرّیاں جھرّیاں چہرے والی
کوئی عورت
کبھی جو خود بھی، کسی سے ملنے
اُسی جگہ پر آتی ہوگی
قہر آلود نگاہوں سے مجھے گھور رہی تھی

میں لوٹ آیا
تیرے اور میرے جذبوں کے
بیچ میں، ایک فصیل کھڑی تھی
اور اُوپر سے دُھوپ کڑی تھی۔

جون ۸۲ء

عزیز حامد مدنی

## سفینہ

سوادِ شہر کو ساحل کی روشنی کو سلام
کبھی یہ فن کا سفینہ رہا شکستہ دنام
اُٹھا سکا نہ شبِ غم میں بھی کسی عنواں
ستونِ روشنیِ شہرِ یار کے احساں
ہوا نے، ابر نے، موجوں نے اس کو گھیر لیا
کئی غنیموں کی فوجوں نے اس کو گھیر لیا
خدائے بحر نے غصّہ میں جال ڈال دیا
نحیف جان کے ترشول پر اچھال دیا
اِدھر پہاڑ سی موجیں تھیں اور ہوا کا جنوں
اُدھر تھا زور پہ کچھ اس کے ناخدا کا جنوں
دعائے ردِّ بلا، دو، کہ آسرا رکھے
حصارِ خو نگہی، میں اُسے خدا رکھے
جہاز رانی کے خط ہائے راہ داں رہ جائیں
اندھیری شب میں ستارہ و بادباں رہ جائیں

جنوری ۱۹۷۹ء

جمیل ملک

## رات، سیپ، سمندر

مرا دل ہے سیپ، سمندر
میں قطرہ قطرہ برسوں
ترے پیار کو پھر بھی ترسوں
جو تیرے لبوں سے چھوٹے
وہ چشمہ میرے اندر
مرا دل ہے سیپ، سمندر

تو رات کی ڈھلتی چھایا
تو شبنم شبنم روئے
تو اپنا سب کچھ کھوئے
تو جس کے پیچھے بھاگے
وہ سورج تو اک سایا
تو رات کی ڈھلتی چھایا

کب رات ڈھلے، دن آئے
کب سیپ سے موتی نکلے
سورج سے جیوتی نکلے
کب میل ہو تیرا میرا
کب دِل دل سے مل جائے
کب رات ڈھلے دن آئے

منیر نیازی

# گھر بنانا چاہتا ہوں

گھر بنانا چاہتا ہوں میرا گھر کوئی نہیں
دامنِ کہسار میں یا ساحلِ دریا کے پاس
اُونچی اُونچی چوٹیوں پر، سرحدِ صحرا کے پاس
منتشر آبادیوں میں، وسعتِ تنہا کے پاس
روزِ روشن کے کنارے یا شبِ یلدا کے پاس
اس پریشانی میں میرا راہ بر کوئی نہیں
خواہشیں ہی خواہشیں ہیں اور ہنر کوئی نہیں
گھر بنانا چاہتا ہوں میرا گھر کوئی نہیں

اگست ۶۸ء

زہرہ نگاہ

# نظم

اَب تو کچھ ایسا لگتا ہے
سارا جگ مجھ سے چھوٹا ہے
آنکھیں بھی مری بوجھل بوجھل
شانوں پر بھی کچھ رکھا ہے
کاتبِ وقت نے جاتے جاتے
چہرے پر کچھ لکھ سا دیا ہے
آئینے میں چہرہ کھولے
دیکھ رہی ہوں کیا لکھا ہے
لکھا ہے ترے روپ کا ہالہ
اور کسی کے گرد سجا ہے
لکھا ہے زُلفوں کا دوشالہ
اور کسی نے اوڑھ لیا ہے
پڑھ کر مصحفِ رُخ کی عبارت
دل کو اطمینان ہوا ہے
روح تلک سرشار ہے میری
آئینہ حیران ہوا ہے —!
اُس کو شاید علم نہیں ہے
میرا دامن اَب بھی بھرا ہے
جو رکھنا تھا رکھے ہوئے ہوں
جو دینا تھا بانٹ دیا ہے

اپریل ۸۴ء

جیلانی کامران

# نظم

تم اگر چنتے زمرد چنتے
ساری دنیا میں اگر چنتے تو یوروپ چنتے
اوج پر پہنچے ہوئے ملک کا پرچم چنتے
تم نے کیوں پاؤں میں روندے ہوئے کنکر کو چنا
تم نے کیوں مجھ کو چنا

چاہے کہسار اگر مجھ سے میں بادل روکوں
میں کہاں ابر کہاں
چاہے گر بحر میں خشکی کے کناروں تاپوں
میں کہاں بحر کہاں
تم نے کیوں ذرّے کو کہسار سے نسبت دے کر
قطرے کو بحر سمجھ کر
تم نے کیوں مجھ کو چنا

اوّل اس روز مجھے تم نے سکھا کر ابجد
کیوں کہا۔ زنگ زدہ قفل کے ہندسے کھولوں
تب مری سالگرہ کا دن تھا
آج میں (آہ مرا آج —)
اوّل اور آج کے مابین میں بھٹکا ڈوبا
تم نے کیوں خاک میں ڈوبے ہوئے کنکر کو چنا
تم نے کیوں مجھ کو چنا۔

اگست ۱۹۷۱ء

چالیس سالہ مخزن

عارف عبدالمتین

# سفر کی عطا

سفر کٹ چکا ہے
میں لمبی مسافت کے جانکاہ صدموں سے دامن چھڑا کر
ابھی گھر کے آنگن میں داخل ہوا ہوں،
جہاں راحتیں میرے بچوں کے اُجلے تبسّم کی صورت میں کب سے
مری منتظر ہیں!

مجھے دیکھتے ہی مری سمت لپکے ہیں اور مجھ کو گھیرے میں لے کر،
مرے پیارے بچے مجھے پوچھتے ہیں:
"کدھر چل دیئے تھے؟ کہاں رک گئے تھے؟
ہمارے لئے آپ کیا لے کے آئے ہیں اس دیس سے
جس کا نام آپ نے ہم کو اب تک بتایا نہیں ہے؟"
انہیں کیا بتاؤں
انہیں کیا بتاؤں کہ میں کونسے دشتِ بے سمت میں کھو گیا تھا،
میں کس خارزارِ کشاکش میں اُلجھا ہوا تھا،
میں جس دیس سے لوٹ کر آرہا ہوں، وہ بے نام ہے
لوگ اس سے پلٹتے ہوئے کم ہی دیکھے گئے ہیں!
میں ان سے کہوں کیا کہ اپنے دل و جاں کے پاتال میں،
ان کی چاہت کو مخزن کی صورت چھپائے ہوئے آگیا ہوں
غنیمت یہی ہے،

وہ ان تلخ اور ترش سچائیوں کا غم انگیز مفہوم سمجھیں گے کیونکر!

اُدھر ان کی ماں ایک سکتے کے عالم میں بے حس کھڑی ہے،
وہ رخسار کے پھول جن پر بہاریں بھی شیدا تھیں، بادِ حوادث کی سختی
سے مرجھا چکے ہیں،
وہ آنکھوں کی جھیلیں کہ جن میں بلا کی پُر اسرار گہرائیاں تھیں،
دہکتے دنوں کے غضب ناک سورج کی پیہم تپش سہتے سہتے،
نمی کیا نمی کے تصوّر سے بھی ماورا ہو چکی ہیں،
وہ پتھر بنی میرے پیراہنِ تار کو دیکھتی ہے،
مرے زرد چہرے پہ پھیلی ہوئی دھول کو تک رہی ہے،
مرے زخم سر سے مری اَن کہی داستانِ سفر سن رہی ہے،
اور اس کی المناکیوں کی حقیقت کو پہچانتی ہے،
حقیقت جسے میرے بچے سمجھنے کے قابل نہیں ہیں،
— یہ ناآگہی
— یہی میرے بلے سفر کی عطا ہے!؟

(جون ۱۹۷۱ء)

ظہور نظر

# بحران

ڈرو اُس وقت سے ـــــ!

جب تم بھی اپنی عمر کے افراطِ زر کی زد میں آؤ گی!

یہ لمحے جو مری قربت میں گذرے ہیں

انہیں اُس وقت سینے سے لگا کر رو دوگی

جب وقت تم کو بھی

مری مانند ـــــ!

پس اندازِ سکوں کے نہ چلنے کی خبر دے گا

کہ اُن پر نقش،

حرف و لفظ، خط و خال گھس کر مٹ چکے ہوں گے!!

نئے سکے کی قیمت ـــــ!

عمر کا افراطِ زر اتنی گرا دے گا

کہ بازارِ دل و جاں میں

پڑا رہ جائے گا، اَٹ جائے گا پیری کی کائی سے

تمہارے حسن کا سونا، تمہارے جسم کا کُندن!!

تمہارے ابر جیسے ـــــ!

کالے، کومل، ریشمی گیسو

جو اُن ایام میں چاندی کے تاروں کی طرح ہوں گے

پُرانے سوت کے بھاؤ بھی بیچوگی

تو یوں منہ موڑ لیں گے لوگ

جیسے تم نے موڑا ہے!!

یہ اپنے حُسن کا سونا

یہ اپنے جسم کا کُندن

جسے چاہو اُسے بخشو!

یہ اپنے ابر جیسے کالے، کومل گیسوؤں کی ریشمی چھاؤں

جہاں چاہو لٹاؤ، جس کو جی چاہے نوازو اس کی ٹھنڈک سے

مجھے تو صرف اپنے قرب کے صحرا میں رہنے دو

کہ اپنے کرب کی وسعت کا

اپنی پیاس کی شدت کا،

اپنی عمر کی غربت کا اندازہ لگانا چاہتا ہوں میں

تمہارے قرب کے صحرا کی ہجر آگیں وساطت سے!!

بتاؤ ـــ!!

پیشتر اس سے

کہ تم بھی عمر کے افراطِ زر کی زد میں آجاؤ

مری چاہت، مری چاندی

پُرانے سوت کے بھاؤ خریدوگی؟؟

(مئی، ۶۰ء)

ڈاکٹر وزیر آغا

## وہ کیا ہے

وہ کیا ہے
جس کی خاطر میں پہاڑوں، ریگزاروں
بند گلیوں
تنگ، کبڑی گھاٹیوں میں گھومتا ہوں
لہو بن کر بدن میں دوڑتا ہوں
کبھی سرکش ہوا کی موج بن کر
کبھی لاوے کی صورت رینگتا ہوں
وہ کیا ہے جس کی صورت سے بھی میں واقف
نہیں ہوں
جسے میں نے کبھی دیکھا نہیں
مگر جو ہر جگہ ہے
ہر بنِ مُو سے اُگی ہے
کرن کی قوس میں
چُپ کی چبھن میں
سانپ کی پتلی میں
اور سورج مکھی کی آنکھ میں موجود ہے
جو رات کے پچھلے پہر شبنم میں ڈھلتی ہے
سحر دم اک عجب جھنکار بنتی ہے
کبھی جب شام کی ڈولی
سیہ بادل کے شانوں سے اُترتی ہے
تو میری تشنہ لب آنکھوں کو
اِک ٹھنڈا ستارہ بن کے ڈستی ہے
تمہاری راہ تکتی ہے!

اگست ۸۶ء

احمد ظفر

## سمندر

میرے آس پاس کوئی نہیں
ہر طرف خلا نے اپنے ہونٹ کھول رکھے ہیں
میرے چہرے پر کسی نے اپنے ہاتھ رکھ دیئے ہیں
تم کون ہو؟
"میں پوچھتا ہوں"
ہوا کا ایک جھونکا

خامشی اور گہری ہو جاتی ہے
جان لیوا سناٹے میں لمبی لمبی سرگوشیاں
میرے اندر خوف کے دروازے کھولتی چلی جاتی ہیں
کسی نے میرے ہونٹوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے ہیں
سرگوشیاں خلا کے دائروں میں دفن ہوتی چلی
جاتی ہیں

وقت کے آہنی قدم
روحوں کو ریزہ ریزہ کر رہے ہیں
خاموشیاں اپنے کاندھوں پر
سیاہ صندلیں تابوت اُٹھائے
کسی اَن دیکھے راہب کے پیچھے پیچھے چل رہی ہیں
کسی نے میری آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے ہیں
اپنی شناخت کے احساس نے مجھے اندھا کر دیا ہے!

مارچ ۸۶ء

عرش صدیقی

## اُسے کہنا

اُسے کہنا دسمبر آ گیا ہے
دسمبر کے گذرتے ہی برس اک اور ماضی
کی گپھا میں ڈوب جائے گا
اُسے کہنا دسمبر لوٹ آئے گا
مگر جو خون سو جائے گا جسموں میں نہ جاگے گا
اُسے کہنا ہوائیں سرد ہیں اور زندگی کے کہرے
دیواروں میں لرزاں ہے
اُسے کہنا شگوفے ٹہنیوں میں سو رہے ہیں
اور اُن پر برف کی چادر بچھی ہے
اُسے کہنا اگر سورج نہ نکلے گا
تو کیسے برف پگھلے گی!
اُسے کہنا کہ لوٹ آئے!!

مئی ۱۹۸۴ء

سرور بارہ بنکوی

# "یوم اناالحق"

آج مئی کا پہلا دن ہے، آج کا دن مزدور کا دن ہے
اہلِ ستم کے مدِ مقابل حوصلۂ جمہور کا دن ہے

صدیوں کے مظلوم انسان نے آج کے دن خود کو پہچانا
آج کا دن ہے یوم اناالحق، آج کا دن منصور کا دن ہے

آج کے دن ہی مجبوروں نے دستِ ستم کو توڑ دیا تھا
ایک نئے عنوان کی روایت، ایک نئے دستور کا دن ہے

آج کا دن ہے فکر و نظر کا، علم و ہنر کی فتح و ظفر کا
آج شکستِ ظلمتِ شب ہے، آج فروغِ نور کا دن ہے

اب سے کوئی مغموم نہ ہوگا، حق سے کوئی محروم نہ ہوگا
ایک نئے اعلان کی ساعت، ایک نئے منشور کا دن ہے



ابن الحسن

# سوچ

ایک ہی رات میں سب کی مائیں جدا
ایک ہی وقت میں سب کی باتیں جدا
ایک ہی فکر میں سب کی گھاتیں جدا
دن بدلتے رہیں گے سدا
اِن کی سُنتے رہیں، اُن کی سُنتے رہیں
سر کو دھنتے رہیں، جال بنتے رہیں
عمر کی راہ میں، خار چنتے رہیں
کب سے جاری ہے یہ سلسلہ
پاؤں تھک بھی گئے، جان ہلکان ہے
ناتواں دوش پر کتنا سامان ہے
عقل رہینِ کمال، آنکھ حیران ہے
میں کھڑا سوچتا رہ گیا
کب سے جاری ہے یہ سلسلہ
دن بدلتے رہیں گے سدا

حمایت علی شاعر

# شاید کہ بہار آئی

آج بھی گرچہ غمِ دہر کا عالم ہے وہی
دلِ سوزاں ہے وہی، دیدۂ پُرنم ہے وہی
روح میں گھُلتے ہوئے زہر کا عالم ہے وہی

میں کہاں اور مرے دل کی تگ و تاز کہاں
رہ گئی چیختی ماحول کی زنجیرِ گراں
لے کے آئی مجھے تخیّل کی پرواز کہاں

فکر چُپ چُپ ہے، پریشان نہیں ہے لیکن
ذہن پر بار نہیں آج کا ڈھلتا ہوا دن
شام خاموش ہے، ویران نہیں ہے لیکن

ایسا عالم ہے کہ نظروں میں سماتا ہی نہیں
اور حسرتِ نگہ شوق سے جاتا بھی نہیں
اتنی روشن ہے نظر، کچھ نظر آتا نہیں

وقت نے کس لئے بے وجہ عنایت کی ہے
میرے ہونٹوں کو تبسّم کی اجازت دی ہے
ایک ناگفتہ تمنّا کی حمایت کی ہے

میرا احساسِ دروں ہے کہ فضا ہے مخمور
ذرّہ ذرہ متبسّم ہے، ہر اک شے مسرور
نشہ و کیف سے ہو جیسے یہ دنیا معمور

دل کا اصرار، بہت دُور نکل جاؤں کہیں
کوئی وادیٔ سمن پوش ہو اور میری جبیں
کسی گل میں نہ سہی، خار میں ڈھل جاؤں کہیں

جانے کس قاف کی وادی میں نکل آیا ہوں
پاؤں دھرتی پہ ہیں اور آپ اڑا جاتا ہوں
ہر نظر مجھ پہ ہے، کس کس کا میں سرمایہ ہوں

لاکھ پہرے ہوں مگر دل پہ کوئی قید نہیں
اس چمن میں کوئی صیّاد نہیں، صید نہیں
زندگی کی اسی منزل پہ کوئی قید نہیں

سبزہ تکتا ہے اُٹھائے ہوئے بھیگی پلکیں
ندیاں ہیں کہ بچھائے ہوئے رہ میں آنکھیں
اور گھٹائیں کہ مئے ناب کے ساغر چھلکیں

شبنم اُٹھ کر مرے پیروں سے چمٹ جاتی ہے
ایک اک چیز قدم بوسی کو بڑھ آتی ہے
باہیں پھیلا کے ہوا مجھ سے لپٹ جاتی ہے

کس طرف جاؤں؟ ہر اک سمت بلاتی ہے مجھے
ہر طرف زیست نیا رنگ دکھاتی ہے مجھے
اور مری فکر، کہ اک شمع جلے، ایک بجھے

میں ہی کچھ کھویا ہوا ہوں کہ فضا گُم سم ہے
جانے کس خوابِ حسیں میں مری دنیا گم ہے
دل کی دھڑکن ہے، دھڑکنے کی صدا گم سم ہے

کس کی آمد ہے جو یوں موجِ ہوا رقص میں ہے
لہریے بنتے ہیں زنجیر کے حلقے جیسے
اور مرا دل ہے کہ زنجیر بپا رقص میں ہے

خوشیاں مناؤ، رقص کرو، قہقہے لٹاؤ
لوگو، خموش کیوں ہو، مرے ساتھ تم بھی گاؤ

گاؤ کہ آج وجد میں ہے رُوحِ کائنات
گاؤ کہ آج رقص میں ہے لیلیٰ حیات
گاؤ کہ آج ختم ہے دوریٔ شش جہات
گاؤ کہ آج موت بھی ہے مژدۂ ثبات

گاؤ کہ رخصت اب غمِ لیل و نہار ہے
گاؤ کہ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

گاؤ کہ آج ٹوٹ گیا ہے سکوت نے
گاؤ کہ آج نغمہ بہ لب ہے ہر ایک شے
گاؤ کہ ظرفِ جام سے باہر ہے موجِ مے
گاؤ کہ ہو گئے ہیں کڑے کوس آج طے

پھر اذنِ نالۂ سحر و شام مل گیا
برسوں کے صبر و ضبط کا انعام مل گیا

کیا کیا نہ خسروؤں کے شکستہ ہوئے ایاغ
کس کس طرح سجایا گیا ہے منزل کا باغ
کن آنسوؤں سے دھوئے گئے ہیں جگر کے داغ
کتنے دیئے بجھا کے جلایا ہے یہ چراغ

اب غم نہیں جو راہ میں کانٹے ہوا کئے
چلتے رہیں گے تو انہیں رہنما کئے

کیا فکر اب جو پاؤں میں زنجیر پڑ گئی
نیزوں کی نوکِ تیز کلیجے میں گڑ گئی
بستی بسے بسائے دلوں کی اُجڑ گئی
زنداں میں فرطِ غم سے کوئی سانس اکھڑ گئی

اب موت میں بھی زیست کا پیغام ہے نہاں
زنداں کی وسعتوں کا نشیمن کو کیا گماں

فروری ۱۹۵۶ء

عباس اطہر

## اتنی محبتیں اتنی نفرتیں

اِک اِک کر کے، آگے پیچھے
سارے ساحل پر اُترے تھے
کوئی سمندر کی لہروں سے
کوئی ہوا سے،
اور کوئی خوشبو سے اُٹھا تھا
خوشبو سے کیا کیا، اُبھرا تھا
ململ کے کُرتے اور لٹھے کی شلواریں
مسکراہٹیں اور آنسو
پھر جو کچھ بھی اس کا تھا
اُس نے بانٹ دیا
اِک اِک کر کے
سب ننگوں کو ڈھانپ دیا
میں نے اس کے ہاتھوں سے کپڑے پہنے
جو کچھ، جس کا حصہ تھا اور جو کچھ، جس نے مانگا تھا
سب کچھ اس کے ہاتھوں میں تھا
خالی خالی ہاتھوں میں
تم نے تو حصے سے بھی بڑھ کر مانگا تھا
تم کو تو مانگے سے بھی بڑھ کر کے ملا تھا
اتنی محبتیں، اتنی نفرتیں
بڑے نصیبوں والوں کو ملتی ہیں

(نومبر ۷۷ء)

اعجاز احمد

## ستاروں کا مزاج

مجھے یہ گستاخ ہوا سخت ناپسند ہے

تم کچھ کہو تو لفظ اُڑا لے جائے گی
اپنی انگلیوں کی غلیظ کنگھی
ہر دم تمہارے بالوں میں پھیرتی ہے
بلا اجازت
غیروں کے سامنے تمہیں چومتی ہے
اور میں کہوں کہ تمہارے آنگن سے ہو کے
جب گزرے
تمیز سے گزرے
تو بچوں کی طرح مچلتی ہے
اور جوتے تک نہیں اُتارتی

مجھے ستاروں کا مزاج پسند ہے
تمہیں دیکھتے ضرور ہیں
مگر ادب اور احترام کے ساتھ

دُور دُور سے

(اپریل ۱۹۷۹ء)

فاروق حسن

## اے میرے جسم کے مکیں

اے میرے جسم کے مکیں
مجھ کو سجھا وہ راستہ
جس سے جہان میں مرا
دل کا سفر طویل ہوا

سلسلہ ہائے روز و شب
میرے لئے وہ خوف ہے
جس کی نہ ابتدا کوئی
جس کی نہ انتہا کوئی

وقت کے بعد وقت کا
کوئی خیال دے مجھے
میرے لئے سنوار نقش
ایسا کوئی کہ اب مرے
جسم کی راہ کٹ سکے

جسم کے اس حصار سے
جاؤں نکل کے میں کہاں
دے میری قید کو ثبات
اے میرے جسم کے مکیں
مجھ سے وفا کا عہد کر

اپریل ۱۹۷۹ء

براج کومل

## آوازوں کا جنگل

جب وہ اپنے گھر سے نکلی
اس کے پیچھے چلنے والی
سب آوازیں
دشمن تھیں
اس کے آگے چلنے والی
سب آوازیں چیخیں تھیں
آوازوں کے وسط میں
چلتے آسمان کے سائے تلے
شعلوں کے طوفان بنے
اک ننھے منے کو جنم دیا
اس کی ماں
اس کا باپ
اس کے گھر کے سارے لوگ
سب جلتی آوازیں تھیں
غیر کے پھول کو شبنم کے قطرے کی طرح
اپنے ویراں سینے میں
اس لڑکی نے جذب کیا
اور منتظر منتظر
جلتی آگ میں کود گئی
دریا کے اس پار گئی

اطہر نفیس

## خوف

میری طرح سے
اپنے اندر چھپ کر بیٹھو
ذات کی تنہائی میں گوشہ گیر رہو
تم کو تم سے
چرانے والا
دور کہیں لے جانے والا
حرص و ہوا کا بزدل جھونکا
تاک میں ہے
میری، تمہاری خاک میں ہے!!

جولائی ۶۷۹

---

کون سے سونے اُجڑے گھر میں
اب وہ لڑکی رہتی ہے؟
کون بتائے؟
دور دور تک
آوازوں کا جنگل ہے۔

دسمبر ۶۸۶

انجم اعظمی

## سچائی

ہر جھوٹ کی مدت تھوڑی ہے
جو ظلم کے اندھے غاروں کی
تاریک فضاؤں میں پل کر
بد مست جوانی پاتا ہے
تاریکی کے بھوتوں کی طرح
جو سچ کے چمکتے سورج کی
اک ایک کرن کا دشمن ہے
تاریکی اس کا جوبن ہے

سچ بولنا کچھ آسان نہیں
لیکن یہ وہی مشکل ہے جسے
آسان بنا لے گر کوئی
پی جائے زہر کا پیالہ بھی
اور زہر کا پیالہ پی کر بھی
سقراط ابھی تک زندہ ہے
ہر مشکل کو آسان کر کے
سچ کا سورج تابندہ ہے

(دسمبر ۶۱۹۶۳)

زاہد ڈار

## نظم

گھاس کی کوئی آواز نہیں ہوتی
انسان پر ظلم کون کرتا ہے؟
کیا انسان محبت کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے
کیا میری محبت کچھ بھی نہیں
کیا تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟
کیا تمہیں انسانوں سے خوف آتا ہے؟
کہیں ایسا تو نہیں کہ تم اپنی خواہشوں سے خوفزدہ ہو؟
رات کے وقت سائے آج بھی دکھائی دیتے ہیں
تمہاری آنکھیں کہاں ہیں؟
کبھی زمین پر چل کر دیکھو
کبھی اندر جھانک کر دیکھو
کبھی لوگوں سے دور جا کر دیکھو
کبھی بے کار اور بے مصرف ہو کر دیکھو
اور سوچو
دکھ اور اذیت اور بے بسی کہاں سے آتے ہیں؟
انسان پر ظلم کون کرتا ہے؟
پانی کا بہاؤ تیز ہے
لیکن پانی سوچ نہیں سکتا
ہوائیں اندھی ہیں
سورج بے نیاز ہے
ہمارا اس کائنات میں کوئی دوست نہیں
کوئی دشمن نہیں
ہمارے سوا

جولائی ۱۹۷۹ء

محمد سلیم الرحمٰن

## نظم

رات دن چاروں طرف یہ پانی بہنے کی آواز
دریاؤں اور نہروں کی بکٹ کہانی
فہم سے بالاتر مگر اداس کرتی ہوتی
اور پانی بہتا ہوا دل سے آنکھوں میں
خواب کے پلوں کے نیچے سے اوپر سے
اور صبح کے دروازوں میں اور آخر
کھڑکی کے باہر آنکھوں کے سامنے سے
دھوپ میں چمکتا ہوا کسی دعا کی طرح
جو ہمیشہ صبح کو یاد آئے

ایک ذخار فراق
جس کے اس طرف سمندر ہی سمندر
اور اِدھر بالکل آخر میں
دل و جان کے تار و پود جیسی
بال سے باریک شریانوں میں
ڈوبی ہوئی چاند سورج گھڑیاں
یا پھر رات کے پردیس پار
چو رنگ بیابانوں میں
کھبے ہوئے تیر اور ٹوٹی ہتھکڑیاں

اوس پی کر جینے والے بھی
کبھی سمندروں میں نہاتے ہیں۔

اپریل ۱۹۷۹ء

جاوید شاہین

## مجھے تھوڑا وقت چاہیے

مجھے بس فراغت چاہیے
کھڑکی میں سے آنے والی دھوپ جتنی
اور سکون
دیوار پر بیٹھے پرندے کے سائے جتنا۔
صرف ایک نظم لکھنے کے لئے
اُن دنوں کی یاد میں
جو مروا دیئے جاتے ہیں
کسی اچھے موسم کی خبر دینے کے الزام میں
اور دفن کر دیئے جاتے ہیں
بے حد خاموشی کے ساتھ۔
کیلنڈر میں کہیں جگہ پانے سے پہلے
مجھے تھوڑا وقت چاہیے۔
گمنام شہروں کی یادگار تعمیر کرنے کے لئے
ایک نظم لکھنے کے لئے۔

جنوری ۱۹۸۰ء

صہبا اختر

# خواہشیں

میں اپنا اظہار چاہتا ہوں
غروبِ شامِ اجل سے پہلے
طلوعِ افکار چاہتا ہوں

عجیب روش ہے غم و طرب کی
میں اس کہانی میں روز و شب کی
خود اپنا کردار چاہتا ہوں

خموشیوں سے رچے جنوں میں
سکوت کے بیکراں فسوں میں
کمالِ گفتار چاہتا ہوں

جو میرے لہجے کو تازگی دیں
جو میرے شعروں کو روشنی دیں
وہ لب، وہ رخسار چاہتا ہوں

میں ڈوب کر شعر لکھنے والا
سنے کوئی مجھ سے ملنے والا
میں ٹوٹ کر پیار چاہتا ہوں

جو مجھ کو اسلوبِ فن سکھا دے
جو میرے دیوان جگمگا دے
وہ تابِ فنکار چاہتا ہوں

حیات بھی ہے ثبات بھی ہے
جو ذات بھی کائنات بھی ہے
وہ فن کا پندار چاہتا ہوں

میں اپنے ہونے کی جستجو میں
میں زندہ رہنے کی آرزو میں
اجل سے پیکار چاہتا ہوں

حجابِ ادراک سے کٹے ہوں
میں کون ہوں اور کس لئے ہوں
کشودِ اسرار چاہتا ہوں

جو اہلِ فن کی شگفتگی ہیں
جو میرؔ و غالبؔ کی زندگی ہیں
کچھ ایسے اشعار چاہتا ہوں

خدائے برتر، میں تیرا بندہ
تجھی سے میرے ہنر کا رشتہ
تجھی سے اقرار چاہتا ہوں

ریاض مجید

# دھند خواہش کا سفر

کیا جانوں میں تو کہاں سے آیا
کیا ربط تھا کوئی تیرا میرا

کیوں تو نے نقب لگائی جاں میں
کیوں تو مری خواہشوں میں اُترا

عمر اچھی بھلی گزر رہی تھی
جیسا بھی تھا وقت کٹ رہا تھا

کیوں رونقیں چھینی تو نے میری
کیوں کر دیا مجھ کو تو نے تنہا

کیوں سوکھی لبوں پہ مسکراہٹ
کیا جان کو لگ گیا ہے دھڑکا

میں جو بھی کوئی کتاب کھولوں
ہر لفظ لگے ہے تیرا چہرہ!

تو خون میں میرے دوڑتا ہے
رگ رگ میں مرے ترا سراپا

اس دھند کے چھٹنے کی کوئی شکل
اس غار سے واپسی کا رستہ

ریاض انور

# آوازوں کا بھنور

(مشرقی پاکستان کے بارے میں طویل نظم کا ایک حصہ)

یہ کاکس بازار، شہرِ خوباں
سُبک ہواؤں کا دیس، خاموشیوں کا مسکن
نشیلے خوابوں کی سرزمیں
گنگناتی صبحوں، مہکتی شاموں کی ارضِ شاداں
یہ ریگِ ساحل کہ جس کی تابندگی کے آگے
خجل ہے تنویرِ کہکشاں، شمعِ زرفشاں
پھول سے بھی نازک گداز جسموں کا عطر جس میں رچا ہوا ہے
حسین چہروں کے عکس سے جگمگا رہی ہے
من بروں، دل زدوں کی منزل
سلگتے ہونٹوں، تڑپتی روحوں، جھکی نگاہوں کی رازداں ہے
ہر ایک ذرّے کی آنکھ میں مثلِ اشک اک داستاں نہاں ہے
یہاں شبِ مہ کی محفل آرائی دیدنی ہے
فلک پہ اک ماہتاب لرزاں
زمیں پہ ہر لہر مثلِ ماہِ تمام رقصاں
چہار سو چاندنی کے قدموں کی دُھول
بیلے کا پھول بن کر مہک رہی ہے
عمیق ساگر کچھ اس طرح مضطرب ہے جیسے
کسی کنواری کا جسمِ نورس
جوان ہاتھوں کے مس سے کپکپا رہا ہو،
دمِ سحر کس قدر سکوں ہے
تمام شب آرزدۂ قلبِ حزیں کی صورت

تڑپ تڑپ کر، مچل مچل کر
نہ جانے لہروں کے قافلے کس کے پائے سیمیں میں سو گئے ہیں

کہ جیسے کوئی سجل کلاکار
رقص کے ایک دلنشیں زاویے پہ آکر
بہ چشمِ حیراں، بہ قلبِ مضطر
کسی حسیں یاد کے مچلنے پہ رک گئی ہو
خدا کرے اس کے لاؤنج میں قہقہوں کے جھرنے کبھی نہ سوکھیں
خدا کرے اس کے بام و در نورِ چشم و لب سے رہیں فروزاں
خدا کرے اس کے روز و شب کا ہر ایک لمحہ ہو گل بداماں
یہ جلوہ گاہِ پری جمالاں
یہ عافیت گاہِ دلفگاراں
رہے گی تاحشر نیلگوں بحر کے کنارے سدا درخشاں

یہ کوہساروں کے سلسلے
اونگھتے ہوئے دلفریب جنگل
ازل سے ہے جن پہ نیلا آکاش سایہ افگن
ہوا کی لہروں پہ ڈولتے لڑکھڑاتے بادل
روش، روش عطر بیز گلشن
ہری بھری وادیوں میں بکھرے ہوئے پگوڈے
یہ امن اور آشتی کے شیدائیوں کے مسکن

گھنے درختوں کی چھاؤں میں اونگھتے ہوئے مُنھ
یہ زرد چادر میں لپٹے بھکشو
جوگیان کی جستجو میں صدیوں سے سرگراں
مہاگرو کے لبوں پہ پھیلی ہوئی
پُراسرار مسکراہٹ کے نور کی اک جھلک کی خاطر
سکوت برلب، نظر جھکائے
چراغِ عجز و وفا جلائے
نہ جانے کب سے یوں ہاتھ باندھے
جھکے ہوئے ہیں جھکے رہیں گے

یہاں سے کچھ دور ہے چیا گانگ کی بہار آفریں وادی
یہ شہر کرناٹلی کے پہلو میں پھول بن کر سجا ہوا ہے
یہ بانس کے جنگلوں کی خوشبوئے دلنشیں سے مہک رہا ہے
یہ شہر جس کے لئے ہیون سانگ نے کہا تھا
یہ ایک خوابیدہ نازنیں ہے
جو دھند اور آبِ نیلگوں کی
ردائے باریک میں چھپی مسکرا رہی ہے،
یہ شہرِ تابندہ جس کے امن و سکوں کی خاطر
نہ جانے کتنے شہوں نے اس کے جیالے بیٹوں کا خوں بہایا
ہو کے دریا میں ڈوب کر بھی رہا ہے زندہ
یہیں پہ اک امن کے پجاری نے
ایک خوں ریز جنگ کے بعد
نوکِ خنجر سے ایک مینار پر کرائے تھے کندہ یہ دلفریب الفاظ
"سیت سی گانگ[۱]"

"سیت سی گانگ"
"آبِ زریں سے جن کو تاریخ میں ہمیشہ لکھا گیا ہے"
مگر یہ پھولوں کا شہر پھر بھی رہا ہے برسوں
ستم گروں کی جفا کا مرکز
جو امن کے نام پر سدا آگ میں اسے جھونکتے رہے ہیں
یہی ہے وہ سرزمینِ گلپوش جس کی راہوں میں اہلِ دل نے
کئے تھے حسنِ ازل کی چاہت میں اپنے نغموں کے دیپ روشن
اُداس روحوں کے شہر میں جگمگا اٹھے حسرتوں کے آنگن
یہیں پہ بہرام سقا مشکیزہ تھامے
مستی میں جھومتا، گاتا، ناچتا
آبِ چاٹگاؤں کی تازگی میں
سمن برانِ دیارِ پارس کی نغمگی کی مٹھاس گھولے
بڑی محبت سے ہر مسافر کو کاسۂ آب پیش کرتا
گلی گلی، کنج کنج اس کی صدائے مستانہ رقص کرتی

بے خود و مستم از محبت وبے
محتسب چیست ایں ہمہ بے بے
می دہد یار بادہ زاں مے ناب
بار سیدانِ خویش پے بہ پے
خوش بود پائے ہوئے مستاں ہم
نیم شب ہا بہ یا رب و بہ مے
زاہد و حافظانِ خوش آواز
بار دردے کشاں و نالہ و نے
نزد سقا سفال فقر خوش است
کے کشد جام او بہ منت کے

---

[۱] "جنگ مت کرو"

سرشار صدیقی

## تنسیخ

حسن ناصر

## تشنۂ تکمیل

وہ شاعرِ کیف و رنگ لمحاتِ جذب میں
اپنے دل کی بے اَنت روشنی کو
خیال کا روپ دے کے لفظوں کے چاند میں ڈھالتا رہا ہے
نہ جانے کیوں پھر بیاض کے ہر ورق کو دھونڈتا رہا ہے
وہ شاعرِ دلنواز مشکیزہ تھامے نغموں کی روشنی سے
جہانِ تاریک میں اُجالوں کا رنگ بھرتا رہا ہے برسوں
یہ شہرِ گل اب حیاتِ نو کی ہماہمی سے دھڑک رہا ہے
یہ برق کے قمقموں کی بے کیف روشنی سے بھڑک رہا ہے
ندی میں بہتے ہوئے سمیرِ دھوئیں کے بادل اُگل رہے ہیں
جو نیلگوں آسماں کے دامن پہ داغ بن کر مچل رہے ہیں
ندی کے ساحل پہ گڑگڑاتے ہوئے کرینوں کا شورِ محشر
یہ کھڑکھڑاتی ہوئی ٹرینیں، یہ انجنوں کی مہیب چیخیں
ہوس کے تاروں پہ اہلِ ثروت کے رقص کا حزن خیز منظر
یہ ریستوراں، یہ کشادہ بازار جگمگاتے ہوئے یہ تھیٹر
یہ شاہراہوں پہ بھاگتی دوڑتی ہوئی دلنواز کاریں
یہ ٹوئسٹ کی دھن بجاتے باجے مہکتی مسکاتی شوخ نارین

یہیں پہ بہرام سقا مشکیزہ تھامے اب بھی کھڑا ہوا ہے
مگر کسی اجنبی مسافر کو اتنی فرصت کہاں کہ رُک کر
غریب سقے کے دستِ لرزاں سے آبِ شیریں کا جام لے لے



جو لمحہ گزرنے
وہ نکہتوں کی طرح سے
پھر پھول کا کوئی پیرہن نہ پائے
جو گھر کو چھوڑے
وہ پھر خدا کی زمیں پہ
میری طرح سے کوئی وطن نہ پائے

یہ وقت کا ایسا فیصلہ ہے
جو گلستاں میں
سند ہوا ہے

مگر یہی فیصلہ
تو کل ایک پھول کے ہاتھ
رَد ہوا ہے

وہ ایک لمحہ
جو اس کو چھو کر گزر گیا تھا
اَبد تو ہے۔۔



منہ میں گوشت کا ٹکڑا لے کر
یہ جو چیل اُڑی ہے
جانے کس ٹیلے پر بیٹھے گی؟
گیروے رنگ کے کپڑوں والا
اس ٹیلے کے پیروں پر
چند لکیریں کھینچے گا
اور پھر ہم سب
اک نجانے شہر کی بنیادوں میں
اپنا لہو نچوڑیں گے
جب شہر مکمل ہو جائے گا
گیروے رنگ کے کپڑوں والا
شہر کی سب سے اُونچی ممٹی پر بیٹھی
چیل کی چونچ میں
گوشت کا دوسرا ٹکڑا دے دے گا

رضی ترمذی

# رستخیزِ درخشاں

(آئینۂ امروز و فردا)

زمانوں کے اجڑے کھنڈر
جن میں صدیوں سے کوئی صدا، کوئی آہٹ نہ پیدا ہوئی تھی
اندھیروں کے بوسیدہ، بوجھل کفن اوڑھ کر بے خبر سو رہے تھے
مگر کل اچانک
نہ معلوم کس وقت
بے رنگ، بکھری ہوئی پتھروں کی سلوں میں
کہیں ایک بے نام آواز، کی سرسراہٹ سی چلتی ہوئی،
دور تک اک چمکتا ہوا سرخ خط کھینچ کر بجھ گئی

کون تھا؟
کیا تھا؟
کوئی نہیں جانتا!
ایک آوارہ، پاگل سا لمحہ
کہیں ٹمٹماتی ہوئی آنکھ سے جھانکتا تھا،

وہ لمحہ یہ کہتا ہے
"اک معجزہ بس یہ پیغام لے کر مرے پاس آیا تھا:
ہشیار!
اِک صبح، اس وقت کی موت کے بعد پھر آ رہی ہے،
کوئی رستخیزِ درخشاں،
کہ جب ساری مٹی کی مردہ تہوں سے
دہکتے ہوئے زخم شاخوں کے مانند پھر لہلہاتے ہوئے پھوٹ نکلیں گے
جلتی سلگتی پرانی خراشیں
ہر اک شہر میں،
شہر کے کوچے کوچے میں
رگ رگ میں
غنچوں کے مانند چٹکیں گی
خوشبو کے مانند
غم کی زمانے میں توقیر ہوگی!"

جنوری ۱۹۶۴ء

خاطر غزنوی

## آٹھواں سمندر

سات سمندر پار، سُنا ہے
ایک سمندر اور بھی ہے
ساری دنیا سے اُونچا ہے
ساری دنیا سے گہرا ہے
ساری دنیا پر پھیلا ہے
سُرخ اور نیلا اور میلا ہے
اس کے گہرے بھورے بادل
ملکوں ملکوں چھا جاتے ہیں
کوکا کولا برساتے ہیں۔

جولائی ۷۷ء

احمد ہمیش

## محور!

ہماری آنکھوں میں جلنے والے نقوش باقی ہیں۔
کان۔ موسم کی گرم آہٹ سے چونک اُٹھتے ہیں۔
بھیگی مٹی کا لمس فن کو نکھار دیتا ہے۔
نرسری کے پُرانے گملوں میں پرورش کے تمام آداب خوب سمجھتے ہیں۔
ہوا ــــ ابھی تک ہمارے پیڑوں کی سرد شاخوں میں سرسراتی ہے
ہونٹ جلتے ہیں۔
اور گانگ۔ ہمارے وجدان کی انت اور اتھاہ لہروں میں بہہ نکلتا ہے
ہماری معصوم آتماؤں کی جوت دھرتی پہ جاگتی ہے۔
ہمارے محور پہ گھومتی ہے۔
کیا ہوا جو ہماری دنیا میں دن کی نفرت
یا شب کا دھوکا بھی حادثہ ہے ہمارے الفاظ کا۔
نہ کوئی تاریخ ساعتوں کی
نہ کوئی ورثہ نہ کوئی تہذیب
سب غلط ہے!
مفاہمت کے تمام بندھن بکھر چکے ہیں۔
ہماری آنکھیں ہی دیکھتی ہیں۔
اور کوئی آواز ــــ ہماری تاریخ کی حکایت سے ماورا ہے
دماغ پتھر اُگا رہے ہیں۔

اکتوبر ۱۹۶۳ء

مُبارک احمد

# میں تنہا نہیں ہوں

میری بیٹی کو
مجھ سے اتنا پیار ضرور ہے
کہ وہ اپنی ڈائری اکثر میری میز پہ بھول جاتی ہے
وہ لکھتی ہے
سارے ناطے کچے ہیں
باپ کا بھی
ماں کا بھی
بھائی کا بھی
بہن کا بھی
اور اُس کا بھی جو اُس کے خوابوں میں بستا ہے
میں ڈرتا ہوں
اُس نے زندگی کو زیادہ دُور تک نہیں سمجھا
میں، جس نے زندگی میں کبھی بھول نہیں کی
آج اپنی ڈائری میز پر بھول آیا ہوں
میں نے لکھا ہے

نئے علم کی روشنی میں پُرانے رشتے ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں
خوش فہمیوں اور خود فریبیوں کا دور ختم ہوا
لیکن مایوسی کا لفظ پہلے کی طرح اب بھی
تعقل کی ڈکشنری میں موجود نہیں
اور پہلے کی طرح اب بھی ہر عہد
دوستی کا بیج ہمارے دلوں کی کھیتیوں میں ضرور بوتا ہے
نئی کونپلیں ضرور پھوٹیں گی
گلاب ضرور کھِلے گا
نئی اقدار ضرور جنم لیں گی
تب تک
اگر ہمیں خود پہ سلیقے سے ہنسنا آجاتا ہے
تو زندگی دوبھر نہیں
اِس وقت بڑا وہ ہے
جو قہقہے بانٹتا ہے
اور اپنے آنسو خود سمیٹتا ہے۔

مئی ۱۹۷۷ء

شمس الرحمٰن فاروقی

رونا اور چلاّنا میرا کام ہے۔ کیونکہ مجھے بخوبی
علم ہے رونے اور چلاّنے سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔
بہت دنوں کی بات ہے، تقریباً میرے بچپن
کی۔ کچھ لوگوں نے ایک گھنے درخت پر اک
لمبی کالی موٹی چیز سی دیکھی۔ وہ سمجھے یہ شاید
کسی کی کالی اوڑھنی ہے۔ شاخوں میں اُلجھ
کر ہوا میں لہراتی ہے۔ کسی کے پاس ایک
لمبا بانس ہو تو اس کو کھینچ اُتاریں۔ کام
میں لائیں۔

اک صاحب بولے جی یہ کچھ بھی نہیں ہے
نظر کا دھوکا ہے۔ تم کو معلوم ہے۔ روشنی
کیسے کیسے دھندے کرتی ہے؟

اجگر ہے اجگر ہے اک بچہ چیخا بھاگو بھاگو اجگر ہے
بچہ تو گرتا پڑتا ماں کو پکارتا گھر کو بھاگا اور بڈھے
بوڑھوں نے کہا شاید یہ کہیں اجگر ہی نہ ہو۔
پھر ایک سے ایک پرانے سپیرے مداری
بلائے گئے کہ بچہ ڈرا ہو بڑا بھیانک اجگر
ہے۔ کسی کو کاٹے تو لہر نہ آئے۔ پانی پانی
ہو کر بہہ جائے گا۔ ایک بزرگ بولے، نہیں یہ
زہریلا تو نہیں ہے لیکن اپنے بلوں میں جکڑ
لے تو ہڈی ہڈی پارہ پارہ کر کے کھا جائے گا۔
اجگر کا لہرانا اب بند تھا لیکن وہ لمبی کالی پٹی
اک موٹی سی شاخ کے گرد یوں لپٹی تھی۔ جیسے
جنم جنم کی پیاسی ہو۔ کسی کسی کو اس کے تکونے
چتکبرے سر کی جھلک آجاتی تو وہ گھبرا کر پیچھے
ہٹ جاتا۔ پھر اس کو وہم سا ہوتا، میری پیٹھ
کو اک ٹھنڈی پتلی لال زبان دو شاخہ چاٹ
رہی ہے۔ گرم پسینہ بھل بھل گرتا، سارے
بدن میں گندی تری پھیلنے لگتی۔

اک اک کر کے سارے سپیرے سارے مداری
ہار گئے۔ کوئی منتر کام نہ آیا۔ اجگر اور درخت
کے سائے مل کر ایک ہوئے۔ شام کی گاڑھی
مہک آنکھ میں اُتری۔ تھوڑے بہت لوگ جن
میں ہمت باقی تھی۔ پیڑ سے کچھ دور حلقہ بنائے
کھڑے رہے۔ ان کی شکلیں دھندلی ہونے
لگی تھیں اور اس پیڑ پہ ایک پرندہ نہ تھا۔
سناٹا تھا۔

شام کے چولہوں کے میٹھے دھوئیں میں لپٹا
ایک سپیرا اچانک آیا۔ اس نے کہا اس اجگر
کو میں پکڑوں گا۔ تم سب اندھے اناڑی
ہو۔ اس نے ایک بڑے منہ کی ٹوکری جیسی
چیز درخت کے نیچے رکھی۔ ٹھیک اس شاخ
کے نیچے جو اندازاً اجگر کی آغوش میں تھی۔
پھر وہ چیخا، آجا، آجا، آجا، میں ماروں گا نہیں
بس پکڑوں گا لے جاؤں گا۔ رات چرانے
والے لمحے چپکے گزرتے گئے۔ اس پیڑ کو
جیسے سانپ ہی سونگھ گیا ہو۔ اک پتی بھی
ہلتی نہ تھی۔ گھروں کی چھتیں تک جوگی کے
شور و غل، غرانے سے گونج رہی تھیں، آ
آ، آ، لے جاؤں گا۔ مت ڈر میں پکڑوں
گا لے جاؤں گا

گندی مٹ میلی سی صبح نے دور سے جھانکا
اجگر والا پیڑ ابھی تک اک دھبہ سا لگتا تھا
اور اجگر کا گدلا رنگ آسمان پر بھی تھا اور
سپیرے کا غل دور سے ایسا لگتا تھا جیسے
کوئی ماتم کرتا ہو، آ، آ، آجا، لے جاؤں گا۔
پھر ایک عجیب سی کھل بل کرتی خشک صدا
کے ساتھ وہ اجگر دھب سے نیچے گرا ٹھیک
اسی ٹوکری میں ٹپکا جیسے پکا کٹھل گرتا ہے۔

جوگی نے لپک کر ٹوکری پر ڈھکن رکھا، ٹوکری
سر پر رکھی اور چلتا بنا۔ تھوڑی دیر میں ایسا
لگنے لگا جیسے کوئی بات ہوئی ہی نہ تھی اور
اس پیڑ کو سات ڈومنیوں نے اپنے گھر
کی خاطر تاک لیا۔ آپ نے شاید ڈومنی دیکھی
ہو۔ خاکی رنگ، اور میلی آنکھیں، پتلی چونچ

بدن پھلائے عجب عجب آوازیں کرتی ہے ۔
خواہ مخواہ ہنسی آنے لگتی ہے ۔

یہ سچ ہے، رونا اور چلّانا آہیں بھرنا میرا کام ہے۔
لیکن میں خوب جانتا ہوں۔ رونے اور چلّانے
سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اگر جوگی ڈومنی اور
پیرا اِک گھر میں کیسے رہ سکتے ہیں ؟
اور وہ بھی تمہاری آنکھوں کا بشری پانی!
ایک زاہد نے
جس کی داڑھی بادلوں سے زیادہ پاک تھی،
آنکھوں سے ایک ولی کے مقبرے کو پانی دیا۔
گرتی ہوئی ندی کے پہلو میں اُگے شہتوت کے
سامنے

تم ایک بار پھر میرا نام لو
اور یہ بول بھی فضاؤں میں تحلیل ہو جائے گا
سبز آنکھوں والے ایک جوانِ رعنا نے دریائے اٹو
کے دوسرے کنارے پر
ایک انار تمہیں تحفے میں دیا
اور روسی جھونپڑوں سے دھواں اُٹھ کھڑا ہوا
اُنہی بانسری کی صدا ایک اور دنیا تھا
ان دیکھا مگر واضح اور
اُدھر ایک ملّاح ناؤ پر مرغوں کے ٹینٹوے
دبا رہا تھا
مفصلات کھلے ہاتھ کی طرح ہیں
اس کی لکیریں ٹوٹے ہوئے ابجد کے نشان

چراگاہ میں گایوں کے ہیولے
بکھرے اور بے ترتیب
میں نے گرد کی تہ کھرچی ہے، کچھ نام واضح
ہوئے ہیں
زدل زدہ چند حروف
اناروں کے چھلے ہوئے بیج، بے نمو
زمین اور ہوا گھومتے اور رُخ بدلتے ہیں
تو باقی ہڈیاں بجتی ہیں
حال جامد ہے
رات اپنے پیڑوں سمیت نازل ہوتی ہے
برقی حشرات اور ریشمی سرسراہٹوں والے وحشیوں
کی رات
مُردوں کو ڈھانپنے والی گھاس کی رات
دور دراز سے آتے پانیوں کی ملاقاتیں ،
سرسراہٹیں
کائناتوں کا ایک دوسرے پر نثار ہونا
ایک کائنات زوال آمادہ ہوتی ہے، اور ایک
بیج بھڑک اُٹھتا ہے۔
میں اندھیرے میں تمہاری دھڑکن کا ارتعاش
محسوس کرتا ہوں۔
ہر دھڑکن ایک لفظ ہے اور ہر لفظ میری
فہم کی دسترس میں،
ہر لفظ میں ایک پہیلی ہے، ریت گھڑی کی
طرح۔
خوابیدہ عورت، ایک فضائے بسیط، تندہ اور

متحرک ایک اُموی جوہر جو ازل سے آپ
منقسم ہوتا ہے۔
ہمیشہ تمہاری خالی کوکھ میں آن گرتا ہے
نارسیڈک قبیلے کی مائیں سورجوں اور سورماؤں
کو جنم دیتی ہیں
اور دنیا بدل جاتی ہے
حال جامد ہے
کرۂ ارض کے عین اوپر
شیو اور پاربتی ایک دوسرے سے پیار میں
مگن ہیں ان کا ایک بوسہ ایک صدی پر
محیط ہے
ایک دیوتا اور عام انسان کے لئے وقت
تو ایک سا ہو، جیسے لاہور میں ہوا، دیوتا
اور انسان دونوں آناً فاناً سر کے بل کھڑے
ہو گئے ، ۔
خون کے دریا میں نہائی لاشیں
دو املی کے پیڑوں کے درمیان، ایک ہی
برہنہ پا دوشیزہ
دونوں جانب ایک سے جذبات ہنشاہ
ارتعاش
اور اس کی غیر مختتم ٹکٹکی
موت اور حیات کے درمیان ایک اونچی
دیوار
آسمان اور زمین کے درمیان معلق پاپلر
کا جھنڈ، پتوں کی تھرتھراہٹ سے زیادہ

روشنی کا جپا کا کیسی بلندی، کیسی پستی؟
حال جامد ہے
میرے بچپن کی یادوں کی برسات برس رہی
ہے، یوں جیسے بے قرار چمن پر پھوار پڑ رہی ہو۔
یا جیسے روشنی کے پھول، مرغولوں کے شجر تم
انجیر کے پتے میں میری ابرو پر تیرتے ہو،
مگر یہ بارش تمہیں گیلا نہیں کرتی
تم تو پانی کا شعلہ ہو
میری پلکوں پہ گرتا ہوا آگ کا شفاف قطرہ،
موتی کی چھب والا
میں اپنے موہوم خیالوں سے باہر جھانکتا ہوں
زمانے کے پہیے گھومتے ہیں، اور آج پھر وہی
دن ہے،
دنیا اپنی جڑوں کو جھٹکوں کے ساتھ کھا رہی ہے
ہمارے پھیلتے جسموں کا وزن
پھر بھی صبح آغاز سے کم ہے۔

جنوری ۸۷ء

غالب احمد

## نظم

تم سے ملنا تھا طلے دنیا سے
کشتیِ کون و مکاں میں بیٹھے
تیر کر پار گئے حرف و حکایت کے سمندر کتنے
کتنی صدیوں سے سفر یاب ہوئے
سرحدِ افلاک سے آگے کے جہاں خانوں میں
روشنی بن کے بہے
غارِ ظلمت میں گئے
چشمۂ ظلمتِ تاریک سے نکلے ہوئے دنیا دیکھے
راستے ساتھ چلے، منزلیں آغوش میں آ کر سوئیں
ہم نہ سوئے کہ کہیں
اپنی قدرت کے کرشموں کی پناہ گاہوں میں
اپنی آنکھوں میں بسائے ہوئے خوابوں کا خمار
خاک اور خون کے سانچوں میں سمٹ جاتے نہیں
جسم کے ان در و دیوار پہ آویزاں تھے
کتنے نقشے

ہم نے تدبیر کے ہر رستے سے آغاز کیا
ہم نے تقدیر کے ہر نقطے کو ہمراز کیا
جسم کو تیری طرف مائل پرواز کیا
تم سے ملنا تھا طلے
اپنی حقیقت سے پرے۔

فروری ۱۹۸۱ء

محسن بھوپالی

## ارتقائے زوال

برائی سے نفرت ہی کرتا تھا پہلے
کہ اپنے بزرگوں سے میں نے یہی کچھ سنا تھا
پھر اک وقت آیا — کہ اوروں کی خاطر
بری چیز کو بھی بری چیز کہتے ہوئے
میں جھجکنے لگا!

اب بُرائی کو اچھا سمجھنے لگا ہوں
یہی "ارتقا" کی وہ دلدل ہے جس سے بچانا
کسی اور کے کیا،
یہ میرے خدا کے بھی بس میں نہیں ہے
اگر میں نہ چاہوں۔

اکتوبر ۱۹۷۹ء

تبسم کاشمیری

# نظم نے کہا

نظم نے کہا مجھ کو لکھو
میں گھڑی ہوں
کسی شجر کی سبز شاخ پہ
کسی پرندے کی نیم خوابیدہ آنکھ میں
کسی باغ کی کہنہ چوبی سیڑھیوں پہ
کسی شام کی دھندلی گھنٹیوں پہ
دھوپ یا بارش کے کسی خوش نما گیت پہ
ترائیوں کے نارنجی بادلوں پہ
تتلیوں کے پروں پہ
یا اک جھیل کی جل پری پہ۔

نظم نے کہا میں گھڑی ہوں
دھوپ کے سرخ پھول پہ
دھند کی ایک تتلی پہ
ہوا کے بجتے گھنگھروں پہ
ادرک کی شراب پہ
راج ہنسوں کی ایک پرواز پہ
کسی بھولے ہوئے
نامعلوم راستے پہ
جو ابریں جنگلوں پہ
اور ان کی سرمئی شام پہ۔

نظم نے کہا میں گھڑی ہوں
ایک بہت پرانے شہر کی
بہت پرانی فصیلوں پہ
بہت پرانی فصیلوں کے بہت پرانے برجوں پہ
اجڑے ہوئے مدفون قلعوں میں
شہزادوں کے گم گشتہ نقشِ پا پہ
سل پتھر ہو جانے والی شہزادیوں کے مجسموں پہ
ان کی آنسو بھری آنکھوں پہ
اور ان کی بہت پرانی داستانوں پہ۔

نظم نے کہا میں گھڑی ہوں
ایک بہت پرانے بادبان پہ
ایک بہت پرانے ساحل پہ
ایک بہت پرانی بستی پہ
اور بستی کے ایک چوراہے پہ
ایک پرانے بادل کی نیگوں چھتری پہ
ایک پرانے دوست ستارے پہ
اور اس کی آنکھ کے خفیہ اشارے پہ۔

نظم نے کہا مجھ کو لکھو
میں گھڑی ہوں

زید کی میگھ ملہار روہی پہ
رانجھے کی ونجلی پہ
ہیر کی ڈولی پہ
صاحباں کے خون پہ
مرزے کی اداس بکی پہ
سوہنی کے کچے گھڑے پہ
اور تھل کی ریت میں جذب ہوتی
سسی کی آخری اوڑک ہچکی پہ۔

نظم نے کہا میں گھڑی ہوں
ایک لڑکی کے سرخ یاقوت ہونٹوں پہ
اس کے حنائی ہاتھوں پہ
اس کے جسم کے ریشم عکس پہ
اور عکس میں تھرتھراتے سرخ سمندر پہ
اور سمندر کے ساحل پہ پھول کشید کرتے
بے انت رنگوں پہ
اس کے رخسار کے رنگین آئینوں پہ
اور آئینوں پہ اترتی ہوئی
شہد جیسی شیریں رات پہ۔

صلاح الدین محمود

## ہوا کے اندر، ہوا ہے

نظم نے کہا مجھ کو لکھو
میں کھڑی ہوں
اُداس شہروں کی چھتوں پہ
تاریک گھروں کی الگنیوں پہ
زرد ماؤں کے تار تار دوپٹوں پہ
ایک زرد بچے کی زرد ہتھیلی پہ
ایک پیاسی بچی کے پیاسے حلق پہ
عذاب کی منڈیروں پہ
پگھلتی ہوئی انسانی کھالوں پہ
جبر سے چرچراتے بدنوں کی درازوں پہ
تشدد کے لشکاروں پہ
بربریت کے دہانوں پہ
منافقتوں کے لادے پہ
ریاکاری کی بھٹیوں پہ
ستم گری کی کارگہوں پہ
انسانی جسموں کے جہنموں پہ
اور ہڈیوں کے تاریک پُلوں پہ۔

نظم نے کہا مجھ کو لکھو
مجھ کو لکھو
میں کھڑی ہوں
میں کھڑی ہوں

ہوا کے اندر
ہوا ہے
اور پانی میں
بس پانی
گل میں بس
گل جیسی خوشبو
رات محض ان جانی
دن میں بس
اب سورج نکلے
شب میں بس اب چندا
بالک بس اب بالک جیسے
بینا ہر اک بندا
میں نے پر
بہتے دیکھا تھا
ہوا کے اندر پانی
گل میں لب کی خوشبو تھی
اور راتوں میں حیرانی

رات میں سورج
جیسے بن تھے۔
دن میں تنہا تن تھے
بالک، جیسے پات سے ڈھکی
بوندوں کے چاندن تھے
کہیں کہیں
بینا لمحوں میں
میں اک نابینا تھا
کہیں کہیں
دن کی جنبش میں
راتوں کا زینہ تھا

(نومبر ۱۹۷۸ء)

سہیل احمد

## ایک بچے کے جھولے کیلئے نظم

وہ ایک برس اُس نے تیری آغوش کو دنیا
سمجھا تھا
اُس وقت ترے ہلکوروں میں اُسے ماں بھی
یاد نہ آتی تھی

اِک نیند بھری دنیا اُس کی
اِک پیار بھرا جیون تیرا
پھر اُس نے چلنا سیکھ لیا
اب وہ گلیوں میں پھرتا ہے
اور تو اُس گھر کے کونے میں
یوں بھولے جانے پر حیران
اس گرد بھری تنہائی کی میلی چادر میں لپٹا ہے
کیا کوئی تجھے ایسا نہ ملا
جو اتنی بات بتا سکتا
تری نیند بھری دنیا سے پرے
جو زندگیوں کا میلہ ہے!
اُس میں ہر شخص اکیلا ہے!!

مئی ۱۹۷۷ء

محمد اظہار الحق

## مجاز

مسئلہ یہ نہیں کہ
بال خشک ہیں یا بھیگے ہوئے
بریدہ ہیں یا لمبے
رخسار تمتما رہے ہیں یا نہیں
مسئلہ یہ ہے کہ تحریر نظر آ رہی ہے یا نہیں

اُترے ہوئے کبوتر کو اُڑانے سے پیشتر
اس کے پنجوں سے بندھا ہوا کاغذ کھول لینا
سرما اُتر چکا ہے اور خشک گوشت کا ذخیرہ کر لیا گیا ہے
تہہ خانہ میں بند ہونے سے پیشتر
آخری مرتبہ راہ دیکھنا
اور اگر گھوڑا میرے بغیر واپس آ جائے
تو خورجین اور زین اُتار لینا
اور اگر برف سے اَٹا ہوا کوئی مسافر
خالی بستی میں آواز لگائے
تو اُسے تہہ خانے میں پناہ دے دینا
آخر تم فرشتہ نہیں ہو
عورت ہو!

جون ۱۹۷۷ء

خورشید رضوی

## جمعہ کے دن دفتر میں پھول

چھ دن کاغذ کا پیراہن پہنے گزرے
بہری اندھی فریادوں کی بھیڑ میں گھٹنے گھٹنے گزرے

آج تو اپنے آپ میں آئیں
پھول ہنسیں، مہکیں مسکائیں
ہرے بھرے پیڑوں میں سُن کر مست ہوا کی تھاپ
دُور دُور تک کہیں نہیں ہے کاغذ کے چلنے کی چاپ

سات دنوں میں ایک یہ دن ہے اپنے آپ میں آنے کا
ہنسنے کا مُسکانے کا
بھونروں سے نین ملانے کا

کل پھر کاغذ ہو جائیں گے
کاغذ کے پیراہن پہنے
بہری اور اندھی فریادوں کی بھیڑ میں کھو جائیں گے
آج تو اپنے آپ میں آ جائیں۔

اکتوبر ۱۹۷۹ء

چالیس سالہ مخزن

عرفانہ عزیز

## شب رو

ڈوب جاتی ہے جب عروسِ حیات
شفق و شام کی بہاروں میں
کون چنتا ہے پھول یادوں کے
تیری سنسان رہ گزاروں میں
کون تاروں کی نرم چھاؤں میں
زیرِ لب تیرا نام لیتا ہے
کون تیرے خیال کا دامن
بے خیالی میں تھام لیتا ہے
کون کرتا ہے یاد خلوت میں
بھولے بسرے ہوتے فسانوں کو
زیرِ لب کون چھیڑ دیتا ہے
حسن کے گم شدہ ترانوں کو
چاندنی رات میں جیسیں جھرنے
گیت گاتے ہیں گنگناتے ہیں
اور خوابوں کے ریشمی پردے
کس کی پلکوں پہ سرسراتے ہیں
سرنگوں کس کے آستاں پہ ہوئی
تیری ہستی کی مضمحل سی اساس
اور رہتا تھا کس کے قدموں پر
منزلوں کا غرور محوِ سپاس!
چھین کر نور کس نے تاروں سے
صبح کی مانگ پر بکھیرا ہے
کس کے گیتوں میں تیرے خوابوں کا
جگمگاتا ہوا سویرا ہے؟

دسمبر ۶۹ء

شاہین غازی پوری

## کسے خبر

ڈھلی ڈھلی سی ہوائیں خرام آہستہ
وہ دور نیم کی شاخوں سے جھانکتا مہتاب
روش روش پہ ہے ساون کی چاندنی رقصاں
سرک رہا ہے کنول کے رُخِ و نظر سے حجاب
تمام پھیل گئے قافلے بہاروں کے
فضائے گلشنِ ہستی میں کھو گیا ہوں میں
تصوّرات میں کتنا سکون ملتا ہے
غمِ حیات سے بیگانہ ہو گیا ہوں میں
کچھ اس طرح سے پریشاں ہیں پیڑ کے سائے
کہ جیسے روح لرزتی ہو ماہ پاروں کی
بکھیرتی ہوئی نغمے رواں دواں ہے ندی
کہ جیسے گاتی ہو دوشیزہ کوہساروں کی
کچھ ایسا ہوتا ہے محسوس چاندنی کے تلے
جبینِ شب پہ ہو جیسے غرورِ عظمت کا
کہ جیسے وادیِ ماہ و نجوم میں جاکر
کسی نے چھیڑ دیا ہو ربابِ فطرت کا
کہ جیسے خواب بسے ہوں نگاہِ نرگس میں
کہ جیسے رقص کناں ہو شبابِ فطرت کا
کہ جیسے پھول بچھائے گئے ہوں راہوں میں
کہ جیسے محوِ سفر کارواں ہو نکہت کا
ڈھلی ڈھلی سی ہوائیں خرام آہستہ
کہ جیسے صحنِ چمن میں چلے نگارِ حسیں
تمام پھیلے ہوئے قافلے بہاروں کے
کسے خبر کہ زمیں پر بھی ہے بہشتِ بریں

ستمبر ۶۸ء

ادیب سہیل

## آدھے سچ کا زہر

جسم ہے اپنا
جسم کے اوپر سر ہے کسی کا
سر میں سوچ ہے اور کسی کی
آئینے کو اپنا سراپا پیش کریں تو
خود کو ہم پہچان نہ پائیں

ربع صدی سے آدھے سچ کا دھیما دھیما زہر
بدن میں اُتر رہا ہے
آدھے چاند پہ گذر بسر ہے
جیون کے ہر ایک ڈگر پر
آدھے پن نے ہم سب کو بے جہت کیا ہے
بھول بھلیّوں میں جیسے ہم رواں دواں ہیں

ہم جو اس دلدل سے جان چھڑانا چاہیں
کوئی بھی سچائی ہو اس کو پورے طور برتنا
سیکھیں
کوئی بھی سچائی ہو اپنے عہد سے کٹ کر
بے چہرہ ہے
پوری سچائی اپنائیں
آدھے سچ کا زہر و گرنہ ـــــ

دسمبر ۷۱ء

سرمد صہبائی

## وہ نیک دل اور سادہ ہے

وہ نیک دل اور سادہ ہے
دن بھر عبادت میں رہتی ہے کہ آخرت کا سفر
اُس پہ آسان ہو
جسم پر آزمائش کے گہرے نشان
پھیلتے اور سمٹتے ہیں
لیکن وہ خوش ہے کہ وہ سارے اسباب کا اک سبب ہے
محافظ ہے ہر رات
جھوٹے دلاسوں کے تحفے لئے آنے والے دنوں کی تسلی کو تھامے
چمکدار وعدوں کے تعویز لے کر
اُسے آخرت کے لئے زادِ راہ لا کے دیتا ہے
وہ نیک دل اور سادہ ہے
جو رات کے فاصلوں میں
سزا اور جزا کے کڑے فیصلوں سے گزرتی ہے
ہر روز اُمید کی چوکھٹوں پر کھڑی راہ تکتی ہے
اُس کا
جو مُنصف ہے
ایک ایک پل کا حساب اور بدل مانگتا ہے
جو اُس کے مقدر کو اپنی پُراسرار جیبوں میں لے کر
زمانے کے فٹ پاتھ پر
آتے جاتے ہوئے راہ گیروں سے کہتا ہے
ہے کوئی جو اُس کی مشکل کو آسان کر دے
کہ وہ نیک دل اور سادہ ہے
دن بھر عبادت میں رہتی ہے۔

( مارچ ۱۹۸۶ء )

ظفر صمدانی

## ایک دل

میں ہوا کا قافلہ
میرے لئے
اس دشتِ بے ساحل میں
اِک ذرہ نہیں
ساعت نہیں
منزل نہیں

میرے گرد و پیش
دیواریں، قدیمی بُت کدے
پتھروں کی مورتیں
بے جان، و بے رحم
جن میں دل نہیں
اِک ہجومِ بے کراں
جس کا کوئی ساحل نہیں
ایک تنہائی کہ جس میں اَن گنت قرنیں نہاں
جس کی وسعت میں زمیں اور آسماں
ایک تنہائی مگر
جس کا کوئی حاصل نہیں

وقت میں ساعت نہیں
روز و شب میں، قربتوں میں فاصلوں میں
ایک بھی راحت نہیں
اس ہجومِ بے کراں میں ایک ہمدم بھی نہیں
ایک دل جس میں خوشی کیا
سایۂ غم بھی نہیں،
ایک دل
جرمِ گاہِ زیست میں جس کا کوئی قاتل نہیں

فروری ۱۹۷۹ء

نذیر قیصر

## میں اُن کے ساتھ ہوں

میں اُن کے ساتھ ہوں
جو تیغ پر ہونٹوں کو رکھے
لفظ کی حرمت کا "ماتم" ہیں

میں اُن کے ساتھ ہوں
جو درد کی دہلیز پر شمعیں جلائے
جاگتی آنکھوں میں زندہ ہیں

میں اُن کے ساتھ ہوں
جو کشتیوں میں جال
اور کھیتوں میں ہل کو چھوڑ کر
بے گھر ہوئے ہیں

ستمبر ۱۹۷۹ء

چالیس سالہ جشن

تاثیر وجدان

# یولیسز

اے چمکتی ظُہر!
ہماری اُجڑی آنکھوں کی بنجر گذرگاہوں سے ہمارے اندر اُتر
اور ہمارے دُکھیا دھیان کو ہری روشنی کا جلتا ذخیرہ واپس دلا
للکتی زبانوں کو کالی رات کا کیچڑ چاٹنے سے رہا کر
اور بشارت بن
بلورِ سلاسل کے نیچے بو مکتی ہوئی ہڈیوں کے لئے!

اے چمکتی ظُہر!
ہمیں ہمارا لفظ دے
کوہستانی چشموں کے نرمل اور مہربان پانیوں جیسا لفظ
جس میں ہم اپنے گونگے ہست کا چہرہ دیکھ سکیں
ہم کرناری سسس ہیں اداس چاہتوں کی پھیلی بانہیں
زرد شاخوں کی صلیبیں ہیں جن پر ہمارے جسم کا سکھ لٹکا
ہوا ہے

وہ بھی دن تھے
جب ہم اپنے ہم راز ساتھیوں میں بیٹھ کر دوسروں کی کہانیاں
کہا کرتے تھے
اور ہنسا کرتے تھے ان نصیب جلوں پر جو مسخ ہو گئے
اور اپنی شکلیں اور اپنی مٹی کے رنگ کا آخری اثاثہ اپنے
ہاتھ سے دے بیٹھے
آج ہم خود ایک کہانی ہیں
زہرناک ہنسی ہنسنے والے ہر لب سے چپکی ہوئی

اے چمکتی ظُہر!
ہمیں کالی رات کے چاہِ بابل سے باہر کھینچ
ہمیں بچا زیرِ زمیں اندھے سفر کے عذاب سے
ہم کہ یولیسز ہیں، ہمیں ہمارے گھروں کا پتہ دے
گھر جو بکھری ہوئی نیلی بلندیوں پر کہیں ہم سے بچھڑ گئے

اے چمکتی ظُہر!

اگست ۱۹۷۷ء

راحت نسیم ملک

# محبّت میں شاعری

تم سے مل کر یہ کُھلا سب شاعری بے کار ہے
تم سے پہلے جلتی پوروں سے کبھی کاغذ کو چھو لیتے
تو ہم اپنے لکھے کو حرفِ آخر جانتے
تم سے پہلے آنکھ کے روزن پہ پھیلی دھند کو
سچائی کا در مانتے
تم سے مل کر یہ کُھلا ہے، حرفِ آخر وہ نہیں
کاغذ پہ جو ہم نے لکھا
اور سچائی کا در بھی وہ نہیں
آنکھ کے روزن پہ پھیلی دھند میں جو وا ہوا
حرفِ آخر خون میں چلتی ہوئی چنگاریوں کا لمس ہے
اور سچائی کا در اس ربط کا اظہار ہے
تم سے مل کر یہ کُھلا یہ ربط بھی تو بار ہے
تم اگر وہ خواب پڑھ لو، جو کُھلی آنکھوں میں ہے
ہم اگر وہ حرف لکھ دیں، جو ابھی سوچوں میں ہے
خواب سے آنکھوں کا رشتہ
حرف سے سوچوں کا ناطہ
سب ہمارے درمیاں جس ربط کی روداد ہے
ہم اگر اس ربط کا اظہار کر دیں بھی تو کیا
جھوٹ سچ کا فاصلہ اک دُھند ہے
ہم تمہیں اک روز پا لیں بھی تو کیا
آنکھ کے روزن پہ پھیلی دھند کیا اس لمس سے چھٹ
جائے گی
زندگی تلوار پہ پنجوں کے بل چلتے ہوئے کٹ جائے گی
تم سے ہم کیسے کہیں جینا بہت دشوار ہے
تم سے مل کر یہ کُھلا یہ سوچ ہی بیکار ہے
جان، تم تو جانتی ہو شاعری آزار ہے۔

جولائی ۷۷ء

محمد انور خالد

# ہونا سب سے بڑا الجھاوا ہے

ہونا سب سے بڑا الجھاوا ہے
شاخِ صنوبر چاند کی آس میں جاگتی ہے
اور دن بھر سونے والے گھر کی دہلیزوں پر آکر بیٹھتے ہیں
اور خواہش و خواب کے اندیشوں میں رات
سمٹتے پیراہن کی لذت بن کر روزنِ در سے جھانکتی ہے
بچے ماؤں کی گردن میں باہیں ڈالے ہوتے ہیں
خواب ہماری مائیں ہیں
خواب ہماری مائیں ہیں
اور راہ کنارے بیٹھے لڑکے گھر کو جانے والا سب سے لمبا
دست چھنتے ہیں

شادابی اس شہر میں ایک دن آئی تھی
شادابی ہر شہر میں اک دن آتی ہے
اور ہر شہر کے ایک گوشے میں سناٹے کی چادر تانے
ایک اکیلا گھر ہوتا ہے
باری باری ایک ایک آنے والا
ایک سا ایک دن اس گھر میں آتا ہے

شادابی اس شہر میں ایک دن آئی تھی
اس دن شہر پناہ میں سب سے پہلے آنے والا میں تھا
اور چاند سمان جھلا جھل چہرے فانوسوں کا سوت بنے تھے
چاند اکیلا گھر
سو ایک دن میں جانے والا اس گھر میں جاتا ہے
مائیں اپنے بچوں کو اس گھر میں جاکر جنتی ہیں
بہنیں ڈھول سہاگ الاپ کے روتی ہیں
اور بیٹے
ساز سجائے میدانوں میں گھوڑا دوڑاتے ہیں
خیموں میں ہر رات الاؤ جلائے جاتے ہیں
اور زخمی جسم کو داغا جاتا ہے
اور مرنے والوں کی فہرست بنائی جاتی ہے
خواہش خواب اندیشے خوف
کبھی نہ تھکنے والے پیاسے
ہم میدانی لوگ
سو ایک دن مرجانے والا اس گھر میں جاتا ہے
اس کے بعد جو ہے وہ شہر پناہ میں آنے کا پچھتاوا ہے
ہونا سب سے بڑا الجھاوا ہے۔

دسمبر ۱۹۷۹ء

پروین شاکر

## کسے کہ کشتہ نہ شد.....

سنا ہے خسروِ دوراں کی کج کلاہی کو
کشیدہ قامتیِ عصر خوش نہیں آئی
بزن کے حکم سے لرزاں چلا جو ہرکارہ
تو اپنے منصبِ عقبیٰ شکار سے آگاہ
ارادۂ شہِ والا کو معتبر کرنے
فقیہِ شہر مناسب جواز لے آیا
طلائی طشت میں تازہ گلاب سجنے لگے
ذرا اُٹھے تھے کہ نیزوں پہ سر پہنچنے لگے
عبا و جبّہ و دستار بے ہنر ٹھہرے
ازل کے کور نظر آج دیدہ ور ٹھہرے
کنارہ کرتے ہوئے دوست شرمسار نہیں
وہ ابتلا ہے کہ سائے کا اعتبار نہیں
وہ تیرگی ہے کہ اُمیدِ اجر دل میں نہیں
دعائیں مانگتے ہیں اور صبر دل میں نہیں

مگر وہ لوگ کہ جن کا یقین زندہ تھا
اُمیدِ اجر پہ جن کا چراغ جلتا تھا
وہ ایک نام کی نسبت سے معتبر اب بھی
وہ ایک زخم کے رشتے سے دوست تر اب بھی
نہ ان کو تخت سے مطلب، نہ لوح کی خواہش
نہ مصلحت کی اسیری، نہ جاہ کی سازش
نجابتوں کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں
درونِ شہر، جہاں جشنِ قتلِ عام ہوا
حضورِ شاہ سبھی جاں گزارنے آئے
زباں کا قرض لہو سے اُتارنے آئے
ہوا نے جتنے دیے مانگے نذر کر ڈالے
کہ روشنی کا نسب صرف بام و در سے نہ تھا
اور آنے والی کسی سرد رات کی خاطر
کوئی چراغ بچا تھا — تو میرے گھر سے نہ تھا

دسمبر ۸۰ء

اصغر ندیم سید

## میں پوچھوں گا

جو بھی مری تاریخ کی وردی پہن کے اب
آئے گا
میں تو اُس سے اس کا پیشہ پوچھوں گا
میں تو اُس سے اپنی زمین پہ اُگنے والے پھول
کی قسمیں پوچھوں گا
میں تو اس سے پوچھوں گا
کہ کون سے گیت ہماری فصل پکاتے ہیں
اور ان میں کس کے خون کا سورج اونچے سُر میں
بولتا ہے
جو بھی میرے لفظ کو اپنا غلام بنانے آئے گا
میں اُس کو اپنی کھال اُتار کے دے دوں گا
اور اپنے سارے لفظ ہوا میں اُڑا دوں گا
اور اپنی آنکھیں شہر کے اونچے میناروں پہ
نصب کروں گا
جو بھی میرے نام کے لفظ بگاڑے گا
میں اس کی یاد میں بہنے والے سارے اَشک
بھلا دوں گا
جو بھی دریاؤں کا پانی گدلا کرنے آئے گا
میں اس کے دل میں پھیلاؤ کے سارے رستے
تاریکی سے بھر دوں گا
میں اس کے سارے رتبے دائمی کر دوں گا

مارچ ۱۹۷۹ء

ذوالفقار احمد

## موت حیات کے شجر کا پھل ہے

موت۔ حیات کے شجر کا پھل ہے
اسے بھی چکھ کر دیکھو
بہت کنارے دیکھ چکے
اب ندی سے مل کر دیکھو
خاک پہ اپنی تدبیروں سے
نقش بنائے کیا کیا
بہت چلے ان رستوں پر
اب ہوا میں چل کر دیکھو
اور بھی دشت ہیں، اور بھی در ہیں
اس بستی سے میلوں باہر
ان جیسے ہی اور بھی گھر ہیں
جن کے آنگن جلتے بجھتے
ایسے ہی کچھ شام و سحر ہیں
جس کی تلاش میں
سب در جھانکے
قریہ قریہ، چڑھتے چاند اور ڈوبتے سورج
کوہ و دمن سب گھومے
شاید وہ بھی وہیں ملے اب
اس گھر چل کر دیکھو
موت، حیات کے شجر کا پھل ہے
اسے بھی چکھ کر دیکھو

اگست ۷۶ء

نسرین انجم بھٹی

## ایک اور نظم

پیاسی کونجیں جب ہڈیوں میں گھل جائیں
تو بادل ہی ہو جاتی ہیں
پیاسی کونجیں، دھرتی پیاسی کونجیں۔
پیا، چندر مکھی کی آس لئے جاتی ہے
پیاس پکار اور پکار پرواز بن جاتی ہے۔
پرواز کے لئے آکسیجن چاہیے نا
لمبا سانس لوں
شاید لوگوں کے دکھ میرے اندر سمٹ آئیں
لوگ سکھی ہو جائیں
مگر اس کے بعد لمبی چپ ہو گی
اور لوگ تو لفظوں کے بھوکے ہیں
انہیں کون بتائے گا کہ میں نے اپنے ساتھ کیا کیا
میں نے ان کے لئے کیا کیا
پیاسی کونجیں بادل میں گھل کر برسیں گی تو
بیج اٹھیں گی
۔اور ان کی پکار صرف دھرتی سن سکے گی
دھان کی فصل پر کونجوں کے آنسو
موتیوں جیسے پیا دل کس کے گلے کا ہار ہوئے
کس کے گلے کا پھندا
مسئلہ رزق اور حسن کا نہیں
مسئلہ میٹن پراسس کا ہے۔
لفظوں کے ساتھ کوئی غلط کام میں نہیں کر سکتی
تو میں چپ ہوتی
میرے حصے کے لفظ تم لے لو
اور آپس میں بانٹ لو
یوسف کے کرتے کی طرح
لیکن ان کے ساتھ غلط کام نہ کرنا۔

دسمبر ۱۹۷۰ء

سعت اشارت

# "میں"!

میں تنہا ہوں کہ میری ذات ہے محشر تمنا کا!

کبھی محسوس ہوتا ہے خلائے بیکراں ہے میرا ہر ذرہ
کبھی میں شش جہاتِ زندگی کا مرکزِ غم ہوں
کبھی میں زندگی ہوں اور کبھی جینے کا ماتم ہوں
کبھی نوحہ کناں ہوں ہر خوشی پر
کبھی خنداں غمِ آزردگی پر!

کبھی خواہاں کہ یہ سب اجنبی چہرے
جو بھیگی گھاس کی مانند اپنے سرد احساسات
مجھ میں منتقل کرتے ہیں، وہ
جو روح کو یخ بستہ اک بیگانگی میں ـــــ
قفل اندر قفل ـ لے جا ڈالتے ہیں
یہ چہرے مجھ سے ہوں! میں ان سے ہوں!
یہ میرے ہمدم ہوں!!

کبھی وہ لوگ جو ارواح کی گہرائیوں تک ـــــ
ـــــ میرے اپنے ہیں۔
جو میرے غم پہ روتے ہیں
مری خوشیوں پہ ہنستے ہیں
مرے جذبات کی گرمی کے مخزن ـــــ

مرے حالات کی آسودگی میں
وہ اکثر بے اماں لمحوں کے خوں آلود حملوں سے
تڑپ کر دور ہٹ جاتے ہیں
تعلق کے روابط منجمد اتنے۔
کہ میرے جذب کی گرمی انہیں پگھلا نہیں سکتی۔
وہ مجھ کو غیر لگتے ہیں۔
میں اُن کو اجنبی ـــــ شاید ـــــ

ہزاروں جسم آنکھیں بن کے ہیں نگراں مری جانب
کوئی نفرت ـــــ کوئی اُلفت ـــــ کوئی بیگانگی کے ساتھ ـــــ
اس کے منتظر ہیں ـــــ
کہ میں کس راہ پر چل دوں
خود کو جان جاؤں!
یا خود سے بے تعلق ہو کے میں بھی اس طرح جی لوں
جیسے اَن گنت انفاس ـــــ جی گزرے ہیں ـــــ
ـــــ جیتے ہیں ـــــ
سبھی ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرا کر
ہر اک سنگین کوتاہی
ہر اک بے مہر خاموشی
ـــــ کو یوں انگیز کر لیتے ہیں ـــــ
ـــــ جیسے یوں ہی ہونا تھا ـــــ یونہی ہوتا ـــــ!

مگر یہ دوست اور یہ غیر اور یہ مہرباں نظریں
میں ان نظروں سے واقف ہوں۔
میں ان جذبوں سے واقف ہوں۔
محرک ہیں یہی جذبے
تخیل۔ اجنبیت مہر و الفت اور عداوت کے
کہ میری بھی نظر—
ان ہی عناصر کی علامت ہے!

میں "اک" ہستی ہوں یا میں تا ابد دنیا کا مظہر ہوں؟
میں اک لمحہ میں ہوں یا سینکڑوں صدیوں کا سنگم ہوں۔
میں ذرّہ ہوں—
کہ دستاویز ہوں ذاتِ دو عالم کی؟

مارچ ١٩٦٧ء

فاطمہ حسن

## اب وہ یادوں کی مالا پروتی ہے

ذہانتیں حسن چہروں پر لکھی گئیں
وہ خامشی کے نقاب میں
چھپ گئے تو ادھوری
لے گویائی کو قوت بخشا
اور لفظوں کے جنگل میں
خودرو پودے اُگنے لگے
پھر جو گن کو اس جنگل سے
کوئی پھول نہیں ملا

دسمبر ١٩٧٨ء

عذرا عباس

## موت کے سائبانوں میں ایک نیند

ہم رات کی چاہتوں کو بھلا کر
اُجلے دنوں میں بھٹکتے رہے
اب کس خواب میں ہیں
جب نیند ہمارے تلووں سے گزر جائے گی
تو موت اپنے پروں کا سایہ کرے گی
نیند میں کیسے چلیں؟
شہر میں کیسے چلیں؟
شہر کی ساری راتیں بھیگی ہوئی ہیں
راستہ دینے والی سڑکیں پانی میں ڈوبی
ہوئی ہیں
وقت سیاہ پرندے کی طرح ہمارے سروں سے
گزرتا رہا ہے
اور اب تو اس کی چونچ ہماری شہ رگ میں
اُترنے لگی ہے

جو کچھ بھی ہے
اور جو کچھ بھی تھا
وہ کچھ بھی نہیں ہے
ہم سے آگے اور پیچھے
واہمہ ہمارا مقدر ہے
حقیقت سفید لباس میں ہم سے بہت دور ہے
محبت ہمیں ڈس چکی ہے
اب زہر پھیلے گا، تو اس دوپہر
ہم سے پیچھے جو قبریں بنی تھیں
ان میں اضافہ ہی ہوگا

اپریل ١٩٧٠ء

ثروت حسین

# ایک نظم کہیں سے بھی شروع ہو سکتی ہے

ایک نظم کہیں سے بھی شروع ہو سکتی ہے
جوتوں کی جوڑی سے
یا قبر سے جو بارشوں میں بیٹھ گئی
یا اُس پھول سے جو قبر کی پائنتی پر کھلا
ہر ایک کو کہیں نہ کہیں پناہ مل گئی
چیونٹیوں کو جاء نماز کے نیچے
اور لڑکیوں کو میری آواز میں
مردہ بیل کی کھوپڑی میں گلہری نے گھر بنا لیا ہے
نظم کا بھی ایک گھر ہو گا
کسی جلاوطن کا دل یا انتظار کرتی ہوئی آنکھیں
ایک پہیہ ہے جو بنانے والے سے ادھورا رہ گیا ہے
اُسے ایک نظم مکمل کر سکتی ہے،
ایک گونجتا ہوا آسمان نظم کے لیے کافی نہیں
لیکن یہ ایک ناشتے دان میں بآسانی سما سکتی ہے
پھول، آنسو اور گھنٹیاں اس میں پروئی جا سکتی ہیں
اسے اندھیرے میں گایا جا سکتا ہے
تہواروں کی دھوپ میں سکھایا جا سکتا ہے
تم اسے دیکھ سکتی ہو
خالی برتنوں، خالی گھوڑوں اور خالی قمیضوں میں؛
تم اُسے سُن سکتی ہو
ہاتھ گاڑیوں اور جنازوں کے ساتھ چلتے ہوئے
تم اسے چوم سکتی ہو
بندرگاہوں کی بھیڑ میں
تم اُسے گوندھ سکتی ہو
پتھر کی مانند میں
تم اسے اُگا سکتی ہو
پودینے کی کیاریوں میں
ایک نظم
کسی بھی رات سے تاریک نہیں کی جا سکتی
کسی تلوار سے کاٹی نہیں جا سکتی
کسی دیوار میں قید نہیں کی جا سکتی
ایک نظم
کہیں بھی ساتھ چھوڑ سکتی ہے
بادل کی طرح
ہوا کی طرح
راستے کی طرح
باپ کے ہاتھ کی طرح۔

فہیم جوزی

# ہونا نہ ہونا

(طویل نظم "نفرت کا رزمیہ" سے اقتباس)

اے قاری! نفرت کے اس رزمیے میں کہیں میں بھی ہوں

میں ایک نامعلوم مُرشد کا کھویا ہوا بالکا
میری دعا ہے ہرتیا میرے دردِ محبت میں اضافہ کر
اے قاری دھوپ اب جاگنے لگی
میرے محبوب کے لگائے ہوئے زخموں سے خوشبو پھوٹنے لگی
مجھے مت روکنا کہ میدانوں میں اس کے بازوؤں کا گداز ہے
اور صرف موسموں کے توازنوں میں اُلجھ کر مت رہ جانا
کہ ادوار میرے اور اس کے رشتے سے قائم ہیں
میں اپنے انتخاب کا پچھتاوہ نہیں
رقیق پچھتاوے ہڈیوں کے گودے سے رسنے لگیں،
اور بچھڑے ہوئے رفیقوں کے خواب دھندلانے لگیں،
طعام چڑچڑانے لگے، آنسو حلقوم میں
پھنس پھنس جائیں اور جسم آدھی حقیقتوں کے
آرے پہ چرنے لگے ــــ کچھ بھی نہیں ہوتا

کچھ بھی نہیں
ہجر کے سائے طویل ہو جاتے ہیں
سالوں کے کھیل میں جیت لڑیوں کی ہوتی ہے

ہاتھوں میں ہاتھ دے کے چلو تو سہی
کنول توڑنے کی ضدی عادت چھوڑ دو
اور سنو گلریز دنوں کا رزمیہ
روشنی کی فصیل ناخنوں پہ اُگنے لگی
تشدد کے ادوار تیرے میرے رشتے توڑ نہیں سکتے
وصل کی سرشاریاں، خواب، یادیں
اور درد کی دہلیز پہ اپنے ہونے کی صدائیں ــــ
لبانیاں داستان گو کی تلاش میں ہیں۔

جون ۱۹۷۷ء

مسعود منوّر

# عبودیت

تو ایسی ہے
سپنے جیسی
مٹی کے صدف میں موتی سی
نم آنچ دہکتی آنکھوں میں
آنسو جیسی
تو تازہ دودھ کی خوشبو سی
او پتن پتن آوارہ
تو ٹھاٹھ ہے چڑھتے پانی کی
تجھے گندلیں توڑتے دیکھا ہے
سرسوں کے سنہرے کھیتوں میں
یہ کون بنا کر چھوڑ گیا
پاؤں سے گھروندے ریتوں میں
تو ایسی ہے
اپنے جیسی
صندل کے مکاں میں چاتن سی
تو ایک ہی عریاں لاکھوں میں
جگنو جیسی
تو جیون کا اک جادو سی
تو دور، تو ہر شے مہنگی ہے
تو پاس تو ہر شے سستی ہے
ترے آنے جانے میں عترا،

یہ بھاؤ اُترتے چڑھتے ہیں
تجھے دیکھ کے ایمانوں والے
تمجید کا کلمہ پڑھتے ہیں
تری زلفیں ناگ نہیں دلوی
تری آنکھیں راگ نہیں ناری
تری قامت شاہ شمشاد نہیں
ترا روپ دہکتی آگ نہیں
چنگاری ہے
تو عام سی لڑکی ہے عترا
ترا ذکر نہیں ہے مصحف میں
تو نورؔ نہیں
اک عام سی لڑکی تنہا سی
تو وینس، ستی، ہیر نہیں
تیری تن تصویر بہت سادہ
یہ مرد مصوّر کی رچنا
کوئی کوکب کی تحریر نہیں
اک عام سی لڑکی، سادہ سی
جیون کا اشارہ رنگ بھرا
کرموں والا، بھاگوں والا
قسمت کا ستارا روشن سا

تو ایسی ہے
چشمے جیسی
تو اپنی ثناء کر شہزادی
تو اپنی ثناء کر سکتی ہے
ترا تن جیسے اُجلا دریا
تو چھم چھم بہتی ندی ہے
میں تیرے کنارے پر تنہا
اک پیاس بھرا کشکول لئے
ہونٹوں میں سلگتا رہتا ہوں
میں کہتا ہوں
جل دے رانی
جل شُپتا
جل اور اجل دو ساحل ہیں
دو سانس سنہرے دو پل ہیں
اک تو عترا، اک میں روگی
ہم اک دوجے کی منزل ہیں
لا ہاتھ امانت چپکے سے
مرے ہاتھوں کی تنہائی میں
تو مصری گھول مرے غم میں
میں درد بھروں تنہائی میں
یا معبودہ!
یا مسجودہ!

نا ہید قاسمی

## اندر بُوٹی مُشک مچایا ......

میں تیری عبادت کرتا ہوں
میری آنکھیں زائر ہیں تیری
میرے لب تجھے سجدہ کرتے ہیں
یا مسجودہ
اِن تینوں پر جب رُت آئے
جب مجھکو تم
پیغام ہوا کو دے دینا
میں آؤں گا
پوجا کا اگر سلگاؤں گا
میں چندن دیپ جلاؤں گا
تم ہنس دینا چھن چھن کِھلنا
باہوں میں سمٹ کر جب مِلنا
آغوشش سمندر ہے گترا
کوئی ڈوب گیا کوئی پار اُترا
کب رات اماوس کی آئی
کب چاند چڑھا کب ڈوب گیا
تو سپنا ہے میں نیند تری
میں کون تھا تو کون مری
یا معبودہ
یا مسجودہ!

جولائی ۶۸ء

لاکھ بہانے بنا ــــ "یہ ساون رُت ہے
بادل تو برسا کرتے ہیں برس گئے!
لاکھ چھپا
لیکن اِن آنکھوں میں اب جو قوسِ قزح سی ناچ اٹھی ہے
تو میں جان گئی ہوں ــــ جان گئی ہوں
(کن کلیوں سے رنگ لئے ہیں تو نے؟)
تیرے دل میں کتنے سوہنے پھولوں کے گھر اُگ آئے ہیں
جن میں تو نے خوشبوؤں کے دیئے جلا رکھے ہیں۔ میرے لئے
بس میرے لئے
اب تو مجھ کو گہرے سمندر کی تہ میں سے سیپی ڈھونڈنے بھیجے گا
تو میں وہ سیپی لا دوں گی
(اس سے تجھے کیا اُبھر اُبھر کے ڈوبوں یا میں ڈوب ڈوب کے اُبھروں)
تو مجھ کو صحرا کی تپتی ریت کے ذرے گننے کو کہہ دے
تو میں وہ سارے ذرّے گن دوں گی
(چاہے میری انگلیاں سُرخ چنار کی شاخیں ہو جائیں)
یا تو مجھ کو (میری بے گنہی کے جرم میں، ایک تنہا جوئی پر کاڑھے
تو میری آنکھ سے تیرے دکھ کے موتی نہیں گریں گے
حشر تک محفوظ رہیں گے

عبدالرشید

## یاد کے ہالے میں ٹھنڈے برگ و بار

راستوں کے دونوں سمتوں میں کھڑے اشجار
جیسے بچپن کے اونچے ایام میں پیڑوں کے
گرد
مٹی میں لپٹی رہگزار
یاد کے ہالے میں ٹھنڈے برگ و بار
ہاتھ پانی کی طراوت میں بکھرے ملتے نہ تھے
رات کی نیندوں سے بوجھل
سبزہ زار
سر میں جلتی بارشوں کے شور میں
اڑتا غبار
آنکھیں موندے لیٹتے اور سوچتے اشکوں
کے تار
انگلیوں کی پور میں شدت سے بہتا
لمس کا بہتا بہار
کھڑکیاں کھولے ہوئے ٹھنڈی ہوائیں
چاند
لکڑی کی تپائی پر خجل دیوار کی اینٹوں
میں چاند
کون سے مقام کران سبز جسموں پہ پانوں لئے
ہونٹ سے پی لے وہ جام
جس کی دُردتہ میں تیرے
زہر کا بادام
یہی دن جو سارے آگئے ہیں
ان کے پیلے پام
میں بہتے ہوئے
پانی کے گام

ستارہ سید

## پھر شامِ مراد ڈھل رہی ہے

پھر شامِ مراد ڈھل رہی ہے
دن بھر کا تھکا ہوا اُجالا
شمعوں کے قریب ہانپتا ہے
اور
رزق کے کھوج میں بھٹکتے
بے زار پرند لوٹتے ہیں
ٹوٹے ہوئے پر، جلی زبانیں
وہ کس کو دکھائیں، کون سمجھے؟
بے سود سفر کی داستانیں

تاریک ہوئے وہ رنگ منظر
جم سے گئے روزنوں میں چہرے
بجھتے ہوئے نیلگوں لبوں پر
ابھرے ہیں کسی سوال کے عکس
آنکھوں کے اُجاڑ بن میں لرزاں
بے اَنت جواب کے ہیولے
پھر شامِ مراد ڈھل رہی ہے

عشرت آفریں

## وجدان

ہجر و وصال کے بیچ بھی اک موسم ہوتا ہے
جیسے تمہاری گم سم آنکھیں
جیسے میری ادھوری نظمیں
جیسے چھاچھ کا خالی پیالہ
جیسے چاک پہ آدھا برتن
جیسے کسی سیارے پر چودہ ماہ کی رات
جیسے کسی تخلیق کے لمحے
کرب کی لذت
جیسے لہو میں سرحدی گیتوں کی سرشاری
جیسے بنجر کورے زمیں کی پیاسی کوکھ میں
نمو کی خواہش
جیسے کوری نرم دہکتی پوروں کی شیتل آنکھوں میں
لمس کے پہلے خواب کی حیرت
کچھ نہ سمجھنے اور سمجھانے کے موسم کی
کچی باتیں
سوندھے جذبے
جیسے گوری کے سینوں میں
پہلی دید کا میٹھا خوف
اور چنگی پیتا مدھم دھڑکا
جیسے ماں کے جسم سے ہونٹ ہٹا کر
چننے والے بچے کی آسودگی

جیسے جنگ کے بعد لٹے ہوئے گاؤں میں
تنہا بوڑھا
بیل کی جوڑی
نہر کا سن سن بہتا پانی
روز کی فصلیں
سرسوں کے بیچ پھٹے آنچل کی دھجی
گہرا آسیبی سناٹا
جیسے کسی بستی کی دھن پر
پیر کبیر کا سادہ دوہا
جیسے بھری چوپال کی چپ کے بیچ
کہانی کار کے لمبے سانس کا وقفہ
ہجر و وصال کے بیچ بھی اک موسم ہوتا ہے۔

ستمبر ۱۹۷۹ء

شاہدہ حسن

## صدائے عندلیبِ شاخِ شب

بہت اُداس ہے صدائے عندلیبِ شاخِ شب
کہیں کہیں سلوتِ خواب گاہ میں
بھٹک رہی ہے یوں چراغ کی نمی
خیالِ رفتگاں میں ہو کوئی اُمید سی عجب

زمینِ ماہ و سال پہ
ہر اک اُمید، ہر خیال، ہر خبر
عجب سی تشنگی میں تر
ہوائے غم! مگر
کسی کا انتظار ہے کسی کو کب؟

جہانِ بے ثبات میں
لبوں کو ادھ کھلے گلاب کی چمک سے پیار کیوں
گھٹا کا اعتبار کیوں
اُڑان پر ہے یہ ستارۂ جہانِ بے سبب۔

ستمبر ۱۹۷۹ء

افضال احمد سید

# مٹی کی کان

میں مٹی کی کان کا مزدور ہوں
کام ختم ہو جانے کے بعد ہماری تلاشی لی جاتی ہے
ہمارے نگراں ہمارے بند بند الگ کر دیتے ہیں
پھر ہمیں جوڑ دیا جاتا ہے

پہلے دن میرے کسی حصے کی جگہ
کسی اور کا حصہ جوڑ دیا گیا تھا
ہوتے ہوتے
ایک ایک رواں کسی نہ کسی اور کا ہو جاتا ہے
خبر نہیں میرے مختلف حصوں سے جُڑے ہوئے مزدوروں
میں سے کتنے
کان بیٹھنے سے مر گئے ہوں گے
مٹی چرانے کے عوض
زندہ جلا دیئے گئے ہوں گے
مٹی کی کان میں کئی چیزوں پر پابندی ہے
پانی مٹی کی حاکمیت کو ختم کر کے اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے
اگر نگرانوں کو معلوم ہو جائے
ہم نے مٹی کی کان میں آنے سے پہلے پانی پی لیا تھا
تو ہمیں شکنجے میں لٹکا کر
سارا پانی نچوڑ لیا جاتا ہے
اور پانی کے جتنے قطرے برآمد ہوتے ہیں
اتنے دنوں کی مزدوری کاٹ لی جاتی ہے
مٹی کی کان میں آگ پر پابندی نہیں ہے
کوئی بھی نگراں آگ پر پابندی نہیں لگاتا
آگ کان کے مختلف حصوں کے درمیان دیوار کا کام
کرتی ہے
میں بھی آگ کی چار دیواریوں کے درمیان کام کرتا ہوں
کوئی بھی مزدوری آگ کی چار دیواریوں کے بغیر نہیں ہو سکتی

مٹی کی کان میں آگ کا ایک اور کام بھی ہے
کبھی کبھی نگراں اچانک ساری کان کو خالی کرانا چاہتے ہیں
اس وقت کان میں آگ پھیلا دی جاتی ہے
اس دن اگر کوئی سلامت نکل جائے تو اس کی تلاشی
نہیں لی جاتی
مٹی اسی دن چرائی جا سکتی ہے۔

میں نے ایک ایسے ہی دن مٹی چرائی تھی

وہ مٹی میں نے ایک جگہ رکھ دی ہے
اور ایک ایسے ہی آگ بھڑکنے کے دن میں نے بیکار اعضا
کے انبار سے
اپنے ناخن اور اپنے دل کی لکیر چرائی تھی

اور انہیں بھی ایک جگہ رکھ دیا ہے
مجھے کسی نہ کسی طرح آگ لگنے کی خبر ہو جاتی ہے
میں چوری کے لئے تیار ہو جاتا ہوں
میں نے کوڑے کے ڈھیر پر ایک پاؤں دیکھ رکھا ہے
جو میرا نہیں ہے
مگر بہت خوبصورت ہے
اگلی آگ لگنے کے وقت اُسے اُٹھا لے جاؤں گا
اور اس کے بعد کچھ اور، کچھ اور۔

ایک دن میں اپنی مرضی کا
ایک پورا آدمی بناؤں گا

مجھے اس پورے آدمی کی فکر ہے
جو ایک دن بن جائے گا
اور مٹی کی کان میں مزدوری نہیں کرے گا

میں اس کے لئے مٹی چراؤں گا
اور تحقیق کروں گا
کان میں آگ کس طرح لگتی ہے
اور کان میں آگ لگاؤں گا
اور مٹی چراؤں گا

اتنی مٹی کہ اس آدمی کے لئے ایک مکان، ایک پانی انبار
کرنے کا کوزہ اور ایک چراغ بنا دوں

چراغ کے لئے آگ چراؤں گا
آگ چوری کرنے کی چیز نہیں ہے
مگر ایک نہ ایک ضرورت کے لئے ہر چیز چوری کی جا سکتی ہے
پھر اس آدمی کو میرے ساتھ رہنا گوارا ہو جائے گا
آدمی کے لئے اگر مکان ہو، پینے کے پانی کا انبار ہو اور چراغ
میں آگ ہو
تو اُسے کسی کے ساتھ بھی رہنا گوارا ہو سکتا ہے
میں اسے اپنی روٹی میں شریک کروں گا
اور اگر روٹیاں کم پڑیں
تو روٹیاں چراؤں گا
ویسے بھی نگران ان مزدوروں کو جو کان میں شور نہیں مچاتے
بچی کھچی روٹیاں دیتے رہتے ہیں۔

میں نے مٹی کی کان میں کبھی کوئی لفظ نہیں بولا
اور اس سے باہر بھی نہیں
میں اپنے بنائے ہوئے آدمی کو اپنی زبان سکھاؤں گا
اور اس سے باتیں کروں گا
میں اس سے مٹی کی کان کی باتیں نہیں کروں گا
مجھے وہ لوگ پسند نہیں جو اپنے کام کاج کی باتیں گھر جا کر بھی
کرتے ہیں

میں اس سے باتیں کروں گا
گہرے پانیوں کے سفر کی
اور اگر میں اس کے سینے میں کوئی دھڑکنے والا دل چرا کر
لگا سکا

تو

اس سے محبت کی باتیں کروں گا
اس لڑکی کی جسے میں نے چاہا ہے
اور اس لڑکی کی جسے وہ چاہے گا

میں اس آدمی کو ہمیشہ اپنے ساتھ نہیں رکھوں گا
کسی بھی آدمی کو کوئی ہمیشہ اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا

میں اس میں سفر کا حوصلہ پیدا کروں گا
جہاں درخت مٹی میں پانی ڈالے بغیر نکل آتے ہیں
اور وہ ان بیجوں کو میرے لئے لے آئے گا۔
جن کے اُگنے کے لئے
پانی کی ضرورت نہیں ہوتی
میں روزانہ ایک ایک بیج
مٹی کی کان میں بوتا جاؤں گا
بوتا جاؤں گا
ایک دن کسی بھی بیج کے پھوٹنے کا موسم آجاتا ہے
مٹی کی کان میں بھی
مٹی کی کان میں میرا لگایا ہوا بیج پھوٹے گا
اور پودا نکلنا شروع ہو گا
میرے نگراں بہت پریشاں ہوں گے
انہوں نے کبھی کوئی درخت نہیں دیکھا ہے
وہ بہت وحشت زدہ ہوں گے اور بھاگیں گے
میں کسی بھی نگران کو بھاگتے دیکھ کر
اس کے ساتھ کان کے دوسرے دہانے کا پتہ لگا لوں گا

کسی بھی کان کا دوسرا دہانہ معلوم ہو جائے تو اس کی دہشت
نکل جاتی ہے

جب میری دہشت نکل جائے گی
میں آگ کی دیوار سے گزر کر
مٹی کی کان کو دور دور جا کر دیکھوں گا
اور ایک ویران گوشے میں
اُوپر کی طرف ایک سرنگ بناؤں گا
سرنگ ایسی جگہ بناؤں گا
جس کے اوپر
ایک دریا بہہ رہا ہو
مجھے ایک دریا چاہیے
میں وہ آدمی ہوں جس نے اپنا دریا بیچ کر
ایک پُل خریدا تھا
اور چاہا تھا کہ اپنی گذر اوقات
پُل کے محصول پر کرے
مگر بے دریا کے پُل سے کوئی گذرنے نہیں آیا

پھر میں نے پُل بیچ دیا
اور ایک ناؤ خرید لی
مگر بے دریا کی ناؤ کو کوئی سواری نہیں ملی

پھر میں نے ناؤ بیچ دی
اور مضبوط ڈوریوں والا جال خرید لیا

مگر بے دریا کے جال میں کوئی مچھلی نہیں پھنسی

پھر میں نے جال بیچ دیا
اور ایک چھتری خرید لی
اور بے دریا کی زمین پر مسافروں کو سایہ فراہم کر کے گزر
بسر کرتا
مگر دھیرے دھیرے مسافر آنے بند ہوتے گئے
اور ایک دن جب
سورج کا سایہ میری چھتری سے چھوٹا ہو گیا
میں نے چھتری بیچ دی
اور ایک روٹی خرید لی
کسی بھی تجارت میں یہ آخری سودا ہوتا ہے
ایک رات یا کئی راتوں کے بعد
جب وہ روٹی ختم ہو گئی
میں نے مزدوری کر لی

مزدوری مٹی کی کان میں ملی۔

سعیدالدین

## تنہائی کا مشغلہ

اپنے دوست کو خط لکھنا
اس کے باغیچے اور کیاریوں کا حال دریافت کرنا
اس کی جیپ، اور اُداسی کے بارے میں پوچھنا
اس نے کتنے خواب دیکھے
کتنے سفر کئے!
اپنے دوست کو خط لکھنا
اس کے دوست اور بہنوں کو موسیقی کے کیسٹ بھیجنا
اس سے خط میں تاخیر کا گلہ کرنا
اور اپنی ڈائری میں لکھی ہوئی
اس کی ایک پرانی بات یاد آنے پر
اپنی حیرانی اور مسرت کا اظہار کرنا
اب میں صحت یاب ہو گیا ہوں
اب جوتے خریدنے ساتھ چلیں گے
اور ایک جیسی شرٹ خریدیں گے
تمہارا دیا ہوا پین میرے ہاتھ میں ہے
اور یہ پیڈ بھی تم نے دو سال پہلے مجھے پارسل کیا تھا۔
اپنے دوست کو خط لکھنا
اور غم کی بات چھپا لینا
اُنھوں نے دوستوں اور فرضی پتوں پر بھیجے ہوئے خط
کہیں نہیں پہنچیں گے
اور گھر سے نکالے ہوئے دُکھ
تحقیر کا نشانہ بنیں گے۔

سارا شگفتہ

# رنگے ہوئے مکان

رنگے ہوئے مکانوں کے لوگ کہاں رہتے ہیں
راہ میں تو کئی راہیں رنگی ہوئی ہیں!
بلکہ کسی اَن دیکھے نے اپنی چالاکی سے بعض جگہ ایک ہی رنگ رنگا
ہوا ہے،

آؤ میں تمہیں پہلے بوجھ لوں
بتاؤ تمہارا کونسا رنگ ہے؟
مجھے بھی اَن دیکھے نے کئی رنگوں سے رنگا ہوا ہے ——
اب ذرا کائنات اُٹھا کر دیکھ
میں کیسا ہوں
میں تو تمہیں بھی کئی رنگوں میں دیکھ رہا ہوں
پھر کیوں تم رنگے ہوئے مکانوں کے لوگوں کا پتہ پوچھ رہے ہو ——
در اصل میں چور ہوں اور میرا کام رنگ چوری کرنا ہے
تم بھی مجھے خوب ملے! میں رنگ ہوں
اور لوگوں کی کینچلی چوری کرتا ہوں ——
اَن لوگوں کی تلاش میں نکلا اور غاروں کے رنگ چوری کرتا ہوں
تم بتاؤ یار رنگا —— میں غاروں کے رنگ چوری کر سکتا ہوں؟
"مجھ سے سچ پوچھو تو سب سے بڑا رنگ چور سورج ہے"
رنگے ہوئے مکانوں تک پہنچتے پہنچتے یہ تمہیں کئی رنگ دکھا جائے گا"
تم نے کتنے رنگ چوری کئے ہیں؟

نو،

شام ہو رہی ہے اور اس نے ہمارے چہرے چوری کرنے شروع
کر دیئے ہیں،
تم چھوٹے چور ہو ——
میں چھوٹا چور نہیں ہوں، ابھی ابھی نیلا رنگ چوری کر کے
آیا ہوں، سمندر میں غوطہ لگایا تو سمندر نے
میرے کپڑوں کا کوئی رنگ نہ چرایا مگر میرے
تھوڑے سے سانس اس نے چوری کر لئے تھے
معلوم ہوتا ہے یہ بھی چور ہے
تم نے کبھی مٹی میں غوطہ لگایا ہے؟
نہ بھلے آدمی ——
مٹی چوری کرنا بڑا مشکل کام ہے ——
مٹی میں اگر میں نے غوطہ لگایا!
اس نے میرے سارے سانس چوری کر لئے ہیں:
پھر یہ بندہ چور نہیں رہے گا ——

یار رنگا! تم کینچلی کس طرح چوری کرتے ہو؟

میں ہر وقت دوپہروں میں رہتا ہوں،
تو تمہیں معلوم ہے کہ دوپہروں کی کینچلی کس طرح تبدیل کرتا ہوں
زمینوں پہ میری زرد دھوپ نہ پھیلے تو زمین خود کینچلی بدل لیتی ہے
اور دریا پھر اس زمین سے بھاگتے نظر آتے ہیں
تم رنگ چور ہو اور میں رنگ:

رنگ چور! ہاں رنگ ——

دیکھنا آئینے میں ہماری آنکھیں ایک سی تو نہیں لگ رہیں

تمہارا بیڑہ غرق کبھی ہوا کو بھی شیشہ کہتے ہیں :

دیکھو!!

ہوا تیرے کپڑے بھی پکڑ رہی ہے اور میرے بھی!

کہیں یہ بھی تو چور نہیں ؟؟

رنگ چوری کرنے نکلے ہو کہ رنگ ہونے ——

دیکھو

جب سمندر پتھر کی سطح پہ آتا ہے سفید ہو جاتا ہے

اور ہوا جب پیڑوں پہ چڑھ ناچتی ہے ہری ہو جاتی ہے

اور آدمی جب روتا ہے نا! آنسوؤں میں ڈوب جاتا ہے ناں ——

اس وقت

تم آدمی کا کوئی رنگ چوری نہیں کر سکتے ——

پودوں کے رنگ چوری کرنے کا کوئی گر بتاؤ؟

جب زور کی ہوائیں چل رہی ہوں اور پودیں سفید ہوں

ناخن پوروں کو کریدتے ہوں

تم پودوں کے رنگ چوری کر سکتے ہو

آسمان کا رنگ سمندر میں کیسے اترا ——

میں رنگ ہوں اور تم رنگ چور :

اتنی باریکیاں میں تمہیں بتا دوں تو خود چوری ہو جاؤں ——

اس وقت ہم ایک ہی پتھر پہ بیٹھے ہیں ——

تو دیکھو ذرا پتھر کا رنگ دیکھو ——

چوری کرو پہلے اس پتھر کا رنگ بھی

اس کو جتنا توڑتا ہوں

ایک ہی رنگ کی آواز دیتا ہے یہ پتھر ——

اور رنگ چور رہ جاتا ہے

بلکہ میرا رنگ یہ پتھر چوری کر لیتے ہیں

چلو پانیوں کی طرف چلتے ہیں

پانی میں خنجر کی تیز دھار چلاتا ہوں

پانی پھر بھی اپنا رنگ نہیں بدلتا ——

کہیں یہ بھی روتا ہوا آدمی تو نہیں ہے ——

چلو پھولوں کے پاس چلتے ہیں —— ہاں میں رنگ کہہ رہا ہوں ——

پھول توڑتے توڑتے شام پڑ جاتی ہے ——

دیکھا!

جو پھول تم نے دوپہر میں توڑا تھا وہ زرد پڑ گیا ہے

ٹوٹے پھول کی گفتگو بھی خنجر ہو گئی ہے۔

مگر جو پھول ہم نے شام میں توڑے تھے

انہیں رات کے اندھیروں نے کالا کر دیا ہے

چلو اب سرنگوں کے رنگ چوری کرتے ہیں

دونوں غار میں چلے جاتے ہیں ——

آہستہ آہستہ چلو ہماری آہٹ پا کر کوئی رنگ چھپ نہ جائے

میں رنگ جو تمہارے ساتھ ہوں

غار میں پتھر ٹکراتے ہیں اور آگ لگ جاتی ہے
یہ کیا ہوا ــــ
میں رنگ خود پتھر ہوا کھڑا ہوں

یہ آگ بجھ نہیں سکتی ــــ
آگ بجھ گئی تو تم چور نہیں رہو گے
غار کے اندھیرے روشنیاں چوری کرتے ہیں
یہ خود چھپے ہوتے ہیں ــــ
میں نے چوری نہ کی تو میرا گھر بے انگارہ رہ جائے گا!
میری روٹی کا رنگ سفید پڑ جائے گا ــــ
اور میری بھوک رنگ رنگ پکائے گی ــــ
مجھے ٹوٹے پھولوں کے پاس لے جائے گی ــــ
اور پھول جانتے ہیں کہ میں چور ہوں ــــ

تم کہاں سے چلے تھے ؟
اپنے گھر سے
تمہارے مکان کا رنگ کیسا ہے ــــ

میں نے سمندر کا رنگ چوری کیا تھا تو فرش بنایا تھا ــــ

آنکھوں کے رنگ چراتے تھے تو دیواریں بنائیں تھیں!

سورج کا رنگ چُرایا تھا تو روشندان بنایا تھا ــــ
بھوک کا رنگ چُرایا تھا تو چولہا بنایا تھا ــــ
چغلی کا رنگ چُرایا تھا تو کپڑے سلوائے تھے

جب آگ کا رنگ چوری کیا
تو میری روٹی کچی رہ گئی
تو میں رنگ چوری کرنے گھر سے نکل کھڑا ہوا ــــ
تو راہ میں تم مجھے مل گئے

یہ تو اپنی کینچلی
جب تم چاند کا رنگ چوری کر رہے تھے اس وقت چرائی تھی!
یہ لو اپنی کینچلی اور یاد رکھنا
جب آنکھوں کی کینچلی چوری ہو جاتی ہے
تو انساں ایسے ہی رنگ چوری کرنے نکل کھڑا ہوتا ہے

آج سے نہ تم رنگ چوری کرنا
اور
نہ میں کینچلی چوری کروں گا
نہیں تو پیڑ سانپ بن جائیں گے اور سمندر اُن کی کینچلی!
دونوں غار میں سے نکل جاتے ہیں
اور پتھر خاموش ہو جاتے ہیں
دیئے کی لو پھر خلا کو جلانا شروع کر دیتی ہے ــــ

مارچ ۱۹۷۹ء

اختر امان

## دشمنوں کے نام

میں جانتا ہوں کہ میری دشمن
ہوائیں
زہریلی ناگنوں کی طرح سے پھنکارتی پھر
رہی ہیں

میں جانتا ہوں کہ میرے دشمن
نجانے کب سے
اُٹھا کے ہاتھوں میں بھاری پتھر کھڑے
ہوئے ہیں
وہ منتظر ہیں
کہ میرے پاؤں جو لڑکھڑائیں تو پل
پڑیں وہ
سجا کے ماتھوں پہ خون میرا
وہ فتح و نصرت کا دن منائیں

میں جانتا ہوں کہ میرے دشمن
کمین گاہوں سے سب نکل کر
حصار باندھے کھڑے ہوئے ہیں
مگر
میں مثلِ شجر ہوں، جس کی جڑیں زمیں میں
اُتر چکی ہیں
ہوائیں گر میرے سوکھے، بے جان، زرد پتے
اُڑا بھی لے جائیں تو بھی کیا ہے
بدلتے موسم کی زَد میں رہ کر بھی میں ہمیشہ
ہرا رہا ہوں
مری جڑیں تو زمیں میں ہیں
جہاں پہ پہلے کھڑا ہوا تھا
وہیں پہ اب بھی کھڑا ہوا ہوں
وہ منتظر ہیں

دسمبر ۱۹۷۷ء

شائستہ حبیب

## سفر جان سے گزرنے کا

دھند اور سردی کی گود میں کانپتی صبح
اکیلی راتوں اور بھیگے لمحوں کے گیت
اور بے چاری جان
اتنے قرضے کون اُتارے گا
دل پتہ پتہ ہو کر سارے آنگن میں ہوا کے ساتھ
آنکھ مچولی کھیل رہا ہے
اوس میں ڈوبے ہونٹوں پر چپ کی انگلیاں
سرگوشیوں میں باتیں ملاقاتیں
ڈری ڈری سہمی سی آنکھیں کمرے کی ہر دیوار
کے ساتھ سجی ہو
کہانیاں لمبی عمروں کی اور تنہا رہنے کی
آنے کی اور پھر کسی دور سفر پر نکل جانے کی
میری پوشاک پر اپنی ڈائری لکھتی ہیں ——
چلو رخصت کا وقت قریب ہے ——
سفر کے سامان میں کیا کیا چیزیں رکھوں، کیا
چھوڑ جاؤں
کہ ہر سفر میں ایک خاص حد تک وزن
لے جانے کی اجازت ہے
پھر بھی سب کچھ لے جانا پڑے گا
صرف آنکھیں چھوڑ جاؤں گی
کہ اس سفر میں صلیب پر ٹنگی آنکھوں کا
بوجھ اب اُٹھائے نہیں اُٹھتا۔

مئی ۱۹۷۸ء

شاہین مفتی

# نیا جنم

دن کو شب تک لاتے لاتے
تن کی عمارت ملبے کا اِک ڈھیر ہوئی ہے
اینٹیں گارا
پتھر چونا
در دروازے
چھت کی کڑیاں
ساری کی ساری
تتر بتر
نیند سے کہہ دو
جلد آئے
خواب حسیں کا
تحفہ لائے
ویرانے ملبے سے
تخلیق کرے
اُس کو
جس نے
کل بھی زندہ رہنا ہے
تتر بتر ہو جانے کا دکھ سہنا ہے۔

اگست ۸۶ء

فرحت نواز

# "ہجرت کر جاؤ"

سرداروں کی یورش
ہر پل بڑھتی جائے
میرے چاہنے والے
سب ہی تیری جان کے دشمن ٹھہرے
میری مانو
میری من بستی سے تم ہجرت کر جاؤ۔
خدا کرے کوئی امن محبت
ساتھ تمہارے کیسے ہو لوں
بعد میں آنے کا وعدہ بھی کر نہیں سکتی
میرے پاس امانتیں ہیں جو
کس کو سونپوں
کوئی بھی ذمہ لے نہیں سکتا
ظاہر ہے اپنے بستر پہ
مجھ کو خود ہی سونا ہوگا۔

اگست ۸۶ء

ذی شان ساحل

# یہ محبت کی نظم ہے

یہ محبت کی نظم ہے
اُسے پانی پر لکھنا چاہیے
یا اسے کسی کبوتر کے پیروں سے
باندھ کے اُڑا دینا چاہیے
یا اسے کسی خرگوش کو
یاد کرا دینا چاہیے
یا پھر کسی پُرانے پیانو میں
چھپا دینا چاہیے —

یہ محبت کی نظم ہے
اسے بالکنی میں نہیں پڑھنا چاہیے
اور کھلے آسمان کے نیچے یاد نہیں کرنا چاہیے
اسے بارش میں نہیں بھولنا چاہیے
اور آنکھوں سے زیادہ قریب
نہیں رکھنا چاہیے —

اگست ۸۶ء

ابرار احمد

## نم ناک صداؤں میں بہنے والی

وہ، تخلیق کی گود میں سسکیاں لیتی ہے،
اس کی بہکی، نم سانسوں میں
ننھے مُنے بچوں کی، آنکھیں اُگی ہیں،
اور لرزتے ہونٹوں سے
جو لفظ، رہا ہوتے ہیں،
بندے، بن جاتے ہیں۔؟؟
اس کی شکستہ باہنوں میں
ان دیکھے چہرے، کھیلتے ہیں،
سرما کے موسم جیسی،
اُس کے خوابوں کی چادر، سورج مانگ رہی ہے،
اس کے ہاتھوں میں
ریشم کے موزے ہیں۔
جن میں اس کی انگلیاں
نرمی، اور گداز سی لذت میں
چلتی رہتی ہیں،
(قدموں میں
اک پیاس کی بوندیں
سہمی آوازوں کا پانی)
میں ___،
یخ بستہ خون میں اس کی آہٹ
سنتا رہتا ہوں
لیکن اک دن وہ،
میری آنکھوں میں، ٹھنڈی ہو جائے گی!!

جون ۸۷ء

زاہد مسعود

## شہر کے اندر ایک نظم

ہم نہیں جانتے کہ ہم
بس سٹاپوں، ریلوے انتظار گاہوں اور
راشن ڈپوؤں پر
ایک دوسرے کے خواب چراتے ہیں
ہم جانتے ہیں
کہ ہم
باغوں، پارکوں اور تفریح گاہوں میں
اپنے دُکھ بکھیر آتے ہیں
ہم میں سے کچھ
سبز پتوں پر سوئی شبنم کو قطرہ قطرہ سمیٹتے ہیں
اور کچھ
شاموں کو درختوں کی چھاؤں میں لپیٹ کر دفن
کر دیتے ہیں

ہم
صرف ایک بار کسی کو تلاش کرتے ہیں
اور
ہر بار اپنے آپ کو کھو دیتے ہیں۔

فروری ۸۷ء

ماہ طلعت زیدی

## مری زندگی کا بہاؤ، روشن ہے

مرے خواب کی فصل
موسموں کے پرندے اڑانوں میں مصروف ہیں
میری آنکھوں پہ نیندوں سے مدہوش راتوں
کی شبنم بچی ہے
بدن میرا ٹھنڈی ہواؤں کے لمسِ گریزاں کی
آہٹ پہ، لہروں میں بٹتا، فضا میں بکھرتا ہے
اور میری سوچوں پہ گلریز لمحوں کی بارش
اُترتی ہے___
لمحے کہ جن سے میں مرتی ہوں، جیتی ہوں
سوچیں جو میری طرح بانکپن کا ابد ڈھونڈتی ہیں
___جو یادوں کی مٹی سے نم مانگتی ہیں
انہی رس بھرے، ڈوبتے اور اُبھرتے
دنوں کے اُجالوں کی مقروض ___!

دسمبر ۷۹ء

گوہر سلطانہ

# نظم

چوڑیاں اچھی نہیں ہوتیں۔
ہاتھوں کو نازک بناتی ہیں
اور ٹوٹ جائیں تو
زخمی کرتی ہیں
شیشے میں سانپ بند ہوتے ہیں
لڑکیاں اپنی ٹوکریوں میں
چائے کی پتی کی طرح
شیشے چنتی ہیں
ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیاں
دُکھ اُن کی آنکھوں میں ہنستا ہے
اور خوشی ان کے چہرے پر روتی ہے
اور آنسو
کسی دل پر انگارے کی طرح گرتے ہیں
چوڑیاں بستر پہ ٹوٹ جاتی ہیں
کنوارپن کے خوابوں کی طرح
جھولے کی رسی پہ لپٹی موتیے کی بیل
کِھلنے کی خوشبو دینے سے پہلے
خون رنگ ہو جاتی ہے
چوڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔
اور کلائی کی رگوں میں اُتر کر
لہو کے سفر ہیں
اور دل کے کسی کونے میں جا کر
بیٹھ جاتی ہیں
چوڑیاں اچھی نہیں ہوتیں
ٹوٹ جائیں تو رُلاتی ہیں
میرا دل ایسی ہی اَن گنت چوڑیوں کی
لہو رنگ قبر ہے
میں نوکِ قلم سے
دل میں چبھے کانچ کے ٹکڑوں کو
کاغذ پہ لا رکھتی ہوں
میری چوڑیاں ٹوٹ جائیں تو
میں روتی نہیں، دل
میرے عہد کی لڑکیاں
کانچ کا نوکیلا زہر دل میں اتار کر بھی
روتی نہیں ہیں
وہ ہنستی ہیں ہمیشہ ہیں
اور نظمیں لکھتی ہیں۔

دسمبر ۱۹۸۶

محمد حنیف

# ہم چڑیاں ہیں

ہم فقیر ہیں
جو قریہ قریہ گھوم کر چونگے وصول کرتے ہیں
جس طرح چڑیوں کو رزق کی تلاش میں روزانہ
نکلنا پڑتا ہے۔
اور دانہ دانہ چگنا پڑتا ہے
ہمارے والدین نے ہمارے لئے غلّے کے گودام
نہیں چھوڑے
اور نہ ہی پٹواریوں کے رجسٹروں میں ہمارے نام ہیں
ہم محنت کش ہیں
کما کر کھاتے ہیں
جس روز بارش برستی ہے
ہم اور ہمارے بچے اُداس ہو جاتے ہیں
وہ کھیل نہیں سکتے
اور ہمیں دکاندار سے دال، آٹا اُدھار لانا پڑتا ہے
ہم چڑیاں ہیں
ہم نے انسانوں کا بہروپ بھر رکھا ہے

جنوری ۱۹۸۷

ابوذر

## کچھ بولو

اَب آئے ہو تو کچھ لمحے ہمارے ساتھ بیٹھو
اور پھر واپس چلے جانا
وفا کرنا نبھانا بھول جانا بے وفا ہونا
ہزاروں سلسلے ہیں۔ اس جہاں میں جان کچھ بولو
کوئی قصہ کسی گزری صدی کا
کوئی جھگڑا سہیلی سے
کوئی شکوہ کسی کے بھول جانے کا جو مجھ سے ہو۔
کسی لڑکی کے بارے میں جو کھاتی ہو نہ پیتی ہو نہ سوتی ہو
جہاں رہتی ہو وہ اُس آدھ کھلی کھڑکی کے بارے میں
کسی ساون کی بارش میں کسی عاشق کسی معشوق کی
بھیگی ملاقاتوں کے بارے میں
میرے محبوب کچھ بولو!
کسی بھی جنگ کے ناطے دھماکوں کی مذمت ہو
کسی دشمن کے نرغے میں کسی بے بس حسینہ کی
جو میری کچھ نہ لگتی ہو، تمہاری کچھ نہ لگتی
کسی ٹوٹے ہوئے اجڑے ہوئے گھر کی
ہزاروں سلسلے ہیں اس جہاں میں جان کچھ بولو!
سناتے جاؤ اک اک کر کے سب باتیں
میرے محبوب کچھ بولو!
تمہارے رابطے سے میں بہت لوگوں سے ملنا چاہتا ہوں۔

سلیم خلجی

## نظم

لوگ تازہ ہوا میں سانس لیتے ہیں
اس لئے کہ تازہ ہوا سب کے لئے ہے
لوگ بہار سے لطف اندوز ہوتے ہیں
اس لئے کہ موسم سب کے لئے ہے
لوگ آسمان اوڑھ کر سوتے ہیں
اس لئے کہ آسمان سب کے لئے ہے
لوگ زمین پر آباد ہیں
اس لئے کہ زمین سب کے لئے ہے
لوگ کرنوں سے خیال بُنتے ہیں
اس لئے کہ روشنی سب کے لئے ہے

لوگ زندہ رہنا چاہتے ہیں
لیکن زندگی سب کے لئے کیوں نہیں ہے۔




فروری ۱۹۸۷ء

## عبدالوہاب البیتی ، بلند الحیدری

احمد ندیم قاسمی

### ہم جلاوطن کیوں ہیں؟

پناہ گزیں پوچھتے ہیں
ہم چُپ چاپ
کیوں مرجاتے ہیں ؟
میرے پاس ایک گھر تھا .
اور میرے پاس .....
اور یہاں مَیں ہوں کہ
نہ دل ہے ، نہ ہی شعلۂ آواز
لیکن ماتم کا سلسلہ جاری ہے
ہم جلا وطن کیوں ہیں ؟
ہم چُپ چاپ کیوں مرجاتے ہیں ؟
ہم سب رو کیوں رہے ہیں ؟
ہم آگ کے دریا پر
کانٹوں کی زمین پر
چلتے رہے
ہم سب کے خدا! ہم سب
ملک کے بغیر محبّت کے بغیر کیوں ہیں ؟
ہم مر رہے ہیں
دہشت سے مر رہے ہیں
ہم کیوں جلا وطن ہیں ؟
اے ہم سب کے خدا !

### پارسل

مَیں دروازے کے پیچھے پیدا ہوا
مَیں دروازے کے پیچھے پلا بڑھا
اور دروازے کے پیچھے ہی
محبّت میرے جسم میں سرایت کرتی رہی
بہت دفعہ ، مرے لہُو!
تم زمین پر بکھرے
عدم وجود میں موجود ہو کر
مَیں ہی قاتل تھا
اور مَیں ہی مقتول تھا ، مَیں زخم بھی تھا
اور مکھی بھی
بہت مرتبہ مَیں نے
اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا
اور سویا ، لیکن کوئی خواب نہیں دیکھا
کوئی سوال نہیں پوچھا
کوئی جواب نہیں ڈھونڈا
کیوں کہ مَیں ہوں ..... !

پریشان مت ہو
بھیڑیئے واپس آجائیں گے
بھیڑیئے واپس آجائیں گے
اور دوسری مرتبہ
اور تیسری مرتبہ
اور چوتھی مرتبہ
دیوار کے پیچھے انسان پیدا ہوتا رہے گا
اور ہم ..... !
پریشان نہ ہو ..... !
ہم ایک چھوٹی سی تقریب میں اپنے
عدم وجود میں زندہ رہیں گے

مارچ ۸۲ء

نزار قبانی
منو بھائی

# ان کی کیا قدر جن کی زبانیں بند ہیں

خبر یہ لایا ہوں میرے دوست
کہ پرانی زبان مرگئی ہے
اور پرانی کتابیں بھی
اور ہماری باتیں
کثرتِ استعمال سے بگڑ جانے والے جوتوں
کی طرح
جگہ جگہ سے پھٹ چکی ہیں۔
وہ الفاظ بھی مرگئے ہیں
جو تحقیر، تہمت اور توہین کا ذریعۂ اظہار
ہے۔
خبر یہ لایا ہوں
کہ ہماری سوچ کا وہ انداز بھی مرگیا ہے
ختم ہوگیا ہے۔
جو ہماری شکست کا سبب بنا۔
شاعری کا ذائقہ ہمارے منہ میں تلخ ہے
ہماری آنکھوں میں چبھتی ہیں
سنوری ہوئی زلفیں
جھلملاتے نقاب، راتیں در جسم
تمام نظارے تکلیف دیتے ہیں۔
میرے دُکھی وطن!
تُو نے رات ہی رات میں مجھے،
جو محبت اور جدائی کے گیت گاتا تھا،
لہو میں قلم ڈبونے والا شاعر بنا دیا
جذبات ان صفحات سے بہت آگے نکل
گئے ہیں۔

ہم اپنی شاعری پر نادم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔
اگر ہم جنگ ہار گئے ہیں تو یہ کوئی حیرت کی
بات نہیں۔
کیوں کہ ہم اس جنگ میں
اپنی خداداد مشرقی خطابت
اور اس نعرہ بازی کے ساتھ شریک ہوئے تھے،
جو ایک مکھی بھی نہیں مار سکتی۔
ہم اس جنگ کے میدان میں طبلے اور رباب
کی منطق کے ساتھ اُترے تھے۔
ہمارے المیہ کا راز یہ ہے کہ
ہمارا شعور ہماری آوازوں سے زیادہ
اور ہماری تلواریں ہمارے قد سے لمبی ہیں۔
اس قضیے کا خلاصہ
ایک جملے میں یوں ہے کہ
ہم نے مہذب نقاب پہن رکھے ہیں
اور ہماری رُوحیں دقیانوسی ہیں
نفیری اور بربط سے
کوئی جنگ جیتی نہیں جا سکتی۔
ہماری فی البدیہہ تقریروں کی برجستگی کا خمیازہ
ہے کہ ہمارے سامنے پچاس ہزار نئے خیمے پھیلا
دیئے گئے ہیں۔
حالات کو الزام نہ دو۔

آسمانوں پر بھی تہمت نہ لگاؤ کہ وہ تمہیں چھوڑ
بیٹھے ہیں۔
کیوں کہ خدا جسے چاہے فتح سے ہمکنار کر دے۔
کوئی لوہار نہیں کہ تمہارے لیے تلوار بنائے،
صبح خبریں سنتے وقت مجھے سخت تکلیف ہوتی ہے۔
دُکھ ہوتا ہے، جب میں کتوں کو بھونکتے سُنتا
ہوں۔
یہودیوں نے ہماری سرحدیں عبور نہیں کیں۔
وہ تو ہماری خامیوں اور غلطیوں
سوراخوں سے چیونٹیوں کی طرح در آئے ہیں۔
پانچ ہزار سال ہم نے اندھیرے تہہ خانوں میں
گزار دیئے ہیں۔
ہماری داڑھیاں بڑھی ہوئی ہیں
دوستو!
دروازے توڑنے کی کوشش کرو۔
لباس کو دھونے اور خیالات کو نہلانے کی
سعی کرو۔
دوستو!
کوئی کتاب پڑھو
کوئی کتاب لکھو۔

انگور۔ اناد اور انفاظا کاشت کر د۔
برف اور دھند کی منزلوں کے لئے بادبان
کھولو ، کہ
تہہ خانوں سے اوپر کی دنیا
تمہیں نہیں جانتی۔
تمہیں بھیڑوں کی نسل کی چیزیں سمجھتی ہے۔
ہماری جلدیں بے حس ہو چکی ہیں
ذہنوں کا دیوالیہ پٹ چکا ہے
ہماری زندگی شطرنج ، توہمات اور غنودگی
سے عبادت ہے۔
کیا ہم دنیا کی بہترین قوم ہیں ؟
تیل جس سے ہمارے صحرا لبریز ہیں
آتش ناک بھالا بنایا جا سکتا ہے
مگر شرفائے قریش ، عمائدینِ عوث
اور معززین نژاد کو شرم آنی چاہیئے۔
کہ اسے لونڈیوں کے قدموں میں بہا دیا گیا۔
ہم جنگلوں میں کمندیں دبائے
گلیوں میں دندناتے پھرتے ہیں
بلا سوچے سمجھے چیختے پھرتے ہیں۔
کھڑکیاں اور دروازے توڑتے ہیں۔
مینڈکوں کی تعریف میں مینڈکوں کی طرح
ٹراتے پھرتے ہیں۔
آرام کے لئے مسجدوں میں بیٹھے رہتے ہیں
شعر گھڑتے ہیں اور محاورے بولتے ہیں۔
اور اللہ میاں سے دعا کرتے ہیں کہ وہ
ہمارے دشمن کو نیست و نابود کر دے۔
اگر جان کی امان پاؤں
اور سلطان سے مل سکوں
تو کہوں عالی جاہ !
آپ کے شکاری کتوں نے میرا لباس تار تار
کر دیا ہے۔
آپ کے کتے ہر وقت میرا تعاقب کرتے ہیں۔
ان کی آنکھیں ان کے ناک
ان کے قدم میرا پیچھا کرتے ہیں
جیسے کہ میں ان کی منزل ہوں
اور وہ میرا نصیب
انہوں نے میری بیوی پر سوالات کی بوچھاڑ
کر دی ہے۔
اور میرے دوستوں کے نام اور پتے لکھ کر لئے
گئے ہیں۔
سلطانِ عالی شان !
میں آپ کی بہری دیواروں تک آیا ہوں۔
اس امید پر کہ اپنے غم اور دکھ کا اظہار کر سکوں
مگر آپ کے سپاہیوں نے
میرے ساتھ یہ شرمناک سلوک کیا۔
کہ مجھے میرے ہی جوتے سے مارا ہے۔
عالی جاہ ! میرے سلطان !
ہماری نصف آبادی کے منہ میں زبان نہیں ہے
اور کیا قدر ہے ان لوگوں کی کہ جن کے ہونٹ
سلے ہوں۔
ہماری نصف آبادی کیڑوں ، مکوڑوں اور
چوہوں کی طرح
نہاں خانوں میں قید ہے۔
اور جناب کیا کوئی قوم آزادیٔ اظہار کے بغیر
زندہ رہ سکتی ہے۔
اگر ان کرپٹ ہیجڑوں کے ظلم سے بچ کر
سلطان کے حضور پہنچ پاؤں تو کہوں عالی جاہ !
آپ دو مرتبہ جنگ ہار چکے ہیں
کیونکہ آپ انسانی حقوق سے بے بہرہ ہیں۔
اگر ہم اتحاد کو صحرا میں دفن نہ کرتے
اگر ہم اس کے نازک جسم کو بھالوں سے چھلنی نہ
کرتے !
اگر ہم اتحاد کو آنکھوں سے لگا کر رکھتے
تو آج ہمارے جسم وحشی کتوں کے ناخنوں اور
دانتوں میں نہ ہوتے۔
ہمیں ایک نا ملامتی نسل کی ضرورت ہے
وہ نسل جو افق میں ہل چلا سکے
جو تاریخ کو اس کی جڑوں سے اکھاڑ سکے
ہمارے افکار کی بنیادیں ہلا سکے۔
ہمیں ایک نئی قسم کی نسل چاہیئے
جو کبھی کسی کو معاف نہ کرے
غلطیوں سے کسی حالت میں بھی چشم پوشی نہ کرے
جو کبھی نہ جھکے اور جسے دنیاوی مصلحتوں سے کوئی
واسطہ نہ ہو۔
ہمیں ایک پوری نسل چاہیئے رہنماؤں کی ، عظیم

## نازک ملائکہ

احسن علی خاں

لوگوں کی،

بچو!

بحرِ اوقیانوس سے خلیج عرب تک پھیلے ہوئے

بچو!

تم گندم کی بالیوں کی طرح ہماری تمنا ہو۔

تم وہ نسل ہو جو زنجیریں توڑے گی

جو ہمارے سروں کی افیون تلف کرے گی

ہماری خوش فہمیوں اور واہموں کو ختم کریگی۔

بچو!

تم معصوم و پرخلوص ہو،

شبنم کے موتیوں اور برف کے گالوں کی طرح

صاف اور پاکیزہ!

ہماری شکست خوردہ نسل کی تقلید نہ کرو۔

کہ ہم ناکام ہیں

ہم بالکل حقیر ہیں۔ تربوز کے چھلکے کی طرح

پرانے جوتوں کی طرح بوسیدہ ہیں۔

ہماری تاریخ نہ پڑھو،

ہمارے نقش قدم پر نہ چلو،

ہمارے خیالات پر کان نہ دھرو۔

ہم بیماروں کی، خوفزدہ لوگوں کی،

دھوکہ بازوں اور بازی گروں کی نسل نہیں،

بچو!

تم بہار کی بارش ہو ــــ

اُمید کی کونپلیں ہو ــــ

ہماری بنجر زمینوں میں زرخیزی کے بیج ہو ــــ

تم ہی وہ نسل ہو جو شکست کو فتح میں تبدیل کریگی۔

مارچ ۶۸۷

## نیا سال

نئے سال، ہمارے گھروں میں نہ آؤ

ہم تو عالم ارواح کی صدائے بازگشت ہیں

لوگوں نے ہمیں چھوڑ دیا ہے

رات اور ماضی ہمارے ہاتھوں سے چھوٹ

گئے ہیں

ہمیں تقدیر نے بھلا دیا ہے۔

ہمارے باطن میں آرزوؤں اور اُمیدوں نے

دم توڑ دیا ہے۔

نہ ہمارے پاس یادیں ہیں نہ خواب

ہمارے خاموش چہروں پر نہ رنگ ہے، نہ

چمک۔ ہم وقت سے کترا کر عدم میں چلے

گئے ہیں۔

اور ہمیں پچھتاوے کے ڈنک کا احساس تک

نہیں ہے، ہم تو آرام دہ محلوں میں جیئے جا

رہے ہیں۔

نئے سال

آگے بڑھ جاؤ

ہمارے جاگنے کی کوئی توقع نہیں

ہماری رگیں تنکے بن چکی ہیں

ہمارے خون میں طیش کی لہریں نہیں اُٹھتیں

کون کہتا ہے کہ روح (بم کی طرح) دھماکے

کے ساتھ پھٹ سکتی ہے؟

کاش کہ ہم مرجاتے اور قبریں ہمیں قبول

نہ کرتیں۔

کاش کہ ہم وقت کو سالوں سے ناپ سکتے۔

کاش ہمیں معلوم ہوتا کہ کسی جگہ (ملک)

سے تعلق رکھنے کے کیا معنی ہیں۔

کاش ہمیں دیوانگی سے ڈر لگتا

کاش کہ خانہ بدوشی ہماری زندگی میں

خلل ڈالتی۔

کاش کہ ہم اس طرح مرتے جیسے کہ اور

لوگ مرتے ہیں۔

نومبر ۶۸۶

توفیق زیاد (فلسطین)
سید سجاد رضوی

# ہم یہاں باقی ہیں اور باقی رہیں گے

کتنا آسان ہے کہ فیلِ مست کو سوئی کے
ناکے سے گزار دو۔
کہکشاں کی وسعتوں میں تم شکارِ ماہیٔ
بریاں کر دو
یا چلاؤ ہل سمندر میں،
مگر مجھ کو کرو آمادۂ شعر و سخن۔
یہ سبھی کچھ عین ممکن بھی ہے، اور آساں
بھی ہے۔

ہاں مگر یہ بات ممکن ہو نہیں سکتی کہ تم
سوچ کی چنگاریوں کو
اپنے جور و ظلم و استبداد سے ناپید کر دو،
منحرف کر دو ہمیں اس راہ سے جو ہم نے
کی ہے اختیار
یہ سبھی کچھ غیر ممکن ہے کہ ہم سے غیر ممکن
بیسیوں انساں یہاں موجود ہیں
اکّر، تلّہ، الجلیل، اللّد میں
ہم یہاں باقی ہیں اور باقی رہیں گے
ہم یہاں باقی رہیں گے مثلِ دیوارِ بکا
اور تمہارے حلق میں شیشے کے ٹکڑے بن کے
آنکھوں میں تمہاری آگ کا نشتر لگا کر
اور تمہارے سینۂ پُرکیں پہ پتھر کی طرح
جم کر یہاں باقی ہیں

ہم باقی رہیں گے
ہم یہاں باقی ہیں اور باقی رہیں گے
ہوٹلوں میں کام کر کے
اہلِ ثروت کے لیے جامِ مئے رنگیں سجا کر
فرش دھو کر
ہم جئیں گے
اور تمہارے منہ سے لقمے چھین کر
اپنے بچوں کو کھلائیں گے کہ وہ جیتے رہیں۔
زندہ رہیں، باقی رہیں۔
اور تمہارے سینۂ پُرکیں پہ ہر دم مونگ دل کر
ہم یہاں باقی ہیں اور باقی رہیں گے۔

بھوک لگتی ہے تو لگتی ہی رہے
جسم ننگا ہے تو ننگا ہی رہے
اپنی للکاریں سلامت ہی رہیں گی
اپنے نعرے بھی جلوسوں میں رہیں گے سربلند
شعر بھی پڑھتے رہیں گے
گیت بھی گاتے رہیں گے
اور تمہارے کوچہ و بازار میں
غیظ و غضب کی آگ بھڑکاتے رہیں گے
قید بھی ہوں گے
ہمارے جسم کوڑوں کے نشاں لے کر
خیابان وفا میں رقص بھی کرتے رہیں گے

ہم تمہارے ظلم و جور و قید و استبداد کے
باوصف
اپنے بچوں کو اک ایسی نسل کی صورت میں ڈھالیں گے
جو تمہارے جسم و جاں کو ہر گھڑی، ہر لحظہ،
ہر دم آتشِ نفرت میں بھونا ہی کرے گی
اور نئی نسلوں کو یہ تلقین کرے گی۔
"انتقام و انتقام و انتقام و انتقام"
ہم یہاں موجود ہیں،
باقی ہیں اور باقی رہیں گے۔

جو تمہارے جی میں آئے سو کرو
ہم یہاں باقی ہیں اور باقی رہیں گے
ہم یہاں زیتون اور انجیر کے سایوں کی نگرانی
کریں گے
اور اپنے فکر کے پودے لگاتے ہی رہیں گے
برف کی ٹھنڈک نہاں اعصاب میں
آتشیں شعلے دلوں میں نعرہ زن
ہوں اگر پیاسے تو پتھر کو نچوڑیں اور خون اس
کا پئیں۔
بھوک کی حالت میں کیچڑ کھائیں اور زندہ رہیں
باقی رہیں ــــ جائیں نہیں

محمود درویش
محمد کاظم

پاک و طاہر خون کی قربانیاں دے کر
یہاں باقی ہیں اور باقی رہیں گے
اپنا ماضی بھی یہیں تھا،
حال بھی اپنا یہیں ہے
اور مستقبل ــــ یہیں ہوگا، یہیں ہوگا
ہم یہاں باقی ہیں اور باقی رہیں گے
الرّملہ، الجلیل، اللد میں
موجود ہیں۔ باقی ہیں اور باقی رہیں گے۔

اے نہالِ زندگانی کی جڑو، زندہ رہو،
زندہ رہو!
اس زمیں کے سینے میں گم ہو کے تابندہ رہو
خود کو ان گہرائیوں میں کھو کے پائندہ رہو!
اے جفا کیشو، ستم رانو!
تمہارے حق میں بہتر ہے کہ تم
اپنے کرتوتوں پہ ڈالو اک نظر
پیشتر اس کے کہ ہو سیلاب کا سر سے گزر
ہر عمل کی اک جزا ہے۔ ہر گنہ کی اک سزا
کہہ رہی ہے تم سے دستورِ زمانہ کی کتاب
جاؤ، خود پڑھ لو کہ پہچانو صواب و ناصواب
اور یہ جانو کہ ہم سے غیر ممکن بیسیوں انسان
یہاں باقی ہیں اور باقی رہیں گے
الرّملہ، الجلیل، اللد میں
زندہ و پائندہ ہیں باقی ہیں اور باقی رہیں گے

مئی ۷۷ء

## آرزوؤں کے بارے میں

مجھ سے یہ مت کہو
اے کاش میں الجزائر میں ایک نانبائی ہوتا
اور انقلابیوں کے ساتھ مل کر بغاوت کے
گیت گاتا
مجھ سے یہ مت کہو
کہ اے کاش میں ملکِ یمن میں بھیڑوں کا
چرواہا ہوتا، اور زمانے کے مدّ و جزر کے نغمے گاتا۔
یہ بھی مت کہو
کہ میں ہوانا کے قہوہ خانے میں ایک بیرا ہوتا
اور مظلوموں کی فتح و نصرت کی تمنا میں کرتا
یہ مت کہو
اے کاش میں اسوان میں بوجھ اٹھانے والا
ایک محنت کش ہوتا۔
اور پتھروں اور چٹانوں کو اپنے گیت سناتا

اے میرے دوست:
نیل کبھی وولگا میں جا کے نہیں گرے گا
اور نہ کبھی اُردن اور کانگو کے پانی فرات میں
آ ملیں گے
ہر دریا کا اپنا منبع ہوتا ہے، اپنی راہ، اور
اپنی زیست
اے دوست! ...۔ ہماری زمین ایسی بانجھ نہیں ہے۔
ہر زمیں کا اپنا یومِ ظہور ہوتا ہے
اور ہر صبح کا اپنا وعدہ
جب وہ اندھیرے کا سینہ چیر کے طلوع
ہوتی ہے!

جولائی ۶۸ء

شاعر: رِلکے

ہادی حسین

# پہلا نوحہ

مَیں روؤں تو فرشتوں کی بھری محفل میں کوئی ہے
سُنے گا جو مرا رونا؟ اور اُن میں سے اگر کوئی
یکایک مجھ کو سینے سے لگا بھی لے تو کیا ہو گا؟
فنا ہو جاؤں گا برقِ تجلّی سے بھسم ہو کر
مری ہستی پہ چھا جائے گا اُس کا غلبۂ ہیبت
کہ کہتے ہیں جسے حُسن ابتدا ہے ایک ہیبت کی
ابھی جو سرحدِ برداشت سے گزری نہیں! اور ہم
پرستش حُسن کی کرتے ہیں کچھ اس امر کے باعث
کہ اس کی شانِ استغنا رَوا رکھتی نہیں ہم کو
جلا کر راکھ کر دینا۔ فرشتوں کی جماعت کا
ہے جو بھی فرد وہ ہیبت کا اک زندہ سراپا ہے
اسی باعث تو مَیں ضبطِ فغاں سے کام لیتا ہوں
اور اپنے سینے کی گہرائیوں میں اپنے نالوں کو
سِسکتا چھوڑ دیتا ہوں۔ کہیں ایسا بھی ہے کوئی
بنے جو غمگسار اپنا؟ نہیں کوئی نہیں ایسا،
فرشتہ ہو کہ انساں ہو۔ یہ ہے حیواں، سو اُن کو بھی
تو یہ معلوم ہے ہم اپنی اس معروف دنیا کو
کہ جس کی ترجمانی ہم نے اپنی عقل سے کی ہے
دیارِ غیر سا نا آشنا محسوس کرتے ہیں
ہمارے اور ان کے درمیاں یہ ایک پردہ ہے
ہے لے دے کر ہمارے واسطے یہ عالمِ اشیا
بس اتنا ہے کہ ہے شاید کسی ٹیلے کے دامن میں
درخت اک جانا پہچانا جسے ہم آتے دن دیکھیں

بس اتنا ہے کہ کل کی سیر کی کچھ یاد باقی ہے
اور اک عادت کہ جس نے ہم سے پیمانِ وفا باندھا
جسے اتنی محبت ہوتے ہوتے ہو گئی ہم سے
کہ آئی اور ہمارے ساتھ ہی رہنے لگی آ کر!
اور اس پر رات ہے، ہاں رات، چلتی ہیں ہوائیں جب
لئے سینے میں آفاقی فضاؤں کی خلاؤں کو
ہے کون ایسا نہ وہ جس کے لئے زندہ حقیقت ہو؟
وہ ہر دل پر تمناؤں کا افسوں پھونکنے والی
وہ پردہ کھولنے والی تمناؤں کے افسوں کا
وہ درد انگیز درماں جس کو ڈھونڈے ہر دلِ محزوں
دلِ عشّاق پر شاید نہیں ہے وہ گراں اتنی
کہ ان کی کائنات سینہ کا وہ ایک پرتو ہے
مگر افسوس! وہ اک دوسرے سے اپنی حالت کو
چھپاتے ہیں —— تمہیں اب تک نہیں معلوم کیا اتنا
کہ یہ سینہ تمہارا لامکاں کا ایک گوشہ ہے
ذرا تم اپنے پہلو کے خلا کو پھینک کر دیکھو
ذرا اس کو ہوا میں تم اُچھالو تو —— یہ ممکن ہے
ہوا میں اس کے باعث اس قدر پھیلاؤ آ جائے
کہ پیدا ہو نئی وسعت پرندوں کی اڑانوں میں
تنک پروازیوں میں ان کی آ جائے فراوانی

ضرورت تھی تمہاری آبشاروں کو،

تمہارے منتظر تھے وہ کہ آؤ اور اُنہیں دیکھو
تمہیں اُٹھ اُٹھ کے دیکھا کرتی تھیں لہریں سمندر کی
اسی صورت کبھی تم اِک کُھلی کھڑکی کے نیچے سے
گزرتے تھے تو سارنگی کی آتی تھی صدا ایسی
کہ اپنا آپ وہ جیسے کسی کو سونپے دیتی ہو
یہ سب کچھ کیا تھا؟ فطرت کی طرف سے اک امانت تھا؟
مگر کیا تم ہوئے پوری طرح عہدہ برآ اس سے؟
پریشاں تم کو رکھتی تھی نہ اک اُمیدِ باطل کیا
کسی محبوبہ کی جیسے یہ سب کچھ آمد آمد ہو؟
(اگر وہ سچ مچ آجاتی، تو تم اس کو کہاں رکھتے؟
تمہارے دل پہ تو قبضہ تھا ان اُونچے خیالوں کا،
اور اندر باہر آتے جاتے تھے یہ اجنبی مہماں؟
یہی کیا بلکہ شب کو بھی یہیں اُن کا بسیرا تھا)

تمہارے دل پہ جب خواہش تسلط پانے والی ہو
تو تم کو چاہیئے ان عاشقوں کے زمزمے گاؤ
کہ جن کے عشق کی عظمت رہی مدفونِ گمنامی
وہ ناکام تمنّا عاشقانِ زار جن پر تم
کیا کرتے تھے رشک اور جن کو تم ترجیح دیتے تھے
تمام ان عاشقوں پر جن کو قسمت نے کیا
ذرا سوچو، ہے میدانِ عمل کا مردِ جو انساں
نمایاں کام جس کے ہاتھ سے انجام پاتے ہیں
وہ اپنے کارناموں کی بدولت زندہ رہتے ہیں
میسّر اُس کو آتی ہے فضائے سازگار ایسی

ممد ہوتی ہے جو اس کی بقائے نام کے حق میں
مگر عشّاق کو دیتی ہے فطرت عمر چھوٹی سی
وہ جتنی جلد بھی ممکن ہو لیتی ہے سمیٹ ان کو
کہ جیسے عشق کی خلّاق طاقت کو جنم دے کر
وہ تھک کر چُور ہو جاتی ہو کچھ ایسی کہ پھر اُس میں
اُسے نشو و نما دینے کی قوّت ہی نہ رہتی ہو ـــ

کہو تو وہ شہیدِ آرزو گسپیا را اسٹمپا
تمہیں کچھ یاد ہے؟ سمجھے ہو تم اس کی حقیقت کو؟
کُھلا ہے تم پہ یہ راز اب کہ ہر وہ چاہنے والی
روا رکھی ہو جس سے بیوفائی اس کے دلبر نے
یہ کہتی ہو گی جی ہی جی میں اس کی داستاں سُن کر
کہ "میں بن جاؤں کاش اُس عاشقِ جانباز کی صورت؟"
ابھی وہ دن نہیں آیا ہے کیا جب رنگ لائیں گے
محبّت کے پرانے غم؟ ابھی وہ دن نہیں آیا
کہ پیدا وہ کمالِ پختہ کاری ہو محبّت میں
کہ ہم محبوب کی ہستی سے بھی آزاد ہو جائیں
تڑپ کر آرزو کی سختیوں کا جھیلنا سیکھیں
کہ جیسے تیر جھیلے کانپ کر چلّے کی سختی کو
اور اپنی جست کی بڑھتی ہوئی رفتار کے ہاتھوں
گزر کر اپنے آپے سے نئی اک چیز ہو جائے؟
سکوں کہتے ہیں جس کو وہ محبّت میں نہیں ممکن
کہ فطرت اُس کی ہے آگے بڑھے جانا، بڑھے جانا
یہ آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں؟ سُن، مرے دل، سُن

ندائے غیب جیسے اولیاء اللہ سُنتے تھے
کچھ اس انداز سے گویا ابھی آواز کی طاقت
اُچھالے گی اُٹھا کر اُن کو اپنے آپ سے اُونچا
کہیں افلاک کی جانب۔ وہ دو زانو جُھکے اُس کو
سُنا کرتے تھے استغراق و محویت کے عالم میں
سماعت کا سراپا بن کے ـــ آوازِ خدا مانا
ہے وہ زہرہ گداز آواز جس کے سُننے کی ہمت
نہیں تجھ میں۔ مگر آہوں کی تُو وہ سرسراہٹ سُن،
وہ خاموشی کی آہٹ سُن، کہ اک آوازِ ہُو بن کر
جوانانِ مرگ روحوں کے تجھے پیغام دیتی ہے
تو نیپلز اور روما میں کسی گرجا میں جاتا تھا
تو سُنتا تھا نہ ان کی داستانِ زندگی کیا تو
زبانِ بے زبانی سے؟ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا
کسی کا دیدۂ افروزِ بصیرت کتبۂ تربت
حیات و موت کے اسرار تجھ پر کھول دیتا تھا؟
ہوا تھا جیسے "سانتا ماریا فرموسا" میں اُس دن ـــ

نہ جانے چاہتے ہیں یہ شہیدانِ تمنا کیا؟
نہ جانے کام انہیں کیا ہے زمیں کے رہنے والوں سے؟
مجھے محسوس ہوتا ہے وہ مجھ سے اس کے طالب ہیں
کہ مجھ سے بن پڑے تو ان کے دل سے دُور کر ڈالوں
جفائے زندگی کی وہ کھٹک جو ان کو مانع ہے
کہ اس دنیا کی ہر حسرت سے کر کے پاک سینے کو
وہ اپنی جنتِ موعود کی جانب بڑھے جائیں
ہے کس درجہ تعجب خیز دنیا سے گزر جانا!

یہ معمول شبانہ روز یکسر ترک کر دینا
جسے برسوں کی جد و جہد سے پختہ کیا ہم نے!
گُل و گلشن اور اُن روحانیت افزا مظاہر سے
کہ جن سے نوعِ انسانی کا مستقبل درخشاں ہے
یکایک موڑ لینا مُنہ ـــــــ وہ سب کچھ جو تھے کل تک ہم
وہ سب کچھ جو کہ بننا چاہتے تھے ہم بصد کوشش،
اسے یوں پھینک دینا ایسے کہ جیسے ہو کوئی اُترن!
یہی کیا، نام بھی اپنا اُٹھا کر یوں پٹک دینا
کوئی ٹوٹا ہوا بیکار سا جیسے کھلونا ہو!
تعجب ہے یہ دل کی خواہشوں کا دل سے رد کرنا!
تعجب ہے کہ کل تک تھا جو شیرازہ روابط کا
فضا میں آج ہوں اس کے عناصر درہم و برہم
اور اس سے بھی کٹھن یہ ہے کہ مرجانے پہ بھی دل میں
رہیں کچھ حسرتیں باقی جو کھینچیں اپنے دامن کو
اور اپنے منزلِ مقصود تک جا کر پہنچنے میں
مزاحم ہوں! یہ سب سچ ہے، مگر جو لوگ زندہ ہیں
وہ اکثر مرتکب ہوتے ہیں تمیزاتِ بیجا کے،
جہاں کچھ بھی نہیں ہے فرق وہ تفریق کرتے ہیں ـ
فرشتے (کہتے ہیں) یہ فرق کر سکتے نہیں مطلق
کہ وہ زندوں کی دنیا میں ہیں یا مُردوں کی دنیا میں
ابد کا سیلِ بے پایاں لئے ہمراہ صدیوں کو
مٹاتا جا رہا ہے دونو دنیاؤں کی سرحدیں
اور اس کا ہمہمی دونوں کے ہنگاموں سے اُونچا ہے

جواں مرگوں کو یا آخر نہیں رہتی ضرورت کچھ

ہانس ماگنس اینسنز برگر

محمد اسحاق میر

ہماری، اور وہ ہو جاتے ہیں اس دنیا سے بیگانہ
کہ جیسے رفتہ رفتہ دُودھ چھُٹ جاتا ہے بچوں کا
مگر دم بھر بھی رہ سکتے ہیں ہم زندہ بغیر اُن کے ؟
کہ اسرارِ عظیم الشان کی ہم کو ضرورت ہے
اور اکثر غم ہمارے واسطے ہوتا ہے سرچشمہ
سعادت اور ترقی کا۔ یہ قصہ کیا ہے بے معنی
کہ لینوسؔ جواناں مرگ کا جاری تھا جب ماتم
تو موسیقی کی صوتِ اولیں کو یہ ہوئی جرأت
کہ خاموشی کا پردہ پھاڑ کر باہر نکل آئے
اور اک مبہوت اور ششدرہ فضا میں، جس کے اندر سے
اک انساں دیوتا بن کر ہوا تھا یک بیک غائب،
ہوائے سب سے پہلی بار کی محسوس وہ لرزش
جو انساں کے لئے اب راحت و عشرت کا ساماں ہے ؟

جون ۱۹۵۰ء

## گھن چکر

بولنا آسان ہے
مگر بولنے سے پیٹ نہیں بھرتا
تو پھر روٹی پکا
روٹی پکانا تو مشکل ہے
تو پھر نانبائی بن جا

لیکن روٹی کے اندر رہائش ناممکن ہے
تو پھر مکان بنا
مکان بنانا تو مشکل ہے
تو پھر معمار بن جا

پہاڑ کے اُوپر تو مکان نہیں بن سکتا
تو پھر پہاڑ کو پرے ہٹا
پہاڑ کو پرے ہٹانا تو مشکل ہے
تو پھر پیغمبر بن جا
لیکن خیالات تو کوئی بھی نہیں سُنتا
تو پھر بول
بولنا تو مشکل ہے
تو پھر جو تو ہے، وہی بن جا
اور یونہی بڑبڑاتا رہ
ایک ناکارہ تخلیق

مئی ۷۸

ہانس ماگنس اینیزنبرگ
یحییٰ فضل

## مڈل کلاس کا ترانہ

ہم برسرِ روزگار ہیں۔
ہمیں کوئی شکایت نہیں
ہمارے شکم پُر ہیں
ہم کھاتے ہیں

گھاس بڑھ رہی ہے
قومی سرمایہ بھی
اُنگلی کا ناخن بھی
ماضی کا زمانہ بھی

راہیں سنسان ہیں
معاہدات پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے ہیں
بگل خاموش ہیں
یہ سماں بھی بدل جائے گا

مرنے والوں نے اپنی وصیتیں کر دی ہیں
بارش دھیمی ہو گئی ہے۔
اعلانِ جنگ ابھی نہیں ہوا
اس کی جلدی بھی کیا ہے

ہم گھاس کھاتے ہیں
ہم قومی سرمایہ کھاتے ہیں
ہم ناخن کھاتے ہیں
ہم زمانۂ ماضی کو کھاتے ہیں

ہمیں کچھ بھی تو نہیں چھپانا ہے
ہمیں کچھ بھی تو نہیں گنوانا ہے
ہمارے پاس کہنے کو کچھ نہیں
ہمارے پاس سب کچھ ہے

گھڑی کو چابی دے دی گئی ہے
معاملات سدھرے ہوئے ہیں
تھالیاں دُھلی ہوئی ہیں
آخری بس گزر رہی ہے
وہ خالی ہے

ہمیں کوئی شکایت نہیں

ہمیں انتظار آخر کاہے کا ہے؟

---

میرین سورسکو
جاوید شاہین

## آنکھیں باندھنے کی کوشش

مَیں نے درختوں کی آنکھیں باندھ دیں
ہریالی کے رومال کے ساتھ
اور کہا
مجھے ڈھونڈلو
درختوں نے مجھے فوراً ڈھونڈلیا
ایک قہقہہ لگا کر
مَیں نے پرندوں کی آنکھیں باندھ دیں
بادلوں کے رومال کے ساتھ
اور کہا
مجھے ڈھونڈلو
گیت گا کر
مَیں نے اُداسی کی آنکھیں باندھ دیں
ایک مسکراہٹ کے ساتھ
اُداسی نے مجھے ڈھونڈ لیا
اگلے ہی دن محبت میں
مَیں نے سورج کی آنکھیں باندھ دیں
اپنی راتوں کے ساتھ
اور کہا
مجھے ڈھونڈ لو
سورج نے کہا، تم تو وہ رہے وقت کی
آڑ میں
زیادہ چھپنے کی کوشش مت کرو،
اور مجھے وہ سب چیزیں بتاؤ
وہ سب جذبے بتاؤ
جن سے تم نے
آنکھیں باندھنے کی کوشش کی تھی؟

شارل بودلیئر
ڈاکٹر لیئق بابری

# نصب العین کی قبر

میری ایک حسینہ سے ملاقات ہوئی، جس کے وجود کی بدولت دُور دُور تک ایک نصب العینی فضا قائم تھی، اُس کی آنکھیں چاروں طرف شان و شوکت، حُسن اور غیر فانی جلووں میں یقین و اعتماد کی دولت بکھیر رہی تھیں۔

مگر یہ فسوں کار دوشیزہ اتنی حسین تھی کہ زیادہ عرصہ جی نہ سکی، اور میرے ساتھ ملاقات کے چند روز بعد ہی مرگئی، میں نے ہی اُسے دفن کیا، ہندوستان کے خوشبودار اور غیر فانی لکڑی کے تابوت میں رکھ کر دفن کیا۔

جب کہ میری نظریں اس جگہ پر مرکوز تھیں جہاں یہ گنج گراں مایہ دفن تھا۔ میں نے دفعتاً ایک حسین سی صورت دیکھی، جو اس مری ہوئی دوشیزہ سے ملتی جلتی تھی، اور جو تازہ قبر کے اوپر چلتی ہوئی قہقہہ لگاتی ہوئی، ایک لرزتی ہوئی آواز میں، عجیب تیزی سے یہ کہہ رہی تھی۔

"یہ میں ہوں سچی دوشیزہ، یہ میں ہوں مشہور ریاکار، اور تمہارے جنون اور اندھے پن کی سزا یہ ہے کہ اب تم میرے ساتھ محبت کروگے، میں جیسی بھی ہوں!" مگر میں نے غصّے میں جواب دیا۔ "نہیں نہیں!" اور اس انکار پر زور ڈالنے کے لئے میں نے اپنا پاؤں زمین پر اتنے زور سے مارا کہ میری پوری ٹانگ گھٹنے تک اس نئی قبر میں دھنس گئی، اور ایک بھیڑئیے کی طرح پنجرے میں گرفتار میں ہمیشہ کے لئے نصب العین کی قبر میں پھنس گیا۔

مئی ۷۷ء

پال ورلین
انیس ناگی

# میرے دل میں آنسو گرتے ہیں

(شہر پہ دھیرے دھیرے بارش ہوتی ہے)

(رن بو)

میرے دل میں آنسو گرتے ہیں
جیسے شہر پہ بارش ہوتی ہے
یہ کیسی سُستی ہے
جو میرے دل میں در آئی ہے؟

ہر چھت پر اور زمیں پر
بارش کا دھیما شور!
وہ دل جو بیزار ہوا ہے
اے بارش کے گیت!

یوں ہی اس دل میں آنسو گرتے ہیں
جو بیمار ہوا ہے
کیا ساتھ کسی نے چھوڑ دیا ہے؟
یہ غم بس یونہی اُٹھتا ہے

اور میں یہ نہ جانوں
کیوں اتنا مہلک درد
کسی نفرت اور محبت کے بن
مرے دل میں یوں اُٹھتا ہے!

فروری ۹۷ء

مورس مترلنک
نفیسہ صدیقی

## آخری الفاظ

اور اگر وہ کبھی واپس آجائیں
تو مَیں کیا کہوں گی ؟
ان سے کہنا کہ مَیں نے تمام عمر
ان کا انتظار کیا
اگر وہ کچھ اور پوچھیں
اور مجھے دیکھنے کی حسرت کا اظہار کریں
تو ان سے نرمی سے بات کرنا ایک بہن کی طرح
شاید وہ دُکھی ہوں
اگر وہ مجھ سے پوچھیں کہ تم کہاں ہو
تو مَیں کیا کہوں گی
اس وقت انہیں میری سونے کی انگوٹھی دے دینا
چپکے سے
اگر وہ یہ جاننا چاہیں
کہ دالان کیوں سونا پڑا ہے
تو انہیں بجھا ہوا چراغ دکھلا دینا
اور کھُلا ہوا دروازہ
اور اگر وہ اس کے بعد مجھ سے پوچھیں
کہ تمہیں نیند کیسے آگئی ؟
ان سے کہنا کہ مَیں نے مسکراتے ہوئے آنکھیں بند
کریں، انہیں رونے نہ دینا۔

جون ۱۹۷۹ء

پال ادین (سارہ لون)
امجد اسلام امجد

## زندگی کے ہاتھوں مر چلے

مَیں مر رہا ہوں
ہو سکتا ہے میری شکل سے اس کا اندازہ نہ ہوتا ہو
لیکن کیا ہم میں سے کسی کی بھی شکل سے یہ اندازہ ہوتا ہے ؟
اس کے باوجود ہم سب مر رہے ہیں
کچھ بیماری سے کچھ بھوک سے اور کچھ ماتم گساری سے
لیکن ہم میں سے زیادہ تر اس زندگی کے ہاتھوں مر رہے ہیں
کیوں کہ ہم مرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں
ہم میں سے کچھ جنت کے لئے مرتے ہیں اور کچھ جہنم کے لئے
اور کچھ گوشۂ گمنامی کے لئے
لیکن چونکہ موت ہم سب کی قدرِ مشترک ہے، اس لئے ہم مسلسل
مر رہے ہیں۔
وہ جو بیماری، بھوک اور ماتم گساری سے مرتے ہیں
اور وہ جو زندگی کے ہاتھوں مر رہے ہیں
اگرچہ تیزی سے مرتے ہیں مگر صحیح وقت پر مرتے ہیں
اگرچہ آہستہ آہستہ مر رہے ہیں لیکن یقیناً اپنے صحیح
وقت پر مرتے ہیں۔
کچھ جنت کے لئے، کچھ جہنم کے لئے اور
کچھ گوشۂ گمنامی کے لئے۔

دسمبر ۱۹۷۹ء

رضا براہنی ۲
ن۔م۔ راشد

# کہر

بیاباں میں چاروں طرف کہر چھا رہی ہے
گاؤں کے دیئے اوجھل ہو گئے ہیں
ایک گرم لہر بیابان کے لہو میں بھر گئی ہے
بیاباں —— تھکا ہوا، خاموش، ہانپتا ہوا
کہر کے گرم ہذیان میں اُس کے جوڑ جوڑ سے پسینہ بہہ رہا ہے

"—— بیابان میں چاروں طرف کہر چھا گئی ہے
(راہرو اپنے آپ سے کہتا ہے)
گاؤں کے کتے چپ ہیں
مَیں کہر کا دوشالہ اوڑھے گھر پہنچوں گا
گل کو نہیں جانتی
مجھے اچانک دہلیز پر دیکھا جائے گا
اس کی آنکھوں میں
آنسو کے قطرے اور ہونٹوں پر ہنسی ہو گی،
کہے گی:
"—— بیابان میں چاروں طرف کہر چھا گئی ہے —— میں دل
میں سوچ رہی تھی کہ کہر اگر یونہی صبح تک چھائی رہی، تو کیا
بہادر لوگ اپنی پوشیدہ کمیں گاہوں سے نکل کر اپنے
پیاروں سے ملنے لوٹ آئیں گے؟"

بیاباں میں چاروں طرف کہر چھا رہی ہے
گاؤں کے دیئے اوجھل ہو گئے ہیں
ایک گرم گرم لہر بیابان کے لہو میں دوڑ رہی ہے
بیابان —— تھکا ہوا —— خاموش —— ہانپتا ہوا
کہر کے گرم ہذیان میں اس کے جوڑ جوڑ سے پسینہ بہتا ہوا

نیما یوشیج
ن۔م۔ راشد

# بے شک ہے رات

بے شک ہے رات —— ایک گھٹی ہوئی رات
اور مٹی کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا
ہوا گھٹاؤں کی نوجوان بیٹی، پہاڑ سے اُتر کر
مجھ پر دوڑی چلی آ رہی ہے

بے شک رات کسی سوجے ہوئے بدن کے مانند
اور ہوا گرم رُکی ہوئی
اس لئے کوئی بھولا ہوا مسافر اپنا راستہ نہیں پا سکتا

یہ طویل بیابان جس کا بدن پھنک رہا ہے
اپنی تنگ قبر میں پڑے ہوئے مُردے کی مانند ہے

یا جیسے میرا ہی دل جھلسا ہوا دل
میرے ہی تھکے ہوئے جسم میں
جو بخار کی شدت سے جل رہا ہے
بے شک رات ہے بے شک!

جولائی ۷۸ء

فروغ فرخ زاد
بیدار بخت

# چابی کی گڑیا

ہاں اس سے بھی زیادہ
اس سے بھی زیادہ گُم سُم رہنا ممکن ہے

ایک ڈاشش کی طرح
گھنٹوں تکا جا سکتا ہے
سگریٹ کے دھوئیں کو
چائے کے ایک پیالے کو
قالین پر ایک مٹتے پھُول کو
دیوار پر ایک موہوم لکیر کو
خشک ہاتھوں سے
پردے کو ذرا ہٹا کر دیکھا جا سکتا ہے
کہ باہر تیز بارش ہو رہی ہے
ایک بچہ رنگین غبارہ لئے
ایک محراب کے نیچے کھڑا ہے
ایک پرانی گاڑی خالی میدان سے
تیزی سے گزر رہی ہے
پردے کے پاس گُم سُم رہا جا سکتا ہے
اندھا ہو کر، بہرہ ہو کر

یہ کہا جا سکتا ہے
مصنوعی اور اجنبی آواز میں
"میں تم سے پیار کرتی ہوں"
ایک مرد کے توانا بازوؤں میں
ایک ایسی حسین اور مکمل شے بنا سکتا ہے
جس کا جسم نرم و نازک ہو
اور جو اکھڑ نہ ہو۔

بستر میں ایک شرابی، ایک پاگل، ایک آوارہ
کے ساتھ محبت کی آبرو کو آلودہ کیا جا سکتا
ہے۔
چالاکی سے تحقیر کی جا سکتی ہے
ہر شگفتہ معمے کی
تنہا پہیلی کو بوجھا جا سکتا ہے
خود ہی بیہودہ جواب پر دل خوش کیا جا سکتا
ہے۔
پرانی مقدس کتابوں کے ورقوں کی طرح

جمع، تفریق اور ضرب میں صفر کی طرح
ایک سا حاصل پیوستہ نکالا جا سکتا ہے
پرانے جوتے کے بٹن سے
تیری آنکھ کا تصور کیا جا سکتا ہے
گڑھے کے پانی کی طرح خود کو خشک کیا جا
سکتا ہے۔

ایک لمحے کی خوبصورتی کو شرم سے
ایک پرانی دھندلی تصویر کی مانند
صندوق کی تہہ میں چھپایا جا سکتا ہے
دن کی خالی قاب میں
ایک محکوم، یا مغلوب، یا مصلوب کی تصویر
لٹکائی جا سکتی ہے۔
گھٹیا تصویر سے دیوار کے رخنے کو چھپایا جا
سکتا ہے۔
بے ہودہ جواب جو پانچ چھ لفظوں کا ہو۔

زندگی بھر ایک شاندار مقبرے کے آگے
سر بزانو رہا جا سکتا ہے
ایک غیر معروف قبر میں خدا دیکھا جا سکتا ہے
ایک معمولی سکّہ میں ایمان ڈھونڈا جا سکتا
ہے۔
مسجد کے حجروں میں مرجھایا جا سکتا ہے
اس سے بھی گھٹیا تصویر کے ساتھ مدغم
ہوا جا سکتا ہے۔

چابی کی گڑیا بنایا جا سکتا ہے۔
جو اپنی دنیا کو شیشے کی دو آنکھوں سے
دیکھتی ہے

کپڑوں کے بکس میں
بھوسا بھرے جسم کے ساتھ
سالوں تک مخمل اور ریشم کی تہوں میں
سویا جا سکتا ہے۔
ہاتھ کے ہر آلودہ دباؤ پر
بے سبب خوش ہو کر کہا جا سکتا ہے
"میں کتنی خوش قسمت ہوں"

علی میسر فطروس
انور زاہدی

کلیوین رینیوڈ
اصغر ندیم سید

## جنوب کے بچے کی آواز

کل رات میری ماں کو بخار ہو گیا
اور میرے دل کے تمام پھول مُرجھا گئے
میرے باپ نے آج اپنے بیلوں کو بیچ دیا
تاکہ دوائی خرید سکے
میری چھوٹی بہن گلنار نے
اپنے سبق کو یاد کرتے ہوئے لکھا
"باپ نے پانی دیا
کل رات باپ نے روٹی نہیں دی
دارا کا گھر بہت خوبصورت ہے"
میرا دل چاہتا ہے
کہ میں پرچم بنوں
پرچم بنوں اور پہاڑ کی چوٹی پہ سجوں
لیکن میرے باپ کا ہاتھ چھوٹا ہے
آج دوپہر اسکول سے واپس آتے ہوئے
میرے ہم جماعت نے مجھ سے پوچھا
کیا سبق اچھی طرح یاد ہے ؟
کل صبح تاریخ کا امتحان ہے
سخت امتحان
ہمیں اپنے سبق کو اچھی طرح یاد کرنا ہے۔

جون ۱۹۸۱

## عام سے عاشق کا گیت

میرے میٹھے گلاب
مجھ سے ایسی محبت نہ کرو
جیسی اپنے سائے سے کرتی ہو
کہ سائے شام کو فنا ہو جاتے ہیں
اور میں تمہیں صبح صادق تک لے جانا
چاہتا ہوں
اور نہ ہی کالی مرچوں جیسی محبت کرو
جو پیٹ میں آگ لگا دیتی ہیں
اس طرح میں بھوکا رہا
تو تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکوں گا
تکیے جیسی محبت بھی نہیں
جس میں ہم گھنٹوں ایک ساتھ رات کو سو
تو سکتے ہیں، لیکن صبح کو ایک دوسرے سے
ملنے کی حاجت کم ہو جاتی ہے۔
چاول کی طرح بھی نہیں
جنہیں ایک دفعہ کھانے سے جی اوب
جاتا ہے۔
ملائم تصویروں کی طرح بھی نہ چاہو
کہ وہ جلدی ہی میں تحلیل ہو جاتی ہیں
شہد کی طرح بھی نہیں
کہ میٹھا ضروری تو ہے لیکن بہت عام
مجھے خوبصورت خواب کی طرح چاہو
تمہاری زندگی رات میں
میری اُمید دن میں
ہمیشہ میرے ساتھ زمین پر رہے
جیسے غریب کے پاس تھوڑے سے
اور عظیم سفر کے لئے
ایک وفادار کا مرید
کالاباش دریا کی طرح
جو پانی گراتے وقت گھٹا ہوا ہوتا ہے
میرے گیت کے لئے ہمیشہ رہ جاتا ہے

اکتوبر ۱۹۷۹ء

یہودا امیچائی

اجمل کمال

## بیل گھر لوٹتا ہے

بیل رنگ میں اپنے دن بھر کے کام کے بعد
گھر لوٹتا ہے۔
اپنے فائٹروں کے ساتھ کافی پی کر
اور درست پتے کے ساتھ اُن کے لئے ایک
رقعہ چھوڑ کر
اور سرخ رومال رکھنے کی جگہ بتا کر
(تلوار اس کی اکڑی ہوئی گردن میں گڑی
ہوئی ہے اور گڑی رہتی ہے)
اب وہ اپنے گھر میں ہے
اور اپنی بھاری یہودی آنکھیں لئے اپنے
بستر پر بیٹھا ہے۔
اسے معلوم ہے
گوشت میں اترتے ہوئے تلوار کو بھی اذیت
ہوتی ہے۔
اگلے جنم میں وہ ایک تلوار ہوگا
اذیت باقی رہے گی۔

(دروازہ کھلا ہے، نہ ہو تو چابی دری کے
نیچے ہوگی)

وہ شام کی مہربانی سے واقف ہے
بچی مہربانی سے
انجیل میں اسے پاک جانوروں میں شمار
کیا گیا ہے۔
وہ حلال گوشت ہے اور اپنی جگالی کرتا ہے۔

اس کا دل بھی سینگ کی طرح دوشاخہ اور
بیچ سے چرا ہوا ہے
باہر اس کے سینے پر بال اُگ آئے ہیں
خشک اور مٹیالے بال
پھٹی ہوئی دری کے دھاگوں جیسے

اپریل ۱۹۹۱ء

خیرالانور

زاہد ڈار

## صبر

مجھے نیند نہیں آتی
لوگ بولے جاتے ہیں، کتے بھونک رہے ہیں
دنیا فاصلے پر جا کر دھندلا جاتی ہے
پتھر کی دیواروں میں گھری ہوئی تاریکی
متواتر
آوازوں کی زد میں ہے
قریب ہی آگ اور راکھ بھی موجود ہیں
مَیں بولنا چاہتا ہوں
میری آواز غائب ہو جاتی ہے
میری طاقت ختم ہو جاتی ہے
ٹھیک ہے! کیا فرق پڑتا ہے
دنیا پسند نہیں کرتی کہ اس کے ساتھ بات
کی جائے مَیں بھی پروا نہیں کرتا

دریا کا پانی برف بن جاتا ہے
زندگی میں اب زندگی باقی نہیں رہی

مَیں ایک بار پھر کرتا ہوں جو پہلے بھی کر چکا ہوں
مَیں اپنے کان بند کر لیتا ہوں
میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں
اور انتظار کرتا ہوں سکون کا جسے آنا ہے۔

فروری ۷۹ء

چالیس سالہ مخزن

رسول حمزہ
ترجمہ : عبدالعزیز خالد

# بادِ شمال

کوہِ نیلم کی جب اونچائی پہ تم چڑھتے ہو
تو فلک بوس بلندی سے وہ چھتری سا تنا
چرخ ـــــــ ہتھیلی پہ دھرا ہو جیسے

یا کسی نالے کا جب صدیوں پرانا آہنگ
سر ٹپکتے ہوئے کہسار سے ، کانوں میں پڑے
گردِ کوہ میں گونجے پرِ پروازِ عقاب
گلّہ در گلّہ چراگاہوں میں بھیڑیں پھیلیں
تم نے ہر چند کبھی پہلے نہ مانگی ہو دُعا
اس گھڑی بارگہِ مادرِ گیتی میں مگر!
دل پہ بے ساختہ طاری ہو مناجات کا رنگ

جب سمندر میں بہت دُور افق کی تہ میں
آتشیں قرصِ فلک زرد ہو رفتہ رفتہ
گُل کوئی کترے گرانڈیل دیئے کا ، جیسے ،
روشنی دن کی جب آہستہ سے
نیلے پانی میں اتر جاتی ہے
جیسے تیراک سمندر میں لگائے غوطہ
آدھے سورج کو جھپاکے سے چھپالیں لہریں
جھک کے تم حرفِ دعا ہونٹوں سے کرتے ہو ادا

چاہے پہلے نہ اٹھایا ہو کبھی دستِ دُعا
انگلیاں بوڑھوں کی جس وقت کریں
اپنی خاکستری ریشوں میں خلال
چھاتیاں چوستے بچے کو تھپکتی بانہیں
ماں کی بانہیں جنہیں تسکین کا گہوارہ کہیں
نظر آئیں تو کلیجے میں کسک اٹھتی ہے
آتشِ رفتۂ ایام چمک اٹھتی ہے

آسماں اور زمیں جب تمہیں دیتے ہیں صدا
کھولو ہستی کی گرہ !
معاً اس ساعتِ گلنار میں ریب و گماں
اَن کہے حرفِ دعا سے گویا
رُندھ سا جاتا ہے گلا
لذتِ شکر سے ہر موئے بدن ہو لرزاں

چاہے کتنا ہی عبادت سے اِبا ہو تم کو
چاہے مضمونِ دُعا بھی نہ تمہیں آتا ہو

اسٹیلا جوزف

احمد مشتاق

## ماں

ایک اتوار
وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا مگ اٹھائے
اور ایک دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ
تھوڑی دیر تک
پھیلتے ہوئے اندھیرے میں بیٹھی رہی۔

وہ دستے والی چھوٹی دیگچی میں کھانا لے کر آئی تھی
جو اُن لوگوں نے اسے دیا تھا جن کے ہاں وہ
کام کرتی تھی
بستر میں پڑے پڑے میں سوچتا رہا
امیر لوگوں کے پیٹ ہمیشہ بھرے رہتے ہیں۔

میری ماں ایک مسکین سی عورت تھی
وہ کم عمری ہی مرگئی، جیسے دھوبنیں مرجاتی ہیں
ان کی ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں
بوجھ اُٹھاتے اُٹھاتے اور استری کرتے کرتے
اُن کے سر دکھنے لگتے ہیں
ان کے لئے پہاڑ میلے کپڑوں کے ڈھیر ہیں
ان کے بادل بھاپ سے بنتے ہیں
اور اگر وہ آب و ہوا کی تبدیلی چاہیں
تو بالا خانے کی سیڑھیاں چڑھ کر
کوٹھے پر جا سکتی ہیں۔

میں اسے استری کرتے کرتے تھک کر دم لیتے
دیکھتا ہوں
اس کے روز بروز دُبلے ہوتے ہوئے لاغر جسم کو
سرمائے نے توڑ ڈالا تھا
پرولتاریو! اس بارے میں بھی سوچو

کپڑے دھوتے دھوتے
اس کی کمر کمان ہو گئی تھی
مجھے محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ
ابھی جوان ہے
صرف اپنے خوابوں میں
وہ دُھلا ہوا ایپرن پہنے ہوتی
اور پھر ڈاکیہ بھی اسے ہیلو نہیں کہتا۔

مئی ۷۸ء

سیسیلیا میریلیز

صلاح الدین محمود

## محترک

مَیں گاتی ہوں اس واسطے کہ یہ لمحہ موجود ہے
اور میری ہستی مکمل ہے
مَیں نہ تو خوش ہوں اور نہ ہی غمگسار
مَیں شاعر ہوں

گزرتی چیزوں کی رشتہ دار
مَیں نہ تو سرد محسوس کرتی ہوں اور نہ ہی ذیت
اور مَیں رات دن
ہوا میں بسر کرتی ہوں
خواہ میں مسمار کروں یا بناؤں
خواہ میں قائم رکھوں یا گھُل جاؤں

——مَیں نہیں جانتی، مَیں نہیں جانتی،
مَیں اتنا تک نہیں جانتی
کہ آیا مَیں قیام میں ہوں یا محض
بیت رہی ہوں
مَیں اتنا جانتی ہوں کہ مَیں گاتی ہوں۔اور
گیت ہی اہم ہے
کہ اس کا ازلی لہو اور رواں پنکھ ہیں
اور مَیں جانتی ہوں کہ ایک یوم مجھ کو بے صوت
کر دیا جائے گا ——اور کچھ نہیں

فروری ۷۹ء

کوموردو
یحییٰ امجد

# ذلیل و برہان کی روشنی میں

(امن کی فاختہ کا گیت)

ہر جگہ، چاہے کوئی بھی ملک ہو
میری طرح کی فاختائیں ہیں
سو میں ہر سرزمین کی زبان سمجھ سکتی ہوں
میں آسمانوں میں اونچی اڑ جاؤں گی
کسی گدھ، کسی عقاب اور کسی امریکی جہاز
کا خدشہ کیے بغیر،

اور ان چند دنوں میں
میں پیکنگ کے ہوٹل میں اڑ کر گئی ہوں،
جہاں ایوانِ اجلاس میں وہ مندوب اب
بحرِ بیکراں بن گئے ہیں
جو ایشیائی اور بحرالکاہلی علاقوں کے
بیس سے زیادہ ممالک سے آئے ہوئے ایک
عظیم بیضوی میز کے گرد بیٹھے ہیں۔

میں آکر ایک سبز رنگ کے وسیع غالیچے
کے درمیان بیٹھتی ہوں جو ایوان کے آخری
سرے پر لٹکا ہوا ہے
میرے نیچے ہر سمت پھول رکھے ہوئے ہیں
لمبے کھجور کے درخت شاخیں بڑھانے کے لیے

لائے گئے ہیں۔
ہر وفد کے سامنے ننھے ننھے پرچم سجے ہیں
جو یوں کھڑے ہیں جیسے بہت سے پھول بہار
دے رہے ہیں۔

ایسی پُرامن تصویر
ایک پُرآہنگ نغمہ کی طرح
کوئی بھی اسلحہ بڑھانا نہیں چاہتا،
نہ اعلانِ جنگ کرنا چاہتا ہے۔
سب پُرامن بقائے باہمی چاہتے ہیں
ناکہ بندی اور روک ٹوک کے بغیر
تجارت کا آزادانہ بہاؤ
کوئی بھی جارحیت یا غلامی نہیں چاہتا
سب زندگی چاہتے ہیں نہ کہ موت!

میں چین کے وفد کی پُروقار تقریر سنتی ہوں
پھر سوویت یونین کی اختتامی تقریر
اور وہ اعلان جو آسٹریلیا کے وفد نے پڑھا
اور پاکستان کو قرارداد پڑھتے ہوئے
سنتی ہوں!

سنجیدہ ملاقاتوں کے چار دن، ہم آہنگی میں
آزادی میں جاپانی در کوریائی وفود شادماں
امریکی اور سوویت وفود ہاتھ میں ہاتھ
ڈالے برہان کی روشنی میں تضادات گھل گئے۔
اور کامل اتفاق کے لیے
مشترکہ رضامندی پیدا ہو گئی۔
تو اے امن کے محافظو!
آپ کو الوداع!
میں برلن کو پرواز کر رہی ہوں
اور اس خزاں کے ختم میں الوداع ہی کہوں گی۔
ور پھر واپس آؤں گی
پھر ہم بے تکلفی سے باتیں کریں گے
تب موسم خوشگوار ہو جائے گا۔
اور سب فصلیں پک جائیں گے۔
تو ہم اس وقت جمع ہو جائیں گے
امن، امن، امن کی
عظیم فصل کے درمیان

اکتوبر ۷۸ء

ڈی۔ جے۔ ڈینٹس
محمد سلیم الرحمٰن

## لوسیفر

وقت آنے پر وہ شاید بعضوں کو قطب معلوم ہونے لگے
اس کے قصے اور آسمان سے آگ لے کر آنے والے کی
کہانی میں پائی جانے والی
وحشیانہ یکسوئی
شاید پھر اسے کسی خدا کا رتبہ واپس دلا دے
فی الحال بھی ہمیں
پچھلے پاتال میں اسے اترتے دیکھتے ہوئے
کوئی دقت پیش نہیں آتی

یہاں سے چھن جاتے ہوئے بیچ رستے میں
اس کی صورت نُور کی خیرہ کن خلعت سے دھندلائی ہوئی،
جیسے ذرّہ بکتر جس کا رُخ سورج کی طرف پھیر دیا گیا ہو
باغی سے کہیں زیادہ افسانوی شہرت کا مالک کوئی صانع
صانع سے کہیں زیادہ کوئی پاگل پروفیسر۔

کیونکہ جس طور کا علم اسے حاصل ہے وہ کبھی
زیادہ دُور نہیں پہنچا سکتا
یہ کہ صوتی لہریں کاربن میں کھپ جاتی ہیں
اور کسی دل جانی کی آواز بن کر برآمد ہوتی ہیں
یہ کہ روشنی عدسے کی چلمن سے چھن کر
پردۂ سیمیں پر پھیل جاتی ہے
تاکہ تنہائی کے مارے اسے دیکھا کریں

یا یہ کہ انسان کے اچانک پر و بال اُگ آئیں
ان سے درحقیقت کچھ بھی نہیں بدلتا

وہ آب و ہوا جو دریافتوں کو پالتی پوستی ہے
جس نے قسم کھائی ہے
کہ ہمارے جیتے جی سرطان پر فتح پا کر رہے گی
جو دل کی دھڑکنیں تیز کرتی ہے
اسی کا کھا کے تو سرطان سڑنا گلتا ہے

تاہم ہمارے لئے لوسیفر کا راز راز ہی رہتا ہے
شر ہمیشہ بدشکل ہوتا ہے
بھسم کر سکتا ہے مگر شاذ و نادر ہی گدگداتا ہے
شاید اس لئے کہ وہ بیزاری سے جنم لیتا ہے
صرف نیکوں ہی کو جرم کا احساس ہوتا ہے
راست باز تو امر ضروری تک کے لئے
بہانے ایجاد کر لیتے ہیں
لیکن صرف یہی ایسی ہستی ہے جو گھونسے پر پلتی ہے
اور سمجھتی ہے کہ اس کی طاقت بڑھ گئی ہے
جو کچھ وہ ہے اسی میں خوش ہے
اسی میں خوش ہے کہ چڑچڑی ہے
اور کوئی اس سے پیار نہیں کرتا

مظفر اقبال

## الوداع

شاعری کے ازلی دریا میں
مَیں نے بھی اپنا حصّہ ڈالا ہے
شاید یہ جھینگروں کی چیں چیں سے
زیادہ کچھ نہیں
مَیں جانتا ہوں۔
مجھے معاف کردو۔
مَیں خاتمے کے قریب ہوں
میرے اشعار تو چاند کی زمین پر پہلے قدموں
کے نشان بھی نہ تھے۔
اگر یہاں وہاں ان میں روشنی کی
کوئی لہر ہے۔
تو یہ کسی داخلی ضیا کے برعکس
اس زبان سے میری محبت ہے
اشعار جو خاموش لبوں کو تھرتھرائیں
جو دن ڈھلے سُرخ رو کھیتوں سے
گزرتے مشتاق کو
بوسے لینے پر اکسائیں

یہ شاعری ازل سے ہمارے ساتھ ہے
محبت کی طرح
بھوک کی طرح،
وباؤں اور جنگوں کی طرح

ایشی کاوا تاکوبوکو

محمد امین

## اُداس کھلونے

آج مَیں کچھ مطمئن ہوں
جس طرح ہم گندے ہاتھ دھوکر مطمئن
ہوتے ہیں۔
یہ سال تو کچھ نہ کچھ اچھا گزرے گا۔
آج کی صبح آسمان صاف ہے۔ اور ہوا ابھی
نہیں چلتی۔
جس طرح جلتی شمعیں آہستہ آہستہ ختم ہو
جاتی ہیں
اسی طرح رات آنے والی ہے۔

---

کبھی کبھی میرے اشعار
شرمندگی کی حد تک لایعنی تھے
لیکن میرے پاس
کوئی عذر نہیں
میرا یقین ہے کہ
خوبصورت لفظوں کی تلاش
مرنے مارنے سے بہتر ہے۔

یہ آخری دن کیسا ہے
صبح ضرور کوئی نہ کوئی اچھائی ہوگی
تنہائی دل کو کوستے ہوئے سو جاؤں
اس بچے کے چہرے سے محبت کرتا ہوں
جو بلی کے کان مروڑتا ہے:
اور بلی کے چلّانے پر حیران ہوکر خوش ہوتا ہے
نبض دیکھنے والی نرس کی گرمجوشی کیسی ہے
کبھی ہاتھ سرد ہوتا ہے۔
اور کسی دن سخت
گھر واپسی کا وقت ہوا (مَیں نے سوچا) میرا
کوئی بھی منتظر نہیں۔
(اس لئے) مَیں سارا دن کام کرتا رہا۔
مجھے شک ہوا۔ کہیں قسمت مجھے
بستر پہ ملنے آئے۔
آدھی رات کے وقت احساسِ جرم سے میری
رضائی بھاری ہوگئی

منصورہ احمد

# ایملی ڈکنسن کی نظمیں

(۱)

مَیں آہستہ اور محتاط قدموں سے
ایک تختے سے دوسرے تختے تک چلتی رہی
حتیٰ کہ
میرا سر تاروں کو چھونے لگا
اور سمندر میرے قدموں تلے آ گیا
مَیں صرف یہی جانتی تھی کہ
اگلا قدم آخری ہوگا
اس احساس نے میری رفتار کو
غیر یقینی اور پُر خطر بنائے رکھا
اور کچھ لوگوں نے مجھے بتایا کہ دراصل اُس کا نام تجربہ ہے۔

(۲)

شاعر دیئے جلاتے ہیں
اور خود بجھ جاتے ہیں
لیکن اُن کے جلائے ہوئے چراغ
اگر تابانی سے روشن ہوں
تو سورج کی سی حرارت سے
ہر دور کو ایک محدب عدسہ دیتے ہیں
جو اُن کی سوچ کا محیط
پھیلاتا چلا جاتا ہے
(اور تاریکی ہارتی رہتی ہے)

جولائی ۸۱ء

(۳)

بظاہر کسی خاص تاثر کے بغیر
کُہر کا سفاک ہاتھ
ہنستے مُسکراتے پھول کا خاتمہ کر دیتا ہے
اور کچھ بھی نہیں ہوتا
خوبصورت قاتل آگے بڑھ جاتا ہے
اور سورج بھی اپنے خدا کو
خوش کرنے کے لیے
ایک اور دن کی مسافت
ناپنے لگتا ہے۔

جون ۱۹۸۲ء

ڈانتا اور ڈینا
نسیم سحر

# ایک لمحہ

آج کل معجزے کہاں رونما ہوتے ہیں!
دنیا ایک خشک ناپسندیدہ جگہ ہے
جہاں یا تو بارش ہوتی ہے، یا برف گرتی ہے
بھلا خشک، بے کیف کام کے دنوں کے بارے
میں کیا شاعری ہو سکتی ہے!

صبح اپنے دامن میں بے داغ دھوپ لے کر
ہم تک آتی ہے
لیکن شام گھٹنوں گھٹنوں کیچڑ میں ہوتی ہے
دل سڑک کے کنارے قبر میں دفن ہوتا ہے
شام کو معلوم ہے اسے کس چیز سے
نفرت اور کس سے محبت تھی۔

ماہ و سال ہمارے خوابوں کی فاختاؤں کو
پنجروں میں اسیر کر دیتے ہیں
اور پھر ایک لمحہ انہیں رہائی دے دیتا ہے!
زندگی کی چکّی
ہمارے لیے روزانہ مُٹھی بھر آٹا پیستی ہے
کہتے ہیں کہ آج کل معجزے رونما نہیں ہوتے؛
لیکن ـ جان ـ تمہارے بارے میں یہ معجزہ نہیں تو
کیا ہے؟
کہ مَیں نے (تمہیں دیکھ کر) انگلی کا اشارہ
تک نہیں کیا تھا
کہ تم سیدھے میرے بازوؤں میں چلے آئے۔

اکتوبر ۱۹۷۹ء

مسز سروجنی نائیڈو
اثر لکھنوی

# بوڑھی بھکارن

اِک ضعیفہ غریب اور تنہا — بیٹھی رہتی ہے رات دن سرِ راہ
وہ ہے ناچار و خانماں برباد — صرف برگد کا پیڑ جائے پناہ

سُنتی ہے چاپ ایسے قدموں کی — جن کی تیزی میں گونجتی ہے اُمنگ
زندگی کی برات جاتی ہے — ولولے ہیں خوشی سے ہم آہنگ

ہے توقع مدد کی تم سب سے — لیکن اکثر وہ رہتی ہے ناکام
منہ میں پڑتی نہیں ہے کھیل اُڑکر — بارہا لے کے صبح سے تا شام

قافلہ ہے سوئے دوام رواں — رنگ رلیاں وہاں منانے کو
سیر کر کے جہانِ فانی کی — اس کے آلام بھول جانے کو

دامنِ صبر پھر بھی ہاتھ میں ہے — لب پہ آجائے کیا مجال گلہ
دھوپ ہے، لُو ہے آندھی پانی ہے — وہ ہے اور روگ، مفلسی فاقہ

کانپتے ہاتھوں میں ضعیفہ کے — ٹوٹا پیالہ ہے ایک چینی کا
کیونکہ یہ آس ہے، ترس کھاکر — ڈال دے کوئی بھیک کا ٹکڑا

منتظر ایسے خواب نوشیں کی — جس سے بیدار پھر نہیں ہونا
آفتوں کا جہاں ہجوم نہیں — خامشی اور قبر کا کونا

وہ ہے محتاج اور خمیدہ پُشت — آہ بینائی سے بھی ہے محروم
روزِ روشن ہنسی اُڑاتا ہے — پھر بھی ہوتی نہیں کبھی مغموم

اُس نے کیا کیا تسلیاں دی ہیں — اپنے شوہر کو نوجوانی میں
سختیاں کیسی کیسی جھیلی ہیں — اپنے بچے کی پاسبانی میں

دل قوی، استوار ہے ہمّت — تھرتھراتی ہے گو نحیف آواز
نغمۂ حمد اس کے لب پر ہے — جس کی بیحد لطیف ہے پرواز

وہ جو بوڑھی ہوئی تو کوئی نہیں — اس کے آرام کی جو فکر کرے
دمِ آخر جو دم دلا سا دے — آنکھ بھر آئے، ٹھنڈی سانس بھرے

مہرباں، یا خلاف ہو دنیا — جس میں ہر سمت شادمانی ہے
اس کی ڈھارس کو ہے یہی کافی — لاکھ پیری کا ہے ناتوانی ہے

نہ کوئی ٹھہرے دلدہی کے لئے — نہ ہو کوئی مدد پر آمادہ
پئے تسکینِ قلبِ تفسیدہ — ہے بہت یہ عقیدۂ سادہ

کلمۂ لا الٰہ الا اللہ، — کلمۂ لا الٰہ الا اللہ،
یا محمدؐ نبی رسول اللہ — یا محمدؐ نبی رسول اللہ

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جب مالک اشتر رضی (وفات ۳۷/۳۸ ھجری)
کو مصر کا گورنر بنایا تو جو ہدایات جاری کیں اُن میں سے ایک یہ تھی :

مظلوم اور نادار افراد کو وقتاً فوقتاً خدا کو
حاضر ناظر جان کر ملنا اور اُن سے دل کھول
کر بات چیت کرنا ۔ اُس وقت اپنے مسلح
حفاظتی دستوں، سول افسروں، پولیس یا خفیہ
کارندوں کو اپنے قریب نہ رہنے دینا، تاکہ
غربا اور ناداروں کے نمائندے تم سے آزادی
اور بیباکی سے اپنی شکایات کر سکیں ۔
کیونکہ میں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے
سُن رکھا ہے کہ کوئی قوم یا معاشرہ اعلیٰ مقام
حاصل نہیں کر سکتا جس کے طاقتور لوگ کمزوروں
سے فرائض ادا نہیں کرتے

محمد باقر

عکس تحریر۔ ڈاکٹر محمد باقر

افسانے

# گزرے دنوں کی یاد

احمد علی

اب یہ بتانے سے کیا فائدہ کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔ بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ میری زندگی میں تھوڑی سی راحت رہی ہے لیکن زیادہ تر درد و درماں۔ اب تو رنج سہتے سہتے دل سُن ہو چکا ہے اور یاد کی ورق گردانی کرتے کرتے دماغ کو ہر چیز دُھندلی معلوم ہوتی ہے۔ ماضی کے غبار کی تہیں جمتے جمتے ایک پپڑی سی جم گئی ہے اور اصلی سطح کا نام و نشان بھی باقی نہیں۔

زمانہ تھا کہ ہر چیز صاف دکھائی دیتی تھی اور جو کچھ بھی کان سُنتے تھے اس میں صبح کے نغموں کی طرح ایک تازی گونج اور سنہری راگ تھا لیکن اب تو ہر آواز ٹیلی فون کے تاروں پر بدلی بدلی سُنائی دیتی ہے، مگر اس کے باوجود بھی کوئی کوئی آواز کانوں کے میل کو پار کرتی ہوئی دل تک اُتر جاتی ہے اور دماغ میں پھر پُرانا سا ہیجان پیدا کر دیتی ہے اور وقت کے سیاہ پردوں کو پھاڑتی ہوئی ماضی سے نکل کر حال کی ساکت زندگی میں پھر ایک نئی اُمنگ اور جذبہ پیدا کر دیتی ہے۔ جیسے ایک پتھر پانی میں چھوٹی چھوٹی لہریں پیدا کر کے اس کے سکوت کو برباد کر دیتا ہے حالانکہ تھوڑی ہی دیر میں ہر قطرہ پھر اپنی اپنی جگہ خاموش اور ساکت ہو جاتا ہے۔

آج صبح کو ٹیلی فون پر کسی کی نرم اور جذبہ سے بھری آواز آئی۔ میں نے پوچھا کون ہے۔ تو جواب ملا:۔

"تم بتاؤ"

میں نہ تو کسی کے ٹیلی فون کا انتظار کر رہا تھا اور نہ مجھے یہ اُمید تھی کہ کوئی پرانی ہمنوا و ہمزاد مجھ کو اتفاقیہ یاد کرے گی چنانچہ جو نام بھی میرے منہ میں آیا میں نے لے ڈالا:۔

"شیلا"

"اور بتاؤ"

میں نے جواب دیا: "سنتوش"۔ لیکن افسوس کہ یہ بھی غلط تھا۔ میں نے فوراً ہی کہا:۔

"مایا"

"خیر کوئی بات نہیں۔ خدا حافظ"۔ لیکن "خدا حافظ" کہتے وقت آواز درد سے کانپی اور خاموش انجان میں کھو گئی۔

میں دل مسوس کے رہ گیا۔ میرے جسم میں گرمی سی دوڑ گئی اور میرے کان بجلی کی تیز گام لیکن ہلکی لہروں سے جلنے لگے اور گرم ہو گئے پھر اس تفاوت ہیجان سے میرا خون رگوں میں رُک گیا۔ میں نے بھی کیا غلطی کی جو اور عورتوں کے نام یکے بعد دیگرے لے ڈالے۔ میں اپنی غلطی پر اپنے آپ کو بُرا بھلا کہنے لگا۔ یہ حالت کچھ دیر قائم رہی۔ آواز بہت پیاری اور محبت کے ہیجان پیدا کرنے والے جذبہ سے بھری ہوئی تھی۔ بولنے والی کوئی دردبھری مجبوبہ تھی مگر وقت نے میرے کانوں پر کچھ ایسا پردہ ڈال دیا تھا کہ وہ حُسن کی اصلیت کو پہنچنے سے

قاصر تھے۔ مجھے کب اس سے محبت تھی؟ اس نے مجھ سے کیا کیا پیار کی باتیں کی ہوں گی۔ میں نے کس کس طرح اپنی محبت کا اظہار کیا ہو گا؛ لیکن محبت کے درد سے میں اب کچھ ایسا سُن ہو گیا ہوں کہ اس نئی چوٹ کو بھی بھلانے کی کوشش کرتا رہا۔ اگر کوئی چیز ہاتھ سے جاتی رہی ہو، اور اتفاق سے پھر وہی چیز اندھیرے میں قریب سے آکر کان میں وہی محبت بھرے جملے دہرائے اور پھر تاریکی میں غائب ہو جائے تو قلق اور بھی سوا ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میری ہوئی۔ پھر میں نے کہا کہ آواز سے ابھی تک محبت ٹپکتی تھی اور ان تینوں عورتوں کے نام لینے سے اس کی رقابت اور بھی بڑھ گئی اس لئے اس نے ٹیلی فون رکھ دیا لیکن جب اس کے دل میں رقابت کی آگ ابھی تک باقی تھی تو یقیناً اس کے دل میں میری محبت بھی باقی ہے، اور وہ دوبارہ بات کرے گی۔ کیا پچھلی محبت پھر موج میں آجائے گی؟ پھر وہی سمندر ہوگا اور وہی پریم کی کشتی اور میں جذبات کے چپوؤں سے حُسن کی ناؤ کھیتا ہوں گا۔

اگر میں ان لڑکیوں کے نام نہ لیتا تو شاید وہ مجھے اپنا نام بتا دیتی۔ ان جانے ہوئے ناموں نے مجھ کو اس کا نام جاننے سے محروم رکھا مجھے تو کہنا چاہیئے تھا کہ چونکہ مجھے اتنی لڑکیاں یاد کرتی ہیں کہ دُور دراز کی آواز کو پہچاننا ممکن نہیں اور یہ کہ میری موجودہ زندگی کی غلاظت سے حُسن دُور بھاگتا ہے۔ مجھے کہنا چاہیئے تھا کہ آواز دلگداز اور پیاری ہے ۔ ۔ ۔ ۔

میں ان خیالوں میں غلطاں و پیچاں تھا اور حالانکہ میں اپنے دل کو یہ سب کہہ کر تسکین دے رہا تھا۔ لیکن انجان جذبہ سے میرے ہاتھ پیر کمزور ہو گئے تھے مگر ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجی۔ وہی دلکش آواز فاصلہ کی مجبوریوں کو عبور کرتی ہوئی درخت اور دریا، اور پہاڑوں کو کودتی پھاندتی تیز روی پر ثابت قدمی سے پھر آئی۔ اس میں وہی درد اور وہی جذبہ تھا۔

"نہ تو میں شیلا ہوں۔ اس نے کہا۔" نہ سنتوش اور نہ مایا۔ میں ماضی کی ایک آواز ہوں۔ میں کون ہوں، یہ تم بتاؤ۔ کیا میں ابھی تک تم کو یاد ہوں؟"

میں نے کہا:۔

"آواز بہت دلکش اور دلگداز ہے۔ اس میں درد ہے اور محبت بھی لیکن تم جانتی ہو کہ ٹیلی فون پر آواز کا پہچاننا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ آواز بدل جاتی ہے اور اس کے علاوہ ہمیں زکام بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے پہچاننے میں دقت ہو رہی ہے:"

"یہ ٹھیک ہے" اس نے کہا۔

"تو اس لئے یہ کہہ دینا کہ کس کی آواز ہے بہت مشکل ہے:"

"یہ کوئی بات نہیں:"

مجھے واجد علی شاہ کی درد بھری ٹھمری یاد آگئی:۔

"یہ کوئی بات نہیں۔ تم جاؤ للہ، جو بھئی سو بھئی:"

لیکن میں نے ماضی کے دَور کو ظاہر کرنے سے گُریز کیا۔ میرے دل میں درحقیقت محبت کا درد پھر اُبھر آیا تھا اور حالانکہ میں آواز سے اس کے جسم کے نقوش نہ دیکھ سکتا تھا۔ حالانکہ میں یہ بھی نہ بتا سکتا تھا کہ وہ کون ہے تاہم اس کی آواز میں ماضی کا سمندر موجیں لے رہا تھا؛ جب کہ زندگی میں احساس تھا۔ حُسن میں شوخی اور عشق میں گرمی۔ موجودہ آواز اس ماضی کی تھی جب میں زندہ تھا۔ یہ کہ وہ ماضی کی آواز تھی۔ اس میں ذرہ برابر شک نہیں۔ میرے دل نے مجھے فوراً بتا دیا تھا کہ آواز حال کی آواز نہ تھی اس لئے بغیر سوچے سمجھے جو نام میری زبان پر آئے وہ ماضی سے تعلق رکھتے تھے۔ کسی اور زندگی سے جو حال سے صدیوں دُور ہے۔ ایک اور نام میرے منہ پر

آتے آتے رہ گیا۔ اگر وہ ذرا اور ٹیلی فون کو بند نہ کرتی تو میں چوتھا نام بھی لے دیتا۔ ایک پانچواں نام بھی میرے ذہن میں تھا جس کو میں اب دہرانا چاہتا تھا۔ وہ کون تھی اور کیا تھی؟ خالی یہ کہہ دینا کہ وہ ماضی کی آواز تھی کافی نہیں۔ بہت سی عورتیں تھیں جن سے مجھ کو محبت رہی ہے اپنے دور میں ہر ایک لاجواب اور حسین تھی۔ وہ میری دلربا محبوبائیں تھیں اور میں ان کا سوگوار عاشق لیکن اور بھی رہی ہوں گی جن کی محبت مجھ پر ظاہر نہ ہوئی۔ جن کو میں نے اپنی محبت کا قصّہ کبھی نہ کہہ سُنایا تھا۔ وہ تو میرے دل میں ایک ٹیس بن کر رہ گئی تھیں۔ وہی ٹیس جو اس وقت میرے گھائل سینہ میں پھر اُٹھ رہی ہے۔ اب پچھلے قصّے دہرانے سے کیا ہوتا ہے؟

"تم جاؤ للہ جو بھی ہو سو بھی"!

زندگی ایک بند گنبد ہے۔ اس کونے میں ماضی ہے۔ اس میں حال۔ اس میں مستقبل۔ ماضی پر سے پردہ ہٹ چکا ہے اور اس کی تصویر ایک سبزہ زار کی طرح پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہ میدان ہے۔ یہ دریا اور یہ پہاڑ۔ یہ سمندر، اور سمندر کے پرے اور بھی ملک ہیں۔ اور یہاں بھی مختلف یادیں مامر غزاروں اور وادیوں میں میری محبوباؤں کی شکل میں رقصاں ہیں۔ یہ لیلاؔ۔ یہ مایاؔ۔ یہ سنتوش۔ یہ سلیمہ ہے۔ یہ اینجیلاؔ۔ ہر گوشہ میں ایک ایک تصویر ہے اور ہر ایک ایک کے بیچ بیچ میں اور تصویریں ہیں۔ یہ وہ آنکھیں ہیں جو نرگس سے زیادہ نرم اور عشق سے زائد بیمار ہیں۔ ان میں سفیدی ہے۔ سیاہی ہے اور خون کی سرخی۔ محبت کے نشے سے آنکھیں چُور ہیں۔ جذبہ میں دل کی ہمراز۔ ان کی تہ میں میرے دل کی قبر ہے اور ان کی چمک میں میرے عشق کی آگ۔ اب بھی میرے مردہ دل میں وہ گھر کئے ہیں۔ اب بھی ان کا جادو میرے خون میں پوشیدہ ہے یہ وہ باہیں ہیں جو میری گردن میں دن رات پڑی رہتی تھیں جن کی گرمی رگِ جان سے میرے دل تک پہنچتی تھی۔ یہ وہ بال ہیں جو میرے شانوں کو سردی سے محفوظ رکھتے تھے جو اپنی سیاہی میں تاروں کی آب و تاب لئے تھے۔ یہ وہ چھاتیاں ہیں جو میرے سینہ کو تسلی بخشتی تھیں۔ لیکن اب تو وہ خواب ہو گئیں یہ باتیں۔ حُسن ناپائیدار ہی یاد ناپائیدار نہیں۔ عشق لازوال ہے۔ پر دل پارہ کی طرح بے قرار اور وقت ہر چیز پر خاک ڈال دیتا ہے۔ ان باتوں کو دہرانے سے اب فائدہ؟ صرف یک یاد ہے جو پَر سے زیادہ ہلکی ہے اور پہاڑوں سے زیادہ بھاری۔

"اگر تم ہنسو تو شاید میں تمہارا نام بتا سکوں"!

دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔

"اچھا اب میں خدا حافظ کہتی ہوں"!

"ذرا ٹھہرو۔ دیکھو میرے سامنے ایک تصویر رکھی ہوئی ہے۔ ایک ترکی بچّہ نے بنائی ہے۔ تین گھوڑے ہیں۔ نچلا چھوٹا۔ بھدا۔ بے ہنگم ہے ایک بونے کی طرح۔ اس کے اوپر والا لمبا ہے۔ اور اس کے ایال کسی ڈراؤنے اور بھیانک گرگٹ کی خاردار دُم کی طرح ہے۔ تیسرا ایک مچھلی کی طرح ہَوا میں اُڑ رہا ہے۔ . . ."

ادھر سے ایک دبی ہوئی ہنسی کی آواز آئی۔ لیکن پوری طرح کھلنے نہ پائی تھی کہ بند ہو گئی۔

"تم نے ہنسی بھی روک لی . . ."

"خیر کوئی بات نہیں"۔ آواز میں ابھی تک وہی نرمی اور محبت۔ وہی جذبہ تھا۔

"میں تو صرف اتنا پوچھنا چاہتی تھی کہ تم کیسے ہو . . ."

میں جو محبت سے مایوس ہو چکا تھا یہ ہرگز نہ جانتا تھا کہ ابھی تک کسی کے دُکھے ہوئے دل میں میری یاد باقی ہے۔ میں جو محبت کو

بھول چکا تھا۔ اس بات کا یقین نہ کر سکتا تھا کہ کوئی ایسا بھی ہے جس کو اگلی محبت یاد ہے۔ جس کے پہلو میں دل ہے اور دل میں سوز و ساز۔ میرا دل تو مر چکا ہے، اس میں نہ تو اُمید کی کرن باقی ہے نہ عشق کا داغ۔ اگلی بہاریں کب کی خزاں بن چکیں۔ حُسن والوں نے چمن کے پھول توڑ کر مسل ڈالے۔ دنیا نے میرے سب غروروں کو مٹا دیا تھا۔ میرے خواب اور میری ناممکن توقعات غیر حقیقی ثابت ہو چکی تھیں۔ جب تک مجھ سے بن پڑا میں اپنے خوابوں کو سینہ سے چمٹائے رہا لیکن بندر کے مرے ہوئے بچے کی طرح وہ آخرکار ایک ایک کر کے مجھ سے جُدا ہو گئے۔ چونکہ میری توقعات بہت گہری تھیں۔ میری خواہشات اس دنیا کے لیے ناممکن، اس لیے وہ کبھی پوری نہ ہو سکیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ خواب پورے ہو سکتے ہیں امیدیں بر آجاتی ہیں لیکن صرف اسی وقت جب کہ انسان اس چیز پر قانع رہے جو میسّر ہو سکتی ہے مگر جوں جوں خواہشیں پوری ہوتی جاتی ہیں، انسان اور سوا مشکل اور ناممکن خواہشیں کرنے لگتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ پاس کی چیز ہاتھ آتی ہے اور نہ توقعات ہی پوری ہوتی ہیں۔ زندگی ایک غبار ہے۔ جب ہوا میں رہا آندھی رہا۔ جب بیٹھ گیا تو ریت بن گیا۔ میں نے آندھی کی تمنا میں آنکھیں بھی کھوئیں اور نہ کچھ حاصل کیا اور نہ پایا۔ اب تو آندھی جم کے رہ گئی ہے۔ نہ آگے ہی بڑھتی ہے اور نہ مطلع صاف ہوتا ہے۔ ایک مستقل ریت کی جھڑی ہے کہ دن رات برستی ہے۔ نہ کھُلتی ہے اور نہ ہیجان پیدا کرتی ہے۔ جب تک ہو سکا میں دنیا سے لڑتا رہا اور پھر بجائے اس چیز پر قناعت کرنے کے جو مل سکتی تھی تھک ہار کے بیٹھ رہا اور اب جب کہ ماحصل قریب تھا جب کہ میں کم از کم اپنے خیال میں اس بات کے لیے تیار تھا کہ اس تک پہنچ کے آرام کروں تو منزل ایک سراب نکلی۔ نہیں وہ قریب تھی پر کمند دو چار ہاتھ چھوٹی رہی اور میں اس تک نہ پہنچ سکا۔

"خدا کے لئے اب تو نام بتا دو" میں نے عاجزی سے کہا۔

"اب اس سے کیا حاصل" وہ نہ جانتی تھی کہ شاید مرجھائے ہوتے پھول پھر زندہ ہو جائیں وہ تو محبت کے غرور سے ابھی تک بھری ہوئی تھی۔ لیکن میں زندگی کی مار سے بے جان ہو چکا تھا۔ وہ شاید اس خیال میں تھی کہ میں ابھی تک وہی عاشق ہوں لیکن میرا دل بُجھ کے راکھ ہو گیا تھا ممکن ہے کہ اس کی گرمی سے میرے دل میں بھی دوبارہ گرمی آجاتی۔

"صرف اتنا بتا دو کہ تم کیسے ہو"

"بس زندہ ہوں۔ نہ مرتا ہوں نہ جیتا ہوں۔ ماضی کی آگ بھڑک کے بُجھ گئی۔ مشینوں نے زندگی کی اُمنگ چھین لی۔ نہ وہ خوشرنگی رہی۔ نہ جوش۔ اب تو فقط یاد ہی یاد باقی ہے اور اس میں بھی سوز باقی نہیں۔ تمہاری آواز سُن کے جیسے جان میں جان آئی، اور وقت کے سیاہ پردے ہٹتے نظر آتے ہیں . . . ."

میری گفتگو کے بیچ بیچ میں وہ آہستہ آہستہ "ہوں ہوں" کہتی رہی پر اتنے ہلکے سے جیسے وہ اپنے دل کو اس احتیاط سے مسل رہی ہو کہ جذبہ کی آواز مجھ کو نہ سنائی دے مگر تار اور رکاوٹیں بیکار ثابت ہوئیں اور اس کی کوشش کے باوجود بھی اس کے دل کی آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی۔

"لیکن تمہیں میرا نام تو معلوم نہیں"

میرے دل پر چوٹ لگی۔ کاش کہ میں اس کا نام بتا سکتا۔ محبت مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ میں اس کے سانس تک کی آواز سُن رہا تھا لیکن کیا مجبوری کا عالم تھا کہ رگِ جاں کی طرح قریب ہوتے ہوئے بھی میں اس کو نہ چھُو سکتا تھا۔ زندگی ہوا میں ایک کاغذ کی طرح اُلٹتی پلٹتی معلوم ہونے لگی۔ سورج کی روشنی کونوں کھدروں میں پڑ رہی تھی اور یاد مجھ سے بہت دُور فضا میں گھوم رہی تھی . . . .

"تم مجھ سے دور ہو۔ اگر تم مجھ کو پتہ دو تو میں تم کو ڈھونڈ لوں گا۔"

"اب کیا فائدہ۔ میں رات کو جا رہی ہوں۔"

"اس لئے تم سے ملنا اور بھی ضروری ہے۔"

وہ ہچکچائی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی قوتِ ارادی کمزور ہو چلی تھی اور وہ مجھے اپنا نام بتانے والی تھی لیکن اس نے کہا:۔

"نہیں اب جانے دو۔ میں بند کرتی ہوں۔ . . ."

درد اور یاس اور تمنا کی مجبوری سے میں نے کہا:۔

"نہیں نہیں۔ ذرا ٹھہرو۔ میں تمہارا نام بتائے دیتا ہوں۔ . . ."

"اچھا خدا حافظ۔ . . ."

"دیکھو۔ دیکھو۔ نینا۔ . . ." میں نے اس کا نام لے ہی ڈالا۔ وہ ذرا دیر بس ایک لمحہ کو جھجکی اور کہا۔

"خدا حافظ۔ . . ."

میں بے جان ٹیلی فون کو بڑی دیر تک کان سے لگائے رہا پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے رکھ دیا۔ کیا وہ نینا تھی؟ میں کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ میرے دل نے اس بات کی گواہی نہ دی۔ یہ ایک اور نام تھا۔ جو میں نے پہلے ناموں کی طرح لے دیا تھا۔ نہ جانے اس نے سنا بھی یا نہیں۔ میں نے نام بہت آہستہ سے لیا تھا۔ غالباً یہ بھی غلط تھا۔

میں سوچتا رہا کہ وہ آخر کون تھی۔ میرا دماغ معطل ہو چکا تھا۔ ماضی سے تصویریں نکل کر میری آنکھوں کے سامنے نہ آئیں۔ میرے ذہن میں بہت سے نام یک وقت آئے اور پھر سب ایک دوسرے میں مل کر کھو گئے۔ صرف ایک ہیجان اور جذبہ کی کیفیت مجھ پر طاری رہی جس میں سب محبتیں اور سارا ماضی موجود تھا۔ آواز کسی معمولی محبوبہ کی آواز نہ تھی۔ اس میں نہ صرف میرا ماضی گونج رہا تھا بلکہ محبت بھی۔ میرا دل رونے لگا۔ میری روح سوگوار تھی۔ یاد ایک جذبہ بن کے میرے اندر سما گئی۔

عورت کا دل کس قدر سخت اور ملائم ہوتا ہے۔ جب میں عشق کرتا تھا، تو اس کا دل پتھر تھا اور جبکہ وہ محبت میں مبتلا تھی تو اس کا دل موم تھا لیکن یاد کے برفانی طوفان نے اس کو اور بھی جما دیا اور موم بھی میرے لئے سنگِ خارا بن گیا اس نے دیکھ لیا کہ وہ اکیلی میرے دل میں نہ بسی تھی۔ ماضی کی اور بھی آوازیں اس میں بند تھیں۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ میرا دل اب ویرانہ ہے۔ اس کی چٹانیں ٹوٹ ٹوٹ کر ریت بن چکی ہیں اور اب ماضی کی آوازیں بھی اس میں نہیں گونجتیں۔ اس وقت جب کہ وہ خود بولی تو میں پرانی آوازِ بازگشت نہ سن سکا صرف اس کی آواز ہی آواز کان میں آئی لیکن اس کی مضراب نے وہ خاص پرانا نغمہ نہ چھیڑا جس کو سن کر درست ہو جاتی۔ میرے دل کے ساز میں اب موسیقی پیدا کرنے کی طاقت ہی باقی نہ رہی تھی۔ صرف یاد اُبھر آئی۔ لیکن یاد بھی ایسی جس میں آوازیں اور جذبات سب مل کے ایک ہو گئے تھے اور نہ تو میں ان کو علیٰحدہ علیٰحدہ کر سکتا تھا اور نہ الگ الگ کر کے ایک کو ایک سے جوڑ سکتا۔ یاد ایک پَر کی طرح ہلکی پھلکی بھی ہوتی ہے اور ایک پہاڑ کی طرح بھاری بھی۔ میں یادوں کے بار کو اپنے دل میں لئے پھرتا ہوں۔ ان کے قافلے میرے دماغ میں گشت کرتے ہیں لیکن مجھے بوجھ تک نہیں معلوم ہوتا۔ وہ اکیلی سب محبوبائیں بھی تھی اور کوئی بھی نہ تھی۔ میں نہ تو وہ ہونٹ دیکھ سکتا تھا، جن کی شیرینی کے مزے میری زبان ابھی تک لے رہی تھی۔ نہ تو بانہیں میرے گلے میں تھیں۔ نہ وہ آنکھیں اپنی محبت کے جادو سے مجھ کو اپنی طرف کھینچ رہی تھیں لیکن وہ سب جذبات ایک یاد بن کر میرے اندر سما گئے تھے اور ماضی کا راگ کانوں میں بج رہا

تھا۔

کیا وہ واقعی زندہ حقیقتیں تھیں۔ کیا وہ واقعی اصلیت کا پتہ دے رہی تھیں؟ لیکن نہ کسی عورت کو مجھ سے محبت تھی نہ ہی میں نے کسی سے عشق کیا۔ یہ سب میرے تخیل کی تصویریں تھیں، جو پٹ بیجنوں کی طرح چمکیں اور غائب ہوگئیں۔ نہ میں تھا۔ نہ وہ تھیں نہ محبت میرے ہونے سنے ان کو مجھ سے چھین لیا۔ زندگی بہت کٹھن، درد انگیز اور سنگلاخ ہے....

جنوری ۱۹۵۵ء

مسافر! تو کہاں سے آیا ہے؟

"ماضی کے اندھیرے غاروں سے،

"اندھیرے تو آج بھی ہیں"

"میرے ہاتھ میں مٹی کا دیا ہے — روشنی میرے ساتھ چلتی رہی ہے"

"تیری منزل کہاں ہے؟"

"وہ — دور نور کے نشان افق — ایک روز میں اپنی یہ

ننھی سی لو اس کی بے کراں روشنیوں میں شامل کر دوں گا"

"خود چپ چاپ وادیٔ خاموشاں میں اتر جاؤں گا"

"مٹی کا دیا" کا اختتامیہ

مرزا ادیب

عکس تحریر:۔ مرزا ادیب

# خزاں نے لوٹ لیا

حجاب امتیاز علی

بیگم نجم کے سالانہ جشنِ رقص و محفل سرود سے لوٹتے ہوئے رستے میں مجھے خزاں کی تیز رفتار آندھی نے آلیا۔ خیال آیا آج زلیخی کی شادی کی پانچویں سالگرہ ہے، جب تک آندھی تھمے اسے مبارکباد ہی دے آؤں۔

اپنی ناکام عشقیہ شادی کے بعد اس نے اپنی تمام سہیلیوں سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ البتہ اس سے کبھی کبھی سرِ راہے مختصر ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔

آج کئی دنوں کے بعد اپنی سہیلی کی اقامت گاہ پر پہنچ کر میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ زلیخی نے دروازہ کھول دیا۔ مجھے دیکھتے ہی آنکھیں پھاڑ کر بولی "تم روحی! ——— رستہ بھول کر آئی ہو؟"

اس کے طنزیہ فقرے کو سن کر میں نے ضبط کر لیا، پھر بولی۔ "دراصل مجھے کسی کی خلوت میں مخل ہونا ناپسند ہے۔ آج تمہیں شادی کی سالگرہ پر مبارکباد دینے چلی آئی۔"

"آندھی کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی، اندر آؤ نا ——— " وہ مجھے اندر لے جا کر لکھنے کی میز کے پاس ایک مومی شمع کے مقابل بٹھاتے ہوئے بولی "خزاں کی رات ہے۔"

"ہاں بہار کب کی گزر چکی! مگر ہم سب کا خیال تھا کہ آج ہمارے ہاں کچھ نہ کچھ اہتمام ضرور ہوگا۔ شادی کی سالگرہ کا دن ہے۔"

"تم سب کا خیال تھا! ——— " وہ ایک پھیکی ہنسی ہنس پڑی۔ پھر ذرا سے توقف کے بعد بات ٹالنے کے انداز میں پوچھنے لگی۔ "آ کہاں سے رہی ہو؟"

"بیگم نجم کے جشنِ سرود سے" میں نے اپنی زریں شال شانوں پر سے گرا دی اور اعصاب کے سکون کے لیے اوڈی کلون سونگھنے لگی۔

"آہ بیگم نجم کے سالانہ جشنِ سرود سے!" اس نے بے قابو لہجے میں کہا، پھر درد انگیز طریق پر مسکرا کر بولی: "نجانے ان کے یہ سب جشن کتنوں کی زندگی کی محفلیں برہم کریں گے! وہاں میرا تو کوئی ذکر نہیں ہوا؟"

"چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔"

"کہ میں نے غلط شادی کی؟"

"اور اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی ماری۔"

"زبانِ خلق کو کون روک سکتا ہے، روحی؟"

"صرف انسانی کردار، زلفی!"

اس کے بعد تھوڑی دیر کے لیے خاموشی طاری ہو گئی۔ وہ ایسی خزاں کی رات تھی، بے حد ویران اور بہت ہی کالی۔ آندھی کا خوفناک شور ساحلوں پر واویلا کر رہا تھا۔ ہوائیں چیخ چیخ کر رو رہی تھیں۔ پتے زندگی کی فنا کی یاد تازہ کر رہے تھے۔ فضا کی اس پراگندگی نے مالیخولیا کی سی کیفیت طاری کر دی۔ میں نے اپنے دستی بٹوے میں سے نکال کر برومائڈ کی ایک گولی نگلی اور غمگین آواز میں پوچھا۔ "فیروز کیسے ہیں؟"

دو لمحے وہ چپ رہی۔ پھر بولی۔ "ویسے ہی! ایک لمحہ ڈوبتے اُبھرتے تنکے کی طرح! شراب نے ان کے دل و دماغ و جگر کو دیمک کی طرح چاٹ کر کھوکھلا کر دیا ہے۔ فن کا وہ پرستار اب زندگی کا منکر ہو رہا ہے بعض وقت تو روحی! مرا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں فیروز سے بیزار ہو گئی ہوں۔"

"اور کیا مطلب ہے؟ جب تم بیزار نہیں ہو تو تمہیں یہ کہنے کی ضرورت ہی کیا آ پڑی ہے کہ تم اس سے بیزار نہیں ہو؟" میں نے فکرمندی سے کہا، پھر بولی:

"پانچ سال پہلے کی بہاریں یاد کرو زلفی! وہ قہقہے، وہ چہچہے، بے فکریاں، وہ محفلیں اور وہ لذتیں ——" میں عہد ماضی کی سیر کرتے کرتے افسردہ سی ہو گئی۔

اس نے تڑپ کر آنکھیں بند کر لیں گویا کہہ رہی تھی کہ

"خزاں کو دیکھ رہے ہیں بہار دیکھ چکے"

لیکن اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ بڑی دیر بعد اپنے آپ کو سنبھال کر اگر کہا تو اتنا کہا۔ "خزاں میں بہاروں کا ذکر نہ کرو روحی! میں انہیں بھول جانا چاہتی ہوں۔"

میں یاس انگیز لہجے میں بولی "انہیں بھولنا اور بھلانا تو تمہارے اختیار میں ہے نہ مرے قابو میں، کسی ٹھوس حقیقت سے گریز کا فائدہ بھی کیا زلفی؟ یہ واقعہ ہے کہ آج سے پانچ سال پہلے کی خزاؤں نے تمہاری بہاریں لوٹ لیں۔ یاد ہے۔ وہ بالکل ایک ایسی ہی خزاں کی پُر شور رات تھی؟"

وہ کانپ کر بولی "اور بیگم نجم کے ہاں محفل سرود منعقد تھی! اسی محفل نے مری زندگی کی محفل ہمیشہ کے لیے درہم برہم کر دی۔ وہاں میں نے آب حیات کے دھوکے میں زہر ہلاہل پی لیا، مگر توبہ! میں بھی کیسی باتیں کر رہی ہوں!! تم سب کے نقطۂ نظر سے میں نے کیسی ہی عظیم غلطی کی ہو، مجھے اس کا مطلقاً افسوس نہیں روحی! کیونکہ مجھے فیروز سے محبت ہے!"

میں نے ایک ترحم آمیز نگاہ اس پر ڈالی۔ "تم بار بار اپنی محبت کا اقرار کر کر کے اپنی مخالفت آپ کر رہی ہو۔ میں نے تو کوئی شبہ ظاہر نہیں کیا تھا!"

وہ بگڑ کر بولی۔ "کون کہہ سکتا ہے کہ مجھے فیروز سے محبت نہیں؟ مانا کہ وہ شرابی ہے، مگر مجھے آج بھی اس سے اتنی ہی محبت ہے جتنی پہلے دن تھی۔" یہ کہتے کہتے اس نے غصے کی بے دھیانی میں شیشے کے میز پر سامنے رکھا ہوا کاغذ کاٹنے کا چاقو، جس کی شکل بالکل تلوار جیسی تھی، ہاتھ میں اٹھا لیا اور گھمانا شروع کر دیا۔

میری نظر اس تلوار سے ٹکرائی۔ "ہوں! میں انسان کو اس کی زبان سے نہیں، اس کی بے اختیارانہ حرکات، اور اس کے کردار

سے پہچاننے کی عادی ہوں زلفی! تم ہوا سے کیوں لڑتی ہو؟ آدمی سے لڑنا سیکھو۔"

رات گہری ہوتی گئی، اور سمندر کے تلاطم کا شور کسی وحشی درندے کی آواز کی طرح سُنائی دینے لگا۔

میرا ذہن آج سے پانچ سال قبل کے ماضی کی ایک رات کی تصویر کشی میں محو ہو گیا۔ خزاں کی پُر شور رات تھی مگر بیگم نجم کے وسیع ایوانوں میں سالانہ جشنِ رقص و سرُود منعقد تھا۔ موسیقی کی درد انگیز تانیں کلاسیکی رقص کے تھمے ہوئے وقفوں میں جذبات میں ایک ارتعاش سا پیدا کر کے قلب کی عجیب کیفیت کر دیتی تھیں۔ خوش باش اور زندہ دل مہمان بقعۂ نور ایوان کے بیچوں بیچ، ہاتھ میں آبِ خوش رنگ کے چھلکتے ہوئے جام تھامے کھڑے تھے اور اپنے رفیقوں اور محبوبوں سے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ کچھ اہلِ جُنوں ایسے بھی تھے جو ان سے الگ تھلگ، کناروں پر دریچوں کے سہارے بیٹھے یا کھڑے ہوئے موسیقی کی دلدوزی پر بے قابو ہو کر سر دُھن رہے تھے اور چشمِ نیم باز سے انسانوں کے اس جیتے جاگتے سمندر کی بیتاب امواج کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ انہی کی صف میں ایک میں بھی تھی، جو ایک پرانی درد انگیز غزل کو سُن کر متاثر ہو گئی تھی اور ایک قدِ آدم فانوس کے پاس تصویر بنی کھڑی تھی کہ دو نوجوان خواتین کے مکالمے نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"یہ پیازی رنگ کی پوشاک میں کون لڑکی ہے جس سے وہ اس انہماک سے باتیں کر رہا ہے؟ وہ تو سُنبل کے عشق میں دیوانہ ہو رہا تھا ابھی اگست کے مہینے کی بات ہے۔"

"یہ ستمبر ہے۔" دوسری نے جواب دیا۔ "اگست کے مہینے کے رومان کو ستمبر تک زندہ رکھنا دقیانوسی پن ہے۔"

دوسری طرف ایک معمّر خاتون اپنی دستی دوربین میں سے پیازی پوشاک والی لڑکی کو بغور دیکھ کر فرمانے لگیں "خدا کی پناہ، آجکل کی عورتیں یہ نہیں دیکھتیں کہ انسان کا باطن کس قسم کا ہے۔ جہاں کسی خوب صورت مرد نے اپنے کوٹ کے کاج میں کارنیشن کی مہکتی ہوئی کلی اٹکا لی اور مسکرا کر ان کو کرسی پیش کی، یا ان کے لئے آئس کریم کی طشتری کہیں سے اُٹھا لایا۔ وہ سمجھیں کہ ہم پر جان دینے لگا ہے۔ اپنے زمانے میں ہم کتنی محتاط ہوتی تھیں۔ کیوں عائشہ؟"

"بے حد محتاط" ان کی بوڑھی سہیلی نے جواب دیا۔ "مگر پھر بھی ترچھی نظروں کی گھائل فوراً ہو جاتی تھیں۔ یاد ہے نواب فرخ کی برقِ تبسّم نے تمہارے خرمنِ آنند پر کس زور کی بجلی —— "

"وہ اور بات تھی —— بالکل اور —— ہم میں اور آجکل کے چھچھورپن میں بڑا فرق ہے۔ عائشہ! ہم محتاط ہوتے ہوئے گھائل ہو جاتی تھیں مگر آجکل کی عورتیں بے احتیاط ہو کر گھائل ہوتی ہیں —— " یہ فرق بتا کر انہوں نے فخر سے اپنے سنہرے دامن سمیٹے، اور مطمئن ہو کر بیٹھ گئیں۔

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا کہ کس کے متعلق چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ سامنے زلفی تھی۔ شگفتہ پیازی رنگ کے ریشم میں ملبوس۔ سیاہ زلفیں شانوں پر بکھیرے، بڑے انہماک سے سر جوڑ کر، ایک سجیلے ڈان جان سے مصروفِ کلام تھی۔ دونوں بے حد جاذبِ نظر معلوم ہو رہے تھے جیسے ہنس کا حسین جوڑا پانی کی لہروں پر تیر رہا ہو! ان کی گفتگو کی طوالت اور ان کی یکجائی نوجوانوں کو پریشان اور مُتفکّر، اور بوڑھوں کو طنز و استہزا پر مجبور کر رہی تھی۔

چند منٹوں کے بعد بیگم نجم میرے قریب سے گزریں "یہ کون شخص ہے شمسہ؟" میں نے پوچھا۔

"ارے! مشہور مصوّر فیروز کو نہیں جانتیں؟ خود تصویرِ حُسن معلوم ہو رہا ہے نا!؟" بیگم نجم نے جواب دیا۔

"ہاں بالکل" میں نے کہا "زلفی کے ان سے پرانے تعلقات ہیں؟"

وہ ہنس کر بولیں "پرانے ہوتے تو ان میں ایسی شیرینی کہاں سے آتی؟"

"ہاں ایسی لگاوٹ ہمیشہ نئے تعارف کی علامت ہوتی ہے۔ مزید برآں میں نے ابھی ابھی اس سلسلے میں اس باکمال مصور کی تعریف سُنی تھی کہ دوستی کے متعلق ان کے خیالات نہایت وسیع ہیں اور نئی دوستی کو ہمیشہ پرانی پر ترجیح دیتے ہیں" میں نے کہا۔

بیگم نجم مسکرائیں: "یہ خوش مذاقی کی علامت ہے —— ایسے ہی لوگ تو رونقِ محفل ہوتے ہیں اور ہر ہنگامے میں مدعو کئے جاتے ہیں۔"

"بے شک۔ رونق کے لئے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا" میں نے جواب دیا۔

ستمبر اور اکتوبر کے مہینے ان دو وارفتگانِ محبت نے دریائے عشق کی غواصی میں بسر کر دیئے اور خزاں میں بہاروں کا مزہ لُوٹا۔ ادھر رواج کے مطابق دقیانوسی دماغ کے مخلص دوستوں نے خلل اندازی شروع کر دی اور اپنے وعظ میں زلفی کو محبت کی اس ڈھلوان چٹان کی قلابازی سے بہت روکا۔ دشتِ محبت کے خاروں سے ڈرایا۔ اس پُرخطر رستہ کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ زلفی نے ان مخلص بے وقوفوں سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر لیا اور اسی زمانے کی بہاروں میں دونوں نے شادی سے فراغت بھی پالی۔ شادی کے چند ہی مہینوں بعد مصور کی جدت اُبھر آئی، چنانچہ اس نے پرانی تصویر سے بیزاری اور نئی سے دلچسپی کا اظہار شروع کر دیا۔ پرانی تصویر ردی کی ٹوکری کے حوالے کر دی۔ زلفی کی بہاروں پر خزاں نے تسلط جما لیا۔

کچھ دیر بعد میں چونک پڑی۔ ماضی کی وادیوں میں بھٹکتے بھٹکتے افسردہ ہو کر میں نے کہا: "نجانے تم پر کیا افتاد پڑی تھی کہ خطرے کی گھنٹیاں بجتی رہیں اور تم پناہ لینے کی بجائے سینہ تان کر کھڑی ہو گئیں۔ اس رات فیروز کا حُسن اور بانکپن قیامت خیز ضرور تھا مگر اس کے ہاتھ میں شرابِ ارغوانی کا جام بھی تو چھلک رہا تھا! جس میں نجانے کتنی زندگیاں غرق ہو چکی تھیں! اس وقت وہ مخمور تھا، قدم مرتعش تھے اور ہاتھ لرزاں۔ پھر بھی تم اس کے دامِ محبت میں گرفتار ہو گئیں!"

اس کا غصہ رفع ہو گیا تھا۔ اب وہ ایک شکستہ پر پرندے کی طرح نظر آ رہی تھی، بے بسی کے انداز میں بولی "پھر کیا کرتی روحی؟ سُنا نہیں آتشِ عشق کے متعلق کیا کہا گیا ہے کہ لگائے نہ لگے اور بُجھائے نہ بنے؛ حُسن آمادۂ پیکار ہو تو عشق ہتھیار پھینک دیتا ہے۔"

ایک لمحہ کے لئے میں متاثر ہو گئی، پھر اپنے آپ کو سنبھال کر کہا "کیا بکتی ہو زلفی؟ اس قسم کا جذباتی اندھا پن مردوں کی ذہنیت ہوتی ہے۔ جذبات کے سیلاب میں ایک حقیر تنکے کی طرح بہہ جانا، مگر عورتیں ان معاملات میں دل سے نہیں ہمیشہ دماغ سے سوچنے کی عادی ہوتی ہیں" —— میں برافروختہ ہو کر بولی۔

"میں اب محسوس کرتی ہوں کہ عقل اور جذبے کے کیا مدارج ہوتے ہیں ——"

"اب محسوس کر رہی ہو! نادان روح! آج سے پانچ سال پہلے تمہارے خیر خواہوں اور دوستوں نے تمہیں کتنا روکا! کتنی اونچ نیچ دکھائی مگر تم ایک ہی وار میں کسی زخمی پرند کی طرح پھڑپھڑاتی ہوئی زمین پر گر چکی تھیں۔ مجبور اور بے بس! میں سوچتی ہوں۔ اس میں بھلا تمہارا بھی کیا قصور؟ تم فطرتاً اذیت میں لذت جو محسوس کرنے کی عادی ہو۔ بعض وقت تم مجھے اسی مدرسۂ فکر کی طالب علم معلوم ہوتی ہو جس سے بعض پُرانے یونانی فلسفی وابستہ تھے، جن کا نظریہ قنوطیت تھا مگر میرا خیال ہے ان پانچ سالوں میں تم اذیت کا خوب خوب لطف اٹھا چکی ہو گی آخر اب اور کیا چاہتی ہو؟"

"بس اب یہی چاہتی ہوں کہ فیروزؔ کی بجائے مجھے موت آجائے۔"

"کیا تمہیں اپنے الفاظ پر یقین ہے؟ مری پیاری! ممکن ہے تم بالکل اس کے برعکس چاہتی ہو، کیونکہ ہم جو کچھ چاہتے ہیں صاف دل سے اس کا اظہار شاذ ہی کرتے ہیں۔ البتہ جو نہیں چاہتے اسے طشت ازبام کرتے رہتے ہیں، حالانکہ اپنے اس فعل سے ہم باخبر نہیں ہوتے۔"

میرا جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ سمندر کی گرج اور بجلی کی کڑک نے دفعتہً فضا میں ایک دھما کا سا پیدا کر دیا، جسے میں نے تو نہیں مگر زلفؔ نے فوراً محسوس کر لیا اور لرز کر بولی۔ "سُنتی ہو روحی! سمندر کا تلاطم اور طوفان کا زور؟"

میں نے اسے بغور دیکھ کر کہا۔ "ہاں سُنتی اور محسوس کرتی ہوں زلفؔ، مگر کس طوفان کا؟"

"کس طوفان کا!! کیا مطلب؟" وہ اداس ہو کر بولی۔ "خزاں کی پریشان رات ہے روحیؔ! یوں فلسفیوں کی سی پیچیدہ گفتگو مت کرو، دم اُلجھتا ہے۔ میں نے بُرا کیا یا اچھا کیا۔ غلطی کی یا نہیں کی۔ جو کچھ بھی کیا اب تو صبر کی سِل سینے پر دھر لی ہے۔"

"میں صبر کی سِلوں کی اس لئے مخالف ہوں کہ ان سے انسان کی قوتِ مقابلہ کمزور ثابت ہوئی ہے۔ صبر آسان اور مقابلہ مشکل ہوتا ہے۔ جو شخص ڈٹ کر کسی مُصیبت یا ظُلم کا مقابلہ کرتا ہے اسے کسی سِل پتھر کی ضرورت نہیں ہوتی مگر تم نے اب تک اپنا عقیدہ اور ایمان پرانے مذاہب کی تلقین پر اُستوار کر رکھا ہے کہ ایذا برداشت کرنا ہی انسانیت کا جوہر اور اس کی معراج ہے۔ صبر و شکر سے ہر وار پر گردن خم کر دینا ہی گویا زندگی کا مقصد ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر کیوں، انسان اس چار دن کی زندگی میں تختۂ مشق بنا رہے؟"

"ٹھیک کہتی ہو۔ اس بات کا مجھے بھی احساس ہے کہ آج سے پانچ سال پہلے بیگم نجمؔ کی محفلِ سرود میں جس شخص نے مجھے ایک لہلہاتے ہوئے مرغزار سے نکال کر ایک لق و دق صحرا میں بے سہارا چھوڑ دیا وہ ہرگز قابلِ معافی نہیں، بلکہ سزا کا مستحق ہے بہت بڑی اور سنگین سزا کا!"

طوفان کا زور اور آندھی کا شور بڑھتا ہی گیا اور وہ شدتِ جذبات سے ہانپنے لگی۔

"بہت بڑی اور سنگین سزا کا! ؟ یعنی تمہارے نہاں خانۂ دل کے کسی خُفیہ گوشے میں اس کے خلاف غم و غصہ کی آگ بھڑک رہی ہے! بھلا بتاؤ میں نے غلط کیا کہا تھا —— اسی لئے تو مجھے تمہاری بات کا یقین کرنے میں تامل تھا، جب تم اس کی بجائے اپنی موت کی دعائیں مانگ رہی تھیں، اسی لئے تو میں نے تم کو ٹوکا تھا۔ اب تم فیروزؔ کو سنگین سزا کا مستحق سمجھ رہی ہو۔ اس قسم کا اجتماعِ ضدین تمہاری جذباتی نابالغی کا ثبوت ہے۔ فیروزؔ پر تمہارا غصہ غیر فطری نہیں ہے۔ یوں آگ کو پردوں میں چھپاؤ گی تو وہ ایک دن بھڑک کر تمہاری ہستی اور تمہاری کائنات ہی کو خاکستر کر دے گی۔"

وہ بے چین ہو کر بولی "نہیں، نہیں، میں اب بھی دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ ؎

"وہی سوزِ دل کی ہیں گرمیاں، وہی دردِ دل کی ہیں شدتیں"

پانچ سال پہلے محبت کا جو چشمہ پھوٹ پڑا تھا، وہ اب تک اُبل رہا ہے۔"

میں بیزار ہو کر بولی۔ "تم ہمیشہ سطح پر تیرتی رہیں۔ تہہ میں جھانک کر دیکھنے کی زحمت کبھی قبول نہیں کی، اسی لئے اپنے جوشِ محبت پر نازاں ہو مگر زلفؔ! بدقسمتی سے مجھے سطحی اور غیر سطحی چیزوں کے پرکھنے کا جنون ہے۔ میرے اسی جنون نے مجھے سرگوشی میں کہا ہے

کہ محبت کے اس حسین اور بظاہر پُرسکون سمندر کی تہ میں خونخوار مچھلیاں بھی موجود ہو سکتی ہیں۔ یہ شاعرانہ باتیں نہیں، خالص حقیقتیں ہیں۔
خیر، ان باتوں کو اُٹھا رکھو۔ یہ بتاؤ معالج کیا کہتا ہے؟"

"مجھے اس سے نفرت ہے۔"

"معالج سے! اس کی کیا وجہ ہے؟" میں حیران ہو کر پوچھنے لگی۔

زلفی میرے اس سوال پر چونک سی پڑی اور دریچے کے باہر اندھیرے میں بجلی زور سے کانپی۔

"وجہ کیا ہوتی! بس ہے نفرت۔" وہ بے تعلقی سے کہنے لگی۔

"نفرت ہے تو معالج بدل کیوں نہیں دیتیں؟"

لمحہ بھر بعد وہ بولی۔ "معالج کا بدلنا کچھ آسان تھوڑا ہی ہے۔ کئی مجبوریاں ہوتی ہیں۔"

"بہت ماہر معالج ہے؟"

"خاک۔"

"مفت علاج کرتا ہے؟"

"نہیں۔"

"تو پھر تامل کس بات کا؟"

"ہاں سوچتی ہوں اسے بدل ہی دوں۔"

اس کے تذبذب کو میں حیران ہو کر دیکھنے لگی۔ دو لمحے وہ کچھ بے چین سی نظر آئی پھر سرگوشی میں کہنے لگی۔ "تجھی معلوم ہے اس نے ایک دن مجھ سے کیا کہا تھا؟"

"کیا؟" میں نے بھی سرگوشی میں پوچھا "کہتا تھا۔ بیگم فیروز! آپ کا اور آپ کے میاں کا کیا جوڑ! آپ حور، وہ ہر وقت نشے میں چُور۔"

"تو تم نے کیا کہا؟"

"کہتی کیا، جواب میں ایک تھپیڑ رسید کر دیا۔" وہ نہایت فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھ کر بولی۔

"ارے تھپیڑ!" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں اس کی موقع شناسی اور شوہر پرستی کی تعریف کے پُل باندھ دوں گی۔ مگر مجھ پر اس کی اس بے ساختہ حرکت کا بالکل اُلٹا اثر پڑا۔ جھنجھلا کر میں نے کہا۔ "جب تمہارا باطن صاف تھا تو تمہیں اپنی اتنی توانائی استعمال کرنے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی، کس جذبے کے خلاف تمہیں اتنی سخت جدوجہد کرنی پڑی؟"

اور اسی وقت دریچے کے باہر تاڑ کے منحوس درخت پر ایک چمگادڑ نے بڑے زور سے اپنے دونوں بازو پھڑپھڑائے "اُف! یہ کیا چیز تھی؟"

"میرا ضمیر —— اسی نے تھپیڑ لگوایا۔"

"اب تک ضمیر ضمیر!" میں نے حقارت سے کہا۔

"زمانۂ جاہلیت کا آدمی ضمیر کی آواز پر نازاں ہو کر بلا سوچے سمجھے سرِ تسلیم خم کر دیا کرتا تھا مگر آج کے انسان کو اپنے آپ اور

اپنے ضمیر پر حکمرانی کی تمنا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا قابو میں آجانا انسانی انفرادیت کی توہین ہے۔ اسی لئے تو تمہارے ضمیر نے تم سے مشورہ لئے بغیر تھپّڑ لگوا دیا۔"

"تو اور کرتی بھی کیا؟ تمہاری رائے میں نہیں لگانا چاہیئے تھا تھپّڑ؟"

"تم نے کبھی سوچا، مجرم اس وقت اپنے ریوالور یا اپنے کسی ہتھیار کو استعمال کرتا ہے، جب اسے پکڑے جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ تم کو تو پکڑے جانے کا ڈر نہیں تھا۔ تمہارا باطن صاف تھا۔ پھر کس سلسلے میں تم نے اسے تھپّڑ لگایا؟ خیر تو اس تھپّڑ کے بعد؟"

وہ اس اہم گفتگو کے درمیان یک لخت اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں تمہارے لئے قہوہ تو تیار کر لوں۔"

"نہیں زلفی! قہوہ نہیں چاہیئے۔ سوچنے کے لئے مواد چاہیئے۔ تو پھر اس تھپّڑ کے بعد؟"

"اس کی زیادتی تو تم دیکھو رو حی! تھپّڑ کے جواب میں اس نے مجھے ایک روز تھیٹر پر مدعو کیا۔"

"اس کے بعد ہی منزل آتی ہے زلفی! نکتہ رس آدمی معصوم ہوتا ہے اور گہرائیوں میں جھانکتا جاتا ہے —— پھر؟"

"مجھے اس سے اور بھی نفرت ہو گئی۔"

"اور بھی نفرت! کتنی؟ ——" میں بے چین ہو کر پوچھنے لگی۔

وہ قدرے حیران ہو کر بولی: "دماغ ٹھکانے ہے؟ میرے پاس نفرت یا محبت ناپنے کا کوئی پیمانہ رکھا ہے؟"

"ان کے لئے دو مختلف پیمانوں کی ضرورت نہیں ہوتی زلفی! یہ دونوں چیزیں ہمیشہ ایک ہی پیمانے سے ناپی جاتی ہیں مگر تم سچ کہتی ہو۔ اس قسم کی جنس کو تولنے کا نہ کوئی پیمانہ ہوتا ہے نہ ترازو۔ تاہم ایک کامل انسان کے لئے نفرت و محبت کے بیوپار میں توازن قائم رکھنا کچھ ایسا جوئے شیر لانا بھی نہیں ——" یہ کہتے کہتے میں کچھ فکرمند سی ہو گئی۔

کمرے پر سکوت طاری ہو گیا۔ میں مومی فانوس کے آگے چپ چاپ بیٹھی قیاس آرائیاں کرتی رہی اور شعلہ بھڑکتا رہا۔ زلفی نہایت جوش و خروش کے ساتھ اپنی نفرت کا اظہار کرتی رہی۔ "جی چاہتا ہے گلا گھونٹ ڈالوں اس بدمعاش ڈاکٹر کا۔ مسکراتا ہے اور سمجھتا ہے میں اس کے برقِ تبسم کی تاب نہ لا سکوں گی۔"

"بہت زیادہ بدشکل ہے؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔ اور اعصاب کو تسکین پہنچانے کے لئے اوڈی کلون سونگھنے لگی۔

وہ دو لمحے چپ رہی پھر بولی۔ "مجھے کیا معلوم؟ میں نے کبھی اسے اتنی توجہ سے دیکھا ہی نہیں۔ گزشتہ دنوں ایک نرس رکھ لی تھی۔ وہ کہتی تھی ہسپتال میں اپنی شکل و صورت کی وجہ سے بہت مقبول ہو رہا ہے۔ ہوں۔ میری بلا سے!"

وہ دیر تک بڑے شد و مد سے غم و غصّے کا اظہار کرتی رہی اور میں خاموشی سے سنتی رہی۔ خزاں کی آندھی کا شور بڑھتا ہی جاتا تھا۔

یہاں تک کہ اس نے کہا: "فیروز شرابی اور کمینہ ضرور ہے مگر میں چاہتی ہوں کہ وہ زندہ رہے۔"

دُور سمندر کا تلاطم اس کے فقروں پر قہقہے لگا رہا تھا۔

میں افسردہ لہجے میں بولی: "تم بار بار فیروز کے متعلق یہ کیوں کہتی رہتی ہو کہ اسے زندہ رہنا چاہیئے؟ کیا مجھے تمہاری اس آرزو کا تمہارے کہے بغیر یقین نہیں آسکتا؟ یا تم خود اپنے آپ کو یقین دلانا چاہتی ہو کہ تم اس کی زندگی کی خواہاں ہو؟"

لمحہ بھر کے لئے آندھی تھمی۔ پھر پہلے سے بھی زیادہ زور و شور کے ساتھ چل پڑی۔

زلفی نے تیز نظروں سے مری طرف دیکھا: "تم بعض وقت خارج از عقل باتیں کرنے لگ جاتی ہو روحی! بھلا تمہارے اس سوال

کا کوئی جواب بھی ہو سکتا ہے ؟"

میں مسکرائی "یہ ایسے سوال ہمیشہ تشنۂ جواب ہی رہ جاتے ہیں زلف! مجھے معاف کرو، محبت و نفرت کی یہ پیچیدہ داستانیں لامحدود ہوتی ہیں۔ مجھے خزاں کی ویرانیوں نے مضمحل کر دیا ہے۔ کہو تو تھوڑی دیر آرام ہی کر لوں؟" یہ کہتے کہتے میں ایک کوچ پر نیم دراز سی ہو گئی۔

اس نے کہا "مگر خزاں میں مری نیند جیسے پر لگا کر اُڑ جاتی ہے۔ مجھ سے تو لمحہ بھر کو سویا نہیں جاتا۔"

"تو پھر ساری رات بیٹھی رہتی ہو؟" میں نے ایک جماہی لے کر غنودگی کی آواز میں پوچھا۔

"نہیں تو، پریشانی کے باعث جو کام دن بھر میں انجام نہیں دے سکتی، انہیں رات کے سناٹے میں ختم کر لیتی ہوں۔ تم جانو گھر کی بیسیوں مصروفیتیں ہوتی ہیں جو میں نے رات کے لئے مخصوص کر رکھی ہیں۔ کبھی کتاب پڑھتی ہوں، کبھی سلائی لے کر بیٹھ جاتی ہوں۔ گزشتہ ہفتے نمائش سے میں نے فیروزہ کے شب خوابی کے لباس کے لئے ایک بڑا خوب صورت دھاری دار ریشم خریدا تھا آج تک اسے بھی نہ سی سکی۔"

کچھ دیر بعد مری آنکھیں بے اختیار بند ہونے لگیں، آندھی ابھی تک چیخیں مار رہی تھی اور سمندر دھاڑیں مار کر رو رہا تھا میں نے نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اس نے مجھے سوتا سمجھ کر مجھ پر شال ڈال دی اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر دریچے کے پاس چُپ چاپ سناٹے کے عالم میں یوں کھڑی رہی جیسے اس کی سُوجھ بُوجھ کی تمام قوتیں مفلوج ہو چکی ہوں اور نہ جانتی ہو کہ اسے کیا کرنا چاہیئے۔

نجانے کیا بات تھی یکلخت اس نے مُڑ کر میز کی طرف دیکھا اور تیزی سے وہاں پہنچی، جُھک کر قینچی اُٹھا لی، بالشت بھر لمبی اور نوکدار قینچی! اتنی تیز اتنی خوفناک کہ کپڑا تو کیا انسانی شہ رگ کو بھی آنِ واحد میں بڑی آسانی سے کاٹ سکتی تھی۔ پھر اس نے قینچی کی زبانیں کچھ اس طرح کھولنی اور بند کرنی شروع کیں جیسے وہ اس بات کا اندازہ لگانا چاہتی تھی کہ وہ تلوار کی دھار کی طرح تیز ہیں یا نہیں!

لمحہ بھر وہ خیالات میں گُم ساکت کھڑی رہی۔ پھر تیز گامی سے مریض کے کمرے کی طرف بڑھی اور درمیانی دروازہ زور سے کھول دیا۔ سامنے شرابی مریض بدمست پڑا تھا وہ آہستہ آہستہ اس کی چارپائی کی طرف بڑھی۔ بڑی احتیاط سے قدم جما جما کر —— تاکہ اس کی آنکھ نہ کُھل جائے!

باہر خزاں کی رات میں کسی حواصل نے ایک ہولناک چیخ ماری۔ دُور ندی کے کنارے ایک کتا اپنی منحوس آواز میں زور زور سے رونے لگا —— کمرے میں گھڑیال کی ٹِک ٹِک واضح طور پر سُنائی دینے لگی۔ اُوپر آندھی کا شور بڑھتا گیا۔ وہ ہاتھ میں تیز اور نوکدار قینچی لئے مریض کے سرہانے پہنچ گئی۔

اس کے ہاتھ میں نوکدار قینچی تھی، ہر طرف سناٹا تھا، وہ تیز تیز سانس لے رہی تھی۔ یک لخت وہ مریض پر جُھک گئی۔ اس کے کُرتے کا گریبان کھول دیا اور بغور دیکھنے لگی —— پھر چارپائی سے لگ کر نیچے فرش پر بیٹھ گئی۔ ایک گٹھڑی کھول کر اس میں سے دھاری دار ریشم نکالا۔ اسے سامنے پھیلا لیا۔ پریشان ہو کر مریض کے گلے کی طرف بار بار دیکھنے لگی۔ پھر منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگی۔

"پہلے اس کا گلا —— گریبان کاٹ لوں ——"

پھر بڑی مہارت اور تیزی سے گریبان کاٹنے لگی۔ مگر قمیص کے گلے کے ساتھ اس کی دو انگلیاں کٹتے کٹتے رہ گئیں۔ اگرچہ بُری طرح زخمی ہوگئیں!

خزاں کی آندھی اب تھم گئی تھی!!

استقلال نمبر ۱۹۵۵ء

ہم اکثر خواب کے کینوس پہ اک منظر بناتے ہیں
پھر اُس منظر کے اک کونے میں اپنا گھر بناتے ہیں

بنا لیتے ہیں گھر کے گرد ہم شیشے کی دیواریں
پھر اپنی خاک، خوں میں گوندھ کر پتھر بناتے ہیں

حسن عباس رضا

عکس تحریر:۔ حسن عباس رضا

# دشمن کی بیٹی

ایم اسلم

کالے کالے بادل ہر طرف چھائے تھے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی، راوی طغیانی پر تھی۔ میلوں تک پانی پھیلا ہوا تھا۔ چودھری عبداللہ خاں پانچ سات آدمیوں کے ساتھ کشتی پر بیٹھا دریا سے پار اُتر رہا تھا۔ یہی فرقہ وارانہ فسادات کی باتیں ہو رہی تھیں۔ دو ملاح کشتی چلا رہے تھے۔ ایک حستو اور دوسرا اس کا بیٹا۔ حستو جو ادھیڑ عمر کا آدمی تھا کہہ رہا تھا۔

"جب چودہ برس کا تھا، تب سے یہ کام کر رہا ہوں، اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔ تمام عمر عسرت اور افلاس میں گزر گئی۔ لیکن کسی نے سچ کہا ہے کہ خدا جب دینے پر آتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔"

"اب تو دلدر دُور ہو گئے نا؟" ایک مسافر نے کہا۔

"ہاں سب دلدر دُور ہو گئے۔" حستو بانس سنبھالتے ہوئے بولا۔

"جتنا ان دو مہینوں میں کمایا ہے ساری عمر میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں ملا۔"

"دو پیسے کی جگہ روپیہ لیتے ہو گے؟"

"یک روپیہ لینے سے کیا بنتا ہے۔" حستو نے سینے کے پورے زور سے کشتی کھیتے ہوئے کہا، "کسی کسی روز تو میں نے ایک ایک پھیرے میں اتنا کمایا ہے جو کبھی سال بھر میں بھی نہیں ملتا تھا۔"

"پھر تو خوب لوٹا تم نے!" ایک اور نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں!" بوڑھے ملاح نے ہاتھ سے پیشانی پر پڑے ہوئے بارش کے قطرے پونچھتے ہوئے کہا "میں نے کسی کو نہیں لوٹا۔ جب موت سامنے نظر آتی تو ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی کہ وہی سب سے پہلے دریا سے پار اُتر جائے اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"اور!" پہلے نے بات کاٹ کر کہا "تم جو کچھ ہوتا دھروا لیتے۔"

"کوئی زبردستی نہیں۔ لوگ خوشی سے دیتے تھے۔" حستو نے جواب دیا۔

"مردود یہ لوٹنا نہیں تو کیا ہے؟" عبداللہ خاں نے کہا "معلوم ہوتا ہے تمہیں مرنے کا ڈر نہیں۔"

"چودھری!" بوڑھے ملاح نے جواب دیا "مرنا تو سب کو ہے لیکن جب گنگا بہہ رہی ہو اور کوئی پیاسا چلا آئے تو دنیا تو اسے اندھا کہے یا بے وقوف! ساون میں جو کھیتی ہری نہ ہوئی پھر کبھی نہ ہو گی۔"

"سکھوں نے مار دھاڑ بھی تو بہت کی۔" ایک اور نے کہا۔

"مار دھاڑ کی مت پوچھو تم" حستو بولا "صبح سے شام تک مسلمان اِدھر اُدھر سے بھاگ بھاگ کر گھاٹ پر آتے اور جمع ہوتے

جاتے۔ پار جانے والے سینکڑوں اور پار لے جانے کو صرف ایک کشتی۔ ایسے میں اگر سکھوں کا کوئی جتھہ آ جاتا تو سب کو موت نظر آ جاتی۔ ایک ہفتے دوسرے فاقوں کے مارے، کئی بار ایسا ہوا کہ اکثر لوگوں نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ مردوں سے زیادہ عورتیں اس طرح جان دیتی تھیں۔ کچھ جوانمرد مقابلہ پر بھی ڈٹ جاتے اور دوسروں کو پار اُتر جانے کا موقع مل جاتا۔ ہم بھی جان پر کھیل کر پناہ گزینوں کو دریا پار کرواتے تھے۔ کسی سے کچھ مفت تو ہمیں بھی نہیں ملتا تھا۔"

"تو اتنی دولت سمیٹ کر بھی تمہارا پیٹ نہیں بھرا؟" پہلے نے کہا۔

"اب بوڑھے ہو گئے ہو آرام کرو۔"

ایک اور نے کہا

"آرام تو اسے نصیب ہوتا ہے جس کی کمائی حق کی ہو۔ جو غریب لٹتا ہے اس کی آہ تو قبر تک بھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔"

کشتی منجدھار میں پہنچی تو دونوں ملاح بولے:

"بولو بھائیو — اللہ ہی اللہ!"

سب نے مل کر اللہ ہی اللہ کا نعرہ لگایا اور ملاح پورے زور لگا کر کشتی منجدھار میں سے نکال لے گئے۔

چودھری عبداللہ بولا۔

"حستو! سکھوں کے جتھے میں کتنے کتنے آدمی ہوتے تھے؟"

"دو دو سو چار چار سو! بندوقیں بھی ہوتیں، رائفلیں بھی ہوتیں۔ تلوار، کرپان یا بلّم سے تو کوئی خالی ہی نہ ہوتا۔" حستو نے جواب دیا "اور مسلمانوں کے پاس لے دے کے ایک اللہ کا نام۔ کسی کے پاس بلّم یا بھالا ہوا تو ہوا ہی سہی۔ عام طور پر سب نہتے ہوتے۔ لیکن ایک بات ہے چودھری! کبھی جو مسلمان بھی سینہ تان کر مقابلہ پر ڈٹ جاتے اور مل کر "اللہ اکبر" کے نعرے مارتے تو سکھوں میں بھگدڑ پڑ جاتی اور ایک ہی ہلے میں مسلمان ان میں سے اکثر کے پاس سے کچھ ہتھیار بھی چھین لیتے، خدا کی قسم! اس وقت ان بھگوڑوں کی حالت دیکھ کر ہنسی سی آ جاتی۔ بس جدھر منہ اُٹھا اُدھر ہی بے تحاشا بھاگے جا رہے ہیں اور کیا مجال ایک بار بھی پلٹ کر دیکھیں۔"

"جتھے ہر روز آتے تھے کیا؟"

"ہر روز تو نہیں۔ پھر بھی آتے ہی رہتے تھے۔"

"اور یونہی مسلمان مارے جاتے تھے؟"

"مارے بھی جاتے تھے اور مارتے بھی تھے۔" حستو ملاح نے جواب دیا۔ "جب شروع شروع میں مار دھاڑ شروع ہوئی ہے تو مسلمانوں کا ایک قافلہ یہاں آیا۔ راوی میں شدت کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ اُوپر سے چھاجوں پانی پڑتا۔ ہم جب کشتی چھوڑتے تو دوسرے کنارے پر گھاٹ سے کہیں دو میل نیچے لگتی۔ مسافر ابھی سوار ہو ہی رہے تھے کہ سکھوں کا ایک جتھا آ گیا۔ بکرم سنگھ جتھہ دار تھا۔ سکھوں کو آتے دیکھ کر بہت سی عورتیں ننگ و ناموس کی خاطر دریا میں کود گئیں۔ بہتیرے مرد بھی ڈوب مرے۔ باقی لوگ جھاڑیوں اور سرکنڈوں کی طرف بھاگے۔ اس قافلے میں ایک سکول ماسٹر بھی تھا۔ اس کے پاس بندوق تھی۔ سکول ماسٹر اور اس کی بیوی سرکنڈوں میں چھپ گئے۔ سرکنڈوں میں بھی پانی چل رہا تھا۔ سکھ آتے ہی مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹنے لگے۔ سکول ماسٹر کی غیرت نے جوش مارا تو وہ سرکنڈوں سے باہر نکل آیا۔ جو سکھ سامنے آتا اسے مار گراتا۔ اس طرح اس نے بہت سے سکھ مارے۔ اچانک ایک گولی ماسٹر کی گردن میں آ کر لگی اور وہ وہیں ڈھیر

ہوگیا۔شوہر کے گرتے ہی اس کی بیوی جو چھپی بیٹھی تھی باہر نکل آئی اور شوہر کی بندوق اُٹھا کر سکھوں پر فائر کرنے لگی اور چلا چلا کر مسلمانوں کو غیرت دلانے لگی۔عورت کی بہادری دیکھ کر اِدھر اُدھر سے کچھ مسلمان بھی نکل آئے کسی کے ہاتھ میں لاٹھی تھی، کسی کے پاس برچھا۔ سب نے مل کر اللہ اکبر کا نعرہ مارا اور سکھوں پر حملہ کر دیا۔سکول ماسٹر کی بیوی آگے آگے تھی۔ہم کنارے سے کچھ دُور کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ہمارے دیکھتے دیکھتے اس عورت نے کئی سکھ مار گرائے اور بہت سے مردوں نے مارے۔اچانک ایک گولی عورت کی کمر میں لگی اور وہ گر گئی۔اتفاق سے اسی وقت کہیں سے پولیس کے سپاہی بھی آپہنچے اور سکھ بھاگ گئے۔

"عورت مر گئی یا بچ گئی؟" عبداللہ خاں نے پوچھا۔

"جب لوگوں نے اسے کشتی میں سوار کرایا تھا اس وقت تو زندہ ہی تھی" حسو نے جواب دیا۔

کشتی کنارے پر جا لگی اور سب مسافر اُتر گئے۔

---

گھاٹ پر چودھری عبداللہ خاں کے لئے گھوڑا آیا ہوا تھا۔وہ گھوڑے پر سوار ہوگیا اور نوکر پانی پھلانگتا ہوا پیچھے پیچھے چلنے لگا۔جدھر نگاہ اُٹھتی، پانی ہی پانی نظر آتا، کہیں کہیں کمر تک گہرا، کہیں گھٹنے گھٹنے۔کہیں ٹخنے ٹخنے! کہیں سرکنڈے تھے کہیں جھاڑیاں تھیں۔کہیں سپید سپید پروں والے لمبے بگلے مچھلیوں کی تاک میں بیٹھے تھے۔کہیں دُور سے کالے تیتر کی مست آواز "سبحان تیری قدرت" بھی وقفہ وقفہ کے بعد سنائی دیتی۔بادل آسمانوں کی فضا میں تیر رہے تھے، پھوار پڑ رہی تھی۔کبھی بادل کی گرج کسی ظالم درندے کی چنگھاڑ کی طرح سنائی دیتی۔کبھی سیاہ بادلوں کے سینے سے بجلی کی چمک کسی سفاک کے نیزے کی انی کی طرح چمکتی نظر آجاتی۔نوکر مالک سے الگ پگڈنڈی کے راستے گاؤں کو جا رہا تھا اور گھوڑا اور سوار کھیتوں کے کنارے کنارے چل رہے تھے۔اچانک جھاڑیوں کی جانب سے کسی عورت کے چیخنے کی آواز آئی۔عبداللہ خاں نے فوراً گھوڑے کی باگ موڑی اور جھاڑیوں کے پاس پہنچ کر پکارا۔

"کون چلا رہا ہے؟"

لیکن کچھ جواب نہ ملا۔اس نے پھر رُعب دار آواز سے کہا۔

"ارے کون ہے یہاں؟"

لیکن پھر بھی کچھ جواب نہ ملا تو وہ جھاڑیوں میں گھس گیا۔چلتے چلتے اس نے ایک جگہ جہاں سرکنڈوں اور جھاڑیوں کا ایک جھنڈ سا تھا۔ایک آدمی کو جھاڑی میں گھستے ہوئے دیکھ لیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر جھٹ وہاں پہنچ گیا۔یہاں ایک نوجوان لڑکی جس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور منہ میں اسی کی اوڑھنی ٹھنسی ہوئی تھی۔پریشان حال پڑی تھی۔عبداللہ خاں گھوڑے سے اُترا اور جھک کر لڑکی کے منہ سے کپڑا نکالنے لگا۔اسی وقت ایک آدمی جس نے منڈاسا باندھ رکھا تھا جھاڑی میں سے کود کر نکلا اور بھاگ گیا۔عبداللہ خاں نے للکارا۔

"اے حرام زادے! کہاں جاتا ہے؟"

لیکن وہ کہیں جھاڑیوں میں گھس گیا۔اس آدمی کے اچانک کودنے سے گھوڑا خوفزدہ سا ہو کر کچھ شوخی کر رہا تھا اور عبداللہ خاں اسے پچکار رہا تھا اور وہ لڑکی جھاڑیوں سے لگی بیٹھی سہمی سہمی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ہاتھ رسی سے بندھے تھے۔بال پریشان، لباس کیچڑ سے لت پت، چہرے پر خوف اور ہراس سے ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔انیس بیس کے لگ بھگ عمر تھی۔لیکن اس

پریشانی اور خوف میں بھی حسن کی جلوہ فرمائیوں میں کچھ ایسی کمی نہ آئی تھی۔

"تم کون ہو؟" عبداللہ خاں نے گھوڑے کو چمکارتے ہوئے پوچھا۔

لڑکی لڑکھڑاتی ہوئی آواز سے بولی۔

"میں سردار بکرم سنگھ کی بیٹی ہوں جی۔"

"تم بکرم سنگھ کی بیٹی ہو؟" عبداللہ خاں نے تعجب سے پوچھا "تم یہاں کیسے آگئیں؟"

"جی ہاں!" لڑکی روتے ہوئے بولی "میرا نام اندر کور ہے۔"

"تمہاری ہی شادی گئے جاڑوں میں ہوئی تھی۔" عبداللہ خاں نے اس کے ہاتھوں کی رسی کھولتے ہوئے پھر پوچھا۔

"جی ہاں!" اندر کور نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

"رو نہیں بیٹی!" عبداللہ خاں نے اسے گھوڑے کی باگ پکڑاتے ہوئے کہا "تم ذرا گھوڑا پکڑو۔ میں اس حرام زادے کو تو دیکھوں کہاں ہے۔"

اندر کور نے گھوڑا پکڑ لیا۔ اور عبداللہ خاں نے بڑھ کر اس آدمی کو ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا تو وہ اندر کور کے پاس واپس آ گیا، اور بولا۔

"بیٹی! تم یہاں کیسے آگئیں؟ یہ آدمی کون تھا؟"

"میں سسرال میں تھی۔ میرے پتی فوج میں ہیں۔" اندر کور سسکیاں بھرتے ہوئے بولی۔ "بابو نے مجھے واپس لانے کو گاؤں سے دو آدمی بھیجے تھے۔ راستے میں ایک جگہ ہماری گاڑی پر مسلمانوں نے حملہ کر دیا۔ گاڑی کے ساتھ فوج کے سپاہی تھے۔ کچھ مسافر گاڑیوں سے نکل کر کھیتوں کی طرف بھاگنے لگے۔ میں اور میرا ساتھی بھی ایک کھیت میں گھس گئے۔ اس وقت شام ہو رہی تھی، ہم کھیتوں میں چھپے بیٹھے رہے۔ جب رات ہوئی تو ہم وہاں سے نکلے اور راتوں رات چل کر صبح ہوتے ہوتے ایک قصبے میں پہنچ گئے۔ اس جگہ اتفاق سے ایک نائب تحصیلدار جو بابو کو جانتا تھا آیا ہوا تھا۔ اس نے مجھے حفاظت سے ایک ایسی جگہ پہنچا دیا جہاں سے ہم آسانی سے اپنے گاؤں پہنچ سکتے تھے۔ لیکن یہ شخص مجھے دھوکے سے ادھر لے آیا۔ اس کی نیت خراب تھی۔ لیکن واہگورو کو بچانا تھا جو آپ آگئے۔ . . . ."

اندر کور پھر رونے لگی۔

"بیٹی رو نہیں!" عبداللہ خاں بولا "تو یہ آدمی بھی کوئی سکھ ہی تھا؟"

"جی ہاں!" اندر کور نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا "ہمارا نوکر ہی ہے۔"

بارش ہونے لگی تھی۔ ہوا بھی تیز چلنے لگی تھی۔

"بیٹی!" عبداللہ خاں بولا۔ "اٹھو! سوار ہو جاؤ کل انشاءاللہ تم اپنے گھر پہنچ جاؤ گی۔"

اندر کور نے اٹھتے اٹھتے سہمی سہمی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بولا:

"بیٹی فکر مت کرو۔ میرا نام عبداللہ خاں ہے۔ آؤ سوار ہو جاؤ۔"

چنانچہ اس نے سہارا دے کر اندر کور کو گھوڑے پر سوار کر دیا اور باگ تھام کر ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد جب وہ اندر کور کو ساتھ لے کر گھر آیا تو بیوی سے کہا کہ وہ لڑکی کو نہلا دھلا کر صاف ستھرے کپڑے پہنائے اور اس کے آرام کا پورا پورا خیال رکھے۔ گھر والوں نے لڑکی کے متعلق کئی بار اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے کچھ نہ بتایا اور نہ بتاتا بھی کیسے؟ اندر کور

اس شخص کی بیٹی تھی جس کے ہاتھوں سینکڑوں بے گناہ مسلمان تباہ اور ہلاک ہوئے تھے۔ جس کے جتھے نے مسلمانوں کے کئی گاؤں لوٹ کر جلا دئے تھے اور ہر طرف ایک قیامت برپا کر رکھی تھی۔

لیکن ان فسادات سے پہلے اسی بکرم سنگھ نے دو ایک بار مقدمات کے سلسلہ میں چودھری عبداللہ خاں کی کچھ مدد کی تھی اور اپنی اکلوتی بیٹی اندر کور کی شادی پر بھی اسے مدعو کیا تھا۔ عبداللہ خاں خود تو کسی وجہ سے شادی میں شامل نہ ہو سکا لیکن اس نے سونے کا ایک خوبصورت زیور دلہن کو تحفہ کے طور پر بھیجا تھا۔ گو آج بکرم سنگھ مسلمانوں کا صرف دشمن ہی نہیں بلکہ ان کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ لیکن چودھری عبداللہ خاں اس کا احسان مند تھا اور قدرت نے اسے دشمن کے احسان سے سبکدوش ہونے کا موقع دیا تھا۔

---

دوسرے روز عبداللہ خاں نے کہاروں سے ڈولی منگوائی اور اندر کور کو سوار کروا کر اپنے پانچ سات آدمیوں کے ساتھ گھاٹ پر آیا اور ڈولی کشتی میں رکھوا کر اپنے آدمیوں سمیت پار اتر گیا۔ دریا سے کوئی دو میل کے فاصلے پر ہندوستان اور پاکستان کی سرحد شروع ہو جاتی تھی۔ سرحد تک مسلمانوں کی آبادی تو اب کوئی نہیں تھی، صرف کھیت تھے اور بکرم سنگھ کا گاؤں بارہ پندرہ میل سے کم نہ تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ لڑکی کو اس کے گھر کیسے پہنچایا جائے۔ کہار ڈولی لے کر دشمن کے علاقے میں جانے سے ڈرتے تھے۔ بہرکیف عبداللہ خاں نے ڈولی اٹھوائی اور اپنے آدمیوں کے ساتھ اس جگہ آ گیا۔ جہاں دونوں ملکوں کی سرحدیں ملتی تھیں۔ ادھر کے کھیتوں میں کچھ سکھ اپنے مویشی چرا رہے تھے۔ یہ لوگ عبداللہ خاں کو جانتے تھے ان سے معلوم ہوا کہ بکرم سنگھ ابھی ابھی کچھ آدمیوں کے ساتھ کھیتوں پر آیا ہوا تھا۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ چودھری عبداللہ خاں سردار بکرم سنگھ کی بیٹی کو لے کر آیا ہے تو ان میں سے ایک گھوڑے پر سوار ہو کر بکرم سنگھ کو تلاش کرنے چلا گیا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد ایک طرف سے کچھ سوار نظر آئے۔ یہ ادھر ہی کو آ رہے تھے۔ بکرم سنگھ مشکی گھوڑے پر سوار آگے آگے تھا اور پوری طرح مسلح تھا۔ جب وہ نزدیک آیا تو اندر کور ڈولی سے نکلی۔۔۔ بکرم سنگھ بیٹی کو دیکھ کر گھوڑے سے اترا اور بیٹی کی طرف آیا۔ اندر کور بھاگ کر باپ کے سینے سے جا لگی اور روتے روتے اسے سب قصہ سنا دیا۔ عبداللہ خاں ڈولی کے پاس کھڑا تھا اور کہار خوفزدہ نگاہوں سے اس دشمن اسلام کی طرف دیکھ رہے تھے۔

بکرم سنگھ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا عبداللہ خاں کے پاس آیا اور ہاتھ ملانے کو ہاتھ بڑھایا۔ لیکن عبداللہ خاں اسی طرح خاموش رہا۔ ندامت سے بکرم سنگھ کا سر خود بخود جھک گیا۔ اندر کور بھی دونوں کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

عبداللہ خاں نے کہا:

”بیٹی! تمہیں دور جانا ہے، آؤ ڈولی میں سوار ہو جاؤ۔“

اندر کور جھک کر اس کے پاؤں چھونے لگی تو اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور محبت سے ڈولی میں سوار کرا دیا اور بکرم سنگھ کی طرف دیکھ کر کہا،

”سردار بکرم سنگھ! خدا کا شکر ہے کہ میں تمہارے احسان سے سبکدوش ہوا۔ اب ان غریب کہاروں پر رحم کرنا۔“

بکرم سنگھ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ سرخ سرخ آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر عبداللہ خاں کو سلام کیا۔ عبداللہ خاں نے بھی دایاں ہاتھ ماتھے تک لا کر سلام کا جواب دیا۔ کہاروں نے ڈولی اٹھائی اور دونوں اپنی اپنی راہ ہو لئے۔ جب کہار واپس آئے تو ان سے معلوم ہوا کہ بکرم سنگھ نے انہیں پچیس پچیس روپے اور ایک ایک پگڑی انعام دی تھی۔

(جون ۴۸ء)

# مریاں

عبدالرحمٰن چغتائی

مریاں کی یہ آرزو دیوانگی کی حد تک جا پہنچی تھی کہ وہ شہر جائے اور شہر کی دلفریبیاں دیکھ آئے۔ جن کی داستانیں سننے سے وہ اب ایک ہیجان سا محسوس کرنے لگی تھی۔ شہر اسے بہشت کا سا اُجلا اُجلا۔ گاؤں اور کھیتوں سے کہیں وسیع نظر آرہا تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا جب بھی اسے شہر جانے کا موقع ملے گا، وہ سُرخ جوڑا پہنے گی جو اسے بھائی کی شادی پر ملا تھا۔ مریاں نے جب یہ سُنا کہ وہ گاؤں والیوں کے ہمراہ کل شہر جانے والی ہے، تو اس نے ایک ایک کے جذبات کا جائزہ لیا اور نیم وا آنکھوں سے گاؤں کے ماحول پر بھی نگاہ ڈالی۔ چوپال پر کوئی جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ شور اتنا بلند تھا کہ وہ برداشت نہ کر سکی اور اس نے اپنی لگن میں اُدھر سے رُخ پھیر لیا

دُور دُور تک پھیلے ہوئے سرسبز کھیت۔ زمین کی وسعتوں کو کاٹنے والی پگڈنڈیاں گرد و غبار سے اٹی ہوئی تھیں اور مویشی دن بھر کے تھکے ہارے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ زمین اور آسمان کچھ اس طرح ایک دوسرے سے ملے ہوتے نظر آرہے تھے، جیسے یہ دنیا اور آسمان کی یہ دنیا کوئی مِلی جُلی آبادی ہے اور ان کے درمیان کا فاصلہ پُراسرار ہونے کے باوجود انسان کا اپنا تخلیق کردہ ہو۔

مریاں سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ گاؤں کی سادہ دل لڑکی کو جب کچھ راحت نہ ملی تو وہ بغیر سوچے سمجھے مکان کے اندر چلی گئی۔ جہاں وہ بے سوچے سمجھے چل پھر رہی تھی اور سوچ رہی تھی کل وہ شہر دیکھ لے گی جسے وہ آج تک نہ دیکھ سکی تھی۔ اس نے بڑے چاؤ سے وہ سرخ جوڑا بھی اپنی ماں سے مانگا جو اس نے اپنے اسی سفر کے لئے منتخب کر رکھا تھا۔ اس نے سرخ رنگ کے اندر ایک آواز سُنی جو دھیمی ہونے کے باوجود سے جھنجوڑ رہی تھی۔ اس کے شگفتہ اور معصوم ہونٹ اسے خشک خشک محسوس ہونے لگے، وہ ان پر زبان پھیرتی جو دل میں آتا اسے دہراتی —— وہ شہر جائے گی —— وہ شہر دیکھے گی۔

مریاں نے جب کچھ بے چینی محسوس کی تو وہ چھت سے صحن میں اور صحن سے دروازے سے باہر آن کھڑی ہوئی۔ وہ پگڈنڈیاں دیکھنے لگی۔ جن پر سکوت طاری تھا اور اس نے ان پر سے گزر کر شہر کو جانے والی آرزوؤں میں لپٹ کر چلنا تھا۔ وہ بہت دیر تک کھڑی یہی سوچتی رہی۔ ان پگڈنڈیوں سے گزر کر ان کے خاتمہ پر ایک حد ہے اور اس حد کے پار شہر ہے۔

گاؤں کے رواج کے مطابق وہ دن بھی آگیا تھا، جب مریاں نے قرآن پڑھنا شروع کیا۔ اس کی بسم اللہ ہوئی تھی اور مائی حاجو نے اس کا ننھا منا ہاتھ پکڑ کر الف۔ بے سے اس کا آغاز کیا تھا۔ شیرینی بانٹی گئی اور استانی کو جوڑا پہنایا گیا اور بسم اللہ کی رسم ادا کی گئی تھی۔ مائی حاجو کو مریاں سے کچھ لگاؤ سا پیدا ہو گیا تھا۔ جب کبھی وہ اپنے شہر جانے کا شوق ظاہر کرتی تو وہ اسے گود میں لے کر کہہ دیتی تو شہر کیا جائے گی۔ میں تجھے اپنے ساتھ حج کو لے جاؤں گی کعبہ خدا کا گھر ہے، مکہ رسول کی بستی ہے اور یہ شہر اور وہ شہر میری بچی! اس کے سامنے بھلا کیا چیز ہیں۔ گاؤں کا کوئی فرد ایسا نہ ہوگا جس نے مائی حاجو سے کلام پاک کا درس نہ لیا ہو۔ اور یہی ایک سبب تھا کہ مائی حاجو بغیر حج

کتنے ہی مائی حاجو کہلاتی تھی۔ اور جب زمانہ حج گزر جاتا تھا تو وہ اطمینان سے کہہ دیتی تھی۔ آئندہ سال وہ کسی قیمت پر اپنے گاؤں میں ٹھیرنے والی نہیں۔ آخر میری عمر بھی تو ایسی نہیں کہ میں خدا کو منہ دکھا سکوں۔ حج کی برکتیں تو کنائی بھی نہیں جا سکتیں۔

مریاں کی طرح مائی حاجو کی بھی ایک ہی آرزو تھی کہ وہ حج کر آئے اور جب مائی حاجو مریاں کو اپنے ہمراہ حج پر لے جانے کا پورا پورا یقین دلاتی تو مریاں چُپ کی چُپ رہ جاتی اور کہہ دیتی جب ہم حج کو جائیں گے تو ہمارا قافلہ شہر سے ضرور گزرے گا شہر کا خیال کسی صورت اس کا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ مریاں کے شہر جانے کا تصور کچھ ایسا پختہ ہو گیا تھا کہ ایک معصوم لڑکی اپنی گڑیا سے باتیں کرے اور خود ہی یہ سمجھے کہ گڑیا بول رہی ہے۔ "میں تجھے رنگ برنگ کے جوڑے پہناؤں گی۔ مٹھائیاں کھلاؤں گی اور تجھے ساتھ سُلاؤں گی۔ جب تُو بڑی ہو جائے گی تو تیرا بیاہ رچاؤں گی۔ تجھے سسرال جانا ہوگا۔ کتنی من موہنی کتنی سُندر ہے تو سیاہ آنکھوں والی۔ سرخ لبوں والی۔"

سیدھا سادا گاؤں تھا جہاں مریاں رہتی تھی۔ یہاں کے ہر فرد کو اپنی محنت مشقت سے کہیں زیادہ اپنی تقدیر کا شکوہ تھا اور یہ شکوہ انہیں اس اُلجھن سے نکلنے نہ دیتا تھا جس سے نکل کر روزی اور زندگی کی جدوجہد زیادہ روشن نظر آتی ہے وہ سمجھتے تھے دھان کے کھیت، کھیتوں کی وسعتیں، چلچلاتی دھوپ، ہل، پنجالی جوتے اپنی اپنی قسمت کے چکر میں سرگرداں ہیں۔ یہی حال گاؤں کی ان پگڈنڈیوں کا تھا، جو ہاتھ کی لکیروں کی طرح کبھی روشن اور کبھی مسخ ہو جاتی تھیں اور کوئی دیکھ کر یہ کہہ نہ سکتا تھا کہ کس پگڈنڈی کا دوسرا سرا شہر کی چار دیواری سے جا ملتا ہے۔ مریاں اسی ماحول میں پلی تھی جو سوچتی تھی یا چاہتی تھی۔ سوائے ایک معصوم تصور کے اور کچھ نہ تھا۔ گاؤں کے رہنے والوں کی پیشانیوں پر لکھا تھا۔ خدا نے ان کی قسمتوں کے نوشتے لکھ کر چھپا دئیے ہیں۔ جَو، دھان، گیہوں اور چنے مٹی کرید کرید کر نکل آتے ہیں، مگر تقدیر کا لکھا ہاتھ نہیں آتا۔ وہ سمجھتے تھے۔ وہ اعمال نامہ ابھی تیار نہیں ہوا جو ان کی نیتوں کا نستارہ کر سکے۔ ہر سزا و جزا ہزاروں سالوں کی محنت اور دیانت کا پھل نہیں، یہ ازل کا لکھا ہوا ہے اور سامنے آتا ہے۔

اُنہوں نے بغیر سوچے سمجھے جینے کا نام توکل رکھ چھوڑا تھا حالانکہ زندگی کھیتوں میں ہے اور شتابی میں ہے درعمل کی بھٹی میں سے بن کر سنور کر سامنے آتی ہے۔ تقدیر کو مُٹھی میں لینے والے اپنے کردار سے کبھی مایوس نہ ہوتے تھے۔ ہر بار پورے اعتماد سے کمربستہ ہو کر خون پسینہ ایک کر دیتے تھے اور اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے یہ آوازیں سُنتے تھے۔ قدرت نے جو کچھ سُن رکھا ہے ایک حقیقت اور حکمت ہے۔ ان کے عزم میں آج بھی مساوات کا جُنوں اپنے پورے عروج پر ہے۔ انسان کو اس مزرع میں اس نے اسی لئے بھیجا ہے۔

مریاں کا خمیر اسی قسم کی مٹی سے تیار ہوا تھا۔ وہ دیوی تھی مگر اس نے شہر کی پریوں اور حوروں کے قصے کچھ اس انداز سے سُنے اور ذہن میں جمع کر رکھے تھے کہ گاؤں والے سنتے تو مسکرا دیتے۔ اس کا شیوہ تھا شہر سے ہر آنے والے سے کوئی نیا سوال کر دیتی اور خود شہر جانے کا یقین دلاتی۔

کھیتوں کی وسعتیں اور گاؤں کی فضا سے شہر کہیں زیادہ ارفع اور اعلیٰ ہے۔ مائی حاجو سُنتی اور مریاں کو گلے لگا لیتی، اور کہتی تو ابھی معصوم ہے۔ بس حج اور حج کی برکتیں تو کیا جانے، پھر تیرے جیسے معصوموں کے لیے شہر میں دھرا ابھی کیا ہے۔ ہماری قناعت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ ہمارا خون اور پسینہ بلوں اور پنجالیوں سے ٹپکے اور لب پر کوئی شکوہ نہ ہو۔ یہ تھا وہ توکل کا گہوارہ جو مریاں کا گاؤں کہلاتا تھا۔ جب اسے پورا اطمینان ہو گیا کہ وہ کل شہر دیکھنے جا رہی ہے تو وہ مستعدی سے کھڑی رہی جہاں سے اسے مسجد، مائی حاجو کا مکان، چودھری کی حویلی دکھائی دیتی تھی۔ حج کی برکات بیان کرتے کرتے مائی حاجو کو برسوں گزر گئے تھے مگر قسمت نے پلٹا نہ کھایا کہ وہ حج کو جاتی اور حاجن کہلاتی۔

وہ جگہ جہاں سے پگڈنڈیاں شہر کو مڑ جاتی تھیں، درختوں کے سایوں سے آئی ہوئی تھی۔ مریاں کھڑی درختوں کے جھنڈ ان کے گہرے سائے اور اس حد کو دیکھتی رہی جہاں سے گزر کر اسے شہر کو جانا تھا۔ گاؤں والوں کو ان درختوں اور ان کے گھنے گھنے سایوں پر بڑا مان تھا۔ وہ فخریہ کہتے تھے۔ ایسے بلند قامت اور گھنی گھنی چھاؤں والے درخت کسی دوسرے گاؤں میں نہیں ہیں۔ مریاں کو بھی ان کی بڑائی اور موجودگی کا زبردست احساس تھا۔ وہ سوچتی تھی۔ کل جب وہ شہر جائے گی تو ان درختوں کی نگاہیں اس کا پیچھا کریں گی۔ کیونکہ انہیں بھی اپنی مریاں کی آرزوؤں کا پتہ ہے۔

مریاں کا کردار کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو۔ پھر بھی ہر گاؤں میں ایک مریاں ہوتی ہی ہے۔ مریاں کے گاؤں سے دور ایک دوسرے گاؤں میں کبوتر شاہ کا مزار تھا جس کا عرس ہر سال بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ اتنی منتیں اور مرادیں مانی جاتی تھیں کہ مریاں نے بھی اپنی منت کو کبوتر شاہ کے سر ڈال رکھا تھا اور وہ سمجھتی تھی جب بھی گاؤں کا چاند ابھرتا ہے۔ کبوتر شاہ کے مزار سے اس کا آستانہ چوم کر ابھرتا ہے۔ وہ آج رات مزار کے متعلق بہت سوچتی رہی، یہاں تک اپنے خیالوں میں سو گئی کہ کل اسے وہ چاند اور سورج بھی دکھا دے گا جو ایک دریائے نور کی طرح شہر سے ابھرتا ہے۔ شہر والوں کو سیراب کرتا ہے۔ وہ صبح اٹھی تو نیم کے پیڑ پر فاختہ اپنی مست مست آواز میں گوگو کہہ رہی تھی اور وہ سمجھی یہ آواز بھی اسی کے لئے ہے، وہ فاختہ بھی شہر سے آئی ہے اور وہ اس کی زبان کو سمجھ سکتی تھی اگر شہر کو پہلے دیکھ لیا ہوتا۔ ایک روز وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ جوہڑ پر کھڑی تھی۔ طوطوں کا ایک جھنڈ فراٹے بھرتا ہوا جوہڑ پر سے گزرا۔ تو ان کے سائے سے پانی کی سطح لرزی اور لہریں مٹ گئیں اور اچانک ایک طوطا درخت کے تنے سے ٹکرا کر زخمی ہوا اور جوہڑ ہی میں گر کر مر گیا تھا۔ اسے یاد تھا اس واقعے نے اس کا دل زخمی کر دیا تھا۔ پچھلے سال کبوتر شاہ کے مزار پر جب میلہ لگا تو وہ بھی منت ماننے گئی تھی اور دودھ کا کٹورہ اس کے ہاتھوں سے گر گیا تھا اور دودھ مزار تک نہ پہنچ سکا تھا۔ ایسے کئی واقعات مختلف شکلوں میں اس کے سامنے آتے تھے اور مٹ جاتے تھے۔ مگر وہ مایوس نہ ہوتی اور اپنی مستعدی کا اظہار کرتی رہی۔ گھر کے صحن میں کھڑی گزرے ہوئے واقعات کو دہراتی رہی کہ اس کی ہمجولیاں اس کے پاس آئیں اور اسے بازوؤں میں بھینچ کر یقین دلاتی رہیں کہ وہ کل سب مل کر شہر جا رہی ہیں۔ نیم کے گھنے درخت سے فاختہ کی آواز برابر آتی رہی۔ ان کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ سب ہی معصوم تھیں اور ایک دوسرے کا منہ تک رہی تھیں۔

صبح سویرے مریاں اٹھی اور اس نے بڑے چاؤ سے وہ سرخ جوڑا پہنا جو اس نے آج کے لئے سنبھال کر رکھا تھا۔ اس کی مندی مندی عمیق سیاہ آنکھیں سانولے سے سرخ چہرے پر امنگیں پیدا کر رہی تھیں۔ خاص کر آج جب کہ وہ شہر جانے والی لڑکیوں اور عورتوں کے حلقے میں گھری کھڑی تھی اور ہر چہرے کا جائزہ لے رہی تھی کیا یہ حقیقت تھی کہ وہ آج شہر جا رہی ہے۔

گاؤں کی سادہ لوح لڑکی کے جسم پر شوخ رنگ کا جوڑا بڑا ہی بھلا معلوم دے رہا تھا۔ جو دیکھتا تھا اسے مبارک فال خیال کرتا اور کوشش کرتا کہ اس کی ہر آرزو پوری ہو۔

شہر کی طرف قدم اٹھاتے وقت اس نے اپنی سمجھ کے مطابق وہ سب کچھ کیا جو کرنا چاہیے تھا۔ مریاں اور شہر جانے والا قافلہ گاؤں چھوڑ کر کھیتوں کی حدود سے باہر نکل آیا تھا۔ غیر شعوری طور پر مریاں نے پلٹ کر گاؤں کو دیکھا۔ مگر وہ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ چھدری چھدری چھاؤں میں لال جوڑا اسے بہت بھلا معلوم دے رہا تھا۔ ہر کوئی محبت سے کہتا اپنی مریاں چودھویں کا چاند دکھائی دے رہی ہے۔ مگر اسے اپنی کوئی اہمیت محسوس نہ ہوئی تھی۔ سوائے اس آرزو کے جس میں وہ لپٹی ہوئی کیفیت نظر آ رہی

تھی۔ یہ گاؤں سے شہر خرید و فروخت کے لئے جا رہی تھیں۔ بعض کو اپنے اپنے رشتہ داروں سے ملنا تھا۔ سب کا مقصد ایک ہی تھا ایسے ہی الگ الگ جیسے معصوم مریاں کو اپنا مقصد سب سے الگ نظر آ رہا تھا۔

چھدری چھدری چھاؤں میں گھنے گھنے درخت بڑے بھلے معلوم دے رہے تھے۔ چلتے چلتے گاؤں کو آنے جانے والی پگڈنڈیاں مٹی کے ساتھ مل کر گم ہو گئیں۔ مریاں اس وقت سب سے آگے نظر آ رہی تھی۔ شرمیلی شرمیلی آنکھوں میں سرمدی جنون شوق سے لپے جا رہا تھا۔ دھوپ تیز ہوتی جا رہی ہے۔ چلو چلو ابھی شہر کی ٹھنڈی ہوائیں احساس لطافت پیدا کر دیں گی۔ اس کا دل خوشی سے اچھل پڑا وہ گاؤں اور شہر کے فرق کا اندازہ کر ہی نہیں سکتی تھی۔

دوپٹہ گرتا تو سنبھال لیتی، سر چھپا لیتی اور کشاں کشاں چلی جاتی۔ وہ ساتھ والیوں سے آگے آگے چلتی کہ بس کے شوق کا ظہار ہوتا رہے۔ شہر کے آسمان کا رنگ ابھی تک ویسا ہی تھا۔ جیسا وہ اپنے گاؤں میں دیکھتی تھی۔ ہواؤں کی ٹھنڈک کم ہوتی جا رہی تھی۔ ایک شور اس کے کانوں میں سمایا جا رہا تھا۔ پھر اس کی آواز اور سرخوشی میں سرِ مو فرق نہ آیا تھا۔ مریاں کی مسرت کے پیچھے ایک روشنی رقصاں تھی کچھ ایسے ہی جیسے فطرت کو بھی اس کی دلجوئی مقصود ہو۔

پختہ پختہ سڑکیں۔ گزرنے والوں کی مصروفیتیں اور ہجوم نے اس کی نگاہوں کو خیرہ تو ضرور کیا مگر وہ اپنے قدموں پر اترنے لگی۔ شہر آگیا ہے۔ اس کے نشان دکھائی دینے لگے ہیں۔ وہ تمام راستے اور پگڈنڈیاں جو دیہات والوں نے بنا رکھی تھیں۔ پختہ سڑکوں سے کہیں دور ختم ہو جاتی تھیں اور ہواؤں کا دم گھٹتا تھا اور گمان تک باقی نہ رہتا تھا کہ ان کا کوئی رشتہ ہے۔

موٹر کاریں، لاریاں اندھا دھند اِدھر سے اُدھر۔ اُدھر سے اِدھر آ جا رہی تھیں۔ سڑکوں پر سے گزرنے والے اس طرح نظر آتے تھے جیسے سب کے سب کھو گئے ہیں۔ افراتفری کا عالم تھا تحیر سے مریاں کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔ شہر کیا ہے۔ یہ مریاں کی آنکھوں میں پھر گیا تھا۔

کسی کار نے ہارن دیا تو ایک ٹانگے والا بے نقط گالیاں بک رہا تھا۔ گاؤں کا یہ بے شعور قافلہ تتر بتر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگا۔ مریاں کار کی لپیٹ میں تھی کہ ڈرائیور نے اسے جھٹکا، اسے دھکیلا اور فٹ پاتھ کی طرف رُخ کر دیا۔ ایک سپاہی دور کھڑا چیخ رہا تھا۔ یہ گاؤں کے گنوار لوگ جب بھی اِدھر کا رُخ کرتے ہیں ٹریفک کنٹرول میں نہیں رہتا۔ مریاں سنبھلی۔ اس نے ساتھ والیوں پر نگاہیں گاڑ دیں کہ وہ شہر میں گاؤں والیوں سے بچھڑ تو نہیں گئی۔ کون بتلائے گا کہ اس کا گاؤں کدھر ہے؟ اور دین کا چراغ جو اسے روشنی میں لے آیا تھا، مدت ہوئی وہ بجھ گیا تھا۔ اس اندھیرے میں ٹٹولتی بھی تو کیا ٹٹولتی؟

مریاں کی ساتھ والیاں جا رہی تھیں، ایک موڑ سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے پر پہنچ کر شہر کے اندرونی حصے میں جلد سے جلد پہنچ جائیں وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ دو کاریں آپس میں ٹکرا گئیں، حادثے کی چیخ پکار میں مریاں کی چیخیں بری طرح دب گئیں۔ وہ چاہتی تھی کہ ابھی بھاگ پڑے اور اپنی ساتھ والیوں کو بھی لے بڑھے۔ مگر وہ دور کھڑی تھی۔ چند فیشن والی لڑکیاں کاروں کے حادثے کی بجائے مریاں کو دیکھ رہی تھیں اور وہ طنز سے یوں مسکرا رہی تھیں۔ جیسے یہ گنوار شہر میں چلنے پھرنے تک کا کوئی حق نہیں رکھتے۔

شہر مریاں کی ذہنی وسعتوں میں نہ سما سکا۔ وہ کبھی اس کا منہ تکتی کبھی اس کا۔ کبھی دائیں دیکھتی اور کبھی بائیں۔ وہ اپنے آپ کو چھپانے میں لگی رہی۔ ساتھ والیاں اس کی کیفیت سے کتنی بھی بے نیازی ظاہر کریں۔ مگر اس کے بجھے ہوئے دل کا اندازہ کر ہی رہی تھیں اس کے

لبوں پر کچھ بھی نہ تھا کہ وہ کہہ سکتی۔ شہر نے اسے اپنے آغوش میں لے لیا ہے جس کے متعلق وہ برسوں سے سوچتی چلی آ رہی تھی اور سمجھتی تھی کہ گاؤں واپس لوٹ بھی سکے گی یا شہر کی ہو کر رہ جائے گی۔

ایک کُتّا اسے غریب شہر سمجھ کر لپکا اور اس کا سُرخ پلّو بے دردی سے کھینچا اور بھاگ نکلا۔ مریاں چیخی اور اس کے آنسو نکل آئے۔ ساری دیہاتی عورتیں یک زبان ہو کر بولیں۔ یہ نامراد اسی طرح سے ہم پر بھونکا کرتے ہیں۔ ان کے حملوں سے ڈر ہی لگا رہتا ہے۔ ایک نے بڑے پیار سے مریاں کو ساتھ لے لیا اور کہا ابھی شاہی مسجد دکھانے تمہیں لے جائیں گے۔ یہاں اس کے دیکھے بغیر دھرا ہی کیا ہے۔ شہر سے وہ بڑی مختلف جگہ ہے۔ مریاں کو اپنی گڑیا یاد آ گئی۔ اُسے ایسا نظر آیا جیسے وہ لب بند اس کی راہ دیکھ رہی ہے۔

مریاں دیکھو وہ اس بڑے مکان کی دیوار پر جوگن کی تصویر بنی ہے اور وہ دوسری طرف پہلوان کشتی لڑ رہے ہیں۔ ایک بوڑھی عورت رُک گئی اس نے کہا میں بھی گاؤں کی ہی رہنے والی تھی۔ مجھے بچپنے میں شہر دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ مگر ان دنوں جب میں بیاہی آئی یہ شہر ایسا شہر نہ تھا۔ نہ یہ لوگ تھے اور نہ یہ رونقیں تھیں۔ یہ کہہ کر بوڑھی نے اپنا مُرجھایا ہوا ہاتھ مریاں کے سر پر رکھ دیا۔ دیکھو وہ گھڑی، یہ خود بخود بجتی ہے۔ شہر کے سارے کاروبار اسی پر چلتے ہیں۔ اس کی آواز گاؤں میں جاتے نہ جاتے پر یہ شہر کی اونچی نشانی ضرور ہے۔

بوڑھی نے کہا وہ دیکھو سفید دُھلے پاکیزہ گنبد۔ وہ چار بلند بلند مینار یہ شاہی مسجد ہے اور ایسی مسجد تیرے گاؤں میں نہ ہو گی اور نہ میرے گاؤں میں ہی تھی۔ عید کے روز اس کی شان دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ بادشاہِ وقت مسجد میں خود نماز پڑھنے آیا کرتا تھا۔ بوڑھی کے تقدس بھرے الفاظ سے مریاں کا دل پھر اُبھرا۔ شہر کا وہ تصور جو اس نے بنا رکھا تھا اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر چمک اُٹھا۔ جو اس کی آرزوؤں کا مرکز تھا۔ شہر ان گنبدوں اور میناروں کے پیچھے ہے۔ بوڑھی آنکھیں آبدیدہ ہو رہی تھیں اور مریاں کی آنکھوں میں ایک نامعلوم سی چمک تھی۔

مریاں اور اس کے ساتھ والیاں بازار کے بیچوں بیچ چلنے لگیں۔ گھڑیال نے اپنے وقت پر صدا بلند کی اور وہ تتر بتر دیکھنے لگیں۔ عین اس وقت یہ گاؤں والیاں بلوری چوڑیاں بڑے قرینے سے شوکیسوں میں سجی ہوئی دیکھ رہی تھیں۔ مریاں رنگا رنگ چوڑیاں دیکھ کر ریجھ گئی تھی کہ کسی راہ گزر کی پلیٹ میں آ گئی اور اوسان خطا ہو گئے۔ وہ مسجد کی طرف ہو لیں۔ موٹر گاڑیوں کا شور، آمد و رفت کی گہما گہمی۔ حسین لباسوں میں حسین لڑکیاں، مریاں دیکھتی، آوازیں سُنتی تو اس کے چہرے پر مختلف رنگ بکھر جاتے جو گاؤں والوں کے چہرے پر کبھی ظاہر نہیں ہوتے۔

مریاں اور اس کی ساتھ والیاں ایک دوکان کے سامنے آ کر رُک گئیں جس کے ایک پہلو میں قدِ آدم آئینہ لگا ہوا تھا۔ سب نے تتر بتر اس میں اپنے آپ کو دیکھا وہ شہر میں کتنی مختلف نظر آ رہی تھیں۔ ایسے ہی جیسے کسی نے جاتے جاتے انہیں روک لیا ہو۔ مریاں نے جب اپنے آپ کو سر سے پاؤں تک دیکھا تو وہ ششدر رہ گئی اور گہری سوچ میں ڈوب گئی، سرخ جوڑا، ماتھے کا جھومر گرد سے اٹا ہوا چہرہ۔ آنکھیں مُندی مُندی، وہ دیکھتی رہی وہ کیا دیکھنے آئی تھی، چھوٹی سی دنیا میں چھوٹے چھوٹے جھٹکے تو لگے مگر وہ طوفان نہ بن سکے۔

وہ میٹھے میٹھے دھیمے دھیمے تصورات جو اس کی خود فریبی سے حقیقت نہ بن سکے تھے اب روکھے روکھے دکھائی دینے لگے تھے اور وہ معصوم خوشیاں جن پر وہ ریجھ گئی تھی۔ پاؤں کی آہٹوں سے ڈر گئی، پھر دل کی کیفیت کسی سے نہ کہہ سکتی۔

ادھیڑ عمر کی دیہاتی عورت نے مریاں کا دل بہلاتے ہوئے اسے وہ عورت دکھانے کی کوشش کی جو شیشے کی ایک الماری میں

بند کھڑی تھی۔ ماڈل تھا، مگر دلہن نظر آ رہی تھی۔ ہاتھ میں آئینہ تھا اور اپنے سنگھار میں محو تھی دوسری بالکل ننگ دھڑنگ تھی۔ آنکھیں جھک گئیں۔ آنے جانے والوں کی بے نیازیاں دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کرتی بھی تو وہ ناکام کی ناکام رہتیں۔ ان میں سے اکثر کو ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے انہوں نے بھی شہر پہلی بار دیکھا ہو۔

❖

دیکھتے دیکھتے چند شہری لڑکیوں نے دیہاتنوں کو آگھیرا۔ یہ تمام لڑکیاں مختلف لباسوں میں تھیں اور ان کا سنگھار ہی کچھ ایسا تھا اور ایسا نظر آتا تھا جیسے کھڑکیوں میں کھڑے ہوئے ماڈل بُتوں کے تُوں ان معصوموں کے سامنے ناچنے لگے ہوں۔ یہ سب خوش گفتار، اور خوش ادا تھیں۔ ایک نے بڑی تمکنت اور تحکم کے لہجہ میں کہا ”ذرا کھڑی ہو جاؤ اپنے چہرے کو اس رخ رکھو، ہم تمہارا فوٹو بنانا چاہتے ہیں۔“ ایک نے بڑھ کر مریاں کو اپنی عکاسی کا مرکز بنایا اور کہا ”کھڑی رہو!“ اس کے چہرے پر احساسِ کمتری سے مُردنی سی چھاگئی مگر وہ بس وقت بہت ہی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ کیمرہ اس وقت بالکل اس کے سامنے تھا۔ ایک نے اس کو پیار سے تھپکا اور اس کے جذبات کو اُبھارتے ہوئے کہا ”کل کے اخبار میں تمہاری فوٹو چھپ جائے گی اور تم کہہ سکو گی کہ شہر دیکھنے آئی تھیں!“ مریاں کی آنکھیں نور کی طرح چمکیں، مگر وہ کچھ سمجھ نہ سکی کہ کیا معجزہ ہونے والا ہے۔ مگر وہ اسے کچھ کچھ محسوس کر رہی تھی۔

مریاں شہر دیکھ چکی تھی۔ وہ اس سڑک پر تھی جو بل کھاتے کھاتے ان پگڈنڈیوں میں جا ملتی تھیں جو گاؤں کو جاتی ہیں۔ درختوں کے سائے ڈھل کر لمبے ہوتے جا رہے تھے اور یوں اوندھے لیٹے ہوئے نظر آتے تھے جیسے اُٹھنے کی سکت جاتی رہی ہو۔ فضا دھندلی دھندلی ہوتی جا رہی تھی، جیسے تازگی کھو گئی ہو۔ اب نہ وہ فضا تھی، نہ وہ اُٹھان، نہ جذبہ وہ جو اس وقت تھا جب مریاں ادھر سے گزر رہی تھی اور شہر قریب دکھائی دے رہا تھا۔

گاؤں واپس جانے والی ہر گاؤں والی کے قدم بھاری بھاری اور جسم بوجھل بوجھل محسوس ہو رہے تھے۔ مریاں گرتے گرتے بچی۔ اس کے ہونٹوں سے خون پھوٹ رہا تھا اور آنکھیں یوں نظر آ رہی تھیں جیسے گاؤں کے تصور کو سمیٹ رہی ہوں۔ درختوں کے بھاری بھاری تنوں کے نیچے اسے سورج بھی نظر آیا اور اسے تسکین سی محسوس ہوئی جیسے وہ اس کے گاؤں میں ہی اُتر رہا ہو اور اپنی طرف بُلا رہا ہو۔ وہ لمحہ بھر کے لئے رُکی۔ اس نے اپنے سرخ جوڑے پر نگاہ ڈالی جو گرد سے اَٹا ہوا تھا۔ ہر چہرہ بے رونق، ہر دل اداس تھا۔ ان سب نے شہر دیکھ لیا تھا۔

جوں جوں گاؤں نزدیک آتا جا رہا تھا، آسمان کی لامحدود وسعتیں مریاں کو پُرخلوص بازوؤں میں لینے کے لئے بیتاب تھیں۔ گاؤں کا تصور فضا میں مسکراتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ آرزوؤں کی شکست نے اسے اعترافِ شکست سے بھی بیگانہ بنا دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے دل کی دھڑکنوں کو کوئی سنے اور اسے دلاسہ دے کہ وہ ابھی بچی ہے اور اس کی آرزوئیں معصوم ہیں اسے ہلکا سا درد محسوس ہوا۔ اسے اپنی بھولی بھالی معصوم گڑیا یاد آئی اور اس یاد نے اسے جھنجھوڑا بھی، جیسے وہ ایک تاریک فضا میں بند کر آئی تھی اور وہ طاق بند کر دئے تھے کہ کوئی اسے نہ دیکھ سکے کہ اس پر کیا گزر رہی ہے دلہن کو خواہ وہ گڑیا ہی کیوں نہ ہو حیادار اور پردہ والی ہونا بھی تو ضروری ہوتا ہے۔ وہ کھلنڈرے، شوخ، شریر چھوکروں سے الگ ہی رہتی ہے —— وہ اکثر اپنی گڑیا کو نیا جوڑا پہناتی۔ طرح طرح کے ”کھانوں“ سے اس کا دسترخوان بھی سجاتی اور کہتی ”یہ دلہن بڑی شرمیلی ہے۔ پردہ دار ہے۔“

آج جب وہ گاؤں سے شہر کی طرف رُخ کرنے والی تھی اس نے اپنی گڑیا کا جوڑا بدلا تھا، اور اس کا دسترخوان بڑے پُرتکلف طور

پر سجایا تھا اور آتی دفعہ کہہ آئی تھی۔ گھبرانا نہیں بس میں گئی اور آئی۔ اس وقت وہ شدت سے گھبرائی ہوئی تھی۔ اسے کپڑوں کی مختلف دکانیں۔ وہ ماڈل عورت، اس کے مقابل غیر ملبوس قد آدم گڑیاں شہر میں نظر آئیں جنہیں دیکھ کر وہ اپنی حیادار گڑیا کو یاد کرنے لگی۔ اس کی فہم اور دماغی توازن قائم نہ رہ سکا۔ مگر وہ فقرہ دہرانے لگی جو بوڑھی عورت نے شیشے کی الماری میں کھڑی ہوئی گڑیا کو دیکھ کر طنزاً کہا تھا "ان کے اطوار سے ایسا نظر آتا ہے: جیسے دونوں کو سانپ ڈس گیا ہے" پھر دونوں کے سر بھی ننگے تھے۔ بڑی عورتوں کا کہنا ہے، ننگے سر عورت کا سہاگ خطرے میں ہوتا ہے۔ جب میری گڑیا میری خالہ نے تیار کی تھی تو خالہ نے دوپٹہ اس کے سر کے ساتھ ہی سی دیا تھا تاکہ وہ سدا سہاگن رہے۔ جب خالہ نے اس کی آنکھوں کے سیاہ ڈورے لگائے تھے۔ کاجل کے نشان دئے تھے تو خالہ اماں نے کتنے اعتماد سے کہا تھا دیکھو تو منہ میں زبان تک نہیں اس کی عادتیں ہم سے کیسی ملتی جلتی ہیں۔ یہ حیا کی پڑیا ہے۔ یہ نسوانی عظمت کی نشانی ہے۔ کہنے کو ایک گڑیا ہے۔

گاؤں گاؤں ہی ہے اور شہر شہر۔ شہر کی دولت ہماری گاؤں کو مل جائے تو یہ گاؤں گاؤں نہ رہے۔ مگر شہر بہت سی دولتوں سے محروم ہے۔ گاؤں کو اپنی معصوم مصروفیتیں شہر بننے کی مہلت نہیں دیتیں۔ اچھا ہی ہے اس سطح ارض پر کوئی جگہ تو پاکیزہ رہے۔ پھر شہر جانے والی سب دیہاتنیں اپنے دروازہ کے سامنے رکیں اور ایک دوسرے کو اللہ کے سپرد کر کے گھروں میں داخل ہو جائیں۔ مرّیاں پیچھے تھی اس نے دیکھا چاند بڑ کے پرانے درخت کے تنوں سے ابھر رہا تھا اور ایسا نظر آ رہا تھا جیسے کسی معصوم کی پیشانی پر جھومر سجا ہوا ہو۔

مرّیاں کو دیکھ کر ہر بچے نے اس کا خیر مقدم کیا۔ کسی نے کچھ پوچھا کسی نے چمٹ کر پیار کیا۔ مگر وہ بولی کچھ نہیں۔ اس کی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہ ہو سکا۔ وہ بتا نہیں سکی شہر کیسے ہوتے ہیں۔ وہ صحن میں پہنچی تو چھوٹی بہن کو کندھوں پر اٹھا لیا اور اندر کی طرف بھاگی اور یہ کہتے ہوئے "تیری میری گڑیا کہیں کلپ نہ رہی ہو" اس وقت اس میں عزم اور غرور تھا۔ اس کا ماتھا ٹھنکا اور وہ اپنی گڑیا کے گھر کی طرف لپکی۔ اور انگلی سے پھلکاری کو سرکا دیا۔ گڑیا کو دیکھا تو مسکرائی جیسے خود ہی اندر بیٹھی ہو۔ چھوٹی سی بے زبان بہن کو کہتی ہوئی تیرا گھر، تیرا گاؤں بڑا اچھا ہے جہاں تُو نے، دادی اماں نے، خالہ نے، اور امی نے جنم لیا ہے۔ شہر شہر ہی ہے۔ مگر مجھے یہ لگتا ہے کہ شہر کبھی گاؤں دیکھنے آئے گا!

اکتوبر ۱۹۶۲ء

وہ جھیل کنارے پرندوں کے ایک غول کے درمیان آ گرا۔
باروشس نے اُسے ایک ہاتھ سے اُٹھایا اور دوسرے سے اُس کی کھلی چونچ
میں پانی ٹپکاتے ہوئے کہا "تم بھی اس جھیل پر مرنے کے لئے آ گئے ہو؟"
پرندے نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مر چکا تھا۔

مستنصر حسین تارڑ

عکس تحریر: مستنصر حسین تارڑ

# سردار

ابوالفضل صدیقی

سو برس سے اُوپر عمر پا گئے تھے پھر بھی پہاڑ کے پہاڑ بنے ہوئے تھے۔ اور پہاڑ بھی کائی سے ڈھکا ہوا۔ کالا چمڑا جو کسی زمانہ میں سنگ مُوسیٰ کی چٹان کی طرح دمکا کرتا ہوگا، اب تو بُھورا بُھورا سیاہی مائل مٹیالا سا ہو گیا تھا اور دُور سے ایسا معلوم ہوتا جیسے اوپر سے نیچے تک میل جھولی پڑی ہوتی ہے، جس کی شکنوں میں دھڑیوں دُھول بھری ہوئی ہے۔ ننھی ننھی گول گول آنکھیں اور بھی اندر جا پڑی تھیں اور دونوں جانب کنپٹیوں کے گڑھے بہت نمایاں اور زیادہ گہرے ہو گئے تھے۔ کسی زمانہ میں جو دانت چیرنے پھاڑنے اکھاڑنے میں غضب ڈھایا کرتے تھے، ان میں سے ایک تو جڑ سے ٹوٹا ہُوا تھا اور دوسرا کھٹل ٹھنڈ کی طرح میلا میلا زردی مائل ترچھا ہُوا آگے کو سینگ کی طرح نکلا ہوا تھا۔ اور یہ بھی بیکار کا بوجھ تھا، خود ہی جب کسی قابل نہ رہے تھے اور اپنے اُوپر آپ ہی بوجھ تھے تو یہ کیا کرتا، اور اب تو ان حالوں کو پہنچ گئے تھے کہ منہ کے اندر داڑھیں بھی کھٹل پڑ گئی تھیں اور چبانے تک سے معذور تھے۔

ساری عمر ہمالیہ اور شوالک کے دامن میں بڑی بہادری کے ساتھ سرداری کی تھی اور اپنے زمانہ میں بڑے بڑوں کا، اپنے سے سوائے ڈیوڑھوں تک کا سکہ نہ جمنے دیا تھا، اور اب تو پیری اور صد عیب، ہاتھ پاؤں جواب دے گئے، گوشت تو رہا نہیں پاؤں نے ہڈیوں اور کھال کا بوجھ لے کر چلنے سے انکار کر دیا۔ کولہوں اور ٹانگوں کا جوڑ چلتے میں چُخ چُخ کر فریادیں کرتے، اور نگاہ تو خیر پیدائش ہی سے کوتاہ ہوا کرتی ہے، سونگھنے کی قوت بھی گر گئی اور ستم بالائے ستم یہ ہُوا کہ پیٹ کا دوزخ تو بھڑک بھڑک کر ایندھن مانگتا اور مونہہ کے دانت دشمن ہو گئے۔ کھاتے میں داڑھیں دکھتیں اور چبانے میں اندر کی کھال دب جاتی۔ جبڑوں کی حرکت بھی ڈانواڈول سی ہو گئی تھی، نرم غذا تو آسانی کے ساتھ ہاتھ نہ آتی اور سخت کاٹے نہ کٹتی۔ پھر بھی چودھراہٹ بنائے آگے آگے چلتے، ساتھ سنگت میں ادھ پڑتا پیٹ بھر ہی جاتا اور اب تو کل کے لونڈے تیز نگاہوں سے دیکھتے۔ پھر ننھی ننھی آنکھیں اندر ہی اندر گُھما کر بل کھا کے مٹ مار جاتے۔ ایک روز ایک نیا چھوکرا ساتھ والی سے ٹھٹھولیں کرتا چل رہا تھا اور کچھ وہ بات تو مدتوں سے نہ تھی، پھر بھی بڑ بُھس تھی، یا شاید یوں ہی جیسے حسب عادت بڑے بوڑھے لڑکوں کو گھرکتے چلتے ہیں۔ ذرا شوں کر کے ڈانٹ سا دیا، اور وہ نالائق تو سیدھا ہو گیا، اور اس کے سیدھے ہوتے ہی چودھراہٹ کی بھو نکل گئی۔ گنیش مہاراج نے بڑے زور سے پھٹی ہوئی گرج میں ڈانٹ بتائی، مگر ڈانٹ کے ساتھ وہ ناخلف تو اُلٹا بھڑ گیا، اور اس کے بھڑتے ہی سب نوجوان اور ادھیڑ تک بھڑ گئے، اور نئی نویلیاں تو خوش خوش کھڑی تماشہ دیکھتی رہیں اور ان کے تو جلے دل کے پھپھولے آج پھوٹ رہے تھے، بڈھے کھوسٹ نے عمر بھر ساتھ والے کے ساتھ ایک ساعت سُہانی نہ گزارنے دی تھی اور جب بہار پر ہوتیں تو غول سے بھٹک کر دُور کہیں گھنے جنگل میں جہاں بڈھے کی مِسی ناک کام نہ کر سکے دو چار دن کے لئے ساتھ بھاگ جایا کرتیں اور وہاں بھی ہر وقت دغدغہ لگا رہتا کہ کہیں خرانٹ سونگھ نہ لے۔ مگر اس وقت چار چھ ٹھنڈی بڑی بوڑھیاں جن سے اپنے زمانے میں واسطہ رہا تھا آڑے آ گئیں، ورنہ بڈھے کو مار ہی

گرایا تھا، پھر بھی سوکھی ہڈیاں اچھی خاصی کٹ گئیں اور وہ تو خیریت گزری کہ پہلی جڈ بڈھا رُک گیا اور اگر کہیں دوسری جڈ ہو جاتی اور نیچے آجاتا تو پھر اُٹھائے اُٹھ بھی نہ سکتا اور یہیں پڑے پڑے گدھ نوچ لیتے۔

پھر دھر اُنت کا طلسم ٹوٹتے ہی غول کی قیادت چھوٹ گئی اور چند روز تو رُوٹھے رُوٹھے سے دائیں بائیں لگے رہے مگر مہاراج میں کچھ باقی تو تھا ہی نہیں جو ساتھ والیاں منا کر لاتیں۔ مُفت ہی گھیر گھار کئے پڑے تھے۔ اور نئے پٹھوروں کے تیور بد ستور بے ڈھب تھے۔ دوسرے ہی تیسرے روز مہاراج کو اندازہ ہو گیا کہ سیادت ہاتھ سے نکل گئی۔ جب ان میں سے ایک نے رہنمائی کرنی شروع کر دی اور پھر قیادت سنبھال لی تو صبر آ گیا۔ مگر غول چھوڑتے بھی بن نہ پڑی۔ اترا شحنہ مرد کی نام — پون صدی سے غول کے آگے آگے چلنے والا غیور سردار اب دو تین سو گز پیچھے چلنے لگا! خیر یہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ آٹھ دس من وزن کا بھاری پیٹ ساتھ لگا ہوا تھا اور اُس دوزخ کے اندر جو دو چار چھ من خس و خاشاک پڑ سکتا تھا وہ غول ہی کے سہارے لگے رہنے سے ممکن تھا مگر چند ہی روز میں یہ بات بھی ناقابلِ برداشت ہو گئی، خیر کچلا ہوا پس خوردہ اور روندی ہوئی بھونٹن کھا کر صبر کر لیا، اور سب سے آگے چلنے والے اور بہترین نرم و شیریں تازہ غذا پر سب سے پہلے موہنہ ڈالنے والے سردار نے اس پر گزر کر لی مگر اس کے ساتھ سب سے مکروہ چیز وہ بول و براز کے غلیظ ڈھیر ہوتے جو غول کے ساتھ ساتھ پیچھے چھوٹتے جاتے، چند ہی روز میں لمبی ناک والے مہاراج جی چھوڑ گئے، اور پھر مجبور ہو کر ان کا پیچھا بھی — اور چھوڑنے کو تو غول چھوڑ گئے مگر چھوڑتے ہی آنکھیں کھل گئیں، مدتوں سے دوسروں کی ناک کان اور آنکھ نے کام کیا تھا اور مہاراج نے مفت میں رہنمائی کی تھی اور بہترین مال مار، تھا، اعلیٰ سے اعلیٰ چارہ کھایا تھا اور نئی سے نئی بھٹور میں ٹوٹ ن تھیں۔ غول کا پیچھا چھوڑ کر پتہ چلا کہ ہم کیا ہیں، نہ تو سو دو سو قدم کا اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں اور نہ میل دو میل کا سُن سکتے ہیں اور خیر چار چھ میل کی سُونگھ بھی لیں کہ نرم نرم نمکین نمکین پیڑ کا قطعہ کدھر ہے، میٹھی میٹھی ایکھ کے رس بھرے گنوں والے ہرے بھرے کھیت کون سی سمت ہیں تو پھر بھوک اور بڑھاپے میں دس پانچ کوس کا دھاوا مار کے وہاں پہنچنا کارے دارد، اور پھر گنے کے کھیتوں پر اکیلے دوکیلے کے بس کا کام بھی نہ ہوتا، کسان بڑی بھرپور چوکسائی کرتے، وہاں تو غول کے ساتھ ہی چھاپا پڑ سکتا تھا، اور وہ بھی ترکیب سے کنٹیلی باڑھیں اور ارگڑے اکھیڑ کر ڈگ ڈگ زمین سونگھتے چلتا اور پھونک پھونک کر قدم ڈالتا کہ کہیں گھاس پھونس سے ڈھکی کھائیوں اور گڑھوں میں نہ جا پڑیں جو کسان کاشتہ قطعوں کے قرب و جوار میں جنگلی جانوروں کی گزرگاہوں پر کھود دیتے ہیں۔ اب رہیں برگد گولر پیپل کی شاخیں، ان کا توڑنا مروڑنا اور پھر چھیل کر اندر سے گری نکالنا یہ تو ان کے لیے مدتوں سے غول والے کیا کرتے تھے دو ایک دن اس پر بھی کوشش کی۔ خیر، مگر پہلے تو محنت بہت زیادہ پھر یہ سخت غذا ان کے دانتوں کے بس کا روگ نہ تھی، سمجھ گئے کہ زندگی کے دن بہت تھوڑے باقی ہیں اور کسی دن گھل گھلا کر جہاں تہاں پسر سے رہ جائیں گے مگر تقدیر کے لکھے کو کون مٹائے مثل مشہور ہے ہاتھی جئے تو لاکھ کا مرے تو سوا لاکھ کا، ساری عمر ہاتھیوں کی سرداری کی تھی، اخیر عمر میں دیوتا بننا اور دودھ ملائی کھانا قسمت میں لکھا کر لائے تھے۔ کئی دن کے بھوکے ایک سمت آہستہ آہستہ بڑھتے چلے گئے اور چلتے چلتے شہر کے مضافات میں جا پہنچے اور ڈیڑھ دو دن کے تو چاروں طرف گھنا جنگل لگا ہوا ہے۔ ایک دیہاتی راستہ کے کنارے شام کے وقت تھکے تھکائے گھنے درختوں کے جھنڈ تلے جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گئے اور بیٹھ کر اچھی طرح سستا بھی نہ پائے تھے کہ شامہ نے تازہ دودھ کی خوشبو لے لی۔ پنکھا سے کان جلدی جلدی ہلے اور سونڈ کی نوک ہوا میں لہرا لہرا کر خوشبو کی سمت کا تعین کرنے لگی، جب تک کچھ نسائی آوازیں کان میں پڑیں، میٹھی میٹھی اطمینان سے بڑھتی ہوئی آوازیں، اور یک دم پانچ چھ دیہاتنیں دودھ کی مٹکیاں سروں پر دھرے شہر کو جاتی سامنے آ گئیں، بالکل ہی ملحق، اتنی قریب کہ اک ذرا کمر سے اچک کر اور سیدھی ٹانگیں آدھی کھڑی کر کے جو سونڈ بڑھائی تو ایک مٹکی سر پر سے سونڈ کی نوک میں پھنس گئی۔ سب نے حیرت اور خوف سے ایک چیخ

لگائی اور "گنیش مہاراج!!" گھگھیا پڑیں بعض اپنی مٹکیاں آہستہ سے اُتار کر اور کچھ پٹخ کر اُلٹے پاؤں بھاگ گئیں۔ گنیش مہاراج نے اطمینان کے ساتھ پہلے سونڈ والی مٹکی سونت کر خالی کی، پھر دوسری مٹکیاں، اور پھر زمین پر چھلکا ہوا جتنا دودھ چوس ملا سونڈ سے جمع کر کر کے چوس گئے اور نہ معلوم کتنے دن کے بھوکے پیاسے گنیش مہاراج کا برت دودھ سے کھلا، اور من بھر دودھ پی کر آنکھیں کھلیں، کان بھی تیز ہوئے اور ناک بھی سڑسڑائی —— صبح تک تمام دیہات میں افواہ پھیل گئی کہ گنیش جی نے درشن دئے ہیں، اور گنیش جی نے یہاں سے ہٹ کر صبح کو دوسری پگڈنڈی پر درشن دئے اور پھر شام کو تیسری سمت اور تیسرے روز لوٹ کر پھر پہلی جگہ پر آ گئے۔ تین چار روز تو کچھ چھپ چھپاؤ جیسی صورت رہی مگر ہفتہ بھر بعد تو یہ چیز عقائد میں گھر کرنے لگی اور روز بروز عقیدہ راسخ تر ہوتا گیا۔ پہاڑ کے دامن کے بسویا بھولے دیہاتی گنیش درشن کے لئے چڑھاوا لے کر تلاش کرنے لگے، اور گنیش مہاراج کو دودھ پلانا سعادت ہو گئی۔ پھر ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک چڑھاوے کے بعد گایوں بھینسوں کا دودھ دوچند بلکہ سہ چند تک بڑھ جانے کی زریں افواہیں اور ساتھ ہی ساتھ کوتاہی کرنے میں اچھی بھلی دودھار گایوں اور بھینسوں کے خشک ہو جانے کی باتیں پھیلنے لگیں — بھلا اس جنگل میں ہاتھی کب نہیں رہتے تھے، مگر پہلے تو شہر سے دُور دُور رہا کرتے تھے اور پھر گھاس پات کھایا کرتے تھے۔ کہیں کہیں جب موقع مل جاتا سال میں دو چار مرتبہ دھان، گنّے، گیہوں، جوار کی فصل پر دھاوا مار دیتے، یہ سر سے دودھ اُتار کر پینے والی بات تو بڑے پُرانے بوڑھوں کے تجربوں میں بھی نہ کبھی دیکھی نہ سُنی تھی۔ لہٰذا بات راسخ تر ہوتی گئی اور شہر میں دودھ والوں کی دکان تک پہنچی اور پھر سارے شہر میں گشت کر گئی۔ مقامی اخباروں تک نے گنیش درشن کے عنوان سے خبریں چھاپیں اور گنیش مہاراج کے ایسے دن پھرے کہ کبھی ان کے باپ دادا کو نصیب نہ ہوتے تھے۔ جوں جوں دن بیتے چڑھاوے میں افزونی اور آسانی ہوتی گئی، اور کبھی کبھی تو پیٹ سے اُوپر آ جاتا اور بچ رہتا۔ پھر تو گاؤں گاؤں باڑھے والوں نے اپنی اپنی باری اور اپنا اپنا دن مقرر کر لیا، تھن کے نیچے کا خالص دودھ اپنی باری پر چڑھاوے میں جاتا، گنیش مہاراج چاروں سمت دھاوا مارتے، کبھی پورب میں کبھی پچھم میں، کبھی شمال کی پہاڑیوں میں جا دبکتے اور کبھی جنوب کی گھاٹیوں میں لگ جاتے۔ دودھ ان کے پیچھے پیچھے پھرتا اور وہ دُور سے سُونگھ کر دودھ کی جانب بڑھتے، کبھی پگڈنڈیوں پر کبھی بڑی سڑک کے کنارے اور کبھی فاریسٹ کی سروس روڈ پر اپنا بریک فاسٹ لنچ ڈنر لگا ہوا پاتے اور کھا پی کر آرام کرتے

ایک روز شام کے وقت آرام کے ساتھ ایک دیہاتی پگڈنڈی پر لگے ہوئے تھے۔ دو عورتیں آگے پیچھے گھاٹی میں سے سر پر دودھ کی مٹکیاں لئے حسبِ معمول شہر کو جاتی ہوئی اوپر کو بڑھیں، نہ تو عورتوں کو ہی گمان تھا کہ اس وقت یہاں پر مہاراج درشن دیں گے اور نہ مہاراج ہی کو چڑھاوے کی کوئی اُمید تھی مگر جب یک دم سامنے آ گئیں تو مہاراج نے ویسے ہی بیٹھے بیٹھے سونڈ بڑھا کر مٹکی پکڑنا چاہی، یا تو عورت کی اونچائی کا اور اپنی سطح کا صحیح اندازہ نہ ہوا یا نہ معلوم کیا بات ہوئی، مٹکی کا موڑھا پھنسنے کے بجائے عورت کی گردن سونڈ میں پھنسی اور جب مہاراج نے مٹکی اٹھائی تو عورت مع مٹکی کے اوپر اُٹھتی چلی آئی، بس بمشکل بیچاری کے مونہہ سے پھنسی پھنسی بھنچی بھنچی آواز میں "ٹن گنیش!" نکلا اور جب تک ہاتھی کی سونڈ کی سیک گرفت ڈھیلی ہو، آنکھیں ہلس آئیں اور زبان باہر نکل آئی اور جب گنیش مہاراج نے اسے زمین پر رکھا تو جان نکل چکی تھی، دوسری اپنی مٹکی پھینک کر بھاگ گئی۔ گنیش مہاراج عورت کے یوں بے حس و حرکت پڑا رہنے پر ذرا متعجب تو ہوئے، پھر اطمینان کے ساتھ دودھ پی پلا کر چلتے ہوئے۔

دوسرے ہی روز دُور دُور خبر پھیل گئی کہ گنیش مہاراج نے بھینٹ لے لی اور خیر چڑھاوا تو اور بات تھی مگر بھینٹ کے خوف سے دیہاتیوں کے پتّے پانی ہونے لگے۔ تت نئی افواہوں نے عام ہراس پھیلا دی، خوف کے ساتھ ساتھ چڑھاوے کی مقدار تو بڑھ گئی مگر، حتیاط بہت بڑھ

گئی۔ دُور سے رکھ کر چلے آتے۔ شہر کو دُودھ پہنچنا کم ہو گیا اور افواہیں پہلے تو خیر شہر سے مضافات اور دیہات میں اور دیہات سے شہر اور مضافات میں پہنچا کرتیں اور اب تو شہر کے شہر ایک محلّے سے دوسرے محلے میں پہنچتیں۔ رات گنیش مہاراج نے بھرے بازار میں درشن دئے، دودھ کی دوکانوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ بھینکے۔ حلوائیوں کی بھینٹ لی اور کڑھائیوں کی کڑھائیاں اُبلتے دودھ کی سونت کر زمین میں دھنس گئے۔ . . . . . . اور خیر شہر میں ہر س تو نہ پھیلنے پائی مگر دودھ کا قحط ہو گیا کیونکہ ڈر کے مارے سو گوالوں میں سے بمشکل پچیس دودھ لے کر شہر آنے کی ہمت کرتے۔ وہ بھی سر ہتھیلی پر رکھ کر، اور شہر میں یہ افواہیں پھیلتیں کہ دودھ کہاں سے آئے، وہ تو سارے کا سارا گنیش مہاراج کے چڑھاوے میں چلا جاتا ہے۔ ساتھ ساتھ روزانہ ایک سوایک بھینٹ کی خبر بھی گشت کر جاتی۔

بہرحال بھینٹ والی بات تو صحیح تھی، یک سوایک نہ سہی تو ایک بھینٹ تو لی ہی تھی۔ حکامِ ضلع شہر کے اندر سے دودھ کی کمی پر ہی پیچ و تاب کھا رہے تھے، عورت کے مارے جانے سے باقاعدہ قانونی شکل پیدا ہو گئی۔

ادھر محکمہ جنگلات والوں نے خونی ہاتھی کا اپنا علیحدہ فائل چلایا اور سرکاری عہدہ داروں کو تو ہر چیز کا سدِ باب کرنا تھا، خونی ہاتھی کا استیصال قدم قدم پر بڑھ جانے والی افواہوں کا خاتمہ، اور پھر شہر سے دودھ کی کمی کا دُور کرنا ـــــ محکمۂ جنگلات اور عامل عہدہ داروں نے میٹنگ کی۔ بات عقیدہ کی حد تک اس وقت تک نبھتی ہے جب تک قانون کی زد میں نہ آ جائے۔ جنگلات کے قواعد کی رُو سے ہاتھی کا شکار مدتوں سے ممنوع تھا مگر جب ہاتھی خونی ہو جائے تو پھر وہ ہاتھی کب رہتا ہے۔ اگرچہ جنگلات کے ماہر حیوانات اس مخصوص ہاتھی کی جبلّت کو عام ہاتھیوں سے بالکل علیحدہ اور منفرد بتاتے تھے، بھلا کسی کتاب یا تجربہ میں یہ آیا تھا کہ ہاتھی دودھ پر ہاتھ مارے! خیر آدمی کے مار دینے کی تو ایک دو مثال پائی بھی جاتی تھی گرچہ یہ بھی ہاتھی کی جبلّت کے منافی تھا، بہرحال عامل عہدہ داروں کو تو اپنا نظم و نسق برقرار رکھنا ہی تھا، دونوں نے مل کر ہاتھی کو مار دینے کا فتویٰ دے دیا اور یہ ڈیوٹی محکمہ جنگلات والوں کی تھی کہ خطرناک جانوروں کا استیصال کریں اگرچہ مقتول عورت کے ورثاء خون کا دعویٰ نہ کرنا چاہتے تھے۔

جب محکمہ جنگلات والوں نے معذوری ظاہر کی اور بتایا کہ گنیش مہاراج کے مقابلہ پر، نہیں دیہاتیوں حتیٰ کہ خانہ بدوشوں سے بھی کوئی مدد نہیں مل سکتی تو پھر عامل عہدہ داروں نے ادھر توجہ کی۔ پہلے تو خود آپس میں نظر دوڑائی تو کمشنری بھر میں کوئی حاکم ایسا نظر نہ آیا جو ڈھنگ کے ساتھ ایک گولی ہاتھی تو ہاتھی جنگلی بکرے پر بھی چلا دے۔ پھر چھاؤنی کی جانب رُخ کیا، بڑے بڑے بال باندھی گولی مارنے والے کرنل جنرل میجر کپتان بھی تھے اور یہ نہیں کہ نرے چاند ماری ہی مارنے والے ہوں، تھوڑا بہت شکار بھی کھیل لیا کرتے تھے مگر ہاتھی کا شکاری تو اپنے فن میں منفرد ہوا کرتا ہے اور ہاتھی بھی خونی! ـــــ اور اب تو خیر مفقود تھا۔ اگلے زمانے میں بھی چار چھ ضلعوں میں، ایک آدھ ہوا کرتا تھا یا وقت بے وقت پرپرانے انگریز فوجیوں میں کوئی افریقہ، برہما کے جنگلوں کا کھیلا شوقین شکاری نکل آتا تھا۔ شہر تو شہر کمشنری بھر میں کوئی نہ نکلا اور چھاؤنی سے بھی جواب آ گیا۔ اور قانونی ایکشن تو کوئی بھی صبر کر کے بیٹھ جانے کے لئے نہیں لیا جاتا اور پھر یہ تو مسلسل خطرہ تھا، اور مستقل نقصان اور بیم و ہراس۔ لہٰذا حاکم ضلع کے سامنے پوری گتھی بن گیا، بہت نگاہیں ڈالیں، پولیس کے عہدہ داروں سے مشورہ کیا اور ایک صورت نکل ہی آئی۔ شہر میں ایک کنبہ ایک معزول شدہ شاہی خاندان کے دس بارہ افراد کا اب بھی بستا تھا، مگر بوڑھا تو بوڑھا اس خاندان کے جوان تک گوشہ نشین ہو چکے تھے ور ان میں سے ہر ایک قادر انداز اور بڑا دلیر شکاری تھا، بڑے بڑے فوجی انگریزوں پر ان کی نشانہ بازی اور بہادری کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی لیکن اب تو برسوں سے ان کی بندوقوں کی گریس بھی نہ چھوٹی تھی اور شاید مہینے گزر جاتے اپنی کوٹھی کے کپ ڈنڈے سے بھی باہر آنے کی نوبت نہ آتی اور خاندانی پنشن پر جو حکومت کی معرفت پہنچا کرتی، گزر تھی۔

جب اپنے ساتوں آٹھوں ضلعوں میں کوئی آدمی نظر نہ آیا، محکمہ جنگلات والوں نے بھی جواب دے دیا۔ دیہاتی اور خانہ بدوش تک پہلوتہی کر گئے اور چھوٹی سے بھی صدائے برنخاست سُن لی تو حاکمِ ضلع نے مجبور ہو کر بوڑھے خان سے تحریک کی کہ اس مُوذی کے ظلم سے مخلوقِ خدا کو نجات دلائے۔

مُوذی کے ظلم سے مخلوقِ خدا کو نجات دلانے سے زیادہ بوڑھے خان کے اندر پُرانا دبا ہُوا شکاری والا جذبہ بھڑک اٹھا۔ ویسے مُدتوں سے بندوق نہ پکڑی تھی اور ہاتھی کے شکار کے لئے بڑی اچھی پریکٹس کر کے جانے کی ضرورت تھی مگر وقت کم تھا، جلدی جلدی پروگرام بنایا۔ ساتھی تو کوئی باقی نہ تھا، بوڑھے خان کے بیٹے پوتے، بھائی بھتیجے، ایک سے ایک بڑھ کر گل چلے تھے۔ سب ملا کر درجن بھر شکاریوں کی پارٹی بن ہی گئی۔ سب نے اپنے بڑے رائفلوں کی گریس صاف کرائی، نئے کارتوس حاصل کئے اور پُرانے شکاری کپڑے نکالے۔ جنگل میں کچھ زیادہ اندر جانے کا تو پروگرام نہ تھا پھر بھی رہنمائی کے لئے آدمی تلاش کئے اور باوجود حاکم ضلع کی مدد کے دیہات سے ایک بھی مُتنفّس اس کے لئے تیار نہ ہُوا، مجبور ہو کر کچھ کوتوالی کے کانسٹیبل اور دس پانچ مضافاتی تھانوں کے چوکیدار اور محکمہ جنگلات کے کچھ بیٹروں اور دو ایک رینجر جمع کئے جن کے ذریعہ ہاتھی کی نقل و حرکت اور جبلت کے متعلق معلومات فراہم کیں، اور گنیش مہاراج جنگل میں اندر زیادہ دُور نہ جاتے، یہی شہر سے دس پانچ میل اِدھر اُدھر کہیں لگے رہتے۔ کبھی کبھی ذرا بڑھ کر دوپہر میں کسی پھیلے ہوئے چشمہ کے کنارے گھنے درختوں کی چھاؤں میں کیچڑ کائی میں جا پڑتے اور کہیں گہرا پانی مل جاتا تو کسی جھیل میں دو چار غوطے لگا لیتے اور سونڈ بھر بھر کر پیٹھ پر پھواریں چھوڑ لیتے، ورنہ دھوکر اپنے وقت پُرخوشبو کے کر دس پانچ میل کے اندر کہیں نہ کہیں اپنا چڑھاوا پا لیتے اور اب تو معتقدین بھی پہنچتے رہتے اور راستہ پر مشکیں چُن آتے۔

تاہم ہاتھی کا شکار ہاتھی کا شکار ہے، کوئی ہرن چیتل پاڑھے نیلے کا کھیل نہیں ہے۔ بھاری بیگنم اور ایکسپریس کارو دائٹ رائفلوں کے علاوہ ہاتھی کے شکار کے اور بہت سے لوازمات اور آداب ہیں۔ جس صبح کو جانے کا پروگرام تھا اس سے پیشتر رات میں خان اور اس کے ساتھی بیٹوں، پوتوں، بھائی بھتیجوں میں مُفصل مشورہ ہُوا۔ ہر ایک نے تجویزیں پیش کیں مگر اس ہاتھی کے شکار میں نہ ان تمام لوازمات کی ضرورت محسوس ہوتی تھی اور نہ وقت اور موقع تھا، نقل و حرکت اور بانٹ دو دن سے معلوم ہی ہو رہی تھی اور جنگل دُور اور نزدیک سب گھوما ہُوا اور اچھی طرح دیکھ بھالا تھا۔ خان اور اس کے چھوٹے بھائی کئی مرتبہ ہاتھیوں کا شکار کر چکے تھے۔ اپنے ہتھیاروں کی ضرب اور گولی لگانے کے پوائنٹ اچھی طرح جانتے تھے، اور صرف گولی ہی لگانا تھی۔ پھر سب سے بڑی آسانی یہ تھی کہ کوئی غول نہ تھا، ہاتھی اکیلا ہی تو تھا۔ بس ایک اکیلی دیوار پر ٹھکانے سے دو گولیاں جڑنی تھیں۔ اپنی عمر میں ایسی دس پانچ دیواریں خان ڈھائے ہوئے تھا، مانا کہ بوڑھا تھا مگر کسی اعتبار سے اتنیس نہ ہوا تھا، اپنے سب جوانوں سے زیادہ کڑیل بنا ہوا تھا اور پچھتر کی عمر میں پچیس سالہ جذبہ رکھتا تھا۔ مستقل مزاجی سے جو اس عمر کا تقاضا تھی مالامال تھا، اور بہادری کے ساتھ شکار کے داؤں پیچ، ساری عمر کے عملی تجربہ نے خان کی ضرب کو موت کا طمانچہ بنا دیا تھا۔ ویسے یہ بات نہیں ہے کہ سبھی مار لئے ہوں اب بھی دس پانچ پرانے ہاتھی جنگل میں ایسے زندہ ہوں گے جن کے کولہوں اور کوکھوں میں خان کی گولیاں پندرہ پندرہ بیس بیس برس پُرانی گوتھیں بنی دھری ہوں گی۔

علی الصبح کچھ زیادہ دُور جانا بھی نہ پڑا، یہی دس میل شو لک کی ترائی میں اور خان نے تیقّن کے ساتھ گنیش مہاراج کی نشست گاہ معلوم کر لی، اب پھر پارٹی میں مشورہ ہوا اور ایک لڑکے نے تجویز پیش کی کہ باقاعدہ شکار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، پہلے خان ایک دو گولی مار کر دُور سے ہاتھی کی ایک یا دو ٹانگیں توڑ دیں، پھر جب وہ مجبور جہاں کا تہاں پڑ جائے تو سب بڑھ کر قریب سے والی مار دیں قصہ ختم

"مگر یہ تو بہت ہی اَن اسپورٹنگ، دو ہاتھی کے شکار کا سخت مذموم طریقہ ہے۔" من چلے بوڑھے خان نے کہا۔

"لیکن دیکھئے، ہمیں تو استیصال کرنا ہے۔" نوجوان بیٹا بولا۔

"تم کچے شکاری ہو، اور مجھ کو تو شکار کا جذبہ لئے جا رہا ہے، یہ شکاری کا کام نہیں، قصائی کا کام ہے جو تم بتا رہے ہو۔" اور خان کے چھوٹے بھائی نے لقمہ دیا۔

"اور یہ چیز شکار جیسے ارفع جذبہ کے سخت منافی ہے۔"

"نہیں میرا مطلب یہ تھا کہ مخلوقِ خدا کو اس کی ایذا رسانی سے نجات ہو جائے اور قصہ ختم ہو۔"

"کیا کہتے میاں! سمجھنے کی بات ہے کہ انہوں نے اسپورٹس مین سمجھ کر ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا تو پھر ہمیں اسپورٹ کے تمام دکمال آداب برتنا چاہئیں اور پھر میں یہ کیوں کروں، ویسے میرے لئے کون سی مشکل ہے۔ بس تم لوگ اپنی اپنی جگہ پر میری ہدایت کے مطابق لگے رہنا، ویسے موقع محل تم سب خود سمجھتے بھی ہو، لیکن جب تک میں اشارہ نہ دوں میرے شکار پر کوئی صاحب فیر نہ کریں خواہ میرے لئے خطرہ ہی کیوں نہ ہو، اور پہلے تو اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔" "ہوں ہمارا مطلب یہ ہے کہ بات بھی بن جاتے اور خطرہ ۔ ۔ ۔ ۔" بھتیجا بولا" اور خان نے بات کاٹ کر کہا" میری زندگی کا شاید یہ اخیر شکار ہو اور میں اپنا ریکارڈ کیوں چھوڑوں جو ساری عمر کے کرے دھرے پر پانی پھر جائے۔"

اور اپنے بوڑھے ملازم شہباز کی جانب دادطلب نظروں سے دیکھا جو چالیس سال خان کے ساتھ کندھے سے کندھا ملاتے بندوقوں کا بیر لئے ہاتھیوں، شیروں اور بھینسوں کے شکار میں سایہ کی طرح ساتھ لگا رہا تھا، اور جس پر خان کے ساتھ بارہا موت جھپٹی تھی، اور اُلٹ کر اوندھے مُنہ جا پڑی تھی اور بوڑھے شہباز نے آنکھ اور گردن کے اشارے سے بہادر آقا کی تائید کی، اگرچہ خود کبھی گولی نہ لگائی تھی اور بندوقیں ہی اٹھائی تھیں۔

دوپہر تک خان گنیش مہاراج کی آرام گاہ کے گرد محاصرہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ گھنے درختوں کی چھاؤں میں کیچڑ پر لوٹیں لگاتے گنیش مہاراج تو میل بھر سے خطرہ کی بُو سونگھ رہے تھے، اور اس بُو کو تو ہاتھی خوب ہی پہچانتا تھا۔ کتنے ہی بہادر ساتھی اس کی بھینٹ چڑھ چکے تھے اور خود گنیش مہاراج کے پٹھوں کولہوں اور کوکھوں میں دو چار آدھ آدھ پاؤ کی سُوکھی گوٹھیں گولیاں دبائے آج تک موجود تھیں اور اور کچھ تفاصیل تو یاد نہ تھیں، بس خطرہ کا احساس جبلّت پر طاری ہو گیا۔ ایک آدھ دھما کا تڑاخا دھکا، پھر کاٹ توڑ جلن اور پھر مہینوں پیپ خون اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ اور تکلیف اور پانسو گز سے دُور بینوں کی مدد سے بھانپ کر قرارداد کے مطابق خان کی پارٹی تین سمت میں بٹ گئی تھی۔ چوتھی سمت اونچی پہاڑی کا ڈھلان تھا جس کی تلی پر یہ جوہڑ تھا جس میں گنیش مہاراج پڑے لوٹیں لگا رہے تھے اور شاد رہا کہ لے رہے تھے۔ اُوپر جانے کا امکان نہ تھا۔ پارٹی تمام جھاڑیوں اور درختوں میں چھپی چھپی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی اور بوڑھا اپنے پرانے تجربہ کار ملازم کو ساتھ لئے خان بوڑھے گنیش مہاراج کے رُو در رُو عین اس پامال شدہ راستہ پر چل رہا تھا جو گنیش مہاراج کے دوپہر کو نہانے کے لئے جانے کا اور سہ پہر کو اُٹھ کر آنے کا تھا، اور ہاتھی تو اپنے راستہ کا بڑا پابند ہوتا ہے۔ گنیش مہاراج نے کیچڑ پانی کا ٹھنڈا مشغلہ چھوڑ کر لمبی سونڈ فضا میں چاروں طرف گھمائی، دائیں بائیں اور سامنے تمام فضا بارُود کی بو سے رچی ہوئی تھی اور لحظہ بہ لحظہ تیز تر ہوتی جا رہی تھی، پہلے تو کھڑے ہو کر جلدی جلدی کان ہلائے اور ساتھ ساتھ ننھی ننھی آنکھیں حلقوں میں گھومیں، سامنے راستہ پر دیکھنے کی بہت کوشش کی مگر کچھ نہ دکھائی دیا، اور نہ سُنائی دیا، ایک مُیڑی بار بار دائیں سے بائیں اور آگے سے پیچھے بڑے زور سے چلاتی اُوپر سے اُڑتی رہی

اور یہ بھی آدمی کی موجودگی کا سگنل ہوا کرتا ہے، بُو اور تیز اور واضح تر ہوگئی اور ٹیڑھی جلدی پلٹ کر آنے لگی۔ بوڑھے گنیش مہاراج نے بھرپور خطرہ محسوس کیا اور قریب ہی اور پھر آگے پیچھے دائیں بائیں سونڈ گھما کر سونگھا اور پیچھے ڈھلان پر سے آتی ہوئی ہوا صاف سنگھائی دی اور اُوپر کو بڑھا اور پھر لپکنا شروع کیا۔ جب خان جو ہٹر سے تین سو گز کے فاصلہ پر نمودار ہوا تو ہاتھی کو پہاڑی کے ڈھلان پر ایک جھلک لپکتے دیکھا، ایسے ڈھلانوں پر چڑھنا ہاتھی کی جبلت کے منافی ہے۔ خان سمجھ گیا کہ تینوں جانب سے خطرہ محسوس کر کے یہ رُخ اختیار کیا ہے اور ہماری پارٹی کی سیدھ بچا کر اور اُوپر پہنچ کر دائیں بائیں کسی جانب کو مڑے گا، غرض جو مُنہ کا نوالہ سمجھ کر چلے تھے وہ بات نہیں ہے، اور جتنا ذکی الحس دودھ کی خوشبو لینے کے معاملہ میں واقع ہوا ہے اس سے زیادہ دشمن کا پسینہ اور رائفل کی بُو لیتا ہے۔ بھینٹ لینے کے بعد بھی گنیش مہاراج کو اندازہ نہ ہوا تھا کہ ان سے کتنی بڑی قانونی خطا سرزد ہوگئی ہے، اس لئے کہ بھینٹ کے بعد چڑھاوے زیادہ بھی ہوگئے تھے اور آسان بھی، وہ لوٹ کھسوٹ اور اچکے پن والی بات تو بالکل ہی جاتی رہی تھی، اب تو جدھر کو نکل جاتے زندگی دودھ ہی دودھ معلوم پڑتی۔ اس دوران میں کچھ نہ کچھ آدمیوں سے وحشت بھی کم ہوگئی تھی۔ وہ دوسری بات تھی کہ سہواً ایک کا کلا گھٹ گیا تھا اور آج یہ بارود کی بُو بڑے دنوں بعد ناک میں پہنچی تھی اور اس کے ساتھ بڑی مہیب یادیں اور تکلیف دہ واقعات وابستہ تھے۔ خان کی پارٹی جمع ہوگئی اور دوربینوں کی مدد سے مفرور شکار کے رُخ کا تعین کرنے کی کوشش کرنے لگی، مگر جھاڑیوں اور گھنے درختوں میں صحیح پتہ نہ چل سکا۔ مجبور ہو کر کچھ دُور اُوپر کی سمت کھوجوں پر چلے مگر اُوپر پتھریلی زمین میں نشانات قدم تو نہ مل سکے تاہم جھاڑیوں و سبزے میں سے گزرتے ہوئے اس کا راستہ صاف معلوم ہوتا تھا۔ چلتے چلتے دوپہر سے سہ پہر اور پھر شام ہونے لگی۔ سورج مغرب کی چمکتی ہوئی پہاڑیوں کے ڈھالوں میں جا پہنچا، جگہ جگہ کھلے حصّوں میں درختوں اور جھاڑیوں کے سائے لمبے لمبے ہو کر پڑنے لگے، جنگل میں شام کے وقت مخصوص آوازیں گونجنے لگیں، گھاٹیوں اور میدانوں میں سے تمام دن چگ کر ڈھالوں پر پتھروں اور چٹانوں میں بسیرے لیتے چکوریں اور مُرغیاں کڑکڑا کر کڑکڑا کر جمع ہونے لگیں اور تھوڑے تھوڑے اُڑان کے ساتھ تیز تیز لپکنے لگیں۔ بارہ سنگھے چیتل پاڑہے اور جھانک جنگل کے اندرونی حصّوں سے نکل نکل کر کاشتہ علاقوں سے ملحق جھاڑیوں اور درختوں کے جھنڈوں میں آ گئے۔ بلند پرواز اور تیز پر طوطے تنگ کے تنگ بنا کر بسیرے کے لئے گھنے حصّوں کی جانب اُڑنے لگے، شوالک رینج کے مشرقی ڈھالوں کی جانب سے بڑی سیاہی ہمالیہ کے سلسلہ کی مشرقی پہاڑیوں سے پڑے پھیلتے ہوئے مہیب دھند لکے سے غت پٹ ہوگئی اور خان کی پارٹی تیزی کے ساتھ ہاتھی کے کھوجوں پر چلتی رہی۔ ہاتھی تو جیسا خان کا خیال تھا کچھ دور ڈھال پر چڑھ کر اور خان کے داہنے ہاتھ والے ساتھیوں کے سروں پر سے تقریباً آدھے میل کے فاصلہ سے گزرتا اُوپر ہی اُوپر مُڑ گیا تھا۔ اب خان کی پارٹی نے رفتار تیز کر دی۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور ہزاروں مربع میل میں پھیلی ہوئی ہمالیہ اور شوالک رینج کی وسیع وادی گُم ہو جانا چاہتی تھی۔ مغرب کے قریب کھوج اسے ملنا شروع ہوئے جس سے ہاتھی کی رفتار مدھم ہونے کا سراغ ملتا تھا، تجربہ کار خان سمجھ گیا کہ بس اب زیادہ دُور نہیں گیا ہوگا۔ تھوڑی دُور چل کر خان اور پوری پارٹی کی دُوربینوں نے بھانپ لیا۔ تین طرف گھنا جنگل اور ایک جانب ڈھلوان پر ایک چھوٹا سا گاؤں اور نیچے درمیان میں ایک زرخیز کاشتہ میدان اور اس میدان کے بیچوں بیچ کھڑے گنیش مہاراج جھوم رہے ہیں۔ شام ہوتے دیکھ کر خان نے اپنی پارٹی کو جلدی جلدی تقسیم کیا، فرق صرف اتنا تھا کہ اب کی ایک جانب یعنی اسی ڈھلوان کی سمت گاؤں تھا جس سمت سے پہلے فرار ہوا تھا، پارٹی کو لگتے دیکھ کر اور گنیش مہاراج کو مارنے کے انتظامات دیکھ کر گاؤں والوں میں بے چینی پھیلی۔ پہلے سب کے سب گاؤں سے باہر جمع ہوگئے اور پھر ڈھلوان سے اُتر کر میدان کی جانب بڑھنے لگے۔ بوڑھوں اور عورتوں نے نوجوانوں کو روکا کہ بارہ نہیں بارہ ہزار بندوقیں آ

جا میں بھلا گنیش مہاراج کو مار سکتے ہیں۔" "اور گنیش مہاراج تو گولی اُلٹی پھیر دیں گے۔" کوئی بولا کہ گنیش مہاراج کے بدن پر گولی گڑے گی ہی نہیں۔

اب ہانکا بڑا مکمل ہو گیا، ساتھ ہی ساتھ کچھ ناقص بھی۔ میدان کے دو سمت سے خان کی پارٹی بڑھی، اُوپر سے گاؤں والوں کی چیقلش اور پھر شور ہُوا اور منظر یہی رہا کہ گنیش مہاراج سامنے کو بڑھیں اور سامنے سے خان اور خان کا پُرانا تجربہ کار بندوق بردار ملازم شہباز آگے پیچھے بڑھ رہے تھے۔ جگہ جگہ میدان میں کھڑی ہوئی جھاڑیوں کی آڑ لیتے خان اور شہباز آگے پیچھے دونوں بڑھتے رہے، اُوپر سے گاؤں والوں کا شور فزوں تر ہو رہا تھا، اردگرد سے پارٹی دونوں جانب سے ایک دوسرے کا آمنا سامنا بچائے سمٹ کر میدان کے کناروں پر آ گئی تھی۔ گنیش مہاراج کے معتقدین پیچھے تھے اور دشمن دائیں بائیں اور سامنے۔ چار چار چھ چھ قدم لپک کر گنیش مہاراج قلعہ کے برج کی طرح ٹھہرتے، توقف کر کے فضا میں لمبی سونڈ لہرا لہرا کر سُونگھتے اور اب تو ہر جانب دشمن ہی کی بو رچی معلوم ہوتی پیچھے کے شور سے زیادہ خائف تھے، دائیں بائیں بُو زیادہ گہری اور تیز تھی اور آدمی دکھائی دے جاتے اور سیدھا ہی بڑھنے میں عافیت سمجھ میں آئی اور خان ہاتھی کی جانب کو اور ہاتھی خان کی جانب کو بڑھ رہا تھا، اور بہت جلد ڈھائی سو گز سے سامنا ہو گیا۔ قاعدے کے مطابق خان کو گولی چلانے میں گاؤں کی سیدھ بچانا چاہیئے تھی مبادا گولی بچ کر دیہاتیوں میں گرے، مگر خان کو اپنے ہاتھ پر بھروسہ تھا اور خالی جانے کا کوئی امکان نہ تھا پھر بھی اس سمت کو فیر کرنا قاعدہ کے خلاف تھا، پچاس گز کا فاصلہ ادھر سے گنیش مہاراج نے، ادھر سے خان نے آناً فاناً میں اور طے کر لیا۔ خان سانڈے کرکان کے کھکھوٹے میں گولی مارنا چاہتا تھا، اور ہاتھی ٹینک کی طرح سیدھا بڑھ رہا تھا۔ خان پینترے سے کاٹ کاٹ کر جھاڑیوں کی آڑ سے لے کر سانڈ لینا چاہتا تھا، اور خان کے دس بیس گز ادھر اُدھر ہوتے ہی ہاتھی اک ذرا ٹھٹک کر پھر سیدھا ہو جاتا تھا اور یہاں تک کہ جب معاملہ دو سو گز کے اندر آ لگا تو خان کو شست لے کر ایک گولی آنکھ پر چپکانی ہی پڑی مگر کچھ تو ہاتھی جھوم رہا تھا، کچھ خان کی پریکٹس چھوٹی ہوئی تھی اور ہاتھ میں بھی وہ بات نہ رہی تھی کہ بال باندھی گولی مارے۔ بجائے آنکھ کے گولی بالشت بھر اُوپر مستک پر پڑی، بھنّا کر ایک پھرکی سی لی، بڑے زور سے کان جھٹکے، سونڈ لہرا کر پھر سیدھا ہو گیا اور رفتار کالی آندھی سی ہو گرج کر بڑے زور سے دانت سیدھا کئے بڑھا اور چارج کیا۔ اور رُخ بدلنے کی ایک اور کوشش میں خان نے تیزی سے پینترا سا بدلا، کچھ جھاڑیوں کی آڑ پکڑنی چاہی، اتنی دیر میں ہاتھی نے لپک کر پچاس گز اور لپیٹ لئے، اور سو گز کے اندر موت سے آمنا سامنا ہُوا، خان کو سانڈ نہ ملی، پھر آنکھ کی شست لے کر گولی کو دماغ تک پہنچانے کا راستہ تلاش کیا اور اب کی مرتبہ گولی ذرا ہٹ کر ایک جانب کو پڑی اور دونوں آنکھوں کے بیچوں بیچ پیشانی کی چٹان سی ہڈیوں میں چیپ ہو کر رہ گئی مگر گنیش مہاراج کی آنکھوں کے سامنے تیلیاں سی ناچ گئیں، اور خود بھی ایک مرتبہ کو ناچ گئے مگر عاجز ہونے کے بجائے بارُود کا بھڑکا ہوا پہاڑ بن گئے۔ سب کچھ اُلٹ پھینکنے اور ڈھا دینے کی تندی سے چنگھاڑ کر لپکے اور اب تو دشمن دو ڈگ میں دانت پر تھا، دوسری نال خالی کر کے خان نے شہباز کے ہاتھ سے دوسرا رائفل لیا اور خالی رائفل اس کو دے دیا۔ اتنی دیر میں ہاتھی پچاس گز کے اندر بڑھ رہا تھا، پارٹی سمٹ کے اور بھی قریب آ گئی تھی اور پارٹی میں سے بعض محتاط شکاریوں نے آواز دی "پاؤں پر! پاؤں پر!" یہ تو خان کو خود بھی سوجھ رہی تھی، اور پاؤں تو چاروں ستون سے، شروع سے آخر تک سامنے تھے، اور اس سے بہت پیشتر پہلی گولی لگانے سے بھی بہت پہلے خان ہاتھی کو بیکار کر سکتا تھا، پہلی ہی جھمک پر ڈھیر ہو جاتا۔ پچاس گز کے اندر بھی خان سانڈ نہ لے سکا اور جب پچیس گز پر معاملہ آ لگا تو خان نے اتنے قریب سے اپنی خارا شگاف گولی کی ضرب کی شدت پر اُمید کر کے پھر فیر کیا۔ گولی پھر کھوپڑی کی چٹان پر رائیگاں ہی گئی۔ اب خان کے رائفل میں ایک کارتوس باقی تھا، پلٹ کر جو دیکھا تو شہباز

اُچھل کود اور پینتروں میں دس گز دُور ایک جانب علیحدہ ہو گیا تھا اور بھرا رائفل اس کے ہاتھ میں تھا۔ ہاتھی دس گز کے اندر خان پر سونڈ بڑھا بڑھا کر لپٹنے کے لئے لپکتا تھا۔ اور شہباز خان تک پہنچنے کے لئے پینترے کاٹ رہا تھا۔ ادھر پوری پارٹی نے بڑے زور سے چلا کر کہا "پاؤں توڑیئے! پاؤں توڑیئے!" مگر خان نہایت اطمینان کے ساتھ پیچ و خم دے کر اور پینترے کاٹ کاٹ کر سونڈ کی نوک سے خود کو بچا رہا تھا اور قلعہ کا قلعہ خان پر دم اُٹھا اُٹھا کر اخیر جھپٹ کر رہا تھا اور چنگھاڑ چنگھاڑ کر سونڈ سے خون کا دُھواں سا اُڑا رہا تھا۔ خان کو خطرہ میں سمجھ کر شہباز نے ایک دفعہ ہاتھی کو بڑے زور سے للکارا، گویا صریحاً اس کی بلا اپنے سر لے کر اسے موقع فراہم کرنے کی کوشش کی۔ ہاتھی اک ذرا ادھر متوجہ ہوا، اور گھوم کر اس پر لپکا، سائڈ ملتے ہی خان نے کان کے ٹھکھوتے میں، خیر گولی لگائی، اور گرتے گرتے شہباز ہاتھی کے چنگل میں تھا، گردن سے پکڑ کر سر سے اُونچا ہوا میں گھمایا اور زمین پر دھم سے پٹخ دیا۔ اگلا پاؤں بڑھا کر پنڈلی دبا لی اور دوسری پنڈلی سونڈ میں پکڑ کر خبر سے چیر دیا، پھر ایک چیتھڑا سونڈ میں دبا ہی ہوا تھا۔ خالی رائفل ہاتھ میں لئے نہتے خان کی جانب رجوع ہوا اور یکدم دائیں بائیں سے چوبیس گولیوں کی باڑھ نے تڑ تڑ تڑ تڑ سر سے پاؤں تک چھلنی کر دیا اور ارارا دھڑام قلعہ کا قلعہ زمین پر آرہا اور جب دونوں جانب سے دھوئیں اور گرد کو چیر کر پہنچے تو سونڈ کی لپیٹ میں بوڑھا خان دبا ہوا تھا — کوہو کے بیلوں میں لپٹا ہوا گنے کا پانا سا۔

نومبر ۱۹۵۷ء

محبت نے اور گیت نے
میرے دل سے نکلنے میں کیوں اتنی جلدی کی
عاشق نے اور موسمِ ہجر کے اک مسافر نے
گھر سے نکلنے میں کیوں اتنی جلدی کی

اصغر ندیم سید

عکس تحریر: اصغر ندیم سید

# خدنگِ جستہ

عزیز احمد

معمولی سا تیر تھا جو اس کے گھٹنے کی ہڈی کے قریب پیوست ہوگیا تھا، تلواروں کی جھنکار اور ڈھال کی کھڑکھڑاہٹ میں اس نے اسے اچھی طرح محسوس بھی نہ کیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس کے بہنوئی سلطان حسین کے سپاہی پھر لاپتہ تھے، بھاگ گئے تو وہ ان سجستانیوں کے سامنے کیا ہوں گے۔ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ کبھی سلطان حسین نے لڑائی میں اس کے نقشے کے مطابق لڑنا مناسب سمجھا اور کبھی نہ سمجھا، اور جب نہ سمجھا تو ہمیشہ خود اس کو، اور اپنے آپ کو مصیبت میں گرفتار کیا۔ ان سجستانیوں کی بہرحال بساط کیا تھی؟ اس نے زور سے ایلچی بہادر کو للکارا اور مٹھی بھر سپاہیوں نے شمال کے پہاڑ کی طرف سجستانیوں کے دل پر ایک کر ڈھالوں کے ابر کھڑے کر دیئے، جن میں سیدھی، موٹی تاتاری تلواریں بجلیوں کی طرح چمکنے لگیں۔ شمال کے پہاڑ میں دو خشک، سُرمگیں چوٹیوں کے درمیان سے ایک قافلہ اسی صبح کو گزرا تھا، جو قندھار سے قلات طرح طرح کے پھل لئے جا رہا تھا، خشک میوے اور سردے۔ اور یہ سب میوے تاتاری سپاہیوں کے پیٹ میں تھے جو مویشی اس قبیلے کے ساتھ تھے ان کی وجہ سے رات کے کھانے کا اطمینان تھا اور تیمور کو اپنے مٹھی بھر سپاہیوں پر بھروسہ تھا، جن کے پیٹ گر بھرے ہوں تو مغلوں کا فن انہیں ازبر یاد تھا، کس طرح غنیم کے سامنے لڑنے کے لئے جاتے ہیں، کس طرح بظاہر ہار کے غنیم کے سامنے سے بھاگتے ہیں لیکن اپنا نظام درہم برہم نہیں ہونے دیتے اور جب تعاقب کے لئے دشمن منتشر ہو جاتا ہے تو کس طرح پھر منقش ڈھالوں کے ابر سے ماوراء النہر اور شمالی ریگستان کی بھاری تلواروں کی بجلیاں چمکتی ہیں۔ کس طرح تیروں کی بارش ہوتی ہے۔

یک معمولی سا تیر اُس کے گھٹنے کی ہڈی کے پاس کھٹک رہا تھا۔ تیمور نے ڈھال سے اپنا منہ اور گردن بچاتے بچاتے گھوڑے پر جُھک کر تیر کو نکالنا چاہا کہ ایک اور تیر، اس مرتبہ بڑی جھنکار سے، اس کے ہاتھ پر لگا، اور اس نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ کی ہڈی چور چور ہوگئی ہے۔ بائیں ہاتھ سے اُس نے پہلے ہاتھ کا تیر کھینچا جو پورا نکل آیا۔ اور پاؤں میں جو تیر لگا تھا وہ ٹوٹ گیا اور لکڑی کی کرچیں چھوٹے چھوٹے ٹیڑھے میڑھے کیلوں کی طرح خون میں نہا گئیں۔

جاکو برلاس نے دفعتاً نعرہ لگایا۔ وہ دیکھو سلطان حسین۔ اور جیسی کہ سلطان حسین کی عادت تھی، کبھی تیمور کے مشورے کے مطابق اور کبھی اس کے برعکس وہ اپنے طور پر، اپنی تجویز کے مطابق سجستانیوں کے عقب میں شمال کے پہاڑ پر دونوں سُرمگیں چٹانوں کے درمیان نمودار ہوا، جدھر سے صبح کو پوندوں کا قافلہ پھلوں اور مویشیوں سے لدا ہوا قندھار سے آتا ہوا ملا تھا۔ اور قلات پہنچنے سے پہلے لُٹ گیا تھا۔

سلطان حسین کے ساتھ اس کے اپنے ہراتی اور ماوراء النہری ساتھیوں کے پرے کے پرے تھے۔ اونچے نوکدار خود پہنے ہوئے تاتاری، چھوٹے چھوٹے گھوڑوں پر صف بہ صف، گرد میں اَٹے ہوئے، ان کی ٹاپوں سے گرد کے بادل اٹھ رہے تھے، اور نشیب

کے گرد و غبار حل ہوتے جا رہے تھے، ان کی کمانوں سے تیروں کی جو بارش ہوئی سجستانی اس کی زد میں آ گئے۔

اور سجستانی سپاہیوں میں انتشار تھا، اونچے، ستواں ناک چکنی زلفوں والے افغان، سرخ و سپید دراز قد بلوچ، سیاہ فام درمیانہ قد بروہی، سیاہ، موٹے ہونٹوں، گھنگھریالے بالوں والے مکرانی، ان کی ہیئت ترکیب ہی میں ایک طرح کا انتشار تھا، جس کو محسوس کر کے تیمور نے ایک طرح کے زہرخند میں اپنے دانت بھینچ لیے، جاکو برلاس سے کچھ کہا، اور ایک مرتبہ نصف دائرے کی شکل میں اس کے سپاہی پیچھے ہٹے اور مکرانیوں اور افغانوں کے درمیان ایک خلیج حائل کر دی، اوپر سے سلطان حسین کے ساتھیوں کے تیروں کا ایک سیلاب سا آیا، اور سجستانیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔

اور اب تیمور نے محسوس کیا کہ اندر سے اس کی طبیعت میں ایک طرح کی تلخی پیدا ہو رہی ہے۔ عمر میں شاید پہلی اور آخری بار اس نے تعاقب نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ایلچی بہادر کو تعاقب کے احکامات دئیے اور اپنے بائیں ہاتھ سے جاکو برلاس کا آہنی بازو تھام کے کہا۔ "خیموں کی طرف چلو"

خیمے نظروں کے سامنے ہی تھے، اور نشیب میں۔ اور وہاں بھی چند جانباز سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ اور ان خیموں میں سے ایک میں اولجائی تھی۔ اس کی بیوی اور سلطان حسین کی بہن۔ دوسرے خیمے میں دلشاد آغا تھی سلطان حسین کی بیوی۔ آج اگر یہ اپنے مردوں کے ساتھ دوش بدوش لڑ نہیں رہی تھیں تو اس کی وجہ محض یہی تھی کہ سجستانیوں کا یہ حملہ غیر متوقع تھا اور یہ سلطان حسین کی غلطی اور زیادتی تھی۔

اور اولجائی خاتون آغا جس کے بال دور لڑائی اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے اڑی ہوئی گرد میں اٹے ہوئے تھے، جس کی دوہری چوٹیوں کے موباف ڈھیلے ہو چکے تھے، اور جس کے جسم میں پختگی اور بالیدگی کے ساتھ ایک خوشگوار فربہی بھی تھی بے اختیار دلشاد آغا کے سامنے اپنے بھائی کو صلواتیں سنا رہی تھی۔ "دیکھو وہ آیا بھی تو اب آیا جب لڑائی ختم ہو چکی ہے"

دلشاد آغا زیادہ خوبصورت تھی، اس کی آنکھوں میں ایرانی چمک تھی، اور آنکھوں کی شکل میں مغلوں کی سی بادامی تراش۔ اس کا رنگ بھی ہرات کی سردار زادیوں کی طرح سُرخ و سفید تھا، خون گویا ٹپکا پڑتا تھا، اور اس کی کمر پتلی تھی۔ اس کے ہونٹ سُرخ اور تر تھے۔ اس دشت و کہستان کی گرد بھی انہیں خشک نہ کر سکتی تھی۔ جھلا کے اس نے اپنی نند سے کہا:

"انہی کے آنے سے تو لڑائی ختم ہوئی"

"ماشاء اللہ" اولجائی نے کہا "اس کی آنکھیں دھوپ سے چکاچوند ہو رہی تھیں، اپنے سفید فربہ ہاتھوں سے آنکھوں پر سایہ کر کے اس نے پوچھا۔

"دیکھو۔ دلشاد، وہ تیمور آ رہا ہے؟ ادھر آ رہا ہے؟"

اولجائی کے لہجے میں صُلح کا اعلان تھا۔ لیکن دلشاد ابھی تک روٹھی ہوئی تھی۔ "ہاں تمہارا تیمور آ رہا ہے۔ اور حسین بھی کمبخت سجستانیوں کا پیچھا کر رہا ہے"

یہ چوٹ اولجائی خاتون آغا کو بُری لگی۔ دن کا کام ختم ہو چکا تھا۔ رات کے لیے دُنبے ذبح کئے رکھے تھے جن کا گوشت اُبالنا تھا تاکہ لڑائی کے بعد شوہر اور سپاہیوں کو دن کی لوٹ ہوئی غذا ملے۔ اور اگر دشمن شب خون بھی مارے تو اُن میں اتنی طاقت ہو کہ وہ اپنی حفاظت کر سکیں۔ اس نے ایک سپاہی کو للکار کے کہا کہ نزدیک کسی کاریز سے پانی بھر بھر کے لاتے اور کڑھائی میں ڈال

دے اور پھر وہ جوابی حملے کے لئے دلشاد کی طرف پلٹی۔

"میری بہن یہ تو بتا۔ یہ لڑائی ہوئی کس کی وجہ سے؟ حسین کی وجہ سے۔ اسے امیر سجستان سے باغیوں کی سرکوبی کے لیے بُلایا تھا۔ بتا بُلایا تھا یا نہیں بُلایا تھا؟ بتا حسین کو یہاں کا سلطان بننے کا شوق کیوں ہُوا؟ اور اس نے خود بخود امیر سجستان کو لڑنے پر مجبور کیا کہ نہیں کیا؟"

"بے شک کیا" دلشاد نے اپنا خوشنما سر ہلایا اور اس کی دونوں چوٹیاں دو توام ناگنوں کی طرح ایک شانے سے دوسرے شانے کی طرف بل کھا گئیں۔ "اس لئے کہ وہ سلطان ہے اور تیرا تیمور سلطان نہیں۔" یاسائے چنگیزی" میں چنگیز خاں کا ارشاد ہے کہ سلطانی صرف چنگیز کی اولاد کو مل سکتی ہے۔ تیمور کو نہیں۔ حسین کا کام سلطانی ہے اور تیمور کا سپاہ گری"

"یاسائے چنگیزی" کی عظمت ان لوگوں کی نظروں میں کلام پاک کے بعد اور ہر کتاب سے زیادہ تھی۔ ایک لمحے کے لئے اولجائی خاتون آغا سناٹے میں آگئی، پھر اس نے پشتِ دست سے اپنے ہونٹوں پر سے گرد صاف کی اور دفعتاً بول اُٹھی :۔

"اور میں؟ کیا میں چنگیز کی اولاد نہیں ہوں؟ حسین میرا ہی تو بھائی ہے"

بحث میں اپنے آپ کو جیتتا پا کے دلشاد کے چہرے پر اس کا بھولا پن واپس آگیا اور اس کا دل صاف ہوگیا۔ "بے شک ہے، بے شک ہے میں کب کہتی ہوں کہ تو شاہزادی نہیں ہے، مجھ سے زیادہ تیری رگوں میں چنگیز کا خون ہے۔ مگر کوئی اور عورت چنگیز کے خاندان میں کبھی بادشاہ نہیں ہوئی ہے۔ سُنا ہے ہند میں ترکوں میں کوئی غلام عورت بادشاہ ہوئی تھی اور مصر میں کوئی کنیز بادشاہ ہوئی تھی۔ مگر ہم تاتاریوں میں کوئی عورت بادشاہ نہیں ہوئی۔ تو پھر جب تو بادشاہ نہیں ہوسکتی تو تیرا میاں تیمور کیسے بادشاہ ہو سکتا ہے؟ اور سُن تیرا بھائی حسین اگر بادشاہ ہے تو کیا ہُوا تیرا بھائی ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

"بے شک میرا بھائی ہے۔ وہ ضرور بادشاہت کرے، ضرور سجستان اور ہرات اور ماوراءالنہر اور بدخشاں کا بادشاہ بنے۔ لیکن اسے چاہیئے کہ تیمور کے مشورے پر عمل کرے، جیسے پہلے وہ امیر کاغان کے مشورے پر چلتا تھا اور جب تک ہم پر کوئی آفت نہیں آئی تھی ۔ ۔ ۔ ۔"

اور پھر وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے کی طرف دیکھنے لگی، جدھر سے جاکو برلاس کے سہارے تیمور آ رہا تھا، دونوں کے گھوڑے آہستہ آہستہ چل رہے تھے اور چٹانوں اور پتھروں پر سورج کی چکا چوند میں اولجائی خاتون آغا کی تجربہ کار نگاہیں اندازہ کرنا چاہتی تھیں کہ تیمور جو خون میں شرابور معلوم ہو رہا تھا کس قدر زخمی ہوگا۔ دلشاد کو وہیں چھوڑ کے وہ بے اختیار دیوانہ وار تیمور اور جاکو برلاس کی طرف دوڑنے لگی اور ایک چیخ کی سی آواز میں اس نے پُوچھا۔

"جاکو برلاس۔ جاکو برلاس۔ تیمور کو کیا ہوا؟"

"ہونا کیا" تیمور نے عزم و استقلال کے ساتھ ایک تلخ سا قہقہہ لگایا۔ "معمولی سی چوٹ۔ لیکن میرا گھٹنا سیدھا نہیں ہو رہا ہے اور رکاب میں پاؤں نہیں رکھا جا رہا ہے۔" ننگے پاؤں، گرد میں اَٹی ہوئی اولجائی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور اپنی آستین سے اس کے ہاتھ اور اس کی ٹانگ سے اُبلتا ہوا خون پونچھتی جا رہی تھی۔

اور اس طرح جیسے کچھ ہوا نہیں تیمور نے اولجائی سے پوچھا "رات کو ہم لوگوں کو کھانے کو کیا دے گی؟"

پسینہ، گرد اور چھلکتے ہوئے آنسوؤں سے بھرا ہوا چہرہ اولجائی نے تیمور کی طرف اُٹھایا اور اس چہرے پر قہرناک لیکن نہایت

حسین دھوپ چمکی۔ آفتاب کی خوبصورت تمازت اور اس نے جلدی جلدی کہا۔ گوشت آبہ۔ خوبانیاں۔ افروٹ ؟"

جاکو برلاس نے اپنے گرد آلود ہونٹوں پر زبان پھیری اور پھرتی سے گھوڑے پر سے کود کے تیمور کو اس کی زین سے اٹھالیا، جیسے کوئی پہلوان کسی بچے کو اٹھاتا ہے۔

یہ اس کی عمر میں پہلی مرتبہ تھی کہ کسی اور کے سہارے، کسی اور کے بازوؤں کے سہارے تیمور کے گھوڑے سے اترا۔ اتنی کمزوری وہ کبھی اپنے آپ سے منسوب کر ہی نہ سکتا تھا۔

اور اس کو اس طرح گھوڑے سے اتارا جاتے دیکھ کر اولجائی بلک بلک کر رونے لگی۔

تیمور نے پھر زہرخند کے ساتھ اپنے سر سے خود اتارا اور اولجائی نے خیمے میں اس کے بستر کی سلوٹیں جلد جلد ٹھیک کیں۔ لیکن وہ بستر کے قریب شیر کی کھال پر بیٹھ گیا اور ٹانگ پھیلا کے تیر کی ٹوٹی ہوئی کرچیں زخم سے نکالنے لگا۔

دلشاد نے جلدی سے گرم پانی اور چونے سے بھرا ہوا ایک پیالہ اولجائی کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ اور تیمور نے کڑوی سی ہنسی ہنس کے اولجائی کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ "تشکرتم۔ جانِ من۔ روتی کیوں ہے؟ تو نے اس سے پہلے مجھے کبھی زخمی نہیں دیکھا؟ کبھی کسی اور کو زخمی نہیں دیکھا؟ تو نے ہزاروں کو گھمسان کی لڑائی میں مرتے نہیں دیکھا؟ کیا تو خود اس سے پہلے زخمی نہیں ہوئی؟ یہ تو خراش ہے۔ معمولی سی خراش۔" اور کھنکھار کے اس نے اپنا گلا صاف کیا۔ اور اس وقت جاکو برلاس نے اطلاع دی کہ "آقا سلطان حسین اب اس طرف واپس آ رہا ہے۔"

"اس قدر جلد؟" تیمور نے غصے کو ضبط کیا۔

جاکو برلاس نے دلشاد کی طرف دیکھ کے ذرا مصلحت کے لہجے میں کہا۔ "شاید تعاقب اس نے ایلچی بہادر کے سپرد کر دیا ہوگا۔"

اور گھوڑوں کے وحشیانہ ٹاپوں کی آواز قریب آ گئی۔ خطرناک موسیقی کے تال کی طرح، ایک ذہنی، صوتی زنجیر کی طرح۔ ایک قسم کی ہم آہنگی اور ترتیب کے ساتھ۔ سُموں اور چٹانوں کے تصادم کی وحشیانہ تال۔ جیسے یہ کل ہی کی تو بات تھی کہ انسان نے شیر اور ریچھ اور مگرمچھ کا ساتھ چھوڑا تھا۔

(۲)

اس کوہستانی دشت میں جو وہاں واقع تھا جو آجکل بلوچستان ہے، رات آئی۔ گرمیوں کی گرم خونریز رات، پتھروں، چٹانوں، سنگلاخ زاویوں پر چاندنی کا وحشیانہ نور برساتی ہوئی۔ دور دور کسی سایۂ درخت، کسی جھاڑی، کسی بوٹی کا پتہ نہ تھا۔ کسی کسی کریز کے کنارے ذرا سی گھاس اُگ آئی تھی۔ اور کریزوں کا پانی گدلا تھا۔ اس وحشیانہ، خون کو کھولانے والی چاندنی رات میں تاتاریوں کے مخروطی خیمے چمک رہے تھے۔ سیاہ خیمے اور ان کے چمکتے ہوئے پیتل کے کلس۔

اولجائی نے خیمے کے شگاف سے جھانک کے اس حسین اور ہیبت ناک رات کا حُسن دیکھا اور پھر ٹمٹماتے ہوئے دیئے میں تھوڑی سی پگھلی ہوئی چربی اور ڈال دی۔ چراغ کی لَو چمک اٹھی۔ اس نے اپنے سر پر چادر ٹھیک کی۔ جیسے کوئی باعصمت، سعادت مند لڑکی اپنے باپ کے سامنے جائے۔ اور اسی طرح کی تعظیم کے جذبے کے ساتھ وہ پھر کلامِ پاک پڑھنے لگی۔ جس کے معنی وہ سمجھ نہ سکتی تھی۔ یہ ایک طرح کی گونگی عبادت تھی، جس میں اس کے دل کا ایک کونا مصروف اور منہمک تھا اور دوسرا کونا بائیں آنکھ بن بن کے بار بار اس سیاہ بستر سے الجھ الجھ جاتا تھا جس پر تیمور پڑا ہوا تھا جو کبھی کبھی آنکھ کھول کے منہ پھیر لیتا، اور ہاتھ بڑھا کے اس کے اور اپنے بچے

جہانگیر کے بالوں میں کنگھی کرتا جو قریب ہی غافل سو رہا تھا اور خراٹے لے رہا تھا۔ اولجائی کا دل گرم تھا، اور وہ گونگی چڑیا کی طرح کتاب مقدس کا ورد کئے جا رہی تھی۔ اور اسے اس پر بڑا فخر تھا کہ مولانا صدرالدین ہراتی سے اس نے قرآن مجید کا درس گیارہ سال سے کم عمر میں ختم کیا تھا۔ اس کے دل میں جو دعا تھی وہ صاف تھی، جو عرضِ مدعا تھا وہ واضح تھا۔ اور دُعا یہ تھی کہ کب تک؟ یہ زندگی کب تک؟ یہ شیروں، ریچھوں، شغالوں کی زندگی کب تک؟ یہ شاہین کا فوری، اور عقاب شکاری کی زندگی، یہ کبک و دُرّاج وسار کی زندگی کب تک؟ کب تک وہ ہر ہر سانس میں اپنے لئے، اپنے مرد کے لئے، اپنی اولاد کے لئے موت کا مزہ چکھے گی۔ کب تک یہ دغدغہ رہے گا کہ کل تیمور مارا جائے گا، کل جہانگیر چھن جائے گا۔ کل وہ کسی کی کنیز بنے گی، کل اُس پر وہی گزرے گی جو اُس نے ہزاروں پر گزرتی دیکھی۔ اور وہ نہ بھی گزری۔ تب بھی یہ زندگی کب تک جس میں برفانی چوٹیاں تھیں اور جُھلسی ہوئی کھیتیاں، جلتے ہوئے گاؤں، لُٹتے ہوئے شہر، ہنستے ہوئے ریگستان۔ اور ایک مسلسل خانہ بدوشی جس کا نہ کوئی آغاز تھا نہ انجام۔ جس میں انسان انسان کا شکاری تھا۔ اور وہ خود ایک شکاری پرندے کی بیوی تھی۔ شکار بھی تھی اور شکاری بھی تھی۔ اور شکار اور شکاری کی ماں تھی، بہن تھی۔ کیا یہ دل جو اس کے سینے میں دھڑک رہا تھا، چنگیز کی اولاد کا دل تھا اور بس۔ یا اس دل میں ہرات کی دھڑکن تھی۔ آباد شہروں کی جہاں نجوم اور فقہ اور بلاغت نے نشوونما پائی۔ اور اگر یہ محض چنگیز کی اولاد کا دل تھا، تب بھی کیا معلوم کہ اس پر بھی وہی گزرے جو ایک بورتے ئی پر گزری۔

ہرات کی گلیاں، اور مناظرے اور وہ تورانی دوشیزہ جس نے کبھی ہرات میں بھی نقاب نہیں پہنا۔ اولجائی کو ان ہراتی عورتوں پر رحم آتا تھا جن کے جسم سیاہ چادروں میں لپٹے لپٹے شاعروں کے لئے سرو بن کے رہ گئے تھے، اور جن کے چہروں پر نقاب گہن کی طرح پڑا رہتا۔ نہیں، اس لحاظ سے وہ تورانی تھی، تیمور کی طرح، چغتائیوں کی طرح، قبچاقیوں کی طرح ریشہ ریشہ مغل۔ بورتے ئی کی طرح۔ بار بار اپنے آپ کو بورتے ئی سے تشبیہ دینے پر اُسے خود حیرت تھی۔ اس کا شوہر اس کے بھائی کا ایک مفلس سپہ سالار تھا، ابھی تک اس نے کوئی بڑی سرزمین فتح نہیں کی تھی، کسی کا تخت و تاج نہیں چھینا تھا، کسی شہر میں قتل عام نہیں تھا، کسی اور عورت کی طرف نظر اُٹھا کے نہیں دیکھا تھا، پھر وہ کیوں بار بار اپنے تیمور کا چنگیز سے اور خود اپنا بورتے ئی سے مقابلہ کرتی تھی۔

اس کے دل کو حضورِ قلب میسّر نہیں تھا۔ لیکن اس کا ذہن سکون میں تھا یہ سب اس لئے ہے کہ وہ تیمور کو جانتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ تیمور کے دل میں ایک پوشیدہ ولولہ ہے، چنگیز بننے کا ولولہ۔ یہ کہ اس ولولہ کا ذکر کبھی نہیں کیا جاتا کیونکہ یہ ولولہ خطرناک ہے۔ مگر یہ ایک خوفناک سانپ کی طرح سب کے دلوں پر مسلط ہے۔ تیمور کے دل پر، اس کے جاں نثار ساتھیوں جاکو برلاس اور ایلچی بہادر کے دلوں پر ایلچی بہادر اب تک بجستانیوں کا پیچھا کر رہا ہے۔ واپس نہیں آیا — اس کے اپنے دل میں شک بن کے وہ سلطان حسین اور دلشاد کے دل میں ہے۔ خوف بن کے وہ تیمور کے دشمنوں کے دلوں پر حاوی ہے یہاں تک کہ چغتائیوں اور برلاسوں کے دلوں پر، یہ ایک طرح کی اٹل تقدیر ہے، ایک لکیر، ایک تحریر ہے جسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔ اور وہ جو ماں اور بہن ہے جانتی ہے کہ یہ ہو کر رہے گا، گزر کر رہے گا، وہ اس اٹل تاریخ اس نئی چنگیزی واردات کو اپنی رگوں میں خون بن کے دوڑتا ہوا محسوس کرتی ہے، اسے وہ تیمور کی پیشانی کی رگوں میں دھڑکتا ہوا محسوس کرتی ہے، اور کبھی ہیبت سے اور کبھی فخر سے کانپ جاتی ہے۔

حضورِ قلب اس نے میسّر کرنا چاہا۔ لیکن میسّر نہ ہو سکا۔ اس نے ادب سے کلام پاک کو جزدان میں لپیٹا اور تیمور کے سرہانے رکھ دیا۔ ایک بار پھر خیمے کا پردہ ہٹا کے سنسناتی ہوئی گرم رات کی کھولتی ہوئی چاندنی کو دیکھا جس میں چٹانوں پر شیطانوں کا سا دیوانہ وار

جلال اور جمال رقص کر رہا تھا۔ اور پھر تیمور کے پاس آ کے بیٹھ گئی۔ درود شریف پڑھ کے اس نے تیمور کے منہ پر دَم کیا۔ تیمور نے اپنی ذرا تھکی تھکی آنکھیں کھولیں اور پھر بند کر لیں۔ اس نے ہاتھ لگا کے دیکھا تو تیمور کا جسم جل رہا تھا۔ "تپ" اس نے اپنے آپ سے ذرا گھبرا کے کہا۔ اور پھر دَم کرنے کے لئے درود شریف پڑھنے لگی۔ اور دَم کرنے کے بعد تیمور کے قدموں کے قریب اپنا بستر گھسیٹ کے لیٹ گئی۔

اور معلوم ہوتا تھا کہ راوی سے بورتے ئی کا جو قصہ اس نے کئی سال پہلے سمرقند میں سُنا تھا، وہ تازہ ہو رہا ہے۔ یہ کہ راوی کی آواز برابر اس کے کانوں میں آ رہی ہے۔ کرخت الیغوری لہجہ میں منگل داستان دہرائی جا رہی ہے اور سجستان کا کہیں وجود نہیں۔ اور اسے کچھ یہ محسوس ہُوا کہ یہ قصہ اس کو نہیں زخمی تیمور کو یاد آ رہا ہے جیسے تپ چڑھ رہی ہے۔ اس دشت میں جہاں کوئی طبیب کوئی جراح نہیں۔ یہ کہ تیمور کی کنپٹیوں کی رگیں معمول سے زیادہ شدت سے دھڑک رہی ہیں اور وہ اس کے ذہن کے ذریعے بورتے ئی کے متعلق سوچ رہا ہے اور الیغوری زبان میں راوی قصہ دہرا رہا ہے، اس کی آواز میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی سی ہم آہنگی ہے اور اس کی زبان سے الفاظ ڈھل رہے ہیں۔

"بُرکان کالدون کے سائے میں خانِ اعظم چنگیز کے ساتھی رنگ رلیاں منا رہے تھے، اور بُرکان کالدون پر سے برف اور پتھروں کا ایک بہت بڑا تودہ گرا مگر وہ نہیں چونکے، آدھی رات تک وہ کومیس پیتے رہے اور گھوڑیوں کا گوشت نگلتے رہے اور قے کرتے رہے اور پھر نگلتے رہے۔ تب جاودانی آسمان نے کہا۔ یہ میرے بندے غافل ہیں، انہیں سزا ملنی چاہیے اور ہیبت کے مارے بُرکان کالدون کی برف پوش چوٹیوں نے سر چھپا لیا۔

"ابھی ایک پہر رات باقی تھی کہ جنگل جانوروں کی جیسی چیخیں بلند ہوئیں جیسے شیر آ گئے، جیسے ریچھ آ گئے، جیسے زلزلہ آ گیا، جیسے بُرکان کالدون کانپ گیا کیونکہ دشمنوں نے حملہ کیا تھا اور وہ منگولوں کے مویشی اور ان کی عورتیں ہانک لے گئے۔

"جب تموچین کی آنکھ کھلی جو خانِ اعظم چنگیز بننے والا تھا، مگر ابھی نہیں بنا تھا کیونکہ ابھی جاودانی آسمان کی مرضی میں وقت باقی تھا۔ اور تموچین نے اپنی کمان سنبھالی، اور اپنا نیزہ سنبھالا اور دیکھا کہ ساتھ کے خالی بستر پر دشمن کا نیزہ گڑا ہوا تھا اور اس کی بیوی بورتے ئی غائب تھی۔

"پھر فوراً تموچین نے سمور کا لبادہ اوڑھا اور اپنے منگول ساتھیوں کو سوتے سے اُٹھایا اور بُرکان کالدون کی گھاٹیوں میں جا چھپا۔ یہ دیکھنے کو کہ دشمن کون تھا اور اس کی کتنی طاقت ہے، اور دشمن کہاں گیا۔

"اور دشمن اس کی تاک میں تھا۔ اس نے گھاٹیوں میں سے دشمن کے شہسواروں کو نکلتے دیکھا، اِدھر اُدھر اس کی تلاش میں اس کے ساتھیوں کی تلاش میں گھوڑوں کو ایڑ لگاتے، گھوڑوں کی گردن سے گردن ملائے، پہاڑیوں میں، چراگاہوں میں چالاکی سے آتے جاتے، وہ انہیں دیکھتا اور چھپا رہتا کیونکہ تموچین اُن سے زیادہ ہوشیار تھا۔

"اور پھر دشمن منگولوں کا خیمہ و خرگاہ چھوڑ کے مویشیوں اور عورتوں کو ہانک کے، جہاں سے آیا تھا وہاں چلا گیا۔

"اور آہستہ آہستہ تموچین کو خبریں ملنے لگیں کہ دشمن کون تھا۔ اور کدھر گیا، وہ مغرب کے پہاڑوں سے نہیں آیا تھا، مشرق کی چراگاہوں سے نہیں آیا تھا، شمال کے جنگلوں سے آیا تھا اور شمال ہی کی طرف چلا گیا اور تب پتہ چلا کہ حملہ آور دشمن مرکیت قبیلہ تھا جو شمال کے جنگلوں میں رہا کرتا تھا۔

"اور اس مرکیت قبیلے کے متعلق راوی نے سُنا ہے، کیا سُنا ہے کہ اس قبیلے کے لوگ بڑے خوفناک خونخوار شکاری تھے اور اسی قبیلے سے بیس سال پہلے تموچین کا باپ ایک لڑکی یُوئُون آیکے کو اُڑا لایا تھا، اور بیس سال کے بعد مرکیت قبیلے نے بدلہ لینے کے لئے دھاوا کیا۔ اور یہ یُوئُون ایکے تموچین کی سوتیلی ماں تھی۔ یوئُون ایکے کے بدلے اب مرکیت لوگ بورتے ئی کو اُڑا لے گئے تھے۔

"تموچین نے قسم کھائی اور اس طرح کہ وہ مقدس پہاڑ بُرکان کالدون کی سب سے اُونچی چوٹی پر چڑھ گیا، جس تک شیر نہیں پہنچ سکتا، گدھ نہیں پہنچ سکتا انسان نہیں پہنچ سکتا، جہاں سال کے ہر دن ہر رات برف گرتی رہتی ہے اور برف کے سیلاب آتے ہیں، جہاں جاودانی آسمان اپنے نیزے کی انی پر بجلی چمکاتا ہے اور اپنی کھنکھار سے گھن گرج پیدا کرتا ہے اور بُرکان کالدون کی سب سے اونچی چوٹی پر پہنچ کے تموچین نے جو ایک دن خانِ اعظم چنگیز بننے والا تھا، اپنی کمر سے تلوار کھولی اور اپنا کمر بند اپنی گردن میں حمائل کیا اور اپنی ٹوپی اُتار کے اُلٹی اور اُلٹ کے پہن لی اور نو بار برف پر دو زانو ہوا اور کومیس کی شراب نذر چڑھائی اور جاودانی نیلے آسمان کا شکر ادا کیا جس نے اس کی جان بچائی۔ اور منگول جو اُس زمانے تک مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے جاودانی نیلے آسمان کو خدا مانتے تھے اور اس کو "من کے کوکو تینگری" کہتے تھے۔

"اور پھر تموچین نے من کے کوکو تینگری کو مخاطب کر کے قسم کھائی اور بُرکان کالدون مقدس پہاڑ کو اپنی قسم کا گواہ بنایا کہ جب تک وہ مرکیت قبیلے کو سزا نہ دے گا، چین نہ لے گا۔ اور اس کے بعد وہ جو دو زانو تھا، اُٹھ کھڑا ہوا اور گردن سے نکال کے، پھر اس نے کمر میں کمر بند باندھا، تلوار لگائی، مکا مار کے اپنی ٹوپی اُلٹی سے سیدھی کی اور سیدھی کر کے پہن لی، نشیلی کومیس کا ایک گھونٹ پیا اور پہاڑ سے نیچے اُتر آیا۔

"تاجوت قبیلہ اور اس کے سردار تارگوتائی سے تو پہلے سے دشمنی تھی۔ تموچین نے اُدھر کا رُخ نہ کیا۔ وہ مغرب کی طرف روانہ ہُوا، جدھر سورج ڈوبتا ہے اور چلتا گیا، کئی دن، کئی منزل۔ یہاں تک کہ وہ تُولا اور چُون ندیوں کے درمیان کی چراگاہوں میں پہنچا جہاں کرائت قبیلہ رہا کرتا تھا۔ یہ قبیلہ بہادر تھا اور یہ بھی من کے کوکو تینگری، ازلی ابدی جاودانی آسمان کو مانتا تھا، ویسے اس قبیلے میں بُدھ بھی تھے اور مسیحی بھی تھے اور مسلمان بھی تھے۔ اس قبیلے کا خان طغرل تھا۔ جو تموچین کے باپ یسوکائی کا اندا تھا۔ اور مغلوں میں اندا منہ بولے بھائی کو کہتے تھے۔ اس نے تموچین کو گلے لگایا اور تموچین نے اس کے قدموں میں وہ تحفے ڈال دیئے جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اور وہ تحفے یہ تھے۔ سمور کا لبادہ، چینی ریشم اور اعلیٰ درجے کی کومیس۔ اور اس نے طغرل خان سے درخواست کی کہ وہ اُسے اپنے بیٹے کی طرح سمجھے۔ طغرل خان مغلوں پر مرکیت قبیلے کے دھاوے کا قصہ سُن چکا تھا اور اس مرکیت قبیلے سے خود اس کی بھی لڑائی ہوتی رہتی تھی۔ وہ تموچین کی سعادت مندی کی تعریف کرنے لگے۔ اور اس سے بھی زیادہ تعریف اُس نے اُن تحفوں کی کی جو وہ ساتھ لایا تھا۔ اور اُس نے بہت سے کرائت شہسوار تموچین کے ساتھ کر دیئے۔

"اور جب طغرل خان نے تموچین کے سر پر ہاتھ رکھا تو اور بھی بہت سے قبیلے جو مغلستان کے مرغزاروں اور جنگلوں میں رہتے تھے اس کا ساتھ دینے کو تیار ہو گئے۔ کیونکہ راوی نے سُنا ہے، کیا سُنا ہے کہ جب قسمت ساتھ دیتی ہے تو سب ساتھ دیتے ہیں، اور جب قسمت ساتھ نہیں دیتی تو کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ کرائتوں کی طرح جراُتوں نے بھی تموچین کا ساتھ دیا۔ اور یہ لوگ شمال کے ان جنگلوں میں بھوکے بھیڑیوں کی طرح پل پڑے جن میں مرکیت قبیلہ رہتا تھا۔

"اور پھر جو گزرنا تھی وہ گزری۔ راوی کیا بتائے کہ کیا گزری۔ تین سو مرکیت جنہوں نے برگان کالدون کے دامن میں مغلوں کے خرگاہ کو تاراج کیا تھا اور ان کی عورتیں اور مویشی ہانک لے گئے تھے اور بورتے ئی کو اپنے ساتھ لیتے گئے تھے۔ پورے تین سو کے تین سو مرکیت ایک ایک کر کے چن چن کے مارے گئے۔ ان کی جو عورتیں، بیویاں بننے کے لائق تھیں، مغلوں اور کرائتوں اور جرائتوں نے پکڑ پکڑ کے اپنی بیویاں بنالیں۔ اور جو مرکیت عورتیں لونڈیاں بننے کے لائق تھیں مغلوں اور کرائتوں اور جرائتوں نے اپنی لونڈیاں بنالیں۔

"اور تموچین ادھر بدلہ لیتا جاتا تھا، اُدھر ایک ایک خیمہ کا پردہ نیزے کی نوک سے اُٹھاتا، اندر جھانکتا اور بورتے ئی کو ڈھونڈھتا یہاں ڈھونڈھتا اور وہاں ڈھونڈھتا۔

"اور پھر راوی نے سُنا ہے، کیا سُنا ہے کہ جاودانی نیلے آسمان کی مہربانی سے بورتے ئی اس کو مل گئی۔ کہاں مل گئی؟ مرکیت سردار کے سفید خیمے میں۔ لیکن بورتے ئی کی آغوش میں ایک ننھا سا بچہ تھا۔ اس ننھے بچے کو دیکھ کر تموچین جو خانِ اعظم چنگیز بننے والا تھا ایک ذرا ہچکچایا، پھر ہنس کے اس نے بورتے ئی کو گلے لگا لیا۔ اور اس سے کہا اس بچے کا نام جوچی ہے۔ راوی نے سُنا ہے، یہ سُنا ہے کہ جوچی مغلوں کی زبان میں مہمان کو کہتے ہیں . . . ."

اولجائی خاتون آغا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تیمور نے ہلکی سی کراہ کے ساتھ کروٹ بدلنی چاہی، مگر اس کی زخمی ٹانگ بہت سُوج گئی تھی اُٹھ نہ سکی، اور اس نے اسی طرح لیٹے لیٹے آنکھیں کھولیں اور خیمے کی چھت کی طرف دیکھا اور جہانگیر کے بالوں پر ہاتھ پھیرا جو معصوم بچپن کی غافل نیند سو رہا تھا اور پھر تیمور کو بخار اور بحران سے ملی جلی نیند آ ہی گئی۔

(۳)

"یہ کس کے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز تھی۔ کون باہر گیا؟"

"حسین۔ حسین قندھار گیا ہے، دلشاد کے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ۔" تیسرے دن علی الصباح اولجائی اسے جوشاندہ اور ماءاللحم پلا رہی تھی۔

"مجھ سے ملے بغیر چلا گیا؟" تیمور نے جھنجھلا کے پوچھا۔

"نہیں وہ تمہیں خدا حافظ کہنے آیا تھا۔ تم سو رہے تھے۔ وہ چلا گیا۔"

اب بھی تیمور کا جسم جل رہا تھا۔ آج تیسرا دن تھا اور تپ بہت شدید تھی۔ "شطرنج لاؤ" اس نے اولجائی سے کہا، اور اولجائی نے شطرنج اور ہاتھی دانت کے مہرے بڑھا دیے۔ لیکن جھنجھلا کے تیمور نے شطرنج کو ہٹا دیا۔

جہانگیر ابھی تک اسی طرح سو رہا تھا۔ تیمور نے اس کی طرف دیکھا، اور پھر اولجائی کی طرف، اور پھر یہ محسوس کر کے کہ خیمے میں اور کوئی ہے اس نے آنکھیں کھول دیں۔ یہ ایلچی بہادر تھا۔

ایلچی بہادر اس کے قریب گھٹنے ٹیک کے بیٹھ گیا، اور اپنے تھیلے سے طلائی زیورات اُلٹ دیے۔ "امیر۔ اب سجستانی بہت دنوں تک سر نہیں اُٹھا سکیں گے۔"

تیمور نے کوئی جواب نہیں دیا اور خیمے کی چھت کی طرف تکتا رہا۔

اولجائی نے جھنجھوڑ کر جہانگیر کو اُٹھایا۔ "جہانگیر۔ جہانگیر صبح ہو گئی ہے۔"

تیمور نے ایلچی بہادر سے کہا۔ "سلطان حسین کا حصہ اسے دے دینا۔"

"بہتر، امیر"

"تم کب آئے ؟"

"کل رات کو"

ایلچی بہادر کے کپڑے ابھی تک گرد میں اَٹے ہوئے تھے اور ان میں ایک طرح کا تعفن تھا، پسینے اور خون کا مرکب جس کے جنگجو عادی ہوتے ہیں۔ ایلچی بہادر نے کہا۔ "امیر کی طبیعت کیسی ہے ؟"

اس پر تیمور پھر جھنجھلا گیا۔ "معمولی خراش ہے۔ مجھے اٹھاؤ اور گھوڑے تک لے چلو۔ میں بھی قندھار چلوں گا"

اولجائی دوڑ کر دوسری طرف اس کے پاس بیٹھ گئی۔ "تیمور۔ تیمور تمہیں بہت تیز تپ ہے۔ تمہارا بدن کس قدر جل رہا ہے۔"

"تمہارے ہاتھ جل رہے ہیں۔" اس نے تلخی سے ہنسنے کی کوشش کی۔ اور اس کے بعد اس نے ایک نشیلی سی غفلت اور غنودگی محسوس کی۔

"آغا یہاں سے کچھ دور آگے ایک وادی ہے، جہاں سرسبز درخت ہیں۔ بہت اچھے میوے ہیں۔ آغا وہاں پھول ہیں اور پانی افراط سے ہے۔ اور وہاں بلوچیوں کا ایک گاؤں ہے۔ امیر کو قندھار نہیں لے جا سکتے مگر وہاں تک لے چلیں۔ میں جاکو برلاس کو بلا لاؤں ...." ایلچی بہادر نے اولجائی سے پوچھا۔

"وہ کیا کہہ رہا تھا" تیمور نے اولجائی سے پوچھا۔ اولجائی نے کہا یہاں سے کچھ آگے ایک وادی ہے، جہاں پانی افراط سے ہے اور خیموں پر درختوں کا سایا رہے گا اتنی گرمی نہیں ہوگی۔ تمہیں وہاں لے چلیں گے۔"

"میں اپنا پیر ہلا نہیں سکتا۔ تیمور نے نا امیدی اور غصے کے عالم میں کہا۔ اور اتنے میں جاکو برلاس" ایلچی بہادر کے ساتھ نمودار ہوا۔ دوڑ کر اس نے تیمور کا بازو پکڑ لیا۔

"امیر کیا حال ہے"

"بہت معمولی سی خراش ہے۔ تیر معلوم ہوتا ہے کہ زخم کے اندر ابھی تک چبھ رہا ہے، اسے خنجر کی نوک سے نکال لے۔"

"امیر جس وادی کا ایلچی بہادر نے ذکر کیا ہے وہاں آپ کو لئے چلتے ہیں۔ وہاں شاید کوئی جرّاح یا طبیب ہو"

اور وہ اس طرح اسے لے کے چلے جیسے کسی کی لاش تابوت میں جاتی ہے۔ اس کی بے بسی دیکھنے کے قابل تھی۔ اس کا زخمی ہاتھ اور زخمی ٹانگ دونوں بہت سوج گئے تھے اور آج تیسرے روز ٹانگ میں پیپ پڑ چکی تھی۔ وہ جو بچپن سے اب تک چنگیز بننے کا لایعنی خواب دیکھتا آیا تھا، کسی اور دنیا کی تسخیر کے لئے جا رہا ہو تو جا رہا ہو اس دنیا میں تو اس کے زیادہ دن رہنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔

اور پھر قطعے کی وادی تک پہنچتے پہنچتے وہ اپنے تخت پر بیہوش ہو گیا، جس پر اس کے وفادار سپاہی اُسے اٹھائے لئے جا رہے تھے۔ کچھ بخار کی شدت سے، کچھ دھوپ کی تمازت سے شروع میں پانی کے قطرے اکسیر معلوم ہوتے رہے، پھر اس اکسیر کا بھی کچھ اثر نہ رہا۔

سرسبز وادی میں پہنچ کر اس کے ساتھیوں نے خیمے نصب کئے۔ اور قریب کے گاؤں کے کچھ بلوچیوں کو بیگار میں پکڑ لائے۔ گاؤں سے کچھ دُنبے اور مرغ پکڑ لائے۔ کسی کے ہاتھ ایک آدھ عورت بھی آ گئی۔ تاتاری خیمے کی مدور مخروطی چھتوں کے کلس اس وادی میں عجیب معلوم ہوتے تھے جس کی زمین سرسبز تھی لیکن جس کے اطراف کے پہاڑ جھلسے ہوئے گرم اور بنجر تھے۔

دوپہر کو اسے اولجائی نے مُرغ کی یخنی پلائی اور اس نے ایک طرح کی اندرونی گرمی محسوس کی۔ ایک طاقت جو اسے زندہ رکھنے کے لئے اُبھار رہی تھی لیکن تپ کی وہی شدت تھی۔

اور جاکو برلاس بار بار آکے اولجائی سے کہہ جاتا تھا۔ "آغا آغا اس علاقے میں کوئی طبیب کوئی جرّاح نہیں۔ یہ سامنے کا گاؤں کچھ چرواہوں کچھ کسانوں کا ہے۔ کہتے ہیں یہاں سے دریائے سندھ تک کوئی بڑی آبادی نہیں جس کے اور آگے ملتان ہے یا پھر شمال میں قندھار ہے۔ حکم ہو تو میں قندھار سے جرّاح بلا لاؤں۔"

لیکن تیمور جاکو برلاس کو اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک طرح سے اُسے اپنے اس ترک رفیق پر زیادہ اعتبار تھا۔ اس نے ایلچی بہادر کو قندھار جانے کا حکم دیا اور پھر جب شام آئی تو اس نے بڑی کمزوری محسوس کی۔

اس سرسبز وادی میں یہ عجیب شام تھی۔ زندگی اور موت کے درمیان ایک سناٹا۔ اولجائی نے خیمے سے باہر نکل کے دیکھا۔ سوائے مٹھی بھر تاتاری سپاہیوں کے زندگی کا کوئی اور پتہ نہ تھا۔ گاؤں پورا کا پورا خالی ہو چکا تھا۔ تاتاریوں کی ہیبت کے مارے جو مویشی تاتاریوں کے ہاتھوں سے بچ گئے تھے انہیں گاؤں والے کسی نہ کسی ترکیب سے ہنکالے گئے تھے۔ آسمان پر بھی فاختاؤں یا تیتروں یا کبوتروں کی جگہ صرف کوّے اور چیلیں تھیں، اور قریب ہی ایک درخت پر اُلّو بیٹھا ہوا رات کا انتظار کر رہا تھا۔

اولجائی کا دل بیٹھنے لگا۔ اس نے پھر تیمور کو گرم یخنی پلائی باوجود اس کے کہ اس پر نیم بیہوشی کا عالم طاری تھا۔

دُور سے کسی کی آواز آئی "بابا" بہت قریب جہانگیر اس سے لپٹ رہا تھا۔ تیمور نے اندھی انگلیوں سے جہانگیر کے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور پھر چونک کر اولجائی سے کہا، ثابت ہوش اور حواس کے عالم میں:

"اولجائی تجھے معلوم ہے شیرنی اپنے بچوں کو کیسے پالتی ہے۔" اس کا لہجہ ضعیف تھا مگر اس کے الفاظ میں عزم بالجزم تھا۔ "پہلے تو وہ بچوں کو دودھ پلاتی ہے، پھر دودھ چھڑانے کا وقت آتا ہے جیسے اور سب جانوروں میں بچوں کا دودھ چھڑانے کا وقت آتا ہے۔ شیر کے پاس سوائے کچے گوشت کے اور کچھ نہیں ہوتا اور کچا گوشت بچوں کو ہضم نہیں ہوتا۔ شیرنی کچا گوشت کھا کے قے کرتی ہے۔ اور اس قے میں گوشت گل جاتا ہے۔ یہ ہضم کیا ہوا گوشت ہوتا ہے۔ اور اس طرح شیر کے بچے دودھ چھوڑ کے یہ قے کیا ہوا گوشت کھاتے ہیں اور پھر کچا گوشت کھانے لگتے ہیں۔ . . ."

اور پھر اس کی آواز زخمی شیر کی طرح نحیف ہو گئی۔ "میرے جہانگیر کو اسی طرح پالنا!"

یہ پہلی مرتبہ تھی کہ زخمی ہونے کے بعد اپنے ہلاک ہونے کا امکان کا تیمور نے پہلی بار بالواسطہ یا بلاواسطہ ذکر کیا تھا۔ اولجائی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تیمور نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے پھر بڑی کمزوری سی محسوس کی اور پھر اس پر غشی سی طاری ہونے لگی۔

یہ رات بڑی سخت تھی۔

نیم بیہوشی کے عالم میں تیمور کا دماغ بڑا مستعد تھا۔ ایک سپاہی تھا، سجستانی سپاہی جس کا سر اس کے گھوڑے کے سُم کے نیچے آکے چکنا چُور ہو گیا تھا۔ جیسے بلّور کا بنا ہوا سر تھا، اور سر سے بھیجے کی سفیدی اور ناک اور کان اور زخم سے فواروں کی طرح خون پھوٹ نکلا تھا۔ اور تیمور نے محسوس کیا کہ خیمے کی چھت اور خیمے کی دیواروں پر وہی سر اس کے سامنے ہے۔ نامعلوم سپاہی کا کچلا ہوا سر، وہ جب آنکھ بند کرتا سر سامنے آجاتا اور جب آنکھیں کھولتا تو چربی کے چراغ کی ٹمٹماتی ہوئی لَو اور قرآن پاک پر اوجی کی سوجی

ہوئی آنکھیں گڑی ہوئی اور اس کے لب ہلتے ہوتے۔

"اس خاتون کو میں نے اس سے پہلے کہیں دیکھا ہے!" نیند اور بیہوشی کے نشے کے بین بین تیمور نے اپنے دل میں تصفیہ کیا اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔ اسی سجستانی سپاہی کا کٹا ہوا سر۔ گھوڑے کی ہر ٹاپ پر وہی کچلا ہوا سر۔ زمین سے آسمان تک، ہر سمت سروں پر گھوڑوں کے سُموں کی بارش اور ناکوں، کانوں اور ہونٹوں سے خون کے فوارے چھوٹتے ہوئے اور اس نے گھبرا کے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ مگر نہ کھول سکا۔

پھر سروں کے ڈھانچے، جدھر دیکھو، جہاں دیکھو کاسۂ سر۔ زمین سے آسمان تک کاسۂ سر۔ پہاڑوں کی یخ بستہ چوٹیوں سے لڑھکتے ہوئے کاسۂ سر۔ دیواروں میں چُنے ہوئے کاسۂ سر۔ صنوبروں کی شاخوں سے جھانکتے ہوئے ڈھانچے اور کاسۂ سر۔ اور ایک زہر خند کے ساتھ تیمور بڑے زور سے کراہا۔

اب جو اُسے سہارا دے رہا تھا جاکو برلاس کا مضبوط اور قوی ہاتھ تھا۔ اُسے بستر سے اُٹھنے سے روک رہا تھا۔ اولجائی کے بال پریشان تھے اور اپنے سینے سے قرآن لگائے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو خشک ہو چکے تھے۔

وہ پھر غافل ہو گیا۔ اسے محسوس یہ ہُوا کہ وہ پستی کی طرف جا رہا ہے، وہ پست ہوتا جا رہا ہے۔ زمین کی گہرائیوں کی طرف، حشر کی طرف، نور نشور کی طرف۔ اس نے لبوں پر خشک زبان پھیرنا چاہی اور نہ پھیر سکا۔ اس نے کلمہ پڑھنا چاہا۔ لیکن کلمہ اُسے کسی طرح یاد نہ آیا۔ گویا ایک شیطانی طاقت تھی جو اُسے نیچے دھکیل رہی تھی۔ سامنے قرآن کو سینے سے بھینچے اولجائی خاتون آ کھڑی تھی۔ "میں نے اس خاتون کو اس سے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔" تیمور نے دیوانہ وار فیصلہ کیا اور اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی۔ میرا ایک دوست تھا۔ اس کی ایک بیوی تھی اور وہ بیوہ ہو گئی۔ اور وہ بیوہ ہو گئی۔ اور شاید وہ یہی خاتون تھی۔ اور اس نے کراہ کر ہذیان کے عالم میں پھر اُٹھنے کی کوشش کی اور جاکو برلاس کے آہنی بازوؤں نے اسے پھر جکڑ لیا۔ اور وہ جھنجلا کے راضی برضا پھر خاموش ہو گیا۔ اور اس دوست کا نام یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا جس کی بیوی بیوہ ہو گئی تھی۔

اور پھر تھوڑی دیر کے لیے سناٹا۔

دفعتاً دماغ پر پھر ہتھوڑے سے پڑے اور اس نے پھر اُٹھنے کی کوشش کی۔ جاکو برلاس نے اُسے پھر جکڑ لیا۔

بچوں کی طرح اس نے شکایت کی۔ "جاکو برلاس اتنی گرمی ہے اور اولجائی نے مجھے چادر اُڑھا رکھی ہے۔"

"امیر تمہیں تیز تپ ہے۔ خدا حاذق اور حکیم ہے۔ انشاء اللہ صبح تک اُتر جائے گی۔"

اس کا دل بے اختیار شطرنج کھیلنے کو چاہنے لگا۔ مگر اس نے شطرنج نہیں منگائی اور پھر غافل ہو گیا۔ اب خیمے کی چھت پر، دیواروں پر، قالینوں پر، بستر پر ہر طرف شطرنج کے مُہرے ہی مُہرے تھے۔ صنوبر کی لکڑی کے تختے، اور چینی فرزیں سمرقندی رُخ، تاتاری پیادے، عربی اسپ، ہر طرف سے شہ پر شہ پڑ رہی تھی۔ اور اس کی پیشانی کی رگیں اس طرح پھڑک رہی تھیں کہ گویا کوئی دم میں پھٹنے والی ہیں۔ اور جب اس نے اسی نیم غشی کے عالم میں دیکھا کہ اب کچلے ہوئے سروں کی وہ کثرت نہیں رہی۔ کچلے ہوئے سر اور کاسۂ سر اور ڈھانچے سرے سے غائب ہو گئے۔ ان کی جگہ شطرنج ہی شطرنج ہے۔ شطرنج کے مہرے ہی مہرے۔ بساط ہی بساط۔ لٹی ہوئی بساط، درہم ہوئی بساط۔ اور یہ کہ ساری دنیا بساط ہی بساط ہے تو اس کے تھکے ہوئے دماغ نے فتح کا نشہ محسوس کیا۔ اپنے آپ پر، بیماری پر، اپنے دشمنوں پر، ما و شما پر۔ یہ کہ کاسۂ سر سے لرزنے والے تیمور، پر شاطر تیمور، شہ مات دینے والے، شہ مات سے بچنے والے تیمور

نے فتح پائی ہے۔ اور اس کے دل میں ایک طرح کی پُرغرور حرارت پیدا ہوئی اور وہ پسینے میں شرابور ہو گیا۔

یہ جاکو برلاس کی آواز تھی جو اولجائی سے آہستہ سے کہہ رہا تھا، اس قدر آہستہ کہ تیمور سُن نہ پاتے "خاتون آغا امیر کو پسینہ بہت نکل رہا ہے۔ اب اللہ نے چاہا تو تپ اُتر جائے گی اور صبح تک جراح آجائے گا۔"

اولجائی خاتون آغا، پھر چراغ کے پاس جا بیٹھی۔ رحل پر اس نے کتابِ مجید رکھی اور چراغ میں چربی ٹپکائی۔ اور اس کی آنکھوں پر آنسو منجمد ہو گئے۔

تیمور کے خراٹے لینے کی آواز آنے لگی اور اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ سانس ایک طرح کی سسکی تھی اور خیمے پر سناٹا چھا گیا۔ درخت پر جو اُلّو شام سے چیخ رہا تھا اس نے بھی چُپ سادھ لی۔

اور پھر دفعتاً تیمور جاگ پڑا۔ اور اپنی آنکھیں اس نے جاکو برلاس پر گاڑ دیں۔ اس نے کہا "جاکو!"

"امیر"

"میں اس سے پہلے بھی یہاں آیا ہوں؟"

"نہیں امیر"

"میں یہاں آیا ہوں، دیکھو وہ کیا جیحون کے بہنے کی آواز آ رہی ہے۔ اُس دن میں چغتائیوں سے لڑ رہا تھا، پھر میں یہاں کیسے پہنچا؟"

اولجائی ساکت ہو گئی۔

جاکو برلاس نے کہا۔ "امیر یہ مشرقی سیستان ہے یہاں ہم سجستانیوں سے لڑ رہے تھے۔"

"اب مجھے کچھ کچھ یاد آ رہا ہے۔" تیمور نے کہا۔ "ہم پہاڑوں پر سے آئے تھے نا، جہاں کبھی برف پگھلتی ہی نہیں۔ بدخشاں کے پہاڑوں پر سے۔"

اور اولجائی نے اس طرح جیسے کوئی بچوں کو سمجھاتا ہے۔ اسے پُچکار کر کہا۔ "تیمور سو جاؤ۔ تمہیں نیند آجائے تو تمہارا بخار کم ہو جائے گا۔"

تیمور یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ لیکن کوئی اسے بتا نہیں رہا تھا۔ جاکو نمک حرام خاموش تھا اور اولجائی اُسے ڈانٹ رہی تھی۔ اس خاتون کو میں نے کہیں دیکھا ہے، اس سے پہلے میں یہاں کبھی آیا ہوں۔ پھر اُس نے سوچا کہ اسے کوئی نہیں بتائے گا، کچھ نہیں بتائے گا، کوئی کچھ نہیں بتائے گا۔ اور یہ کہ یہ ساری کوشش بیکار ہے اور اس پر پھر غنودگی طاری ہو گئی۔

پھر شطرنج ہی شطرنج تھی۔ زمین سے آسمان تک ہزار ہا مہرے۔ ستاروں کی طرح نیلے جاودانی آسمان پر بکھرے ہوئے جس کی چنگیز اور اس کے مغل پرستش کرتے تھے، گھوڑوں کی ایالوں میں گُندھے ہوئے مُہرے، ہزاروں، سپ، اشتر، رخ، لاکھوں پیادے، اور شہ مات شہ مات۔ ستاروں کو شہ مات، نیل فام جاودانی آسمان کو شہ مات، کاسۂ سر کو شہ مات۔۔۔۔

جاکو برلاس نے انگڑائی لی۔ اپنی تلوار کمر سے کھول کے تیمور کے زخمی پَیر کے قریب رکھ دی اور آنکھیں بند کر لیں۔

کہ اتنے میں ایک آواز آئی۔ ایک مانوس آواز۔ ایک پرند کی آواز۔ مگر یہ اُلّو کی آواز نہیں تھی۔ یہ مرغِ سحر کی آواز تھی۔ کسی مرغ کی آواز جسے گاؤں سے کوئی تاتاری سپاہی پکڑ لایا تھا، لیکن اسے اب تک ذبح نہیں کیا تھا۔

(۴)

جراح کی ساری کوشش کے باوجود کئی ہفتے گزر گئے اور تیمور کی ٹانگ سیدھی نہیں ہوئی۔ زخم بھرنے کے قریب ہوتا تھا، پھر یک لخت اس میں پیپ اور مواد پڑ جاتا اور رسنے لگتا۔ اور اب اس زخم سے سب کے سب اُکتا گئے تھے۔ تیمور سب سے زیادہ، اولجائی خاتون آغا سب سے کم، کم اس لئے کہ اس سے پہلے ابھی تک کبھی اس طرح تیمور اس کے اس قدر قریب اور اس کی ملکیت نہیں رہا تھا۔ اس زخم نے تیمور کو تلوار سے، کارزار سے، دشمنوں سے، دن رات کی تاخت و تاراج سے دُور کر کے اس کے قریب کر دیا تھا۔ اس وادی میں کوئی دشمن سجستانیوں کی فوج کی شکست اور پسپائی کے بعد سے نمودار نہیں ہوا تھا۔ سلطان حسین ابھی تک قندھار میں جما ہوا تھا اور اولجائی خوش تھی۔ اگر زندگی اسی طرح گزر جائے۔ روز صبح کو کہیں کُوچ نہ کرنا پڑے، روز دوپہر کو جھُلستی ہوئی دھوپ اور ریت سے نجات مل جائے۔ شام کو پہاڑوں کی یخ بستہ ہوا سے سابقہ نہ پڑے۔ ہر رات یہ اندیشہ نہ رہے کہ اب کسی نے دغا دی، اب کسی نے شبخون مارا۔ وہ ہو اور تیمور ہو، اور جہانگیر ہو، اور پھر وہ سوچتی کہ یہ خواب ناممکن ہے۔ ایک نہ ایک دن تیمور کی ٹانگ کا زخم اچھا ہو ہی جائے گا، جیسے اس کے ہاتھ کا زخم اچھا ہو گیا تھا۔ کس کمال سے پٹھان جراح نے ہاتھ کے زخم کو مالش کر کے ہڈیوں کو پھر سے جوڑ دیا تھا کہ اب کہیں زخم کا پتہ تک نہ تھا۔ مگر تیمور اپنی زخمی، پیپ سے رِستی ہوئی ٹانگ کے باوجود بے تاب تھا کہ پھر اپنے شبدیز پر سوار ہو، اور پھر تلواروں کا، شہسواروں کا، یخ بستہ ہوا کا، جھُلستی ہوئی ریت کا مقابلہ کرے۔ کیونکہ اولجائی کو معلوم تھا کہ امن کہیں نہیں، اور کبھی نہیں نصیب ہوگا۔ اس کی دنیا ہی ایسی تھی، جہاں انسان جنگل کے جانوروں کی طرح رہتے تھے' یا ایک دوسرے کی خوراک بنتے یا دوسروں کی خوراک چھین کر پیٹ بھرتے۔ کسی نے کسی وادی میں امن چاہا تو آج نہیں، آج سے مہینے بھر بعد سال بھر بعد کوئی دونوں سرمگیں چوٹیوں کے درمیان نمودار ہوگا۔ پہلے تپتی ہوئی وادی میں جہاں سجستانیوں سے لڑائی ہوئی تھی اپنا شکار ڈھونڈھے گا، اور پھر اس سرسبز وادی تک پہنچے گا، اور کچھ اور نہیں تو خیموں کی خاطر، قالینوں کی خاطر، مویشیوں، وادی کے خربوزوں، اخروٹوں، سردوں انگوروں کی خاطر حملہ کرے گا، بورتے ئی کی طرح اُسے اُٹھائے جائے گا، تیمور کو قتل کرے گا اور جہانگیر کو غلام بنائے گا۔ کیونکہ دنیا کا یہی دستور ہے۔

رات کو جب تیمور سوتا ہوتا، اس کے قدموں کے قریب شیر کی کھال پر پڑی پڑی، شیر کے سر کا تکیہ لگائے وہ یہی سوچتی رہتی۔

تیمور کو اب نیند آنے لگی تھی اور بخار بہت کم ہو گیا تھا۔ شام سے بخار آتا اور صبح تک اُتر جاتا، اور اب وہ پھر پہلے کی طرح خوب کھانے لگا تھا، یخنی اور تر بتر پلاؤ، اور اُبلا ہوا گوشت اور اس سبز وادی کے میوے۔ اُس کے چہرے پر ذرا ذرا سرخی آ گئی تھی جو دن کو صحت کی سُرخی ہوتی اور شام کو بیماری کی سُرخی بن جاتی۔ اور اب ذرا اطمینان ہو گیا تھا تو اولجائی نے قرآن مجید پڑھنا بھی کم کر دیا تھا۔ کبھی کبھی ضمیر ملامت کرتا تو وہ رحل سامنے رکھ کے بیٹھ جاتی۔ پھر جلدی سے کوئی آیت ختم کر کے خیمے کے باہر دیگوں کی طرف چل جاتی جہاں گوشت اُبل رہا ہوتا، یا جہاں جاکو برلاس کی نگرانی میں خچر کے دودھ سے نشہ آور کومیس تیار کی جاتی اور سپاہیوں میں تقسیم کی جاتی۔

رات کو لیٹے لیٹے وہ رات اُسے یاد آ جاتی، جیسی رات پھر کبھی نہ آئے گی۔ وہ رات پھر نہ آئے گی۔ وہ رات جو عورت کی زندگی میں ایک ہی بار آتی ہے، اور پھر کبھی نہیں آتی، جس رات وہ اس گھر کو چھوڑتی ہے جس میں وہ پیدا ہوئی، پلی، بڑھی، جوان ہوئی۔ جس رات وہ اپنے ماں باپ، بھائی بہن، بچپن کی ساتھ کھیلی ہوئی سہیلیاں، کنیزیں سب چھوڑتی ہے۔ وہ رات جب اس کی ایک زندگی کو موت آتی ہے، اور وہ ایک دوسرے گھر، دوسرے ماحول، دوسری زندگی میں پیدا ہوتی ہے، اور رات ہی بھر میں پیدا ہو کے، جوان ہوتی ہے، اور دوسری زندگی کی عادی ہو جاتی ہے۔ جس رات وہ لڑکی سے عورت بنتی ہے۔ ایک اجنبی سے پہلی مرتبہ ملتی

ہے، اسے پہلی مرتبہ دیکھتی ہے، اور اسی کی ہو جاتی ہے۔ اور وہ کہتی ہے میرا خواب میٹھا تھا یا جھوٹا تھا بہر حال اس کی تعبیر یہی ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔

جب اُس سے اُس کے نانا کازغان نے پہلی مرتبہ تاراگائی کے بیٹے تیمور کا ذکر کیا تھا تو وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ بلا کسی خاص وجہ، خاص لگاؤ، خاص خیال کے۔ اُس نے تیمور کو کئی بار دُور سے دیکھا تھا، وہ اس کے بھائی حسین کا دوست تھا۔ اُسے شہسواری، لڑائی، نیزہ بازی کا جنون تھا۔ ہُوا کرے۔ وہ اُسے ذرا ذرا وحشی سمجھتی تھی۔ اس کے نام کی طرح لوہا، فولاد، تلوار۔ لیکن تاتاری دوشیزاؤں کو اپنے مَردوں کا وحشی پن پسند تھا، اور یہ اس امر کے باوجود کہ اس کی تربیت ہرات ہی میں ہوئی تھی۔ وہ تورانی لڑکیوں کی طرح ہمیشہ بغیر نقاب کے پھرا کی۔ کانوں سے بڑے بڑے گوشوارے لٹکتے ہُوئے، دوہری چوٹیاں، کالی کالی، گندھی ہوئی، سینے پر سانپوں کی طرح لوٹتی ہوئی گہرا کالا، یا گہرا نیلا یا گہرا سرخ لبادہ۔ اُسے لڑائی اور انسان کے بہتے ہوئے خون سے نفرت تھی، لیکن شکار میں تیمور یا حُسین یا ایلچی بہادر یا برلاسوں میں سے کوئی اس کا مقابلہ کر کے دیکھ لے۔ اور پھر بھی اس وقت جب وہ اپنے آپ کو حلبی شیشہ کے آگے دیکھتی تو اپنے ہونٹ دانتوں سے کاٹ لیتی۔ کیونکہ وہ حسین تھی اور الھڑ تھی، مگر اسے اپنے حُسن کا ذرا ذرا سا غرور تھا۔ شاعروں کی طرح اس نے اپنے حُسن کو کبھی غزالوں سے تشبیہ نہیں دی تھی، اور اس نے سُنا تھا کہ جب وہ چودہ سال کی تھی تو اُس کے حُسن میں ہرات کے کسی شاعر نے قصیدہ لکھا تھا، مگر اس کے باپ نے سلطانِ ہرات سے شکایت کر کے اس کی زبان اور سیدھے ہاتھ کی اُنگلیاں کٹوا دی تھیں۔ ہاں اُس کا حُسن شکاریوں کا، شکاریوں کے خاندان کا حُسن تھا، جس سے گُریز، فرار ممکن نہ تھا۔

اور جب اس کے نانا کازغان نے اس سے تیمور کا ذکر کیا۔ "کبھی نچلا نہیں بیٹھتا، صبح، دوپہر، شام ایک شہر میں گزار نہیں سکتا، جب تک ایک دشمن کو قتل نہ کر لے رات کو سو نہیں سکتا۔ کئی کئی رات گھوڑے پر سوار چلا جاتا ہے اور ایک آدھ گھنٹے گھوڑے کی ایال پر سر رکھ کے سو جاتا ہے مگر رُکتا نہیں۔ میں نے تیرے لئے بڑا بانکا جوان ڈھونڈا ہے۔" تو اس کے رخساروں پر خون کی اور حیا کی سُرخی دوڑ گئی اور وہ الھڑ پن سے کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

اور اس پر کسی نشے سے چُور اس کی انگہ نے کہا تھا آج ہنس رہی ہے گویا حلوہ ملے گا۔ لیکن ایک دن آئے گا کہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کے روئے گی۔" اور یہ سُن کے اس کے دل میں مبہم سا شک، مبہم سا وہم اور مبہم سا غصہ پیدا ہوا تھا۔

اُسے یاد آیا کہ وہ کس طرح کازغان سے چھپ کے، اور انگہ کو ساتھ لے کے، سر پر سیاہ چادر اوڑھ کے، اور منہ کو چھپا کے شامانوں کے خیمے میں گئی تھی۔ کازغان کے اردو میں کچھ کچھ مغل شامان موجود تھے، مگر ان کا کہا ہُوا کفر اور زندقہ سمجھا جاتا تھا کیونکہ وہ ابھی تک بجائے خدائے واحد القہار کے نیلگوں جاودانی آسمان کی پرستش کرتے تھے، اپنے آباؤ اجداد کی طرح من کے کوکو تینگری سے مُرادیں مانگتے تھے اور ستاروں کی گردش سے فال نکالتے تھے، اور مستقبل اور تقدیر کا حال بتاتے تھے۔ وہ کبھی ایران سے آئی ہوئی انگوری شراب کو یا عراق سے آئی ہوئی کھجوروں کی شراب کو ہاتھ نہ لگاتے، خچروں کے دودھ سے خود نشیلی کومیس تیار کرتے، اور اس قدر پیتے کہ مدہوش ہو جاتے۔ اور کازغان نے انہیں صرف چغتائیوں کے خوف سے باقی رکھا تھا۔ مگر ان سے مشورہ کرنا کفر سمجھا جاتا تھا۔

ایک بوڑھے شامان نے اپنے نُکیلے، اونچے خیمے سے باہر نکل کے ستاروں کی طرف دیکھا تھا، ایک نیلگوں ستارہ جس کا اس نے ایغوری میں کچھ عجیب سا نام لیا، اور ایک سرخ انگارہ سا ستارہ جسے اس نے فارسی میں مریخ کہا۔ اور اپنے بوڑھے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اولجائی کے سر سے چادر ہٹا دی اور اس کے منہ کو دونوں ہاتھوں میں لے کے دیکھا۔ اور اولجائی پھر کھلکھلا کے ہنس دی۔

انگہ نے وہم اور خوف سے اُسے ڈانٹا "خاموش رہ"۔

اور بوڑھے شامان نے کہا۔ "اس چاند سی صورت کی تقدیر اس کی پیشانی پر لکھی ہوئی ہے، اور اس چاند کو دو ستاروں سے سابقہ پڑے گا۔ ایک تحسین ستارہ ہے جو اس کا اپنا ستارہ ہے اور جو چمکے گا، دمکے گا پھر چھپ جائے گا، اور ایک سرخ ستارہ، لال انگارہ ہے جو اسے آگ میں، برف میں، طوفان میں، زلزلے میں، بجلی کی چمک میں بادل کی کڑک میں ساتھ لئے لئے پھرے گا"

اولجائی کو بوڑھے شامان کی باتیں عجیب اور مضحکہ خیز معلوم ہوئیں۔ ہراتی مولانا نے اس کے دل میں ایمان کو راسخ کر دیا تھا۔ مگر انگہ دہشت اور وہم سے کانپنے لگی۔ اور اس نے کہا۔

"شامان۔ اس لڑکی پر رحم کر۔ اسے میں نے کھلایا اور دودھ پلایا ہے۔ اس کی تقدیر اچھی بتا"

اور قہقہہ لگا کے شرارت سے اولجائی نے بوڑھے شامان سے کہا، جس کے منہ سے کومیس کی بدبو کے بھپکے آرہے تھے۔ "ہاں بوڑھے شامان سچ سچ بتا، نہیں تو میں اپنے نانا سے کہہ کے تجھے کل دیوار میں چنوا دوں گی"

بوڑھے شامان نے آہستہ آہستہ سر ہلایا۔ اور کہا۔ "بیٹی تیری تقدیر تیری پیشانی پر لکھی ہے، اسے کوئی نہیں بدل سکتا"

یہ سن کے وہ گھوم گئی۔ اس نے اپنی چادر انگہ کے کاندھے پر ڈالی اور اسے گھسیٹتی ہوئی اپنے خیمہ کی طرف چلی۔

اور پھر وہ رات آئی جس دن، جس رات ایک زندگی ختم اور دوسری شروع ہوتی ہے، اور وہ یہ سوچ کے شرمائی اور خوش ہوئی کہ اسے اس رات کا انتظار تھا، گویا وہ اسی رات کے لئے پیدا ہوئی تھی، اسی رات کو اس کی تکمیل ہونے والی تھی۔

انگہ نے اسے گرم پانی سے نہلایا جس میں گلاب کی پتیاں پڑی ہوئی تھیں، اس کے بالوں میں یاسمین کا تیل لگایا جو جلائروں کے پاس ہند و سند کے بادشاہ نے تحفتاً بھیجا تھا، پھر ان بالوں کو بکریوں کے گرم گرم دودھ میں دھویا۔ پھر اسے سرخ سرخ چینی شہاب شعلہ جیسے سرخ ریشم کا ملبوس پہنایا جس پر سنہرے پھول کڑھے ہوئے تھے، اور جس کے حاشیوں پر چنار کی پتیاں روپہلے رنگ میں بنی ہوئی تھیں، اس کے سر پر زرتار کامدانی سے کاڑھی ہوئی جگمگاتی ٹوپی پہنائی جس میں لعل اور یاقوت ٹکے ہوئے تھے، اس کے چہرے اور اس کے ہاتھوں پر پسے ہوئے چاولوں کا غازہ لگایا اور اس کے ابرو پر نیلگوں سُرمے کی تحریر لگائی، جس کی وجہ سے اس کی لمبی پتلی ختائی آنکھیں چمک اُٹھیں اس کی پیشانی پر ستارہ آویزاں کیا۔ اور اس کی ماں، اور دوسری عورتیں اُسے وسیع شامیانہ میں لے آئیں جہاں تورانی عورتوں کا حلقہ الگ تھا اور جہاں شامیانے کے اس سرے پر مسند پر کازغان اور قاضی کے درمیان دولہا بیٹھا تھا۔ اس نے کنکھیوں سے تیمور کے پتلے اور گورے چٹے چہرے، اور رعب دار سیاہ پتلی سی داڑھی کو دیکھا اور دہشت سے کھلکھلا کر ہنسنا چاہا مگر پھر آنکھیں بند کر کے ہنسی ضبط کی، اور یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی کہ مرد عورتیں سب اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ اس کی ماں نے اس کی زرتار کلاہ پر سفید کلغی ٹھیک کی۔ نقارے پر چوب پڑی۔ دائرہ، چنگ، نے بجنے لگے۔ کنیزوں نے رقص کرتے کرتے مہمانوں کے لئے جام بھرنے شروع کئے۔ اور عورتیں زور زور سے باتیں کرنے لگیں۔

ایجاب و قبول کے وقت وہ ذرا شرمائی۔ کچھ کچھ سہمی۔ پھر ڈھیٹ ہو کے اس نے ہاں کہا، اور پہلی مرتبہ محبت سے تیمور کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر ہنسی نہ تھی، غصہ بھی نہ تھا۔ ایک عجیب طرح کی خشک متانت جو اس ریشم اور زر و جواہر سے لدی ہوئی دلہن کی سمجھ میں نہ آئی اور اس نے پھر ایک بار کھلکھلا کے ہنسنا چاہا اور بڑی مشکل سے ہنسی روکی۔

ایجاب و قبول کے بعد قاضی زین الدین نے اُسے دل کھول کے دعا دی۔ وہ جانتی تھی کہ قاضی کو تیمور سے بہت محبت ہے اور

یہ کہ جو دعا نکل رہی ہے وہ قاضی زین الدین کے دل سے نکل رہی ہے جو ان دونوں کا نکاح پڑھا کے پھولا نہیں سما رہا تھا، اس نے قاضی زین الدین کی نورانی صورت دیکھی، سپید عمامہ سرخ پیشانی، اور ناف تک لہراتی ہوئی سفید داڑھی۔ چوڑی سُرخ پیشانی پر سجدوں کا نشان۔ اور قاضی زین الدین کے الفاظ اُس کے دل میں کُھب گئے۔ "بیٹی تجھے اللہ تعالیٰ تیمور کے ساتھ خوش رکھے۔ تجھے پاکدامن بیوی اور مقدس ماں بنائے۔ تجھے دشمنوں سے پناہ میں رکھے۔ تیری عزت محفوظ رکھے۔ خدا تم دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لئے محبت ڈالے، تُو اس کی اطاعت کر، اور اس کے لئے سعادت مند بچے پیدا کر، جن میں چنگیزی جلائروں اور سمرقندی ترکوں کی شجاعت ہو۔

پھر اس کے بعد اس کے نانا کازغان نے کمال ہی کر دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا نانا اسے بہت چاہتا تھا، لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ اس قدر۔ اور وہ یہ کہ جب نوکر طلاکار خوان پوشوں سے ڈھکے ہوئے بڑے بڑے خوان لے کر آتے، اور کازغان نے ایک میز خوان پوش ہٹایا تو اس میں تقسیم کے لئے نُقل نہیں تھے، سچے موتی تھے۔ کازغان نے مٹھی بھر بھر کے موتی براتیوں میں پھینکے، اور تھوڑی دیر کے لئے سارا مجمع شور اور ہنگامہ کا مرکز بن گیا۔ لوگ جھپٹ جھپٹ کے قالینوں کے فرش پر دانہ دانہ موتی چُن رہے تھے۔ دائرے اور دف کی نوا دب گئی، اور چینی اور ترکمان کنیزیں رقص کرتے کرتے مبہوت ہو گئیں۔ موتیوں کے پہلے خوان کے بعد کازغان نے پھر دوسرا خوان اسی طرح کھولا اور لُٹا دیا۔ اور قاضی زین الدین جس نے کئی نکاح پڑھائے تھے لیکن ایسی دریا دلی نہ دیکھی تھی، اور نہ کبھی اس کی کازغان سے توقع کی تھی، بجائے ان موتیوں کو چُننے کے جو اس کی عبا میں آ گرے تھے۔ تسبیح کے دانوں پر کوئی دعا پڑھنے لگا۔

اولجائی خاتون آغا نے محسوس کیا کہ اس کی کان کی لَویں گرم ہو رہی ہیں" یہ کہ اندر سے اس کا سینہ دہک رہا ہے۔ فخر اور غرور سے۔ اور ساتھ ہی طبل پر چوب پڑی۔ جیسے جنگ کا اعلان ہوتا ہے۔ نقارے بجے۔ کازغان نے اشارہ کیا اور صراحیاں بھر بھر کے کومیس گشت کرنے لگی۔ اعلیٰ مہمانوں کے لئے انگور کی کشید کی ہوئی ایرانی شراب جو تبریز کے جلائروں اور صفہان اور شیراز کے بادشاہوں کے پاس سے تحفتاً آئی تھی۔ اور چینی چاول کی شراب۔ قاضی زین الدین نے سر جُھکا لیا۔

کومیس کا ایک بڑا سا گھونٹ پی کے کازغان اٹھ کھڑا ہوا، ذرا لڑکھڑایا، اور پھر ایک غلام کے کاندھے کا سہارا لیا۔ نوکر خلعتیں لئے ہوئے آگے بڑھے۔ کازغان کا قد اس مجمع بھر میں اور بھی اونچا معلوم ہوا، اس نے زور سے ڈکارلی اور پکار کے بُلایا۔ "بایزید جلائر"!

اولجائی نے اپنے چچا کو اُٹھتے دیکھا، اور تھوڑی دیر میں سمور کی بھاری خلعت جس کے حاشیوں پر زریں اطلس تھی اس کے کندھوں پر آ گری۔ جلائر شہزادے نے جُھک کے کازغان کے ہاتھ چُومے۔ اور پھر کازغان کی بلند بزرگ آواز نے پکارا۔

"حاجی برلاس"

اور اولجائی نے تیمور کے چچا کا اپنے چچا سے مقابلہ کیا۔ اپنے چچا میں مغل اکڑ اور شان اور شاہزادگی کا جو بانکپن تھا وہ حاجی برلاس میں نہیں تھا۔

کازغان نے پھر پکارا۔ "تاراگائی۔ تاراگائی برلاس" یہ تیمور کے باپ کا نام تھا۔ اولجائی نے اِدھر اُدھر نظر پھاڑ کے دیکھا۔ اس نے اپنے خُسر کے زُہد اور بزرگی کے متعلق بہت سُن رکھا تھا۔ یہ کہ وہ اور سب برلاسوں سے بہت الگ ہے۔ سب کی نظروں نے تاراگائی کو اِدھر اُدھر ڈھونڈھا۔ اور تیمور نے نظریں نیچی کر لیں۔ آج ہی صبح کو جب تیمور نے دو زانو ہو کے تاراگائی کی خانقاہ میں اس سے اپنی شادی میں شریک ہونے کی درخواست کی تھی۔ تو اس نے کہا تھا، "خدا تجھے زندہ اور خوش و خرم رکھے۔ لیکن جس دُنیا میں تو پھل پھول چننے کے

لئے باغ لگا رہا ہے۔ اس دنیا سے میں بارہ برس پہلے منہ موڑ چکا۔ بارہ برس سے میں نے اس خانقاہ سے باہر قدم نہیں رکھا۔ اور اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ تھی کہ ہم بھائیوں میں سے ایک اس دنیا کی فکر کرے، اور وہ تیرا چچا حاجی برلاس ہے اور ایک اُس دنیا کی۔ اور وہ میں ہوں۔ جا اور اپنی دُلہن کو لا کے اپنا خیمہ آباد کر۔ خدا تجھے خوش رکھے۔"

جب تیسری بار کازغان نے تاراگائی کا نام لیا تو قاضی زین الدین نے تسبیح اپنے زانو پر رکھ کر، اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔ کازغان وہ تجھ سے بڑے سردار کے دربار میں ہے۔ اور اسے اس کا قرب حاصل ہے۔ ہم سب دُنیا کے کُتے ہیں، ایک سردار کو یاد کرتے ہیں اور دوسرے کے دربار سے ٹکڑے مانگتے ہیں۔ وہ قطب ہے۔ اور اسے کسی اور سردار کے حضور میں حاضر ہونے کی ضرورت نہیں۔"

حاجی برلاس نے جلدی سے کہا "زین الدین۔ یہ عجیب بات ہے۔ میرے بھائی نے رہبانیت اختیار کی ہے جو بدھ مت والے کرتے ہیں یا عیسائی کرتے ہیں۔ ہمارے مذہب میں رہبانیت کہاں جائز ہے۔ اور تُو میرے بھائی کی حمایت کر رہا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی شادی میں شریک نہیں ہوا۔"

کومیس کا ایک اور جام ایک نوکر نے بڑھایا، اسے خالی کر کے کازغان نے سرُور کے عالم میں قہقہہ لگایا۔ اور ہچکی لے کے بے ساختہ ترکی میں کہا "دین ایری کارداش" بھائیو۔ مذہب کی باتیں چھوڑو۔ یہ شادی ہے، مناظرہ نہیں۔ اور پھر اس نے زین الدین کو خلعت دی۔ پھر مغل، جلائر، ترکمان، برلاس، قپچاق، ہراتی، خراسانی سردار آتے گئے، اور خلعتیں، مرصع کمر، تلواریں، طلائی نیام کے خنجر لیتے گئے۔ پھر کازغان مسند پر تیمور کے قریب بیٹھ گیا۔ اب سارے کے سارے مجمع پر نشہ کا عالم طاری تھا۔ لیکن اس نشہ میں کسی طرح کی بدتمیزی نہ تھی۔ آداب کا تقاضا یہ تھا کہ جب نشہ زیادہ ہو تو آدمی لڑکھڑاتا ہوا محفل سے باہر چلا جائے، حلق میں انگلیاں ٹھونس کے قے کر آئے، اور واپس آ کے پھر کومیس چڑھانا شروع کر دے۔ دائرے اور دف دھما دھم بج رہے تھے، اور نَے سے سُریلی صوفیانہ تانیں نکل رہی تھیں، اور جب حاضرین رقص و سرود کے منظر سے تھک گئے، تو کازغان نے اشارہ کیا۔ رقص کرنے والی کنیزیں جو تھک کے چُور ہو گئی تھیں، شامیانے کے اس حصے میں جا بیٹھیں جہاں تورانی عورتیں بیٹھی تھیں، اور براتیوں کے درمیان راوی آن بیٹھے۔ راوی اور داستان گو کچھ نظم میں کچھ نثر میں، کبھی ترکی میں کبھی ایغوری میں انہوں نے داستانیں شروع کیں۔

اور انہیں راویوں میں سے ایک نے بورتے ئی کا قصہ سُنایا۔ الجائی مبہوت ہو کے یہ قصہ سُنتی رہی، اور ایک نامعلوم ہراس اس کے دل پر چھانے لگا اور راوی کی آواز جو آدھی گانا تھی اور آدھی نثر اس کے کانوں میں گونجنے لگی:

"ابھی ایک پہر رات باقی تھی کہ جنگلی جانوروں کی جیسی چیخیں بلند ہوئیں۔ جیسے شیر آ گئے، جیسے ریچھ آ گئے، جیسے زلزلہ آ گیا، جیسے برکان کالدون کانپ گیا۔ کیونکہ دشمنوں نے حملہ کیا تھا اور وہ منگولوں کے مویشی اور اُن کی عورتیں ہانک لے گئے۔"

جب یہ قصہ ختم ہُوا تو وہ ذرا سوچ میں پڑ گئی۔ بوڑھے شامان کی آواز جس کے منہ سے کومیس کی بدبو کے بھبکے نکل رہے تھے، اور جس کے سامنے کے بڑے بڑے دانتوں پر کائی کی طرح زردی جمی ہوئی تھی، جس کی سفید مونچھیں بہت دُور تک اس کے گالوں پر لٹک رہی تھیں، جنہیں دیکھ کر متلی ہوتی تھی۔ "بیٹی تیری تقدیر تیری پیشانی پر لکھی ہے، اسے کوئی نہیں بدل سکتا۔"

پھر دوسرے راوی نے بورتے ئی کا دوسرا قصہ شروع کیا۔ وہ اور سب عورتیں ہمہ تن گوش ہو کے سُننے لگیں۔ یہ چنگیز کی دوسری شادی کا قصہ تھا۔ اور یہ قصہ مرکیت قبیلہ پر چنگیز کے دوسرے حملے کا بھی تھا۔ جب اس نے حملہ کے دوران میں بورتے ئی کے اغوا کا بدلہ لینے کے لئے مرکیت قبیلہ کی ایک دوشیزہ کُولان بغل میں ہاتھ ڈال کے اُٹھائی، اور اپنے گھوڑے پر ڈال لی۔ اور اُس نے کولان کو

اس قدر لطیف پایا، شیریں حلوے کی طرح، تازہ برف کی ٹھنڈک کی طرح، کہ اُسے بجائے اپنی کنیز کے اپنی دوسری بیوی بنا لیا اور اب وہ پریشان تھا کہ بورتے ئی کو اس کی اطلاع کیسے کرے۔

راوی کی آواز ڈنکے کی چوٹ کی طرح اُبھری۔ "خانِ اعظم چنگیز کے نو سردار تھے جو ترخان کہلاتے تھے ان نو کے نو سرداروں نے گدلے چشمے کا پانی پیا تھا۔ مٹیالے چشمے کا پانی پیا تھا اور قسم کھائی تھی، سوگند کھائی تھی نہ ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے اور چنگیز سے وفادار رہیں گے، چنگیز جو ابھی تموچین تھا۔ اور تموچین نے ان نو کے نو سرداروں کو ترخان کا نام دیا۔ وہ خانوں میں سب سے اونچے تھے اُن کی لُوٹ ان کی اپنی لُوٹ تھی۔ اور تموچین کا اس میں حصہ نہیں تھا، نو مرتبہ ان کی خطا معاف تھی اور دسویں خطا پر انہیں سزا ملتی۔ انہیں نو خون معاف تھے، اور دسویں خون پر سزا تھی کیونکہ تموچین کی یہی مرضی تھی اور یہی مرضی نیلگوں جاودانی آسمان کی تھی۔

"اور پھر تموچین نے نو کے نو ترخانوں کو بلایا۔ اور کہا تم میرے دوست میرے ترخان، جنہوں نے میرے ساتھ گدلے چشمے کا پانی پیا ہے اور سوگند کھائی ہے کہ جو مجھ سے بے وفائی کرے گا اور ایک دوسرے کا ساتھ نہ دے گا۔ وہ اس گدلے میلے چشمے کے پانی کی طرح گندا اور ناپاک ہو جائے گا۔ اب مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں۔ بورتے ئی میری بیوی ہے۔ جسے مرکیت پکڑ لے گئے تھے اور جسے میں مرکیتوں سے چھین لایا پھر میں نے مرکیتوں پر حملہ کیا اور کولان کو پکڑ لایا اور اسے اپنی دوسری بیوی بنایا کس طرح کولان کے ساتھ میں بورتے ئی کا کیسے سامنا کروں۔" اور وہ جو دنیا کے سب بہادروں کو نیچا دکھا سکتا تھا، جس نے چین فتح کیا، فرغانہ فتح کیا، ایک عورت کا سامنا کرنے سے ڈرتا تھا۔ تب تموچین نے ایک ایک کر کے نو کے نو ترخانوں سے پوچھ کہ کون پہلے جا کے بورتے ئی کو آگاہ کرے گا۔

تموچین نے پوچھا۔

"تم جیلمی؟"

"جیلمی وفادار تھا، مگر جیلمی کی گردن جُھک گئی۔"

"تم جے بے ئی؟"

"جے بے ئی نڈر تھا مگر اس کی گردن جُھک گئی۔"

"تم بوگورچی؟"

"بوگورچی چنگیز کا سب سے پہلا نوکر تھا مگر اُس نے گردن جُھکا لی۔"

"تم سورگان شیرا؟"

"سورگان شیرا بوڑھا اور وفادار تھا، اور اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کے تموچین کی جان بچائی تھی مگر اس نے بھی گردن جُھکا لی۔"

"تم مُوکُول؟"

"اور مُوکُولی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس نے کہا میں نے شیر مارے ہیں اور دشمن مارے ہیں اور بھیڑیوں کا خون پیا ہے۔ لیکن یہ کام سب سے مشکل ہے۔ یہ مشکل ہے لیکن میں جاؤں گا اور بورتے ئی سے بات کروں گا۔

"راوی نے سُنایا۔ کیا سُنا ہے کہ مُوکُولی اور نون ندی کے کنارے موڑ پر پہنچا جہاں مغل عورتیں مرکیتوں پر حملے کے بعد اپنے مردوں کی واپسی کا انتظار کر رہی تھیں، اور اس نے دیکھا کہ بورتے ئی تموچین کے خیمے کے آگے چمڑے کا تھیلا سی رہی ہے اور مُوکُولی

س کے آگے آ کے بیٹھ گیا۔ اور بورتے ٹی نے اس سے توچین کا حال پوچھا، پھر اس کا اپنا حال پوچھا اور پھر توچین کا حال پوچھا۔

" پھر موگولی نے جو سورما تھا اپنے دل میں کہا میں نے جنگلی سُور مارے ہیں، اور چیتا ا کا شکار کیا ہے۔ میں نے مرکیت مارے ہیں اور کوائت مارے ہیں۔ میں اس عورت سے کیا بات کروں۔ اس نے کہا بورتے ٹی سُن۔ پہلے سُن اور پھر بات کر۔ توچین جو تیرا اور میرا مالک ہے اس نے چیتے کی کھال کے خیمے میں عیش کیا ہے۔ اس نے چیتے کی کھال کے رنگ برنگ رنگ میں عیش کیا ہے۔ اس نے بے حیائی کی ہے۔ اور رات کے اندھیرے کا تفکر نہیں کیا، اور کولان کو نئی بیوی بنایا ہے۔

" پھر موگولی نے بورتے ٹی کی طرف دیکھا۔ اور بورتے ٹی نے سر جھکا لیا۔ اور بورتے ٹی نے کہا۔ موگولی سُن اور توچین سے جا کے کہہ دے، جو تیرا اور میرا مالک ہے۔ اس سے کہہ دے . . . .

" راوی نے سُنا ہے، کیا سُنا ہے کہ بورتے ٹی نے موگولی سے کہا، توچین سے کہہ دے کہ وہ میرا اور سب کا مالک ہے۔ وہ دہ ادنان اور کیرولین کا اور ان ندیوں کے کنارے کی گھانس کا مالک ہے۔ اس گھانس میں بہت مرغابیاں اور بطیں ہیں۔ کہہ دے کہ بورتے ٹی کہتی ہے مالک کو اختیار ہے کہ جتنی مرغابیاں چاہے شکار کرے، جتنے چاہے تیر چلائے۔ اور پھر موگولی اپنے خیمے کے اندر جانے لگی اور پلٹ کے اس نے موگولی سے کہا۔ موگولی اپنے مالک سے کہہ دے میرے خیمے میں کولان کے لئے جگہ نہیں۔ اس کے لئے الگ خیمہ کھڑا کرے :

دو تین بوڑھے تاتاری برابر راوی کو ٹوکتے جا رہے تھے کہ اب کیا بکواس کر رہا ہے۔ یہ بول یوں نہیں یوں ہے۔ اور راوی ان کی پروا کئے بغیر برابر پڑھتا، گاتا جا رہا تھا۔ ادلجائی خاتون آغا یہ کہانی سُن کے ذرا سناٹے میں آگئی اور اس کے کان گرم ہو گئے۔

اب دعوت ختم ہوئی۔ گھوڑوں اور گایوں کی تلی ہوئی رانوں سے اور چاولوں سے بھرے ہوئے طبق کے طبق خالی ہو چکے تھے۔ اُبلے ہوئے میمنوں کی ہڈی ہڈی چوسی جا چکی تھی۔ شہد میں ڈوبی ہوئی جو اور گندم کی نان ختائیاں ختم ہو رہی تھیں اور نوکر خوان بڑھا رہے تھے۔ مہمانوں نے ڈکاریں لیں، اور گرم پانی سے ہاتھ دھو کے وداع کا انتظار کرنے لگے۔

نقاروں پر پھر چوٹ پڑی جیسے جنگ کا آغاز ہو۔ تیمور مہمانوں کے درمیان اُٹھا، بلند بالا، خوب رُو، سرخ و سفید چھریرا شہسواروں کا سا بدن، ہلکی کالی داڑھی اور پتلی پتلی مونچھیں۔ اور فرش کے کنارے پہنچ کے اس نے اپنے سفید عرب گھوڑے کے پٹھے پر ہاتھ رکھا۔ اس کی لگام اپنے ہاتھ میں لی اور مہمانوں کے درمیان اپنے بادپا رہوار کو موٹے نرم بخارائی قیلیں پا قالینوں پر لے آیا۔ مہمان اس کے اور اس کے گھوڑے کے لئے راستہ چھوڑنے لگے۔ ادلجائی جو چنگیز کی دوسری شادی کی کہانی سُن کر ابھی تک دم بخود تھی، اب سر سے پیر جوانی کی آگ میں سُلگ اُٹھی۔ تمام ہراس غائب ہو گیا اور اس میں غزالانِ توران کی ساری رعنائی آگئی۔ عورتوں نے اس کے سر سے زرتار کامدانی ٹوپی اتاری جس پر لعل اور یاقوت ٹنکے ہوئے تھے۔ جس پر طاؤس کے پروں کی کلغی لگی تھی۔ اس کا چیتے کی سمور کا خلعت اُتارا اور اب وہ شہاب جیسے سُرخ ریشم کے کاڑھے ہوئے لبادے میں دلہن اور دوشیزہ رہ گئی اور پریوں کے ہجوم میں شرما گئی، اور اس نے اپنی گردن جھکا لی۔ کازغان نے اسے گلے سے لگایا۔ اور اس کی پیشانی چومی اور اس کی آنکھوں سے کچھ خوشی، کچھ غم، کچھ زبردستی کے آنسو اُبل پڑے۔ تیمور نے دونوں شانے پکڑ کے ادلجائی کو ہوا میں اُٹھا لیا، اور اپنے سفید بادپا رہوار کی سنہری زین پر بٹھا لیا۔ مہمانوں میں مبارکباد کا شور بلند ہوا۔ جنگی نقاروں پر اسی طرح چوٹ پڑتی رہی، اور تیمور کا رہوار بڑی رعنائی سے تیمور کے خیمے کی طرف روانہ ہوا۔ گویا اسے اپنے نازک اور حسین بوجھ پر ناز تھا اور دونوں کی لگام تیمور کے ہاتھ میں تھی۔

یہ سب الجائی خاتون آغا نے یاد کیا، اور مسکرائی۔ اس نے چراغ کی لو بڑھائی اور تیمور اور جہانگیر کی طرف دیکھا۔ اور بورتے ئی کے متعلق سوچا اور اونگھنے لگی۔

اس رات کو، جس رات اس نے ایک زندگی چھوڑی اور دوسری شروع کی، جس دن ایک الجائی مری اور دوسری پیدا ہوئی جوان ہوں اور وہ الجائی بن گئی جو وہ آج کی رات بھی ہے، آج کی رات جب کہ تیمور، نجر بہادروں کے درمیان اس دودھ پیتے زخمی پڑا ہے۔ بورتے ئی۔۔۔

تقدیر اور قدر، تیمور اور جہانگیر کی طرح خراٹے لے رہے تھے۔ ورنہ وہ الجائی خاتون آغا کو سمجھا دیتے کہ اس کا یہ محض وہم ہے اور یہ کہ بوڑھے شامان نے جو کچھ کہا تھا وہ کچھ اور تھا۔ اور یہ کہ بورتے ئی کی تقدیر اور تھی اور اس کی تقدیر اور ہے۔

کیونکہ بہت سی خطرے کی گھڑیاں آئی تھیں اور گزر گئی تھیں، مثلاً وہ بھیانک رات جب جہانگیر پیدا ہوا تھا، جس کا نام پیدا ہونے سے پہلے ہی تیمور نے جہانگیر رکھ دیا تھا اور کہا تھا کہ میں نہیں تو یہ میرا بیٹا ساری دنیا فتح کرے گا۔ وہ بھی ابھی ہوش میں آئی تھی اور ابھی ابھی اس نے ماں بننے کا وہ لطیف جذبہ، وہ نادر محبت محسوس کی تھی جو اور کسی نوع اور کسی طرح حاصل نہیں ہوتی۔ جب اس نے اپنی زندگی، جسم، روح کو پارہ پارہ چاک چاک کر کے ایک نئی مٹی کی جاندار صورت بنائی تھی، ایک کھلونا تیار کیا تھا۔ اور اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ اور تیمور اس کے قریب کھڑا تھا۔ اس بھیانک اندھیری رات کو اس نے دستک کی ایسی آواز سنی جو کمزور تھی مگر جس کو سن کر اس کا دل دہل گیا۔

اور اندھیرے میں کوئی تیمور کو، کازان کے ہزار لشکروں کے سردار کو دبے دبے مگر ڈرے گھبرائے ہوئے لہجے میں پکار رہا تھا "بلند باشی امیر تیمور برلاس!"

یہ قاضی زین الدین کا نقیب تھا۔

اس نے قاضی زین الدین کو تیمور سے کچھ کہتے ہوئے سنا۔ قاضی کی آواز تھرائی ہوئی لرزتی ہوئی تھی۔ کسی نامعلوم خوف سے الجائی کا دل بیٹھنے لگا۔

"میں ابھی جاتا ہوں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن" اس نے تیمور کی گرجدار آواز سنی۔ پھر اس نے تیمور کو کہتے سنا۔

"حضرت قاضی زین الدین میرے بچے کے کانوں میں اذان دے دیجئے گا!"

اس نے تیمور کو تلوار لگاتے، ڈھال باندھتے، خود پہنتے دیکھا۔ وہ چاہتی تھی کہ خود اٹھ کر تیمور کو مسلح کرے۔ لیکن وہ اپنے نرم بستر سے اٹھ نہ سکی۔

تیمور نے آ کے اس کا ہاتھ دبایا۔ اس کے رخسار کو چوما۔ انگلی سے بچے کی ٹھوڑی کو چھیڑا، جسے الجائی گود میں لئے بیٹھی تھی اور بغیر کچھ کہے خیمے سے باہر نکل گیا۔

قاضی زین الدین نے ہلکی سی دستک دی، اور خیمے کے اندر آ کے بچے کے کان میں اذان دی۔ اور پھر الجائی سے پوچھا۔ "بیٹی تو کیسی ہے؟"

"زین الدین بابا اچھی ہوں!"

اور وہ یہ پوچھتے ہوئے ڈرنے لگی کہ کیا ہوا۔ کیا حادثہ پیش آیا، کیا مصیبت پیش آئی۔ تیمور کہاں گیا، اور کیوں گیا۔ کہ کسی دشمن

نے حملہ کیا؟ چغتائی مغلوں نے، قپچاقیوں نے، شاہ ہرات نے؟ مگر کہیں گھوڑوں کی ٹاپوں، چیخوں، ہتھیاروں کی آواز نہیں آئی تھی۔ تیمور نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا اور آخر اس سے رہا نہیں گیا، اس نامعلوم خوف سے وہ چھٹکارا پانا چاہتی تھی، انگہ نے اُسے گرم دودھ کا جو پیالہ دیا تھا وہ ختم کرکے اس نے کمزور، نیم مُردہ آواز میں پُوچھا

"زین الدین بابا۔ کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں بیٹی۔ جو خدا کی مرضی ہوتی ہے۔ وہی ہوتا ہے۔ جو اس کی مصلحت ہوتی ہے وہی جانتا ہے، اب ماوراء النہر میں امن نہیں رہے گا"

"مغلوں نے حملہ کیا ہے؟"

"نہیں۔ مگر اب شاید کریں گے۔ انہیں روکنے والا کوئی نہیں رہا۔"

اچانک جیسے چمک ہوئی، جیسے بجلی گری۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "میرے نانا۔ میرے نانا مر گئے۔ مجھے کیوں نہیں بتاتے کہ میرے نانا قزغان مر گئے۔ مجھ سے تم سب کیوں چھپا رہے ہو۔"

قاضی زین الدین نے اس کے سر پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا، تسبیح والا ہاتھ۔ اس کی ایک چوٹی مخمل کے تکیے کے اس پار لٹک رہی تھی، دوسری اس کے سینے پر اس کی سسکیوں میں لرز رہی تھی۔

قاضی زین الدین کی ضعیف پیلی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ انہوں نے ایک آہ بھری اور کہا۔ "یہی اس کی مصلحت ہے۔ کوئی مرتا ہے، کوئی پیدا ہوتا ہے۔ کسی کا کوچ ہوتا ہے، کوئی منزل پر پہنچتا ہے۔ یہی اس بچے کی پیدائش کا دن بھی ہے۔"

روتے روتے میں الجائی نے کروٹ بدلنے کی کوشش کی اور بدل نہ سکی۔ اس نے کہا۔ "قاضی بابا۔ کل تک تو میرے نانا اچھے تھے۔ کل تو وہ جیحون کے اس پار شکار کھیلنے گئے تھے۔ کیا انہیں کسی جانور نے ہلاک کر دیا؟"

مثنوی مولانا روم کے کچھ شعر قاضی زین الدین کو یاد آ گئے۔ اور انہوں نے ایک عجیب طرح کا سکون محسوس کیا، یہ سکون اس لڑکی تک پہنچانا ضروری تھا۔ اور وہ کہنے لگے کہ روح بدن ہے اور جسم ملبوس۔ جس نے ملبوس کا خلعت عطا کیا تھا۔ اسی نے واپس چھین لیا۔ کس طرح چھینا، یہ اس کا اپنا معاملہ ہے۔ مگر مجھے یہ معلوم ہوا کہ تیرے نانا کو شہادت نصیب ہوئی۔ دو جلائر سرداروں نے اسے شکار کے درمیان میں قتل کیا، اور مجھے تو شبہ ہے کہ اس قتل میں تیرے چچا بایزید جلائر اور تیمور کے چچا حاجی برلاس کا بھی ہاتھ ہے۔"

اس نے صرف اتنا کہا: "جن لوگوں نے میرے نانا کو قتل کیا ان پر اللہ کی لعنت۔"

قاضی زین الدین نے کہا۔ "بہت سے امرا کہتے تھے کہ شاہ ہرات کو قتل کرکے اس کا سارا مال و متاع لوٹ لو۔ اور تیرے نانا کا کہنا تھا کہ تاوان لے کے اُسے چھوڑ دو۔ اس نے ہرات کے ملک کو چھوڑ دیا۔ اس لئے کہ اس نے تیرے باپ پر بڑے احسانات کئے تھے اور تیری تعلیم ہرات میں ہوئی تھی۔ ان لالچی سرداروں نے قزغان کو تہ تیغ کر دیا۔ اور اب تیمور اس کی لاش لانے جیحون کے اس پار گیا ہے۔"

بے چینی اور نیند کے عالم میں الجائی نے وہ بھیانک رات یاد کی جب اسی خیمے میں، جس میں چند ساعت پہلے جہانگیر پیدا ہوا تھا، اس کے نانا کی خون آلود لاش لائی گئی اور خیمے کے باہر زین الدین نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اب صبح ہو رہی تھی اور اس کا سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ اس کا جسم کچا تھا۔ اور نوزائیدہ بچہ بلک بلک کے رو رہا تھا۔

اور پھر تیمور اور اس کے ساتھی مسلح ہو کے قاتلوں کی تلاش میں نکلے۔ اور کئی دن غائب رہے تھے۔ ان برلاس تاتاریوں نے سوگند کھائی تھی کہ جب تک قاتلوں سے انتقام نہ لیں گے اس آسمان کے نیچے نہ آرام کریں گے، نہ سوئیں گے، بس آسمان کے نیچے ان کے عزیز کا قتل ہوا ہے۔ وہ جیحوں پار کر کے اس طرف پہنچے اور دشت اور صحرا کو چھان مارا اور بالآخر بدخشاں کی پہاڑیوں میں قاتلوں کو جا لیا۔

اور تیمور کی واپسی یاد کر کے اس کا دل فخر سے دھڑک اٹھا۔ وہ سر سے پیر تک خاک سے اٹا ہوا تھا، اس کا رنگ دھوپ میں سواری کرتے کرتے سانولا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں نیند کے فقدان سے پتھرا گئی تھیں اور اپنے خیمے میں آ کے پہلے وہ دنبے کی بھونی ہوئی ران پر اور پھر اپنے بستر پر اس طرح گرا کہ اسے کسی اور چیز کا ہوش ہی نہیں رہا۔ اس نے اولجائی کی طرف دیکھا تھا، اور نہ جہانگیر کی طرف وہ گھنٹوں، ڈیڑھ دن مُردوں کی طرح غافل سوتا رہا۔

اور تب اولجائی کو اندازہ ہوا کہ اُسے تیمور سے اتنی محبت ہے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔

اس پر پھر غنودگی طاری ہوئی، مگر وہ سو نہ سکی۔ اب خیمے میں صبح کا ٹھنڈا ٹھنڈا نور چھت کی جالی، اور درزوں سے داخل ہو رہا تھا۔ اس نے کلبلا کر کروٹ بدلی۔ کہ اتنے میں غیر متوقع طور پر اس نے تیمور کی آواز سنی جس میں گرج کے ساتھ عشق کی گھلاوٹ تھی۔

"اولجائی تو رات بھر سوئی نہیں!"

"تمہیں کیسے معلوم!" اس نے سر اٹھا کے پوچھا۔

"تیری آنکھوں میں بے خوابی کا نشہ ہے!"

بہت کم تیمور اتنی شاعری کرتا تھا۔ اولجائی ہنس پڑی۔

"اولجائی تیرے دانت بہت خوبصورت ہیں!"

وہ خوش ہوئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ اس نے کہا "تمہارا زخم کیسا ہے!"

جھنجھلا کر تیمور نے کہا "ویسا ہی ہے۔ میں اب ضرور اٹھ کر گھوڑے پر بیٹھوں گا!"

"ابھی نہیں۔ ابھی نہیں!" اولجائی نے خوشامد کے لہجے میں اسے منع کیا۔ "تمہارے لئے یخنی لے آؤں!"

تیمور نے جواب نہیں دیا۔

یخنی پی کے پشت دست سے تیمور نے منہ پونچھا۔ پھر اولجائی سے پوچھا:

"اولجائی تو سوئی کیوں نہیں؟"

"میں سوچ رہی تھی!"

"عورتیں ہمیشہ سوچتی رہتی ہیں۔ تو کیا سوچ رہی تھی؟"

اولجائی کے کان کھڑے ہوئے "کون عورتیں سوچتی رہتی ہیں!"

"کوئی نہیں۔ میں اور کسی عورت کو نہیں جانتا۔ تو سوچتی رہتی ہے!"

اولجائی کی شکن جیسے رفع ہو گئی۔ "یہ ہماری اپنی شطرنج ہے!"

"تو کیا سوچ رہی تھی؟"

اب سوال میں ذرا سا حاکمانہ رنگ تھا۔

اولجائی نے کہا۔ "میں اپنی شادی کی رات کی باتیں یاد کر رہی تھی۔ پھر میں نے نانا کازغان کی موت کی رات یاد کی۔"

"یہ تو یاد ہوئی۔ سوچ نہیں ہوئی۔"

"میں بورتے ئی کے متعلق سوچ رہی تھی۔"

"وہ کون؟"

"چنگیز کی بیوی، بورتے ئی۔"

تیمور ہنسا۔ "اولجائی تُو دیوانی ہے۔ میں نے تجھ سے کتنی بار کہا راویوں سے قصے نہ سُنا کر۔"

اولجائی نے کہا۔ "بورتے ئی کو مرکیت پکڑے گئے تھے۔"

"پکڑے گئے ہوں گے۔ تجھے اس سے کیا؟"

"مجھے وہ دن یاد آتا ہے جب تم نے مجھے کنوئیں میں چُھپا دیا تھا۔ جب دشادنے حُسین کو اپنا گھوڑا دیا تھا، ورنہ وہ مارا جاتا جب چغتائی ہمارا پیچھا کر رہے تھے۔ اُس دن اگر تم نے مجھے کنوئیں میں نہ چُھپا دیا ہوتا تو دشمن مجھے پکڑے جاتے۔ میں کہیں کی نہ رہتی۔"

اور بیمار زخمی تیمور نے زور سے زمین پر گھونسہ مار کے کہا۔ "جس دن تجھے کوئی پکڑ کے لے جائے گا اس دن میں اس دُنیا کو تہس نہس کر ڈالوں گا اور کسی ذی روح کو زندہ نہ چھوڑوں گا۔"

(۵)

وہ جس نے زمین پر گھونسہ مار کے اعلان کیا تھا کہ کسی ذی روح کو زندہ نہ چھوڑے گا، جرثوموں کی زبان سے ناآشنا تھا۔ اس کی ٹانگ میں جو زخم تھا اس میں لاکھوں کا پڑاؤ تھا۔ اس میں دق کے جرثوموں کا جرار لشکر تھا، اور طرح طرح کے اور جراثیم تھے جن کی پسلیوں سے نائیوں کے اندر ہزارہا آدم ہزارہا حوّائیں پیدا ہوتیں۔ اور جراح حیران تھا کہ یہ زخم بھرتا کیوں نہیں۔

وہ جس نے انسانوں کی بستیاں تہس نہس کرنے کی دھمکی دی تھی خود اس کی ہڈی، گوشت خون میں دشمن موجود تھا اور اس کے خلاف ہر رات بخار کی شکر آرائی کرتا۔ تیمور اس دشمن سے بے خبر تھا، اور بے خبر رہا، یہاں تک کہ بخار کم ہوتا گیا، طاقت آنے لگی، وہ زیادہ کھانے لگا، اُسے زیادہ بھوک لگنے لگی۔ جراح اور قندھار کے ایک طبیب نے اُسے معجون دیے، ایک کُشتہ کھلایا جو موافق آگیا، وہ اُٹھ کر گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھنے لگا، پھر وہ اولجائی یا جاکو برلاس کے سہارے اُٹھ کر کھڑا ہونے کے قابل ہوگیا، مگر اُسے چلنے میں تکلیف ہوتی، عصا کے ساتھ بھی۔

اولجائی منع کرتی ہی رہی۔ ایک دن اس نے ایلچی بہادر سے اپنا شبدیز منگوایا۔ اس پر زین کسوائی۔ سوار ہونا چاہا، سوار نہ ہو سکا، زمین پر گر پڑا۔ وہ جو آج تک کسی کی موت پر رویا نہ تھا، بے اختیار زار و قطار رونے لگا۔ لیکن اس نے ایلچی بہادر کے گلے میں ہاتھ ڈال اور کہا، مجھے اُٹھا کر زین پر بٹھا دو۔ اور جب وہ زین پر بٹھا دیا گیا تو جم کر بیٹھا، گھوڑا اس کے قابو میں تھا، اگرچہ اس کی اپنی ٹانگ اس کے قابو میں نہ تھی۔ اور اس کے بعد پھر کبھی وہ گھوڑے پر خود سوار نہ ہو سکا، ہمیشہ سوار کرایا گیا۔ جرثوموں کی یہی مرضی تھی کہ دنیا کا سب سے بڑا شہسوار ان کے سامنے مجبور ہے۔ اور تیمور جرثوموں کی زبان سے بے خبر تھا۔ ابھی تک خوردبین کی آنکھ نے دیکھنا نہیں شروع کیا تھا۔ اور اسے صرف مشیتِ ایزدی پر غصہ تھا، جس نے اُسے ہمیشہ کے لئے لنگڑا کر دیا تھا۔

اس نے دیکھا کہ ہر سپاہی کی نظر اس کی لنگڑی ٹانگ پر پڑتی۔ اس کی اس نے پہلے پروا نہ کی۔ پھر ایک دن جب اس کا گھوڑا ایلچی

بہادر کے خیمے کے پاس سے گزر رہا تھا اس نے ایک ترکمان سپاہی کو دیکھا کہ اس کے گزر جانے کے بعد اس نے اپنے ساتھی سے اس کا نام تیمور لنگ کہہ کر لیا۔ اور تیمور کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے اسی وقت لگام کھینچ لی۔ اور ڈانٹ کر ایلچی بہادر کو حکم دیا کہ اس ترکمان کی کھال کھینچ لی جائے۔ اس کی لاش تین دن تک وہیں پڑی سڑتی رہی، اور اس پر مکھیاں بھنبھناتی رہیں اور جنگلی کتے اور گدھ دوڑتے رہے۔ پھر تمام سپاہیوں کے دل میں اپنے آقا کے لئے تعظیم اور ہیبت کا جذبہ پیدا ہوا۔ اور اس واقعہ کے کچھ روز بعد، وہ جانی روکتی ہی رہی، مگر اس نے گھوڑے پر جم کے کوچ کا حکم دے دیا۔

ایک معمولی سا تیر تھا، خدنگِ جستہ، میدانِ حرب میں اتنا عام جیسے گھر میں سوئی اور تاگہ۔ لیکن اس نے زندگی، زندگیوں کی، کی دنیا کی انسان آبادی کی کایا پلٹ دی۔ اب قاضی زین الدین سے کون پوچھے کہ اگر علم قلندری کا خلاصہ یہی کچھ تھا تو لب خاں خلاصہ تھا۔

اگست ۱۹۵۴ء

## آئینہ در آئینہ

اس بار وہ ملا تو عجب اس کا رنگ تھا — الفاظ میں ترنگ نہ لہجہ دبنگ تھا
اک سوچ تھی کہ بکھری ہوئی خال و خط میں تھی — اک درد تھا کہ جس کا شہید انگ انگ تھا
اک آگ تھی کہ راکھ میں پوشیدہ تھی کہیں — اک جسم تھا کہ روح سے مصروفِ جنگ تھا

میں نے کہا کہ یار تجھے کیا ہوا ہے یہ — اس نے کہا کہ عمرِ رواں کی عطا ہے یہ
میں نے کہا کہ عمرِ رواں تو سبھی کی ہے — اس نے کہا کہ فکر و نظر کی سزا ہے یہ
میں نے کہا کہ سوچتا رہتا تو میں بھی ہوں — اس نے کہا کہ آئینہ رکھا ہوا ہے یہ

دیکھا تو میرا اپنا ہی عکسِ جلی تھا وہ
وہ شخص میں تھا اور حمایت علی تھا وہ

---

عکس تحریر: حمایت علی شاعر

# حسن کی دیوی

سید فیاض محمود

اس نے حسن کی دیوی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں دیوی کے تاہرانہ جلال کو دیکھ کر چندھیا گئیں۔ وہ سمجھا کرتا تھا کہ حسن، لطافت، ملائمت اور رحم کی صفات سے مرکب ہے مگر اس نے دیکھا کہ دیوی کی خشم گیں نظریں بھالے بن بن کر اس کے دماغ کے پار ہو رہی تھیں۔ دیوی کا عطر بیز لبوں کا ہیکرہ تھا اور نہ ہی اس کے ہونٹوں پر محبت آمیز مسکراہٹ تھی جس کا ذکر وہ سنتا آیا تھا۔ ایک تبسم دیوی کے لبوں پر ضرور کھیل رہا تھا مگر اس تبسم میں اگر استہزا نہیں تو طنز ضرور تھی اور وہ تبسم اس کے لبوں تک ہی محدود نہ تھا۔ اس تبسم کا عکس اُن آنکھوں میں نہیں جھلکتا تھا۔ جس کی تعریف میں شعرائے مشرق و مغرب صدیوں سے ترانے گا رہے تھے۔ صبح کے دھندلکے میں دیوی کی جھلک ایسی واضح تھی کہ اس کے ذہن میں دیوی کا جلوہ، ایک مرتعش نقش بن کر رہ گیا۔ اس نے آنکھیں ملیں، دیکھا کہ صبح صادق کے آثار مشرق سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ وہ بستر سے اُٹھ بیٹھا۔

اُسے گزشتہ رات اچھی طرح نیند نہ آئی تھی خیالات ہی کچھ ایسے پریشان سے تھے۔ دوستی بھی عجیب چیز ہوتی ہے خصوصاً اُس کے لیے جسے اس کی قدر ہو۔ اس کا بچپن کا ساتھی نعیم ایسی اُلجھن میں پھنسا ہُوا تھا کہ اس کے دوست بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ خصوصیت سے وہ شخص جو اُسے بیس سال سے جانتا تھا، جو بچپن سے اس کے ساتھ کھیلا پڑھا جس نے اُس کے خیالات، اُس کے راز، اُس کے دُکھ اُس کی خوشیاں، اُس کے ارادے، تمنائیں سبھی کچھ میں شرکت کی اور مدد دی۔ نعیم کبھی بھی دُنیا کے مقابلہ کی طاقت نہ رکھتا تھا۔ یہ نہیں کہ وہ جسمانی طور پر کمزور تھا یا یہ کہ وہ بیمار رہتا تھا یا اُس میں کسی دماغی یا ذہنی قوت کی کمی تھی۔ بلکہ اس کے اس میں چند ایک صفات ایسی تھیں جو اُسے اور لوگوں سے ممیز کرتی تھیں اور اس کے دماغ میں ایک عجیب قسم کا اُجالا تھا جس سے دوست دشمن سبھی متاثر ہوتے تھے۔ مگر نعیم دُنیا اور دُنیا والوں کو سمجھ نہیں سکتا تھا، اِسی لیے ہر ملنے والا دوست اور ہر کوئی جو اُس کی ذرا سی بھی مخالفت کرے اس کا دشمن تھا۔ نعیم کی دُنیا میں فقط دو رنگ تھے، سفید اور سیاہ۔ کچھ لوگ ایسے صاف شفاف اچھے، پسندیدہ معلوم ہوتے تھے۔ اکثر لوگ جن سے ان کا واسطہ نہ بھی ہوتا تھا۔ اسے بے عیب ہی نظر آتے۔ اسے کبھی وجہ نظر نہ آتی کہ وہ اُنہیں سمجھنے کی کوشش کرے۔ ان کے خفیہ خیالات، اُن کی اپنی دلچسپیاں، رنج و غم کی کہانیاں، ذاتی پیچیدگیاں کبھی اسے پریشان نہ کرتیں۔ نہ وہ کرید کرید کر دوستوں سے ان کے راز دریافت کرتا اور نہ وہ اُن کے جھگڑوں، تعلقیوں، ضرورتوں، حاجتوں کو گہرے طور پر محسوس کرتا۔ یہ نہیں کہ وہ خود سطحی قسم کا آدمی تھا۔ وہ دوستوں کا عاشق اور ہمدردی کا پتلا تھا۔ اپنے دوستوں کی خوشی میں اس قدر خلوص سے شریک ہوتا کہ ان کی خوشی دوبالا ہو جاتی۔ ان کے غم سے اتنا متاثر ہوتا کہ اُنھیں اپنا غم بھُول جاتا۔ مگر زندگی کے جزئیات کا ذہنی ادراک اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لیے اگرچہ اس کے دوست اس کی قدر کرتے مگر ما سوا دو ایک کے احباب کا یہی اندازہ تھا کہ

کوئی مرے، کوئی جئے نعیم کی دُنیا تہ و بالا نہیں ہو سکتی۔ اس کا اپنا بھی یہی خیال ہوا کرتا تھا۔ بیس سال سے اس کا یہی خیال تھا۔ اب ان کی عمر تیں اکتیس کے قریب تھی اور اس کا خیال تھا کہ نعیم اور وہ جُدائی کے ہنگامہ زار سے گزر چکے ہیں۔ اس کی شادی ہوئے پانچ سال ہو چکے تھے اور نعیم کو شادی سے دلچسپی ہی نہیں تھی۔ اُسے گھر بار کے جنجال سے نفرت تھی۔ وہ گوشۂ عافیت سے گریزاں نہ تھا مگر اس عافیت کے لیے جو قیمت ادا کرنی پڑتی تھی اُس کی وُہ اپنے آپ میں ہمت نہ پاتا تھا اور اُسے یہ قوی شک ہمیشہ روکتا تھا کہ اگر بیوی مجبل اور ہمدم نہ ثابت ہوئی تو پھر اس کا کیا علاج ہے اور تجربہ کرنے سے وُہ گھبراتا تھا۔ یہ تھا نعیم جو آنکھوں سے مُسکراہٹ کے شرارے بکھیرتا، دوستوں کی زندگی میں ایک خوشگوار نسیم بن کر تلطف کے پھُول برساتا، اپنی عمر کے اکتیس سال ایک جذباتی غبار میں گزار چکا تھا۔

احمد نے سوچا کہ جوانی بھی کیا موسم ہے! پھر خود ایک تلخ ہنسی ہنسا۔ کیا نئی اور اچھوتی بات میں نے نکالی ہے! اس نے اپنے آپ سے کہا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ نعیم جیسے حُسن سے ایک دائمی محبت تھی، جو دوشیزاؤں کی ہنسی، کسی گذرنے والے کی آواز، کسی زلف کی بکھراہٹ، کسی بادل کی ساخت، کسی پرندے کی اُڑان، کسی خیال کی وجد آفریں تڑپ، کسی مجسمے کے خطوط، کسی لبوں کی خمیدگی، کسی سینے کے اُبھار سے گھنٹوں، دنوں، مہینوں، بلکہ برسوں محظوظ ہوا کرتا تھا۔ ایک دن اسی خوبصورتی کے ہاتھوں خوار ہوگا۔ اس کا ذہن ایک عجائب گھر تھا جس میں عجیب عجیب کول اور مجسموں یا نادر اشیاء کی جگہ ایسی ہی چھوٹی چھوٹی یادوں کے قرینے سے سجے ہوئے انبار تھے۔ کہیں کسی مسکراہٹ کی کرن دمک رہی تھی، اور کہیں کسی ہنسی کی گونج، کہیں کسی ہاتھ کا لمس تھا تو کہیں کسی بلوس کی خوشبو، کہیں کسی سیر کی یاد تھی تو کہیں کسی واقعہ کا مکمل نقشہ۔ نعیم مصوّر نہیں تھا، مبصّر نہیں تھا مگر شاہد ضرور تھا۔ اس کا مشاہدہ باریک، عمیق یا مکمل نہ ہوتا مگر ہر حسین شے یا منظر، پیکر یا جلوہ، احساس یا خیال کا عکس اس کے دماغ پر اس طرح ثبت ہو جاتا کہ وہ دس دس سال کے بعد بھی وہ ہو بہو تمام جزئی تفصیلات دہرا سکتا۔ وہ کہا کرتا میں دیکھنے، سُونگھنے اور چھُونے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔ اس کی زندگی ایک رنگین مرقع تھی احساسات کا! مگر وہ تماشائی ہی نہیں تھا۔

احمد کو یاد آیا کہ نعیم ایک دفعہ نہر میں کُود گیا تھا۔ دوست کے لیے نہیں ایک غیر کے لیے۔ حالانکہ اُسے خود زیادہ تیرنا نہیں آتا تھا۔ اس کو یہ بھی یاد تھا کہ ایک دن اس نے اپنا کوٹ اُتار کر ایک ٹھٹھرتے ہوئے فقیر کو دے دیا تھا۔ جب احمد نے کہا کہ یہ کیا حماقت کر رہے ہو تو کھسیانی ہنسی ہنس کر بولا، کوئی بات نہیں پُرانا کوٹ تھا، برسوں سے اُسے پہن رہا تھا۔ پھینک دینے کی جرأت نہیں پاتا تھا۔ چلو اچھا ہوا بَلا گلے سے ٹلی۔ حالانکہ احمد کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ کوٹ پُرانا نہیں تھا اور نہ نعیم بہت امیر ہی تھا۔ مگر وہ واقعی دوسروں کے دُکھ کو دیکھ کر اپنے آپ میں نہیں رہتا تھا اور یہ نعیم یہ حُسن کا پرستار جو حُسن کو تخلیق کا راز جو حُسن کو خدا کا منظر، حقیقت کائنات کہا کرتا تھا، اب حُسن کے ہاتھوں مفلوج، مغلوب، مظلوم ہو کر بے بس ہو رہا تھا!

نعیم وہ حُسن کا شیدائی وہ جو حُسن کو محبت کی دیوی سمجھا کرتا تھا۔ "میں سب حسین چیزوں سے محبت کرتا ہوں۔" وہ کہا کرتا تھا۔ "حسن ہی محبت ہے، حُسن میں شفقت ہے، تلطف ہے، رحم ہے، حُسن میں نیکی ہے، نغمہ ہے، سرُور ہے، حُسن رُوحِ کائنات ہے، حُسن ہی خالق ہے، اور حُسن ہی تخلیق۔ ہر طرف حُسن ہے، حُسن ہی حُسن ہے۔ حُسن سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچ سکتی، حُسن تو دُکھ کا دارو ہے، حُسن تخریب کا دشمن ہے، تکلیف کا علاج!" کوئی پوچھے بیچارے تیرے نظریے کہاں گئے!

"میں کہتا تھا" احمد نے سوچا "دیکھو نعیم فضول نغمہ طرازیاں مت کیا کرو، خدا سے ڈرو، خدا کو غرور پسند نہیں۔ دیکھو لوگ جو کچھ کہتے ہیں وہ بالکل غلط نہیں ہو سکتا۔ پھُول کے پاس ہی کانٹا بھی ہوتا ہے۔ یہ حُسن کی رٹ، اسی وقت تک ٹھیک ہے جب تک تمہیں حُسن نے نہ

طرف پوری طرح مائل نہیں کیا اور جب تمھیں کسی حسین شے یا حسین ذی روح نے اپنی طرف کھینچا تو سب کچھ بھول جائے گا۔ بڑے بڑے اس میدان میں بازی ہار گئے۔" کہتا "یہ کوئی گھوڑ دوڑ ہے جس میں ہار جیت ہوگی۔ میں بازی نہیں لگا رہا، جوا نہیں کھیلتا، فقط ایمان رکھتا ہوں کہ حسن کی پرستش خدا کی پرستش ہے۔ خدا خود حسین ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔" واہ رے خدا پرست!

"میں نے کہا" اس کے ذہن نے پھر دہرایا۔ "دیکھو رحمت اللہ خاں کے گھر اتنا مت جایا کرو۔ وہ تمھارے باپ کے دوست ہیں مگر پرانی وضع کے بزرگ ہیں، نمازی پرہیزگار ہیں کیا سمجھیں گے؟" کہنے لگا "احمد تم جلتے ہو۔" "میں نے سمجھایا دیکھو ان کی لڑکیاں سنا ہے بہت حسین ہیں مگر وہ بھی باپ کی طرح نمازی ہیں۔ وہ تمھارے جیسے متوالے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں گی۔" کہنے لگا "نہ دیکھیں میں تو ان کو دیکھ لیا کرتا ہوں۔"

"مگر سبھی کو دیکھتا ہے وہ تو تین بہنیں ہیں۔ تینوں کے پیچھے پڑے ہو۔"

احمد تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے! وہ تینوں دراصل ایک ہیں، ایک ڈالی ہے جس پر تین پھول ہیں۔ میں تو خدا کی صنعت کا تماشا کرتا ہوں۔ تم اپنے کثیف دماغ سے معلوم نہیں کیا کیا تہمتیں تراشتے ہو۔"

"میاں احمق! میں تہمتیں نہیں تلاش کر رہا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بہت سی چیزوں سے بیگانہ ہو رہے ہو۔ دوستوں سے کم ملتے ہو۔"

"تم سے تو اسی طرح ملتا ہوں۔"

"......میری اور بات ہے! میرا گھر تمھارا گھر ہے، میری بیوی تمھیں بھائیوں سے زیادہ پیار کرتی ہے، میرا بچہ تم سے اسی طرح مانوس ہے جتنا مجھ سے، میرے والد تم کو اپنا حقیقی بیٹا سمجھتے ہیں، میری طرف سے تم بیگانہ کیا ہو گے۔ مگر واحد شا کی ہے۔ راشد چلاتا ہے۔ تمھارے بہنوئی کل ملے تھے وہ پوچھ رہے تھے۔ سنتا ہوں کہ تم اپنی والدہ کے خط کا جواب بھی دینا بھول جاتے ہو۔ تمھارے بھائی مجھے لکھتے ہیں کہ نعیم کا پتا بتاؤ۔ دفتر میں سنا ہے کہ تم سے کئی دفعہ پرسش ہو چکی ہے اور تم ہو کہ مجھی کو بے وقوف بنا رہے ہو۔"

نعیم اسے یاد آیا، چپ ہو گیا۔ سر جھکا لیا، ہاتھ میں پنسل تھی۔ پاس پڑے ہوئے اخبار پر گول دائرے بناتا رہا۔ دیر ہو گئی میں نے پوچھا۔

"کیوں بولتے کیوں نہیں۔"

ایک عاجزانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا "کیا بتاؤں؟"

"یہ بتاؤ تمھیں ہو کیا گیا ہے۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوا میں حسن زدہ ہو گیا ہوں۔"

"حسن زدہ!"

"ہوں ہہ"

پھر کچھ دیر خاموشی طاری ہو گئی، احمد کو غصہ آیا۔ زندگی کی بے رحم رفتار پر، زندگی پھولوں کو، تیتریوں کو، صبح کی کرنوں کو، شبنم کے قطروں کو ملیا میٹ کر دینے کا نام نہیں ہونا چاہیے۔ حسن ایک تعمیری صفت ہے نعیم کے نظریوں کو کیا ہوا، ان میں صداقت کی بو آیا کرتی تھی! ہم سب نعیم پر ہنسا کرتے مگر اس کے خیالات جن کی تبلیغ میں نعیم نے زندگی کے دس سال گزار دیے تھے۔ ہماری محفلوں میں عود عنبر کا کام دیا کرتے تھے۔ ان میں حقیقت ہونی چاہیے۔ حسن بے رحم نہیں ہو سکتا۔ حسن کا پجاری اس طرح مایوس اور محزون اس قدر مضمحل اور عاجز نہیں ہونا چاہیے۔ اُسے یاد آیا کہ نعیم منجھلی لڑکی کی تعریف کرتے وقت کچھ اور ہی ہو جایا کرتا تھا۔ اس کی آواز رقص کرتی اور اس کی

آنکھیں روشنی کے دو چراغ بن جایا کرتے۔ وہ اس کی تعریف نہیں کیا کرتا تھا سننے والوں کو مسحور کر لیا کرتا تھا۔ اس نے پوچھا۔

کیا ہوا ؟

"کچھ نہیں !

پھر بھی !

کچھ نہیں !

کچھ کیا نہیں ! یہ تو بتاؤ ؟

کیا بتاؤں ؟

اس کا بیاہ ہوگیا ؟

کس کا ؟

اُسی کا !

اُس کا ؟

ہونہہ۔

نہیں !

پھر کیا ہوا۔ خان صاحب نے آنا جانا بند کر دیا ؟

نہیں۔ وہ تو بہت تپاک سے پیش آتے ہیں۔

پھر کیا بجلی گری ہے۔

نعیم خاموش ہوگیا !

احمد کے دل میں غم و غصہ نے سانپ کی طرح بل کھایا۔ وہ پھنکارتا ہوا بولا۔

نعیم تم لعنت کیوں نہیں بھیجتے سب پر۔ وہ اس قابل نہیں کہ تم یوں پریشان رہو۔ وہ تمھاری قدر نہیں کر سکیں۔ تم ان سے کیا باتیں کر سکتے ہو۔ وہ تمھاری باتیں سمجھ ہی نہیں سکتیں۔ تم نے خود بتایا ہے۔ جب تم جوش میں آکر کسی حسین شے کی تعریف میں رطب اللسانی کرتے ہو تو وہ آپس میں کنکھیوں سے اشارے کیا کرتی ہیں۔ تم شکیلہ کا نام نہیں لے سکتے۔ تم نے کبھی اُس کے ہاتھوں کی تعریف نہیں کی۔ نہ اُس کے سراپا پر گیت گائے ہیں اور نہ ہی میں نے تمھاری زبان سے آج تک یہ سنا ہے کہ اس میں دماغ بھی ہے۔ تم کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہو۔ دُنیا میں اچھی سے اچھی لڑکیاں موجود ہیں۔ حسین سے حسین ! جمیل سے جمیل ! تم کیوں اُسی کے متوالے ہو رہے ہو۔ نعیم نے فقط یہ کہا۔

"تم کیا جانو"!

تو آخر وہ کیسی ہے ! تم کہتے ہو تم نے کبھی محبت کا لفظ منہ سے نہیں نکالا مگر وہ سمجھتی تو ہوگی کہ تم اُس پر جان دیتے ہو کہ وہ تمھارے دماغ پر حاوی ہے کہ تم اُسی کی تصویر آنکھوں کے سامنے لیے پھرتے ہو۔ کہ تم یوں پریشان و مضطرب پھر پھر کر اپنی زندگی برباد کر رہے ہو۔ کیا اُسے خبر نہیں۔

"نہیں !"

"کیا ؟؟؟" احمد نے چلا کر پوچھا۔

نہیں! وہ بالکل بے خبر ہے۔ اُسے محبت کا مفہوم ہی نہیں معلوم میں یہ نہیں سمجھ سکتا کہ وہ اتنی زخ بستہ کیوں ہے۔ اس قدر حسین! اتنی حسین! اور بے خبر! بالکل بے خبر! مگر تمہاری کہانی تو ایک اندھا بھی آنکھوں میں پڑھ سکتا ہے۔

"اس کی بہنیں جانتی ہیں۔"

"اور وہ!"

اُسے خبر ہی نہیں۔

خبر ہی نہیں کہ پرواہ ہی نہیں ؟

نہیں وہ سنگ دل نہیں۔ اُس کا دل بہت نرم ہے، بہت نرم ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے متاثر ہو جاتی ہے کسی کی دُکھ بھری کہانی سے بے تاب ہو جاتی ہے حُسن کی تعریف پر اس کا چہرہ چمک اُٹھتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ مرمر کے بُت میں سُرخ بجلی دَوڑ گئی ہے۔ گھر کا ذرہ ذرہ اُس وقت منوّر ہو جاتا ہے۔ ان کا گھر وسعت میں صحرا بن جاتا ہے۔ پھولوں کی خوشبوئیں مجھے ہر طرف سے دائرہ میں کر لیتی ہیں۔ وہ حُسن کی قدردان ہے مگر اُس کے لیے ایک ملاقاتی ہوں ایک پُرانا ملاقاتی جسے وہ کئی سال سے دیکھ رہی ہے جس کے خدوخال مانوس ہیں۔ جس کے حرکات وسکنات جانے پہچانے ہوئے سے ہیں جس کی باتیں ایک دہرائی ہوئی کہانی ہے۔ میں اس کے لیے ایک ایسی عطر کی شیشی ہوں جس کا عطر ختم ہو چکا ہے۔ بوتل میں خوشبو باقی ہے مگر عطر سے خالی ہے بیکار ہے مگر پھینکنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"مگر اندھی ہے! دیکھتی نہیں کہ تم اس کے سامنے گھُل رہے ہو۔"

"مگر وہ کیا کرے۔ پروانہ جلتا ہے تو شمع کیا کر سکتی ہے۔"

"چھوڑو یہ فرسودہ شاعری۔"

" افسوس ہے میں بھی پروانہ اور شمع کی کہانی مبتذل ہی سمجھا کرتا تھا، اب دیکھتا ہوں کہ یہ وہ حقیقت ہے جس کے متواتر اظہار نے ہمیں اس سے بیگانہ کر دیا۔ مگر پروانہ جلتا ہے۔ لاکھ ہٹاؤ جلتا ہے۔ میں نے اپنے کمرے میں کئی بار شمع جلا کر پروانہ کا مرگ ناچ دیکھا ہے۔ یہ موت کا ناچ بھیانک ضرور ہے مگر ہم میں سے کئی ایک یہ ناچ ضرور ناچتے ہیں۔ فقط دیکھنے میں فرق ہے۔"

"وہی فلسفہ بازی!"

"اب فلسفے ختم ہو چکے۔ اب کیا تم لوگوں کے دماغ چاٹوں گا!"

"مگر نعیم تمہیں کچھ تو کرنا چاہیے۔ میں ابّا جان سے کہوں کہ خان صاحب سے سوال کریں۔"

"توبہ توبہ! ایسی بات ہرگز نہ کرنا۔ میں کہیں نکل جاؤں گا۔

"کیوں؟"

"احمد تم نہیں سمجھ سکتے۔ اللہ میاں نے خوش قسمتی سے تمہارے حواس ایسے قائم اور صالح پیدا کیے ہیں کہ تم جذبات کے گورکھ دھندے میں اُلجھ ہی نہیں سکتے اور نہ سمجھ سکتے ہو۔"

"پھر بھی کچھ تو بتاؤ؟"

کیا کہوں؟ کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ لڑکی بھی دماغ رکھتی ہے دل رکھتی ہے۔ جوان ہے۔ اس کے دل میں بھی حرکت ہوگی۔ وہ

بھی کسی کو چاہے گی۔ میں جانتا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس میں محبت کرنے والا مادّہ موجود ہے۔ مگر میں وہ خوش قسمت انسان نہیں میری طرف بھی اس کی نظر اٹھتی ہے مگر اس کی آنکھیں مجھے تلاش نہیں کرتیں۔ وہ اگر میری طرف دیکھتی بھی ہے تو اسی طرح جس طرح کسی دلچسپ عمارت کی طرف دیکھتے ہیں۔ وہ بے پروا ہے کیونکہ اس کی زندگی میں میرا کوئی حصّہ نہیں کوئی دخل نہیں۔

"مگر یہ بے رحمی!"

"تم اُسے بے رحم کیوں کہتے ہو۔ یہ اس کا قصور نہیں کہ میں اُسے بھلا نہیں سکتا کہ وہ میری رگ رگ میں، خون کے قطرے قطرے میں سانس کے ہر پردے میں رچی ہوئی ہے۔ اور میں اُسے کیسے قصوروار ٹھہراؤں فقط اسی لیے کہ وہ حسین ہے!"

"افسوس! نعیم تمھیں کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ نہیں!"

"اس کا کچھ تو علاج ہونا چاہیئے؟"

"تم صحیح الدماغوں کے نزدیک ہر روگ کا علاج ہونا چاہیے مگر جانے دو میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"اچھے ہو رہے ہو کہ کپڑے تک ڈھیلے ہو گئے ہیں۔"

"تو کیا حرج ہے!"

"واحد کہتا ہے تم کئی کئی وقت کھانا نہیں کھاتے؟"

"جھوٹ بکتا ہے۔ اور احمد جانے دو۔ ناحق تمھارا دل خراب کر رہا ہوں اب چلتا ہوں۔"

"کھانا تو کھاتے جاؤ!"

"نہیں بھئی مجھے بھوک نہیں۔ خدا حافظ!"

ایک ہفتہ ہو گیا تھا اور نعیم جو کبھی دو دن سے زیادہ ملے بغیر نہیں رہا تھا ابھی تک احمد کے ہاں نہ آیا تھا اور نہ ہی احمد معلوم کر سکا تھا وہ کہاں رہتا ہے۔ سوچ سوچ کر احمد کا دماغ چکرا جاتا تھا۔ کل شام وہ نعیم کی تلاش میں دو گھنٹے پھرتا رہا کبھی سنا کانی ہاؤس میں بیٹھا تھا کبھی یہ کہ جناح باغ میں گھوم رہا ہے کبھی میاں کا پتا چلتا تھا کبھی وہاں کا مگر وہ ملا نہیں تھا۔ ساری رات احمد اسی فکر میں رہا۔ صبح اٹھتے ہی پھر انھیں خیالات نے انھیں گھیرا کہ اُسے معلوم ہوا کہ وہ حُسن کی دیوی ہی سے دوچار ہو رہا ہے۔ مگر اسے دیکھ کر صدمہ ہوا کہ یہ حُسن کی دیوی نرمی کی دیوی نہیں۔ اس کی آنکھوں میں رحم نہیں۔ اس کی مسکراہٹ میں ہمدردی اور محبّت نہیں۔ اُسے ایک چبھن کے ساتھ محسوس ہوا کہ نعیم کی دیوی دراصل رحم کی دیوی نہیں تھی۔ اس نے سوچا شاید حُسن واقعی بے رحم ہے۔

اکتوبر ۵۵ء

# عشقیہ کہانی

سعادت حسن منٹو

میرے متعلق عام لوگوں کو شکایت ہے کہ میں عشقیہ کہانیاں نہیں لکھتا۔ میرے افسانوں میں چونکہ عشق و محبت کی چاشنی نہیں ہوتی اس لئے وہ بالکل سپاٹ ہوتے ہیں۔ میں اب یہ عشقیہ کہانیاں لکھ رہا ہوں تاکہ لوگوں کی یہ شکایت کسی حد تک دُور ہو جائے۔

جمیل کا نام اگر آپ نے پہلے نہیں سُنا تو اب سُن لیجئے۔ اس کا تعارف مختصر طور پر کرائے دیتا ہوں۔ وہ میرا لنگوٹیا دوست تھا۔ ہم اکٹھے اسکول میں پڑھے، پھر کالج میں ایک ساتھ داخل ہوئے۔ میں ایف اے میں فیل ہو گیا اور وہ پاس۔ میں نے پڑھائی چھوڑ دی، مگر اس نے جاری رکھی۔ ڈبل ایم اے کیا اور معلوم نہیں کہاں غائب ہو گیا۔ صرف اتنا سُننے میں آیا تھا کہ اس نے ایک پارسی تھوڑی مال سے شادی کر لی تھی اور آبادان چلا گیا تھا۔ وہاں سے واپس آیا یا وہیں رہا، اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔

جمیل بڑا عاشق مزاج تھا۔ اسکول کے دنوں ہی میں اس کا جی بیقرار رہتا تھا کہ وہ کسی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو جائے۔ مجھے ایسی گرفتاری سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن اس کی سرگرمیوں میں جو عشق سے متعلق ہوتیں برابر کا حصہ لیا کرتا تھا۔

جمیل دراز قد نہیں تھا مگر اچھے خدوخال کا مالک تھا۔ میرا مطلب ہے، اگر اُسے خوب صورت نہ کہا جائے تو اس کے قبول صورت ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا۔ رنگ گورا اور سرخی مائل، تیز تیز باتیں کرنے والا، بلا کا ذہین، انسانی نفسیات کا ماہر، صحت مند۔

اس کے دل و دماغ میں سن بلوغت تک پہنچنے سے کچھ عرصہ پہلے ہی عشق کرنے کی زبردست خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ اس کو غالب کے اس شعر کا مفہوم اچھی طرح معلوم تھا کہ ؎

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب　　　　کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

مگر اس کے برعکس وہ یہ آگ خود اپنی ماچس سے لگانا چاہتا تھا۔

اُس نے اس کوشش میں کئی ماچسیں جلائیں۔ میرا مطلب یہ ہے کئی لڑکیوں کے عشق میں گرفتار ہو جانے کے لئے نت نئے سُوٹ سلوائے، بڑھیا سے بڑھیا ٹائیاں خریدیں، سینٹ کی سینکڑوں قیمتی شیشیاں استعمال کیں مگر یہ سُوٹ، ٹائیاں اور سینٹ اس کی کوئی مدد نہ کر سکے۔

میں اور وہ دونوں شام کو کمپنی باغ کا رُخ کرتے، وہ خوب سجا بنا ہوتا، اس کے کپڑوں سے بہترین خوشبو نکل رہی ہوتی۔ باغ کی روشوں پر متعدد لڑکیاں۔ بدصورت، خوب صورت اور قبول صورت محوِ خرام ہوتی تھیں۔ وہ ان میں سے کسی ایک کو اپنے عشق کے لئے منتخب کرنے کی کوشش کرتا مگر ناکام رہتا۔

ایک دن اس نے مجھ سے کہا "سعادت، میں نے آخر کار ایک لڑکی چن ہی لی ہے۔ خدا کی قسم چندے آفتاب، چندے ماہتاب ہے، میں کل صبح سیر کے لیے نکلا۔ بہت سی لڑکیاں مائی کے ساتھ اسکول جا رہی تھیں۔ ان میں ایک برقع پوش لڑکی نے جو اپنی نقاب ہٹائی تو اس کا چہرہ دیکھ کر میری آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ کیا حسن وجمال تھا، بس میں نے وہیں فیصلہ کر لیا کہ جمیل، اب مزید تگ و دو چھوڑ دو۔ اس حسینہ ہی کے عشق میں تمہیں گرفتار ہونا چاہیئے۔ ہونا کیا " تم ہو چکے ہو۔"

اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہر روز صبح اٹھ کر اس مقام پر جہاں اس نے اس کافر جمال حسینہ کو دیکھا تھا پہنچ جایا کرے گا، اور اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرے گا۔

اس کے لئے اس کے ذہین دماغ نے بہت سے پلان سوچے تھے، ایک جو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ قابل عمل اور زود اثر تھا اس نے مجھے بتا دیا تھا۔

اس نے حساب لگا کر سوچا تھا کہ دس دن متواتر اس لڑکی کو ایک ہی مقام پر کھڑے رہ کر دیکھنے اور گھورنے سے اتنا ضرور معلوم ہو جائے گا کہ اس کا مطلب کیا ہے، یعنی وہ کیا چاہتا ہے۔ اس مدت کے بعد وہ اس کا ردِ عمل ملاحظہ کرے گا اور اس تجزیہ کرنے کے بعد کوئی فیصلہ مرتب کرے گا۔

یہ اغلب تھا کہ وہ لڑکی اس کا دیکھنا گھورنا پسند نہ کرے، مائی سے یا اپنے والدین سے اس کے غیر اخلاقی رویے کی شکایت کر دے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ راضی ہو جاتی۔ اس کی ثابت قدمی اس پر اتنا اثر کرتی کہ اس کے ساتھ بھاگ جانے کو تیار ہو جاتی۔

جمیل نے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کر لیا تھا۔ شاید، ضرورت سے زیادہ۔ اس لئے کہ دوسرے روز جب وہ الارم بجنے پر اٹھا تو اس نے اس مقام پر جہاں اس لڑکی سے اس کی پہلی مرتبہ مڈبھیڑ ہوئی تھی، جانے کا خیال ترک کر دیا۔

اس نے مجھ سے کہا۔ "سعادت، میں نے یہ سوچا ہے کہ ہو سکتا ہے اسکول میں چھٹی ہو۔ کیونکہ جمعہ ہے معلوم نہیں اسلامی اسکول میں پڑھتی ہے یا کسی گورنمنٹ اسکول میں۔ پھر یہ بھی ممکن تھا کہ اگر میں اُسے زیادہ شدت سے گھورتا تو وہ بھنا جاتی۔ اس کے علاوہ اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ دس دن کے اندر اندر مجھے اس کا ردِ عمل یقینی طور پر معلوم ہو جائے گا۔ بفرضِ محال وہ رضامند ہو جاتی۔ میرا مطلب ہے، مجھے بالمشافہ گفتگو کا موقع دے دیتی، تو میں اس سے کیا کہتا؟"

میں نے کہا "یہی کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔"

جمیل سنجیدہ ہوگیا۔ "یار، مجھ سے کبھی کہا نہ جاتا — تم سوچو نا کہ اگر یہ سُن کر وہ میرے منہ پر یہ پتھر دے مارتی کہ جناب آپ کو اس کا کیا حق حاصل ہے، تو میں کیا جواب دیتا۔ زیادہ سے زیادہ میں یہ کہہ سکتا کہ حضور محبت کرنے کا حق ہر انسان کو حاصل ہے، مگر وہ ایک اور پتھر میرے مار سکتی تھی کہ تم بکواس کرتے ہو، کون کہتا ہے کہ تم انسان ہو۔"

قصہ مختصر یہ کہ جمیل، اس حسین وجمیل لڑکی کی محبت میں خود کو اپنے تجزیۂ خودی کے باعث گرفتار نہ کرا سکا، مگر اس کی خواہش بدستور موجود تھی۔ ایک اور خوبرو لڑکی اس کی تلاش کرنے والی نگاہوں کے سامنے آئی اور اس نے فوراً تہیہ کر لیا کہ اس سے عشق لڑانا شروع کر دے گا۔

جمیل نے سوچا کہ اس سے خط وکتابت کی جائے۔ چنانچہ اس نے پہلے خط کے کئی مسودے پھاڑنے کے بعد ایک آخری عشق و محبت میں شرابور، تحریر مکمل کی، جو میں یہاں من وعن نقل کرتا ہوں —

جانِ جمیل!

اپنے دل کی دھڑکنیں سلام کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ حیران نہ ہو جیئے گا کہ یہ کون ہے جو آپ سے یوں بے دھڑک ہم کلام ہے۔ میں عرض کئے دیتا ہوں۔ کل شام کو سوا چھ بجے —— نہیں۔ چھ بج کر گیارہ منٹ پر جب آپ امرت سینما کے پاس ٹانگے میں سے اُتریں تو میں نے آپ کو دیکھا۔ بس، ایک ہی نظر میں آپ نے مجھے مسحور کر لیا۔

آپ اپنی سہیلیوں کے ساتھ پکچر دیکھنے چلی گئیں اور میں باہر کھڑا آپ کو اپنی تصور کی آنکھوں سے مختلف رُوپوں میں دیکھتا رہا۔ دو گھنٹے کے بعد آپ باہر نکلیں۔ پھر زیارت نصیب ہوئی اور میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپ کا غلام ہو گیا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا، میں آپ کو اور کیا لکھوں۔ بس اتنا پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میری محبت کو اپنے حُسن وجمال کے شایانِ شان سمجھیں گی یا نہیں۔

اگر آپ نے مجھے ٹھکرا دیا تو میں خودکشی نہیں کروں گا۔ زندہ رہوں گا تاکہ آپ کے دیدار ہوتے رہیں۔

آپ کے حُسن وجمال کا پرستار

جمیل

یہ خط اس نے میرے گھر میں ایک خوشبودار کاغذ پر اپنی رف تحریر سے منتقل کیا تھا۔ لفافہ پھول والا اور خوشبودار تھا جس کو جمالیاتی ذوق نے پسند نہیں کیا تھا۔

چند روز کے بعد جمیل مجھ سے ملا تو معلوم ہوا کہ اس نے یہ خط اس لڑکی تک نہیں پہنچایا۔

اوّلاً اس لئے کہ عشق کا آغاز خط سے کرنا نامناسب ہے۔

ثانیاً اس لئے کہ اس خط کی تحریر بے ربط اور بے اثر ہے۔ اس نے خود کو لڑکی متصور کر کے یہ خط پڑھا اور اس کو بہت مضحکہ خیز معلوم ہوا۔

ثالثاً اس لئے کہ تفتیش کرنے کے بعد اس کو معلوم ہوا کہ لڑکی ہندو ہے۔

یہ مرحلہ بھی شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔

اس کے گھر میں میرا آنا جانا تھا۔ مجھ سے کوئی پردہ وغیرہ نہیں تھا۔ ہم گھنٹوں بیٹھے پڑھائی یا گپ بازیوں میں مشغول رہتے۔ اس کی دو بہنیں تھیں۔ چھوٹی چھوٹی۔ ان سے بڑی بچگانہ قسم کی پُرلطف باتیں ہوتیں۔ اس کی موسی کی ایک انتہا درجے کی سادہ لوح لڑکی عذرا تھی۔ عمر یہی کوئی سترہ اٹھارہ برس ہو گی۔ اس کا ہم دونوں بہت مذاق اُڑایا کرتے تھے۔

جمیل کی دوسری کوشش بھی جب بار آور ثابت نہ ہوئی تو وہ دو مہینے تک خاموش رہا۔ اس دوران میں اس نے عشق میں گرفتار ہونے کی کوئی نئی کوشش نہ کی۔ لیکن اس کے بعد اس کو ایک دم دورہ پڑا اور اس نے ایک ہفتے کے اندر اندر پانچ چھ لڑکیاں اپنی عشق کی بندوق کے لئے نشانے کے طور پر منتخب کر لیں پر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ صرف چار لڑکیوں کے متعلق مجھے اس کی عشقیہ مہم کے بارے میں علم ہے۔

پہلی نے جو اس کی دُور دراز کی رشتے دار تھی، اپنی ماں کے ذریعے سے اس کی ماں تک یہ الٹی میٹم بھجوا دیا کہ اگر جمیل نے اُس کو پھر بُری نظروں سے دیکھا تو اس کے حق میں اچھا نہ ہو گا۔

دوسری، غور سے دیکھنے پر چیچک کے داغوں والی نکلی۔

تیسری کی چھٹے ساتویں روز ایک قصائی سے منگنی ہو گئی۔

چوتھی کو اس نے ایک بہت لمبا عشقیہ خط لکھا جو اس کی موسی کی بیٹی عذرا کے ہاتھ آ گیا۔ معلوم نہیں کس طرح۔ پہلے جمیل اس کا مذاق اُڑایا کرتا تھا، اب اُس نے اڑانا شروع کر دیا۔ اتنا کہ جمیل کا ناک میں دم آ گیا۔

جمیل نے مجھے بتایا " سعادت یہ عذرا جسے ہم بے وقوفی کی حد تک سادہ لوح سمجھتے ہیں، سخت ظالم ہے۔ سب سمجھتی ہے جس لڑکی کو میں نے خط لکھا تھا اور غلطی سے اپنے میز کے دراز میں رکھ کر یہ سوچنے میں مشغول تھا کہ وہ اس کا کیا جواب لکھے گی یہ کم بخت جانے کیسے لے اُڑی۔ اب اس نے میرا ناطقہ بند کر دیا ہے۔ بعض اوقات ایسی تلخ باتیں کرتی ہے کہ مجھے رلاتی ہے اور خود بھی روتی ہے۔ میں تو تنگ آ گیا ہوں"۔

اس سے بہت زیادہ تنگ آ کر اس نے اپنے عشق کی مہم اور تیز کر دی۔ اب کی اس نے چودہ لڑکیاں چُنیں، مگر اچھی طرح غور کرنے کے بعد ان میں سے صرف ایک باقی رہ گئی۔ دس اس کے مکان سے بہت دُور رہتی تھیں۔ جن کو ہر روز حتمی طور پر دیکھنے کے متعلق اس کا دل گواہی نہیں دیتا تھا۔ دو ایسی تھیں جن کے خاندانی ہونے کے بارے میں اُسے شُبہ تھا۔ بارہ ہوئیں۔ تیرھویں نے اسے یک دن ایسی بُری طرح گھورا کہ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

چودھویں جو کہ چودھویں کا چاند تھی ملتفت ہو جاتی مگر وہ کم بخت کمیونسٹ تھی۔ جمیل نے سوچا تھا کہ اس کا تعفات حاصل کرنے کے لئے وہ ضرور کمیونسٹ بن جاتا، کھادی کے کپڑے پہن کر مزدوروں کے حق میں دس بارہ تقریریں بھی کر دیتا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ اس کے والد صاحب ریٹائرڈ انجینئر تھے۔ ان کی پنشن یقیناً بند ہو جاتی۔ یہاں سے ناامیدی ہوئی تو اس نے سوچا کہ عشق بازی فضول ہے۔ شرافت یہی ہے کہ وہ کسی سے شادی کرے۔ اس کے بعد، اگر طبیعت چاہے تو اپنی بیوی کی محبت میں گرفتار ہو جائے۔ چنانچہ اس نے مجھے اس فیصلے سے آگاہ کیا۔ طے یہ ہُوا کہ وہ اپنی امی جان اور اپنے ابا جان سے بات کرے۔

بہت دنوں کی سوچ بچار کے بعد اُس نے اس گفتگو کا مسودہ تیار کیا —— سب سے پہلے اس نے اپنی امی سے بات کی۔ وہ بہت خوش ہوئیں —— اِدھر اُدھر اپنے عزیزوں میں انہوں نے جمیل کے لئے موزوں رشتہ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ مگر ناکامی ہوئی —— پڑوس میں خان بہادر صاحب کی لڑکی تھی —— ایم۔ اے۔ بڑی ذہین اور طبیعت کی بہت اچھی —— مگر اس کی ناک چپٹی تھی، خالہ کی بیٹی حُسن آرا تھی پر بے حد کالی۔ صغریٰ تھی مگر اس کے والدین بڑے کنجوس تھے۔ جہیز میں جتنے جوڑے جمیل کی ماں چاہتی تھی؛ اس سے وہ آدھے بھی دینے پر رضامند نہیں تھے۔ عذرا کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

جمیل کی ماں نے بڑی کوششوں کے بعد راولپنڈی کے ایک معزز اور متمول خاندان کی لڑکی سے بات چیت طے کر لی۔ جمیل اپنی ناکام عشق بازیوں سے اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ اس نے اپنی ماں سے یہ بھی نہ پوچھا کہ وہ شکل و صورت کی کیسی ہے ویسے اس نے اپنے زندہ تصور میں اس کا اندازہ لگا لیا تھا اور مفصل طور پر سوچ لیا تھا کہ وہ اس کی محبت میں کس طرح گرفتار ہو گا۔

یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔ میں خوش تھا کہ جمیل کی شادی ہو رہی ہے، اس کے مرض متعلقہ بہ عشق کا ایک فقط یہی واحد علاج تھا۔

چھ مہینے گزر گئے آخر راولپنڈی کے اس معزز اور متمول خاندان کی لڑکی سے جس کا نام غالباً شریفہ تھا۔ اس کی منگنی ہو گئی۔

اس تقریب پر اُسے سسرال کی طرف سے ہیرے کی ایک انگوٹھی ملی جو وہ ہر وقت پہنے رہتا تھا اس پر اس نے ایک نظم بھی لکھی جس کا کوئی شعر مجھے یاد نہیں۔ ایک برس تک سوچتا رہا کہ اسے اپنی دلہن کو کب اپنے یہاں لانا چاہیئے۔ آدمی چونکہ آزاد اور روشن خیال قسم

تھا اس لئے اس کی خواہش تھی کہ ماں باپ سے علیحدہ اپنا گھر بنائے۔ یہ کیسا ہونا چاہیئے۔ اس میں کس ڈیزائن کا فرنیچر ہو۔ نوکر کتنے ہوں۔ ماہوار خرچ کتنا ہوگا۔ ساس کے ساتھ اس کا کیا سلوک ہوگا۔ ان تمام اُمور کے بارے میں اس نے کافی سوچ بچار کی۔ نتیجہ یہ ہوا لڑکی والے تنگ آگئے۔ وہ چاہتے تھے کہ رخصتی کا مرحلہ جلد از جلد طے ہو۔

جمیل اس بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ لیکن اس کی اتی نے ایک تاریخ مقرر کر دی۔ کارڈ وارڈ چھپ گئے۔ ولیمے کی دعوت کے لیے ضروری سامان کا بندوبست کر لیا گیا۔ اس کے والد بزرگوار شیخ محمد اسماعیل صاحب ریٹائرڈ انجینئر بہت مسرور تھے مگر جمیل بہت پریشان تھا اس لئے کہ وہ اپنے بننے والے گھر کا آخری نقشہ تیار نہیں کر سکا تھا۔

رخصتی کی تاریخ ۹۔ اکتوبر مقرر کی گئی تھی۔ ۸۔ کی شام کو ہم دونوں بہت دیر تک —— میرا خیال ہے رات کے دو بجے تک، اس آنے والے حادثے کے متعلق تبادلۂ خیال کرتے رہے لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچے۔ آخر طے یہ ہُوا کہ جو ہوتا ہے ہونے دیا جائے۔

اور ہُوا یہ کہ نو اکتوبر کی صبح کو —— منہ اندھیرے جمیل میرے پاس سخت اضطراب اور کرب کے عالم میں آیا اور اس نے مجھے یہ خبر سُنائی کہ اس کی ماسی کی لڑکی عذرا نے جو بے وقوفی کی حد تک، سادہ لوح تھی خودکشی کر لی ہے۔ اس لئے کہ اس کو جمیل سے والہانہ عشق تھا، وہ برداشت نہ کر سکی کہ اس کے محبوب و معبود کی شادی کسی اور لڑکی سے ہو۔ اس ضمن میں اُس نے جمیل کے نام ایک خط لکھا، جس کی عبارت بہت دردناک تھی۔ میرا خیال ہے کہ یہ تحریر یادگار کے طور پر اس کے پاس محفوظ ہوگی۔

اگست ۱۹۵۴ء

دوپہر کی سَلطنت میں
فاختہ کچھ بولتی ہے
زندگی پَر کھولتی ہے

نیند سے باہر نکل کر
میں نے اُس کے ہونٹ چکھے
آئینے پر پھول رکھے
دوپہر کی سَلطنت میں

○

عکس تحریر۔ ثروت حسین

# چوتھا

ممتاز مفتی

اس بنے سجے آرام دہ کمرے میں ہم دو تھے۔ لیکن دونوں ہی اکیلے تنہا۔ اگر ہم دونوں اکیلے اکیلے ہوتے تو یقیناً اس قدر اکیلے نہ ہوتے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت دور تھے، بہت دور۔ وہ مجھ سے بیزار تھی میں اس سے بیزار تھا۔ چالیس سال ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہتے آئے تھے۔

چالیس سال پہلے ہمیں ایک دوسرے سے محبت تھی، عشق تھا۔ ایک دوسرے کے بغیر دم نکلتا تھا۔ مجھے ایک فکر دامن گیر تھا اگر وہ مجھے نہ ملی تو میں کیا کروں گا۔ اسے ایک غم تھا اگر ملاپ نہ ہوا تو زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ خوش قسمتی سے بات بن گئی ہم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ ایک پھلجھڑی سی چل گئی۔ پھر کئی ایک سال ہم محبت میں لت پت رہے۔ لت پت وہ میرے لئے جیتی تھی، میں اس کے لئے جیتا تھا۔

پھر پتہ نہیں کیا ہوا، آہستہ آہستہ اسے پتہ چلتا گیا کہ میں وہ نہیں ہوں جو وہ سمجھتی تھی کہ ہوں۔ آہستہ آہستہ مجھ پر انکشاف ہوتا رہا کہ اس کی کچھ عادتیں ناقابلِ برداشت ہیں پھر جھگڑے شروع ہو گئے۔ کئی ایک سال ہم ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہے، لڑتے جھگڑتے رہے۔ یہ صورتحال اس قدر بڑھ گئی کہ لڑنے جھگڑنے کے سوا ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ کوئی سروکار نہ رہا۔

اور اب ــ اب ہم دونوں بوڑھے ہو چکے ہیں۔ لڑ لڑ جھگڑ جھگڑ کر تھک گئے ہیں۔ اب اتنا تعلق بھی نہیں رہا کہ ایک دوسرے سے لڑیں جھگڑیں اب ہم ایک دوسرے کو برداشت کر رہے ہیں۔ وہ مجھے گوارا کر رہی ہے۔ مجبوراً میں اسے گوارا کر رہا ہوں۔ مجبوراً وہ کہتی ہے اس کا تو دماغ خراب ہے یہ کیا سمجھے گا۔ میں کہتا ہوں اس کا تو دماغ سرے سے ہے ہی نہیں، سمجھانے کی کوشش عبث ہے۔

یوں ہم ایک دوسرے کے ساتھ۔ لیکن ایک دوسرے سے دور گاؤں کی حویلی میں بڑے سکون سے زندگی بسر کر رہے تھے۔

میرے پاس اسے کہنے کے لئے کوئی بات نہ تھی، وہ مجھ سے بات کرنے کی روادار نہ تھی۔ دن میں دو ایک بار بات کرنے کی ضرورت پڑ جاتی۔ وہ آلو چھیلتے ہوئے چاقو سے مخاطب ہو کر کہتی آلو میں بینگن ڈال لوں۔ میں شیو کرتے ہوئے استرے سے کہتا ڈال لو۔ اکثر بار تو بات اشاروں کی مدد سے ہو جاتی۔ وہ بن بولے سمجھا دیتی، میں بن کہے سمجھا دیتا۔

اب جب سے ہم دونوں کراچی اپنے بیٹے سکندر کے گھر آئے ہیں۔ ایک دوسرے سے بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ وہ چپ چاپ اپنے بستر پر بیٹھ کر کھڑکی کو گھورتی رہتی ہے۔ میں کرسی پر بیٹھ کر نیچے سڑک پر چلنے والی ٹریفک کو دیکھتا رہتا ہوں۔ کتنا سکون ہے کتنا چین ہے۔ کسے رلایا کسے کا دے نہ پایا نہ۔

پہلے ہم گاؤں میں رہتے تھے۔ تھی تو حویلی لیکن سال ہا سال سے مرمت نہیں ہوئی تھی۔ ٹوٹ پھوٹ گئی تھی، سکندر سے کئی بار مرمت کے لئے کہا لیکن اس نے پرواہ نہ کی بات ٹال دی۔

سکندر ہمارا اکلوتا بیٹا ہے۔ وہ گاؤں میں زیادہ دیر نہیں رہا۔ پہلے شہر میں پڑھنے کے لئے بورڈنگ میں رہا پھر بڑا افسر بن گیا۔ بیوی بھی

شہر کی ملی۔ اس نے ہم سے پوچھے بنا خود ڈھونڈی جیسے میں نے ڈھونڈلی تھی اور اب وہ اس کی محبت میں لت پت ہو رہا ہے جس طرح میں ہوا تھا۔ سکندر اور اس کی بیوی دونوں کراچی میں صاحبوں کی طرح ٹھاٹھ سے رہتے ہیں۔ بال بچہ ہے نہیں۔ بس ایک دوسرے میں ڈوبے رہتے ہیں۔

گاؤں کی حویلی کے مغربی حصے کے تین کمرے ٹھیک ٹھاک ہیں وہاں ہم دونوں رہتے تھے۔ گاؤں سے ذرا فاصلے پر، شور شرابے سے دور، حویلی سے سو پچاس قدم پر سائیں زروٹ کا مزار تھا، ہماری کھڑکیوں سے صاف نظر آتا تھا۔ انہیں سائیں چُپ شاہ بھی کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ انہوں نے زندگی بھر کسی سے بات نہیں کی تھی بس اشاروں سے ہی بات کہہ دیتے تھے میں پیروں فقیروں کو نہیں مانتا لیکن دو ایک بار میں اتا پتا لگانے کے لئے مزار پر گیا تھا۔ وہاں جاکر پتہ چلا کہ سائیں جی کا اصل نام ذڑ۔ وٹ تھا جو غلط العام ہوکر زروٹ بن گیا۔ سائیں جی نے عمر بھر دڑوٹی رکھی تھی، یہ جان کر مجھے سائیں جی سے دلچسپی ہوگئی۔ اس لئے کہ ہم بھی سائیں جی کی طرح دڑ۔ وٹی زندگی بسر کر رہے تھے۔

مزار پر ایک شخص باقاعدہ حاضری دیتا تھا اور جھاڑ پونچھ میں لگا رہتا تھا۔ اس کا نام فضلا تھا۔ فضلا شہر میں رہتا تھا مگر جب بھی چھٹی ملتی مزار کی طرف چل پڑتا تا مجھے فضلے پر بڑا ترس آتا ہے، بے چارہ احمق خواہ مخواہ سائیں کی لگن لگائے بیٹھا ہے۔

پھر ہم دونوں میں۔ اور میری بیوی میں چوہے کی بات چل نکلی۔ ایسی چلی ایسی چلی کہ سب اُلٹ پلٹ ہوگیا۔ پتہ نہیں کیا ہوا نہ وہ، وہ رہی نہ میں، میں رہا۔

چوہے کی بات ابھی چل ہی رہی تھی کہ سکندر آگیا اور وہ ہمیں زبردستی کراچی لے آیا۔

کراچی میں تین چار ہفتے تو ہم جگہیں دیکھنے میں مصروف رہے۔ ہوا بندر، منگو پیر، کیماڑی اور پتہ نہیں کیا کیا، لیکن آخر جگہیں ختم ہوگئیں اور ہم اس بیچ بچی انڈے کی طرح چمکتی ہوئی فلیٹ میں اکیلے رہ گئے۔

سکندر اور اس کی بیگم صبح اپنے اپنے دفتر چلے جاتے شام کو کوئی پارٹی یا ڈنر ہوتا، گھر میں صرف ہم ہوتے یا نوکر ہوتے۔

پھر وہ بنی سجائی تنہائی کھیلنے لگتی۔ وہ کمرے کی سجاوٹ وہ آرام زدہ صبح و شام وہ تکلف وہ رکھ رکھاؤ وہ سب کچھ اک بوجھ بن جاتا۔ دم گھٹنے لگتا گاؤں میں یہ بات نہ تھی وہاں تنہائی تو تھی پر دم نہیں گھٹتا تھا۔ وہاں ہم دونوں اس قدر اکیلے نہ تھے بے زاری اتنی گاڑھی نہ تھی۔

گاؤں میں وہ میرے لئے چائے بناتی تھی کھانا پکاتی تھی میں کبھی کبھار بازار سے سودا لے آتا۔ کراچی میں نہ کھانا پکانے کی بات تھی نہ سودا لانے کی۔ اس لئے ہم ایک دوسرے سے بالکل بے نیاز ہوگئے تھے میں سارا دن برآمدے میں بیٹھ کر نیچے چلتی ہوئی شاہراہ کا نظارہ کرتا رہتا اور بستر میں وہ اندر بیٹھی کیا کرتی رہتی۔

ایک دن جب میں سڑک کا نظارہ کر رہا تھا تو اس کی آواز سنائی دی، بولی شہروں میں چوہے نہیں ہوتے کیا۔ میں نے حیرت سے مڑ کر دیکھا وہ ٹائیلوں کے فرش پر نگاہیں گاڑے بیٹھی تھی جیسے مجھ سے نہیں بلکہ ان سے پوچھ رہی ہو۔

چوہے کی بات سن کر میرا دل ڈوب گیا۔ تو یہاں بھی چوہا آپہنچا کتنی مشکل سے گاؤں میں اس سے جان چھڑائی تھی۔

ہوتے ہوں گے میں نے سڑک سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

دیر تک خاموشی چھائی رہی اس کی آواز آئی۔ یہاں تو چوہا نہیں آیا کوئی۔

یہاں نہیں آیا تو میں کیا کروں، یہ کیا میرا قصور ہے۔ مجھے غصہ آگیا۔ مڑ کر دیکھا عابدہ گلے پر جھکی ہوتی تھی یوں جیسے یہ سوال اس نے

گلے سے کیا ہو۔

میں نے اپنے سیپر کو مخاطب کر کے کہا چوہا یہاں ٹائیلوں میں بل کیسے بنائے۔

کمرے میں دیر تک خاموشی طاری رہی۔

پھر وہ چھت سے مخاطب ہو کر بولی۔ بے شک بل نہ بنائے پر آئے تو سہی۔

اس پر مجھے بہت غصہ آیا۔ اس عورت کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا جب گاؤں میں تھی تو کہتی تھی چوہا کیوں آتا ہے اب کہہ رہی ہے چوہا کیوں نہیں آتا۔

گاؤں میں چوہے کی بات اچانک چل پڑی تھی ہوا یوں کہ گاؤں میں ایک رات میں جاگا تو دیکھا کہ عابدہ چارپائی پر گٹھڑی بن کر بیٹھی ہے۔ میں نے سوچا چلو بیٹھی ہے تو بیٹھی رہے اپنا کیا جاتا ہے پھر جو میں نے غور سے دیکھا تو وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

کیا ہوا میں نے پوچھا۔

خوف زدہ آواز میں بولی۔ چوہا ہے۔

اس پر مجھے غصہ آ گیا۔ چوہا ہے تو پڑا ہو۔ گاؤں میں چوہا تو ہو گا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ رضائی لی اور پھر سے سو گیا۔

دوبارہ جاگا تو دیکھا کہ وہ جوں کی توں بیٹھی ہے۔

سوتی کیوں نہیں، میں نے کہا۔

نیند نہیں آتی۔

کیوں نہیں آتی۔

ڈر لگتا ہے۔

ڈر کیسا۔

چوہا جو ہے۔

کیا کرے گا چوہا؟

کاٹے گا۔

لاحول ولا قوت۔ یہ محترمہ سمجھتی ہے کہ اس کا گوشت اس قدر لذیذ ہے کہ چوہا اسے کاٹنے کے لئے اتنی دور سے چل کر آیا ہے۔

اگلے روز اس نے مجھے ایک سوراخ دکھایا کہنے لگی چوہا یہاں سے آتا ہے۔ میں نے اس سوراخ کے مطابق ایک پتھر تلاش کیا اور ہتھوڑے سے پتھر کو اس سوراخ میں ٹھونک دیا۔ تو میں نے اسے مخاطب کئے بغیر کہا اب چوہا نہیں آئے گا۔

رات کو اس نے مجھے جگایا، بولی چوہا تو آیا ہوا ہے، ذرا سنو تو۔

میں نے سنا واقعی ٹک ٹک کی آواز آ رہی تھی۔

اگلے دن اس نے ایک اور سوراخ ڈھونڈ لیا بولی یہاں سے آتا ہے آٹھ دس دن ہم سوراخ ڈھونڈتے اور بند کرتے رہے اس کے باوجود چوہا آتا رہا۔

پھر میں نے ایک ترکیب سوچی۔ میں نے کہا دیکھ چوہا تجھے کاٹنے کے لئے نہیں آتا بلکہ کچھ کھانے کے لئے آتا ہے۔ اگر ڈیوڑھی میں کھانے

کے لئے کوئی چیز رکھ دی جائے تو وہ نہ تو باورچی خانے میں جائے گا نہ ہمارے کمرے میں آئے گا۔

اس نے میری بات مان لی۔ دو تین دن وہ سارے گھر میں بڑبڑ کرتی پھری۔ چوہا کون سی چیز خوشی سے کھاتا ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ چوہا کیا کھاتا ہے اس لئے میں خاموش رہا۔ تیسرے دن پتہ نہیں وہ کہاں سے سن آئی کہ چوہا پنیر بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ روز وہ رومال میں دہی باندھ کر لٹکا دیتی تاکہ شام تک پنیر تیار ہو جائے۔

اگلے روز صبح سویرے وہ دوڑی دوڑی آئی، چوہے نے سارا پنیر کھا لیا ہے۔ اس کے بعد جب بھی میں باہر نکلتا تو ڈیوڑھی میں چوہے کی تھالی کو غور سے دیکھتا کہ چوہے نے کچھ کھایا ہے یا نہیں۔ رات کو آنکھ کھلتی تو کان لگا کر آواز سنتا رہتا کہ چوہا ٹک ٹک کر رہا ہے یا نہیں۔

دس پندرہ دنوں کے بعد عابدہ منہ لٹکائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ بولی چوہا نہیں آیا۔

چوہا نہیں آیا؟ میرے منہ سے نکل گیا، کیوں نہیں آیا۔

دیکھ تو، وہ بولی روٹی اور پنیر ویسے ہی پڑے ہیں تھالی میں۔

میں اٹھ کر ڈیوڑھی میں گیا، دیکھا تو چوہے کی تھالی پر ایک چڑیا بیٹھی ٹھونگے مار رہی ہے۔ میں نے عابدہ کو آواز دی یہ دیکھو چوہے کا پنیر چڑیا کھا رہی ہے۔

وہ دروازے میں آکھڑی ہوئی بولی، کھاتے دو بے چاری بھوکی ہے۔

اس کے بعد روز صبح عابدہ مجھے آواز دیتی۔ چوہا آج بھی نہیں آیا انہی دنوں سکندر آگیا اور زبردستی ہمیں کراچی لے آیا۔

کراچی میں آنے کے بعد میں چوہے کو بالکل بھول چکا تھا۔ اس روز اچانک اس نے چوہے کی بات چھیڑ کر مجھے پریشان کر دیا۔ دراصل میں اس بات پر شرمندگی محسوس کر رہا تھا کہ گاؤں میں اس نے چوہے کی بات چلا کر مجھے احمق بنایا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ چوہے کی بات کا جواب نہیں دوں گا۔

دو روز وہ کسی نہ کسی بہانے چوہے کی بات کرتی رہی مگر میں نے جواب نہ دیا۔

تیسرے دن وہ واپس گاؤں جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ سکندر نے بڑی کوشش کی کہ وہ رک جائے لیکن وہ نہ مانی۔ اگلے روز ہم گاڑی میں سوار ہو گئے۔

راستے میں وہ بار بار گویا اپنے آپ سے کہتی رہی۔ چوہا ہماری راہ دیکھ رہا ہو گا۔ لیکن میں نے جواب نہ دیا۔

اگلے روز ہم ریل گاڑی سے سٹیشن پر اترے جہاں سے تانگہ پر بیٹھ کر گاؤں جانا تھا، تو وہاں فضلا مل گیا۔

میں نے کہا فضلے تو کہاں سے آ رہا ہے۔

وہ بولا شہر سے آیا ہوں سائیں جی کی حاضری دینے گاؤں جا رہا ہوں۔

میں نے کہا فضلے تو سائیں دروٹ کو مانتا ہے کیا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا بولا میں نے سائیں کو دیکھا ہی نہیں تو ماننا کیسا۔

پھر تو مزار پر حاضری کیوں دیتا ہے باقاعدہ۔ میں نے پوچھا۔

اس میں ایک بھید ہے وہ بولا۔

کیا بھید ہے میں نے پوچھا۔

بس اتنا سا بھید ہے فضلے نے کہا کہ دھیان خود سے ہٹا کر دوجے پر لگا دو چاہے وہ پیر ہو فقیر ہو یا چوہا ہو۔

چوہا ہو میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

ہاں وہ بولا چاہے چوہا ہو اور پھر معنی خیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا، بولا آپ چلیں چودھری جی۔ میں نذر نیاز دے کر گاؤں پہنچ جاؤں گا۔

تانگہ چلنے لگا تو میں نے صوبیتا تانگہ والے سے کہا ذرا رک جا اور پھر بے سوچے سمجھے بولا عابدہ۔

عابدہ نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ پتہ نہیں کتنے سالوں بعد میں نے نام لے کر اسے بلایا تھا۔ میں نے کہا عابدہ اس کے لئے کچھ لے جائیں یہاں سے۔

اس کی آنکھوں میں تبسم کی ایک لہر جھلکی، بولی میں لے آئی ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے تھیلے سے ولایتی پنیر کا ایک ڈبہ نکالا اور فکرمند آواز سے بولی سکندر کے ابا وہ ولایتی پنیر کھائے گا کیا!

(ستمبر ۸۶ء)

ہوائے بہار

وہی ہوا ہے یہ جانِ جاناں

جو تیری زلفوں سے کھیلتی تھی

حجاب اُلٹتی، حجاب پہناتی

تمہاری پلکوں کی جھلملاہٹ سے پیام دیتی

سلام دیتی

وہی ہوا ہے

جو میرے بالوں کو چھیڑتی تھی،

تمہارے دستِ حنا کے شانہ سے پیار کرتی

یہی ہوا ہے جو تیرے شب تار کاکلوں کو

گلاب، گاؤں، سبزہ زار [illegible]

میرے ہونٹوں کو گدگداتی

دلوں [illegible] کرتی

چمن کی روحِ رواں تھی، جاں تھی

ابوسعید قریشی

عکسِ تحریر:- ابوسعید قریشی

# گھر سے گھر تک

احمد ندیم قاسمی

حاجی مقتدا احمد کے دیوان خانے میں قدم رکھتے ہی شیخ نور الزماں کی بیوی عشرت خانم، ان کی بیٹی ہما اور بیٹے وقار کا سارا رعب داب صابن کے جھاگ کی طرح فشا فش غائب ہو گیا۔ یہ لوگ جس کار میں حاجی صاحب کے ہاں آئے تھے وہ اتنی لمبی تھی کہ اگر ہوائی اڈے پر کھلے دروازوں کے ساتھ کھڑی ہوتی تو لوگ اسے طیارہ سمجھ بیٹھتے۔ حاجی صاحب کی گلی میں مڑتے ہوئے ڈرائیور کو اسی لئے خاصی دقت ہوئی تھی۔ پھر یہ کار جتنی لمبی تھی اتنی ہی خوبصورت اور چمکیلی بھی تھی۔ اسے دیکھ کر عام آدمی کا ایسا ایک جی چاہتا تھا کہ اسے چھونا اور محسوس کرنا چاہیئے مگر فوراً خیال آتا تھا کہ اس ٹھاٹھ کی کار کو چھونا یقیناً خلافِ قانون ہو گا اور پولیس پکڑ کر لے جائے گی۔

کار حاجی مقتدا احمد کے مکان کے سامنے رکی تو باوردی ڈرائیور نے اتر کر کار کے باقی تینوں دروازے کھولے۔ عشرت خانم، ہما اور وقار پھول میں سے بھونروں کی طرح برآمد ہوئے۔ پھر ڈرائیور نے ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ تینوں دروازے تڑاخ پڑاخ بند کئے تو گلی کے اس سرے سے اُس سرے تک کھڑکیوں میں سے جھانکتی ہوئی عورتوں اور آدھی آدھی لٹکتی ہوئی لڑکیوں کے کلیجے دھک سے رہ گئے۔ ڈرائیور بائیں بازو کو ہوا میں لہرا کر کلائی کو آنکھوں کے قریب لایا اور گھڑی میں وقت دیکھا۔ پھر اپنی سیٹ پر بیٹھ کر مونچھیں مروڑنے لگا۔

حاجی مقتدا احمد کی بیوی نور النساء نے دروازے پر عشرت خانم، ہما اور وقار کا استقبال کیا اور کار کی طرف یوں دیکھا جیسے بچے پیسٹری کی طرف دیکھتے ہیں۔ پھر جب تینوں مہمان حاجی صاحب کے دیوان خانے کا ریشمی پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئے تو پائدان پر ذرا دیر کو یوں کھڑے رہ گئے جیسے آگے قدم بڑھایا تو بے ادبی کا ارتکاب کر بیٹھیں گے۔

سب سے آگے عشرت خانم تھیں۔ انہوں نے قالین پر قدم رکھا تو ڈگمگا گئیں جیسے پھسلنے سے بچی ہیں۔ پلٹ کر انہوں نے ہما کی طرف دیکھا اور شلوار کے پائنچوں کو ذرا سا اُٹھا کر صوفے کی طرف بڑھیں جیسے تالاب میں اُترنے چلی ہیں۔ ہما اور وقار پر بھی کم و بیش یہی عالم گزر گیا۔ نور النساء نے سلیپر پائدان پر اُتار دیئے اور ایک ڈگ بھر کر تخت کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ سب اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھنے لگے تو وقار ایک قدم پیچھے ہٹ کر دروازے کے پاس پلش میں لپٹے ہوئے ایک مونڈھے پر دربان کی طرح بیٹھ گیا۔

نور النساء چونک کر بولیں۔ "اے بنے وقار میاں' یہ کیا کر رہے ہو؟ اے بہن عشرت خانم' اسے سمجھائیے۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ وہیں مونڈھے پر ہی ٹک گیا۔ اٹھو بیٹا اٹھو، صوفے کس لئے رکھے ہیں؟"

عشرت خانم نے وقار سے کہا۔ "سن رہے ہو میاں' تمہاری خالہ جان کیا کہہ رہی ہیں؟"

وقار کچھ اس طرح چل کر صوفے کی طرف گیا جیسے ایک ایک سیڑھی چھوڑ کر زینہ اُتر رہا ہے۔

اس کے بعد تکلفات شروع ہوئے۔ تہذیب برتی جانے لگی۔ موسم کی بوالعجبیوں کا ذکر چلا۔ پھر نور النساء اُٹھیں۔ "ہائے میں نے معصوم

کو تو بتایا ہی نہیں کہ تمہاری خالہ جان آئی ہیں۔"

وقار جو دائیں ٹانگ کو بائیں ٹانگ پر رکھے بیٹھا تھا، بائیں ٹانگ کو دائیں ٹانگ پر رکھ کر اور ہما کی طرف دیکھتے ہوئے یوں مسکرا جیسے کہہ رہا ہے۔ "دیکھئے باجی! انہیں منع کرلیجئے۔"

ہما کھڑکھڑاتے ہوئے ریشم کے لباس کو سنبھالتی ہوئی اٹھی اور مسکرا کر بولی۔ "آپ تشریف رکھئے خالہ جان، معصومہ کو میں لئے آتی ہوں۔"

نورالنساء فوراً بولیں۔ "نہیں نہیں ہما بیٹی۔ تم بیٹھو۔ میں نوکروں سے چائے لگانے کو بھی تو کہہ دوں۔"

نورالنساء سپیر ٹھاتی سیڑھیوں پر چڑھنے لگیں تو ہما بولی۔ "دیکھا اماں۔ میں نہ کہتی تھی۔"

"اسی لئے تو میں آتی نہیں تھی۔" عشرت خانم بولیں۔ "سمجھ میں نہیں آتا حاجی صاحب نے اتنی بہت سی دولت کہاں سے بٹور رکھی ہے؟"

"غالیچہ دیکھئے جیسے سمندر کا جھاگ ہے" ہما نے ہاتھ بڑھا کر غالیچے میں انگلیوں کی پوریں ڈبو دیں۔ "پاؤں رکھو تو تھاہ نہ پاؤ۔ ایک ہزار کا تو ہوگا۔"

"ایک ہزار کا؟" وقار پہلی بار بولا۔ "کمال کرتی ہیں باجی۔ دس ہزار کہیئے۔"

"آہستہ بولو" ہما نے آہستہ سے کہا۔ "جب لڑکیوں کو دیکھنے آتے ہیں تو آہستہ بولتے ہیں۔ یوں سمجھو کہ ہر پردے کے پیچھے کوئی کھڑا تمہاری باتیں سن رہا ہے۔"

"دس ہزار کا اگر صرف یہ غالیچہ ہے تو اس دیوان خانے کا پورا سامان ایک لاکھ سے کم کا کیا ہوگا؟" عشرت خانم نے صوفے میں گھوم کر پورے دیوان خانے پر نظریں دوڑائیں۔ "ایک لاکھ کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔ منہ میں سماتی ہے، جیب میں رکھو تو پھٹ کر نیچے جا پڑے۔"

ہما جو دروازے کے قریب والے صوفے پر بیٹھی تھی۔ چمکتے ہوئے پردے کو چھو کر کہنے لگی۔ "خالص ریشم کے نو پردے ہیں۔" پھر وہ پردے کو ذرا سا جھٹک کر بولی۔ "یہ دیکھئے۔ ذرا سی شکن جو پیدا ہوتی ہے وہ پانی کی لہر کی طرح آخر تک چلی جاتی ہے۔ یہ دیکھئے۔ یہ دیکھئے۔" ہما نے پردے کو دو تین بار جھٹکا۔

"اسے رہنے دے۔" عشرت خانم نے سرزنش کی۔ "کیا کر رہی ہے۔ پردہ گر پڑے گا۔" پھر دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت سے پردے گنتی ہوئی بولیں۔ "ایک دو تین چار پانچ اور چھ۔ اکٹھے چھ پردے ہیں ایک جیسے۔"

"کچھ نہیں تو چھ سو کے تو یہی ہوں گے۔" ہما بولی۔

"لیجئے اور سنیئے" وقار تڑپ اٹھا۔ "باجی تو کمال کر رہی ہیں۔ دو ہزار سے کم کے نہیں ہوں گے۔ لکھوا لیجئے مجھ سے۔"

"صوفہ دیکھئے، بالکل نئے فیشن کا ہے۔" ہما نے تبصرہ جاری رکھا۔ "تپائیوں پر رکھے ہوئے عجائبات دیکھئے۔ وقار مینٹل پیس پر وہ جو ہرن رکھا ہے وہ مٹی کا ہے کہ لکڑی کا؟"

وقار نے ہرن کی طرف جوہری کی طرح دیکھتے ہوئے کہا۔ "نہ مٹی کا ہے نہ لکڑی کا۔ مجھے تو کسی قیمتی پتھر کا معلوم ہوتا ہے شاید عقیق کا ہے۔"

"عقیق کا؟" عشرت خانم ہرن کو دیکھنے کے لئے آدھی اٹھ گئیں۔

"بڑے بڑے گھروں کے دیوان خانے دیکھے ہیں۔" ہما نے جھوم کر کہا۔ "ایسے ٹھاٹھ کہیں نظر نہیں آئے۔"

عشرت خانم ہاتھ مل کر بولیں۔ "اتنے بڑے گھر کی لڑکی جانے مزاج کی کیسی ہوگی۔"

"میں نے تو کہا تھا کہ پہلے دیکھ دکھا لیجئے۔" وقار نے کہا۔

"ہما سے پوچھو۔" عشرت خانم بولیں۔ "مجھے تو یہی گھسیٹے لئے پھر رہی ہے۔"

"دکیا ہے اماں؟" ہما بولی۔ "اس میں نقصان کونسا ہے۔ اتنا بہت سا جہیز ملے گا۔"

"تم بھی تو اتنے بڑے گھر کی بہو بن کر گئی تھیں۔" عشرت خانم اداس ہو گئیں۔ "بتاؤ کیا ملا؟"

"چُپ" ہما نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔

تینوں یوں سنبھل بیٹھے جیسے اُن کی تصویر اترنے والی ہے۔ سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ آ رہی تھی۔ ساتھ ہی بغل والے کمرے میں ریشمی پردے کے اُدھر چینی کے برتن بجنے لگے تھے۔

نورالنسار پردہ ہٹا کر بولیں۔ "آجا بیٹی۔ شرمانے کی کونسی بات ہے۔ اپنی خالہ ہیں۔ اپنی باجی ہما ہیں جن سے تو سلیمہ کے ہاں ملی تھی سب ایسے ہیں۔ آجا۔"

معصومہ کی صورت میں ریشم اور ناخنوں کا ایک ڈھیر دیوان خانے میں داخل ہوا۔ وقار ادب سے کھڑا ہو گیا۔ عشرت خانم اور ہما نے معصومہ کے سر پر ہاتھ رکھا، اور نورالنسا نے معصومہ کو وقار کے بالکل سامنے والے صوفہ پر بٹھا دیا۔

معصومہ ایک دو بار سر پر سے کھسکتے ہوئے دوپٹہ کو درست کرنے کے لئے اپنا ہاتھ یوں ہولے سے اُٹھایا جیسے ذرا تیزی سے ہاتھ اٹھایا تو ریشم کہیں نہ کہیں سے ضرور مسک جائے گا۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھی جہاں بدصورتی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ہما معصومہ سے باتیں کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر "جی" یا "جی نہیں" سے زیادہ اسے کسی سوال کا جواب نہ ملا۔ وقار معصومہ کو یوں چوری چوری دیکھتا رہا جیسے اپنے مکان کی چھت پر کھڑا ہے۔ نورالنسا معصومہ کی سلیقہ مندیوں اور کشیدہ کاریوں کے قصے سُناتی رہیں اور عشرت خانم "ماشاء اللہ، ماشاء اللہ" سے جواب دیتی رہیں۔

پھر جب ستھرے کی صاف ستھری شلوار قمیص میں ملبوس ملازم نے بغل والے کمرے کا دروازہ کھول کر پردہ سرکایا اور سب لوگ طعام گاہ میں داخل ہوئے تو عشرت خانم تو جیسے گونگی ہو کر رہ گئیں۔ اتنی بڑی میز پر بچھے ہوئے منقش پلاسٹک پر انہیں ایسی کراکری نظر آئی جس کے بارے میں انہوں نے بازار میں سے گزرتے ہوئے کئی بار کہا تھا کہ ایسے برتنوں کے لئے دو ہی جگہیں مناسب ہیں۔ دکانوں کے شوکیس یا وزیروں وزراء کی طعام گاہیں مگر یہ تو حاجی مقتدا احمد کا گھر تھا جس کے بارے میں ہما نے انہیں بتایا تھا کہ منیاری کی دکان ہے اور خاصے کھاتے پیتے آدمی ہیں "یہ تو خاصے کھاتے کھلاتے پیتے چھلکاتے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔" عشرت خانم نے سوچا۔ طعام گاہ کے بڑے پن کو صرف ایک ریفریجریٹر کی کمی نے ٹھیس پہنچا رکھی تھی یا معصومہ کی انتہا درجے کی شرم و حیا نے معصومہ نے نہ تو بڑے گھروں کی لڑکیوں کی طرح چہک چہک کر چائے بنائی نہ کوئی پلیٹ اُٹھا کر وقار کو چھوڑ، ہما اور عشرت خانم تک سے کہا کہ یہ خاص میرے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیز ہے۔ نہ اس نے کسی ذرا سی بات پر بڑا سا قہقہہ لگایا اور نہ اس انداز سے تعجب کا اظہار کیا کہ سب لوگوں کی نگاہیں اس پر گڑ جائیں اور اس کی بھووں کے کٹیلے پن اور آنکھوں کے جوہر با طول و عرض سے لے کر اس کی لمبی گردن کے مرمر تک کا جائزہ لے آئیں۔ وہ ہما اور اپنی اماں کے درمیان بیٹھی دیر تک مسلسل ایک ہی بسکٹ کو ذرا چکھتی رہی اور پیالی میں سے ایک ایک قطرہ چائے پی کر پرچ میں اسے یوں کوئی آواز پیدا کئے بغیر رکھتی رہی جیسے پیالی اور پرچ دونوں گتے سے بنی ہیں۔

"حاجی صاحب جب مدن میں بزنس کرتے تھے۔" نورالنسا نے بتایا۔ "تو وہ دنیا جہان کے عجائبات اپنے گھر میں بھرتے رہے۔

چھ قسم کے تو چائے کے صرف روسی سیٹ تھے۔ کافی کے تین سیٹ انہوں نے ولایت جانے والے ایک دوست کے ہاتھ جرمن سے منگائے اور ان کی قیمت جو ادا کی اس کا اندازہ آپ سے زیادہ کس کو ہوگا۔ ایران سے وہ جس آدمی کے ہاں سے قالین منگاتے تھے وہ ان سے یوں خط و کتابت کرتا تھا جیسے حاجی صاحب عدن میں قالینوں کے سوداگر ہیں۔ ایک بار نہیں لکھنے کے کمرے کی میزیں خریدنے کا شوق چرایا تو ایک دو سال کے اندر ساگوان کی اکٹھی پانچ میزیں جمع کر لیں۔ میں چیختی چلاتی تو بجائے اس کے کہ نیلام کر دیتے، یہ انگریز دوستوں کو مفت میں دے آئے۔ نیلام کرتے تو چار پانچ ہزار روپے تو ضرور آجاتے۔ اب آپ سے زیادہ کس کو اندازہ ہوگا کہ نیلام کے دام یہ ہیں تو اصل قیمت کیا ہوگی۔ مگر جب اتنے بڑے بنگلے میں ایک نیا تنکا تک رکھنے کی جگہ نہ رہی اور ادھر اپنے وطن کی آزادی کے بعد انہوں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا تو ساری عمر کی کمائی ہی اونے پونے بیچنا پڑی۔ بڑے بڑے انگریز افسروں اور عرب شیخوں نے آکر بولیاں دیں۔ گھر سے باہر بازار لگ گیا۔ معصومہ اس وقت یہی کوئی چار پانچ سال کی ہوگی۔ اسے بھی یاد ہوگا کہ اس روز کیسے سارا عدن ہمارے گھر سے باہر امڈ پڑا تھا۔ یاد ہے بیٹی؟

"جی" معصومہ بولی۔

"اور بہن عشرت خانم!" نورالنساء نے کہنا شروع کیا۔ "واپس وطن آکر ——"

باہر کا دروازہ کھلا اور صاف ستھرے ملازم نے اندر آکر پوچھا۔ "اور چائے لاؤں بی بی؟"

"لے آؤ۔" نورالنساء فوراً بولیں

عشرت خانم اور ہما چلا اٹھیں۔ "نہیں نہیں۔ ابھی رکھی ہے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی اور ملازم بڑے ادب سے وہیں کھڑا رہا۔

سلسلۂ کلام جاری رکھنے کے لیے نورالنساء نے گلا صاف کیا اور عشرت خانم کی طرف متوجہ ہوئیں مگر فوراً سیدھی ہو بیٹھیں۔ "ہو ملیں ضرورت ہوئی تو بلا لیں گے۔ جاؤ۔"

ملازم چلا گیا تو نورالنساء بولیں۔ "تو بہن۔ وہ میں کہہ رہی تھی کہ وطن واپس آکر حاجی صاحب نے کتابیں جمع کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو اب تک ختم ہونے میں نہیں آیا۔ ادھر جس کمرے میں بھی جائیے، کتابیں ہی کتابیں ٹھنسی پڑی ہیں۔ معصومہ اور میں کسی اور بات کی عادی تھیں۔ سو یہ سب عزیبانہ چیزیں جو آپ کو یہاں نظر آ رہی ہیں وہ ہم دونوں ہی کی دوڑ بھاگ کا نتیجہ ہیں۔ چیزیں میں نے جمع کر دی ہیں، انہیں ترتیب سے لگانے کا سلیقہ معصومہ کا ہے۔"

"ماشاء اللہ، ماشاء اللہ!" عشرت خانم بولیں۔

"سلیقہ ہی تو سب کچھ ہے۔" ہما بولی۔ "ورنہ مشین تو آدمی سے بھی زیادہ تیزی سے کام کر سکتی ہے۔" وقار اپنے مکان کی چھت پر گھر نظر آنے لگا۔

واپس دیوان خانے میں آکر سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے مگر معصومہ کھڑی رہی اور اسے کھڑا دیکھ کر وقار بھی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر نورالنساء نے کہا۔ "ادھر آج میری بیٹی جمیلہ کے بچے آئے ہوتے ہیں۔ صبح سے دھما چوکڑی مچا رکھی ہے۔ معصومہ کو اجازت دیجئے کہ جا کر انہیں سنبھالے۔ چائے پینے میں کپڑے سان دیں گے۔ چھوٹے چھوٹے سے ہیں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" عشرت خانم بولیں۔

"میں بس ایک منٹ میں حاضر ہوئی۔" نورالنساء نے کہا اور بیٹی کے ساتھ باہر چلی گئیں۔ چند منٹ تک ماں، بیٹی اور بیٹا چُپ چاپ بیٹھے رہے جیسے مینار کی سیڑھیاں طے کرنے کے بعد چوٹی پر آئے ہیں تو چکرا گئے ہیں۔

"اماں جی۔" ہما بولی۔ "دیکھا؟"

عشرت خانم ابھی جواب نہیں دے پائی تھیں کہ باہر سے ڈرائیور کی آواز آئی۔ "بی بی جی۔"

"کیا بات ہے؟" عشرت خانم جلدی سے باہر نکلیں۔ ڈرائیور کی بات سُن کر بولیں۔ "بس کوئی پانچ منٹ میں۔ زیادہ نہیں۔" ڈرائیور اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ عشرت خانم نے اُوپر جاتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ ذرا دیر کھڑی سوچتی رہیں۔ پھر دیوان خانے کے دروازے کا پردہ ہٹا کر بولیں۔ "تم دونوں یہیں بیٹھو۔ میں ایک منٹ میں اُوپر سے ہو کر آتی ہوں۔ نورالنساء کے نواسوں نواسیوں کو ایک ایک روپیہ دے آؤں۔"

"ایک ایک روپیہ؟" ہما بولی۔ "نہیں اماں۔ دو دو دیجئے گا۔ کیوں وقار؟"

"اماں کی مرضی ہے۔" وقار بولا

"دو دو دے دوں گی پر نہ جانے ہیں کتنے؟" عشرت خانم سوچنے لگیں۔

ہما نے بڑی ناگواری سے کہا۔ "افوہ اماں۔ کبھی کبھی تو آپ حد کر دیتی ہیں۔ جتنے بھی ہوں پر دیجئے گا دو دو۔"

عشرت خانم نے کچھ کہے بغیر پردہ گرا دیا اور آہستہ آہستہ اُوپر جانے لگیں۔ سیڑھیوں کے پہلے ہی موڑ پر رُک گئیں کیونکہ اوپر سے نورالنساء چلی تھیں۔ انہوں نے عشرت خانم کو یہاں کھڑے دیکھا تو پہلے تو ہکّا بکّا رہ گئیں۔ پھر بولیں۔ "اے بہن۔ دیوان خانے میں جا کر بیٹھئے یہاں کھڑی کیا کر رہی ہیں؟"

"یونہی ذرا جی چاہا کہ اُوپر سے بھی ہو آؤں۔" عشرت خانم نے مُسکرا کر کہا۔ "دو تین منزلوں والے مکان میں گھر کا ماحول اُوپر کے حصّے ہی میں ملتا ہے اور میں گھریلو عورت ہوں۔ پھر آپ کے نواسے نواسیوں کو بھی تو نہیں دیکھا۔ چلئے۔ ملا دیجئے ان سے۔"

"میں انہیں نیچے ہی بُلائے لیتی ہوں۔" نورالنساء بضد رہیں۔ "ایک تو اوپر بچّوں نے دنیا جہان کا کوڑا کباڑ جمع کر رکھا ہے۔ دوسرے ——"

"تو کیا ہوا؟" عشرت خانم نے اگلی سیڑھی پر قدم رکھ دیا اور نورالنساء کو بازو سے پکڑ کر کہا۔ "آئیے۔"

"نیچے ہما بیٹی اور وقار بیٹا کیا کہیں گے کہ —— " نورالنساء نے احتجاج کیا۔

"کچھ نہیں کہیں گے۔" عشرت خانم نے نورالنساء کو کھینچا۔ "میں ان سے کہہ آئی ہوں کہ میں اُوپر جا رہی ہوں۔"

نورالنساء چُپ چاپ عشرت خانم کے ساتھ ہو لیں۔

آخری سیڑھی تک پہنچی تھیں کہ معصومہ کی کھنکتی ہوئی آواز آئی۔ "اے کلثوم۔ اس زاہد کے بچّے کو پکڑ۔ یہ چائے سے سَنے ہوئے ہاتھ لئے میرے کپڑوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں نے تو اتنی دیر تک نیچے بیٹھ کر ان کی استری تک خراب نہیں ہونے دی اور یہ اسے مدھولنے چلا ہے۔ سلیمہ کیا کہے گی کہ ——"

یکایک نورالنساء نے اونچی آواز میں باتیں کرنا شروع کر دیں۔ "میری تو سمجھ میں نہیں آتا بہن کہ آپ کو کس کمرے میں لے جاؤں۔ آج تو یہاں سے وہاں تک بچّوں کا گھر بنا ہوا ہے۔ وہ اٹھا پٹخ مچاتی ہے انہوں نے کہ اللہ میری توبہ ہے۔" پھر جس طرح انہوں نے یکایک بولنا شروع کیا تھا اسی طرح یکایک رُک گئیں اور چہرے پر ایسی کیفیت طاری کر لی جیسے کان لگا کر کچھ سُن رہی ہیں۔

عشرت خانم نے اپنی میزبان کو ایک لمحہ غور سے دیکھا پھر بولیں۔ "اِدھر بچوں کے پاس چلتے ہیں۔"

"ہائے بہن وہاں تو ——" نور النساء جیسے رونے کے قریب پہنچ گئیں مگر عشرت خانم کو بڑھتا دیکھا تو ان کے ساتھ ہولیں۔

"اے ہے بیٹی، کپڑے بدل لئے؟" عشرت خانم دروازے کے سامنے جا کر بولیں اور نور النساء نے قدم روک لئے جیسے معصومہ سے ان کا پردہ ہے۔

میل داغی دیواروں اور جالوں بھری چھت والے اس کمرے کے دروازے پر پُرانے دوپٹے کا ایک ادھورا سا پردہ لٹک رہا تھا جس کا ایک سرا اُٹھا کر کواڑ سے اٹکا دیا گیا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ٹوٹی ہوئی ادوائن کا ایک کھٹولا پڑا تھا جس پر معصومہ کے ریشمی بدس کا ڈھیر رکھا تھا اور پائینتی کے پاس پانچ چھ برس کا ننگا زاہد کھڑا جاتے سے سنی ہوئی انگلیاں چوس رہا تھا۔ اُکھڑے ہوئے سیمنٹ کے فرش پر مختلف عمروں کے پانچ لڑکے لڑکیاں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ چائے ایک کالی بھجنگ پتیلی میں تھی۔ چائے پینے والوں میں سے کسی کے ہاتھ میں مٹی کا پیالہ تھا تو کسی کے سامنے مراد آبادی کٹورا رکھا تھا۔ ایک بچے کے ہاتھ میں چینی کی پیالی تھی جس کی دستی ٹوٹ چکی تھی۔ ایک لڑکی نے ہاتھوں کو چائے کی تپش سے بچانے کے لئے ایلومونیم کے ایک ٹیڑھے میڑھے گلاس کو اپنی فراک میں لے کر اسے دونوں ہاتھوں میں یوں مُٹھ رکھا تھا کہ اس کا ننھا سا پیٹ دکھائی دے رہا تھا۔ بڑی لڑکی کلثوم کے سامنے ایک پلیٹ میں لال شکر رکھی تھی جسے مکھیوں نے سیاہ کوڑ لا تھا۔ وہ کرے ہوئے کناروں والی ایک پرچ میں چائے پی رہی تھی۔ معصومہ میلی چیکٹ شلوار اور قمیض پر ایک چیکٹ چیکٹ دوپٹہ اوڑھے ننگے پاؤں یوں کھڑی تھی جیسے اسے چھو لیا جائے تو گر پڑے گی۔ اس کی لمبی سیاہ آنکھوں میں خوف گھس گیا تھا اور اس کے گلابی ہونٹوں پر نیل پڑ رہے تھے۔

عشرت خانم دروازے میں کھڑی یہ منظر دیکھتی رہیں۔ پھر مسکرا کر نور النساء کی طرف دیکھا تو وہ غائب تھیں۔ "اے بہن نور النساء" وہ پکاریں۔ جواب نہ پا کر سنجیدہ ہو گئیں اور اِدھر اُدھر دیکھ کر آگے بڑھ گئیں۔ ساتھ والے کمرے سے برتنوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کے دروازے پر پہنچیں تو دیکھا کہ نور النساء جلدی جلدی سے برتن سمیٹ رہی ہیں۔ "بہن" انہوں نے کہا اور نور النساء سناٹے میں آ گئیں۔ پھر بولیں۔ "یہ باورچی خانہ ہے مگر بچوں نے آج اسے کباڑ خانہ بنا رکھا ہے۔ ہائے بہن، مجھے تو ——"

پھر وہ خاموش ہو گئیں۔ ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو خاموش ہو جاتا۔ وجہ یہ تھی کہ عشرت خانم ہنس رہی تھیں۔

معصومہ پرلے دروازے میں سے ڈری ڈری جھانک رہی تھی جیسے وہ ایک ایسی گاڑی میں سوار ہے جس کی بس ایک دو لمحوں کے اندر مخالف سمت سے آتی ہوئی گاڑی کے ساتھ ٹکر ہونے والی ہے۔

عشرت خانم ہنسے جا رہی تھیں اور اب پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ "ہائے میرے اللہ" وہ بڑی مشکل سے بولیں۔ "توبہ ہے" انہوں نے بڑی محنت سے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا اور پھر سامنے دیکھا۔

نور النساء کے ایک ہاتھ میں پتیلی اور دوسرے ہاتھ میں اپنا سر تھا اور وہ یوں بیٹھی تھیں جیسے مٹی کی بیٹھی رہ گئی ہیں۔

عشرت خانم پر ہنسی کا ایک اور دورہ پڑا۔ "اے بہن معاف کرنا" وہ بولیں۔ "آپ نے مجھے یہ ٹوٹے ہوئے پیالے اور یہ پچکی ہوئی پتیلیاں پہلے کیوں نہیں دکھائیں؟ یہ کالی میلی دیواریں، اور یہ پُرانے دوپٹوں کے پردے آپ نے اوپر کیوں چھپا رکھے تھے؟ یہ ننگے اور ادھ ننگے بے دُھلے بے جامہ بچے، وہ ٹوٹا ہوا کھٹولا اور یہ بے گنڈے کا توا۔ اے بہن نور النساء۔ آپ نے یہ سب کچھ مجھ سے کیوں چھپایا؟ اور ذرا ادھر تو دیکھئے بہن" عشرت خانم اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ "وہ کیا رکھا ہے؟ اچھا تو وہ تمام چینی کی چوٹ لگی پلیٹیں ہیں جن کے کناروں پر چنے کی دال تک جمی ہوئی ہے۔ ادھر معصومہ بیٹی کے کمرے میں جو چارپائی رکھی ہے اس کی ادوائن کو پورا کرنے کے لئے رسّی کے ساتھ کسی کا کمربند بھی تو باندھ

دیا گیا ہے۔" عشرت خانم نے یہاں رُک کر دو تین قہقہے مارے۔ پھر آنکھیں پونچھنے کے لئے اپنے دوپٹے کا پلو پکڑا مگر دوپٹے کو ابھی آنکھوں تک نہیں لے گئی تھیں کہ دیکھا، نورالنساء کو یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگیں جیسے گھنی دُھند میں راستہ ڈھونڈ رہی ہیں۔ "بہن" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئیں۔

عشرت خانم باورچی خانے میں داخل ہو کر نورالنساء کے پاس بیٹھ گئیں۔ نورالنساء کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں سے بینائی جیسے چوس لی گئی تھی۔

"دیکھئے بہن۔ مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا ہے" عشرت خانم نے کہا۔ "نیچے سیڑھیوں میں۔ الگ سے"

نورالنساء گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھیں تو ان کی ریڑھ کی ہڈی میں سے چٹاک پٹاک کی دو تین آوازیں آئیں جیسے تیز ہوا میں خشک ٹہنیاں ٹوٹ رہی ہیں۔

عشرت خانم منہ میں دوپٹے کا ایک پلو ٹھونسے اور ادھر اُدھر دیکھے بغیر چند سیڑھیاں اُتر گئیں۔ پھر رُک کر اُوپر دیکھا۔ نورالنساء برسوں کے مریضوں کی طرح سیڑھیوں کے جنگلے کے سہارے آہستہ آہستہ اتر رہی تھیں۔ جب وہ عشرت خانم کے قریب آئیں تو آنکھیں جھکا کر اُتری چلی گئیں مگر عشرت خانم نے انہیں بازو سے پکڑ کر روک لیا۔ پھر انہیں اپنے مقابل کھڑا کر کے منہ میں سے دوپٹہ نکالا اور بجائے بولنے کے ہنسنے لگیں۔

"جوتیاں مار لیجئے بہن عشرت خانم" نورالنساء کی کہیں دُور سے آواز آئی۔ "پر یہ جو آپ کی ہنسی —— "

نورالنساء آگے کچھ نہ کہہ سکیں کیونکہ نیچے کسی نے دروازے پر دستک دے دی۔ نورالنساء بھڑک کر تیزی کے ساتھ نیچے اُتریں مگر جب تک وہ سیڑھیاں اُتریں، ایک لڑکے نے دروازہ کھولتے ہی کڑک کر کہہ دیا "بی بی جی سلام۔ آپا جی کہہ رہی ہیں کہ جب مہمان چلے جائیں تو ہمیں جلدی سے بتا دیجئے گا۔ کہتی ہیں قالین اور صوفہ اور پردے بے شک کل تک رکھے رہیں۔ برتن اور سجاوٹ کی چیزیں ہم آج ہی واپس منگا لیں گے۔ صبح سویرے ہمارے ہاں بھی مہمان آ رہے ہیں۔"

نورالنساء آخری سیڑھی پر جنگلے کو مٹھی میں دبوچے کھڑی تھیں۔ انہوں نے صرف گردن کی جنبش سے "اچھا" کہا۔ لڑکا دھڑ سے دروازہ بند کر کے چلا گیا اور نورالنساء آخری سیڑھی پر جیسے گر پڑیں۔

"ڈرائیور" عشرت خانم زور سے پکاریں۔ اور دیوان خانے کا پردہ ہٹا کر ہما نے جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں اماں جی۔ کیا ہے؟"

"میں نے ڈرائیور کو بلایا ہے۔ تم اندر بیٹھو" عشرت خانم بولیں۔ "اور دیکھو۔ صوفے پر احتیاط سے بیٹھو۔ کپڑوں میں شکن نہ آئے۔ تمہاری بہن کیا کہے گی کہ مانگ کر پہننے کو لے گئیں اور گندا کر کے واپس کئے۔"

"اماں" ہما کے سینے پر عشرت خانم نے جیسے مکا مار دیا۔ پھر وہ تیورا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"بڑی بے لحاظ ہوتی ہیں اس زمانے کی لڑکیاں" عشرت خانم نے نورالنساء کے پاس آخری سیڑھی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مانگے کے کپڑے یوں پہنتی ہیں جیسے باپ نے خرید کر دئے ہیں" پھر وہ ہنسنے لگیں اور ادھر پہلی بار نورالنساء کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ کا پرتو پڑا۔

"ڈرائیور" عشرت خانم نے اُٹھ کر باہر کا دروازہ کھول دیا۔ ڈرائیور سامنے آیا تو وہ بولیں۔ "بھئی دیکھو۔ تم کار واپس لے جاؤ۔ ہم لوگ تانگے سے آ جائیں گے۔ بیگم صاحب کو سینما دیکھنے جانا ہے تو یہ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا کہ کار کے مالک تو دوسروں سے کار مانگتے پھریں اور جو ایک گھنٹے کے لئے کار مانگ کر لائے ہیں وہ اس پر قبضہ جما کر بیٹھ جائیں۔ کہنا بہت بہت شکریہ" —— پھر پانچ روپے کا ایک نوٹ بڑھ

کر بولیں "یہ لو۔ تمہارا انعام ہے۔"

ڈرائیور سلام کر کے پلٹ گیا تو عشرت خانم دروازہ بند کر کے ہنسنے لگیں۔ پھر وہ اسی طرح ہنستی ہوئی بڑھیں اور نور النساء سے لپٹ کر بولیں۔ "اے بہن نور النساء خدا کے لئے ہنسنے۔ کیا یہ ہنسی کی بات نہیں ہے! اے بہن کیا یہ ہنسی کی بات نہیں ہے کہ انسان اپنے گھر سے نکل کر کسی دوسرے کے گھر جائے تو اپنے ہی گھر جا نکلے۔ اور بہن۔ میری معصومہ بھی اپنے گھر سے چلے گی تو اپنے ہی گھر جائے گی۔

اب نور النساء کھُل کر مسکرا رہی تھیں۔

باہر کار سٹارٹ ہوئی اور ڈرائیور نے رخصت کا ہارن دیا تو وقار جھپٹ کر دیوان خانے پر آیا۔ "اماں جی۔ کار تو جا رہی ہے۔"

"جا رہی ہے تو جانے دو۔" عشرت خانم بولیں۔ "کیا یہ تمہارے باپ کی کار ہے؟"

وقار جھینپ کر پیچھے ہٹ گیا اور نور النساء پہلی بار قہقہہ مار کر عشرت خانم سے لپٹ گئیں۔ دونوں کی ہنسی وقار اور ہما کو ایک بار پھر دیوان خانے کے دروازے پر کھینچ لائی۔ جہاں وہ ریشمی پردہ ہٹا کر تلوں کی سی گول گول حیران حیران آنکھوں سے دونوں کو دیکھنے لگے۔ اوپر سیڑھیوں کے پہلے موڑ پر معصومہ کھڑی نیچے یوں دیکھ رہی تھی جیسے مداری نے ٹوکری کے نیچے جلا ہوا کاغذ رکھنے کے بعد اس میں سے کبوتر نکال لیا ہے اور عشرت خانم کہہ رہی تھیں۔ "ہائے بہن نور النساء میرے تو پیٹ میں بل پڑ گئے۔ قسم قرآن مجید کی، پسینہ سرخی پوڈر بہا لے جاتا ہے تو نیچے سے کیسے سچے اور کھرے چہرے نکل آتے ہیں۔ ہائے مجھے کتنا پیار آ رہا ہے آپ پر۔ آئیے ذرا اوپر گاؤ تکیے پر باورچی خانے کے تخت پر بیٹھیں۔

گست ۱۹۵۹ء

اے ہوائے عنبر و جلال چل مجھے خاک و آب سے پار کر

مجھے توڑ شاخِ سکوت سے کسی موجِ تند کا بار کر

جو پلا تھا خواہشِ خون میں مجھے اس تپاک سے دور کر

جو بنا ہو سنگِ فساد سے نہ وہ شہر میرا دیار کر

# گوندنی والا تکیہ

غلام عباس

خدا خدا کرکے ریل کا طولانی سفر ختم ہوا اور میں اپنا سوٹ کیس اور بیگ اٹھا، مسافروں کے جمگھٹے سے نکلا اور اپنے قصبے کے چھوٹے سے اسٹیشن پر اتر پڑا۔

میں ایک طویل مدت کے بعد اس خطۂ زمین پر دوبارہ قدم رکھ رہا تھا جو میرا آبائی وطن تھا۔ مگر سفر کی تکان، سردی اور بے خوابی کی وجہ سے دل و دماغ پر کچھ ایسا بوجھ تھا کہ نہ تو حُبّ الوطن نے میرے دل میں سوز و گداز کی کوئی کیفیت پیدا کی اور نہ وہ عرفانی مسرت اور ذہنی آسودگی ہی حاصل ہوئی جو وطن واپس آنے پر عموماً لوگوں کو ہوا کرتی ہے۔ اس کے برعکس میں یہاں آکر ایک اجنبیت سی محسوس کرنے لگا تھا اور چاہتا تھا کہ جلد سے جلد منزلِ مقصود پر پہنچ جاؤں۔

میں ابھی بچہ ہی تھا کہ والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا اور جب والد نے انتقال کیا تو میری عمر تقریباً سترہ برس کی تھی۔ اس صدمے سے دل اچاٹ ہوگیا تھا۔ نہ کوئی بھائی تھا نہ بہن۔ اٹھتی جوانی تھی، دل میں امنگیں تھیں۔ سر میں آزادی کی دُھن ایسی سمائی کہ ایک رات چپکے سے گھر سے نکل کھڑا ہوا، اور جدھر منہ اٹھا چل دیا تھا۔

سیاحت کے شوق اور معاش کی تلاش نے مجھ سے ملک ملک کی خاک چھنوائی تھی اور آخر کار میں سمندر پار ایک غیر علاقے میں جا کے بس گیا تھا۔ میں نے کچھ دولت یا ثروت حاصل نہیں کی تھی۔ معمولی تجارت کا کاروبار تھا۔ مگر میں اس میں کچھ ایسی بری طرح پھنس گیا تھا کہ نہ نکلتے بنتی تھی نہ چھوڑتے۔ پھر میں نے شادی بھی وہیں کر لی تھی جس نے اور بھی پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں اور میں وہیں کا ہو کے رہ گیا تھا۔

اب جبکہ کوئی بیس پچیس برس کے بعد بعض اہم کاروباری امور کے سلسلے میں میرا وطن کا چکر لگانا ناگزیر ہوگیا تھا تو میں نے سوچا تھا کہ واپسی پر اپنے اس جنم بھوم کو بھی ایک نظر دیکھتا چلوں گا۔ میرے اس ارادے کو اس وجہ سے اور بھی تقویت حاصل ہوئی کہ اس قصبے میں ہماری کچھ آبائی جائیداد تھی جس کی فروخت کی بات چیت ایک عرصے سے ہو رہی تھی۔ مگر چونکہ اس کے ورثا میں میں بھی شامل تھا اس لیے میری عدم موجودگی میں اس کی تکمیل نہ ہو سکی تھی، لہٰذا اس سلسلے میں میرا یہاں آنا لازمی ہوگیا تھا۔

اس پچیس برس کے طویل عرصے میں، جو میں نے باہر گزارا تھا، قصبے کے اسٹیشن میں تو کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ البتہ سٹیشن سے باہر نکلتے ہی مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نئی جگہ پہنچ گیا ہوں۔ قصبہ پہلے کی نسبت بہت بہت پھیل گیا تھا۔ جو علاقے میرے ہوش میں ٹھاٹ بنے ہوئے تھے وہاں اب چھوٹے چھوٹے بازار بن گئے تھے۔ ہر طرف چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔ اسٹیشن کے باہر جہاں کبھی اکّا دکّا سکّہ سے مڈ بھیڑ ہوتا تھا وہاں اب تانگوں اور ٹیکسیوں کے لیے علیحدہ علیحدہ اڈے بنے ہوئے تھے۔

دیکھتے ہی دو تین تانگے والے شور مچاتے ہوئے لپکے۔ میں نے ایک کو اس ہوٹل کا پتہ بتایا جس میں ٹھہرنے کی وکیل نے مجھے ہدایت کی تھی اور اپنا مختصر سا اسباب اس کے تانگے میں رکھ کے سوار ہوگیا۔ جائیداد کے دوسرے ورثا کو جو میرے چچیرے بھائی، بہنیں

تھیں کل پہنچنا تھا۔ میں ان سے ایک روز پہلے اس لئے آگیا تھا کہ اپنے مولد کو اطمینان سے دیکھ سکوں۔

تانگہ چلا تو میں نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینا شروع کیا۔ جا بجا پختہ اینٹ کی نئی ہوئی عمارتیں نظر آئیں۔ کچے گھروندے بھی دکھائی دیئے۔ مگر خال خال۔ اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا پارک بھی دیکھنے میں آیا جس میں لوگ گھاس پر بیٹھے دھوپ کھا رہے تھے۔ غرض قصبے کو جدید طرز پر لانے کی پوری کوشش کی جا رہی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ میرے بعد اس قصبے نے حد درجے کی ترقی کر لی تھی اور مجھے اس پر خوشی ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن اس کو کیا کروں کہ میں جوں جوں اسے دیکھتا جاتا تھا میرے دل میں بیگانگی کا احساس بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔ اسٹیشن کے سوا مجھے اب تک کوئی مانوس پہچانی چیز نظر نہیں آئی تھی۔ کوئی ایسی چیز جس کو دیکھ کر بچپن کی کوئی بھولی بسری یاد تازہ ہو جاتی۔

تھوڑی دیر میں تانگہ ہوٹل کے پاس پہنچ گیا۔ باہر سے دیکھنے میں یہ ویسا ہی تھا جیسے شہروں میں معمولی درجے کے ہوٹل ہوا کرتے ہیں۔ تانگے والے نے بتایا کہ آس پاس اور بھی کئی ہوٹل ہیں مگر سب میں اچھا یہی ہے۔ قصبے میں ہوٹلوں کا کھل جانا بھی بلا شبہ اس کی ترقی کی علامتوں میں سے تھا۔ کیونکہ میرے زمانے میں تو یہاں فقط ایک سرائے ہوا کرتی تھی۔

ہوٹل کا منیجر یا مالک جو بھی وہ تھا، تپاک سے مجھ سے ملا۔ اُس نے کہا:

"یہاں آپ کو اپنے شہر کا سا آرام تو نہیں مل سکتا۔ البتہ جس چیز کی ضرورت ہو، بلا تکلف کہہ دیجیئے گا۔ ہم حتی الامکان اُسے مہیا کرنے کی کوشش کریں گے۔"

اپنے لہجے کی طرح اپنی وضع قطع اور لباس سے بھی وہ خاصا مہذب معلوم ہوتا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا مگر خوب چست اور تو، کاروباری آدمی تھا۔ ابھی تک کسی بات سے اُس کا قصباتی پن ظاہر نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ نہ جانے میں نے اُسے یہ بتانا کیوں مناسب نہیں سمجھا کہ میں اسی قصبے کا قدیمی باشندہ ہوں۔

ایک خالی کمرہ جو سب میں بڑا اور صاف تھا مجھے رہنے کو دے دیا گیا۔ اس میں ایک نواڑی پلنگ جس کی نواڑ خاصی میلی ہو چکی تھی، ایک پرانی میز اور دو کرسیاں تھیں۔ علاوہ ازیں ایک دیسی ساخت کا آئینہ، دو تین قطعات چوکھٹوں میں جڑے ہوئے، بعض فلمی ستاروں کے رنگین فوٹو اور ایک پچھلے سال کا کیلنڈر جس پر کسی چھاپے خانے کے معمر پروپرائٹر کی تصویر تھی، دیواروں پر مختلف زاویوں سے لٹکے ہوئے کمرے کی زینت بڑھا رہے تھے۔ میز پر پیتل کی ایک منقش گول راکھ دانی بھی رکھی تھی۔ غرض مسافروں کے آرام کا حتی المقدور خیال رکھا گیا تھا۔

میں نے اپنا سوٹ کیس اور بیگ کمرے میں ایک طرف رکھوا دیا۔ غسل خانے میں جا کر ہاتھ منہ دھویا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت نکل ہی چکا تھا اس لئے صرف چائے اور انڈے پر اکتفا کی۔ اس کے بعد بیگ سے اپنا مختصر سا بستر نکالا اور کمبل اوڑھ کر پلنگ پر دراز ہو گیا۔ ذرا سی دیر میں آنکھ لگ گئی۔

کوئی دو گھنٹے کے بعد اُٹھا تو طبیعت بحال تھی۔ سفر کی تکان بڑی حد تک دور ہو چکی تھی۔ شام ہونے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور قصبے میں گھومنے کے لئے نکل گیا۔

صبح سے اب تک نئی آبادی دیکھ دیکھ کر طبیعت بھر چکی تھی۔ چنانچہ اب میرے قدم کشاں کشاں مجھے اس محلے کی طرف لئے جا رہے تھے۔ جہاں میں نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ وہ علاقہ ہوٹل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ البتہ نئے نئے بازار اور سڑکیں بن جانے سے مجھے دو چار جگہ راستہ معلوم کرنے میں دقت ہوئی۔ لیکن بالآخر میں نے اپنے کو اس قدیمی مکان کے دروازے کے سامنے پایا جس میں میری نال گڑی تھی یہ اور اس کے ساتھ والا مکان جو تقریباً ایک ہی وضع کے تھے، میرے جدِ امجد نے تعمیر کرائے تھے

اور ان کی فروخت کے سلسلے میں یہاں آیا تھا۔ دونوں مکان ایک مدت سے کرائے پر اُٹھا دیئے گئے تھے۔ کیونکہ میرے بعد میرے اقربا نے بھی رفتہ رفتہ شہروں کی سکونت اختیار کر لی تھی۔

دونوں مکانوں کے آگے ڈیوڑھیاں تھیں، جیسی عموماً پرانی طرز کے مکانوں میں ہوا کرتی تھیں۔ ان کے دروازوں پر ٹاٹ کے بوسیدہ پردے پڑے ہوئے تھے اور چار پانچ بچے، قریب قریب ایک ہی عمر کے میلے کچیلے کپڑے اور سوئٹر پہنے دہلیزوں پر بیٹھے کھیل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ایک بچے نے نہ جانے کس جذبے کے ماتحت اچانک ہنسنا شروع کر دیا۔ میں بھی بے اختیار مسکرا دیا۔ جی میں آیا ان بچوں کو کچھ پیسے دوں۔ مگر اس خیال سے کہ شاید ان کے ماں باپ بُرا مانیں، میں نے ہاتھ روک لیا اور جو بچہ ہنستا تھا اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

میں یہاں پل بھر ہی کو رُکا تھا مگر اس ذرا سے وقفے میں میرا تمام بچپن میری نظروں کے سامنے سے پھر گیا تھا۔ اس بچے کی معصوم ہنسی نے بیگانگی کے طلسم کو، جو صبح سے مجھ پر مسلط تھا، یکبارگی توڑ دیا تھا۔ میرا دل شدتِ جذبات سے بھر آیا تھا۔ چاہتا تھا بار بار اس کوچے کا طوف کروں، لیکن میں نے جلد ہی اپنے پر قابو پا لیا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس محلے میں کوئی خاص تغیر نہیں ہوا تھا۔ یہ قریب قریب ویسا ہی تھا جیسا میں اسے چھوڑ گیا تھا۔

ہمارے گھر سے کوئی دو سو گز کے فاصلے پر ایک کھلا میدان ہوا کرتا تھا جس میں ہم لڑکے اسکول سے آنے کے بعد کھیلا کرتے تھے اور یہیں وہ پُرانا تکیہ بھی تھا جس کو گوندنی والا تکیہ کہتے تھے کیونکہ اس میں گوندنی کے آٹھ دس پیڑ تھے۔ ہم لڑکپن میں اکثر ان درختوں کی چھاؤں میں کھیلا کرتے تھے اور گوندنی کا موسم آتا تو درختوں پر چڑھ کے گوندنی توڑا کرتے تھے۔ تکیے کا سائیں ہمیں گوندنی توڑنے سے کبھی منع نہیں کرتا تھا۔ البتہ جب کبھی کوئی لڑکا شاخ توڑ دیتا تو وہ بہت ناراض ہوا کرتا تھا اور کبھی کبھی کان بھی امیٹھ دیا کرتا تھا اس کا یہ قاعدہ بھی تھا کہ ہم گوندنی توڑنے کے بعد اس کو دکھا کے لے جائیں۔ اس نے ہم سے کبھی گوندنی نہیں لی تھی۔ مگر اس قاعدے کی بڑی سختی سے پابندی کرائی جاتی تھی۔ اگر معلوم ہو جاتا کہ کوئی لڑکا اُسے دکھائے بغیر گوندنی لے گیا ہے تو وہ اس کا حُلیہ یاد رکھتا اور پھر کبھی اُسے درخت پر چڑھنے نہیں دیتا تھا

کئی مرتبہ دکان داروں نے گوندنی کے موسم میں ان درختوں کے پھل کا ٹھیکہ لینے کے لئے اُسے خاصی معقول رقمیں پیش کی تھیں۔ مگر اس نے کبھی منظور نہیں کیا تھا۔ وہ کہا کرتا یہ تو محلے کے بچوں کا مال ہے۔

یہاں سے میں نے سیدھا اُسی تکیے کا رُخ کیا۔ مگر وہاں اب ایک چار دیواری بنا دی گئی تھی۔ میں نے اس کے دروازے کے اندر جھانک کر دیکھا تو ایک مدرسے کے سے آثار دکھائی دیئے۔ ایک لڑکا باہر نکل رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیوں میاں گوندنی والا تکیہ ہوا کرتا تھا وہ کیا ہوا؟"

لڑکے نے جس کی عمر کوئی دس گیارہ برس کی ہو گی، جواب دیا۔

"کونسا تکیہ؟ ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔" "کیا تم یہیں پیدا ہوئے تھے؟"

"جی ہاں۔ وہ سامنے اونچے نجار پچے والا ہمارا ہی گھر ہے۔"

اتنے میں ایک معمر شخص پاس سے گزرے تو میں نے اُن سے دریافت کیا:۔

"کیوں حضرت یہاں جو گوندنی والا تکیہ ہوا کرتا تھا کیا ہوا؟" اُن صاحب نے مجھ پر سر سے پیر تک ایک نظر ڈالی اور فرمایا:

"آپ شاید بہت مدت کے بعد یہاں آئے ہیں؟"

"بجا فرمایا آپ نے۔ کوئی پچیس برس کے بعد۔"

"جی ہاں تو۔ صاحب وہ تکیہ مٹوا دیا گیا تھا۔"

اگر زحمت نہ ہوا تو ذرا اس کی تفصیل سے آگاہ کیجئے۔ میں ممنون ہوں گا"۔ ایک مختامل کرکے یوں گویا ہوئے:۔

"پندرہ یا شاید سولہ برس ہوئے کہ اس تکئے کے متوفی کا انتقال ہوگیا۔ بھلا سا نام تھا اس کا:"

"نگینہ سائیں"۔ میں نے کہا۔

"ہاں ہاں وہی۔ وہ خود تو بہت اچھا تھا لیکن اس کے بعد جو لوگ اس تکئیے پر قابض ہوئے وہ اچھے نہیں تھے۔ نتیجہ یہ کہ یہ اچھا خاصا اوباشی کا اڈا بن گیا۔ اس پر پے در پے کچھ ایسی وارداتیں ہوئیں کہ آخر کار قصبے والوں نے آپس میں مشورہ کرکے اس کی جگہ ایک مدرسہ قائم کر دیا"۔

"اس تکئے میں کسی بزرگ کا مزار بھی تو ہوا کرتا تھا؟"

"جی ہاں مستان شاہ کا۔ وہ مزار اب بھی مدرسے کے صحن میں موجود ہے مگر کسی مجاور کو رہنے کی اجازت نہیں۔ مدرسے کے معلم خود ہی اس کی دیکھ بھال کر لیتے ہیں"۔

"گوندنی کے درخت تو کٹوا ہی دیئے گئے ہوں گے؟"

"جی ہاں فقط ایک رہنے دیا گیا ہے جو مستان شاہ کی قبر پہ سایہ کئے ہوئے ہے"۔

میں نے ان بزرگ کا بڑی گرمجوشی سے شکریہ ادا کیا اور مدرسے کے اندر داخل ہوگیا۔ صحن میں پختہ اینٹ کا فرش تھا جس کے ایک گوشے میں ایک چھوٹے سے گوندنی کے پیڑ کے نیچے ایک قبر نظر آئی۔ یہ سبز رنگ کی ایک بوسیدہ سی چادر سے ڈھکی ہوئی تھی جس پر کچھ سوکھے ہوئے پھول پڑے تھے۔ میں نے قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی۔ پھر کسی سے کچھ کہے سنے بغیر واپس ہوٹل کو چل دیا۔

اپنے کمرے میں پہنچا تو حد درجے کی پژمردگی مجھ پر طاری تھی۔ اس تکئے کے اٹھ جانے کا مجھے دلی صدمہ ہوا تھا۔ مگر میں قصبے والوں کو الزام نہیں دیتا۔ شاید اس زمانے کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ اپنے فیصلے میں حق بجانب ہوں۔ ممکن ہے میں اس زمانے میں یہاں ہوتا تو ان ہی کا ساتھ دیتا۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ یہ تکیہ غریب غربا کا مونس اور سارے قصبے کی تفریح گاہ تھا۔ جس سے وہ ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئے تھے۔

وہ علی الصباح تکئے سے بھیروں کے میٹھے سروں میں اللہ ہو، اللہ، جل شان اللہ کا نغمہ بلند ہونا۔ وہ قوالی کی محفلیں، وہ پنجابی کے مشاعرے، وہ مرغوں کی پالیاں وہ گویوں کے مقابلے، وہ گوندنی کے پیڑوں سے ٹنگے ہوئے پنجروں میں تیتروں کا "سبحان تیری قدرت" چہکارنا، دوپہر کو پیڑوں کی چھاؤں میں کہیں شطرنج کی بازی ہو رہی ہے۔ کہیں ہیر پڑھی جا رہی ہے۔ کہیں کوئی نومشق ستار کی مشق کر رہا ہے۔ پاس ہی بچے اور ریٹھے کی گولیوں سے کھیل رہے ہیں، کبھی کبھی ان کی کسی شرارت یا زیادہ شور مچانے پر بڑوں میں سے کوئی آکر ایک آدھ چپت لگا جاتا ہے اور بچے پھر کھیل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

اور پھر اس تکئے کی جان اس کا بالا بند سائیں گلے میں رنگ برنگی منکوں کی مالا پہنے سردی ہو یا گرمی ایک پھٹی ہوئی کالی کملی میں نیم برہنہ جسم کو چھپائے کبھی فرزانہ کبھی دیوانہ مگر بہرحال میں ہر کہ و مہ کی تواضع کے لئے مستعد ......

شام ہو چکی تھی اور اس کے ساتھ خنکی بھی بڑھ گئی تھی۔ میں نے بجلی روشن نہیں کی تھی کیونکہ کمرے کی نیم تاریکی سکون بخش تھی۔ میں نے شانوں پر کمبل ڈال لیا تھا اور کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ گوندنی والا تکیہ اپنی پوری گہما گہمیوں کے ساتھ ابھی تک میری نظروں میں پھر رہا تھا۔

(ناول کا ایک باب)

فروری ۱۹۵۲ء

# جب سنت رام نے بیلن اٹھایا

اوپندرناتھ اشک

سنت رام میرا نوکر نہ تھا۔ بس سلام دعا ہی کا رشتہ تھا۔ میرے بلاک کے اُوپر دوسری منزل میں رہنے والے ایک سندھی سیٹھ کے ہاں وہ کام کرتا تھا۔ کانگڑے کا رہنے والا تھا۔ کبھی خطوط پڑھانے میرے پاس آجاتا تھا اور اسی ناطے سے میرے چھوٹے موٹے کام کر دیتا۔ ساڑھے پانچ ہاتھ کا گورا چٹا خوبصورت اور مضبوط آدمی لیکن عجز اور انکسار کا پتلا۔ باتیں کرتا تو کبھی آنکھ اُوپر نہ اٹھاتا۔

ایک دن پڑوس میں کچھ شور سُن کر میں اپنے دروازے کی چوکھٹ میں آکھڑا ہوا۔ تب ہی سنت رام میرے سامنے سے بھاگتا ہوا سا گیا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی کچھ جھگڑا ہو رہا ہے، ابھی آکر بتاتا ہوں"

چند ہی منٹ بعد وہ واپس آگیا۔ معلوم ہوا کہ پڑوس کے سیٹھ کی جو نئی بیوی آئی ہے وہ نوکر چھوکرے کو بڑا پریشان کرتی ہے۔ ابھی ابھی اس نے چھوکرے کو گالی دی، چھوکرا جوان ہے، اس سے برداشت نہیں ہوئی۔ اس نے احتجاج کیا تو بڑھشو کی اس "لاڈلی" نے دھڑ سے ایک تھپڑ اس کے منہ پر جا دیا۔ چھوکرے نے اپنا حساب مانگا تو کہنے لگی کہ پندرہ دن کا نوٹس دئے بغیر تو جا کیسے سکتا ہے؟ چھوکرے نے ضد کی تو بڑھشو بھی اپنی لاڈلی کی مدد کو آگیا۔ چار چھ تھپڑ اس نے جڑ دئے۔ شور سُن کر پڑوسی اکٹھے ہو گئے۔ لیکن سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ چھوکرے نے پندرہ دن کام کرنا منظور کر لیا ہے اور سیٹھ نے پندرہ دن کے بعد اسے چھٹی دینے کی بات مان لی ہے۔

"سالا چھ ہاتھ کا گبرو جوان ہے" سنت رام نے جھگڑے کی رپورٹ دے کر اپنی طرف سے ایزادی کی۔ "تھپڑ اور گالیاں کھا کر جواب نہ دے سکتا تھا تو کام تو چھوڑ سکتا تھا۔ دس پندرہ دن کی پگار[1] اچھی کہ عزت"

میں حیرت سے سنت رام کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ میں نے کبھی اسے بلند آواز سے بولتے نہ سُنا تھا۔ لیکن اس وقت نہ صرف اس کی آواز بلند تھی بلکہ اس کی آنکھیں بھی لال انگارہ ہو رہی تھیں، گویا بے عزتی چھوکرے کی نہیں خود اس کی ہوئی ہو۔

"اب تو صاحب بیوی ہے، بچے ہیں اور گھر کی ضرورتوں نے خون کی تمام گرمی نکال دی ہے۔ چار باتیں سُن کر بھی چُپ رہنا سیکھ گئے ہیں" سنت رام کہنے لگا "ورنہ جب میں اس چھوکرے کی عمر کا تھا ایک مالکن نے یوں ہی مجھے گالی دی تھی۔ تھا پکا رہا تھا میں نے بیلن اُٹھا لیا۔ وہ بھاگ کر کواڑ بند نہ کر لیتیں تو میں ان کا سر پھوڑ دیتا"

افلاطون نے کہا ہے "ظاہر دیکھ کر باطن کو نہیں جانا جا سکتا" لہذا ہیں ظاہر نے میں ماہر کسی شخص نے اس کو دوہرا کر اس طرح بیان کر دیا ہے کہ "سب جو چمکتا ہے سونا نہیں ہوتا" میں جس شخص کو اطاعت، اور فرماں برداری کا مجسمہ سمجھتا تھا وہ اتنا خونخوار بھی ہو سکتا ہے، اس کا مجھے خیال تک نہ تھا۔ بیلن کی بات سُن کر میرا تجسس بڑھا۔ میں نے پوچھا "بات کیا ہوئی تھی سنت رام؟"

---

[1] پگار، بمبئی کی اصطلاح میں تنخواہ

"کچھ نہیں صاحب" وہ سامنے کے مکان کی سیڑھی پر اکڑوں بیٹھتا ہوا بولا" میں ان دنوں نیا نیا ایک بڑے صاحب کے گھر نوکر ہوا تھا۔ بیس برس کی عمر تھی، خون گرم تھا، کام سے کبھی جی نہ چُراتا تھا اور سونا بھی سامنے پڑا ہو تو ہاتھ نہ لگاتا تھا۔ میرا چچا ان صاحب کے دفتر میں چپڑاسی تھا۔ ان کو اچھے باورچی کی ضرورت تھی۔ ایک بڑے ہوٹل میں کام کرنے کی وجہ سے میں بہت اچھا کھانا پکا لیتا تھا۔ اپنے چچا کے زور دینے پر میں ان کے ہاں نوکر ہو گیا۔

صاحب ادھیڑ عمر کے آدمی تھے بارہ تیرہ سو روپیہ مہینہ پاتے تھے، اور بڑی اچھی طبیعت کے مالک تھے۔ میم صاحب ان سے عمر میں بہت کم تھیں۔ شوخ طرار اور غصیل۔ نوکروں کو تنگ کرتی تھیں۔ جب سے آئی تھیں کئی نوکر بدل چکی تھیں۔ کام شروع کرنے سے پہلے میں نے صاف لفظوں میں صاحب سے کہہ دیا تھا۔ صاحب ہم کام دیں گے مگر عزت نہیں دیں گے، رہی کھانا پکانے کی بات تو آپ کی پسند کو سمجھنے میں ہمیں کچھ دن لگ جائیں گے۔ ایک بار پتہ چل گیا پھر کام بگڑے تو کہئے۔ پیسے پائی کا نقصان ہو جائے تو گردن مار دیجیے، لیکن بے قصور گالی ہم نہ سنیں گے۔ پچیس نہیں خواہ پچاس روپے تنخواہ دیجیے۔

صاحب کو میرا کھانا بے حد پسند تھا اور مجھے ان سے کوئی شکایت نہ تھی لیکن میم صاحب ان کی تیسری بیوی تھیں اور تھیں بھی کسی چھوٹے خاندان کی۔ گالی دینا ان کی عادت تھی۔ ایک دن میں بیٹھا روٹی بیل رہا تھا کہ انہوں نے پوچھا۔ "پانچ روپے کا نوٹ رکھا تھا کہاں گیا؟"

میں نے کہا "دیکھا نہیں۔"

اس پر بہت بگڑیں، اور لگیں انٹ سنٹ بکنے۔

میں نے کہا "یہ تو پانچ روپیہ ہے پانچ سو بھی ہو تو میں تھوکتا نہیں . . ."

چلا کر بولیں "ہمارے روپے کیا تھوکنے کے لئے ہیں، کیا بکتا ہے حرامی . . ."

لیکن گالی ابھی ان کے ہونٹوں ہی پر تھی کہ میں چلایا "کیا گالی دی آپ نے" اور بیلن ہاتھ میں لئے ہوئے اُٹھا۔

انہوں نے بھاگ کر دروازہ بند کر لیا اور اس وقت تک نہ کھولا جب تک صاحب نہ آ گئے، کھانا کھانے بھی وہ باہر نہیں نکلیں۔"

سنت رام چُپ ہو گیا لیکن میرا تجسس اپنی انتہا پر پہنچ گیا۔ میں نے پوچھا تو صاحب کچھ بولے نہیں؟"

"میں نے ان سے آتے ہی کہہ دیا تھا" سنت رام بولا۔ "میم صاحب نے چوری لگائی اور بڑی بھاری گالی دے ڈالی ہے۔ ہمارے ہاتھ میں بیلن تھا، نہ جانے غصے میں کیا ہو جاتا۔ آپ مہربانی کرکے ہمیں چھٹی دے دیجیے۔ جتنے دن کام کیا ہے، اس کی تنخواہ دینا چاہیں دیجئے نہ دینا چاہیں نہ دیجئے۔ اپنا گھر سنبھالئے ہم چلے جائیں گے۔"

صاحب دفتر سے آئے تھے تھکے ہوئے تھے، انہوں نے سُن لیا اور کچھ نہ کہا بولے۔ جب میم صاحب نے ان کے اندر جانے پر دروازہ کھولا اور میری شکایت کی تو انہوں نے مجھے بُلایا بولے "بیلن لئے تم کیا کر رہے تھے؟"

"روٹی بیل رہا تھا۔"

تب میم صاحب کو سمجھاتے ہوئے بولے "بیلن تو اس کے ہاتھ ہی میں تھا۔ وہ تمہیں اس سے مارنے تھوڑی ہی آیا تھا۔ یہی بات ہے نہ سنت رام؟" انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"جی!" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور کیا جواب دیتا۔ وہ بھاگ کر دروازہ نہ بند کر لیتیں تو میں سر توڑ دیتا۔ لیکن صاحب کی بات مجھ

سے رد نہ ہوئی۔ میں نیا نیا آیا تھا اور پھر سچی بات تو ایک حرج میں نے ان سے کہہ ہی دی تھی۔"

سنت رام پھر چُپ ہو گیا۔ بیٹھا بیٹھا نہ جانے کن خیالات میں کھو گیا۔ اور میں سوچنے لگا کہ عجیب افسر تھے وہ۔ میں نوکروں کے حقوق کا زبردست حامی ہوں، لیکن اگر میری بیوی کی غلطی کے باوجود، کوئی نوکر اس پر ہاتھ اٹھائے تو اپنی تمام انصاف پسندی کے باوجود، اس کا سر توڑ کر رکھ دوں۔

سنت رام اُٹھ کر جانے لگا تھا کہ میں نے پوچھا "تو اسی دن وہاں سے نوکری چھوڑ دی تم نے؟"

"جی نہیں، صاحب نے مجھے نہیں چھوڑا۔ اس واقعہ کے بعد تو میں وہاں چھ برس رہا۔"

"میم صاحب نے کچھ نہیں کہا؟"

انہوں نے دو چار بار تنگ کرنے کی کوشش کی۔ شکایت بھی کی لیکن پھر تو وہ ایسی رام ہوئیں.... کہ.... کہ اب میں آپ سے کیا کہوں۔"

آخری فقرہ کہتے کہتے سنت رام اپنی ادھیڑ عمر کے باوجود شرما گیا۔ ہونٹوں پر آئی ہوئی مسکراہٹ کو روک کر اور آنکھوں میں کوندنے والی چمک کو دبا کر سر جھکائے ہوئے وہ اُوپر بھاگ گیا۔

اور جہاں سے سنت رام نے اپنی کہانی ختم کی وہیں سے ایک ازدواجی ٹریجڈی آہستہ آہستہ میری آنکھوں کے سامنے کُھل گئی۔

اگست ۱۹۴۸ء

نئے زمانوں پیر تالیں
جب مڑے بڑوں کو
میری روح کی نرم روی کے
آگے ہی آگے بڑھنے سے خوف آیا
تو مجھ کو زنجیر سے باندھ کے
کتنے ہی ردلوٹوں نے
مجھے مارا، پیٹا اور گھسیٹا
پھر وہ لے گئے ایسے صحراؤں میں مجھے
جن میں دن کو دن ہی رہنا تھا

ناہید قاسمی

عکس تحریر:- ناہید قاسمی

# فاصلے

میرزا ادیب

کوچہ رحمت خاں خاصا طویل تھا۔ دُور دُور تک پرانے مکانوں کی دو رویہ قطاریں پھیلی ہوئی تھیں، آخر میں جہاں آنے جانے والوں کے لیے راستہ بند کرنے کی خاطر ایک دیوار کھڑی کی گئی تھی۔ آمنے سامنے پانچ دُکانیں اس کوچے میں رہنے والوں کی ضرورتیں پوری کر رہی تھیں۔ ان دُکانوں سے کچھ دُور، دیوار کے ساتھ لکڑی کا ایک تخت بچھا رہتا تھا۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ تخت کب بچھایا گیا تھا اور اس کا بچھانے والا کون تھا۔ اور یہ جاننے کے لیے کسی کو ضرورت بھی نہیں تھی۔ دکان داروں کو اس سے فائدہ اُٹھانے میں کوئی دقت نہیں تھی اور نہ ہی اس پر کسی کو اعتراض تھا۔ کسی دوکان دار کو دن بھر کے لیے کہیں فالتو سامان رکھوانے کی مجبوری ہوتی تھی تو وہ بلاتکلف اپنی یہ چیزیں اس تخت پر ڈھیر کر دیتا تھا اور دوکان بند کرتے وقت انہیں اُٹھوا لیتا تھا۔

یہ تخت عام طور پر سامان رکھوانے ہی کے کام آتا تھا مگر چند ماہ سے اس مصرف کے ساتھ ساتھ ایک اُدھیڑ عمر کا آدمی بھی یہاں دن کا بیشتر حصہ گزارنے لگا تھا۔ یہ شخص جس کا نام حسین احمد تھا۔ خود اس کوچے میں نہیں رہتا تھا۔ دوسرے محلّے میں رہتا تھا۔ صُبح سویرے آجاتا تھا۔ اور دوپہر کے آدھ پونے گھنٹے کے وقفے کے سوا شام تک یہیں رہتا تھا۔

دوکاندار اس سے خوش تھے کیونکہ انہیں اس شخص کے رُوپ میں ایک قسم کا نوکر مل گیا تھا۔ ایک ایسا نوکر جو کسی سے ایک پیسہ بھی نہیں لیتا تھا اور ہر ایک کا کام بخوشی کر دیتا تھا۔ کسی کو کسی ضرورت سے گھر جانا پڑتا تھا تو وہ اسے اپنی دوکان میں بٹھا کر چلا جاتا تھا اور دُکان کی طرف سے بے فکر ہو جاتا تھا۔

حسین احمد کے لیے ان پانچ دکانوں میں سے چار دوکانوں کے اندر بیٹھ کر ڈیڑھ دو گھنٹے کے لیے سودا بیچنا کوئی مشکل مسئلہ نہیں تھا بشیر اور ارشد کی دوکانوں میں دالیں، آٹا اور ایسی ہی اشیائے صَرف بکتی تھیں اور وہ ان کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل کر چکا تھا تیسری دوکان بوتلوں اور پان سگریٹ کی تھی۔ اس سے ملحقہ دوکان میں ڈبل روٹی، انڈے، اچار، جام اور اس قسم کی چیزیں دستیاب تھیں۔ پان سگریٹ کی دوکان کا کرایہ دار ابراہیم تھا اور ڈبل روٹی اور انڈوں کی دوکان میں خود بیٹھتا تھا۔ ان دوکانوں میں بھی بیٹھنے اور وقتی طور پر انہیں چلانے میں حسین احمد کو کوئی مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ البتہ پانچویں دوکان جو افضال درزی کی تھی یہاں وہ صرف بیٹھ کر دوکان کی چیزوں کی نگرانی ہی کر سکتا تھا۔ درزی کا کام کرنا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔

حسین احمد کا تخت پر بیٹھ کر دکان داروں کی کچھ دیر کے لیے ذمے داریاں نبھانا ایک حادثے کا نتیجہ تھا۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں دوکانداری نہیں کی تھی وہ تو میٹرک کرنے کے بعد ایک دفتر میں بطور کلرک کے بھرتی ہوا تھا اور جُوں کی رفتار سے ترقی کرتے کرتے سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر پہنچا تھا اور جب اس عہدے پر پہنچا تھا تو اس سے صرف ایک سال بعد مقررہ اُصول کے مطابق ریٹائر کر دیا گیا تھا۔

اپنے ریٹائر ہونے کے بعد سارا وقت گھر کی چار دیواری کے اندر گزارنا اس کے لیے بڑا بور کام تھا۔ ایک ماہ تک تو اسے بوریت محسوس نہ ہوئی۔ دوستوں، عزیزوں نے اپنے گھروں میں چائے، کھانے کی دعوتیں دیں۔ اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا رہا۔ گھر کا سامان از سرِ نو ترتیب سے رکھا۔ کتابوں کے لیے الماری خریدی۔ اس میں پرانی اور نئی کتابیں رکھیں۔ اس طرح تیس دن بیت گئے۔ اگلے مہینے کے لیے اس کے پاس اس نوعیت کا کوئی کام نہیں تھا۔ مشکل یہ تھی کہ بیوی کو فوت ہوئے دس برس گزر چکے تھے۔ بیٹا ماں کے انتقال کے بعد سارا سرمایہ اور جمع جتھا سمیٹ کر انگلینڈ میں جا بسا تھا جہاں اس نے شادی بھی کر لی تھی۔

بیٹی شادی کے بعد امریکہ اپنے شوہر کے ہمراہ جا چکی تھی۔ گھر میں وہ تنہا رہ گیا تھا۔

دفتر میں کام کرتا تھا تو آدھا دن وہیں گزر جاتا تھا۔ کچھ وقت کسی کے ہاں جا کر تاش وغیرہ کھیل کر بتا دیتا تھا۔ شام کے بعد گھر آتا تھا۔ کھانا کھا کر کچھ دیر پڑھتا تھا پھر سو جاتا تھا۔ دوسرے روز پھر یہی سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔

اس کے مکان کے دو حصے تھے۔ اوپر کی منزل میں اس کی رشتے میں ایک بہن زینب نام کی رہتی تھی۔ جس کے بچوں کی تعداد میں مستقل اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ یہ بھی بڑی بات تھی کہ وہ رات کا کھانا اس کے لیے نیچے بھجوا دیتی تھی۔ ناشتہ اور دوپہر کا کھانا حسین احمد دفتر کی کینٹین میں کھاتا تھا یا دل چاہتا تھا تو ایک قریبی ہوٹل میں چلا جاتا تھا۔

اس کوچے کی دو دکانوں سے وہ عموماً سودا سلف نہیں خریدتا تھا۔ ہاں کبھی زینب کہتی تھی تو آٹا، دال یا کوئی اور شے خرید لاتا تھا۔ اس روز بہن کی فرمائش پر وہ چاول خریدنے گیا تھا۔

دکاندار بشیر کے ہاں اس وقت چاول تھے نہیں۔ بولا

"جناب! بوری آنے ہی والی ہے، بڑی جلدی۔ آپ ذرا اُدھر بیٹھ جائیں۔"

دکاندار نے تخت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ حسین احمد نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ ضرورت کی چیز دوسری دکان سے خرید لے۔ اس لیے چپ چاپ تخت پر جا بیٹھا۔

وہاں بیٹھ کر اسے عجیب لطف آیا۔ دائیں بائیں حدِ نگاہ تک مکان ہی مکان، کچھ دو تین منزلہ اونچے، کچھ ایک منزلہ چھوٹے، دروازوں میں سے لوگ نکلتے ہوئے، اندر جاتے ہوئے، کوئی کسی دروازے پر دستک دیتا خود، کوئی کسی مکان کے سامنے کسی سے مصروفِ گفتگو، کوئی بچے کا ہاتھ پکڑے آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ مکانوں کی دائیں قطار کے آگے ایک لڑکا ہاتھوں میں فٹ بال اٹھائے بھاگ رہا تھا اور اس کا تعاقب ایک بچی کر رہی تھی جو یقیناً اس کی بہن ہوگی۔ دونوں کے چہرے فرطِ مسرت سے دمک رہے تھے۔ ایک جگہ ایک شخص مختلف چیزوں سے لدا پھندا ایک عورت کے پہلو میں قدم اٹھا رہا تھا۔ عورت نے بھی دائیں ہاتھ میں ایک سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا۔ عورت مرد کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ یہ مسکراہٹ مستقبل کے خوشگوار خوابوں میں رچی بسی تھی۔ ایک نوجوان کبھی اِدھر دیکھتا تھا اور کبھی اُدھر اور پھر جلدی سے اوپر اس چک پر نظریں ڈال دیتا تھا جیسے لمحہ بہ لمحہ جنبش ہو رہی تھی۔

زندگی کے یہ سارے مناظر اسے پیارے سے لگے۔ اس نے یہ سب کچھ بارہا دیکھا ہوگا مگر اپنے منصبی فرائض کے ہجوم میں ان کا کبھی خیال نہیں کیا تھا لیکن اس روز یہ ساری سرگرمیاں اسے دلچسپ لگ رہی تھیں اور اس کا جی چاہتا تھا کہ انہیں کچھ دیر کے لیے دیکھتا رہے۔ وہ وقتی طور پر یہ بھول ہی گیا تھا کہ گھر سے چاول لینے کے لئے نکلا تھا اور اس تخت پر ایک دکاندار کے کہنے پر بیٹھا انتظار کر رہا ہے۔ گاہک دکانوں پر آ جا رہے تھے اور اس کو ایک لمحے کے لیے دیکھ کر سودا لینے میں مصروف ہو جاتے تھے۔

وہ تخت پر بیٹھا رہا۔ آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ اچانک معصوم سے قہقہے گونجے۔ کوئی شے اس کے پاؤں کو چھونے لگی۔

اُس نے اپنے قریب ہی اُسی بہن اور اس کے بھائی کو دیکھا جو چند منٹ پہلے اُس سے کچھ دُور بھاگ رہے تھے۔

"یہ میرا ہے"

"نہیں، میرا ہے"

فُٹ بال اُس کے پاؤں کے پاس پڑا تھا اور بیک وقت چار ننھے ننھے ہاتھ اُس کی طرف بڑھے ہوئے تھے۔

"او بدتمیزو!" یہ گرجدار آواز بشیر کی تھی جو بچوں کو ڈانٹ رہا تھا۔

بچے خاموش ہو گئے تھے مگر اُنہوں نے اپنے ہاتھ نہیں کھینچے تھے۔

حسین احمد نے فُٹ بال ہاتھوں میں پکڑ لیا۔

"بیٹھ جاؤ"

بچے تخت پر بیٹھ گئے۔ اُس نے فُٹ بال بچّی کی گود میں رکھ دیا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ فوراً اُٹھی اور بھاگ گئی۔ اُس کا بھائی اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔ وہ یہ منظر دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ دونوں بچے کُوچے کے دوسرے سرے پر پہنچ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

"لیجیے جناب!" بشیر ایک لفافہ اُس کی طرف بڑھا رہا تھا۔

اس نے لفافہ تھام لیا اور دوکاندار کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"سات روپے!"

اُسے احساس ہی نہ ہوا کہ کب اُس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تھا اور کب خانے کے پیسے بشیر کے ہاتھ میں رکھے تھے۔

یہ اُس کا تخت پر بیٹھنے کا پہلا تجربہ تھا۔

چاولوں کا لفافہ زینب کو دیتے ہوئے اُس نے کہہ دیا۔

"زینب! دیکھو! آئندہ کوئی چیز منگوانی ہو تو مجھ سے کہہ دیا کرو۔"

"بچے جو ہیں۔"

"نہیں۔ میں لایا کروں گا۔" اُس کا فیصلہ تھا۔

پہلے تجربے نے اُسے ایسی خوشی دی تھی کہ وہ سودا لینے کے لیے جب بھی کسی دوکان پر جاتا تھا۔ دوکاندار سے پوچھے بغیر تخت پر جا بیٹھتا تھا۔ اس طرح تخت اس کے اور دوکانداروں کے درمیان رابطہ اُستوار کرنے کا ذریعہ بن گیا۔ دن گزرتے گئے اور یہ رابطہ بڑھتے چلے گئے۔ گھر میں اس کے لیے سوائے کتابوں کے مطالعہ کے کوئی خاص مصروفیت نہیں تھی۔ اس لیے وہ باقاعدہ وہاں بیٹھنے لگا۔ وہ خوش تھا کہ دن کا ایک معقول حصہ خوشگوار ماحول میں گزر جاتا ہے اور دوکانداروں نے اس اعتبار سے اُسے غنیمت سمجھ لیا تھا کہ وہ اپنی اپنی دوکانوں سے نکل کر کوئی نہ کوئی کام کاج کر لیتے تھے اور گاہکوں کی طرف سے انہیں کوئی فکر نہیں ستاتی تھی۔ حسین احمد نے اپنی کارکردگی سے ثابت کر دیا تھا کہ ان کی عدم موجودگی میں گاہکوں سے نمٹ سکتا ہے۔

دوکان پر شور، دوسروں سے پہلے سودا لینے کی جدوجہد، ہلکی پھلکی لڑائیاں، طعنے، مذاق، فقرہ بازی —— ان سب چیزوں سے وہ خوش ہوتا تھا۔ دوکانداروں سے بے تکلفی بڑھی تو آپ سے مخاطب تم تک پہنچی۔ پہلے وہ اسے حسین احمد کہتے تھے —— پھر "گنجو" کہنے لگے۔ مدت ہوئی وہ سر کے بالوں کے معاملے میں فارغ البال ہو چکا تھا۔ اور اُس کی یہی خصوصیت اسے "گنجو" کہلوانے کی ذمہ دار تھی

کوئی دوہم رجب اُسے مخاطب کرکے کہتا تھا "آیار گنجو۔ جا رہا ہوں۔ بیٹھ گدی پر" تو وہ بُرا نہیں مانتا تھا۔ سمجھتا تھا کہ اس اندازِ تخاطب میں ایک نیا اخلوص ہے اور محبت ہے۔

اس میں اور دوکانداروں میں بے تکلفی کا احساس اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ ابراہیم تو اُسے آواز بھی نہیں دیتا تھا چٹکی بجا کر اُسے مخاطب کرتا تھا اور دایاں ہاتھ لہرا کر روانہ ہو جاتا تھا۔ حسین احمد کو اس کی یہ ادا بڑی پسند تھی اور وہ اس پر مسکرائے بغیر نہیں رہتا تھا۔ صمد چٹکی کی بجائے تال بجاتا تھا اور جب وہ اس کی طرف دیکھتا تھا تو اس وقت چٹکی بجا دیتا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بڑی جلدی واپس دوکان پر آجائے گا۔

روز بروز یہ بے تکلفانہ روابط بڑھتے جا رہے تھے۔

حسین احمد جب تک اپنی چار دیواری کے اندر رہتا تھا اُسے گھٹن سی محسوس ہوتی رہتی تھی۔ زینب اُسے کئی بار کہہ چکی تھی کہ "بھجان تم دوکانداروں کے نوکر بن گئے ہو۔ لوگ باتیں بناتے ہیں۔ گھر میں آرام سے بیٹھا کرو۔" مگر وہ اس کے جواب میں ہوں ہاں کرکے رہ جاتا تھا اور زینب کچھ مایوس ہو جاتی تھی۔ اصل میں اس کے لیے بھی ایک مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ حسین احمد کی عدم موجودگی میں زینب کے بچے ماں کی نظر بچا کر نیچے چلے جاتے تھے اور حسین احمد کی چیزوں کو خراب کر دیتے تھے۔ حسین احمد اس کی شکایت کرتا تھا تو زینب ایک لمحہ تامل کیے بغیر کہہ دیتی تھی۔ "بھجان نہ جائیں آپ وہاں بچوں کو لاکھ روکو، کرماں مارے باز آتے نہیں۔"

زینب اپنے شوہر کو ناشتہ دینے کے بعد عام طور پر حسین احمد کے لیے ناشتہ لے کر اس کے کمرے میں آجاتی تھی۔ کبھی نہیں بھی آسکتی تھی تو وہ زیادہ انتظار نہیں کرتا تھا۔ اپنی ڈیوٹی پر چلا جاتا تھا۔ وہیں ناشتہ کر لیتا تھا۔

اُس روز وہ ابھی چارپائی سے اُٹھا بھی نہیں تھا کہ اُسے زینب کے قدموں کی مانوس آہٹ سنائی دی۔

"یہ آج اتنی جلدی کیوں آگئی ہے؟" اُس نے کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے دل میں کہا۔

زینب کے ہاتھ میں معمول کے مطابق ناشتے کی ٹرے نہیں تھی بلکہ ایک لفافہ تھا۔

"بھجان!"

حسین احمد اُٹھ کر بیٹھ گیا اور نگاہوں سے استفسار کیا کہ کیا معاملہ ہے۔

"یہ تار آیا تھا۔ تم گھر میں تھے نہیں۔"

حسین احمد نے لفافہ لے لیا، کھولا۔ انگلینڈ سے اُس کے بیٹے الطاف نے بھیجا تھا اور پاکستان میں آنے کی اطلاع دی تھی۔

"الطاف کا ہوگا؟" زینب نے کہا۔

"ہاں ... آ رہا ہے"

"... پہنچ رہا ہے؟"

"تار میں تو یہی لکھا ہے۔"

دوسرا تار اس نے کراچی بھیج کر دیا کہ وہ جمعرات کو شام چھ بجے لاہور ائرپورٹ پر پہنچ جائے گا۔

جمعرات کو پانچ بجے وہ ائرپورٹ میں تھا۔

چھ کی بجائے ساڑھے چھ بجے جہاز نے ائرپورٹ پر لینڈ کیا اور حسین احمد کو آدھ گھنٹہ اور بیٹے کا انتظار کرنا پڑا۔

وہ بیٹے کے علاوہ پانچ چہرے اور دیکھ رہا تھا۔

ایک خوبصورت میم۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی۔

میم ادب اور احترام سے اپنا سر جھکائے اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ بچے اپنے دادا کو عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ بیٹا باپ سے گرمجوشی کے ساتھ بغل گیر ہونے کے بعد پوچھ رہا تھا۔

"اباجان! آپ بالکل ٹھیک ہیں نا؟"

"ہاں پُتر۔ ٹھیک ہوں۔ آج تیری ماں ہوتی تو کتنی خوش ہوتی۔" حسین احمد کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے اباجان!"

ائرپورٹ کے باہر سفید رنگ کی ایک شاندار کار کھڑی تھی۔ یہ الطاف کا ایک دوست الطاف اور اس کی فیملی کے لیے لایا تھا۔

کار چلی تو الطاف باپ سے وہ حالات پوچھتا رہا جو اس کی غیر حاضری میں اُسے پیش آئے تھے مگر حسین احمد یہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ کار شہر کے اندر جانے کی بجائے کہیں اور جا رہی تھی اور جس راستے پر جا رہی تھی، اس سے وہ واقف نہیں تھا۔ شہر تو وہ بہت کم گھوما پھرا تھا اور نئی آبادیوں کے معاملے میں تو بالکل کورا تھا۔

پندرہ بیس منٹ بعد کار ایک شاندار ہوٹل کے وسیع پورچ میں رُک گئی۔

"اباجی!" الطاف کار سے اُترتے ہوئے بولا "جب تک رہائش کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا میرا قیام یہیں رہے گا۔"

"ہوٹل میں؟"

"ہاں اباجی۔"

"مگر الطاف اپنا گھر —"

"اب اُس گھر میں کون جاتا ہے انکل! آپ کا بیٹا ڈاکٹری کی بڑی ڈگریاں لے کر آیا ہے۔ وہاں رہنا اس کی شان کے خلاف ہے۔" الطاف کی بجائے اُس کے دوست نے وضاحت کی۔

"میں گھر آؤں گا — مگر ابھی نہیں ابھی تو سخت بزی ہوں گا۔ آنٹی زینب سے کہہ دیں۔ میں آؤں گا۔"

کمرے میں داخل ہوتے ہی الطاف نے ٹیلی فون سنبھال لیا اور آدھ گھنٹے کے بعد لوگ آنے لگے۔

قہقہے، مبارکبادیں، بے تکلفانہ گفتگو، معانقے، مصافحے، حسین احمد ایک طرف بیٹھا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اُسے اس طرح فراموش کر دیا گیا تھا جیسے وہ ایک زندہ انسان نہیں، کمرے کے فرنیچر کا کوئی حصہ ہے۔ جیسے صوفہ سیٹ، میز، دیوار پر لگی ہوئی تصویر، ٹیبل لیمپ۔ اُسے یہ ماحول اجنبی سا، غیر مانوس لگ رہا تھا۔ بیرا بار بار چائے لے کر آ رہا تھا نئی ٹرے آتی تو الطاف باپ سے پوچھتا۔

"چائے چلے گی اباجی؟"

"نہیں، بہت پی چکا۔"

اباجی کے لفظ پر الطاف کا نیا آنے والا دوست حسین احمد پر ایک نظر ڈال کر سلام کے انداز میں اپنا سر ذرا خم کر دیتا اور پھر خالی صوفے پر بیٹھ جاتا۔

شام تک یہ گہما گہمی ہوتی رہی۔

بیٹے نے یہ محسوس کر لیا کہ باپ بور ہو رہا ہے۔ کرسی سے اٹھ کر اُس کے قریب آیا۔

"اباجی۔ آپ کچھ۔"

# ستارے دور ہیں

شوکت صدیقی

اندھیرا ہونے میں، ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا

دھوپ ڈھل چکی تھی اور جیب میں کل ساڑھے چھ آنے موجود تھے۔ اس لئے اتنی بھی گنجائش نہیں تھی کہ کسی چائے خانہ میں بیٹھ کر وقت گزارا جاتا۔ لیکن زیادہ دیر تک سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کی نوبت نہ آئی۔ ایک بارگی اس کو نعمان کا خیال آیا۔ ان دنوں وہ دفتر سے رخصت لے کر گھر پر آرام کر رہا تھا۔

نعمان کا مکان وہاں سے کچھ زیادہ دور نہ تھا لہٰذا وہ اسی جانب چل دیا۔ آچاریہ مینشن کی تیسری منزل پر اس کا فلیٹ تھا۔ دوپہر کی گرمی سے وہ پہلے ہی پریشان ہو رہا تھا۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے اور بھی ہراساں ہو گیا۔ آخر دروازے پر جا کر اس نے دستک دی، کسی نے بھاری لہجہ میں دریافت کیا۔

"کون ہے؟"

اس بیگانہ آواز پر اس کو تعجب تو ضرور ہوا، لیکن نام بتانا ضروری تھا، اس لئے کسی قدر اونچی آواز میں اس نے جواب دیا۔

"میں ہوں انصار احمد!" ذرا دیر تک خاموشی چھائی رہی، پھر اندر سے آواز آئی "اندر آجائیے، دروازہ کھلا ہے!"

اور وہ چپ چاپ کمرے میں داخل ہو گیا۔ سامنے کرسی پر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی، اکڑوں بیٹھا ہوا اخبار پڑھنے میں منہمک تھا۔ اس نے انصار کی طرف نظریں اٹھائے بغیر، بڑی لاپروائی سے پوچھا "کہیئے"

اس بے نیازی پر انصار جھنجھلا کر رہ گیا۔ اس نے کسی قدر تیکھے لہجہ میں کہا۔

"کیا نعمان اندر ہیں؟"

لیکن وہ ادھیڑ عمر کا آدمی اس بات سے ذرا بھی مرعوب نہ ہو سکا۔ وہ اسی طرح پورے انہماک سے بیٹھا ہوا اخبار پڑھتا اور اس کی طرف کسی توجہ کا اظہار کئے بغیر اسی انداز سے بولا۔

"جی نہیں، کوئی ہفتہ بھر ہوا کہ وہ فلیٹ چھوڑ کر راولپنڈی چلے گئے۔ اب یہاں عبدالباری خاں رہتے ہیں۔ اگر ان سے ملنے کا ارادہ ہو تو تھوڑی انتظار کیجئے، وہ دو بجے تک واپس آجائیں گے۔"

انصار کچھ سٹپٹا سا گیا۔ اس نے تجسس آمیز نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ کمرہ تو وہی تھا مگر اس کا حلیہ بالکل تبدیل ہو چکا تھا۔ اس خواہ مخواہ کی ندامت سے زیادہ انصار کو اس بات کی کوفت تھی کہ وہ یہاں بیٹھ کر کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ لیکن اب تو معاملہ ہی اور تھا۔ اس نے واپس جانے کے لئے دروازہ کی طرف مڑتے ہوئے آہستہ سے کہا؛

جی نہیں۔ مجھ کو تو صرف نعمانی صاحب سے کام تھا۔ معاف کیجئے گا، آپ کو بیٹھے بٹھائے زحمت دی۔"

اس دفعہ ادھیڑ عمر کے آدمی نے اخبار پر سے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، لیکن جواب میں اس نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ بلکہ خاموشی سے اس کے چہرے کی جانب اس طرح تکتا رہا، جیسے اس کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ لیکن انصار اب وہاں ٹھہرنا نہ چاہتا تھا۔ لہٰذا وہ دروازے کی طرف چل دیا۔ ابھی وہ کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا کہ پشت پر سے، اس کی بھاری آواز اُبھری۔

"ذرا ٹھہر جائیے۔"

انصار دہلیز پر ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ابھی تک بغور اس کے چہرے کی جانب تک رہا تھا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا "یہاں آئیے۔" اور اس کے ساتھ ہی اس نے برابر رکھی ہوئی کرسی اس کی طرف بڑھا دی۔

"بیٹھ جائیے اس پر۔ میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

انصار چپ چاپ اس کے قریب چلا گیا۔ لیکن وہ ادھیڑ عمر کا آدمی ابھی تک اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے اس انداز سے وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ اس شخص نے جیسے اس کی گھبراہٹ کو بھانپ لیا تھا۔ اس لئے وہ بڑی نرمی کے ساتھ کہنے لگا۔

"بھئی پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں، میں صرف اس قدر معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کی کنپٹی پر یہ جو بھورے کا سا سُرخ نشان ہے۔ یہ پیدائشی ہے، یا کسی چوٹ کی وجہ سے پڑ گیا ہے؟"

انصار نے جواب دیا "جی نہیں، یہ تو ہمیشہ سے اسی طرح ہے۔" لیکن اس کی سمجھ میں کوئی ایسی بات نہیں آئی جس سے وہ یہ اندازہ لگا سکتا کہ اس کے برابر بیٹھا ہوا یہ ادھیڑ عمر کا آدمی اس سُرخ دھبہ کے متعلق کیوں دریافت کر رہا ہے۔ لیکن وہ اس کی اُلجھن سے بالکل بے نیاز ہو کر، زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔ پھر اُس نے اخبار اٹھا کر ایک طرف ڈال دیا اور بڑے اطمینان آمیز لہجہ میں کہنے لگا۔

"معلوم ہوتا ہے اس نشان کے متعلق کسی نے اب تک آپ کو کچھ بتایا نہیں۔" اتنا کہہ کر وہ لمحہ بھر تک خاموش بیٹھا رہا۔ غالباً وہ انصار سے اس بات کی تائید کرانا چاہتا تھا، مگر جب اس کو کوئی جواب نہ ملا تو وہ بتانے لگا "دراصل مجھ کو علم نجوم میں کچھ دخل ہے۔ البتہ اس بات کا خیال رکھئے گا کہ میں پیشہ ور نجومی نہیں ہوں۔ اس علم سے شوقیہ لگاؤ ہے، اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا نصیبہ یاور ہے۔" پھر اس نے بڑی صاف گوئی سے کہا "آپ کو جو کچھ ہونا چاہیئے، بظاہر اس کے کچھ آثار نظر نہیں آتے۔"

انصار کہنے لگا "یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔" وہ اس کی باتوں سے اب خاصہ متاثر ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس سے یہ بھی دریافت کر بیٹھا "اچھا تو یہ بتایئے کہ میں ابھی تھوڑی دیر میں جس انٹرویو کے لئے جا رہا ہوں، اس میں کیا ہوگا۔" وہ آدمی تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھا ہوا کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے میز پر سے کاغذ اور پنسل اٹھائی اور تھکے ہوئے انداز میں کہنے لگا۔

"اس وقت آفتاب نصف النہار پر پہنچ چکا ہے۔ اس لئے ستاروں کی چال کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ بہرحال آپ نے اب بات پوچھ ہی لی ہے تو کچھ نہ کچھ بتانا ہی پڑے گا۔"

پھر اس نے انصار سے اس کا پورا نام اور تاریخ پیدائش کے متعلق معلومات حاصل کیں اور کاغذ پر زائچہ بنانے میں مصروف ہو گیا۔ انصار چپ چاپ بیٹھا ہوا اس کی تمام حرکتوں کو پوری توجہ کے ساتھ دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے گردن اُٹھا کر انصار سے دریافت کیا۔

"ذرا یہ تو بتایئے کہ تمام پھولوں میں آپ کو کون سا پھول زیادہ اچھا لگتا ہے؟"

انصار خود کو الجھن میں پڑ گیا۔ اس لئے کہ اس نے آج تک یہ غور ہی نہیں کیا تھا کہ کوئی ایسا بھی پھول ہے جو اس کو سب سے زیادہ پسند ہے۔ پھر بھی جواب تو کچھ نہ کچھ دینا ہی تھا۔ لہٰذا اس نے کہہ دیا۔

"مجھ کو تو چنبیلی کے پھول زیادہ تر پسند آتے ہیں"

ادھیڑ عمر کے آدمی نے ایک بار پھر اس کو زیرِ لب مسکرا کر دیکھا اور جس کاغذ پر اس نے زائچہ بنا کر تیار کیا تھا، اس کو اُلٹ کر اس کے سامنے کر دیا۔ ایک کونے میں پنسل سے یہ جملہ لکھا ہوا تھا "چنبیلی کا پھول پسند کیا جائے گا"۔ اب اس آدمی کے چہرے پر بے حد اطمینان جھلک رہا تھا۔ وہ کچھ عرصہ اور خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا:

"بھئی یہ انٹرویو تو آپ کا کامیاب ہوتا نظر نہیں آتا۔"

انصار کے چہرے پر مُردنی سی چھا گئی۔ وہ نظریں جھکا کر فرش کو تکنے لگا۔ وہ آدمی تسلی دینے کے سے انداز میں کہنے لگا۔

"دیکھئے میں یہ بات دعوے سے تو کہہ نہیں رہا ہوں۔ غیب کا حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ یہ تو صرف ہندسوں کا حساب ہے۔ آپ دل برداشتہ نہ ہوں انٹرویو میں جا کر دیکھئے تو کیا ہوتا ہے۔" لیکن اس حوصلہ افزائی سے انصار کچھ متاثر نہ ہو سکا۔ آخر اس نے ذرا بھرائی ہوئی آواز میں دریافت کیا "اچھا یہ تو بتائیے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے؟"

وہ کہنے لگا "ابھی تو آپ کا ستارہ بڑی گردش میں ہے۔ کچھ ٹھیک سے نہیں کہا جا سکتا۔ کسی وقت اطمینان سے ملئے گا تو آپ کا مکمل زائچہ تیار کروں گا۔" یہ بات کہنے کے بعد اس نے کاغذ اور پنسل اٹھا کر میز پر رکھ دی اور اخبار لے کر پھر اس کو پڑھنے لگا۔ یہ اس بات کی تاکید تھی کہ گویا وہ اب مزید گفتگو کرنا نہیں چاہتا۔ انصار کچھ عرصہ خاموش بیٹھا رہا پھر اس سے اجازت لے کر کمرے سے باہر آ گیا۔

سڑک پر آ کر اس نے محسوس کیا کہ دھوپ کی تپش اور تیز ہو گئی ہے اور آچاریہ منشن کی تیسری منزل پر بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر کے نجومی کا چہرہ راہ گیروں کی بھیڑ میں غائب ہوتا جا رہا ہے اور اس کی بھاری آواز شور و غل کا ایک حصہ بن گئی ہے۔ البتہ اس کے ذہن میں کسی قدر کھلبلی ہو رہی تھی۔

دفتر پہنچ کر اس بات سے اس کو ذرا ڈھارس بندھی کہ امیدواروں کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ لیکن جب چپراسی نے اس کے قریب آ کر اندر جانے کے لئے کہا تو وہ گھبرا سا گیا۔ کمرے میں فرم کا اسسٹنٹ منیجر ایک لمبی سی میز پر کہنیاں ٹکائے خاموش بیٹھا تھا۔ وہ پستہ قد کا آدمی تھا لیکن عینک کے چوڑے فریم اور فرنچ کٹ داڑھی نے اس کو کسی پروفیسر کی طرح بارعب بنا دیا تھا۔ اس نے بڑی متانت کے ساتھ انصار کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر سامنے میز پر رکھے ہوئے کاغذات کو دیکھنے لگا۔ انصار نے ایک ہی نظر میں یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ اس کی درخواست کا جائزہ لے رہا ہے جس پر جگہ جگہ سرخ پنسل کے نشان لگے ہوئے تھے۔ ذرا دیر بعد اس نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ انصار انٹرویو کے لئے خود کو آمادہ کرنے کے لئے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ لیکن خلاف توقع اس نے بڑا عجیب سا سوال پوچھا۔ کہنے لگا "آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

انصار نے ہچکچاتے ہوئے بتا دیا "گورکھپور!"

"کبھی دیوریا جانے کا بھی اتفاق ہوا؟"

اس دفعہ اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "جی ہاں، کچھ عرصہ تک ابا جان کے ساتھ وہاں رہ چکا ہوں۔ وہ ان دنوں

دیوریا میں ریونیو آفیسر تھے۔"

اسسٹنٹ مینجر کے چہرے پر موہوم سی حیرت جھلکنے لگی۔" ذرا ان کا نام تو بتائیے؟"

اس نے جلدی سے بتا دیا" خان بہادر اشفاق احمد"

چوڑے فریم والی عینک کے پیچھے مینجر کی آنکھیں مسکراہٹ سے جھلملانے لگیں۔" غالباً میں ان سے مل چکا ہوں، آج کل وہ کہاں ہیں؟"

انصار بتانے لگا" اب تو وہ ریٹائر ہو چکے ہیں اور گورکھپور میں پریکٹس کر رہے ہیں۔"

" تب تو آپ یہاں تنہا ہوں گے۔"

انصار کو اپنی کامیابی کی کچھ اُمید ہونے لگی تھی۔ اس نے سوچا کہ اب بات ایک ایسے نکتہ پر پہنچ گئی ہے کہ اسسٹنٹ مینجر کی وہ جس قدر بھی ہمدردی حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے لئے جھجکنے سے کام نہیں چلے گا، لہٰذا اس نے کہہ دیا۔

" جی نہیں، سب سے بڑی دشواری تو یہ ہے کہ بال بچے ساتھ ہیں، ان کے علاوہ میری بیوہ ساس اور ان کا کنبہ بھی ہے۔" اس نے اپنی بات کو زیادہ سے زیادہ اثرانگیز بنانے کے واسطے مبالغہ آرائی کی تکنیک پر بھی عمل کیا۔

فرینچ کٹ داڑھی والے مینجر کے چہرے پر ایک بارگی سنجیدگی چھا گئی۔ اس نے حسبِ توقع ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا" نئی جگہ ہے سینکڑوں طرح کی پریشانیاں ہیں۔ بہرصورت میں آپ کے لئے حتی الوسع کوشش کروں گا۔ اس لئے کہ انتخاب تو جنرل مینجر کے مشورے سے ہوگا۔"

انصار نے جھٹ سے پوچھا" کب تک اس بات کا پتہ چلے گا؟"

" جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔ آپ یہاں آکر پریشان نہ ہوں، ڈاک کے ذریعے اطلاع پہنچا دی جائے گی۔"

کمرے کے اندر ذرا دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ پھر مینجر کی آواز اُبھری" اچھا اب آپ جا سکتے ہیں۔" انصار نے چلتے چلتے ایک بار پھر اپنی پریشانیوں کا اظہار کیا اور کمرے سے باہر چلا آیا۔

وزیٹرز روم میں رفیق اس کا انتظار کر رہا تھا، وہ فرم میں اسٹینو ٹائپسٹ تھا۔ اس کو دیکھتے ہی پوچھنے لگا" کہو بھئی کیا کر آئے؟"

انصار مسکرا کر کہنے لگا" بھئی اُمید تو بہت معلوم ہوتی ہے وہ تو ابا جان کا ملنے والا نکل آیا۔"

لیکن زیادہ باتیں کرنے کی نوبت نہ آئی۔ اسی اثنا میں چپراسی نے آکر کہا" صاب بلا رہے ہیں" اور وہ اندر چلا گیا۔ کوئی دس منٹ بعد جب وہ باہر آیا تو اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ انصار کو اس نے صاف صاف بتا دیا" بھئی تمہارا اندازہ تو غلط نکلا، وہ تو کسی اور کا اپائنٹمنٹ کر رہا ہے، یہ دیکھو آرڈر بھی ہو چکے۔" اس نے ہاتھ میں دبے ہوئے کاغذ اس کے سامنے کر دیئے۔

انصار ایک دم سے بجھ کر رہ گیا۔ پھر اس نے بڑے اُداس لہجہ میں کہا" بھئی وہ تو بڑی ہمدردی کا اظہار کر رہا تھا۔ میں نے تو اس سے یہاں تک کہہ دیا کہ بال بچے دار ہوں اور عرصہ سے بے روزگار ہوں۔" رفیق جیسے ایکبارگی اُچھل پڑا۔

" یہی تو تم نے غضب کر دیا، اس کی چار لڑکیاں جوان ہو چکی ہیں، جن کی شادی کے لئے وہ ہر وقت پریشان رہتا ہے، تم نے اس کے متعلق مجھ سے کچھ معلوم کر لیا ہوتا۔ بڑی چوک ہو گئی۔"

انصار کو جیسے یقین نہ آیا، کہنے لگا" نہیں بھئی۔ ایسی کوئی بات نہیں، ہو سکتا ہے وہ پہلے ہی سے طے کر چکا ہو۔ جبھی تو اس نے

انٹرویو میں کوئی بھی قاعدے کا سوال نہیں پوچھا" دونوں میں دیر تک اس بات پر بحث ہوتی رہی، آخر جب وہ وہاں سے واپس لوٹا تو بہت جھنجھلایا ہوا تھا۔

گھر پہنچ کر وہ نڈھال سا بستر پر جا کر دراز ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی بیوی کسی بات پر بڑبڑاتی ہوئی کمرے کے اندر آئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ پوچھنے لگی "کیا ہوا؟" اس نے کوئی جواب نہ دیا، چپ چاپ کروٹ بدل کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ واپس لوٹ گئی۔ اس کے بعد وہ کئی بار کمرے میں آئی۔ ہر دفعہ انصار نے اس کے قدموں کی آہٹ کو محسوس کیا لیکن دونوں میں کوئی بات نہ ہو سکی۔ وہ تمام دن کا بھوکا تھا، اس لئے ہر بار اس کی آمد پر انصار کو یہ امید ہوتی کہ شاید وہ کھانے کے لئے کچھ کہے گی۔ لیکن ہر مرتبہ اس کو مایوسی پہنچتی۔ وہ خاموش لیٹا ہوا کروٹیں بدلتا رہا۔ گھر کے اندر ملی جلی آوازیں گونجتی رہیں۔ شام سے کچھ دیر پہلے سے آوازیں اچانک جیسے ٹھہر گئیں۔ اب فرید اپنے دفتر سے واپس آ گیا تھا۔ برابر والے کمرے میں اس کی بیوی فرید سے کہہ رہی تھی۔

"بھائی جان، آج چپراسی تو آیا نہیں، سودا سلف بھی نہیں آیا، اب کیا ہو گا؟"

وہ اونچی آواز میں تقریباً چیخ کر بولا "آخر یہ انصار کس مرض کی دوا ہیں۔ کسی روز چپراسی نہ آ سکے تو ان سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ جا کر راشن ہی لے آئیں۔ اب اگر ان سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا تو پھر کام کیسے چلے گا۔" اس کی بیوی بھائی کی ہاں میں ہاں ملانے لگی "آپ ان سے کہئے میں کچھ بولوں گی تو میرے سر ہو جائیں گے ان کو تو سوائے ناراضگی کے اور کچھ آتا ہی نہیں" انصار چپ چاپ لیٹا ہوا یہ تمام باتیں سنتا رہا۔ ہر بار جیسے اس کے پہلو میں نشتر سا لگتا اور وہ تلملا اٹھتا۔ آخر اپنی بے بسی پر اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں وہ غور کرنے لگا کہ وہ کب تک یہ طعنے سہتا رہے گا۔ کب تک وہ اس طرح ذلت برداشت کرتا رہے گا۔ آخر وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کوٹ کی جیبیں ٹٹول کر ملک عرفان علی کا پتہ تلاش کیا اور کسی سے بغیر کچھ کہے سنے گھر سے باہر چلا گیا۔

اتفاق سے ملک عرفان علی اپنی کوٹھی پر موجود تھے، ان کو ایک پرائیویٹ ٹیوٹر کی ضرورت تھی، ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر انہوں نے انصار کو ملازم رکھ لیا، مگر ان کی بنیادی شرط یہ تھی کہ ان کی کوٹھی کے اندر ہی اس کو رہنا پڑے گا۔ انصار نے اس شرط کو بھی منظور کر لیا۔ دوسرے روز جب وہ ضروری سامان لے کر آنے لگا تو بیوی نے استفسار کیا، لیکن اس نے یہ کہہ کر اس کو کسی حد تک مطمئن کر دیا کہ وہ مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہا ہے، اس لئے کچھ دنوں کے لئے اپنے ایک دوست کے مکان پر جا کر رہے گا۔ یہاں بچوں کے شور و غل میں پڑھائی ٹھیک سے نہیں ہو گی۔ بات آئی گئی ہو گئی اور وہ ملک عرفان کے ساتھ رہنے لگا۔

ملک کے دو لڑکے تو کانونٹ میں ابتدائی تعلیم پا رہے تھے۔ دونوں خوب گول مٹول اور بے حد شریر تھے لیکن اس کا ہر طرح سے احترام کرتے تھے۔ البتہ لڑکی بڑی کم سخن اور سنجیدہ تھی۔ وہ میٹرک کی تیاری کر رہی تھی۔ دن بھر میں وہ کئی بار سب کو پڑھاتا۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر ہر طرح کی باتیں کرتا۔ ملک صاحب کاروباری آدمی تھے، اس لئے وہ زیادہ تر گھر سے باہر رہتے۔ انصار سے ان کی بہت کم ملاقات ہوتی، البتہ کبھی کبھار رات کے وقت کھانے پر ان سے گفتگو ہو جاتی تو وہ سب کی پڑھائی کے متعلق دریافت کرتے اور اپنے کنبہ کے ایک فرد کی طرح ہمیشہ اس کی خاطر میں بھی اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے۔

دوسرے ہی مہینہ سے اس کی تنخواہ میں پچاس روپے کا اور اضافہ ہو گیا۔ اب اس کی یہ بھی ڈیوٹی ہو گئی تھی کہ صبح اٹھ کر بیگم صاحبہ کو اخباروں میں سے خبریں پڑھ کر سنائے، ان پر تبادلۂ خیالات کرے۔ یہ کام ایسا مشکل تو نہیں تھا مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ بے حد باتونی

واقع ہوئی تھیں، سیاسی حالات پر باتیں کرتے کرتے وہ اپنی ذاتی باتیں چھیڑ دیتیں۔ جن میں عام طور پر اس بات کا گلہ ہوتا تھا کہ ملک صاحب ان سے بڑی بے اعتنائی برتتے ہیں۔ حالانکہ انصار اس بات کو ماننے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ پھر بھی اس کو اس طرح کے دکھڑے سننا پڑتے۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ ان کا مزاج بہت اچھا تھا۔ کبھی انہوں نے ایسا رویہ اختیار نہیں کیا، جس سے اس کی دل شکنی ہو، بلکہ اس کی دیکھ بھال کے سلسلہ میں وہ برابر مستعدی کا اظہار کرتیں۔ غرضیکہ انصار کو اس کوٹھی میں ہر طرح کی آسائش تھی۔ وہ خاصہ مطمئن تھا۔ اب اس کی صحت بھی عمدہ ہو گئی تھی۔

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک روز جب وہ تنخواہ کے روپے جیب میں ڈال کر بال بچوں کے لئے کچھ سامان خریدنے گیا تو بس اسٹینڈ پر اس کو ادھیڑ عمر کا وہ نجومی مل گیا جس سے اس کی پہلی ملاقات اچاریہ منشن کی تیسری منزل کے ایک کمرے میں ہوئی تھی۔ اس دفعہ اس نے انصار کو کئی بار سر سے پاؤں تک بغور دیکھا۔ رخساروں سے پھوٹتی ہوئی سرخی، آنکھوں میں آب و تاب اور اعلیٰ درجہ کا سلا ہوا ہلکا سرمئی سوٹ سچ مچ وہ بڑا اسمارٹ نظر آ رہا تھا۔ وہ کچھ حیرت زدہ ہو رہا تھا۔ آخر اس نے پوچھ ہی لیا

"آج کل آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"ایک غیر ملکی فرم میں اسسٹنٹ مینجر ہو گیا ہوں"

وہ اس کے متعلق کچھ اور بھی معلوم کرنا چاہتا تھا، اس لئے کہنے لگا "تنخواہ کیا مل رہی ہے؟"

لیکن انصار جیسے اس کو مرعوب کرنے پر تلا ہوا تھا، بڑی بے نیازی سے بولا "فی الحال تو پانچسو مل رہے ہیں" وہ اس کی باتوں سے واقعی خاصا مرعوب ہو گیا پھر دونوں باتیں کرتے ہوئے ایک ریستوران میں چلے گئے۔ اس نے ایک دفعہ پھر اس کا زائچہ تیار کیا اور بتانے لگا "ابھی تو آپ اور ترقی کریں گے۔ مگر کوئی عورت ہے جو ناگن کی طرح آپ کی راہ میں حائل ہے۔ کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے؟"

لیکن انصار نے اس روز جیسے جھوٹ بولنے کی قسم کھالی تھی، صاف مکر گیا "جی نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں" وہ ذرا دیر تک خاموش بیٹھا غور کرتا رہا۔ پھر اس نے مشورہ دینے کے سے انداز میں کہا "خیر ایسا ہی ہوگا، لیکن اگر کہیں ایسا سلسلہ چل رہا ہو تو اس کو ختم کر دیجئے" انصار نے خواہ مخواہ اس کی تائید کرنے کی کوشش کی "جی ہاں، میری منگنی تو ایک جگہ ہو چکی ہے"

اور ادھیڑ عمر کا نجومی ایک بارگی چونک پڑا "دیکھئے اب آپ نے پتہ کی بات بتائی۔ اس رشتہ کو جس قدر جلد ہو سکے منقطع کر دیجئے، البتہ کسی اور جگہ ہو سکے تو شادی کر لیجئے۔ پھر دیکھئے آپ کا ستارہ کس بلندی پر پہنچتا ہے" مگر انصار نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ کہنے لگا "جی نہیں، ابھی تو کوئی ایسا ارادہ نہیں ہے"

لیکن وہ باز نہ آیا۔ اس کو سمجھانے لگا "میں آپ ہی کی بہتری کے لئے کہہ رہا ہوں۔ بہتر اتنا ضرور خیال رکھئے گا کہ شادی کرنے سے پہلے مجھ سے زائچہ بنوا لیجئے گا۔ اس لئے کہ خدانخواستہ اگر ستارے نہیں ملے تو پھر کوئی آفت بھی نازل ہو جائے تو کچھ عجب نہیں" اس موضوع پر وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ آخر جب وہ ایک دوسرے سے رخصت ہونے لگے تو اس نے انصار سے دریافت کیا،

"یہ تو بتاتے جائیے کہ آج کل آپ رہتے کہاں ہیں؟"

انصار نے بتا دیا "میں اپنے ماموں کے ساتھ مقیم ہوں" اور اس نے ملک عرفان علی کا پتہ بتا دیا۔

اس نجومی سے رخصت ہو کر اس نے دو دکانوں پر جا کر سامان خریدا اور برابر یہ سوچتا رہا کہ ستاروں کی چال کا یہ حساب تو محض مسخرہ پن ہے مگر یہ ادھیڑ عمر کا آدمی جو کچھ کہتا ہے اس میں کچھ نہ کچھ حقیقت تو ضرور ہوتی ہے۔ یہی سوچتا ہوا وہ سامان کے بنڈلوں ۔

لدا پھندا گھر پہنچ گیا۔ اب شام ہو چکی تھی، اس کی بیوی باورچی خانہ میں بیٹھی کسی کام میں مصروف تھی۔ وہ خاموش بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا، کوئی آدھ گھنٹہ بعد وہ آئی، تو انصار نے پیکٹ کھول کر ساری چیزیں اس کے سامنے بکھرا دیں۔ پھر اس نے ایک دوپٹہ کو اٹھا کر کہا

”کہو کچھ آیا پسند، خدا قسم سارا بازار چھان مارا۔“

وہ اس کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھنے لگا لیکن حسبِ معمول اس دفعہ بھی اس نے بڑی سرد مہری سے جواب دیا ”ہاں اچھا ہے، مگر بھابی کا پرسوں جو دوپٹہ آیا ہے، نہ جانے کہاں سے انہوں نے خریدا ہے، نظر نہیں ٹھہرتی۔“

انصار کے پہلو میں جیسے بچھو نے ڈنگ مار دیا۔ وہ دل برداشتہ ہو کر سوچنے لگا کہ آخر یہ مجھ کو اس طرح کمتر ثابت کرنے کی کیوں کوشش کرتی ہے۔ ٹھیک ہے کہ فرید کو مجھ سے بہت زیادہ تنخواہ ملتی ہے لیکن اس میں سے کسی اور کو کیا مل سکتا ہے۔ آخر یہ عورت کب تک اپنے میکہ کی بڑائی سے اس طرح اس کو مرعوب کرتی رہے گی۔ وہ اسی طرح خاموش بیٹھا ہوا پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ باہر لان میں اختر کے رونے کی آواز ابھری، یہ اس کا پانچ سالہ لڑکا تھا، وہ فوراً باہر چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ فرید کی چھوٹی لڑکی اس کو جھاڑیوں میں گرا کر منہ نوچ رہی تھی۔ قریب ہی کرسی پر بھابی لیٹی ہوئی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھیں۔ ان کی اس بے نیازی پر کڑھتا ہوا وہ اختر کے پاس چلا گیا۔ ننھی سے چھڑا کر جب انصار نے اس کو علیحدہ کیا تو اس کے رخساروں پر خراشوں سے خون چھلک آیا تھا۔ وہ پھر بھی چپ رہا لیکن جب ننھی نے اس کے سامنے اختر پر جھپٹ کر دوبارہ اس کا منہ نوچا تو وہ بے قابو ہو گیا۔ اس نے ننھی کی پیٹھ پر دھمکاتے کے لئے آہستہ سے ایک تھپڑ لگایا اور اختر کو ساتھ لے کر کمرے میں آ گیا۔ پھر شام کے سناٹے میں ننھی کی تیز چیخیں ابھرنے لگیں اور اس کے ساتھ ہی بھابی بھی بڑبڑانے لگیں۔ اس نے ان باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی بلکہ بسکٹ کا پیکٹ کھول کر اختر کو بہلانے لگا۔ البتہ جب اس کی بیوی اختر کو پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی بھابی کے سامنے لے گئی تو اس کو بھی غصہ آ گیا۔ بات قطعی معمولی سی تھی مگر اس نے جلد ہی ہنگامہ کی صورت اختیار کر لی۔

جب وہ دروازے سے باہر نکل رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ سامنے کے مکانوں سے عورتیں حیرت زدہ سی کھڑی اسی جانب دیکھ رہی تھیں اور اندر اس کی بیوی زور زور سے چیخ رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی وہ اپنی قسمت کا گلہ کر رہی تھی، اپنے ماں باپ کو کوسنے دے رہی تھی اور اس کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ یوں تو اس قسم کے جھگڑے اکثر دونوں کے درمیان ہو جاتے تھے مگر اس روز اس کو رہ رہ کے یہ خیال آ رہا تھا کہ سچ مچ اس کی بیوی ناگن ہے۔ اسی عالم میں جب وہ ملک عرفان علی کی کوٹھی پر پہنچا تو بیگم صاحبہ دروازے ہی پر مل گئیں۔ اس کو پریشان دیکھ کر کہنے لگیں۔

”کیا ہوا تمہارا چہرہ اس قدر کیوں اترا ہوا ہے۔“

وہ اس وقت کسی سے بھی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے صاف بہانہ کر دیا ”کچھ نہیں، طبیعت سست ہو رہی ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اس نے دیکھا کہ بیگم صاحبہ ڈاکٹر کے ہمراہ دروازے پر کھڑی ہیں۔ چنانچہ اس کو خواہ مخواہ کڑوی کسیلی دوا پینی پڑی اور رات گئے تک وہ کئی بار اس کی طبیعت کا حال کمرے میں آ کر خود دریافت کر گئیں۔ لیکن کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ رات گئے اس کو کچھ حرارت ہو گئی۔ دوسرے روز بخار کچھ اور تیز ہو گیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ملیریا ہے، گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ پھر بھی ہر طرح اس کی دیکھ بھال ہوتی۔ بچوں کی طرح اس کی ناز برداری کی جاتی۔ ابھی بیماری سے چھٹکارہ نہیں ملا تھا کہ ایک روز سہ پہر میں ادھیڑ عمر کا نجومی آ گیا۔ ہمیشہ کی طرح اس ملاقات میں بھی وہ اس کی آنے والی خوشحالی کے متعلق بہت سی باتیں بتاتا

رہا۔ متوسط طبقہ کے عام نوجوان کی طرح جس نے زندگی بھر صرف سہانے خواب ہی دیکھے تھے، یہ تمام باتیں بڑی مسرت بخش تھیں۔

اسی گفتگو کے دوران میں ادھیڑ عمر کے آدمی نے تجسس آمیز نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا اور پھر جیب سے ایک فوٹو نکال کر انصار کے سامنے کر دیا۔ یہ کسی لڑکی کی تصویر تھی۔ اس نے پہلی ہی نظر میں یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ بے حد خوبصورت تھی لیکن وہ اس کو پوری توجہ کے ساتھ نہ دیکھ سکا، بلکہ کسی قدر شرما کر نگاہیں موڑ لیں اور اس سے دریافت کرنے لگا "کس کا فوٹو ہے؟"

وہ بتانے لگا "میں نے اس لڑکی کو آپ کے لئے پسند کیا ہے۔ اس کا ستارہ آپ سے ملتا ہے۔ اگر آپ دونوں کا رشتہ ہو جائے تو پھر دیکھئے گا کہ آپ کی زندگی میں کتنا بڑا تغیر نمودار ہوگا۔ بجلی کے دونوں تار مل کر جس طرح روشنی پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح آپ کا ستارہ روشن ہو جائے گا۔" اور پھر وہ بے ساختہ ہنسنے لگا۔ انصار کچھ پریشان سا ہو گیا اس لئے کہ اس مسئلہ پر اس نے ابھی تک سنجیدگی سے کچھ غور ہی نہیں کیا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ وہ اپنی بیوی سے بے حد نالاں ہو چکا تھا لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ کوئی ایسا قدم اٹھائے جو سب کے لئے عذاب بن جائے۔ کچھ یہی سوچ کر اس نے پہلو تہی اختیار کرنے کی کوشش کی۔

"دراصل یہ ایسی بات ہے جس کا جواب میں فوری طور پر نہیں دے سکتا۔"

وہ بڑی بے تکلفی سے کہنے لگا۔ "کوئی مضائقہ نہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ آپ مجھ کو اپنے خالو جان سے ملوا دیں۔ سچ پوچھئے تو یہ باتیں انہی سے طے کرنے کی ہیں۔" انصار ایکبارگی گھبرا سا گیا۔ اس نے سوچا اگر کہیں ایسا ہو گیا تب تو بڑی مشکل پڑ جائے گی۔ اس نے فوراً ہی یہ عذر پیش کیا "خدا کے لئے کہیں ایسا غضب بھی نہ کیجئے گا۔ سچ پوچھئے تو بات یہ ہے کہ میں نے جس منگنی کا ذکر کیا تھا وہ انہی کے یہاں تو ہوئی تھی۔ کہیں ان کو یہ بات معلوم ہو گئی تو ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ میں دراصل اس سلسلہ میں اپنے گھر والوں سے خط لکھ کر مشورہ کروں گا۔" خیریت ہوئی کہ اس طرح بات بن گئی۔

وہ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ آخر وہ ادھیڑ عمر کا آدمی دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اس کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد ملک صاحب کی بڑی لڑکی آ گئی۔ بہت سی باتیں کرنے کے باعث وہ کچھ تھک سا گیا تھا۔ اس نے آ کر انصار کو دوا دی اور جس طرح خاموشی سے آئی تھی اسی طرح واپس چلی گئی۔ وہ بے حد خاموش قسم کی لڑکی تھی۔ اس کے ہر انداز میں گھریلو پن نمایاں تھا۔ عرصہ دراز کے بعد انصار نے اس کو پوری توجہ سے دیکھا تھا اور یہ محسوس کر کے اس کو ہنسی آ گئی کہ وہ اس کو اپنی منگیتر بنا چکا تھا۔

انصار ملیریا سے جلد ہی صحت یاب ہو گیا، لیکن اس کو اس بات کا قطعی طور پر اندازہ ہو گیا کہ ملک عرفان کے گھر کا ہر فرد اس کو اپنے ہی کنبہ کے لوگوں کی طرح سمجھتا ہے بلکہ علالت کے دوران میں جس طرح مستعدی کے ساتھ اس پر توجہ دی گئی۔ اتنی دیکھ بھال تو وہ اپنی بیوی کی موجودگی میں بھی نہیں پا سکتا تھا۔ یہ اور ایسی ہی اور باتوں نے مل جل کر اس کو ملک عرفان علی کے گھرانے کے ساتھ ایک وابستگی پیدا کرا دی۔ اب وہ زیادہ تندہی سے سب کو پڑھاتا۔ بیگم صاحبہ کی باتوں میں پوری دلچسپی کا اظہار کرتا۔ یہ لگاؤ کچھ اس طرح بڑھتا گیا کہ اب وہ بیوی بچوں سے ملنے کے سلسلہ میں بھی بڑی لاپرواہی برتنے لگا۔ حسب وعدہ ادھیڑ عمر کا نجومی دوبارہ وہاں آ گیا۔ اس دفعہ اس کو دیکھ کر وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔ اس لئے کہ وہ اس کی آمد و رفت کو زیادہ بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس روز اس کے لباس میں خاص اہتمام تھا اور وہ بڑا خوش نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ جلد ہی حرفِ مطلب پر آ گیا۔ "کہئے کیا طے کیا آپ نے؟ دراصل مجھ کو سب سے زیادہ دلچسپی اس بات میں ہے کہ میں اپنے علم کی آزمائش چاہتا ہوں۔ آپ کے زائچہ پر یقین مانئے، میں نے بڑی محنت کی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نکلے۔"

اس دفعہ انصار نے کسی تکلف سے کام نہیں لیا، بلکہ بڑی بے باکی سے پوچھنے لگا "پہلی بات تو یہ ہے کہ میں ان لوگوں کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں جن کی طرف سے آپ نمائندگی کر رہے ہیں:" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"یہ نمائندگی کی بات آپ نے بالکل درست کہی۔ واقعہ بھی یہ ہے۔ انہوں نے مجھ کو ہر طرح کی اجازت دے دی ہے۔ وہ میرے بڑے دیرینہ کرمفرما ہیں۔ یہاں ایک کارخانے میں اکاؤنٹنٹ ہیں، خاندانی آدمی ہیں، خوش اخلاق اور بڑے وضع دار ہیں۔ لڑکی کی تعلیم تو زیادہ نہیں۔ لیکن بے حد سگھڑ اور سلیقہ مند ہیں اور پھر اس کا ستارہ! خدا کی قسم میں نے اس کا زائچہ بنا کر دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ اللہ میاں نے کیا قسمت بنائی ہے۔

انصار اس کی باتوں میں پوری دلچسپی لیتا رہا۔ مگر آج وہ طے کر چکا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اس سلسلہ کو اب ختم ہی کر دیا جائے۔ اس لئے اس نے بڑی ٹیڑھی سی خرط اس کے سامنے رکھ دی۔ کہنے لگا۔ "دیکھئے میرا ابھی تو کوئی ایسا ارادہ نہیں۔ البتہ میں یہ ضرور سوچ رہا ہوں کہ کسی طرح اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے کچھ عرصے کے واسطے انگلستان چلا جاؤں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ میرے پاس اب تک کل دو ہزار روپے اکٹھا ہوئے ہیں، خالو جان سے اس سلسلہ میں کچھ کہنا نہیں چاہتا، ورنہ وہ تو خوشی سے تیار ہو جائیں گے۔ آپ نے تاکید کی ہے کہ یہ منگنی راس نہیں آئے گی۔ اس لئے اب مسئلہ یہ درپیش ہے کہ اگر مجھ کو دس ہزار روپے مل جائیں تو میں پوری طرح آمادہ ہوں ورنہ سر دست میں نے پروگرام کو ملتوی کر دیا ہے۔" ادھیڑ عمر کا آدمی خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری ہو گئی۔ وہ دیر تک بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ آخر انصار نے خود ہی کہا۔

"آپ خواہ مخواہ کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔ ان سے مشورہ کر کے بتا دیجئے گا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے کوئی بے جا شرط تو پیش نہیں کی:"

وہ کہنے لگا "یہی تو میں بھی غور کر رہا ہوں۔ آپ کا مطالبہ بھی کسی حد تک درست ہے لیکن یہ ممکن بھی ہے کہ نہیں:" وہ ایک بار پھر گہری خاموشی میں غرق ہو گیا۔ انصار اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ اس کی پریشانی سے اچانک اس کو کچھ ایسا محسوس ہوا کہ کہیں یہ اس شخص کا ذاتی معاملہ تو نہیں! اسی اثنا میں اس نے کسی قدر بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ اس بات پر رضامند ہو جائیں گے۔ مگر اتنا خیال رکھئے کہ انگلستان جانے سے قبل آپ کو تمام رسوم ادا کرنا پڑیں گے۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آخر ان کے اطمینان کے لئے بھی تو کچھ نہ کچھ ضرور ہونا چاہیئے:"

انصار نے بلا جھجک اس بات کو قبول کر لیا۔ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ یہ شرط کسی ایسے شخص کے لئے پوری کرنا ناممکن ہے جو کسی کارخانے میں اکاؤنٹنٹ کا کام کر رہا ہے۔ اب کے اس کے جانے سے پہلے انصار نے احتیاطاً یہ طے کر لیا کہ اس کو یہاں بلانے کی بجائے وہ خود اس کے پاس پہنچ جائے۔ ادھیڑ عمر کا نجومی کہنے لگا "میں شام کو عام طور پر لوٹس ریستوراں میں بیٹھتا ہوں۔ آپ وہاں مجھ سے مل لیں، ورنہ میں خود چلا آؤں گا۔ آپ میری پریشانی کا خیال نہ کریں" اور پھر وہ واپس جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے باہر نکلنے کے انصار نے سوچا کہ شاید اب یہ نجومی قسم کا آدمی دوبارہ نہیں آئے گا اور اگر آیا بھی تو کسی ایسے پروگرام پر گفتگو کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ اس روز شام کو وہ اپنے کمرے میں لیٹا ہوا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ خلاف توقع ملک صاحب آ گئے۔ اس کو اس طرح بستر پر لیٹے ہوئے دیکھ کر کہنے لگے۔ "کیا کچھ طبیعت خراب ہے:"

وہ کہنے لگا "جی نہیں، باہر جانے کا ارادہ نہیں تھا، اس لئے یہاں چلا آیا:"

وہ ہمدردی کے سے انداز میں بولے" میں دیکھ رہا ہوں کہ ادھر تم کچھ شست نظر آرہے ہو"
ظاہر ہے کہ وہ اپنی اُلجھنوں کو ان کے سامنے کس طرح بیان کر سکتا تھا، لہٰذا وہ بات کو ٹال گیا" ایسی تو کوئی بات نہیں ، بلکہ آپ کے یہاں تو مجھ کو اس قدر آرام اور سکون حاصل ہے کہ میں اس شہر میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا"

وہ ہنسنے لگے "تم مجھ کو خواہ مخواہ شرمندہ کر رہے ہو۔ یقین مانو، میں تو تمہارے لئے بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں، تم پریشان نہ ہو۔ انشاء اللہ سب بہتر ہی ہوگا۔ وقت آنے پر تم کو خود ہی علم ہو جائے گا کہ مجھ کو تمہارا کتنا خیال ہے۔ وہ اسی طرح کی اور بہت سی باتیں کر کے واپس چلے گئے" لیکن وہ دیر تک اس گفتگو پر غور کرتا رہا۔ پھر اس کو رفتہ رفتہ یہ محسوس ہونے لگا کہ بیگم صاحبہ بھی روز بروز اس پر مہربان ہوتی جا رہی ہیں۔ بچے اس کو اب" ماسٹر صاحب" کے بجائے بھائی جان کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ان تمام باتوں پر اس نے بڑے جذباتی انداز سے سوچنا شروع کر دیا اور ایک روز جب گھر پر بیوی سے اس کی پھر ان بن ہوگئی تو اسی جھنجھلاہٹ میں اس نے طے کیا کہ اب وہ کچھ نہ کچھ ضرور کر ڈالے گا۔ اس لئے کہ خانگی زندگی اس کے لئے اس قدر عذاب بن چکی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس سے نجات پانے ہی میں اپنی بہتری سمجھنے لگا۔

رات گئے تک وہ بے چینی سے جاگتا رہا۔ آخر اس نے بہت کچھ سوچ کر بیگم صاحبہ کے نام خط لکھا جس میں اس نے دبی زبان سے اس بات کا اظہار کر دیا کہ اگر اس کو بہ حیثیت داماد قبول کر لیا جائے تو وہ ہمیشہ کی طرح ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا لیکن تمام دن وہ اس خط کو لئے کر بیٹھا رہا۔ دراصل ابھی تک وہ کوئی فیصلہ کن بات نہیں طے کر سکا تھا۔ آخر اس نے رات کا کھانا کھانے کے بعد بیگم صاحبہ کو جرأت کر کے یہ خط دے ہی دیا۔ یہ رات بھی بے چینی میں کٹی۔ کچھ تو ادھیڑ عمر نجومی کی بات، اور کچھ ملک صاحب کے برتاؤ سے اس کو یقین تھا کہ نتیجہ کچھ نہ کچھ بہتر ہی نکلے گا۔

لیکن صبح یہ دیکھ کر اس کو تعجب ہوا کہ نہ تو دونوں لڑکے پڑھنے کے واسطے اس کے پاس آئے اور نہ بیگم صاحبہ نے اس کو بلوایا البتہ دن چڑھے ملک صاحب خود اس کے کمرے میں آئے۔ ان کے ماتھے پر بل دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ وہ تھوڑی دیر خاموش کھڑے رہے۔ پھر انہوں نے جیب سے ایک سو بہتر روپے نکال کر اس کے سامنے ڈال دیئے اور آہستہ آہستہ کہنے لگے" یہ آپ کی تنخواہ ہے۔ شام تک آپ کمرہ خالی کر کے اپنا کہیں اور انتظام کر لیجیے"

اور پھر کسی جواب کا انتظار کئے بغیر وہ تیزی سے کمرے سے باہر چلے گئے۔ اس کو ایسا لگا جیسے سناٹے میں آگیا۔ اس نے بیگم صاحبہ سے ملنا چاہا تو وہ اس قدر ناراض تھیں کہ انہوں نے یہ بھی گوارا نہ کیا۔ بہر حال اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنے گھر واپس چلا جائے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔

گھر جا کر کئی روز تک وہ اسی کوفت میں بے حد اداس اداس رہا۔ ان تمام باتوں پر غور کرتے کرتے اس کو نجومی کا خیال آگیا۔ اس نے سوچا کہ کہیں وہ ملک صاحب کی کوٹھی پر نہ پہنچ جائے اور ان سے اس کی ملاقات ہو جائے، یہ تو اور بھی بُرا ہوگا۔ اس لئے کہ وہ ان کی نظروں میں اس قدر ذلیل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا اس روز شام کو وہ لوٹس ریستوران پہنچا۔ مگر ادھیڑ عمر کا نجومی وہاں موجود نہ تھا۔ اس نے منیجر سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کئی روز سے یہاں نہیں آرہا ہے۔ پھر اس نے مزید معلومات کے لئے پوچھا" وہ کس دفتر میں ملازم ہیں؟"

تو یہ سن کر اس کو تعجب ہوا کہ وہ منگھو پیر کے کسی کارخانے میں اکاؤنٹنٹ ہیں لیکن وہ اس روز کسی نہ کسی طرح اس سے ضرور

مل لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس کے گھر کا پتہ معلوم کرکے وہ وہیں پہنچ گیا۔ گھر پر سب لوگ پریشان تھے۔ اس لئے کہ کل صبح سے اب تک وہ گھر نہیں پہنچا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کو بڑا دکھ ہوا کہ اس کے کئی چھوٹے چھوٹے بچے تھے اور گھر پر سوائے پاس پڑوس کے لوگوں کے علاوہ کوئی بھی ایسا نہیں تھا کہ اس کی تلاش میں پوری تندہی سے کام لے۔

جب وہ وہاں سے لوٹا تو اس کے دل پر ایک بوجھ سا تھا۔ راستہ میں اس نے شام کو شائع ہونے والا اخبار خریدا اور اس کو پڑھنے لگا۔ اچانک اخبار کے ایک گوشہ میں اس کی نظر پڑی، تو وہ چونک پڑا۔ پاسپورٹ سائز کے ایک فوٹو کے نیچے یہ عبارت تحریر تھی: "یہ شخص بیس ہزار روپے کا غبن کرکے ایک عرصہ سے مفرور ہے۔ پولیس اس کی تلاش میں ہے۔ جو کوئی اس کی گرفتاری میں اعانت کرے گا، اس کو مبلغ ایک ہزار روپیہ بطور انعام پیش کیا جائے گا۔"

اس اشتہار کو کسی فرم کی جانب سے شائع کیا گیا تھا۔ انصار نے فوٹو کو غور سے دیکھا، مگر یہ ادھیڑ عمر کے بجوی کی تصویر نہیں تھی بلکہ یہ کسی اور شخص کا حلیہ تھا، لیکن پھر بھی اس کو کچھ ایسا محسوس ہوا، گویا کسی نے اس کا سارا خون نچوڑ لیا ہے، اور وہ بالکل مُردہ ہو کر رہ گیا ہے۔

(اگست ۵۳ء)

جیون کے
بے انت سفر میں
میں نے تیری
دونوں آنکھیں
اپنا زادِ راہ سمجھ کر
ساتھ رکھی ہیں

یہ صحرا کا قطبی تارا
بیچ بھنور میں میرا کنارہ

شاہین مفتی

عکس تحریر:۔ شاہین مفتی

# آنسو

شکیلہ اختر

جاڑے کا اُداس دن، سائیں سائیں چلتی ہوئی ٹھنڈی ہواؤں میں اور بھی ویران نظر آتا تھا۔ کھیتوں سے سنہرے دھان کٹ چکے تھے اور الگ الگ کھلیانوں میں ان کا پونج لگ رہا تھا۔ دھان کی کھلیں، پیلی مٹی سے لیپے پُتے ہوتے کھلیان کے صحن میں سونے کی طرح دمک رہی تھیں، اور موٹے موٹے بانس کے محور پر بیچارے بیل بس اپنا دہی ازلی چکر کاٹ رہے تھے۔ اسد علی صاحب کی اتنی بڑی حویلی بالکل سنسان نظر آتی تھی۔ دو چار نوکرانیاں مکان کے کسی کسی حصے میں چھپی چھپی بیٹھی اور لالہ براہل اور گماشتوں کا وقت زیادہ تر کھلیانوں میں گزرتا۔ گھر بھر میں ایک منجھلی دُلہن کا رہنا اور نہ رہنا سب برابر تھا۔ وہ بھی ہفتے سے بیمار اپنے کمرے میں پڑی تھیں۔ یہ زکام، کھانسی اور بخار کچھ اس طرح سے ان کے پیچھے پڑا تھا کہ جان چھڑانا مشکل ہو گیا۔

ثریا کی شادی کی تمنا سارے خاندان کو کب سے تھی مگر اس کی شادی کی خبر ایسی، چونک آئی کہ فصل کے دنوں گھر بھر کا اٹھ کر چلا جانا ناممکن سی بات تھی اور اس پر سے منجھلی دلہن کی طبیعت کی خرابی، یہاں سے چھوٹے چچا نے بہت لکھا کہ کچھ دنوں کے لیے بھی تاریخ بڑھا دو مگر ننھیال والوں کی مرضی۔ سارے نیچے وہیں پالے پوسے گئے تھے۔ سارا خرچ برچ انہی لوگوں کا ہوا تھا تو پھر چچی کو شرکت کے سوا اور کرنا ہی کیا تھا؟ اور یہاں چھوٹے چچا مظہر علی پیچ و تاب کھا کے رہ گئے۔ کیسی نسبت تھی؟ کیسے لوگ تھے؟ کون سا گھرانہ تھا؟ مگر ان کو اپنے بڑے بھائی کے خط سے بس اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا کہ یہ شادی خاندان کے اندر ہی ہو رہی ہے اور لڑکا کسی ممتاز عہدے پر ہے۔ آخر وہ کون سا لڑکا ہو سکتا ہے؟ گھر کے لوگ خیالی گھوڑے دوڑایا کئے مگر سمجھ میں کسی کے کچھ نہ آیا۔ جو بھی ہو ثریا اس خاندان کی پہلی پوتی بیاہی جا رہی تھی۔ وقت کم تھا مگر شادی کی ایک ہلکی سی رونق یہاں بھی چھا گئی۔ حویلی کے اندر سے گیتوں کی لہکار اٹھنے لگی۔ نیچے دینے کے کپڑوں پر جھلانے ہوتے مصالحے نکلنے لگے، ٹونہ اور جوگ گا کر بیاہ کے لیے ہلدی کٹانے لگی، لالہ براہل اور منشی جی؟ گھی کے کنستر، تیل کے پیپے، باسمتی چاولوں کے بورے، کوٹے چھانے ہوتے مصالحوں اور میٹھوں کے ساتھ حلوائی، دھوبی، اور کام کرنے والے کئی رعیتوں کو لیے پہلے ہی بوڑھے بابو کے سسرال پہنچ گئے تھے۔ منجھلی دُلہن گھر کی دیکھ بھال اور اپنی بیماری کی وجہ سے نہیں گئیں۔ مظہر علی کا پورا خاندان، گھر کی پرانی دائیوں کے ساتھ گیا۔ منجھلی دُلہن کا جی کئی دنوں سے گھبرایا گھبرایا سا لگ رہا تھا۔ جانے کیوں آپ ہی آپ ان کی آنکھیں اُبل پڑنے کو بے چین سی تھیں مگر وہ اپنے جی کو سنبھالیتیں۔ ”ثریا بیاہی جا رہی تھی، اس کی ناک میں سہاگ کی نتھ اور ہاتھوں میں شہاتی مہندی رچے گی“ اور پھر ان کا دل جیسے امڈ آتا ”اللہ مبارک کرے“ جب چھوٹی دلہن کی موٹر اسٹارٹ ہونے لگی تو کواڑ کی اوٹ سے لگی ہوئی منجھی دُلہن کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ ان کے کلیجے سے لگی ہوئی ثریا کو جیسے کوئی زبردستی ان سے چھینے لیے جا رہا تھا، اور ان کا جی تڑپ رہا تھا کہ ایک آخری بار ہی سہی مگر وہ ثریا کو اپنے بیقرار دل سے لگا لیتیں۔

دوسرے دن پلنگ پر پڑی پڑی منجھلی دلہن نے مشکلوں سے اپنی آنکھوں کو کھولا۔

"کون ہے؟ رحیمن بوا؟"

"ہاں بیگم صاحب! کہئے نہ کیسا جی ہے آپ کا؟"

"اچھی ہوں بوا مگر۔ مگر سر پھٹ رہا ہے اور سارا جسم ٹوٹا جا رہا ہے۔"

"تو پھر اچھی کہاں ہوئی بی؟" بوڑھی کھائی پتیا نہیں بیٹھی" تو اسلاتی ہوئی بولی، "پتہ بھی ہے تو کو۔ راتنے، رات بھر ہم، رحیمن اور جوہیا چھوکری تلوے سہلاتے رہے ہیں تو ابھی گھڑی تم آنکھ کھولے ہو۔"

"ہاں کھائی بوا۔ جانے کیوں دل ہی گھبراتا رہتا ہے۔ اسی بخار کے عالم میں رات امی مرحومہ کو خواب میں دیکھا تھا کہ یہاں آئی ہیں مگر چپ چپ سی اور روٹھی روٹھی ہوئی۔"

"ہاں تو بی بی بڑی سرکار کا تو۔ کاہے نہ لگے گا، گھر کی پہلی پوتی کا بیاہ ہو۔ اور گھر سے دور۔ اللہ جانے بڑی دلہن نے مردوں کو بھی نیوتا دیا تھا یا نہیں۔ بھلا پہلا پہلا بیاہ اور اودھ ہو دے نہیاں ہیں" "اچھا تو رحیمن بوا۔ میرا منہ دھلا کر بنفشہ کا گرم گرم جوشاندہ پلا دو۔ سردی جیسے جکڑ کے رہ گئی ہے۔"

"بیگم صاحب نا۔ ای جوشاندہ، او شاندہ سے کچھ نہ ہوگا جا ہن منشی جی سے کہہ کے ڈاکٹر بلوا دے۔"

رحیمن بوا تیزی سے جھپٹتی ہوئی پھاٹک سے باہر نکل گئیں، کمرے کے اندر باہر دریچہ سے ایک ہلکا سا سایہ لپٹا "کون ہے؟" منجھلی دلہن نے نحیف آواز میں پوچھا۔ "میں ہوں بیگم صاحب" باہر ہی سے دریچے کی سلاخوں سے لگی ہوئی نرگس چھوکری کھڑی تھی۔

"حضور کے پاس یار دنہیں۔ نہیں بیگم صاحبہ نے بھیجا ہے کہ اب آپ کا مزاج کیسا ہے؟ اور اگر ضرورت ہو تو ہم آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہیں" تہذیب و سلیقہ سے نرگس نے اپنی بیگم صاحبہ کا پیغام پہنچایا۔

منجھلی دلہن کے کمزور پیلے چہرے پر ان کی سیاہ بھنویں یکدم تن گئیں اور نگاہوں میں تیکھا پن چھا گیا مگر اچانک انہوں نے اپنے کو سنبھالا۔ اور اپنی نحیف آواز میں وقار کے ساتھ بولیں "اپنی بیگم صاحب کو میرا سلام۔ اور شکریہ کہہ دینا۔ اور یہ کہہ دینا کہ ابھی تک تو اللہ نے فضل کیا ہے، اور ماشاء اللہ میرے گھر پر ابھی دیکھنے والے موجود ہیں۔"

اتنے میں رحیمن بوا بڑبڑاتی ہوئی آئیں، "اللہ غارت کرے ایسے نگوڑے مارے ڈاکٹر۔ ابھی خسو میاں دوکان دار اسپتال سے چلے آ رہے ہیں، کہہ رہے ہیں کہ ڈاکٹر گواہی میں گیا ہے۔"

اور بغیر دوا اور علاج کے منجھلی دلہن کا بخار اچھی طرح سے بڑھا۔ انفلوئنزا کی تکلیف اور تیز بخار کو دیکھ کر رحیمن بوا اور کھلائی بوا دونوں کی دونوں رونے لگیں۔ منجھلی دلہن بے سدھ پڑی تھیں۔ منشی اور گماشتہ جی دروازے پر آکر خیریت دریافت کر لیتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ابھی تک غائب تھے اور حکیم جی الگ بیمار پڑے کراہ رہے تھے۔

رات کو نرگس چھپتی چھپاتی جوہیا چھوکری کے پاس آئی "ارے جوہیا سن تو۔ آنا یہاں" "کیا ہے رے" جوہیا شان سے اکڑ کر بولی، "چپ رحیمن بوا سے جوتا کیا کھلاتے گی؟" "آ سن رے ایک بات" "جانا سنیں گے، ہم کوئی بات اوت" وہ اکڑی ہی چلی جا رہی تھی۔ "اچھا بس یہاں پر آ کے دیکھ لے" "مجال ہے یہاں کسی کے آنے کی؟" جوہیا شان سے آگے بڑھی "ارے کون؟ آپ؟ پارو بی بی!" "پھر شور مچا گی تیں" نرگسیا نے پیار سے تھپڑ اٹھایا "کیسی ہیں اب تیری بیگم صاحب؟" پارو بہت ہی آہستہ سے بولی "بیگم صاحب تو بے سدھ ہو کے سو

رہی ہیں" اور بخار کتنا ہے ؟" پارو نے ہلکے سے پوچھا۔ "ہم کو کا معلوم۔ مگر بُوا کہتے ہیں کہ بڑا تیز بخار لگ رہا ہے" "تو۔ تو پھر اپنے بابو کو تار دے کر بلا کیوں نہیں لیتی۔؟" "کون ریاض بابو کو؟" جھیا پارو کو تکتی ہوئی بول اُٹھی اور پارو کی سیاہ آنکھیں دم بھر کے لیے چمک اُٹھیں ؟

"اچھا تو سُن۔ کسی سے کہنا نہیں۔ کہ میں یہاں آئی تھی۔ سمجھی نہ ؟" اور یہ کہہ کر پارو رنگ سیا کے ساتھ چپکے سے اپنے گھر واپس چلی گئی۔

دوسرے دن منجھلی دلہن کا بخار کچھ کم ہو گیا تھا۔ مگر رات ہوتے ہوتے بے چینی پھر بڑھ گئی تھی اور اندر سے باہر کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ منجھلی دلہن کو کیسے اچھا کیا جائے۔ سب قسم کے جوشاندے پلائے جا چکے تھے اور شادی کے گھر میں تار دے کر بیماری کی خبر دینا بھی مناسب نہ تھا۔

تیسرے دن صبح ہی صبح منجھلی دلہن کے سرہانے اسٹول پر بیٹھی ہوئی رحمن بوا اچانک چہک اُٹھیں "دے ہمرا بابو۔ ہمرا اپنا ڈاکٹر لال آگیا" ماں نے اپنی کمزور نگاہوں کو اوپر اٹھا کر دیکھا۔ اور آنسوؤں کے چند قطرے آنکھوں سے ٹپک پڑے۔

"میری می !" ریاض ننھے بچے کی طرح ماں کی کروٹ میں پٹی پر بیٹھ کر پیار سے اُن پر جُھک گیا۔ "اب تو بخار نہیں ہے امی ؟" وہ نبض دیکھ کر بولا۔

"امی ! آپ اتنی بیمار پڑی رہیں اور مجھ کو ذرا سی خبر تک نہ دی۔ وہ تو بچارے اسلم چچا کا تار کل پہنچا اور میں بدحواس آیا ہوں"

"اسلم بھائی نے بے سمجھے بوجھے تم کو ناحق تار دے دیا، انفلوئنزا میں ڈرنے کی کیا بات تھی اور یہ جو تمہارا پڑھنا ہرج ہوا" منجھلی دلہن دبے تکلیف کے ساتھ بولیں۔

"تو امی ! آپ سے بڑھ کر ہے پڑھائی ؟ پھر ان دنوں کوئی خاص پڑھائی بھی نہیں تھی"

"ریاض۔ میں نے تم کو لکھنا چاہا تھا کہ دو دن کے لیے بھی بڑی بھابی کے یہاں شادی میں چلے جاؤ۔ آج کون سی تاریخ ہے ؟"

"۷ فروری ہے امی !"

"آج ہی ثریا کی برات ہے نا ؟" منجھلی دلہن کے بیمار چہرے پر ایک غمگین لہر سی دوڑ گئی۔

"بڑے ابا کا دعوتی کارڈ میرے پاس بھی آیا تھا۔ مگر امی یہ حیدری صاحب جج کون ہیں ؟ آپ جانتی ہیں انہیں ؟" ——— ریاض کے گلے میں پھندا سا اٹک رہا تھا اور وہ جان رہا تھا کہ اس کی امی کا دل ثریا کی شادی کی خبر سے کتنا بے چین ہو رہا ہے۔

"میں۔ میں کچھ بھی نہیں جانتی ریاض : بس اتنا ہی سنا ہے کہ یہ لڑکا بڑی بھابی کا اپنا ہی عزیز ہے" "کتنی محبت کرنے والی کیسی حسین اور کس قدر پیاری لڑکی ہے ثریا : اللہ اس کے دل کو سچی خوشی اور راحت نصیب کرے" منجھلی دُلہن کے دل سے دُعا نکلی اور ان کی نحیف آواز میں دل کی ٹیس صاف جھلک رہی تھی !

شہنائی بجتی رہی، لاؤڈ اسپیکر پر فلمی گانوں کی دھوم مچتی رہی اور مراثنیں ٹونے اور جوگ گاتی رہیں۔ مگر سیما گھٹتی رہی۔ ثریا کے مانجھے خانے میں جاتے ہی اس سیروں خون خشک ہو جاتا۔ زردی زرد رنگ ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ دیوار، چھت، پردے، بستر، ثریا اور ثریا کا لباس سب ہی کچھ، جیسے دنیا بھر کا پیلا رنگ یہیں بھر دیا گیا تھا۔ ہلدی ہلدی کی موٹی موٹی گرھیں، اور اس کی آنکھیں چوندھیا جاتیں "توبہ ! یہ کیا کر رکھا ہے۔ ثریا آپا ؟ اُنہہ ! یہاں تو آنے کو جی نہیں چاہتا ہے ! ایمان سے :"

اور ثریا سامنے خلا کو اپنی کھوکھلی نگاہوں سے تکتی ہوئی بس ایک لاش کی طرح نظر آتی "سیما ! میرا دل ایسا ڈوبا ڈوبا سا کیوں رہتا ہے۔ ایک عجیب سا خوف چھا گیا ہے مجھ پر۔ امی بہت خوش ہیں نا ؟ مگر بچارے "ابی"" وہ کپکپا سی جاتی۔ برف کی طرح ٹھنڈے ہاتھوں سے وہ سیما کا ہاتھ پکڑ لیتی "انور بھیا کہاں ہیں سیما ؟ تم انہیں کسی طرح سے بھی یہاں بلا سکتی ہو نہ ؟ اچھا تو پھر جانے دو، سیما میں بھی

امی اور خالہ امی دونوں سے ڈرتی ہوں ۔ بہت ڈرتی ہوں سیما ! میں نے سنا تھا کہ انور بھیا کل اپنے کمرے میں رو رہے تھے ۔ امی سے وہ بیچارے بھی ڈرتے ہیں ، جبھی تو چھپ کے کیلئے کمرے میں رو رہے تھے اور انہیں کوئی چپ بھی نہ کرا سکا ، میرے بھیا کتنا مجھ کو چاہتے ہیں ! کتنی محبت سے آئی ۔ اے تک پڑھ لکھ کر مجھ کو پڑھوا دیا ، اور اب وہ بھی رو رہے ہیں اور میں بھی ، لیکن سیما تم ان کے پاس کیوں نہ گئیں ؟ شاید ان کے دل کو تھوڑا سا سکون مل جاتا ۔ اور ناہید ــــ ناہید کہاں ہے ؟ جاؤ سیما ! اس کو کہہ دو کہ میرے بھیا کے پاس رہے ، ان کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھتی رہے ۔ اور ــــ اور اس سے کیا کہوگی ؟ مگر یہ ــ ریاض بھیا کیوں نہ آئے سیما ؟ تم نے کسی سے پوچھا نہیں کہ ریاض بھیا آئے کہ نہیں ؟ مگر چھوڑ دو سیما ، وہ نہیں آئیں گے ۔ اور کبھی بھی نہ آئیں گے ۔" اور سیما گھبرا جاتی ۔ "ثریا آپا لیٹ جائیے ، میں گلوکوز کا شربت بنا کے لاتی ہوں ۔ ہائے اللہ ! آپ کے ہاتھ ۔ یہ ہاتھ کیسے برف جیسے ٹھنڈے ہو رہے ہیں" ! اور سیاہ پلکوں کے سائے میں سیما کی کانپتی ہوئی آنکھوں کی چمک بجھنے لگتی ، دور سے اس کی نگاہیں نور کے کمرہ میں جھولتے ہوئے بردے پر ٹکتیں ــــ مگر ! وہ اتنی دور ایک بھیانک خلا کو پار کر کے وہاں جانے کی اس میں ہمت نہ تھی !

"کون سیما ہو جی ! ایک سلائی بھی تم نے اپنے ہاتھ سے کی ؟ بڑی اماں کی آواز ــــ ۔ اور سیما کو مجبوراً دنیا بھر کے پھیلے ہوئے کپڑوں ، گوٹے ٹھپے ، گوکھرو اور بنت کے درمیان بیٹھ جانا پڑا ۔

"ہاں تو ثریا بھی بدلے گی" ! سیما کی امی جمپر میں سلمٰی کی بیل ٹانکتی ہوئی بولیں ۔

"ذرا یہ دیکھو تو حسنا ! غرارے میں بنت لگا کے اس کے کناروں پر گوکھرو اور رچپا کیسا لگے گا ؟" ــــ ثریا کی خالہ امی نے اپنی معذور آنکھوں کو جنبش دیتے ہوئے کہا ۔

"بہت ہی اچھا لگ رہا ہے باجی ۔ بھلا آپ کی پسند اور اچھی نہ لگے ۔ باجی ! حیدری میاں کی اماں جانی کے پلیچے یاد ہیں آپ کو ؟ اللہ کیا دن تھے ۔ بہن تو ان کو دیکھتے ہی سہم جاتی تھی ، وہ دو ٹوکرانیاں پیچھے سے پائنچے سنبھالتی چلی آ رہی ہیں" ؛ ثریا کی اماں ہنستی ہوئی بولیں ۔

"پہلے ڈرتی تھیں ، اور اب سمدھن بن رہی ہو ۔ وہ زندہ رہتیں تو میاں حیدری ایسے ایسے لاکھ سر ٹپک کر مرجاتے ۔ کبھی تو کرتیں یہ شادی ! خالہ امی کی پتلی دار آواز گونجی ۔

"تو یہ رشتہ حیدری میاں نے خود ہی سے پسند کیا ہے ؟ سیما کی امی نے پوچھا ۔

"اے بہن آپ پسند کو کہتی ہیں ، حیدری میاں تو کہتے ہیں کہ ثریا کے سوا ہم کسی اور سے شادی کریں گے ہی نہیں ، وہ تو سمجھئے خدا نے اب دماغ بدلا نہیں تو کس کو امید تھی کہ یہ عمر کا شادی کا نام بھی لے گا ۔ خاندان میں سوائے بڑے بھائی کے اور کس نے شادی کی ہے ؟ صفدر میاں کو عورت کے نام سے چڑ ہے ۔ منظر میاں کی یہ عمر ہو گئی ، کنوارے بیٹھے ہیں ، وہ حسنو تو کھل کر کہتے ہیں کہ بڑے بھائی کی مٹی پلید ہوتے دیکھ کر سانپ سے کون کھیلے گا ؟ حیدری میاں تین تین بار ولایت گئے مگر جیسے گئے ویسے ہی آ گئے ۔ دولت کا ڈھیر لگا ہے ۔ تین تین بیرسٹر اور جج ، مگر کھانے والا کوئی نہیں ــــ وہ تو مالک کا شکر ہے کہ حیدری میاں کی نظر اب گھی اور ان کی نگاہوں میں ثریا جچ گئی اور وہ اس کے متوجہ ہو کر رہ گئے ہیں" ۔ خالہ امی کی بات سن کر سیما چونک پڑی ؟ نوشے بھائی ۔ تب تو بڑے رنگین مزاج نکلے نہ ؟ پھر ریاض بھیا ۔ بچارے جو پلید کو پسند کرتے ہیں تو اتنا برا کیوں سمجھا جاتا ہے ؟ مگر انور بھیا کے آنسو اور ثریا آپا کی دیوانوں جیسی باتیں پھر کیوں تھیں اور خواہ مخواہ بہت سی باتوں کو سوچتے سوچتے اس کا دماغ تھک گیا ۔

عورتوں کے ہجوم میں سیما دب دبا کر رہ گئی ـــــ ہائے اللہ، ارے بھئی ذرا ہٹو بھی تو۔" دلہا کو جلد سے جلد دیکھنے کی تمنا میں جیسے اس کا دم نکلا جا رہا تھا۔ ناہید کے ساتھ اس نے بھی دلہا سے کھیلنے کو آٹے کا گیند سکھا سکھا کر رکھا تھا۔ مگر ایک دن ثریا نے اس کے بہت سے گیند دریچے کے سامنے نیم کے موٹے تنے پر مار مار کر برباد کر دیئے تھے، اور پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی "پہلے میں کھیلوں گی سیتو! بعد میں تم لوٹ کھیلنا۔ مگر یہ عورتیں تھیں۔ توبہ! جیسے کوئی سمندر کا سمندر موجیں مار رہا ہو۔ آخر اس نے بڑی مشکلوں سے توبت پہنچتے ہوئے دلہا کو کسی نہ کسی طرح سے دیکھ ہی لیا اور پھر وہ کچھ دیر تک ٹکٹکی لگائے اس کو غور سے تکتی رہی۔ اس کا کھلا ہوا چہرہ ایک جھلسے ہوئے پھول کی طرح مرجھا گیا اور بے اختیار اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ روتے ہوئے انور کے ساتھ ثریا سے لپٹ کر پھوٹ پڑنے کو اس کا دل بھی تڑپنے لگا۔ وہ عورتوں کو دھکیلتی، بچوں کو گراتی، بوکھلائی ہوئی ایک ہی ریلے میں ثریا کے پاس پہنچنے کو بے قرار ہو رہی تھی۔ ٹھاٹھیں مارتا ہوا مجمع کا سیلاب اس نے جیسے تیسے پار کیا، وہ ثریا کے قریب پہنچ گئی۔ "آپا!" مگر سوکھے ہوئے لبوں سے آواز باہر نہ نکل سکی۔ عورتیں ثریا کو اپنے گھیرے میں لیے بیٹھی ہیں، ثریا کی آنکھیں بند تھیں، لب ساکت تھے اور وہاں بے حس و حرکت ثریا کی جگہ ثریا کا ایک مجسمہ دھرا تھا جس کو عورتیں ٹونے، در جوگ گا گا کر سنوار رہی تھیں۔ ٹونے اور جوگ تاکہ دلہا ریجھا ہوا رہے۔ دلہن اس کی آنکھوں کا تارا بنی رہے۔ مگر دلہا؟ سیما وحشت زدہ کمرہ سے باہر نکل گئی، اس کا جی بہت ہی بے چین لگ رہا ہے۔ ہائے! دولت کے ڈھیر پر، تنی پیاری سی ثریا باجی کی بھینٹ کیوں چڑھا دی گئی؟" کھدر کے سوٹ میں پھولوں سے لدا ہوا دلہا اس کو ایک سرخ و سفید تندرست منڈھا سا نظر آیا جس کی عینک سے ڈھکی ہوئی آنکھوں کے گرد ہلکی ہلکی جھریوں کی لکیریں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ سیما کا دل رو پڑا۔ یہی اس کے نوشے بھائی تھے جن سے ملنے کی تمنا میں وہ مری جا رہی تھی۔ اس نے پھر غور سے دیکھا۔ "ہائے خدا! یہ روسی بڈھا جرنیل کہاں سے ٹپک پڑا تھا؟" اور بچاری دبلی پتلی معصوم سی میری ثریا آپا!" اور اپنی بے اختیار چیخ کو اس نے بڑی مشکل سے روکا۔ سب ہی طرف ہنگامے بپا ہو رہے تھے، سارے کمروں میں مہمانوں کا ایک ریلا تھا، سب سے کنارے بس ایک انور ہی کا کمرہ محفوظ تھا، سیما اپنی آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسوؤں کو چھپاتے تیزی سے بھاگی۔ میری آپا بھی ہونگی، اسی اکیلے کمرے میں، وہ اس سرخ چہرے والے موٹے جرنیل کے ڈر سے رو رہی ہوں گی۔ اور انور بھائی۔ انور بھائی کے آنسو بھی بہہ رہے ہوں گے۔ میں اپنی آپا کو تسکین دینے جاؤں گی، میں ان کے آنسوؤں کو خشک کرونگی، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی مگر اس کو یہاں بھی چین نہ ملا۔ اس نے کمرہ کے اندر آتی ہوئی آہٹ کو سن کر اپنی سسکیوں کو چھپانا چاہا مگر اس کی ہچکیاں نہ رک سکیں۔

"کون؟ ثریا؟ میری بہن ثریا! تم یہاں رو رہی ہو؟" انور کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز سیما کے قریب ہوتی گئی اور انور نے کمرے کے اندر ہلکی ہلکی سی آتی ہوئی روشنی میں اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پلنگ پر بیٹھی ہوئی سیما کو بڑی محبت سے اپنے پہلو سے لگا لیا۔

"میری بہن اب نہ رو۔ تیرا بھائی ساری زندگی تیرے اس غم کو بھلا نہ سکے گا۔ میرے آنسو اب کہاں بہتے ہیں وہ تو اپنی شکستگی پر خشک ہو چکے ثریا! پھر میری بہن تو کب تک رو سکے گی؟" انور کا سارا جسم کانپ رہا تھا مگر اس سے بھی زیادہ سیما تھرتھرا رہی تھی۔ باہر آتش بازیاں چھوٹ رہی تھیں، پٹاخے دغ رہے تھے اور باجے کا شور دم بدم بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

"جاؤ! میری بہن اب جاؤ! کوئی دیکھے نہیں۔ یہیں پر اپنے آنسوؤں کو پونچھ لو۔ جاؤ ثریا! امی تمہیں ڈھونڈھ رہی ہوں گی۔" انور نے روشنی کی سوئچ دبائی اور جب اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کی مسہری پر پیر لٹکائے بیٹھی ہوئی ثریا نہیں سیما سسک سسک کر رو رہی تھی۔

"تم۔ تم ہو سیما؟ ثریا نہیں تھی یہاں؟ مگر تم کیوں رو رہی ہو سیما؟ ثریا کے لیے؟" اور وہ سیما کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔

اب نہ رو سیما، ثریا کو نہیں دیکھتی ہو کہ اس نے کتنے بڑے غم کو ہمیشہ کے لیے اپنا لیا ہے۔ تم تو جانتی ہو کہ میں نے ایک پودے کی طرح اس کو کتنی محنت سے سینچا تھا، خاندان بھر کی باتیں سن سن کر کسی طرح سے آئی اے تک اس کو تعلیم دلا سکا۔ مگر آج بنک کی تجوریوں پر کس بے دردی سے اس کو قربان کر دیا گیا! اور غریب ثریا کو تو دولت کی پروا تک نہ تھی، مگر اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ ثریا مٹ چکی اور اسی طرح یہ انور بھی ایک دن مٹا دیا جائے گا! تم کس کس کا ماتم کر سکو گی سیما؟"

سیما نے اپنی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی پلکیں اوپر اٹھائیں اور وہ انور کے اداس چہرے پر غم کی چھائی ہوئی گھٹاؤں کو دیکھ کر لرز گئی۔

"سیما ثریا تو دلہن بنائی جا چکی ہو گی نہ؟ مگر امی یا چھوٹی امی کہیں تمہیں ڈھونڈتی نہ ہوں۔ اچھا ہوتا اگر تم میرے پاس ذرا اور ٹھہر جاتیں تم سے تھوڑی سی باتیں کر کے شاید میں، اپنا غم کچھ ہلکا کر سکوں۔" نور کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز کو سن کر سیما کا دل ایک بار پھر تڑپ اٹھا۔ "ہائے میری آپا!" اور اس کا جی چاہا کہ آنٹے کے وہ سارے گیند توڑ پھوڑ کر پھینک دے، کتنی تمنا تھی اسے دولہا سے گیند کھیلنے کی۔ وہ، کیلا، کمرہ اور انور، سب کچھ بھول کر غم کی پھر انہی لہروں پر بہنے لگی۔

"سیما باجی، سیما باجی!" دور سے ناہید کی آواز سن کر وہ چونک پڑی۔ "اللہ آپ کہاں چھپ گئیں سیما باجی؟" ناہید کی آواز دور دور ہوتی چلی گئی۔ سیما اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی "انور بھائی! مجھ سے گیند نہیں کھیلا جائے گا۔ ہائے! میری اتنی اچھی سی آپا!!" اور جب وہ دروازے سے باہر جانے لگی تو اس نے پلٹ کر دیکھا، انور کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لمبی لمبی دھاریں بہہ رہی تھیں!

جنوری، ۵۳ء

میں جرم خموشی کی صفائی نہیں دیتا
ظالم اسے کہیے جو دہائی نہیں دیتا
کہتا ہے کہ آواز یہیں چھوڑ کے جاؤ
میں ورنہ تمہیں اذن رہائی نہیں دیتا

انور مسعود

عکس تحریر:- انور مسعود

# اور سورج نکل آیا

صادق حسین

دفعتاً اکبر کا مضبوط ہاتھ ہوا میں بلند ہوا اور پھر دوسرے لمحہ جیسے ایک بھاری سِل پارو کے سانولے منہ پر دھائیں دھائیں برس پڑی ہو۔ پارو کے کانوں میں سیٹیاں بجنے لگیں۔ سر چکرا گیا۔ نرم و نازک رخسار پر پانچ انگلیوں کے نشان تیزی سے ابھرنے لگے۔ اچانک اور غیر متوقع چوٹ کھا کر پارو کو درد کا احساس کم ہوا مگر حیرت زیادہ معلوم ہوئی۔ ضرب چہرہ پر لگی تھی مگر لہو کی دھاریں دل سے پھوٹ نکلیں۔ وہ پتھر کا مجسمہ بنی چوکی پر بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ لمحہ بہ لمحہ اسے محسوس ہونے لگا جیسے اس کی سرخ ساڑھی میں آگ لگ گئی ہو۔ چوڑے سنہرے حاشیہ والی شوخ سرخ رنگ کی ساڑھی جو اکبر چکاڈں سے خرید کر لایا تھا۔ یہی ساڑھی جو پارو نے چار ماہ پہلے شب عروسی پہنی تھی اور اکبر نے اس کا گھونگھٹ اٹھا کر محبت بھری آواز میں کہا تھا "سبحان اللہ آج میرے گھر میں چاند نکل آیا ہے"۔ وہ بات، وہ الفاظ، وہ جیتی جاگتی بھرپور زندگی کی پکار سن کر پارو کو ایک عجیب و غریب احساس ہوا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی: اس کی پلکیں خود بخود جھک گئی تھیں۔ اس رات اکبر نے من موہ لینے والی باتیں کی تھیں۔ اور ان باتوں میں کھو کر پارو اپنا گاؤں، اپنا میکا، وہاں کے کھیت، پگڈنڈیاں، تالاب، اور وہاں کی نہ بھولنے والی ان گنت یادوں کو سچ مچ بھول سی گئی تھی۔

اس رات کے چراغوں سے چاروں طرف اجالا ہی اجالا ہو گیا تھا پھر اکبر نے پہلی تین بیویوں کے عیوب، خامیاں اور کرتوت انگلیوں پر گن گن کر شدید نفرت کا اظہار کیا تھا۔ وہ تمام قصے سن کر پارو کو تسلی ہو گئی تھی کہ جو اڑتی اڑتی افواہیں اس نے سن رکھی تھیں وہ سب کی سب بے بنیاد ہیں۔ اسے پورا یقین ہو گیا تھا کہ گاؤں کے لوگ اس کے شوہر سے خواہ مخواہ جلتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ اکبر دو سو ایکڑ زرخیز زمین اور پانچ سو ناریل اور سپاری کے پیڑوں کا مالک تھا۔ اس کے پاس عمدہ بیلوں کی دس جوڑیاں تھیں اور اس کے پانچ تالابوں میں "روئی" مچھلی کی افراط تھی۔

وہ رات پلک جھپکتے بیت گئی تھی۔ پھر آفتاب طلوع ہوا تھا جس کی کرنوں میں ایک نئی زندگی کا پیغام تھا۔ ایسی زندگی جس کے وہ اکثر خواب دیکھا کرتی تھی۔ وہ خواب جن میں ساون کے گیت تھے اور بکل کے پھولوں کی بھینی بھینی مہک۔ لیکن دوسرے ہی دن خوابوں کی اس دنیا کو ایک خوفناک دھچکا سا لگا جب اس کی ایک سوکن نے نہایت رازدارانہ لہجہ میں اس سے کہا تھا "سبحان اللہ! آج میرے گھر میں چاند نکل آیا ہے" یہ سن کر پارو اپنے بالوں میں کنگھی کرتے کرتے رک گئی تھی۔ اس کے کانوں کی لوئیں گرم انگارے بن گئی تھیں۔ خون کھول اٹھا تھا۔ اس نے سوچا تھا "بدتمیز کہیں کی۔ رات کو کن سوئیاں لیتی رہی ہے" اور پھر اس کا جی چاہا تھا کہ وہ اپنی سوکن کے منہ پر طمانچہ مار دے۔ لیکن جب باقی دو سوکنوں سے بات چیت ہوئی تو اسے پتہ چلا کہ یہ فقرہ تو اکبر کی پہلی تینوں بیویوں نے بھی شب عروسی پر سنا تھا۔ جذبات کی اسی شدت کے ساتھ، عہد و پیمان کی اسی گمبھیرتا کے بیچ۔

آج شادی کے چار ماہ بعد پارو طمانچہ کھا کر چوکی پر چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اکبر پلنگ پر نیم دراز ہو کر سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تاڑی کی سرخی جھلک رہی تھی۔ وہ چارخانہ دار لنگی اور سفید بنیان پہنے ہوئے تھا۔ اس کی دونالی بندوق دیوار کے ساتھ کھڑی تھی۔ لالٹین کی روشنی میں اکبر کے بھاری بھر کم جثے کا سایہ دیوار پر یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا تھا۔

"کھٹ! کھٹ!" کسی نے صدر دروازے پر دستک دی۔

اکبر نے اٹھ کر کھڑاویں پہنیں۔ دروازہ کھولا۔ اور پھر ڈیوڑھی سے گذر کر صدر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

"کون۔؟" اکبر نے پوچھا۔

"غنی" جواب ملا

اکبر نے دروازہ کھولا۔ باہر گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کچا راستہ سنسان پڑا تھا۔ غنی اور کبیر ہاتھ میں قلم لئے سامنے کھڑے تھے۔ غنی نے اکبر

کے کان میں کچھ کہا اور پھر غنی اور کبیر دونوں آناً فاناً اندھیرے میں گم ہو گئے۔ اکبر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کمرے میں پہنچا۔ کھلے آنگن میں بوکل، ناریل اور سپاری کے پیڑ خاموش کھڑے تھے۔ اس کی تیسری بیوی کے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔ وہاں سے دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اندھیرے میں جھانک رہی تھیں۔ اس کی دوسری بیوی اپنے کمرے میں مصلے پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔ اس کی پہلی بیوی کے کمرے میں تاریکی تھی اور وہاں سے خراٹوں کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ اکبر نے جھٹ پٹ جوتا پہنا، کمر میں بھورے چمڑے کی چوڑی پٹی باندھی۔ پٹی کا دایاں بٹوا کھول کر سو سو کے نوٹوں کا جائزہ لیا۔ بائیں بٹوے میں کارتوس ٹھونس لئے اور پھر ٹارچ پٹی میں اڑس، دونالی بندوق ہاتھ میں لے، گھر سے باہر نکلا۔ ۔ اور چند لمحوں میں پیڑوں کے جھنڈ تک جا پہنچا جہاں غنی اور کبیر ہاتھ میں لئے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ کسی نے بات نہ کی۔ مشینی طور پر اکبر آگے آگے چل پڑا۔ غنی اور کبیر اس کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ عام راہوں اور پگڈنڈیوں سے ہٹ کر اکبر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دریا کے کنارے جا پہنچا اور چپ چاپ ایک "شمپان" (کشتی) میں بیٹھ گیا۔ غنی اور کبیر نے شمپان کو گہرے پانی کی طرف دھکیلا اور پھر وہ دونوں نہایت پھرتی سے اچک کر شمپان کے دونوں سروں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ شمپان پانی کے بہاؤ کے ساتھ تیزی سے بہنے لگا۔ چپوؤں کی شپ شپ رات کے سناٹے میں ہلچل مچانے لگی۔ اکبر نے اپنا دایاں ہاتھ پانی میں ڈبو کر ایک گہرا سانس لیا اور پھر بھیگی ہوئی ہتھیلی پھیلا کر اپنے بائیں شانے پر آہستہ آہستہ پھیری۔ سخت اور کھردری انگلیاں زخم کے اس ترچھے نشان کو سہلانے لگیں جو اس کے مضبوط شانے کو عبور کر کے گردن کی طرف نکل گیا تھا۔ یوں تو اکبر کے بدن پر زخموں کے نشان ایک درجن کے لگ بھگ تھے مگر یہ زخم سب سے بڑا تھا جو اس نے زندگی کی جدوجہد کے ابتدائی دنوں میں کھایا تھا۔ اس وقت وہ صرف وار کرنا جانتا تھا وار سہنے اور روکنے کا ریاض نہ تھا۔ وہ اپنے دھندے کو زندگی کی جدوجہد کا نام دے کر اپنے آدمیوں کو آگے بڑھنے پر اکسایا کرتا تھا۔ اسے یاد تھا جب وہ پہلے پہل دھان کی بوریاں شمپان میں لاد کر راتوں رات ایک تحصیل سے دوسری تحصیل میں لے گیا تھا تو مارے خوف کے اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ خوف کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا۔ شروع شروع میں اس کے دل میں ایک چبھن سی ہوا کرتی تھی مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا دل میں کھٹکنے والا کانٹا خود بخود نکل گیا۔ اور اب اسے اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ دولت کی گرمی زندگی کو کتنی توانائی بخش سکتی ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر اب وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے اپنے گاؤں میں لوگ فاقوں سے مر رہے ہیں۔ جوان ہڈیوں کے ڈھانچے بن گئے ہیں۔ ننھی ننھی جانیں بلک بلک کر ہمیشہ کے لئے چپ ہو رہی ہیں۔ خوبصورت چہروں پر موت کی زردی چھائی ہوئی ہے۔ کہیں سے بانسری کی مدھر تان سنائی نہیں دیتی۔ دریا کی لہریں بھٹیالی گیتوں کی تانوں کو ترس گئی ہیں۔ بھوک کی آگ نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر وہ دل ہی دل میں ہنستا۔ اور پھر اسے اپنی ماں یاد آ جاتی۔ وہ ماں جو جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ جس نے بڑے دکھ اٹھا کر اسے پالا تھا اور جب وہ سیانا ہوا تھا تو اس نے اپنی آنکھوں سے اپنی ماں کو قحط کی بھٹی میں جلتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ منظر اس کی آنکھوں میں اکثر پھر جاتا تھا۔ جب تھوڑا سا باسی بھات اس کی ماں کے کانپتے ہوئے ہاتھوں نے اسے دیا تھا اور وہ ایک بھوکے کتے کی طرح دانہ دانہ کھا کر ادھ موا ہو کر زمین پر گر پڑا تھا اور اس کی ماں نے "بھات! بھات!!" پکار پکار کر جان دے دی تھی وہ پکار اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہی پکار جس کو گاؤں کے ہر شخص نے سننے سے انکار کر دیا تھا۔ اسے اپنی ماں کی ایک ایک بات یاد تھی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ اس نے زندگی میں بہت دکھ پائے تھے۔ اسے اپنی ازدواجی زندگی میں سکھ کی گھڑی میسر نہ آئی تھی۔ وہ کہا کرتی تھی "تیرا باپ ایک جلاد تھا۔ وہ مجھے بہت پیٹا کرتا تھا۔ میں اس کی چوتھی بیوی تھی۔ باقی تینوں کا تو مجھ سے بھی برا حال تھا۔"

"مالک!" غنی نے خاموشی کو توڑا۔

چپو تھما تھم رک گئے۔ کہیں دور سے انجن چلنے کی آواز آ رہی تھی۔

"ادھر لے چلو" اکبر نے سامنے دریا کے کنارے کی طرف اشارہ کیا جہاں خمیدہ درختوں نے پانی کے کچھ حصہ کو چھپا رکھا تھا۔

چپو تیزی سے چلنے لگے۔ چند لمحوں میں شمپان ٹہنیوں اور پتوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ اور انجن کی آواز قریب سے آنے لگی۔

اکبر نے بندوق سنبھالی۔

"مالک!" غنی آہستہ سے بولا "معلوم ہوتا ہے آج کسی نے مخبری کی ہے۔ دھان پکڑا گیا ہوگا۔"

"ہمارا دھان کوئی نہیں پکڑ سکتا" اکبر نے دونالی بندوق اور بٹوے کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

موٹر لانچ شور مچاتی ہوئی آگے نکل گئی۔ پانی کی لہریں دوڑتی ہوئی دونوں کناروں سے ٹکرائیں۔ شمپان نے دو ایک ہچکولے کھائے۔ اکبر نے لبلبی سے ہاتھ ہٹا لئے۔ موٹر لانچ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تو شمپان درختوں کی اوٹ سے نکل کر پھر لہروں کے ساتھ بہنے لگا۔ یکایک سمت مخالف سے کسی نے ٹارچ جلائی۔ چپو پھر تھم گئے۔ عین منجدھار میں شمپان رک گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک شمپان کچھ فاصلہ پر نظر آیا۔ وہاں سے کسی نے تین مرتبہ ٹارچ روشن کی۔ اکبر نے جواباً دو پتلے دو مرتبہ ٹارچ جلائی۔ دوسرا شمپان قریب آ گیا

"سب ٹھیک ہے مالک" دوسرے شتپان سے ایک شخص بولا۔ اور پھر دونوں شتپان گھوم کر بہاؤ کے خلاف چلنے لگے۔ شپ۔ شپ! شپ شپ!! ۔ چپو تھامے ہوئے ہاتھوں کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ بازوؤں کی مچھلیاں ابھر آئیں۔ گردنوں کی رگیں تن گئیں۔ ہر جھٹکے کے ساتھ جھکورا اور ہر جھکورے کے ساتھ شتپان کی مخصوص آواز تاریک رات میں پراسرار معلوم ہونے لگی۔ اکبر نے پانی میں ہاتھ ڈبو کر ایک گہرا سانس لیا۔ اور اس دفعہ ایسا کرتے ہوئے اس کے دل میں تین خیال آئے۔ پہلا خیال اس بھکاری سے وابستہ تھا جس نے کل اس کے دروازے پہ صدا دی تھی۔ ہاتھ پھیلا کر چاول کی بھیک مانگی تھی اور اکبر نے بھیک دینے کے بجائے بھکاری کے منہ پر تھپڑ۔ رسید کیا تھا بھکاری نے ایک آہ بھری تھی اور پھر سر جھکا کر، چپ سادھے۔ کچے راستہ پر آنسو بہاتا کھیتوں کی طرف نکل گیا تھا۔ اور شام کو اکبر نے اس بھکاری کی لاش ایک درخت کے نیچے پڑی ہوئی دیکھی تھی۔ دوسرا خیال اس کی چوتھی بیوی پارو سے متعلق تھا اس نے پارو کو نہایت معمولی سی بات پر چند گھنٹے پہلے چانٹے مارے تھے۔ اس نے بھی ایک گہرا سانس لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو امڈ آئے تھے۔ اکبر کے دل میں ایک نامعلوم سا درد ہونے لگا۔ عین اسی لمحہ اکبر کی ماں کا شکن آلود چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ اس نے بھی ایک لمبی آہ کھینچی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے تھے۔ اس خیال کے آتے ہی اکبر کے دل میں ایک جوالا پھوٹ پڑی۔ اس کا بدن جلنے لگا۔ اس نے پانی میں سے ہاتھ نکال کر اپنے چہرے پر پھیرا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے تراوت پہنچانے لگے۔

★

گھر پہنچ کر اکبر نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر کسی نے پہلے لالٹین روشن کی اور پھر قدموں کی آہٹ آہستہ آہستہ دروازے کے قریب آنے لگی۔

"کون۔؟" کسی عورت کی آواز تھی۔

"دروازہ کھولو"

کسی نے دروازہ کھول دیا۔

اکبر نے اندر داخل ہو کر چٹخنی چڑھائی۔ اس کی تیسری بیوی لالٹین ہاتھ میں لئے دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ چھریرا بدن، چہرے پر اداس اداس زردی، سر کے چمکیلے اور سیاہ بالوں کا بھاری جوڑا، آنکھوں میں ساون کی بدلی، وہ یوں نظر آ رہی تھی جیسے کوئی تصویر لالٹین ہاتھ میں تھامے دیوار کے چوکھٹے میں کھڑی ہو۔ یکایک کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ اکبر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پارو چوکی پر سو رہی تھی۔ اس کا بایاں ہاتھ اب بھی اس کے بائیں رخسار پر ٹکا ہوا تھا۔ اس کی چمپا کی کلیوں جیسی انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں چمک رہی تھیں۔ اس کے سر کے لانبے بال چوکی سے نیچے لٹک کر فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ اکبر نے پہلے جوتا اتارا پھر پیٹی کھول کر تکیے کے نیچے رکھی، بندوق پلنگ کی پٹی کے متوازی توشک کے نیچے جما دی اور پھر لالٹین بجھا کر بستر پر لیٹ گیا۔ اس کا بدن تکان سے چور چور ہو رہا تھا۔ اس نے دو ایک بار سر کو جھٹکا کر۔ انگلیاں چٹخائیں اور پھر جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر ہر خیال کو دماغ سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ آنگن سے رات کی رانی کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ ٹھنڈی اور معطر ہوا کے جھونکے تھکے ہوئے اعضاء کو فرحت پہنچانے لگے۔ آہستہ آہستہ اکبر کی پلکیں نیند سے بوجھل ہو کر آپس میں مل گئیں۔

★

"چور!" — "چور!!"

"کون۔؟" اکبر نے لپک کر لالٹین روشن کی۔ پارو چوکی پر ایک کونے میں سمٹی بیٹھی تھی۔

"چور چور!!" آنگن سے پھر آوازیں آئیں۔

اکبر نے بندوق اور ٹارچ سنبھال کر دروازہ کھولا۔ اور پھر کود کر آنگن میں چلا گیا۔

اس کی پہلی بیوی بند کمرے سے شور مچا رہی تھی۔ دوسری اور تیسری بیوی کے کمروں میں روشنی تھی۔

"کہاں ہے چور۔؟" اکبر گرج کر بولا۔

"میں نے دروازے کی جھری میں سے کسی کو باورچی خانے میں جاتے ہوئے دیکھا ہے" اکبر کی پہلی بیوی اندر سے بولی

"برتن گرنے کی آواز آئی تھی" اس کی دوسری بیوی اپنے کمرے سے گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"کوئی دروازہ توڑ رہا تھا" اس کی تیسری بیوی نے کھڑکی کھولتے ہوئے کہا۔

باورچی خانہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اکبر نے ٹارچ کی روشنی باورچی خانہ کے اندر پھینکی۔ ایک شخص کونے میں جھکا ہوا بیٹھا نظر آیا۔ اکبر نے بندوق سیدھی کی۔ مگر دوسرے لمحہ کچھ سوچ کر رک گیا۔ اس نے پھر ایک بار ٹارچ کی روشنی میں مجرم کو دیکھا۔ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ باورچی خانہ کے ایک کونے میں دیگچی پر جھکا ہوا

لپ لپ بھات کھا رہا تھا۔

"ذلیل کتے" اکبر نے للکار کر کہا۔

چور کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ بے تحاشہ کھائے جا رہا تھا۔ اکبر کو حیرت ہونے لگی کہ وہ "دنزار شخص دیوار پھاند کر کیسے اندر آیا۔ اس نے باورچی خانہ کا دروازہ کیسے توڑا۔ ان ہڈیوں میں اتنی ہمت، اتنی دلیری، اتنی جرأت کہاں سے آئی۔ اکبر یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پار ولالٹین ہاتھ میں لئے آ پہنچی اور اس کے پیچھے اس کی تینوں سوکنیں بھی باہر نکل آئیں۔ اکبر بائیں ہاتھ میں روشن ٹارچ اور دائیں ہاتھ میں بندوق تھامے آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ چور نے کوئی حرکت نہ کی۔ اکبر باورچی خانے کی دہلیز پر پہنچ کر رک گیا۔ چور نے بھات کھاتے کھاتے ایک مرتبہ اکبر کی طرف اس طرح دیکھا جس طرح ہرن زخمی ہو کر آخری بار شکاری کی طرف دیکھتا ہے۔ چور کی آنکھیں دو گڑھوں کے اندر سے صرف ایک لمحے کے لئے اکبر کی طرف دیکھ کر پھر بھات پر جم گئیں۔ وہ مٹھیاں بھر بھر کر بھات منہ میں ڈالے جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ پسینہ میں شرابور تھا۔ سانس پھول رہا تھا۔ بڑھی ہوئی داڑھی، الجھے ہوئے سر کے بال، جسم پر صرف ایک پھٹی پرانی لنگی، پسلیوں کی ایک ایک ہڈی نمایاں، چور مجسم بھوک بن کر بے خوف و خطر اکبر کے باسی بھات کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا تھا۔

"بندوق سیدھی کیوں نہیں کرتے" اکبر کی دوسری بیوی بولی۔

"بھات! بھات!!" ماضی کے تاریک غار سے ایک خوفناک آواز آئی۔ ایک بھوکی بیوہ کی آواز۔ وہ بیوہ جس نے تھوڑا سا باسی بھات کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے بچے کو کھلا کر اپنی جان دیدی تھی۔ اس آواز کو گاؤں کے ہر شخص نے سننے سے انکار کر دیا تھا۔

"ذلیل کتے" اکبر گرج کر بولا۔ اور پھر بندوق کا سرا چور کے سینے کے قریب چلا گیا۔

چور نے بھات کھاتے کھاتے ہاتھ روک لیا۔ اس نے دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر ٹانگیں پسار لیں۔ اس کی مرجھائی ہوئی آنکھوں نے اکبر کی طرف دیکھ کر ایک سوالیہ نشان کی صورت اختیار کر لی۔ اور سوالیہ نشان تمام گاؤں پر پھیلتا ہوا ایک تحصیل سے دوسری تحصیل اور دوسری تحصیل سے دیس کے گوشہ گوشہ تک پھیل گیا۔

"گولی کیوں نہیں چلاتے۔ صرف عورتوں پر ہاتھ اٹھانا جانتے ہو" اکبر کی پہلی بیوی تنک کر بولی۔

یکایک اکبر کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ کھنچی ہوئی رگیں اپنی اصل حالت پر آ گئیں۔ جھنجھلاہٹ، بے چارگی، اور پھر انجانے جذبات کا ایک ہجوم اس کی آنکھوں میں ڈبڈبانے لگا۔ چاروں بیویاں اکبر کی پلکوں پر پہلی مرتبہ تھر تھراتی ہوئی شبنم دیکھ کر ہکا بکا رہ گئیں۔

مارچ ۱۹۵۹ء



ڈوبتے اور ابھرتے ہیں ستارے شب بھر
اور یہ صورت تعمیر افلاک فقط میری ہے

پھیلتا جاتا ہے آئینۂ ہستی پہ غبار
اس خرابے میں یہی خاک فقط میری ہے

محمد خالد

عکس تحریر:۔ محمد خالد

ممتاز شیریں

"لنگا!"

"سوامی"

ہم راستہ بھول گئے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے، ہمارا گاؤں یہاں سے قریب ہی ہے۔" "اُدھر دیکھئے۔ سوامی۔ سفید لکیر دکھائی دے رہی ہے۔ وہی ہرگی سڑک۔ نہیں وہ تو پانی بہ رہا ہے۔ ایک چھوٹا سا نالا۔"

"اِدھر آ، اس ٹیلے پر چڑھ کر دیکھیں۔ شاید کچھ پتہ چلے۔"

ہم چڑھنے لگے۔ لنگا بڑی مشکل سے چل رہا تھا۔ پاؤں کیچڑ میں دھنس دھنس جاتے۔ میں اس کے پیچھے گھوڑے پر ہو لیا۔

اندھیرا ہو چلا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ گرمی کی چھٹیوں میں میں اپنے گاؤں جا رہا تھا۔ بنگلور سے بس میں چلا، تحصیل پہنچ کر وہاں تحصیلدار صاحب سے جن سے میری جان پہچان تھی، گھوڑا لیا۔ اور ان کے نوکر لنگا کو ساتھ لیے گاؤں چلا تھا۔ لنگا راستے سے اچھی طرح واقف نہ تھا۔ لیکن میں ادھر سے کئی دفعہ گزرا ہوں۔ جانے کیسے ہم اس شام بھٹک گئے۔

"لنگا!"

"جی، سوامی۔"

"سوٹ کیس کا بوجھ زیادہ تو نہیں معلوم ہو رہا؟"

"جی، نہیں بہت ہلکا ہے یہ۔ دیکھنے میں بڑا معلوم ہوتا ہے بس۔ کیا رکھا ہے سوامی۔ اس میں؟" "بس، چند کتابیں، دو جوڑے کپڑے۔ بھائی کے لیے زری کی ٹوپی اور جوتے، بہن کے لیے دو گڑیاں۔ بس یہی"

"بنگلور میں آپ کتنے دن رہے سوامی؟"

"پچھلی گرمیوں کے بعد گیا اب لوٹ رہا ہوں۔ دیکھا ایک سال میں یہ جگہ اتنی بدل گئی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف جھاڑیاں اور پودے بھی بدل گئے ہیں۔ اسی لیے تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہم کس سمت جا رہے ہیں۔"

ہم تینوں، لنگا، میں، اور گھوڑا تھک کر چور ہو رہے تھے۔ کچھ دیر خاموشی سے یونہی چلتے رہے۔ مجھے گھر جلدی پہنچنے کی بے تابی تھی۔ میں ماں سے ملنا چاہتا تھا، ننھے بھائی کو دیکھنا چاہتا تھا، جو ٹوپی کا انتظار کر رہا ہوگا۔ پتا جی کو سنانا چاہتا تھا کہ میں نے امتحان میں پرچے کتنے اچھے کئے ہیں۔ اور بھی کتنی ساری باتیں تھیں جو گھر والوں کو سنانی تھیں۔۔۔"

ہم چڑھائی پر چڑھ کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔ لیکن بے سود۔ راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ صحیح راستہ معلوم کرنے کی صورت

نظر نہیں آ رہی تھی۔ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے ہی میں نے سگریٹ جلانے کی کوشش کی۔ ہوا اتنی تیز تھی۔ دیا سلائی بجھ بجھ جاتی۔ آخر بڑی مشکل سے سگریٹ جلایا۔

سناٹا، ویرانی اور ہوا کی سائیں سائیں۔

"ہمیں ساری رات یہیں پڑا رہنا ہوگا۔ اس بیابان میں۔"

گھوڑا جیسے میری بات سمجھ گیا، اس کے کان کھڑے ہو گئے،

لنگا بولا "ذرا سنئے سرکار۔"

ہماری داہنی جانب کتے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے کہا "چل اسی طرف چلیں، شاید کوئی گاؤں مل جائے۔ پیڑ پودوں کو دیکھتے چلیں۔ کچھ نہ کچھ نشان مل جائے گا۔"

ہم ذرا ڈھلان کو مڑ کر اترنے لگے لیکن کتے کا بھونکنا پھر سنائی نہ پڑا۔ لنگا یکایک رک گیا۔

"وہ ۔۔۔ وہ دیکھئے ادھر۔"

میں نے ادھر دیکھا جدھر اس نے اشارہ کیا تھا "اوہ! وہ تو ایک پیڑ ہے۔ ڈرپوک کہیں کا، ادھر آجا۔ گھوڑے کے ساتھ چل، گھبرا نہیں میں تجھے ایک کہانی سناؤں گا۔ تجھے پڑھنا لکھنا آتا ہے کیا؟"

"کچھ کچھ آتا ہے، سوامی، اچھا، سنائیے کہانی۔"

وہیں ایک مینڈھ پر ہم دونوں بیٹھ گئے۔ میں لنگا کو کہانی سنانے لگا۔

انگریزی فوج کاویری ندی پار کر کے کیسے آئی ۔۔۔ کھڑی دوپہر میں، انگریز قلعے پر چڑھ آئے اور اس پر اپنا جھنڈا چڑھا دیا ۔۔۔ اس وقت سلطان ٹیپو، کھانے پر بیٹھے تھے۔ وہ نوالے ہی لے رہے تھے کہ انگریزوں کی چڑھائی کی خبر سُنی۔ کھانا چھوڑا، اٹھ کھڑے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو کر قلعے کے پاس آئے ۔۔۔ شام تک ڈٹ کر لڑتے رہے۔ سات گولیاں کھائیں، پھر بھی جان باقی تھی۔ وہ لاشوں میں چھپے پڑے تھے۔ ایک گورے نے ٹیپو کا کمربند نکالنا چاہا۔ ٹیپو نے تلوار کا وار کیا۔ سپاہی نے گولی چلا دی۔ اس گولی سے وہ ختم ہو گئے ۔۔۔ پھر کہانی کا بقیہ حصہ، انگریزوں کا سلطان کے بیٹوں کو قید کرنا۔ لالٹین لے کر ٹیپو کی تلاش کرنا ۔۔۔ رات کی تاریکی میں سرنگاپٹم میں لوٹ مار ۔۔۔ ہراساں عورتوں، اور بچوں کا رات سڑکوں پر گزارنا، دوسری صبح ٹیپو کے جنازے کا جلوس، تجہیز و تکفین ۔۔۔ اور پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا ۔۔۔

"بڑی دکھ بھری کہانی ہے، سوامی، سچ کتنی دکھ بھری ہے۔"

ہم پھر چل پڑے۔ پیڑ کی طرف دیکھتے ہوئے لنگا نے زیر لب کہا "سوامی، پیڑ کہیں ایسا ہوتا ہے؟" اور گھوڑے کے نزدیک آگیا۔ بات بھی یہ تھی کہ وہ پیڑ تاریکی میں کچھ بھیانک سا معلوم ہو رہا تھا۔ یہ سوچ کر کہ لڑکا ڈر جائے گا، میں گھوڑے سے نیچے اتر پڑا۔

"اس پیڑ کو میں اچھی طرح جانتا ہوں، رے، ہمارا گاؤں یہاں سے بالکل قریب ہے۔ اسی پیڑ کو دیکھ کر میرا بھائی شامنا، ڈر گیا تھا۔"

"وہ اس طرف کیوں آنکلے تھے، سرکار؟"

"پچھلی گرمیوں میں جب میں یہاں آیا تھا۔ شامنا اور میں شام میں یونہی گھومنے نکلے۔ اس وقت اس کی عمر صرف آٹھ سال کی

تھی۔ وہ مجھے ایک کہانی سنارہا تھا۔ وہی کہانی جو ابھی میں نے سنائی۔ وہ اتنے جوش و خروش میں ہوتا کہ کہانی سناتے اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ شامتا بڑا ہوشیار ہے۔ بڑی اچھی کہانیاں سناتا ہے۔ سر پر سنگھن کی کہانی اسے بہت پسند ہے۔ وہ مجھے تنگ کیا کرتا ہے مجھے سر پر سنگھن سے چلو۔ اس دن بھی کہانی سنتے سنتے رات ہو گئی اور ہم راستہ بھول گئے اور بھٹک کر اسی پیڑ کے پاس پہنچے۔ شامتا، اس پیڑ کو دیکھ کر ڈر گیا گھر پہنچتے ہی اس کو بخار چڑھ آیا اور تین دن تک نہ اترا۔"

"تب تو یہاں سے گاؤں جانے کا راستہ آپ کو معلوم ہوگا۔۔۔ یہاں سے گاؤں اور کتنی دور ہے؟"

"یہاں سے گاؤں تک کوئی سیدھی سڑک نہیں۔ ہمیں اندھیرے میں کھوج لگاتے جانا ہوگا۔ یہاں سے گاؤں کوئی آدھ میل ہوگا۔ یہ ہمارے گاؤں کا شمشان ہے۔"

"کیا کہا سوامی؟"

ارے توبہ، میں نے بھول کر شمشان کا ذکر اس کے سامنے کر دیا۔ یہ چودہ سال کا لڑکا پھر ڈر جائے تو؟

"بس اب گاؤں آہی گیا۔ یہاں سے ذرا داہنی طرف جانا ہے۔ یہ پیڑ ہمارے گاؤں کے پچھم میں ہے۔"

بارش تھم گئی تھی۔ لیکن تاریکی بڑھ گئی تھی۔ لنگا پیچھے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا۔ میں جان گیا وہ ڈر گیا ہے۔ اس سے بات کرتے رہنا چاہیے، میں نے سوچا۔

"لنگا!"

"ادھر دیکھیے" اس نے انگلی سے پیچھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بھوتوں سے ڈرتا ہے بزدل، ڈرپوک کہیں کا!"

"لیکن وہاں سوامی، دیکھیے ادھر۔۔۔" وہ اصرار کر رہا تھا۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مینڈھ کے پاس جہاں بیٹھ کر میں نے لنگا کو کہانی سنائی تھی۔ روشنی نظر آئی۔ اور دو شکلیں آمنے سامنے بیٹھی زمین کی طرف تک رہی تھیں۔ جھوٹ کیوں کہوں؟ مجھے بھی ذرا ڈر لگا۔

"لنگا" تجھے کیا دکھائی پڑتا ہے وہاں"

"دیکھیے۔ ایک مشعل ہے اور اس کے پاس ــــــ"

"ڈرمت، چل پاس جا کر دیکھیں"۔

"دیکھیے اس طرف، دیکھیے" وہ بے حد سہما ہوا تھا۔

روشنی اب حرکت کرتی نظر آئی۔ میں نے لنگا کا ہاتھ تھام لیا اور دوسرے میں گھوڑے کی لگام پکڑے، میں دھیرے دھیرے مینڈھ کی طرف بڑھا۔ جو کچھ نظر آیا تھا وہ ہمارا وہم نہیں تھا۔ دو مورتیں واقعی تھیں اور وہ بات کر رہی تھیں۔ انسانی آواز سن کر ہم میں ہمت آئی اور ہم پیڑ کے پیچھے کھڑے ہو کر سننے لگے۔

"ہائے، میرے بچے، میرے لال، تو پیاس سے تڑپتا رہا۔ تیرے لیے دودھ لائی ہوں، لے، پی لے"۔۔۔ کیسا تھا میرا لال، اور اب تو سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا،۔۔۔ ہم سب کو چھوڑ کر کہاں چلا گیا تو۔۔۔۔ آخر وقت تو کیا کہنا چاہتا تھا، میرے بچے، تیرے ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ تیری آنکھیں، تیری آنکھوں میں کتنا کرب تھا! تیری آنکھیں کہتی تھیں تو ہمیں چھوڑنا نہیں چاہتا۔ ہائے، میرے

بچے، اس جنگل بیابان میں اکیلا تن تنہا، ہائے بھگوان کیا یہ سب سچ ہے ؟" . . . . ایک عورت کوڑے سے منڈھ پر دودھ انڈیل کر دردناک رو رہی تھی، بین کر رہی تھی۔ ہم اس دھیمی روشنی میں پہچان سکتے تھے کہ وہاں دو عورتیں ہیں، ان میں سے ایک چھوٹی لڑکی ہے۔ لڑکی رو رو کر کہہ رہی تھی۔

"ہم بھیا کو ملکہ بھی نہ سکے۔ دو دن کے اندر ہی یہ کیا ہوگیا۔ ہائے۔

میں نے چند قدم آگے بڑھائے۔ اتنے میں ہمارے سامنے کی روشنی منڈھ میں پہنچ گئی . . . .

پھر تیسری آواز آئی بھرائی ہوئی لیکن قدرے کرخت۔

"یہ کیا پاگل پن ہے کہ ایسی خوفناک رات میں تم یہاں آتی ہو۔ کیا تمہارے رونے چلانے . . . سے وہ واپس آجائے گا ؟"

میں نے آواز پہچان لی۔ یہ میرے پتاجی کی آواز تھی۔

میرے بچے، تو اندھیرے سے ڈرتا تھا، اب اندھیرے میں اکیلا پڑا ہے۔ تو ایک بار اسی جگہ ڈر گیا تھا، تجھے بخار چڑھ گیا تھا۔ اور اب تو اکیلا اسی جگہ پڑا ہے، اب تجھے ڈر نہیں لگتا ؟ میں تجھے اکیلا چھوڑ کر گھر کیسے جاؤں ؟" میری ماں پھر پھوٹ پڑی۔

"بھیا ٹوپی اور جوتے لائیں گے۔ اب انہیں سرپوہنگسٹن کا قصہ کون سنے گا۔ بھیا کس کو سرپوہنگسٹن دکھائیں گے۔ شیامو، میرے شیامو، ہائے بھگوان" یہ میری بہن تھی۔

اس وقت مجھ پر کیا گزر رہی تھی میں بیان نہیں کر سکتا۔ ایسا لگتا تھا کائنات کی اس بے کراں وسعت میں، میں بالکل اکیلا رہ گیا ہوں۔ رنگا میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہا تھا، مجھے وہاں جانے سے روک رہا تھا۔ لیکن میں ہاتھ چھڑا کر منڈھ کی طرف بھاگا۔

"پتاجی نے لالٹین اوپر اٹھائی اور پوچھا کون ہے ؟"

مجھے دیکھتے ہی سب پھر پھوٹ پڑے۔ نئے سرے سے کرب، ان کے سینوں میں امڈ آیا۔ میں بہت دیر تک شاستا کی قبر پر آنسو بہاتا رہا۔ میں نے سوٹ کیس سے ٹوپی اور جوتے نکالے، اور انہیں شاستا کی قبر پر رکھ دیا۔ شاستا نے ایک بار پوچھا تھا "بھیا یہ پیڑ پودے جنگل میں اکیلے کیسے رہتے ہیں" میرا جی چاہا ساری رات یہیں گزار دوں، شاستا کو اکیلا نہ چھوڑوں۔

ہم بہت دیر تک وہاں رہے۔ شاستا کی باتیں کرتے رہے۔ اس کی بیماری، اس کی موت . . . . . . . وہ ہمارے گھر کا ہیرا تھا، سب گاؤں والوں کی آنکھوں کا تارا تھا۔ سب کا چہیتا، ذہین، عقلمند، اب اس کے بغیر گھر میں زندگی بے کیف تھی۔

پتاجی نے آہ بھر کر کہا "ایک نہ ایک دن ہم سب کو یہیں آنا ہوگا۔"

ہوا کا ایک جھونکا جیسے اپنے ساتھ اس کا جواب لایا۔ "ہاں"

میرا بھائی، اسی جگہ جہاں وہ ڈر گیا تھا، آج اکیلا، ابدی نیند سو رہا تھا۔ اسے چھوڑ کر ہم گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ جی ہاں گھر کی طرف ؟ لیکن ہمارا گھر ہے کہاں ؟

# جھینپ

خدیجہ مستور

ابھی تو ذرا دیر پہلے خوب بادل گرجے تھے، بجلی رہ رہ کے چمکی تھی، ہوا نے سراٹے بھرے تھے اور اب برس کے چھوٹے چھوٹے سیاہ ٹکڑے ہوا میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے پھر رہے تھے، گڑھے دار سڑک پر جگہ جگہ پانی بھرا ہوا تھا جس پر تانگہ بڑی بے بسی سے دھچر دھچر کرتا ہوا چل رہا تھا اور خاتون ہچکولے کھاتے ہوئے اپنی مرنے والی دادی انا کے لئے سوچ سوچ کر رونے کی کیفیت طاری کرنے کی کوشش کر رہی تھی ——— ہے، ہے بیچاری دادی انا ——— ابا کو تو خیر اس لئے چاہتی تھیں کہ اپنا خون چُسا چُسا کر پالا تھا مگر اسے بچپن ہی سے کس قدر چاہتی تھیں ——— راتوں کو اسے اپنے پاس لٹا کر راجہ بھوج اور گنگو تیلی کی کہانی دو دھنوں میں گا کر سنائی ——— جب وہ روٹی تو سب بچوں سے چھپا کر اسے گھی شکر کے بڑے بڑے نوالے کھلائے اور اس کی ضد کرنے پر اسے اکثر اپنے موٹے شیشوں والی عینک بھی پہننے کو دے دی۔ کیا مجال جو کوئی دوسرا بچہ ان کی عینک ایک ذرا دیر کو بھی لے لے۔ عطو اور رضو اس کی حرص میں کیسا کیسا عینک کے لئے مچلتیں مگر دادی انا کے کان پر جوں بھی نہ رینگتی۔ آخر وہ بھی تو اس کی طرح بچہ تھیں لیکن انہیں محبت ہی نہ تھی، کسی دوسرے بچے سے، بس ان پر جان چھڑکتی تھیں۔ افوہ ——— وہی تو بچپن کی محبت تھی کہ دادی انا ابا کے مرنے کے بعد اس کے ہاں سے چلی گئیں پھر کبھی بھی نہ آئیں۔ مگر مہینے میں ایک آدھ بار اس کی خیریت ضرور پچھوا لیتیں ——— سچ ——— بیچاری دادی انا، اس کے نام کا کلمہ پڑھتی ہوئی مرگئیں ......
کاش! کوئی اسے اطلاع دے دیتا کہ تمہاری دادی انا کا آخری وقت ہے، وہ تمہیں یاد کر رہی ہیں تو کتنا اچھا ہوتا، وہ اس وقت ..
..... ! تانگے کا پہیہ ایک بڑے سے گڑھے میں دھچ سے جا گرا ..... اور کیچڑ ملے پانی کا ایک چھپا کا خاتون کے ریشمین سیاہ برقع پر آپڑا۔

"ایہہ! بیٹا لگا تو زور" ———

تانگے والے نے چابک ہوا میں لہرا کر سڑاک سے بجائی تو مریل ٹٹو نے ایک جھٹکے کے ساتھ تانگے کے پہیے کو گڑھے سے نکال لیا اور پھر جیسے پھونک پھونک کر قدم رکھنے لگا۔ کتنی دیر سے تانگہ یوں ہی دھچڑ دھچڑ کرتا ہوا چل رہا تھا لیکن گڑھے دار سڑک کسی طرح ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ جاتے کتنے موڑ آئے اور گزر گئے ——— خاتون کے خیالات کا سلسلہ کتنی ہی بار ٹوٹ ٹوٹ کر پھر جڑا مگر دادی انا کا گھر نہ آنا تھا نہ آیا، اور خاتون جو اتنی دیر سے دادی انا کے لئے سوچ سوچ کر رونے کی کوشش کر رہی تھی، اب ریشمیں برقع پر کیچڑ کی چھٹکیاں دیکھ کر غصّے کی ہلکی ہلکی جھنجھناہٹ اپنی رگوں میں محسوس کرنے لگی ——— بھلا کیا پڑی تھی اس برسات کی رات میں دادی انا کو رونے آنے کی ..... اماں نے کہا بھی تھا کہ صبح چلی جانا گھڑی بھر کو پرسے کے لئے

. . . . مگر وہ کو ایسی کہ جہاں سنا کہ دادی انا نے مرنے سے پہلے اسے یاد کیا تھا بس مارے فخر کے مر گئی اور جھٹ سے چل آئی اس گڑھے دار سڑک پر اپنے جسم کی چولیں ڈھیلی کراتے ——————

"تو یہ ایسی سڑک ہے کہ . . . . . ."

خاتون جانے اور کیا کہتی کہ نیاز محمد نے اس کی بات کاٹ کر لفظ بہ لفظ وہی باتیں دہرا دیں جنہیں وہ کئی بار کہہ چکا تھا۔

"مگر بی بی نے آپ کو مرنے سے پہلے یاد کیا تھا۔ آپ کے نام کی ایسی رٹ لگا رکھی تھی کہ کلمہ تک پڑھنا یاد نہ رہا۔"

نیاز محمد نے ایک لمبی ٹھنڈی آہ بھری۔ خاتون نے سڑک کی سونی سونی زرد روشنی میں دیکھا کہ نیاز محمد کی بڑی بڑی آنکھوں میں پانی چمک رہا تھا۔ بھیگتی ہوئی مسوں پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے اُبھرے ہوئے تھے اور چہرے پر بڑی بے بسی چھائی ہوئی تھی۔ خاتون یہ دیکھ کر خود بھی رونے کے موڈ میں آنے لگی —— اوہ! بیچاری دادی انا کی موت نے ان سب کے دلوں پر کیا اثر کیا ہوگا۔ کس قدر محبت کرنے والی تھیں، مرنے سے پہلے بجائے خدا کے اسے یاد کرتی مریں۔ اوہ . . . . . اُف! مارے احساس برتری کے خاتون کی آنکھوں میں دو گرم گرم آنسو بھر گئے اور اس کا جھکا ہوا سر جیسے تانگے کی چھت سے لگ گیا۔

دھچر دھچر کرتا ہوا تانگہ ایک گز بھر چوڑی گلی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ جس کے بالکل قریب سڑک کے کنارے نانبائی کی دوکان میں ایک کالا کلوٹا آدمی سُرخ لنگوٹ کسے دھپا دھپ تنور میں روٹی لگا رہا تھا۔ کچھ لوگ وہیں زمین پر اکڑوں بیٹھے بڑے بڑے نوالے ٹھونس رہے تھے۔ لمبی ڈاڑھی والا نانبائی چولہے پر رکھے ہوئے بڑے سے بدقلعی پتیلے میں جھانک جھانک کر مٹی کے پیالوں میں سالن نکال رہا تھا اور دوکان کے بالکل سامنے لوہے کی سلاخ میں لٹکا ہوا دھوئیں دینے والا چراغ دھندلی روشنی کے ساتھ دھوئیں کے بادل اُگل رہا تھا۔ خاتون نے اپنے گرد و پیش ایک گہری نظر ڈالی اور پھر برقع سنبھالتی تانگے سے اُتر آئی۔ پرس کھول کر تانگے کا کرایہ ادا کیا اور جیسے ہی نیاز محمد کے پیچھے گلی میں داخل ہوئی بدبو کا ایک دماغ چکرا دینے والا بھبکا اس کی ناک میں گھس گیا۔ خاتون کو مارے کراہت کے دو تین جھرجھریاں آگئیں۔ وہ پیچ در پیچ گلیوں میں تیزی سے چلنے کی کوشش کرنے لگی مگر بدبو بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی جیسے دو طرفہ اُتھلی اُتھلی نالیوں میں پانی اور پانی کی سرسراہٹ کے ساتھ بدبو اڑ رہی تھی۔ مینڈک زور زور سے ٹرٹرا رہے تھے۔ مارے بدبو کے خاتون کو اپنا دماغ پھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

"کتنی دور ہے گھر؟"

"بس اب آیا چاہتا ہے۔"

نیاز محمد نے مڑ کر جواب دیا اور پھر جلدی جلدی قدم اٹھانے لگا —— گلی کے ایک موڑ پر تہمد باندھے دو آدمی کھڑے باتیں کر رہے تھے۔

"بڑا برا زمانہ آن لگا ہے ہر وقت جان کا خطرہ رہتا ہے۔ بیچارے غریبوں کی مصیبت ہے۔"

"ہاں! کیا وقت ہے کبھی کیسا بھائی چارہ تھا اب تو ہندو مسلمانوں کو بھونے کھاتے ہیں اور مسلمان ہندوؤں کو، واہ ری آزادی کہ بھائی بھائی کا خون بہا رہا ہے۔"

"چھوڑو یار، ہم تو یہ جانتے ہیں کہ . . . . . . ."

خاتون نے ان دونوں سے بچ کر آگے نکلنا چاہا تو ایک نے اپنا تہبند سمیٹ کر ایک بھیانک گالی بک کر جیسے بڑے

زمانے کی مزید تائید کردی۔ خاتون بوکھلا کر جلدی سے آگے بڑھ گئی ـــ کسی مکان میں کوئی عورت بڑی کراستی آواز میں رو رو کر خوفناک گالیاں بک رہی تھی۔

"ارے، رے، رے، دھم ـــ دھم"

اور ساتھ ہی کوئی جیسے کسی ملائم چیز پر قوت آزمائی کر رہا تھا ـــ نیاز محمد کے قدم تیز ہو گئے اور پھر وہ ایک مکان کے سامنے کھڑا ہو گیا جہاں گلی کچھ چوڑی ہو گئی تھی۔ مکان کے سامنے نالیوں کے دونوں طرف دو پتلی پتلی بانس کی کھاٹیں پڑی ہوئی تھیں جن پر چھ سات آدمی بیٹھے حقہ پی رہے تھے اور نیاز محمد کا باپ سر تھامے ان سب کے بیچ میں بیٹھا تھا۔ خاتون کے پہنچتے ہی سب اسے گردنیں اُچکا اُچکا کر دیکھنے لگے۔

"اسے سب لوگ ذرا منہ پھیر لو۔"

نیاز محمد کے باپ نے کہا اور سب نے اپنے منہ اِدھر اُدھر کر لئے۔

"اندر آئیے بجیا"

نیاز محمد نے کہا اور اینٹوں کی تین سیڑھیاں چڑھ کر جلدی سے اندر ہو گیا۔ وہ بھی اس کے پیچھے اندر چلی گئی ـــ پتلی لمبی ڈیوڑھی میں ایک چندھی سی لالٹین جیسے سوگ منا رہی تھی، کسی کونے میں چھپا ہوا جھینگر بین کر رہا تھا اور بس ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

"اماں! میں بجیا کو لے آیا۔"

نیاز محمد نے ٹاٹ کے پھٹے ہوئے پردے میں منہ ڈال کر اس طرح کہا جیسے اس نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہو۔

"ہائے میری اماں ـــ"

نیاز محمد کی بات ختم ہونے کے ایک ہی لمحے بعد گھر کے اندر ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی اور خاتون پھٹے ہوئے ٹاٹ کی سُتلیوں میں اُلجھ کر رہ گئی۔ پھر سنبھلتی ہوئی اندر چلی گئی ـــ چھوٹے سے دالان میں سامنے طاق پر جلتے ہوئے چراغ کی اُداس روشنی میں اس کی پہلی نظر اس کھاٹ پر پڑی جس پر دادی انا کی لاش میلی چادر سے ڈھکی پڑی تھی، سرہانے کرچھے میں لوبان سلگ رہا تھا۔ کھاٹ کے اردگرد زمین پر دس بارہ عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں وہ نیاز محمد کی ماں پٹی سے سر ٹیکے بین کر رہی تھی۔

"ہائے اماں ـــ کچھ تو بولو ـــ میں اماں کہہ کر کسے پکاروں گی ـــ ہائے ایک بار تو بول دو ـــ دیکھو تمہاری لاڈلی گودوں کی کھلائی پوتی آئی ہے ـــ آنکھیں کھولو ـــ ہائے۔"

نیاز محمد کی ماں جانے اور کیا کہہ رہی تھی خاتون کو کچھ بھی سنائی نہ دیا۔ وہ موت کا گھرا اپنے ہوش میں دوسری بار دیکھ رہی تھی اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ دادی انا کی موت کا یہ صدمہ اس کے لئے بڑا سخت ہے۔ اس کا جی گھٹا جا رہا ہے، ڈوبا جا رہا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ خوب چیخ چیخ کر رونے لگے اور دوڑ کر دادی انا کی لاش سے لپٹ جائے۔ ان کا منہ کھول دے، ان کے سرد ہونٹ چوم لے اور ان سے کہے کہ تم نے مجھے یاد کیا تھا نا، دیکھو میں آ گئی۔ اب یوں آنکھیں بند کئے چپ چاپ کیوں پڑی ہو، میری اچھی دادی انا! ـــ لیکن خاتون یہ سب کچھ نہ کہہ سکی، نہ کر سکی۔ اس کے دل میں اچانک پیدا ہونے والے

سچے دلی جذبات کو پلنگ کے گرد بیٹھی ہوئی عورتوں کی اشتیاق بھری نگاہوں نے منتشر ہونے سے پہلے ہی جکڑ دیا اور وہ اپنی جگہ پر اس طرح چپ چاپ بے سُدھ سی کھڑی رہ گئی جیسے اس کے پاؤں زمین میں کیل دئے گئے ہوں — ہائے میری اماں —!

نیاز محمد کی ماں جب بین کرتے کرتے تھک گئی تو ایک دم سسکیوں اور ہچکیوں کی گاڑی پوری رفتار سے چل پڑی۔ رونے ہچکیوں کے اس کا بُرا حال ہونے لگا۔ پلنگ کے گرد بیٹھی ہوئی عورتوں نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی لیکن اس نے تو جیسے اپنی ماں کے پلنگ کی پٹی نہ چھوڑنے کی قسم کھا رکھی تھی اور وہ قسم اس وقت ٹوٹی جب خاتون نے آگے بڑھ کر ہچکچاتے ہوئے اس کا سوکھا بازو پکڑ کر ہٹایا اور اس نے پٹی چھوڑ کر اپنا سر خاتون کے شانے پر رکھ دیا۔ چراغ کی روتی بسورتی روشنی میں خاتون کو نیاز محمد کی ماں کا چہرہ بڑا ہی گھناؤنا اور بھیانک لگا۔ کالی، سوکھی ہوئی، بڑی بڑی اُبھری ہوئی آنکھیں جن میں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے رس رہے تھے۔ پھر اس کے بڑے بڑے دانت، آنسو رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں پر ایک لمحے کو رُکتے پھر ڈھلک کر ہونٹوں پر سے ہوتے ہوئے دانتوں میں سما جاتے۔ نمکین نمکین آنسوؤں کو پینے کے خیال ہی سے خاتون کو متلی سی ہونے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ نیاز محمد کی ماں کا سر اپنے کاندھے سے جھٹک دے لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ وہ بھلا اس کا سر کیسے ہٹا سکتی تھی جس کی ماں مر گئی تھی اور جس نے اس کے شانے کا سہارا لیا تھا۔ اس نے اپنی نظریں نیاز محمد کی ماں پر سے ہٹا کر دادی انا کی لاش پر گاڑ دینا چاہیں مگر میت کے اردگرد بیٹھی ہوئی ان عورتوں میں اس کی نظریں اُلجھ اُلجھ کر رہ جاتیں جو اسے اشتیاق اور للچاہٹ سے دیکھ رہی تھیں۔ سوکھی، مرجھلی، بے تحاشہ موٹی، کالی پیلی اور شلجم کی طرح پھیکی عورتیں جن کے گندے گندے لباس چراغ کی بسورتی روشنی میں اور بھی گندے نظر آرہے تھے۔ اسے ان عورتوں کے یوں دیکھنے سے الجھن سی ہونے لگی تو اس نے ان سب کی طرف سے منہ پھیر کر نیچے سے چوکور صحن کو یوں ہی دیکھنا شروع کر دیا۔ پورے صحن میں چراغ کی مدہم سی روشنی رینگی ہوئی تھی، بیچ میں جھلنگا کھاٹ پڑی تھی جس کے بان زمین پر جھونجھ کی طرح رکھے ہوئے تھے اور صحن کے ایک کونے میں لگے ہوئے نل سے بہتی ہوئی پانی کی پتلی سی دھار پکی زمین پر جیسے گنگنا رہی تھی — ہائے اماں — خاتون کے شانے پر اُچک کر نیاز محمد کی ماں نے ایک چیخ کے ساتھ پھر رونا شروع کر دیا۔ خاتون نے منہ موڑ کر دیکھا تو نیاز محمد کی ماں بڑی بے بسی سے رو رہی تھی۔ کچھ ایسی بے بسی جس میں ماں کی موت کے رنج سے زیادہ کوئی اور ہی رنج شریک معلوم ہو رہا تھا۔ مگر کیا —؟ خاتون یہ سوچ بھی نہ سکی۔ عورتیں اسے اسی طرح للچاہٹ سے دیکھ رہی تھیں۔ دادی انا کی میت — نیاز محمد کی ماں کی بے بسی اور عورتوں کے مسلسل دیکھتے رہنے کی ملی جلی کیفیت نے اس کی آنکھوں میں مارے الجھن کے گرم گرم آنسو بھر دئے۔ آہ — ہائے — نیاز کی اماں روئے جا رہی تھی۔ خاتون نے بھری بھری آنکھوں سے دیکھ کر اب بھی عورتیں چُپ چاپ بیٹھی اسے اشتیاق سے دیکھ رہی ہیں۔ نیاز محمد کی طرف ان کی ذرا بھی توجہ نہیں۔ ہائے اللہ — وہ جی ہی جی میں الجھی۔ جانے کمبختیں ایسے مریضوں کی طرح کیوں دیکھے جا رہی ہیں۔ خاتون نے سوچا اور پھر اسے ایک دم اپنی کلاس فیلو کلثوم کا خیال آگیا۔ کالی، بدصورت کلثوم جو بے حد غریب تھی اور جس کی فیس معاف تھی اور جسے کبھی کسی نے اچھا یا بہت صاف لباس پہنے نہ دیکھا تھا اسکول میں اسے کوئی لڑکی منہ لگانا بھی پسند نہ کرتی اور کلثوم رنگ برنگے لباسوں میں پھدکتی، تھرکتی خوبصورت خوبصورت لڑکیوں کو اشتیاق اور للچاہٹ سے دیکھا کرتی۔ بالکل اسی طرح جیسے میت کے گرد بیٹھی ہوئی

عورتیں دیکھ رہی تھیں اور پھر اس خیال کے بعد اسے فوراً احساس ہوا کہ وہ یقیناً اس انداز میں بہت خوبصورت لگ رہی ہو گی۔ ایک حور جو ارضی مصیبتوں پر رونے آ گئی ہو ـــــ خاتون نے اپنے چہرے کو اور بھی غمناک بنا لیا۔ پھر وہ تصور ہی تصور میں اپنے سوگوار حسن کو اچھی طرح محسوس کرنے لگی۔ چڑھی چڑھی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو۔ بڑے پیارے انداز میں موہوم طریقے پر کپکپاتے ہوئے لب، کسی قدر اوپر کو اٹھا ہوا چہرہ، خوبصورت چمپئی گردن میں لپٹا شیفون کا سفید دوپٹہ اور گھٹنے اس طرح زمین پر ٹیکے ہوئے جیسے کوئی مسیحی دوشیزہ قربان گاہ کے سامنے دعا مانگ رہی ہو۔ حسن کے اس تصور نے اسے روتے ہوئے نحوست زدہ ماحول سے اٹھا کر ایک دم کسی آرٹسٹ کا موڈل بنا دیا۔ دادی اناّ کا جنازہ اور رونے والے سب پس منظر میں کھو کر رہ گئے۔

"مت رو بٹیا ـــ تمہاری دادی اناّ کی روح بے چین ہو گی۔"

نیاز محمد کی ماں نے سسکیوں کے درمیان کہا اور دو تین عورتوں نے جلدی سے اس کی تائید کر دی۔ آرٹسٹ کا موڈل پھر نحوست زدہ ماحول میں آ گرا۔

"پھول جیسا چہرہ کملا کر رہ گیا۔" ایک عورت نے اپنے پائینچے سنبھالتے ہوئے کہا۔

"ہاں! بالکل ـــ ارے نیازو کی اماں صاحبزادی کو اچھی طرح بٹھاؤ۔ کب سے زمین پر بیٹھی ہیں۔" دوسری عورت نے اپنے ہونٹوں پر پان کی لالی ملتے ہوئے کہا۔

"اور دیکھو اب تم بھی رونا دھونا مت، صاحبزادی کا جی تھوڑا ہوگا۔" اسی عورت نے کہا اور پھر پان چبانے لگی۔ نیاز محمد کی ماں نے ایک سانس لے کر جیسے سارے اندوہ کو چراغ کے دھوئیں میں گھل مل جانے کے لئے نکل دیا، اور خاتون کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے، اپنے بال بکھرائے، نیاز محمد کی ماں کی طرح سینہ کوٹے، زمین پر پچھاڑیں کھائے اور پھر ان سب عورتوں کو اپنے لئے اور بھی پریشان دیکھے جو اس کا چہرہ اُترجانے پر اتنی بہت سی باتیں کر گئی تھیں لیکن اس سے قبل کہ وہ رو پڑنے کی کوشش کرتی، نیاز محمد کی ماں نے اپنا سوکھا ہوا بڑا سا ہاتھ اس کے ملائم بازو میں پھنسا دیا۔

"بٹیا یہاں سے اُٹھ کر پلنگ پر بیٹھو۔"

خاتون نے ہلکی سی مزاحمت میں اپنا ہاتھ کھینچا۔

"ارے کون نہیں جانتا کہ تمہیں اپنی دادی اناّ سے حد بھر محبت تھی مگر کب تک اپنا آرام حرام رکھو گی۔ چلو، اُٹھو!"

نیاز محمد کی ماں نے بلکے سے اس کا ہاتھ کھینچا تو وہ ایک ایسی چیخ کے ساتھ رو پڑی جس میں نہ غم تھا نہ خوشی، روتے روتے اس نے اپنا سر دادی اناّ کی کھاٹ کی پٹی سے ٹیک دیا۔

"ارے ـــ رے ـــ رے ـــ نانا بٹیا"

کئی سخت سخت محنتی ہاتھ اس کی طرف لپک پڑے اور سرسراتے ہوئے کپڑوں سے آتی ہوئی برساتی بو اس کے نتھنوں میں گھس گئی۔ خاتون نے گھبرا کر سر اٹھایا۔ وہ عورتوں کے بیچ میں گھری ہوئی تھی، بدبو اور عورتوں کے جمگھٹ سے اس کا دم گھٹنے لگا تو وہ ایک دم کھڑی ہو گئی اور نیاز محمد کی ماں نے اسے بیماروں کی طرح سہارا دے کر دالان کے کونے میں پڑی ہوئی کھاٹ پر بٹھا دیا پھر خود اس کے پاس ٹیک کر پنکھا جھلنے لگی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں خاتون نے آنکھیں موندلیں۔

"لیٹ رہو بٹیا" نیاز محمد کی ماں نے آہستہ سے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے لٹانے لگی۔

"نہیں — نہیں!" وہ سرہانے رکھے ہوئے میلے چیکٹ تکئے کے خیال ہی سے بیزار ہونے لگی۔ نیاز محمد کی ماں نے اسے اس طرح غور سے دیکھا جیسے وہ اس کی بیزاری تاڑنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"ہاں! کون سے دل سے لیٹا جائے، دل میں تو آگ لگی ہے۔"

پھر وہ آہستہ سے بولی اور خاتون سوچنے لگی کہ بھلا اسے دادی انا سے محبت ہی کب تھی؛ وہ تو بس ان کی عزت کرتی تھی، اتنی زیادہ کہ اپنی پڑھی لکھی سہیلیوں میں بھی ان کا ذکر کیا کرتی۔ لیکن یہ سب کتنے معصوم ہیں کہ اس کے رونے پیٹنے کو محبت سمجھ رہے ہیں۔ بیچارے ـــــ پھر بھی اسے رونا چاہیئے ورنہ سب کیا کہیں گے؛ یہی نا کہ یہ اس دادی انا کے جنازے پر آئی ہے جس نے مرنے سے پہلے کلمے کی بجائے اس کا نام رٹا۔ ہے ری دنیا، خاتون کو اپنی ذات پر افسوس ہونے لگا، ساتھ ہی اس نے رونے کی کوشش کی مگر وہ بھی تو بغیر تیل کا چراغ جلانے کی کوشش کر رہی تھی ـــــ بس ہونٹ کپکپا کر رہ گئے اور وہ نظریں جھکا کر چپ چاپ بیٹھی رہی ـــــ نیاز محمد کی ماں گھٹنوں میں سر چھپائے بے سدھ سی بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی اس کا دبلا پتلا جسم ایک لمبی آہ سے لرز اٹھتا۔ محلے کی عورتیں بھی چپ بیٹھی تھیں، بس دہیز میں چھپا ہوا جھینگر جیسے بین کر رہا تھا اور گاہے گاہے آہوں کے سرانے والاں میں سرسرا اٹھتے۔ دیر تک یوں ہی خاموشی چھائی رہی۔ خاتون کو بیٹھے بیٹھے بے چینی اور تھکن ہونے لگی تو وہ سوچنے لگی کہ جانے کب اٹھیں گی دادی انا ـــــ رات ہوتی جارہی ہے بھلا وہ گھر کیسے پہنچے گی؛ یہاں تو رات کاٹنا بڑا مشکل کام ہے، گھٹن، گرمی اور پھر نیاز محمد کی ماں ساری رات روئے گی مگر یہاں تو سب اس طرح مطمئن بیٹھے ہیں جیسے کہ بیچاری دادی انا خود ہی اٹھ کر نہا دھولیں گی، کفن پہن لیں گی اور پھر خود ہی قبرستان چلی جائیں گی۔ عورتیں تو اطمینان سے بیٹھی آہیں بھر رہی ہیں ابھی اور مردوں کی چلم شاید صبح تک تمباکو سے خالی نہ ہو، جانے کیا ہو رہا ہے۔

"میت کب تک اُٹھے گی؟ اب تو کافی دیر ہو رہی ہے۔"

خاتون نے فکرمندانہ لہجے میں پوچھا اور نیاز محمد کی ماں جواب دینے کے بجائے اس طرح ایک دم پھوٹ کر رو پڑی جیسے خاتون نے اس کا کلیجہ نوچ لیا ہو ـــــ ہے ناحق ہی تو پھر دادی انا کی یاد دلا کر بیچاری کو رلوا دیا۔ خاتون نے شرمندہ ہو کر اپنا سر جھکا لیا۔ نیاز محمد کی ماں تھوڑی دیر تک رو چکنے کے بعد ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان کہنے لگی۔

"جب اٹھیں ـــ نیازو کے ابا محلے بھر سے قرض مانگ آئے، کہیں سے نہ ملا۔ اب صبح صاحب کے بنگلے پر جائیں گے مگر کون سنتا ہے نوکر کی۔ اب تو ایک پیسہ بھی شاید ہی دے۔ علاج معالجے کے لئے ایک مہینے کی پیشگی تنخواہ دے چکا ہے۔ ہائے رے۔ اب تو یہ لاش چندے سے اُٹھے گی بٹیا، یا پھر پڑے پڑے سڑ جائے۔ ہائے اماں ـــ"

نیاز محمد کی ماں پھر رونے لگی۔

"ارے کیوں روتی ہو نیازو کی اماں، ہم غریبوں کا بھی خدا ہے، کچھ تو کرے گا۔ ہم سب تو تمہارے ہی جیسے حال میں ہیں، ورنہ بھلا محلّے ٹولے کے لوگ ایسے وقت میں بھی کام نہ آئیں۔ جو دس پانچ بھی پڑے ہوں پاس تو کفن پر اُٹھیں۔"

ایک عورت نے کہا؛

"اور دس پانچ میں ہوتا کیا ہے اس زمانے میں۔ تیس چالیس چاہئیں تیس چالیس۔"

دوسری عورت آہوں اور سسکیوں سے الجھی ہوئی فضا میں محروم محروم نظروں سے دیکھنے لگی۔ دوسری عورتیں اپنی اپنی مصیبتوں کا ذکر کر رہی تھیں۔ پیٹ کو روٹی ہے نہ تن کو کپڑا ـــــ اور پھر وہ سب کی سب اُمید بھری نظروں سے خاتون کو دیکھنے لگیں۔ ایسی اُمید بھری نظریں جو چیخ رہی

تھیں کہ تم ضرور اپنی دادی انا کے کفن کا انتظام کر سکتی ہو، تم بڑی آدمی ہو، تم ریشمین کپڑے پہنے ہو، تمہارے ہاتھ میں بڑا سا بٹوہ ہے اور پھر تمہیں اپنی دادی انا سے محبت بھی ہے'۔۔۔ خاتون نے ان نظروں کو دیکھا، پہچانا اور سوچنے لگی کہ اب کیا کیا کرنا چاہیئے۔ ابھی وہ بے کس قابل۔ یہ سب اسے نہ جانے کیا سمجھ رہی ہیں۔ جیب خرچ سے وہ صرف پچاس روپے بچا سکی ہے اتنے دنوں میں اور پھر اس نے کب سے سلمہ سے کہہ رکھا ہے کہ وہ اس کے لئے اپنی جیسی ساری خرید لے، پورے تیس روپے اسے دیا ہیں۔ پانچ روپے جلسے کے چندے کے۔ اگر یہاں اس نے تیس چالیس دے دیئے تو پھر اماں تو اسے اتنے روپے اکٹھا دینے سے رہیں۔ ویسے ہی اسے فضول خرچ کہا کرتی ہیں۔ دادی انا جب بھی اس کی خیریت پچھوایا کرتی تھیں اور وہ انہیں اپنی جیب سے پانچ چھ روپے بھجوا دیا کرتی تو اماں ناراض ہوتی تھیں۔ خاتون تو خیریت پچھوانے پر جھلا جاتی ہے۔ تمہاری دادی انا کبھی ہماری خیریت نہیں پوچھتیں۔ خاتون روپے جوڑ دیتی ہے، میں کہتی ہوں کہ کوئی ضرورت نہیں ایک پیسہ دینے کی۔ ان کی خدمات کا کیا کچھ کم صلہ دیا جا چکا ہے؟ اب جو اماں کو معلوم ہو گا کہ وہ ایک دم اتنے بہت سے روپے دے بیٹھی تو کس قدر ناراض ہوں گی۔۔۔ خیر ناراضگی کی ایسی کیا پروا مگر سلمہ کیا کہے گی کہ دس بار کہا ساری خرید لو، خرید لو اور روپے نہ نکلے جیب سے۔۔ اب کیا ہوا آخر۔ خاتون نے الجھ کر عورتوں کی طرف دیکھا تو وہ سب اسے اس طرح دیکھ رہی تھیں جیسے وہ کوئی جادو کا پٹارہ ہو، جس میں سے کوئی بہت ہی عجیب چیز نکلنے والی ہو۔۔۔ خاتون پھر سوچنے لگی۔۔۔ اگر اس وقت وہ دادی انا کی میت اٹھوا دے تو ان سب عورتوں کو کتنی حیرت ہو گی۔۔۔ اور یہ روتی ہوئی نیاز محمد کی ماں کس قدر احسان مانے گی۔ احسان، توبہ! توبہ! خاتون کانپ پر پسلتے پسلتے بچی۔۔ احسان کا ہے کا۔۔ یہ تو اس کا فرض ہے کہ وہ دادی انا کی لاش اٹھوا دے جو اسے عزیز رکھتی تھیں، جنہوں نے مرنے سے پہلے کلمے کے بجائے اس کے نام کی رٹ لگا دی تھی۔ وہ ان کی کچھ بھی تو خدمت نہ کر سکی، وہ ان کی محبت کا بدلہ کسی طرح تو نہ دے سکی، کاش! وہ بیماری ہی میں ان کی تیمارداری کر لیتی۔ لیکن اس کی قسمت ہی میں نہ تھا۔ پھر بھی اب وہ اس آخری کام کو انجام دے سکتی ہے۔ وہ ساری پھر خرید لے گی، وہ اماں کی کڑوی باتیں بھی برداشت کر لے گی مگر یہ روپے دادی انا کی سچی الفت پر ضرور قربان کرے گی۔ آہ! بیچاری۔۔۔ خلوص و محبت کے اچانک پیدا ہونے والے جذبات نے اس کی آنکھوں میں گرم گرم آنسو بھر دئیے۔

"نیاز محمد کی اماں" اس نے نیاز محمد کی ماں کا ہاتھ چھو کر چپکے سے پکارا۔

"ہاں بیٹیا!" وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"یہ لو۔۔۔" وہ پرس کھول کر روپے نکالنے لگی۔

"یہ لو، جلدی سے انتظام کر لو۔۔۔" خاتون نے دس دس کے تین نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دئیے۔

"اگر اور ضرورت پڑے تو مانگ لینا، ہماری دادی انا سے زیادہ عزیز نہیں ہے روپیہ"۔

نیاز محمد کی ماں نوٹوں کو مٹھی میں دبائے اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی، جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ خاتون نے اسے اتنے بہت سے روپے دئیے ہیں سچ مچ کہ وہ اپنی ماں کی اس لاش کو اٹھوا سکتی ہے۔ صبح سے پڑی تھی اور اس کے شوہر کو کہیں سے قرض نہ ملا تھا اور نہ ملنے کی امید تھی۔

"ہائے ماں۔۔۔" خاتون کو دیکھتے دیکھتے وہ یکدم چیخ کر رو پڑی اور دیوانہ وار اٹھ کر اپنی ماں کے پلنگ کی پٹی سے لپٹ گئی۔

"یہ لو۔۔۔" اس نے نوٹ میت پر پڑی ہوئی چادر پر بکھیر دئیے۔

"یہ لو تمہاری لاڈلی پوتی نے تمہاری لاش اٹھوانے کا انتظام کر دیا۔ نہیں تو تمہاری لاش چندے سے اٹھتی، یا پھر سڑ جاتی تمہاری

لاش پڑے پڑے ـــ ہائے اماں تم خوش قسمت ہو، آنکھیں کھولو ـــ ایک بار اپنی پوتی کو دیکھ لو۔ ہائے ـــ ہائے ـــ"

نیاز کی ماں کلیجہ پھاڑ پھاڑ کر رو رہی تھی، جیسے، اس کا سارا جسم بری طرح لرز رہا تھا، ماں کی لاش نہ اٹھوا سکنے کی بے بسی، ماں کے مرنے کا غم ادھر روپے مل جانے کی خوشی، تینوں نے مل کر اس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت پیدا کر دی تھی، ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے رنج و خوشی آپس میں ٹکرا کر اپنی حدیں بھول گئے ہوں ـــ محلے کی عورتیں ڈبڈباتی ہوئی متشکر نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں اور خاتون کی بڑی عجیب سی حالت ہو رہی تھی، جیسے وہ متشکر نگاہیں اسے مع پلنگ کے آسمان کی طرف اٹھائے لئے جا رہی ہوں۔ زمین اور زمین پر پڑی ہوئی ہر چیز اس سے دور تر ہوتی جا رہی تھی۔ پھر اس کی یہ کیفیت اس وقت ختم ہوئی جب چھوٹے سے چوکور صحن میں اینٹوں کا چولہا بنا کر آگ جلا دی گئی تھی، پانی سے بھرا ہوا بڑا سا بدقلعی پتیلہ چولہے پر رکھ دیا گیا تھا۔ آگ کے شعلوں کے سائے دیواروں پر کپکپا رہے تھے اور میت کو نہلانے کے لئے بھیانک اور جذبات سے عاری صورت کی موٹی غسالن ایک طرف بیٹھی پان چبا رہی تھی، اور نیاز کی ماں دیوار کا سہارا لئے تنہا زمین پر بیٹھی لمبی لمبی آہیں بھر رہی تھی، دادی اناّ کے سرہانے سلگتے ہوئے لوبان کا دھواں دالان میں بے چین ہو رہا تھا۔ خاتون نے سہمی اور نفرت زدہ نظروں سے غسالن کو دیکھا، عام انسانوں سے کس قدر مختلف تھا اس کا چہرہ۔ اس کا چہرہ جیسے پکار پکار کر کہہ رہا تھا: "جب دوسروں کے کلیجوں میں آگ لگتی ہے تو میرے پیٹ کی آگ ٹھنڈی ہوتی ہے، مجھے کسی کے مرنے کا غم نہیں ہوتا۔ موت میرا کاروبار ہے، زندگی سے مجھے نفرت ہے۔" خاتون نے مارے نفرت کے اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپا کر اچھی طرح دیوار کا سہارا لے لیا۔ اب اُسے بے چینی سے انتظار تھا کہ کب دادی اناّ اُٹھیں اور وہ اپنے گھر جائے۔ کئی گھنٹے کی مسلسل بے آرامی، روتا بسورتا ماحول، گرمی اور گھٹن، ساری جان میں چٹکیاں لگ رہی تھیں مگر ابھی تو میّت کو نہلانے کے لئے پانی گرم ہو رہا تھا۔ خاتون اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اونگھ گئی اور جب بے چین سی نیند اس پر بُری طرح چھا گئی تھی تو بہت سی چیخیں اس کے کانوں کے پار ہو گئیں وہ سوتے سے اُچھل کر کھڑی ہو گئی ـ دادی اناّ کو غسل دے کر کفنایا جا چکا تھا۔ نیاز کی ماں زمین پر پچھاڑیں کھا رہی تھی، محلے کی عورتیں اسے سنبھال رہی تھیں، ڈیوڑھی میں کئی بھاری بھاری آوازیں چیخ رہی تھیں۔

"پردہ کر لو ـــ پردہ کر لو" خاتون دادی اناّ کے پاس کھڑی ہو کر ان کے کفن سے جھانکتے ہوئے پیلے چہرے کو حسرت سے دیکھنے لگی۔ موت کا زبردست پہرہ لگا ہوا تھا۔ شکست خوردہ زندگی کا کہیں دور دور پتہ نہ تھا۔ خاتون کی آنکھوں سے بے شمار آنسو بہہ نکلے۔

"پردہ کر لو، دیر ہو رہی ہے، پردہ کر لو" نیاز کا باپ اور کئی آدمی چیختے ہوئے اندر آنے لگے تو محلے کی عورتیں اپنے اپنے دوپٹوں میں چھپ چھپ کر بیٹھنے لگیں۔ نیاز کے باپ نے آگے بڑھ کر دادی اناّ کا چہرہ کفن میں چھپا کر بوری کے منہ کی طرح باندھ دیا۔ لاش کو آہستہ سے کئی آدمیوں نے سہارا دے کر اٹھایا اور جب کلمہ پڑھتے ہوئے باہر جانے لگے تو نیاز کی ماں دیوانہ وار ان کے پیچھے بھاگنے لگی۔

"آہ! مت لے جاؤ، مت لے جاؤ میری ماں کو، چھوڑ دو خدارا ـــ"

نیاز کی ماں بے تحاشا چیخ رہی تھی، خاتون نے اسے باہر نکلنے سے بڑی مشکل سے روکا، میت نظروں سے اوجھل ہو گئی تو نیاز کی ماں زمین پر لیٹ کر سینہ کوٹتے کوٹتے جیسے بے ہوش سی ہونے لگی۔ محلے کی عورتوں نے پانی کے چھینٹے مارے، دو گھونٹ پانی حلق میں ڈالا اور نیاز کی ماں نے آنکھیں کھول دیں ـــ "آہ ـ آہ ـ ہائے رے" وہ دیوار کا سہارا لے کر بیٹھتے ہوئے جیسے کراہنے لگی اور پھر ایک دم چپ ہو کر اس طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے سو گئی ہو تھک کر ـــ محلے کی عورتیں، نمازی، پرہیزگار اور محلے کے ہر فرد سے محبت کرنے والی

دادی اناکی دائمی جدائی پر اس طرح چپ اور سوگوار بیٹھی تھیں جیسے ان سے ان کا سب کچھ چھین لیا گیا ہو لیکن تھکی ماندی خاتون اب صرف گھر جانے کے لئے سوچ رہی تھی، تھکا ہوا دل و دماغ دادی انا کے غم کو ان کے ساتھ دفن کر چکا تھا، آرام رہ رہ کے انگڑائیاں لے رہا تھا۔ لیکن اس سے کچھ کہتے نہ بن پڑتی جانے کے لئے صرف اس خیال کی وجہ سے کہ سب کیا کہیں گے؟ تو ابھی تو دادی انا کو اٹھے چند منٹ گزرے ہیں، ابھی تو ان کی لاش قبرستان بھی نہ پہنچی ہوگی اور صاحبزادی کو اپنے آرام کی سوجھنے لگی۔ یہ وہی صاحبزادی ہیں جن کا کلمہ خدا کے بجائے پڑھا گیا ہے ری دنیا۔ اور خاتون الکسائی سی چپ چاپ بیٹھی کسمسا رہی تھی ـــ وہ وقت گزرانے کے لئے چراغ کی مدھم روشنی میں دالان کی ایک ایک چیز کو گھورنے لگی۔ چراغ کی ننھی سی لپکپاتی ہوئی سرخ زبان، تیل میں گرے ہوئے ننھے ننھے پتنگے۔ زمین پر لڑھکا ہوا پانی کا گلاس، کئی بسورتے ہوئے چہرے اور دادی انا کا وہ پلنگ جس پر ذرا دیر پہلے وہ جیسے چادر اوڑھے سو رہی تھیں۔ اب بغیر بستر کے وہ کھرا پلنگ کسی قدر سونا اور بھیانک لگ رہا تھا۔ جیسے اس نے بیچاری دادی کو نگل لیا ہو ـــ نیاز کی ماں ٹک ٹک سونے پلنگ کو دیکھ رہی تھی۔

"ہائے ـــ اے اماں ـــ"، نیاز کی ماں پلنگ کو دیکھتے دیکھتے پھر رونے لگی۔

"نہ نہ ـــ اب مت رویو نیاز کی اماں۔ روح پہ عذاب ہوگا۔ یہ دعا کا وقت ہے"۔

ایک عورت نے اٹھ کر نیاز کی ماں کے آنسو پونچھ دئے اور لمبی آہ بھر کر بالکل اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"ہاں اب مت رونا، ایسی نیک بیوی کی جان پر عذاب ڈالنے سے کیا فائدہ، کون اب وہ ہمیں مل جائیں گی"۔

دوسری عورت نے اپنی خشک آنکھیں دوپٹے کے پلو سے رگڑ ڈالیں۔ ایسی محبت کرنے والی تھیں مرحومہ کہ ان کے خیال سے کلیجہ پھٹنے لگتا ہے اور اب تو ایسا لگتا ہے کہ ہم سے پیار سے بولنے والا دنیا میں کوئی نہیں رہا۔ تیسری عورت بھی بول اٹھی ایک لمبی سسکی کے ساتھ اور نیاز کی ماں پھر بے تحاشہ رونے کی تیاری کرنے لگی۔ اس کے ہونٹ زور سے پکپانے لگے ـــ خاتون کو غصہ آنے لگا کہ یہ سب چپ بھی کراتی ہیں اور پھر باتیں بھی ایسی کرتی ہیں کہ خبردار چپ نہ رہنا روئے جاؤ ـــ"

"آٹھ بچوں کی ماں ہوگئی مگر ایسی موت ہم نے نہ دیکھی ـــ"، چوتھی عورت بھی خاموش نہ رہ سکتی تھی ـــ نہ ایک ہچکی آئی نہ موت کی تکلیف کا کھٹکا لگا بس بچوں کی طرح پٹ سے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ سب ان کی نیکیاں تھیں کہ ذرا بھی خدا نے تکلیف نہ دی ورنہ ـــ"، وہ اور نہ جانے کیا کہنے والی تھی کہ نیاز محمد کی بھاری آواز نے بات کاٹ دی۔ ٹاٹ کے پھٹے ہوئے پردے میں منہ ڈالے ڈیوڑھی سے کہہ رہا تھا۔

"بجیا میں آپ کے لئے تانگہ لے آیا ہوں، چلئے، رات بہت ہو رہی ہے"۔

"اچھا"، خاتون نے اپنے پاس پڑا ہوا برقع اٹھا کر اوڑھ لیا۔ نیاز کی ماں اٹھ کر خاتون سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر بے بسی سے رونے لگی۔ "صبر سے کام لو نیاز کی اماں، رونے سے کیا فائدہ"، خاتون نے اسے الگ کرتے ہوئے کہا، اور پھر ان عورتوں کی طرف ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر تیزی سے نیاز محمد کے پیچھے ہو لی۔

ایک بار پھر تانگہ بڑی بے بسی سے گڑھے دار سڑک پر دھچر دھچر کرتا ہوا جا رہا تھا اور ہر طرف سے گھرا ہوا ابر جیسے ہر لمحے برس کر خاتون کو پانی سے شرابور کر دینے کی دھمکیاں دے رہا تھا ـــ بجلی کی پتلی سی تلوار جیسی لہر سیاہ ابر کو پھاڑتی ہوئی بار بار لہراتی اور غائب ہو جاتی ـــ دکانیں بند ہو چکی تھیں، سڑک پر ویرانی نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا، کہیں کہیں کوئی راہ گیر کھانستا، کھنکارتا

یا گنگناتا ہوا نظر آجاتا یا پھر دُم دباتے ہوئے گھُستے۔

نیاز محمد تانگے کی اگلی سیٹ پر بیٹھا سڑک کی سونی سوتی روشنی میں نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھی ایک طویل آہ اس کے لبوں پر دم توڑ دیتی اور خاتون بھیگنے اور بیمار پڑنے کے خیال سے بیزار ہو رہی تھی، لیکن گھر تو اس کا ابھی بہت دور تھا۔

"نیاز۔ دادی انا کی حالت کب سے خراب ہوئی تھی؟" خاتون وقت گزارنے کے لئے باتیں کرنے لگی۔ بجلی زور سے کوندی اور بادل گرج اُٹھے۔

"آج صبح سے" نیاز نے بڑے کرب سے جواب دیا۔

"اور انتقال کس وقت ہوا؟"

"کوئی چار بجے شام کو" نیاز نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔

"ہا۔۔۔ہ۔۔۔ بچاری دادی انا۔۔۔" اور خاتون کو ایک دم وہی سر بلند کر دینے والا خیال آگیا۔۔۔ دادی انا خدا کے بجائے اس کے نام کا کلمہ پڑھتے ہوئے مریں۔

"کیا کیا کہتی تھیں مرنے سے پہلے؟" نیاز سے پھر وہی بات سننے کی تمنا خاتون کو اکسانے لگی۔

"کچھ بھی تو نہ کہا۔ ساآہ! ہا۔۔۔ہ۔۔۔ بس کلمہ پڑھتے پڑھتے خدا کو پیاری ہوگئیں۔"

"کس کا کلمہ، اوہ!" خاتون اپنے سوال پر ایک دم جھینپ گئی۔ بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات تھی کہ دادی انا اس کا کلمہ پڑھتے ہوئے مریں؟ کس قدر نا معقول سوال کیا ہے اس نے۔

"کلمہ کس کا ہوتا ہے۔۔۔؟ خدا رسول کا کلمہ تھا، آپ بھی بعض وقت بچوں جیسی بات کرتی ہیں بجیا؟" نیاز محمد زبردستی ایک تلخ سی ہنسی ہنس پڑا اور خاتون کا جیسے کسی نے کلیجہ نوچ لیا ہو۔

"تم بھی ان کمبخت نفیریوں کی محبت پر یقین کرتی ہو۔ یہ تو محبت کا ڈھونگ رچا کر لوٹتی ہیں کمینیاں۔۔۔" خاتون کو اپنی ماں کی بات یاد آگئی جب انہوں نے خاتون کے روپے بھیجنے پر ایک بار بہت بگڑ کر کہا تھا۔

"تیز چلاؤ تانگہ" خاتون تقریباً چیخ پڑی۔

"سڑاک۔۔۔" چابک لہرا کر زور سے گھوڑے کی پیٹھ پر پڑی اور گھوڑا جیسے جان چھوڑ کر بھاگا، مگر خاتون کو محسوس ہو رہا تھا کہ تانگہ اور بھی بے بسی سے دھچر دھچر کر رہا ہے۔۔۔ بجلی زور سے کڑکی اور آسمان پر جیسے بہت سے بم پھٹ گئے۔

(جولائی ۱۹۴۰ء)

# عطو

ہاجرہ مسرور

چھوٹے سرکار کئی دن سے اپنے تعلقے پر گئے ہوئے تھے۔ پھوپی اماں آئیں تو اس خبر سے لدی ہوئی کہ گلو میاں ماشاء اللہ پانچویں دفعہ امتحان دے کر دسویں پاس کر ہی گئے۔ یہ گلو میاں پھوپی کے اکلوتے بیٹے تھے اور چھوٹے سرکار کی مالی حالت کے سہارے امتحان دینے کا شغل فرما رہے تھے۔ پھوپی بیاہی تو گئی تھیں اچھا گھر دیکھ کر لیکن جب شادی ہو گئی تو پتہ چلا کہ میاں کی پوری جائداد مختلف مانیوں کے قبضے میں ہے۔ یہی پڑھی لکھی سارا زیور سارا جہیز بھی جب ایک ایک کر کے مہاجن کے گھر پہنچ گیا تو چھوٹے سرکار نے بہنوئی کی جانب سے غصہ کھا کر بھانجے کو تعلیم دلانے کا تہیہ کیا۔ اور اب ستائیس سال کے مختصر عرصہ میں گلو میاں میٹرک پاس بن گئے۔ عجب ڈرپوک، کند ذہن سا انسان جسے منظور میاں ریڑھ دماغ کہا کرتے اور اس کی تشریح یوں کرتے کہ انھیں جتنا چاہو کھینچو لیکن ذرا چھوڑا کہ پھر اپنے سائز پر آگئے۔ تو اسی خوشی میں پھوپی آکر رضیہ، صفیہ اور نانی بی کو مع لانی کے اپنے ہاں لے گئیں۔ عطیہ کو زکام تھا اور ہلکا بخار، اس لئے پھوپی نے اتنی رعایت کی کہ اسے جوشاندہ پی کر لیٹے رہنے کی ہدایت کی اور عبادی خانم کو محل ہی میں چھوڑ گئیں۔

نانی کی ہدایت کے مطابق عطیہ بستر پر جوشاندہ پی کر لیٹ گئی اور جب سب چلے گئے تو وہ اس بے رخی پر جانے کیوں پہلی مرتبہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سب چلے گئے، سب مجھے چھوڑ گئے۔ وہ بڑبڑاتی رہی۔ تمام دن بستر پر پڑے پڑے ساری پرانی یادوں کے انباروں کو کریدتی رہی اور تنہائی میں وفادار محبوباؤں کی طرح چھوٹے سرکار کا انتظار کرتی رہی۔ جیسے گھر کے تمام افراد اس کے اور چھوٹے سرکار کے درمیان دیواروں کی طرح حائل ہوں۔ اسے یاد تھا کہ جب وہ روتی یا تکلیف میں ہوتی تو چھوٹے سرکار اسے سینے سے لگانے آپہنچتے، جیسا کہ ماضی میں دو ایک بار ہو چکا تھا۔ تو اس وقت بھی وہ روئے چلی گئی، ایک اہم کام، ایک مقدس فرض سمجھ کر جسے اسے یقین ہو کہ اس کے آنسوؤں کی لڑی کے دوسرے سرے پر چھوٹے سرکار کا دل بندھا ہوا ہے۔ "وہ میرے اباجان ہیں، وہ تو مجھے بہت چاہتے ہیں" عطیہ اسی ایمان کی گرہ کستی ہی چلی گئی "انہوں نے مجھے پیار کیا تھا۔ انھوں نے مجھے گود میں اٹھایا تھا۔ اور پھر میرے لئے روئے تھے۔ انھوں نے رضیہ صفیہ کو کبھی گود میں نہیں اٹھایا۔" وہ اپنے آپ کو یقین دلاتی اور روتی رہی، انتظار کرتی رہی۔

عبادی خانم موقع غنیمت جان کر تمام دن آرام سے اونگھتی رہیں یا پھر ڈلی کاٹتی رہیں۔ سورج جھکتے نومبر کی سردی چمک گئی۔ دفعتاً عطیہ تیز بخار میں ڈولتی اٹھی اور محل کے سونے کونوں میں گھومنے لگی۔ خواہ مخواہ ہر کمرے میں جاکر بیٹھی، ہر بیگم کو ان کے کمرے میں جاکر پکارتی رہی۔ رضیہ، صفیہ کے کمرے میں جاکر اس نے ان کی الماریوں میں رکھی ہوئی کپڑے کی گڑیاں اور گرہستی کے کھلونے اٹھا کر فرش پر دے مارے۔ گڑیوں کے ننھے ننھے چاندی کے زیور اتار کر دانتوں تلے دبا کر ٹیڑھے میڑھے کر دیئے۔

"آئیں اور اب کچھ کہیں مجھ سے۔" اس نے دانت کچکچا کر آپ ہی آپ کہا، جیسے وہ رضیہ، صفیہ کو دانتوں سے نوچ ڈالنا چاہتی ہو۔

"تم ہو کون م..." اس نے جیسے رقیہ کو مخاطب کر کے ... کہ بیعت کی مولی ہو" اس نے رقیہ کے منہ پر اسی کا سوال تڑاق سے کھینچ مارا۔ "جب دیکھو جب ہی کہ تم ہو کس کھیت کی مولی۔ واہ میں تو عطیہ جوں مولی ہوگی وہ خود" ...اس نے کہا اور پھر یوں تیر کی طرح اس کمرے سے نکلی ... چکی ہو۔ بخار سے اس کی ہڈیاں تک پگھلی جا رہی تھیں۔ ...جا کر وہ ہال میں تختوں کے چوکے پر بیٹھ گئی

"میں کون ہوں، کوئی کیا ہوتا ہے؟" یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی۔ "کیا میں عطیہ بیگم نہیں ہوں۔ جیسے کہ عبادی خانم، جیسے انی بی، جیسے خود رقیہ بیگم" عطیہ نے وصل دی ... نہیں شاید یہ بات نہیں، کوئی اور بات ہے۔ کوئی اور بات ہے" اس کے سینے میں کوئی جیسے ... سے الجھن کے پاؤں پٹخنے لگا۔ گھبرا کر وہ چھوٹے سرکار کے کمرے کا زینہ چڑھنے لگی ... بھول دار ... ہی حالیں بر پانوں۔ کہتے ہی اس کے ذہن میں برقی رو سی دوڑ گئی۔ تکلیف دہ دھکا سا۔ منصور میاں نے جب اسے اذیت پہنچائی تھی تو وہ اس کمرے میں دبی گئی تھی۔ بڑا خوف اس پر نہایت شدت سے حملہ آور ہوا اور وہ دوڑ کر چھوٹے سرکار کی اسپرنگوں والی مسہری میں گٹھری سی بن کر دب گئی۔

"چھوٹے سرکار — ابا جان آ جاؤ" اس نے مسہری میں تھر تھرا کر پکارا۔ اس کے دل میں بے شمار کہنے کی باتیں تھیں۔ وہ چھوٹے سرکار کو اپنی کتابوں کے بارے میں بتانا چاہتی تھی۔ وہ کہنا چاہتی کہ مسز البرٹ اسے پڑھاتے پڑھاتے تھک جاتی ہیں لیکن وہ پڑھتے نہیں تھکتی۔ وہ رقیہ، صفیہ کی کند ذہنی کے بارے میں بھی اطلاع دینا ضروری سمجھتی تھی۔ پھر وہ اس ڈر کے لیے بھی بات کرنا چاہتی تھی جو اسے منصور میاں اور دوسرے بھائیوں سے محسوس ہوتا تھا۔

"چھوٹے سرکار ہم سے بولا کریں نا" عطیہ نے آنکھیں بند کر کے چھوٹے سرکار کو اپنے قریب ٹٹول لیا۔ "آپ ہمیں بہت اچھے لگتے ہیں۔ چاند سے بھی زیادہ اچھے لگتے ہیں چھوٹے سرکار، ہمارے سر پر ہاتھ پھیریے، اچھا ہم آپ کے گلے میں ہاتھ ڈال لیں؟ ہمارا بڑا جی چاہتا ہے سرکار، ایک بات تو بتایئے ... اچھے لگتے ہیں، وہ الگ کمرے میں کیوں رہتے ہیں اور جو اچھے نہیں لگتے وہ ساتھ کیوں رہتے ہیں؟ چھوٹے سرکار! ابا جان!"

... مارے سرخ آنکھیں کھول کر پکارا، اور پھر چھوٹے سرکار کی جوانی کی بڑی سی روغنی تصویر کو اپنی طرف گھورتے پا کر مٹھیوں سے بستر کوٹ ... دفعتاً جست کر کے وہ کمرے سے نکل بھاگی۔

"نہ آؤ — کوئی نہ آؤ —" وہ بخار میں چیختی ہوئی زینے پر سے لڑھک گئی۔

عبادی خانم نے چیخ سنی تو پاخانے ہی میں لوٹا پٹخ کر بھاگیں۔ عطیہ کو چھوٹے سرکار کے زینے تلے پڑے دیکھ کر ہول گئیں۔ سارا ماتھا خون میں تر بتر اور بخار میں جلتی ہوئی۔ مارے خوف کے ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ گرتی پڑتی ڈیوڑھی کی طرف بھاگیں کہ کسی نوکر کو پکار کر ڈاکٹر کو بلوا لیں۔ ... سب معمول ڈیوڑھی سے غائب۔ عبادی خانم نے ہول کر سینہ پیٹ لیا، عمر بھر تو بغیر ڈولی کے گھر سے قدم نہ نکالا تھا۔ اب کیسے نکلیں۔ ہائے ...ن کو بھی ساتھ لے گئیں ... ان ہی کو چھوڑ جاتیں۔ اب کیا ہو لڑکی تو عجب حال میں پڑی ہے۔ ... کچھ ہو گیا تو مجھ بدی کے سفید چونڈے کی خیر نہیں۔ ...ان کی ایک ہو شیا۔ چھوٹے سرکار کے سامنے مجھی پہ سارا الزام تھوپ دیں گی۔

... خانم نے اپنے بوڑھے ہاتھوں سے عطیہ کے بیہوش بخار سے جلتے جسم کو اٹھا کر تخت پر ڈالنا چاہا مگر دو قدم چل کر دھم سے پھر گر بیٹھیں۔ ... کوئی ہے ڈیوڑھی میں سوئے سارے نوکر مر گئے۔ اے دوڑیو کوئی لڑکی ہاتھ سے جا رہی ہے" عبادی خانم پردے سے نکل کر چلائیں۔ ... بادشاہ ... سے آ گئے ہوں اور دیوان خانے میں موجود ہوں۔

عبادی خانم کی ... کے جواب میں دیوان خانے میں ایک کھنکار بلند ہوئی اور پھر ڈیوڑھی میں کھلنے والا دروازہ دھڑ سے کھل گیا۔ عبادی خانم نے

دوپٹے کی اوٹ کر لی۔

"اے وکیل صاحب! جلدی سے دیکھیے عطیہ بیگم کو کیا ہو گیا" عبادی خانم ہانپتی کانپتی اندر بھاگیں۔ وہ پیچھے سے عرفانی۔

انھوں نے عطیہ کو اٹھا کر اندر لٹایا، پانی کے چھینٹے دیے اور جب وہ ہوش میں نہ آئی تو ڈاکٹر کو بلانے چلے گئے۔

انجکشن کے بعد ڈاکٹر کی ہدایت کے موجب عطیہ کے سر پر پانی کے بھیگے کپڑے رکھتے ہوئے عرفانی نے تیز آواز میں مغلانی بی کو مخاطب کیا جو آتی دیر سے چادر کی اوٹ کیے عطیہ کا منہ دیکھے جا رہی تھیں۔

"مغلانی بی جب بچی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو آپ نے اسے اوپر کیوں جانے دیا۔"

"اے جناب اچھی بھلی تھیں، میں ذرا باورچی خانے گئی کہ یہ ہو گیا۔"

مغلانی بی نے برا مان کر کہا ۔ یہ کیا کہ لگے سوال جواب کرنے ۔۔ تو کیا بڑے چھوٹے سرکار سے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ رعب جمانے لگیں۔

عطیہ نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں

"جب بچی بیمار تھی تو گھر کے سب لوگوں کو اسے چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا" عرفانی نے بڑے دکھ سے مغلانی بی کی چادر کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

"اے جناب کہا تو بس معمولی سا کام تھا۔ کسے معلوم تھا کہ بخار ہو جانے کا" عبادی خانم نے چادر کے پیچھے ہی سے جواب دیا۔ اور دل میں سوچا کہ وہ نانی بی سے عرفانی صاحب کی شکایت کریں گی ۔۔ واہ ایک تو اتنے دن سے ذرا سی رشتے داری کے بوتے پر چھوٹے سرکار کی روٹی کھا رہے ہیں، اس پر سے باتیں بناتے ہیں۔

لیکن عطیہ نے جب آنکھیں کھول کر سینے اور سر کے درد کو محسوس کرتے ایک آہ بھری تو عرفانی نے کپڑا نچوڑتے ہوئے جھک کر اس کے گال تھپتھپا دیے۔

"اے بی بی! بس ذرا سی چوٹ میں یہ حال کر لیا۔ بہادر بچے ایسا نہیں کرتے" عرفانی شفقت سے مسکرائے اور اس کے سیاہ بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

اور عطیہ کو بخار کی تیز گرمی کے ساتھ یہ ماحول، یہ فقرے اور عرفانی کی شخصیت بڑی خوابناک، بڑی نرم اور دلکش لگی۔ اور شام کو جب نانی بی کی واپسی پر وہ مردانے حصے میں جانے لگے تو عطیہ کو لگا جیسے عرفانی کے بازوؤں پر جھکے دو دھوپ بر اُگ رہے ہیں۔

اور جب وہ چلنے لگے تو عطیہ کو محسوس ہوا جیسے وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے چلی جا رہی ہے۔

مارچ ۱۹۶۴ء

# دل کی بستی عجیب بستی ہے

آغا بابر

مصطفٰے کو یہ سُن کر بہت خوشی ہوئی کہ میرا تبادلہ دہلی کا ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے خط میں لکھا کہ تم آؤ گے تو وقت اچھا کٹے گا، کیونکہ آج کل میرا اُٹھنا بیٹھنا چند بزرگوں کے ساتھ ہے جن کی صحبت سے میں بیزار ہو چکا ہوں۔ ایک صوفی صاحب میرے نئے دوست ہیں جو تمھارا انتظار مجھ سے زیادہ کر رہے ہیں۔

سیاہ رنگت، چھوٹا قد، چھدری ڈاڑھی، سر پر کامدار ٹوپی، گلے میں پُرانی وضع کا لمبا خاکی کوٹ اور کندھے پر عربی رُومال۔ یہ تھا حُلیہ صوفی صاحب کا۔ آنکھیں تو ہمیشہ ان کی سُرخ رہتیں، لیکن کبھی بالکل بے آب نظر آتی تھیں اور کبھی ان میں اتنی گہرائی نظر آتی تھی جیسے کوئی تھاہ ہی نہ ہو۔ جب مصطفٰے نے تعارف کرایا تو صوفی صاحب کو میں نے سراپا خلوص پایا۔ اُنھوں نے مجھے اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی اور چلے گئے۔

مصطفٰے سے معلوم ہوا کہ صوفی حاکم علی اس کے دفتر میں ہیں تو معمولی دفتری مگر ملنا اچھے اچھے لوگوں سے ہے۔ پہاڑ گنج میں کسی بزرگ کی خانقاہ کے ساتھ درویش خانہ ہے، وہاں ایک کوٹھڑی میں رہتے ہیں۔ اولیاء اللہ کے مزاروں پر حاضری دینا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔

"مگر یہ باپ کے برابر آدمی سے دوستی بھی تو عجیب سی بات ہے۔؟"

"یہ تم نے صحیح کہا مگر ہوا یوں کہ جب میں ظہر کی نماز پڑھنے دفتر کی مسجد میں گیا تو وہاں سوائے میرے سب نمازی ادھیڑ عمر کے تھے۔ ایک روز ظہر کی نماز کے بعد صوفی صاحب مجھ سے آکر ملے اور میری پابندی نماز پر خوشی کا اظہار کرنے لگے۔ چند روز بعد مجھے ایک دعوت نامہ دے گئے۔ دعوت درویش خانہ میں تھی۔ وہاں مجھے ان کے حلقۂ احباب سے ملنے کا موقع ملا۔ ہر چند وہ لوگ مُسن تھے، مگر میں اُن صوفیوں کی مجلس میں نہ جانے کیوں دلچسپی لینے لگا۔ دو چار دعوتوں میں شریک ہو چکا ہوں، اب ایک ضیافت مع قوالی صوفی صاحب کے ذمہ ہے جسے اُنھوں نے محض اس لیے اُٹھا رکھا ہے کہ تم دہلی آلو تو پھر اس کا اہتمام کروں گا۔" میں نے جھٹ کہا "تو جس ضیافت پر وہ مجھے مدعو کر گئے ہیں، وہ یہی ضیافت ہے۔؟"

مصطفٰے نے مسکرا کر کہا "نہیں، یہ تو اس ضیافت کا عشرِ عشیر بھی نہیں بس نہاری اور آم۔"

نہاری، پراٹھے اور دسہری آم کھانے کے بعد چلچلاتی دھوپ میں واپس کون آتا۔ دوپہر وہیں سو گئے۔ عصر کے وقت اُٹھے اور ان دو نمازیوں کے ساتھ مجھے بھی جا کر خانقاہ شریف میں نماز ادا کرنی پڑی۔ آموں کے ساتھ پھر دو دو ہاتھ کر رہے تھے کہ صوفی صاحب "ابھی حاضر ہوا" کہہ کر چلے گئے۔ قلفیاں لیے واپس آئے۔ مہمان نوازی ختم تھی ان پر۔

مگر قوالی کی ضیافت کے کیا کہنے۔ بڑے بڑے دیگچے دم کیے جا رہے تھے۔ دو چار آدمی پستہ کی ہوائیاں کاٹ رہے تھے۔ ایک بارش

بزرگ ان کے سر پر کھڑے آستینیں چڑھائے نگرانی کر رہے تھے۔ صوفی صاحب نے سب سے پہلے ہمارا تعارف انھیں سے کرایا۔ یہ میاں قمرالدین تھے جو بہت انکساری سے ملے اور کہنے لگے "آپ کا نام ہمارے لیے باعثِ فخر ہے۔" جدھر کھانا پک رہا تھا اُدھر سے کسی نے پکارا "میاں جی چاول دیکھ لیجیے۔" وہ ادھر کو مڑے اور ہم درویش خانے میں داخل ہوئے۔ دالان میں جھاڑ فانوس لٹک رہے تھے۔ کارنس پر پھولوں کے گلدستے رکھے تھے۔ دیواروں پر قرآن مجید کی آیتیں اور فارسی کے قطعے آویزاں تھے۔ چاندنی بچھی تھی جس پر دیوار کے ساتھ ساتھ کوئی ساٹھ ستر معزز صورتیں بیٹھی نظر آئیں۔ کھانا نہایت لذیذ اور پُر تکلف تھا۔ کچھ لوگ کھانے کے بعد رخصت ہوئے۔ سارنگی غلاف میں سے نکلی۔ طبلے کو درست کیا جانے لگا۔ صوفی صاحب نے آ کر ہم سے کہا "اب محفلِ سماع ہوگی۔ وضو کر لیجیے۔" میں حیران کہ یہ کیا۔ بادلِ ناخواستہ اُٹھ کر باہر آئے تو سارے مجلس میں شریک ہونے والوں کو آفتابہ لیے وضو کرتے دیکھا۔ میاں قمرالدین کے پکوان پر واہ واہ ہو رہی تھی، کیونکہ کھانا انہیں نے پکایا تھا۔ وہ دہلی کے پیشہ ور باورچی تھے۔

باوضو ہونے کے بعد ایک اور مصیبت یہ ہوئی کہ چاندنی کے فرش پر دوزانو بیٹھنا لازمی تھا۔ تھک کر جو کبھی گھٹنا اُوپر اُٹھ جاتا تو سامنے بیٹھے صوفی صاحب اشاروں سے گھٹنا نیچے کرنے کو کہتے۔ عجیب مصیبت میں جان تھی مگر تھوڑی سے لغت تک پہنچتے پہنچتے مجلس خُوب جم گئی۔ جامی کی غزل شروع ہوئی۔ قوالوں نے جب یہ مصرعہ گایا "چہ کردی از خودم بیگانہ کردی"، تو ایک صاحب نے جو دیکھنے میں اچھے خاصے سفید پوش تھے اپنی ران پر زور سے دوہتڑ مارا اور کہا "چہ کردی۔ از خودم بیگانہ کردی؟" قوال جان گئے کہ اس طرف کوئی صاحبِ دل بیٹھا ہے۔ اُنھوں نے پھر مصرعہ اُٹھایا "چہ کردی از خودم بیگانہ کردی"۔ صاحبِ دل نے پہلے دو چار بار مصرع دہرایا۔ پھر نہ جانے کس طرح بیٹھے ہی بیٹھے گھٹنے ٹیکے، پاؤں سے رقص سا کرتے ہوئے ہارمونیم کی طرف بڑھ کر قوال کا پاؤں چُھونے لگے۔ قوال نے تعظیماً پاؤں کھینچ لیا۔ ہارمونیم پر آنکھیں ٹیکیں اور جُھومتے جھامتے ویسے ہی رقص کرتے واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھے۔ جب تک حال طاری رہا قوال یہی مصرع گاتے رہے تاکہ صاحبِ دل جی بھر کے اس کیفیت کے مزے لُوٹ سکے۔ جب قوال اس شعر پر پہنچے کہ "ربودی دل زِ محبوبانِ عالم" تو ایک اور صاحب کو حال آگیا۔ بڑے چوڑے چکلے گھنی خشخشی داڑھی، سفید ململ کا کرتا، زبان سے پُکارے "ربودی دل زِ محبوبانِ عالم" اور سر سے چوگوشیہ ٹوپی اتار کر اپنے آگے دے ماری جیسے کوئی تاش کا پتّا پھینک کر کہے "یہ سر تو ہماری ہے"۔ اب یہ شخص قوالوں کی توجہ کا مرکز تھا جو بار بار یہی مصرع اس پر پھینک رہے تھے اور وہ پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کا چہرہ مسخ ہونے لگا۔ اس نے اپنی ران پر زور سے ہاتھ مارا۔ کہا "ربودی دل زِ محبُوبانِ عالم" اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ قوال بھی کھڑے ہو گئے۔ ساری مجلس اُٹھ کھڑی ہوئی۔ طبلے والے نے طبلہ اور ہارمونیم والے نے ہارمونیم پیٹ پر باندھ لیا، مگر اس دوران میں مجال ہے جو گانے کی رفتار میں ذرا بھی سُستی آئی ہو۔ مصرع متواتر گایا جاتا رہا۔ وہ شخص آنکھیں بند کیے بدستور جُھومتا رہا اور ساتھ والے نے بغل میں ہاتھ دے کر بازو سے تھامے رکھا تاکہ گر نہ پڑے۔ جب وہ بیٹھا تو مجلس بیٹھی۔ ابھی تک قوال یہی گا رہے تھے۔ "ربُودی دل زِ محبوبانِ عالم"۔ اب اُنھوں نے یہ دیکھ کر کہ حال چڑھاؤ سے اُتار پر آگیا ہے دوسرا مصرع گایا "حرام نازِ چوں زنکانہ کردی"۔ اُس شخص نے مصرع مکمل ہوتے ہی اپنا گریبان تار تار کر دیا اور آنکھیں بند کر کے پھر جُھومنے لگا۔

غرض یہ مجلسِ سماع کافی دیر تک جاری رہی۔ قوال ذرا دم لینے کے لیے رُکے تو چائے کا دَور چلا۔ اس وقفہ میں صوفی صاحب سے معلوم ہوا کہ جس شخص نے اپنا گریبان تار تار کر دیا تھا وہ چاندنی چوک میں ٹوپیوں کی دکان کرتا ہے اور جس صاحبِ دل پر پہلے کیفیت گزری تھی وہ دہلی کا بہت بڑا آڑھتی ہے۔ میں نے پوچھا "کچھ لوگ سماع کے دوران اُٹھ کر باہر کیوں چلے جاتے تھے اور تھوڑی دیر بعد

پھر آ بیٹھتے تھے۔؟"

صوفیوں کی اس جماعت کا تعلقِ خاطر پیروں کے کسی خاندان سے تھا۔ اکثر بڑے پیر صاحب اور چھوٹے پیر صاحب کی کرامتوں کا ذکر ہوتا رہتا۔ صوفی صاحب کے سب قریبی دوست بال بچوں والے تھے۔ صرف صوفی صاحب تنہا ایسے تھے جو آلائشِ دنیوی سے عمر بھر کنارہ کش رہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے بھائی بہنوں سے بھی قطع تعلق کیے بیٹھے تھے۔ میں نے ان دوستوں میں ایک دستور یہ بھی دیکھا کہ جمعرات کی جمعرات کوئی نہ کوئی "اپنا" ختم پڑھواتا۔ باریاں ٹھہرا رکھی تھیں۔ اس جمعرات کو صوفی صاحب نے حلوے پوری سے اپنا ختم پڑھوایا۔ میاں قمر دین اپنی جمعرات پر متنجن کا دیگچہ تیار کر کے لائے ساتھ سبز چائے ضرور ہوتی۔ آخر یہ کیوں؟ صوفی صاحب نے بتایا "پرایا پھر پرایا ہے۔ جیتے جی بات کرنے کے روادار نہیں۔ واللہ اعلم مرنے کے بعد کیا نقشہ ہو کوئی ختم پڑھوائے نہ پڑھوائے۔"

ان یارانِ باصفا کا جس سے دل ملتا اُس سے مل کر خوش ہوتے اور خوش رہتے۔ ان کا ٹھکانہ درویش خانہ تھا۔ وہیں مجلسیں جمتیں، دھمال ہوتی اور وہیں ہر جمعرات کوئی زندہ خود کو مردہ سمجھ کر اپنا ختم دلواتا۔ محفل میں صرف یارانِ دردمند ہوتے اور جس کی جمعرات ہوتی وہ اپنے دو چار ملنے والوں کو مدعو کر لیتا۔ درویش خانہ میں رہنے والے اپاہجوں کا حصہ الگ کر لیا جاتا۔

ایک روز صوفی صاحب کا ٹیلیفون آیا کہ مرزا حرمت بیگ اچانک حرکتِ قلب بند جانے سے فوت ہو گئے ہیں میت درویش خانے میں مغرب کے وقت پہنچے گی۔ نمازِ جنازہ کے لیے پہنچ جائیے۔ مرزا حرمت بیگ وہی بزرگ تھے جنھوں نے محفلِ سماع میں اپنا گریبان تار تار کر لیا تھا۔ رسمِ قل پر معلوم ہوا کہ وہ ہر سال وصیت نامہ تیار رکھتے تھے۔ کثیر الاولاد تھے۔ اپنی ٹوپیوں کی دکان لالہ اسلم کو اس شرط پر سونپ گئے کہ وہ کاروبار کی آمدنی کا نصف یتیم بچوں اور بیواؤں کو دیا کرے۔

صوفی صاحب کا مختصر سا حجرہ اب ہمارا جانا پہچانا تھا۔ پلنگ کے نیچے چائے کا سامان، بجلی کا چولہا، صراحی، کونے میں سوٹ کیس اور ٹرنک، آدھے حجرے میں چاندنی اور گاؤ تکیہ۔ کونے میں قلمدان اور پاس دفتر سے اُٹھائے ہوئے خاکی سفید سرکاری کاغذوں کے رجسٹر، جنتری اور دینیات کی موٹی موٹی کتابیں۔ دیوار پر ایک کیلنڈر اور الماری کے پاس ایک تصویر لٹکی رہتی۔ گھوڑے کی باگیں تھامے ایک خوبرو نو عمر لڑکا نشست میں بیٹھا ہے۔ پاس سائیس کھڑا ہے۔ میں نے ایک روز پوچھ ہی لیا "صوفی صاحب قریب قریب آپ کے سب احباب سے تعارف ہو چکا ہے مگر آپ نے اس تصویر کے متعلق کچھ نہیں بتایا کہ یہ کس کی ہے؟"

"یہ آگرہ کے ایک رئیس زادے تھے۔ مجھ پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ عین بھرپور جوانی میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ بس یہی ایک تصویر اُن کی یادگار ہے۔ اُن کے انتقال کے بعد میں نے آگرہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"نہ جانے کیوں طبیعت بالکل اچاٹ ہو گئی تھی۔ دلوں کی بستیاں اُجڑ کے کہیں بستی بھی ہیں۔"

سال بھر میں جس اتفاقیہ رخصتیں مل سکتی تھیں جو صوفی صاحب ختم کر چکے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ اجمیر شریف کے عرس پر جانے کے لیے سات روز کی رخصت مانگ رہے تھے جس کا ملنا محال نظر آ رہا تھا۔ افسر کے سامنے پیش ہوئے۔ اس نے درخواست پر نظر ڈالتے ہی کہا "تم اپنی رخصتیں ختم کر چکے ہو اور اب عرس پر جانے کے لیے سات روز کی رخصت اور مانگ رہے ہو۔ یہ بہت مشکل ہے۔"

صوفی صاحب نے جواب دیا "سرکار یہ صحیح ہے کہ میں رخصتیں پوری کر چکا ہوں مگر صابر کلیر والے نے بلوایا ہے۔ یہ بندہ انکار کیسے کر سکتا ہے۔"

افسر نے حیران ہوکر کہا "کلیر والے نے بُلوایا ہے ؟"

"جی ہاں۔ اُنھوں نے توجہ فرمائی ہے، اِسی لیے تو میں نے درخواست دی ہے۔ اب پاکستان بننے والا ہے۔ طرح طرح کی اُڑتی اُڑ رہی ہیں۔ واللہ اعلم اس بُلاوے میں کونسا بھوتنی ہے۔ سرکار میں درگاہ شریف پر ضرور حاضری دینا چاہتا ہوں۔"

صوفی صاحب کا اعتقاد کام کرگیا یا افسر کا اپنا کوئی جذبہ۔ بہرحال پانچ روز کی رخصت مل گئی۔

عرس پر جانے سے پہلے چاندنی چوک میں ان سے ملاقات ہوئی اور اس کے بعد کیا کچھ ہوا۔ شہر میں ایک اندھیر تھا۔ دن رات فسا ہو رہے تھے۔ آج اس کے گولی لگی، پرسوں وہ مارا گیا۔ پہاڑ گنج میں کسی قتل کی واردات سن پاتا تو یارانِ طریقت کی ٹولی یاد آتی۔ ایک دن اچانک صوفی صاحب کا ٹیلیفون آیا کہ "میاں قمردین اور اس کا بیٹا قتل کر دیئے گئے۔ میاں قمردین کی وصیت کے مطابق میت درویش خانہ میں دفن ہوگی۔ نمازِ جنازہ کی اطلاع ہے۔"

صوفی صاحب کی آواز میں کوئی لرزہ نہ تھا۔ کوئی غم نہ تھا، کوئی رقت نہ تھی۔ وہ مجھے اپنے دوست کے مرنے کی یوں اطلاع دے رہے تھے جیسے برادری کا ڈوم ایک ڈھیکے کے مرنے کی اطلاع دیتا ہے۔ مجھے صوفی صاحب کے جذبہ سے عاری لہجہ پر افسوس بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔ میں نے کہا "دیکھئے صوفی صاحب! آپ جس قدر جلد ہو سکے درویش خانہ کو چھوڑ دیجئے۔ یہ علاقہ اب خطرے سے خالی نہیں رہا۔"

"آپ فکر نہ کیجئے جو ہوگا خدا کی طرف سے ہوگا۔ موت کی جگہ اور وقت مقرر ہے۔" لہجے میں عجیب قسم کی مجاہدانہ بے نیازی تھی ٹیلیفون رکھ دینے کے بعد میں سوچنے لگا۔ یہ افراتفری کے دن۔ میاں قمردین کا ختم پڑھوانا اب کسے سوجھے گا۔ اچھا ہوا مرحوم اپنے ختم آپ پڑھ گئے، اور پھر میاں قمردین نے اپنی وصیت بھی لکھوا رکھی تھی۔ اس کے قتل ہونے پر صوفی صاحب کے لہجہ میں افسوس اور ہمدردی کا شائبہ تک نہ تھا۔ یہ میرے لیے حیرت کا باعث تھا جیسے صوفی صاحب کو پہلے سے معلوم ہو کہ وہ قتل ہونے والا ہے۔ اس ٹولی کا ایک ایک شخص مجھے پُراسرار طور پر فسادیوں اور بلوائیوں کا سرغنہ معلوم ہونے لگا۔

میں اچھے وقت پاکستان چلا آیا۔ بعد کی خبریں بہت دہشت ناک تھیں۔ واللہ اعلم درویش خانہ پر کیا گزری اور ہمارا دوست کے قائل صوفی صاحب کا کیا انجام ہوا۔

تین سال بعد کراچی جانے کا اتفاق ہوا۔ ریڈیو سٹیشن پر چند دوستوں سے گپ شپ ہو رہی تھی کہ میز گھبرایا ہوا آیا اور بولا، کوئی آدھ گھنٹہ کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ اگر بیٹھنا چاہتے ہو تو بیٹھے رہو، چلنا چاہو تو آ جاؤ۔ میں اُٹھ کر ساتھ ہو لیا۔

ہماری کار یشمن بائی کو لینے کے لیے جا رہی تھی۔ یشمن بائی ایک گانے والی تھی۔

اُس نے میز سے کہا: "آپ کو اتنی گرمی میں آنے کی زحمت ہوئی۔ تشریف رکھیے۔ آپ کے لیے لیمنیڈ منگاتی ہوں۔ یہ سگرٹ پیجیے۔" اس نے نوکر سے لیمنیڈ لانے کو کہا اور خود تیار ہونے کے لیے اندر چلی گئی۔ ہم کمرے میں سے اُٹھ کر باہر جا فری کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ اوپر جانے والی سیڑھیوں کے نیچے ایک ڈربہ سے ملتی جلتی جگہ تھی جس میں عام طور پر لوگ ایندھن پھینک دیتے ہیں۔ مگر اس میں نہ لکڑیاں کا گٹھا نہ کوئلے کی بوری۔ صرف ایک پُرانا ٹرنک اور ایک گھسا ہوا تھیلا رکھا تھا جس پر دری میں لپٹا ہوا تکیہ پڑا تھا۔ ادھر گھٹنوں کو مارنے کے لیے ایک چارپائی دھوپ میں اُلٹی رکھی تھی ادھر ایک پھٹی پُرانی چٹائی کا ٹکڑا بچھا تھا جس پر اگلے وقتوں کی چھپی ہوئی دو چار کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ جیسے کوئی پڑھتا پڑھتا ابھی اُٹھ کر گیا ہو۔ جیسے کوئی چیز مجھے پوچھنے پر مجبور کر رہی ہو میں

نے منیر سے پوچھا" یہاں کون رہتا ہے ؟" منیر بولا یہاں ایک عجیب و غریب شخص رہتا ہے کسی چھاپہ خانہ میں ملازم ہے۔ اپنی ساری تنخواہ لا کر نشیمن بائی کے ہاتھ میں دے دیتا ہے اور جو سلوک اس کے ساتھ ہوتا ہے خدا کرے کسی کے ساتھ نہ ہو۔ پورا مہینہ نشیمن بائی کے رحم و کرم پر پڑا رہتا ہے۔ اس کی مرضی ہو تو کچھ دے دے، نہ ہو تو نہ دے۔"

اس پھٹی پرانی چٹائی کے ٹکڑے میں جیسے کوئی مقناطیسی کشش تھی۔ میں آگے بڑھا۔ ایک کتاب اُٹھا کر دیکھی۔ تصوف کے مسائل تھے، پھر دوسری اُٹھائی، سرورق اُلٹا پہلے صفحہ پر لکھا تھا "صوفی حاکم علی، دہلی"۔ اس کے نیچے ایک لکیر تھی اور یہ شعر ؎

زر کوئے نیک نامی ما را گزر ندادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

ذکر لیمنیڈ لے آیا اور ہم کمرے میں واپس آ گئے۔ دوسرے دروازے سے نشیمن بائی تیار ہو کر آ گئی" آپ لیمنیڈ تو پئیں ؟"

مَیں نے کہا" جی ہاں پیتا ہوں۔ یہاں آپ کے برآمدے میں جو شخص رہتا ہے اس وقت کہیں باہر گیا ہوا ہے ؟"

نشیمن نے کچھ عجیب کراہت کے ساتھ مسکرا کر کہا" صبح سے میرا مرغا نہیں مل رہا تھا، اُسے ڈھونڈنے گیا ہے۔ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں ؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔ بس ایسے ہی۔ نام کیا ہے اُس کا ؟"

"صوفی صوفی کہتے ہیں۔ گم سم ہو کر بیٹھا رہتا ہے۔ جمعرات کی جمعرات اپنا ختم پڑھواتا ہے۔ عجیب ہونق سا آدمی ہے۔ اوہو، آپ پانی تو پئیں۔"

میں لیمنیڈ کا گلاس ایک ہی سانس میں چڑھا گیا اور کار میں آ بیٹھا۔ راستہ بھر سوچتا رہا، یہ نیا مسلک کیسا ہے۔ صوفی صاحب طرن کو نہ طوں۔ وہ کس منزل سے گزر رہے تھے۔ اس حسرتناک نفس کشی میں کونسا رُوحانی پہلو مخفی تھا۔ کونسا بے قرار جذبہ تھا جس کی مچلتی ہوئی موج نے یہ پیمانہ ڈھونڈ لیا۔

ستمبر ۱۹۵۱ء

ترچھی چھت والے اوپر کے کمرے کو لکڑی کے پھٹوں سے تقسیم کیا گیا ہے ہر منزل کیلئے ایک پورشن مختص ہے۔ اور ہر پورشن کی حفاظت کیلئے ایک آڑ لگا ہوا ہے۔ یقیناً یہاں پر پرانے گھر بنے ہوں گے۔ فوٹو البم اور ڈائریاں آ گئیں۔
کوئی شخص ہر دو ہفتوں کے بعد ترچھی چھت والے اوپر کے کمرے پر جھاڑو دیتا ہے۔

عکس تحریر۔ ڈاکٹر منیر الدین

# اُجالا

ابوسعید قریشی

فضا میں فاختاؤں کے پر بکھرے ہوئے تھے۔ سڑکیں نیلی رگوں کی طرح پھیلی ہوئی تھیں اور دُھند کے پیچھے بجلی کے بلب اپنی ہی راکھ میں لپٹے ہوئے کوئلوں کی مانند نظر آ رہے تھے۔ پہاڑوں کے خطوط جنہیں دیکھ کر فاصلہ کا احساس ہوا کرتا تھا، یوں مٹ گئے تھے جیسے سلیٹ پر اسفنج پھیر دیا جائے —— زمین تھی نہ آسمان، اُفق تھا نہ شفق، سمت کی خبر تھی نہ سمے کا احساس، اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں اُس صحت افزا مقام کے شمال میں صدیوں کی برف سے ڈھنپا ہوا مردہ پہاڑ ہوں، جس کے گرد ازلی دھند کے پردے پڑے ہوئے تھے، جس کی چوٹی کبھی نظر نہیں آتی تھی، جو گڈریوں کی کہانیوں کے مطابق آسیب زدہ تھا۔ جیسے کسی فقیر کی بددعا تھی کہ جا تیرے اوپر سورج کبھی نہیں چمکے گا، جس کی خودنمائی کی تمام کوششیں اس طلسمی بادل کے بگولوں کی گود میں سر ٹپک رہی تھیں جو اس کے گرد اَن گنت صدیوں سے گھوم رہا تھا —— اور کون جانے کہ وہ تھا بھی یا نہیں۔

متواتر تین دن سے موسم کی یہ کیفیت تھی جیسے ہواؤں کے سوتے سوکھ گئے ہوں، چیڑ کے جنگل جن کی سائیں سائیں اپنی غریب کانوں کو خاص کشش تھی، چپ سادھے کھڑے تھے۔ خبر ملی تھی کہ دھند سے فائدہ اُٹھا کر نیچے گوالوں کی بستی سے ایک چیتا گائے مار گیا ہے اور ریچھ ایک عورت کو زخمی کر گیا ہے۔ ایسے میں جب ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہ دے، بھلے چنگوں کا دم گھٹنے لگتا ہے اور میں تو پہلے ہی "کلوسٹرو فوبیا" کا مریض رہ چکا تھا۔ سانس گھٹنے لگا اور میں باہر نکل آیا۔ دھند میں لپٹی ہوئی آوازیں کہہ رہی تھیں "ایسی دھند پہلے کبھی نہیں دیکھی۔"

"ہوا چلے یا برس جائے ——"

"موتیا اُتر آیا ہو جیسے آنکھوں میں"۔

"تین دن کی ہو گئی رات!"

"برستا ہی نہیں، کھُلتا ہی نہیں"

"اللہ میرے ——!"

دفعتاً پھوار سی پڑنے لگی۔ کسی نامعلوم سمت میں چمک سی ہوئی۔ پھوار تیز ہو کر بوچھاڑ بن گئی —— اور پھر آسمان پھٹ پڑا۔ میں لپک کر بازار کے ایک برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سڑک کی پہاڑی دیوار آبشار بن گئی۔ بجلی چمکی، کڑکی اور اُس کی آواز غاروں، کھڈوں اور وادیوں میں لہراتی ہوئی جانے کہاں نکل گئی، پرنالے غرّائے اور گرجنے لگے۔ برآمدے کی چھت ٹپک پڑی۔ "اندر تشریف لے آیئے" کسی نے کہا۔

لیکن میں اپنے خیالات میں غرق تھا —— اُداسی، تنہائی، قدرناشناسی، اپنوں کی بیگانگی، بیگانوں کی بے مہری، غریبی... مختصراً

بلاؤں کا ہجوم تھا۔۔۔ یہ دعوت میرے لئے کیوں کر ہو سکتی تھی؟ میں نے اپنے سر پر رومال پھیر کر پانی پونچھا اور ٹپکے کی زد سے ذرا پیچھے ہٹ گیا: "اندر آ جائیے ناب۔ یہ بارش تو تھمتے ہی تھمے گی" وہی آواز پھر سنائی دی۔

اس آواز میں بچپن اور بڑھاپے کا کچھ عجیب امتزاج تھا۔۔۔ مرا دھیمے، آواز مدہم۔۔۔ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔

چھوٹے باداموں جیسی دو آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں اور اُن کے کونوں پر اُڑتی ہوئی چڑیوں کے پروں جیسی جھرّیاں کنپٹیوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ پلکیں قریب قریب غائب تھیں اوپر جھاڑ سی بھویں، ناک چھوٹی لیکن بھدی نہیں تھی، ہونٹوں پر مسکراہٹ کا نقش جما ہوا تھا، جلد پرانے ہاتھی دانت کی طرح زرد تھی۔ خدوخال سے ہٹ کر جب پورا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک چینی کا چہرہ تھا۔۔۔ اُس کی آواز میں بچپن کی کھنک مجھے یقین دلا گئی تھی کہ اس کی دعوت میں بناوٹ نہیں تھی۔

دروازہ کھلا تو میں نے دیکھا کہ ایک کفش دوز کے شوروم میں کھڑا ہوں، مگر کچے چمڑے کی بدبو کی بجائے ایک خاص قسم کی خوشبو آ رہی تھی، جیسے نافہ، صندل، حنا اور چمڑا ایک ساتھ سلگ رہے ہوں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ یورپ میں اُمرا کے لئے چمڑے کا عطر کھنچتا تھا کہاں؟ میں سوچنے لگا۔۔۔ مگر "بیٹے" کی آواز مجھے کتابوں کی دنیا سے کھینچ لائی۔

"اندر تشریف لے چلیے!" اُس نے دوکان کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔

میرے سامنے ایک پرانے چینی سکرین کی عمودی تکونیں لہروں کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔۔۔ پورا اُفق تھا جس میں پہاڑ، ندیاں، بید مجنوں، جھونپڑے، مندر، دھان کے کھیت۔۔۔۔ کسی خواب کی طرح پھیلے ہوئے تھے اور مینا کاری کے ایک تختے پر بانسوں کے جھنڈ تلے، لمبے لبادے والا ایک چینی کتار لئے، آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر تبسم کی لکیر اِس بات کا پتہ دے رہی تھی کہ اس نے سارے منظر کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے اور اب وہ وجدان کی اس ساعت میں گم ہے جس میں جسم تحلیل ہو جاتا ہے، صرف روح باقی رہ جاتی ہے اور کائنات کا ضمیر اپنے ملبوسات اتار کر سیاروں کی موسیقی، نور کا جھالا اور خوشبو کی موج بن جاتا ہے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں دیوارِ چین کے اس طرف آگہی کی دہلیز پر کھڑا ہوں اور ابدیت کا طلسم مجھے اپنی آغوش میں لے رہا ہے۔ ایسے میں وہی آواز پھر سنائی دی لیکن بوڑھا غائب ہو چکا تھا۔

"یہ سکرین میرے باپ کو اس کے باپ نے دیا تھا" یہ ایک بچے کی آواز تھی جو اپنی سالگرہ کا تحفہ اپنے ساتھیوں کو دکھا رہا ہو۔

"آئیے، آئیے!۔۔۔ یہ میرا لِونگ روم ہے"

سکرین کے پیچھے، کمرے میں بید مجنوں کا ایک صوفہ رکھا تھا۔ چینی کشیدہ کاری کی گدیاں۔۔۔ ایک طرف بستر تھا۔ نیلے پلنگ پر ایک ریشمی اژدہا کنڈلی مارے لیٹا ہوا تھا جیسے دھوپ سینک رہا ہو۔ فرش پر ایک چینی قالین کا ٹکڑا اپنی پائمالی کا اعلان کر رہا تھا صوفے کے پاس ہی کتابوں کی ایک الماری تھی۔ میں عادت سے مجبور عنوان دیکھنے کے لئے جھکا۔

"بس نام ہی کی لائبریری ہے" اس نے ہنستے ہوئے کہا "یہ تو سب ولایتی کیٹالاگ ہیں۔ یہ کچھ میری فنّی کتابیں ہیں۔ البتہ یہ چند کتابیں ضرور نایاب ہیں۔۔۔ ایک تو چینی کتابیں یہاں ملتی نہیں۔ دو چار نسخے جو ساتھ آ گئے تھے۔ اُن میں بس برائے نام ہی اضافہ ہوا ہے۔۔۔ یہ تو رہا کنفیوشس۔ اور یہ چین کے کچھ گمنام شاعروں کا کلام ہے۔ کام زندہ، نام نامعلوم!"

"کس قدر ستم ظریفی ہے قدرت کی!" میں نے کہا "زندوں کو مار کر اُن کے مزار بنائے جاتے ہیں۔ بے چارے شاعر کے لئے کتنی سنگدلی ہے، ستم ظریفی ہے، ستم ہے صریحاً!!"

جی ہاں۔۔۔ بظاہر" اس کی آواز کا بڑھاپا لوٹ آیا "لیکن اگر یہ اشعار نام کے لئے لکھے گئے ہوتے تو شاید شاعر کے ساتھ آج ان کا بھی

نشان نہ ملتا ۔۔۔ یہ دیکھئے، سنئے ۔۔۔ ترجمے میں آدھی بات تو خبط ہو جاتی ہے تاہم کوشش کرتا ہوں" وہ گنگنایا "جی تو کہتا ہے:

"اے منزلِ مراد
تجھے میری تمناؤں کی قسم
مجھ سے ہر قدم دور ہوتی چلی جا
ورنہ تیری راہیں سنسان ہو جائیں گی"

"اب آپ ہی کہئے یہ شعر ادا "تا" کی خاطر کہا جا سکتا تھا؟" اس نے ایک آہ کھینچی اور کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔ لیکن اس کی نظر کہیں نہیں ٹھہر رہی تھی، جیسے اُن اوراق کے پیرہن میں وہ اپنے نقشِ قدم دیکھ رہا تھا، تہذیبوں کے کارواں جو اس سنسان راستے کو آباد کرتے چلے آئے تھے۔

بادل نقارے کی مبہم آواز کی طرح گرجا اور میرا ساتھی چونک پڑا "سو یہ قصہ ہے صاحب" اس نے کتاب الماری میں رکھی اور ایک اور کتاب اٹھائی "یہ بائبل ہے فادر جون کی نشانی۔ مشنری تھا ۔۔۔ بچپن میں، کہاں کہاں پہنچے ہیں یہ لوگ! ۔۔۔ ایک اسکول بھی کھول رکھا تھا، نچلے طبقے کے بچوں کے لئے۔ یہ جو ٹوٹی پھوٹی انگریزی مجھے آتی ہے میں نے وہیں سیکھی تھی۔ بڑا زوردار آدمی تھا فادر جون۔ مجھے موچی کے پیشے سے نفرت تھی، مگر فادر جون نے کہا کہ دنیا کا کوئی پیشہ ذلیل نہیں ہے۔

کرائیسٹ بڑھئی تھا..... دنیا میں اگر موچی نہ ہوتے تو لوگ ننگے پاؤں پھرتے، راستے کے کانٹوں اور پتھروں سے تلوے مجروح ہو جاتے اور جراثیم سے پک کر ناسور بن جاتے ۔۔۔ مگر میں تو چائے بنانے کا ارادہ کر رہا تھا آپ کے لئے" اور وہ اٹھنے لگا۔

"چائے کی چنداں ضرورت تو ہے نہیں" میں نے کہا۔

"مگر ہے ضرور، شمال کی ہوا ہے صاحب۔ اُن پہاڑوں کی برف تو کبھی پگھلی ہی نہیں۔ جاڑے برس سے تو میں دیکھ رہا ہوں خانہ جنگی کی ابتدا تھی، باپ میرا اُن دنوں بسترِ مرگ پر تھا۔ کہنے لگا تم جاؤ بیٹا، جس ملک کے لوگ آپس میں لڑنے مرنے لگیں، اس میں رہنا بے کار ہے بس ایک بات یاد رکھنا اپنے کام کے بارے میں، ہاں اور وہ یہ ہے کہ اگر آج تم نے دوسرے درجے کی چیز قبول کر لی تو کل دنیا تیسرے درجے سے مطمئن ہو جائے گی اور برسوں اس سے نچلا درجہ تم کو خوش کر دے گا اور ایک دن تم اصطلاحی "موچی" بن جاؤ گے اور زندہ پاؤں کے لئے لباس تیار کرنے کے بجائے مُردہ جانوروں کی کھالوں کے درزی رہ جاؤ گے۔ ہمارے اور تمہارے فن کو فخر سے دکھانے کے بجائے لوگ تمہیں گالیاں دیں گے کہ انہوں نے دام دے کر تم سے اذیت خریدی"

اس نے سٹوو میں سپرٹ ڈالی، دیا سلائی دکھائی اور پمپ کر کے اینمل کی کیتلی میں پانی لے آیا۔

"بڑی غریب نواز ایجاد ہے" اس نے سٹوو کے نیلے شعلوں پر اطمینان آمیز نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ اس کی باتوں میں مجھے لطف آنے لگا تھا۔ اس بوڑھے موچی کے پیچھے ایک پرانی تہذیب کی روایات یوں ہی تھیں، تہذیب جو انقلاب کی زد میں آ کر اب ایک نئی شکل اختیار کر رہی تھی اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ تکمیل کے بعد وہ کیا رنگ اختیار کرے گی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اسی رو میں باتیں کرتا رہے اور ایجادوں کی دنیا سے نکل آئے۔

"چیز تو اچھی ہے یہ سٹوو" میں نے کہا "بس پھٹ جاتا ہے کبھی کبھی"

جواب ملا "استعمال کرنے والے کا قصور! اس کا قصور جو یہ چاہتا ہے کہ ضروری مدارج طے کئے بغیر سب کچھ فوراً ہو جائے، جو یہ چاہے

جاننا کہ اس میں کس طرح اور کتنی ہوا بھرنی چاہیئے ـــــ نتیجہ معلوم۔"

"مگر اتنا تردّد کرنے کے بجائے آدمی بجلی کا چولہا ہی کیوں استعمال نہ کرے" ؟ میں نے کہا۔

"بے تو گستاخی" اس نے جواب دیا۔ "مگر اس کے ساتھ بھی تو خاص وائرنگ، خاص میٹر کا تردّد موجود ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ بجلی کا چولہا مجھے کبھی پسند نہیں آیا۔ بس سُلگتے رہو اندر ہی اندر، گُڑھتے رہو پیچ ہی پیچ میں حتیٰ کہ کام تمام ہو جائے۔ آگ وہ کہ شعلے لپکیں اور دنیا دیکھے۔ یہ کیا کہ پیچ ہی پیچ میں، روئی کی طرح۔ اُس وقت پتہ چلے جب سب کچھ خاک ہو جائے ـــــ ہم چینی خوب زبان چٹخا چٹخا کر کھاتے ہیں ـــــ یہ بدتمیزی ہے جی، کچھ لوگ کہیں گے ـــــ ہم کہتے ہیں چوری کا مال تو نہیں کھا رہے کہ دانت پیس پیس کر، ہونٹ بھینچ کر، چپ چاپ زہر مار کرو کفرانِ نعمت ہے یہ جناب! دیکھ لیجئے گا ایک دن بے کار ہو کر رہ جائیں گی چکھنے اور سونگھنے کی حِسّیں۔ باپ میرے کی تو یہ کیفیت تھی کہ ذرا سی تکلیف ہوئی تو وہ شور مچایا کہ گھر بھر کو سر پر اُٹھا لیا۔ اب ایسا بھی کیا، مگر نہیں وہاں جواز موجود تھا کہ بھئی جب تم قہقہے لگا لگا کر، ناچ کر اپنی خوشی میں دوسروں کو شریک کرتے ہو تو رو رو کر، چیخ کر اپنی تکلیف کیوں دوسروں میں تقسیم نہ کرو؟"

"کیا آپ بھی اُن کی تعلیم پر عمل کرتے ہیں؟" میں نے شرارتاً پوچھا۔

جواب ملا "جی نہیں، میں وحشی بن چکا ہوں۔"

اس نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا اور ہنستے ہنستے اپنا پیٹ تھام لیا، لیکن یہ دورہ جس بے ساختگی سے پڑا تھا، اسی طرح اچانک ختم ہو گیا جیسے بجلی کی رو بند ہو جائے۔ "لیجئے چاء تیار ہو گئی۔"

کیتلی گنگنا رہی تھی۔ وہ گنگنانے لگا۔

"ہاں صاحب، ایک بات پوچھوں؟ اس کا تسلی بخش جواب مجھے کبھی نہیں ملا۔ شاید آپ بتا سکیں۔ ہم تو چائے میں شکر ڈالنے کے قائل ہی نہیں، دودھ نہ شکر، مگر یہ بتایئے کہ شکر کو چینی کیوں کہتے ہیں؟" اس نے نہایت متانت سے پوچھا۔ اتنی متانت سے کہ مجھے حیرت ہوئی۔ یہ وہی شخص ہے جس نے ابھی چند گھنٹے ہوئے اتنا زوردار قہقہہ لگایا تھا۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے، آنکھیں سکڑی ہوئی تھیں، ماتھے پر بل تھے، جیسے وہ کسی نہایت ہی پیچیدہ مسئلہ کا حل چاہتا ہے۔

"سچ تو یہ ہے کہ میں نے کبھی غور نہیں کیا اِس سوال پر" میں نے لاعلمی کا اظہار کیا، لیکن اس کا بظاہر یہی جواب ہو سکتا تھا، فیکٹری کی شکر چینی پورسلین کی طرح سفید ہوتی ہے۔ شاید اس لئے چینی کہلاتی ہے۔"

"شکر بھی چینی، برتنوں کی مٹی بھی چینی اور چینی بھی چینی ـــــ ہم لوگ یہاں بہت ہر دلعزیز ہیں" اُس کی مسکراہٹ پھیل کر سمٹ گئی جیسے ماہر پتنگ باز ڈور کو حسبِ منشا ڈھیل دے کر کھینچ لیتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ واقعی موچی ہے۔ جس پیشے کو حقیر اور ذلیل سمجھا جاتا ہے؟ اگر یہ واقعی موچی ہے تو ایسے دس بیس موچی ہر شہر میں ہونے چاہئیں، جن سے آدمی جینے کا سلیقہ سیکھ لے۔

اس نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگائی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے فیروزی پیالی پر انگلی جھنکار اٹھا ہو۔ وہ سمجھ گیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔

"معاف کیجئے گا، ہم چینی لوگ خاموشی سے چاء نہیں پی سکتے، لطف ہی نہیں آتا ویسے ـــــ میرا باپ کہا کرتا تھا کہ چاء دانی کو ٹی کوزی میں رکھو اور شراب کی بوتل کو برف کی بالٹی میں، ورنہ دونوں کی تاثیر بدل جائے گی۔ شراب گرم ہو تو حنطل ہونے لگتی ہے، چائے شیر گرم ہو تو اس سے بدمزہ مشروب دوسرا نہیں ہو گا۔"

"صولۃً تو میں بھی آپ کا ہم نوا ہوں" میں نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی، "لیکن مصیبت یہ آن پڑی ہے کہ تہذیب یافتہ سوسائٹی میں یہ معیوب

سمجھا جاتا ہے کہ ہم عمر بھر گزر کے چاہتیں۔

اگر بوڑھا منگ آج یہاں ہوتا ـــــ شاعر تھا، دیوانہ، مجذوب ـــــ کہتا۔ وہ تہذیب معیوب ہے عریاں ہے فحش ہے جو ایسی غیر فطری باتیں ایجاد کرتی ہے اور ان کے موجدوں کو اپنی فصد کھلوانی چاہیئے۔" وہ ہنسا۔ اس کی آنکھیں کہیں ماضی کے نظاروں میں گم ہوگئیں "خوب آدمی تھا یہ منگ بھی! خاص خاص علاقوں میں دن بدن بھر صدا لگاتا پھرتا تھا کہ فصد کھلوالو! ـــــ مگر فلسفہ میں چاہ ٹھنڈی ہوگئی۔ ہم لوگ تو دراصل ایک وقت میں ایک ہی کام کرنے کے قائل ہیں۔ مثلاً مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ جوتے ہی بناتا جاؤں اور ساتھ ساتھ چائے بھی پیتا جاؤں ـــــ چائے کا مزہ تو قطعاً نہیں آئے گا۔ رہا جوتا تو کسی کے پاؤں میں ہونے کی بجائے میرے سر پر ہوگا ـــــ کھٹ سے!" وہ ہنسا اور اپنی چندیا سہلانے لگا۔

جوتوں کا ذکر آیا تو میں نے اُس سے رسماً ہی پوچھ لیا کہ کاروبار کا کیا حال ہے۔ جواب ملا "جسم و جان کا رشتہ برقرار ہے۔ اس سے زیادہ کاروبار کی کوئی اہمیت نہیں۔"

"تاہم" میں نے اسے چھیڑنے کے لئے کہا "مشینوں کے اس زمانے میں جب دن میں دس دس ہزار جوڑے ڈبوں میں بند ہوکر دکان میں پہنچ جاتے ہیں ـــــ"

اس نے میری بات کاٹی "جب تک دنیا میں ذوقِ سلیم کا ایک ذرہ بھی موجود ہے اور جب تک آدمی یہ جانتا ہے کہ اس کے پاؤں بھی اس کے زندہ جسم کا حصہ ہیں، اُسے میرے یہاں ہی آنا ہوگا ـــــ چل کے!" اُس کے ہونٹوں پر چند شرارت بھری شعاعیں ناچیں اور غائب ہوگئیں "مشین آدمی کے ہاتھوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی جناب! دنیا میں کروڑوں انسان بستے ہیں اور ایک کی شکل دوسرے سے نہیں ملتی۔ چہروں کی طرح پیروں کے بھی خدوخال ہیں۔ بے روح مشین اُن کی قوسوں کو کیا سمجھے گی! ایک پاؤں کا جوتا ایک ہزار کے پاؤں میں کیسے پورا آسکتا ہے پاؤں کی صورت مسخ ہو جائے گی، چال کا بانکپن ختم ہو جائے گا، قامت کا حُسن جاتا رہے گا ـــــ ذرا جوتا کھولئے اپنا۔"

قبل اس کے کہ میں اس کی فرمائش پوری کرتا وہ کرسی سے اُچک کر گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گیا اور میرے جوتے کے فیتے کھول ڈالے۔

"بہت عمدہ جوتا ہے! نہایت اچھا ہاتھ ہے کاریگر کا، لیکن معاف کیجئے گا۔ ریڈی میڈ ہے اور یہ ربڑ کے سول؟ جسم میں جو بجلی پیدا ہوتی ہے اُس کو روک لیتے ہیں، جس کا صحت پر بُرا اثر پڑتا ہے ـــــ اس کے علاوہ اپنا پاؤں دیکھئے؟ ہلکا ہے اور جوتا بھاری ـــــ اور پھر یہ ہڈی دیکھی آپ نے؟ شاید بچپن میں چوٹ آگئی تھی۔ قدرت نے ایک اور تہہ چڑھا دی، مگر اس جوتے میں اس کے لئے گنجائش نہیں رکھی گئی۔ فیتہ ڈھیلا باندھنا پڑتا ہوگا آپ کو؟"

"کس کر باندھوں تو پاؤں دُکھتا ہے۔"

"بس اس سے نتیجہ نکال لیجئے ـــــ مگر ٹھہریئے۔"

اس نے بک کیس میں سے ایک بہت بڑی البم نما کتاب نکالی۔ "یہ آرڈر بک ہے میری۔"

کفش دوز کی آرڈر بک کی بجائے وہ کسی سرجری کی درسی کتاب معلوم ہوتی تھی، جس میں طرح طرح کے پاؤں بنے ہوئے تھے، یا کسی مصوّر کی سکیچ بک، جس نے اپنے موضوع میں رنگ بھرنے سے پہلے ہر زاویہ سے اس کے خاکے بنا لئے تھے۔

"ملاحظہ کیا آپ نے؟ ایک کا پاؤں دوسرے سے نہیں ملے گا، بلکہ ایک ہی آدمی کا پاؤں اس کے دوسرے پاؤں سے نہیں ملتا ـــــ اب دیکھئے کسی کی انگلیاں چھوٹی ہیں کسی کی لمبی! یہ موٹی ہیں یہ پتلی! کسی کا خم زیادہ ہے کسی کا کم! یہ ایک خاتون کا پاؤں ہے، جب گرمیاں گزارنے یہاں آتی ہے تو مداحوں کے آہوں کے دھوئیں سے دھند بڑھ جاتی ہے ـــــ مگر۔ فلیٹ فُٹڈ ہے" اس نے ڈرامائی وقفہ کے بعد کہا "قدرت کی اس ستم ظریفی کو

چھپانے کے لئے آدمی کا آرٹ کام آتا ہے۔ آرٹ کا مقصد بدصورتی کو چھپانا اور حُسن کو اُبھارنا ہے۔ اس طرح آرٹ اور اُس کے ذرائع حسن کی جستجو اور بالآخر مدعا اور صلہ بن جاتے ہیں۔"

باہر بجلی چمکی اور مکان کے درودیوار ہل گئے۔

"دُگری کہیں" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"اُجالا کر گئی" میرے میزبان نے ذو معنی انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے کھڑکی کے شیشوں سے جھانک کر دیکھا۔ دھند کی سیاہی کافی حد تک کم ہو چکی تھی، روئی جیسے بادلوں میں حرکت کے آثار تھے اور کہیں کہیں اُن کے پیچھے پہاڑوں کے خطوط سے پتہ چلتا تھا کہ کائنات ابھی روئی کے گالوں میں تبدیل نہیں ہوئی۔

میں نے سگریٹ کیس نکال کر اپنے ساتھی کی طرف بڑھایا۔

"جی نہیں۔ شکریہ۔ مجھے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ اس کا خیال آئے ـــــ نقشِ پا کی دلفریبیاں مجھے مسرہی کہاں اٹھانے دیتی ہیں ـــــ اِن ہتھیلیوں پر کیسے کیسے پاؤں نہیں سستائے۔" اس نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور آہ بھرتے ہوئے بولا۔ "مگر ایسا کوئی نہ ملا جس کے پاؤں سینے سے لگا لینے کی تمنا پیدا ہوتی۔ آنکھوں سے مَلنے کو جی چاہتا ـــــ آپ کہیں گے کہ یہ چینی جذباتی ہو گیا ہے۔ یہ موچی! ـــــ مگر یہ حقیقت ہے اور سچ تو یہ ہے کہ کون جانے کوئی ایسا ہے بھی کہ نہیں۔"

"کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حُسن کا کوئی وجود ہی نہیں ہے؟ کوئی حقیقت ہی نہیں ہے حسن کی؟" میں نے اُسے چھیڑنے کے لئے پوچھا۔

"اتنا سہل نہیں ہے اس کا جواب ـــــ آیئے، میرے ساتھ آیئے!"

وہ مجھے شوروم سے ملحق ایک کمرے میں لے گیا۔ چمڑے، صندل اور حنا کی ملی جلی خوشبو جس کا مجھے دوکان میں داخل ہوتے وقت احساس ہوا تھا یہیں سے آ رہی تھی۔

"یہ میرا معبد ہے۔ میرا ورکشاپ!"

کمرے کی کھڑکی کے شیشوں سے دھند کے پیچھے دیوداروں کی شاخیں، کھلی آستینوں کے کرتے پہنے باہیں پھیلائے گویا خواب کے پردوں سے نمودار ہو رہی تھیں۔ کھڑکی کے قریب دیوار کے ساتھ ایک میز تھا۔ میز کے پاس بغیر تختوں کی الماری میں کفش دوزی کے اوزار چمک رہے تھے۔ ایک طرف شیشوں جڑی الماری میں چمڑے کے تھان حریر و دیبا کی طرح احتیاط سے لپٹے پڑے تھے ـــــ اور میز پر دیوار کے ساتھ ایک پرانی چینی تصویر آویزاں تھی جس کے خطوط موجِ آب کی طرح بہتے چلے گئے تھے ـــــ کنول کے تالاب میں لمبی بادامی آنکھوں، لہراتی کالی زلفوں والی ایک حسینہ کھلے اَدھ کھلے پھولوں اور کلیوں کے درمیان ایک کلی کی مانند نظر آ رہی تھی، کلی جو کھِلا چاہتی تھی۔ کھِلنے کی ساعت تھی جسے مصور کے قلم کی جنبش نے وہیں روک دیا تھا اور جوشِ نمو سے ڈنٹھل پر لہرا کر رہ گئی تھی۔ اُس کے بالوں کی لہریں سیاہ ریشمی پیرہن کی طرح اُس کے بدن سے لپٹ گئی تھی۔ گردن میں ہلکا سا خم تھا، ہونٹ اَدھ کھلے اور آنکھیں جیسے احساسِ حُسن سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ انگوٹھوں بلکہ ناخنوں کے بل کھڑی تھی، جیسے ابھی ابھی آسمان سے اُتری ہے یا اُڑنے کی تیاری کر رہی ہے۔ میرا ساتھی کسی پُجاری کی طرح تصویر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"وانگ۔ مال روڈ پر گھومنے والوں کے لئے جوتے نہیں بناتا۔ وانگ کا فن اس کے پاؤں کا پیرہن تراشنے کے لئے وقف ہو چکا ہے۔ کنول کے اِن شگوفوں کے سبھی زاویئے اس کی نگاہوں کے سامنے نہیں آ سکے۔ پاؤں کی ان عمودی محرابوں کے پیچھے کفِ پا کی قوسیں ابھی وانگ کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔" اب وہ مجھ سے نہیں، تصویر سے نہیں، اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ اُس کی آواز اتنی ہلکی تھی جیسے تیز قدموں سے ناآشنا ہوں۔

کاش اس خط کے پیچھے خم گہرائی کا پتہ چل سکتا۔ اس قوس کے پیچھے ۔۔۔۔ نیچے کی پشت پر اُبھرتی ہوئی لہر کا اندازہ ہو سکتا ــــ وانگ کو ابھی بہت کچھ جاننا ہے، بہت کچھ جاننا ہے ابھی وانگ کو۔ جب جاکر ــــ ،

باہر بجلی چمکی اور شیشوں کے پیچھے روشنی کا ایک بے برگ و بار درخت آسمان سے اُترتا ہوا کہیں وادی کی گہرائیوں میں گڑ گیا۔

مدگری کہیں !" وانگ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"آجالا کر گئی !" میں نے جواب دیا۔

اس کے ہونٹوں پر پُر اسرار تبسم کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اُس کے ہاتھ کسی تندرست عورت کے ہاتھوں کی طرح گرم اور نرم تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے سر سے برف پگھل رہی ہے۔ میں وہ فلک بوس پہاڑ ہوں جس کے گرد لپٹی ہوئی دھند کے دبیز پردے چیر کر سورج کی شعاعیں میرے بالوں کو سہلا رہی ہیں اور میری انگلیوں سے چاندی کی ندیاں بہہ نکلی ہیں اور میرے سینے منعکس ہوتی ہوئی روشنی سے دنیا کے تاریک ترین گوشے بھی چمک اُٹھے ہیں۔

جولائی ۵۶ء

دیکھنے کے لیے اس کا کرایہ بھی بہت ہے
اے شخص ترا قلب کشادہ بھی نہیں ہے

اب کون دکھائے گا مجھے میرے خد و خال
بستی میں کوئی آئینہ زادہ بھی نہیں ہے

پڑھتے ہیں پڑھے لکھے بڑے شوق سے مجھ کو
ساجد کا کوئی علم زیادہ بھی نہیں ہے

اقبال ساجد
5/3/87
سروسز ہسپتال

عکس تحریر۔ اقبال ساجد

# توتا کہانی

اشفاق احمد

ایک دن کاشی کی سمت سے آنے والے بادل نہ جانے ادھر کیسے چلے آئے کہ سارا شہر اندھیارے کی لپیٹ میں آگیا اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ ہم چاروں دوست ہوسٹل کے ایک کمرے میں سٹوو لیمپ کے اردگرد کیتلی سے اٹھتی ہوئی بھاپ میں اپنے سگرٹوں کا دبیز دھواں ملا ملا کر نظارہ کر رہے تھے۔ سخت سردی میں ایسی شدید بارش کھڑکی کے شیشوں پر پتہ نہیں کون سی گت بجا رہی تھی اور دریچوں کے جھنجھناتے ہوئے پٹ معلوم نہیں کیا تال دے رہے تھے۔ ہمیں تو اتنا یاد ہے کہ برکھا کی مینڈک ایسی ٹھنڈی رانی بار بار ہمارے منہ چوم کر خنکی حاصل کرنے کے لیے کسی چور دروازے سے باہر نکل جاتی تھی اور ہمیں یوں محسوس ہونے لگتا تھا جیسے ہم کسی بے پیندے کی کشتی میں کرسمس کارڈوں والی نیم برفیلی جھیلیں تیزی سے طے کر رہے ہوں۔

جب ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ ہمارے کمرے کے دروازے سے کان لگا کر کھڑا ہو گیا تو میں نے کہا "تم نے میرا جو کارنامہ سننے کے لیے مجھے یہاں چلتے کی دعوت دی ہے وہ اپنی نوعیت کا بالکل انوکھا ایثار ہے جو میں ایک عفت مآب لڑکی کی خاطر کر سکا۔ شاید تم میں اسے سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو لیکن اس کی برتری کے تم یقیناً قائل ہو جاؤ گے — یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں اور میرا ایک ساتھی ایک باورچی کے ساتھ کرشن نگر کے ایک ایسے مکان میں رہتے تھے جس کے پڑوس میں ایک کنبہ آباد تھا۔ ہم میں سے باورچی کے سوا کسی نے بھی ایڑیاں اٹھا کر دیوار کے اس پار جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ س پر بھی وہ لوگ ہمیں شریف نہ سمجھتے تھے اور السلام علیکم کا جواب بڑی تلخی سے دیا کرتے تھے۔ خجستہ بڑی بڑی آنکھوں والی سانولے رنگ کی ایک ایسی لڑکی تھی جس کے سینڈل کی چوبی ایڑیاں باہر سے کافی گھسی ہوئی تھیں اور جب وہ چلتے ہوئے ایک قدم اٹھاتی تو دوسرے پاؤں کی ایڑی جسم کے بوجھ سے پیچھے کو پھیل جاتی اور جب وہ اس قدم کو اٹھاتی تو وہی چوبی ایڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھتی۔ اس سے تمہیں اس کے جسم کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا۔ اور اس کے سوا میں اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ خجستہ کا باپ پتہ نہیں کس دفتر میں ملازم تھا، مگر اس کی ماں دل کے عارضہ کی پرانی بیمار تھی اور ایک ایسی حاکم تھی جو ہر گھریلو کام کی فائیل پر "فوری" کی چٹ لگا دیا کرتی تھی۔

حیدر آباد سندھ سے خجستہ کی پھوپھی صرف بات پکی کرنے یہاں آئی تھیں اور بہت دنوں سے یہیں رہ رہی تھیں۔ ایک دن دوپہر کو انہوں نے جہانگیر کے مقبرے کی سیر کا پروگرام مرتب کیا جو میں نے اپنے کوٹھے پر سے بغیر ایڑیاں اٹھاتے سن لیا۔

خجستہ سے میری ملاقات بس یونہی سرسری سی تھی۔ میں اپنے کوٹھے پر آنے کا اعلان شیفتہ کے اشعار سے کیا کرتا اور وہ اپنی چھت پر آ کر زور سے پکارتی "سارے کپڑے اتار لاؤں امی ؟" اور ہماری ملاقات ہو جاتی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ الگنی پر ڈالا ہوا ان کا کوئی رومال سوکھ کر ہوا سے اڑتا ہوا ہمارے کوٹھے پر آ جاتا اور میں اس کی آمد کی خبر پا کر رومال کی گیند اپنے کوٹھے سے ان کے یہاں پھینکتا اور کہتا "آپ کا رومال ہے۔ اڑ کر ہمارے یہاں پہنچ گیا تھا۔" لیکن اس کے جواب میں صرف "شکریہ" کا ایک لفظ وصول ہوتا۔ میرے ساتھی کو دیرینہ زکام کی شکایت تھی۔ وہ میرے اس طرح رومال لوٹا دینے پر بہت جز بز ہوتا اور اکثر ایک ہی قصہ سنایا کرتا کہ کس طرح اس نے ایک لڑکی کو اغوا کرنے کا منصوبہ باندھا اور اسے

اس ارادے سے باخبر کر کے اس کی اجازت حاصل کی اور پھر جب مقررہ وقت آپہنچا اور اس لڑکی نے ڈیوڑھی کا دروازہ رات بھر کھلا رکھا تو وہ دبے پاؤں ان کے گھر میں داخل ہوا اور ٹٹولتے ٹٹولتے ان کی ایک اصیل مرغی اغوا کر کے لے گیا جسے اس نے لونگ اور جائفل کا بگھار دے کر صبح و شام دو وقت ضیافت اڑائی۔ لیکن میں تو ہمیشہ رومال واپس کر دیا کرتا تھا۔ کیونکہ رومال نہ تو بگھارا جا سکتا ہے اور نہ مجھے کبھی زکام ہوا ہے۔

جس جمعہ کو انہیں جہانگیر کے مقبرہ کی سیر کو جانا تھا اس دن صبح ہی صبح ان کے یہاں پکوان پکنے لگے۔ ان پکوانوں میں سب سے بڑھ چڑھ کر نجمہ نے حصہ لیا۔ چونکہ کفگیر بار بار دیگچی سے ٹکرا رہا تھا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ کوئی اناڑی باورچی اپنی پھرتی کی داد لینا چاہتا ہے۔ اور اس گھر میں نجمہ کے علاوہ اور کون اناڑی ہو سکتا تھا!

میں نے اپنی سائیکل برآمدے میں نکالی۔ اسے پرانی جراب سے صاف کیا اور اس کی ایک ایک کل اور پرزے کو آئینگ اور ... مالامال کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ مقبرہ شہر سے کافی دور ہے اور وہاں تک پہنچتے پہنچتے اچھی خاصی سائیکلیں جواب دے جاتی ہیں۔

جب باورچی نے سائیکل نکال کر باہر گلی میں کھڑی کر دی تو میں نے ٹائی کی گرہ پر برش کرتے ہوئے کہا "میرا انتظار نہ کرنا۔ میں آج کھانا نہیں کھاؤں گا۔" اس نے ایک لمحہ کے لیے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر بڑبڑاتا اندر باورچی خانہ میں چلا گیا جہاں اس نے میرے حصے کا آٹا گوندھ کر ابھی چنگیری سے ڈھانپ رکھا تھا۔

پتہ نہیں کتنی دیر تک میں مقبرے کی چار دیواری میں گھاس کے پلاٹ پر بیٹھا ان کا انتظار کرتا رہا۔ جمعہ کا دن ہونے کی وجہ سے کوئی شخص بھی ادھر سیر کو نہ آیا اور میں چار دیواری کی محرابوں کو بار بار گن کر چار سے ضرب دیتا اور تین پر تقسیم کرتا رہا۔ ایک بجے کے قریب صدر دروازے کے سامنے ایک تانگہ رکا اور اس میں سے تین برقعہ پوش عورتیں اتریں جن میں سے ایک کا برقعہ سیاہ تھا اور اس کے سینڈل کی ایڑیاں گھسی ہوئی تھیں۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور خراماں خراماں مقبرے کی عمارت کی طرف چل دیا۔ مرد سہمے ہوئے مجھے اپنے قریب سے گزرتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ باغ سنسان تھا۔ روشیں درختوں کے سوکھے ہوئے پتوں سے اٹی ہوئی تھیں اور فوارے کا پانی لیکر بہنے والی نہر میں گھاس پھونس مٹی اور خشک ٹہنیوں کو اپنے کناروں میں دبائے آرام سے لیٹی تھیں اور مجھے ایسا لگا جیسے جہانگیر کی قبر کے ارد گرد ہر قسم کی اور بہت سی قبریں بھول بسری اجڑی اجڑی گول گھری۔

بوٹ اتارتے ہوئے میں نے لڑکے سے پوچھا "مجاور کہاں ہے؟" تو اس نے زور سے ناک صاف کر کے کہا "جمعہ پڑھنے۔"

اس مختصر سے جواب کے بعد میں نے اس سے کچھ اور پوچھنے کی جرأت نہیں کی اور چپ چاپ مینار کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اوپر پہنچ کر میں نے راوی کو ایک نظر دیکھا اور پھر سبزی مائل مٹیالے درختوں کے درمیان ان تینوں کا انتظار کرنے لگا۔

وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھیں اور اوپر سے مجھے ایسے دکھائی دیتا تھا جیسے وہ صدیوں سے رینگ رہی ہوں اور نرمی صدیاں ان کے سامنے پھیلے ہوئے پھیل رہا ہو۔ وقت گزارنے کے لیے میں نے سگریٹ کا سہارا ڈھونڈا اور جب سگریٹ بالکل راکھ ہو گئی تو وہ نظروں سے معدوم ہو گئیں۔ شاید وہ اسی لڑکے کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئی تھیں؟

جب اس نے مینار کی سب سیڑھیاں چڑھ کر آخری مرتبہ لمبی سانس "اُف" کی تو میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سیڑھیوں کی بلندی کی ... کرکے کہنے لگا "مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گی۔" اس نے خوف اور حیرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولی:

"آپ کون ہیں؟"

میں نے کہا "بہتر تھا تم نے یہ سوال مجھ سے نہ پوچھا ہوتا۔ لیکن اب جو پوچھ لیا ہے تو سنو میں وہی چھوٹا سا تکیہ ہوں جسے تم عکس میں اپنے سینے سے لگائے پھرتی تھیں اور میں انہیں رنگ برنگی چیزوں کا عکس ہوں جنہیں اوڑھ کر تم ملائی جیسے ... پڑھتی تھیں۔

میں وہی تمہیرا ماموں زاد بھائی ہوں جس کے متعلق تمہیں تمہاری کلاس فیلو کیسی کیسی مزیدار باتیں سنایا کرتی تھی ۔ اب تم مجھ سے پوچھ رہی ہو میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں ؟ میرا نام کیا ہے ۔ یاد نہیں جب تم بورڈنگ میں رہا کرتی تھیں تو تم نے مجھے ایک مرتبہ خواب میں دیکھا اور تم اپنی استانی کی گرویدہ ہو گئیں ۔ جب تم صبح سویرے سکول کے باغ سے کلیوں کی جھولی بھر کر اپنی استانی کے انتظار میں سائنس روم کی سیڑھیوں پر بیٹھ جایا کرتی تھیں ۔ اس وقت تمہیں اسی کا تو انتظار ہوتا تھا جسے تم نے خواب میں دیکھا تھا ۔ اور آج جب وہ خواب سچا ہو گیا ہے تو تم مجھ سے پوچھتی ہو کہ میں کون ہوں ؟"

اس نے رونکی ہو کر کہا " میں اپنی امی کو پکارتی ہوں ......"

میں نے کہا " تم ہر روز کوٹھے پر آ کر اپنی امی کو پکارا کرتی ہو مگر جاتی کسی اور کو ہو ۔ ہر روز رات کو تم اپنے نرم اور گداز بستر سے اٹھ کر میری طرف آنے کا قصد کرتی ہو مگر تم نے اپنی پسلیوں کے اندر دل کا ایک ایسا ہوا پال رکھا ہے جو تمہیں بھیانک باتیں سنا سنا کر ڈرا دیتا ہے کیا اس وقت تم اپنی امی کو پکارا کرو یہ نہیں کہہ سکتی ہو کر اس ہوا کی گردن موڑ دیں ؟ لیکن تم اپنی امی کو پکارتی ہی کب ہو ؟ تمہیں آواز دینا نہیں آتی ۔ اب بھی تم اپنی امی کو آواز دے کر مجھے یہ بتانا چاہتی ہو کہ وہ اختلاج قلب کی مریض ہیں اور کئی گھنٹے میں بھی یہ سیڑھیاں طے نہیں کر سکتیں ۔ تم اس طرح کب تک اپنے آپ کو دھوکا دیتی رہو گی ؟"

بارش کے دو موٹے قطروں ایسے بڑے آنسو اس کی ابریشمی پلکوں پر تھرکنے لگے اور اس نے کہا " دھوکا ! دھوکا !"

" ہاں " میں نے جواب دیا ۔ " تم خود فریبی کے سنہرے جال خود ہی بنتی ہو اور خود اس میں الجھ کر رہ جاتی ہو ۔ اس دن جب تمہارا کارڈ ہو سفید روعل ہمارے کوٹھے پر آ گرا تو تم نے جھلا کر کتنے زور سے کہا تھا " یہ کیا مصیبت ہے " دراصل تمہارا مطلب تھا " یہ کتنی بڑی راحت ہے " اور تم راحت کو اجاگر کرنے کے لئے اس کے گرد مصیبتوں کے گھپلے ہوئے انبار لگاتی رہی ہو ۔ تم نے ہر مسرت کی طرف منفیانہ پیشقدمی کی ہے اور آج تک کرتی رہی ہو لیکن ...... اس نے اپنے برقعے کے نقاب کو انگلی کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا " میں نے کون سی خوشی حاصل کی ؟ مجھے معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو ۔ میرے فرشتوں کو بھی پتہ نہیں کہ تم کون ہو !"

میں نے کہا " تم خوشیاں اکٹھی کرنے کے لیے چھوٹی چھوٹی چھولداریاں نصب کرتی ہو مگر ان کی طنابیں بہت کمزور ہوتی ہیں ۔ ہر صبح جب سورج کی پہلی کرن دروازے کی جھری میں داخل ہو کر تمہیں بیدار کر کے کہتی ہے کہ اٹھو میں تمہارے لیے خوشیاں لائی ہوں " تو تم ہڑبڑا کر اپنے تکیے کے نیچے ہاتھ پھیرتی ہو اور سراسیمہ ہو کر پوچھتی ہو ۔ " میری کل کی خوشیاں کہاں گئیں ؟" اور اس طرح ہر روز تمہاری مسرتوں کا بنک دیوالیہ ہو جاتا ہے ۔ آسمان پر جب میری روح نے تمہاری روح سے کہا کہ زمین پر پہنچ کر ہم ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوں گی تو تمہاری روح روح القدس کے پروں کی طرح پھڑ پھڑائی اور تم مجھے لنکا کی پہاڑیوں میں ڈھونڈتی رہیں اور آج جب ہم اس مینار پر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہیں تو تم مجھے پہچاننے سے معذوری ظاہر کر رہی ہو ۔ جب تم ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہو کر اپنی جان سے بیزار ہو گئی تھیں اس وقت تمہارے منہ میں تھرمامیٹر لگا کر بائیں جھری کلائی پر ڈاکٹر کی گھڑی میں کون وقت دیکھتا رہا تھا اور کون تمہارے ٹمپریچر کا چارٹ بھرتا رہا تھا ۔ آج تم اس کلائی کو ، اس گھڑی کو تو پہچان رہی ہو مگر اس آدمی سے نامانوس ہو ؟

اس نے گھبرا کر پوچھا " تم حکیم ہو ؟ لیکن تم حکیم کیسے ہو سکتے ہو تم تو ۔ تم تو ۔ ۔ ۔ " پھر اس نے کہا " میرا راستہ چھوڑ دو میں نیچے جانا چاہتی ہوں "

میں نے جواب دیا " اس جگہ سے کوئی راستہ نیچے نہیں جاتا ۔ ہم تو تحت الثریٰ میں کھڑے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں ۔ یوں کہو تو اوپر چلیں لیکن مجھے معلوم ہے تم اوپر نہیں جا سکو گی ۔ تم نیچے نہیں جا سکو گی تم نے یہ بات اس لیے کہی ہے کہ تم یہاں کھڑی رہو ۔ اور میرے ذہن میں کبھی بھی

یہ خیال نہ آنے پائے کہ تم یہاں سے جا بھی سکتی ہو۔ تم نے مجھے ایک دفعہ بلایا تھا اور ٹال دیا تھا۔ اب دوسری مرتبہ بلایا ہے اور پھر جھجک رہی ہو۔ کہ تمھاری جگہ میں ہوتا تو تمھیں بلاتا ہی نہیں۔"

اس نے روتے ہوئے کہا "میں نے تمھیں کب بلایا؟ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم یہاں ہو تو میں کبھی بھی اُوپر نہ آتی بلکہ میں اس مقام پر ہی نہ آتی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تمھارے جیسے بدمعاش ــ بدمعاش" اور پھر وہ زار و قطار رونے لگی۔

میں نے اس کا کندھا تھپک کر کہا "ہم جیسے ظالم کہتے ہیں وہ دراصل ہمارا اپنا پیدا ہوتا ہے ہم جیسے مایوسی سمجھتے ہیں وہ ہماری ابھرتی ہوئی اُمنگ دب کر گھٹی ہوتی ہے اور جسے تم بدمعاش کہتی ہو وہ تمھارا محبوب ہوتا ہے۔ اگر تمھیں کسی کی محبوبہ بننے کی سعادت نصیب ہوتی تو تم یقیناً ایسا نہ کہتیں۔ لیکن رونا تو یہی ہے کہ تم بچپن سے لے کر اب تک محبت کرتی آئی ہو اور بڑھاپے میں بھی اپنے عاشقانہ جذبات سے گریز نہ کر سکو گی۔ پتہ نہیں اب تم مجھے پہچانتے ہوئے بھی نہ پہچاننے کی کوشش کیوں کر رہی ہو؟ تم نے بڑی مشکل سے ریل گاڑی کی چھت سے بلب چرایا ہے اور اب اسے پھر اسی جگہ لگانے کی سوچ رہی ہو۔ اسی طرح سے تم دو چوریاں کرو گی ایک ریل گاڑی کی اور ایک اس چور کی جس نے یہ قمقمہ چرایا ہے"۔

اس نے آنسو پونچھ کر کہا "میری پھوپھی بھی ساتھ ہیں اور میں ان کے لڑکے سے منسوب ہو چکی ہوں۔ تم کیوں ــــ"

میں نے کہا "تم اسی سے بیاہی جاؤ گی جس کے لئے تم شملہ کی پہاڑیوں میں ماری ماری پھری ہو۔ تمہارے پھوپھی زاد بھائی کا وجود محض ایک حادثہ ہے۔ موٹر پہلے زمزمہ کے چبوترے سے ٹکراتی ہے، حادثہ بعد میں اسے الٹ کر اس سے مڈگارڈ اور بتیاں توڑ دیتا ہے"۔

اس نے کہا "مجھے معلوم نہ تھا کہ کوئی دیوانہ مقبرۂ جہانگیر کے مینار میں چھپا ہوا ہے۔ اگر تم پاگل ہو تو ۔ ۔ ۔ ۔"

میں نے جواب دیا "واقعی تم پاگل ہو لیکن تم مینار میں چھپی ہوئی نہیں ہو بلکہ اس پر کھڑی ہو کر اردگرد کی چیزوں کو روشنی بخش رہی ہو۔ تمہیں تو جہانگیر ہو جس نے اپنی سلطنت اپنی محبوبہ کے ہاتھوں شراب کے ایک پیالے اور پاؤ بھر کبابوں کے عوض بیچ دی تھی، لیکن تمہاری محبوبہ کو یہ سودا کس قدر مہنگا پڑا۔ اُدھر دیکھو! وہاں تمہاری محبوبہ اسی سودے میں جا، کھا لہراتی ملوں اور اس قدر پریشان ہے کہ اس کے تعویذ کی خاک تک اس تجارت کی نذر ہو چکی ہے۔ اب تم اس کے نام کو بھی حرف میں ملانے پر اُتر آئی ہو اور اتنی بلندی پر چڑھ کر بولی دے رہی ہو"۔

اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے اور آنکھوں میں نرگس کے دھوئے دھائے رنگوں بھول پشیمان ہو کر کمد ئے ہا مسب تھے اس نے اپنے لب کھولے اور ہارمونیم کے پردوں ایسے دانتوں میں اپنی سُرخ سُرخ زبان دبالی۔ پھر اپنے گوشۂ چشم سے مجھے دیکھا اور بولی "تم ہمارے پڑوسی تو نہیں ہو؟"

میں نے کہا "ہاں تم میری پڑوسی ہو اور میرے مکان کے گرد جو کوئی بھی رہتا ہے وہ میرا پڑوسی ہے پر میں تو اس طوطے کا ہمسایہ ہوں جو ہر رات تمہیں مجھ سے بدظن کرنے کے لئے ایک کہانی سنایا کرتا ہوں۔ اس کی ہر کہانی میرے گھر کے دروازوں میں ایک ایک میخ بن کر گڑی ہوئی ہے اور میرے نکلنے کا راستہ بند ہو گیا ہے۔ تم ہر شام وہ میخیں اکھاڑنے آتی ہو مگر ایک نئی ٹھونک کر چلی جاتی ہو۔ اور میں صبح سے شام تک دیواروں کو ناخنوں سے کھرچ کھرچ کر نقب لگانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں، لیکن تم جانتی ہو کہ میرے گھر کی دیواریں ہاتھی کی کھال سے بنی ہیں جو قطبی ستارہ نکلتے ہی اپنے زخموں کو رفو کر لیتی ہیں"۔

اس نے ٹھوڑی کے نیچے برقعے کی ڈوری کھولتے ہوئے کہا "تم بڑی مزیدار باتیں کرتے ہو یہ تم نے کہاں سے سیکھیں؟"

میں نے کہا "تمہارا مطلب ہے کہ میں نے یہ سبق پڑھا نہیں۔ میں بڑا ہونہار شاگرد ہوں اور اپنے معلم کے سامنے آموختہ بڑے حسن

اور سلیقہ سے دہرا سکتا ہوں۔"

اس پر وہ مسکرانے لگی اور اس کے گالوں میں دو ننھے گڑھے پیدا ہو گئے۔ رنگے ہوئے ناخنوں والا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر بولی "مجھے معلوم نہ تھا کہ تم بھی اسی قدر بے قرار ہو۔ میں نے سوچا دیواریں کھرچتے کھرچتے تمہاری انگلیوں میں ناسور ہو جائیں گے اور تم اجگر کی طرح کینچلی چڑھا کر میٹھی نیند سو جاؤ گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ تم دُھن کے پکے نکلے۔ آؤ اب ہم دونوں مل کر اس طوطے کی گردن مروڑ دیں۔"

میں نے کہا "اس طوطے کو نہ مارنا۔ اس میں میری جان ہے اگر میری جان نکل گئی تو تم مر جاؤ گی۔"

اس نے کہا "مجھے اپنی زندگی کی پروا نہیں۔"

میں نے جواب دیا "مجھے بھی اپنی زندگی کی پروا نہیں۔ لیکن مجھے طوطے کی زندگی عزیز ہے۔"

اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "لیکن میرا پھوپھی زاد بھائی اس طوطے کو مار ڈالے گا، کیونکہ اس کی ناک بلی جیسی ہے اور اس کی آنکھیں شکرے کی طرح تیز ہیں۔"

میں نے اس کے سر کو کندھے سے لگا کر تھپکا اور کہا "تم فکر نہ کرو وہ اسے گزند نہیں پہنچا سکتا۔ یہ بات الگ ہے کہ وہ بھی جلن میں آ کے ایک مینا پال لے۔ لیکن ایسا کبھی نہ ہوگا وہ تاجر ہے اور تاجر ایسی چیزیں نہیں پالا کرتے جن میں اچھا خاصا نفع نہ ہو۔"

اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور اس نے میری ٹائی پر ناک رگڑتے ہوئے کہا "ایک مرتبہ جب میں کمرۂ امتحان میں سوال حل کر رہی تھی تو تم نے اچانک آن کر مجھے گدگدایا تھا اور میں نے جل کر کہا تھا تم نے تو وعدہ کیا تھا کہ یہاں نہ آؤ گے لیکن اب میرا وقت خراب کرنے کو یہاں بھی پہنچ گئے ہو، تو تم نے قسم کھا کر جواب دیا تھا کہ میں نہیں آیا ہوں تمہیں وہم ہو رہا ہے۔ اس پر میں نے تنگ آ کر کہہ دیا تھا کہ کتنا جھوٹ بولتے ہیں آپ، جہنم میں جائیں گے۔ کیا تم میرا مطلب سمجھے تھے؟"

میں نے سر ہلا کر کہا "نہیں"

اس نے اپنا ماتھا میری چھاتی پر ہولے ہولے مارتے ہوئے کہا "آپ سے ملنے کی تمنا پہلے ایک چنگاری بن کر سلگتی رہی۔ اس کے بعد تو بھڑک اٹھی اور آگ کے رنگین شعلوں نے مجھے دن رات جلانا شروع کر دیا ـــــ میں آپ کو اسی جہنم میں بھیجنا چاہتی تھی۔"

میں نے کہا "تمہاری باتیں تو پہیلیاں ہیں اور میں صرف سیدھی سادھی باتیں سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ تمہارے اس معمہ کو کیونکر حل کرتا!"

پھر ہم دونوں ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔ میں نے اس کی گود میں سر رکھ دیا جس میں وہ اپنی انگلیوں سے کنگھی کرتی رہی اور آہستہ آہستہ کچھ گنگناتی رہی۔

تھوڑی دیر بعد ہمیں سیڑھیوں سے قدموں کی چاپ اور پھولے ہوئے سانسوں سے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں اس کی گود سے سر اٹھا کر سیدھا بیٹھ گیا۔ گھبرائی ہوئی نگاہوں سے میں نے اس کو دیکھا لیکن اس کی آنکھوں میں سکون اور لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ اٹھا کر کہا:

"یہ ہیرے کی انگوٹھی ہے اور میری زندگی ختم کرنے کے لئے کافی ہوگی۔ اس طرح میں اپنی امّی اور اپنی پھوپھی کی طعن آمیز باتیں

گھُٹنے سے بچ جاؤں گی"۔

یہ کہہ کر اس نے اپنا اُلٹا ہاتھ لبوں کی طرف بڑھایا لیکن میں نے اس کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لی۔ اُس نے زور لگایا اور اسی دوران میں ہم اُٹھ کر کھڑے ہوئے۔ اپنی ساری قوت سے اُسے فرش پر گرا کر ایک عصمت مآب لڑکی کی عفت اور عزت برقرار رکھنے کے لئے میں مینار کی بلندی سے نیچے کود گیا۔

(مئی ۱۹۵۰ء)

غزل

جس رات تہہ خاک لحد سو گئے یارو
اس رات بھی کچھ لوگ نہیں رو بھی گئے یارو

پلکوں پہ جو چمکے تھے ستارے سے لرزتے ہیں یہ موتی
یہ بھید وہ پائیں گے جو کچھ ہو بھی گئے یارو

کیا ہیں گے وہی فصل بہار دیکھنا آخر
اس عہد میں جو اہل وفا ہو بھی گئے یارو

جو داغ ملے دل کو وہ اشکوں نے مٹائے ہیں
جو داغ ہیں اب دل پہ کہاں دھو بھی گئے یارو

احمد راہی

عکس تحریر:- احمد راہی

# درگاہ

عبدالرحمٰن صدیقی

پیر بخش کی موت نے حضرت پیر بخشؒ کو زندۂ جاوید کر دیا۔ پیر بخش، پیرا اور حضرت پیر بخشؒ دراصل ایک ہی شخص کے تین مختلف نام اور القاب تھے۔ پیر بخش اس کا وہ نام تھا جو ان پیر صاحب کی رعایت سے رکھا گیا، جن کی دعا سے وہ پیدا ہوا تھا۔

"پیرا" پیر بخش کا پیار بھرا اختصار تھا۔

حضرت پیر بخشؒ البتہ اس کا وہ نام یا القاب تھا جو اس کے گاؤں والوں کی طرف سے اسے ملا اور اب جب کہ پیر بخش کو مرے ہوئے ایک زمانہ گذر گیا ہے اور اس کا کوئی نام لیوا تک نہیں رہا ہے۔ حضرت پیر بخش کو خود ان کے اپنے ہی گاؤں کیا بلکہ آس پاس کے علاقے کا بچہ بچہ جانتا ہے۔

ہر سال اس مہینے میں جب جھلسا دینے والی دھوپ میں ہرن کالے پڑنے لگتے ہیں اور چوٹی سے ایڑی تک پسینہ بہنے لگتا ہے۔ دور دور سے سینکڑوں دیہاتی اپنے اپنے کنبوں سمیت اس چھوٹے سے گاؤں میں جمع ہو کر حضرت پیر بخشؒ کی درگاہ پر عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں۔

منوں کھانا پکتا ہے۔ بڑی بڑی ڈیرے دارنیاں اور مانے ہوئے خوش گلو قوال اپنے اپنے گلے بازی کے جوہر دکھاتے ہیں — ہزار روپے کی سچے کام کی چادر حضرت پیر بخشؒ کے مزار پر چڑھائی جاتی ہے اور فقیروں کے کاسے روپوں پیسوں سے بھر جاتے ہیں۔

کھانے کی بڑی دیگ جس میں بیک وقت دس من کھانا تیار ہو سکتا ہے اور جو سالہا سال سے ایک ہی جگہ گڑی ہوئی ہے۔ یہ عرس کے

دوران چوبیس گھنٹے چڑھی رہتی ہے اور اس میں گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار کے بارہ مرغوں اور ایک من چاولوں سے لے کر گاؤں کے ایرے غیرے نتھو خیرے کے ہاں کی ارہر کی دال اور بھینسے کا گوشت ایک ہی ساتھ پکتے رہتے ہیں اور پھر اس دیگ کا رنگا رنگ پکوان جو بیسیوں لاعلاج امراض کا تیر بہدف علاج سمجھا جاتا ہے۔ زائرین میں تبرک کے طور پر تقسیم کیا جاتا ہے۔

پیرا کی موت بظاہر تو کوئی ایسی اچنبھے کی بات نہیں تھی اسے تو مر ہی جانا چاہیئے تھا۔ مر تو دراصل وہ اسی وقت سے رہا تھا، جب سے وہ پیدا ہوا تھا۔ سرسام، نمونیہ، موتی دھارا، چیچک اور لو اور ناقابل تشخیص اور پراسرار بیماریوں نے اس کے سوکھے جسم میں زندگی کے سوتے بند کر کے موت کے بڑے بڑے سوراخ کر دیئے تھے۔ خدا جانے وہ سترہ سال بھی کیسے زندہ رہ گیا، مگر اتنے عرصے تو اسے زندہ رہنا ہی چاہیئے تھا، ورنہ آج حضرت پیر بخشؒ کو کون جانتا اور ان کی درگاہ کہاں ہوتی۔

پیرا چودھری رحیم اللہ خان کا پہلا بچہ تھا جو سال بھر کے اندر اندر نہیں مرا۔ اس سے پہلے اس کے ہاں اوپر تلے کئی لڑکے اور لڑکیاں ہوئے مگر ان میں سے کوئی بھی سال سے اوپر زندہ نہیں رہا۔ چودھری کے پاس خدا کا دیا سب کچھ تھا مگر زندگی کے پچاس برس بیت جانے

پر بھی وہ بے اولاد ہی رہا اور اس کے دل میں اولاد کا ارمان کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا۔

کریم الدین کو اپنی بیوی سے بڑی چاہت تھی۔ اس لئے لوگوں کے سکھانے پڑھانے کے باوجود دوسری شادی سے اس نے ہمیشہ انکار کیا۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ کریم الدین کی بیوی اپنی اولاد کے حق میں سخت منحوس ہے ورنہ اس کی کوئی اولاد کبھی جانبر نہ ہو سکے گی، مگر کریم الدین کبھی ان باتوں پر کان نہیں دھرتا، بھلا اللہ دے ہو کر مر جانے میں آخر اس بیچاری کا کیا قصور ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے، اولاد کے حق میں وہ خود ہی منحوس ہو۔ ایسی صورت میں بھلا دوسری بیوی بھی آکر کیا کرے گی۔

کریم الدین کی بیوی کا تو اولاد کے غم میں گھل گھل کر اس سے بھی بدتر حال ہو رہا تھا۔ پینتیس برس کی عمر میں وہ بالکل پچپن برس کی بڑھیا معلوم ہوتی تھی اس کو نہ کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کا دھیان۔ سارا دن گھر میں بڑی سسکیاں بھرا کرتی۔ کئی بار اس نے کریم الدین سے کہا کہ وہ دوسری شادی کر لے، شاید اسی طرح ان کے دن پھر جائیں اور ان کا گھر بچے کی چہکار سے گونج اٹھے، مگر ایسی باتوں پر کریم الدین ہمیشہ اسے سختی سے ڈانٹ دیا کرتا تھا۔

ویسے اولاد کے لئے کریم الدین نے کیا کیا کچھ نہیں کیا، کیا کیا جتن نہیں کئے۔ نہ جانے کتنے سیانوں کی جوتیاں سیدھی کیں، ان کو خوب خوب مرغ پلاؤ کھلائے۔ بڑی بڑی درگاہوں اور خانقاہوں کی خاک چھانی، منتیں مانیں چڑھاوے چڑھائے۔ جادو ٹونا، گنڈے تعویذ، سبھی کچھ کر ڈالا۔ کریم الدین کی بیوی کا تو یہ حال تھا کہ وہ تعویذ گنڈوں سے بالکل لدی رہتی۔ اس کے گلے سے لے کر ناف تک تعویذ ہی تعویذ بندھے ہوئے تھے۔ بازوؤں پر بازوبند کی بجائے بڑی مسجد کے مولوی صاحب کی لکھی ہوئی ٹھیکریاں اور ہاتھوں میں چوڑیوں کی جگہ کالے گنڈے تھے۔ پانچوں وقت نمازیں پڑھتی، چلّے کھینچتی، راتوں کو جنگلوں میں جا کر مرغ حلال کرتی اور ان کا خون سوکھے پیڑوں کی جڑوں میں ڈالتی۔ جمعرات کی جمعرات ایک فربہ دنبہ یا بکرا حلال کرا کے غربا اور مساکین میں تقسیم کرتی۔ غرض جو بھی کوئی اسے بتاتا وہی کرتی مگر پھر وہی ڈھاک کے تین پات اور اب تو مدت سے اس کے ہاں اولاد ہی ہونا بند ہو گئی تھی گذشتہ دس سال سے تو پتہ بھی نہیں کہ ہاں چڑیا کا بچہ بھی نہیں ہوا تھا۔

اپنی بیوی کی زبوں حالی اور خود اپنے بڑھتے ہوئے بڑھاپے کا خیال کر کے کریم الدین اولاد کی طرف سے بالکل ہی مایوس ہو چلا تھا، مگر جب چاروں طرف سے مایوسیوں کی کالی گھٹائیں گھر آتی ہیں تو اکثر ان میں امید کی بجلیاں بھی کوندا مارنے لگتی ہیں۔

ایک دن کریم الدین کو معلوم ہوا کہ کچھ دنوں سے گاؤں کی مسجد میں ایک بہت پہنچے ہوئے پیر آئے ہوئے ہیں، اس کے دوستوں نے مشورہ دیا کہ حرج بھی کیا ہے اگر قسمت آزمائی کر لی جائے، شاید ان بزرگ کی دعا ہی سے اس کا نخلِ امید ہرا ہو جائے۔

اولاد کی لگن بری ہوتی ہے۔ کریم الدین بمعہ اپنی آدھی سے زیادہ سفید داڑھی والی بیوی کے پیر صاحب کی قیامگاہ پر حاضر ہو گیا۔ مسجد کا صحن خود اسی جیسے بیسیوں حاجتمند اور پیر صاحب کے مریدوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ صحن کے بیچوں بیچ ایک لکڑی کی چوکی پر جس پر سفید براق چادر بچھی ہوئی تھی ایک سفید ریش بزرگ گاؤ تکیہ سے لگے بیٹھے تھے۔ انہوں نے ڈھاکہ کی ململ کا کرتا اور کورے لٹھے کا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ سر پر ململ ہی کی چوگوشہ ٹوپی تھی۔ سر سے پیر تک سفید لباس نے ان کے سفید براق داڑھی والے چہرے کو اور بھی پُرنور اور باوقار بنا دیا تھا۔

جب وہ کسی حاجت مند کی بات سنتے تو زیر لب کچھ پڑھ کر اس پر دم کرتے اور اطمینان کے دو چار لفظ کہہ کر اس کی خاطر جمع کر دیتے۔ کریم الدین بھی اپنی بیوی سمیت مسجد کے کونے میں بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا کہ اتنے میں خود بخود بزرگ کی نظریں ان کی طرف اٹھ گئیں۔ کریم الدین کی بیوی گھونگھٹ کی اوٹ میں بزرگ کے جلال اور بھرے مجمع میں ہونے کے باعث تھرتھر کانپ رہی تھی

کریم الدین نے جو پیر صاحب کا رخ اپنی طرف دیکھا تو فوراً دست بستہ کھڑے ہو کر عرض کی کہ حضور یہ میری گھر والی ہے۔ بے اولاد ہے۔ کریم الدین ابھی اپنی بات پوری بھی نہیں کرنے پایا تھا کہ پیر صاحب نے آہستہ مگر پروقار لہجے میں فرمایا کہ ہم سمجھ گئے۔ اور کریم الدین کی بیوی کی طرف رخ کر کے بولے "بی بی ہمارے پاس آؤ۔ گھبراؤ مت ـــــ مولا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں ـــــ"

اس بیچاری کی حالت اس وقت واقعی بہت غیر ہو رہی تھی۔ ہانپتی کانپتی اٹھی اور پیر صاحب کے قدموں میں جا گری، پیر صاحب نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور پھر بلا تامل اس کی چادر میں منہ ڈال کر کچھ پڑھ کر دم کیا اور کہا "جا بچہ! جا! حق نے چاہا تو تیری گود بھری ہو گی۔ لڑکا ہو گا اور جیئے گا" بزرگ کی دعا سے میاں بیوی کو بڑی ڈھارس ہوئی اور ان کو یقین ہو گیا کہ وہ آخر یونہی بے اولاد نہیں مر جائیں گے۔

اس کو بزرگ کی دعا سمجھئے یا قدرت کا کرشمہ کہ ٹھیک سال بھر بعد کریم الدین کے ہاں جیتا جاگتا لڑکا ہو گیا۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی اس کی بیوی تو گویا پھر سے جی اٹھی تھی۔

کریم الدین کے سونے گھر میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ صدقہ خیرات کا یہ حال تھا کہ گھر سے کوئی بھی حاجتمند خالی ہاتھ نہیں لوٹتا تھا۔ پیر صاحب کی رعایت سے لڑکے کا نام پیر بخش رکھا گیا اور بڑی اللہ آمین سے اس کی پرورش ہونے لگی۔

پیر بخش کا رنگ خوب اچھا کالا تھا اور اس کے نقش بھی کافی بھونڈے تھے۔ اس پر طرّہ یہ کہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ، آخر تھا بھی تو بڑھاپے کی اولاد۔ مگر ماں باپ کی آنکھوں میں تو گویا وہ شہزادہ تھا۔

ماں کو تو ہمیشہ نظرِ بد کا دھڑکا لگا رہتا، ذرا لونڈے کو چھینک آتی اور ماں کا جی دہل جاتا۔ فوراً نظر اتارنے کے لئے کالے دانے کی دھونی دی جاتی۔ ننھی سی جان!

جب دھوئیں کے بادل اس کے حلق اور ناک میں گھستے تو اس کا دم گھٹ جاتا، مگر دھونی نہیں رکتی تھی۔

ابھی پیر بخش ایک ہی مہینے کا ہوا ہو گا کہ اس کا سارا بدن تعویذ گنڈوں سے لد گیا گلے میں کالا ڈورا، دائیں بازو پر خورد بین سے پڑھے جانے والے قرآن شریف کا تعویذ، کلائیوں پر ٹھیکریاں، ناف پر لال پیلا ڈورا، گلے میں سانپ کی ہڈیوں کی مالا مگر اس کے باوجود پیر بخش کو آئے دن کوئی نہ کوئی روگ لگا ہی رہتا۔ کبھی پیٹ میں تکلیف ہے کبھی سینہ جکڑا ہوا ہے، اگر کسی نے گود میں ذرا بے احتیاطی سے لے لیا، تو صاحبزادے کا ہنسلی مونڈھا اتر گیا۔ تین مہینے کا ہونے تک وجود وہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی پیدا ہوا ہے۔

ملاؤں، سیانوں سے کریم الدین کا گھر کبھی خالی نہ رہتا۔ کوئی پیر بخش پر دم کر کے پھونکتا تو کوئی اس کے لئے نیا تعویذ تیار کرتا اور تو اور بھینسوں والے حکیم صاحب نے تو دو چار مہینے میں اپنے ہاتھ کی کالی روشنائی سے لکھی ہوئی کم از کم ایک درجن پلیٹیں پیر بخش کے حلق سے اتروا دیں۔ یہ حکیم صاحب نہ صرف حکمت کے ماہر تھے بلکہ علاج روحانی میں بھی انہیں ید طولےٰ حاصل تھا اور ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی پلیٹیں تو ہر بیماری کا آخری علاج سمجھی جاتی تھیں۔

پیر بخش اسی طرح جھینکتے جھینکتے سال بھر کا ہو گیا اور اس نے کچھ نہ کچھ رینگنا بھی شروع کر دیا مگر اس کے جسم پر بوٹی نہیں چڑھی۔ کریم الدین کی بیوی گوند کھانے کھا کر لڑکے کو دودھ پلاتی، مگر سوکھے تلوں میں تیل کہاں۔ دودھ تو وہ لپ لپ کر کے سارا پی جاتا مگر پھر وہی سوکھے کا سوکھا، منہ سے برسوں کا فاقہ ٹپکتا تھا۔

ایک دفعہ بلا کی گرمیاں پڑ رہی تھیں۔ پیر بخش کو تو بیماری کا بس ایک بہانہ چاہیے تھا، لو کے اثر سے اسے کچھ بخار ہو گیا اور باوجود

جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کے پارہ چڑھتا ہی گیا۔ دوسرے دن تو اس پر غشی کی حالت طاری ہو گئی۔ اس کی پیشانی اور ہاتھ پیر بھٹی کی طرح جلنے لگے۔ کریم الدین کے گھر میں کہرام مچ گیا۔

جب ملاؤں سیانوں کی جھاڑ پھونک بالکل اکارت جاتی ہوئی معلوم ہوئی تو گاؤں کے بڑے حکیم صاحب کو بلایا گیا۔ انہوں نے سرسام بتلایا اور دو چار شربت اور خمیرے تجویز کئے مگر حکیم صاحب کی دوا تو گویا پیر بخش کے حق میں زہر ثابت ہوئی۔ اس کی حالت بالکل ہی غیر ہو گئی۔ سانس اسی طرح اٹک اٹک کے چلتی کہ بس گویا ہر سانس آخری سانس ہے۔ حکیم صاحب کو دوبارہ بلوایا گیا تو انہوں نے صاف کہہ دیا کہ اب دوا کا وقت نہیں، دعا کرو۔ اس کی روح اذیت میں ہے۔ خدا مشکل آسان کرے۔

کریم الدین کا گھر بالکل ماتم کدہ بن گیا۔

مگر وہ جو کہتے ہیں نا کہ جسے خدا رکھے اسے کون چکھے، ہفتے دس روز کی جاں کنی کے بعد ایسے معلوم ہوا جیسے پیر بخش کی حالت سدھر رہی ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن اس نے آنکھیں کھول کر انتہائی لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں پانی مانگا اور پھر اس کے بعد اس کی حالت دن بدن سنبھلتی گئی۔

پیر بخش یوں اچھا ہونے کو تو اچھا ہو گیا مگر اس کی حالت مردوں سے بدتر تھی۔ بخار نے تو اس کا بالکل ڈھچر ہی نکال دیا تھا۔ اس کی چیچڑ میں لسی ہوئی سرخ آنکھیں چڑھی چڑھی رہتیں اور اس کے منہ اور ناک سے ہر وقت غلاظت بہتی رہتی۔ اس کا سر بالکل گنجا ہو گیا اور زبان اس قدر موٹی ہو گئی کہ اس کے منہ سے نکلی ہوئی رال لبھے ہوئے تاروں کا گچھا معلوم ہوتی۔

بگڑی ہوئی بیماری نے اس کے دماغی توازن کو بری طرح درہم برہم کر دیا۔ اس کا سارا وجود معمول سے اس قدر ہٹ گیا کہ اس میں سادوں کی سی کوئی بات ہی نہ رہی۔ اس کے ہمجولی اس کو "پاگل! پاگل!" کہنے لگے جس وقت وہ کھیلتے تو پیرا یا تو علیحدہ بیٹھا رال ٹپکایا کرتا یا یک دم یونہی بیٹھے بیٹھے جوش میں آجاتا اور دیوانوں کی طرح خود اپنے کپڑے پھاڑنے اور دوسروں پر پتھر پھینکنے لگتا۔ اس اثنا میں اس کا دم اس قدر پھول جاتا کہ وہ بالکل ڈھیر سا ہو جاتا۔ مگر ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے اس بڑھتے ہوئے فقدان نے پیر بخش کی شخصیت کے چند پراسرار پہلو اجاگر کرنا شروع کر دیئے۔ گاؤں کے لوگوں کو اب یقین سا ہو چلا تھا کہ اس کے دماغ پران پیر صاحب کے جلال کا اثر ہے جن کی دعا سے وہ پیدا ہوا تھا۔

پیر بخش اسی طرح گھٹتا بڑھتا رہا۔ سرسام کے بعد اس کو کوئی اور ایسی شدید بیماری تو نہ ہوئی مگر اس کا جسم بیماریوں سے پہلے ہی اس قدر بگھر چکا تھا کہ اگر اسے کوئی اور عارضہ لاحق بھی ہوتا تو کیسے اس کا پتہ چل سکتا تھا۔ پرانے ناسور میں اگر چند اور دانے اور پھنسیاں نکل آئیں تو بھلا فرق ہی کیا پڑتا ہے۔

عمر کے ساتھ پیر بخش کی ذہنی اور جسمانی کیفیت ذرا بھی نہ سنبھلی۔ گو اس میں ایک خاص قسم کی متانت اور ٹھہراؤ اب ضرور پیدا ہو گیا تھا۔ اب بھی وہ کبھی کبھی ایک نامعلوم جذبے میں آکر مجنونانہ حرکتیں کرنے لگتا۔ مگر زیادہ تر اب وہ اپنے مکان کی ڈیوڑھی میں پڑا "ہو ہو" کیا کرتا کبھی زیر لب اور کبھی زور زور سے۔

کریم الدین کی بیوی کا تو کچھ عرصہ ہوا انتقال ہو چکا تھا۔ خود کریم الدین پر بھی ایک دم بڑھاپا ٹوٹ پڑا۔ پچاس ساٹھ کے پیٹے میں آنے کے باوجود ابھی تک اس کے جسم کا ٹھاٹھ بنا ہوا تھا مگر اب تو گویا راتوں رات اس کی داڑھی ایک دم سفید ہو گئی اور اس کے ہاتھوں میں رعشہ بھی آگیا۔ اس کے اب وہ دن آگئے تھے کہ وہ گھر میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرے اور دنیا کے کاروبار اولاد پر چھوڑ دے مگر پیر بخش کے

ہوش پکڑنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اُنا کریم الدین کو اس کے سارے کام کرنے پڑتے۔ وہی اس کو پکڑ پکڑ کر نہلاتا، کپڑے بدلواتا اور دوسری ضروریات سے فارغ کرواتا۔

ایک بڑی مصیبت اب یہ پیدا ہوگئی تھی کہ گاؤں کے سارے آوارہ اور اوباش لوگ باوجود کریم الدین کی ڈانٹ ڈپٹ کے پیر بخش کو گھیرے رہتے۔ پیر بخش کو خود تو کسی چیز کا ہوش ہی نہیں تھا۔ وہ تو سارا دن ڈیوڑھی میں پڑا "ہُو حق" کیا کرتا، مگر گاؤں کے لوہار کے لونڈے اور اس کے ہمجولیوں کو یہ یقین ہوگیا تھا کہ پیر بخش کی "ہُو حق" محض دیوانے کی بڑ نہیں بلکہ اس میں بڑے بڑے راز اور پیشین گوئیاں مضمر ہیں۔

دراصل ایک دفعہ ہوا یوں کہ لوہار کا لونڈا جس کو جوا کھیلنے کی لت تھی کہیں چلتے چلتے پیر بخش سے اپنی ہار جیت کے متعلق کچھ پوچھنے بیٹھ گیا اور پیر بخش کے کچھ "ہاں نہ" کہنے پر اس دن خوب جیتا۔ اس کے بعد اس کو پیر بخش پر اتنا اعتقاد ہوگیا کہ وہ ہمیشہ جوا کھیلنے سے پہلے اس کی ہاں نہ ضرور لیتا۔ اب وہ پیر بخش کو محض پیر بخش یا پیرا بھی نہ کہتا بلکہ حضرت پیر بخش صاحب کے نام سے پکارتا کیونکہ جب سے اس نے پیر بخش کے ہاں جانا شروع کیا تھا وہ جوئے میں مسلسل جیت رہا تھا۔

لوہار کے لونڈے کی دیکھا دیکھی کمہار، چمار، تیلی اور تمبولیوں کے لڑکے اور گاؤں کے چھٹے ہوئے بدمعاش اور لچے لفنگے اب بھی ہر وقت پیر بخش کو چپٹے رہتے اور اپنی اپنی مشکلوں کے متعلق اس کی "ہاں نہ" لیتے۔ اس کی مٹھی چاپی کرتے اور جب اس پر شدید دوروں کے باعث غشی طاری ہو جاتی تو اس کی ہر طرح خدمت کرتے۔ ان کے خیال میں دراصل یہ دورے ہی پیر بخش کی پیری اور برگزیدگی کی سب سے بڑی علامت تھے کیونکہ جب وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑا ہوتا اور اس کے منہ سے کف جاری ہوتا تو اس کی "ہو حق" کی آوازیں اور بھی بلند ہو جاتیں اور ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کے گلے میں انسان کی آواز کی جگہ کسی دیو کی آواز بھری ہے۔

گاؤں کے بڑے بزرگوں نے پہلے تو لونڈوں کی باتوں پر کچھ دھیان نہیں دیا مگر جب انہوں نے ان میں سے ہر ایک کو پیر بخش کی تعریف میں رطب اللسان پایا تو وہ بھی اس کے اتنے ہی معتقد ہوگئے اور پیر بخش کی ڈیوڑھی اچھی خاصی درگاہ سی بن گئی۔

گاؤں والوں کے لئے پیر بخش کی "ہو حق" اب الہامی ہے او پیش گوئی کی صدا بن چکی تھی۔ ایک دن پیر بخش اپنی ڈیوڑھی میں پڑا "ہو حق" کر رہا تھا کہ اس پر ایک شدید دورہ پڑا۔ اس کا جسم تشنج سے بالکل بت کی مانند اکڑ کھنچ گیا اور اس کے منہ سے گاڑھی گاڑھی جھاگ نکلنے لگی۔ اس کے مریدوں نے بہتیرا اس کو ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ اس کو خلخلہ، پیاز اور پرانی جوتیاں سنگھائیں۔ پانی چھڑک چھڑک کر ہلکا ہلکا تھپکا گیا مگر اس کی حالت کسی طرح نہ سنبھلی۔ اس کی نبضیں چھوٹ گئیں اور وہ اسی طرح بے ہوشی کے عالم میں چل بسا۔

ڈیوڑھی کے قبرستان میں پہلے ایک قبر کا اضافہ ہوا اور پھر آہستہ آہستہ اس پر اینٹوں کی ایک پکی خوشنما عمارت ابھرنے لگی۔ جو آج تک حضرت پیر بخش رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے نام سے مشہور چلی آتی ہے اور جہاں ہزاروں دیہاتی جمع ہو کر ہر سال عرس مناتے ہیں۔ طوائفیں اور قوال اپنے اپنے گلے کے جوہر دکھاتے ہیں اور دس من کی دیگ پورا ایک ہفتہ چڑھی رہتی ہے! ٭

جنوری ۱۹۵۵ء

اور پھر وہ دن — جب ہمارے پاس کسی وقت
کھانے کے لئے کچھ نہیں ہوتا تھا۔

عائشہ احمد

# روپ نگر کی سواریاں

انتظار حسین

منشی رحمت علی حسبِ عادت منہ اندھیرے تانگوں کے اڈے پر پہنچ گئے۔ اڈہ سنسان پڑا تھا۔ چاروں طرف دو چار تانگے نظر آتے تھے لیکن بے جتے ہوئے۔ ان کے بموں کا رخ آسمان کی طرف تھا اور چھتریاں زمین کی طرف جھکی ہوئی تھیں۔ جا بجا کھونٹوں سے بندھے ہوئے گھوڑے یا تو اونگھ رہے تھے یا ایک الکساہٹ کے ساتھ اپنے آگے پڑی ہوئی گھاس چر رہے تھے۔ البتہ پاس پاس والے خشک تالاب کی گندی منڈیروں پر منڈلاتے ہوئے بعض گدھ بہت بیدار نظر آتے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ان کے رینگنے کا ایسا تار بندھتا تھا کہ ٹوٹنے میں نہ آتا تھا۔ اس پورے ماحول میں جو چیز سب سے زیادہ چمک رہی تھی وہ سامنے ڈاک خانے کے دروازے کے برابر والا سرخ لیٹر بکس تھا۔ اس سے چار قدم پرے لال چھوٹی کی کھپچیوں والی دوکان بند پڑی تھی لیکن اس کے چبوترے پر جنگلی کبوتروں کا ایک غول اتر آیا تھا۔ یہ کبوتر اناج کے اکا دکا دانے چنتے اور اس قدر قریب آ جاتے کہ ان کا رنگ وجود ختم ہو جاتا اور زمین پر بس ایک مٹی سا سایہ پھیلا نظر آتا۔ کنوئیں کے قریب املی کے درخت کے نیچے چھدا اپنے تانگے کے گھوڑے کو دانہ کھلا رہا تھا۔ دور سے وہ صورت تو نہیں پہچان سکا لیکن چال ڈھال اور حلیہ دیکھ کر اس نے تاڑ لیا تھا کہ ہو نہ ہو یہ منشی رحمت علی ہیں اور جب وہ ذرا قریب آئے تو چھدا نے آواز لگائی "میاں چلو رستے اور!"

"ابے چلو نہ ہو، تو مجھے کیا باؤلے کتے نے کاٹا تھا جو صبح ہی صبح اڈے پر آتا؟"

"تو بس میاں آ جاؤ۔ میں بھی تیار ہوں۔ اب گھوڑا جوتا۔"

لیکن بھاؤ تاؤ کیے بغیر کوئی کام کرنا منشی رحمت علی کی وضعداری کے خلاف تھا اور بات یہ ہے کہ بہت چالاک بننے کی کوشش میں کبھی کبھی وہ چوٹ بھی کھا جاتے تھے۔ بہرحال وہ تو اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔ آگے اللہ میاں کی مرضی۔ چھدا کا پہلا وار تو خالی گیا۔ اب اس نے دوسری چال چلی "اجی منشی جی! تم سے زیادہ تھوڑا ہی لوں گا۔ بس خوشی سے دے دیجیو۔"

"جیسا میرا تیرا سودا نہیں پٹے گا۔" منشی رحمت علی نے قطعی طور پر اپنی ناراضامندی کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے اپنا رخ سامنے والے تانبے کی دوکان کی طرف کر لیا تھا لیکن چھدا نے انہیں جاتے جاتے پکڑ ہی لیا "تو میاں تم کیا دوگے؟" منشی رحمت علی نے بات دونی سے شروع کی اور بالآخر تین آنے پر ٹک گئے۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا "کان کھول کے سن لے تین آنے سے ایک کوڑی زیادہ نہیں دوں گا۔"

چھدا نے بھی قطعی جواب دے دیا "اجی میاں تین آنے تو نہیں ہوں گا۔" اور جب وہ جانے لگے تو چھدا نے چلتے چلاتے ایک ٹکڑا اور لگا دیا۔ "ہمیں بھی دیکھنا ہے کہ تین آنے میں کون سا تانگے والا منشی جی کو روپ نگر پہنچا دے گا۔" لیکن منشی رحمت علی نے چھدا کا کہنا سنا ان سنا کر دیا۔

تُلے ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ بات بھی سنی ان سنی کر دی اور نانبائی کی دوکان کی طرف چل پڑے۔ دور سے ہی انہوں نے صدا لگائی "ابے گلزار حقہ تازہ کیا؟"

گلزار نے تنور کی آگ بھڑکاتے ہوئے جواب دیا "آجاؤ منشی جی حقّہ تازہ کر لیا ہے۔"

منشی رحمت علی نے حقے کی بدمیل اور نیچی منھی میں دبائی اور بڑے اطمینان اور فراغت کے ساتھ کش لگانے شروع کر دیئے۔ چھدا مات تو پہلے ہی کھا چکا تھا۔ منشی جی کے اس اطمینان نے اس کا رہا سہا حوصلہ بھی ختم کر دیا۔ اطمینان اور بے نیازی کا مظاہرہ کرنے میں اگرچہ اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن اندر سے اس کا دل دھکڑ پکڑ کر رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اور کوئی اِکّے والا آن ٹپکے اور اچھی خاصی سواری کو اُچک لے۔ لیکن وہ اتنی سستی اسامی بھی نہیں تھا کہ اس معمولی اعصابی جنگ میں منشی رحمت علی سے اتنی جلدی ہار مان لیتا۔ اس نے بدحواسی تو یقیناً نہیں دکھائی لیکن پھر بھی ذرا اک عجلت سے دانے کی باٹی اِکّے کے خانے میں رکھی اور اِکّے کو جوتنا شروع کیا۔ گھوڑا جوتنے کے بعد وہ اِکّے پر بیٹھ کر اطمینان کے ساتھ آواز لگائی "روپ نگر کی سواری" گلزار کی دوکان پر حقّہ کی گڑگڑ کی آواز بدستور ایک اطمینان اور بے نیازی کی کیفیت کا اظہار کئے جا رہی تھی۔ چھدا نے ایک ڈیڑھ منٹ انتظار کیا اور جب حقّے کی آواز میں کوئی نمایاں فرق نہیں پڑا تو اس نے طے کیا کہ تالاب کے گرد ایک چکّر لگا لینا چاہیئے۔ اس طرح یہ بھی ممکن ہے کہ کسی اور سواری سے مڈبھیڑ ہو جائے، اس نے آہستہ سے لگام کھینچی اور گھوڑے نے خراماں خراماں چلنا شروع کر دیا۔ تالاب کے دوسری طرف پن چکی کے سامنے کلیا بھنگن لمبا گھونگھٹ نکالے سڑک پر جھاڑو دے رہی تھی۔ چھدا کئی مرتبہ مختلف طریقوں سے کھنکارا مگر اس کے باوجود کلیا کی جونے اس کی پرواہ کی تو پھر اس نے براہِ راست خطاب کر ڈالا۔

"اری اس کلیا لنگڑی کو بہت روٹیاں لگ گئی ہیں، نہ جھاڑو دینے آتی ہے نہ ٹھکانوں پر پہنچتی ہے۔ تجھے ٹھکانے مارتی ہے۔" لیکن دوسری طرف سے کوئی ہمت افزا جواب موصول نہیں ہوا، اور یوں بھی چھدا کو اس وقت اتنی فراغت کہاں میسّر تھی جو وہ پہل کرتا۔ چنانچہ اس نے اپنا راستہ بدل دیا اور چند قدم آگے چل کر بڑی شانِ تغافل سے آواز لگائی "روپ نگر کی سواریاں" سامنے سیٹھ ہردیال مل کے مکان کے سب سے اونچے کنگرے پر ایک کالے مرداسفید کبوتر بیٹھا اونگھ رہا تھا اور چھدا کو یکایک یاد آیا کہ رات شمّی کی کمسری گھر واپس نہیں پہنچی تھی۔ ابھی وہ اسی قدر سوچ پایا تھا کہ دور کی سڑک سے اِکّے کی گھڑ گھڑ کی آواز آئی اور اس نے ہڑبڑا کر گھوڑے کے ایک چابک رسید کیا۔ چھدا کی قوتِ مدافعت نے بالآخر گھٹنے ٹیک دیئے۔ ٹھیک گلزار کی دوکان کے سامنے پہنچ کر اس نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور کسی قسم کا انتظار کئے بغیر سوال کیا "منشی جی۔ آج تحصیل پہنچنے کے جی میں نہیں ہے کیا؟"

"ہمیں تو تحصیل جانا ہی ہے تو نہ سہی تیرا بھائی اور سہی۔ مگر تو کہہ تیرے جی میں کیا ہے ابے اِکّہ چلاتا ہے کہ ٹھگی کرتا ہے؟"

"اجی منشی جی بگڑتے کیوں ہو اِکّہ تو تمہارا ہی ہے بیٹھ جاؤ۔ پیسے پھلے مت دیجو۔"

منشی رحمت علی ٹھہرے وضعدار آدمی، اس بات پر بہت بگڑے "ابے تو نے ہمیں سمجھا کیا ہے۔ ہم چونّے اچنتے نہیں۔ پچھے لفنگے نہیں۔ پہلے نک پر پیسہ راستے میں پھر بیٹھتے ہیں کوئی اِکّے والے جانتے ہیں آج تک ہم کبھی مفت بیٹھے ہوں۔"

"تو میاں منشی جی۔ غصّے کیوں ہوتے ہو۔ پیسہ دھیلا کمتی بڑتی دیدیجو، اچھا لو تم بھی کیا یاد کرو گے۔ چھ آنے دیدیجو۔"

لیکن منشی رحمت علی ایسی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں تھے انہوں نے کھرا جواب دیا "چھ آنے تو تو مرتے مرجائے گا تب بھی نہیں دونگا۔ تو ہے کس ہوا میں؟"

گلزار نے محسوس کیا کہ اب میرے بیچ میں پڑنے کا وقت آگیا ہے اس نے چھدا کو ڈانٹ بتائی "ابے چھدا منشی جی کو کیوں تنگ

کر رہا اسے ٹھیک دام کیوں نہیں بتا دیتا؟"

چھدا نے اپنی بیگناہی جتائی "لو بھئی میں کیا تنگ کر رہا ہوں، اتنا کرایہ کم کر دیا لیکن منشی جی ہیں کہ سامان ہیں نہیں آتے۔"
گلزار بولا "اچھا اے بھئی نہ تیری بات رئی نہ منشی جی کی، چونی ہو گئی۔"

منشی رحمت علی نے ظاہری طور پر تھوڑی سی ہچر مچر کی اور راضی ہو گئے۔ چھدا نے اپنی بات ایک دوسرے طریقہ سے نباہی:
"آج تو منشی جی سے ہی بونی کروں گا۔ بڑی بھاگوان سواری ہیں۔" اور ٹاٹ کی پوشش درست کرتے ہوئے بولا "اچھا تو بس بیٹھ جاؤ منشی جی اب دیر کا وقت نہیں اے۔"

منشی رحمت علی دراصل ایک انفرادی سواری کی حیثیت سے چھدا کی نظر میں ایسی زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ ان کی اہمیت اس لئے تھی کہ ان کی وجہ سے دوسری سواریوں کے لئے راستہ ہموار ہوتا تھا۔ چھدا اس نکتہ سے خوب آگاہ تھا کہ خالی چھتری پر کبوتر نہیں گرتا۔ پیسہ کو پیسہ اور سواری کو سواری کھینچتی ہے۔ جس اکے میں پہلے سواری بیٹھ گئی، سمجھو کہ وہی اکہ سب سے پہلے بھرے گا۔ سواریاں اوپر کر اسی اکے پر ٹوٹتی ہیں جس میں کوئی سواری پہلے سے بیٹھی ہو۔ اس وقت اگرچہ اور اکے بھی اڈے پر آ گئے تھے اور ایک سے ایک بڑھیا اکہ کھڑا تھا لیکن پھر بھی چھدا کا پلڑہ جھکا ہوا رہا۔ یہ صحیح ہے کہ سارے اکے والوں سے اس کا مقابلہ نہیں تھا۔ روپ نگر کے سوا اور منزلیں بھی تھیں جہاں کی صدائیں لگ رہی تھیں لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اس وقت روپ نگر جانے والوں کا بازار سب سے زیادہ گرم تھا اللہ دتے کا اکہ سب سے زیادہ چمک رہا تھا۔ شاید اڈے پر سب سے اونچا اکہ اسی کا تھا۔ چھتری پر سفید لٹھے کا غلاف اس نے کل پرسوں ہی چڑھوایا تھا۔ پشت پر جو سفید پردہ لہرا رہا تھا اس کے کناروں پر سرخ دھاگے سے بیل کڑھی ہوئی تھی۔ ڈنڈوں پر پیتل کی ایک ایک انچ چوڑی پتیاں چمک مار رہی تھیں۔ پھر گھوڑا خوب تیار تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ پہیوں میں ربڑ کے ٹائر لگے ہوئے تھے۔ نصر اللہ کا اکہ تھا تو چھوٹا سا لیکن سجا بنا وہ بھی خوب تھا۔ نصر اللہ نے اس مرتبہ اپنے اکے پر نیلا رنگ کرایا تھا۔ پورا اکہ چمک رہا تھا اگر اس وقت اللہ دتے کا اکہ نہ ہوتا تو پھر تو نصر اللہ ہی نصر اللہ تھا۔ نصر اللہ بھی سواریوں کو گانٹھنے کے لئے طرح طرح کے جتن کر رہا تھا لیکن چھدا ہر نئی سواری کی آمد پر کچھ اس انداز سے باگ اٹھا کر اپنے چلنے کے عزم کا اظہار کرتا تھا کہ سواری خواہ مخواہ اس کی طرف راغب ہو جاتی تھی۔ ایک سواری تو نصر اللہ کے اکے میں بیٹھی اور پھر اتر کر چھدا کے اکے میں جا بیٹھی۔ اس بات پر چھدا اور نصر اللہ میں خوب ٹھنی نصر اللہ کو شکایت تھی کہ "چھدا نے بے ایمانی سے سواری توڑی ہے۔" اور چھدا کہتا تھا کہ "سالے تیرا اکہ نہ اکے کی دم۔ سواری اتر کے میرے پاس چلی آئی۔ میں ویسے منع کر دیتا؟" بڑی مشکل سے سارے اکے والوں نے مل کر بیچ بچاؤ کرایا۔ البتہ اللہ دیا بہت مطمئن تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ جو وقار اس کے اکے اور گھوڑے سے ٹپک رہا تھا وہی شان اس کی حرکات و سکنات سے عیاں تھی۔ اس وقت عام بھاؤ چونی سواری کا تھا لیکن اللہ دتے کا تانگہ ربڑ ٹائر تھا۔ وہ چھ آنے سے کوڑی کم لینے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے کسی سواری کو بڑھ کر اچکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ وہ جانتا تھا کہ ایرا غیرا تو میرے اکے میں بیٹھے گا نہیں۔ رئیس سواریاں ہی بیٹھیں گی اور وہ میرے اکے کو دیکھ کر خود میری طرف آئیں گی۔ پرمیشری نے پہلے اللہ دتے کی طرف ہی رخ کیا تھا اور اللہ دتے نے بھی اس کا خیر مقدم کیا "آ جاؤ ٹھاکر صاحب۔" لیکن چھ آنے کا نام سن کر پرمیشری کا دم خشک ہو گیا، اور وہ چپکے سے سٹک کر چھدا کے اکے میں جا بیٹھا۔ پرمیشری کے آ جانے سے اکے میں پانچ سواریاں ہو گئی تھیں۔ اکے میں نہ سہی لیکن چھدا کے دل میں اب بھی جگہ تھی لیکن سواریوں کا پیمانۂ صبر اب لبریز ہو چکا تھا۔ انہوں نے کھلے الفاظ میں کہا "بھائی اکہ نہیں چلا تو ہم سب اتر پڑیں گے۔" چھدا نے ہنٹر اٹھایا اور اکے والوں پر ایک فاتحانہ نگاہ ڈالی۔ سب اکے والے ہی

اپنی جگہ زور مار رہے تھے کہ ہمارا اکّہ اڈّے سے پہلے چلے، لیکن سب دھرے کے دھرے رہ گئے اور چھدّا نے بہت تمکنت سے اپنے گھوڑے کے چابک رسید کرکے اپنی روانگی کا اعلان کیا۔ چھدّا نے اگرچہ اپنے اکّے کی رائے عامہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا تھا لیکن جب دو قدم آگے بڑھنے کے بعد اس نے نتھوا چمار کی جورو کو بن ٹھن کر گلی سے نکلتے دیکھا تو جلدی سے بڑھ کر پوچھا "اری روپ نگر چلے گی؟" لیکن نتھوا کی جورو نے چھدّا کی بات سننے سے صاف انکار کر دیا اور سونتی ہوئی اڈّے کی طرف چلی گئی۔ آگے چل کر جب اس نے ایک گنواری کو سر پہ گٹھری رکھے جاتے ہوئے دیکھا تو اس کی نیت میں پھر فتور آگیا اور سواریوں کے احتجاج کے باوجود اس نے اسے دعوت دے ہی ڈالی:

"اری ڈکریا روپ نگر چل رئی اے؟"

گنواری نے چھدّا کے سوال کا جواب سوال سے دیا "اچھا دری کا کبالیوت ہے رے؟"

"آ بیٹھ جا چونّی دے دیجو"

چونّی کا نام سن کر گنواری بدک گئی اور سیدھی اپنے رستے پر ہولی۔ چھدّا نے اسے پھر ٹوکا "اری منہ ہے تو پھوٹ۔ تو کیا دینے کہت ہے؟"

"مو پہ تو اکنی اے"

"لمبی بن۔ مرنے چلی ہے کفن کا ٹوٹا" اور تاؤ میں آکے اس نے گھوڑے کو تڑاخ سے چابک رسید کیا۔

چھدّا کا اکّہ اب تمباکو خانے سے آگے نکل آیا تھا اتنے میں پیچھے سے ایک گرجدار آواز آئی "ابے او چھدّا۔ اکّہ روک بے"۔ چھدّا نے اکّہ روک لیا۔ شیخ جی اپنی لاٹھی ٹیکاتے مونچھوں کو تاؤ دیتے چلے آرہے تھے۔ سواریوں کا اندر ہی اندر خون بہت کھولا، اور چھدّا بھی اس نئی سواری کے بارے میں کچھ زیادہ پُرجوش نہیں تھا لیکن دم مارنے کی مجال کس کو تھی۔ شیخ جی آئے اور بغیر سواری چکائے اکّے میں آن بیٹھے۔ منشی رحمت علی کو شیخ جی نے دیکھا تو بس کھل گئے "اخاہ، منشی جی ہیں۔ اماں کدھر کو؟"

"اماں کدھر کو کیا۔ وہی ملّا کی دوڑ مسجد تک۔ اس حرام زادی تحصیل کو جانا تو قبر میں جانے کے بعد ہی بند ہوگا"

بس اتنے سے دیر تھی سودہ مل گیا تھا۔ شیخ جی جھٹ نمبردار کا ذکر نکال بیٹھے "منشی جی تم تحصیل سے اتنا کیوں بدکتے ہو۔ ایک اپنے نمبردار بھی تو ہیں۔ روز کچہری میں کھڑے رہتے ہیں۔ ہر چھٹے مہینے ایک جعلی مقدمہ کھڑا کر دیتے ہیں۔ جس روز عدالت کا منہ نہیں دیکھتے ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا"

"اماں شیخ جی بات یہ ہے کہ" منشی رحمت علی بھلا ایسے موقع پہ کہاں چوکنے والے تھے اور نمبردار کا ذکر تو یوں بھی ان کے تخیل کے لئے مہمیز کا کام کرتا تھا —— "اپنی اپنی عادت ہوتی ہے۔ پیٹ بُری بلا ہے۔ یہ سب کچھ کراتا ہے ورنہ اشرافوں کا یہ طور تھوڑا ہی ہے کہ روز تھانے تحصیل کے کٹہرے رگو۔ نمبردار صاحب سے پوچھو کر بھئے آدمی تیرے الغاروں پیسہ بھرا پڑا ہے۔ تیری سات پشتیں بیٹھ کے کھائیں گی اور مزے کریں گی۔ تو نے اپنے پیچھے یہ کیا پخ لگا لی ہے۔ آج اس پہ نالش ٹھونک دی، کل اس پہ مقدمہ چلایا۔ یہ سوں فلاں کی قرقی کرائی۔ بھلے مانس گھر میں بیٹھ۔ اللہ اللہ کر۔ غریب غرباؤں کو کچھ دے دلا۔ حج کو جا۔ دنیا میں تو اتنا روسیاہ ہو لیا۔ اب کچھ عاقبت کی فکر کر۔ مگر....."

یہاں آکر شیخ جی نے ان کی گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ شیخ جی یوں بھی زیادہ لمبی تقریر کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے اور پھر عاقبت کے لفظ پر تو ان کے ہاتھ سے صبر کا دامن بالکل ہی چھوٹ گیا۔ بات کاٹ کے بولے "اجی عاقبت کی فکر —— توبہ کیجئے، منشی جی، ایسے

لوگ اگر عاقبت کی فکر کرنے لگیں تو جہنم کے لیے ایندھن کہاں سے آئے گا۔ یہ شخص تو دوزخ کا کندا بنے گا کندا۔"

منشی رحمت علی کو شیخ جی کی بات سے پورا پورا اتفاق تھا۔ لمبا سا سانس لے کر بولے۔" ہاں میاں۔ یہ دولت ہے ہی بُری چیز۔ آنکھوں پر چربی چھا جاتی ہے۔ آدمی کو قارون کا خزانہ بھی مل جاوے تو بھی اس کی ہوس پوری نہیں ہوتی۔"

چھدا اب تک تو گھوڑے پر چابک برسانے میں مصروف تھا لیکن اب گھوڑا راہ پر آ گیا تھا۔ چھدا کو جب اس طرف سے فراغت ہوئی تو اس کی طبع موزوں نے بھی زور مارا۔" میاں یہ لمبردار بڑا موذی ہے۔ سالے نے میرے پھوپا کو اٹھنگے میں لا کے وس کے سارے کھیت کوڑیوں میں خرید لیے۔" اور پھر ذرا آواز بلند کر کے بولا۔" شیخ جی تمہیں یقین نہیں آئے کہ یہ سالا چوروں سے ملا ہوا ہے۔"

شیخ جی کو بھلا کیوں یقین نہ آتا۔ نمبردار صاحب کے متعلق وہ ہر بات یقین کرنے کو تیار تھے۔ چھدا کی بات پر انہیں کچھ ذرا تاؤ آیا بولے کہ" ابے یقین نہ آنے کی کیا بات ہے۔ میں نمبردار کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ اجی وہ سات تالوں میں بھی کوئی کام کرے گا تو مجھے پتہ چل جائے گا۔ اب تک تو خیر میں یہ بات منہ پر لایا نہیں تھا لیکن اب بات منہ پر آ ہی گئی ہے تو کہتا ہوں کہ ..."اور میاں اکرشیخ جی کی آواز دھیمی پڑ گئی اور اس نے تقریباً سرگوشی کا انداز اختیار کر لیا۔" میاں محلے میں جتنی چوریاں ہوئی ہیں ان سب میں نمبردار کا ہاتھ ہے۔" اِ بریشری کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ منشی رحمت علی کے منہ سے بے ساختہ" اچھا" نکل گیا۔ لیکن چھدا نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے دعوے کی تائید بہت شاندار طریقے پر ہوئی تھی۔ اب اس نے اور ہاتھ پیر پھیلائے۔ کہنے لگا۔" اس لمبردار نے تو میرے باپ کا ڈبا کر دیا۔ وس نے اتنی محنت سے میری بہو کے لیے زیور اور کپڑا خریدا تھا۔ سالے نے کو مل لگوا دیا۔ صبح جو اٹھیں ہیں تو کیا دیکھیں کہ گھر میں ایک کی بجائے دو دروازے بنے ہوئے ہیں جو اس دروازے سے لائے تھے وہ وس دروزے سے نکل گیا۔" اور یہ کہتے کہتے چھدا کو یکایک احساس ہوا کہ گھوڑے کی رفتار سست پڑ گئی ہے۔ اس نے ساٹ سے ایک چابک رسید کیا لیکن گھوڑے نے آگے بڑھنے کی بجائے دولتیاں چھینکنی شروع کر دیں۔ چھدا نے تاؤ میں آ کر للکارا۔" ہت تیری دُم میں کشکشا۔" اور سٹر سٹر ہنٹر برسانے شروع کر دیتے۔ مار کے آگے تو بھوت بھی بھاگتا ہے۔ چھدا کا گھوڑا تو پھر گھوڑا تھا۔ اڑ کے کھڑا ہو گیا، دولتیاں چھینکیں، الف کھڑا ہو گیا، ہنہنایا اور بالآخر پھر سیدھے سبھاؤ دوڑنے لگا اور جب اکہ اپنی پوری رفتار پر چلنے لگا تو چھدا کو ایک عجیب سی آسودگی کا احساس ہوا۔ اس نے چابک کا ٹٹ سرا خواہ مخواہ پہیے کے ڈنڈوں پر لٹکا دیا۔ کنکروں کی سڑک پر جب اکہ تیزی سے دوڑتا ہے تو ہنگم کھردرے شور کا ایک تسلسل قائم ہو جاتا ہے اور پھر پہیے کے ڈنڈوں اور چابک کے تصادم سے پیدا ہونے والا کٹ کٹ کا یہ تیز شور متزاد، خام اور کھردری آوازوں کے اس ترنم میں چھدا نے اپنے آپ کو گم ہوتا ہوا محسوس کیا اس نے مزے میں آ کر تان لگائی:

دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے

اب چھدا کسی دوسری دنیا میں پہونچ گیا تھا۔ شیخ جی اور منشی جی اب بھی اسی جوش و خروش کے ساتھ نمبردار کے کردار پر تنقید کئے جا رہے تھے۔ لیکن چھدا کو بس اب اتنا محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں دور سے دھند میں لپٹی ہوئی آوازیں اس کے کانوں میں آ رہی ہیں۔ اسے اس غزل کا اکتا سیدھا ایک سالم شعر بھی یاد تھا جب ایک مصرعہ پڑھتے پڑھتے اس کی طبیعت سیر ہو گئی تو اس نے ایک نئی ترنگ کے ساتھ اس شعر کو گانا شروع کیا:

اے دیکھنے والو مجھے ہنس ہنس کے نہ دیکھو ۔۔۔ دنیا نہ تمہیں بھی کہیں دیوانہ بنا دے

لیکن سرور اور سرشاری کی یہ کیفیت دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ اچانک پیچھے ایک دوسرے اکے کی آہٹ ہوئی اور چشم زدن میں اللہ دیا اور اس کا

تنو مند گھوڑا برابر میں سیدھے ہاتھ پر نظر آیا اور اُوجھل ہو گیا، البتہ اِکّے کی پُشت پر لہراتا ہوا سفید پردہ کافی دیر تک نظر آتا رہا۔ ممکن ہے چھدّا اس واقعہ کو گول کر جاتا لیکن بد بختی نے بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ منشی رحمت علی کو ٹہوک کر بولا "منشی جی۔ یو اللہ دیا چوکھا رہا۔ جو سمراتہ چلا تھا وا کے اِکّے میں کا ہو سواری نائے تھی۔"

چھدّا بہت گھٹا، کہنے لگا "مہاراج اس کا اکڑ ہے بھی تو رہتا پر۔"

لیکن شیخ جی چھدّا کی بات کاٹ دی "ابے سالے اِکّے کی بات نہیں ہے۔ اس کا گھوڑا بہت تیار ہے، اشارے پر چلتا ہے، واہ کیا گھوڑا ہے جسم شیشے کی طرح چمکتا ہے۔"

"ہاں صاحب کھلائی کی بڑی بات ہے۔" منشی رحمت علی نے لقمہ دیا۔

شیخ جی کے لہجے میں اور گرمی پیدا ہو گئی "منشی جی اس ٹکر کا گھوڑا اس وقت سارے قصبے میں کسی کے پاس نہیں ہے۔"

اللہ دیئے کے گھوڑے کی تعریف پر چھدّا کا تخیل بہک نکلا۔ کہنے لگا "میاں تم نے میری گھوڑی نہیں دیکھی۔ واہ کیا فروٹ جاتی تھی، یہ سالا اللہ دیئے کا گھوڑا اوس کے سامنے کیا ہے!"

"ابے تیرے پاس گھوڑی کس دن ہوتی تھی؟" شیخ جی آج ہر طرح چھدّا کی توہین کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔

چھدّا بھی گرم ہو گیا۔ بولا "شیخ جی تمہیں ہی تو پتہ نہیں اے۔ میاں میں نے دلّی میں گھوڑی خریدی تھی۔ وہ گھوڑی تھی۔ بس کیا پوچھو ہو۔ ادھو ہو ہنٹر چھوا اور ہوا ہوئی، اور میاں جیسی گھوڑی تھی ویسا ہی تانگہ تھا۔۔۔ منشی جی دلّی میں اِکّے نئیں چلتے۔"

"تو پھر بگھیاں چلتی ہیں۔" منشی رحمت علی نے ہنس کر جواب دیا۔

"لو میاں میں جھوٹ بول رہا اوں۔" چھدّا کو بھی اپنے اوپر پورا اعتماد تھا "سو سو روپے کی شرط رہی، اگر کوئی دلّی میں مجھے اکّہ دکھا دے تو غلام بن جاؤں۔ وانپہ تو تانگے چلتے ہیں۔ میاں تانگہ بھی خوب ہو وے ہے۔ اوپر ٹپ پڑی رہوے ہے۔ دھوپ ہو تو ڈال دو۔ ہوا کھانے کو جی چاہے تو ٹپ گرا دو۔"

منشی رحمت علی اور جھلائے "سالی سواری نہ ہوئی چھتری ہو گئی۔"

چھدّا نے بڑے فخر سے جواب دیا "ہاں میاں یہی تو ٹھاٹ ہیں۔ ایک ٹکٹ میں دو مزے۔ دس تانگے سے میں نے بھی وہ کمایا کہ بس میرے پو بارے ہو گئے۔ گھنٹہ گھر سے فوارہ، فوارے سے جمعہ مجت۔ جمعہ مجت سے حوض قاضی، حوض قاضی سے بارہ کھمبے۔ اور جدھر نکل جاؤ سواریں ہی سواریں لے لو۔ یہاں کی طریوں تھوڑائی کہ اڈے پر بیٹھے اونگھ رہے ایں کہ اللہ بھیج مولا بھیج اور سواری آوے ہے تو دس کی انٹی سے پیسہ نئیں نکلتا۔"

شیخ جی بولے "ابے وہ شہر ہے وہاں کا اور یہاں کا کیا مقابلہ۔"

لیکن چھدّا تو گرمی کھا گیا تھا اب وہ کہاں چپکا ہونے والا تھا بولا "شیخ جی ایک دلّی پر ہی تھوڑائی ہے۔ سال کے سال میرٹھ کی نوچندی پر جاوے تھا۔ دلّی سے نکل کے جو بھیا دوڑ لگے تھی تو بس پھر رُکنے کا نام نئیں۔ میرٹھ پر ہی جا کے رکیں تھے۔ میری گھوڑی بھی فر فر جاوے تھی، بس ایک ہنٹر لگایا اور گھوڑی اُڑن چھو ہوئی اور پھر میرٹھ میں دسے پھیرے پر پھیرا۔ گھنٹہ گھر سے نوچندی، نوچندی سے گھنٹہ گھر۔ سارے میرٹھ والے بھی میرے سامنے چوکڑی بھول گئے تھے اور بھیا شام کو نوچندی میں جا کے پشاوری سے آدھ سیر پراٹھے کباب تلوائے اور ڈیڑھ پاحلوا لیا اور کھا پی مونچھوں پہ تاؤ دیتے یار جی ٹھنڈ ٹھنڈ میں گھر کو آ گئے۔"

"واہ بے مسخرے!" منشی رحمت علی سے اب ضبط نہ ہو سکا "ابے ساری شیخی تیرے ہی حصہ میں آئی ہے۔ میں پوچھوں ہوں کہ تیرے جب یہ ٹھاٹ تھے تو تو یہاں کس لئے آمرا!"

"منشی جی" چھدا کی آواز گلوگیر ہو گئی "یہ میرا باپ بڑا ستیاناسی ہے، میں تو کبھی نہ آتا مگر وس نے مجھے واں ٹکنے نئیں دیا۔ یاں اب کرموں کو روؤں ہوں جو کما کے لایا تھا وہ سارا چوری میں نکل گیا!"

شیخ جی تو گویا اُدھار کھائے بیٹھے تھے، بس چوری کا لفظ پکڑ کے انہوں نے اپنی بات پھر شروع کر دی۔ نمبردار پر جو گفتگو انہوں نے شروع کی تھی یا تو وہ خود تشنہ رہ گئی تھی یا پھر ان کی طبیعت سیر نہ ہوئی تھی۔ بہر حال چھدا نے بیچ میں جو موضوع چھیڑ دیا تھا اس کے معاملہ میں وہ کچھ زیادہ پُرجوش نہیں تھے۔ اب جو چوری کی بات آئی تو شیخ جی کو ڈور کا ٹوٹا ہوا سرا مل گیا۔ کہنے لگے "میاں جب تک یہ نمبردار ہیں اس وقت تک یاں کسی کا گھر بار محفوظ نہیں ہے!"

"اماں لوٹ مار تو ان کا آبائی پیشہ ہے۔ یہ دولت چھپر پھاڑ کے تو آئی نہیں ہے۔ ایسے ہی جمع ہوئی ہے۔ اللہ بخشے ان کے باپ اشرف علی ان سے بھی چار جوتے بڑھے ہوئے تھے، اور یہاں پہونچکر منشی رحمت علی کی گفتگو نے ایک اور پلٹا کھایا "اب گڑے مردے کیا اکھیڑنا۔ میاں اشرف علی کی حیثیت کیا تھی، نال نکالا کرتے تھے۔ ہمارے والد مرحوم کو تو دنیا جانتی ہے، کبھی پیسے کو پیسہ نہ سمجھا، جوئے کی لت پڑ گئی تھی۔ ساری دولت جوئے کی راہ اڑا دی۔ ایک روز جوا زوروں پر ہو رہا تھا، والد صاحب گرکے مٹے جب سب کچھ دے بیٹھے تو انہوں نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ اشرف علی نے پچاس روپلی سرکا دیئے اور سید پور کا کاغذ لکھوا لیا۔ مقدر کا کھوٹ، وہ پچاس روپے بھی ہار گئے اور لیں میاں ہمارا پورا گاؤں ان حضرت اشرف علی کے ہتھے چڑھ گیا!"

شیخ جی نے اس بات کی بہت زور و شور سے تائید کی "اجی یہ واقعہ کون نہیں جانتا۔ آپ کے والد بھی بڑے جنتی تھے۔ کوڑیوں کے مول ریاست بیچ ڈالی!"

منشی رحمت نے آہ سرد بھرتے ہوئے کہا "میاں اب اُن پرانی باتوں کا کیا یاد کرنا۔ والد صاحب خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے انہوں نے بہت کمایا لیکن رکھنا نہ جانا، اور کوئی ہوتا تو اس پیسے سے سونے کی دیواریں کھڑی کر جاتا۔ مگر انہوں نے جتنا کمایا اس سے زیادہ کھایا اور جتنا کھایا اس سے زیادہ لٹایا۔ علی گڑھ کی مدار دروازے والیوں نے اسی پیسے سے محل کھڑے کرا لئے اور زہرہ جان تو گھر ہی آکر پڑ رہی تھیں۔"

زہرہ جان کا نام سن کر چھدا تڑپ اٹھا۔ "واہ میاں زہرہ جان کی بھی کیا بات تھی۔ میرا باپ کہا کرے ہے کہ وس کی آواز کیا تھی بس بپتا تھی!"

منشی رحمت علی کی بات کو سہارا ملا تو وہ ذرا اور چہکے "اماں یاں والوں نے اسے کہاں سنا ہے۔ جب یاں آئی تھی تو اس کا گلا خراب ہو چکا تھا دشمنی میں آکر کسی نے اسے سندور کھلا دیا تھا، مگر ہاتھی مر کر بھی سوا لاکھ کا۔ اس کے بعد بھی یہ حال تھا کہ محفل میں تہلکہ مچا دیتی تھی۔ بس والد صاحب اس کی آواز پر لوٹ ہو گئے!"

شیخ جی نے لقمہ دیا "اجی آپ کے والد کے بھی رئیسوں کے سے کاروبار تھے اور بھئی کیوں نہ ہوتے آخر کو بڑے باپ کے بڑے بیٹے تھے!"

منشی رحمت علی نے پھر لمبا سا ٹھنڈا سانس لیا اور ہاں میاں خود چین کر گئے ان کی اولاد پاپڑ بیل رہی ہے۔ جس کے گھر لکھ لٹتے تھے، اس کا بیٹا رحمت علی آج کارندہ گیری کرکے اپنا پیٹ پالتا ہے۔ بچپن میں کبھی بگھی کے سوا دوسری سواری نہیں دیکھی۔ آج کرائے کے اکّوں میں بیٹھے چکر کاٹتے پھرتے ہیں۔ کوئی دھیلے کو نہیں پوچھتا!"

چھدا مرعوب ہو کر بولا "ہاں جی آپ ٹھہرے پوتڑوں کے رئیس، اور میاں یہ نمبردار صاحب . . . اس مرتبہ شیخ جی کا فریضہ چھدا

نے ادا کیا: "میر لمبردار صاحب تو مجھے یونہی لگیں ہیں۔ میاں کچھ ہی ہو ان کی شہر میں عزت آبرو تو ہے نئیں۔ ہر شخص و نہیں گالنئیں دلیوے ہے۔"

شیخ جی چمک کر بولے "اماں عزت آبرو کہیں خالی پیسے سے ہوا کرتی ہے۔ گھسیارا لاکھ راجہ بنجائے رہیے گا گھسیارا ہی۔"

چھدّا کا گھوڑا اس وقت بقول چھدّا فروٹ اڑا چلا جا رہا تھا۔ گڈہوں والی سڑک پیچھے رہ گئی تھی۔ سامنے سڑک دور تک ہموار نظر آ رہی تھی اور خالی پڑی تھی۔ دائیں بائیں آم جامنوں اور شیشم کے ہرے بھرے درخت جھکے کھڑے تھے۔ اس وقت چھدّا کی روح کاروان رواں ناچ رہا تھا۔ اس کا گھوڑا جب بھی بغیر ہنٹر کا انتظار کئے تیزی سے دوڑتا تھا اس کی روح وجد کرنے لگتی تھی۔ اس نے مزے میں آ کر ایک سوال کر ڈالا "میاں یہ لمبردار اپنے آپ کو سید کہویں ہیں۔"

"سید" شیخ جی کے لہجہ میں طنز کے ساتھ ساتھ اہانت کا پہلو بھی پیدا ہو گیا تھا "خدا کی قدرت دیکھو، بہشتی بھی سید ہونے لگے۔ منشی جی سن رئے ہو۔"

منشی جی بہت اطمینان سے کھنکارے اور پھر سر سے ململ کی گول ٹوپی اتارتے ہوئے بڑی متانت سے بولے "میاں ہم اور کچھ تو جانتے نہیں لیکن ان کی دوباری میں مشک ٹنگی ہوئی تو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔"

منشی جی کا سہارا پاکر شیخ جی اور چہکے، سقّے کی اولاد۔ پانی بھرتے بھرتے نمبرداری کرنے لگے، ہمیں شیخ کلال بتاوے ہیں۔

چھدّا نے پھر ٹانگ اڑائی "اجی دلّی میں بشیر پنواڑی کی دوکان پر ایک خاں صاحب بیٹھا کریں تھے۔ وہنوں نے لاکھ روپے کی بات کہی کہ میاں نہ کوئی سید ہے نہ پٹھان ہے، نہ مغل نہ شیخ۔ منشی رحمت علی تھوڑی دیر تک تو چپکے رہے اور جب چھدّا کی بات کا اثر زائل ہو چکا تو بولے کہ "میاں شیخی کی بات نہیں ہے ہمارے خاندان کا تو شجرہ بھی تھا لیکن کیا کہیں اپنے والد صاحب کو، بڑے بھولے تھے۔ انہیں یہاں نمبردار صاحب کے باپ ایک روز آئے۔ گڑگڑا کے کہنے لگے کہ کلکٹر صاحب سے مجھے ملنا ہے ذرا اپنا شجرہ دو دن کے لئے دیدو۔ والد صاحب جھانسے میں آگئے۔ میاں وہ شجرہ ایسا گیا کہ پھر واپس نہیں آیا۔ باپ چل بسے اب ان کا بیٹا اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ جہاں کوئی حاکم آیا اور شجرہ لے جا کے پیش کر دیا۔ اب انہیں جا کے کون بتاتا کہ کن کی باتوں میں آ رہے ہو یہ سقّے ہیں سقّے۔"

شیخ جی کچھ کہنے کے لئے پر تول ہی رہے تھے کہ ..... ارے یہ کیا آفت آئی ... یکایک اِکّے کا ایک پہیہ گڑھے میں گرا اور اُڑا اٹھے اللہ بچا۔ گھوڑا پھر بگڑ گیا۔ چھدّا نے چابک بھی برسائے اور چمکارا بھی لیکن گھوڑے نے بھی اس مرتبہ آگے بڑھنے کی قسم کھالی تھی۔ چھدّا جب تابڑ توڑ چابک رسید کرتا تھا تو اِکّے کو حرکت تو ضرور ہوتی تھی لیکن تھوڑی دیر بعد دیکھئے تو اِکّا آگے کے بجائے چند قدم پیچھے کھڑا نظر آتا تھا۔

اسی اثناء میں پیچھے کھڑ کھڑ کی آواز ہوئی۔ نصر اللہ کا اِکّہ برابر میں آن لگا تھا۔ نصر اللہ نے برابر سے گذرتے ہوئے فقرہ کسا "ابے اس مریل ٹٹو کو بیچ میں سے کے کہاں کھڑا ہو گیا بھیا یہ سڑک پر نہیں چلے گا، وگڑے دگڑے چلا۔"

چھدّا کا خون ایک تو ویسے ہی کھول رہا تھا۔ نصر اللہ کا فقرہ سن کر اور بھُن گیا۔ تاؤ میں آ کے جواب دیا "ابے انجر پنجر رنگ کرا کے اترا رہا ہے۔"

نصر اللہ کہاں چوکنے والا تھا۔ اس نے پلٹ کر آواز لگائی "پیارے اب کے پینٹھ میں اس ٹٹو کو نیلام کر دیجو۔ کچھ پیسے اٹھ جائیں گے۔"

چھدّا بہت بھنایا لیکن کیا کرتا، چپ ہوتے ہی بنی۔ گھوڑا تھا کہ سامان میں ہی نہ آتا تھا۔ اب منشی رحمت علی کو تحصیل کی فکر سوار ہوئی بولے کہ "یار میرے آج تحصیل بھی پہونچائے گا یا نہیں۔"

"ہت تیری تحصیل کی دم میں فدا" اور اس نے منتر منتر بجا ڈالے۔ لیکن گھوڑے کی حالت یہ ہو رہی تھی کہ نہ ہلدنہ کھسکت نہ جنبد نہ جاہ۔ چھدا لاچار ہو کر اکے سے اتر آیا۔ اس نے گھوڑے کی لگام پکڑی اور آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا۔ بیس پچیس قدم یوں چلنے کے بعد گھوڑا کچھ راہ راست پر آیا۔ چھدا اچک کر ڈنڈے پر بیٹھ گیا اور کئی چابک جلدی جلدی رسید کر ڈالے۔ گھوڑا پھر طرارے بھرنے لگا۔ چھدا نے اطمینان کا سانس لیا۔ مصیبت ٹل جانے کے بعد اس نے مصیبت کا جواز پیش کرنا شروع کیا۔ منشی جی گھوڑا بچارا کیا کرے، اس سڑک کو ہی بس کیا کہوں وگڑا بنی ہوئی ہے۔ میاں دلی کی سڑکیں تھیں، ایسے ویسے آدمی کا تو وسپہ سے پیر رپٹ جاوے تھا اور تانگہ یوں جاوے تھا فٹا فٹ۔"

پرمیشری کا چپکے بیٹھے بیٹھے منھ بندھ گیا تھا۔ اس نے طویل سی جماہی لیتے ہوئے کہا "شیخ جی اس سڑک کے بننے ونے کا بھی کچھ لونت بنت ہے۔"

"چین کی بنسری بجاؤ لالہ" شیخ جی پھر اپنے پرانے موضوع پر آگئے "جب تک نمبردار صاحب کا دم سلامت ہے اس وقت تک تو اس سڑک کے دن پھرتے نہیں۔"

پرمیشری بگڑ کر بولا "نمبردار صاحب اچھے چُنگی کے ممبر بنے سڑک ساری بھوس کا تھیلا بن گئی۔"

چھدا نے ایک دوسرے پہلو کی طرف اشارہ کیا "یارو جب سے ہم نے ہوش سنبھالا یہ سارے کنکروں کے ڈھیر کنارے کنارے یونہی پڑے دیکھے۔ سڑک تو بن چکی یہ تو بس غلیل کے غلّوں کے ہی کام آئیں گے۔" اور یہ کہتے کہتے اس کی توجہ کنکروں کی ڈھیریوں سے ہٹ کر درختوں پر مرکوز ہو گئی۔ اکہ اسی وقت آم کے گھنے درختوں کے نیچے گذر رہا تھا۔ سیدھے ہاتھ پر مندر سے لگے ہوئے کنوئیں کی پکی منڈیر پر طوطوں کی کتری ہوئی ان گنت چھوٹی چھوٹی کچی امیاں بکھری پڑی تھیں۔ مندر کی چھت پر اور کنوئیں کی منڈیر پر بہت سے چھوٹے بڑے بندر بری طرح چیں ہیں کر رہے تھے۔ ایک بندر نے چھدا کی طرف رخ کر کے آہستہ سے خو کیا اور پھر چپکا ہو گیا۔ چھدا کی طبیعت لہک اٹھی۔ بولا "یارو اب کے آم تو خوب ہوا ہے۔"

پرمیشری نے فوراً گرہ لگائی "آموں کا بھاؤ اب کے مندا رہے گا۔" "پر بابو فصل بھی وہ ہوئی ہے کہ جس نے باغ لے یا اس کی چاندی ہی چاندی ہے۔" چھدا نے ایک اور اعتراض کیا "مگر لالہ اب کے کویل نئیں بولی، پہاڑ سے آئی بھی ہے یا نئیں۔"

شیخ جی کو اس کی اس بے خبری پہ بہت تاؤ آیا "ابے سارے دن تیرا گھوڑا ہنہناتا ہے تو کویل کی آواز کہاں سے سن لے گا۔"

منشی رحمت علی بولے "بھیا تجھے آم کھانے سے مطلب ہے نہ کہ پیڑ گننے سے۔ تجھے کویل سے کیا۔ آم چاہیئے وہ تجھے مل جائے گا۔"

سامنے ایک درخت کی جڑ سے ایک نیولا نکلا اور سٹاک سے سڑک کو عبور کر کے دوسری سمت میں کہیں جا کر غائب ہو گیا۔ ایک ادھیڑ عمر کی کھوسٹ بندریا سینے سے بچے کو لگائے خراماں خراماں سڑک کو عبور کر رہی تھی اور جب اکہ بالکل قریب آگیا تو اس نے تیزی سے قدم بڑھائے اور اچک کر ایک املی کے درخت پر چڑھ گئی۔ آبادی اب قریب آگئی تھی دور کچی پکی عمارتوں کا ایک انبار نظر آ رہا تھا۔ سب سے پہلے پرمیشری کو بکلی محسوس ہوئی۔ یوں بھی وہ سواریوں کے بیچ میں بڑا دبا ہوا بیٹھا تھا۔ اس نے بمشکل تمام پہلو بدلا اور جماہی لیتے ہوئے بولا "منسی جی تم تو تحصیل کے اڈے پر اترو گے؟"

"اور کیا۔ تجھے کہاں جانا ہے راجہ؟"

"مورے کو تو پینٹھ جانا ہے۔"

"اچھا آج پینٹھ لگ رہی ہے۔" منشی رحمت علی بولے "تو لالہ دو قدم پر پینٹھ ہے۔ اڈے سے اتر کے چلے جیو۔"

چھدا کا اکہ تحصیل کے سامنے اڈے پہ جاکے رکا۔ جن اکوں کو وہ اڈے پہ چھوڑ کے روانہ ہوا تھا وہ یہاں اس سے پہلے آن موجود ہوئے

تھے۔ نمبردار سڑک کے کنارے چھتری لگائے کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے پیچھے ان کا منشی بغل میں رجسٹروں کا بستہ دبائے کھڑا تھا۔ منشی رحمت علی نے نمبردار کو دیکھا تو بچھ گئے "اماں نمبردار صاحب میں نے آپ کو اڈے پر بہت ٹٹولا۔ آپ کہاں رہ گئے تھے۔"

"منشی جی کچھ گھر سے نکلنے میں دیر ہو گئی لیکن خیر اللہ دتے نے بہت جلدی پہونچا دیا۔" نمبردار صاحب نے منشی جی کے جوش و خروش کا جواب اتنے ہی جوش و خروش سے دینا ضروری نہ سمجھا۔

شیخ جی اُدھر سے بولے "تو نمبردار صاحب واپسی تو ساتھ ہی ہو گی۔"

نمبردار صاحب نے سوچتے ہوئے جواب دیا "ہاں دیکھو آج یہ تحصیلدار نہ معلوم کس وقت تک رگڑے گا۔"

پیچھے سے چھدا بولا "نمبردار صاحب اکہ لئے کھڑا ہوں۔ بس آج تمہیں ہی لے چلوں گا۔"

"ابے گھوڑا اکہ ٹھیک ہے؟"

"اجی گھوڑا اکہ۔ کیا کر رئے او نمبردار صاحب" چھدا نے ہاتھ میں چٹکی کا اشارہ کیا "یوں پہونچاؤں گا۔ اِدھر بیٹھے اور اُدھر زن سے گھر پہ!"

نومبر سنہ ۵۰ء

سلام اُن پر
درود اُن پر
وہ کہہ رہے تھے
"زمیں نے بوجھ ایسے آدمی کا نہیں اُٹھایا جو تم سے سچا ہو اے ابوذر"
وہ کہہ رہے تھے
"فلک نے سایہ نہیں کیا ایسے آدمی پر جو تم سے سچا ہو اے ابوذر"
سبھی پیمبر یہی تصدیق کر رہے تھے
تمام اہلِ یقین تصدیق کر رہے تھے
سلام اُن پر درود اُن پر

افتخار عارف

عکسِ تحریر:- افتخار عارف

# مُردے

## جوگندر پال

ڈاکٹر سروپ کے چپراسی چرنجی نے اپنی محتاط نظروں سے ڈاکٹر کے دفتر کے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے سر سے اپنی ٹوپی اتارنے لگا۔ اس کے سر سے ایک دم سو سو کے کئی نوٹ فرش پر آ گرے اور گھبرا کر انہیں تیز تیز سمیٹنے لگا۔

اسی اثنا میں ایک بڈھا بے تحاشا کمرے میں داخل ہوا۔ "ڈاکٹر جی! ——— ڈاک ——— !"

"ارے! باہر جاؤ!" چرنجی اور گھبرا کر فرش سے اٹھا اور بڈھے کو دروازے سے باہر دھکیلنے لگا۔ "ہر کوئی بے دھڑک اندر آ دھمکتا ہے۔ کرکے جو بتہوں کسی کو بلا اجازت اندر مت آنے دیا کریں؛" اس کی حیدرآبادی "کرکے" کی منطق سے ڈاکٹر سروپ اس قدر مرعوب تھا کہ لہجے میں تاثر پیدا کرنے کی خواہش سے اس کے منہ سے بھی "اس لئے" کی بجائے بے اختیار "کرکے" ہی نکل جاتا۔

چرنجی نے دروازہ بھیڑ کر مندرسے چٹخنی چڑھا لی ——— اور نوٹ گننے لگا۔ ایک، دو، تین ——— چودہ؛ وہ پھر فرش پر جھک گیا۔ "ایک اور کہاں گیا؟"

ڈاکٹر سروپ اُس کے گنجے سر پر چپکے ہوئے ایک نوٹ کو دیکھ کر ہنسنے لگا۔ "ہمارے سر پر اُگیں تو گندے بال اُگتے ہیں مگر معلوم نہیں تم کیا سوچتے رہتے ہو۔ جب بھی ٹوپی اٹھاتے ہو، تمہارے سر پر بڑے بڑے نوٹوں کا جھنڈ کا جھنڈ اگا ہوتا ہے؛" ڈاکٹر کو یاد آیا کہ آج اُسے اپنے ڈینڈرف کی دوا لے کے گھر جانا ہے۔ اس کی بیوی نے کہا تھا، تمہارے گندے بالوں کی بُو سے کھایا پیا منہ کی طرف پلٹ آتا ہے۔

چرنجی نے نوٹ کو اپنے گنجے سر سے اکھاڑنے کے انداز میں ہاتھ میں لیا اور ایک دفعہ پھر نوٹوں کو گن کر ڈاکٹر سروپ کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ "پندرہ ہیں، صاحب"

"صرف پندرہ؟"

ڈاکٹر کے ماتھے پر تیوری دیکھ کر چرنجی نے کہا: "دو ہزار کا ہفتہ طے کر گیا تھا صاحب، مگر گھگیائی پر حرام کی اولاد کہنے لگا، اس موسم میں ہرن نیچے زمین پر کہاں ملتی ہے؟ اسے آسمان سے کھود کر لانا پڑتا ہے"

"تو کیا ہوا؟ برف میں تھوڑا کم کر لے۔ اور بھی تو بیسیوں آئٹم ہیں!"

"کرکے میں نے بولا تھا صاحب، ٹھیکے کو دو حصوں میں بانٹ دیجئے اور گنگو سے بھی معاملہ کر لیجے۔ وہ بڑا ایمان دار آدمی ہے:"

"اچھا دیال کے بچے کو بھی تو تم ہی لائے تھے!"

"لایا تو میں ہی تھا مگر کیا ہوتا؟ آج کل سبھی اپنے دھرم ایمان کو بیچے ہوئے ہیں۔ اب اگلے چار ہفتے پندرہ سو پر ہی چلنے دیجئے۔ وہ بولتا ہے چار ہفتوں کے بعد موسم کھل جائے گا پھر وہ پورے دو ہزار دینا شروع کر دے گا!"

ڈاکٹر نے پانچ نوٹ اُس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "ڈیڑھ سو تمہارا اور ڈیڑھ سو کیئر ٹیکر کا باقی کے دو سو بڑے بابو کو دے دو!"

"ٹھیک ہے صاحب!" چرنجی نے نوٹوں کو پھر ٹوپی کے نیچے رکھ لیا اور جانے کے لئے دروازے کی طرف مڑا، مگر چند قدم چل کر رک گیا "کیئر ٹیکر صاحب نے کہا تھا صاحب، میرے چپراسی کے لئے بھی ایک سو لایا کرو!"

ڈاکٹر سروپ نے اُسے قریب آنے کا اشارہ کرکے ایک سو کا ایک اور نوٹ اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "کرکے دیال سے کم سے کم سو دو سو ہی وصول کر لیتے۔"

چرنجی نے نوٹ کو ویسے ہی اپنی ٹوپی کے نیچے جما لیا۔ "آج کل آپ جیسے رحمدل افسر کہاں ملتے ہیں صاحب؟ آپ تو اپنی ساری پرجا کے کھیون ہار ہیں!"

چرنجی کے جانے کے بعد ڈاکٹر نے آدھا، ٹھوکر پتلون کی پچھلی جیب سے اُس کے دیئے ہوئے نوٹ نکالے اور یونہی ان پر اپنی نظر ٹکائی اور ریزرو بنک آف انڈیا کے گورنر کی طرف سے ادائیگی کے وعدے کی تحریر پڑھنے لگا ـــــ سرکار جو وعدہ کرتی ہے اسے ہمیشہ پورا کرتی ہے۔ لیکن لوگوں کا یہ حال ہے کہ کسی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ پورے پانچ سو کم ـــ ڈاکٹر کو دیال پر ابھی تک بہت غصہ آ رہا تھا ـــــ خیر، اسے معلوم ہو جائے گا کہ سرکاری معاملوں میں زبان سے پھرنا اتنا آسان نہیں ـــــ اس نے نوٹوں کی تہہ جما کر انہیں پھر جیب میں رکھ لیا اور سوچنے لگا کہ ڈائریکٹر چھ سو سے کم میں نہیں ٹلے گا۔ سارا کام ہم لوگ کرتے ہیں اور وہ بڈھا مفت میں سب سے بڑا حصہ اڑا لے جاتا ہے۔ سالا اکیلا آدمی اتنے پیسوں سے کرتا کیا ہے؟ ـــــ آج شام کو گھر لوٹتے ہوئے میں اسکاچ کی بوتل لیتا جاؤں گا اور سوڈا بھی۔ اسکاچ میں پانی ملانے سے تو بہتر ہے کہ صرف پانی ہی پی لیا جائے۔

"مگر پیاس تو پانی سے ہی بجھتی ہے"۔ اُس کی بیوی روشی اپنے شوہر کی شراب کی لت سے چڑی رہتی تھی۔

"ہاں، مگر جن کی پیاس پہلے ہی مری پڑی ہو، نہیں تو اسے زندہ کرنا ہوتا ہے"۔ روشی سے جھگڑتے ہوئے اس کا دماغ روشن ہو جاتا۔

"ارے او شرد، تمہارے بیوی ہے، بھولی سی بچی ہے، ہم سے تمہاری پیاس زندہ کیوں نہیں ہوتی؟" پھر ناری کو یکلخت اپنی بے بسی پر غصہ آنے لگتا۔ "تم ـــ تم مُردوں کے ڈاکٹر ہو، مُردو، تم کیا جانو، کسی بیکل روح کی بچی کھچی سانسیں اکٹھی کر کے اُسے اپنے پیروں پر کیسے کھڑا کیا جا سکتا ہے؟"

جب ڈاکٹر سروپ کو پیشہ ورانہ نااہلی کے باعث ٹرانسفر پر سرکاری ہسپتالوں کی زنجیر کے اس مُردہ خانے کا انچارج بنایا گیا تھا تو وہ بہت تلملایا تھا کہ اتنے سالوں کے تجربے کے باوجود اُسے موت کی سندیں لکھنے اور مُردوں کی دیکھ بھال پر مامور کر دیا گیا ہے۔

"دل چھوٹا مت کرو ڈاکٹر"۔ اس کے ایک سینئر شریک کار نے اُسے تسلی دینے کے لئے سمجھایا تھا۔ "سرکاری ڈاکٹر یہاں ہو یا وہاں، ایک ہی بات ہے۔ وہاں وہ مریض کو موت کی راہ پر ڈالتا ہے اور یہاں مریض اُس راہ پر چلتے ہوئے اُس کے پاس آ پہنچتا ہے"۔ اس نے ہنستے ہوئے ڈاکٹر سروپ کی پیٹھ تھپکی تھی۔ "بڑے آرام دہ ٹھکانے پر آ گئے ہو۔ اب چین کی بانسری بجاؤ"۔

ڈاکٹر سروپ نے واقعی چین کی بانسری بجاتے ہوئے ہی یہ سارے سال بتا دیئے تھے۔ بہت ہونے پر اس کے چارج میں بیس سے زیادہ مُردے نہ ہوتے۔ ان میں سے بیشتر لاوارث ہوتے۔ ڈاکٹر اپنے دفتر سے باہر چوبیس گھنٹے کا نوٹس لگانے کے بعد لاوارث مُردوں کو سرکاری تجربہ گاہوں میں کام میں لانے کے لئے بھیج دیتا۔ مُردوں کی دیکھ بھال کرتے کرتے وہ زندوں کا علاج کرنا بھول ہی گیا تھا۔ سرکاری رجسٹر میں 'نارمل' کا اندراج کر کے وہ دراصل اس امر کی تصدیق کرتا تھا کہ مریض قطعی طور پر مر چکا ہے۔ ایک دفعہ چرنجی اپنی بیماری کے باعث چھٹی کی درخواست لے کر آیا تو ڈاکٹر سروپ نے اس سے کہا۔ "ادھر آؤ، تمہاری نبض دیکھوں"۔ اور نبض پر انگلی رکھے چند لمحات وہ اسے نہایت متانت سے محسوس کرتا رہا اور پھر بولا۔ "تمہیں کوئی تکلیف نہیں۔ جاؤ کام کرو"۔

"مگر صاحب ـــــ"

"کہہ دیا ہے نا، جاؤ، تمہاری نبض بالکل بند ہے"۔

چرنجی کا یہ حال تھا کہ ہنستے ہنستے وہ اپنی بیماری بھول گیا تھا اور ڈاکٹر سروپ کو غصہ آ رہا تھا کہ یہ بدتمیز اس طرح ہنس کیوں رہا ہے۔

چرنجی کا آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔

"ایک بات کہوں، صاحب"۔ ایک دن وہ ڈاکٹر سے کہنے لگا۔ "گر کبھی اچانک میرا دم نکل جائے تو مجھے کہیں ڈاکٹری تجربوں کے لئے مت بھیجئے"۔

"کیوں؟"

"آپ تو جانتے ہی ہیں صاحب، میڈیکل کالج کے لونڈے جنگلی بھیڑیوں کی طرح نوچتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے گوشت کی گٹھڑیوں میں ٹوٹی پھوٹی ہڈیاں سی ہوتی ہیں"۔

"اب بھی تو تم ایسے ہی دکھتے ہو"۔

چرنجی نے سر کھجانے کے لئے اپنی ٹوپی اتاری تو اس کے گنجے سر سے دس کا نوٹ نیچے آ گرا۔

"یہ نوٹ کہاں سے مارا ہے؟"

"آپ سے کیا پردہ، صاحب، گنگو ٹھیکیدار آیا ہوا تھا۔ انعام دے گیا ہے۔ آپ کو سلام بولنے کو کہہ گیا ہے"۔

"اس سے کہو، صرف سلام بول دینے سے کام نہیں بنتا"۔

"بڑا دلدار سیٹھ ہے صاحب۔ آپ اُس کی طرف ایک بار نظر بھر کے دیکھیں گے تو وہ اپنے آپ کو بیچ کر بھی آپ کی خدمت کرتا رہے گا"۔

ڈاکٹر سروپ نے خود کو پھر یاد دلایا کہ آج اسکاچ اور سوڈا لے کر گھر جاؤں گا۔

"آج پھر؟"

پچھلے ہفتے تو اس کی بیوی نے چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا تھا اور پھر بیڈ پر بستر سے بستر پر چت ہو گئی تھی اور کھلی آنکھوں سے بے ہوش پڑی تھیں۔ اس نے انجانے میں اس کی آنکھیں بند کر دی تھیں۔ اور اُس کے دل کی دھڑکن محسوس کر کے ایک دم خوف سے پیچھے ہٹ گیا تھا ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر سروپ نے، اچانک سر اٹھایا اور دیکھا کہ کوئی شخص، اس کے دفتر کے دروازے کے عین وسط میں کھڑا ڈ سا کھڑا اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پہلے تو ڈاکٹر نے اُسے باہر انتظار کرنے کو کہا تھا اور پھر آنکھیں جھپک کر حیرت اور ہیبت سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

"میں اپنے بھائی کو لینے آیا ہوں۔" وہ شخص دو قدم آفس کے اندر چلا آیا۔ "میں اُسے دیکھنے آیا ہوں۔ شاید وہ یہی تھا۔"

"او ـــ ہ ـــ ہ!" ڈاکٹر نے ڈھیلا ہو کر کھلی سانس لی۔ "مجھے خیال گزرا تھا تمہارا بھائی خود آپ ہی مردہ خانے سے اُٹھ کر چلا آیا ہے۔ پرسوں شام کو اسے یہاں بھیجا گیا تھا۔"

"ہم جڑواں بھائی ہیں۔" اس شخص نے روتی ہوئی آواز میں ڈاکٹر کو بتایا۔

ڈاکٹر اپنے حواس پر قابو پانے کے لئے ہنسنے لگا۔ "میں تو ٹھنڈا ہو گیا تھا، مانو ایک مردے نے دوسرے پر آنکھیں گاڑ رکھی ہوں۔"

ڈاکٹر نے اسے اپنے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "بیٹھ جاؤ۔" وہ ابھی تک اپنی واردات کے طلسم میں گرفتار تھا۔ "مُردے بھی ضرور کہیں نہ کہیں ہماری طرح بس ملتے ہوں گے۔ ٹھہرو، بولو نہیں! ـــ کیا پتہ ـــ کیا پتہ، ہم بھی مُردے ہوں۔ میں نے کہیں پڑھ رکھا ہے کہ ہر شخص دراصل اپنی موت سے پہلے ہی مر چکا ہوتا ہے۔ نامعلوم کب سے؟" وہ گویا اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا تھا۔ "مجھے بڑی دُھندلی سی یاد آ رہی ہے میں نے بھی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دی تھی اور پھر مجھے یہاں مردہ خانے میں بھیج دیا گیا تھا پچھلے پندرہ سال سے میں یہاں گل سڑ رہا ہوں۔" اس نے اپنے آپ کو جھنجھوڑ کر بتایا اس اجنبی کے سامنے کیا رونا رونے لگے ہو ـــ نیور مائینڈ! ـــ وہ سر جھٹک کے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"میں اپنے بھائی کی لاش لینے آیا ہوں۔"

اب تک ڈاکٹر سروپ اپنے معمول پر آ چکا تھا۔

لاشیں یونہی ہر آتے جاتے کے حوالے نہیں کی جاتیں۔ پہلے ہمارے آفس کا ایک فارم بھرو ـــ نہیں، دو فارم ـــ سمجھے! ـــ کسی مجسٹریٹ کا تصدیق شدہ حلف نامہ دو اور ایک اعلان نامہ جس پر دو گواہوں کے دستخط ہوں اور ان دونوں سے ایک کو ہمارے دفتر کا کوئی آدمی بخوبی جانتا ہو ـــ جاؤ ـــ ب...

نوارد پریشان ہو کر کھڑا ہو گیا۔ "کہاں جاؤں؟"

"کہیں بھی، میں کیا بتاؤں؟"

"فارم، اعلان نامہ"

ساتھ کے دفتر میں بڑے بابو سے ملو۔ وہ تمہیں سمجھا دے گا۔

وہ شخص جانے کے لئے اٹھنے لگا تو ڈاکٹر سروپ کو شاید اُس پر ترس آ گیا۔ "بیٹھ جاؤ مُردے کے مندرجات میرے رجسٹر میں نوٹ کرواکے جاؤ۔" اس نے ایک رجسٹر کھول لیا

"نام؟"

"امریک سنگھ۔"

"امریک سنگھ کس کا نام ہے، تمہارا یا اُس کا؟"

"میرا"

"ارے بھائی، اس کا نام بتاؤ جسے تم لینے آئے ہو۔"

"کشن سنگھ۔"

"عمر؟"

"میری عمر چھتیس برس ہے۔"

"تمہاری عمر سے کیا غرض؟ لاش کی عمر بتاؤ۔"

"ہم جڑواں بھائی ہیں۔"

"تو میں کیا کروں؟ لاش کی عمر بتاؤ اور اس کا پتہ ——"

کشن سنگھ چڑ گیا۔ "میں کیا پتہ بتاؤں؟ وہ تو آپ کے پاس ہی گل سڑ رہی ہے۔"

ڈاکٹر بھی چڑ گیا۔ "گل سڑ نہیں رہی، ایئر کنڈیشنڈ ڈارمیٹری میں ہے اور وہاں برف میں رکھی ہے۔"

"میں وہیں سے آ رہا ہوں۔ ایئر کنڈیشنر کام نہیں کر رہا اور جتنی بھی تھوڑی سی برف تھی، وہ پگھل چکی تھی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" ڈاکٹر سروپ نے گھنٹی بجائی جسے سن کر چپڑاسی دوڑا ہوا آ پہنچا۔

ڈاکٹر نے بُو سونگھنے کے لئے ناک سے ایک لمبی سانس لی۔ "کیا تمہیں بُو آ رہی ہے چپڑاسی جی؟"

چپڑاسی نے بھی اُسی کے مانند اپنی ناک پھڑپھڑایا۔

"ہاں، بُو تو آ رہی ہے صاحب۔"

"تو میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ جاؤ، بڑے بابو سے کہو ایئر کنڈیشن والے کو فوراً بلائے، نہیں تو لاشیں اپنی بُو کی تاب نہ لا کر اُدھر سے اِدھر آ نکلیں گی۔ کیر ٹیکر سے بھی میرے پاس آنے کو کہو —— جاؤ!"

چپڑاسی اپنی ٹوپی اتارنے کے لیے سر کی طرف ہاتھ اٹھانے لگا تو ڈاکٹر سروپ نے چوکنا ہو کر اُسے روک دیا۔ "نہیں، سر کو ڈھنپا رہنے دو۔" پھر وہ کشن سنگھ سے مخاطب ہوا۔ "تم بھی بڑے بابو سے مل کر فارم وارم بھر کے اپنی لاش اٹھوا لو۔"

"میری لاش؟"

"تو کیا میری؟ —— جاؤ، اٹھوا لو۔"

"کسے اٹھواؤں؟ سبھی کے سبھی تو پھول پھول کر ایک جیسے دکھ رہے ہیں۔"

"مگر تم نے بتایا ہے، تم اُسے دیکھ آئے ہو۔"

"ہاں، ایک پر تو مجھے گمان تو ہوا تھا، پر ہو سکتا ہے وہ کوئی اور ہو۔"

"تو کیا ہوا؟ سبھی تمہارے بھائی ہیں۔"

"مگر مجھے صرف اپنے بھائی کو لے جانا ہے۔"

"تمہارا بھائی اب وہ ہی کہاں گیا ہے؟"

"مگر ——"

"ڈاکٹر صاحب کی جان کیوں کھا رہے ہو، بھائی؟" چپڑاسی نے اپنے افسر کی مدد کے لئے مداخلت کی۔ "کرکے بوتا ہوں صاحب، ہر ایرے غیرے کو اندر مت آنے دیا کریں۔" پھر وہ کشن سنگھ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے سمجھانے لگا۔ "اپنے بھائی کو تو تم نے ہی پہچانا ہے، ہم نے تو نہیں۔"

ڈاکٹر سروپ اپنے غصے پر قابو پانے کے لئے سگریٹ سلگانے لگا۔ "کیا زمانہ آ گیا ہے! بھائی اپنے بھائی کو بھی نہیں پہچان سکتا۔"

کشن سنگھ منہ لٹکا کر چپڑاسی کے ساتھ باہر جانے لگا تو ڈاکٹر سروپ کو پھر اُس پر ترس آنے لگا۔ "ٹھہرو، گھبراؤ نہیں، کوشش کرو گے تو پہچان لو گے۔" سگریٹ کا ایک کش لے کر اُسے خواہش ہونے لگی کہ بے چارے کی مزید مدد کی جائے۔ "اگر تمہیں کوئی ایسا گواہ نہ ملے جسے ہم جانتے ہوں تو ہمارے اس چپڑاسی کو ہی اپنا گواہ بنا لو —— اور سنو، تمہارے حلف نامہ پر بھی بڑا بابو کسی نوٹری سے دستخط کروا لے گا۔"

"تھینک یُو، ڈاکٹر صاحب۔"

"کوئی بات نہیں۔" ڈاکٹر سروپ نے مسکراتے ہوئے سوچا کہ بڑا بابو اور چپڑاسی اُس سے پچاس روپے تو اینٹھ ہی لیں گے، جن میں سے بیس اپنے لئے کھرے ہو جائیں گے۔ اُس نے بدستور مسکراتے ہوئے اپنے سامنے رکھے کورے کاغذ پر آج کی ٹوٹل آمدنی کے ہندسے لکھے ہیں —— ۲۰ + ۴۰۰ ——

چرنجی اور کشن سنگھ اُس کے کمرے سے باہر ہو لئے اور اُس نے لاشوں کی بو سونگھنے کے لئے پھر اپنی ناک کو اوپر اٹھا کر ایک بڑی لمبی سانس لی اور بڑبڑایا، بُو پہلے سے بڑھ گئی ہے۔ اس قسم کی بُو محسوس کرکے وہ بڑا بے چین ہو جاتا۔ اول تو وہ مُردوں کی ڈارمیٹری کا رخ ہی نہ کرتا، یا پھر اُدھر جانا بے حد ضروری ہو جاتا تو ہدایت بھیج کر بلڈنگ کے اُس ونگ میں خوب دوائیاں چھڑکوا لیتا اور اکثر وہاں کیئر ٹیکر کے دفتر میں کام نمٹا کر لوٹ آتا۔ پچھلے ہفتے اس کے ڈائریکٹر نے اسے اطلاع دی تھی کہ آئندہ سال سے ہر لاش کے بستر پر ایک فریزر فٹ کرنے کی تجویز منظور ہو گئی ہے۔

"وہ تو ٹھیک ہے سر،" اُس نے جواب دیا تھا۔ "مگر لائنے سے پاور میں اب بھی ہماری مشینوں کے تار چھٹ جاتے ہیں۔ اس وقت کیا بنے گا؟"

اس کے افسر نے اسے متنبہ کرنے کے لہجے میں کہا تھا: "تم ہمیشہ پیچھے کی طرف دیکھتے ہو ینگ مین۔ آگے کی طرف دیکھا کرو۔"

حرامی! آپ خود تو آگے کی طرف دیکھتا ہے نہ پیچھے کی طرف، بس جہاں بھی دیکھیں، ہیں دیکھیں ــــــ ڈاکٹر سروپ کو خیال آیا کہ آج ابھی تک مُردوں کی کل تعداد چیک نہیں کی۔ اس نے سگریٹ بجھا کر متعلقہ رجسٹر اپنے آگے کھول لیا اور کاغذ پر مُردے گننے لگا۔ ایک ــ دو ــ تین ــ آٹھ ــ سولہ ــ اٹھارہ اور یہ انیس ــــ پھر اس نے کیئر ٹیکر کے ابھرے ہوئے کام پر سرسری نظر دوڑائی تاکہ ایگزیکٹو بھی دیکھ لے ــــ اٹھارہ ــــ رہے ــــ ایک کم کیسے ہو گا؟ ــــ اس نے گھنٹی بجائی اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا اور کوئی نہ آیا تو پھر رجسٹر پر جھک گیا ــــ ایک ــ دو ــــ انیس! ــــ ایک مُردہ کہاں غائب ہو گیا؟ ــــ کہیں واقعی وہ وہی تو نہ تھا۔ اُسے کشن سنگھ کا خیال آیا اور وہ بدحواس سی ہنسی ہنس دیا اور ایک بار پھر رجسٹر پہ نگاہ جمائی ــــ ایک ــــ دو ــ تین ــــ

"آپ نے گھنٹی بجائی ہے صاحب؟" چسرنجی نے کمرے میں داخل ہو کر پوچھا اور اُس کے پیچھے پیچھے ایک اور آدمی داخل ہوا۔ "آپ نے یاد کیا ہے؟"

ڈاکٹر سروپ نے نئے آدمی کو گھور کر دیکھا۔ "تم کون ہو؟"

"میں کیئر ٹیکر صاحب کا نیا چپراسی ہوں صاحب ــــ راجو!"

"ارے ہاں، تم ہی تو ہو۔ میں تمہیں پہچان ہی نہیں پایا۔" ڈاکٹر نے اس کے منہ کی طرف اشارہ کیا۔ "تم نے یہ پھنسیوں کا نقاب جو چسڑھا رکھا ہے؟"

"علاج کروا رہا ہوں صاحب۔"

"سوچ سوچ کر گپّا بنے ہوئے ہو۔ کیا تمہیں اپنے آپ سے بُو نہیں آتی؟"

"کیا کروں صاحب؟"

"رت ــــ منہ پر برف رکھا کرو۔" ڈاکٹر نے اچانک اپنے نتھنوں کو پھڑک محسوس کیا ــ پھر وہی بُو! اُس نے نتھنوں کے راستے سانس لی۔ "بڑھ گئی ہے۔"

چسرنجی اور راجو نے بھی ویسے ہی سانسیں لیں۔ "ہاں، بُو تو آ رہی ہے۔"

"کیئر ٹیکر کہاں ہے؟" ڈاکٹر کو یاد آیا کہ کیئر ٹیکر نے تو آج اپنے دانتوں کے ڈاکٹر کے پاس جانے کی اجازت لے رکھی ہے۔ "کیا تمہارا ایئر کنڈیشنر چل رہا ہے؟"

"میں اتنا بھاگیہ شالی کہاں ہوں صاحب؟" راجو احمقوں کی طرح کھی کھی کرنے لگا ہے۔ "یہ نعمت تو مُردوں کو ہی نصیب ہے۔"

راجو کی بات ڈاکٹر کے دل کو جا لگی ــ ہاں، اس دنیا کی عجیب ریت ہے۔ یہ نعمت صرف انہیں نصیب ہے جو اس کی زندگی بخش ٹھنڈک میں بھی بے جان پڑے رہتے ہیں۔

"ابھی تک کھی کھی کئے جا رہے ہو۔ میری بات کا سیدھا جواب دو۔"

کرتے ہوتے ہوں افسر کے سامنے زیادہ حلق مت پھاڑو۔" چرنجی نے اپنی ٹوپی اتارنا چاہی لیکن ڈاکٹر کی نظر میں ڈانٹ محسوس کرکے اس نے اپنا ہاتھ روک لیا۔

ڈاکٹر سروپ کو یکبارگی یاد آیا کہ ایک مُردے کا حساب نہیں جڑ پا رہا۔ اُس نے چسرنجی کو حکم دیا کہ وہ بڑے بابو کو بلائے، لیکن پھر اُسے جھٹ ہی روک لیا۔ "بڑے بابو کے منہ سے گندی باس آتی ہے کہ طبیعت متلانے لگتی ہے۔" اُس نے راجو سے مُردوں کی تعداد کے بارے میں استفسار کیا اور راجو نے فوراً جواب دیا۔ "پورے اٹھارہ ہیں صاحب۔"

"کیا تمہیں یقین ہے، اٹھارہ ہیں؟"

میرا اور کام ہی کیا ہے صاحب؟ دروازے پر بیٹھا انہیں ہی بار بار گنتا رہتا ہوں۔"

"اب تو اس کی عادت ہو گئی ہے صاحب، جدھر بھی چند لوگ اکٹھے دکھ جائیں، انہیں گننا شروع کر دیتا ہے۔"

"دیکھو راجو" ڈاکٹر سروپ نے چانک کچھ فیصلہ کرکے اپنا منہ بڑا کر لیا ہے۔ "اب میں تم سے صاف صاف پوچھ رہا ہوں۔ اگر تم لوگوں سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو بتا دو میں تمہیں بچا لوں گا۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا، صاحب!"

"تمہاری سمجھ میں اتنا تو آرہا ہے کہ ایک مُردہ کالے دھندے میں ہزار پندرہ سو پر اٹھتا ہے۔ اگر تم نے گول مال نہیں کیا تو ایک مردہ کہاں گیا؟ سرکار تو اس کی جگہ مجھے شاکر جانے پورا کرے گی، تمہارا کیا جائے گا؟"

"نہیں صاحب!" ڈاکٹر کے چہیتے چپراسی نے مداخلت کی۔ "میں راجو کی طرف سے آگ میں ہاتھ ڈال کر کہہ سکتا ہوں، وہ ایسا آدمی نہیں!"

"تو پھر مُردہ کہاں گیا؟ جیسے بھی ہو مجھے اسی وقت اپنا مردہ چاہیے!" ڈاکٹر نے ایک بار اور رجسٹر پر اپنی پریشان نگاہ دوڑائی اور ایک فقرے میں اس کی آنکھیں اٹک گئیں اور وہ مسرت سے اچھل پڑا۔۔۔ "مل گیا!۔۔۔ یہ دیکھو! بڑے بابو نے یہاں ایک ہی مُردے کی تفصیلات غلطی سے دوبارہ درج کر دی ہیں۔ مُردے اٹھارہ ہی ہیں!۔۔۔ جاؤ، بڑے بابو کو بلاؤ!" مگر اُس کا جی متلانے لگا۔

"نہیں، رہنے دو! کیا تمہیں بو محسوس نہیں ہو رہی ہے؟" اسے نا معلوم کیا سوجھی ہے کہ وہ اپنا ہی بدن سونگھنے لگا ہے۔

"نہیں، صاحب، اس وقت تو نہیں ہو رہی!"

"لاشوں کے پاس بیٹھ بیٹھ کر تمہاری ناک ٹھیک طرح کام نہیں کرتی۔ میں نے تم سے پوچھا تھا، مردہ خانے کا ایئر کنڈیشنر چل رہا ہے یا بند پڑا ہے؟"

"دس پندرہ منٹ بند رہا صاحب، پھر آپ ہی آپ چلنے لگا!"

"یہاں سبھی کچھ آپ ہی آپ چلے تو چلے۔ تم سب لوگ نااہل ہو۔ اگر میں تمہاری حفاظت نہ کروں تو تم سبھوں کو دو دن میں جوتے مار مار کر یہاں سے نکال دیا جائے!"

"کرتے ہیں تو ہم سب آپ کے نام کی مالا جپتے ہیں صاحب!"

"مگر کچھ کام بھی کیا کرو۔ کیا وہ حرامی چاچا پوری برف بھیج رہا ہے؟"

"نہیں صاحب، پہلے سے آدھی بھی نہیں بھیج رہا۔"

ڈاکٹر اپنی پتلون کی پچھلی جیب کی طرف ہاتھ لے گیا اور دانت پیس کر بولا۔ "اس سے طے تو یہ ہوا تھا کہ کھپت سے آدھی مزدور بھیجے گا۔ چلو، کم سے کم ایک تہائی ہی بھیج دے۔ مگر بے ایمان سارے وعدے بھول گیا ہے!" وہ اپنا بلڈ پریشر بڑھتا ہوا محسوس کر کے سگریٹ سلگانے لگا۔ "گنگو ٹھیکیدار کو تم بلا بھیجو چپراسی، وہ مجھے فوراً ملے!"

چپراسی بتیسی بھلانے لگا۔ "میں آپ ہی اس کے پاس چلا جاؤں گا صاحب!"

اسی اثنا میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

"ہیلو ڈارلنگ!" ڈاکٹر کی بیوی کا ٹیلی فون تھا۔ "کیا ہم۔۔۔ فرج میں برف نہیں بن پا رہی؟۔۔۔ ہوں؟۔۔۔ کیوں؟۔۔۔ ان مشین ہی بگڑ گئی ہو تو بو تو آئے گی ہی!"

دسمبر ۸۶ء

اب نہ آؤ گے کبھی تو کیا رکھا ہے
پھر بھی دروازہ کھلا رکھا ہے

دل میں جو زخم ہیں کیسے ہم نے
پھول کا سر میں سجا رکھا ہے — نذیر قیصر

عکس تحریر:- نذیر قیصر

# دوسری ملاقات

اے حمید

دوپہر ایک بجے وحید دفتر سے آیا اور کھانا کھا کر سو گیا۔

چار بجے کے قریب وہ اٹھا۔ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے اور چائے پی کر چنبہ گلی کی طرف چل پڑا۔ دو ڈھائی میل کی مسافت طے کرنے کے بعد وہ نالے کے پل پر پہنچ کر بیٹھ گیا اور گوالن کا انتظار کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ قصبے سے واپس آ رہی ہو گی اور یہاں سے مل کر دو یا دو میل کا باقی رستہ پیدل طے کریں گے۔ وحید کتنی ہی دیر وہاں بیٹھا رہا مگر گوالن کی خچر کہیں دکھائی نہ دی۔ شہر سے آنے والے لوگوں کے دو تین قافلے ٹٹوؤں پر سوار پل پر سے گذرے۔ ٹٹوؤں اور خچروں پر بیٹھے ہوئے مردوں، عورتوں اور بچوں نے بڑی دلچسپی سے وحید کو پل کے پتھر پر بیٹھے دیکھا۔ کیونکہ اب انہیں یقین ہو گیا تھا کہ قصبہ پنج ناگ قریب ہی ہے۔ دیکھتے دیکھتے آسمان گدلے گدلے بھورے بادلوں میں چھپ گیا اور وادیوں پر لطیف دھند سی تن گئی۔ لوگوں کے گذر جانے پر وہاں پھر خاموشی چھا گئی اور نالے میں پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر بہنے والے پانی کا دھیما دھیما شور صاف سنائی دینے لگا۔ دور پہاڑیوں کے اوپر بجلی چمکی اور ہلکی سی گرج سنائی دی۔ وحید وہاں سے اٹھا اور چنبہ گلی، ریشم کے گاؤں کی طرف چلنے لگا۔ جس وقت وہ باؤلی پر پہنچا بادل آہستہ سے گرجا اور بوندا باندی شروع ہو گئی۔ وحید نے کوٹ کے کالر چڑھا لئے اور پریشان سا ہو کر اخروٹ کے گنجان درخت تلے بیٹھ گیا۔ اس نے وقت دیکھا، شام کے سوا پانچ بج رہے تھے اور باغ میں شام کے اولیں مرطوب سائے اترنے لگے تھے۔ آدھ گھنٹہ اور گذر گیا۔ جب وہ بالکل ناامید ہو کر واپس مڑنے لگا تو کہیں قریب ہی پتوں پر کسی کے چلنے کی آہٹ ہوئی اور ساتھ ہی چاندی کے کڑے کھنکنائے۔ وحید نے کان کھڑے کر کے گھور کر درختوں میں دیکھا اور تھوڑی ہی دیر بعد اس کے سامنے ریشم چلی آ رہی تھی۔ وہ قدرے بدحواس تھی۔ قریب آ کر وہ خوفزدہ ہرنی کی طرح سمٹ کر کھڑی ہو گئی اور سانس درست کرتے ہوئے بولی۔

بڑی مشکل سے آئی ہوں۔ آج باپو خود دودھ لیکر چلا گیا اور ماں مجھے آنے ہی نہ دیتی تھی۔ اس نے مجھے کام میں لگا دیا۔ بڑی مشکل سے سارو سے ملنے کا بہانہ بنا کر آئی ہوں۔

اور اگر تمہاری ماں سارو کے گھر چلی گئی تو؟

میں نے سارو کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ وہ کہتی تھی تم جاؤ میں سب ٹھیک کر لوں گی۔

تم نے اسے کیا بتا دیا ہے گوالن؟

یہی کہ —— میں ——

اور ریشم کی آواز رک گئی اور وہ جلدی سے بات پلٹ کر بولی، آج تو مینہ برسنے لگا ہے۔ تم کب سے کھڑے ہو؟ ابھی آئے ہو گے، ہیں؟

وحید نے مسکرا کر ریشم کو دیکھا۔ سیاہ کپڑوں میں اس کا سانولا سا تیکھا چہرہ کالے پانیوں میں تیرنے والے پھول کی طرح تھا۔ کھنچے ہوئے سیاہ بال سر کے

ساتھ لگے تھے اور ان میں کہیں کہیں پانی کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ آج گوالن نے آنکھوں میں سرمہ لگا رکھا تھا اور ہونٹ اخروٹ کا داتن کرنے سے گہرے براؤن ہو رہے تھے۔ ریشم نے اپنے سیاہ دوپٹے پر سے پانی کے قطرے جھاڑتے ہوئے کہا، آج وہاں بیٹھتے ہیں۔

کہاں؟

وہاں۔ ندی کی پرلی طرف۔ جہاں موتیا لگا ہے۔

جہاں موتیا لگا تھا وہاں گلاب کے جھاڑ اور چنبیلی کی بیل بھی تھی۔ یہ بیل کاڈ کے موٹے تنے سے لپٹی ہوئی تھی اور اس میں بےشمار سفید کلیاں مہک رہی تھیں۔ نیچے زمین پر بھی گری ہوئی پتیوں کا فرش سا بچھ رہا تھا۔ وہ پھولوں کی اس سیج پر بیٹھ گئے۔ ان کے اوپر کاڈ کی گھنی شاخوں کی لمبی چوڑی چھت پھیلی تھی۔ جہاں چوڑے چوڑے پتوں میں بارش کی بوندوں کے گرنے کی آواز تو سنائی دیتی تھی مگر وہ ان تک نہ پہنچتی تھیں۔ پاس ہی گلاب اور موتیے کی جھاڑیوں میں کوئی جھینگر بول رہا تھا۔ وحید نے پوچھا۔

پھر بتاؤ نہ گوالن۔

کیا؟ ریشم نے بڑے بھولپن سے کہا۔

یہی کہ تم نے سارو کو کیا کہا؟

ہائے کتنی چھوٹی سی بات پر اڑ گئے ہو۔ کہہ تو دیا کہ میں نے کہا تھا سارو میں ذرا باؤلی تک جا رہی ہوں، تم خیال رکھنا۔

غلط۔ بالکل غلط۔ تم نے یہ نہیں کہا تھا۔

وحید بیچ ہی میں بول اٹھا اور ریشم منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔ وحید نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر پوچھا۔

ریشم! سچی سچی بات کیوں نہیں بتاتیں؟

ریشم نے شرم سے تمتمایا ہوا چہرہ اٹھا کر کہا۔

جی اور کیا بتاؤں؟ بتا تو دیا ہے جو کہا تھا۔

اور وہ اپنے ہاتھ کھینچنے لگی۔ وحید نے انھیں اور مضبوطی سے تھام لیا۔ اب یہ ہاتھ کبھی جدا نہ ہوں گے ریشم! انھیں ریشم کی ڈوری سے باندھ دیا گیا ہے۔

مگر۔ مگر تم تو چلے جاؤ گے پردیسی! ریشم نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا۔

میں پردیسی نہیں ہوں گوالن۔ میرے لئے کوئی دیس پرایا نہیں۔ سب دیس میرے ہیں، میں ہر جگہ رہ سکتا ہوں، میں یہاں بھی رہوں گا اور تمہارے پاس رہوں گا اور پھر کہیں نہ جاؤں گا۔

سچ! ریشم نے بےتابی سے پوچھا۔

بالکل سچ!

گوالن کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا اور وحید نے اسے بڑی نرمی سے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ریشم ایک دم اکٹھی ہو گئی اور وحید کی آغوش میں ریشم کی گچھی سی بن کر رہ گئی۔

مجھ سے ڈرو نہیں گوالن، مجھے تمہاری عزت اپنی عزت سے زیادہ عزیز ہے۔ میں اس کی مرتے دم تک حفاظت کروں گا۔ ریشم اس طرح سمٹی رہی۔ اس کا سر وحید کے بازو سے لگا تھا، اس نے زمین پر بکھری ہوئی سفید پتیوں پر نظریں جھکا کر خنک آواز میں کہا۔

نہ جانے مجھے کیوں ڈر سا لگتا ہے۔ میں اس روز بھی ڈر رہی تھی جب میں نے تمہیں پہلی مرتبہ باؤلی پر پانی پیتے دیکھا تھا۔ اور آج بھی ڈر رہی ہوں۔

وحید گوالن کا گورا ہاتھ چوم کر بولا۔

تم یونہی ڈرتی ہو، میرا پیار چمبہ کلی کی طرح ہے گوالن! جو صرف اس وقت مہکتی ہے جب کسی ثمر میلی دلہن کے گلے میں ہوتی ہے۔

ساردہ سے میں نے تمہارا ذکر کیا تو وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ریشمی! پردیسیوں سے پیار نہیں بڑھانا چاہیئے۔ وہ ایک نہ ایک دن روتا چھوڑ کر چل دیتے ہیں لیکن میں نے اس کی بات کا اعتبار نہیں کیا۔ میں نے کہا۔

نہیں ساردہ! تو نہیں جانتی وحید ایسا نہیں ہے' وہ مجھے روتا چھوڑ کر نہیں جائیگا۔ کیوں ٹھیک ہے نا ــــ؟

ریشم نے اپنا بھولا بھالا سانولا چہرہ اوپر اٹھا کر وحید کو دیکھا' وحید نے دیکھا کہ ریشم کے گہرے براؤن ہونٹ خزاں رسیدہ چنار کے پتے کی طرح جذبات کی آنچ میں کپکپا رہے تھے اور اس کی آنکھوں میں بسے پیار کے ان چھوٹے سگوفے کھل رہے تھے اور ان سُنے گیت بیدار ہو رہے تھے۔

تم نے ٹھیک کہا گوالن! میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گا' کبھی نہیں۔ یہ چمبہ کلی کے پھول اور موتیئے کی کلیاں اور گلاب کے شگوفے' سیب کے درخت اور کالو کی تتلیاں اور ترناری کی بیلیں اور باؤلی کے پتھر۔ یہ سب میری محبت کے گواہ رہیں گے۔ جب تمہیں چھوڑنے کا خیال پیدا ہوگا تو میں بھاگ کر تمہارے پاس آجاؤں گا اور تم مجھے اپنے بازوؤں میں چھپا لینا اور مجھ پر اپنے بالوں کا سایہ ڈال دینا اور مجھے اپنے ساتھ لگا لینا' زندگی بڑی ظالم ہے گوالن! بڑی تیز ہے۔ بروک باؤنڈ چائے سے بھی زیادہ تیز۔

ریشم نے وحید کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔

ہاں۔ میں تمہیں اپنے دل میں اتار لوں گی' اپنے بازوؤں میں چھپا لوں گی مسافر اور کبھی آنچ نہ آنے دوں گی۔ کبھی نہیں' کبھی نہیں۔

وحید نے کھینچ کر ریشم کو اپنے سینے سے لگا لیا اور اپنے ہونٹ اس سے پکے ہوئے شہد بھرے' گہرے براؤن ہونٹوں پر رکھ دیئے وہ دونوں پہلی بار ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ وحید پہلی بار زمین سے دس ہزار فٹ کی بلندی پر پلی ہوئی گوالن کے ہونٹ چوم رہا تھا، اور ریشم زندگی میں پہلی بار کسی مرد کے بدن کی حرارت اپنے بدن پر محسوس کر رہی تھی۔ وحید کی آغوش میں وہ ٹہنی پر لگے اکیلے پتے کی طرح کانپنے لگی جس نے پہلی دفعہ پہاڑی ہوا کا جھونکا محسوس کیا ہو۔ اس کا جسم پہلے ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا اور پھر دھیمے دھیمے سلگنے لگا اور ایک نامعلوم لذت کے بوجھ سے دب گیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور سانس پھول گیا۔ وحید نے اس سے قبل پہاڑی شہد کبھی نہ چکھا تھا۔ اس شہد میں پکے ہوئے سیب کی طرح خوشبودار مٹھاس بھی تھی اور بے معلوم سی ترشی کا احساس بھی تھا۔ بخارا اور سمرقند سے آئے ہوئے سرخ و سپید بوڑھوں کے ساتھ ڈیسٹ روم میں بیٹھ کر اس نے ترکی فنجانوں میں پڑی ہوئی قسم قسم کی چائے کے مرکبات چکھے تھے لیکن جو ذائقہ اور جو مہک اور جو ملیدہ گوالن کے ان چھوٹے ہونٹوں میں تھی وہ دنیا کی کسی چائے' چائے کے کسی مرکب اور کسی شہد میں نہ تھی۔ دور ــــ سمندر کی نچلی تہوں سے کہیں ریشم کی آواز سنائی دی۔

ہائے میرا دم گھٹ رہا ہے وحید!

وحید نے آہستہ سے اپنے ہونٹ الگ کر لیے۔ ریشم کی آنکھیں بند تھیں اور سانس پھول رہا تھا۔ اس نے اپنا سر وحید کی چھاتی سے لگا دیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کالو کی گنجان شاخوں میں جو بلبل ماندی کا شور رک گیا تھا اور اب گُلہ میں جھینگر چہچہا رہی تھیں۔ کسی وقت بڑی دور سے بادل کے دھیمے دھیمے گرجنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ اندھیرا بتدریج بڑھ رہا تھا اور موتیئے اور گلاب کی جھاڑیوں میں بے شمار جھینگر

وہ نمودار ہو گئے تھے۔ جب گلی گاؤں کی طرف سے کسی بھیڑ کے ممیانے کی اور لکڑی کے مڈھ پر کلہاڑا چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اب میں جاتی ہوں وحید!

نہیں گوالن ابھی نہ جاؤ۔

بابو قصبے سے آ گیا ہوگا۔ وہ پھر بگڑ جائے گا۔

پانچ منٹ اور رک جاؤ۔

ریشم شرما گئی اور ہنستے ہنستے رہ گئی اور اس نے گردن جھکالی۔

جب تم ہنستی ہو تو تمھارے گالوں میں گڑھے بڑے خوبصورت لگتے ہیں ریشم!

میں انھیں گڑھوں میں کہیں گر پڑا ہوں اور اب ساری عمر نہیں اٹھ سکتا۔

ریشم نے کوئی جواب نہ دیا، صرف اس کے رخسار ہولے سے تھرتھرائے اور وحید نے جھک کر انھیں چوم لیا۔ گوالن دیوانوں کی طرح وحید کو تکنے لگی اور وحید نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے اور کسی ہی دیر وہاں مخمور سی خاموشی طاری رہی۔ جھینگر اور رنگڑ میں بھی جیسے رک کر اس مقدس خاموشی میں ڈوبے ہوئے ہمارے سروں کو سننے کی کوشش کرنے لگیں۔ وحید نے گوالن کی گردن کو بار بار چومتے ہوئے کہا۔ ریشم! میں پاگل سا ہو رہا ہوں۔ میں نہیں جانتا مجھے کیا ہو گیا ہے۔ مجھے اپنی قمیض کے اندر چھپا لو۔ وگرنہ میں اتنی خوشی برداشت نہ کر سکوں گا۔ مجھے تم سے دیوانہ وار محبت ہے، میں نے کبھی کسی سے اتنی محبت نہیں کی، نہ اپنے دوستوں سے، نہ اپنے بہن بھائیوں سے اور نہ اپنے آپ سے۔ میں تمھارا زرخرید غلام ہوں مجھے کہو تاکہ میں کوہ سلیمان کا جگر چیر کر تمھارے قدموں میں لعل و گوہر کا ڈھیر لگا دوں۔

گوالن نے بے اختیار ہو کر اپنا ہاتھ وحید کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ ایسا نہ کہو پردیسی! —— میں تمھاری کنیز ہوں، تمھاری داسی ہوں، تم میرے سر کے تاج ہو۔ میرے جوڑے کے پھول ہو اور میرے ہار کے موتی ہو۔ تم میرے سب کچھ ہو، سب کچھ۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور ان کے اوپر بادل مدھم آواز میں دیر تک گرجتا رہا اور جھینگر اور رنگڑوں نے چہک چہک کر شور مچانا شروع کر دیا اور گاؤں کی طرف سے آنے والی بھیڑ کی آواز زیادہ تیز ہو گئی اور ہلکی ہلکی بوندا باندی پھر شروع ہو گئی۔ اب سردی بھی بڑھ گئی تھی اور باغ میں شام کا اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ گوالن نے وحید سے یکدم الگ ہوتے ہوئے کہا۔

میں جاتی ہوں پردیسی۔

پھر کب آؤ گی ریشم؟

کب آؤں؟

کل صبح ——

کس وقت؟

جب دودھ لے کر جاتی ہو۔ ذرا پہلے آ جانا۔

اچھا

وحید نے آگے بڑھ کر ریشم کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ ریشم نے مخمور پلکیں اٹھا کر وحید کو دیکھا۔ اسے اندھیرے میں چمکتی ہوئی دو آنکھیں دکھائی دیں۔ وحید اسے چھوڑنے باغ کے کنارے تک آیا۔ مینہ کی دھیمی دھیمی پھوار پڑ رہی تھی اور سردی زیادہ ہو رہی تھی۔

تم کیسے گھر جاؤ گے ؟ تمہیں سردی تو نہیں لگے گی ؟ میرا دوپٹہ گلے میں لپیٹ لو ۔

وحید ہنس پڑا ۔

تم میری فکر نہ کرو ریشم !

ریشم باغ کی منڈیر اتر کر ذرا پرے نشیب میں نظر آنے والے مکانوں کے دھندلے خاکوں کی جانب روانہ ہو گئی ۔ چند قدم چلنے کے بعد اسے درختوں اور سایوں نے وحید کی نظروں سے اوجھل کر دیا ۔ وحید نے سگریٹ جلا کر کوٹ کے کالر اچھی طرح اوپر کئے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا قصبے کی طرف ہو لیا ۔ ریشم کی ماں چھپر تلے دیئے کی روشنی میں بیٹھی سوت کات رہی تھی ۔ ریشم جاتے ہی چھوٹے موٹے کام دھندوں میں لگ گئی اسے ڈر تھا کہ اس کی ماں اس پر ضرور برسے گی ۔ لیکن وہ زیادہ ناراض نہ ہوئی ۔ اس نے قدرے ترش روئی سے صرف اتنا کہا کہ آئندہ سارو کے ہاں اگر اس نے اتنی دیر لگائی تو اسے پھر کبھی شام کو گھر سے باہر نکلنے نہ دیا جائیگا ۔ ریشم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی ماں کہیں خود سارو کے گھر نہیں چلی گئی تھی ۔ پھر نہ جانے بیچاری سارو کو کیا کیا جتن نہ کرنے پڑتے ۔ اس کی یہ سہیلی کتنی اچھی ہے اور اس کے لیے کیا کچھ کرنے کو تیار نہیں ہو جاتی ۔ ریشم کا باپ گڑ گڑی پیتا کھیتوں کی جانب سے آنگن میں نمودار ہوا اور کھانستے ہوئے بولا بڑی دیر لگا دی تھی بٹیا نے ۔

ہاں باپو ۔ سارو کی ماں بھٹے ابال رہی تھی ، پھر میں بھی بیٹھ گئی ۔ وہ تو مجھے کتنے سارے بھٹے دے رہی تھی ۔ میں نے کہا ماسی سویرے آکر لے جاؤں گی ۔

بھٹے کیا کرنے ہیں ہمیں ۔ پینے ہی ختم نہیں ہوتے ۔ بوڑھا گڑ گڑی پیتا چھپر کھٹ تلے جا کر چارپائی پر بیٹھ گیا ۔ بادل سر پر کھڑا ہے ۔ کھل کے برسا تو جوار میٹھی ہو جائے گی ۔ ہو ہو ہو ہو ہو ۔ پالا ہو رہا ہے ۔

ریشم کی ماں سوت کا ٹوٹا ہوا دھاگہ جوڑتے ہوئے بولی ۔ اندر جا کر سو کیوں نہیں جاتے !

ہو ہو ۔ جیون جو گئے ! اب سونا ہی سونا ہے ۔

ریشم نے سارے برتن مانجھے ۔ پھلدار پودوں پر پھوس کے غلاف ڈالے ۔ باپو اور ماں کے بستروں کو دوبارا جھاڑ کر ٹھیک سے بچھایا اپنے بستر کو درست کیا ۔ جب کوئی کام نہ رہا تو یہی بولی ۔

باپو چلم بھر دوں ؟

باپو کسی سوچ میں محو تھا ، چونک کر بولا

نہیں بٹیا ابھی تو بھری ہے ۔

اتنے میں بکری کے ممیانے کی آواز آئی ۔

اسے سردی لگ رہی ہے ماں ۔

اتنا کہہ کر ریشم بھاگ کر باڑے میں پہنچی ، بکری اسے آتا دیکھ کر سر مار کر اگلے کھر جھاڑنے لگی ۔

کیوں ری تجھے نیند نہیں آتی ۔

اور پھر اس نے سنا جیسے بکری کہہ رہی تھی ۔

ریشم ، ریشم ، ــــ ریشی !! آج مجھے نیند نہیں آئے گی ۔ آج میں رات بھر جاگتی رہوں گی ۔ آج میری آنکھوں میں خوابوں کے رنگ ہیں اور بہاروں کے گیت ہیں ۔ آج میں انھیں ایک پل کے لیے بند نہ ہونے دوں گی لیکن ریشم ! یہ تمہارے گال کیوں دہک رہے ہیں ؟ تیرے

ہونٹوں پر آگ سی کیا لگ رہی ہے، ریشم۔ ریشم۔ ریشمی! ریشم نے جلدی سے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور پھر کچھ سوچ کر شرما گئی۔ وہ تھی آج اس کی آنکھوں سے بلند مخاطب تھی۔ وہ بانٹ کے حصّے سے ... کرنا دیپ میں کھڑی ہو گئی اور دور قصبہ ننج ناگ کے ٹیلوں پر مکانوں میں جلتی ہوئی روشنیوں کے جگنوؤں کو دیکھنے لگی۔ اس کے سامنے مکئی کے کھیت میں ہر بادل ہوا میں لہرا رہی تھی اور کسی وقت مینہ کی پھوار۔ گرد کی مانند اس کے چہرے پر اڑی جاتی تھی۔ وہ اپنے جسم کے ذرّے ذرّے میں پہلی محبت کی لذیذ حکمن محسوس کر رہی تھی۔ اس کا انگ انگ کچھ بول رہا تھا۔ کچھ کہہ رہا تھا۔ بکری ممیائی۔

ریشم بکری کے گلے میں بانہیں ڈال کر بیٹھ گئی۔

میری منّو! آج اتنی خوش کیوں ہے؟ وہ سو کیوں نہیں رہی؟

بکری اپنی گرم گرم تھوتھنی ریشم کے گال پر رگڑنے لگی۔ اوئی اللہ!

ریشم نے جلدی سے گال پرے ہٹا لیا اور اسے رحیم کا خیال آ گیا جب پہلی بار اس نے ریشم کے رخساروں کو چوما تھا۔ ریشم نے بکری کو اپنے ساتھ لگا لیا اور اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر گانے لگی۔

جھکاں نے بوڑ دیاں

ادھ وچ نہ چھوڑیں

لائیاں اساں توڑ دیاں

اگست ۱۹۵۲ء

میرا نامکمل افسانہ اسی طرح نامکمل
ہے، جس کا ہیرو ہر ایک پل صراط پر سے
گزر رہا ہے جو تلوار سے زیادہ تیز اور بال
سے زیادہ باریک ہے

ضیاء بٹ

عکس تحریر: ضیاء بٹ

# احسان منزل

ابن الحسن

احسان منزل — بے شمار کمرے۔ بڑے چھوٹے ایک کے بعد ایک، درجنوں برآمدے، سیدھے، گول چکر کھائے ہوئے۔ بیسیوں دالان بھول بھلیّاں کی طرح — بے مصرف مگر لازم۔ اُونچی اُونچی چھتیں گونجتی ہوئی اور ہیل تن گرانڈیل دیواریں جن سے ٹکرانے کو جی چاہے۔ وسیع چکنے فرش جن پہ گرمیوں میں ننگے پاؤں چلو تو منٹ بھر میں ٹھنڈا فرش پیروں کی ساری گرمی چوس لے۔ بے حساب دروازے محرابوں دار حیرت سے منہ کھولے۔ ادب اور مروّت سے سر جھکائے۔ بلند کرداری اور احساسِ وفاداری سے منہ بند کئے۔

احسان منزل — دس سال بعد میری نگاہیں احسان منزل کی فولادی دیواروں سے ٹکرائیں۔ پورے دس سال، ایک صدی کا دسواں حصّہ — مگر ہر چیز جُوں کی توں۔ ہر تفصیل ضروری اور غیر ضروری اپنی جگہ موجود۔ نہ کوئی ابہام نہ کسی قسم کی دُھند بلکہ بس چلے تو چھو دیکھو۔ وہ دیو نژاد صدر دروازہ بھاری بھاری شہتیروں کا بنا ہوا لوہے کی بڑی بڑی کیلوں، پیتل کی پتریوں اور چوبی نقش و نگار سے مزیّن، اپنی بلندی اور وسعت سے دلوں میں خوف سا پیدا کرتا تھا۔ اس صدر دروازہ کو دن اور رات کو چوبیس گھنٹوں میں صرف تین یا چار گھنٹہ کے لئے بند کیا جاتا تھا۔ جب آدھی رات کا سکوت اتنا گہرا ہو جاتا کہ احسان منزل بھی اس سکوت میں غرق ہو جاتی تب صدر دروازہ کی چرچراہٹ آہستہ آہستہ تاریکی اور سکوت میں ایک ہلکی سی لکیر کھینچتی چلی جاتی اور اپنی مقررہ مدت میں اپنا مقررہ فاصلہ طے کر کے تاریکی اور سکوت میں کہیں ڈوب جاتی۔ پھر صبح منہ اندھیرے ایسا معلوم ہوتا کہ اُفق کی اُبھرتی ہوئی سفیدی میں سے یہی لکیر آہستہ آہستہ واپس لوٹتی اور صدر دروازہ میں سے ہوتی ہوئی احسان منزل کے کسی وسیع صحن میں غائب ہو جاتی اور سامنے صدر دروازہ کھلا ہوتا جیسے رات کی تاریکی میں کسی نے بند ہوتے نہ دیکھا تھا اور جو دن کی روشنی میں بیباکانہ کھلا اپنی بلندی اور وسعت کا رُعب ہر شخص پہ ڈالتا تھا۔

بلند صدر دروازہ کے اُوپر بالاخانہ، جسے کوٹھی کہتے تھے، بند رہتا تھا جب میاں جان کے پیر صاحب اپنے سالانہ دورہ پر تشریف لاتے تھے تو اس کوٹھی میں قیام فرماتے تھے۔ یہ کوٹھی پیر صاحب کے آنے سے کئی دن پہلے جھاڑی پونچھی جاتی تھی فرش باہر دھوپ میں ڈالے جاتے تھے، قالین رگڑ رگڑ کر صاف کئے جاتے تھے، آلات شیشہ، جھاڑ فانوس کمالِ محنت سے چمکائے جاتے تھے۔ مدینہ منوّرہ، در خانہ کعبہ کی رنگین تصاویر "یا محمدؐ" "یا اللہ" کے فریم کئے ہوئے طغرے دیواروں پر قرینہ سے سجائے جاتے تھے۔ پیتل کے اگر دان مانجھ کر صاف کئے جاتے اور اگر بتیاں لگا دی جاتیں۔ لوبان سے کوٹھی کے ہر کونے کو دھونی دی جاتی۔ غرضیکہ احسان منزل کی تمام تر توجہ کوٹھی پر مرکوز ہو جاتی۔

مگر — نوجوان طبقہ پر پیر صاحب کے تشریف لانے کی خبر بجلی کی طرح گرتی۔ نمعلوم کتنے منصوبے تبدیل کرنے پڑتے۔ خدا معلوم کتنی تجاویز پر نظرِ ثانی کرنا ضروری ہو جاتا کہ کوٹھی کے آگے شہ نشین جوانی کی شہ رگ تھی۔ شہ نشین جسے بالکونی کہا جا سکتا ہے مگر کہاں بالکونی اور کہاں شہ نشین۔ شہ نشین صدر دروازے پہ آگے کی طرف ٹھہری ہوتی تھی، اس پہ نہایت سبک چوبی کام اور سبز روغن ہوتا تھا۔ کنگوروں دار چھجہ سے قناتوں کی قسم کے چھپے ہوئے کپڑے کے بنے ہوئے پردے لٹکتے تھے، اور نوجوان اُمّت کے جو چار پانچ ایک گروہ والے بانکے احسان منزل میں اپنی حدود میں رہتے ہوئے اپنے طور پر حکومت کرتے تھے اس

شہ نشیں سے کیا کچھ فائدہ نہ اُٹھاتے تھے۔ یہ شہ نشیں اندھیری راتوں میں بھی کام آتی یا پھر صبح ہونے سے دو ایک گھنٹہ قبل رات کے کھلنے سے پہلے یا دو ان یا بعد کسی نہ کسی وقت موقع پا کر دو بیتاب، بیباک، نہایت چالاک مگر ملتجی نگاہیں دو محجوب، ہراساں اور مجبور آنکھوں کو اپنی طرف مخاطب کرتیں۔ وقت اور طریقہ کا ان آنکھوں آنکھوں میں بتلا دیا جاتا اور گروہ کے سب لوگوں کو شہ نشیں کے گھرے ہونے کی اطلاع ہو جاتی۔ آدھی رات کو محجوب، ہراساں اور مجبور آنکھیں چھتوں اور منڈیروں کو دبے قدموں عبور کرتیں یا پھر صبح ہونے سے دو ایک گھنٹہ قبل دبے قدموں کی چاپ سنائی دیتی اور بیتاب، بیباک نہایت چالاک مگر ملتجی نگاہیں شہ نشیں پر محجوب، ہراساں، اور مجبور آنکھوں کے لئے فرشِ راہ ہوتیں اور پھر شکوے شکایت، رمز و کنائے، کتنے وعدے ہوتے، کتنی سسکیاں کتنی التجائیں۔ کتنے جھوٹ ہوتے جو بالکل سچ معلوم ہوتے اور کتنے سچ ہوتے جن سے پہلو تہی کی کوشش کی جاتی۔

محرم کے دنوں میں جب صدر دروازہ پر سبیل چڑھائی جاتی تو میاں جان دوسرے بزرگوں کے ہم جلو اسی شہ نشیں پر بیٹھتے۔ صدر دروازہ پر سبیل کے چاروں طرف خلقت جمع ہوتی، کورے کورے آبخوروں میں شربت بانٹا جاتا، میاں جان سارے انتظام کا بچشم خود معائنہ فرماتے جو لوگ ان کے ساتھ بیٹھے ہوتے ان میں سے کسی کو نہایت ہموار اور متوازن آواز میں نہایت سنجیدگی سے کوئی ہدایت دیتے اور وہ "حضرت جی بہت بہتر" کہہ کر شہ نشیں پر سے نیچے کی طرف جھک کر بلند آواز میں وہی ہدایت بڑے ذمہ دارانہ انداز میں دہرا دیتے اور اس ہدایت کا اثر مجمع اور منتظمین دونوں پر خاطر خواہ ہوتا۔ اسی شہ نشیں سے بیبیاں، بیٹیاں، بیگمیں، بہوئیں، تعزیے، مہندیاں گزرتے دیکھتیں۔ یہ شہ نشیں، جس کے ہر چوبی نقش سے ایک داستان عبارت تھی، جس کے کنگوروں نے کیا کچھ منظر نہ دیکھے تھے، جس کے شطرنجی فرش پر ایک تاریخ مرتسم تھی، جس کے سبک ستونوں میں رازِ دل کے خزانے بند تھے۔

مجھے دس سال بعد بھی بے شمار باتیں یاد تھیں، بلکہ ساری ہی باتیں یاد تھیں۔ یہ دس سال پلک جھپکتے گزر گئے دس سال پہلے جب میں احسان منزل چھوڑ کر اس جگہ آیا تھا تو یہاں آتے ہی دوڑتی ہوئی، لپکتی ہوئی، تڑپتی اور مچلتی ہوئی تیز و تند اور صبا رفتار زندگی نے مجھے جھپٹ لیا۔ پھر میں دس سال تک اس رواں دواں زندگی میں کسی گم کردہ راہ کی طرح ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر سرگرداں رہا۔ اس دس سالہ برق رفتار زندگی میں کبھی یہ نہ سوچا کہ میں نے کیا کھویا، اور کیا پایا اور آج دس سال بعد ہنگامہ کا تسلسل معاً ٹوٹ گیا اور میرا ذہن ہزاروں یادوں، سینکڑوں واقعات اور تفصیلات کی آماجگاہ بن گیا ہے۔ میں پھر دس سال پیچھے لوٹ رہا ہوں۔ دس سال پہلے کی زندگی کی طرف، احسان منزل کی طرف!

احسان منزل کے بلند صدر دروازے کی غلام گردش میں دیوار کے سہارے دو بیساکھیاں لگی تھیں۔ ان دو بیساکھیوں کا رنگ اب بھی گہرا کتھئی تھا۔ ان دونوں بیساکھیوں کا کتھئی رنگ قریب بالشت بھر اُڑ گیا تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سے انہیں پکڑا جاتا تھا۔ یہ دونوں بیساکھیاں جو دیوار سے لگی کسی کی منتظر تھیں معلوم نہیں کب سے استعمال نہ ہوئی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کے متوازن دیوار سے لگی کھڑی تھیں۔ معاً ان کے درمیان جو خلا تھا وہ آہستہ آہستہ بھرنا شروع ہوا اور وہ کابلی خاں جس کی دونوں ٹانگیں افغانستان میں گولیوں سے چھلنی کر دی گئی تھیں، دیوار میں سے اُبھرا اور ان بیساکھیوں پر لٹک گیا۔ اس کی بیکار ٹانگیں بیساکھیوں پر جھولنے لگیں اور اس کا سر کندھوں پر ڈھلک گیا اور اس کی مہندی سے رنگی ہوئی سرخ داڑھی اس کے سینہ کو چھونے لگی۔ کابلی خاں دیوار سے لگی بیساکھیوں پر اس طرح لٹکا تھا جیسے تصویروں میں حضرت عیسیٰ صلیب پر لٹکے نظر آتے ہیں۔ ان بیساکھیوں کے سہارے یہ کابلی خاں جب جی چاہتا اُٹھ کر چل دیتا۔ اس کے آنے جانے، اُٹھنے بیٹھنے پر کوئی روک تھام نہ تھی۔ احسان منزل میں مزاحمت کا دستور ہی نہ تھا۔ سارے شہر پر اس کابلی خاں کا رُعب تھا۔ شہر کی امن پسند آبادی میں اس کابلی خاں کا وجود ایسا تھا جیسے کمپنی باغ کے سبزہ زار میں کسی جنگ کی یادگار کا ستون نصب ہوتا ہے، جس پر اس جنگ کی تاریخ، جگہ، مدت، مختصر حال اور مرنے والوں کی فہرست کندہ ہوتی ہے۔ شہر کی امن پسند آبادی کی جنگ سے متعلق معلومات اتنی کم تھی کہ اس کا ردِ عمل یہی ہو سکتا تھا کہ وہ سب کابلی خاں کی محض غیر ارادی طور پر عزت کریں۔

احسان منزل کے صدر دروازہ میں یہ بیساکھیاں جب کھٹ کھٹ کرتی داخل ہوتیں تو صرف اتنی ہی آہٹ پیدا ہوتی جتنی ان بیساکھیوں کی کھٹ کھٹ سے پیدا ہو سکتی تھی، نہ کم نہ زیادہ اور جب یہ کھٹ کھٹ بند ہو جاتی تب بھی اس کی خاموشی سے فضا کی خاموشی پر کوئی غیر معمولی اثر نہ ہوتا۔ احسان منزل کی فضا میں کسی آہٹ اور کسی سناٹے کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ وہاں دن رات کے ہر حصہ میں کوئی نہ کوئی دروازہ کھلتا یا بند ہوتا ہی رہتا تھا، کوئی نہ کوئی چیز اٹھائی یا رکھی ہی جاتی تھی۔ آہٹیں اور آوازیں احسان منزل کے ماحول پر جس قدر بھی اثر انداز ہوتی ہوں، بہر حال ان کا اثر غیر متوقع یا غیر معمولی نہ ہوتا تھا۔ مثلاً صدر دروازہ کے اوپر، تہ نشین اور کوٹھی سے کہیں اونچائی پر وہ ممٹی، وہ چھتری نما برجی، جس پر کبوتر آ بیٹھتے تھے، پرواز کرتے کرتے سستانے کے لئے ممٹی پر گویا قیام کرتے، اپنی چونچ سے اپنے پروں میں کوئی چیز تلاش کرتے، اپنے بازو اپنے پیروں پر رگڑتے، اپنی دُمیں پھیلاتے، ان کے چنور بناتے۔ دن بھر نہ معلوم کہاں کہاں سے یہ کبوتر ممٹی پر بیٹھتے رہتے، گویا یہ ان کی قیام گاہ تھی اور ذرا دیر سستانے کے بعد نہ معلوم کس منزل کی طرف اُڑ جاتے اور شام کو بسیرا لینے والے ہی کبوتر ممٹی پر آ کر بیٹھنا شروع کر دیتے۔ جب سورج ڈوب رہا ہوتا اور ہوا میں ایک مخصوص سنسناہٹ پیدا ہونے لگتی تو اس ساری فضا میں بسیرا لینے والے ان کبوتروں کی غٹرغوں بھی شامل ہو جاتی۔ اتنی اونچی ممٹی پر سے غٹرغوں کی یہ آواز صدر دروازہ تک پہنچ ہی جاتی اور یہ معلوم ہوتا کہ یہ ہلکی ہلکی غٹرغوں چھت کی طرف سے نہیں آ رہی بلکہ غلام گردش کے فرش سے اُٹھ کر فضا میں تحلیل ہو رہی ہے۔

یہ ہلکی ہلکی آوازیں، شور کی ایک دھیمی اور ہموار کیفیت، مختلف آوازوں کا یہ مانوس سا امتزاج کانوں سے ہوتا ہوا میرے سارے جسم میں سرایت کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ گویا میرے خون میں تحلیل ہو رہا تھا۔ اس آواز میں ایک اور چیز شامل ہو رہی تھی، میرے دل کی دھڑکن اور مجھے آوازوں کے اس ہموار امتزاج کے ساتھ ساتھ ہر آواز الگ الگ بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں بالکل تنہا بھی تو نہ تھا۔ میرے اِرد گرد ایک ہجوم تھا۔ یادوں کا، خیالات کا، خوابوں کا۔ بے شمار مناظر میری آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ میرا ذہن ان تصاویر کی ورق درورق گردان کر رہا تھا۔

دیوان خانے داخل ہوتے ہی ایک وسیع صحن عبور کرنا پڑتا تھا۔ اس وسیع صحن میں چارپائیوں، بنچوں یا فرش پر سارے دن کاشتکار، نمبردار، اہلِ غرض، علاقوں سے مقدموں کے سلسلے میں آئے ہوئے پیروکار، غرضیکہ بیسیوں متعلق اور غیر متعلق قسم کے لوگ بیٹھے نظر آتے تھے۔ علاقوں سے جو بھی کسی کام سے شہر آتا احسان منزل کا رخ کرتا اور میاں جان کو پتہ نہیں اتنے بہت سے آنے والوں کی شکلیں، نام اور اتہ پتہ کیونکر یاد رہتا تھا۔ داہنے ہاتھ پر بڑے بڑے ستونوں والا جو برآمدہ تھا اس میں جوں ہی میاں جان نظر آتے علاقہ سے آئے ہوئے سب لوگ ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑے ہوتے اور جھک کر ڈنڈوت کرتے، میاں جان کے پاؤں چھونے کے لئے آگے کی طرف لپکتے۔ میاں جان کے چہرے پر ٹھہری متانت میں بالکل فرق نہ آتا۔ "کیسے آئے ہربنس؟" میاں جان ان میں سے ایک سے پوچھتے۔

"سرکار کو پیشی ہے مالک" ہربنس لجاجت سے کہتا۔

"اور تو ٹھیک ہے نا سب" میاں جان پوچھتے۔

"سرکار حضور کی کرپا سے سب ٹھیک ہے مالک" ہربنس جواب دیتا اور اس طرح میاں جان تقریباً ہر شخص سے فرداً فرداً بات چیت کرتے۔ انہیں کسی سے یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ احسان منزل میں ان لوگوں کے قیام و طعام کا کیا کچھ انتظام ہوتا تھا یا یہ کہ ان میں سے کس کس کو احسان منزل میں ٹھہرنے کی اجازت تھی، کیونکہ احسان منزل میں ٹھہرنا ان سب کا فرض تھا اور اس فرض نے یہ صورت اختیار کر لی تھی کہ علاقوں سے آنے والی رعایا، پٹواری، اہلکار، چوکیدار، نمبردار، کسی کو بھی مجال نہ تھی کہ شہر آنے پر احسان منزل کے علاوہ کسی جگہ بھی اپنے قیام کا انتظام کرتا۔ ان میں سے بیشتر لوگ

اپنے ساتھ پڑلیاں تھیلے وغیرہ بھی لاتے تھے جن میں علاوہ دوسری ضروری چیزوں کے آٹا، دال، نمک اور ایک دو برتن بھی ہوتے تھے۔ دیوان خانے کے وسیع صحن میں گھستے ہی یہ لوگ اپنے گرد آلود جوتے اتار کر دیوار کے سہارے رکھ دیتے۔ پوٹلیاں، گٹھڑیاں، تھیلے ایک کونے میں ڈال دیتے اور خود کارندوں سے ذرا فاصلہ پر حسبِ مرتبہ فرش، چارپائی یا بنچ پر بیٹھ جاتے۔ کارندے لکڑی کے ڈیسکوں پر کھلی ہوئی کھیوٹ کھتونیوں اور نقشوں پر جھکے نظر آتے۔ ہندو کارندوں کے سروں پہ کالے رنگ کی گول ٹوپیاں ہوتیں اور ناک کے بھجے پر کالی کمانی کا چشمہ لگا ہوتا۔ یہ سب اس بڑے سے برآمدہ میں بیٹھے ہوتے جو صحن کی داہنی طرف تھا اور جس کی چھت کو بڑے بڑے ستون اپنے سروں پر اٹھائے کھڑے تھے۔ برآمدہ کے دروں میں گملے لٹکے ہوتے تھے اور ستونوں پر چمیلی کی بیل جھاڑ جھنکاڑ کی طرح پڑھتی چلی جارہی تھی۔

دیوان خانہ کے صحن میں جو چبوترہ تھا اس پر ایک لمبی سی آرام کرسی پڑی تھی۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس آرام کرسی پر برسوں سے کوئی نہ بیٹھا تھا۔ شاید یہ برسوں سے اسی طرح اس چبوترہ پر پڑی تھی۔ کریم بخش اسے اٹھانے کی ضرورت نہ سمجھی ہوگی۔ میاں جان کے علاوہ اس کرسی پہ کون بیٹھ سکتا تھا اور میاں جان کے انتقال کے بعد اس کرسی کا مصرف بھی کیا تھا۔ کرسی کی بید کا رنگ دھوپ اور بارش کے باعث کتھئی ہوتا جاتا تھا اور وارنش کا رنگ اُڑ رہا تھا۔ وارنش کا اُڑا اجاڑ رنگ بید کے کتھئی رنگ میں حل ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کرسی نہ صرف کریم بخش کی بے توجہی کا شکار ہوچکی ہے بلکہ وہ خود بھی اپنی طرف سے بے اعتنا ہوگئی۔ مجھے دکھائی دے رہا تھا کہ اس کرسی کی آنکھیں ہیں جو نیم غنودگی کے عالم میں بند ہیں اور سر ہے جو ایک طرف کو ڈھلک گیا ہے اور بدن ہے جو بے حس سا پڑا ہے۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ کرسی نے جھرجھری سی لی اور مجھے اس کے گرد پڑے مونڈھے اور پلنگ نظر آنے لگے۔ جن پر مانوس شکلیں براجمان تھیں۔

میاں جان کرسی پر بیٹھے تھے اور پیچوان ان کے قریب رکھا تھا۔ حکیم صاحب اور قاضی صاحب حسبِ معمول تخم ریحان یا کسی ایسی ہی چیز کی خاصیت بتلانے کے لئے موجود تھے۔ شیخ صاحب اپنے چہرے پر حزن و ملال کی کیفیات کو شدید سے شدید تر کرنے میں منہمک تھے۔ شاید ان کے کسی عزیز پر کوئی نئی مصیبت ٹوٹ پڑی تھی۔ سید علمدار حسین صاحب حالاتِ حاضرہ کو اپنے رنگ میں پیش کرنے کے لئے بیتاب نظر آرہے تھے۔ بیخبر امروہوی گردن جھکائے اپنی تازہ غزل دل ہی دل میں دہرا رہے تھے۔ مطلع بہت روح پرور تھا:

آئے ہیں وہ، ہر طرف جلوہ گری کا جوش ہے | ہر نگاہِ شوق میری گلستاں بردوش ہے

قریب ہی اثر در اکبرآبادی بھی تیار بیٹھے تھے۔ بیخبر صاحب کی غزل کے بعد انہیں اپنا مزاحیہ کلام اسی زمین میں پیش کرنا تھا:

میرے مسکن کا پتہ پوچھیں تو یہ دینا بتا | اِک محلہ ہے کہ مے خانے سے ہم آغوش ہے

اثردر صاحب اور بیخبر صاحب میں ایک سمجھوتہ تھا۔ سرِ محفل چشمک رہتی تھی۔ احسان منزل سے باہر نکلتے ہی دوسرے دن کا پروگرام طے کیا جاتا تھا۔ اس طرح نہ صرف نشست میں دلچسپی قائم رہتی تھی بلکہ خاطر خواہ مشقِ سخن جاری رہتی تھی۔

"سرکا ابن خلدون کے نزدیک قبیلہ کی اہمیت ....." اس قسم کی بات ہمیشہ مولوی ولایت حسین صاحب شروع کرتے تھے اور ساری فضا مکدر ہوجاتی تھی۔ ہر شخص کے چہرہ پر کرب کے آثار نمایاں ہونے لگتے۔ مگر میاں جان مولوی صاحب سے مصروفِ گفتگو ہوجاتے اور جب کھانا کھا کر کہیں رات گئے یہ سب حضرات رخصت ہوتے اور احسان منزل سے باہر آتے تو بیخبر صاحب اثردر صاحب سے کہتے:

ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ کیا معنی کہ اس قدر سنگلاخ زمین تھی جس میں اتنی مرصع غزل نکالی مگر خدا بھلا کرے مولوی صاحب قبلہ کا کہ ابن خلدون لے بیٹھے۔"

اثردر صاحب غزل کے بیکار جانے پر تأسف کا اظہار کرتے مگر اپنے مخصوص انداز میں فرماتے "تو گویا غزل کو ابنِ خلدون لے بیٹھے"۔

کھانے کے بعد میاں جان اپنے مطالعہ کے کمرہ میں چلے جاتے جہاں بغیر کسی خاص ترتیب کے سینکڑوں کتابیں رکھی تھیں اور کسی کی یہ ہمت نہ تھی کہ کتابوں کی بے ترتیبی کو کسی قسم کی ترتیب دے سکتا۔ مطالعہ کے کمرہ میں کتابوں کی یہی بے ترتیبی اصل ترتیب تھی کیونکہ میاں جان کو معلوم تھا کہ کونسی کتاب کس جگہ ہے۔ آدھی رات تک وہ مطالعہ کرتے رہتے، پھر ان کے کھنکارنے کی ایک مخصوص آواز آتی اور سب کو معلوم ہو جاتا کہ وہ آرام کرنے اپنے خاص کمرہ میں تشریف لے آئے ہیں۔ وہ ایک آدھ مرتبہ کھانستے، کچھ دیر حقہ کے گڑگڑ کرنے کی آواز احسان منزل میں پھیلی رہتی، پھر اس آواز کی رفتار کم ہونا شروع ہوتی، یہاں تک کہ پلنگ پر کروٹ لینے کی ایک بہت مدھم آہٹ سی سنائی دیتی اور اس آہٹ کے ساتھ ہر چیز سکوت میں ڈوب جاتی۔ احسان منزل کی آغوش میں پڑی ہر چیز گہری نیند میں غرق ہو جاتی اور رات کی تاریک فضا میں احسان منزل سیاہ آسمان کی طرف منہ اٹھائے کھڑی رہتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کائنات میں صرف دو چیزیں ہیں۔ آسمان اور احسان منزل اور یہ دونوں ایک دوسرے کی رازداں ہیں اور رات کی تاریکی میں جب ہر شخص نیند میں مدہوش ہے، اس وقت یہ دونوں رازداں کسی گہری سوچ میں غرق ہیں۔

اس تاریکی اور سکوت میں کبھی کسی کتے کے بھونکنے کی آواز فضا میں پھیل جاتی، کبھی کسی یکہ کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دے جاتی اور کبھی احسان منزل کے زنانخانے میں کسی بچہ کے نیند سے چونک کر رو پڑنے کی آواز آتی۔ یہ سب آوازیں اس سکوت اور تاریکی میں اور زیادہ گہرائی پیدا کر دیتیں۔ گویا یہ سکوت اور تاریکی کوئی خاموش کیفیت نہ تھی اور یہ آوازیں رات کے اس گہرے سناٹے کا صوتی اظہار تھیں۔

زنانخانے میں میاں جان دوپہر کے کھانے سے ذرا پہلے تشریف لاتے تھے۔ رات کا کھانا وہ دیوان خانے میں ہی کھاتے تھے۔ دوپہر کا کھانا بیچ کے کمرہ میں کھایا جاتا تھا۔ اس وسیع کمرہ میں بڑے بڑے قالین بچھے تھے اور صاف شفاف چاندنی پر میاں جان گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر بیٹھ جاتے تھے۔ ایک لمبا دسترخوان کمرہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا دیا جاتا تھا۔ خادمائیں تانبے کی جھلمل کرتی قلعی دار قابیں لا لا کر دسترخوان پر رکھتی جاتیں۔ قابوں پر سرپوش ڈھکے ہوتے، دروازے کے ایک طرف دہلیز پر بڑا سا آفتابہ رکھا ہوتا۔ میاں جان کے آتے ہی ایک ایک کرکے خاندان کے دوسرے لوگ آنا شروع ہو جاتے اور دسترخوان کے اردگرد بیٹھتے جاتے۔ عورتیں، مرد، لڑکیاں، لڑکے سب کے سر ڈھکے ہوتے اور اس سلسلہ میں کسی نامعقولیت کو کبھی برداشت نہ کیا جاتا۔ درجنوں بھتیجے بھانجے احسان منزل میں پل رہے تھے۔ اور سب کا دوپہر کے کھانے پر موجود ہونا ضروری تھا۔ سب کے سب سہمے ہوئے سے سر جھکائے، دبے پاؤں داخل ہوتے اور چپکے سے دسترخوان کے پاس ایک طرف کو بیٹھ جاتے۔ کمرہ میں گھستے وقت ایک احساسِ جرم ساتھ ہوتا اور کھانے کے دوران یہ احساسِ جرم برابر فضا پر طاری رہتا۔ اگر ہم میں سے ایک کے خلاف کوئی شکایت میاں جان تک پہنچی ہوتی تو وہ کچھ کہنے کی غرض سے اس شخص کی طرف نگاہ اٹھاتے اور اس شخص کی طرف سب کی نگاہیں آہستہ آہستہ اٹھ جاتیں۔ پھر میاں جان کی نگاہ دسترخوان کے اس سرے پر پڑتی جہاں ان کی بیوہ ہمشیرہ یا مرحوم بھائی کی بیوہ بیٹھی ہوتیں اور مجرم کی والدہ ہونے کی وجہ سے ان بیچاری کا لقمہ حلق سے اترنا مشکل ہو جاتا۔ میاں جان کی نگاہیں واپس لوٹ آتیں اور وہ بغیر کچھ کہے کھانے کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ یہ سب ایک منٹ میں ہو جاتا، مگر اس ایک منٹ میں جو کچھ ہوتا وہ کتنی طویل داستان تھی اور اس کا بیان کس قدر مشکل تھا۔

بیچ کے کمرہ میں ایک بڑی تصویر لگی تھی جس کا فریم سنہری تھا۔ تصویر میں احسان منزل کی ایک پرانی نسل کے اراکین کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ نوجوان کرسیوں کے پیچھے کھڑے تھے اور بچے فرش پر بیٹھے تھے۔ میاں جان نوجوانوں میں نظر آ رہے تھے، انگرکھا، مشروع کا پاجامہ، چوگوشیہ کامدار ٹوپی، سلیم شاہی جوتا۔ تصویر میرے خاندان کی ایک تاریخی یادگار تھی۔ تصویر کے نیچے سب لوگوں کے نام لکھے تھے۔

"رکابدار نصیر خاں، صاحبزادہ عظمت علی خاں بہادر عرف بنّے صاحب، صاحبزادہ شفقت علی خان بہادر عرف مجن میاں، نواب احتشام حسین صاحب، رکابدار شفیع اللہ مرحوم، داہنے سے بائیں کھڑے ہوئے ہیں۔"

نواب سید عرفان حسین محشر مرحوم، خاں بہادر نواب سید قربان حسین صاحب سرکار نواب احسان حسین صاحب، حاجی حافظ منشی مراتب علی سحر مرحوم، نواب حاجی رضوان حسین مرحوم۔ داہنے سے بائیں بیٹھے ہیں۔"

یہ تصویر مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ جیسے میرے سامنے یہ جو ابتر سے بسے ہوئے ہسپتال کے کمرہ کی سپاٹ دیوار ہے، اسی پر یہ تصویر لگی ہو اور میں تو یہ بھی اچھی طرح دیکھ سکتا تھا کہ اس تصویر پر گرد جمی ہوئی ہے۔ اس کے اُوپر جو سنہری گوٹے کے ہار ٹنگے ہوئے تھے وہ ایک دوسرے میں اُلجھ گئے ہیں اور ان پر سلمے اور ستارے کالے پڑ گئے ہیں۔ اسی تصویر کے اِدھر اُدھر فریم کئے ہوئے سپاسنامے، قصائد اور طغرے ٹنگے ہوئے تھے اور ان سب پر سنہری گوٹے کے ہار لٹک رہے تھے۔

بیچ کے کمرہ سے اور کئی کمرے نکلتے تھے، نمعلوم کتنے بہت سے کمرے تھے، نمعلوم کون کون ان میں رہتا تھا۔ سب ہمارے اپنے آدمی تھے۔ مگر اب یاد کرتا ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سے کیا رشتہ تھا۔ ان کا مجھ پر اور میرا اُن پر کیا کچھ حق تھا۔ ان میں ہر عمر کے لوگ تھے۔ عورتیں، لڑکیاں، بُڑھیاں، بچیاں، ان میں ماماٗیں، خادمائیں مغلانیاں بھی تھیں۔ ان کے خاندان بھی تھے اور احسان منزل کی زندگی میں یہ سب برابر کے شریک تھے۔ شادی بیاہ، مرنے جینے، کھیل کود غرضیکہ ہر موقع پر یہ لوگ اپنے اپنے فرائض انجام دیتے رہتے تھے۔

رات کے اندھیرے میں جب آنکھ مچولی کھیلی جاتی تو گھر کی لڑکیاں اور خادماؤں کی لڑکیاں سب شریک ہوتیں۔ میری نگاہوں کے سامنے برسوں پہلے کا وہ واقعہ آ گیا جب آنکھ مچولی کے دوران سب لڑکیاں زنان خانے کے کسی نہ کسی حصہ میں چھپی، دبکی سانس بند کئے بیٹھی تھیں اور میں نے بارہ دری میں سے گزرتے ہوئے دیکھ لیا تھا کہ اختری، جس کی ماں کو پھوپھی اماں نے نوکر رکھا تھا اور جس کے مرنے کے بعد اختری کو پھوپھی اماں نے ہی پالا تھا، سامنے والی کوٹھری میں چھپنے کے لئے داخل ہو رہی تھی۔ میں دبے پاؤں کوٹھڑی میں داخل ہوا اور اختری کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "کیا کرتے ہیں چھوٹے میاں؟" اختری نے سہم کر دبی آواز میں کہا اور میں نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ پھر کتنی دیر تک میرا دل دھڑکتا رہا اور کتنی دیر تک میں کانپتا رہا۔ پھر کئی دن تک میں اختری سے نظریں نہ ملا سکا اور وہ بھی مجھے قریب آتا دیکھ کر کتراتی رہی۔

پھر جب اختری بیمار پڑی اور اس کے میعادی بخار نے خطرناک صورت اختیار کر لی تو میں واقعی بے حد پریشان تھا اور میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں اختری کی خیریت گھر والوں سے کس طرح پوچھوں۔ اس کے جواب میں اگر کوئی مجھ سے یہ سوال کر بیٹھتا کہ تمہیں اختری کی خیریت کی اتنی فکر کیوں ہے؟ تو میں کیا جواب دیتا۔ کئی دفعہ میں نے سوچا کہ میں خود اختری سے کسی طرح اکیلے میں جا ملوں اور اس کی مزاج پُرسی کروں یا کم از کم یہ بتا دوں کہ میں اس کی طرف سے کتنا متفکر ہوں۔ مگر یہ بھی تو ممکن نہ تھا۔ بیمار کی چارپائی سے لگا کوئی نہ کوئی بیٹھا ہی رہتا تھا اور آج میں اپنی زندگی کے اس ادھورے رومان کو کس جذبہ، کس کیف سے یاد کر رہا ہوں۔ حالانکہ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ اس معمولی سے واقعہ میں دراصل کوئی رومان ہے بھی یا نہیں۔ مگر اب کہ مجھے ڈاکٹر جواب دے چکے ہیں اور اب کہ میں محض رساً جی رہا ہوں، بستر پر پڑا ہوں۔ ہسپتال کے اس بیکیف کمرہ میں جہاں دوسرے مریض بھی میری طرح زندگی کی دوڑ میں تھک سے گئے ہیں اور اب کہ کسی بھی دن کسی بھی لمحہ ان پر گہری نیند طاری ہونے والی ہے ہسپتال کے اس بے کیف کمرہ میں مجھے اس ادھورے رومان کی یاد اور زیادہ افسردہ بنا رہی ہے۔ مجھے اختری کے چہرہ کا رنگ یاد نہیں آ رہا، مگر اس کے چہرہ پر حزن کی کبھی دبتی کبھی نکھرتی کیفیت میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ میری انگلیوں میں اس کی گداز کلائی کا لمس جاگ اُٹھا ہے۔ چند سیکنڈ ہی میں نے اس کی کلائی پکڑی تھی۔ اس نے سہم کر دبی آواز میں کہا تھا "کیا کرتے ہیں چھوٹے میاں؟" اور میں کلائی چھوڑ دی تھی۔ مگر اس وقت

ایسا محسوس کر رہا ہوں۔ گویا ان نحیف، ناتواں، سوکھے ہوئے ہاتھوں نے وہ گداز کلائی ساری عمر پکڑی ہے اور اس کے لمس سے، اس کی گرمی سے، اس کی روح سے یہ انگلیاں آگاہ ہیں۔

احسان منزل میں کیا قیامت بپا ہوئی تھی، جس دن میاں جان کا انتقال ہوا تھا۔ زنانخانے میں کہرام مچا ہوا تھا۔ دیوان خانے میں ہر شخص منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔ ملازم رونے کے لئے چھپتے پھرتے تھے۔ کوئی برآمدہ کے ستون کے پیچھے منہ چھپا کر آنسو پونچھ رہا تھا۔ کوئی کمرہ میں جا کر ایک کونے میں بیٹھ گیا تھا اور ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ کوئی پانی کا گلاس آگے بڑھا کر آنسوؤں کو نہ روک سکنے کی وجہ سے منہ دوسری طرف کئے پیتا تھا۔ آنسو پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ عورتیں، بچے، جوان، بڈھے، سب ہی بے طرح متاثر تھے۔ احسان منزل کے پیچھے جو بہت بڑا باغ تھا اس کے آخری سرے پر ہمارے خاندان کی قبریں تھیں۔ جنازہ صدر دروازے سے نکلا اور پورے شہر کا چکر لگا کر باغ کے اس آخری سرے تک لے جایا گیا جہاں بڑی اور چھوٹی قبروں میں احسان منزل کے چشم و چراغ ابدی نیند سو رہے تھے۔ قبر تیار تھی، دفن کرنے سے پہلے تابوت پر سے کفن ہٹایا گیا۔ میاں جان کا متین چہرہ۔ خاموش، بردبار، سنجیدہ اور پھر ذرا دیر میں ان پر منوں مٹی ڈال دی گئی۔ احسان منزل کے قدموں میں انہیں دفن کر دیا گیا۔

اور اس کے بعد ہر چیز اجڑی ہوئی معلوم ہوتی۔ ہر چیز پر بیوگی کی سی کیفیت طاری تھی۔ سناٹا، اداسی، حزن، رات کی سیاہی بڑھنے لگی اور جو دن بھر سوگ منا کر نڈھال ہو گئے تھے جہاں بیٹھے تھے وہیں سو گئے۔ جو جس جگہ تھا وہیں لیٹ گیا اور میں بڑی دیر تک میاں جان کے کھنکارنے کی مانوس آواز کا منتظر رہا۔ حقہ کی گڑگڑاہٹ کی ہلکی ہلکی آواز کے لئے میرے کان بیتاب تھے مگر دیوان خانے میں موت کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا بلکہ اندر اور باہر ساری احسان منزل خاموش اور سوگوار تھی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ یہ اندھیرا، یہ خاموشی، یہ سوگ مجھے اس وقت بھی محسوس ہو رہا ہے۔ دس سال قبل جب آخری دفعہ میں احسان منزل چھوڑ کر جا رہا تھا تو میں نے پھوپھی اماں سے ساتھ چلنے کے لئے کہا تھا۔

"کہاں لے جاؤ گے میرے چاند؟" انہوں نے پوچھا تھا۔

"آخر آپ یہاں کیا کریں گی؟ کون آپ کی دیکھ بھال کرے گا؟ اب کون ہے آپ کا احسان منزل میں؟" میں نے ان سے کہا تھا۔

"میں کہاں جاتی اس بڑھاپے میں مٹی خراب کرنے۔ اور راے لو، یہاں میرا کوئی کیوں نہ ہوتا۔ میرے لوگوں کی قبریں ہیں یہاں" پھوپھی اماں نے جواب دیا تھا۔ "کیا فضول سی بات ہے" میں نے سوچا تھا۔

مگر یہ فضول سی بات۔ آج میں اس ہسپتال کے بے کیف اور غیر مانوس ماحول میں موت کی آخری گھڑیاں گن رہا ہوں تو میرا ذہن بھٹک کر احسان منزل کے پیچھے جنگل کی طرح دور تک پھیلے ہوئے اس باغ کی طرف مجھے لے جا رہا ہے جس کے آخری سرے پر ہمارے خاندان کی قبریں تھیں۔ پھوپھی اماں کے لوگوں کی قبریں۔ انار کے درخت اسی طرح لگے تھے اور ان میں چھوٹے چھوٹے ہرے ہرے انار لٹک رہے تھے، جن میں سے سرخ رنگ کے پھول باہر کی طرف جھانکے جا رہے تھے اور امرود کے بے شمار درخت اور کروندے کی جھاڑیاں۔ قبروں کے ساتھ ساتھ مہندی کی روش اور چھوٹی بڑی قبریں جس میں وہ سب دفن تھے جن کی تصویریں بیچ کے کمرہ میں لگی تھیں۔ میرے اپنے لوگوں کی قبریں اور میں ان قبروں سے ہزاروں میل دور اپنی آخری ہچکی کا منتظر ہوں۔ مجھے میاں جان کی قبر نظر آ رہی ہے جو اب پختہ بن چکی ہے اور جس پر مرحوم کا نام، تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کندہ ہے۔ اس قبر کے پاس جو خالی جگہ چھوٹی ہوئی ہے میں اس سے بہت دور، بہت دور موت کا انتظار کر رہا ہوں اور میرا ذہن دس برس پیچھے کی طرف لوٹ رہا ہے۔ احسان منزل کی طرف!

ستمبر ۵۶ء

چالیس سالہ مخزن

# رضائی

مسعود مفتی

آج مجھے پھر ڈر لگ رہا تھا۔

بظاہر کوئی وجہ نہ تھی۔ جنگ وقتی طور پر بند ہو چکی تھی۔ زخمیوں کے وارڈ سے میری ڈیوٹی بدل چکی تھی۔ میں دفتر میں بیٹھ کر مختلف رجسٹروں میں اندراج کرتی اور رضائیاں، کپڑے اور تحفے وصول کرتی تھی۔ وقت گو رات کا تھا مگر چھوٹے سے کمرے میں بڑے بڑے بلب روشنی کر رہے تھے۔ اس روشنی کے باوجود مجھے ڈر لگ رہا تھا۔

میں بچپن سے ہی ڈرپوک ہوں اور مجھے اکثر ڈر لگتا ہے۔ گھر والے میرا مذاق بھی اُڑا دیتے ہیں۔ عموماً ڈر اچانک پنے کی وجہ سے لگتا ہے۔ اگر آدمی ذہنی طور پر کسی چیز کے لئے تیار نہ ہو اور وہ اچانک ہو جائے تو ڈر کر چیخ مار دیتا ہے۔ مگر آج والا ڈر ایسا نہ تھا۔ میں بس کرسی پر بیٹھی بیٹھی سہم رہی تھی۔

ایک دفعہ پہلے بھی مجھے ایسا ہی ڈر لگا تھا، بغیر کسی وجہ کے۔ وہ ۶ستمبر ۱۹۶۵ء کی رات تھی۔ آدھی رات کو میری آنکھ بغیر کسی ڈراونے خواب کے کھلی مگر میں پسینہ میں شرابور تھی۔ جیسے سخت دہشت میں ڈوبی ہوئی ہوں۔ کتنی دیر تک میں نے آنکھ کھول کر کروٹ بدلنے کی کوشش نہ کی۔ بالکل ساکت لیٹی کلمہ پڑھتی رہی مگر یوں کہ ہونٹ بھی نہ ہلیں، مبادا وہ انجانی طاقت جو مجھے خوفزدہ کر رہی تھی، ہلتے ہونٹ دیکھ کر مجھے دبوچ لے۔ کافی دیر بعد ابو صبح کی نماز سے کچھ پہلے اٹھے تو میرا دل چاہا کہ دوڑ کر لپٹ جاؤں مگر دوسرے شخص کو بیدار پا کر میں اپنی بے وقوفی پر خود ہی پشیمان ہونے لگی۔ گو ڈر بدستور قائم تھا۔

اتنے میں یک لخت خطرے کے سائرن لاہور کی خاموش ٹھنڈی نیم روشن فضا میں گونجے۔ میں ایک دم کمبل دُور پھینک کر امی سے جا لپٹی اور اپنی کپکپی سے ان کی چارپائی ہلا دی۔

پھر تھوڑی دیر بعد دُور سے گولے پھٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ تو اب باقی سب ڈرنے لگے مگر میرا ڈر ختم ہو گیا۔ . . . جیسے مجھے اسی چیز کا انتظار تھا اور اب اطمینان ہو گیا ہے۔

کچھ دیر بعد ہم مکان کی چھت پر چلے گئے۔ دُور سے لگاتار گولیاں چلنے کی آواز آ رہی تھی جیسے کوئی پاس بیٹھا حقہ پی رہا ہو۔ گیارہ بجے ریڈیو پر اعلان ہونے سے پہلے ہی ہمیں پتہ چل گیا کہ ہندوستان سے جنگ شروع ہو گئی ہے۔

مگر اب تو جنگ ختم ہو چکی ہے۔ پھر مجھے آج کیوں ڈر لگ رہا ہے ـــ میں نے ابھی ابھی ریڈیو پر خبریں بھی سُنی تھیں، حالات معمول پر تھے کسی قسم کا خطرہ نہ تھا۔

"او خدا!" میں نے سہم کر کمرے، دروازوں اور کھڑکیوں پر نظر ڈالی، وہ بند تھے۔ بلب بالکل خاموشی سے لٹکا ہوا روشنی دے گا۔

تھا۔ دیوار کے ساتھ والا بنچ خالی اور ساکت تھا۔ کھڑکی کے پاس چھوٹی میز میں بھی کوئی جان نہ تھی۔ میری پشت پر دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی پرانی رضائی بھی بے حس و حرکت پڑی تھی۔ یہ تھوڑی دیر پہلے مجھے ملی تھی ـــ کمرے کی سب چیزیں دم سادھے تھیں۔ میرے ذہن میں تشبیہ ابھری۔ جیسے قبرستان کی خاموشی ـــ اور قبرستان کا خیال آتے ہی ڈر کی ایک لہر دماغ میں گھوم گئی۔ میں نے یہ جھٹک کر خیالات ہٹانے کی کوشش کی اور دل کی تسلی کے لئے میز پر سے پیپر ویٹ اٹھا لیا۔

اتنے میں ۔ ۔ ۔ بڑی مدھم ۔ ۔ ۔ ۔ مگر بڑی واضح ـــ سسکی کی آواز کمرے کی خاموشی میں ابھری۔

میں اتنی سہم گئی کہ ہل بھی نہ سکی اور سردی کی ایک لہر سی ریڑھ کی ہڈی سے اوپر کی طرف چڑھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں دم بخود اسی سسکی سے تھی تاہم میرے وحشت زدہ حواس بے صبری سے دوسری سسکی سننے کے منتظر تھے اور چند لمحے بعد دوسری سسکی کی آواز ابھری۔

میں نے آہستہ آہستہ آنکھیں گھما کر سر ہلائے بغیر آنکھوں کے کونوں سے کمرے کا جائزہ لینے کی کوشش کی پھر ہمت کر کے ذرا گردن موڑ کر کمرے کا جائزہ لیا ۔ ہر چیز پہلے کی طرح ساکت و خاموش تھی۔ قطعی کوئی حرکت نہ تھی۔ پر اسرار سکوت میرے اعصاب ـــ مجھے بے چینی پیدا کرنے لگا۔ کمرے سے کچھ دور کاریڈور میں لوگ گزر رہے تھے۔ مگر مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میں کسی کو آواز دیتی۔

"تڑاخ" کمرے کی خاموشی کو اس آواز نے پاش پاش کر دیا۔

"اوئی!" میں نیم مردہ چیخ مارتے ہوئے کرسی سے اچھلی۔

میں نے بے یقینی سے فرش پر گرے ہوئے پیپر ویٹ کو دیکھا۔ شیشے کی کرچیاں دیکھیں۔ اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھا جن سے چھوٹ کر وہ گرا تھا اور اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو تسلی دیتے ہوئے شیشے کی کرچیاں چننے لگی۔

میرے ہلنے سے کمرے میں جو حرکت ہوئی اس سے تناؤ ہوا۔ لرزہ خیز سحر ٹوٹ کر بکھر گیا اور میرے اعصاب کچھ حد تک اس کے جادو سے آزاد ہو گئے۔ چنانچہ میں نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ کھڑکیوں کے پاس گئی وہ بالکل بند تھیں۔ دروازہ جانچا ـــ وہ کھلا تھا مگر اس کے عین سامنے بڑا بلب جل رہا تھا۔ بند الماری کھول کر دیکھی ـــ اس کے اندر کوئی نہ تھا۔ بنچ کو چھو کر دیکھا ـــ وہ بنچ ہی تھا کرسی پر بیٹھنے سے پہلے میں نے رضائی کو بھی دیکھا ـــ دونوں ہاتھوں میں اس کے دو کونے پکڑ کر اوپر اٹھائے اور اس کے پھیلاؤ پر نظریں دوڑانے لگی۔ اس وقت تک میری ہمت کافی مقدار میں واپس آ گئی تھی۔

وہ ایک پرانی رضائی تھی جس کے کنارے میلے ہو رہے تھے۔ خصوصاً ایک کنارہ تو کافی میلا تھا جس پر سر کی چکنائی لگتی رہتی تھی۔ ایک آدھ جگہ سے دھاگے نکلے ہوئے تھے اور ۔ ۔ ۔ ۔ اوخدا! اس کے درمیان بالشت بھر کا خون کا دھبہ تھا۔ رضائی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ خوف سے میرا جسم سن ہو گیا۔ حلق خشک ہو گیا۔ میں اپنا پرس اور بُنے جانے والا سویٹر اٹھا کر کمرے سے باہر بھاگی دروازے سے کافی دور جا کر کھڑی ہو گئی اور اپنے بھائی کا انتظار کرنے لگی

میں نے جب سے ریلیف کیمپ میں رضا کارانہ طور پر کام شروع کیا تھا، صبح سویرے یہاں آجاتی۔ رات کو ۹ بجے بھائی گھر سے لینے آجاتا تھا، سوائے ان دنوں کے جب میری رات کی بھی ڈیوٹی ہوتی تھی میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس روز رات کی ڈیوٹی نہ تھی شروع شروع میں تو مریضوں کی تیمارداری بھی کرنی پڑتی مگر بعد میں تربیت یافتہ نرسیں آنے کے بعد میں اسٹور میں آ گئی تھی کسی نرس وغیرہ کی غیر حاضری کی صورت میں اب بھی کبھی کبھی وارڈ میں ڈیوٹی لگ جاتی۔ آج میں نے کافی رضائیاں اور بستر جمع

کے تین دوست کیمپ میں دیئے جا چکے تھے صرف یہی رضائی بچ گئی تھی۔ بغیر کسی دلیل کے اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میرا خوف ساری کی وجہ تھی۔ میں کسی قیمت پر بھی اس کمرے میں جانے کو تیار نہ تھی۔ جہاں وہ پڑی تھی۔

چھٹی کا ہارن سنائی دیا تو میں بے اختیار بھاگی اور جلدی سے دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ اس نے پوچھا بھی کیا بات ہے۔ مگر میں گول کر گئی۔ گھر جا کر میں نے کھانا بھی واجبی سا کھایا اور جب رات بستر میں گھسی تو مجھے اپنی رضائی میں بڑا ہی سکون ملا۔

اگلے دن میں پھر ڈیوٹی پر پہنچی۔ ہم لوگ رضاکارانہ کام کر رہے تھے مگر وقت کی پابندی کافی تھی۔ آج آصفہ نے بھی وعدہ کیا تھا کہ پہلے وہ آ کر اپنا نام رضاکاروں میں لکھوائے گی۔ آصفہ بھی میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی مگر اس کے والدین بیمار تھے اور وہ پہلے یہ قومی خدمت نہ کر سکی تھی۔ اب انہیں افاقہ تھا اور اس نے آج آنے کا وعدہ کیا تھا۔

مگر کمرے میں جا کر جب میں نے دیکھا کہ آصفہ نہیں آئی اور رضائی وہیں پڑی ہے تو مجھے پھر خوف محسوس ہونے لگا۔ میں کسی نہ کسی بہانے کمرے سے باہر چلی جاتی اور پھر آ جاتی اس طرح مجھے کچھ تسلی محسوس ہوتی تھی۔

باہر جاتے ہوئے ایک بوڑھی عورت مجھے نظر آئی جو دروازے سے تھوڑی دور بیٹھی تھی۔

”مائی تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

”کچھ نہیں بی بی“

”تو پھر اندر کمرے میں کیوں نہیں جاتیں؟“

ہال کمرے میں سب پناہ گزیں رہتے تھے۔ یہ بہت بڑا کمرہ تھا جس کے ساتھ والے کمروں کے دروازے کھول کر وسعت اور بھی بڑھا لی گئی تھی۔ جب تک لوگوں کے لئے مکان وغیرہ کا بندوبست نہ ہو جاتا وہ وہیں ٹکے رہتے۔

”بی بی۔ وہاں ایک سے ایک دکھی پڑا ہے۔ انہیں دیکھ کر میری طبیعت خراب ہوتی ہے ـــــ میں ذرا اکیلا رہنا چاہتی ہوں۔“

”تو ادھر آ . . . . اندر بیٹھ جا۔“ میں اسے کمرے میں لے آئی۔ ظاہر ہے خود غرضی سے۔ وہ دعائیں دیتی ہوئی اندر آ گئی اور بینچ پر بیٹھ گئی۔ میں بھی کرسی پر اطمینان سے بیٹھ کر کام کرنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد میں نے سر اٹھایا تو بوڑھی کی عجیب حالت تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھیں پھاڑے رضائی کو تک رہی تھی۔ اس کے چہرے سے دہشت برس رہی تھی۔ جسم بالکل ساکت تھا۔ اکڑوں بیٹھ کر دونوں ہاتھ پاؤں سامنے بینچ کے سرے پر ٹکائے ہوئے تھے جیسے عین اٹھنے سے پہلے وہ کسی جادو کے اثر سے جم گئی ہو۔

مائی ... میں نے آواز دی مگر اس نے کوئی جنبش نہ کی اور وہ اسی طرح ٹکٹکی باندھے رضائی کو گھورتی رہی۔

میرے جسم میں پھر سے کپکپی جاگ اٹھی میں اپنے آپ کو ایسی بے حال اور بے بس محسوس کرنے لگی جیسے اسی کی طرح منجمد ہو رہی ہوں کمرے کی خاموش فضا کا سارا بوجھ اور تناؤ جیسے میرے کندھوں اور کمر پر پڑنے لگا۔ بوڑھی عورت نے ایک دم چیخ ماری۔ میں دہل گئی اور کرسی کے بازوؤں کو زور سے پکڑ لیا۔ وہ عورت جھپٹی اور بالکل مسحور انداز میں جا کر رضائی سے لپٹ گئی پھر اس میں اپنا چہرہ چھپا کر بے تحاشا رونے لگی۔

کمرے کی خاموش منجمد فضا۔ میرا خوف زدہ ذہن سسکیوں کی دردناک آواز ... میں تو جیسے نیم پاگل ہو گئی اور جا کر اس عورت کا

کندھا جھنجھوڑنے لگی۔ساتھ ہی چلائی:

"مائی۔ ۔ ۔ ۔ مائی۔ ۔ ۔ ۔ اومائی۔کیابات ہے؟"

مگر وہ روتی گئی۔ ۔ ۔ ۔ پھر اس نے رضائی کو اُلٹنا پلٹنا شروع کیا اور جب وہ خون کا دھبہ دیکھا تو اس میں اپنا چہرہ گاڑ دیا۔

۔ ۔ ۔ اب اس کی چیخیں نکلنے لگیں۔

میں خوف سے لرزتی ہوئی کمرے کے باہر دروازے کے پاس جاکر کھڑی ہوگئی۔کبھی کاریڈور کے سرے سے سرے پر رش کا ریلا کو گھومتے دیکھ کر تقویت حاصل کرتی اور کبھی گردن بڑھا کر اس بڑھیا کی طرف دیکھ لیتی۔تھوڑی دیر بعد اس کا رونا تھم گیا اور وہ رضائی کو گود میں لے کر زمین پر بیٹھ گئی۔اب وہ پھر پہلے کی طرح گم سم ہوگئی۔عین اس وقت آصفہ سامنے سے آتی دکھائی دی۔میں نے دوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا"تم کہاں تھیں صبح سے؟"

"میں تو سویرے ہی آگئی تھی۔انہوں نے میری ڈیوٹی عورتوں والے وارڈ میں لگا دی۔وہاں کل ہی کچھ نئے کیس آئے ہیں۔بعض کی بہت بُری حالت ہے۔"

"ہائے اللہ" میں نے بے اختیار سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

"تمہارے پاس کوئی رضائی ہے کیا؟"

"کیوں؟"

"وہاں ایک حاملہ عورت بڑی تکلیف میں ہے۔ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تمہارے پاس سے فوراً ایک رضائی لے آؤں۔"

"ہے تو۔ ۔ ۔ ۔ مگر وہ نہ ہی دو تو اچھا ہے۔"

"کیوں؟"

میں نے جھجکتے جھجکتے کہا"وہ تو۔ ۔ ۔ ۔ پتہ نہیں۔ ۔ ۔ ۔ کچھ منحوس سی ہے۔ ۔ ۔ ۔ یا کچھ سایہ ہے اس پر۔"

"چلو پاگل نہ بنو۔لاؤ دو مجھے۔"

تب میں نے آصفہ کو بتایا کہ اس پر خون کا دھبہ ہے اور کل رات سے مجھے اس سے خوف آرہا ہے اور اس میں سے سسکیوں کی آواز آتی ہے اور ابھی ایک بوڑھی عورت اس کو دیکھ کر مجنونانہ حرکتیں کر رہی تھی۔

"چھوڑو ان خرافات کو۔ہمیں اس وقت رضائی کی بڑی ضرورت ہے۔"وہ کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی اور اندر جا کر اس نے ایک ہی نظر میں صورت حال کو بھانپ لیا اور بڑھیا سے رضائی مانگی مگر وہ خاموش بیٹھی رہی۔آصفہ نے ایک دفعہ اور مانگنے کے بعد رضائی اس کی گود میں سے آہستہ سے کھینچی۔مگر اس نے کوئی حرکت نہ کی اور وہ رضائی لے کر چلی گئی۔

رضائی کے جانے سے مجھے جیسے کچھ سکون سا ہوگیا۔میری ہمت لوٹ کر آئی اور میں اس بڑھیا کی طرف متوجہ ہوئی۔تھوڑے سے پانی میں سپرٹ ملا کر اسے پلائی۔اٹھا کر بیچ پر لٹایا اور خود کمرے سے باہر نکل آئی اور کچھ دیر ادھر اُدھر گھوم کر وقت کاٹتی رہی۔واپس آئی تو عورت پہلے سے بہتر تھی۔وہ خاموش تھی مگر گیلی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ابھی ابھی رو چکی ہے۔باوجود کوشش کے، میری ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس سے کچھ پوچھ سکوں۔اس نے بھی بات کرنے کی کوئی کوشش نہ کی بلکہ اپنی سوچ میں گم سم بیٹھی رہی۔اس کی خاموشی سے فضا میں پھر سے تناؤ پیدا ہونے لگا جسے توڑنے کے لیے میں نے بالآخر پوچھا:

مائی تم کہاں سے آئی ہو؟

اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا . . . . اور دیکھتی رہی . . . . جب میں مایوس ہوگئی تو اس نے ہولے سے کسی گاؤں کا نام لیا

"یہ کدھر ہے؟"

"لاہور سے پرے ۔ بالکل سرحد کے پاس ہے بی بی ــــ میری تو زمینوں کے ساتھ ہی ہندوستان شروع ہو جاتا ہے۔"

"تم یہاں کب آئیں بی بی؟"

"جب پاکستان نے ہمارا گاؤں فتح کیا۔"

"تمہارا مطلب ہے ہندوستان نے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "اس وقت آ سکتی تو کیوں اتنی دکھی ہوتی۔"

میں کچھ نہ سمجھ سکی مگر خاموش رہی۔

لیکن بڑھیا کے دکھ کا دھارا باہر نکلا تھا اس لئے وہ خود ہی بولنے لگی: بی بی! ہندوستانیوں نے تو مہلت ہی نہ دی نکلنے کی ــــ میرا لڑکا صبح صبح کھیتوں کو پانی دینے گیا تھا میں نے اسے دروازے کے طاق سے اپنی چادر اور پگڑی اتارتے دیکھا تھا اور وہ جیسے پاؤں باہر نکلا تھا کہ میں جاگ پڑی تھی مگر میں تو دودھ بلونے کے لئے اٹھنے ہی والی تھی۔ بس اٹھ کر اندھیرے میں ٹٹول کر مٹکے میں مدھانی ڈال رہی تھی کہ اتنے میں ایک دم گولیاں چلنے کی آواز آئی جیسے بھاڑ بھن رہا ہو۔ میرا تو سارا پنڈا جیسے سو گیا۔ تب گولیوں کی آواز بڑھنے لگیں۔ میں اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگی ــــ سر نکال کر دیکھا تو کچھ نظر نہ پڑا۔ صرف لوگوں کا شور اور اندھیرے میں بھاگنے والے سائے تھے ــــ میں نے خوفزدہ ہو کر اپنے لڑکے کو پکارا، کئی آوازیں دیں۔ اسمٰعیل ــــ وے اسمٰعیل مگر جواب کون دیتا۔ وہاں تو قیامت آ گئی تھی۔ میں کنڈی بند کر کے اندر آئی تو نازو سہم کر بستر میں بیٹھی تھی اور کانوں پر ہاتھ رکھے مجھے آوازیں دے رہی تھی۔ میں نے لپک کر اسے سینے سے لگا لیا۔"

"کیا عمر تھی نازو کی؟"

"دس سال بی بی۔ اگلے کاتک میں گیارہ پورے ہونے تھے۔"

پھر؟

"پھر کیا بی بی ــــ ہمیں تو پتہ ہی نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے سمجھا کوئی ڈاکہ پڑا ہے۔ نازو کو بٹھا کر پھر باہر آئی اور ساتھ والے ہمسائیوں کے گھر میں آوازیں دیں۔ بدرو ــــ وے بدرو!!! مگر کون بولتا۔ ساری عورتیں اپنے دروازوں میں سے جھانک ایک دوسری سے باتیں کر رہی تھیں۔ کئی مرد بھی باہر نکل آئے تھے۔ اتنے میں صبح کا اجالا بھی پھیلنے لگا تھا۔ شور بڑھ رہا تھا۔ میں نہ آتا تھا کیا کروں۔ میں نے تو جتنے کلمے یاد تھے، پڑھ ڈالے۔

اتنے میں گلی کے کونے سے چند فوجی بھاگتے ہوئے مڑے اور اندھا دھند گولیاں برسانے لگے۔ گلی میں جتنے لوگ اپنے دروازوں میں کھڑے تھے ان میں سے اکثر تڑپ کر مر گئے اور ساری گلی شور اور چیخوں سے بھر گئی۔

میں تو ایسی سہم کر بھاگی کہ دروازے کو کنڈی لگانا بھی بھول گئی، جا کر نازو کو گود میں چھپا لیا اور اوپر رضائی ڈال کر زور

زور سے کلمہ پڑھنے لگی۔ ساتھ ہی دل میں دعا کرتی جاتی تھی کہ یا اللہ! اسمٰعیل کو خیر سے جلدی واپس لا۔

تھوڑی تھوڑی دیر بعد گولیوں کی آواز آجاتی یا کوئی موت کے کرب میں بے اختیار چیخ اٹھتا۔ اتنے میں ہمسایوں کے گھر سے بدرو کی بڑی بہن کے چیخنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی چند مردوں کی بھی۔ وہ چیخ رہی تھی کہ خدا کے لئے مجھے نہ گھسیٹیں۔ . . . پھر آہستہ آہستہ یہ آواز دور چلی گئی . . . . میں نے نازو کو زور سے بھینچ لیا۔

تھوڑی دیر بعد گولیوں کی آواز بھی تھم گئی۔ کبھی کبھار کوئی دھماکہ یا چیخ سنائی دیتی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اسمٰعیل آجائے تو ہم کہیں چھپنے کا بندوبست کریں۔ ایسا نہ ہو میں چھپ جاؤں اور وہ آکر مجھے ڈھونڈتا پھرے۔ اتنے میں چار فوجی اندر داخل ہوئے۔ اس وقت صبح بہت روشن ہو چکی تھی۔ مجھے ان کی خشمگیں نظروں سے خوف آنے لگا۔ ان میں سے ایک نے بڑھ کر مجھے زور سے کہا: "اے بڑھیا! کدھر ہیں تمہارے پیسے اور زیور؟"

میں نے سہم کر بھوسے والی کوٹھڑی کی طرف اشارہ کیا اور وہ ادھر لپکا۔ اتنے میں رضائی کے نیچے سے کسی کو نازو کا سفید پاؤں نظر آیا تو دوسرے نے رضائی اُٹھا کر دور پھینک دی اور چیخ کر بولا: "اصل مال تو ادھر ہے تم کہاں بھاگے جاتے ہو؟"

"انہوں نے نازو کو پکڑ لیا، کسی نے ٹانگ پر ہاتھ ڈالا، کسی نے بازو پر اور اُٹھا کر بھوسے کی کوٹھڑی میں لے گئے۔" میں دیکھتی رہی مگر ایک نے رائفل کا سرا مار کر مجھے گرا دیا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ . . . میں نے دروازے سے لپٹ کر ان کی بے شمار منتیں کیں۔ نازو کی عمر بتائی مگر اندر سے ان کی ہنسی، شور اور نازو کی چیخوں کے سوا کوئی جواب نہ آیا۔ میں نڈھال ہو کر دہلیز پر گر گئی۔ کافی دیر بعد وہ ہنستے ہوئے باہر نکلے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں میرے زیور تھے، دوسرے نے ہنس کر مجھے دھپ جماتے ہوئے کہا: "جا بڑھی۔ مل لے اپنی لڑکی سے۔"

ایک اور نے مونچھوں میں بل دیتے "پاکستان کا پہلا مزہ تو اچھا تھا۔ اب دیکھیں لاہور کا مزہ کیسا ہے؟"

"اچھا ہی ہوگا جی" ایک اور نے کہا اور سب ہنستے ہوئے باہر چلے گئے۔

میں اندر لپکی۔ بھوسے کے ڈھیر پر نازو بالکل برہنہ پڑی تھی۔ اس کی ٹانگیں خون میں لت پت تھیں۔ میں نے جھٹ سے یہ رضائی اس پر ڈال دی . . . . یہ خون کا دھبہ جو تم نے رضائی میں دیکھا ہے، وہیں سے لگا تھا . . . . اس کی نبض دیکھی تو غائب تھی۔

"نازو . . . . نازو" میں نے آواز دی، مگر اس کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی۔ بڑی مشکل سے ذرا آنکھیں کھول کر اس نے مجھے دیکھا۔ پھر اس کی کھلی آنکھوں میں کالے دائرے آہستہ آہستہ ماتھے پر چڑھنے لگے اور ساتھ ساتھ کانوں کی طرف تیرتے گئے۔ میں نازو کو بلاتی رہی۔ مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف دو چار دفعہ ہلکی ہلکی سسکیاں لیں۔

میں ہی باہر کو بھاگی کہ ہمسایوں کو خبر کروں مگر گلی میں تو ہر طرف لاشیں پڑی تھیں۔ کسی جگہ بارود سے جلا ہوا ہاتھ یا پاؤں، کہیں دھماکے سے اُڑ کر آنے والی انگلیاں۔ ہر طرف خون تھا اور زخمی کراہ رہے تھے۔ دو ایک جگہ مکانوں کو آگ لگی تھی۔ میں کس کو مدد کے لئے کہتی، سبھی میرے جیسے تھے۔ تب میں اسمٰعیل کو ڈھونڈنے کھیتوں کی طرف گئی۔ لاشوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا مگر اس کا کوئی نشان نہ تھا۔ کئی انسانوں کے ٹکڑے ادھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ کیا پتہ میرا لال بھی اسی طرح قیمہ ہو گیا ہوگا۔ اس دن کے بعد میں نے اُسے آج تک نہیں دیکھا۔ واپس آکر میں نے اپنے صحن ہی میں کھرپے سے گڑھا کھودا اور نازو کو اس میں دبا کر پاس ہی قرآن پڑھنے بیٹھ گئی۔

بڑھیا سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ میں نے اسے پانی پینے کو دیا تو وہ ذرا سنبھلی مگر گم سم بیٹھ گئی۔

"پھر مائی تم یہاں کیسے پہنچ گیئں؟"

"دو دن بعد پاکستان نے گاڑی واپس لے لی اور ہمیں ٹرکوں میں ڈال کر یہاں لے آئے۔ دور سے میں نے دیکھا تھا کہ وہ ایک ٹرک میں یہ رضائی بھی ڈال رہے تھے"

"یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے تمہیں؟" میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیسے اس کی دلداری کروں۔

وہ ہنسی، بڑی زہریلی ہنسی "تکلیف کاہے کی بی بی۔ ۔ ۔ ۔ یہاں آکر دیکھتی ہوں تو ایک سے ایک دکھیا ہے۔ میرے ہی جیسی عورتوں نے اپنے چار چار گھبرو جوان پاکستان پر قربان کئے ہیں۔ میرے پاس تو اسمٰعیل اور تازو تھے۔ پر ایک بات مانو بی بی وہ رضائی مجھے دلوا دو تو میں بڑی دُعا دوں گی تمہیں"

میں بھاگ بھاگ وارڈ کی طرف گئی۔ آمنہ سے رضائی مانگی مگر اس نے انکار کر دیا۔ حاملہ عورت کو تکلیف تھی اور رضائی کی اشد ضرورت تھی۔ اس کا کہنا بھی ٹھیک تھا۔ مجبوراً واپس آکر بڑھیا سے کہا کہ تھوڑی دیر میں اور رضائیاں آجائیں گی تو میں وہ رضائی واپس دلوا دوں گی۔ وہ مجھے دعائیں دیتی چلی گئی۔ مگر اگلے دن صبح ایک رضاکار لڑکی میرے رجسٹر سے اس کا نام کٹوانے آئی۔

"کیوں مکان مل گیا اسے؟"

"وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے مرگئی ہے"

آمنہ نے بتایا کہ اس حاملہ عورت کو اب کافی سکون ہے۔

اس دن سے میری ڈیوٹی مستورات وارڈ میں لگ گئی۔ ڈاکٹر خوش ہے کہ میں مریضوں کا خیال رکھتی ہوں۔ مگر اسے کیا پتہ کہ جس عورت کو بھی تکلیف ہوتی ہے میں اس پر وہی رضائی ڈال دیتی ہوں اور اسے فوراً سکون آجاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ عجیب حکایت ہے۔

(اگست ۱۹۶۸)

چلے اک بار بچوں یا پرندوں کی حکومت
کوئی ایسا طریقہ شہر ہوں خوشحال سارے
بچا کر بھی کہاں لے جا سکیں گے وقت کو ہم
یہیں رہ جائیں گے ہفتے مہینے سال سارے

محمد ستار الحق

# دوزخ

غلام الثقلین نقوی

گفتگو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی ہے!

سانپوں کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ننھے سے سنپولئے سے بات شروع ہوئی جو اتفاقاً ایک دن اشرف کے پاؤں تلے کچلا گیا تھا اور ایک اژدہے پر ختم ہوئی جسے برما کی جنگ میں اشرف اور اس کے ساتھی سپاہیوں نے برین گن کی گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔ پھر نہ جانے کیسے موضوع یکدم بدلا اور ٹھگوں اور گرہ کٹوں کی لذیذ حکایات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

نذر نے کہا: "مجھے دو بار ٹھگوں سے پالا پڑا ہے۔ ایک بار مجھے میری دیانت اور فطرتی شرافت نے بچا لیا اور کافی دنوں کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میں ٹھگوں کے پلے پڑ گیا تھا۔ دوسری بار مجھے پورا پورا احساس تھا کہ میں ٹھگا جا رہا ہوں لیکن میں اُس پرندے کی طرح جسے سانپ کی آنکھ نے مسحور کر لیا ہو اور وہ چیختا چلاتا اور پھڑپھڑاتا ہوا آخر بے بس ہو کر سانپ کے منہ میں چلا جاتا ہے، دامِ فریب میں پھنس کر رہ گیا اور ستم ظریفی تو یہ ہے کہ بعد میں اپنے کیے پر پچھتا بھی نہ سکا۔"

سب نذر کی طرف متوجہ ہو گئے۔ نذر سب کی توجہ ایک مرکز پر مرکوز دیکھ کر کھنکھارا اور کہنے لگا:۔

"یہ آج سے تین سال پہلے کا واقعہ ہے۔ مجھے ایک کام سے ملتان جانا پڑا۔ ملتان چھاؤنی کے اسٹیشن پر گاڑی سے اترا۔ ابھی پوری پوری روشنی نہ ہوئی تھی۔ میں نے باہر نکل کر ہاتھ منہ دھوئے اور پھر اٹیچی کیس اٹھا کر اس سڑک پر ہو لیا جو چھاؤنی میں سے گزرتی ہوئی شہر کی طرف جاتی ہے۔ سڑک کے دو رویہ سایہ دار درخت تھے اور صبح کی ہوا خنک تھی۔ میں نے تانگہ لینے سے پیدل چلنا بہتر سمجھا۔ رات جاگتے گزری تھی۔ رات بھر گاڑی کے ڈبے میں اُمس اور گرمی تھی۔ پسینے پر پسینے آتے رہے تھے لیکن یہ صبح کی لطیف ہوا کا معجزہ تھا کہ چند قدم چلنے کے بعد طبیعت ہشاش بشاش ہو گئی۔ وہ بند بند سے تھکن شبنم کے قطروں کی مانند اُڑ گئی۔

میں نے اٹیچی کیس زمین پر رکھ، ایک سگریٹ ہونٹوں میں دابا، دیا سلائی رگڑی لیکن وہ آگ نہ پکڑ سکی۔ رات بھر پتلون کی جیب میں رہ کر دیا سلائی پسینے میں بھیگ چکی تھی۔ میں مایوس ہو کر سگریٹ ہونٹوں سے نکالنے والا ہی تھا کہ شرر کی آواز آئی اور پیالی کی صورت میں بند دو ہاتھ میرے ہونٹوں تک آ پہنچے جن کے اندر ننھا سا شعلہ روشن تھا۔ میں چونک گیا، لیکن سگریٹ کو آگ لگ چکی تھی اور پہلا کش فضا میں نیلا دھواں بن کر منتشر ہو چکا تھا۔ میں نے شکریے کے الفاظ کہے۔ نووارد نے مسکرا کر کہا: "کوئی بات نہیں صاحب!" میں نے نووارد کو بڑے غور سے دیکھا۔ شلوار، قمیص اور اس کے اوپر خاکی کوٹ۔ آنکھوں پر رنگین چشمہ، نفیس ترشی ہوئی مونچھیں، بڑی صفائی سے مونڈی ہوئی ڈاڑھی۔ میں اٹیچی کیس اٹھانے کے لئے جھکا۔ معاً وہ ہاتھ اٹیچی کیس کی طرف لپکا۔ میں نے کہا: "صاحب آپ تکلیف نہ کیجئے۔" نووارد جواب میں محض مسکرا دیا۔ بڑی دلکش، میٹھی مسکراہٹ جیسے کہہ رہی ہو: اس میں تکلف کی کونسی بات ہے دوستوں کے لئے یہ تکلیف عین راحت ہے۔

پھر ہم دونوں روانہ ہو پڑے۔ راستے میں اُس نے بڑے میٹھے انداز میں باتیں کیں۔ لاہور کی باتیں، پشاور کی باتیں، لندن اور نیویارک کی باتیں۔ اخبار کی باتیں۔ لیڈروں کی باتیں۔ جناح اور لیاقت کی باتیں۔ وہ باتیں جو بڑی معمولی معمولی تھیں لیکن کہنے والے کا انداز بہت نرالا تھا۔ اس نے پاکستان کا کونہ کونہ کھنگال ڈالا تھا۔ سیر و سیاحت اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ میں نے یہی سمجھا کہ وہ صبح کا ناشتہ لاہور میں کرتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا ملتان میں کھاتے ہیں سہ پہر کی چائے کراچی میں پیتے ہیں اور رات بلوچستان کے کسی صحرائی ٹیلے پر بسر ہوتی ہے جہاں رات رات بھر پریاں ناچتی گاتی اور ہوا ٹھنڈے سانس بھر کر

...دیتی رہتی ہے اور سمندر کی لہریں نغموں کی بارش کرتی ہیں۔ آبشار گنگناتے ہیں۔ ندیاں مستی کے عالم میں پتھروں پر سے رقص کرتی پھسلتی چلی جاتی ہیں۔

میں نے گھبرا کر کہا "بلوچستان کے صحرا میں لہروں کے نغمے۔ آبشاروں کی گنگناہٹ ندیوں کا رقص!"

"وہ صاحب!" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: "سمندر تو کراچی کے پاس ہے اور آبشار اور ندیاں مری اور ایبٹ آباد کے پہاڑوں پر لیکن ان کا صحیح لطف ریت کے ٹیلوں پر ہی آتا ہے۔ یہ اس کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے۔ ہاں صاحب! سبحان اللہ۔۔۔۔ آپ نے کبھی ریڈیو سنا ہے؟"

"آپ کا مطلب؟" میں نے بوکھلا کر کہا۔

"ایریل جو لہروں کی آواز کو پکڑتا ہے اور ارتھ زمین سے۔"

"لیکن بلوچستان کے ریت کے ٹیلوں سے اس کا تعلق؟" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

اور معاً فضاؤں میں ایک قہقہہ گونج گیا۔ گونجیلا۔ چکیلا۔ لرزتا کانپتا قہقہہ۔ وہ قہقہہ جس میں چھوت کے جراثیم ہوتے ہیں۔ میرا دل چاہا کہ میں بھی اتنا زور سے قہقہہ لگاؤں کہ پھیپھڑے پھٹ جائیں۔ میں نے اس خواہش کو بڑی مشکل سے روک کر کہا۔

"آپ قہقہے پر قہقہہ لگا رہے ہیں؟"

"معاف کیجئے! میں قہقہہ لگانے کو صحت کے لئے نہایت ضروری سمجھتا ہوں پھیپھڑے کھل جاتے ہیں۔ دق اور سل سے انسان محفوظ رہتا ہے۔۔۔ اور ۔۔۔۔۔ آپ کو معلوم ہے کیا؟"

"کیا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"فرنگی ہندوستان چھوڑنے سے پہلے یہاں دق کے جراثیم پھیلا گئے تھے۔" اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

"دق کے جراثیم!" میں نے خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔

"فرنگی سونے کی چڑیا کو بھلا کیسے چھوڑ سکتا تھا صاحب!" اس نے کبوتر کی طرح چہرے کو معصوم بناتے ہوئے کہا: "فرنگیوں نے جانے سے پہلے بوتلوں کے منہ کھول دیئے۔ آپ یقین جانیں۔ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ ایک دن شہروں کی سڑکوں اور دیہاتوں کی گلیوں میں لاشوں کے انبار ہوں گے۔ ہاں گھر گھری لاشوں کے انبار۔ ہڈیوں کے ڈھیر۔ کھوپڑیوں کے ہار۔"

"کھوپڑیوں کے ہار!" میں نے ڈری ہوئی آواز میں کہا۔

"لوگ کھوپڑیوں کے ہار پہنیں گے۔"

"کون لوگ؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"وہی لوگ جو قہقہہ لگا کر ہنسیں گے۔ جن کے سینوں کے اندر تازہ ہوا آتی جاتی رہے گی یعنی میرا مطلب یہ ہے جو زندہ رہیں گے۔ میں اسی لئے تو قہقہے لگا کر ہنستا ہوں اور خوراک بھی تو اچھی کھاتا ہوں یعنی میرا مطلب ہے انڈا، گوشت، مرغی، مکھن اور دودھ۔ لکھنؤ کے باورچی بھی تو کمال کے کاریگر تھے۔"

"یعنی؟"

"ہمارے گاؤں کے ذیلدار نے لکھنؤ کے ایک باورچی کو ملازم رکھ لیا تھا۔ اس نے ایک پاؤ مونگ کی دال پکائی اور تیس روپے خرچ مانگا۔ 'تیس روپے' ذیلدار نے حیران ہو کر پوچھا۔ باورچی کو غصہ آیا۔ اس نے دال ایک سوکھے درخت کی جڑ میں انڈیل دی اور خود چلا گیا۔ دوسری صبح اس ٹنڈ منڈ درخت پر سبز کونپلیں اور ہرے بھرے پتے تھے۔ میں نے اس باورچی کو دیکھا ہے"

"آپ نے؟"

"جی ہاں! میں نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ باورچی لکھنؤ کے آخری نواب کے پاس تھا۔ اور پھر جب نواب غریب ہو گیا تو وہ روزگار کی تلاش میں پنجاب آ گیا۔ بہت بڈھا تھا۔ محض ہڈیوں کا ڈھانچہ۔"

"لکھنؤ کو انقلاب ہوئے سو سال گذر چکے ہیں۔"

"سو سال ۔۔۔" اس نے کچھ دیر سوچ کر کہا: "اس کی عمر کوئی ایک سو تیس سال ہوگی جس دال سے سوکھے درخت ہرے ہو سکتے ہیں۔ اس سے عمر کے چند سال نہیں بڑھ سکتے۔ آپ بھی تو کمال کرتے ہیں بابو جی!"

اور مجھے اپنے کمال پر کمال ندامت ہوئی۔

"کیا وہ اب بھی زندہ ہے؟"

"مر گیا ہے بیچارا!" اُس نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "موت سے کس کو مفر ہے!"
اور مجھے حیرت ہوئی جس شخص کے پاس ٹنڈ منڈ درخت کو ہرا بھرا کرنے کا معجزہ ہے۔ وہ بھلا مر کیسے سکتا ہے؟
"کیسے شکر ادا کروں تیرا نیلی چھتری والے!" اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "سچ جانیں باؤ جی میرا کوئی دھندا نہیں۔ پھر بھی دو وقت کی
روٹی مل ہی جاتی ہے۔"
"گزارے کی کوئی سبیل نہیں! پھر بھی ......" اس نے میری بات کاٹ لی۔
"بہت دیتا ہے۔ پیٹ بھر کے دیتا ہے۔"
"بغیر کسی کام کے"
"ہاں صاحب! بغیر کام کے چھپر پھاڑ کر ..... ایک سگریٹ۔"
میں نے جلدی جلدی سگریٹ اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اس نے ایچی کیس نیچے رکھا اور سگریٹ سلگایا۔ پہلا کش لیکر کہا۔ "اُس کے دینے
کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ میں جب اسٹیشن پر اترا تو میرے پاس صرف ایک آنہ تھا۔ وہ میں نے ایک فقیر کو دے دیا۔ سگریٹ کی سخت طلب تھی۔ ہاں! واقعی
اس کے دینے کے ڈھنگ نرالے ہیں۔"
مجھے دوسری بار ندامت ہوئی۔ کم بخت نے اپنی بات کا عملی ثبوت دے دیا تھا۔ اُس نے منہ کو غنچے کی مانند سکیڑا۔ لمبا سا کش لیا۔ دھوئیں کے حلقے
بنتے اور فضا میں تحلیل ہوتے گئے۔ اس کے سگریٹ پینے کا انداز بھی بڑا فنکارانہ تھا۔ ایک عرصے تک ہم دونوں خاموش رہے۔ پھر اس نے کہا۔
"آپ بہت کم باتیں کرتے ہیں۔" میں احتجاج کرنے کے لئے منہ کھولنے ہی والا تھا کہ اس نے کہا۔
"کچھ لوگ فطرتاً بہت خاموش ہوتے ہیں صاحب۔ میں بھی بعض اوقات اتنا کم گو بن جاتا ہوں کہ میرے دوست شکایت کرتے ہیں۔"
"لیکن آج تو آپ کی روانی پر مجھے رشک آ رہا ہے۔" میں نے بڑی جرأت سے کہا۔
"رشک!" اور وہی گونجیلے، لچکیلے قہقہے پھر ساکن فضاؤں میں گونجے۔ "آپ سے مل کر نجانے کیوں خواہ مخواہ بے تکلف ہونے کو جی چاہتا
ہے۔ بالکل آپ ہی کی شکل و صورت کا میرا ایک دوست تھا۔"
"تھا" میں نے کہا۔
"ہاں صاحب کبھی تھا، اب نہیں۔"
"الجھ پڑے تھے آپ۔"
"نہیں صاحب میری دوستی کا محل ریت کی بنیادوں پر نہیں بنا کرتا۔ یہی مولا کی مرضی تھی۔ موت نے اُسے چھین لیا۔"
اُس کی آواز میں غم کی کپکپاہٹیں تھیں۔ "وہ گھر سے امیر تھا لیکن جب مرا تو اُس کے پاس کفن کے لئے پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔"
"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ کہہ رہے تھے کہ وہ امیر تھا۔"
"دولت خواہ جوئے میں لٹائی جائے یا عیاشی کی نذر کر دی جائے یا حاتم طائی کی طرح فقیروں میں بانٹ دی جائے۔ آخر ختم ہو ہی جاتی ہے۔"
"وہ شرابی تھے یا ......؟"
"نہیں صاحب! وہ سخی تھا۔ دولت اس کے ہاتھوں کی میل تھی۔" میں نہ جانے کیوں مسکرا دیا۔ اس نے جواب میں پوری بتیسی کی نمائش کی۔
ہولا ایسی جس کے سامنے کے دو دانت سنہری تھے۔ سونے کے پتروں میں مڑھے ہوئے دانت۔ یہ سنہری مسکراہٹ بہت دلآویز تھی۔ بڑی معصوم۔ بڑی بے تکلف۔
"آپ کا اسم شریف؟" میں نے سیدھے سادھے خالص الیشیائی انداز میں پوچھا۔ "میرا نام جان کر کیا ملے گا آپ کو؟ یہی سمجھ لیں کہ ایک مسافر ساتھی
کے ساتھ چند لمحے گزرے تھے۔ مجھے آپ پردیسی کہہ لیا کریں۔" اور بات کرتے کرتے وہ یکدم چونک پڑا۔
"اُس عورت کو دیکھا آپ نے؟"
"کس عورت کو؟"
"وہ سامنے دیکھئے نا! اس کے متعلق کیا خیال ہے آپ کا؟"
"میرا خیال! میں اسے نہیں جانتا۔"

"جانتا میں بھی نہیں لیکن تجربہ بھی تو کچھ چیز ہے۔"

"مجھے عورتوں کے متعلق بہت کم تجربہ ہوا۔"

"واہ صاحب! تو سنیئے! اس عورت کی کوئی چیز گم ہو گئی ہے۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کیا؟"

"نہیں!" میں نے چڑ کر کہا۔

اس نے مسکرا کر کہا: "شرط لگاتے ہیں آپ! میرا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوا۔"

اس اثنا میں وہ عورت نزدیک آ چکی تھی۔ دھیڑ عمر کی عورت جس نے حد سے زیادہ شوخ اور رنگین کپڑے پہن رکھے تھے۔ ہونٹوں پر سرخی! آنکھوں میں کاجل۔ پاؤں میں سفید لفٹی۔ اس کی نگاہوں سے پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔

میرے پردیسی دوست نے آگے بڑھ کر کہا: "بی بی!"

عورت نے چونک کر دیکھا اور اس کی نگاہیں اور زیادہ پریشان ہو گئیں۔

"بی بی! تیری کوئی چیز گم ہو گئی ہے کیا؟"

"ہاں! بھائی!"

پردیسی نے مجھے گھور کر دیکھا۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ ان نگاہوں کی اس چمک کو بیان کر سکوں جس میں ہٹلر، مسولینی، چنگیز اور دنیا کے تمام فاتحوں کی فتحمندی میں چور روحیں ہجوم کر آئی تھیں۔ میں نے ہارے ہوئے دشمن کی مانند شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

"کیا چیز تھی بی بی؟ اور کہاں گم ہوئی؟" اس نے اپنے لہجے میں دنیا بھر کی ہمدردی سمیٹتے ہوئے کہا۔

"یہیں اس سڑک پر...... میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تھک چکی ہوں۔"

"کیا چیز تھی بی بی؟" بی بی خاموش رہیں۔

"ڈرنے کی کونسی بات ہے؟ ایک ہی ہاتھ کی پانچ انگلیاں بھی تو برابر نہیں ہوتیں"

"نیکلس تھا۔ ایک سہیلی سے مانگ کر لائی تھی۔ ایک شادی میں شریک ہونا تھا۔ رومال میں لپیٹ کر جیب میں ڈال لیا تھا۔ نہ جانے کیسے گر گیا؟"

اس عورت کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

ہم دونوں آگے چل پڑے۔ کوئی دو فرلانگ چلنے کے بعد اس نے سرخ رومال میں لپٹی ہوئی ایک پڑیا کو ٹھوکر لگا کر دور پھینک دیا اور پھر آگے بڑھ کر اٹھا لیا۔ اس نے پڑیا کھولی۔ اس کے اندر سنہری چمکتا ہوا ہار تھا۔ اس کا ہاتھ کانپا اور پھر اس نے میری کلائی پکڑ لی اور کشاں کشاں مجھے سڑک سے ایک طرف لے گیا۔ ایک پرانے قبرستان میں ٹوٹی پھوٹی قبروں کے درمیان، اس نے ایک بوڑھے اوکان کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا لی۔

"خدا جب دینے پہ آتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔"

"یہ ہار تو اس عورت کا ہے"

"ہوگا مجھے کیا معلوم۔ میں نے رستے میں پڑا ہوا پایا۔" اس نے بڑی خشونت سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں دنیا بھر کی ہوس جھانک رہی تھی۔ ایک قاتل کی آنکھوں کی خونی چمک جیسے اس کے ہاتھ ابھی بڑھیں گے اور میرا گلا دبا ڈالیں گے۔

"تو پھر مجھے جانے دو۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"مجھے پولیس کے سپرد کرنا چاہتے ہو دوست۔ میں ایسی چالاکیوں کو خوب سمجھتا ہوں۔" اس نے دانت کٹکٹا کر کہا اور میری کلائی پر گرفت اور بھی سخت کر دی۔

"یہ ہار اس عورت کا ہے۔ تم نے کہا تھا ایک ہی ہاتھ کی پانچ انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔" میں نے بڑی جرأت سے کہا۔

"میں اب بھی یہی کہتا ہوں۔"

"پھر بہتر یہی ہے کہ......" اس نے مجھے بات پوری نہ کرنے دی۔

"بہتر یہی ہے کہ میں اسے لوٹا دوں۔ یہی کہنا چاہتے تھے نا آپ! میں آخری بار کہتا ہوں کہ یہ ہار مجھے سڑک پر گرا ہوا ملا۔ میں نے ڈاکہ نہیں ڈالا۔ چوری نہیں کی۔ میں ہار واپس نہیں کروں گا۔ تین ساڑھے تین سو پر لات کیسے ماروں؟ لیکن آپ میرے شریک ہیں۔"

"میں حصہ نہیں لوں گا۔" میں نے بڑی شدت سے انکار کیا۔ اس کے دو سنہری دانت ننگے ہو گئے لیکن اب اس پر سونے کی بنی ہوئی مسکراہٹ نہیں تھی۔ ایک جھلائے ہوئے کتے کی غراہٹ تھی۔

"آپ کو حصہ لینا پڑے گا۔ میں پولیس کے سپرد نہیں ہونا چاہتا۔" اس نے ہار کو بڑے غور سے دیکھا "بڑی خوبصورت چیز ہے۔ اس کے دو ٹکڑے نہیں ہو سکتے۔ آپ نصف ہار کی قیمت ..... " چھٹکارے کی اور کوئی سبیل نہ تھی۔ میں نے سر ہلا کر رضامندی کا اظہار کیا۔

"تو لائیے ڈیڑھ سو روپے" اس نے چہک کر کہا۔

میں نے چیخ کر کہا "تم نے نصف قیمت دینے کی پیشکش کی تھی"

"میں نے کہہ تھا؟ میں نے کب کہا تھا؟ میں نے ابھی ابھی بھکاریوں کی طرح ہاتھ پھیلا کر آپ سے ایک سگریٹ کی بھیک مانگی تھی۔ گاڑی سے اترتے وقت میری جیب میں محض ایک آنہ تھا جو میں نے اپنے جیسے بھکاری کو خیرات کر دیا کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ ضرورت مند تھا" پھر اس کے چہرے کی کیفیات ہارے ہوئے مایوس جواری کی مانند اداسی، بے کسی، بے بسی اور شکست میں بدل گئیں۔ سچ جانئے! میں پھر شرمندہ ہو گیا۔ میرے لاشعور نے اس کی سیدھی سادی بات کو غلط معنی دے تھے۔

اُس نے امید بھری آنکھوں کے ساتھ ہار کو لہرا کر کہا "آپ کے پاس ڈیڑھ سو روپے ہیں؟"

"نہیں"

"ایک سو"

"نہیں"

"پچاس"

"نہیں"

"آپ بہت ضدی ہیں۔ میں پچاس میں ساڑھے تین سو کا ہار پیش کر رہا تھا۔ آپ نے سنہری موقع کھو دیا"

"میرے پاس کچھ بھی نہیں"

"کچھ بھی نہیں، آپ بہت بڑا جھوٹ بول رہے ہیں"

"جھوٹ!" میں نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔

"معاف کیجئے! میں پاگل ہو گیا تھا" اس نے آنکھیں بھینچ لیں اور خیالات کی دنیا میں کھو گیا۔ اس کے مایوس چہرے کی شکنیں ایک ایک کے ہموار ہونے لگیں جیسے کوئی اَن دیکھا ہاتھ حرص و ہوس کے نقوش کو آہستہ آہستہ مٹاتا چلا جا رہا ہے۔ پھر آنکھوں میں مسکراہٹ جھلکی اور ہونٹوں پر اتر آئی۔ بھینچے ہوئے ہونٹوں کے تالے کھلے اور اُن سنہری دانتوں پر شفق کے لالہ زار کھلنے لگے۔

"یہ ہار اس عورت کو دے دیجئے" میں نے زندگی میں پہلی بار ایسی مسرت کا لطف اٹھایا جو غرض کے ہر جذبے سے پاک ہوتی ہے۔ میں نے ایک انسان کے ابلیس کو زیر کر لیا تھا۔ ہم چپ چاپ سڑک پر آ گئے۔ وہ عورت ابھی تک ہار تلاش کر رہی تھی۔ میں نے اسے اشارے سے بلایا۔ قریب آنے پر

میں نے ہار اس کے ہاتھ میں تھما دیا لیکن میں حیران رہ گیا کیونکہ اس کے چہرے پر خوشی کی ایک رمق بھی پیدا نہ ہوئی۔ میرا پردیسی ساتھی ہاتھ ملا کر اپنا پتہ میرے ہاتھ میں تھما کر رخصت ہو گیا۔ میں سارے راستہ یہی سوچتا چلا آیا کہ وہ عورت ہار کو دوبارہ پا لینے پر خوشی سے پاگل کیوں نہ ہو گئی۔

اور یہ عقدہ جلد وا ہو گیا۔ چند دنوں کے بعد میں نے اخبار میں ایک خبر پڑھی۔ پولیس نے ٹھگوں کے ایک گروہ کو گرفتار کر لیا تھا جن میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ وہ ہار پیتل کا تھا جس پر سنہری پانی پھرا ہوا تھا۔ پھر مجھے اپنی شرافت پر غصہ آیا۔ اپنی دیانتداری پر ڈوب مرنے کو جی چاہا۔

"کیوں؟" اشرف نے پوچھا

"اسلئے کہ جس شرافت، جس دیانتداری میں عقل کا فقدان ہو، وہ شرمناک طور پر قابل نفرت ہے"

"اور دوسرا واقعہ؟" اشرف نے بے قرار ہو کر کہا

یہ پچھلے سال کی بات ہے۔ میں چھٹی لے کر گھر آیا۔ معلوم ہوا کہ اہلیہ عرصے سے بیمار چلی آ رہی ہیں۔ انہیں گردے کا درد تھا۔ میں انہیں لیڈی ڈاکٹر سلیمہ کے پاس لے گیا۔ انہوں نے تشخیص کی کہ تلی بڑھ گئی ہے۔ انہوں نے دو روپے میں ایک بڑی بوتل بھر کر دوائی دی۔ میری اہلیہ نے دوائی پی۔ انہیں کچھ دوا افاقہ بھی ہوا لیکن پورا آرام نہ آیا۔ دوائی شاید بہت کڑوی تھی یا وہم بڑھ گیا تھا۔ وہ لیڈی ڈاکٹر سلیمہ کے علاج سے مطمئن نہ ہو سکیں۔ اس لئے مجھے ڈاکٹر ارشد مرزا کے ہسپتال میں جانا پڑا۔ انہیں ڈاکٹری کے میدان میں بقراط سے بھی بڑھ کر شہرت حاصل تھی۔

ہم قریباً سات بجے صبح اُن کے ہسپتال میں پہنچے۔ ابھی مریضوں کا تانتا نہیں بندھا تھا۔ ارشد مرزا بہترین سوٹ پہنے کرسی پر دراز تھے۔ اُن کے گنجے سر کی چندیا انڈے کی طرح صاف، روشن اور شفاف تھی۔ بھرے بھرے گالوں پر ایک کھونٹی بھی نہ تھی اور سفید مونچھیں لبوں کے گوشے میں کچھ اس انداز سے لٹک رہی تھیں جیسے اپنے آپ سے محجوب ہوں۔ میں نے السلام علیکم کہی۔ ارشد مرزا کے چہرے کا ایک ایک نقش مسکرایا اور ہنسا حتیٰ کہ ان کی مونچھوں کا ایک ایک سفید بال تبسم کی نقرئی کرن بن گیا۔ وہ کرسی سے مسکراتے ہوئے اٹھے مسکراتے ہوئے مجھ سے مصافحہ کیا اور پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگے :

"آپ تشریف رکھیں۔ اوہ! معاف کیجئے آپ کے ساتھ لیڈیز بھی ہیں" اور دوسرے کمرے کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہنے لگے "لیڈیز روم ہے" پھر مسکراتے ہوئے آہستہ آہستہ کرسی پر بیٹھے۔ دروازہ ہو گئے۔ وہ دائمی مسکراہٹ دیر تک اُن کے ہموار اور نرم چہرے اور ملائم مونچھوں پہ اس کی خوشگوار دھوپ کی مانند پھیلتی اور سمٹتی رہی۔ اس وقت مجھے افسوس ہوا کہ کاش میں ایک مصور ہوتا اور ڈاکٹر ارشد مرزا کو ماڈل بنا کر "اخلاق کا دیوتا" نامی تصویر بنا کر شہرت دوام کا تمغہ حاصل کر لیتا اے کاش!

میں نے بیوی کو لیڈیز روم میں بٹھایا اور پھر ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں چلا آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر مسکراہٹوں کا ریشمی لبادہ اوڑھ لیا۔ کہنے لگے "فرمائیے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" میں نے اپنی بیوی کی بیماری کا ذکر کیا۔ وہ ہمہ تن توجہ بن گئے۔ میں نے اس کی تکلیف بیان کی۔ اُن کے چہرے پر درد اور کرب کے نقوش اُبھرنے لگے۔ میں نے کہا کہ میری بیوی لیڈی ڈاکٹر سلیمہ کے علاج سے صحتیاب نہیں ہو سکیں۔ ان کے چہرے پر بے اطمینانی اور مایوسی کا اندھیرا چھانے لگا اور جب میں نے کہا کہ میری بیوی آپکے پاس آئے بغیر مطمئن نہ ہو سکتی تھیں تو اُن کی باچھیں خوشی سے کھل گئیں۔ موٹے موٹے گال غبارے کی مانند پھولے اور پھولتے چلے گئے اور مجھے ڈر لگا کہ یہ گال روایتی مینڈک ——— کی طرح نہ پھٹ جائیں۔ اس لئے میں نے مزید تعریف سے اجتناب کیا۔

ڈاکٹر نے گھنٹی پر ہاتھ رکھا۔ ایک ڈسپنسر نمودار ہوا۔ "ڈاکٹر مس قریشی سے کہیں کہ ذرا کنسلٹنگ روم میں تشریف لے آئیں"

میں اپنی بیوی کو لے کر کنسلٹنگ روم میں پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب پہلے ہی سے موجود تھے۔ چند لمحوں کے بعد لیڈی ڈاکٹر مس قریشی صاحبہ بھی نمودار ہوئیں اور میں نے سمجھا کہ کوہ ہمالیہ کی بلندیوں سے لڑھکتا ہوا کوئی برف کا ٹکڑا کمرے میں پھسل آیا ہے۔ سفید لباس۔ سفید بے داغ چہرہ۔ اُن کی تشریف آوری سے کمرے کا ٹمپریچر یکدم گرتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے کپکپی سی محسوس کی۔

"کوئی سیریس کیس ہے کیا؟" اُن کا انداز گفتگو ان کے لباس اور چہرے سے بھی زیادہ برفیلا تھا۔

"سیریس ...... نہیں ...... شاید!" ڈاکٹر نے کہا۔ میں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اس کا رنگ اڑا جا رہا تھا میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی ہمت بندھانے کی کوشش کی لیکن بے سود۔

مس قریشی نے آگے بڑھ کر میری بیوی کی نبض کو ٹٹولا۔ آنکھوں میں جھانکا۔ پیٹ کو تھپتھپایا۔ سٹیتھیسکوپ کانوں سے لگا کر دل کی دھڑکن پھیپھڑوں کے زیر و بم کو محسوس کیا اور پھر برفیلے چہرے کو نقطۂ انجماد بناتے ہوئے بولیں "جگر بڑھ گیا ہے" ڈاکٹر ارشد مرزا نے سر ہلا دیا اور پھر محض نگاہوں سے کام لینا شروع کر دیا۔

"دل پر ورم ہے!" شاید اس نگاہ نے کہا۔

"تلی بڑھ گئی ہے" "ہو سکتا ہے" نگاہ نے جواب دیا۔

"گردے پر زخم ہو گیا ہے"

"ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے" ڈاکٹر مرزا کہنے لگے "یورین (URINE) ٹیسٹ کر لینا بہتر رہے گا" اور پھر انہوں نے ایسے لہجے میں جس میں شفقت اور ہمدردی کی ہر گہرائی موجود تھی، میری بیوی سے کہا:

"آپ ذرا پردے کے پیچھے ...... میرا مطلب ہے یورین ٹسٹ کرنا ہے"

میری بیوی پردے کے پیچھے چلی گئیں اور چند منٹوں کے بعد واپس آ گئیں۔ پھر دونوں ڈاکٹر پردے کے پیچھے چلے گئے۔ دو منٹ تین منٹ حتیٰ کہ دس منٹ گزر گئے اور آخر خدا خدا کر کے ڈاکٹر باہر آئے۔

"پیشاب میں البیومن ہے" ارشد مرزا نے کہا۔

"میں نے پس سیلز (PUS CELLS) بھی دیکھے ہیں" لیڈی ڈاکٹر بولیں۔

"پس؟" ڈاکٹر ارشد مرزا نے حیران ہو کر کہا۔

"گردے میں زخم معلوم ہوتا ہے۔" لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔

"زخم؟" میں نے گھبرا کر پوچھا

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میرا اندازہ کاڈ فرنس آف اوپینین ہے۔ ابھی فیصلہ ہوا جاتا ہے۔" ڈاکٹر ارشد مرزا نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"میں کہتا ہوں 'البیومن' ہے۔ آپ کہتے ہیں 'پس' ہے۔ جب دو ڈاکٹر اگری نہ کر سکیں تو بیماری کی تشخیص میں شک پڑ جاتا ہے۔" ڈاکٹر ارشد مرزا نے بڑی مایوسی سے کہا اور گہری سوچ میں پڑ گئے۔ "ایکس رے" لیڈی ڈاکٹر مس قریشی نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

اور میرے ذہن سے ایک عکس ریز شعاع لپکی اور دونوں ڈاکٹروں کے ذہن کے پردوں سے گزرتی ہوئی ایک مقام پر پہنچ کر رک گئی جہاں صاف لکھا ہوا تھا "دھوکا! دھوکا" یہ ڈرامہ دس منٹ سے محض اس لئے کھیلا جا رہا تھا کہ عکس ریزی نقطۂ عروج پر پہنچایا جا سکے۔ ڈاکٹر ارشد مرزا نے حال ہی میں ایکس رے مشین خریدی تھی۔ اور اس کا استعمال ضروری تھا۔ اور مجھے بے انتہا غصہ آیا۔ اپنی بیوی کی ضد پر۔ اپنی بیوقوفی پر۔ اخلاق کے دیوتا کی ساحری پر۔ ہیرت کی قاش پر۔ لیکن اب میں جال میں پھنس چکا تھا۔ بیوی سے کیسے کہتا کہ اٹھو اور اللہ کا نام لے کر لیڈی ڈاکٹر سلیمہ کی بوتل خالی کر دو۔

پھر ایکس رے فوٹو لی گئی۔ دونوں ڈاکٹروں نے فوٹو کو غور سے دیکھا۔ اور پھر دونوں اگری کر گئے۔ میں نہیں جانتا کونسی بیماری کی تشخیص ہوئی۔ نسخہ لکھا گیا۔ ایک بڑی سی بوتل پر ہوئی۔ ٹیکوں کا ایک ڈبہ میرے ایک ہاتھ میں تھما دیا گیا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے پانچ پانچ کے پانچ نوٹ ڈاکٹر کی میز پر رکھ دئے۔ انہوں نے نوٹ میز کی دراز میں رکھے اور پھر اٹھ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ مسکراہٹوں کے طوفان میں "تھینکس" کا لوچدار لفظ ابھر کر ڈوب گیا۔

میں نے ہاہرا کر بوتل کو غور سے دیکھا اور میں نے شرما کر نگاہیں جھکا لیں۔

"کیوں؟" اشرف نے پوچھا۔

"مجھے بوتل کے پیچھے لیڈی ڈاکٹر سلیمہ طنزیہ انداز میں مسکراتی نظر آئیں۔"

"وہ کیسے" اشرف نے پھر پوچھا۔

"اس بوتل کی دوائی کا رنگ بھی وہی تھا۔ جو لیڈی ڈاکٹر سلیمہ نے محض دو روپے میں دو روز قبل مجھے دی تھی!" ✧

جون ۱۹۵۹ء



عکسِ تحریر: محسن بھوپالی

# ریستوران میں

ابن سعید

"اب تو ایڈنا بھی مجھ کو چھوڑ کے جا رہی ہے!" روشن نے کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے ہوئے سوچا اور ایڈنا کو ہال کے دوسرے سرے پر چکر کھاتے ہوئے دروازے میں سے نکلتے ہوئے دیکھنے لگا، ہال کا دوسرا سرا اس سے کافی دور تھا اور ہال میں شام کا دھندلکا پھیلنا شروع ہو چکا تھا۔ لیکن گھومنے والے دروازے میں سے روشنی چھن چھن کر اندر آ رہی تھی، اس روشنی اور دھندلکے کے جال میں گھرے ہوئے وہ ایڈنا کو دیکھ سکتا تھا ——— ایڈنا نے ہلکے ہلکے بوجھل قدموں سے ہال کی لمبائی طے کی۔ دروازے کے قریب رکھی ہوئی میز پر سے اپنا چمڑے کا بٹوہ اٹھایا اور پھر گھومنے والے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ باہر جاتے جاتے اس کا پاؤں ایک مرتبہ جوتیاں صاف کرنے کی چٹائی میں اٹکا مگر اس نے ساڑھی کے گھیر کو ذرا سا اونچا کر کے اپنے کو گرنے سے سنبھال لیا ——— اور پھر خاموشی کے ساتھ گھومنے والے دروازے سے باہر نکل گئی۔

ایک نیم دائرہ بنا کر چکر کھانے والا دروازہ پھر اپنے محور پر ساکت ہو گیا اور لکڑی کے کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے ہوئے روشن نے ایک مرتبہ پھر اپنے سے کہا "اب تو ایڈنا بھی چلی گئی!" اور پھر ویسے ہی خاموش اور ساکت بیٹھ گیا۔ وہ خود کو بیحد سست اور تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا، جب ایڈنا نے اس سے کہا تھا ——— "اچھا اگر یہ بات ہے تو میں بھی چلی جاتی ہوں!" تب بھی وہ یونہی خاموش اور ساکت بیٹھا رہا تھا اور جب وہ واقعی باہر جا رہی تھی تو اس نے ایک مرتبہ سوچا تھا کہ وہ اٹھ کر اس کو باہر جانے سے روک لے اور اس سے کہہ دے "چلو، یہ سب فالتو باتیں ہیں، تم کیوں شمیم، ڈیزی اور ماری کی طرح سے ریستوران کو چھوڑ کر جاتی ہو"، لیکن پھر یونہی غیر شعوری طور پر اس کی وہ بے وجہ خاموشی اور سستی اس کی طبیعت پر غالب آ گئی تھی، اور وہ یونہی خاموش بیٹھا رہا، اور ایڈنا باہر چلی گئی۔

ریستوران کو سب سے پہلے چھوڑ کر شمیم گئی تھی، پھر ڈیزی اور پھر ماری، اور اب ایڈنا، اور اب ریستوران بالکل خالی اور ویران رہ گیا تھا کونے میں سکرین کے پیچھے رکھا ہوا وہ آئینہ بے معنی سا معلوم ہو رہا تھا کیونکہ یہ آئینہ تو روشن نے خاص طور پر ان لڑکیوں کے لئے ہی لگوایا تھا، وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بال اور لپ سٹک پاؤڈر وغیرہ درست کر لیتی تھیں۔ روشن ان کو کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے ہوئے آئینہ کے سامنے بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اب تو سکرین کے پیچھے بھی سناٹا تھا اور اس نے جب غیر شعوری طور پر اس آئینے میں کسی مانوس چہرے کو تلاش کرنے کی کوشش کی تو اس کو وہاں کسی کی جھلک نظر نہ آئی ——— اور وہ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا ہوا خود کو بے حد سست اور جامد محسوس کرتا رہا۔

ریستوراں کی چھت اونچی تھی، اور اس میں نقلی چاند ستارے بنے ہوئے تھے۔ رات کے وقت ان چاند ستاروں میں روشنیاں جگمگا اٹھتیں اور دیواروں پر بنی ہوئی رنگ برنگی تصویروں میں بھی گویا جان پڑ جاتی۔ روشن نے دیکھا کہ اس وقت وہ چاند ستارے بالکل بجھے ہوئے سے تھے اور یہ تصویریں بھی بالکل بے جان تھیں۔ ایک تصویر میں ایک بے جان ہرن ایک بے جان عورت کے ہاتھ کو چاٹ رہا تھا۔ قریب ہی

سبے جان پتھروں پر سے بے جان پانی کی ایک آبشار بہہ رہی تھی ـــــ تصویروں کے پس منظر میں گھنے جنگل تھے، جن کے تن اور درختوں میں روشنیاں لٹکی ہوئی تھیں ـــــ روشن کو یہ تمام بے جان مناظر بہت ہی بھدے، بے رونق اور تھکا دینے والے معلوم ہوئے ـــــ اور اس کو لڑکا ایکی یاد آگیا کہ جب اس نے پہلی بار اس قسم کا ریستوراں کھولنے کا ارادہ کیا تھا تو سب سے پہلے اس کے دماغ میں، ہرنوں اور جوتوں اور گنگناتی ہوئی آبشاروں اور نقلی چاند ستاروں کے ان مناظر نے ہی جنم لیا تھا۔ اس نے انگریزی اور امریکی فلموں میں کئی بار ایسے الف لیلوی ریستوراں دیکھے تھے اور پھر اس نے شہر میں ڈھونڈ ڈھانڈ کر دیواروں پر تصویریں بنانے والے ایک سستے سے آرٹسٹ کا پتہ لگا لیا تھا۔

ریستوراں کھولنے سے چند روز پہلے روشن نے اخباروں میں ویٹرسوں کے لئے اشتہار دیا اور اس اشتہار کے جواب میں کئی لڑکیاں اس کے سامنے انٹرویو کے لئے آموجود ہوئیں۔ ریستوراں میں یوں ویٹرسوں کو ملازم رکھنا بھی ایک نیا تجربہ تھا اور روشن کو اُمید تھی کہ شاید یہ تجربہ ہی اس کے ریستوراں کی کامیابی کا باعث بن جائے اور پھر کئی لڑکیوں کو انٹرویو کرنے کے بعد اس نے شمیم، ماری، ڈیزی اور ایڈنا کو اپنے ریستوراں کے لئے منتخب کر لیا۔

شمیم شاید ان سب سے عمر میں کم تھی لیکن اس کم عمری کے باوجود اس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کا پکا پن تھا جو اس سے پہلے روشن نے صرف بڑی عمروں والی تجربہ کار عورتوں کے چہروں پر ہی دیکھا تھا۔ وہ تیز تیز چبھتے ہوئے سے لہجے میں باتیں کرتی اور باتیں کرتے کرتے اس کے چہرے پر ایک بے وجہ سی مسکراہٹ پھیلنے لگتی، نہ جانے کیوں روشن کو اس کی یہ مسکراہٹ ہمیشہ کچھ ناگوار سی معلوم ہوتی۔ جیسے یہ بے وجہ مسکراہٹ اپنے اندر کوئی راز پنہاں کئے ہو۔ یہ تلخ اور ترش اور قدرے زہریلی مسکراہٹ ہمیشہ اس کی شخصیت کا ایک جزو بنی رہتی۔ شمیم نے اس کو بتایا تھا کہ وہ رفیوجی تھی۔ پنجاب میں سرحد کے پار اس کا چھوٹا سا قصبہ تھا اور اس چھوٹے سے قصبے میں اس کا ایک چھوٹا سا گھر تھا اور جب تباہی اور موت کا ایک سیلاب اس علاقے میں ٹوٹا تھا تو وہ اور اس کا وہ چھوٹا سا گھر بھی اس سیلاب کی زد میں آگئے تھے ـــــ اور پھر اس بھنور میں پھنسے پھنسے وہ نہ معلوم زندگی کی کتنی منزلیں طے کر گئی۔ وہ کہتی: "اس سے پہلے میں صرف تیرہ برس کی ایک بیوقوف جاہل لڑکی تھی لیکن پھر اس سیلاب کی بدولت میں نے زندگی کی ان گنت منزلیں ایک ساتھ طے کر ڈالیں، جیسے جوانی مجھ پر زبردستی عائد کر دی گئی ہو!" ـــــ اتنا کہنے کے بعد اس کی مسکراہٹ میں تلخی کا عنصر کچھ زیادہ ہی ہو جاتا اور روشن کا دماغ بالکل ہی جھلّا اُٹھتا!

ماری اور ڈیزی بہنیں تھیں، وہ دونوں انٹرویو کے لئے ایک ساتھ آئی تھیں، وہ اکثر کپڑے بھی ایک جیسے پہنتیں اور ایک دفعہ تو ماری نے بے حیائی کے ساتھ ہنستے ہوئے کہا: "ہم دونوں کی پسند اکثر معاملوں میں ایک سی ہی ہے بلکہ ایک مرتبہ تو جنگ کے زمانے میں ہم دونوں نے عاشق بھی ایک ہی تلاش کیا تھا!"

اور ماری نے کہا "بائی گوڈ! وہ امریکن بہت حسین تھا، لمبا قد، چکلا سینہ، یونانیوں جیسا ناک نقشہ! پہلے اس کی ملاقات ڈیزی سے ہوئی تھی اور یہ چھپ چھپ کر اس سے ملتی، لیکن پھر مجھ کو بھی پتہ چل گیا! ـــــ اور وہ دونو ساتھ مل کر قہقہہ لگاتیں۔ ماری پیانو اچھی بجاتی تھی وہ اکثر ریستوراں کے پیانو پر ناچ کی دھنیں بجاتی اور ڈیزی اولڈ والٹس بہت اچھا ناچتی اور بعض دفعہ تو والٹس ناچتے ناچتے جیسے وہ بھی سٹراؤس کی خیالی دنیا کا ایک فرد بن جاتی!

ایڈنا عمر میں ان سے بڑی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی ایک پھیکا پھیکا پختہ پن تھا اور ایک گہری سنجیدگی تھی۔ یہ سنجیدگی اس کی ویران بے چمک آنکھوں میں بھری رہتی اور کبھی کبھی یہی سنجیدگی ایک ویران اور بے رنگ سی مسکراہٹ بن کر اس کے چہرے پر پھیل جاتی۔ وہ دن دن بھر ریستوراں کے مختلف کاموں میں خاموشی کے ساتھ مشغول رہتی اور جب زیادہ شام گزر جانے کے بعد ریستوراں میں خاموشی چھانے لگتی اور ریڈیو پروگرام پر ناچ کی دھنیں بجنی شروع ہو جاتیں تو وہ ایک کونے میں رکھی ہوئی جھولنے والی کرسی پر خاموش اور سنجیدہ بیٹھ جاتی اور روشن اور ڈیزی،

اور ماری کو ناچتے دیکھتی رہتی۔ شمیم کے بے وجہ اور بے موقعہ قہقہوں کی گونج کو سنتے رہتی اور کبھی کبھی نظریں اٹھا کر ان چاند ستاروں کی چمکدار روشنی کو محویت سے ساتھ گھورنے لگتی ـــــ لیکن پھر کبھی کبھار روشن اس کی سنجیدگی میں حائل ہو جاتا۔

وہ کہتا "مس ایڈنا۔ تم اس قدر سنجیدہ کیوں بیٹھی ہو۔ جیسے ہم سب سکول کے بچے ہوں اور تم کوئی فلسفہ دان میٹرن!" ـــــ دیہ خفیف سے وقفے رہتے ایڈنا کے چہرے پر بھی ایک مسکراہٹ اُبھر آتی اور وہ کہتا ـــــ "آؤ تم بھی ناچو تم بہت اچھا کرتی ہو" ـــــ اور ایڈنا ایسی سنجیدگی کے ساتھ اس کی بات کی تعمیل میں اُٹھ کھڑی ہوتی۔

اس بڑے شہر کے سب سے بڑے بازار میں جب روشن نے اپنے انوکھے ریستوران کا افتتاح کیا تو بہت سے لوگ محض تجسس کے جذبے میں اس کو دیکھنے آگئے، ویسے تو ریستوران اس شہر میں بہت سے تھے لیکن اس ریستوران کی چھت میں یہ نقلی چاند تاروں کا جال اور دیواروں پر الف لیلوی تصویریں اور خوفناک شکلوں والے بیراؤں کے بجائے نازک سی وردیوں میں ملبوس ویٹریس ـــــ سب کو ایک انوکھی سی بات معلوم ہوتی، اور لوگ ایک آدھ بار ضرور اس ریستوران کو دیکھنے چلے آتے اور اسی وجہ سے روشن شروع شروع میں اپنے کاؤنٹر کے پیچھے اطمینان سے بیٹھا رہتا اور سوچتا کہ شاید ریستوران بازی میں اس کا یہ انوکھا افسانوی قسم کا تجربہ کامیاب ہی ثابت ہوگا اس کے تمام خواب اصلیت بن جائیں گے۔ اس کے خوابوں میں اعلیٰ درجے کی لمبی چوڑی موٹر کار اور سمندر کے کنارے ایک موڈرن وضع کے بنگلے کو ایک خاص جگہ حاصل تھی اس کے باپ کے پاس پیسہ بہت تھا لیکن وہ پھر بھی شہر کے ایک گنجان علاقے کی ایک تنگ و تاریک گلی میں اپنے آبائی مکان میں رہنا پسند کرتا۔ سفر صرف ان علاقوں کا کرتا جن میں ٹریم کی پٹڑی موجود تھی اور اسی لئے اس کو کبھی بھی موٹر کار کی ضرورت محسوس نہ ہوتی اور اس کا باپ ہمیشہ اس کی رومانوی اور الف لیلوی باتوں کو بیکار اور بے معنی تصور کرتا۔ ریستوران کے لئے آتا روپیہ نہ جانے کس کمزوری کے ماتحت اس نے روشن کو دے دیا، لیکن اس کو یقین تھا کہ یہ افسانوی طرز کا تجربہ کبھی بھی کامیاب نہ بن سکے گا! ـــــ اور روشن کو بھی اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ اگر اس کا یہ تجربہ ناکام رہا تو اس کے خواب محض خواب ہی رہیں گے اور اس کو اپنی باقی زندگی شہر کی ایک تنگ و تاریک گلی کے ایک تاریک نما مکان میں گزار دینی پڑے گی ـــــ اور یہ تصور ہی کس قدر بھیانک تھا!

ریستوران کھلنے کے چند روز بعد تک لوگ کافی تعداد میں آتے رہے۔ ریستوران میں آنے والے زیادہ تر نوجوان طالب علم، بڑی بڑی تجارتی فرموں کے کلرک اور لمبے لمبے بالوں اور بے ترتیب مونچھوں والے اخبار نویس تھے۔ یہ سب میزوں کے گرد گھنٹوں بیٹھے اُلٹی سیدھی بحثوں میں اُلجھے رہتے۔ اور ان میں سے اکثر محض ایک پیالی کے آرڈر کی بدولت تمام دن ریستوران کی کرسیوں پر قابض رہتے! لیکن پھر ایک روز ریستوران کھلنے کے تھوڑے عرصے بعد ہی روشن کو کاؤنٹر کے اوپر حساب کتاب چکاتے چکاتے ایکا ایکی اس بات کا گہرا احساس ہو گیا کہ ان نوجوان طالب علموں، کلرکوں اور اخبار نویسوں کے جمگھٹوں کے باوجود اس کے ریستوران کی آمدنی کم سے کم تر ہوتی جا رہی ہے!

اور اس کو اس احساس پر سخت جھنجھلاہٹ محسوس ہونے لگی اور اس کے خوابوں کے تصور میں ان نوجوانوں کے بلند قہقہے بُری طرح مخل ہونے لگے! ـــــ لیکن پھر ان ہی دنوں ایک عجیب و غریب واقعے نے اس کے دل میں اپنے ریستوران کے بارے میں امید کی ایک تازہ جھلک پیدا کر دی اور اس واقعے نے اس کو اپنے تجربے کے ایک انوکھے پہلو سے بھی واقف کر دیا!

ایک شام ریستوران کی ایک گول میز کے گرد ان نوجوانوں کا ایک جمگھٹا تھا، وہ تمام شام میز کے گرد بیٹھے رہے تھے اور اونچی اونچی آوازوں میں قہقہے لگاتے رہے تھے جب وہ ریستوران میں آئے تھے تو انہوں نے چائے کا آرڈر دیا تھا لیکن پھر چائے پینے کے بعد اور بل چکا دینے کے بعد بھی وہ وہیں بیٹھے رہے اور اپنی طویل مسلسل بحثوں اور قہقہوں میں اُلجھے رہے، جب ڈیزی اور ماری اس گروہ سے تنگ آ گئیں تو وہ میز پر سے

برتن وغیرہ اٹھا لینے کے بعد سکرین کے پیچھے جا کر آرام کرسی پر بیٹھ گئیں، ایڈنا بھی کاؤنٹر کے پیچھے رکھے ہوئے ایک اونچے سے سٹول پر خاموش بیٹھ گئی اور دیر تک ان نوجوانوں کو ایسے گھورتی رہی جیسے اس کو ان پر غصہ بھی آ رہا ہو اور رحم بھی اور پھر شاید ان سب لوگوں کے وجود سے اُکتا سی گئی اور دوسری طرف منہ موڑ کر بیٹھ گئی لیکن یوں منہ پھیر لینے کے باوجود بھی وہ ان کی چبھتی ہوئی حریصانہ نگاہوں کو اپنی جانب گھورتے ہوئے محسوس کرتی رہی اور پھر اس کی خفگی میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا چلا گیا! ـــــ شمیم تمام شام بھرتی کے ساتھ اپنے کاموں میں مصروف رہی۔

”چار گلاس پانی، مِس!“ ان میں سے کوئی نوجوان ایسے آواز لگاتا، جیسے وہ اس لفظ ”مِس“ کی چاشنی کو دیر تک محسوس کرنا چاہتا ہو، اور شمیم ایک چمکدار ٹرے پر چار گلاس سجا کر ان کو دے آتی۔ کبھی کبھی وہ لوگ اس کو اپنی میز کے قریب باتوں میں مصروف رکھنے کی بھی کوشش کرتے، وہ کہتے :

”مِس، اب کیا بجا ہے؟“

”ذرا ایش ٹرے چاہیئے ہے ـــــ مِس!“

”ذرا یہ میز کو صاف تو کرتی جایئے!“ ـــــ اور نہ جانے کیا کیا، ایڈنا کو کاؤنٹر کے قریب بیٹھے بیٹھے ان لوگوں کی آوازوں سے بے پناہ کوفت محسوس ہونے لگی لیکن شمیم کے ہونٹوں پر ایک بے معنی سی مسکراہٹ مستقل مزاجی کے ساتھ کھیلتی رہتی، وہ اور بھرتی کے ساتھ ہال میں اِدھر سے اُدھر بھاگتی رہتی، جب وہ ٹرے سنبھالے سنبھالے میز کے قریب پہونچتی تو ایڈنا کو یہ محسوس ہوتا کہ شاید ان لوگوں کی نظریں بالکل ہی قابو سے باہر ہو جائیں گی اور جب شمیم میز پر برتن رکھ کر واپس پلٹتی تب بھی یہ نظریں اس کا تعاقب کرتی رہتیں ـــــ اور ایڈنا کو اس احساس پر بری طرح جھرجھری آ گئی۔

جب شام زیادہ ہو گئی تو ریستوراں کے ہال میں رنگ برنگی روشنیوں کا ایک جال پھیل گیا، نوجوانوں کا وہ مجمع بدستور میز کے گرد جمع رہا، اور رنگ برنگی روشنیوں کے اس جال میں سگریٹوں کے دھوئیں کے بادل بے ترتیب طریقے پر پھیل گئے اور ایڈنا کو اپنی آنکھوں میں مرچیں سی محسوس ہونے لگیں ـــــ اور وہ سٹول پر خاموش اور ساکت بیٹھے رہنے کے باوجود خود کو بے حد تھکا ہوا محسوس کرنے لگی۔

لیکن پھر یکایک ایڈنا نے اپنی دکھتی ہوئی آنکھوں کو پھاڑ پھاڑ کر دھوئیں اور رنگ برنگی روشنیوں کے ان بادلوں میں گھورنا شروع کر دیا، اس نے دیکھا کہ اب ان نوجوانوں کی میز کے قریب ایک اور نووارد کھڑا تھا جس کے بال اور کپڑے پریشان اور بے ترتیب تھے، وہ جھوم جھوم کر باتیں کر رہا تھا ـــــ ایڈنا کا بے تحاشہ جی چاہا کہ وہ چلّا اُٹھے : ”اُفوہ ـــــ یہ شرابی کون ہے؟“ ـــــ لیکن وہ ویسے ہی خاموش بیٹھی رہی اور دھوئیں کے بادلوں کے پار گھور گھور کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی، دو ایک مرتبہ جب شمیم برتنوں کی ٹرے لئے اس میز کے قریب گئی تو وہ نووارد گھور گھور کر اس کو دیکھنے لگا اور شمیم شپٹا سی گئی، تھوڑی دیر بعد وہ اپنے جوتوں سے شور مچاتا ہوا کاؤنٹر کے بالکل قریب آن کھڑا ہو گیا اس نے اپنی کہنیاں کاؤنٹر پر ٹکا لیں، اور اپنا چہرہ بہت ہی رازدارانہ طریقے پر روشن کے چہرے کے قریب کر لیا۔ اس کے کاؤنٹر کے قریب آتے ہی بدبو کا ایک بھپکا فضا میں پھیل گیا۔

اس نے شمیم کی طرف گھورتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں پوچھا : ”یہ لڑکی کون ہے!“

”کیا مطلب؟“ روشن نے روکھائی اور خفگی کے ملے جُلے لہجے میں کہا۔

”یہ کون ہے؟ ـــــ کیا نام ہے؟ ـــــ کیا کرتی ہے؟“ ـــــ اس نے رُک رُک کر شرابی انداز میں پوچھا اور پھر بے حیائی کے ساتھ مسکرانے لگا۔ اور شمیم کی خفگی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ اس نے اسی بے اعتنائی کے ساتھ کہا : ”یہ ہماری ویٹرس ہے، اس کا نام شمیم ہے!

لیکن آپ کو کیا کام ہے ؟" اس نووارد نے کوئی جواب نہ دیا لیکن وہ بیہودہ مسکراہٹ اور بھی اس کے چہرے پر نمایاں ہوگئی اور روشن کی تیوری پر واقعی غصّے اور جھنجھلاہٹ کے آثار پیدا ہو گئے ۔ اس نے سوچا کہ ایسے ذلیل اور بیہودہ انسان دراصل اس غیر مرئی خوبصورتی سے ناواقف ہیں جو اس کے اپنے دماغ پر حاوی ہے ، جس کا ایک نمایاں ثبوت یہ ریستوراں ہے ۔ ان لوگوں کے دماغوں میں تو تمام وقت بدبو اور بساند بھری رہتی ہے ، لیکن اس نووارد پر روشن کی خفگی آمیز نظروں کا کوئی اثر نہ ہوا ، وہ تو ویسے ہی بے حیائی کے ساتھ مسکراتا رہا اور پھر ایک دم سے چیخ اُٹھا ،" تم کیوں یوں خفا ہوتے ہو ! وہ کوئی تمہاری بیوی تھوڑا ہی ہے ! " اس کی آواز بہت ہی بیہودہ طریقہ پر تمام ہال میں گونج گئی اور ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ ان کی طرف دیکھنے لگے ——— اور پھر وہ نووارد اپنے پیروں سے ویسے ہی بلند شور مچاتا ہوا باہر چلا گیا ، اور ان نوجوانوں کے قہقہے اور بھی بلند ہو گئے ——— اور روشن کی کوفت اور اکتاہٹ اور غصّے میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ۔ اس نے ایک لمحے کے واسطے سوچا کہ وہ شمیم سے اظہارِ ہمدردی کرے کیونکہ شرابی آدمی اس قدر بے حیائی کے ساتھ اس کے بارے میں باتیں کر رہا تھا لیکن اس نے دیکھا کہ شمیم بدستور اس گول میز کے گرد بیٹھے ہوئے نوجوانوں کے لئے پھرتی کے ساتھ کام کرتی پھر رہی ہے اور ان کے قہقہوں کے طنز کو سمجھنے سے قاصر ہے ، اور اس کے چہرے پر وہی پکی پکی مسکراہٹ پھیلی ہوئی ہے ——— اور وہ ویسے ہی اپنی جگہ خاموش بیٹھا رہ گیا !

اور دوسرے دن جب ڈیزی اور ماری ریستوراں میں آئیں تو ان کے چہروں پر بھی ایک طنزیہ مسکراہٹ تھی ، انہوں نے معنی خیز قہقہوں کے ساتھ روشن کو بتایا کہ گذشتہ رات بارہ بجے ، جب وہ کام ختم کر کے واپس گھر جا رہی تھیں تو قریب کی ایک گلی میں انہوں نے شمیم کو اسی شرابی کے ساتھ دیکھا تھا ، وہ دونوں بے تکلفی کے ساتھ قریب قریب چل رہے تھے اور وہ آدمی اپنے مخصوص شرابی انداز میں سرگوشیوں میں باتیں کر رہا تھا !

روشن نے سوچا کہ نہ جانے اس کو کیوں اس آدمی کی باتوں پر بے طرح غصّہ آگیا تھا ، اب جبکہ اس کی کوفت زائل ہو چکی تھی ، وہ ان باتوں کا ٹھنڈے دل سے تجزیہ کرنے کے لئے تیار تھا ، اور اس کو اپنی کوفت اور خفگی اور جھنجھلاہٹ بے معنی معلوم ہونے لگی ، ماری اور ڈیزی بدستور معنی خیز طور پر قہقہے لگا رہی تھیں ۔

ڈیزی نے کہا ، " ویسے یہ بھی ہے کہ اب ریستوراں میں رش کم ہو گیا ہے اور اس کے مطابق ٹپس میں بھی کمی آگئی ہے !" ——— اور پھر وہ اپنا فقرہ مکمل کئے بغیر مکروہ طریقے پر ہنسنے لگی ۔

پھر ماری نے کہا ، " بیچاری شمیم دراصل بہت ڈرپوک واقع ہوئی ہے ۔ وہ ہمیشہ مجھ سے کہتی تھی کہ رات کی تاریکی میں گھر واپس جاتے ہوئے وہ تمام راستے ایک نامعلوم خوف میں گھری رہتی ہے ——— یہ خوف اس پر پہلی دفعہ ستائیس ؟ میں سوار ہوا تھا ، اور اب تک اس کے اعصاب پر قابض ہے ؟ ——— اور نہ جانے کیا کیا ۔ ان کی باتیں طویل قہقہوں میں بدل گئیں اور روشن بھی کھسیانے طور پر ان کی ہنسی میں شریک ہو گیا ! ——— لیکن پھر شمیم غائب ہو گئی ۔ اس رات کے بعد نہ اس کو ماری اور ڈیزی نے ہی کہیں دیکھا اور نہ ہی روشن نے ۔ شروع شروع روشن کو اس کا یوں غائب ہو جانا کچھ عجیب سا معلوم ہوا ، وہ کاؤنٹر پر بیٹھے بیٹھے سوچتا کہ نہ جانے وہ کیوں یوں بغیر کہے سُنے غائب ہو گئی ہے اور نہ معلوم وہ شرابی آدمی کون تھا ! ——— لیکن پھر وہ سوچتا کہ دراصل یہ شہر بہت زیادہ وسیع ہے اور ایک جیتے جاگتے انسان کو بالکل آسانی کے ساتھ نگل سکتا ہے ——— اور پھر اس کے خیالات میں ڈیزی اور ماری کے خیالات حائل ہو جاتے اور وہ اپنے کاؤنٹر پر خاموش بیٹھ جاتا ، اور ڈیزی کہتی : " دیکھو نا ! ریستوراں کی نوکری میں آمدنی کتنی قلیل ہوتی ہے ——— کبھی کبھار ہی کوئی معقول ٹپ ملتا ہے ۔ ورنہ تو بس یہ ستر روپے ماہوار پر ہی گزر کرنا پڑتا ہے ! " ——— روشن سوچتا کہ یہ لڑکیاں کتنی غیر شاعرانہ باتیں کرتی ہیں ۔ تمام وقت ایک ایک پیسہ گنتی رہتی ہیں ۔ ایک پیسہ زیادہ مل گیا تو خوشی ہے ، راحت ہے ، سکون ہے ، آرام

ہے اور اگر ایک پیسہ کم ملا تو اُداسی ہے، زندگی سے نفرت ہے، بےکیفی ہے، یہ کتنی واہیات، کتنی فضول زندگی ہے!

شمیم غائب ہوگئی اور پھر چند دن بعد ڈیزی کو بھی کسی ہوائی کمپنی میں ہوسٹس کی جگہ مل گئی اور وہ بھی روشن کے ریستوران کو چھوڑ کر چلی گئی۔ اس نے ریستوراں کی پُرشور اور سگریٹوں کے دھوئیں سے لبریز زندگی پرخلاء میں اڑتے پھرنے کو ترجیح دی اور وہ غائب ہوگئی، مگر اس کے چلے جانے کے بعد ماری کے قہقہوں میں کچھ کمی ہوگئی جیسے وہ کبھی کبھی سوچ میں کھو جاتی ہو۔ پر ایڈنا ویسے ہی سکرین کے پیچھے خاموش بیٹھی رہتی جیسے وہ وہاں موجود بھی ہو اور نہ بھی ہو۔ وہ اس ریستوراں کے ماحول میں بالکل ہی کوئی اضافہ نہ کرتی، ماری بیٹک اپنی اونچی ایڑیوں کی جوتیوں سے ہال بھر میں شور مچاتی پھرتی۔

ریستوراں میں آنے والے لوگوں کی تعداد میں رفتہ رفتہ کمی ہوتی چلی گئی۔ کبھی کبھار دن کے وقت بازار میں خرید و فروخت کرنے والی معمر عورتیں تھک جانے کے بعد تھوڑا سا وقت آرام کرنے کی خاطر ریستوراں میں آجاتیں یا پھر شام کے وقت کوئی نوجوانوں کا گروہ آجاتا، ورنہ باقی تو ریستوراں میں سناٹا ہی چھایا رہتا اور روشن سوچتا کہ شاید اس کے تمام خواب ایک بار پھر منہدم ہو جائیں گے، اور اس کو واقعی اپنی تمام زندگی اپنے باپ کے ساتھ ایک کابک نما فلیٹ میں گزار دینی پڑے گی۔

ایک شام ریستوراں میں سناٹا کچھ معمول سے بھی زیادہ تھا۔ اتوار کی شام کو ویسے ہی اس بڑے بازار میں اس قدر خاموشی چھا جاتی تھی کہ گویا اس شہر کا کوئی قریبی عزیز چل بسا ہو اور تمام عمارتیں، سڑکیں، موٹریں، گاڑیاں اور پیدل چلنے والے انسان اس قریبی عزیز کے سوگ میں ڈوب کے رہ گئے ہوں!

اور روشن کو اس شام کی گرانی اور بھی بُری طرح اپنے اعصاب پر محسوس ہو رہی تھی، اس نے سوچا کہ ایک اتنے بڑے شہر کے ایک بڑے ریستوراں میں بھی زندگی کس قدر جامد اور ساکت بن سکتی ہے، جیسے وقت اپنے مرکز پر ٹھہر گیا ہو یا جیسے کہ دنیا اس ضرب المثل والی گائے کے سینگوں پر پوری طرح جم کے رہ گئی ہو اور اس کو اس تصور سے ہی وحشت ہونے لگی۔

"آئرش آئز آر سمائیلنگ، ایٹ می!"

"آئرش آنکھیں مجھے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہیں!" نظریں، بڑی گہرے براؤن رنگ کی خوش وضع آنکھیں جن پر پلکوں کی ایک دبیز جھالر پڑی رہتی ہے اور اس جھالر کے پیچھے سے کبھی کبھی ایک گہری چمک یا ایک اتھاہ مسکراہٹ نظر آجاتی ہے! اور گو کہ ماری کی آنکھیں گہری براؤن نہ تھیں بلکہ ایک گدلے سے بھورے رنگ کی تھیں اور گو کہ ان میں کوئی خاص جاذبیت بھی نہ تھی بلکہ ان کے اوپر وہ ترشی ہوئی بھنویں کچھ بہت ہی بے ہنگم معلوم ہوتی تھیں لیکن پھر بھی جب ریڈیو گرام پر یہ بہت پرانا نغمہ ایکا ایکی بجنا شروع ہوگیا تو روشن کو ریستوراں کی خاموشی کا احساس پہلے سے دوگنا ہوگیا، اور اس کو محسوس ہوا کہ وہ اس ریستوراں کی بوجھل فضا میں آہستہ آہستہ ڈوبتا چلا جا رہا ہے، جیسے یہ دلدل اس کو نگلنے میں مصروف ہو، اور اس میں اتنی بھی سکت نہ تھی کہ وہ اپنے کو اس دلدل سے باہر نکال سکتا اور اس نے غیر ارادی طور پر اپنے کو ماری کے بازوؤں کے سہارے اس پرانے والٹز کی دھن پر چھوڑ دیا! بے آواز، خاموش، ناچتے ناچتے روشن نے سوچا کہ نہ معلوم یہ آئرش آنکھیں کیسی ہوتی ہیں؟ نیلی یا کالی یا پھر براؤن یا گہری سبز؟ شاید ماری کے پر دادا کے دادا اسی آئرلینڈ کی سرزمین کے باشندے تھے، اور شاید وہ کمپنی کی نوکری کی لالچ میں یہاں چلے آتے تھے اور پھر یہاں پر کوئی مقامی عورت، شاید کوئی گھاٹن یا شاید کلکتہ کے سوناگاچی یا دلی کی چاوڑی کی کوئی ناچنے گانے والی یا شاید کوئی آیا، ماما وغیرہ وغیرہ اور اب آج وہ ماری کے ساتھ مل کر ناچ رہا تھا اور اسی آئرلینڈ کی سرزمین کے حُسن کے بارے میں ایک نغمہ سن رہا تھا اور غیر شعوری طور پر اس دھن کے ساتھ ساتھ اپنے قدموں سے تال دے رہا تھا۔ وہ بیچارہ بےبس بھی تھا

اور بیوقوف بھی، بے جان بھی تھا اور بے ہمت بھی! ــــ لیکن پھر جیسے ایکا ایکی کسی نے بیدردی کے ساتھ کھینچ کر اسے اس بوجھل دلدل سے باہر نکال لیا۔

وہ شرابی کس وقت ریستوراں میں آیا تھا، یہ نہ روشن کو معلوم ہوا اور نہ ماری کو، وہ دونوں ریڈیو گرام کے نغموں پر ناچ رہے تھے، پھر اس شرابی نے اپنی مخصوص بلند آواز میں "ویٹر ــــ ویٹر!" چلانا شروع کر دیا، اور وہ دونوں اس نغمے کے طلسم سے باہر آگئے۔ ایڈنا آہستہ قدموں سے اس آدمی کی میز کی جانب چل پڑی اور ماری آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے بالوں کو سنوارنے لگی۔ روشن ایک پھر اپنے کاؤنٹر کے پیچھے آکر بیٹھ گیا۔ اب وہ ریستوراں کی فضا کے بوجھل پن، یا بڑی سڑک کی گہری خاموشی اور ویرانی جیسی واہیات باتوں کے بارے میں سوچنے سے قاصر تھا۔ اس نے بل بنانے کی کتاب اپنے سامنے رکھ لی اور بے خیالی میں اس کے سرورق پر لکیریں کھینچنا شروع کر دیں۔ اس نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا کہ یہ وہی نوجوان تھا جو پچھلی مرتبہ بھی اس قدر شراب پی کر اس کے ریستوراں میں گھس آیا تھا اور بیہودہ طور پر شور مچاتا رہا تھا اور پھر دوسرے دن شمیم غائب ہو گئی تھی اور گو کہ آج اس کو اس نوجوان کے آنے اور شمیم کے بے وجہ غائب ہو جانے میں کوئی رابطہ نظر نہیں آیا، لیکن اس نے پھر بھی ایک مرتبہ ضرور سوچا کہ ــــ "دیکھیں اب کیا ہوتا ہے؟"

"مجھ کو وسکی سوڈا چاہیئے!" اس نے چلّا کر کہا۔

"بار نو بجے بند ہو جاتی ہے ــــ" روشن نے کاؤنٹر پر سے جواب دیا اور وہ آدمی اونچی آواز میں بڑبڑانے لگا۔ پھر وہ اُٹھ کر کاؤنٹر کے قریب آگیا اور اُسی رازدارانہ انداز میں روشن سے کچھ کہنے لگا۔ روشن خاموشی کے ساتھ اس کی باتیں سنتا رہا۔

"دیکھو ریستوراں چلانے کا ایک گُر ہوتا ہے اور تم اس گُر سے ناواقف ہو۔ تم تو مزے میں ڈانس کرتے رہتے ہو اور تمہارے گاہک بیٹھے ویٹر کا انتظار کرتے رہتے ہیں! ــــ تم تو بالکل اناڑی ہو! ــــ تم کو چاہیئے کہ گاہکوں کو ڈانس کرنے دو ــــ اور خود بیٹھ کر مزے سے کمیشن کھاؤ! ــــ سمجھے! ــــ" اور وہ بیہودہ طریقے پر رکھی رکھی کر کے ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی کے ساتھ ساتھ اس کا تھوک اُڑ کر روشن کے چہرے پر آرہا تھا۔ وہ بہت ہی تکلیف دہ طریقے پر ہنس رہا تھا۔ روشن جانتا تھا کہ اب سے کچھ عرصے پہلے اگر کوئی شرابی آدمی اس کے سامنے اس طریقے پر ہنستا تو وہ شاید اس کا منہ نوچ لیتا ــــ لیکن اس وقت تو وہ اپنے کاؤنٹر پر خاموش بیٹھا رہا اور وہ شرابی آدمی ہنستا رہا اور بولتا رہا ــــ "وہ ــــ وہ لڑکی کہاں ہے، وہی جس کے ساتھ تم ابھی ڈانس کر رہے تھے!" اور وہ سوالیانہ انداز میں روشن کو دیکھنے لگا۔ روشن نے بالکل غیر شعوری طور پر آواز دی "ماری، دیکھو یہ صاحب کیا چاہتے ہیں!" اور سر جھکا کر اپنی کیش بک پر کچھ لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ وہ اب کسی قسم کا احتجاج کرنے سے معذور ہے۔ ماری آئی تو اس شرابی آدمی نے ہکلاتے ہوئے اپنا تعارف کرا دیا اور ماری کے ساتھ فاتحانہ انداز میں ایک میز کے قریب بیٹھ گیا۔ ماری کے لیئے اس نے کریم ملی ہوئی کافی منگا دی اور ماری مسکرا مسکرا کر کافی کی تلخی کو اپنی زبان پر محسوس کرتی رہی۔ اس نے سوچا کہ کافی تلخ ضرور ہوتی ہے لیکن اس تلخی میں ایک طرح کا شیریں مزہ بھی شامل ہے، شاید یہ شیرینی اس بات کی ہے کہ وہ اب سے پہلے کبھی بھی اس قدر بے تکلفی کے ساتھ اپنے مالک کے ریستوراں میں کسی گاہک کے ساتھ مل کر نہ بیٹھی تھی مزا مطلوب آرڈر دے کر اپنے ریستوراں کی کافی پی تھی بلکہ اس ریستوراں میں زندگی گزارنے کے باوجود تمام وقت ایک قسم کی بھوک اس کے اعصاب پر سوار رہتی تھی اور آج اس بھوک کو تقویت پہونچ رہی ہے یا شاید کافی واقعی شیریں ہوتی ہے! ــــ اور وہ اجنبی جو اس کے ساتھ بیٹھا تھا مسکرا مسکرا کر معنی خیز طریقے پر روشن کو دیکھنے لگا، جیسے کہہ رہا ہو! "تم فکر نہ کرو ــــ وہ کمیشن والی بات ٹھیک ہے!" اور پھر وہ اور ماری اُٹھ کر باہر چلے گئے۔ باہر پھیلی ہوئی تاریکی اور سناٹے کا ایک جزو بن گئے اور روشن کو محسوس ہوا کہ گویا ریستوراں کی فضا پر مسلط خاموشی پہلے سے بھی زیادہ وحشت ناک بن گئی ہے، یہ

اس بڑے شہر میں اتوار کی شام ہمیشہ اسی قدر وحشت ناک بن جاتی ہے اور اس نے سوچا کہ شاید یہ دلدل اس کو نگل کے ہی چھوڑے گی۔

دوسرے روز ماری ریستوران نہ آئی۔

روشن نے سوچا کہ شاید وہ ابھی تک پچھلی شام کے تجربے کے تأثر میں گم ہو، لیکن پھر وہ تیسرے روز بھی نہ آئی، چوتھے روز بھی نہ آئی، پانچویں روز بھی نہ آئی اور روشن کو یقین ہو گیا کہ ضرور وہ بھی ڈیزی اور شمیم کی طرح غائب ہو گئی ہے۔ وہ سب اس ریستوران کی سانس گھونٹ دینے والی فضا سے اُکتا کر باہر کی دنیا کی کشادہ، آزاد اور لطیف فضا میں سانس لینے کے لئے بھاگ کھڑی ہوئی ہیں، —— اور اب اس سانس گھونٹ دینے والی فضا میں وہ اکیلا رہ گیا، ویسے اس کے ساتھ ایڈنا بھی یہاں موجود ہے، لیکن یہ ایڈنا کس قدر خاموش لڑکی ہے، خاموش اور بے رنگ۔ نہ جانے وہ اب تک کیسے اس ریستوران میں گزر کرتی رہی ہے —— شاید یہ ڈیزی اور شمیم اور ماری تینوں سے بہت مختلف ہے، نہ معلوم اس پٹے ہوئے آدمی نے ایڈنا کو اپنے پاس بلا کر کیوں نہ بٹھایا، لیکن ایڈنا اس کے خیالات سے بے خبر، ایک کونے میں آرام دہ کرسی پر ٹانگیں پھیلائے لیٹی ہوئی تھی۔ شاید وہ ریستوران کے گاہکوں کا انتظار کر رہی تھی، وہ گاہک جو کبھی نہیں آئیں گے، روشن کو یقین تھا کہ ایڈنا کا یہ انتظار رائیگاں جائے گا۔ اس نے ایڈنا کو کاؤنٹر کے قریب بلایا۔ ایڈنا آن کر خاموشی کے ساتھ کاؤنٹر سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ خاموش ضرور تھی لیکن روشن کو یقین تھا کہ وہ اس کی بات سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہے اور روشن کو ایڈنا کے اس انداز پر کچھ جھنجھلاہٹ محسوس ہونے لگی۔

اس نے سنجیدہ طریقے پر کہا "ایڈنا تم ہنستی کیوں نہیں ہو؟" ایک لمحے کے لئے ایڈنا کی آنکھیں حیرت سے جھپک گئیں، پھر وہ پھیکے انداز میں مسکرانے لگی —— "اونہہ —— ہنستی تو ہوں!" لیکن روشن نے اس کے جواب کو نظر انداز کر دیا۔ اس نے کہا "نہیں بالکل نہیں —— تم ہنستی نہیں ہو! —— تم خاموش بیٹھی رہتی ہو! —— تمہاری آنکھوں میں پھیکا پن بسا رہتا ہے! —— تم کو ڈانس کرنا کیوں نہیں آتا! —— تم گاہکوں کو دیکھ کر مسکراتی کیوں نہیں؟ ——" اور نہ جانے کیا کیا ایڈنا پہلے تو اپنے مخصوص انداز میں پھیکے پن کے ساتھ مسکراتی رہی لیکن پھر چند لمحوں بعد اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور اس کی جگہ ایک ہلکی ہلکی اُداسی نے لے لی لیکن وہ پھر بھی بالکل خاموش کھڑی رہی اور شاید اسی وجہ سے روشن کی اُکتاہٹ میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ اس نے کہا:

"تم شاید بہت ہی عجیب لڑکی ہو —— اگر تم کو یہی اُداسی اس ریستوران کی فضا میں پھیلانی تھی تو تم یہاں کیوں آئیں؟ —— تم کو چاہیئے تھا کہ بچوں کے کسی سکول میں حمدیں سکھانے پر نوکر ہو جاتیں، یا پھر کسی راہب خانے میں اپنی جگہ تلاش کرتیں —— !"

روشن کے لہجے میں ایک طرح کی خفگی اور جھنجھلاہٹ تھی اور اس سے زیادہ ایک طرح کی بے بسی کا انداز بھی تھا۔ وہ اپنے جذبات کی رو میں نہ جانے کیا کیا کہتا رہا، لیکن ایڈنا ویسے ہی کاؤنٹر کے پاس خاموش کھڑی رہی اس کی خاموشی اپنی جگہ قائم رہی اور اس کی آنکھوں کی اداسی میں کچھ اور اضافہ ہوتا چلا گیا۔

روشن جب بولتے بولتے تھک گیا تو خاموش ہو گیا۔ چند لمحوں تک ایڈنا بھی خاموش رہی، پھر اس نے دبے دبے لہجے میں کہا: "میں نے اس روز اس پٹے ہوئے آدمی کی تمام باتیں سنی تھیں —— شاید تم کو اپنے کیشن کی بہت فکر ہے اور اگر یہ بات ہے تو میں یہاں سے چلی جاتی ہوں، ممکن ہے کہ میرے چلے جانے کے بعد تم کو کوئی اور ڈیزی، یا کوئی اور ماری یا کوئی اور شمیم مل جائے! —— لیکن نہ جانے وہ تینوں تم کو یوں چھوڑ کر کیوں چل دیں، ایسے پُراسرار طریقے پر غائب کیوں ہو گئیں؟"

ایڈنا کے لہجے کا طنز روشن کے دماغ میں کچوکے دے رہا تھا۔ اب سے پہلے کبھی بھی اس کے لہجے میں نفرت اور طنز نہ پیدا ہوئے تھے

جب وہ اپنی بات ختم کر چکی تو کاؤنٹر کے پاس سے ہٹ گئی، پھر اس نے ہلکے ہلکے قدموں کے ساتھ ریستوران کے ہال کی لمبائی طے کی۔ دروازے کے قریب رکھی ہوئی میز پر سے اس نے اپنا بٹوہ اٹھایا، اور پھر گھومنے والے دروازے کو دھکیلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ باہر جاتے جاتے اس کا پاؤں ایک مرتبہ جوتیاں صاف کرنے کی چٹائی میں اٹکا، لیکن اس نے اپنے کو گرتے سے سنبھال لیا، اور پھر باہر چلی گئی۔

——— اور پھر وہ گھومنے والا دروازہ ایک نیم دائرہ بنا کر اپنے محور پر ساکت ہو گیا۔ روشن نے اپنے آپ سے کہا: "اب تو ایڈنا بھی چلی گئی!" اور بے ساختہ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی اٹھ کر باہر چلا جائے۔ ریستوران کی دم گھونٹ دینے والی فضا سے باہر نکل جائے اور کم از کم ایڈنا کو واپس بلا لائے، لیکن پھر غیر شعوری طور پر وہ خود کو بے حد شکست اور تھکا ہوا محسوس کرتا رہا، اور وہیں کاؤنٹر کے پیچھے خاموش اور جامد بیٹھا رہا ——— اور پھر اپنے آپ کو اس دلدل کے سپرد کر دینے کے لئے تیار ہو گیا۔

دسمبر ۵۲ء

میں اسیرِ دشتِ فریب ہوں، تو رہینِ رشتۂ دیر ہے
ترے در کے سب نئے سلسلے ہیں، مرے در کے سب نئے لمحے ہیں

میں سفر سے لوٹ کے آؤں گا، تو ہر راز تجھ کو بتاؤں گا
کہ قیام مثلِ دوام ہے، یہ سفر کے سارے نئے لمحے ہیں

عرش

عکسِ تحریر: عرش صدیقی

# سَدا کا روگ

بانو قدسیہ

بابا خیرو بہت کم اس قصباتی بازار کی طرف آتا تھا لیکن جب کبھی وہ آتا دوکانوں کی رونق بڑھ جاتی۔ اونگھتے دکاندار اونچی آوازوں میں ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگتے۔ سیدو قصائی بغدے سے قیمہ بناتے ہوئے نعرہ لگاتا "اوئے بابا خیرو چلا آرہا ہے.... بابا خیرو..... دینے پہلوان، بابا خیرو ہی تو ہے.... دیکھتا نہیں"

دینا بساطی پنساری بھی تھا اور آڑھت کی دوکان بھی کرتا تھا۔ بابا خیرو کو نکڑ کی گلی میں سے ابھرتا دیکھتا تو اس کی باچھیں کھل جاتیں۔ چھوٹی سی دُکان کی متفرق اشیا پر جاگم جاگ سی نظر ڈالتا ہوا لکڑی کی سیڑھیوں پر آکر کھڑا ہو جاتا اور باآواز بلند کہتا "شیخ جی شکنجہ پھر کس لینا، ادھر دیکھیں کون چلا آرہا ہے"

لیکن شیخ صاحب کبھی نظر اٹھا کر خیرو بابا کی طرف نہ دیکھتے۔ وہ کاغذ کو لئی سے جوڑے جاتے، اَبری کو انگلیوں سے ہموار کرتے اور رشید کو متنبہ کرتے ہوئے کہتے "بیٹا رشید دیکھ گتّا ٹھیک کاٹنا، تُو ایسی کاٹ ڈالتا ہے کہ مجھے پھر کتر بیونت کرنی پڑتی ہے اور انچ انچ گتّا ضائع ہو جاتا ہے پیسہ دو پیسے کی آس بھی ٹوٹ جاتی ہے"

لیکن جلد ساز کا بچہ رشید قینچی اور گتے کو زانو پر رکھ کر ٹاٹ ایک طرف کرتا اور دینے کی دکان پر نظریں جما لیتا۔ دینے کی کتنی ساکھ تھی۔ سبھی اسے جاگ جاگ کر ادھار دیتے تھے۔ شام کو نفع نقصان کا پڑتا لگانے بیٹھتا تو سکّوں کی کھنکھناتی آواز دور تک آتی۔ اور تو اور بابا خیرو بھی ہمیشہ دینے ہی کی دُکان پر آتا۔ جلد ساز کی دُکان پر تو وہ ماسٹر جی آیا کرتے تھے جن کی عینک کی کمانی ٹوٹی ہوتی اور پاؤں میں اکھڑے ہوئے ربڑ والے فلیٹ بوٹ ہوتے۔

دینا کی دکان کے دائیں طرف ملا بخش موچی اپنی صندوقچی نما دکان میں رہتا تھا اور بائیں جانب حلوائی کی دکان تھی۔ بابا خیرو کا نام سنتے ہی مولا بخش آرا اور ستالی چھوڑ کر آگے کو کھسک آتا اور ہنس کر کہتا "دینے تیری ہٹی پر دھن برستا ہے۔ بابا خیرو بھی آئے گا تو تیری چوکھٹ پر ہی آئے گا۔ ہمیں اس بھنڈار میں کون پوچھتا ہے؟"

چھاچھو حلوائی کڑھائی میں ہاتھ ڈالتا، کڑکڑاتے تیل میں پکوڑے چھوڑتا اور چمک کر کہتا "کبھی دو پیسے کے پکوڑے تک ہم سے نہ لئے۔ ہم بابا خیرو کو کیا یاد کریں گے بھلا۔؟"

دینا ہنستا رہتا اور بابا خیرو کا منتظر رہتا۔ بابا خیرو اس قصبے کا سب سے پُراسرار شخص تھا۔ وہ قصبے سے دو میل دور ریل کے پھاٹک کے پاس رہتا تھا۔ قصبے کی آبادی کے لئے وہ ایک معمے سے کسی طرح کم نہ تھا اور ایک آنکھ پر سبز کاغذ کی اندھیری ہوتی میلی کاسنی صدری کی جیبوں میں بہت سے رُقعے اور نسخے جمع رہتے، یوں لگتا جیسے بابا خیرو نے جیبوں میں گیندیں چھپا رکھی ہیں۔ لنگڑاتا ہوا دینے کی دکان تک پہنچتا۔ اپنی

پھولی ہوئی ڈب کو ٹٹولتا اور سبز تہمد کو احتیاط سے سنبھالتا ہوا سیڑھیوں پر ہی بیٹھ جاتا۔ بابا خیرو الف لیلیٰ کی داستان تھی۔ وہ اس بازار میں لنگوٹ بادشاہ بن کر کبھی داخل نہ ہوا بلکہ وہ تو دھیلے پیسے پر جھگڑتا۔ پھر بھی اس کی باتوں میں جادو تھا۔ وہ مٹی کو سونا کرنے کا فن جانتا تھا۔ اس کی پُراسرار شکل، اس کا انداز گفتگو اتنا مختلف تھا کہ دکانداروں کی اس بستی میں ہلچل مچ جاتی۔ یہاں صبح سے شام تک خون پسینہ ایک کرنے والوں کا گروہ پیسے پیسے کے لئے سرگرداں رہتا۔ جب بابا خیرو جیبوں میں نسخے چھپائے دینے کی دکان پر چڑھتا تو ان لوگوں کو اپنی تگ و دو پر پشیمانی ہونے لگتی، اور وہ بھی سوچنے لگتے کہ کاش پیسے بنانے کا کوئی سہل نسخہ ہاتھ آجاتا تو وہ بھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر آرام سے بیٹھے رہتے۔ نہ کوئی فکر رہتا نہ فاقہ۔

دینے کی دکان پر بھیڑ بڑھ جاتی۔ سیدو قصائی بغدا چھری اپنے شاگرد کے سپرد کر کے آبیٹھتا۔ چھری والا اپنا ریڑھا پاس کھسکا لاتا اور مولا بخش نری کے چمڑے کو پرکھنا چھوڑ کر پوچھتا: "کیوں بابا آج پھر نسخہ بنوانے آئے ہو جی؟"

بابا خیرو مولا بخش کی بات کا جواب کبھی نہ دیتا اور کہتا: "دینے مجھے جلدی ہے اگر سودا دینا ہے تو دے ورنہ میں چلا۔"

چاچا چھو حلوائی کی کڑاہی میں سے تازہ پکوڑوں کی خوشبو مہکتی اور سارے بازار کو لپیٹ لیتی۔ وہ ہنس کر پوچھتا: "بابا خیرو میں نے تو سوچا ہے اب یہ دھندا نہ کروں گا۔ اگر تو اپنے ساتھ لگالے تو سنور جائیں۔ قسم اللہ کی پیراں والے کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھاؤں۔ سُنا ہے تُو نے چاندی بنا کر شہر میں بیچی ہے۔ چاندی بنا لیتا ہے بابا خیرو بتا نا؟"

بابا خیرو ایک آنکھ سے گلے سڑے کاغذ کو ٹٹول ٹٹول کر پڑھتا اور پھر دینے سے مخاطب ہوتا: "ہڑتال ورقیہ دو تولے ..... دیکھ پچھلی بار ٹھیک نہ تھی۔ ساری محنت اکارت گئی۔"

دینا زانو پر کہنی جما لیتا اور ہاتھ بھر ترازو دور کرتے ہوئے کہتا: "تو خود دیکھ لے بابا خیرو، تیری اپنی دکان ہے۔ تجھ سے فرق کی بات کبھی کی ہے؟"

مولا بخش کے جی میں ہڑتال ورقیہ کا نام سن کر کھد بد ہونے لگتی۔ وہ بابا کی بے نیازی کو بھول کر پوچھتا: "کیوں بابا خیرو کیا کبھی کچھ بنا بھی ہے کہ یونہی ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرتا ہے؟" بابا خیرو لمحے بھر کو ترازو سے نظریں اُٹھا کر مولا بخش کو گھورتا پھر کہتا۔ "اور تیری طرح سارا دن ادھوڑی کے جوتے نہیں سیتا رہتا۔ باریک کام کرتا ہوں باریک کام۔ تیری جگہ میں ہوتا تو پھاوڑہ بگا کر کسی دن جوتی کی جگہ اپنی کھوپڑی ہی چوڑی کر لیتا۔"

مولا بخش پر ان باتوں کا کبھی کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ اپنے ہاتھی دانت جیسے دو لمبے تیشے نچلے لب پر جما کر ہولے ہولے ہنسنے لگتا پھر ریڑھے والا نذیرا اپنی چلم بابا کو پیش کرتے ہوئے کہتا: "لے بابا کش لگا کش۔ حقے کے دو مزے ہیں نشے کا نشہ، باجے کا باجہ۔ جلترنگ بجتا ہے میرے حقے میں۔"

دینا بڑھ کر گڑگڑی پکڑ لیتا اور بابا خیرو کو پیش کرتے ہوئے بول اٹھتا۔ "بابا تو پورا چلم چٹ ہے۔ ایک منٹ میں چلم گل بن جاتی ہے۔ ساری کی ساری۔"

بابا منہال منہ سے لگاتا تو دم بھر کو نسخہ بھول کر باتیں کرنے لگتا۔ اس کی باتوں میں بڑی ترنگ آجاتی۔ وہ کہتا: "جب جان تھی تو حقہ پیتا تھا اب تو دل بہلا لیا کرتا ہوں۔ نہ کبھی سلفے کا دم لگایا نہ کبھی چرس پی۔ خالی خولی دھوئیں میں کیا دھرا ہے۔ لے بھائی دینے جلدی سے دو تولے چاندی کے تو تول دے مجھے دیر ہوتی ہے۔"

اب دینا لاڈ بگھار کر کہتا۔ "جا پھر بابا کچھ نہیں دوں گا۔ تجھے کھڑے گاؤں سے آنا ہے تو بھی دو گھڑی بیٹھ۔ باتیں کر پھر چلے جانا۔ سچ مچ تو نے چاندی بنا کر بیچی تھی نا، سُنا ہے گورنمنٹ تیرے پیچھے لگی رہتی ہے؟"

بابا منہ سے منہال نکال کر سُرخ رنگی داڑھی میں انگلیاں پھیرتا اور کہتا: "چاندی۔ ارے چاندی بنانا کیا مشکل ہے یہاں تو چکر ہی اور چل رہا ہے۔ دیکھو جو خدا کو منظور ہوا تو ایک دن تم سب میں موتی بانٹنے آؤں گا۔"

کلفی بیچنے والا لڑکا یک لخت بول اٹھتا: "اور مجھے نہ بھول جانا اس دن بابا خیرو۔ ہم بھی تیری رعایا ہیں"!

پھر دینا دبی زبان میں طنز کرتا: "بیچارے شیخ کو بھی یاد رکھنا۔ بیچارہ گتّا کاغذ باندھتا باندھتا خود کاغذ بن گیا ہے۔۔۔!"

سب دکاندار ہولے ہولے ہنسنے لگتے۔

لیکن رشید کی ناک پر پسینہ آجاتا، وہ سوچتا۔ ابا دینے کی دکان پر کیوں نہیں چلا جاتا۔ گھڑی دو گھڑی اگر گپ بازی ہو بھی گئی ہو تو کونسی قیامت آجائے گی۔ جب کبھی خیرو آتا وہ ٹاٹ کا پٹ سرکا کر اُسے دیکھتا رہتا اور وہ تمام باتیں بھی سُنتا جو دینے کی دکان پر ہوتیں۔ اس کا جی چاہتا کہ گتّا قینچی پھینک کر دینے کی دکان پر چڑھ جائے اور بابا خیرو کے پاؤں پکڑ لے لیکن ساتھ بیٹھا ہوا باپ بالکل ویسا پھاٹک بن کر مانع ہو جاتا جو بابا خیرو کی جھونپڑی سے کچھ ہی فاصلے پر پٹڑیوں کے ادھر کھڑا تھا۔

بابا خیرو کو رشید نے پہلی بار اسی پھاٹک کے قریب دیکھا تھا۔ رشید ان دنوں گلی سے نکل کر بڑی مسجد میں پڑھنے جاتا تھا۔ بستہ بغل میں داب کر تختی جھلاتا وہ اور اس کا ساتھی فقیرا کبھی کبھی ریل کا نظارہ کرنے مسجد ہی سے غائب ہو جاتے۔ میل دو میل پیدل چلنے کے بعد جب انہیں ریل کا پھاٹک نظر آتا تو وہ دونوں بھاگنے لگتے۔ شہر کو جانے والی گاڑی کے ساتھ لٹکی ہوئی خلقت کھڑکیوں میں سے جھانکتے ہوئے چہرے گارڈ کا جنگلے دار ڈبہ ان کے لئے کتنی پراسرار چیزیں تھیں۔ سیٹی بجاتا بھاپ چھوڑتا انجن جب دُور افق میں غائب ہو جاتا تو وہ دونوں انجن بن کر دیر تک پٹڑیوں پہ کھیلتے رہتے لیکن انہیں روز روز گاڑی دیکھنا نصیب نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ قصبے سے پٹڑی خاصی دور تھی اور گھر پہنچنے تک اندھیرا ہو جاتا تھا۔ جس روز بھی رشید گاڑی دیکھ کر لوٹتا شیخ جی کے ہتھے پر بُری چڑھ جاتا۔ وہ شیشے کی موٹی عینک ناک پر پھنسائے قہر بھری نظروں سے اُسے گھورتے اور پھر انگوٹھے اور شہادت کی انگلی میں کان پکڑ کر کہتے۔ "گدھے: میں اپنی گاڑھے کی کمائی تجھ پر صرف کر رہا ہوں اور تجھے گھومنے پھرنے کا چسکا پڑ گیا ہے۔ جلد ساز کی اولاد ہے بنئیے دینے کی نسل نہیں کہ تجوری میں سے توڑے نکال نکال کر ضائع کرتا رہوں گا۔" لیکن ایسی جھڑکیوں کا رشید پر کچھ بھی اثر نہ ہوتا۔ اس کی نظروں میں تو انجن کے گھومتے پہیے دور سے کوکتی ہوئی سیٹی اور ریل کا پھاٹک گھومتا رہتا باپ کی جھڑکیاں گاڑی کی کھٹا کھٹ میں کہیں کھو جاتیں اور رشید گاڑی پر چڑھ کر شہر پہنچ جاتا جہاں اونچی اونچی عمارتیں، سینما گھر اور لمبی لمبی کاریں تھیں!

کبھی کبھی جب فقیرا اور رشید لائن پر پہنچتے اور بڑی دیر تک ریل گاڑی نہ آتی تو وہ دونوں پٹڑی سے پتھر اٹھا کر دور دور پھینکنے لگتے اور ایسے میں رشید اور فقیرے پر جملیت کا دورہ پڑ جاتا۔ رشید کہتا: "برادر الانتظار شدید الموت!" فقیرا ہنستا اور کہتا: "دریں چہ شک؟ دریں چہ شک!"

تھوڑی دیر بعد پھر رشید کہہ اٹھتا: "بھائی الانتظار شدید الموت!"

اب فقیرے کو غصہ آجاتا اور وہ کہتا: "کوئی اور محاورہ نہیں آتا تجھے ۔۔۔ لاتقنطو ۔۔۔ لاتقنطو!"

رشید بھی بپھر جاتا اور جھلا کر پوچھتا: "اچھا تجھے کوئی اور محاورہ آتا ہے؟"

"ہاں ہاں ہاں" فقیرا الائین پتھر سے بجاتا ہوا کہتا اور پھر بڑی سوچ بچار کے بعد بات کرتا "اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ!"

اس محاورے کو سُن کر رشید ہمیشہ گہری سوچ میں پڑ جاتا اور چونکہ فقیرا اس کا شاگرد تھا اس لئے وہ اسی سے پوچھتا: "فقیرے یار میاں ٹھیلتے کے کیا معنی ہیں؟"

فقیرے کو دنیا جہاں کے علموں سے واقفیت تھی۔ نیلی چڑیا کے انڈے چرانے کا طریقہ وہ جانتا تھا بخارات سے انجن کیوں کر چلتے ہیں، اور کیسے چلتے ہیں؟ ان کے متعلق اس کی معلومات بڑی وسیع تھیں۔ مسجد کے مولوی صاحب کون سا خضاب لگاتے ہیں اور خضاب بنانے کی کون کونسی ترکیبیں ہو سکتی ہیں۔ ان کے بارے میں بھی لمبی چوڑی تقریر کر سکتا تھا لیکن جب رشید اس سے محاوروں کے معنی پوچھتا تو وہ گڑبڑا جاتا اور کہتا ٹھیلے

پر جانا اور کیا؟"

"یعنی یہاں کیا معنی ہوئے؟"

فقیرا بدحواس سا ہو جاتا اور جلدی سے بیان کرتا "جب ٹھیلے پر سوار ہو تو اُونگھ آجاتی ہے اور آدمی گر جاتا ہے یعنی اونگھنے کو ٹھیلا گرنے کا بہانہ ہو جاتا ہے۔"

"اچھا!" رشید معنوں پر غور کرتا۔

فقیرا موضوع کو پتھر کے ساتھ دور پھینک کر کہتا "الانتظار شدید الموت۔"

اب رشید کو موقع ملتا اور وہ شیخی بگھارتا ہوا چلاتا "لاتقنطو..... لاتقنطو...."

اور بار بار ایسا ہوتا کہ دور سے ریل گاڑی کے پہیئے لاتقنطو کا ورد کرتے فضا میں جھنجھناہٹ سی پیدا کرتے سنائی دیتے۔ ریل کا پھاٹک بند ہو جاتا۔ رشید اور فقیرا بستے اور تختیاں سنبھال کر گاڑی کے انتظار میں بُت بن کر کھڑے ہو جاتے لیکن ایک دن گاڑی بہت لیٹ ہو گئی تھی۔ فقیرا گھر سے ایک پیسہ چرا لایا تھا اور انہوں نے یہ پیسہ لائن پر دس جگہ جا کر اٹھا لیا تھا انہیں اس دن گاڑی کا کس قدر انتظار تھا۔ گاڑی آتی، پیسہ پچکتا تو پھر کہیں ان کا تجربہ صحیح نکلتا، وہ چلتے چلتے پھاٹک کے بہت قریب آگئے۔ شام کے دھندلکے میں پھاٹک کے چوکیدار کی گڑگڑی کے پھول چمک رہے تھے اور دور سٹیشن کی بتیوں کی روشنی مدہم سا ہیولا بنی فضا کو منور کر رہی تھی۔

اس دھندلکے میں سٹیشن کی طرف سے ایک آدمی عین پٹڑی کے درمیان آتا دکھائی دیا۔ یہ آدمی دائیں پاؤں کو دبا کر لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا۔ اس کی تہمد ہوا میں اُڑ رہی تھی۔ فقیرا اور رشید خواہ مخواہ گھبرا کر ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ گئے۔ بابا خیرو عین پٹڑی کے وسط میں ابھرتا آیا اس کی مہندی رنگی داڑھی سیاہ نظر آرہی تھی اور وہ اپنے آپ سے باتیں کئے جا رہا تھا۔ جب بابا ان سے کچھ فاصلے پر پہنچ گیا تو فقیرا نے رشید کو کہنی ماری اور پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔ بابا خیرو پھاٹک سے نکلا اور پکی سڑک پر ہو لیا۔ فقیرا اور رشید جونہی پھاٹک کے دوسری طرف پہنچے، چوکیدار نے پھاٹک بند کر دیا۔ دور فضا میں لاتقنطو پکارتی ہوئی گاڑی کی جھنجھناہٹ بلند ہوئی لیکن آج ان دونوں کے سامنے ایک نئی کہانی تھی۔ ایک گاڑی سے بھی پُراسرار شخصیت لنگڑاتی چلی جا رہی تھی۔ انہیں تو یہ بھی بھول گیا تھا کہ لائن پر فقیرے کا اکلوتا پیسہ انجن کے انتظار میں ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

بابا خیرو نے اپنی کوٹھری کا پٹ بند کر لیا تو رشید اور فقیرے نے درز میں سے جھانکنا شروع کیا۔ اندر اندھیرا تھا اور بابا خیرو بدروح کی طرح اِدھر اُدھر منڈلا رہا تھا پھر طاقچے پر مٹی کا دیا جلا۔ بابا خیرو نے چٹائی پر بیٹھ کر اپنی جیبوں کو ٹٹولنا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ چٹائی پر ننھی ننھی پڑیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ پھر بابا خیرو نے کہیں سے ایک پرانا ترازو نکالا اور ایک ایک پڑیا تولنے لگا۔ انجن کی آواز اب بہت بلند ہو گئی تھی اور اس کی سیٹی چلا چلا کر انہیں پکار رہی تھی وہ دونوں لائن کی طرف بھاگے چمکتے ہوئے جگنوؤں کی قطار بہت دور نکل چکی تھی۔ فضا میں غبار تحلیل ہو چکا تھا لیکن چمکتی لائن پر پھیلا ہوا پیسہ پڑا تھا۔ ان دونوں کو بابا خیرو بھول گیا اور وہ خوشی سے اچھلنے لگے۔

دوسرے دن وہ دونوں نہ جا سکے لیکن رشید کے دل میں ہلچل سی مچی تھی۔ رہ رہ کر اس کے ذہن میں بابا خیرو کی تصویر اُبھرتی رہی۔ وہ ساری رات بابا خیرو کے متعلق سوچتا رہا۔ باوجودیکہ دونوں کان ابا کی توبیخ کے باعث درد کرتے تھے۔ لیکن بابا خیرو کا پُراسرار وجود انکی طرف توجہ بھی نہ کرنے دیتا تھا۔ رات بھر وہ عجیب عجیب خواب دیکھتا رہا۔ جیسے مدہم دیا جلا کر وہ غاروں میں پھرتا رہا ہو اور کوئی بڈھا لاٹھی اٹھائے اس کے تعاقب میں بھاگ رہا ہو۔ اس خواب نے کئی صورتیں اختیار کیں لیکن اس خوف کا تانا بانا قائم رہا جو کہ اس کو گھیرے ہوئے تھے۔

مسجد میں سورۃ مزمل کو رٹتے رٹتے وہ رک گیا اور فقیرے سے پوچھنے لگا: "یار وہ کون آدمی تھا؟"

"کون سا آدمی؟" مولوی جی کی نظر بچا کر فقیرے نے جواب دیا

"وہی کل شام والا۔"

"وہ تو بابا خیرو ہے۔ ہماری دکان پر آتا ہے۔"

مولوی صاحب غیر متوجہ دیکھ کر گرجے: "ارے خنزیرو! گھر سے یہاں باتیں کرنے آتے ہو؟ ابھی مُرغا بنا دوں گا تو سب باتیں اڑنچھو ہو جائیں گی۔ پتہ نہیں انہیں ایسی کون سی ضروری باتیں کرنا ہوتی ہیں۔ کیوں بے بٹیئے کی اولاد، کیا بہکا رہا تھا اس ٹٹ پونجیئے کو۔۔۔"

"کچھ نہیں،" فقیرا منمنایا۔

"اب جو آواز آئی تو الٹا لٹکا دوں گا،" مولوی صاحب گرجے۔

رشید نے پھر سورۃ مزمل کو لمبی لمبی آوازیں لگا کر پڑھنا شروع کیا لیکن اس کی نظروں کے سامنے پھر جھونپڑی اور بابا خیرو آ گئے وہ فقیرے کو کہنی مار کر بولا: "یار تمہاری دکان پر بابا کیا کرنے آتا ہے"

دینے بساطی کے لڑکے فقیرے نے گردن اٹھا کر فخر سے کہا: "سودا لینے آتا ہے اور کیا؟"

"کیا سودا۔۔۔؟"

"بعد میں بتاؤں گا مولوی صاحب دیکھ رہے ہیں۔"

اتنے میں مولوی صاحب نے انہیں للکارا۔ وہ دونوں گدی پر جا ئیں اور مکتب کے تمام بچوں کے سامنے مُرغا بننے کا حکم صادر کر دیا۔ شام کو جب دونوں گھر کی طرف پلٹ رہے تھے تو رشید کے لبوں پر سوالوں کی بوچھاڑ تھی۔ فقط فقیرے کا موڈ خراب تھا۔ اسے رہ رہ کر مولوی صاحب کی جھڑکیوں پر غصہ آ رہا تھا، اس کا بس چلتا تو مولوی صاحب کو چٹکی بھر زہر کھلا دیتا۔

بستہ جھُلاتے ہوئے وہ بولا: "مجھے ایک عمل آتا ہے۔ اگر چالیس دن پڑھیں تو پھر جس پر پڑھ کر پھونک ماریں بس وہ بھسم ہو جاتا ہے۔ اس کی راکھ تک نہیں ملتی۔"

اگر کبھی پہلے دن ہوتے تو رشید کا تخیل پھڑک اٹھتا لیکن اس دن تو اس پر بابا خیرو سوار تھا۔ اس نے سُنی اَن سُنی کر کے کہا: "بابا خیرو تمہاری دکان پر کب آتا ہے؟"

"کبھی کبھی آتا ہے۔ مولوی صاحب کی کیا بساط! بڑے بڑے اس عمل کے سامنے ٹھہر نہیں سکتے بس پڑھنے کی دیر ہے۔ جتنی دیر یہ عمل کریں نا تو بس ایک سبز چادر باندھ کر کسی کھجور کے پیڑ تلے چلّہ کاٹنا پڑتا ہے۔"

"کیوں آتا ہے بابا خیرو؟"

"نسخہ بنوانے اور کیا؟"

"چاچا دینا علاج بھی کرتا ہے کیا؟" رشید نے پوچھا۔

"علاج؟ کیوں علاج کیا؟"

اب رشید نے خفیف ہو کر کہا: "خود ہی تو کہہ رہا تھا کہ بابا خیرو نسخہ بنوانے آتا ہے۔"

فقیرا دیر تک ہنستا رہا۔ مولوی صاحب کی بخشی ہوئی بے عزتی کا درد نا دھل گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ ابھی اس سے بھی گھٹیا اور ذلیل

لوگ دنیا میں زندہ ہیں اس لئے جب ہنس ہنس کر تسلی ہو گئی تو بولا۔" ارے گدھے وہ بیمار تھوڑا ہے ؛ وہ تو دوسری طرح کے نسخے بنوانے آتا ہے، جادو کے نسخے.... گنڈے تعویذ کی چیزیں لینے آتا ہے بابا خیرو۔"

"ہیں !"

"اور کیا۔ بابا خیرو تو جادوگر ہے.... بڑے بڑے جن اس کے تابع ہیں۔ چاہے تو راتوں رات مولوی صاحب کی چارپائی اٹھوا کر قبرستان میں پہنچا دے، چاہے تو سارے قصبے میں لال آندھی آجائے۔"

"اچھا!"

فقیرا اور بھی پھولنے لگا :" اور کیا! میرا چاچا باتیں کیا کرتا ہے۔ چاچا کہتا ہے ایک دن بابا خیرو نے مٹی کو ہاتھ لگایا تو وہ چاندی بن گئی اور پھر وہ یہ چاندی لے کر بیچنے شہر چلا گیا!"

رشید نے پریشان ہو کر پوچھا :" تو پھر بابا اس جھونپڑی میں کیوں رہتا ہے۔ اپنی کوٹھی کیوں نہیں بنوا لیتا تحصیلدار صاحب کی طرح...."

فقیرا نے قہقہہ لگایا اور ہنس کر بولا :" مولوی صاحب ٹھیک کہتے ہیں، ہے تو ٹٹ پونجیا۔ اے یہ جادوگر غنی ہوتے ہیں غنی.... انہیں شرک ہوتا ہے اپنے کام کا.... چاچا کہتا ہے اگر یہ مایا میں پھنس جائیں تو پھر قدرت جاتی رہتی ہے!"

"موہ مایا — ؟ وہ کیا ؟"

فقیرے نے دینے کی بات دہرا کر گویا اپنی ذہانت کا ثبوت دیا تھا۔ اب اکڑ کر کہنے لگا :" موہ مایا ایک چیز ہوتی ہے۔ ابھی تو بہت چھوٹا ہے۔ تجھے ان چیزوں کی سمجھ نہیں۔ رفتہ رفتہ آپ ہی سمجھ آجائے گی۔"

فقیرے کی بات سن کر اپنے قد اور عمر کو دل میں کوستا چلنے لگا۔ لیکن بابا خیرو کو دوبارہ دیکھنے کی تمنا اور بھی جوان ہو گئی۔

فقیرا تو مولوی صاحب کی مار سے نجات پا گیا لیکن جلد سازی کا رشید ابھی تک پھنسا ہوا تھا۔ پورے سات دن جب فقیرا مسجد میں نہ آیا اور مولوی صاحب کی لعنت پھٹکار اکیلے رشید کو برداشت کرنا پڑی تو اس کا جی ڈوب گیا۔ وہ سارا دن بیٹھا یہی سوچتا رہتا کہ کاش وہ عمل ہی فقیرے سے سیکھ لیتا تاکہ مولوی صاحب کو راکھ بنانے میں آسانی ہوتی لیکن فقیرا تو مسجد چھوڑ کر دینے کی دکان پر بیٹھنے لگا تھا۔ شام کو شیخ جی نے کبھی رشید کو باہر جانے دیا تھا اور دن بھر رشید کو مکتب سے چھٹی نہ ہوتی تھی کہ فقیرے سے ملاقات کرتا۔ یوں تو مکتب کے تمام بچے فقیرے کو چھیڑتے رہتے اور اونچے اونچے گایا کرتے تھے "ارے فقیرا تیری فقیری دو راہے" لیکن فقیرا ان باتوں سے کبھی نہ چڑتا تھا اسے تو مولوی صاحب کی مار سے نفرت تھی کس طرح وہ دونوں کانوں سے تھا کر الف کر دیتے تھے۔ کس طرح گدی میں تڑاتڑ دھولیں پڑتی ہیں۔ جس روز فقیرا اپنے باپ کی دکان پر بیٹھا ہے اس سے ایک دن پہلے لے اور رشید کو بے بھاؤ کی پڑی تھیں۔ فقیرا تو گھر آتے ہی بپھر گیا۔ تختی بستہ، قلم دوات سب پھینک دیں اور دینے سے کچھ اس طرح بات کی کہ دینے نے بھی فیصلہ کر لیا کہ مسجد میں چراغوں کے لئے تیل دینا اور جمعرات کو مولوی صاحب کے لئے روٹیوں کا انتظام کرنا بالکل گھاٹے کا سودا ہے۔ فقیرا دکان پر بیٹھے گا۔ ایک ایک دو گیارہ باپ بیٹا مل کر کام کریں گے تو ہزار قسم کے ال بل سے نجات مل جائے گی دینے نے تو اپنے پیسوں کو کھرے کرنے کی سوچی اور فقیرے کو دکان پر گدی نشین بنا کر بٹھا لیا لیکن جب رشید نے شیخ جی سے مکتب کا کچا چٹھا کہہ سنایا تو الٹی آنتیں گلے کو آئیں۔ شیخ جی نے رشید کا کان ہاتھ میں پکڑ لیا، عینک کان پر لٹک آئی، نرخرا بجنے لگا اور وہ بلی ڈاگ کی طرح غرائے "ادے لکے کبوتر! آنہ آنہ کر کے تیرا بڈھا باپ پیسے جوڑتا ہے کہ تجھے ملٹی سکول میں ڈالے گا۔ پڑھائے گا۔ لکھائے گا، لیکن تیرے جی میں آتی ہو گی کہ باپ کہیں مرے تو اس کے ناؤں کو ڈبوئیں.... مولوی صاحب نے مارا تو کیا برا کیا تیری بھلے کی ہی کہتے ہوں گے بیچارے.... تیری ماں

آج زندہ ہوتی تو میں پوچھتا، کہتی تھی کہ میرا بچہ تحصیلدار بنے گا۔ یہاں مکتب سے ہی اٹھنے کی صلاح بن رہی ہے۔ دوبارہ اگر مولوی صاحب کی شکایت کی تو دھنک کر رکھ دوں گا۔۔۔۔ کھانے پینے کا لاڈ ہوتا ہے پہننے اوڑھنے کا لاڈ ہوتا ہے لیکن اولاد کا بگاڑنا کون سا لاڈ ہے۔ بیٹھ جا ابھی اور تختی لکھ۔!

مولوی صاحب کے ساتھ ساتھ باپ کو بھی دل میں کوستا رشید اٹھا اور تختی دھونے بیٹھ گیا۔

فقیرا تو سات دن سے نجات حاصل کر چکا تھا لیکن رشید کو روز روز مرغا بننا پڑتا تھا۔ اس روز وہ ظہر کی نماز کے وقت مسجد سے کھسک گیا۔ سب سے بڑا دھڑکا اسے اس بات کا تھا کہ اگر شیخ جی نے بازار میں دیکھ لیا تو پھر خیر نہیں، لیکن دل میں ٹھان چکا تھا کہ آج تو فقیرے سے وہ عمل پوچھ کر آؤں گا جس سے لوگوں کو بھسم کرنے کی طاقت اپنے میں آجاتی ہے۔ وہ بازار کی نکڑ پر بزاز کی دکان کے پاس بڑی دیر تک چھپا رہا۔ شیخ جی نے جب نماز کے لئے دکان بند کی تو اسی وقت ایک چھوٹی سی کار عین دکان کے سامنے آکر رُک گئی۔ رشید اچھی طرح دیکھ نہ سکا کہ شیخ جی رخصت ہو گئے کہ ابھی کھڑے نئے گاہک سے باتیں کر رہے ہیں۔

تنگ بازار میں چھپتا چھپاتا وہ دینے کی دکان تک پہنچا، کالی کار کی آڑ لے کر اس نے ایک بار باپ کی دکان پر نظر ڈالی۔ دکان کے تختے بند تھے۔ سامنے سیڑھیوں پر رنگین کاغذوں کی کچھ کترنیں پڑی تھیں اور ٹاٹ کا سائبان ہوا میں جھول رہا تھا۔ وہ ایک دکان پر چڑھ گیا سامنے ہاتھ میں ترازو سنبھالے فقیرا بڑی چابکدستی سے کچھ تول رہا تھا اور ننھی لڑکی رو کر لینے کے لئے تقاضا کر رہی تھی۔ جب رشید چوروں کی طرح بدن چرائے اس کے پاس آکر بیٹھ گیا تو وہ لڑکی سے بولا۔" دو پیسے کی چیز لیتی ہے اور اکنی کی چلونی مانگتی ہے۔ جا جاگ جا!"

لڑکی برا سا منہ بنا کر بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی لیکن رشید پر یک لخت فقیرے کا کچھ رعب سا پڑ گیا۔ وہ بڑے مؤدب لہجے میں گویا ہوا! "تم نے مکتب کیوں چھوڑ دیا ہے فقیرے!"

"مکتب! ارے وہاں کیا دھرا تھا! صبح سے شام تک مار مار مرا۔۔۔ یہاں مزے سے بیٹھتا ہوں۔ چار آنے روز چاچا مجھے دیتا ہے۔"

"وہ کاہے کو۔۔؟"

فقیرا مسکرایا اور کہنے لگا۔" دستوری ملتی ہے۔ حق ہوتا ہے مول تول کرنے والے کا!"

رشید کی آنکھوں میں رشک آگیا۔ وہ دانتوں سے ناخن کاٹنے لگا۔ فقیرا اور بھی فخریہ انداز میں بولا! اور کچھ اوپر سے بھی آمدنی ہو جاتی ہے۔ صرف چاچا حساب کا بہت کھرا ہے۔ ہیرا پھیری کرنے کا موقع کم ملتا ہے۔"

ساتھ والی دکان سے چاچا چھوحلوائی نے نعرہ لگایا! "کیوں بیٹا یار بیلی آئے بیٹھے ہیں۔ ان کا منہ میٹھا کرانا ہو تو گرم گرم امرتیاں بھیجوں!"

فقیرے کے ماتھے پر بل پڑ گیا۔ وہ اونچی آواز میں لیکن مؤدب لہجے میں بولا۔" نہیں چاچا گھر کی بات ہے۔ شیخ جی کا رشید ہے جی!"

"اچھا!"

کالی کار والا حلوائی کی دکان پر پہنچا، کچھ مٹھائی خریدنے لگا۔ فقیرے نے اپنی دکان سے ہانک لگائی۔" سرکار کچھ ادھر بھی مہربانی کرنا۔ صبح سے بوہنی نہیں کی، مندا حال ہو رہا ہے!"

کار والے نے مسکرا کر کہا! بھئی فی الحال تو کچھ نہیں چاہیئے۔ ہاں اگر دس روپے کا نوٹ ہو تو عنایت کرو!"

"لیجئے سرکار ابھی لیجئے!" فقیرے نے پیسے گن کر جب کار والے کے حوالے کئے تو ایک آنہ کم تھا۔ فقیرا اپنی تہمد سنبھالتا اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔

"یہ جی میں ابھی اکنی لے کر آیا۔ میرا تو خیال تھا پورے نکلیں گے — لیکن"

"کوئی بات نہیں۔ اکنی کے لئے تردد نہ کریں" کار والے نے ہاتھ ہلاتے ہوئے جواب دیا اور حلوائی کا حساب چکانے لگا۔

"جناب ایسے نہیں ہو سکتا۔ حساب حساب ہوتا۔۔۔"

لیکن فقیرے نے یہ بات اتنی دیر سے اور ایسے مدھم طریق سے کہی کہ کار والا اکنی سے بے نیاز واپس کار میں بھی پہنچ گیا۔ فقیرے نے رشید کو آنکھ ماری اور بولا: "کیوں بے وہ مکتب والوں کا کیا حال ہے!"

اب تک رشید بار بار عمل کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا، لیکن زبان پر بات ہی نہ آتی تھی۔ جب فقیرے نے خود بات چھیڑی تو لجاجت سے کہنے لگا: "مولوی صاحب نے تو ناک میں دم کر دیا ہے اب تو اور بھی سخت ہو گئے ہیں۔ پل میں مار پڑتی ہے"

رشید نے گلّے میں سے ایک اکنی نکالی اور صدری کی اندر والی جیب میں اڑس لی۔

رشید کہنے لگا: "اگر تو مجھے وہ عمل سکھا دے تو میں ایک بار مولوی صاحب سے بدلہ لے لوں۔ کھجور کا درخت میں نے ڈھونڈ لیا ہے"

فقیرے نے تعجب سے پوچھا: "کون سا عمل؟"

"وہی دوسرے کو بھسم کرنے والا اور کون سا!"

"اچھا! بیٹا اس سے بھی اچھے اچھے منتر یہاں آتے ہیں، لیکن یہاں نہیں، چاچا آ رہا ہے۔ تو شام کو وہیں پہنچ جانا میں آ جاؤں گا"

"کہاں — ؟"

فقیرے نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا — "بھئی وہیں لائن پر اور دیکھ ساتھ پانچ پیسے بھی لانا نیاز کے لئے، سب کام بن جائے گا تیرا!"

"پانچ پیسے، کیوں!"

فقیرے نے بڑے رعب سے کہا: "بابا خیر دے سے تجھے تعویز لکھوا دوں گا"

رشید کا منہ کھُلے کا کھُلا رہ گیا۔ وہ تعجب سے بولا: "بابا خیر دے سے؟"

"ہاں بیٹا، اور اب بھاگ جا۔ میرے چاچا نے تجھے دیکھ لیا تو میری خیر نہیں۔ وہ دکان پر یار بیلیوں کا گٹھ جوڑ پسند نہیں کرتا"

رشید کو مکتب چھوڑنے میں کچھ دیر لگی، لیکن اسی دن فقیرے کی بدلی ہوئی حالت دیکھ کر وہ ایک بات کا فیصلہ دل میں کر چکا تھا، یا تو فقیر اللہ بابا خیر دے سے تعویز لا کر دے گا۔ اور وہ مولوی صاحب کی بے جا مار سے بچے گا، اور اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا تو مکتب کو خیر باد کہنا ہی پڑے گا۔

جب وہ بستہ اور تختی لے کر لائنوں تک پہنچا تو جھٹ پٹا سا ہو چلا تھا۔ مولوی صاحب نے اسے جمعرات کی روٹیاں اکٹھی کرنے بھیج دیا تھا اور وہ بد دلی سے دو چار گھر دیکھ کر کھسک آیا تھا۔ دل میں اُسے خوب علم تھا کہ دوسرے دن پھر دھواں دھار گالیوں اور تابڑ توڑ مار کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن اس کے جی میں ایسے پختہ ارادے جنم لے رہے تھے کہ ابا اور مولوی صاحب دونوں کی شخصیتیں مخفی ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔

اس نے ہتھیلی میں پانچ پیسے اتنی زور سے بھینچ رکھے تھے کہ پسینے میں بھیگ گئے۔ یہ پانچ پیسے تھے جو ماسی رحمت نے روٹیوں کے ساتھ مولوی صاحب کو چراغوں میں تیل ڈالنے کے لئے بھیجے تھے۔ جب بھی اسے اپنی چوری کا خیال آ جاتا اس کی ناک کی پھننگ پر ننھے ننھے قطرے اُبھر آتے۔

رشید کو لائن پر بیٹھے بڑی دیر ہو گئی۔ پھاٹک کے چوکیدار نے لائن پار کرنے والی سڑک کے دونوں پھاٹک بند کئے دور سے انجن کی خوش آئند سیٹی ہوا میں لہرائی۔ رشید کے جی میں آئی ایک پیسہ نکال کر لائن کی چمکتی سطح پر رکھ دے لیکن اسے فقیرے کا انتظار تھا۔ اگر ایک پیسہ کم ہو گیا تو بہت

ممکن ہے بابا خیرو تعویز لکھ کر نہ دے۔ جونہی شعلے اڑاتی، دھوئیں چھوڑتی گاڑی اس سے کچھ فاصلے پر سے گذری وہ گزوں پیچھے بھاگ کر کھڑا ہوگیا۔ انجن کے دھماکے اور لرزتی زمین سے نامعلوم سا خوف آرہا تھا۔ ڈبوں کی جلتی ہوئی بتیوں کے عکس روشن تختے بنے اس کے پاس سے گذرے جارہے تھے۔ پھر انجن گاڑی کو اغوا کر کے بہت دور چلا گیا۔ پھاٹک کھل گئے لیکن کریر اور ڈبوں سے چھپا ہوا ملا جیسے سہم کر رہ گیا۔ فقیرا ابھی تک نہ پہنچا تھا، اور پھر سڑک پر ہولیا۔ وہ بابا خیرو کی جھونپڑی تک پہنچ گیا لیکن اندر جانے کی اس میں ہمت نہ تھی ٹوٹے ہوئے دروازے کے ساتھ ہی جابجا کوئلے اور راکھ کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں تھیں۔ رشید نے دروازے کے ساتھ منہ لگایا اور اندر جھانکنے کی کوشش کرتا رہا لیکن تنگ کوٹھری کے اندر روشنی کی ایک بھی کرن نہ پھوٹی بالآخر رشید نے دروازہ دھکیلنا چاہا اور جونہی کواڑ ذرا سے جھولے کسی نے پیچھے سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔ سامنے بابا خیرو کھڑا تھا اس کا چہرہ غصے سے تمتمایا ہوا تھا۔ بھرے ہاتھ کا طمانچہ رشید کے منہ پر جماتے ہوئے بابا خیرو بولا "کیوں بے حرامی۔ سارا شہر چھوڑ کر فقیروں کے گھر میں ڈاکہ ڈالنا تھا، حرامزادے پھر کبھی یہاں دیکھا تو تیزاب ڈال کر بھسم کر دوں گا"

پھر اس کے کان اینٹھ کر کہنے لگا "اس دن بھی میں نے تجھے جھاڑیوں کے پیچھے دیکھا تھا۔ جوتی چور، اٹھائی گیرا کس کا لڑکا ہے تو۔!"
رشید کے تمام منصوبے، سارے ارادے حلق ہی میں خشک ہو گئے۔ ڈر کے مارے تو توف نہ آیا لیکن بابا خیرو تو جادوگر تھا اور کون جانے بستی سے اتنی دور اجاڑ سنسان جگہ میں ابھی پل بھر میں اس کا کلیجہ ہی نکال لیتا۔ رشید نے جلدی سے کان چھڑایا اور سرپٹ بھاگنے لگا۔ دور تک بابا خیرو کی آواز اس کا تعاقب کرتی رہی۔ وہ للکار للکار کر کہہ رہا تھا۔ حرام زادے۔ پھر کبھی ادھر آیا تو ہڈیاں توڑ دوں گا۔۔ میرا پتہ نہیں بابا خیرو ہوں خیرو۔۔۔۔

جب تک قصبے کی بتیاں نظر نہ آئیں وہ بھاگتا ہی چلا گیا۔ باربار مڑ کر دیکھ لیتا کہ کہیں بابا خیرو تعاقب میں چلا تو نہیں آرہا۔ ساری راہ اس کی نظریں فقیرے کو ڈھونڈتی رہیں لیکن سوائے بھاگتی بیریوں کے اور کچھ بھی نظر نہ آیا۔ ڈیوڑھی میں پہنچ کر اسے اپنے پانچ پیسے اور تختی یاد آئی لیکن اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ان چیزوں کو ڈھونڈنے نکلتا چوروں کی طرح وہ گھر میں داخل ہوا۔ شیخ جی گھر میں موجود نہ تھے۔ ہنڈیا چولہے پر دھری اُبل رہی تھی۔ اُس نے چارپائی پر بیٹھ کر کٹورہ بھر ٹھنڈا پانی پیا تو جان میں جان آئی۔

اس کے بعد اس نے پھاٹک کی طرف جانا ہی چھوڑ دیا۔ فقیرے نے کئی بار اُسے ترغیب دلائی لیکن رشید نے ٹال دیا۔
رشید کو مکتب چھوڑنے میں دقت پیش آئی، کیونکہ شیخ جی کے دل میں اپنے اکلوتے رشید کے لئے بڑے بڑے خواب تھے جو پڑھائی کے بغیر پورے ہو ہی نہیں سکتے تھے لیکن رشید نے فقیرے کی خوشحالی دیکھ لی تھی اور وہ بضد تھا کہ وہ بھی دکان پر کام کرے گا۔ بالآخر شیخ جی کو ہتھیار ڈالنا پڑے اور رشید بھی دکان پر جانے لگا۔

جب تک فقیرا کو دکان کی سمجھ بوجھ پیدا ہوئی دینا زیادہ وقت منڈی سے سودا لانے اور کھاتا بہی کی جانچ پڑتال میں وقت گزارنے لگا۔ ترازو کی ڈنڈی اب فقیرے کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ گاہکوں سے مول تول کرتا۔ باقی دکانداروں سے لین دین رکھنا اور دکان کی تمام ذمہ داری اسی کی تھی۔ چاچا چھو حلوائی سے اب فقیرے کے مراسم بہت اچھے ہو گئے تھے اور جونہی دینا منڈی جاتا وہ دودھ جلیبیاں ضرور خرید کر کھاتا۔ فقیرا تھوڑے ہی عرصہ میں گبھرو ہو گیا تھا۔ گالوں کے گڑھے بھر گئے تھے اور ٹھوڑی کے نیچے گوشت کی ننھی سی گہرائی اُبھر آئی تھی۔
شیخ جی ہمیشہ بازار کی جانب پشت کر کے بیٹھتے تھے، انہیں بازار کے شور و شر سے کوئی سروکار نہ تھا۔ آرام سے بیٹھے جلدیں کس کرتے کبھی کبھار کوئی دلچسپ مسودہ ہاتھ لگ جاتا تو اُسے علیحدہ رکھ دیتے اور گھر لا کر دیئے کی روشنی میں پڑھنے لگتے لیکن رشید ہمیشہ دینے کی دکان کا رُخ کر کے بیٹھتا۔ بار بار اس کی نظر سامنے اُٹھ جاتی دینے کی دکان پر جو بھیڑ رہتی تھی، جیسے بھانت بھانت کے گاہک آتے تھے۔ ان کا نظارہ وہ اپنی دکان

سے بیٹھ کر ہی کرلیتا۔ اسے لئی بنانے سے نفرت تھی۔ گتا کاٹنے اور شکنجہ کسنا اُسے بڑے فضول کام نظر آتے کیونکہ صبح سے شام تک اتنی ساری کتابیں سینے، جوڑنے اور جلد بندی کرنے کے بدلے ایک آنہ بھی دستوری نہ ملتی۔ شیخ جی کی دکان پر آتے ہی وہ لوگ تھے جو شکل سے بھک منگے اور فقیر سے نظر آتے تھے۔ کبھی کبھار کیتلی سکول کے ماسٹر آتے لیکن وہ ہمیشہ بل پر کام کرواتے تھے اس لئے اوپر کی آمدنی کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا مولوی صاحب کی قید سے چھوٹ کر رشید کو آزادی نصیب نہ ہوئی اور آزادی سلب ہو جانے سے اتنا رنج نہ تھا جتنا دکھ اُسے اس بات کا تھا کہ اب کماؤ ہونے کے باوجود ایک پائی کا حقدار نہ تھا۔ اس کی ذاتی پونجی صفر تھی۔ نئی واسکٹ اور سرخ جوتی خریدنا تو در کنار وہ تو آج تک دو آنے کی کلفی بھی خرید نہ سکا تھا۔ اس لئے جب ایک لڑکا اپنی کتابیں بندھوانے آیا تو رشید نے اس سے چار آنے زیادہ وصول کرلئے۔

لیکن شیخ جی سے اس بچے نے کہیں جڑ دی۔ دوسرے ہی دن شیخ جی نے رشید سے پوچھا۔ "وہ ہسٹری جغرافیہ کی کتابیں حمید صاحب کا لڑکا بندھوا کرلے گیا تھا؟"

"جی ۔۔!"

"ابری لگائی تھی ۔۔؟"

"جی ۔۔!"

اب شیخ جی اس کے قریب آکھڑے ہوتے اور بولے: "کیوں میاں شکنجے میں جلدیں کس لی تھیں ۔۔؟"

رشید نے گیدڑ بھبکی کے انداز میں چڑ کر کہا: "جی، اور کیا ایسا ہی بے وقوف سمجھ رکھا ہے مجھے!"

شیخ جی نے آنکھیں کھول کر لمحہ بھر کو اسے گھورا اور پھر کہنے لگے: "جی! اور آپ کا کیا خیال ہے لئی دو گھنٹے میں خشک ہو گئی ہوگی؟"

"جلدیں تو خشک ہی لگتی تھیں"

"اور کتنے پیسے لئے تھے اس لڑکے سے؟"

اب رشید کی زبان کو تالا لگ گیا۔

"کیا رقم وصول کی تھی اس سے ۔۔؟"

رشید خاموش رہا تو شیخ جی نے اسے کان سے پکڑ لیا اور بولے: "اس اڈے میں ہیرا پھیری نہیں چلے گی۔ ایک دمڑی کا فرق نکلا تو ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔ میں نے ساری عمر ایک زبان رکھی ہے۔ کبھی گاہک سے جھوٹ نہیں بولا ایک وقت سوکھی کھائی ہے لیکن جھوٹ کی نیو ڈال کر عمارت کھڑی نہیں کی۔ تجھے رہنا ہو تو رہ، جانا ہو تو جا، لیکن میں لین دین کا کھرا ہوں، یہاں بھاؤ تاؤ کی گنجائش نہیں، کان کھول کر سن لے۔ اگر آئندہ ایسی حرکت کی تو کھڑے کھڑے نکال دوں گا۔"

رشید کو پھر کبھی ہیرا پھیری کرنے کی ہمت نہ پڑی لیکن اس کی حسرتیں ان گنت ہو گئیں۔ وہ خالی وقت میں بیٹھ کر ایسی چیزوں کے خواب دیکھنے لگا جو بازار میں کھلے بندوں بکتی تھیں جب کبھی فرصت ہوتی یا فقیرے کو کام نہ ہوتا تو وہ گھڑی بھر کے لئے اس کے پاس بھی جا بیٹھتا۔ فقیرے سے ملنے کے بعد اس کی طبیعت اور بھی پریشان ہو جاتی۔ وہ سوچنے لگتا کیا کوئی ایسا طریقہ نہیں ہو سکتا کہ راتوں رات انسان امیر ہو جائے۔ کسی طرح چھپر پھٹ جائے اور سونے چاندی کی بارش ہونے لگے؛ کہیں سے چھپا ہوا خزانہ چلتے چلتے مل جائے؛ کوئی لکھ پتی اپنا وارث بنا کر مر جائے؟

ان خوابوں کو اور بھی تقویت ملتی، یہ تخیلات اور بھی رنگین ہو جاتے۔ اگر کبھی بازار میں بابا خیرو آ نکلتا۔ وہ بابا خیرو کا سامنا کرنے سے ڈرتا

تھا لیکن اس کی آنکھوں میں چمک آجاتی اور وہ ٹاٹ کا ایک سرا اٹھا کر دینے کی دکان کو بار بار دیکھنے لگتا۔ دینے بنئے کی دکان کی ساری باتیں کان لگا کر سنتا۔ اس کا کتنا جی چاہتا تھا کہ کسی دن ہمت کر کے بابا خیرو سے پوچھ ہی لے "بابا کیا تمہیں سونا بنانے کا نسخہ آتا ہے۔ کیا تم نے چاندی بنا کر دیکھی ہے؟"

شیخ جی کا خیال تھا کہ سلیمہ سے شادی ہو جانے کے بعد رشید بھی فقیرے کی طرح دکان کا ہی ہو کر رہ جائے گا لیکن رشید تو اور بھی اجڑ کر رہ گیا۔ شیخ جی نے اتنی محنت سے اور جانفشانی سے اسے کتابت کا فن سکھایا تھا۔ شیخ سعدی کے اشعار اور حافظ کے اشعار لکھ لکھ کر قطعے لکھنے سکھائے تھے لیکن اب رشید کی لکھائی کا یہ عالم تھا کہ تمام گاہک شکایت کرتے تھے۔ نہ دائرے ٹھیک بیٹھتے، نہ نوک پلک ہی درست ہوتی۔ نقطے بھی چھوٹے بڑے لگتے تھے۔ مسطر گھٹنے پر جمائے قلم کی نال روشنائی سے بھر کر وہ بیٹھا رہتا۔ چوری چوری شیخ جی اس پر نظر ڈالتے لمبی سانس بھرتے اور پھر عینک ناک پر جما کر جلدیں باندھنے لگتے، اب انہیں دینے بساطی کی زندگی پر رشک آنے لگا تھا۔ ان کا فقیرا سیلے بازار میں کس قدر معتبر تھا۔ گاہکوں سے لپک جھپک کر پیش آتا۔ اسے کھرے کھوٹے کی پہچان تھی۔ معاملے کی اہمیت کو پلک جھپکتے ہی پہچان لیتا شیخ جی نے دینے سے مشورہ کیا تو جھٹ بولا: دو بول پڑھوا دو شیخ جی۔ بال بچے کی محبت سب کچھ ٹھیک کر دے گی۔ آپ ہی سدھر جائے گا!"

شیخ جی نے اپنی برادری کی سب سے سگھڑ لڑکی شہر سے لا کر اس کے گھر بسائی۔ سلیمہ بڑی سلیقہ شعار اور نفاست پسند تھی۔ اس نے آتے ہی اپنے کمرے میں نیا کیلنڈر اور موتیوں سے کڑھی ہوئی خوب صورت تصویر دیوار پر لٹکائی۔ اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے میز پوش اور چادریں ہرے نیلے بسنتی پھولوں سے لدی ہوئی تھیں۔ بالوں میں چنبیلی کا تیل لگاتی تھیں۔ دوپٹوں میں ساگو دانے کی ایسی کلف ہوتی جو اچھی سے اچھی کتاب کی جلد بندی کے لئے کبھی رشید نے استعمال نہ کی تھی۔ رشید کی خاموشی اور بد دلی شیخ جی کو سمجھ نہ آتی تھی لیکن سلیمہ ٹوہ میں تھی۔ ایک رات کھانے کے بعد رشید کھری چارپائی پر جب چپ چاپ لیٹ تھا، آنگن میں مٹی کی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ طاقچے میں دھرے ہوئے دیئے کی لو مسلسل کانپ رہی تھی۔ شیخ جی وضو کر کے ساتھ والی مسجد میں عشاء کی نماز پڑھنے گئے تھے۔ جب سلیمہ نے اپنا چنا ہوا دوپٹہ اتارا اور بڑی بے تکلفی سے وہ ان کی طرف جا بیٹھی اور بولی: "کیوں کسی سے نہیں بولنا کیا؟"

رشید نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ رشید کا پاؤں کھجلا کر کہنے لگی "سرِ شام نہ سو جایا کریں صحت کے لئے بڑا خراب ہے"

رشید کو ہنسی آ گئی لیکن وہ بن کر بولا "تنگ نہ کر چھیماں میں سو رہا ہوں"

اب وہ جھپاک سے اٹھی اور کہنے لگی "تو یہ دیا خواہ مخواہ جل رہا ہے، بجھا دوں اسے؟"

"نہیں رہنے دو"

چھیماں طاقچے کے قریب جا کھڑی ہوئی دیئے کی مدھم لو میں اس کی کاجل بھری آنکھیں، بانہوں میں پڑے ہوئے کنگن اور ناک کی ننھی سی کیل چمکنے لگیں۔ بالوں کی لٹ پرے کرتے ہوئے چھیماں بولی: "نہ جی، یہاں کیا سبھی نے جلنے کا ٹھیکہ لیا ہے۔ کم از کم دیا تو آرام کرے"

اس نے منہ سے سیٹی سی بنائی اور بگلے سی سفید گردن بڑھا کر دیا بجھا دیا۔ آنگن میں چاند کی چاندنی ہر طرف پھیل گئی۔ بیری کے پتے سیاہ سفید کے دھبے بن کر فرش پر منعکس ہو گئے۔

"ادھر آ چھیماں"، رشید نے آواز دی۔ چھیماں طاقچے کے قریب ہی کھڑی رہی۔ رشید بولا "اس گھر میں سبھی کیوں جلیں۔ میں کافی نہیں ہوں کیا۔؟"

زیرِ لب چھیماں نے لاحول پڑھی اور جلدی سے بولی "جلیں آپ کے دشمن"

رشید نے لمبی سانس بھری اور بولا: "تمہارے کرم جل گئے جو مجھ سا شوہر ملا۔ کسی اچھی سی جگہ بیاہی جاتیں تو کاہے کا غم ہوتا۔ صبح شام چولہا جھونکنا۔ ڈھنگ کا کوئی کپڑا نہیں ۔۔۔ جب سے آئی ہو، سونے کا زیور درکنار کانچ کی چوڑیاں بھی تمہارے لئے نہیں لاسکا۔ تمہارا کیا خیال ہے، مجھے ان باتوں کا خیال ہی نہیں آتا۔ ؟ تمہارا خیال ہوگا پتہ نہیں کس معشوق کے لئے روتا رہتا ہوں میں !"

چھیماں کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ بڑے انداز سے چارپائی کی طرف لپکی اور فرش پر ہی دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔ رشید نے پہلو بدل کر اس کی طرف دیکھا اور کہنے لگا "چھیماں میں نے تو بڑی کوشش کی تھی۔ کسی طرح ہمارے حالات سنور جائیں لیکن، باجی کے نزدیک تو ہر طرح کا نفع چوری ہے، ڈاکہ ہے، رہزنی ہے ۔۔ یہاں تو جینے کا نام ہی ہیرا پھیری ہے، کوئی کیا کرے ۔ ؟"

چھیماں نے حیرانی سے پوچھا "لیکن چاچا جی تو خود دکانداری کرتے ہیں"

"اس دکان سے تو اتنا بھی نہیں ہوتا کہ رات کو ڈھنگ کا کھانا کھالیں"

"پھر"

رشید نے چڑ کر کہا۔ میں نے ایک بار مشورہ دیا تھا کہ جلد سازی اور کتابت کا کام چھوڑ کر ہم بھی آڑھت کریں لیکن انہیں تو چڑ ہے جس کام میں نفع ہوگا اسی سے انہیں نفرت ہوگی۔ ایک بار میں نے شہر جا کر تجارت کرنے کا مشورہ دیا تو ٹال گئے۔ کہتے ہیں۔ اسی دکان میں خدا برکت دے گا اگر مولا نے چاہا یہیں کچھ سبیل بن جائے گی۔"

"پھر آپ کی کیا صلاح ہے یوں چڑنے سے تو کچھ نہ بنے گا !"

رشید نے ہولے سے آہ بھری اور بولا: "یہی اگر کچھ پونجی ہوتی میں، پنا کچھ کام چلاتا !"

"توبہ توبہ ..... اور چاچا جی کو بیچ منجدھار میں چھوڑ جاتے ۔ ؟"

رشید نے تنک کر پوچھا "تو کیا ہم نے ان کا عمر کا ٹھیکہ لیا ہے ؟"

چھیماں نے نرمی سے اس کے بالوں میں انگلیاں ڈبو کر کہا "نہیں ٹھیکہ تو نہیں لیا لیکن اس عمر میں انہیں دھکا بھی تو نہیں دے سکتے نا۔ کوئی ایسا کام کیوں نہیں کرتے جس کی خبر چاچا جی کو نہ ہو۔ بظاہر تو جلد سازی ہی کرتے رہو لیکن کچھ معقول آمدنی کی صورت بھی بن جائے"

رشید نے دکھی ہو کر جواب دیا۔ بھلئے لوک ! کام تو بہت سے ہیں لیکن نانواں کہاں ہے !"

چھیماں نے نظریں جھکا کر اپنے کنگنوں کی طرف بڑے پیار سے دیکھا اور پھر بولی۔ "یہ کنگن تو خیر میں نہیں دے سکتی میری ماں کی نشانی ہیں لیکن میری دھگدھگی بیچ لیجئے۔ پورا سوا دو تولے کی ہے لیکن ایک شرط ہے"

رشید نے دھگدھگی کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے جلدی سے پوچھا۔ "شرط، وہ کیسی ؟"

چھیماں نے کنگن گھماتے ہوئے کہا: "شرط یہ ہے کہ چاچا جی کو پتہ نہ چلے کہ آپ کوئی کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی دکان پر بڑی محنت کی ہے۔ اپنی اولاد کی طرح یہ پیشہ بھی انہیں بچوں کی طرح عزیز ہے۔ اگر انہیں پتہ چلا کہ آپ دکان سے بے وفائی کر رہے ہیں تو انہیں بڑا رنج ہوگا !"

"اور اگر انہوں نے پوچھا کہ دھن کہاں سے برسنے لگا ہے تو ۔۔ ؟"

"کہہ دیجئے گا کہ دکان سے زیادہ نفع ہونے لگا ہے۔ آج کل وہ دکان پر کم جاتے ہیں انہیں شک نہ گزرے گا !"

پھر آہستہ سے چھیماں نے پوچھا: "کوئی ایسا کام ممکن ہو سکے گا کیا ۔ ؟"

رشید نے ہنس کر اس کی لٹ ماتھے سے پرے کی اور بولا "پچھلے کام تو بہت سے ہیں انشاء اللہ دیکھنا اب کیا بنتا ہے۔ دگدھگی کے لیے گھبرانا نا، نئی بنواؤں گا"

چھیماں کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک ذرا سی دیر کو لہرائی اور پھر وہ بولی "واہ یہ آپ سے اچھی ہے کیا۔ ؟"

اسی وقت شیخ جی کھونٹے سے راہ ٹٹولتے ڈیوڑھی میں پہنچے اور وہیں سے چلائے "کیوں چھیماں آج دیا نہیں جلایا۔ ؟ مجھ بڈھے کی گر کر ہڈی ٹوٹ گئی تو بنوانے کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ ؟"

چھیماں نے لپک کر دوپٹہ اٹھایا اور پھر طاقچے کی طرف بڑھ گئی۔

رشید نے دو سو روپے ریشمی رومال میں کس کر باندھے، پھر انہیں اپنی قمیض کی جیب میں ڈالا۔ پھر واسکٹ کی اوپر والی جیب میں جلدی سے گھسیڑ دیئے۔ ممدو سنار کی ساری چمک دمک اور آن بان اس کی نظروں کے سامنے تھی، اسے ممدو کی دکان پر بیٹھے دو تین گھنٹے لگ گئے تھے۔ بھیڑ کم ہوتی تو وہ عرض مدعا کرتا۔ اس کے سامنے سونے کے کنگن بکے۔ ایک دیہاتی نے اپنی بیوی کے لئے بڑی خوب صورت پازیبیں خریدیں، ایک عورت دیر تک متذبذب بیٹھی سوچتی رہی کہ اپنی بچی کو جگنی بنوا دے یا ہنسلی بہتر رہے گی۔ ممدو کبھی ہنسلی سبز کاغذ پر رکھ کر دکھاتا کبھی جگنی لہرا کر پیش کرتا۔ اتنے خوب صورت اور چمکیلے زیور دیکھ کر رشید پر عجیب کیفیت طاری تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ دھگدھگی بیچ کر ایک جڑاؤ بازو بند اور کانوں کی ہلکی ہلکی بالیوں کا ایک جوڑا خریدے۔ چھیماں کے بھرے بھرے اور سفید بازو اسے یک لخت سونے سونے سے نظر آنے لگے تھے پھر اس کے جی میں آئی کہ اس جھنجھٹ سے یہی بہتر ہے کہ دھگدھگی صاف کروا کر چھیماں کو لوٹا دے اور وہ اُٹھ بھی جاتا اگر ممدو اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر بے تکلفی سے نہ کہتا "کیوں شیخ جی۔ کچھ پیسے درکار ہیں۔ ؟"

"ہاں" چوروں کی طرح رشید نے جواب دیا۔

اس وقت تو مشکل ہے شیخ جی، کاروبار مندا ہے۔ قسم پنجتن پاک کی، سونے کے بیوپار کو ہی آگ لگی ہے۔ رتی تولے کا حساب کرتا کرتا انسان پاگل ہو جاتا ہے اور بچت کوڑی کی نہیں، پہلے اس میں ہزاروں کا لین دین رہتا تھا۔ اب تو سارا حساب ہی بٹا کھاتا بن گیا ہے پھر ممدو ہولے ہولے ہنسنے لگا اور شیشے کی صندوقچی پر رکھے ہوئے زیور واپس سبز، لال اور پیلے کاغذ میں لپیٹنے لگا۔

رشید نے چند لمحے سوچ کر آہستہ سے دھگدھگی نکالی اور اسے ہتھیلی پر رکھ کر بولا "چاچا جی یہ دھگدھگی لایا تھا بیچنے کے لئے"

"توبہ توبہ توبہ..... تمہاری چیز میرے ہاں نہیں بک سکتی بیٹا"

رشید کی ٹانگیں کانپنے لگیں، لیکن اسے یک گونہ سکون بھی ملا کہ چلو خیریت ہوئی میرے ہاتھوں چھیماں کا زیور نہ بکے گا۔

"اچھا..... تو میں چلتا ہوں..."

ممدو نے اس کی قمیض کا کونہ پکڑ کر بٹھا لیا اور آہستہ سے بولا "ارے نہ لسی نہ پانی، بیٹھو بیٹھو... تمہاری ضرورت میری اپنی ضرورت ہے کہو کتنے روپے درکار ہیں ؟"

"جتنے میں یہ زیور بک سکے چاچا"

ممدو نے دھگدھگی لے کر روشنی کی طرف گھمائی، پھر بے پروائی سے صندوقچی پر ڈال کر کہا "بازار کا بھاؤ مندا ہے۔ بیٹا سو ڈیڑھ سو کی چیز ہو گی۔ کہو تو کچھ رقم ادھار دے دوں ؟"

"وہ آپ کی مہربانی ہے"

پھر ممدو نے صندوقچی سے کچھ نوٹ نکالے اور انگلیوں میں تھوک لگا کر جلدی جلدی گننے لگا۔

"ڈھائی سو روپیہ درکار تھا کم از کم۔"

"سر دست تو صرف دو سو ہیں، تمہارا کام چل سکے تو چلا لو۔ اور ــــ یہ تمہاری دھگدھگی رکھ لیتا ہوں رقم ہو گی تو لے جانا... اس کا نمونہ شہری ہے، میں بنا لوں گا، بکری ہو جائے گی میری۔"

"ہاں ہاں.... چاچا آپ رکھیں اسے۔" رقم پکڑتے ہوتے رشید نے کہا۔

رنگین رومال میں دو سو روپے باندھ کر رشید باہر نکلا تو بمشکل تمام بولا "جی اس بات کا ابا سے ذکر نہ کرنا... یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

ممدو کسی فلم کے دلال کی طرح مسکرایا اور سر ہلا کر کہنے لگا "مجھے بچہ سمجھا ہے کیا؟ ــ کام بن جائے تو مہینے کے بعد اپنی چیز لے جانا۔ بعد میں ضامن نہ رہوں گا... ہاں!"

رشید زیور گروی رکھ کر جب دکان سے باہر نکلا تو اس کے ذہن میں کوئی پروگرام نہ تھا۔ اسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ دو سو روپوں سے وہ کیا کاروبار کرے گا اور کیونکر یہ دو سو ہزاروں میں بدل سکیں گے؟ آج تک اس کے پاس کبھی اکٹھے پچاس روپے بھی نہ ہوتے تھے اور وہ خوابوں میں لاکھوں کما چکا تھا۔ کبھی سوچتا آٹا پیسنے کی مشین لگا لوں؟ کبھی جی میں آتا افیون کا بیوپار کروں۔ چوری چھپے کی آمدنی ہو گی، ابا کو کبھی خبر نہ ہو سکے گی اور بیوپار بھی لاکھوں کا ہو گا، پھر سوچنے لگا کہ شہر چل کر کچھ قسمت آزماؤں تو دارے نیارے کیونکر ہوں گے۔ اس نے کچھ بھی نہ سوچا تھا۔

فقیرے کی دکان پر آج خوب رونق تھی۔ رشید نے چوری چوری گزر جانا چاہا لیکن فقیرے نے آواز دے کر کہا: "کیوں میاں! اب تو بڑے آدمی ہو گئے۔ بات بھی نہیں کرتے۔"

رشید نے دینے کی دکان پر دیکھا تو بابا خیرو نظر آیا وہ لکڑی کی سیڑھیوں پر بیٹھا ایک پرزہ پڑھ رہا تھا۔ رشید کے قدم خود بخود فقیرے کی طرف بڑھنے لگے۔ مولا بخش موچی بڑے جوش سے کہہ رہا تھا "کیوں بابا اگر چاندی بن جاتی ہے تو بناتے کیوں نہیں؟"

بابا خیرو نے موٹی سی گالی سے مولا بخش کو نوازتے ہوئے کہا: "تو بیٹھا جوتے سی تجھے چاندی سے کیا! فقیرے، فقیرے۔ ارے بنیئے کی اولاد۔ ارے پھندنے سے پکڑ کر تول.... ڈنڈی مارنے سے باز نہیں آتا نا...."

فقیرے نے ترازو بابا خیرو کی طرف بڑھا دیا اور جلدی سے بولا "بابا تم خود جو کھ لو..... ہمارا پتا اُلٹ جائے اگر رتی کا بھی فرق ہو.."

چاچا چھو حلوائی نے لڈوؤں کے تھال پر ورق سجاتے ہوتے کوئی ہزارویں دفعہ کہا "ہم تو اس مٹھائی کے دھندے سے بھر پائے ہیں ساتھ لگو بابا خیرو، سنا ہے تمہارے پاس بڑے بڑے نسخے ہیں۔ کوئی تعویذ ہیں بھی لکھ دو اور کچھ نہیں تو اللہ اسی تیل گھی کے بیوپار میں برکت دیدے چار آنے لابھ ہی ہو جائے۔"

بابا خیرو نے اپنی پوٹلیاں باندھتے ہوتے دیر تک کچھ زبانی حساب کتاب کیا اور پھر حلوائی سے مخاطب ہوا "چاچو پہلوان یہ پلیے پھیر ہیں۔ سونا چاندی بنتا ہے لیکن لگن چاہیئے لگن۔ چاندی کا ورق بھی تو کسی نے بنایا ہی تھا نا ــ؟ اپنی تو بائیں آنکھ ہی ان تجربوں کی نذر ہو گئی ہے اور پوچھ لو کسی سے کبھی جی میلا نہیں ہوا..."

یہ کہہ کر بابا خیرو اٹھا اس نے اپنے چھوٹے سے تھیلے میں تمام پڑیاں لپیٹیں۔ پیسے چکاتے اور لنگڑاتا ہوا چلنے لگا۔ اس کے اوجھل ہوتے ہی چاچا چھو نے کہا۔ بھید ضرور ہے کوئی۔ بڈھا ہے کاریگر، ورنہ یوں بے کار زندگی کٹنے سے رہی اور آج تک اسے بھیک مانگتے کسی نے دیکھا نہیں۔"

مولا بخش ہنسا اور کہنے لگا: "شیرے نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے خود بابا خیرو کو چاندی بناتے دیکھا ہے۔ بابا خیرو کے گھر میں چاندی کی پوری دیگ رکھی ہے۔"

"دیگ۔۔؟" چلم کا کش ادھورا چھوڑ کر قصائی نے پوچھا

مولا بخش جلدی جلدی بولا۔ "اب تو شیدا بڑے گھر پہنچ گیا ہے ورنہ میں تمہیں سامنے پھروا دیتا۔ یاد نہیں اس کے ٹھسے؟ بازار سارے کو خرید لیتا۔۔ ریشمی لنگی، تلے کی جوتی، ڈب میں ہزاروں گورنمنٹ پیچھے لگ گئی تھی اس کے۔ بابا خیرو تو زندہ بچ گیا شیدا پکڑا گیا۔"

فقیرے نے قمیض میں لگے ہوئے سونے کے بٹنے کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "پر میں نے سنا تھا کہ چاچا شیدے پر چوری کا مقدمہ بنا تھا۔"

مولا بخش نے ہنس کر کہا: "وہ تو گھر والوں نے بات بنائی تھی۔ اسی بابا خیرو کے ساتھ مل کر شہر چاندی سونا بیچنے جاتا تھا۔ گورنمنٹ پیچھے لگ گئی۔ پکڑا گیا اور کیا۔۔؟"

رشید کے پاؤں اپنی دکان کی طرف نہ اٹھے بلکہ وہ تیزی سے بابا خیرو کے تعاقب میں چلنے لگا۔ فقیرے نے دو تین آوازیں بھی دیں لیکن رشید سنی ان سنی کر کے چلتا گیا باوجودیکہ خیرو لنگڑاتا تھا پھر بھی اس کی چال میں بلا کی تیزی تھی۔ آبادی سے بہت دور کھجوروں کا جھنڈ اور اینٹوں کا بھٹہ تھا۔ یہاں پہنچ کر رشید اور بابا خیرو میں صرف چند گز کا فاصلہ رہ گیا۔ رشید کی چال سست پڑ گئی کیونکہ اسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ وہ بابا خیرو سے کہے گا کیا۔۔؟

بالآخر بابا خیرو نے تعاقب کرتے رشید پر ایک نظر ڈالی اور خود ہی بولا۔ "حُب کا تعویذ پورے دس روپے میں لکھ دوں گا لیکن شرط یہ ہے کہ شام سے پہلے پہلے کسی انار کے درخت پر ٹیک لگا دینا اور چالیس دن تک صبح شام پانچ پتنگ ہماری خدمت میں حاضر کرنا ہوں گے۔ جوں جوں پتنگ ہوا میں اڑے گا محبوب پر تعویذ کا اثر ہوگا۔"

رشید نے ممناتے ہوئے کہا: "جی تعویز تو نہیں لکھوانا مجھے۔"

"سمجھا! علاج کی غرض سے آیا ہوگا۔"

اب رشید بابا خیرو کے قریب آگیا اور بہ منت کہنے لگا: "نہیں بابا یہ بات نہیں ہے۔"

بابا خیرو نے رشید کو سر سے پیر تک گھورا پھر لمحہ بھر کچھ سوچ کر ہنس دیا۔ اس کے چہرے تمام بھیانک پن ختم ہو گیا اور رشید نے ہاتھ باندھ کر یکدم کہا: "مجھے اپنے ساتھ لگا لے بابا خیرو۔ بخدا کبھی دم نہ ماروں گا۔"

"پتنگ کا دُم چھلا دیکھا ہے؟"

"جی۔۔!"

بابا خیرو نے سر ہلا کر کہا۔ "پتنگ پھٹتی ہے۔ کانپ ٹوٹتی ہے۔ ڈور کٹتی ہے لیکن دم چھلا ساتھ رہتا ہے۔ ہمارا کام بڑا مشکل ہے بابو لوٹ جا۔"

"میں انشاء اللہ دُم چھلا بن کر ہی رہوں گا۔"

"دیکھ لے سوچ لے۔ پانسہ پلٹنے میں دیر نہیں لگتی۔ کون جانے کل تو ہزاروں میں کھیلے اور میں بھیک مانگتا پھروں۔"

رشید نے بڑی منت بھری آواز میں کہا: "میں ساتھ چھوڑنے والا نہیں۔"

"تو پھر شام کو کچھ نذر نیاز لے کر پہنچ جانا۔ شاگردی کوئی لڑکوں کا کھیل نہیں اور دیکھ پتنگ اور گڈے نہ بھولنا۔ ڈور کو مانجھا میں خود لگا لوں گا۔"

"بہت اچھا جی۔ پیسے چاہیں آپ مجھ سے ابھی لے لیں؟"

"نہیں بھئی شام کو، شام کو۔ ایسی جلدی کیا ہے۔ میرا ڈیرہ پتہ ہے نا۔؟"

رشید نے وثوق سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں لائینوں والے پھاٹک کے پاس ہی نا۔؟"

"بس وہیں..... وہیں...."

اندھیرا ہوا تو کنیاتی ہوئی پتنگ کو بابا خیرو فضا میں سے اتارنے لگا۔ ہلکا سا سیاہ دھبہ اب ہولے ہولے زمین کی طرف بڑھ رہا تھا اور بابا خیرو کہہ رہا تھا۔ "اپنی عمر میں بہت کچھ سیکھا ہے رشید.... بہت کچھ سکھایا رشید۔ لوگوں سے قلعی کا پانی خشک نہیں ہوتا شنگرف کی موم نہیں بنتی ان ہاتھوں نے گندھک آملہ سار کا تیل بنایا ہے۔ وہ کشتے مارے ہیں کہ مردہ چکھ لیتا تو جی اٹھتا.... اب تو ہمت ساتھ نہیں دیتی ورنہ تجھے بتاتا کہ سونا بنانا کیا چیز ہے۔؟"

جھکپ کھاتا کنکوا کچھ فاصلے پر شپ سے گرا۔ رشید نے بھاگ کر دبوچ لیا۔ بابا خیرو گولے پہ ڈور چڑھانے لگا۔ اندھیرا ہر طرف پھیل گیا تھا دور سٹیشن کی بتیاں بیوہ ہی فضا میں مدھم روشنی بکھیر رہی تھیں۔ سڑک کے دونوں جانب پھاٹک بند ہو چکا تھا۔ بابا خیرو اور رشید کوٹھڑی کی طرف چل دیئے۔ دیئے کی ٹمٹماتی روشنی میں بابا خیرو کے چہرے پر ان گنت لکیروں کا جال نظر آنے لگا۔ اس نے پتنگ اور ڈوریں کھڑی جھنگا چارپائی کے نیچے کھسکا دیں اور چٹائی پر بیٹھ کر کچھ پڑیاں اور پوٹلیاں کھولنے لگا۔ "دیکھ یہ پٹھ کنڈا ہے۔ یہ جنگلی شلجم ہیں.... اور یہ ہے چوہے کھنی.... آگ جلالے... اور دیکھ آگ بھی دو قسم کی ہوتی ہے۔ کوئلے کی آنچ کا کشتہ کچھ اور ہوتا ہے اور تھاپی کی تاثیر کچھ اور ہوتی ہے.... ان تھاپیوں کو ہمنے جلا۔ گر آگ تیز ہوئی تو پٹھ کنڈا چوہے کھنی کی تاثیر کر چاٹ جائے گا۔"

رشید آگ جلانے لگا لیکن بار بار اس کی نظر کونے میں پڑی ہوئی دیگ پر جاتی تھی۔ پھر اس دیگ پر سے نظریں ہٹا کر وہ بابا خیرو کو دیکھنے لگتا۔ ساری شام پتنگ بازی میں گنوانے والا بابا خیرو اس وقت عینک چڑھائے بڑے انہماک سے پوٹلیاں کھول کر چیزیں تول رہا تھا۔ اس کا چہرہ بے حد پر جلال نظر آ رہا تھا۔

رشید نے آگ جلائی، کوٹھڑی میں دھواں پھیل گیا۔ جب وہ دروازہ کھول کر پلٹنے لگا تو دیگ کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس بے سرو سامانی میں یہ چمکتی دیگ بڑی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔

"اس دیگ میں کیا تھا بابا خیرو؟"

بابا خیرو نے لمحہ بھر کو دیگ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اس دیگ میں؟ اس دیگ میں چاندی تھی بیٹا، چاندی.... قناعت کرتا تو عمر کو یہ دولت کافی تھی لیکن... خیر... آگ جل گئی؟"

رشید دیگ کو دیکھتا ہی رہ گیا۔

"آگ جل گئی رشید؟"

"جی۔!"

بابا خیرو نے ترازو کو اس جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ایک پلڑے میں سہاگہ ہے دوسرے میں گندھک۔ دونوں کو کھیل کر نلکے چل میں بتاؤں"

جس وقت رشید گھر چلا تو بارش شروع ہو چکی تھی۔ بجلی رہ رہ کر چمکتی تو اسے پانی میں آگے بڑھتے ہوئے اپنے بوٹ نظر آ جاتے۔ ساری راہ اس کے اس کے دل میں سوچ تھی کہ کس طرح وہ دوسرے دن ریشمی تہمد اور پگڑی خریدے گا کیونکہ بابا خیرو کی فرمائش پوری کرنا ضروری تھی اور

بزاز سے شیخ جی کے تعلقات اتنے گہرے تھے کہ بات نکل جانے کا اندیشہ تھا۔

اپنی ڈیوڑھی کا دروازہ اسے ذرا کھلا نظر آیا۔ قریب پہنچا تو اس نے ایک سائے کو دروازے میں کھڑے پایا۔ چھیماں نے ذرا سا چہرہ باہر نکال کر کہا: "ذرا آہستہ آنا، چاچا جی جاگ رہے ہیں۔"

"پھر۔۔؟"

چھیماں نے ہولے سے کہا: "میں نے ان سے کہہ دیا کہ آپ سو رہے ہیں۔"

کمرے میں پہنچ کر اس نے دروازہ بند کیا تو چھیماں نے پوچھا: "کچھ کام بنا؟"

"امید تو ہے۔"

چھیماں ہولے سے بولی: "لیکن اتنی دیر سے نہ آیا کریں، چاچا جی آج کئی بار پوچھ چکے ہیں۔"

"جب اس گھر میں سونے کی اینٹیں آئیں گی تو سب پوچھنا بند ہو جائے گا۔"

چھیماں نے لمحہ بھر اس کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھ کر منہ پر انگلی رکھ لی اور کہنے لگی: "آہستہ بولئے ذرا۔"

"کچھ کھانے کو ہو تو جلدی لاؤ۔ آج تو سارا دن گھومتے ہی گذر گیا ہے۔"

لیکن چھیماں جگہ سے نہ ہلی اور پوچھنے لگی: "کام کیا شروع کیا ہے، مجھے تو بتائیں۔"

"سب پتہ لگ جائے گا۔ جلدی کاہے کی ہے۔ کچھ کھانے کو تو لا۔"

چھیماں چلی گئی تو وہ گیلے بوٹوں سمیت چارپائی پر دراز ہو گیا۔ اس کی نظروں کے سامنے چاندی سے بھری ہوئی دیگ گھومنے لگی۔

دوپہر کی دھوپ موکھے میں سے اتر کر عین وہاں پڑ رہی تھی جہاں چھیماں کا پھولوں والا نگین بکس پڑا تھا۔ بابا خیرو کے پاس رشید کو گئے پورا ایک ہفتہ ہو چلا تھا۔ رشید کی جیب میں جو پونجی تھی وہ بھی کھوٹی تھی اور جو اشیاء بابا خیرو نے خرید کر لانے کو کہا تھا ان پر پورے تیس روپے سوا پے لاگت اٹھتی تھی۔ چار دن سے وہ دکان پر بھی نہ گیا تھا۔ اسے یوں احساس ہو رہا تھا کہ اب کام بننے ہی والا ہے اور جوں جوں یہ احساس بڑھتا اس کی بے چینی بڑھتی جاتی۔ دھگدھگی گئی، کانوں کی مرکیاں گئیں، چاندی کی پازیبیں گئیں حتیٰ کہ موتیوں والی تصویر بھی بک گئی جو چھیماں جہیز میں لائی تھی اور جو آتے ہی سامنے والی دیوار کی زینت بن گئی تھی۔ چھیماں خاموشی سے اپنی چیزیں رشید کو پکڑاتی رہی لیکن جب رشید نے کنگن طلب کئے تو چھیماں نے صاف انکار کر دیا۔ کنگن چھیماں کی ماں نے مرتے دم اس کی باہوں میں پہنائے تھے۔ یہ اس کی مرحوم ماں کی یاد سے بھی زیادہ مقدس تھے۔ دو ایک بار تو رشید نے دبی زبان میں ان کا مطالبہ کیا لیکن چھیماں جو بے حد ٹھنڈے میٹھے مزاج کی عورت تھی ہر بار بھڑک اٹھتی۔ آج صبح سے رشید کے دماغ میں بابا خیرو کا ڈیرہ گھوم رہا تھا۔ وہ چارپائی پر چت لیٹا چھیماں کو دوپٹہ چنتے دیکھ رہا تھا۔ یک لخت اس نے محسوس کیا کہ چھیماں کی باہیں ننگی ہیں ان پر وہ کنگن نہیں جنہیں وہ رات کے وقت بھی کبھی نہ اتارتی تھی۔

"تمہارے کنگن کیا ہوئے چھیماں؟" رشید نے بالآخر پوچھا۔

چھیماں نے نظریں اٹھائیں اور منہ بنا کر کہا: "بند کر دیئے ہیں میں نے۔"

رشید کی نظریں اس بکس پر ٹک گئیں جہاں دھوپ تختہ بنی چمک رہی تھی۔ "کیوں؟" وہ آہستہ سے بولا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں وہ بھی بابا خیرو کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔ نہ آپ کو نظر آئیں گے نہ آپ مانگیں گے۔"

رشید اٹھ کر بیٹھ گیا اور بڑے جوش سے بولا "چھیماں یہ کام بے استاد کے نہیں ہوتا۔ بابا خیرو استاد ہے۔ میں نے اسے خود چاندی بناتے

دیکھا ہے۔ !"

چھیماں چڑ کر بولی: "جتنا سونا اس کے پیچھے ہم نے گنوایا ہے اس سے تو ہم چاندی کے توڑے خرید لیتے توبہ، بڑھاپے کس قدر شوقین زمانے کی کوئی فرمائش ایسی نہیں جو رہ گئی ہو۔"

رشید نے بابا خیرو کی طرفداری میں کہا۔ "شوقینی کی کیا بات ہے، اکیلی جان ہے۔ کسی طرح تو اپنا راضی کرنا ہی پڑتا ہے۔ سونا بنانا بھی تو بڑی بات ہے۔"

"مجھے تو چور لگتا ہے پورا۔ سونا بنا سکتا تو یوں تم سے چیزیں نہ مانگا کرتا۔"

رشید نے جلدی سے کہا: "ارے بیوقوف میں اس کالوں سا گھر بنا دیتا ہوں۔ کبھی کبھار کوئی ایک آدھ چیز لے جاتا ہوں۔ بابا خود بھی بڑا سخی ہے، بڑا وسیع کاروبار ہے۔ آئے دن شہر جاتا ہے بڈھا۔۔ سونا بیچنے ہی جاتا ہے ورنہ اس کے کون سے لڑکے کالجوں میں پڑھتے ہیں۔"

"تمہیں تو ابھی تک سونے کی کیل تک بنا کر نہیں دی!"

رشید چڑ کر بولا: "تمہارے جیسوں تو بیگ لگے نہ پھٹکری اور سونے کی اینٹیں کہیں سے مل جائیں۔ گندھک آملہ سار کا تیل بنانا سیکھ لیا ہے۔ پاتال جنتر کے عمل کرنا جانتا ہوں۔ اب دو چار دن اور لگاؤں تو یقیناً سونا بن جائے نسخہ میں جانتا ہوں فقط دو ایک باتیں وضاحت طلب ہیں جونہی یہ گتھیاں حل ہو گئیں تیرے لئے سونے کی اینٹیں بنا لاؤں گا۔"

"میں تو کہتی ہوں کوئی اور کام کرو۔ اب تو چاچا جی بھی شک کرنے لگے ہیں۔" چھیماں بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے بولی۔

"اور کیا کام کروں۔ ؟ کہتی ہو تو شہر چلا جاتا ہوں لیکن وہاں بھی تو کتابت ہی کرنا پڑے گی۔ کون سا وہاں پہنچ کر لوگ تحصیلدار لگا لیں گے۔ پھر بھی۔"

رشید نے بڑے جوش سے کہا: "چھیماں میرا جی کہتا ہے کہ بابا خیرو سونا بنانے کی ترکیب جانتا ہے۔ میں جانتا ہوں وہ اصلی بات بتاتا ہوا کتراتا ہے لیکن تابکے! ارے جھلیے چھ ماہ کی محنت کیا یونہی اکارت جائے گی۔ تو مجھے بس مہینہ بھر کی اور مہلت دے دے پھر دیکھ کیا ہوتا ہے!"

چھیماں نے کندھے پر برقعہ اٹھایا اور بولی: "میری طرف سے مہلت ہی مہلت ہے لیکن ہمارے پلے کیا رہ گیا ہے جس پر بابا خیرو ریجھے گا! میں زینب کی طرف جا رہی ہوں وہاں آج گیارھویں کا ختم ہے شام کو آ جاؤں گی۔"

جانے سے پہلے چھیماں نے ایک نظر اپنے چھوڑوں والے بکس پر ڈالی اور پھر چور نظروں سے رشید کو دیکھتی ہوئی چل دی۔

جس وقت رشید ممدو کی دکان پر پہنچا شام تو نہ ہوئی تھی لیکن دوپہر ڈھل چکی تھی۔ بدقسمتی سے ممدو کی دکان پر بڑا سا تالا پڑا تھا۔ رشید کا دل بجھ گیا اور اسے واسکٹ کی اندرونی جیب بھاری لگنے لگی۔

اپنی دکان کے سامنے سے وہ کنی کترا کر نکل گیا۔ شیخ جی بازار کی جانب پیٹھ کئے کسی کتاب کو شکنجہ میں کس رہے تھے۔ بازار سے نکلتے ہی اس کی رفتار تیز ہو گئی اب اس کے جی میں یہی دھن سمائی تھی کہ جلد از جلد بابا خیرو کے ڈیرے پر پہنچ جائے۔ راہ میں جہاں کھجوروں کا جھنڈ اور اینٹوں کا بھٹہ تھا اور جہاں پہلے پہل وہ بابا خیرو کا مرید ہوا تھا وہاں پہنچ کر اس نے اندرونی جیب ٹٹولی اور پھر ریلوے لائن کی طرف بھاگنے لگا۔

بابا خیرو کی جھونپڑی تک پہنچتے پہنچتے شام ہو چکی تھی۔ کیکر کے درخت اب سیاہ دھبے سے لگتے تھے اور لائن کا پھاٹک دھاریاں سی نظر آتا تھا۔ بابا خیرو کی جھونپڑی میں اندھیرا تھا۔ رشید نے نظر دوڑائی تو کچھ فاصلے پر بابا خیرو کو پتنگ اڑاتے دیکھا بھاگم بھاگ میدان میں پہنچا۔

"آ گیا۔ شیخ بچے!"

"جی.... اتنے دن کچھ انتظام نہ ہو سکا، اس لئے نہ آسکا...."

"تیرے بعد.... میں نے تیل بنا لیا۔ تانبے پر ڈالا تو سونا بن گیا۔ وہی رنگت وہی وزن۔"

رشید کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ آہستہ سے بولا: "اندر چلئے بابا جی میں کچھ لایا ہوں۔"

"تو چل میں آیا۔ اس وقت ٹھمکی نہ دی تو پتنگ آگرے گی۔ بڑی مشکل سے آج چڑھایا ہے اسے!.... ہوا بالکل بند ہے۔"

"بند کریں اس مشغلے کو۔ میں بڑا سامان لایا ہوں بابا خیرو۔"

پتنگ اور گولا سنبھال کر دونوں جھونپڑی کے اندر پہنچے اور بابا خیرو نے دیا سلگایا تو رشید نے کہا: "تو پھر بن گیا سونا بابا خیرو۔"

"ہاں بن تو گیا ہے لیکن ہے بھربھرا جیسے ریت ہوتی ہے۔ لیکن خیر دیکھوں گا اور بیٹھے تو کون سا سامان لایا ہے آج۔؟"

رشید نے بابا خیرو کی بات سنی تو اس کا دل بجھ سا گیا۔ لمحہ بھر پہلے اس کا دل کھل گیا تھا۔ اسے کیسی امید بندھ گئی تھی کہ واپسی پر وہ چھیماں کو مژدہ سنا کر اپنا گناہ بخشوا لے گا۔ اس نے بددلی سے اندرونی جیب ٹٹولی اور کنگن کی جوڑی ہتھیلی پر رکھ کر بابا خیرو کی طرف بڑھا دی۔

بابا خیرو کچھ دیر کنگن دیکھتا رہا۔ پھر ہولے ہولے اس کی دائیں آنکھ رشید کے چہرے پر جم گئی ۔۔ وہ آہستہ سے بولا: "یہ کنگن کس کے ہیں رشید۔؟"

"جی چھیماں کے ہیں۔" وہ بمشکل تمام بولا

خیرو کے جبڑے تن گئے۔ اس کی دائیں آنکھ بیر بوٹی کی طرح سرخ ہو گئی: "اب تک تو نے کیا کیا بیچ کھایا ہے رشید۔؟ سچ بول، ورنہ ابھی مار ڈالوں گا۔!"

رشید نے تعجب سے بابا خیرو کو دیکھا اور کہا: "بس یہ کنگن باقی ہیں سو لے آیا ہوں۔"

خیرو غصے سے تھر تھر کانپنے لگا اور گرج کر بولا: "یہ دیگ دیکھتا ہے؟ دیکھتا ہے یہ دیگ۔ اس میں میری روشناں کا زیور آیا تھا۔ میں نے سب کچھ بیچ کھایا.... ایک ایک چیز گنوا دی اور روشناں بھی گنوا دی، لیکن یہ دیگ یہیں ہے اور یہیں رہے گی۔ میں صبح و شام اسے دیکھ کر کہتا ہوں۔ تو روشناں کی آخری نشانی ہے، تجھے بیچ کھاؤں تو سور کھاؤں، حرام کھاؤں.... جا بھاگ جا، یہ کنگن لے جا ورنہ روشناں کی طرح وہ بھی چلی جائے گی۔ جا ابھی بھاگ جا....؟

"جا کھڑا میرا منہ کیا تکتا ہے.... جا.... روشناں کا باپ سونا بناتا تھا لیکن میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ جا بھاگ جا ابھی وقت ہے ورنہ سونا تو کیا بنے گا مٹی کے ساتھ مٹی ہو جائے گا۔ جا۔"

رشید گھر پہنچا تو رات بہت ہو چکی تھی۔ ڈیوڑھی میں اندھیرا تھا اور اس کے آدھ کھلے پٹ میں کوئی کھڑا جھانک رہا تھا۔ رشید دھڑکتے دل سے اندر داخل ہوا تو شیخ جی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: "بیٹا تم سے چھیماں لڑی تھی کیا؟"

رشید کی زبان نے کتنی ہی دیر ساتھ نہ دیا پھر وہ آہستہ سے بولا: "نہیں تو جی۔"

"پھر پتہ نہیں کیا بات ہے۔ شام کو آئی تو بڑی دیر تک ٹرنک بستر جھاڑتی رہی۔ پھر اپنا سامان باندھ کر چلتی بنی کہنے لگی چاچا جی کہا سنا معاف کر دینا۔"

رشید کا ایک ایک پیر من من کا ہو گیا۔

"تم بھاگ کر سٹیشن تک تو دیکھ آؤ۔ شاید ابھی گاڑی نہ گئی ہو۔ شاباش بیٹا شاباش۔"

رشید سٹیشن پر نہ گیا بلکہ اسی پھاٹک پر جا پہنچا جہاں بچپن میں وہ اور فقیرا ریل دیکھنے جایا کرتے تھے۔ پھاٹک بند تھا۔ اس کا جی چاہا کہ کنگن اٹھا کر پٹڑی پر رکھ دے اور ریل کے پہیئے اسے پیس کر نکل جائیں تو آرام سے گھر چلا جائے، پھر دور سے انجن سیٹی بجاتا ہوا، دھواں اڑاتا ہوا نکلا۔ اس کے پیروں تلے زمین کانپنے لگی۔ ڈبوں میں لٹکے ہوئے آدمیوں کے عکس اور روشنی کے تختے زمین پر بھاگتے چلے گئے۔ رشید غور سے گاڑی دیکھتا رہا۔

پھر دور جگنوؤں کی قطار سی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ صرف فضا میں گاڑی کے پہیوں کا شور رہ گیا۔ جیسے اب بھی وہ لاتقنطو کا ورد کرتی چلی جا رہی ہو۔۔۔ کنگن ہاتھ میں پگھلے ہوئے پیسے کی طرح سنبھالے وہ بابا خیرو کی جھونپڑی کی طرف پلٹ گیا۔

جولائی ۸۳ء

حقیقت کو چھپا لے کر فسانے ڈھونڈ لیتا ہے — وہ ہر صورت نہ ملنے کے بہانے ڈھونڈ لیتا ہے

محبت اُس کی فطرت ہے تجسس اُس کی عادت ہے — وہ ہر منظر میں کچھ منظر سہانے ڈھونڈ لیتا ہے

کوئی بھی وار اُس کی بات کا خالی نہیں جاتا — وہ اپنی کامیابی کے نشانے ڈھونڈ لیتا ہے

اگرچہ مدت کے بعد وطن واپس وہ آتا ہے — جب آتا ہے تو یاروں کے ٹھکانے ڈھونڈ لیتا ہے

کبھی اُس کا ہدف اُس کی نظر سے چھپ نہیں سکتا — وہ کوندا ہے لپک کر آشیانے ڈھونڈ لیتا ہے

وہ خوشبوؤں کا متوالا وہ تابانی کا شیدائی — چھلکتے جگمگاتے آستانے ڈھونڈ لیتا ہے

روایات جنوں کی پاسداری ختم ہے اُس پر — وہ دیوانہ ہے دیوانے پرانے ڈھونڈ لیتا ہے

کمال رنگ محتاج قسمت کا نہیں ہوتا — جو زندہ ہے وہ خود اپنے زمانے ڈھونڈ لیتا ہے

اسے فطرت سے نسبت ہے نگاہ دور بیں ایسی — بلندی سے تتلیوں کے گھرانے ڈھونڈ لیتا ہے

شنیدہ و دیدہ کا منظر کبھی ویراں نہیں ہوتا — روایت سے کچھ نہاں خانے ڈھونڈ لیتا ہے

نہیں اُس کے لبوں پر گردش ایام کا شکوہ

وہ ہنسنے اور ہنسانے کے زمانے ڈھونڈ لیتا ہے

ارشد ملتانی

عکس تحریر۔ ارشد ملتانی

# شیری

جمیلہ ہاشمی

مہر کا تار اماں کے نام آیا "شیری کو برٹش ایئر ویز کی فلائٹ ۰۳۲ سے لے لیجئے گا۔"

سخت غصہ آیا۔ میں نے اُسے لکھا تھا۔ "تم شیری کو یہاں کیوں بھجوا رہی ہو۔ اماں اپنا خیال تو ڈھنگ سے رکھ نہیں سکتیں۔ اس کا کیا کریں گی تیز سلیقے کا کوئی نوکر ان دنوں ملنا مشکل ہے اور جو ہیں وہ بھی بہتر جگہوں کی تلاش میں یہاں اَن منے دل سے رہ رہے ہیں۔ جب تک پاپا تھے تو سب کچھ تھا اب تمہیں معلوم ہی نہیں ہو سکتا میں اکیلے یہ گھر کی کشتی کیسے کیسے کھے رہی ہوں۔ پریشانی اور شدید مصروفیت کا شکار رہتی ہوں اُمید ہے تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرو گی اور ضدی ہونے کے باوجود میری بات میں تم کو وزن معلوم ہو گا۔"

میری بہن ہمیشہ کی بدتمیز بے مروت اور اپنے سامنے کسی کو کچھ نہ سمجھنے والی تھی اور مختصر نویس ہونے کے باوجود اُس نے مجھے پانچ صفحوں کا کوسنوں طعنوں اور گالیوں سے بھرا خط لکھا تھا یہ کہ

"گھر پر اس کا بھی اُتنا ہی حق تھا جتنا کسی اور کا تھا۔ شادی کے بعد لڑکیوں کا مائکے سے کوئی ناتہ ٹوٹ تو نہیں جاتا اُسے بھی اپنے لئے اتنی سہولت لینے میں کوئی مانع نہیں ہو سکتا تھا اماں بھی سب کی تھیں اور اگر ضرورت پڑے تو مدد بھی کر سکتی تھیں اور یہ کہ میں نے کب سے اپنے آپ کو اس گھر کا مالک تصور کرنا شروع کر دیا تھا۔ پاپا نہیں تھے تو کیا مکان پر تو اب بھی اُنہیں کا روپیہ صرف ہوتا تھا۔ شیری یہاں رہ سکتا تھا اور اماں خود ہی اُس کے لئے مناسب دیکھ بھال کا بندوبست کریں گی۔ پھر آخر میں یہ کہ میری تنہا اُجاڑ زندگی اور ویران دنوں کی ذمہ داری سوائے میرے اپنے کسی پر نہ تھی۔ میری تیز مزاجی اور زبان درازی اور دوسروں سے ضرورت سے زیادہ توقع رکھنے ورنہ لائق دوستوں کی وجہ سے معاملہ یہاں تک پہنچا تھا ورنہ وہ کرنل کیا برا تھا جو تمہارے پیچھے پھرا کرتا تھا یہ اور بات ہے کہ اُس نے تم سے دوستی کے دوران دو چار اور لڑکیوں سے بھی تعلقات استوار کر رکھے تھے مگر تمہیں خود معلوم ہے تم پر مکمل بھروسہ آخر وقت تک نہیں کیا جا سکتا تم تو بس خوب سے خوب تر کی تلاش میں سخت وفاداری کو کھوجتی رہی ہو جو میری جان اس جہان میں معدوم ہے۔ بھلا مردوں کو غلام بنا کر اور ان کا امتحان لے کر تم کبھی کسی نتیجے پر پہنچ سکی ہو۔ تم نے دنیا کے مردوں کو اپنے پاؤں میں رگیدا اور قدموں تلے دیکھنا چاہا ہے تم کو اپنے موہوم حسن پر کیا کیا ناز رہے ہیں جس کو کسی نے دو کوڑی کو نہیں پوچھا۔ سمجھتی ہو تمہاری ان چمکتی ہوئی آنکھوں کے سحر میں کوئی گرفتار ہو گا۔ کبھی نہیں کبھی نہیں۔"

خط پڑھ کر میں نے سوچا ہٹاؤ مار دو گولی اگر شیری کو وہ اماں کے پاس بھیجنا ہی چاہتی ہے تو میری بلا سے میں نے اس بے ہودہ تحریر کا بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا جب وہ عقل کی بات سننے کی تاب ہی نہیں رکھتی تو کا ہے سنائی جائے اور پھر پھر سے خط و کتابت کی اس لڑائی میں ہار ہمیشہ میری ہوتی تھی۔ وہ اماں کی لاڈلی بہن بھائیوں کی چہیتی تھی۔ رستم نے اُسے گھر کا سکون دیا تھا۔ جو اس کی طاقت اور اس کا مان تھا۔ پھر اس کی بیٹی نور تو اُس کی دیوانی تھی اور اس لئے وہ میری ویران زندگی کا مذاق اُڑایا کرتی تھی۔

اُس کا تار پڑھ کر میں جل بھن گئی۔ اماں خود جاتی پھریں۔ شیری کو لانے کراچی کم از کم اُس واہیات خط کے بعد سے میرا تو اس سارے واقعے سے کوئی سروکار ہی نہیں رہا تھا۔ اماں جانیں اور مہر جانے۔ پھر ایک سہ پہر جب میں ابھی دفتر سے آئی تھی، اماں اپنے تو بے گھٹنے اور سخت ٹانگیں گھسیٹتی آئیں۔

اے لڑکی سیٹ بُک کروالی ہے۔

کیوں!

لو اور سنو کیوں بھلا اس حالت میں مجھ سے کراچی جایا جائے گا۔ تمہارے والد کے بعد سے یوں بھی مجھے اکیلے کہیں جانا مصیبت لگتا ہے۔ سفر کرنے کا مزہ تو اُن کے ساتھ تھا پورا دُنیا پنا ہے۔ بس چلے جا رہے ہیں۔ کھاتے پیتے ہنستے ہنساتے جیسے اپنے گھر میں ہوں۔ وہ یادوں میں گم سی ہو گئیں۔ گزرے زمانوں میں ریل کے ہچکولوں سے انہیں جیسے نیند آنے لگی ہو چپ چاپ دور دیکھتی ہوئی بیٹھی رہیں۔ پھر اچانک کہنے لگیں۔ آخر تجھے جانا ہی پڑے گا۔ خرچ کا فکر نہ کر تو میرے لئے اتنا سا کام بھی نہیں کر سکتی؟

بنا کوئی اور سوال کئے میں نے اسٹیشن فون کیا۔

فلائیٹ لیٹ تھی میں انتظارگاہ میں لوگوں کے جمِ غفیر کے درمیان ٹہلتی رہی۔

دولت کی تلاش میں پرائے دیسوں کو جانے والوں کی آنکھوں میں آنسو اور خواب، بچے اور سامان ٹرالیاں، قلی، گرجتے ہوئے لینڈ کرتے جہاز گڑگڑاہٹ سے سروں کے اوپر سے گزر کر منزلوں کو روانہ ہوتے طیارے، آواز میں رونا ہنسی پھڑنا وعدے چاہتیں مزید آرزو میں ایک گنگا جمنی بھیڑ۔

نئی روشنی کی تیز لڑکیاں عجیب تراش خراش کے لباس پہنے خود آگاہ بال جھلا جھلا کر سر کو گھما کر اپنے گرد و پیش دیکھتی ہوئیں، کھنکتے قہقہے گونجتی ہنسی تیز انگریزی اونچی گفتگو دکھاوا بناوٹ پسندیدہ نظروں کے حصار میں اپنے سحر سے آشنا اور بے پرواہ گھائل کرنے کی ساری اداؤں کو نہایت غفلت سے بڑے ناز سے نماتی ہوئیں، اور ان کی نہایت ماڈرن مائیں خود آگاہ مصنوعی حسن کی تاثیر سے آشنا جنہیں دیکھ کر بے اختیار سیٹی بجانے کو جی چاہے۔

لڑکے مضحکہ خیز چوہوں کی طرح فلموں کے ہیروز ہیروئنوں کے گروہوں کے گرد چکر کاٹتے ہوئے اپنے باپوں کے ساتھ دلچسپی سے عریاں نگاہوں سے اپنے گرد و پیش نگاہ دوڑاتے نیچے سُروں میں باتوں کے سیلاب میں بہتے ہوئے مگن مصروف اُوپر نیچے گھومتے پھرتے ہوئے گھاگ شکاریوں کے سارے داؤ پیچ سے آشنا۔

میں ٹہلتی ہوئی ذرا پرے جنگلے کے ساتھ دور چلی گئی اور اُس سے سر ٹکا کر میلوں تک پھیلے ہوئے رن وے کی طرف دیکھنے لگی جہاں چھوٹے بڑے جہازوں کی ہیبت، سیڑھیاں کھسکتیں اور لگائی جا رہی تھیں ایک بھگدڑ مچی تھی۔ عملے کے لوگ موٹریں سامان ادھر جانے کیا کیا۔ اس منظر سے تھک کر میں نے اپنے اطراف دیکھا۔

لڑکی کے رخسار گھڑی گھڑی گلابی ہو جاتے کان سیبوں کی طرح سرخ سے چمکنے لگتے وہ دونوں چپ تھے ایک دوسرے سے بہت قریب بھی نہ تھے۔ لڑکا میری طرح اپنے سامنے دیکھ رہا تھا مگر جب وہ سر کو گھما کر اس کی طرف دیکھتا تو وہ یوں چھوئی موئی سی اپنے ہاتھوں تک انگلیوں کی پوروں تک رنگین ہو جاتی۔ ہائے یہ نگاہ کی رنگینی تھی۔ بھیگی ہوئی چنری کی طرح کی یہ لڑکی رنگ میں ڈوبی تھی۔ سرشار بے چین پُرسکون وارفتہ۔

مجھے وقت گھسیٹ کر پیچھے لے گیا۔ اُس جنگلے سے دور اُن برآمدوں میں جہاں میں اُونچی ایڑی کا جوتا پہنے کھٹ کھٹ کرتی چلتی تھی گویا زیبا اصفہانی کے دل پر چل رہی ہوں۔ زیبا کو اپنے حُسن کا غرّہ اور اپنے ایرانی ہونے پر ناز تھا۔ وہ ابھی نیا نیا آیا تھا اور لیکچر دیتے وقت جب وہ سمجھاتا اور سیدھا تمہاری آنکھوں میں دیکھتا تو دل سینے میں ڈول جاتا تھا۔ میں جسے اپنی شوخی پر اعتماد تھا سمجھتی رہی کہ وہ کہاں جائے گا چند دنوں میں اس کا غرور نیاز میں اور اس کا سر میرے قدموں میں ہو گا۔ ایسی چھوٹی چھوٹی فتوحات سے تو میرا دامن بھرا ہوا تھا۔ زیبا تو اُسے درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھتی تھی۔ چند دنوں بعد مجھے اور اچھا لگنے لگا وہ کلاس میں جب بھی زیبا کی طرف دیکھتا میں محسوس کرتی کہ زیبا کی لمبی پلکیں رخساروں پر جھالر کی طرح جھک جاتیں اور وہ گلابی ہو جاتی۔ عجیب خود فراموشی سے وہ اس کی نگاہ کا جواب دینے کے بجائے اپنے سامنے دونوں ہاتھ رکھے ناخنوں کی طرف دیکھتی جس میں سرخی تیزی سے جھلکنے لگتی تھی۔ اچھا تو اس کھیل میں کہیں کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ یہ عجیب بے قاعدہ مثلث تھی۔ درمیان میں وہ تھا اور اس کی نگاہوں کی ساری روشنیاں اس کے لئے تھیں اور میں تھی جو اس کے لئے کچھ نہ تھی اور جس کا دل کلاس میں آنے سے پہلے بعد میں سارا دن یونہی دھڑکا کرتا تھا۔ ایک دہکتی ہوئی گرمی میرے سارے وجود کو تڑپاتی رہتی۔ مگر میرا حُسن جہاں سوز بیکار میری آج تک کی فتوحات غلط تھیں۔ میں نے اتنی ذلت کبھی نہ اُٹھائی تھی۔ میں اس کے پاس سے گزرتی بھی تو وہ میری طرف مُڑ کر نہ دیکھتا روز میرے لئے ایک نیا مقابلہ ہوتا تھا۔ میں نے اپنا آپ آزمانا چاہا اور میں جہنم میں سے گزر گئی۔

میں نے اُسے پیغام بھجوایا رات کو دروازہ کھلا رکھنا میں زیبا کا ایک خاص پیغام لے کر آؤں گی۔ وہ خوشی سے تقریباً دیوانہ ہو گیا تھا جیسے اُس نے سرخ گلابوں کا عکس اندھیرے میں دیکھ لیا ہو۔ جیسے تاریک پانیوں پر ڈولتے کنول کے ہونٹوں کو سورج کی کرن چھوئے، وہ ہولے ہولے کھلنے لگے۔ میرے سینے میں دل کو کوئی چپکے چپکے مسل رہا تھا میں جیسے موت کے بند کواڑوں کو کھولنے جا رہی تھی۔ اپنے مقدر کے نوشتے کو پڑھنے کے لئے میں نے دروازہ کھولا، اُسے اپنا حالِ دل سنایا میں نے کہا تھا زیبا ایک خواب ہے۔ تم اُسے کبھی حاصل نہ کر سکو گے وہ پرائے دیس چلی جائے گی تو لوٹ کر نہیں آئے گی آ نہ سکے گی اس کا وطن کوئی اور تھا۔۔۔۔ میں تمہاری زندگی سنوار

دوں گی۔ میرے پاس ذرائع تھے خاندان تھا۔ وہ نگاہوں میں تمسخر لیے نہایت خاموشی سے میری باتیں سُنتا رہا۔ اُس گھڑی مجھے لگتا تھا میری روح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کرچیاں ہو کر میری آنکھوں سے بہہ رہی ہے میں ٹوٹے شیشے چبا رہی ہوں اور ابھی گر کر بے ہوش ہو جاؤں گی۔

اُس نے ہنس کر کہا تھا "بی بی چاہت کو تم کیا سمجھتی ہو کہ جب چاہو قیمت چکا کر خرید لو۔ یا یہ چربہ ہے کہ جب تیلی دکھاؤ جلنے لگے۔ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا اب تم جا سکتی ہو"

جب وارڈن نے مجھے اس کے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا تو میرا رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ چہرہ آنسوؤں سے دُھلا ہوا۔ آنکھیں دھندلائی ہوئی تھیں اور میں تقریباً گری جا رہی تھی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔

اُسے دو باتوں میں سے ایک کو چننے کا اختیار دیا گیا۔

وہ مجھ سے شادی کر لے اور یہیں ٹھہر رہے یا پھر خود استعفیٰ پیش کرے اور چلا جائے۔

ہائے کیسے اُس نے انکار کر دیا تھا اور چُپ چاپ چلا گیا تھا۔ اُس نے میرے بدلے وہ ذلت قبول کر لی تھی۔

میری قیمت ذلت سے بھی کم تھی۔ اور ان اوزاں بے قیمت میں۔ اُس کے جانے کے بعد سے مردوں پر سے میرا اعتبار اُٹھ گیا۔ اپنے حُسن کی چمک بھی دھندلی اور بیکار کا فسانہ لگی۔ میرے چاروں طرف خلا تھا جس میں لڑکیوں کے قہقہے گونجتے اور ان کی نگاہیں تیروں کی طرح میرے آر پار ہوتی جاتیں مگر میں سر دنیچے کئے زیبا صفاہانی کے دل پر جلتی رہتی بے پناہ خود اعتمادی کے ساتھ کیونکہ میں آگ کی محراب تلے سے گزر گئی تھی اور میں نے اپنا سارا ماضی سارا مستقبل جلا ڈالا تھا۔

میں نے محبت کی خوشبو کے بدلے انگارے سونگھے تھے اپنے دل کی جلن کی بو ساری عمر میرے دماغ میں تیرتی رہی ہے۔

ہائے مجھے کسی نے کبھی ایسے کیوں نہیں چاہا کہ میں رنگ سے بھیگی ہوئی چُنری لگوں۔

برٹش ایئرویز کی فلائٹ کے لینڈ کرنے کا اعلان کیا گیا۔

طیارہ رن وے کے دوسرے سرے پر ایک بڑے پرندے کی طرح اُترا پھر واپس مڑا، قریب لائے سیڑھیاں مسافروں کو لانے کے لئے اور یاں سامان کے لئے گاڑیاں، رونق، چہل پہل ہو گئی پھر لوگ اپنے سامان کے ساتھ باہر آنے لگے۔ سب سے آخر میں وہ اُسے لائے۔ خوبصورت پنجرے میں چمکتے ہوئے سنہرے بالوں والا روشن اور ذہین آنکھوں والا تھا نہ بہت لمبی ورنہ ہی چھوٹی، صاف ستھرا دُھلا دُھلایا۔ بے حد اسمارٹ کار پہنے بڑی بے پروائی سے اپنے گرد و پیش دیکھتا ہوا کبھی سر اپنی اگلی پھیلی ہوئی ٹانگوں پر رکھ لیتا اور آنکھیں بند کر لیتا۔ مجھے وہ بہت عمدہ لگا۔

میں نے پنجرے کے ساتھ ساتھ چلتے پکارا۔ شیری شیری۔

اُس نے ہوا میں ناک اُٹھائی کوئی مانوس بو سونگھی غور سے مجھے دیکھا عف عف کیا جیسے پکار کا جواب دے رہا ہو اور پھر منہ اپنی ٹانگ پر رکھ لیا اس کا سر ہل رہا تھا۔ جیسے وہ ہانپ رہا ہو۔ چل چل کر تھکا ہوا بیٹھا ہو۔ ائر ہوسٹس نے اس کی زنجیر مجھے تھمائی اُس کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔

"کاش میں نے تمہاری بات مان لی ہوتی اور شیری کو نہ بھیجا ہوتا۔ اس سے جُدا ہوتے وقت ہمارا دل کٹ کٹ گیا ہے۔ رستم اُداس ہے۔ نور جہاں روتی ہے اور میں تو باقاعدہ غم زدہ ہوں۔ جب ڈین سے لینے آئی ہے تو یہ اُن سے چھُوٹ کر گھر میں گھُس گیا اور غسل خانے میں چھُپ گیا۔ بڑی مشکل سے اسے گھسیٹ کر لایا گیا۔ یہ ہمیں بہت عزیز ہے۔ تقریباً ایک فرد کی حیثیت سے اس میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ یہ بہت محبت کرنے والا ہے اور اُمید ہے تم امّاں کے گھر میں ساری کوششوں کے باوجود اس سے نفرت نہیں کر سکو گی۔ تکلیف فرمائی کے لئے شکریہ۔ ہم لوگ کل جدّہ روانہ ہوں گے۔ والدہ" ائر پورٹ سے باہر آ کر میں نے وہ زنجیر اس کے کالر میں اٹکائی اس نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا میرے ہاتھوں کو سونگھا۔ مہر کی اور میری مہک ایک سی ہونا چاہیے۔ اس نے بنا مزاحمت کے زنجیر کے ساتھ مجھے اپنا مالک تسلیم کر لیا۔ میں نے اُسے بسکٹ دیا جو اُس نے کھایا اور پانی پی کر ہم دونوں امّاں کی طرف روانہ ہوئے۔

ٹرین میں وہ سیٹ پر بیٹھا شیشے کے ساتھ منہ لگا کر باہر جھانکتا رہا۔ کھیتوں ندی نالوں اور ان سب پر جھکا نیلا آسمان دھوپ روشنی کی طرح بھری ہوئی اور بہت تیز۔ وہ اس نئی زمین سے واقفیت پیدا کر رہا تھا جس کی عام آدمی کو ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اس کے رنگوں اور خوشبوؤں اور بدلتے مناظر درختوں اور ہواؤں کو ازبر کر رہا تھا۔ جہاں شفاف بستیوں پر اور دُور جلتے چراغوں پر سیاہ ابر آلود رات چھائی ہوئی تھی اور چاند ستاروں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا پھرتا تھا۔

شیری کی تنہائی اور غریب الوطنی نے میرے دل کو آنسوؤں سے بھر دیا۔

اماں بیماری کے بعد سے خواب آور گولیاں کھانے لگی تھیں اور اس لئے دن چڑھے تک سویا کرتیں میں دفتر جانے کے تقریباً تیار ہو چکی ہوتی تو وہ شیری کہہ کر پکارتیں نہایت تیزداری سے میز کے قریب نیچے بیٹھ کر وہ اپنے پیالے میں سے کبھی دودھ اور ڈبل روٹی کبھی گوشت کھاتا نہایت چبا کر آہستہ آہستہ جیسے کوئی آہٹ بھی نہ کرنا چاہتا ہو۔ اماں کہتیں مہر نے اسے کیسا عمدہ پالا ہے آدمی کے بچوں سے زیادہ تمیزدار ہے۔

انہیں خواہی نخواہی مہر کی تعریف کرنے کی عادت سی تھی۔

موسم بدلا۔ درجہ حرارت بڑھنے لگا گرمی میں تیزی آتی گئی اور شیری بہت گھبرایا گھبرایا رہنے لگا۔ ہانپتا ہوا زبان لٹکتی ہوئی تیز سانس لیتا ہوا۔ اماں اُسے اپنے ساتھ کمرے میں بند رکھتیں۔ شام کو مجھے کہتیں ذرا اسے ٹہلا دیا کرو بے چارا پردیس میں آن پھنسا ہے۔ مہر نے ظلم ڈھایا ہے۔ بھلا سرد ملکوں سے تو آ کر یہاں لوگ یہ گرمی برداشت نہیں کر سکتے یہ تو ذرا سا بے زبان جانور ہے۔

دریوں شاموں کو جب گرم رت میں ریت کی ٹھنڈک ہلنے لگتی ہوا نرم نرم جھونکوں سے قابلِ برداشت ہو جاتی میں شیری کو ٹہلانے لے جانے لگی۔ وہ سایوں پر ہو کتا ٹنڈوں کی چرچراہٹ کر خاموش کھڑا ہوتا جیسے کسی دور کے سیارے کی نغمگی یا کسی دیس کی موسیقی ہو پھر بھاگتا اور اس کی چھوٹی سی دُم اٹھی ہوئی ہوتی گھاس پر اُلٹ لیٹ کر لوٹ لگاتا اور جگنوؤں کو پکڑنے کی کوشش کرتا۔ پھر عُف عُف کرتا۔ در میرے قدموں میں جھکتا پھر چک پھیریاں لیتا اور میرے ساتھ چلتا رہتا۔ بلیوں کے پیچھے بھاگتے میں اُس کے سنہری بال سیدھے کھڑے ہو جاتے اور وہ تیزی سے ان پر جھپٹتا جب دو بلیاں اکٹھی ہوتیں تو اس سے ذرا نہ ڈرتیں اسے تھپڑ مارتیں بیچارا چوں چوں کرتا اور دُم دبا کر میری ٹانگوں سے لگ کر کھڑا ہوتا گویا پناہ گاہ میں ہو۔ کبھی چڑیوں کو دیکھ کر آنکھیں بند کر کے سوتا بن جاتا وہ اس کی گردن پر آ بیٹھتیں جیسے اُس کی پرواہ ہی نہ کرتی ہوں۔ کبھی یک آدھ کو پنجے میں دبوچ کر بیٹھا رہتا۔ جب وہ دل کی طرح خوف سے دھڑکنے لگتی تو یک بیک اُسے اُڑا کر تماشا دیکھتا۔

اس کی طبیعت میں مردم رسانی نہ تھی، اس نئے گھر میں جو مہمان آتا شیری سے بس کا تعارف کروایا جاتا اماں اس کی نسل اور ملک اور اس کے انگریزی زبان سمجھنے سے بہت مرعوب تھیں پھر اور خوبیاں تمیزداری عمدگی کھیل اور کھانے کے آداب سب اس کی وقعت میں اضافہ تھے۔ اماں کے صبح دیر میں اُٹھنے کی عادت نے مجھے شیری کی طرف زیادہ توجہ دینے پر مجبور کر دیا۔ میں تیار ہو رہی ہوتی تو وہ پاس ہی ڈولتا رہتا۔ میرے جوتے لا کر قریب رکھ دیتا۔ میرے ہاتھ سے کوئی چیز چھوٹ جاتی تو لپک کر منہ میں اٹھا کر مجھے پکڑا دیتا اور اب میں اکثر اس کے بالوں میں کنگھی کر دیتی اور ان کے سنہرے ملائم بہاؤ کو محسوس کر کے میرا جی خوش ہوتا۔ اگر کبھی میں مہر کی پسندیدہ خوشبو لگا لیتی بس دیوانہ ہونے لگتا میرے گرد گھومتا میرے دامن پر اگلے دونوں پاؤں رکھ دیتا مجھے سونگھتا یوں ہمکتا جیسے گود میں آنا چاہتا ہو۔ مگر میں نے کسی بات سے متاثر ہونے اور مہر کی کسی شے کو پسند کرنے کی جی ہی جی میں قسم اٹھا رکھی تھی اور شیری کی یہ ساری حرکتیں مجھے چھو نہ سکتیں۔ البتہ ایک جانور کی جو لگن دیکھ بھال ہو سکتی تھی اس میں میں نے کا ہاتھ بٹاتی اور یوں میں نے ہوتے ہوتے اُس کا زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا۔

شدید گرمی کے دن تھے لُو چل رہی تھی جھلسائے دیتی تھی۔ دفتر سے آ کر میں سخت ٹھنڈے پانی سے نہائی اور تقریباً بیہوش ہو گئی پھر یکدم تیز بخار آ گیا۔ اماں گھبرا گئی ہوں گی کہ انہوں نے اِدھر اُدھر میری دوستوں کو فون کئے۔ کئی دنوں ہذیانی کیفیت رہی اور پھر لوٹ پوٹ کر میں تندرست ہو گئی۔ شیری مجھے دُبلا لگا اور بہت ہی بے آسرا اداس بھی۔ اس دن میں نے پاس بلا کر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کے پیالے میں گوشت خود ڈالا۔

اماں کہنے لگیں، اسے دیکھو تم بیمار کیا ہوئیں اس کا تو کھانا پینا ہی چھوٹ گیا۔ دن رات تمہارے پلنگ کی پائنتی کے نیچے بیٹھا رہتا جیسے اُسے تمہاری بیماری کی بہت فکر ہو اپنی اولاد سے بھی بڑھ کر،

ہنس کر میں نے شیری کی طرف دیکھا ایک احساس تشکر اس بھرے پُرے گھر میں کوئی تو ہے جو میرے لئے پریشان ہوا۔

اماں پھر بولیں چلو آج اس کے منہ پر رونق تو آئی مجھے تو سخت فکر لگ گئی تھی کہیں یہ مر ہی نہ جائے۔ عجیب جانور ہے اپنے اصل مالکوں کو بھول کر تم سے اتنا ہل گیا ہے۔

میں نے چڑ چڑا کر اماں سے کہا کیا مطلب ہے آپ کا مجھ سے اگر ایک جانور بھی مانوس ہو تو آپ کو اعتراض ہوتا ہے۔

ارے نہیں بدنصیب مجھے کسی بات پر اعتراض نہیں ہے اگر تجھ سے کوئی انسان ایسے مانوس ہو تو میرا بوجھ نہ ٹل جائے مگر تیری سخت طبیعت کی وجہ سے کوئی تیرے قریب ہی کیوں آئے گا پھر کسی کو تو کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے لوگوں کو فرشتہ چاہتی ہے۔ ایسی عمر میں کون ایسا وفادار ملے گا؟

میری اور اماں کی خوب تُو تُو میں میں ہوئی کسی نے کھانا نہ کھایا ہم دونوں رقیبوں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹتیں، میں میرا جی چاہتا تھا۔ خوب دھاڑیں مار مار

کر روؤں اور دیواروں سے سر ٹکراؤں یا اس گھر کو آگ لگا دوں جو میرا قید خانہ بن گیا تھا۔ میں اُس دن کو یاد کر کے اُونچے اُونچے بین کر کے روئی جب میں نے پاپا کی بیماری کی وجہ سے اماں کے مایوس کُن خط پڑھ کر ایک دم امریکہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ مستقبل کے سنہرے کو اور روپہلے خوابوں کو اپنے پیچھے کشتیوں کی طرح جلا کر گھر واپس آ گئی تھی اور اب اماں مجھی کو الزام دے رہی تھیں۔ دشمن کی طرح میری طبیعت اور میری عادتوں میں سو سو کیڑے نکالتی تھیں۔ امریکہ میں کیا نہیں تھا، مواقع، آزادی چاہنے والے لوگ، نباہ کرنے کو تیار، میری رفاقت میں مسرت محسوس کرنے والے اور وہ بھی تو تھا میرا جرمن دوست۔

چھٹی کے دن اپنے کمرے میں جو اُوپر کی منزل میں تھا، مجھے مدعو کرتا اور گٹار بجاتا۔ میں مشرقی کھانے پکاتی پھر مل کر رائن وائن پیتے جرعہ جرعہ اور اپنے اپنے ملک کی کہانیاں لطیفے سناتے کبھی بحث چل نکلتی موسیقی اور آرٹ اور خدا جانے کیا کیا۔ اُس کے کمرے کی کھڑکیاں جھیل کی طرف کھلتی تھیں۔ جہاں لوگ کشتی رانی کرتے۔ سکیٹنگ ہوتی، فوارے تھے اور پارک میں لوگ نہایت پرانی دُھنیں بجاتے تھے۔ کبھی کبھار ہم چپ چاپ بیٹھے رہتے اتنی خوبصورتی اور تکمیل میں بات کرنا بے معنی لگتا بس اُس کمرے میں اُس لمحے میں ہم دونوں زندہ ہیں یہ بہت تھا۔ اُس نے کبھی مجھے یہ نہیں کہا کہ وہ مجھے چاہتا ہے چونکہ میں دوسروں سے مختلف تھی اُسے اچھی لگتی تھی، وہ بہت سیدھا تھا اور مجھے کہا کرتا تھا۔

"تم اپنے دیس میں جا کر جب کسی سے شادی کرو گی تو وہ بہت خوش قسمت ہو گا۔ تم میں بہت خوبیاں ہیں مردوں کو سمجھنے کی، انہیں خوش رکھنے کی۔" ہم دونوں ہنستے رہتے وقت گزرتا رہتا اور پھر وقت گزر گیا۔

آخری دن جب ہمارا امتحان ہو چکا تھا ہم وطنوں کو لوٹ رہے تھے۔ چھٹیاں گزر چکی تھیں گٹار میں رنگ کے سب گیت گائے جا چکے تھے تو اُس نے سیڑھیوں کے نیچے بڑی دوست داری سے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا۔

"کیا مجھ سے شادی کرو گی؟"

ہنس کر میں نے کہا تھا "میں ساری عمر کھانا پکا کر تمہارا جی خوش نہیں کر سکتی۔ تم ہمیشہ مشرقی کھانوں کے دلدادہ نہیں رہو گے۔ گذری ہوئی صحبتوں اور ساتھ گذرے دنوں اور محبتوں کا شکریہ" وہ دیر تک میری آنکھوں میں دیکھتا رہا جہاں ہنسی اُبل پڑی تھی اور میرے رخسار انتہائی سردی کی وجہ سے گہرے گلابی ہو رہے تھے۔ پھر اس کا رنگ پھیکا پڑا اور زرد ہو گیا اور وہ کچھ کہے بنا اوپر کی طرف بڑھ گیا۔ اور میں ہماری قدموں سے لوٹ آئی۔ اب بہت دیر ہو گئی تھی، اس نے اتنے لمبے عرصے میں کبھی بھی تو اشارے سے کسی لفظ سے یہ تک نہیں تھا کہ مجھے چاہتا ہے۔ ہم بہت اچھے دوستوں کی طرح تھے یہ میرا وہم تھا کہ اس کا رنگ اُڑ گیا تھا اور کچھ کہے بنا مُڑ جانے کا جواز یہ تھا کہ اُسے شاید جلدی تھی میں نے ذہن میں بیکار کی تصویر کشی کبھی نہیں کی سر کو جھٹک کر میں شام کی فلائٹ سے واپس وطن آ گئی اور اس ڈر سے کہ مبادا مجھے کوئی لوٹانا دے میں نے مسے لوٹا دیا یہ لوٹا ہی دیا۔ ہائے برباد شدہ میں

کچھ دن اماں اور میں روٹھے رہے شیری اماں کے جانے پر بھی ان کی طرف نہ جاتا۔ میرے سوا اُسے کسی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اماں خوب جز بز ہوتیں مجھے کوستیں ایک دو بار انہوں نے شیری کو ہلکے سے تھپڑ بھی مارے وہ پٹ کر آتا اور میرے پاؤں کے قریب نہایت سعادت مندی سے بیٹھ جاتا۔ زبان نکالے سر ہلاتا ہوا دُرا ہوا بے بس سا اور مجھے اُس کی غریب الوطنی پر پیار آتا پھر میں اُسے سمجھانے لگتی۔

دیکھو شیری تمہیں گھبرانا نہیں چاہیئے تم تو بہت بہادر بچے ہو یہ بڑا اور عدتی کا زمانہ ہے گزر جائے گا پھر تم اپنے وطن لوٹ جاؤ گے۔ جہاں ٹھنڈ ہو گی تم اپنے نرم اور گرم بستر میں لیٹو گے۔ تمہارے ساتھ نُور کھیلا کرے گی۔ وہ تمہیں نہلانے لے جایا کرے گی وہ تم سے بہت پیار کرے گی۔ اصل محبت جس میں دل کا پھول کھلتا ہے، اور کوئی تمہاری پٹائی نہیں کر سکے گا۔ تم نور کے پاس ہر جلنے والی آنکھ سے محفوظ رہو گے۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو ہوتے اور وہ میری ٹانگوں سے اپنا سر ملتا میرے پاؤں کو سونگھتا۔

کیا وہ ابھی تک نور کا اور مہر کا اور رستم کا PET تھا؟ کیا اُس کے جانے سے میں اُداس نہیں ہو جاؤں گی۔ میں سر کو جھٹکتی مجھے پرائے شیری سے جو محض وقت گزاری کے لئے یہاں بھیج گیا تھا اس لگاؤ کا کوئی حق نہیں۔ میں اُٹھ کر اوپر کے کاموں میں لگ جاتی وہ میرا پیچھا کرتا۔ میں کہتی شیری میرے پیچھے مت آؤ وہیں بیٹھو وہ اپنی شفاف نگاہوں سے میری طرف تکتا رہتا۔ عجیب مخمصے میں پھنس گئی تھی میں۔ جب وہ نُور کو دیکھے گا تو اُس سے بھی یونہی چاہے گا۔ یہ اُنسیت کا چکر بھی کیا ہے بھلا۔

میں انسانی فرض سمجھ کر اس کی دیکھ بھال کرتی رہی اُسے نہلانے لے جاتی رہی اس سے باتیں کرتی رہی تاکہ وہ تنہائی محسوس نہ کرے چند دنوں کے لئے

مجھے کسی دوسرے شہر جانا پڑ گیا۔ پھر دوستوں کی ضد کی وجہ سے دو چار دن اور رُکی رہی۔ گھر میں میرا تھا ہی کیا؟ امّاں جن سے اکثر بات بے بات میرا جھگڑا ہو جاتا تھا۔ وہ مجھ سے خواہ مخواہ اُلجھتی تھیں اور میں بھی ان کی بات برداشت نہیں کرتی تھی۔ رسہ کشی چلی ہی رہتی۔ میں انہیں ایک بھاری بوجھ لگتی تھی۔ جسے محسوس کرکے اُن کا جی دہلتا تھا وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر مجھ میں کوتاہیاں اور خامیاں نکالتیں میرے اکیلے پن کو میری بدنصیبی شمار کرتیں۔ اصل حساب تو آدمی کا اپنے سے ہوتا ہے اور امّاں کے اپنے اس حساب میں کہیں گڑبڑ ضرور تھی۔ مجھے دیکھ کر آہیں بھرتیں۔ بہت اُداس اُداس رہتیں مجھے کچھ بھلا نے ہی نہ دیتیں حالانکہ ان کی دوسری بیٹیاں ان کے بیٹے اور بہوئیں کوئی سال دو سال میں ایک آدھ بار ہی اس گھر میں جھانکتا تھا۔ وہ اُن سب کو یاد کرکے روتی رہتیں انہیں پکارتیں خط لکھتیں ان کے لئے دعائیں کرتیں اور میں غصّے کے مارے اپنے کمرے میں اُبلتی اور جلتی رہتی۔

آخر مجھے اُسی قید خانے میں واپس آنا ہوتا تھا۔ میری واحد پناہ گاہ تھا۔

بھونک بھونک کر شیری نے بُرا حال کر لیا۔ خوشی سے پاگل ہو گیا۔ میرا بیگ اپنے قبضے میں کر لیا۔ پرس کو مارے غصّے کے قالین پر گھسیٹتا رہا۔ صوفے پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور مجھے کرنے سے باہر جاتے دیکھ کر کود کر کندھوں پر دونوں، گلے پاؤں سے لٹک گیا۔ عجیب دیوانہ پن سے روتا رہا جیسے خوشی کے بوجھ تلے نہایت پریشان ہو۔ رات جب میں سوئی ہوں دن بھر کی دھول جھاڑ کر خیالوں کی یورش سے بچنے کے لئے میں نے کروٹ بدلی تو شیری آنکھیں بند کئے میرے ساتھ لیٹا تھا۔ میں ہولے ہولے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ طمانیت سکون اور راحت کے شدید احساس کے ساتھ۔ پھر وہ اور قریب آگیا اور اُس نے سر میرے سینے کے ساتھ لگا دیا۔ مجھے وہ لڑکا یاد آیا جو بحری سفر کے دوران جہاز کے عرشے پر مجھے ملا تھا۔

آغازِ شباب میں قدم رکھتا ہوا، تھرتھراتا شرمایا ہوا سادہ ہوا خوری کے درمیان مجھ سے باتیں کیا کرتا۔ بچوں کی سی بے ضرر باتیں سمندروں اور ہواؤں طوفانوں اور لہروں کی بادلوں اور آندھیوں کی جھکڑوں اور سمندری مخلوق کی دریاؤں اور پہاڑوں سے اُسے عشق تھا۔ رنگ سے بے حد پسند تھے۔ مجھے خوبصورت کپڑے پہنے دیکھ کر کبھی کبھی فرمائش کرتا کہ کل میں نیلے رنگ کی ساڑھی پہنوں یہ بے ضرر سی خواہش مجھے بھی خوش کرتی۔ اُسے پھول اچھے لگتے تھے۔ مجھے کہتا اس رنگ میں تم ڈیزی لگ رہی ہو۔ عجیب دیوانہ سا بچہ تھا۔ بیک وقت سمجھدار بھی اور سیدھا بھی۔ ایک شام اُس نے فرمائش کی کہ میں اُس کے ساتھ ناچوں لہروں کی تیز موسیقی پر ہم قدم سے قدم ملائے اُوپر اُوپر بانہوں کے سہارے جھومتے رہے اور جب ہم ایک نسبتاً تاریک گوشے میں گئے تو اس نے اپنا سر میرے سینے سے لگا دیا مجھے اپنے کمزور بازوؤں کے حلقے میں لے لیا اور مجھ سے اس طرح لگا کھڑا رہا۔ عجیب کیفیت تھی۔ سکون کی لہریں سرشاری کے ساتھ اس کے سر سے نکل کر میری ساری ہنسی کو ہلکورے دے رہی تھیں۔ سمندر کی طرح اُس کی معصوم چاہت نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا مجھ پر سے گذرنے لگی۔ سیپ میں بند موتی کی طرح وقت کی موجیں ہم پر سے بہتی رہیں۔

اور اب شیری میرے سینے سے لگا تھا۔ آنکھیں بند کئے گھبرا کر مجھ میں سکون ڈھونڈتا ہو۔ یہ نور کا، مہر کا اور رستم کا نہیں میرا شیری تھا اور میں نے تہیہ کر لیا کہ اب اسے کبھی نہیں لوٹاؤں گی، ہرگز نہیں۔

تعطیلات اور شدید گرمی کے دنوں میں وہ لوگ امّاں سے ملنے آئے۔ شیری کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئے اس ایک سال میں اُس نے خوب قد نکالا تھا۔ اُس کے ڈر کی وجہ سے کسی اجنبی کو گھر میں آنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ لوگوں نے آنا کم کر دیا تھا۔ اماں سخت خفا تھیں۔ آخر میرے سوا وہی تو بس گھر میں رہا تھا ان دنوں خان صاحب زندہ تھے نا اور اسے انہوں نے سر پر نہیں چڑھایا تھا۔ مہر سے کہنے لگیں عجیب جنگلی ہو گیا ہے۔ تم اب کے اسے اپنے ساتھ لے جاؤ میں چپکی یہ سب سنتی رہی۔

میری طرف مڑ کر کہا۔ "جب تم گھر میں نہیں ہوتی ہو اور میں اسے کھانے کو کوئی چیز دوں تو بالکل نہیں کھاتا مجھ پر بھونکتا ہے، وہ برآمدے میں بیٹھا رہتا ہے جب تم آتی ہو تو یہ دکھائی ہی نہیں دیتا چاہے بلیاں گھر میں بھری رہیں اور آوارہ کتے دوڑیں لگاتے رہیں۔

مگر اصل مالکوں کے آنے پر بھی شیری نے کوئی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ دُم ہلا کر اُن کے گرد نہیں گھوما نور سے بھی لبس واجبی سا اظہارِ محبت کیا۔ وہ کھینچ کر باہر لے جاتی تو چلا جاتا، اور پھر فوراً آ کر میرے پلنگ کے نیچے گھس جاتا۔ وہ چنیتی ہوئی مہر سے کہتی "مما شیری بہت بدل گیا ہے۔ بالکل جنگلی ہو گیا ہے۔"

اور مہر کہتی تسلی رکھو بچے، اب ہم اسے ساتھ لے جائیں گے تو اس کی پرانی خوش طبعی عود کر آئے گی یہ تمہارا پیارا شیری بن جائے گا میں چپ رہتی اُن کا ارادہ پر جی ہی میں ہنستی اور کُڑھتی بھی کیا میں نے مہر کو منع نہیں کیا تھا کہ وہ اُسے یہاں نہ بھجوائے اور میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ یہ ہمدردی کا ان دیکھا رشتہ جو شیری کے اور میرے درمیان قائم ہو گیا تھا، اس میں حالات کا دخل تھا نہ شیری کا اور نہ میری مرضی کا جیسے وقت کے سمندر پر بہتے دو تنکے کسی تند ہوا کے زور سے یک دوسرے

کے ساتھ پیوست ہو جائیں۔ محبتیں جو مجھ سے کی گئیں اُن میں میری مرضی تو شامل نہ تھی میرے لئے تو اب ہر شے بیکار تھی اور پھر کسی نے مجھے اتنا کب چاہا تھا کہ میں اس کے دامن سے لگ جاؤں۔ مجھے اُس رات کی اپنی زردہ روتی ہوئی صورت اکثر یاد آتی۔ وہ کون تھی؟ جس کے آنسوؤں میں اس کا دل بہہ گیا تھا۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر احساسِ ذلت سے لوٹائے جانے کے درد سے میں اب بھی بے تاب ہو جاتی تھی۔

اُس دن گرمی سخت تھی۔ نور اور رستم شیری کو ٹہلانے لے جانا چاہتے تھے۔ مجھے دخل دینے کا کوئی اختیار تو نہیں تھا مگر میں نے کہا تھا۔

نور ابھی نہ لے جاؤ دن کو ذرا ٹھہرنے دو شام کو آنے دو ہوا میں خنکی ہو لے پھر جانا۔

اُس نے کندھے اچکائے باپ کی طرف دیکھا اور شیری کو میز کے نیچے سے نکالنے کے لئے اس کے کالر کو کھینچا۔ شیری نے زچ ہو کر اور کوئی داؤ فریب نہ پا کر اس کے ہاتھ پر کاٹ لیا۔ مہر نے چیخ چیخ کر گھر کو سر پر اٹھا لیا۔ سب ایک ساتھ چیخ رہے تھے نور شکست اور تکلیف کے احساس سے زمین پر لیٹ رہی تھی۔ اماں نے جوان کے جی میں آیا کہا۔ اگلی پچھلی تمام تلخیاں انہیں یاد آگئیں خوب خوب انہوں نے مجھے کوسا اور گھر میں فضا یک دم سخت کشیدہ ہو گئی۔ رات شیری نے لیٹ کر سختی سے سر میرے سینے کے ساتھ لگا دیا۔ وہ شاید اپنی غلطی پر نادم تھا اور اپنے آپ کو اتنے شور و غل کا قصور وار سمجھتا تھا۔

تم بیوقوف ہو بچے وہ آخر چلے جاتے نور لئے بہر حال تم سے زیادتی کی ہے۔ تم بہت جلد باز ہو وہ دم سادھے پڑا رہا۔ میرے ہاتھ کے نیچے بالکل ساکن اور سویا ہوا اور نہایت خوش،

سرگوشیوں میں باتیں ہوتیں مجھ سے ہر بات چھپائی جاتی اماں کی اور میری بول چال بند تھی۔ ہم دونوں میں اور شیری گویا ذات برادری باہر کر دیئے گئے تھے۔ کھانا دو مرحلوں میں کھایا جاتا یا پھر میں اپنے کمرے میں کھاتی اور شیری کو بھی وہیں کھلاتی۔ جب میں کام پر چلی جاتی تب بھی کوئی اُس کو نہیں بلاتا تھا آخر وہ کب تک میری پناہ میں رہے گا آخر اسے ان کے ساتھ ہی تو جانا تھا۔ جیسے جیسے اُن کی روانگی کے دن قریب آ رہے تھے میرا ارادہ بھی پختہ ہو گیا تھا۔

میں نے اپنے اور شیری کے لئے ریل میں سیٹ بک کروائی سامان اپنی ایک دوست کی معرفت اسٹیشن بھجوایا۔ اُس دن شام کو معمول کے مطابق میں اسے ٹہلانے کے لئے باہر لے گئی اور ہم مخالف سمت میں اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ جب انہیں پتہ چلا تو کیا ہوا یہ ایک الگ داستان ہے۔ اُن کی ہاؤ ہو کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہر نے عدالت میں حدود آرڈیننس کے تحت میرے خلاف ایک مقدمہ دائر کر دیا جو اس کے چلے جانے اور عدم پیروی کی وجہ سے بالآخر خارج ہو گیا۔

شیری اور میں مری سے لوٹ آئے۔

اماں کچھ دنوں سخت خفا رہیں پھر جب برف پگھلی اور شدید تنہائی نے انہیں ہراساں کیا تو کہنے لگیں۔

اچھا ہو شیری نہیں گیا تھوڑی رونق رہتی ہے۔

میں اماں سے کیا کہتی کہ اماں اس دھندلی بیکار زندگی میں اس خالی گھر میں میرے آنے پر کوئی تو ہوتا ہے جو محبت سے میری راہ دیکھتا ہے۔ اچھلتا کودتا اظہارِ شوق کرتا اور میرے پیچھے پھرتا ہے۔ میرے قدموں پر لوٹتا ہے۔ میرے سینے پر سر رکھ کر مجھے سکون دیتا ہے۔ ہمک کر میری باہوں میں آنے کی کوشش کرتا ہے۔ مجھ پر اپنا مکمل حق سمجھتا ہے۔ بھلا ٹوٹ کر ایسا کسی نے مجھے کبھی چاہا ہے۔ ملنے والے کہتے ہیں "جیسا تم شیری کو چاہتی ہو ایسا تو بہت کم مائیں اپنے بچوں کو چاہتی ہیں" میں اُن کی آواز میں چھپے طنز کو سمجھتی ہوں، اگر یہی محبت تو اب میری زندگی ہے وہ میرا محبوب میرا ہمدم میرا ساتھی ہے۔ جب سب طرف سناٹا ہوتا ہے تو میں اُس سے اپنے دل کی باتیں کہتی ہوں اس کو کھوئی ہوئی چاہتوں کے تذکرے سناتی ہوں۔ محبتیں جو مجھ تک پہنچ نہ پائیں اور چھین گئیں۔ لگاؤ جو میرا مقدر نہ بن سکے۔ وہ سارے گزرے لوٹ جو جانے والوں کے لئے میرے دل میں بند تھے میں نے شیری کو سنائے اُس کے سینے میں میرے راز ہیں وہ مکمل ساتھی ہے جب وہ مجھے کام میں منہمک دیکھ کر تعرض نہ کرنے والا، میری کیفیات میری خوشی میرے غم سب اُس پر عیاں ہیں وہ نبض کی طرح میرے دل کے ساتھ دھڑکتا ہوا۔ انسانوں کی محبتوں میں یہ گرمجوشی اور خود سپردگی کہاں ہوتی ہے۔ شیری تو میرے لئے جان سے گزر سکتا ہے۔

مہر کے ساتھ مقدمہ کے سلسلے میں میری ایک مجسٹریٹ سے ملاقات ہوئی میرے کاموں میں اس نے بہت دلچسپی لی پھر آہستہ آہستہ ہماری ملاقات بڑھ گئی میں جب دفتر سے آتے ہوئے یا ادھر سے گزرتے ہوئے اس کے پاس چلی جاتی کافی کا پیالہ پی کر ادھر اُدھر کی گپ ہوتی شیری کی باتیں اس کی ذہانت اس کی چالاکیاں گھر میں اُس کی رونق زندگی میں اس کا مقام وہ سنتا اور دلچسپی سے یہ سب سنتا مگر اُس نے کبھی یہ نہیں کہا کہ وہ شیری کو دیکھنا چاہتا ہے۔ عجیب آدمی تھا۔ اب میں اُلجھنے لگی تھی۔ بھلا وہ کیوں شیری کو نہیں دیکھنا چاہتا۔ ہماری دوستی بڑھتی بھی رہی اور اُس میں دراڑ بھی پڑتی گئی۔ میرا جی چاہتا وہ مجھ سے شیری کی باتیں

پوچھنے پھر میں نے محسوس کیا جب میں شیری کی بات کرتی ہوں۔ وہ توجہ سے نہیں سنتا کوئی اِدھر اُدھر کی کہانی سنانے لگتا ہے اپنی زندگی کے خلاؤں کا ذکر اپنے دکھوں اور ارمانوں کا تذکرہ اپنی دائم المریض بیوی کی بیماری کے عذاب کے قصے اپنی تنہائی کے کرب کا فسانہ اپنی خالی خولی بیکار زندگی کا المیہ جس میں پارسائی اور بے رنگی کے سوا کچھ نہ تھا۔ خدا کے ساتھ اپنے تعلقات کا کہتا جو کبھی اُستوار نہ ہو سکے تھے۔ خوابوں اور پرچھائیوں کی سی داستان۔ پتہ نہیں وہ مجھے کیا کہنا چاہتا تھا کیا سمجھ نا چاہتا تھا؟ میں جو خوش وقتی گپ اور ذہنی آسودگی کے لئے اس کے پاس چلی جاتی تھی اس کی کیا مدد کر سکتی تھی بھلا۔ کیا ہلکی پھلکی دلچسپی کا دھارا کسی اور رُخ پلٹنا چاہتا تھا۔ ایک دن اُس نے پوچھا۔

"تم شیری سے ایک جانور سے اتنی شدید بے پناہ محبت کیوں کرنے لگی ہو جبکہ کئی اور انسان اُس سے زیادہ توجہ کے مستحق اور متمنی ہیں"۔ اس کی ہنسی بڑی معنی خیز تھی۔ پہلی بار مجھے شدید ذہنی دھچکا لگا۔

"اور پتہ ہے لوگ کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ تمہارے متعلق" اُس نے آنکھیں جھکا کر کہا۔

"لوگ کس کس کی کہانیاں نہیں کہتے جناب" میں کھڑی ہو گئی میں کانپتی رہی۔ غصے اور رنج سے۔ دنوں میں اُدھر سے نہیں گزری پھر مہنا اس کا تبادلہ ہو گیا۔ اس سال گرمی شدید پڑی لگتا تھا قیامت اس سے زیادہ کیا ہو گی۔ ریت کے جھکڑ چلتے، آسمان زرد گرد کے بادلوں کے پیچھے چھپ گیا تھا جو نہ برستی تھی اور نہ ہٹتی تھی بس عجیب ریزہ ریزہ ہو کر وجود کو دہکاتی تھی اور گھٹن اتنی تھی کہ سانس رُکتا ہوا لگتا تھا۔ کمروں میں بھی پناہ نہ ملتی میں شیری کو دیکھتی کہ اُس کی آنکھیں زرد ہوئی جاتی ہیں وہ بہت کم جاگتا اور نہلائے جانے کے باوجود گرمی کی لپٹیں اُس کی سانس سے نکلتی تھیں۔ برف کا بلاک منگو کر میں کمرے میں رکھتی آگ برساتا ہوا پنکھا اور کولر کچھ نہ کر سکتے۔ شیری دن بدن گھلتا جا رہا تھا میں اُسے تسلی دیتی جی سے لگاتی۔

شیری ہمت پکڑو یہ ذرا سے سخت دن یونہی نکل جائیں گے۔ موسم بدلے گا گرد بیٹھ جائے گی مزیدار سردی آئے گی اب کے دیکھنا خوب ہڈیوں کا گودا جمانے والی ٹھنڈ پڑے گی تمہارے دلہن کی طرح میرے لاڈلے میں تمہارے لئے کڑھنے کے سوا اور کیا کر سکتی ہوں اگر اماں کا بڑھاپا نہ ہوتا گھر میں کوئی اور ہوتا میرے وسائل ہوتے تو میں تمہیں کسی ٹھنڈے پرسکون خطے میں لے جاتی میرے چاند حوصلہ رکھو مردوں کی طرح مقابلہ کرو۔ میں اُس کے سنہرے بالوں پر ہاتھ پھیرتی جو اس کی کھال کو چھوتے تو بخار کا احساس ہوتا۔ وہ ذرا سی غُٹ غُف کرتا۔ میں بے تاب ہوتی اسے میں کیا کر سکتی تھی۔ اپنے پیارے کے لئے اُس اجنبی کے لئے اُس پردیسی کے لئے۔

مہر کا تار آیا رستم کی طبیعت سخت خراب تھی وہ ہسپتال میں تھا۔ نورا کیلی تھی اور پردیس میں تھی اماں کو بُلوایا تھا۔

اماں نے کہا تم چلی جاؤ نا آخر بہن ہو مجھ سے تو پلا بھی نہیں جاتا میں اس کے کس کام کی ہوں گی۔ پچھلی باتیں بھول جاؤ۔ اُسے معاف کر دو۔ شیری کو اس حال میں چھوڑتے ہوئے میرا دل اتھل پتھل ہو رہا تھا مگر مجبوری تھی ہائے میں کیا کروں۔

اماں نے کہا تم فکر نہ کرو میں یہاں گھر پر اس کی خوب دیکھ بھال کروں گی۔ روانہ ہونے سے پہلے میں نے برف والے کو تاکید کی کہ وہ روز بلاک خود کمرے میں رکھ جایا کرے۔ الماری میں قریبا سامنے میں نے دوائیاں۔ بسکٹ ضروری سامان رکھ دیا تاکہ ضرورت پڑنے پر ڈھونڈنے میں تکلیف نہ ہو۔ جاتے ہوئے میرا دل بجھ رہا تھا میں دروازے میں سے پلٹ آئی شیری آنکھیں موندے بیمار اور گرمی کی شدت سے تپ رہا تھا۔ سینے سے لگا کر میں نے اُس کے کان میں کہا شیری میں جلد لوٹ آؤں گی گھبرانا نہیں۔ بس یوں محو ہو گئی اور آئی۔

حسبِ خلافِ توقع مجھے زیادہ دن ٹھہرنا پڑا رستم پر دل کا جان لیوا دورہ پڑا تھا اور وہ بہت آہستہ صحت کی طرف واپس آ رہا تھا۔

اماں کا فون آتا مہر بہت دھیمے سُروں میں بات کرتی بڑی عمر تک ہوتی مجھے بھی اُس پر ترس آتا کبھی کبھار کہتی اماں تمہارا پوچھ رہی تھیں، خیریت سے تھیں۔ رستم کے لئے نہایت فکرمند تھیں مگر اپنی صحت کی وجہ سے آ نہیں سکیں۔ میں اُس سے یہ نہ کہہ پاتی کہ اب کے جب اماں کا فون آئے تو شیری کا بھی پوچھ لینا۔

جس دن ڈاکٹروں نے اطمینان کا سانس لیا، اور رستم کی حالت کو خطرے سے باہر قرار دیا، مہر کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو اور اس کے چہرے پر رونق آئی میں نے اُس کے منع کرنے کے باوجود اپنی سیٹ بُک کروالی۔

آخر جلدی کیا ہے تمہیں، اماں کی خیریت تو معلوم ہو ہی جاتی ہے یہاں سے تار دے کر چھٹی بڑھوائی جا سکتی ہے۔

بس اب میں جانا چاہتی ہوں شیری بیمار تھا

اپنی ساری کیفیت کو آواز میں بھر کر اس نے کہا "اوہ" اور پھر پلٹ کر شیری سے کہنے لگی گر وہ نہ رہا تو تم بیوہ تو نہیں ہو جاؤ گی۔ میں اس کے گھر میں اُس کے شوہر کی تیمارداری کے لئے مصیبت میں شریک ہونے کی خاطر اتنی دور سے آئی بیٹھی تھی اور وہ مجھے شیری کے طعنے دے رہی تھی۔ جب اس سے مزید بات کئے میں رہا نہ گیا تو ائیر پورٹ آ گئی۔

گھر میں سب طرف عجیب سناٹا تھا حالانکہ دن کے تقریباً دس بجے تھے۔ سب ابھی تک سوئی ہوئی تھیں۔ کمروں میں اِدھر اُدھر دیکھتی شیری کو پکاری میں۔ مدت تک شیری اپنے وجود کا سایہ لگ رہا تھا سہما ہوا گھٹا ہوا۔ اس کے پاس جھک کر میں نے پکارا، شیری دیکھو میں آ گئی ہوں۔

نقاہت کی وجہ سے اس کی آنکھیں بھی نہیں کھلیں۔ ہلکے سے مسکرا کر کے بہن سی چوں کر کے رہ گیا۔ میں نے اُس کے سر کو سہلایا، شیری! شیری! میں نے زور سے پکارا۔

اماں کہنے لگیں تمہیں میں نے مہر سے کہلوایا تو تھا کہ شیری سخت بیمار ہے وہ بھی دُکھی ہو رہی تھیں۔

میں بھاگی ڈاکٹروں کو فون کئے دُعا کرتی رہی خدا سے میں نے کہا۔

"دیکھ اگر تو نے مجھ سے شیری لے لیا تو میں تیری ہستی میں یقین کرنا چھوڑ دوں گی۔ اگر تجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تو مجھے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تیرا خیال ہے تیری اس دنیا میں محبت کی روشنی کے بنا جیا جا سکتا ہے؟ اتنے گہرے اندھیرے تو نے بنائے ہیں، کیا اُجالے کی ایک کرن دینے کا بخل بھی نہیں کرنا چاہتا۔ تو سنتا ہے کہ نہیں یہ چاہنے والی آنکھیں ہیں انہیں بے نور نہ کر یہ اُلفت بھرا دل ہے اسے دھڑکنے کے لئے چھوڑ دے!"

مگر وہ آسمانوں پر کہیں دور بیٹھا جانے کس تانے میں کونسا بانا پرونے میں مگن تھا کہ اس نے میری بات سُنی ہی نہیں۔ پتہ نہیں وہ کیوں مجھ سے خفا تھا کہ اُس نے میری تڑپ کا کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ ڈاکٹروں کی ساری بھاگ دوڑ بیکار گئی۔

پھر میں بیوہ ہو گئی۔

اماں نے کہا" وہ تو تمہارے جاتے ہی سخت بیمار ہو گیا تھا میں بے آس تھی مگر پتہ نہیں کیسے اتنے دن تمہارے انتظار میں جی لیا۔ اپنے طور پر میں ڈاکٹروں سے علاج کروایا تھا، تم مجھتی نہیں ہو مجھے بھی اُس کی بہت پرواہ تھی بڑی رونق رہتی تھی اس کی وجہ سے!"

میرا دل ایک ویرانہ تھا جس میں تیز غم ناک آندھیوں کے شور کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ اذیت اور بے چارگی نے میرے دل کو مسل کر رکھ دیا۔ یہ ایک جانکاہ عذاب تھا۔ جس کا اس سے پہلے میں نے کبھی تجربہ نہیں کیا تھا تب بھی نہیں جب میرے اُس کا دل زیبا کی طرف سے اپنی طرف لگانا چاہا تھا۔

بے خواب راتیں تاریک دن صرف ایک ہی خیال تھا کہ شیری نے میرے لئے کتنی اذیت برداشت کی، آخر کیوں کی؟

اور اب وہ سب مجھے یاد آتے ہیں شیری کے پیچھے وہ سب۔

وہ جو کبھی میری راہوں سے گزرے میں جو کبھی ان کی راہوں میں آئی۔

کیا آدمی اتنی بے ریا بے لوث بے پایاں محبت کرنے کا اہل ہے؟

جولائی ۸۷ء

ان کی زبان رواں، شستہ اور ابہام سے خالی ہے۔
ان کے یہاں فنی نئے استعارات اور کلاسیکی دونوں ہیئت میں علیحدہ علیحدہ بخوبی موجود ہے۔ اس کی کوئی مخلوط النسل (HYBRID) شکل نہیں ہے۔
وہ خود کسی بیمار ذہن کی نمائندگی نہیں کرتے، اس کی عکاسی ضرور کرتے ہیں۔

حسن منظر

عکس تحریر: احسن منظر

# آسیب

حمید کاشمیری

اونچے اونچے سر بفلک پہاڑوں کے نشیب میں ایک سرسبز و شاداب وادی میں زرد آلو، آلوچے اور ناشپاتی کے درختوں میں گھرا ہوا ایک حویلی نما بوسیدہ مگر وضعدار مکان ہے۔ مکان کی چھت لوہے کی چادروں کی ہے۔ اور دیواریں پکے پتھر کی۔ جن میں سیمنٹ کی ٹیپ کی گئی ہے۔ مگر دیواروں میں ہلکے ہلکے شگاف سے پڑ گئے ہیں۔ دروازوں کا رنگ اڑا ہوا ہے۔ اور روشندانوں کے شیشے ٹوٹے ہوتے ہیں۔ مکان کے عقب میں انار کا ایک بہت بڑا جھنڈ دار درخت ہے۔ جس پر گزشتہ کئی برس سے جنات کے قابض ہونے کی خبر مشہور ہے۔ احاطے کے گرد کافی وسیع رقبے میں ایک ٹوٹی پھوٹی زنگ آلود کانٹے دار باڑھ لگی ہوئی ہے۔ اور جو اس درجہ شکستہ ہو چکی ہے کہ چوپائے تک آسانی سے اندر داخل ہو سکتے ہیں۔ مکان سات برس سے غیر آباد ہے۔ سات برس پہلے جب مکاندار احاطے میں رہتے تھے تو یہ کانٹے دار باڑھ جالی سے بھی زیادہ باریک بنی ہوئی تھی جس میں سے چڑیاں تک بھی اندر داخل نہ ہو سکتی تھیں اور نشیبی بستیوں کے لوگ جب دودھ، گھی اور مکھن وغیرہ فروخت کرنے کے لیے صبح صبح چھاؤنی جاتے تھے تو انہیں احاطے کی وجہ سے بہت لمبا راستہ طے کر کے احاطے کے اوپر والے راستے میں پڑنا پڑتا تھا۔ مگر اب جبکہ باڑھ ٹوٹ ٹاٹ گئی ہے تو گاؤں والوں نے، احاطے کے بیچ میں سے چلنا شروع کر دیا اور جیسے صدیوں پرانی پگڈنڈی سی بن گئی اور مکان کے بائیں جانب سے نکلتے ہوتے چشمے پر دیہاتی عورتوں نے کپڑے دھونے اور مویشی نہلانے شروع کر دیئے اور اسی چشمے کو دیکھنے کے لیے دیہاتی عورتیں ترساکوئی شخص مکان کی رکھوالی اور احاطے کی دیکھ بھال کے لیے پورے سات برس سے خانو بڑھئی کو ماہانہ منی آرڈر مل رہا ہے مگر خانو پھر بھی احاطے کی حفاظت نہ کر سکا۔ گاؤں والوں کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ چلی۔ سارے گاؤں کا گاؤں مستفید ہو رہا تھا۔ گاؤں والوں نے تو خانو کو احاطے کا پھل تک نہیں بیچنے دیا حالانکہ اسے اجازت مل چکی تھی کہ وہ پھلوں کو بیچ کے اپنے لیے روپیہ حاصل کرتا رہے۔ بس خانو بے چارہ تو اپنا منہ تکتا رہ گیا اور مکان اور احاطے کو گاؤں والوں ہی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ کبھی کبھار منی آرڈر کے ساتھ جب خط بھی آجاتا اور احاطے کی اور احاطے کے حالات دریافت کیے ہوتے تو خانو ہر چیز کی خیر خیریت کی اطلاع دے دیتا ۔۔۔۔۔

ساتویں کے سال کے "سیزن" میں جب ایک بار خانو کو مالکن کا خط ملا کہ وہ گرمیاں گزارنے پہاڑ پر آ رہی ہیں لہٰذا مکان صاف کر دیا جائے، تو خانو نے اس خط کو کوئی اہمیت ہی نہ دی، وہ جانتا تھا کہ مالکن نہیں آئے گی۔ اسے قریباً ہر سیزن میں ایک ایسا ہی خط مل جایا کرتا تھا۔ مگر دوسرے ہی روز اچانک اسے ایک تار ملا دیکھتے ہی خانو نے پھوٹ پھوٹ کے رونا شروع کیا اور روتے روتے جب اچانک اسے خیال آیا کہ اس کا پردیس میں کوئی مرنے والا ہی نہیں تو قدرے تسلی ہوئی اور جب چھاؤنی جا کر اس نے تار پڑھوایا تو اسے پکا یقین ہو گیا کہ مالکن اسی مہینے کی سولہ تاریخ کو پہاڑ پر آ رہی ہیں۔ اگرچہ مکان برسوں کی دھول سے اٹا ہوا تھا اور کمروں میں جا بجا مکڑی کے جالے لٹک رہے تھے لیکن پھر بھی خانو نے ایسی محنت سے صفائی کی تھی کہ مکان کا گوشہ گوشہ چمک اٹھا تھا اور بستے گھر کی سی رونق آ گئی تھی مقررہ تاریخ

کو جب ریل گاڑی ۔ بس تانگہ اور پھر طویل پیدل سفر کرنے کے بعد جب ۔ مالکن اپنی دو جوان لڑکیوں اور ایک کمسن لڑکے اور سامان اٹھائے ہوئے قلیوں کے ساتھ پہاڑ کی ڈھلی سے نیچے نشیب کی طرف اتر رہی تھی تو راستہ چلنے والوں کی آنکھیں جیسے چکا چوند ہو گئیں ۔ مالکن جب سے گئی تھی تو اس وقت رفعت اور رضیہ دونوں چھوٹی چھوٹی گڑیا سی تھیں ، مگر اب تو نقشے ہی بدل گئے تھے ۔ جوانی تھی کہ سیلاب کی طرح امڈی چلی آ رہی تھی ، انگاروں کی طرح دہکے ہوئے چہرے ۔ چست لباس سے پھوٹ پھوٹ کے نکلتا ہوا جسم ، دلکش انداز سے پھیلے ہوئے سینے ، جدید وضع کے بنائے ہوئے بال ، پیشانی پر مدلن مانڈ ٹائپ کے بالوں کے گچھے ۔ اور آنکھوں پر سرخ فریم والا سیاہ چشمہ ، جس کے فریموں کا رنگ ہونٹوں کی لپ اسٹک سے میل کھاتا تھا ۔ گاؤں کے جس شخص نے بھی رستے میں انہیں دیکھا اسے اپنی آنکھوں پر دھوکا سا ہونے لگا ۔ خانو بوڑھے کی جب نظر پڑی تو وہ ہانپتا ہوا ڈھلی کی طرف استقبال کے لیے بھاگا ۔ بڑے احترام سے مالکن کے پاؤں چھو کر سلام کیا ۔ پھر لڑکیوں کی طرف متحیر نظروں سے دیکھا کچھ کہنا چاہا مگر جرأت نہ ہوئی ۔ سلام کر کے رہ گیا ۔ احتراماً رفعت کے ہاتھ سے اٹیچی کیس لے لیا اور فاصلہ قائم کر کے پیچھے پیچھے چلنے لگا ۔ اور مکان تک اسی خدمت گزارانہ انداز سے چلتا رہا ۔ ۔ ۔ ۔

مالکن تو بہت خوش تھی جیسے کوئی نئی نویلی دلہن میکے لوٹ رہی ہو ۔ لیکن رفعت اور رضیہ کچھ عجیب اجنبی اجنبی انداز سے مکان کو گھورتی ہوئی اندر داخل ہوئیں ۔ ایک ایک کمرے میں گھس کر اچھی طرح دیکھا ۔ کھڑکیوں اور کواڑوں کو کھینچ تان اور کھول بند کر کے جائزہ لیا ۔ پھر امی کے کہنے سے سارا سامان مناسب جگہوں پر قرینے سے رکھا ۔ کتابیں صندوق سے نکال کر شلف میں سجا دیں ۔ فالتو سامان پچھلی کھوٹی میں رکھوا دیا ۔ تین کمروں میں تین پلنگ بچھا کے بستر لگا دیئے ۔ اور پلنگ پوشوں سے ڈھانپ دیا ۔ امی نے دوپہر کا کھانا تیار کیا ۔ تینوں ماں بیٹیوں اور ننھے جاوید نے مل کر کھانا کھایا اور کھانے کے فوراً ہی بعد تھکان نے ایسی نیند غالب کی کہ شام تک گھر کا گھر سویا رہا ۔ اور خانو صحن میں بیٹھ بچے کھچے کھانے کی ہڈیاں چچوڑتا رہا ۔

امی نے لمحہ بھر کے لیے جو کروٹ بدل کے نیم خوابی کے عالم میں آنکھ کھولی تو اچانک ان کی نظر دیوار پر لگے ہوئے کلاک پر پڑی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں آنکھیں ملتی ہوئی رفعت کے کمرے کی طرف آئیں ، وہ ابھی تک گہری نیند سو رہی تھی ۔ انہوں نے رفعت کو جھنجھوڑ کر جگایا اور پھر لپک کر رضیہ کو بھی اٹھایا ۔ ننھا جاوید ابھی تک سو رہا تھا ۔ اسے سوتا ہوا ہی چھوڑ کر تینوں آنکھیں ملتی ہوئی باہر صحن میں نکل آئیں ۔ خانو بدستور چوکی پر پہرے داروں کے انداز سے بیٹھا تھا ۔ انہیں دیکھتے ہی احتراماً اٹھ کھڑا ہوا ۔

" ہم بہت دیر سوئیں تم نے جگایا کیوں نہیں " امی نے خانو سے کہا ۔

" میں نے سوچا آپ بہت تھک گئی ہوں گی اس لیے ۔ ۔ ۔ ۔ " خانو نے جواز پیش کیا ۔

" اچھا بتیاں صاف کر کے جلا دو " رفعت نے حکم دیا ، اور تینوں ماں بیٹیاں منہ ہاتھ دھونے کے لیے چشمے پر چلی گئیں ۔ جھرنا بوستانی نالے کی سی تیزی سے بہہ رہا تھا اور پانی میں برف کی سی خنکی اور ہلکی ہلکی مٹھاس تھی ۔ چشمے کے گرد بے ڈھب پتھروں کی قد آدم دیوار لگی ہوئی ۔ تھی اور پانی کی شدت کی وجہ سے دیوار کی دراڑوں اور سطح زمین پر لمبی لمبی ہری گھاس اگی ہوئی تھی جو آئے دن مویشیوں کا چارہ بننے کے باوجود گز بھر اونچا قد نکالے ہوئے تھی ۔ امی دیوار کے پیچھے جا کر دیر تک صرف پانی کے پھوٹتے ہوئے دھارے کو دیکھتی رہیں جو بدستور سات سال پہلے کی سی شان کے ساتھ بہہ رہا تھا جب کہ ہر چیز خورد برد ہو گئی تھی ۔ کتنے ہی درخت گاؤں والوں نے کاٹ دیئے تھے ۔ احاطے کے گرد لگی ہوئی باڑھ کھا دی گئی تھی کھیتوں کی مینڈیں گرا دی گئی تھیں ۔ کھڑکیوں اور روشندانوں کے بیشتر شیشے ٹوٹ گئے تھے مگر اس پانی کا غرور قائم تھا ، اس کی ساخت میں رتی بھر فرق نہ آیا تھا ۔

" امی جلدی سے فارغ ہو جاؤ " چشمے کی دیوار کے باہر سے رفعت چیخی ، اور امی نے جلدی جلدی منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے شروع کئے اور

اس کے بعد رضیہ اور رضیہ کے بعد جب رفعت اندر گھسی تو اس کا جی چاہا کہ اس پانی کو اپنی نس نس میں سمو لے۔ اس نے ایک نظر اوپر پہاڑ کی چوٹی پر دیکھا جہاں سورج کی زرد زرد کرنیں اب بھی موجود تھیں۔ اور تاریک سائے ان کرنوں کو ہڑپ کرنے کے لیے بادلوں کی طرح نشیب سے اوپر کی طرف بھاگ رہے تھے۔ رفعت نے اونچی ہو کر دیوار کے باہر جھانکا تو امی اور رضیہ کھڑی انتظار کر رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے کپڑے اتار دیے، ہوا کے تیز جھونکوں نے اس جسم کا محاصرہ کر لیا، اس نے بازو سکیڑے اور سمٹ سمٹا کر جسم سے جھر جھر بہتے پانی کے نیچے دبک گئی۔ اور اس نے عجیب لطافت سی محسوس کی اس اشنان میں جو شہر میں اسے سو سال تک بھی میسر نہ آ سکتی۔ اور اگر امی اور رضیہ باہر سے چلا نہ اٹھتیں تو نجانے رفعت کتنی دیر تک یونہی پانی میں دبکی رہتی۔ جب وہ نہا کر چشمے سے باہر نکلی تو اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ گاؤں کی دوسری دنیا میں آنے کے بعد کسی تیسری دنیا میں آ گئی ہو۔ وہ سر سے پاؤں تک ٹھنڈک محسوس کر رہی تھی، اس نے ہلکی سی ایک جھرجھری لی۔ امی نے گھوم کر دیکھا اور بولیں۔

"واہ یہ بھی کوئی نہانے کا وقت تھا۔"

"بس ہماری مرضی" رفعت اٹھلائی۔

پھر تینوں ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے گھر کی طرف چلنے لگیں۔ مکان کے عقب میں جب وہ انار کے جھنڈ وار درخت کے پاس پہنچیں تو امی باتیں کرتی کرتی ایک دم خاموش ہو گئیں۔ اور دبے پاؤں چلتے ہوئے زیر لب کچھ پڑھنے لگیں اور انگلیوں کی پوروں پر انگوٹھے کی نوک سے ہلکی ہلکی چوٹیں سی دینے لگیں۔ رفعت نے بھی دیکھا دیکھی دھیرے دھیرے کچھ پڑھنا شروع کیا۔ اور رضیہ سمٹی سکڑتی ہوئی امی اور رفعت کے کندھوں کے ساتھ جیسے چپک گئی۔ مکان کے پچھیے کا چکر کاٹ کر جب وہ صحن میں پہنچیں تو امی نے سکوت توڑا "ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔۔۔"

"تمہیں کیا ہو گیا تھا امی تم دونوں کو" رضیہ نے بات کاٹتے ہوئے بڑی تشویش سے پوچھا۔

"سب بتا دوں گی" امی نے تھپک دیا۔



رفعت تو سات سال پہلے بھی، اگر جوان نہیں تھی تو بچی بھی نہیں تھی، ایک ایک بات اس کے حافظے میں محفوظ تھی۔ مگر رضیہ تو گاؤں سے متعلق ایک خواب کی سی کیفیت رکھتی تھی، جیسے یہ جگہ اس نے کبھی کہیں کسی زمانے میں دیکھی ہو۔ اور امی نے اس رات اسے بہت سارے قصے بتاتے تھے۔ جن کے اظہار کی کبھی شہر میں فرصت ہی نہ ملی تھی اور اگر فرصت ملی تھی تو ضرورت ہی نہ محسوس ہوئی۔ اور جب بات انار کے پیڑ تک پہنچی تو خانو جو صحن میں سہما ہوا آ گیا اور اپنی معلومات کا دفتر کھول بیٹھا۔

"کیا بتاؤں بی بی جی" وہ جبڑے پھیلا کر بولا اور رفعت اور رضیہ سراپا گوش ہو گئیں۔ "منگھو کمہار کے لڑکے نے ایک دفعہ بھولے سے۔۔۔ کہیں انار کے نیچے پیشاب کر دیا۔ بس اٹھ کے چار ہی قدم چلا ہو گا کہ گھوٹ پڑ گئی اور لڑکھڑا کے گر پڑا۔ میری نظر پڑی تو میں نے سنبھالا دے کر گھر تک پہنچا دیا۔ مگر کیوں جی، گھر پہنچتے ہی لگا وہی بتاہی بکنے۔ دو تین دن تک جن اس کے قالب میں بولتا رہا۔ منگھو کمہار بیچارے کا وہی ایک سہارا تھا۔ اپنا سر پیٹ ڈالا۔ پیر فقیر بلائے مگر سب جواب دے گئے۔ میاں خیر نے ایک گھنٹے تک کلمے پڑھ پڑھ کے پھونکا۔ کوئی اثر نہ ہوا۔ سائیں دتے نے دھاگے کی ایک گولی میں ورد کی پانچ سو گرہیں لگائیں مگر سب بے کار۔ منگھو کمہار نے بڑی تلاش اور خوشامد کے بعد بیس روپے پیشگی دے کر پیر دلی اللہ شاہ کو شہر سے بلوایا۔ پیر صاحب نے پوری کوشش کی مگر کچھ نہ بنا کہنے لگے جن ہندو ہے اور خطرناک بھی جو بھی نکالے گا اسی کے سر چڑھ جائے گا۔ مولوی الہ دین نے جب معاملہ خطرناک دیکھا تو صاف مکر گئے کہنے لگے میں نے جن نکالنے کا دھندا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اور منگھو کمہار بے چارہ، چاروں طرف سے نا امید ہو گیا مگر دوسری ہی رات جن نے خود ہی کالے بکرے کا صدقہ مانگا۔ منگھو کمہار نے اس وقت حامی بھر لی اور جن نے لڑکا بھی چھوڑ دیا مگر منگھو نے جب مہینہ بھر تک بھی صدقہ نہیں دیا تو لڑکے ہی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اسے ایسا تاپ چڑھا کہ بیچارہ ٹھکانے ہی لگ گیا۔"

خانو بات ختم کر چکا تو رفعت اور رضیہ نے ایک جھرجھری سی لی اور خوف زدہ چہروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں، لیکن امی کے چہرے پر خوف کے کوئی آثار نہیں تھے اور ننھا جاوید ابھی تک سو رہا تھا۔

"ایک دفعہ یوں ہوا کہ ....." خانو نے دوسرے قصے کا آغاز کیا لیکن امی نے لڑکیوں کے تیور دیکھ کر خانو کو چپ کر دیا اور باتوں کا موضوع بدل گیا، مگر رات بھر رفعت اور رضیہ کے ذہن میں جن کا ہلکا ہلکا تصور رہا ....

دوسرے دن صبح صبح جب چڑیاں چہک چہک کر درختوں سے اڑ گئیں۔ اور سورج کی روپہلی روشندانوں سے چھن چھن کر رفعت کے بستر پر پڑنے لگیں تو کمبلوں میں لپٹی ہوئی رفعت نے نیم خوابی کے سے عالم میں صبح کی پہلی انگڑائی لی۔ ہاتھوں کی انگلیوں میں گرہ لگا کر بازو اینٹھے ہوئے پہلو بدلا۔ آنکھیں تھوڑی سی وا کیں، اور پلنگ کے ساتھ لگے ہوئے قد آدم آئینے میں اپنے پلنگ پر ایک بھرپور نظر ڈالی ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھری اور انگلیوں کی گرفت چھوڑ دی۔ جمائیاں لیتی ہوئی اٹھی۔ ہاتھوں میں سے بکھرے ہوئے بالوں کو سلجھایا اور ساتھ کے کمرے سے رضیہ کو جگا کر دونوں چشمے پر چلی گئیں۔

چشمے کی فضا دلکشی کی حد تک حسین اور رومانک ہو رہی تھی۔ ہری ہری میٹھی گھاس میں سے پانی کے پھوٹتے ہوئے تیز رفتار دھارے، درختوں کی ٹہنیوں سے صبح کے ٹھنڈے سورج کی چھنتی ہوئی کرنوں اور گھاٹیوں کے کنوارے پھولوں اور اچھوتی کلیوں کو چوم کر آتے ہوئے ہوا کے خوشگوار جھونکوں اور آس پاس کے درختوں پر پرندوں کی ہلکی ہلکی چہکار سے رفعت کے من میں گدگدی سی ہوئی۔ اس کے کندھے اپنے آپ سکڑ گئے من میں ایک سرسراہٹ سی ہوئی، اور ماحول میں کسی چیز کی کمی کا ہلکا ہلکا احساس سا ہونے لگا۔ اس کے بازو ایک بار پھر انگڑائی لینے کے لیے سینے کے برابر اٹھ گئے۔ اور اس نے قریب کھڑی ہوئی رضیہ کو اپنے بازوؤں میں لپیٹ لیا، اور اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ چسپاں کر دیے ___ سامنے کی پگڈنڈی سے دودھ مکھن اور گھی والے پہاڑیوں کی ایک قطار چڑھ رہی تھی۔ سر پر بے ترتیبی سے بندھی ہوئی پگڑیاں، پگڑیوں پر سلور کی بڑی بڑی چمکدار بالٹیاں اور ہاتھوں میں سنہری کنبیوں والی لمبی لمبی لاٹھیں ان میں سے ہر ایک رفعت اور رضیہ کو للچائی للچائی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر رفعت نے دیکھا کہ ایک کانوں تک مونچھ والے نے اسے گھورتے ہوئے جبڑے پھیلا کر ہلکی سی آنکھ ماری ہے۔ رفعت غصے سے چراغ پا ہو گئی اس نے کڑتے ہوئے لہجے میں انگریزی میں کوئی گالی دی اور جو گیت بن کر پہاڑیوں کی سماعت تک پہنچی اور پہاڑی محظوظ ہونے لگے رفعت خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی، پھر اس نے دیکھا کہ پہاڑیوں کے گروہ احاطے کی پگڈنڈی سے گزر کر احاطے کے اوپر والے راستے میں پڑتے ہیں۔ اسے یہ عام راستہ بہت کھٹکا۔ تیسرے پہر جب وہ کرسی چشمے پر بچھا کر مطالعہ کر رہی تھی تو اس وقت بھی پگڈنڈی سے اترتے چڑھتے بے ڈھب اور غلیظ پہاڑی اسے تکلیف دہ نظروں سے گھور رہے تھے۔ اور پھر سورج غروب ہوتے ہی چھاؤنی سے لوٹنے والے پہاڑی بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح پگڈنڈی سے اتر کر نشیبی بستیوں میں جانے لگے۔ رفعت کو بہت ناگوار گزرا، اس نے امی سے احتجاج کیا اور دوسرے ہی دن کام شروع ہو گیا اور احاطے کے گرد نئی کانٹے دار باڑھ لگ گئی اور احاطہ پہاڑیوں کے لیے جنت کی سی حیثیت اختیار کر گیا اور پگڈنڈی بند ہو جانے سے پہاڑیوں کا راستہ تقریب ایک میل پھر لمبا ہو گیا۔ جس سے عارضی طور پر انہوں نے نجات حاصل کر لی تھی۔

راستہ بند ہو جانے سے احاطہ پھر مالکان کے لیے مخصوص ہو گیا اور رفعت کو اپنی فتح پر غرور کا ہلکا احساس ہونے لگا۔ اور اسے یوں لگا جیسے وہ کسی الف لیلوی کہانی کی پری زاد ہیروئن ہو جو ایک وسیع اور سرسبز و شاداب احاطے کے اندر رقص کرتی پھرتی ہو۔ ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہو۔ موتیوں کے سے صاف اور نغمہ بار چشمے پر ننگی غسل کرتی ہو۔ زہد شکن انگڑائیاں لیتی ہو ___ اس کا جی چاہتا تو رضیہ کو ساتھ لے کر تفریح کے لیے نکلتی اور جی چاہتا تو اکیلی۔ اور جب رضیہ اس کے ساتھ ہوتی تو وہ اکثر ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے چل لیتیں، اور اچھے اچھے مناظر

کی تصویریں کھینچتیں ــــــ اور امی تو اکثر گھر پر ہی دن گزار دیتیں۔ کھانے پکانے کے لیے تو گاؤں کی مائی کریمو کو ملازمہ رکھ لیا گیا تھا مگر پھر بھی امّی کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتیں اور اپنے من پسند کھانے خود اپنے ہاتھ سے بنایا کرتیں۔ رضیہ اور رفعت کو چولھے چوکھے سے کوئی کام ہی نہ تھا۔ اور نہ ہی امی چاہتی تھیں کہ ان سے کوئی سخت یا نرم کام لیا جاتا۔ پھر ایسے کام کی سخت مخالف تھیں جس سے لڑکیوں کے ہاتھ منہ کالے ہوں۔ دونوں کو ڈھیل تو مل ہی چکی تھی بس پکے پکائے پر آکر بیٹھ جاتیں، اور باقی سب وقت سونے، کھیلنے، تفریح کرنے اور ناولیں پڑھنے میں گزر جاتا۔

چشمے کے پاس شہتوت اور زرد آلو کے گھنے اور خوشبودار سایوں میں آرام کرسی بچھا کر رفعت نیم دراز سی ہو گئی اور تپائی پر پڑی ہوئی کتابوں کی ورق گردانی کرنے لگی ــــــ گھاٹیوں کے ننھے ننھے پودوں اور معصوم کلیوں کو چومتے ہوئے اور مدھم مدھم سروں میں کوئی دلکش لے گنگناتے ہوئے ہوا کے ٹھنڈے جھونکے زرد آلو اور شہتوت کے نومولود پتوں سے ٹکرا کر ایک نیا راگ پیدا کر کے سائیں سائیں کرتے ہوئے پہاڑوں کے دامن میں کھو جاتے۔ یکے بعد دیگرے ہوا کے جھونکے نئی لَے میں وارد ہوتے۔ بہتا ہوا چشمہ کسی کسی پتھر سے ٹکرا کر جلترنگ بجا اٹھتا۔ پہاڑی نالے میں کوئل کوئی نیا سا گیت چھیڑ دیتی۔ آسمان پر بادل کا کوئی ٹکڑا ہلکی سی گرج پیدا کر دیتا۔ ہوا تیزی سے چلنے لگتی بھینی بھینی خوشبو چاروں طرف پھیل جاتی اور رفعت کے بال کنپٹیوں سے دیر کو اُٹھ جاتے۔ اور وہ ایک کتاب بند کر کے رکھ دیتی اور دوسری اٹھا لیتی۔ ماحول اتنا خوشگوار ہو رہا تھا کہ وہ مطالعہ سے زیادہ ماحول سے محظوظ ہو رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ کتابیں ساری اٹھا کے الگ رکھ دے اور اسی طرح کرسی پر پڑتے پڑتے آنکھیں نیم خوابی کے عالم میں بند کر دے۔ پاؤں پسار دے۔ ہاتھ سینے پر رکھ دے اور بیٹھی رہے "تصورِ جاناں کیے ہوئے!" اور سچ مچ وہ کتنی دیر تک آنکھیں موندے بیٹھی رہی، اور اچانک رضیہ اس کے کان میں "گر گر" "ہو" نہ کرتی تو نجانے رفعت کتنی دیر تک تصورِ جاناں میں کھوئی رہتی۔ اور جب رضیہ اُسے چھوڑ کر دیوار کے پیچھے چشمے پر نہانے کے لیے چلی گئی تو رفعت سوچنے لگی کہ اس زندگی اور شہر کی زندگی میں کتنا فرق ہے۔ اتنا ہی فرق جتنا کالے اور سفید رنگ میں ہوتا ہے۔ یا اس سے بڑا کوئی فرق ہو سکتا ہے۔ زمین اور آسمان کا فرق ــــــ شہر کا گھٹا ہوا ماحول، گنجان آبادی، ٹراموں اور بسوں کی کھڑکھڑاہٹ، خوانچہ فروشوں کی ٹائیں ٹائیں، فٹ پاتھوں اور سڑکوں پر پان اور بلغم کی پیکوں کی گلکاریاں ــــــ لوگوں کے پیلے پیلے مدقوق چہرے، جسم ہڈیوں کے ڈھانچے۔۔۔ اُسے لمحہ بھر کے لیے شہر سے نفرت ہو گئی، اور اس نے وادی کی حسین فضا میں شہر کے تصور کو بھی گناہ بے لذت سمجھا ــــــ لیکن شہر میں تو اور بھی بہت سی چیزیں تھیں جو اس کی دلچسپی کا سامان مہیا کرتے ہوتے تھیں۔ ریڈیو، اخبار، سینما، کلب، پکنک پارٹیاں اور رومانس۔۔۔۔ اور رومانس کے ساتھ ہی اسے شہر کا ذہین جرنلسٹ عبیدی یاد آگیا جس کی تحریروں نے اخباری حلقوں میں تہلکہ مچا دیا تھا اور جو اسے پسند ہی نہیں تھا بلکہ اس کی بے تکلفیاں بھی پسند تھیں۔ مگر نجانے امی عبیدی کو کیوں پسند نہیں کرتی تھیں جب کہ اس کے گھٹیا گھٹیا دوست بھی امی کو بہت پسند تھے اور وہ کتاب بند کیے آنکھیں موندے پہروں اسی سوچ میں کھوئی رہی۔

(۲) ایک آدھ مہینے کے دن تو بڑی دلچسپی سے گزر گئے مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا، اور ماحول کی یکسانیت، ایک ہی سے مناظر ایک ہی سی فضا سے رفعت کچھ اکتاتی گئی اب نہ اسے مرغزاروں سے آتی ہوئی ٹھنڈی اور معطر ہواؤں کی سنسناہٹ ہی سے کوئی کیف ملتا۔ نہ بادلوں کی گھن گرج اس کے دل میں کوئی ہلچل مچاتی، جلترنگ بجاتے ہوئے چشمے ہی میں کوئی موسیقیت ملتی۔ اور نہ ہی سریلی کوئل کی کوک ہی کوئی جاں گداز اثر چھوڑتی ــــــ اور اس نے محسوس کیا کہ جیسے وہ گھاٹیوں کے مسلسل ٹھہراؤ اور قبرستان کے سے سکوت دینے والے سناٹوں کے لیے نہیں بلکہ شہر کی ہماہمی اور گہما گہمی کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ اسے قدم قدم پر اکتاہٹ کا احساس ہونے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ بغیر کسی تامل کے شہر کوچ کر جاتے مگر اس خیال سے رضیہ کی چھٹیاں ختم ہونے پر امی خود ہی تیار ہو جائیں گی وہ خاموش ہو گئی۔ اور اس نے مزید کچھ دن صبر و استقلال سے گزارنے کا ارادہ کر لیا۔ مگر رضیہ

کی چھٹیاں ابھی ختم ہی نہ ہوئی تھیں کہ امریکہ سے ان کے بھائی جان کا تار آگیا۔ لکھا تھا کہ ان کے آنے تک پہاڑ پر ہی قیام کیا جائے ـــــ رفعت اور رضیہ بھائی جان کے آنے کی خبر سن کر جہاں بے انتہا خوش ہوئیں وہاں انہیں پہاڑ پر رک جانے کا کہیں اس سے زیادہ افسوس ہوا۔ اور وہ کلیجہ مسوس کے رہ گئیں۔ اور بھائی جان کی آمد کا بغیر کسی مقررہ وقت کے بڑی بے قراری کے ساتھ انتظار کرنے لگیں اور اس انتظار میں رضیہ کی چھٹیاں بھی ختم ہوگئیں مگر بھائی جان کی پھر بھی کوئی اطلاع نہیں آئی۔ رفعت نے امی کو پہاڑ چھوڑنے پر اکسایا مگر امی ٹس سے مس نہ ہوئیں پھر اس نے رضیہ کی تعلیم کی اہمیت جتائی مگر امی نے ٹال دیا اور رضیہ کی مزید ایک ماہ کی چھٹی کے لیے لکھ دیا۔ جس کا رضیہ کو شدید افسوس ہوا اور رفعت کے لیے جیسے صفِ ماتم بچھ گئی۔ اور اسے یوں لگا جیسے اسے کئی مہینے کی سزائے قید بامشقت سنا دی گئی ہو۔ اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس نے امی سے مزید کچھ کہنا بے کار سمجھا۔ بس دن رضیہ کے ساتھ مل کر کسی نہ کسی طرح گزار دیتی اور رات سونے سے پہلے اپنے ماضی پر ایک نظر ڈالتی اور ماضی ایک متحرک تصویر کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے آتا اور گزر جاتا۔ اور اس تصویر میں وہ بہت سارے چہروں کے ساتھ عبیدی کا مسکراتا ہوا چہرہ بھی دیکھ لیتی اور بعض اوقات تصویر ختم ہو جاتی مگر عبیدی کھڑا مسکراتا رہتا اور رفعت میٹھی میٹھی نیند میں آنکھیں موندے اسے دیر تک دیکھتی رہتی ـــــ! مگر انتظار جان لیوا حد تک طویل ثابت ہوا اور اس قید خانے سے نجات پانے کے کہیں کوئی آثار نمودار نہ ہوتے۔ اور نہ امریکہ سے بھائی جان کی روانگی کی مزید کوئی اطلاع آئی اور یہ پہاڑ چھوڑنے کی کوئی معقول تجویز سوچ سکیں

اس رات ہوائیں معمول سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ چل رہی تھیں۔ چاند تنور کی سی آدھی گولائی لے کر پہاڑوں کی اوٹ میں غروب ہو چکا تھا مگر رات کے سناٹے ابھی گہرے نہیں ہونے پاتے تھے۔ دور پہاڑوں کی گپھاؤں سے کہیں کہیں کسی گیدڑ کے بولنے کی سامعہ خراش آواز بلند ہو جاتی تھی مگر حویلی کے گرد و نواح میں مکمل سناٹا تھا۔ دروازے بھڑے ہوتے تھے اور ہوا کی تیزی کی وجہ سے کھڑکیاں بند کر دی گئی تھیں۔ اور نیند کے ماتے لمحہ بہ لمحہ گہرے ہوتے جا رہے تھے ـــــ اچانک رفعت کے کمرے سے ایک چیخ بلند ہوئی جو سناٹے کو چیرتی ہوئی دور تک نکل گئی اور احاطے میں ایک ارتعاش سا پیدا ہوگیا۔ امی ہڑبڑا کر بیٹھیں، جلدی سے بتی جلائی اور گھبراتے ہوئے انداز سے دوڑتی ہوئی رفعت کے کمرے کی طرف گئیں ـــــ رفعت پلنگ پر بے حال پڑی تھی، اس کا جسم مارے خوف کے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ آواز حلق میں اٹک رہی تھی۔ منہ سے کف جاری تھا اور آنکھیں پھٹی پھٹی سی باہر نکل رہی تھیں۔

"بچاؤ۔۔۔ بچاؤ" امی کو دیکھتے ہی وہ چمٹ پڑی۔ امی نے اسے سہارا دیا۔ کمبل اچھی طرح اوڑھایا اور تسلی آمیز لہجے میں پوچھا "کیا بات ہے رفعت کیا ہوا؟" مگر رفعت نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے جسم پر ہلکا ہلکا رعشہ سا طاری تھا اور دانت اس طرح بجنے لگے جیسے وہ برف میں ٹھٹھر گئی ہو۔ امی کی گھبراہٹ بہت زیادہ بڑھ گئی وہ رضیہ کو جگانے کے لیے اس کے کمرے کی طرف دوڑیں اور دوسرے ہی لمحے جب وہ رضیہ کو ساتھ لے کر آئیں تو رفعت گہری نیند سو چکی تھی اور پسینے کے ننھے ننھے قطرے اس کی پیشانی پر چمک رہے تھے۔ امی نے دوپٹے سے آہستہ آہستہ پسینہ پونچھا اور پھر دونوں متفکر سی اپنے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

صبح رفعت نے بتایا کہ رات اس نے کوئی مہیب سا سایہ کمرے میں پھرتا ہوا دیکھا اور جب اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو سائے نے دونوں خونخوار پنجے اس کی گردن کی طرف بڑھائے اور وہ مارے خوف کے صرف ایک چیخ مار کے رہ گئی۔ امی خوف زدہ ہوگئیں مگر لڑکیوں کی تسلی کے لیے حوصلہ آمیز لہجے میں بولیں:۔

"ایسی کوئی بات نہیں، تم نے ضرور کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہوگا" بات آئی گئی ہو جاتی اگر تھوڑی ہی دیر بعد دوسرا واقعہ پیش نہ آتا۔ امی ہاتھ منہ دھو کر ناشتہ کرنے کے لیے بیٹھی ہی تھیں کہ روشندان میں سے ایک بہت بڑا پتھر آیا اور امی بال بال بچ گئیں مگر ناشتہ دان چور چور ہوگیا۔ ایک

دم بھگدڑ سی پڑ گئی۔ خانو دوڑتا ہوا مکان کے عقب میں گیا مگر وہاں کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی، اور انار کی ٹہنیاں بڑے زور زور سے ہلکورے لے رہی تھیں۔ اس نے واپس آکر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو امی بہت زیادہ پریشان ہوگئیں۔ خوف زدہ نظروں سے کچھ دیر پتھر کو دیکھتی رہیں، پھر اٹھا کے الگ رکھ دیا اور تینوں ماں بیٹیاں سر جوڑے پہروں سوچتی رہیں اور شام تک دونوں واقعات کی خبر اعاطے کی کانٹے دار باڑھ کو عبور کر کے مضافات کے دیہات تک پہنچ چکی تھی۔ اور اکثر گھروں میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئی تھیں۔

اگلی رات خانو کو برابر والے کمرے میں سلایا گیا۔ اور رفعت، رضیہ اور امی ننھے جاوید سمیت مل کر بڑے کمرے میں سوئیں۔ مگر روز کی طرح نیند کے دبے پاؤں آنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ مغربی گھاٹیوں سے آتی ہوئی ہواؤں کی سنسناہٹ اور دور کسی کچھار سے گیدڑ کی ابھرتی ہوئی کرخت آواز اور کتوں کے بے وجہ بھونکنے سے رات معمول سے کچھ مختلف اور ڈراؤنی سی لگ رہی تھی...... امی کی بے تاب کروٹیں گنتے گنتے جب گھڑی نے بارہ گھنٹے بجائے تو امی نے سر اٹھا کر خاموش کمرے کا ایک سرسری سا جائزہ لیا۔ پھر رفعت اور رضیہ کے پلنگ پر نظر ڈالی تو انہیں سویا ہوا دیکھ کر تنہائی کا شدید احساس ہوا مگر نجانے کیا سوچ کر بتی بجھا دی اور ننھے جاوید سے لپٹ کر سو گئیں اور تھوڑی ہی دیر بعد انہیں احساس ہوا جیسے نیند چوروں کی طرح دبے پاؤں کہیں سے داخل ہو رہی ہو اور وہ لحظہ بہ لحظہ گرد و پیش سے دور...... بے خبر اور نیند سے قریب ہوتی گئیں، اور نیند کا میٹھا میٹھا خمار ان کے سراپے پر جیسے کسی اوڑھنی کی طرح چھا گیا۔

جانے رات کتنی گزری ہوگی کہ خاموش کمرے میں امی کے ابھرتے ہوئے خراٹے گلے میں اٹک اٹک کر رک سے گئے۔ انہوں نے نیم خوابی کے سے عالم میں محسوس کیا کہ ان کے سینے پر کسی کی انگلیاں بڑی تیزی کے ساتھ حرکت کر رہی ہیں اور پھر جب انگلیاں بڑھتے بڑھتے گردن پر آکر رک گئیں تو امی نے پوری طرح بیدار ہو کر ایک خوفناک چیخ ماری، اور چیخ کے ساتھ ہی وہ خوفناک ہاتھ ان کی گردن سے اٹھ گیا۔ اور امی نے گھبراہٹ میں بے تحاشا چلانا شروع کیا۔ ور رفعت اور رضیہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں، جلدی سے بتی جلائی تو دیکھا کمرے کی حالت ہی غیر تھی، دوسرے کمرے کا فرنیچر اس کمرے میں الٹا سیدھا پڑا تھا اور گھر کا سارا سامان بکھرا ہوا تھا۔ اور امی پسینے میں نہائی ہوئی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ رفعت نے دروازے پر دو ہتڑ مار مار کے دوسرے کمرے میں سوتے ہوئے خانو کو جگایا۔ خانو نیند سے بوجھل آنکھیں ملتا، بھاگتا ہوا آیا۔ رفعت گھبراتے ہوئے انداز سے امی کے منہ پر جھک گئی۔ رضیہ پلنگ کے پاس کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اور بے ہوشی کے عالم میں امی کے منہ سے کف بہہ رہا تھا اور نتھنوں سے شائیں شائیں کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ خانو لپک کر پانی کا گلاس لے آیا اور مالکن منہ پر پانی کے ہلکے ہلکے چھینٹے مارنے لگا اور کافی دیر بعد جب مالکن کے ہوش ٹھکانے آئے تو انہوں نے تھکے تھکے انداز سے آنکھیں کھولیں، پتلیاں گھما گھما کر اپنے گرد کھڑے خانو، رفعت اور رضیہ کو دیکھا۔ اور ہونٹوں کی ہلکی سی جنبش سے زیر لب بولیں:-

"پانی"...... اور جب رفعت نے سہارا دے کر پانی کا گلاس پلایا تو امی پسینے سے شرابور ہوگئی تھیں۔ اور تھوڑی دیر بعد جب وہ پوری طرح ہوش میں آئیں تو سہمے سہمے لہجے میں ساری کیفیت بتا دی اور تھوڑی دیر کے لیے کمرے پر ایک اور بھیانک سناٹا چھا گیا۔ رفعت اور رضیہ امی کے پلنگ کی دونوں پٹیوں پر چپ چاپ سی بیٹھ گئیں۔ اور خانو سر پکڑتے ہوئے زمین پر جیسے ڈھیر ہوگیا اور ماتھے کو انگلیوں کی پوروں سے دباتا ہوا کافی دیر تک سوچتا رہا، پھر خاموشی توڑتے ہوئے بڑے رازدارانہ طریقے سے بولا:-

"جن پھر جاگ اٹھا ہے مالکن۔ معلوم ہوتا ہے کوئی بے ادبی ہوگئی ہے ہم سے۔"

"کیا کہیں" مالکن نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا، اور پھر سب چپ چاپ بیٹھے حیرت زدہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے اور جاگتے ہوئے کمرے کی بتی صبح تک جلتی رہی۔

اگلے دن ، ملکن کے کہنے سے خانو گاؤں کی مسجد سے میاں خیرے کو بلا لایا ۔ میاں خیرے نے پہلے واقعات کو بہت غور سے سُنا پھر بنفسِ نفیس حویلی کے گرد و پیش اور انار کے پیڑ کا جائزہ لیا ۔ کتاب دیکھی ، اور جب بات کچھ سمجھ میں آگئی تو داڑھی پر بوڑھے اعتماد سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا ۔

" گھبرانے کی کوئی بات نہیں ۔ اونچی ذات کا جن ہے ۔ سیّد ہے ۔ کچھ بے ادبی ہوگئی کسی سے جس بنا پر بگڑ گیا ۔ تین روز تک وظیفہ کرنا ہوگا ۔ انشاء اللہ سب معاملہ ٹھیک ہو جائے گا ! "

" میں ہر خدمت کے لیے تیار ہوں ۔ مولوی جی ۔ آپ وظیفہ شروع کر دیجیے ۔ " ملکن نے بڑی بے تابی سے کہا ۔ اور میاں خیرا اپنے چار شاگردوں سمیت انار کے پیڑ کے نیچے ، اگربتیاں سلگا کر وظیفے کے لیے بیٹھ گیا اور شاگردوں کو ساری ترتیب بتا دی کہ کس ورد کے بعد کیا پڑھنا ہوگا ۔ پہلے سو بار " اللہ ہُو " اور پھر سو بار دوسرے اذکار ۔ اور ہدایت کے مطابق شاگردوں نے مولوی خیرے کی آواز سے ہم آہنگ ہو کر تسبیح کے دانوں کو رولتے ہوئے " اللہ ہُو " کا ورد شروع کر دیا اور ملکن عقیدت مندانہ طریقے سے دو زانو ہو کے پاس بیٹھی رہیں ۔ اور جب ذکر پچاس کے قریب پہنچا ، تو مولوی خیرے نے آنکھیں بھینچ لیں ، کندھے سکیڑ لیے اور گردن کو بڑے زور سے جنبش دیتے ہوئے آواز کو قدرے اور بلند اور ہیبت ناک کر دیا اور شاگردوں کی آواز اپنے آپ ہی اونچی ہوگئی اور گردنیں گھٹنوں تک جھولنے لگیں اور ابھی سو کا ورد پورا نہیں ہوا تھا کہ قریب کی جھاڑیوں کے پیچھے سے ایک بہت بڑا کدو آیا اور مولوی خیرے کے حال میں آئے ہوئے سر پر دھم سے ایسا لگا کہ وہیں شگاف پڑ گیا اور مولوی خیرے نے ایک دھاڑ ماری اور چکرا کے اوندھے منہ گر پڑا ۔ شاگردوں نے دیکھا تو ورد بھول گئے اور کلمۂ توحید پڑھنے لگے ۔ پھر ایکا ایکی جھاڑیوں سے پتھروں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی ۔

امی زور زور سے رفعت اور رضیہ کو پکارنے لگیں اور شاگرد کلمہ بھی بھول بیٹھے اور چیخنا شروع کر دیا اور جب پتھروں کی بوچھاڑ رُکی پیڑ کے نیچے کوئی بھی نہیں تھا ۔ میاں خیرا ہانپتا کانپتا ہوا شاگردوں سمیت اوپر والے پھاٹک سے نکل رہا تھا ۔ امی ، رفعت اور رضیہ صحن میں سر تو بے پریشان حال بیٹھی تھیں اور خانو بھاگتا دوڑتا احاطے کی چھان بین کر رہا تھا ، مگر احاطے میں کسی چیز کا نشان تک بھی موجود نہیں تھا ۔ ۔ ۔ جب مولوی خیرے نے واقعات گاؤں میں بیان کیے تو لوگوں نے اس موضوع پر سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا ، اگرچہ احاطے کا عام راستہ بند کر دینے سے گاؤں والے سخت نالاں تھے ، تاہم بیشتر لوگوں کو احاطے والوں سے ہمدردی ہوگئی ۔ اور اس روز شام تک گاؤں کے کتنے ہی معزز لوگ ملکن کے پاس اظہارِ ہمدردی کے لیے آئے اور خانو کو کئی بار احاطے کا نشیبی پھاٹک کھولنا اور بند کرنا پڑا ۔ دن بھر اکا دکا آدمیوں کی آمد و رفت رہی مگر کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا ۔ کبھی کبھار مکان کے عقب سے کوئی پتھر زناٹے سے آجاتا ، جو سب کو متحیر اور خائف کر دیتا ۔ ۔ ۔ جب شام بھیانک رات کا پیغام لیے ہوئے قریب آئی تو گھر پہ ایک دہشت سی طاری ہونے لگی جیسے رات میں کوئی قیامت آنے والی ہو ۔ تاہم ، امی لڑکیوں کی ڈھارس بندھانے کے لیے حوصلہ آمیز انداز سے باتیں کرتی رہیں لیکن خود ان کا حوصلہ کم نہیں تھا جیسے آنے والے کسی خطرے کا مقابلہ کرنے کی ساری قوت سلب ہو چکی ہو ۔ ——

لیکن سائیں دِتّے کے خیال سے انہیں کسی قدر تسلی ہوئی ۔ خانو نے بتایا تھا کہ اس علاقے میں جنات پر جتنا عبور سائیں دِتّے کو ہے کسی دوسرے کو نہیں اور خانو کافی دیر سے سائیں دِتّے ہی کی تلاش میں گیا ہوا تھا اور سارے گھر کو سائیں دِتّے کی آمد کا بہت بے تابی سے انتظار تھا ۔ ۔ ۔ ۔ !

شفق کی سرخیاں بھی سیاہ رات کے سینے میں اُتر نے نہیں پائیں تھیں کہ خانو سائیں دتّے کو لے کر آ گیا ۔ امی کی جان میں جان آئی اور کچھ رات کے کٹنے کے آثار نظر آئے ۔ گزشتہ رات کی طرح امی ، رفعت اور رضیہ نے اپنے بستر پھر ایک ہی کمرے میں بچھائے ۔ ایک ملحقہ کمرے میں خانو کو سلایا گیا اور دوسرا علیحدہ کمرہ سائیں دِتّے کو دیا گیا —— عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر سائیں دتّے نے سب لوگوں کو اطمینان دلاتے ہوئے سو جانے کی

ہدایت کی، اور دعویٰ کیا کہ "اگر جن کو آج کمرے میں بند کر کے نہ جلا دوں، سائیں دِتا نام نہیں۔" امی اور لڑکیاں قدرے مطمئن ہو کر بستروں میں دبک گئیں اور سائیں دِتے نے کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر دیں اور مٹی کے دیے کی روشنی میں دھاگے کی گولی لے کر بیٹھ گیا اور کچھ پڑھ پڑھ کے ایک سرے سے گرہیں لگانی شروع کر دیں ——— اور لگاتار سائیں دِتا پڑھتا رہا۔ پھونکتا رہا اور دھاگے میں گرہیں لگاتا رہا۔

جانے رات کتنی گزری ہوگی، ہر طرف ایک مکمل سکوت چھا چکا تھا۔ بڑے کمرے میں سوئی ہوئی امی، رفعت اور رضیہ کے ملے جلے خراٹے ابھرنے لگے تھے جن سے کمرے میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو جاتا تھا اور سائیں دِتا بند کمرے میں لگاتار وظیفہ کر رہا تھا۔ اس کے ہونٹ بڑی تیزی کے ساتھ حرکت کر رہے تھے اور انگلیاں بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ تاگے میں گرہیں لگاتی ہوئی چل رہی تھیں اور دیئے کی لو میں بتی کا گل جمع ہو گیا تھا اور کمرے میں روشنی مدھم پڑ گئی تھی۔ سائیں دِتے کی انگلیاں اکڑ سی گئیں اور آنکھیں نیند کے خمار سے بوجھل ہونے لگیں۔ تب اس نے لمحہ بھر سستانے کے لئے پڑھنا بند کر دیا۔ آنکھیں پوری طرح کھولیں۔ انگلیاں کھینچ تان کے چٹخائیں، دیے کا گل جھاڑا، گرد و پیش پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور پھر محویت کے سے عالم میں پڑھنے لگا ——— معاً کوئی چیز دھپ سے اس کے آگے گری۔ بدک کر آنکھیں کھولیں تو دیا بجھ چکا تھا اور کمرے میں مہیب سناٹا چھا چکا تھا۔ سائیں دِتا کچھ تذبذب میں پڑ گیا اور ابھی وہ کچھ سوچ بھی نہ سکا تھا کہ کواڑوں کے قریب سے ایک دبی دبی آواز آئی "بھاگ جاؤ"۔

"کون ہو تم" سائیں دِتے نے سہمے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری شامت" وہی آواز

"میں تمہارے ٹکڑے کر دوں گا" سائیں دِتے نے قدرے جرأت کی، مگر دوسرے ہی لمحے ایک تختہ بڑے زناٹے کے ساتھ سائیں دِتے کے سر پر آن لگا اور پھر پے در پے تختوں کے وار شروع ہو گئے۔ سائیں دِتے نے حلق پھاڑ پھاڑ کے چلانا اور مدد کے لیے پکارنا شروع کیا۔ سارا گھر گھبرا کے جاگ اٹھا۔ بتی جلی۔ سائیں دِتے کے کمرے کی طرف دوڑے دیکھا تو سائیں دِتے کا برا حال ہو رہا تھا۔ سر پر زخموں کے نشان پڑ گئے تھے اور جسم پر رعشہ طاری تھا۔ خانو نے تلوے سہلائے۔ مالکن نے پانی پلوایا۔ گرم گرم دودھ کی پیالی دی اور بڑی مشکل سے کہیں سائیں دِتے کے حواس قائم ہوئے۔ رات اللہ اللہ کر کے کاٹی اور صبح پو پھٹتے ہی سائیں دِتا احاطے کی حدود سے باہر نکل گیا تھا اور صبح اس کے ساتھ ہی ساتھ رات والے واقعہ کی خبر بھی بہت دور نکل گئی تھی۔ میاں خیرتے والا واقعہ اور دوسرے حالات گاؤں والوں نے پہلے ہی چھاؤنی تک پہنچا دئے تھے اور سائیں دِتے والی خبر اس سے بھی دور دور تک پہنچی۔ ضلع کے اخباروں نے مختلف طریقوں سے چھاپا اور ایک سنسنی خیز خبریں چھاپنے والے اخبار نے سنسنی خیز طریقے سے صفحہ اول پر سرخی جمائی اور دوسرے شہروں کے اخباروں نے ادھر ادھر خبر کو چھاپنا شروع کیا، اور مزید حالات کا انتظار کرنے لگے اور سنسنی خیز خبریں پڑھنے والے حلقوں میں موضوعِ سخن سا بن گیا۔

امی نے لڑکیوں کے مشورے سے امریکہ میں اپنے بیٹے کے نام تار لکھا: "ہم زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ تمہارا جواب آنے پر ہی شہر روانہ ہو جائیں گے۔" اور جب خانو تار لے کر چھاؤنی جانے لگا تو رفعت نے چپکے سے عبیدی کے نام خط ڈالنے کے لیے دے دیا۔

پھر دن بھر احاطے کے پھاٹک کھلے رہے۔ لوگ آتے رہے جاتے رہے، پہاڑ کے دیہاتی بڑی بڑی شلوں والے، بے ترتیبی سے بندھی ہوئی پگڑیوں والے نسوار پھانکنے والی عورتیں اور بچے ...... رضیہ اور رفعت بالکل الگ رہیں، اور امی سب کو مختلف حالات سناتیں اور شکریہ ادا کر کے رخصت کرتی رہیں۔ گاؤں کے نمبردار نے احاطہ چھوڑ دینے اور اپنی حویلی میں رہنے کے لیے ایک خالی مکان کی پیشکش بھی کی مگر امی کچھ فوری طور پر فیصلہ نہ کر سکیں۔

سہ پہر کو خانو ضروری سامان اور کچھ اخبار لے کر چھاؤنی سے واپس لوٹا۔ رفعت نے اخبار کو بے تابی سے کھولا اور احاطے کی خبر پڑھنے لگی، جو سُنے سنائے واقعات پر مبنی تھی، اور جسے بہت غلط، سنسنی خیز اور مبالغہ آمیز طریقے سے پیش کیا گیا تھا۔ خبروں کو پڑھ کر وہ تھوڑی دیر کے لیے مسکرائے بغیر نہ رہ سکی ..... وقت کٹ گیا تھا، رات سر پر آ رہی تھی اور گھر کا گھر متفکر ہو رہا تھا جیسے کوئی قیامت آنے والی ہو۔ امی کی رنگت بھی اُڑی اُڑی سی لگ رہی تھی اور رفعت اور رضیہ بھی کھوئی کھوئی سی معلوم ہو رہی تھیں مگر ننھا جاوید سب باتوں سے بے نیاز تھا اور خانو کو بھی پریشانی سے زیادہ مالکن اور لڑکیوں کی پریشانی کا احساس تھا ______ امی نے رفعت اور رضیہ سے کچھ مشورہ کیا اور پھر تار کے جواب کا انتظار کیے بغیر آنا فاناً تیاری کا اعلان کر دیا اور فیصلہ کر لیا کہ صبح سورج طلوع ہوتے ہی پہاڑ چھوڑ دیا جائے گا۔ اس اچانک فیصلے سے گھر میں ایک تبدیلی محسوس ہونے لگی۔ رفعت اور رضیہ کے چہروں پر خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی لیکن امی جو دراصل پہاڑ پر مستقل طور پر قیام کرنے کا ارادہ لے کر آئی تھیں، اس اپنے ہی کیے ہوئے فیصلے سے مطمئن نہیں ہوئیں بلکہ بڑی مجبوری اور بے بسی کے عالم میں انہوں نے یہ فیصلہ کیا۔ وہ چاہتی تھیں کہ بیٹے کو امریکہ سے بُلا کر مشورہ کریں اور احاطے کو از سرِ نو آباد کر کے، اپنے خاندان کی یادگار کو مٹنے سے بچا لیتیں، بنجر زمین سیراب کر کے زراعت کا کام شروع کرا دیتیں اور چند ہی برس میں احاطہ پھر ہری بھری سبزیوں اور فصلوں سے لہلہا اُٹھتا۔ مگر خلافِ توقع انہیں اپنے ارادے میں ناکامی ہوئی اور ناکامی ہی نہیں بلکہ اپنی ہی جان کے لالے پڑ گئے اور اس دن شام سے پہلے پہلے سارا موٹا موٹا سامان سمیٹ لیا گیا۔ خانو بستر باندھ دیئے گئے۔ کتابیں شیلفوں سے نکال کر صندوقوں میں ڈال دی گئیں اور چھوٹی چھوٹی پوٹلیوں کی ایک ڈھیری سی لگا دی گئی۔ مگر آنے والی رات کا اندیشہ سارے گھر کو لگا ہوا تھا اور امی آخری رات کے خیریت سے گزر جانے کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔ مکان کے عقب سے اب بھی کوئی مہیب قسم کی آواز اُبھر آتی تھی یا کبھی کبھار کوئی پتھر آ جاتا تھا اور گھر کے اندر کے سامان میں سے کوئی نہ کوئی چیز خود بخود اپنی جگہ تبدیل کر دیتی یا بکھر جاتی۔

سورج غروب ہوا تو امی کے چہرے پر مردنی سی چھا گئی اور رفعت اور رضیہ کی پریشانی میں اور اضافہ ہو گیا اور ننھے جاوید کو سب کی پریشانی کا ہلکا ہلکا احساس ہونے لگا مگر کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آ سکی۔

سورج غروب ہوتے ہی ایک ملنگوں کی سی وضع قطع کا گرانڈیل شخص احاطے میں داخل ہوا۔ داڑھی صفاچٹ اور تلوار کٹ مونچھیں، رنگ گندمی، آنکھیں موٹی موٹی جن میں سرمے کی سلائیاں کنپٹیوں تک کھچی ہوئی تھیں۔ کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں اور بال گھنگھریالے اور بکھرے ہوئے تھے اور ہاتھ میں ایک روپہلی کیلوں والی لاٹھی تھی، جو قد سے بھی لمبی تھی۔ اُسے دور سے آتا دیکھ کر امی کچھ متعجب سی ہوئیں مگر جب خانو کی نظر پڑی تو ایک دم چلا اٹھا:

"پیر ولی اللہ شاہ ..... پیر ولی اللہ شاہ" وہ دوڑتا ہوا استقبال کے لیے آگے گیا اور بڑے احترام کے ساتھ پیر ولی اللہ شاہ کو مکان پر لایا۔ خانو نے مالکن سے پیر ولی اللہ شاہ کا تعارف کرایا اور بتایا کہ پیر صاحب کا علم سات سمندروں کے برابر ہے۔ اتنے علم روئے زمین پر کسی اور شخص کو نصیب نہیں ہو سکے۔ آپ میں اتنی طاقت ہے کہ بہتے دریاؤں کا رُخ پھیر سکتے ہیں۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ پیر صاحب خود بخود تشریف لے آئے ہیں ورنہ مدتوں ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔" امی پہلے ہی سے غائبانہ طور پر متعارف تھیں۔ پیر صاحب سے مل کر بہت متاثر ہوئیں پیر صاحب کہنے لگے:

"میں دورے پر گیا ہوا تھا۔ اسی دوران میں مجھے یہاں کسی جن کی کارستانیوں کا پتہ چلا۔ میرا خون کھول اٹھا اور میں کام چھوڑ کر یہاں آ گیا ہوں۔"

"پیر صاحب ہماری تو یہاں آخری رات ہے، وہی خیر سے گزر جائے تو غنیمت ہے۔ ہم لوگ کل جا رہے ہیں"، مالکن نے بڑی حسرت سے کہا، وہ پیر صاحب بڑے جلال میں آ کر بولے:

"آپ جائیے یا نہ جائیے، یہ آپ کی مرضی ہے مگر جن آج کے بعد اس حویلی میں نہیں پھٹکے گا۔"

"اگر ایسا ہو گیا تو میں دوبارہ اس حویلی کو آباد کر دوں گی۔ پیر جی"۔ مالکن مسرت سے بولیں۔

رات جب سب لوگ کھانے سے فارغ ہو گئے تو حسب معمول رفعت، رضیہ تنہا جاوید اور ممی مل کو بڑے کمرے میں سوئیں۔ خانو باہر والے کمرے میں اور پیر ولی اللہ شاہ کو کوٹھڑی کے ساتھ ملحقہ کمرہ دیا گیا جس کا ایک دروازہ کوٹھڑی میں اور دوسرا بڑے کمرے میں کھلتا تھا۔

رات کافی گزر چکی تھی۔ سب لوگ سو گئے تھے۔ باہر والے کمرے میں سویا ہوا خانو بھینس کے ڈکارنے کے سے انداز سے خراٹے لے رہا تھا جو رات کے سناٹے میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ بڑے کمرے میں مکمل سکوت اور تاریکی تھی۔ آج ہی بہت دنوں کے بعد اتنی گہری نیند سوتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ پیر ولی اللہ شاہ کے کمرے میں مکمل سناٹا تھا۔ مٹی کا ٹمٹماتا ہوا دیا انہوں نے رات پہلے پہر ہی بجھا دیا تھا اور ایک کونے میں دبکے بیٹھے کسی واقعہ کا مسلسل انتظار کر رہے تھے مگر کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ باہر والے کمرے میں خانو کے خراٹے لگاتار ابھر رہے تھے، وہ بڑے کمرے میں گھڑی کی ٹک ٹک رات کو خوفناک بنا رہی تھی...... ایک دم باہر درختوں میں شائیں شائیں کی آواز پیدا ہوئی۔ سامنے والی کھڑکی سے ہوا کا ایک تیز جھونکا اندر داخل ہوا اور کسی کونے میں پڑے ہوئے کاغذ کھڑکھڑانے لگے۔ پیر صاحب فوراً چوکنے ہو گئے...... پھر ہوا اور تیزی سے چلنے لگی اور کاغذ کھڑکھڑا کے چپ ہو گئے جیسے کسی دیوار کے ساتھ چپک گئے ہوں۔ پیر ولی اللہ شاہ نے کمرے میں کچھ خنکی سی محسوس کی اور آنکھوں پر نیند کا ہلکا ہلکا خمار ——— دبے پاؤں اٹھے۔ پنجوں کے بل چل کر کھڑکی کے قریب پہنچے۔ آہستہ سے کھڑکی بند کر دی اور ٹٹولتے ہوئے واپس آ کر اسی کونے میں دبک گئے اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر ایک جماہی سی لی اور سو جانے کی کوشش کرنے لگے۔ مقابل برابر والا دروازہ تھوڑا سا چرچرایا اور کسی کے قدموں کی ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ لیکن کمرے کی گہری تاریکی میں کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ پیر صاحب سمٹ سمٹا کر دیوار کے ساتھ لگ گئے اور ٹکٹکی باندھ کے کواڑوں کی طرف دیکھنے لگے۔ دوسرے ہی لمحے دروازے میں تھوڑی سی اور آواز پیدا ہوئی اور ایک پٹ تھوڑا سا کھلتا ہوا محسوس ہوا۔ پیر صاحب نے جلدی سے پاؤں پسارے۔ سر سے پاؤں تک چادر اوڑھ لی۔ منہ تھوڑا سا کھلا رکھا اور نیند کی سی دبی دبی سانسیں لینے لگے۔ اور گہرے اندھیرے میں دیدے پھاڑ پھاڑ کے دروازے کی طرف غور سے دیکھتے رہے ——— آہستہ آہستہ دروازے کا ایک پٹ پورا کھل چکا تھا لیکن کوئی چیز وارد نہیں ہوئی تھی مگر اچانک ہی انہیں محسوس ہوا کہ کوئی نامعلوم سا سایہ بڑی آہستگی سے دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ پیر صاحب دبے دبے خراٹے لینے لگے جیسے وہ گہری نیند سو رہے ہوں۔ کچھ دیر سایہ اپنی جگہ پر ساکت رہا پھر چپکے سے زمین پر جھک گیا، اور رینگتا ہوا سا محسوس ہونے لگا۔ دوسرے ہی لمحے، انہیں ایسا محسوس ہوا کہ کوئی ہاتھ ان کی طرف بڑھ رہا ہے اور ابھی وہ کچھ سوچنے بھی نہ پائے تھے کہ کسی نے ایک جھٹکے کے ساتھ ان کے اوپر والی چادر کھینچ لی۔ سایہ پھرتی سے کواڑ کی طرف لپکا مگر پیر ولی اللہ شاہ بڑی مستعدی سے اٹھے اور تیزی کے ساتھ کواڑ بند کر دیے۔ کنڈی چڑھا دی اور دونوں بازو پھیلا کر کواڑوں کے ساتھ لگ گئے۔

"کون ہو تم" پیر ولی اللہ نے ہانپتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

"تمہاری موت" کسی کونے سے ایک کرخت آواز آئی۔

"ابھی معلوم ہو جائے گا" پیر صاحب نے بڑے اعتماد سے کہا مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اور کمرے پر ایک عجیب سناٹا چھا گیا۔ مٹی کا ٹھیکرا پیر ولی اللہ کے سینے پر اتنے زور سے لگا کہ ان کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"زندگی چاہتے ہو تو دروازہ کھول دو اور اسی وقت احاطے کی حدود سے نکل جاؤ۔" اب کے آواز پہلے سے مختلف تھی، در پیر ولی اللہ شاہ نے بغیر کسی تامل کے ہاتھ بڑھایا اور دروازے کی چٹخنی کھول دی اور ایک پٹ وا کر دیا اور خود دروازے سے الگ ہٹ گئے۔ سایہ بجلی کی سی تیزی سے کھلے ہوئے پٹ کی طرف دوڑا مگر پیر ولی اللہ شاہ چیل کی طرح جھپٹے اور سایہ طلسماتی انداز سے پیر صاحب کی مضبوط بانہوں میں جکڑ کے رہ گیا۔ جوڑ دوبارہ بھڑ گئے اور ایک تھل تھل پل پل کرتا نسوانی جسم پیر صاحب کی بانہوں کے شکنجے میں کس کے رہ گیا۔

"چھوڑ دو مجھے بدمعاش۔" اس نے آزاد ہونے کی کوشش کی۔

"خبردار" پیر صاحب نے دبے دبے لہجے میں گھُرکی دیتے ہوئے کہا۔ "میں جن بھوت اتارنے میں ماہر ہوں۔ میں نے بڑے بڑے کھڑ جن نکالے ہیں" اور وہ جیسے اپنی پوری طاقت کے ساتھ جن پر ٹوٹ پڑا۔

دوسرے دن پیر صاحب نے فخریہ اپنی کامیابی کا اعلان کیا اور مالکن نے اظہارِ احسان مندی کے طور پر گردن جھکا دی۔ تھوڑی دیر بعد بندھے ہوئے بستر دوبارہ کھُل گئے اور سامان اپنی اپنی جگہ قرینے قرینے سے رکھ دیا گیا۔ مالکن نے امریکہ اپنے بیٹے کے نام ایک اور تار لکھا اور جب خانو تارے کو چھاؤنی جانے لگا، تو رفعت نے چپکے سے عبیدی کے نام دوسرا خط ڈالنے کو دے دیا۔

جنوری ۱۹۵۶ء

"یہاں کوئی جنگل نہیں ہے۔ تمہیں دھوکا ہوا ہے۔ یہاں تو سب باغ ہی باغ ہیں"

"مگر وہ پودے۔ اُس میں پھل کھلانے ہیں۔"

"موسم تو گزر گیا"

"مگر میں بے موسم کا پھل کھلانا چاہتا ہوں" اُس نے مَیں پر زور دیتے ہوئے کہا۔

اُس لڑکی نے پھر دوسری لڑکیوں کی طرف دیکھا اور سب کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"میں تمہارے قریب آجاؤں"

"آجاؤ۔ مگر مجھے بے موسم کا پھل کھلانا ہے۔ اس لئے۔۔۔"

فہیم اعظمی

عکسِ تحریر:- فہیم اعظمی

# حوّا اور سانپ

اعجاز بٹالوی

وہ میرا نیا مؤکل تھا اور قانونی مشورہ کرنے آیا تھا۔

اس کی عمر بیس اکیس سے زیادہ نہ ہوگی۔ اکہرا بدن، لمبا قد، باریک سی مونچھیں اور چہرے پر ہلکی سی اُداسی جیسے جوانی میں کبھی کبھی ہوتی ہے۔ گفتگو میں ذرا سا حجاب۔ میں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ اگر میں اس کے چہرے کی طرف دیکھوں تو اسے گفتگو کرنے میں اور زیادہ دقت ہوتی ہے۔ بعض مؤکلوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہ کرو تو انہیں تسلی نہیں ہوتی۔ بعضوں کے چہرے کی طرف دیکھتے رہو تو ان کے لئے گفتگو کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں کبھی سامنے کی دیوار پر لگے ہوئے کیلنڈر کی طرف اور کبھی کتابوں کی الماریوں کی طرف دیکھتا رہا۔

اس نے کہا: "جناب میں آپ سے ایک مشورہ کرنے آیا ہوں۔" پھر اس نے ذرا سا رک کر آہستہ سے کہا، جیسے کوئی سازش کی بات ہو: "کیا عورت اپنے خاوند کو طلاق دے سکتی ہے؟"

"جی نہیں۔" میں نے جواب دیا: "میرا خیال ہے آپ مسلمان عورت کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ وہ خاوند کو طلاق نہیں دے سکتی، اس سے طلاق حاصل کرنے کے لئے عدالت میں دعویٰ دائر کر سکتی ہے۔"

وہ خاموش ہو کر کسی گہری سوچ میں کھو گیا۔ میں نے پوچھا: "آپ شادی شدہ ہیں؟"

"جی نہیں۔" وہ پھر خاموش ہو گیا۔

میرا اصول ہے کہ جب تک مؤکل ایسے موقع پر خود کھل کر بات نہ بتائے اس سے کرید کرید کر پوچھنا مناسب نہیں سمجھتا۔ کیا معلوم وہ اس وقت اپنے آپ سے کونسی جنگ لڑ رہا ہو۔ میں نے سوچا یہ سوال اب تک مجھ سے کئی ایسی عورتوں نے پوچھا ہے جو شادی شدہ زندگی کی ناکامیوں اور مصیبتوں سے تنگ آ کر مجھ سے قانونی مشورہ کرنے آئی تھیں مگر ایک غیر شادی نوجوان مرد یہ سوال کیوں پوچھ رہا ہے۔ میں نے اس کے چہرے پر تذبذب اور کشمکش کے آثار دیکھ کر پوچھا: "آپ کیا کرتے ہیں؟"

"میں..... جی میں ریلوے ورکشاپ میں ملازم ہوں: ایف ایس سی میں دو مرتبہ فیل ہونے کے بعد مجھے نوکری کرنی پڑی۔ ہم انبالے کے ریفیوجی ہیں۔ والد کے کاروبار کا بھٹہ بیٹھ گیا تو میں تعلیم جاری نہ رکھ سکا، اب ورکشاپ میں کام کرتا ہوں۔ والدین کے پاس رہتا ہوں۔ ہمارا گھر شہر کے اندر ہے۔ ہم کو صرف نچلی منزل الاٹ ہوئی ہے۔ اُوپر والی منزل میں جالندھر کے ریفیوجی رہتے ہیں۔ ہم پانچ بہن بھائی ہیں۔"

میرے مختصر سے سوال کے جواب میں جب اس نے اتنی باتیں یکدم بتا دیں تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کہنے کی کوئی بات چھپا رہا ہے اور اس کے عوض ان باتوں کو غیر ضروری سمجھ کر اُگلتا جا رہا ہے۔ وہ مجھے نچلے درجے کا سمجھدار نوجوان معلوم ہوتا تھا جس کی تعلیم اگر مکمل ہو جاتی تو زندگی میں ذمہ داری کا کوئی کام اچھی طرح سے انجام دے سکتا تھا۔

پھر وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولا: "کیوں صاحب، اس مقدمے کا فیصلہ ہونے میں کتنا وقت لگے گا اور کیا اس میں کامیابی یقینی ہوتی ہے؟"

میرا جواب سنکر وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ "تو جناب اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ ممکن ہے ایسے مقدمے میں ایک دو برس لگ جائیں اور یہ بھی ممکن ہے آخر میں طلاق بھی نہ ہو۔"

"یہ ٹھیک ہے" میں نے جواب دیا: "یہ سب کچھ تو مقدمے کے واقعات پر منحصر ہے اگر شہادت اچھی ہے اور وجہ مضبوط ہے تو طلاق ہو جائے گی ورنہ مشکل ہے۔" پھر میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا: "آپ کا کیا خیال ہے، وہ صاحب جن کے خلاف یہ مقدمہ دائر کیا جائے گا کیا وہ پوری شد و مد سے اس کی پیروی کریں گے؟"

"جی ہاں ضرور کرے گا۔ وہ بڑا ظالم انسان ہے"۔ اور نوجوان کے چہرے پر غصّے اور نفرت کے رنگ پھیلنے لگے۔ "اس کا بس چلے تو وہ اپنی بیوی کی ناک کاٹ ڈالے، اس کی آنکھیں پھوڑ دے، اس کے چہرے پر تیزاب ڈال دے، وہ تو بڑا مردود آدمی ہے جناب"۔ اور پھر یک لخت اسکے چہرے پر اداسی کا سایہ پڑ گیا اور میری طرف دیکھکر اس نے یوں زہرخند کیا جیسے نہ کہنے کی باتیں کہہ گیا ہو۔ پھر اس نے ایک عجیب و غریب سوال کیا۔ "یہ تو بتائیے کہ جب تک طلاق کا مقدمہ چلتا ہے، کیا میاں بیوی ایک ہی گھر میں رہ سکتے ہیں؟"

میں نے کہا: "یہ تو نا ممکن ہے۔ کم از کم میں نے کبھی یہ سنا نہیں، میرا خیال ہے اس سے تو مقدمہ کمزور ہو جائے گا"۔

پھر وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا اور اٹھ کر دروازے کی طرف چلا گیا۔ پھر وہاں سے پلٹ آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب اس کی پریشانی اور اضطراب نمایاں ہو گئے تھے۔ میں نے سوچا وہ بات جو اس کے دل میں اس طرح کھٹک رہی ہے، اب کہلوا ہی کیوں نہ لی جائے۔ میں نے چہرے پر وکیلوں کی سی بے تعلقی پیدا کرتے ہوئے کہا: "میرا خیال ہے آپ کسی ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں جو کسی اور کی بیوی ہے"۔

طوفان ختم ہو گیا اور اس کے چہرے پر سکون کے آثار نظر آنے لگے: "جی ہاں، یہی بات ہے۔ بالکل یہی بات ہے۔ وہ لڑکی ایک بہت ظالم آدمی کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے۔ وہ اسے گھر سے باہر نکلنے نہیں دیتا۔ لڑکی کچھ پڑھی لکھی ہے، وہ خود جاہل ہے۔ خود بڈھا ہے نا، ہوٹل کا کام کرتا ہے اور ہر روز رات کو کام سے گھر آتا ہے تو اپنی بیوی کو پیٹتا ہے۔ میں نے ابھی آپ سے کہا تھا کہ ہمارے مکان کی اوپر والی چھت پر جالندھر کے ریفیوجی رہتے ہیں۔ یہ میں انہیں کا ذکر کر رہا تھا"۔

میں نے قانون کے ترازو میں زندگی کے بٹے ڈالتے ہوئے اس سے پوچھا: "بچے بھی ہیں ان کے کوئی؟"

"جی نہیں، ان کا کوئی بچہ نہیں، صرف میاں بیوی اس گھر میں رہتے ہیں اور سارے محلے والوں کو معلوم ہے کہ وہ اپنی بیوی کو مارتا ہے"۔

"تو یہ بتائیے کہ آپ جو اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو یہ محض اپنے ارادے کا اظہار کر رہے ہیں یا اس میں اس لڑکی کی خواہش بھی شامل ہے"۔

نوجوان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے چند آنکھ سے دروازے کی طرف دیکھا اور ذرا میز پر آگے کی طرف جھک کر کہا۔ "وہ بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے لیکن اگر اسے طلاق نہ ہو سکی تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ ہم دونوں برباد ہو جائیں گے"۔ محبت کی نرمی اس کی آواز میں آ گئی اور مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے اندر بیٹھے ہوئے وکیل کو زندگی کی لوری سنا کر خاموش کرتا جا رہا ہے۔

اس کے عشق کی داستان طویل نہ تھی۔ میں اندرونِ شہر کے ایسے مقدموں کی نوعیت سے واقف ہوں۔ وہاں عشق کا آغاز اکثر ہمسائے میں ہوتا ہے۔ انجام کی صورتیں البتہ مختلف ہوتی ہیں مگر یہ نوجوان تو اپنی محبت میں نہا کر پاکیزہ ہو چکا تھا اور اس لڑکی کی باتیں کرتے ہوئے اس کے چہرے پر ایسی روشنی آ جاتی جیسی بعض مصوروں نے فرشتوں کے چہروں پر بنائی ہے۔ اس کی وارفتگی دیکھکر مجھے اس پر رشک آنے لگا شاید ایسی بے پناہ محبت جو طوفان کی طرح ہر طرف چھا جاتی ہے جوانی کے اسی حصّے میں ہوتی ہے اور پھر انسان باقی عمر اسی محبت کے بہانے چھوٹی چھوٹی محبتوں میں گزار دیتا ہے۔ یہ نوجوان جو زندگی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا، ایک ایسی محبت سے سرشار ہو چکا تھا جو اپنا راستہ خود متعین کرے گی اور میں تو محض ایک وکیل تھا۔ میں نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "یہ طلاق کا مقدمہ اس لڑکی کو خود دائر کرنا پڑے گا۔ آپ اس کی طرف سے پیروی نہ کریں تو اچھا ہو گا۔ لڑکی کے والدین میں سے کسی کو یہ فرض انجام دینے دیجئے اور ہاں، یہ بھی یاد رکھئے کہ مقدمے کے واقعات کو ثابت کرنے کے لئے شہادت کی ضرورت ہو گی"۔

وہ نوجوان چلا گیا تو میں دوسرے مقدموں کی تفصیلات میں الجھ گیا۔ کہیں زندگی کی قبا پر کھونچ آ گئی ہے تو قانون اسے سینے کی کوشش کر رہا ہے۔ کہیں زندگی کے جامے پر خون کے دھبے ہیں تو قانون انہیں دھونے کی فکر میں ہے اور عدالتیں شہادتوں پر فیصلے کرتی چلی جاتی ہیں۔

چند دن گزرے ہوں گے کہ وہی نوجوان پھر میرے دفتر میں آیا۔ اس دفعہ اسکے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ کالا برقع پہنے ہوئے۔ جب وہ دونوں میرے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے تو لڑکے نے ایک جھجک کے ساتھ مجھ سے کہا۔ "انہیں کے بارے میں اس دن میں نے آپ سے ذکر کیا تھا"۔ پھر اس نے لڑکی کو نام سے پکارتے ہوئے کہا: "آجرہ نقاب اٹھاؤ"۔ اور لڑکے کے کہنے پر اس نے نقاب اٹھا دیا۔ اٹھارہ انیس برس کی ایک خوش شکل لڑکی تھی۔ غریب گھرانے کی مگر سلجھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے پوچھا:

"آپ اپنے میاں سے طلاق لینا چاہتی ہیں؟"

وہ شرما گئی اور بولی۔ "جی ہاں!"

"وجہ کیا ہے؟"

وہ اور شرمائی، ور اس کے رخساروں پر سرخی کی لکیریں دوڑنے لگیں رشمنے اس کی طرف دیکھکر کہا۔ "ہاں ہاں بتاؤ شرمائی کیوں ہو؟" لڑکی نے ہمت کر کے کہا۔ "جی وہ مجھے مارتا بہت ہے۔ ہماری بنتی نہیں اور وہ مجھ پر ظلم بہت کرتا ہے۔ اور پھر......" یہاں پہنچکر لڑکی رک گئی۔

"اور پھر......؟" میں نے دہرایا۔

"اور پھر اگر مجھے طلاق ہو جائے تو میں کسی اچھے آدمی کے ساتھ شادی کروں گی۔" میں نے چور نظر سے دیکھا تو میز کے نیچے اس لڑکی نے لڑکے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور ان دونوں نے اس طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے انہیں میری موجودگی کا قطعاً احساس نہیں رہا۔ خدا جانے وہ کیا نگاہ تھی کہ مجھے یوں معلوم ہوا جیسے کمرے میں چاروں طرف موتیا کی ہلکی ہلکی مہک پھیل گئی ہو۔ محبت بھی کیا عجیب چیز ہوتی ہے۔ لڑکے نے پہلی دفعہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

"یہ بتلایئے اگر ہم اس وقت گھر جانے کی بجائے کہیں اور چلے جائیں تو کیا ہو گا؟"

میں نے کہا۔ "آپ دونوں گرفتار ہو جائیں گے۔"

"اور اگر ہم نکاح پڑھوالیں تو؟"

"تو آپ کے ساتھ وہ مولوی بھی گرفتار ہو جائے گا جو آپ کا نکاح پڑھے گا۔ شادی شدہ عورت سے شادی کرنا جرم ہے۔"

میں نے لڑکے کے چہرے کی طرف دیکھا تو مجھے اطمینان ہوا کہ یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی ہے۔

لڑکی کی طرف دیکھکر میں نے کہا۔ "اگر آپ طلاق کا دعویٰ دائر کرنا چاہتی ہوں تو اپنے والد یا کسی اور عزیز کو میرے پاس بھیجدیجئے۔" چلتے ہوئے میں نے نوجوان کو پھر تاکید کردی کہ اس نے لڑکی کے ساتھ بھاگ جانے کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان پر عمل نہ کرے۔ اس میں سراسر نقصان ہو گا، ور کوئی اچھا نتیجہ نہ نکلے گا۔ لڑکی کی آنکھوں میں تشکر کی جھلک تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ "اچھا کیا آپ نے ہم کو سیدھے راستے پر ڈال دیا۔"

اس واقعہ کو مہینوں گزر گئے۔ ایک روز دفتر میں کام کر رہا تھا کہ منشی جی نے کہا: "ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ کہتے ہیں ضروری کام ہے۔"

میں نے کہا۔ "اندر بھیج دیجئے۔" ایک بزرگ صورت کمرے میں داخل ہوئے۔ عمر کوئی ساٹھ سے دو ایک برس کم۔ چہرے پر سفید ہوتی ہوئی چگی سی داڑھی، لبریز آنکھیں، کچھ پریشان سے دکھائی دیتے تھے۔ بیٹھتے ہی بولے۔ "میرے لڑکے نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ آپ کو سب قصہ معلوم ہے۔ انہوں نے اپنے لڑکے کا نام بھی لیا مگر مجھے کچھ یاد نہ آیا کہ کس کا ذکر کر رہے ہیں۔ اور میں یونہی اس امید میں ہوں ہاں کرتا رہا کہ کہیں نہ کہیں سے اس بات کا سرا ہاتھ لگ جائے گا۔ وہ کچھ اکھڑی اکھڑی سی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "آپ اپنے لڑکے کو کیوں نہیں بلا لیتے؟"

انہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولے۔ "آپ کو نہیں معلوم، اسے تو تین سال قید بامشقت کی سزا ہو گئی ہے۔" اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے کاغذوں کا ایک پلندا میرے سامنے رکھ دیا۔ "میرا تو خیال تھا۔ آپ کو سب معلوم ہے۔ وہ ہمارے گھر کے اوپر والی منزل پر جالندھر کا ایک ریفیوجی رہتا ہے، ہوٹل کا کاروبار کرتا ہے، اس کی ایک جوان بیوی ہے۔"

میرے ذہن میں ٹن سے گھنٹی بجی اور میں نے بے صبری سے پوچھا۔ "تو وہ نوجوان لڑکا اسے اغوا کر کے لے گیا آخر؟"

"جی نہیں اغوا کر کے لے جاتا تو مجھے افسوس نہ ہوتا۔ اس عورت کے خاوند کو جب ان دونوں کے بارے میں علم ہو گیا تو اس نے تھانے میں جھوٹی رپٹ لکھا دی کہ جب وہ عورت گھر میں اکیلی تھی تو وہ بری نیت سے اس کے گھر میں گھس گیا اور......"

مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی اور میں نے جلدی سے پوچھا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے، کیا یہ وہی لڑکی نہیں جو آپ کے لڑکے کے ساتھ میرے دفتر میں آئی تھی۔ اپنے خاوند پر طلاق کا مقدمہ دائر کرنے؟"

اس بزرگ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جیسے وہ یہ بات پہلی دفعہ سن رہا ہے۔ اس نے کہا۔ "یہ مجھے معلوم نہیں۔ میرے لڑکے نے یہ مختارنامہ آپ کے نام دیا ہے۔ میں اسے جیل میں ملنے گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میں آپ سے ملوں اور مقدمے کے کاغذ اور اپیل دائر کرنے کے لئے مختارنامہ آپ کو دیدوں۔ وہ تو یہی کہتا تھا کہ آپ کو سب معلوم ہے۔"

اور جب میں نے جلدی جلدی کاغذات دیکھنا شروع کیے تو مجھے احساس ہوا کہ مجھے تو خاک بھی معلوم نہیں۔ مقدمے کی رپٹ خاوند نے لکھوائی تھی کہ جب وہ دوپہر کو غیر متوقع طور پر گھر پہنچا تو مکان کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس کی بیوی کے چیخنے چلانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ دروازہ توڑ کر اندر پہنچا تو ملزم اسکی بیوی کے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے جلدی سے مسماۃ ہاجرہ بی بی کا بیان پڑھنا شروع کیا۔ میں جوں جوں اس کا بیان پڑھتا جاتا تھا۔ الجھن اور بے یقینی کا جال میرے گرد تنگ تر ہوتا جا رہا تھا۔ کیا یہ وہی لڑکی تھی جو اس خوبرو نوجوان کے ساتھ میرے دفتر میں آئی تھی۔ اس نے نہ صرف اپنے خاوند کے بیان کی تائید کی تھی بلکہ جرح میں یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ اس ملزم کو سرے سے جانتی ہی نہیں اور نہ اس سے پہلے کبھی اس سے ملی ہے۔

میں نے سفید چگی داڑھی والے بزرگ سے پوچھا: "کیا آپ بتا سکتے ہیں اس عورت نے آپ کے لڑکے کے خلاف شہادت کیوں دی؟"
بڈھے نے میری طرف یوں دیکھا جیسے اس لمحے میں اسے دنیا کا بیوقوف ترین آدمی نظر آ رہا تھا اور پھر اس نے کہا: "میاں صاحب، آپ تو سمجھدار آدمی ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہوگا کہ عورت جس کے قبضے میں ہو ہمیشہ اسی کی شہادت دیتی ہے۔ سارا محلہ جانتا ہے میرا لڑکا بے گناہ ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ ہوٹل والے نے عدالت میں لے جانے سے پہلے اپنی بیوی کو مارا بھی، اسے قرآن بھی اٹھوایا اور منتیں بھی کیں کہ اگر اس نے یہ گواہی نہ دی تو اس کے خاوند کی عزت ختم ہو جائے گی۔"

میں نے نظریں میز پر جھکا لیں اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرنے لگا جیسے کاغذات کو دیکھنے میں مصروف ہوں۔ مگر دل تو یہی پوچھ رہا تھا کہ آخر اس لڑکی نے یہ بیان کیوں دیا۔ یہ تو وہی لڑکی ہے جو اس ملزم کے ساتھ میرے دفتر میں آئی تھی اور ان دونوں نے میری آنکھ بچا کر میز کے نیچے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ چگی داڑھی والے بزرگ نے دفتر کی گہری خاموشی کو توڑا۔ "میرے لڑکے کا آخری سہارا آپ ہیں۔ سب سے بڑی امیدیں ہیں۔"

میں سوچنے لگا کہ میں اس بزرگ کو کیسے سمجھاؤں کہ مجھے تو اس مقدمے میں وکیل نہیں گواہ ہونا چاہیے تھا۔ عدالتیں تو مقدموں کے فیصلے شہادت پر کرتی ہیں۔ دفتر میں ہر طرف دیمک لگے ہوئے بوسیدہ کاغذوں کی بو پھیلنے لگی تھی۔

اگست ۱۹۶۱ [year uncertain]

ناول نگار کے سامنے [illegible] ہے کہ [illegible] ان سب جگہوں
کے بارے میں لکھنا تھا جہاں حیدر خان نے اپنی زندگی کے بدترین
اور بہترین دن گزارے۔ یہ کام بڑی عمدگی سے انجام دیا گیا ہے
بصرہ کی بندرگاہ ہو یا منچوریا کے قحبہ خانے امریکہ کی بستیاں ہوں
یا پرانے لندن کی گلیاں۔ منظر نگاری اتنی اچھی ہے کہ ہم خود کو
وہاں سانس لیتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ اور جب زندگی کی
کوئی بہت گھناؤنی حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے تو ہم
سچ مچ کی پریشانی محسوس کرتے ہیں۔

عکس تحریر [illegible] جمال

# فاختہ

واجدہ تبسم

مینا ابھی ابھی بستر پہ سے اٹھ کر گئی تھی۔ اس کے بدن کی گرمی سے بستر گویا جھلس رہا تھا۔ سر کے دباؤ سے تکیہ کے بیچ میں ایک گول سا نشان پڑ گیا تھا۔ چوٹی جو پیٹھ کے نیچے دب گئی تھی اس نے چادر پر اپنا بل کھایا ہوا نقش چھوڑ دیا تھا۔ اور پورا بستر بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

بشیر میاں جوتے اتار کر بستر پر بیٹھنے لگے تو اکدم انہیں مانوس سی خوشبو کا احساس ہوا۔ بستر پر بیٹھے تو اسے بڑا نرم نرم گرم گرم سا پایا۔ جیسے فاختہ کے پر۔

"سوں" کر کے انہوں نے زور سے سانس لی۔ اور ناک سے ہوتی ہوئی خوشبو ان کے دل تک اتر گئی۔ اکدم وہ بوکھلا سے گئے۔ یہ کیفیت تو ان پر کبھی نہ گزری تھی۔ ایسا لگا گویا فاختہ کے گدگدے اور چپتے ہوئے پروں میں دھنس گئے ہوں۔ وہ بستر سے اٹھ گئے۔ منی اور ارشد کمرے کے باہر کھیل رہے تھے۔ انہوں نے بڑی سہمی ہوئی آواز سے پکارا:

"اے منی۔ اے ارشد۔ ذرا ادھر تو آؤ۔"

منی بھاگتی ہوئی آئی اور آنکھوں پر سے بال ہٹاتی ہوئی بولی،

"ہمیں بلایا ابا میاں"؟؟

"بیٹی تم میرے بستر پر سوئی تھیں۔"؟ انہوں نے حد درجہ رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں جی۔ ہم تو جب سے باہر کھیل رہے ہیں"

"اچھا تو شاید ارشد سویا ہوگا"۔ اور انہوں نے ارشد کو پکارا۔ "واہ جی۔ ہم تو ایکساں منی کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ ہم نے تھوڑے ہی دھرے ہیں گندے پیر آپ کے بستر پہ۔ ہاں آپا ابھی ابھی سو کے اٹھی ہیں۔"؟

بشیر میاں سن ہو گئے۔ بستر پہ مچلتی ہوئی خوشبو نے انہیں آپ ہی بتا دیا تھا "میں مینا کے پاس سے آئی ہوں"!

انہیں یاد آیا ممانی بی سدا مینا کے لیے چکی میں خوشبودار مصالحے پسوایا کرتی تھیں۔ اور مینا ہمیشہ سے صابن کی بجائے مصالحوں سے نہاتی ہے۔ جبھی تو اس کے بال اتنے لمبے لمبے ہیں اور چلتے میں اس کے پاس سے نئی نویلی دلہنوں کی سی خوشبو آتی ہے۔

گول بیچ دار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ سنائی دی اور پھر بڑی باریک سی۔ ملائم سی میٹھی آواز آئی:

"اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آ گئے۔"

آج بشیر میاں کو یہ آواز بالکل نئی لگی۔ لہجہ بالکل نیا لگا اور وہ بیٹھے بیٹھے الجھتے رہے۔ "اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آ گئے۔" ممانی بی مینا کو کئی بار ٹوک چکی تھیں کہ "اے بیٹا اپنے سے بڑوں کو رشتہ لگایا کرتے ہیں۔" مگر جہاں جہاں بھی رشتہ لگانے کا موقع آیا مینا کی زبان ہکلا گئی۔

بشیر میاں ممانی بی کے سگوں میں سے ہوتے تھے۔ ایسا بہت دور کا رشتہ بھی نہ تھا۔ شادی ہوئی تو دوہرا رشتہ ہو گیا۔ بھانجے لگتے تھے اور ممانی بی ممانی بی کہتے منہ سکھاتے تھے۔ ممانی بی کو بھی ان سے بڑی محبت تھی۔ کوئی کار ہو کوئی کاج ہر کام میں بشیر میاں کی رائے لی جا رہی ہے۔ بشیر میاں بلائے جا رہے ہیں۔

جہاں کوئی اچھی سی چیز پکی۔ رکابیوں میں لگا، سرپوش ڈھک، جھٹ سے نصیبن لوا کے حوالے کشتی کی کہ جا جلدی سے بشیر میاں کے ہاں پہونچا آ۔

شبیر میاں بھی ممانی سے ایسے گھلے ملے تھے کہ ماں سے بھی اتنی نہ رہی ہوگی۔ اور جب سے تو ان کی جاگیر کا قصہ ختم ہوا تھا یہ اپنا گاؤں چھوڑ کر یہیں آبسے تھے۔ ممانی جی کے ہی پڑوس میں چھوٹا سا مکان تھا۔ وہیں رہتے۔ شادی شدہ تھے۔ شریف خاندانی بیوی تھی۔ دو بچے۔ مزے سے کٹ رہی تھی۔ اپنے کام کاج سے فرصت پاتیں تو رفیعہ بیگم بھی گھڑی دو گھڑی کو ممانی بی کے پاس آ بیٹھتیں۔ مینا سے ان کی بڑی دوستی تھی۔ دل سے دل ملتے کیا دیر لگتی ہے۔؟ یہ تیس کے اندر تھیں اور مینا تو سولھویں سترھویں میں ہی تھی۔ پھر بھی دونوں ایسے گھل مل تھیں گویا ساتھ کی کھیلی سہیلیاں۔ گھنٹوں سر جوڑے میٹھی باتیں کرتی رہتیں۔

مینا کو شہر سے افسر کا پیام آیا تو انہی کی کوششوں سے ہی طے ہوئی تھی۔ اب لاکھ ممانی بی کہتی ہیں:

"واہ بی۔ اچھا کیا لڑکا ہے۔ گن کا ڈھنگ کا۔ اب اور کیا دکھیں گے؟" مگر رفیعہ بیگم کی ایک نہیں تو لاکھ نہیں۔ ممانی بی نے کہا بھی۔ "اے تم ایسی جنم جنم کی دشمن کاہے سے ہوگئی ہو لڑکی کی۔ کہ منہ توڑا انکار کئے جاتی ہو" ہنس کے بولیں۔ "اے ممانی بی ہماری مرضی نہیں تو آپ کیوں مجبور کر رہی ہیں"

اصل میں مینا کی مرضی نہ تھی۔ کیوں نہیں تھی؟ بس نہیں تھی۔ اڑتے اڑتے اتنا ضرور سنا تھا کہ صاحبزادے ذرا رنگین مزاج ہیں۔ ممانی بی اتنی روشن خیال بھی نہ تھیں کہ بیٹی کے منہ سے صاف "نہیں" سن سکتیں۔ اس لئے رفیعہ بیگم نے اپنی طرف سے توڑ جوڑ کر کے بات بنادی۔ ممانی بی بھی کھٹک گئیں سوچا "اپنی طرف سے تو یہ زور زور دری سے کہہ نہیں سکتی۔ ہوگی دونوں کی ملی بھگت" خاموش رہ گئیں۔

ویسے سچ بات تو یہ بھی کہ ممانی بی اتنی لکیر کی فقیر بھی نہ تھیں۔ انہوں نے تو آپ ہی بہت سی دیواریں گرادی تھیں۔ "عصمت" تو خیر جانے زمانے سے آتا تھا۔ اب تو رسالوں کی ڈور بندھ گئی تھی۔ جہاں کسی نئے پرچے کا نام سنا اور مینا نے چندہ بھیجا۔ اتنا یقین تو انہیں بھی ضرور تھا کہ اوندھی سیدھی کتابیں تو خیر مینا نے نہیں پڑھیں مگر یہ انہونی ضرور کر دکھائی کہ ایک مضمون لکھ ڈالا۔ اب نصیب ہی اوندھے ہو ں تو کوئی کیا کرے۔ وہ چھپ بھی گیا۔ سارے خانوادے میں دبے دبے ہوئی کہ ممانی بی سے تو منہ چھپانا بھی نہ بن پڑسکا۔ پانی ایک ہی بار منہ زور توڑ کے راہ بنائے تو پھر تو سبھی جگہ سے بہتا چلا جاتا ہے۔ پہلی بات تھی۔ سبھوں میں دھوم سی ہوگئی۔ مگر اب بعد میں تو یہ عالم ہو گیا کہ مینا نے باقاعدہ انگریزی بھی پڑھ ڈالی۔ بہشتی زیور اور دینی مسائل تو پڑھے ہی پڑھے تھے۔ الٹے سیدھے ناول کہانیاں بھی پڑھنی شروع کر دیں۔ سب سے پہلے جو کتاب گھر میں آئی "دولت پر قربانیاں" تھی۔ پھر تو گویا کھلی چھٹی ہی مل گئی۔

مگر اب الٹے سیدھے ناول پڑھنے کا یہ بھی مطلب نہیں ہے کہ سرے سے ناک ہی کاٹ ڈالی ماں باپ کی۔ مگر ہاں اپنا مستقبل خود بنالیا۔ ساتھ ہی ساتھ پرانی باتوں کا تو رطلسم، سی نے توڑا۔ چار کلی کے کھڑے پائنچوں کے پاجاموں، اور بند گلے کی کرتیوں کی بجائے وہ ساڑی پہنتی تھی۔ کانوں میں ممانی بی کے جہیز کی بالیاں تو اس نے سرے سے پہنیں ہی نہیں۔ جگ مگ جگ مگ کرتے ٹاپس پہنتی تھی۔ جھکا جھول چندن ہار اور چوسری کی بجائے گلے میں ہلکا پھلکا کوئی نکلس ڈال لیتی۔ اور یہ بھی روز روز نہیں۔ کسی کے ہاں آنا جانا ہوا تو ماں کے اصرار پہ پہن لیا۔ نہیں تو وہی اپنے بھونڈے ہاتھ۔ بھونڈا گلا۔ آنے جانے والیاں ٹوکتیں بھی۔

"اے کنواری اور سہاگن سے ہی گھر کی رونق ہے۔ یہ ٹھنٹھے ہاتھوں کی کیا چال اٹھائی ہے بی" یہ مسکرا کر رہ جاتی۔ خاندان والے تو علی الاعلان کہتے کہ۔ "اے بی بڑی بیگم نے تو لونڈیا کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے"

گھپ اندھیرے میں زور دار اجالا گھس پڑے تو آنکھیں پہلے تو چکاچوند کرنے لگتی ہیں پھر اسی چکا چک اجالے کی عادی ہوجاتی ہیں۔ ممانی بی کو تو احساس ہی نہ ہوتا تھا کہ واقعی ان کی بیٹی اور خاندان والیوں سے الگ ہے۔

ممانی بی کے میکے میں، اور اب یہاں سسرال میں بھی اتنا سخت پردہ تھا کہ مردوں کی تصویر تک دیکھنا گویا پردہ توڑ دینے کے برابر تھا۔ مینا کو بھی حسب قاعدہ سب سے پردہ کرایا جاتا مگر اس نے جو ادھر ہاتھ پاؤں اچھالے تو سبھی جڑیں کاٹ پھینکیں۔

رفیعہ بیگم کا زچہ خانہ ہونے والا تھا۔ دردوں سے بے حال پڑی تھیں۔ ڈاکٹر لیڈی ڈاکٹر کا تو کدھر گذر ہوتا محلے کی دائی کو بلایا گیا۔ وہ بھی آخر کو اناڑی نکلی۔ کچھ سمجھ پڑا کچھ نہ پڑا۔ اس نے آڑے ٹیڑھے ہاتھوں سے کچی زچہ کو ایسے جھجھوڑ دیئے کہ لالے جینے کے دینے پڑ گئے۔ بڑی تجربہ کار بوڑھیاں بھی ہاتھ مل کر رہ گئیں۔ ممانی بی کو بھی کچھ نہ سوجھا۔ مینا اپنے گھر ہی پر تھی۔ کنواری بال چھوکریوں کا ایسے موقعوں پر کام بھی کیا؟ مگر شبیر میاں کو تو معلوم تھا کہ بٹیا کافی لکھ پڑھ گئی ہیں۔ جھنو خالہ کا بیٹا حوض میں گر پڑا تھا تو انہوں نے اوندھا لٹا کے سارا پانی نکلوا دیا تھا۔ جھنو ماں کو سانپ نے کاٹا تو یہ اثر زائل ہونے تک نیم کی پتیاں بار بار چبواتی رہیں۔ ممکن ہے رفیعہ بیگم کو بھی کوئی دوا لگ جائے۔ اے مان لیا کہ ڈاکٹرنی نہیں تھیں پھر بھی تھوڑی بہت دوا دارو دینی تو آتی ہی تھی؟

دوڑے دوڑے آئے۔ وہیں پردے کے پاس کھڑے کھڑے نصیبن بوا سے کہلوایا۔

"چھوٹی بی بی سے کہیو۔ بیوی کی طبیعت اچھی نہیں۔" ساری ..... بات پوری ہونے سے پہلے ہی نصیبن بوا چیخ اٹھی۔ "اے میاں تمہاری عقل سلامت ہے۔ بالی چھوکری سے ......."

بات پوری ہونے سے پہلے ہی مینا خود دروازے تک پہنچ گئی اور وہیں سے بولی۔ "میری اپنی ذاتی رائے تو یہ ہے کہ آپ فوراً کسی لیڈی ڈاکٹر کو بلوا لیجیے۔" اور ایک ڈاکٹرنی کا پتہ بھی بتا دیا۔

شبیر میاں الٹے پاؤں واپس ہوئے۔ جانے کیا بات یاد آئی تو پھر لوٹ کر آئے۔ آواز دی اور کہا:

"میں یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ وہ فیس کیا لے گی؟ ابھی یہ بات منہ ہی میں تھی کہ پھر بولے۔" اور فیس کا کیا ہے۔ جان سے بڑھ کر تو پیسہ ہوتا نہیں۔ اللہ جانے وہ آتی ہے یا نہیں۔ پھر میں کیا کروں گا؟"

اور ان کی آواز بھرا گئی۔ لاکھ آدمی ضبط کرے مگر بیوی کا ساتھ کچھ ایسا کچا بندھن تو ہوتا نہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ ان کی بی بی ان کا کہنا ذرا کم ہی مانتیں۔ اور بات پیچھے منہ کو منہ دیئے چلی جاتیں۔ کہنے والے کہتے ہی ہیں کہ یہی منہ چادر سے اٹھاتا ہے اور یہی منہ چادر میں بٹھاتا ہے۔ مگر اب یہ بات بھی نہ تھی کہ اتنی اتنی سی باتوں کو لے کر وہ کھڑے کھڑے کہہ دیتے کہ "جاؤ بی بی میں نے تین بار کہتیں طلاق دی۔" میاں بی بی کی زندگی بچوں کا کھیل تو ہوتی نہیں کہ جب دل بھر گیا ایک نے سب کو مخاطب کر کے کہہ دیا "کھیل ختم پیسہ ہضم۔" ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ بغیر دھوئیں کے لکڑی جلے۔

مینا کو بھی خیال آ گیا کہ اللہ جانے وہ انکار ہی کر دے۔ پھر کیا ہو گا۔" لپک کر باہر ہی تو نکل آئی اور بولی:

"چلیے دونوں مل کر اسے بلا لائیں۔" اور اسی جھپاکے میں وہ شبیر میاں کے ساتھ ہو گئی۔

شبیر میاں کی بی بی کی زچگی بھی ہو گئی۔ چلہ بھی نہا لیا۔ بات پرانی پڑ گئی مگر خاندان والوں نے کیا کیا بہتان نہیں باندھے! لیکن مینا نے ذرا شکن نہ چڑھائی۔ ممانی بی نے البتہ دو چار دن بٹیا سے بول چال ضرور بند رکھی مگر پیٹ کی اولاد سے کوئی منہ پھیرے بھی تو کب تک؟ اب تو شبیر میاں کا آنا جانا بھی شروع تھا اور مینا بھی سامنے آتی تھی۔ سلام کرنے کو ہاتھ تو اٹھاتی مگر منہ سے کچھ نہ بولتی۔ بس چاندی کا پنجہ چاند ایسے ماتھے سے چھو جاتا۔ ممانی بی ہنس کر جاتیں "ڈانٹتی بھی۔" پڑھ لکھ کر بالکل ہی چلن بدل دیا۔ یہ بھی کوئی سلام ہوا؟" مینا ہنس پڑتی۔

رفیعہ بیگم کی زچگی بڑی مشکلوں سے ہوا کرتی۔ پہلا بچہ تو جیسا ہوا ہوا۔ دوسرا اپنے وقت کا قیصر تھا۔ ڈاکٹرنی صاف کہہ گئی تھی کہ اب کے بچہ ہوا تو جان کو خطرہ ہے۔ مگر ڈھائی دو برس پیچھے پھر رفیعہ بیگم امید سے رہیں۔ اور اب کے جو زچگی کا وقت آیا تو بچہ بھی ضائع ہوا اور ماں بھی۔ شبیر میاں بھری پُری دنیا میں تنہا رہ گئے۔

چہلم پر ممانی بی نے بہت آنسو بہائے۔ دل تو شبیر میاں کے لئے بہت دھڑک رہا تھا مگر کرتی بھی کیا بیچاری۔ جوان بیٹی کا ساتھ تھا اور ہر ایک کے پیچھے شیطان لگا ہوا ہے۔ دنیا دکھاوے کو منہ سے کہا بھی کہ "میاں اب تو دیکھ بھال والا کوئی نہیں۔ ہائے ہائے اٹھ آؤ نا۔" مگر شبیر میاں بھی ان کی مجبوری کو سمجھتے تھے۔ سر ہلا کر انکار کر دیا۔

مینا کو ان پر بڑا ترس آتا۔ بیچارے اول ہی تو اللہ میاں کی گائے تھے اب تو بالکل ہی موم ہو کر رہ گئے تھے۔ دونوں بچے الگ ڈھائیں ڈھائیں پھرتے۔ مینا ہاتھ پکڑ کر منہ ہاتھ دھلا دیتی۔ ناشتے کے وقت آتے تو ساتھ بٹھا لیتی۔

ایک دن شبیر میاں بھی آئے بیٹھے تھے۔ دونوں بچے بھی ساتھ تھے۔ ممانی بی نے پھیر پھیر سے ذکر چھیڑا۔ "اے میاں لوگ تو کہتے ہیں بیوی کی موت کہنی کی چوٹ ہوتی ہے۔ لگتی بڑے زور سے ہے مگر ذرا دیر میں درد غائب۔ تم کب تک یونہی رہو گے۔ ماشاء اللہ خود بھی جان جوان ہو۔ ننھے ننھے بچے ہیں کوئی تو ہو دیکھ بھال کرنے والا؟"

شبیر میاں بولے "ممانی بی رنج و غم کی بات تو جانے ہی دیجیے۔ میں سوچتا ہوں آنے والی بچوں سے سگی ماں کا سا برتاؤ نہیں کر سکے گی۔ اور میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکوں گا۔" ان کی آواز بھیگ سی گئی پھر ٹھہر کر بولے "کیا گھر کا گھر دا ہو گیا ممانی بی۔ اب تو دھول اڑتی ہے ہر طرف۔ باہر سے آؤں تو کوئی منہ دھلانے والا بھی نہیں۔ پانی وانی کی ضرورت پڑے تو اٹھ کر خود دوں تو لوں ورنہ کوئی اس کا بھی روادار نہیں کہ پیاس ہی بجھا دے۔ بچے الگ تباہ حال۔"!

مینا کا دل اندر سے پگھل اٹھا۔ بولی:

"آیئے ہمارے ہاں آجایئے نا۔ یہاں اماں بھی ہیں۔ بچوں کا جی بھی بہل جائے گا۔"

"میں آتو جاؤں۔ مگر" شبیر میاں کی زبان گنگ ہوگئی۔

ممانی بی بھی بات کا رخ دیکھ کر خاموش رہ گئیں۔ مینا پھر بولی۔ "خاندان والوں سے ہی ڈر رہے ہیں نا آپ؟؟ اپنے کام سے کام رکھئے۔ کتوں کا کام بھونکنا ہے۔ بھونکتے ہی رہتے ہیں؟"

تھوڑی دیر یوں ہی ہاں ہاں ہوتی رہی پھر ممانی بی نے بھی زور دیا تو شبیر میاں اسی دن اٹھ آئے۔ مینا کا وقت اب بڑا اچھا کٹ جاتا۔ تمام دن بچوں میں الجھی رہتی۔ بچے بھی ہل مل گئے تھے۔ اپنی ماں کو بھول کر بھی یاد نہ کرتے کبھی کبھار ایسے ہی مینا کے جسم پر کوئی خوبصورت سا کپڑا یا زیور دیکھ لیتے تو کہتے:

"امی جی بھی ایسا ہی کرتا پہنتی تھیں۔"

"ہماری امی کے پاس بھی ایسا ہی ہار تھا؟"

شبیر میاں گھر میں رہتے ضرور۔ مگر یوں جیسے رہتے ہی نہ ہوں۔ نہ چیٹ نہ پٹ کبھی اونچی آواز سے بولتے نہ قہقہہ لگا کر ہنستے۔ ممانی بی جس ڈر سے انہیں اپنے گھر بلانے سے ڈرتی تھیں وہ بالکل ناممکن سی بات تھی۔ ایسے بھولے بھالے تھے کہ بھولے سے بھی مینا کو آنکھ بھر کر نہ دیکھتے۔ ایک دن باتوں ہی باتوں میں ممانی بی بولی تھیں۔ بچپن میں میری بٹیا مینا کی طرح چہکتی تھی بس میں نے یہی نام ڈال دیا۔" اس پر شبیر میاں نے آنکھیں اٹھا کر ضرور اسے دیکھا اور بڑی سادگی سے بولے۔ "واقعی اچھا نام دیا آپ نے۔ مینا بڑی پیاری ہنسی ہنستی ہیں؟"

مینا کے چم چم چمکتے دانت گلابی گلابی ہونٹوں میں چھپ گئے۔ اتنی سادگی سے جو اتنا بڑا سچ کہہ دے تو اس سے کوئی خطرہ نہیں ہوسکتا۔ شبیر میاں کے لہجے میں کوئی گہرائی نہ تھی۔

بڑے نانا کہتے تھے کتوں کا رونا بڑا نحس ہوتا ہے۔ کتے کے رونے کی آواز آئے تو صدقہ دلوا دینا چاہیئے۔۔ اس رات رو رو کے کتے بھونکتے رہے۔ اور صبح ہی صبح نصیبن بوا نے تازہ تازہ دودھ ابال لینے کے لئے چولھے پر چڑھایا تو وہ آپ ہی آپ پھٹ گیا۔ نصیبن بوا زمانہ دیکھے ہوئے تھیں۔ منہ سے تو کچھ نہ بولیں مگر مولی کی دوہائی مانگنے لگیں۔ چار دن کی بیماری میں ممانی بی چٹ پٹ ہوگئیں۔ اور مینا، مینا سے اُلو بن گئی۔ اندھیاروں میں چھپتی روتی پھرتی۔ بستر پر اوندھے منہ پڑی پڑی سسکیاں لیتی رہتی۔ بیسیوں ہی تو پیام اچھے برے آئے ہوں گے مگر ماں کو پسند نہ آتے اور جو ماں کو پسند آیا بیٹی کو ناپسند ہوا۔ بیٹی کے بیاہ کا ارمان جی کے جی میں ہی لے گئیں۔ اب تو خاندان والوں کو موقع ہی مل گیا۔ جہاں دیکھو وہاں مینا اور شبیر میاں موضوع بنے ہوئے ہیں۔ اوندھی سیدھی، جھوٹی سچی ہزاروں ہی باتیں اڑائی گئیں اور مینا ہول ہول جاتی۔ باپ کا سایہ تو مدت ہوئی اٹھ چکا تھا ماں چھاؤں بن کر سہارے بیٹھی تھیں وہ بھی چل دیں۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی مگر روپے پیسے ہی سے تو سب کام نہیں چلتے؟۔

بولنے والے بھی کہاں تک بولتے۔ تھک ہار کر خود ہی چپ رہ گئے۔ شبیر میاں اب بھی مینا کے ہاں ہی رہتے۔ باہر سے آتے سیدھے اپنے کمرے میں پہونچ جاتے۔ گرمی کے دن ہوتے تو دالان میں نظر آتے۔ مونڈھا بچھا ہوا۔ اخبار منہ سے لگا ہوا۔ سردیوں اور بارشوں میں تو اتنا بھی نہ ہوتا۔ ان کے آنے ہی گول پیچ دار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ ابھرتی۔ اور پھر نرم نرم سی میٹھی آواز:

"اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آگئے؟"

شبیر میاں اور مینا اسی زندگی کے عادی ہوگئے۔ نہ ان کے دل میں ان کے لئے کوئی جگہ بنی نہ انہوں نے ان کو اپنے دل پر چڑھایا ایک دن ارشد اپنی آنکھیں کھجلاتا ہوا آیا اور ٹھنکا کر بولا۔ "ہماری آنکھوں میں کھجلی ہوتی تھی تو امی کاجل لگا دیتی تھیں۔"

"ارے رے۔ مینا نے اسے پیار سے گود میں اٹھا لیا۔" تو بھی مجھ سے پہلے ہی کیوں نہ کہا۔ میں نہ بنا دیتی اپنے راجہ گڈے کے لئے کاجل؟

مینا نے سکوری بھر کے ارنڈ کا تیل شیشی سے انڈیلا۔ روئی کو بل دے کر بتی بنائی اور کونے میں چراغ سا بنا کر اوپر سے مٹی کا ایک پیالہ اوندھا دیا۔ گھنٹہ بھر کے بعد یہ اتنا بڑا کاجل جم گیا۔ مینا نے ڈبیہ میں کاجل پکڑا۔ ارشد کو گود میں بٹھا کر اس کی آنکھوں میں سلائی پھیرنی چاہی:

"آں ہاں۔ امی کہتی تھیں آنکھوں میں لوہا نہیں پھیرنا چاہیئے؟" مینا ہنس پڑی۔ "اچھا تو انگلی سے لگا دیں؟"

"ہاں"؟ ارشد نے سر ہلا دیا۔

مینا نے ارشد کی دونوں آنکھوں میں انگلی پھیری۔ تھوڑا کاجل پھر بھی انگلی پر لگا رہ گیا۔ وہ اس نے اپنی آنکھوں میں بھر لیا۔ اور بھول بھی گئی کہ کاجل لگا تھا۔

شام کو شبیر میاں آئے۔ گول پیچ دار زینے پر مانوس قدموں کی کھٹ کھٹ سنائی دی پھر میٹھے لہجے میں آواز آئی:

"خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آ گئے۔"

دسترخوان پر بیٹھے تھے کہ ارشد مینا کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لے آیا۔

"ابا میاں۔ آپا نے ہماری آنکھوں میں کاجل لگا دیا ہے۔ دیکھا آپ نے۔"

"ہاں ہاں۔ بڑی اچھی ہیں تمہاری آپا۔" اور وہ اسی انہماک سے کھاتے رہے۔ کھانے کے بعد دالان میں نکل کر مونڈھے پر بیٹھے تھے کہ مینا آ گئی۔ اخبار دیتے ہوئے بولی:

"ذرا پڑھنے کے لئے لے گئی تھی۔ معاف کیجئے بغیر پوچھے ہی اٹھا لیا۔" شبیر میاں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی معذرت پر کچھ کہنا چاہتے تھے۔ مگر اکدم رک کر، سادگی سے بولے:

"ارے میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔ مینا تمہاری آنکھیں کتنی خوب صورت ہیں۔" اور اخبار لے کر پڑھنے میں یوں منہمک ہو گئے گویا کسی لڑکی کی خوبصورت آنکھوں کی تعریف نہ کی ہو، موسم کی تعریف کی ہو۔ "واہ بھئی۔ کیا اچھا موسم ہے!"

مینا بوکھلا کر الٹے پاؤں بھاگی تو اس کا پیر ساڑی سے الجھ گیا اور وہ گر پڑی۔ شبیر میاں نے لپک کر اسے اٹھایا۔ نرم نرم گرم گرم پروں والی فاختہ گویا ہاتھوں میں آ گئی۔ سادگی سے بولے:

"ذرا سنبھل کے نہیں چلتیں ابھی ہڈی چورا ہو گئی ہوتی!" اور اٹھاتے میں مینا کا سر ان کی ناک سے اتنی قریب ہو گیا کہ بھینی بھینی سی خوشبو سے ان کا پورا وجود مہک مہک گیا۔

شبیر میاں نے اس دن اخبار پڑھا ضرور۔ لیکن اگر کوئی پوچھتا "سناؤ میاں آج کی خاص خبر کیا ہے؟" تو وہ بس ٹٹا کر رہ جاتے۔ مینا تین دن سے کسی نزلے میں پڑی گھل رہی تھی۔ شبیر میاں کو تین دن سے وہ مانوس کھٹ کھٹ سنائی نہ دی تھی۔ انہوں نے چاہا خبر لینے کو جائیں مگر پھر ارادہ ترک کر دیا۔ جانے کا ارادہ کرنے تو لگتا کہ نرم گرم پروں کے ڈھیر میں دھنسے جا رہے ہیں۔ گھبرا کر وہ باہر نکل آتے۔

"اونہہ زکام بھی کوئی بیماری ہوئی بھلا۔ آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی۔"

ایک دفعہ وہ بخار میں بھن کراہ کر پڑے ہوئے تھے تو مینا نے انہیں مشورہ دیا تھا:

"آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ آخر کوئی دیکھ بھال والا بھی تو چاہیئے نا؟"

اب انہیں خیال آیا یہ مینا شادی کیوں نہیں کر لیتی؟ آخر کوئی دیکھ بھال والا بھی تو چاہیئے نا؟ پھر انہیں مینا اور ممانی بی کے احسان یاد آ گئے انہوں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ مینا کے لائق کوئی بر ڈھونڈ نکالیں گے۔ مینا جو اتنی پیاری۔ اتنی خوبصورت اتنی سگھڑ اتنی تعلیم یافتہ ہے اس کے جوڑ کو جوڑ تو ملے۔ امینا کا دل کتنا نرم تھا۔ کئی بار وہ اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ چکے تھے۔ بچوں سے باتیں کرتے کرتے وہ رفیعہ بیگم کی یاد میں آنسو بہانا شروع کر دیتی۔ بچوں سے تو اب وہ اتنی ہل مل گئی تھی کہ رفیعہ بیگم کی کمی بھلا دی۔ بچے اب صاف ستھرے رہتے۔ روتے بسورتے نہ تھے اور صورت پر بہار آ گئی تھی۔

"لاحول ولا۔" شبیر میاں نے سوچا "میں بھی کتنا کور اخلاق ہوں وہ تو مجھ سے میرے بچوں سے اتنی ہمدردی کرے اور میں اس کی خبر تک نہ لوں!" اخبار مونڈھے پر رکھ کر وہ اٹھے اور مینا کے کمرے کی طرف چلے۔

مینا نے سردی کے مارے سوئیٹر چڑھا لیا تھا۔ اب جو گرمی ہوئی تو اسے اتار پھینکنا چاہا۔ سوئیٹر کھلے گلے کا نہ تھا۔ گردن میں سے اتار چڑھانا پڑتا تھا۔ دروازے کی طرف پیٹھ کر کے، ساڑی کا آنچل دونوں گھٹنوں میں دبا کر، وہ پیٹھ کے بل جھکے جھکے، زور لگا کر سوئیٹر اتار رہی تھی۔

شبیر میاں روایتی کابخ کی جوتی اور بالوں کی سنہری لٹ دیکھ کر، دھڑا دھڑ عاشق ہو جانے والے شہزادوں میں سے تو تھے نہیں۔ مگر یہاں اکدم جگمگاتی صبح دیکھ کر گھبرا اٹھے۔ ڈھیر سارے نرم گرم پر ان پر ان کو اپنا وجود ڈوبتا محسوس ہوا اور وہ ہڑبڑا کر لوٹ گئے۔

مینا نے قدموں کی چاپ سن کر بمشکل سوئیٹر کھینچ کر پھینکا۔ اور دیکھا تو شبیر میاں سر نیہوڑائے جلدی جلدی چلے جا رہے تھے؟

تین دن سے تو بخار ہی تھا تین دن مینا نے یوں ہی کمرے میں کاٹ دیئے۔ ہمت نہ پڑتی تھی کہ باہر نکلے۔ ساتویں دن اپنے کمرے سے باہر آئی تو سہی مگر شبیر میاں سے یوں لجائی لجائی جیسے نئی نویلی دلہن سسرال دکھاوے کو دولھا سے شرمائے۔ اور موقع ملنے پر دوپٹے کے کن انکھیوں سے دولھا کو دیکھتی جائے۔

شبیر میاں چپ چپ سے تھے۔ آگے بھی انہیں یہ خوشبو اپنے تکیئے پہ بستر پہ مل چکی تھی جو اپنے منہ سے کہتی تھی۔ "میں مینا کے پاس سے آئی ہوں"!

اب مینا اتنی گئی گذری بھی نہ تھی کہ کسی کے بستر پر لوٹیں لگاتی پھرے۔ منی اور ارشد سونے کے لئے کمرے میں جاتے تو اسے بھی گھسیٹ لیتے۔ "آپا ہمیں ڈر لگتا ہے نا۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلئے"۔

تب تک کہ یہ سوئیں سوئیں۔ یہ بیٹھی کتابیں ٹٹولتی رہتی۔ کبھی کبھار پیٹھ سیدھی کرنے کو شبیر میاں کے بستر پر لڑھک جاتی۔ انہی کا پلنگ اس وقت خالی ہوتا تھا۔

بدلی چھائی۔ برس گئی۔ آسمان پھر نیلا نیلا دھلا دھلا تھا۔ وہی شام کی واپسی۔ وہی بچوں کی شرارت۔ وہی مینا کی کھنکتی ہوئی ہنسی اور گول پیچ دار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ کے بعد نرم ملائم گھلی گھلی سی آواز:

"اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آ گئے"!

جاتے جاتے ایک دن شبیر میاں کہہ گئے۔ "مینا ان کپڑوں کو ذرا دھوپ دکھا دینا۔ کیڑا نہ لگ جائے"۔

اس دن تو مینا سے نہ ہو سکا۔ دوسرے دن صبح ابھی شبیر میاں گھر پر ہی تھے تو سارا سامان لے کر بیٹھ گئی۔ کپڑوں کے صندوق میں زیورات کی صندوقچی بھی نکلی۔ بچے بھی آدھمکے۔ صندوقچی کھول کے یوں ہی مینا بیٹھ گئی۔ سامان الٹ پلٹ کرنے لگی۔ صندوقچی بھری پڑی تھی۔ زیور سے۔ کرن افشاں تک۔ بس جوں کی توں۔ بچے پاس بیٹھے اوندھی سیدھی باتیں کر رہے تھے۔ ایک بھی سوال انہوں نے اپنی ماں سے متعلق نہ کیا۔

مینا خود ہی بول پڑی:

"امی کی یاد آتی ہے منے؟" ارشد اور منی ایک زبان ہو کر بولے۔ "اونہوں۔ آپ جو اتنی اچھی ہیں"!

"مگر میں امی کی برابری کہاں کر سکتی ہوں"۔ وہ ہنس کر بولی "اوں"۔ ارشد بولا۔ "ہم تو آپ کو اپنی امی سمجھتے ہیں"۔ مینا کا منہ لال ہو گیا۔ ہونٹ کانپ اٹھے۔ اس کی آنکھوں کے کونے گیلے گیلے ہو گئے۔ بڑی مشکل سے مسکرا کر بولی۔ "سچ"؟؟ "ہاں اور کیا"۔ ارشد بولا۔

مینا نے صندوقچی کا نچلا خانہ ٹٹولا۔ کالی پوت کا لچھا پڑا چمک رہا تھا۔ اس نے لچھا اٹھا کر مٹھی میں دبا لیا اور گھڑی کی طرف دیکھا — دس بجنے میں پندرہ منٹ تھے۔ روز اسی وقت شبیر میاں گھر سے باہر جاتے تھے۔

وہ تیزی سے لپکی۔ زینے کے پاس تھوڑی دیر رکی۔ مٹھی کھولی۔ اور پھر ڈرتی ہوئی دروازے میں رک گئی۔ "سنیئے"۔ وہ ٹھٹھک گئی۔

شبیر میاں بھی رک گئے۔ اور یکدم چونک گئے۔ دھانی ساڑی میں اس کا ہلکا پھلکا جسم کانپا جا رہا تھا۔ ساڑی کے آنچل کا ایک کونہ پتلے پتلے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ پلکیں لرز رہی تھیں۔ اور گوری گوری گردن میں سانسوں کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ کالی پوت کا لچھا کانپ رہا تھا۔

وہ اٹک اٹک کر بولی:

"سنگھار دان میں اور تو سب چیزیں ہیں۔ مگر مسی نہیں ہے"! اور وہ منہ پلو میں چھپا کر، شرما کر بھاگ گئی۔ شبیر میاں کے آس پاس نرم نرم فاختئی پروں کا ڈھیر سا لگ گیا اور وہ ڈوبتے ہی چلے گئے۔

شام کو جب وہ ہاتھ میں مسی کی دوہری پڑیا سنبھالے گھر میں داخل ہوئے تو گول پیچ دار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ اور ہوئی اور نرم ملائم سی، شکر میں گھلی ہوئی میٹھی آواز گونجی:

"اے خانساماں کھانا لگا دے۔ "وہ" آ گئے ہیں"!

ستمبر ۵۷ء

چالیس سالہ مخزن

# بیس منٹ کی جنت

رشیدہ رضویہ

جوتے کے تسمے جب نہیں کھلے۔ تو شوہر نے سنگھار میز سے قینچی اٹھا کر تسمے ہی کاٹ ڈالے۔ تقریباً پندرہ منٹ سے وہ تسموں سے الجھ رہا تھا۔ اب یہ تو بیوی کا فرض تھا کہ اس کام میں اس کی معاون ثابت ہوتی۔ جب کہ بیچارے کے جوتے پانی میں تر بھیگی بلی کی بجی کھچی سی دم کی مانند ہو گئے تھے۔ اور قیمتی پتلون کے پائینچوں پر یہ گھٹنوں تک کیچڑ لگا تھا۔ سڑک پہ بہتے پانی کے گندے تالاب میں جب موٹر پھنس گئی تھی، تو اُسے خود ہی دھکے لگانا پڑے تھے۔ کسی کو اُس کی پریشانی کی قطعی پرواہ نہ تھی۔ ہر شخص اپنی فکروں کے پختہ مزار خود ہی اپنے کندھوں پہ اٹھائے اٹھائے پھر رہا تھا۔

جوتے دور پھینک کر شوہر کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ پانی میں بھیگا بھیگا وہ کس قدر مضحکہ خیز نظر آ رہا تھا۔ گویا دُم کٹا لومڑ ہو۔ جو اپنی دُم کٹنے کا افسوس کرتا ہو۔ لمحہ بھر کے لئے عونیہ کو ہنسی آ گئی۔ عونیہ پلنگ کے نیچے فرش پہ بچھی دری پہ گاؤ تکیہ لگائے لیٹی تھی۔ پلنگ پرانی وضع کا تھا۔ لمبی لمبی ٹانگوں والا، چوڑا چوڑا، جس کے نیچے دنیا بھر کی چیزیں سما جائیں۔ اور جس کی چادر نیچے لٹک کر تمام اشیا کو اپنے اندر چھپا لے۔ یہ پلنگ دراصل عونیہ کی نانی امّاں کا تھا۔ نانی امّاں سے عونیہ کی امّاں کو ملا۔ اور اب عونیہ کی تحویل میں تھا۔ اس پلنگ نے خواہ مخواہ جگہ گھیر رکھی تھی۔ آج کل زمانہ تھا ایسے لمبے چوڑے پلنگوں کا۔ اور پلنگوں کے لئے بڑی بڑی اساطیری داستانوں جیسی خواب گاہوں کا۔ جائداد ٹیکس کے اضافے بھلا ایسی عشرت کی اجازت دیتے تھے؟ ان دنوں تو چھوٹے گھروں اور ہلکے پھلکے فرنیچر کا رواج تھا۔ لیکن عونیہ کو ہلکے فرنیچر سے ہلکے پن، چھچھور پن اور جانے کس کس "پن" کی بُو آتی تھی۔ فرنیچر ہو۔ تو وہی وکٹورین عہد کا بھاری بھرکم۔ اور گھر ہو تو وہی محرابوں والا۔ اونچے اونچے درختوں میں گھرا گھرایا۔ جہاں چمگادڑیں رہتی ہوں۔ مکڑیاں جالے تنتی ہوں۔ جس سے بے شمار کہانیاں وابستہ ہوں۔ اور جہاں بھوت پریت کے رہنے کا گمان ہو۔ ارے بھئی عونیہ بیگم! یہ بھلا پرانی روایات سے چپکے رہنا کہاں کی عقلمندی ہے۔

شوہر نے غصے سے پلنگ کو دیکھا۔ اس کا جی چاہتا تھا۔ کہ پلنگ پہ زور زور سے یوں کودے کہ یہ ٹوٹ ٹوٹ جائے کسی منتشر اور غیر مطمئن معاشرے کی مانند بکھر بکھر جائے۔ لیکن اس پلنگ سے ہی تو زندگی وابستہ تھی۔ زندگی کی شدت اور وجود کا احساس چند لمحوں کے لئے اِسی پلنگ پر تو ملتا تھا۔

بالوں میں کنگھی کر کے وہ کمرے سے باہر نکلا۔ اُسے چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ لیکن خانساماں غائب تھا۔ اور آیا برآمدے میں تینوں بچوں کو لئے بیٹھی کوئی کہانی سنا رہی تھی۔ کہانیاں زندگی سے بنتی ہیں۔ واقعات انسانوں کی ہر جنبش و حرکت سے جنم لیتے ہیں۔ لیکن شوہر کے لئے کہانیوں اور واقعات کا وقت نہ رہا تھا۔ وہ چائے تیار کر کے بغیر دودھ و چینی پینے لگا۔ کیونکہ گھر میں دودھ نہ تھا۔ کہ دودھ والا آیا ہی نہیں تھا۔ اور چینی دان خالی پڑا تھا۔ کہ چینی کے بھرے مرتبان عونیہ بیگم نے اپنی کپڑوں کی الماری میں ٹھونس رکھے تھے۔ اور الماری کو قفل لگا تھا۔ اور چابی نہ جانے کہاں تھی۔

ہا ہا! زندگی بھی کسی قدر تنگ ہو گئی تھی۔ اور شوہر کو یقین کامل تھا کہ ایک ایسا وقت بھی آئے گا۔ جب کہ کھانا بھی

اُسے خود تیار کرنا پڑے گا۔ اور بچّے بھی خود ہی پالنا پڑیں گے۔ جل جل کر اور کُڑھ کُڑھ کر وہ کالی چائے ہی پیتا گیا۔

بارش بدستور ہو رہی تھی۔ دریچوں کے شیشوں پہ قطرے بڑی فرمانبرداری سے بہہ رہے تھے۔ اندھیرا سا ہر طرف پھیلتا جا رہا تھا۔ فضا میں محض بارش کی آواز تھی۔ ورنہ ایک کیف آور سی خاموشی تھی۔ آیا کی کہانی اور بچوں کی شرارت بھری آوازیں بھی پس منظر میں چلی گئی تھیں۔ عونیہ بچّوں کی جانب سے مطمئن تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ آیا بچوں کو کھلا پلا کر سُلا دے گی۔ لمحہ بھر کے لئے اُس کا دل ضرور یہ چاہا کہ اٹھ کر ذرا بچوں کو اور شوہر کو دیکھے۔ لیکن پھر یہ ارادہ کتاب کے ختم ہونے پہ ملتوی کر دیا۔ جانے کون سی بدذوقی کی کتاب تھی، نہ تو جاسوسی کی تھی، نہ کوئی ترغیبی سنسنی خیز کتاب تھی۔ ارے کیا اسٹاک ایکسچینج یا بجٹ کی کوئی کتاب تھی۔

غالباً کسی ڈرامے ورامے کی کتاب تھی۔ جب کہ ڈراموں اور مکالمات کا وقت بھی گزر چکا تھا اور شوہر کالی چائے پینے کے بعد اب کمرے میں آکر پلنگ کو گھُور رہا تھا۔ عونیہ نے چادر کے ایک سوراخ سے جھانک کر شوہر کو دیکھا، اور پھر بے نیازی سے کتاب پہ نگاہیں جما دیں۔ شوہر کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ عونیہ کہاں چھپی بیٹھی ہے۔ گھر آتے ہی اُس نے عونیہ کو آوازیں دی تھیں، اور کوئی جواب نہ پاکر سوچا تھا کہ اس بارش میں ہی نکل گئی ہے، کسی سہیلی کے گھر!

شوہر کا دل شدت سے چاہتا تھا، اس بھیگی تنہائی میں کوئی اُس کے پاس بیٹھ کر تسکین کی باتیں کرے۔ عونیہ کی ہمدردی میں تو ایسی بے نیازی اور لاتعلقی تھی کہ اس کی تمام تر لطافت و الفت خود ساختہ محسوس ہوتی تھی، لیکن عونیہ ہنستی تھی، کہ اس عظیم جنگل میں جس کا نام دنیا ہے تو یہاں جو درندے رہتے ہیں اُن میں محض ریاکاری اور مبالغہ پایا جاتا ہے۔ ایاز احمد یعنی شوہر نامدار بھی تو ایک ایسا مبالغہ ہے کہ کسی المیہ کھیل کا کوئی کردار محسوس ہوتا ہے، جسے ہمدردی اور ملائمت کی کوئی ضرورت نہ ہو تو ریاکاری اور مبالغے سے بہتر ہے کہ انسان بے نیازی اور لاتعلقی اختیار کر لے۔

لیکن میں محض ایاز احمد ہی نہیں ہوں، بلکہ شوہر بھی ہوں، مارے غصّے کے شوہر نے ٹی۔ وی کھول دیا، کس قدر حیرت انگیز بات تھی کہ ٹی۔ وی پاکستان کے شہروں میں بھی آگیا تھا، اور کراچی میں بھی سال بھر سے کام کر رہا تھا، لیکن زیادہ حیرت انگیز بات تو یہ تھی کہ وہ عونیہ جو لندن میں کوئی بھی ٹی۔ وی کھیل دیکھنا نہ بھولتی تھی۔ کراچی ٹی۔ وی کے کھیل مطلق نہ دیکھتی تھی، اور شوہر کو ٹی۔ وی پر نگاہیں جمائے دیکھ کر بدمزہ ہو جاتی تھی، اور لوگ افسوس کرتے رہ جاتے تھے، کہ ایاز احمد کی بیوی کس قدر سپاٹ اور روکھی پھیکی ہے، زندگی کے مختلف رنگ کھیل کی صورت میں دیکھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتی تھی۔

اب اُس روز ہی عونیہ بیگم نے اتنے ڈھیروں لوگوں کی موجودگی میں کتنی بدذوقی کا ثبوت دیا تھا۔ ستمبر کا کوئی دن تھا بارش بھی ہو رہی تھی، لیکن بارش میں شدت نہ تھی، بس ہلکی ہلکی سی پھوار تھی، جانو سمندر کی پرسکون لہروں پر دھیرے دھیرے ہوا چل رہی ہو، گھنے درختوں کے نیچے سوئمنگ پول کے کنارے پھیلی زندگی بڑی مسرور اور مطمئن تھی، ہر طرف شگفتگی اور بشاشت ہی بشاشت تھی، بچے بڑے سب ہی تالاب میں تیر رہے تھے، عونیہ کا دل چاہتا تھا، وہ بھی تالاب میں کود جائے۔ لیکن وہ تیراکی کا لباس ہمراہ نہیں لائی تھی، اور پھر وہ اس حالت میں بھی نہ تھی کہ ہلکی پھلکی تتلیوں کی مانند پانی کی نیلی سطح پہ پرواز کرتی چلی جائے، اور چاکلیٹ آئسکریم کھاتے کھاتے وہ ایک کتاب بھی پڑھ رہی تھی، یہ کتاب جانے کس کی داستانِ حیات تھی، کبھی کبھی اُس کا بھی دل چاہتا تھا کہ اپنی کہانی سنائے، لیکن اس کی تو کوئی کہانی ہی نہیں تھی، کہانی تو دکھوں اور غموں کی ہوتی ہے، سسکتی، دم توڑتی زندگی کی ہوتی ہے جیسے لوگ شہرت حاصل کرنے کے بعد مزید شہرت حاصل کرنے اور لوگوں کی نگاہوں میں ایک اونچے انسان کا درجہ لینے کے لئے اپنی کہانی بنا کر مبالغے کے ساتھ پیش کرتے ہیں، لیکن عونیہ کے پاس ایسی کوئی بات نہ تھی۔ وہ جب وہ پیچھے پلٹ کر دیکھتی، تو ایک شاندار ورثے اور اطمینان و آسودگی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا، اُس کا دُکھ بھی۔ وہ بہت غور کرتی تو کوئی دُکھ سمجھ میں نہ آتا تھا، اُس کے لئے دُکھ کا لفظ بھی چاکلیٹ آئس کریم کی مانند تھا۔

سوئمنگ پول کے کنارے بیٹھی وہ آئس کریم کھاتی رہی، ایاز دونوں بچّے لئے تیر رہا تھا، یا بچوں کو تیرنا سکھا رہا تھا۔ یہ سوئمنگ پول دیوار کے اندر تھا اور دیوار کے دوسری جانب سبزہ پر کرسیاں بچھی تھیں، کسی تقریب کا اہتمام تھا اور کوئی صاحب تقریر فرما رہے

تھے، آواز ہوا کے ذریعے عونیہ کے کانوں تک آرہی تھی اور اُسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی مولوی نکاح پڑھا رہا ہے۔

اب اس کلب میں نکاح بھی ہونے لگے، تجسس سے عونیہ نے سوچا، اور پھر دیوار کے دوسری جانب جھانکا، وہاں کرسیوں کے درمیان ایک میز پر چاندی کے کپ دھرے تھے، وہاں نکاح نہیں ہو رہا تھا، بلکہ کوئی صاحب ہاکی یا کرکٹ کی اہمیت پر تقریر فرما رہے تھے۔

نہ جانے کہاں سے ہر روز ایک بڑے میاں کو پکڑ لاتے ہیں بے نیازی سے سر جھٹک کر وہ اپنے بچوں کی جانب دیکھنے لگی، بچے اور شوہر تالاب سے باہر نکلے، اور وہ بچوں کو آیا کے سپرد کرنے دیوار کے دوسری جانب آئے تو تقریر ختم ہو چکی تھی، اور انعامات تقسیم کئے جا رہے تھے، مقرر نے انعام بانٹتے بانٹتے لمحہ بھر کے لئے عونیہ کی جانب دیکھا، اور حیرت اور مسرت اس کے چہرے پر پھیل گئی، مقرر کے ساتھ ہی حاضرین اور فوٹوگرافروں کے چہرے بھی عونیہ کی طرف پلٹے، لیکن وہ بے نیازی سے قدم اٹھاتی رہی۔

اصغر حفیظ، شوہر لمحہ بھر کے لئے رکا، اور مقرر کی جانب بغور دیکھا۔

اصغر حفیظ۔ ارے وہ بڑے میاں اصغر حفیظ ہیں، عونیہ بھی رک گئی، اور زور سے ہنسی۔

شرم کرو عونیہ، وہ تو اب تک تم پہ اس قدر جان چھڑکتا ہے، کہ تمھارے ایک اشارے پر تمھارے گھر پہ آدھمکے، اور ایک زمانہ تھا، تم بھی اُسے پسند کرتی تھیں۔

اے لو۔ میں اس بڑے میاں کو کیوں پسند کرنے لگی۔

بڑے میاں، شوہر نے تعجب سے عونیہ کو دیکھا، "واللہ کیا شانِ بے نیازی ہے، ایک شخص کو پیچھے لگا کر بالکل انجان بن جانا یہ تو تمھاری عادت ہے، عونیہ بیگم تم چاہتی ہو کہ ہمیشہ لوگوں کے دلوں پر قدم دھرتی چلی جاؤ، وہ اجمل نعیم بھی تو تمھاری یاد لئے بیٹھا ہے، لیکن اتنا تو سوچو کہ دو بچوں کی ماں ہو، اور تیسرا وارد ہونے والا ہے۔"

"یہ بچے میں نے لوگوں کے دلوں پہ حکمرانی کرنے سے حاصل نہیں کئے ہیں، بلکہ تم سے اور محض تم سے حاصل کئے ہیں" وہ ہنسی، اور بچوں کو آیا کے سپرد کر کے دوبارہ شوہر کے ہمراہ سوئمنگ پول کی طرف آگئی، اُن کا ارادہ تھا، کھانا وہیں کھایا جائے لیکن ٹی۔وی جو سوئمنگ پول کے کنارے نیم کے درخت تلے رنگ برنگے قمقموں کے درمیان دھرا تھا، اپنے پروگرام پیش کر رہا تھا۔ عونیہ نے ٹی۔وی کی جانب دیکھا، اور چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔

"تم یہ کھیل دیکھو، میں گھر جا رہی ہوں،" وہ تیز تیز قدم اٹھاتی دوبارہ دیوار کے دوسری جانب آگئی۔

تمھاری بیوی کو کھیلوں سے اس قدر چڑ کیوں ہے؟ کسی نے ایاز سے دریافت کیا۔

"کھیل آخر کھیل ہے" ایاز احمد نے سر جھکا لیا۔ دیوار کے دوسری جانب اصغر حفیظ نے دوبارہ عونیہ کی جانب اشتیاق سے دیکھا، وہ اس کے قریب آنے لگا، لیکن عونیہ سر جھٹک کر اور "کھیل آخر کھیل ہے" کہہ کر آگے بڑھ گئی، اصغر حفیظ وہیں کھڑا رہ گیا اور ایاز احمد وہیں ٹی۔وی کے سامنے بیٹھا رہ گیا۔ اُس کے ذہن میں وہی ایک خلش بار بار سر اٹھا رہی تھی۔ جس نے کئی سالوں سے پریشان کر رکھا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے، کام کرتے کرتے، وہی ایک چبھن ہوتی تھی، دفتر میں فائلوں پر جھکے جھکے وہی ایک بات یاد آجاتی، اور وہ خلا میں دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا۔ زندگی اُس کے لئے مستقل الجھن بن کر رہ گئی تھی، اُس کی اپنی مشکل پسندی نے بھی اتنے الجھاؤ پیدا کر دیئے تھے، کہ عونیہ اور بچوں کی موجودگی کے باوجود زندگی بے رنگ ہو کر رہ گئی تھی، زندگی کی ابتدا بھی کچھ ایسی ہی ہوئی تھی، بچپن شہروں کے تشنج میں اور گلی کوچوں میں آوارہ لونڈوں کے ساتھ گزرا، والدین کی خواہشات جانے کیا تھیں۔ ایاز نے ہر خودسر بیٹے کی طرح والدین سے بغاوت کی، اور اپنا راستہ خود تلاش کرنے نکل پڑا، لیکن تنگ تنگ گلیوں کے کھنڈر نما مکانوں کے تیرہ و تار کمرے اور فلتھ اس کا مقدر بن گئے، مایوسیاں اور کچھ بننے کی تمنا اُسے مختلف شہروں میں گھماتی پھراتی لندن تک لے آئی، اور یہاں واسطہ ایسے لوگوں سے بھی پڑا، جو کھیلوں، ڈراموں کے عشق میں شدھ بدھ کھوئے بیٹھے تھے۔ ان لوگوں کے درمیان آکر ایاز پہ ایک انکشاف یہ ہوا، کہ کراچی اور لاہور میں تو لڑنے جھگڑنے اور چلا چلا کر بولنے کو اور

چہرے کے جبری آثار چڑھاؤ کو اداکاری کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہاں جسم کی ایک ایک جنبش اور آواز کے ایک ایک زیر اور بم پر کس قدر زور دیا جاتا ہے، لیکن یہ سب کچھ دیکھ کر ایاز احمد کو تھکاوٹ سی ہونے لگی، زیادہ بیزاری تو ان ہنسی گاتی لڑکیوں سے ہوتی، جن کے ہجوم میں جمالِ ہم نشیں کہیں نظر نہ آتا تھا، وہ صورت کہیں نہ ملتی تھی، جو ہم خیال اور ہم زبان ثابت ہوتی اور تنہائی اس کی زندگی میں برابر زہر گھولتی رہی۔

عموماً یوں ہوتا ہے کہ ہم کسی ایک چہرے کی تلاش میں گلی گلی، کوچے کوچے، قریے قریے، شہر شہر گھومتے پھرتے ہیں، اور ہوتا یوں ہے، کہ اچانک بالکل قریب ہی ایک ایسا چہرہ نظر آجاتا ہے جسے دیکھ کر ہم چلا اٹھتے ہیں، ارے یہ تو وہی ہے، جس کی ہم جستجو کر رہے تھے۔

شہر کے ایک تاریک ہال میں طلبا کا ایک گروہ کوئی کھیل پیش کر رہا تھا، اور ایاز کے آخری کونے میں کھڑا سگریٹ سے شغل کر رہا تھا اور بیزار سا ہو رہا تھا کہ دفعتاً اس کے لئے تمام منظر ہی بدل گیا، سائے کی طرح ایک لڑکی اندر داخل ہوئی اور دوسرے کونے میں کھڑی ہوگئی، کسی کو اس کے وجود کی آہٹ تک محسوس نہ ہوئی، وہ تو اچانک اک مہک بنکر ایاز کی روح میں سرایت کر گئی، سر اٹھایا تو سنگ کے بجائے اک گلِ تازہ سامنے پایا۔

ہال کے باہر برف گر رہی تھی جیسے ذہن میں اچھے اچھے خیالات آرہے ہوں، اور خوبصورت جملے کسی کاغذ پر اترتے جاتے ہوں، اور الفاظ سے ایک نئی اور پُرجلال دنیا کی تعمیر ہوتی ہو۔ ٹیمز دریا پر گویا وہ تمام ستارے اتر آئے تھے جو لندن کے آسمان پر کبھی نظر ہی نہ آتے تھے، گھروں میں گلاب کے پھولوں کی مہک تھی، اور کالجی عمارات شاندار طور پر بڑی وضع داری کے ساتھ پھیلی ہوئی تھیں۔ اور عونیہ وہاں کھڑی تمام تر پس منظر سے بالکل الگ تھلگ نظر آتی تھی، جانے کس اجنبی دنیا سے برفوں کے ساتھ ساتھ اڑتی اڑتی چلی آئی تھی، یوں محسوس ہوتا تھا، پھولوں، تتلیوں، خرگوشوں سے کھیلتے کھیلتے چاکلیٹ اور آئس کریم کھاتے کھاتے اور گھر کے آخری کمرے میں بیٹھ کر پریوں کی کہانیاں پڑھتے پڑھتے چلی آئی ہے، یا پھر کسی آثار قدیمہ سے کوئی دیوی سی نکل کر چلی آئی ہے، جو ایک زندگی نہیں بلکہ کئی زندگیوں کے روپ رکھتی ہے۔

عونیہ کے چہرے پر طمانیت اور سکون پھیلا تھا اور مختصر سا دہان ذرا سا کھلا تھا، ایاز کی تمام تر کلفتیں یک لخت دھل گئیں۔ سردی کی تمام ترکیفیت بادل کی طرح اس کے ذہن پر برسنے لگیں، اور ایک ہی لمحہ میں وہ ایاز کے دل میں اتر گئی۔ ایاز کو خواہش ہوئی کہ اس پرسکون چہرے کو اپنے قریب کرلے جو ایسی ندی کے مانند تھا۔ جس میں کبھی طوفان نہ آتا ہو، اک نامعلوم سحر کے زیر اثر ایاز اس کے بالکل قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ سامی نقوش کی وہ دراز قد لڑکی قد میں اس کے برابر تھی، ایاز کے دل میں خواہشات کی زبردست یلغار ہوئی اور لائیٹر اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ آواز پر عونیہ پلٹی، بدمزگی کا سایہ اس کے چہرے پر آیا اور چلا گیا۔ اور اس ایک لمحے میں عونیہ نے ایاز کا پورا ذہن پڑھ لیا اور ناگواری سے سامنے دیکھنے لگی، عونیہ کے انداز اور تیوروں میں اس قدر بے ساختگی اور معصومیت تھی کہ ایاز متعجب سا رہ گیا۔ اس کی دنیا میں مبالغہ اور تصنع کے سوا کچھ نہ تھا، یہ سمندر کی خوبصورت سی لہر کہاں سے بھٹکتی بھٹکتی چلی آئی تھی۔ ایاز نے اسے مخاطب کرنا چاہا۔ اور تب ہی اسے محسوس ہوا کہ وہ عونیہ کو بخوبی جانتا ہے۔ عونیہ سائے کی مانند ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ رہی ہے، چاندنی راتوں میں ان وادیوں میں اس کے ہمراہ گھومتی پھری ہے، جہاں خیالوں کے مہکتے پھول کھلتے ہیں، اور وہ ہمیشہ اسی کا انتظار کرتا رہا ہے جو دو انتہاؤں پہ کھڑی پلٹ پلٹ کر دیکھتی ہے، اور کبھی تو بالکل ایاز کی گرفت میں محسوس ہوتی ہے، اور کبھی دور کھڑی منہ چڑاتی ہے، اور کبھی کسی چمن کے خاموش سے تنہا گوشے میں بیٹھی ایاز کی کہانی سن رہی ہے، اور اپنی کہانی سنا رہی ہے، لیکن عونیہ کی تو سرے سے کوئی کہانی ہی نہ تھی، آسودہ گھر کی آسودہ لڑکی تھی، جسے کائنات کی ہر شے بڑی خوبصورت نظر آتی تھی، جو اپنے وجود سے بڑی مطمئن تھی، زندگی کے حسین سپنے دیکھنے کے لئے وہ کس قدر تنہائی کو پسند کرتی تھی اور اسی لئے گھر کے آخری کمرے میں بیٹھ کر ڈرامے پڑھتی تھی۔ اور تصویریں بناتی تھی کہ ایک روز ایک بہت ہی خوبصورت اور شاندار شخص اس کی تصویروں اور ڈراموں سے نکل کر سامنے

آ کھڑا ہوا، اس شخص کے چہرے میں دھوپ کی تمازت تھی اور بڑی بڑی کانوں تک کھنچی آنکھوں میں گومتی اور سرجو بہتی تھیں اور اُس کی گفتگو میں شامِ اودھ جیسی حلاوت اور حسن تھا۔ لیکن ان تمام ترخوبیوں کے باوجود اس سے عشق عونیہ کو انتہائی مضحکہ خیز معلوم دیا۔ عشق کرتا آدمی بالکل لکڑ بھگا معلوم دیتا ہے، عونیہ کو اس تصور سے ہی وحشت ہونے لگی کہ ایک تو وہ اس شخص اصغر حفیظ کے عشق کا جواب دے۔ اور پھر اس سے شادی رچا کر مختلف سفارت خانوں اور اونچی محفلوں میں شرکت کرے، ڈھیروں زیورات لاد کر بیگمات کی محفل میں بیٹھی اسکنڈل سازی کرے، لہٰذا وہ کراچی چھوڑ کر لاہور چلی گئی، لیکن وہاں اجمل نعیم سامنے آ کھڑا ہوا جو اصغر حفیظ سے قطعی مختلف تھا۔ اخلاقی سطح سے کافی نیچے ہو کر بات کرتا تھا، اور ہر لڑکی میں اپنی حسرتوں کی تکمیل چاہتا تھا، وہ کسی درمیانے ماحول کا شخص تھا۔ اُس کے ہاں دنیا بھر کی اُلجھنیں تھیں، عونیہ کو الجھنوں سے دلچسپی نہ تھی، یوں بھی اُسے لندن کی راہ اختیار کرنا تھی۔

یہاں وہ لندن یونیورسٹی میں ڈرامہ پڑھتی تھی، اور ٹیٹ گیلری اور برٹش میوزیم میں جا کر تصویریں بناتی تھی یہ محض ایک اتفاق تھا کہ یہاں ایاز احمد اُس کے سامنے آیا۔

"تم ہمیشہ میرے قریب رہو گی" ایاز نے اُس تاریک ہال میں کھڑے کھڑے پیار سے عونیہ کے بال سہلائے عونیہ کے بالوں سے مہک نکل رہی تھی، وہ مدہوش سا ہو گیا۔

اور جب وہ عالمِ کیف و سرور سے چونکا تو سامنے اسٹیج پر کھیل بدستور ہو رہا تھا، اور عونیہ اپنی خوشبو چھوڑ کر جا چکی تھی، ایاز کے اس سہانے خواب کی مدت محض بیس منٹ کی تھی، لیکن عونیہ سے ایک رشتہ قایم ہو گیا تھا جو کبھی ٹوٹ نہ سکتا تھا۔

ایاز کافی بدشکل انسان تھا۔ چہرے کے نقوش کچھ واہیات سے تھے۔ ایک نقش کی دوسرے نقش سے کچھ مطابقت نہ تھی، مجموعی طور پر یہ صورت ایسی تھی جس کا تجزیہ کیا جاتا تو کچھ بھی پلے نہ پڑتا، عونیہ کی فنکارانہ فطرت نے اس چہرے کو رنگوں میں گھول لینا چاہا، لیکن مصیبت یہ تھی کہ کوئی بھی رنگ اس چہرے کو قبول نہ کرتا تھا، عونیہ کی سمجھ میں نہ آتا تھا اس چہرے کے پیچھے درحقیقت ہے کیا، اُس نے تمام رنگوں کے تجربے کر ڈالے، لیکن ہر رنگ اُسے سیاہ رنگ کی ترغیب دیتا تھا اور ایاز کے تمام تر کردار کو گناہ کی سیاہ رات قرار دیتا تھا، ایاز کی تصویر کو سیاہ رنگ سے رنگ کر عونیہ نے الٹا لٹکا دیا۔

اور پھر جب کئی سالوں بعد ایاز وطن آیا تو بڑا آدمی بن چکا تھا اور لڑکیوں کے ہجوم میں رہتا تھا، لیکن یہ تمام لڑکیاں، تمام خوبصورت چہرے اُس کی فردوس گم گشتہ واپس نہیں دے سکتے تھے، جس کی ایک جھلک لندن کی اُس برف آلود فضا میں بیس منٹ کے اندر اندر دیکھی تھی، ہجوم میں بھی تنہائی اور سناٹا، بے کیفی اور بدمزگی اپنی اپنی جگہ بدستور تھے، جمال ہم نشیں کی تلاش جاری تھی۔

ایک شام وہ کراچی کے اسی کلب میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ یونانی ڈراموں کی دیوی آثار قدیمہ سے نکل کر سامنے آ گئی، وہ ایک ستون کے سہارے کھڑی بے نیازی سے جیا ہوا دوپٹہ لہرا رہی تھی۔

"عونیہ" وہ آنکھیں مسلنے لگا، لیکن عونیہ اب بھی اُسے پہچان نہ پائی۔ اس چہرے کو اب بھی اُس نے ایک فنکار کی نگاہ سے دیکھا، لیکن اب بھی یہ چہرہ کوئی رنگ قبول نہ کر سکا، ایک مرتبہ پھر عونیہ نے اس کی تصویر کو سیاہ کر ڈالا اور اس سیاہی کی وجہ معلوم کرنے ایاز کے قریب چلی آئی۔

"تمہارے قرب کے باوجود بھی میں بھٹکتا پھرتا ہوں، تنہائی اور سناٹا بدستور میرا مقدر ہے،" شوہر نے غصے سے پلنگ کی جانب دیکھا، عونیہ گو اُس کے تین بچوں کی ماں تھی، لیکن ان تمام سالوں میں بھی وہ ایاز کی تصویر کو کوئی اچھا رنگ نہ دے پائی تھی اور ایاز کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس مونا لیزا نے کون سا انتقام لینے کے لئے اس کی زندگی کو سیاہ رنگ کی ایک تصویر بنا ڈالا ہے۔

مارچ ۶۹ء

# بایاں ہاتھ

جناب والا: میں سچ کہوں گی۔ بالکل سچ۔ پورا سچ۔ اور کچھ نہیں مگر سچ۔ گو کہ یہ سب کچھ کہتے ہوئے بھی میں نہیں جانتی کہ سچ کیا ہے۔ یہ تو بس ایسی شبیہہ ہے جو کوئی ایک دیکھے تو سیاہ۔ بالکل سیاہ نظر آتی ہے۔ کوئی دوسرا دیکھے تو روشن چمکتی دھوپ ایسی روشن، تو کیا یہ کوئی آنکھ کا نقص ہے دونوں میں کون سا شوب چشم کا شکار ہے۔ بہر حال یہ تو بالکل غیر متعلق سی بات بیچ میں آن پڑی تھی۔

میں تو بات اس لمحے سے شروع کرنا چاہ رہی ہوں گی۔ جب میرے حواس پر سے میرا ایمان اُٹھ گیا۔ وہ دن بڑا تباہی کا دن تھا۔ صد حیف اس دن بڑے کرب میں نے ایک دم یہ جانا کہ دنیا سے رنگوں، خوشبوؤں اور آوازوں کا تنوع مر گیا۔ ہر چیز کا ذائقہ ایک سا ثقیل تہہ میں زبان پر جمنے لگا اور تمام لمس ایک سے ہو گئے بس ایک مٹیالا۔ زرد مٹیلا میں ڈوبا دن ہر چیز پر محیط ہو گیا۔ میں نے جو چیز منہ میں ڈالی ایک مٹیالا ذائقہ چھوڑ گئی۔ چیزوں کے رنگ ان مٹی بھری سلوٹوں میں ڈوب گئے اور اپنے پیاروں کے لمس دور دراز کے لاتعلق سلیقے بن گئے۔

کچھ دن تو میرے کنبے کے لوگ یہ سب کچھ دیکھتے اور برداشت کرتے رہے، پھر سب کو میرے چہرے کی لاتعلقی اور آنکھوں کے خالی پن سے کوفت ہونے لگی۔ میرے زوج نے تنگ آ کر کہا۔ مجھے لگتا ہے میں کسی پتھر کے ساتھ عمر قید کاٹ رہا ہوں۔ مجھے اس کی یہ بات بہت پسند آئی کیونکہ ایک عرصے مجھے اپنا آپ سڑک کے کنارے کھڑے، گرد میں اٹے حرف مٹے سنگِ میل کی طرح نظر آ رہا تھا۔ شاں شاں شاں قریب سے تیز رفتار گاڑیاں گرد اُڑاتی چلی جا رہی تھیں اور اب ہر طرف صرف شاں شاں کی مسلسل دبی ہوئی کبھی ابھرتی ہوئی گونج تھی۔ شاید یہ سب باتیں آپ کو نہایت غیر ضروری اور لاتعلق نظر آتی ہیں۔ مگر پھر آخر آنکھ کو کچھ تو دیکھنا۔ کان کو کچھ تو سننا ہے۔ اگر یہ نہیں تو اس کے علاوہ بھی اور جو کچھ بھی ہے یہی ہے۔ شاید اب میں آپ کو اُلجھا رہی ہوں۔ میں اس تمہید کو ختم کر کے اب اصل واقعہ کی طرف آتی ہوں۔

جناب والا جیسا کہ میں نے عرض کیا وہ دن بڑا خرابی کا دن تھا جب اپنے حواس پر سے میرا ایمان اُٹھ گیا۔ کچھ روز تو میں اپنے آپ کو ملامت کرتی رہی۔ میں نے اپنے آپ کو خوب خوب کوسا کہ اے بنتِ حوا لعنت ہے تجھ پر جو تو نے اپنے آپ کو یوں نفس کے حوالے کر دیا۔ ہاں یہ نفس کے حوالے کرنا نہیں تو اور کیا ہے کہ انسان ہوتے ہوئے کوئی اپنے حواس کی نعمتوں سے فیض یاب نہ ہو۔ جی بھاتے والے رنگ دیکھے نہ میٹھی سُریلی صدائیں اس کے کان میں پڑیں۔ انواع و اقسام کے ذائقوں کے لئے اس کی زبان مر جائے۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ پر سو بار لعنت کی اور میں بہت روئی بہت گڑگڑائی اپنے خالق کے حضور کہ بس اب ایک مہیب اندیشہ منہ کھولے میرے سامنے چلا آتا تھا۔ وہ اندیشہ ایک عجب اصل ساعت کا تھا۔ نہ ٹلنے والی ساعت۔

میں نے بہت چاہا کہ میں ایک بار پھر وہی وجود بن جاؤں جو در اصل میں تھی۔ وہ جو دیکھنے والوں کو بہت بھاتا تھا۔ جو لطیف خوشبوؤں اور رنگوں کی شبیہہ تھی۔ اور روح پرور موسیقی کی ہر تھی۔ لیکن ایسا نہ ہوا میں نے سب سے۔ ان سب سے جو میری ذات کے ساتھ کوئی تعلق رکھتے تھے کہا دیکھو سائیں سائیں کرتا ایک مہیب آسیب منہ کھولے میرے سامنے چلا آتا ہے، اگر اس آسیب نے مجھے نگل لیا تو تم کیا کرو گے؟ اور پھر مجھے اپنی اس بات

پر خود ہی ہنسی بھی آگئی۔ دراصل کہنا تو مجھے یہ تھا کہ اگر اس آسیب نے مجھے نگل لیا تو میں کیا کروں گی؟ آخر دوسروں کے لئے اُس آنے والی واردات کی کیا اہمیت ہو سکتی تھی۔ اور پھر کونسا تعلق ایسا ہے کہ ٹوٹ نہیں سکتا جب مجھے یہ احساس ہُوا تو میں اپنے خالق کے حضور بہت رو ئی گڑگڑا ئی کہ مجھے اس آنکھ کے عذاب سے پناہ میں رکھ کہ یہ وہ کچھ دیکھتی ہے جو اُسے نہیں دیکھنا چاہیئے اور مجھے خود میری اپنی ذات سے پناہ میں رکھ کہ یہ بڑی سفاک ہے جب اپنی جان پہ ظلم کرنے پر آتی ہے تو ٹلتی نہیں مگر جنابِ والا، اب میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ اس وقت بھی دراصل یہ رونا گڑگڑانا کچھ عجب تھا کہ اندر سے مت جیسے گہرے نیلی کنوئیں میں سے کوئی برابر کہتا چلا جاتا تھا کہ ایسا نہ ہو تو اچھا اسی طرح ٹھیک ہے۔ ایک تاریک تجسس۔ پیچھے غولے مجھے بگڑنے کو بل پل بڑھ رہا تھا۔

جنابِ والا آپ ان باتوں سے یہ اندازہ نہ لگایئے کہ میں ان دنوں نارمل زندگی بسر نہیں کر رہی تھی۔ جی نہیں ابھی مجھ میں اتنی روحانی منافقت تھی کہ میں تمام دُنیاوی معمولات کو پورا کر سکوں۔ اور دیکھنے والوں کو محض اتنا سا احساس ہوتا تھا کہ اس عورت کا چہرہ ایک دم سپاٹ اور خالی ہے۔ اور اس کی آواز کہیں دُور سے آتی محسوس ہوتی ہے۔

بس یہ انہی دنوں کا ذکر ہے جب میں اپنے شہر کے اس بڑے اسٹور کے قریب سے گذری۔ ان دنوں کیلے اکیلے سڑکوں پر پھرنا کچھ میرا معمول سا ہو گیا تھا۔ اس اسٹور کے باہر کھڑی ہو گئی اور اس کے بڑے بڑے شوکیسوں میں جھانکنے لگی۔ کچھ مجھے میں نے تمام چیزیں ایک لاتعلقی جو ایک عرصہ سے مجھ پر حاوی تھی۔ مگر پھر وہ عجیب واقعہ ہُوا۔

جنابِ والا مجھے یوں لگا۔ جیسے کسی نے بجلی کا تیز جھٹکا لگا یا ہو۔ اس سے بجلی کی تھرتھراہٹ سر سے لے کر میرے پاؤں کے ناخنوں تک پھیل گئی پھر یکدم ایک عجیب طرح کی میٹھی آسودگی میرے تمام جسم میں بھر گئی اور مجھے اپنے گرد رنگ ہی رنگ۔ خوشبوئیں ہی خوشبوئیں سُر ہی سُر پھیلے نظر آئے۔ اتنی خوبصورت دُنیا تو میں نے کبھی بھولے سے بھی بچپن میں دیکھی ہو گی۔ جب کبھی میں ماں کا ہاتھ تھامے کھلونوں بھرے بازار سے گذرتی تھی اب مجھے حیرت تھی کہ دُنیا ایک دم اتنی خوبصورت اتنی رنگین کیوں کر ہو گئی۔ شوکیس میں سجی خوبصورت بوتلوں اور اُن پر لگے رنگا رنگ لیبل میری آنکھوں سے چپک گئے۔ وہاں اِن شیشوں کے اندر رنگ و بو، حسن موسیقی کی ایک دُنیا آباد تھی۔ وہ دُنیا جو میرے لئے مر چکی تھی۔ یہ دُنیا خریدی تو جا سکتی تھی۔ مگر اس کے بجائے تو میں اس کے سراب ہو جانے کا خطرہ تھا۔ میں مسحور نظروں سے وہ سب کچھ دیکھتی رہی مجھے وہ سات رنگا شیشہ یاد آ گیا جو کبھی بچپن میں اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ مل کر روشنی کے سامنے رکھ کر دیکھتی تھی۔ کس قدر خوبصورت چمکتے، شفاف اور شگفتہ رنگ نکلتے تھے۔ اس میں سے۔ جی چاہتا تھا ان کو انگلیوں سے چھو کر دیکھو مٹھیوں میں قید کر لو۔ وہ رنگ اکیلے اس سات رنگ شیشے میں سے نہ نکلتے تھے۔ ان کے ساتھ ہی وہ ایک خوشبوؤں، سُروں اور محبت بھرے لمحوں کی لہریں تھیں کہ گرداگرد بہنے لگتی تھیں۔ اور چلتے چلتے ایک نیم بے ہوش اُداسی دل کو دے جاتی تھیں۔ تو آج وہ سب رنگ و بو، حُسن و موسیقی کی دُنیا اس شوکیس میں، اس سات رنگ میں بند تھی۔ میں نے شوکیس کے شیشے کے ساتھ ناک چپکا دی تھی۔ اتنی بہت سی خوبصورت چیزیں۔ گویا ایک جنّت گم گشتہ۔ تھی اور اس جنّتِ گم گشتہ کو پا لینے کا ایک جنون میٹھی میٹھی لہریں بن کر میرے دل و دماغ کو جکڑتا گیا میں ایک دھڑکتے ہجوم جال میں لپٹ گئی کہ جس سے نکلنا اس خوبصورت دُنیا کی موت تھی۔ دنیا جو برسوں بعد مجھے نظر آئی تھی۔ وہ ایک عجیب شوق انگیز لہر تھی کہ مجھے مست بناتی چلی گئی۔

"بیگم صاحبہ۔ اندر تشریف لے آیئے۔" اسٹور کے دروازے پہ سیلز مین نے مجھے مخاطب کیا تھا۔ میں چونکی۔ کوئی انجانا فیصلہ ابہام کی حدوں کو کاٹنے والی سوچ میرے ذہن میں داخل ہوئی۔ میں مسکراتی ہوئی اندر چلی گئی۔

جنابِ والا! میرا بیگ اس وقت بھی نقدی سے بوجھل تھا۔ مگر وہ آسیب منہ کھولے چلا آ رہا تھا۔ وہ اٹل ساعت آ پہنچی تھی۔ اور میں اس کے گھیرے میں تھی۔ میں نے بہت سی چیزیں نکلوا کے دیکھیں۔ پھر میں خود ہی اپنی اس فنکارانہ چابکدستی پہ حیران رہ گئی۔ میرے بائیں ہاتھ نے خوبصورت رنگ برنگی

چیزیں خاموشی سے یوں کہ دائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ بیگ میں انڈیل لیں۔ رنگوں، سُروں اور خوشبوؤں کی ایک دُنیا میرے بیگ میں تھی۔ وہ ساتوں رنگ میری مُٹھی میں اسیر تھے۔ بظاہر میں نے ایک معمولی سی بوتل پسند کر کے اس کی قیمت ادا کی اور اڑتے اڑتے قدموں کے ساتھ دکان سے نکل آئی۔ میں زمین پر نہیں گویا بادلوں پہ چل رہی تھی۔ ایک رنگین ترنگ میری آنکھوں میں اُتر آئی تھی۔ ایک خاص وحشی جذبہ میرے اندر رقصاں تھا۔

جنابِ والا میرا جی چاہتا تھا۔ سڑکوں پر قہقہے لگاتی پھروں۔ آج پھر دُنیا اتنے بہت سے رنگوں اور خوشبوؤں سمیت زندہ ہو گئی تھی۔ مگر کی دہلیز پر کر کے میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ وہ بیگ کھولا اور رنگ و نور کی اِس دُنیا کو میز پر انڈیل دیا۔ ان سب چیزوں کو مختلف زاویوں سے اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ اُن کے رنگوں کو آنکھوں میں بسایا۔ اور تب مُدتوں کے آنسو بہہ نکلے۔

میرے کنبے نے مجھے کبھی روتے کبھی ہنستے دیکھا اور میز پر لگے اس رنگ و نور کے انبار کو بھی۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" اس نے خوف اور نفرت بھری آواز میں کہا۔ تب میں چونکی اور میں نے سوچا اور خود سے پوچھا ہاں واقعی یہ تم نے کیا کیا؟ اور اس سوچ کے ساتھ ہی وہ رنگ و نور کی دنیا پھر مر گئی۔ وہ سب کچھ مردہ مکڑی میں سے نکلا۔ برادہ بن گیا۔ اور تمام دنیا پھر وہ میٹالا دن مچیلا ہو گیا۔ چنانچہ جنابِ والا میں نے وہ سب کچھ اٹھایا اور متعلقہ افسروں کو اس واردات کی اطلاع کی۔

مجھے اپنے بائیں ہاتھ کی جُدائی کا دُکھ نہیں۔ جب وہ ہاتھ مجھ سے الگ ہُوا تو گویا وہ آسیب بھی میرا وجود چھوڑ گیا۔ تب میں نے شکر ادا کیا کہ مجھے اس بائیں ہاتھ سے نجات ملی۔ اور اب صرف وہ نور بھرا پاکیزہ دایاں ہاتھ میرا ساتھی تھا اور میں خوش تھی اور کہتی تھی۔ اے بنتِ حوا تو خوش قسمت ہے کہ آج تیرے وجود کا سیاہ سایہ مٹ گیا۔ اب تیرا یہ مبارک روشن دایاں ہاتھ تیری اچھی اچھی خبریں سب کو دے گا۔

مگر جنابِ والا اب میں اصل واقعہ کی طرف آتی ہُوں۔ یہ کل رات ہی کا ذکر ہے۔ میں اس مٹیالے دن اور مٹیالی رت کی عادی ہو چکی تھی۔ رنگ و بو، حُسن و موسیقی کی اس دنیا کی یاد میرے ذہن سے مٹ چکی تھی۔ وہ میرا بایاں ہاتھ سب منحوس یادیں اپنے ساتھ لے جا چکا تھا۔ اور میں سُکھ کی نیند سوتی تھی۔ سُکھ کی گہری نیند مگر کل رات اسی اس گہری نیند سے میں ایک سرسراہٹ سے جاگ اُٹھی جیسے میرے بستر میں کوئی جان دار چل رہا ہو۔ میں نے بیڈ لیمپ روشن کیا۔ اور یہ دیکھ کر میری پیشانی عرقِ ندامت میں ڈوب گئی کہ وہ سرسراتی، کلبلاتی چیز، وہ میرا بایاں ہاتھ دوبارہ میرے بازو کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی اپنے آپ کو اس بائیں ہاتھ سے محفوظ رکھنے کی۔ مگر دیکھئے، اب میں آپ کے سامنے ہوں۔ یہ پھر اسی طرح میری کلائی سے جڑا ہے۔ میرے وجود کا حصہ ہے جیسے کبھی کاٹا ہی نہ گیا ہو۔ جنابِ والا کیا آپ بھی یقین نہ کریں گے کہ یہ کٹا تھا مگر پھر زندہ ہو کر آن جُڑا! صد حیف ہے میرے وجود پر کہ میں اپنے بائیں ہاتھ سے نجات نہ پا سکی۔

(جولائی ۱۹۷۱ء)

میں کھڑکی بند کر کے پھر کھول لیتا ہوں

اس منظر میں شہر کے دریچے، در، روزن، دالان، آنگن، بالکونیاں، چھجاں

سورج کی حرارت میں پگھل پگھل کر ایک دوسرے میں گھلتی ملتی اپنی شکل ختم کر کے

کسی بڑی، لیکن غیر متوقع صورت میں ڈھل رہی ہیں۔ میں اس منظر کی

دیوار پر نوشتۂ دیوار پڑھنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ تحریر کسی آئندہ زبان میں ہے

عکس تحریر: اسلم کمال

# غنچے چٹکے آدھی رات

محمد عمر میمن

اس کے چہرے سے گہرے فکر کے جذبات ہویدا تھے۔ سامنے تپائی پر اخبار پڑا تھا۔ اس نے بہ لحاظ اپنے امڈتے ہوئے جذبات کی طغیانی سے نجات پانے کو پھر ایک اخبار اٹھا کر یونہی خالی خالی نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔ وہ پڑھ کیا رہا تھا یہ تو خود اسے بھی معلوم نہ تھا۔ بس اس کے ذہن میں تو دو گھنٹہ قبل پڑھی ہوئی۔ اخبار کے پہلے صفحے پر جلی حروف میں درج خبر بری طرح چکر لگا رہی تھی۔

حکومت نے تمام ناجائز املاک کا حساب مانگ لیا تھا اور ڈکلریشن فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ میں اب صرف دو دن باقی رہ گئے تھے۔ ان گذشتہ نو سال میں "بلیک" کے کام اور دیگر چند طریقوں سے حاصل شدہ دولت کا حساب اس قدر آسانی سے نہ ہو سکتا تھا۔ مستقل ڈیڑھ ماہ سے وہ برابر کوشش کر رہا تھا کہ اخباروں یا ریڈیو سے وہ توجہ ہٹا لے اور اعلان نہ پڑھے نہ سنے۔ مگر کبھی ایسا نہ ہو سکا۔

"اف میں کس قدر مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔ اف میرے خدا۔ . . ." اس کے چہرے پر فکر اور پریشانی سے پیدا شدہ لکیریں اور بھی گہری ہو گئیں۔ تب اچانک اسے یہ محسوس ہوا کہ وہ اس جال میں جو خود اس نے دوسروں کو پھانسنے کے لیے گذشتہ نو سال میں بنا تھا بری طرح خود ہی پھنس گیا ہے۔ لیکن یہ تو سب میری مرضی کے عین منافی ہوتا رہا ہے۔ میں نے ان ناجائز دولت کے حصول کے لیے جو کچھ ذرائع استعمال کئے ان میں کب میرے ارادے کو دخل تھا . . . ذہن کے کسی گوشے سے آواز آئی اور ضمیر تڑپ اٹھا۔

"سیٹھ محمود علی۔ اب تم کتنے بھولے بنتے ہو۔ یہ تمام املاک، یہ محلوں کا نفیس بنگلہ، یہ کاریں، عیش و طرب کے سامان، چمکیلا فرنیچر ان سب کے حصول کے لیے جب تم ناجائز طریقوں کو اپنانے کے لیے بڑھتے تھے۔ تو کیا اس موقع پر میں نے تمہاری راہ نہ روکی تھی کیا تمہیں اس وقت میں نے تمہارے اس مکروہ اقدام سے باز رکھنے کی کوشش نہ کی تھی۔ اور صرف ایک دفعہ ہی کیا۔ ان طویل نو سال میں جب بھی تم نے دولت کے حصول کے لیے کوئی بھی ناجائز ذریعہ استعمال کیا میں نے ہر بار تمہیں اپنے ارادے سے باز رکھنے کی تنبیہ کی۔ لیکن سیٹھ! دولت کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ کھنکھناتے روپے سکوں کی جھنکار انسان کی عقل پر دبیز پردہ ڈال دیتی ہے اور تم نے بھی ہر بار ان کھنکھناتے سکوں کی جھنکار کے آگے میری سرزنش کو پس پشت ڈال دیا۔ ورنہ اب تم کتنے بھولے بن رہے ہو جو تمہارے فعل میں تمہارے ارادے کو دخل نہ تھا تو سیٹھ محمود علی یہ بنگلہ کیسے بن گیا۔ اور چمکتی ہوئی ہزاروں کی یہ پیکارڈ تم کہاں سے لے آئے۔؟"

"لیکن . . . . لیکن —— یہ سب میں نے اپنے لئے تو حاصل نہ کیا تھا —— اور جب یہ سب میرے لئے نہیں تو میں ہی کیوں اس کا تن تنہا خمیازہ بھگت رہا ہوں؟"

اس سے بحث نہیں یہ تم نے اپنے لئے حاصل کیا یا طویل حزنیہ جملوں کی ہر لمحہ بڑھتی ہوئی یورش سے اپنے کو محفوظ رکھنے کے لئے یا اپنی بیوی اور دیگر رشتہ داروں کے ہم اصرار کے بعد —— حاصل تو کیا۔ تو اب پھر ان طویل پچھتاووں سے کیا حاصل! تم اپنا ضمیر تو پہلے ہی بیچ چکے ہو سیٹھ"

تب اچانک ضمیر کی اس کشمکش سے ہٹ کر اس کی آنکھیں اخبار پر پھیلی ہوئی ایک دوسری سرخی پر پھنس گئیں. . .

"ایک خوفناک اسمگلر اپنی لانچوں سمیت بحری فوج کے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ . . ." اب تک سے کچھ شک سا گزرا۔ روزانہ وہ اخبار میں اسمگلروں کی گرفتاریوں کی خبریں پڑھتا رہا تھا۔ لیکن کریم والا ابھی تک آزاد تھا اور وہ کریم والا کی پھرتی اور چالاکی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس انقلابی دور میں جب کہ فوج نے ایک ایک اسمگلر کو پکڑ لیا تھا۔ کریم والا ابھی آزادی سے سب ہی لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتا پھر رہا تھا اور یہ ناممکن ہے کہ بلیک لسٹ پر کریم والا جیسے کالے مجرم کا نام نہ ہو۔ لیکن نہ جانے آج اس کا دل کیسے طرح دھڑکنے لگا۔ باوجود بڑی کوشش کے وہ خبر کی مکمل روداد پڑھنے سے اپنے آپ کو باز نہ رکھ سکا —— اس کا خدشہ صحیح تھا۔ کریم والا اپنے کیفر کردار کو پہنچ چکا تھا۔ یکایک ایک ٹیس سی اس کے سینے سے نکلی اور اسے شدت سے محسوس ہوا کہ اس کا دل بیٹھ گیا۔ وہ ٹوٹ چکا ہے وہ تقریباً بے حال ہو گیا ہے۔

"وہ —— ہائے" وہ کس اندرونی ہیجان سے کراہ اٹھا اور اس کی آہ ہونٹوں سے نکل کر کمرے کی فضا میں پھیل گئی۔ اس نے ختم ہوتے ہوئے سگار کے دو تین طویل کش جلد جلد لئے اور اسے ایش ٹرے میں رکھتے ہوئے بکس سے دوسرا سگار نکال لیا۔ لائٹر کے شعلے سے کانپتے ہوئے لبوں سے تھامے اسے اپنا مستقبل،

نظر آنے لگا۔ اس نے عجیب بد دلی انداز میں جلدی سے پھونک مار کر شیشے کو گول کر دیا جیسے وہ اپنا مستقبل نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ جیسے اسے علم تھا کہ اس کا مستقبل کا روپ کس قدر گھناؤنا اور تاریک ہوگا۔ ایک بھرپور کش لیتے ہوئے اس نے سارا دھواں کمرے میں بکھیر دیا۔ دھوئیں کے پرپیچ بادل کمرے میں بے ترتیبی سے پھیل گئے اور ان دھندلے دھندلے بادلوں کے بیچ میں سے اپنا مستقبل نظر آنے لگا جسے وہ اپنی مرضی کے خلاف بے بس و مجبور بنا دیکھ رہا تھا۔

وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے بڑے بڑے جرم کرنے والا بن کر کھڑا ہے اس کے ہاتھوں میں آہنی چوڑیاں ہیں اور پیروں میں وزنی بیڑیاں جنہوں نے اس درجہ بے بس کر دیا ہے کہ وہ ایک ہلکی سی آزاد جنبش سے بھی معذور ہے۔

"اف! کیا اس تمام دولت کے عوض اس کی قسمت میں یہ سلاسل ہی آتی ہیں۔ تب پھر یہ سب کس لیے تھا۔ اب سے نو سال پہلے کی زندگی کیا اتنی کمی گزری تھی، کہ وہ اس آزاد معصوم اور پاکیزہ زندگی کو خیرباد کہہ کر ایک نئے باب میں داخل ہوا تھا وہ باب ــــــ زندگی کا وہ حصہ جو نو سال تک اس کی قسمت میں اپنے نئے نئے انوکھے رنگ بھر کر اب اس مکروہ اور انتہائی گھناؤنے ایک اور رنگ کا اضافہ کر رہا تھا۔ اسے یہ رنگ نہیں چاہیئے۔ اس نے اس رنگ کی تمنا ہی کب کی تھی۔ اسے تو نو سال قبل کی وہ معصوم پاکیزہ اور آزاد زندگی ہی پسند تھی۔ لیکن اب تو اس کی یہ سوچ بھی کتنی بعد از وقت ہے۔ وقت اس کی راہوں میں مگر کی نرم نرم خوشنما بیلوں کو بچھاتے ہوئے اتنی دور پہنچ گیا ہے کہ اگر وہ باقی ساری زندگی بھی اپنی پوری قوت سے دوڑے تب بھی وہ اس کو نہیں پا سکتا اور مگر کی ان مخملیں بیلوں پر طویل نو سال تک چلتے چلتے اب جبکہ اپنی راہوں میں خاردار جھاڑیاں اگ آئی ہیں تو وہ چاہتا ہے کہ واپس اس راہ پر لوٹ کر پھر وہی پرانی روش اختیار کرے جہاں نہ پھول ہیں نہ کانٹے ــــ اطمینان تو ہے لیکن اب تو وہ اتنی دور نکل آیا ہے کہ واپس لوٹ جانا بھی اس کے بس کی بات نہیں۔ قسمت کی کبھی ان خارزار رہگزاروں پر اب اسے طوعاً و کرہاً یا سفر جاری ہی رکھنا ہو

دھوئیں کے بادل فضا میں تحلیل ہو گئے۔ کمرے میں نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اور مینٹل پیس پر خوشنما گھڑی کے نزدیک پڑا ہوا بدھ کا لکڑی کا مجسمہ اسی روایتی انداز میں سر جھکائے کسی گہری فکر میں ڈوبا ہوا تھا ــــ یکایک اسے محسوس ہوا ــــــ بدھ بھی اپنی سوچ اور استغراق کے عالم سے جب چونکے گا تو شاید اس طویل خاموشی اور سکوت کا بدلہ مل جائے گا وہ بھی راہ نجات پا لے گا۔ لیکن میں . . . . ؟ اس نے پھر ایک گہرا کش لے کر فضا کو دھوئیں سے بوجھل کر دیا ــــــــ اس کے چہرے پر بے چینی اور اضطراب اور بھی بڑھ گیا۔

رات کی سنسان خاموشی میں کسی کمرے میں لگے ہوئے ٹیبل کلاک نے گزرتے ہوئے وقت کی ماتم پرستی پر اپنی بھرپور قوت سے ضربیں لگانی شروع کیں۔ وہ چونک گیا۔ صوفے پر نیلے سلیپنگ سوٹ میں ملبوس اپنے جسم کو ہلکی سی جنبش دی اور کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر ایک سرسری سی نظر ڈالی ــــــ "اف! ــــــ دو بج گئے اور جانے کتنے بجتے جائیں گے۔"

سامنے دبیز مخملیں کمبلوں میں لپٹی ہوئی اس کی محو خواب بیوی نے کسمسا کر پہلو بدلا، اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

"ارے! آپ ابھی تک نہیں سوئے ــــــ پھر اس نے مینٹل پیس پر رکھی ہوئی گھڑی کی جانب دیکھ کر حیرت سے کہا۔ "تو دو بج گئے" کسی نازک سی حرکت سے اگر دھیمے سے، اس کی سوچ کے ساکت سمندر کی خاموش سطح پر جیسے ایک چھوٹا سا کنکر لڑھک آیا۔ وہ چونک پڑا۔

"ٹھیک کہا روبی ــــ سو کیوں نہیں۔" اس کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ رینگ گئی اور وہ اپنے احساس میں نیم کی نبولی جیسی کڑواہٹ اور تلخی لیے ہوئے بولا "تم سو جاؤ روبی ــــــ یہ شب بیداری تمہاری تو نہیں ہوئی ہے . . . سو جاؤ . . . . . میں نے جانے کتنی ہی ایسی طویل راتیں جاگ کر کاٹ دی ہیں۔"

"یہ پچھلے چند دنوں سے آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ آپ کی بہکی بہکی باتیں یہ اضطراب اور یہ کھویا کھویا پن آخر کس چیز کا ردعمل ہے؟ ــــــ"

"ایک حسرتناک مستقبل کا پیش خیمہ کہو روبی!" وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے عجیب اضطراری انداز میں بولا۔

"کیوں ــــ؟ کیسا مستقبل؟ کیسی حسرت؟ یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے آخر؟"

"کچھ بھی تو نہیں ہوا مجھے روبی . . . تم سو جاؤ۔ تم پریشان نہ ہو" وہ بڑے مدھم لہجے میں بولا اور روبی دوسری طرف کروٹ بدل کر سو گئی۔ اس کے جی میں آیا کہہ دے "روبی تم بہت بھولی ہو اب سے صرف نو سال پہلے تم نہ کہا کرتی تھیں۔ آخر ہمارے رشتہ دار سرحد پار کوٹھیاں لیے رئیس تھے۔ لیکن اب . . . ہمارے آنے کی ان کی قسمت جاگ گئی تھی۔ ان کوڑی کوڑی کے دن پھر گئے اور اب تو زندگی خود ان پر رشک کرتی ہے۔ آخر ہم میں کیا برائی ہے، ہم کیوں ایسے نہیں . . . اور تب پھر روبی "محمود جنرل اسٹورز" کی فٹ پاتھ سے ملی ہوئی دوکان شہر کی سب سے عظیم شاہراہ پر "محمود اینڈ سنز کیمسٹس اینڈ میڈیسن" کے بہت بڑے آفس میں تبدیل ہو گئی۔ لیکن روبی اس چھوٹی سی دوکان کی سو ڈیڑھ سو روپے کی آمدنی ہم اور ہمارے بچوں کو ایک سکون تو دے سکتی تھی۔ مگر اچھا تم پہننے کو اور سیدھا سادا کھانے کو لیکن . . . . تمہیں اس زندگی سے اور اس کے اطمینان سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اپنے تمہارے اور تمہارے رشتہ داروں کے طویل طنزیہ جملوں سے بچنے کے لیے ہر مخدوش ذریعہ کو حصول دولت کے لیے اپنا کر تمہارے زرد پڑتے ہوئے رخساروں کو کھنکھناتے سکوں کی سرخی سے ہم کنار کر دیا۔ لیکن اپنا سکون اور وہ مطمئن نیند میں نے اسی دن کھو دیا تھا۔ جب پہلی بار ۲۵ ہزار کا درآمدی لائسنس ۴۵ ہزار میں بیچ کر دس ہزار کے نوٹ میں نے تمہیں بھاری کر دی تھیں اور جب زندگی میں سب سے پہلی بار میرے رنگ ڈھنگ میں مسرت کی لہر دوڑی

تھی یکھو مکمل مسرت! تب اس شب دیر تک مجھے نیند نہ آسکی تھی۔ اور میں یہ سمجھ رہا تھا آج کی حاصل کردہ خوشی مجھے سونے نہ دے گی۔۔۔۔ تب میں زندگی میں پہلی بار اپنے دوستوں سمیت بار میں پہنچا تھا ـــــ اس دن کے بعد سے آج کی رات تک میں بہت ہی کم سو پایا ہوں۔"

اس نے چاہا وہ سب کچھ اپنی بیوی سے کہہ دے جو مستقل اس کے ذہن میں رہ رہ کر ہجوم کر رہا تھا۔ لیکن وہ صرف سوچ کر رہ گیا۔ کہہ کچھ بھی نہ سکا۔

اس نے نیا سگار اٹھا کر سلگایا اور فضا میں دھواں بکھیر دیا۔ نیلگوں پینٹ سے رنگی ہوئی بیڈ روم کی دیواروں کو اپنے پس منظر میں لئے ہوئے دھواں ایک عجیب رنگ کو جنم دے رہا تھا۔ تب وہ اٹھا اور اپنے صدیوں سے دکھتے ہوئے بدن کو کڑا کر کے ایک بھرپور انگڑائی لی اور پھر دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ دروازے میں آراستہ نشین نیلگوں حریری پردے اس کے پیچھے ہوا کے مدھر دوش پر دھیمے دھیمے لہرانے لگے۔

ہلکی ہلکی خنکی فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ مرے کی گرم فضا سے نکل کر اب اس ہلکی ہلکی خنکی نے اس کے جسم میں ایک جھرجھری سی پھیلا دی۔ چاندنی کی دودھیا نرم نرم روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اور نچلی منزل کے سامنے خوشنما باغ کی سیمیں روشوں سے ذرا ہٹ کر ہری ہری کیاریوں میں سرخ سرخ گلابوں کی ادھ کھلی کلیوں پر چاندنی اپنی کرنوں کا حسین سا رقص پیش کر رہی تھی۔ ہر چیز میں حسن تھا اور بلاوا ـــــ لیکن وہ فطرت کی ان تمام رنگینیوں سے بے خبر اپنے گنجان خیالات کے لامتناہی سلسلہ میں گم تھا۔۔۔۔۔۔ یہاں تک کہ جب اس خنکی سے سردی کی ایک دھیمی سی لہر اس کی رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ تو جانے وہ کس خیال سے پلٹ کر کمرے میں پہنچا۔

"کہیں جاگ نہ جائے!" اس نے دھیمے سے سرگوشی کی۔ ان طویل نو سالوں کی اس عیش و طرب کی زندگی نے اس کے دماغ میں بلا کی نازکی پھیلا دی ہے اس کی جلد بہت نرم اور حساس ہو گئی ہے۔ کہیں اس خنکی کا اثر نہ قبول کر لے۔" تب کمرے میں پہنچ کر اس نے اپنا گاؤن اپنے شانوں پر پھیلا دیا اور بیڈ روم کے کھلے دروازے کو بند کرتا ہوا ہال کونی میں نکل آیا۔ کٹہرے کے سہارے کھڑے ہو کر اس نے اپنے جسم کا سارا بوجھ کی ہوئی اپنی کہنیوں پر منتقل کر دیا۔

رات کی رانی کی خوشبو میں بسا ہوا ایک معطر سا جھونکا اس کے نتھنوں سے آ ٹکرایا۔ اس نے ایک بھرپور سانس لیکر ساری خوشبو اپنے میں جذب کر لی۔ دور تک رنگ لی روشوں پر چاندنی اپنے کو نچھاور کئے دے رہی تھی اور بیچ کے ہچوں بیچ سنگ مرمر سے تراشیدہ کیوپڈ کے نازک سے مجسمے ست لگے ہوئے فوارے کے نیچے سلور کٹرے کمرے کے موزیک جیسے (CHIPS) چاندنی میں اپنی پوری تابانی سے جگمگا رہے تھے فوارے کے گھیرے میں پڑا ہوا پانی خاموش اور ساکت تھا۔ اچانک پانی کی پرسکون سطح پر الجھی سی ہوئی اور سوئی ہوئی خاموشی ختم سی ننھی ہزار ہا شوخ رنگوں والی مچھلیاں اپنی سیمیں دموں کو ہلاتی ہوئی تیرنے لگیں۔ باغ کے دائیں کونے میں مہندی کی باڑ سے دھلا ہوا بچوں کا جھولا بھی خاموش تھا۔ کائنات سو رہی تھی۔ لیکن وہ تنہا فطرت کی رنگینیوں کے بیچ اپنے دل کے بڑھتے ہوئے اضطراب کو لئے بالکونی میں کٹہرے سے ٹکا کھڑا تھا۔ اس نے سگار کا ایک، وہ طویل کش لیا اور چاہا سینے سے نکلتے ہوئے دھوئیں کے ساتھ ہی اس کا سارا بوجھ اور خلش نکل جائے جو ان نو سالوں سے مسلسل اس کے دل کو بھینچتی رہی ہے۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔

دھوئیں کا بادل اس کے خیالوں کو بڑے ہی پرفن انداز میں بالکل غیر محسوس طریقے پر ماضی کی ان گم گشتہ راہوں پر لے گیا۔ جو اب بالکل اجڑی پڑی ہیں۔

"ہائے! وہ زندگی کیا بری تھی۔ ہم اپنے پرانے دیس میں کونسی ایسی جاگیر چھوڑ کر آتے تھے جو یہاں آکر ہم نے دولتمند بننے کے خواب دیکھے۔ وہ زندگی جیسی کچھ بھی تھی، پرسکون، اطمینان بخش تو تھی۔ جب سارا دن اپنی چھوٹی سی دوکان میں گاہکوں کو رخصت کرتے کرتے تھک کر جب رات گئے میں گھر لوٹتا تھا۔ تو مجھے کتنی مسرت ہوتی تھی۔ نہ مستقبل کا کوئی غم نہ کوئی فکر ـــــ کاش میں ان ترغیبوں میں نہ آتا۔"

یکایک یوکلپٹس کی کسی شاخ سے کوئی چمگادڑ اس کے خیالات کے پرسکون سمندر اور فضا کی ہم آہنگی میں اپنے پیچھے ایک بے ہنگم سی پھڑپھڑاہٹ کے شور کو جنم دیتی ہوئی سڑک کی دوسری جانب بجلی کے کھمبے کے کسی تار پر جا ٹکی ـــــ

اس کے خیالات بہک گئے اور اب تو وہ بڑے واضح انداز میں ان تمام ترغیبات کو سن رہا تھا جو وقتاً فوقتاً کبھی اپنی بیوی اور کبھی اپنے دیگر رشتہ داروں سے اس مکروہ زندگی میں داخل ہونے کے لئے اسے ملی تھیں۔

"آپ اپنی اس معمولی زندگی سے مطمئن ہیں۔ کیا آپ کو اچھا کھانے اچھا پہننے کی تمنا نہیں؟ آپ ذرا ہاتھ پاؤں تو ماریئے۔ اب بھلا چچا اسلم کا لڑکا ایسا وہاں کون ہزار دو ہزار کما رہا تھا۔ لیکن سب آپ کی طرح ہاتھ پہ ہاتھ دھرے تھوڑی بیٹھے رہتے ہیں۔ یہاں آتے ہی اس نے اپنی قسمت چمکالی۔ ٹھاٹ سے رہتا ہے۔ لاکھوں کا بنگلہ ہے ہزاروں کی کار ہے، ایک اسی پر کیا موقوف۔ ریحانہ خالہ کے داماد ہی کو لیجئے۔ شہر کی سب سے بڑی شاہراہ پر سب سے جگمگاتی ہوئی دوکان اسی کی ہے ریحانہ کے شوہر ہی کو لیجئے۔ ملک کا ایک متمول ترین تاجر ہے۔ جب کہ وہاں اس کے گھر کی حالت آپ سے کچھ چھپی نہیں تھی۔ پھر آخر ہم سب یہ کیوں حاصل نہیں کر سکتے۔ اور وہ اکثر اپنی بیوی کی ان ترغیبات پر جھنجھلا اٹھتا ـــــ "آخر یہ عورت چاہتی کیا ہے؟ کیا میں دوکان پر سارا دن بیکار بیٹھا رہتا ہوں۔ کیا میں ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا سارا دن تو محنت کرتا ہوں۔ تب پھر ہاتھ پاؤں ہلانے کے کیا معنی ہوتے ہیں" وہ پھر بڑی بیزاری سے پوچھتا۔ "کیا تمہارے خیال میں میں ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا؟ تو پھر!

تمہارا منشا کیا ہے؟ میں نہیں سمجھ سکتا!"

اور روبی اپنے خاوند کی اس سادہ لوحی پر کڑھ کر سب کچھ سمجھتے ہوتے بھی بڑے مبہم انداز میں ہمیشہ جملہ اس طرح ختم کر دیتی:

"ہاتھ پاؤں تو آپ بھی ہلاتے ہیں۔ لیکن ذرا ــــ اب میں خود کیا کہوں آپ خالہ رفیعہ کے داماد سے مل لیں تو شاید وہ خود آپ کو اس کا مطلب بتا دیں گے"

اور وہ جھنجلا کر کہتا "کیا ذرا ــــ؟"

عرصہ تک اپنی سادہ لوحی کے سبب وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ اس ہاتھ پاؤں ہلانے کا دوسرا مطلب کیا ہو سکتا ہے۔

"میاں محمود! تم بیکار اپنی زندگی ضائع کر رہے ہو۔ کچھ کرو اولاد کی بھلائی کے ہی کام آئے گا۔ انسان کو اپنی موجودہ زندگی سے کبھی مطمئن نہ ہونا چاہیئے۔ ہر لحہ خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رکھنی چاہیئے۔ بھئی ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ جانے کیسے انسان ہو تم بھی! ارے کچھ ہاتھ پیر بھی تو ہلاؤ ــــ میں تمہاری مدد کو تیار ہوں" خالہ رفیعہ کا داماد ایک روز بولا تھا۔ اور پھر وہی ہاتھ پاؤں ہلاؤ ــــ وہ بھنا گیا ــــ اسے ایک ضد سی ہو گئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ خاموش ہی رہا۔

اور جب ایک روز اپنی بیوی کی تنبیہہ اور رشتہ داروں کے طنزیہ فقروں سے تنگ آ کر اس نے گھنٹوں سر جوڑ کر غور کیا تو اس ہاتھ پاؤں ہلانے کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھ گیا۔ لیکن اچانک اسے محسوس ہوا۔ لعنت ہو۔ ناجائز ذرائع سے حاصل شدہ دولت پر لعنت ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن وہ اپنے خیالات میں ثابت قدم نہ رہ سکا ــــ اور پھر ایک روز وہ رفیعہ خالہ کے داماد منور علی کے پاس پہنچا۔

"منور بھائی۔ بھئی میں تو اپنی زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔ آپ صحیح کہتے تھے۔ لیکن اب آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ آپ کے سوا کون ہے۔ آپ مجھے بتائیں کونسا دھندہ سودمند ثابت ہوگا۔"

اور منور علی مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

"ایکسپورٹر امپورٹر بن جاؤ ــــ ایک ہی لائسنس میں قسمت بدل جائے گی۔"

"وہ کیسے منور بھائی؟ یہ ایکسپورٹر اور امپورٹر کیا ہوتا ہے؟"

اور تب منور علی نے اسے ان تمام باتوں سے باخبر کر دیا۔ اس کی سیدھ بندھائی۔ تمام تجارتی ہتھکنڈے ازبر کرا دیئے۔ مزید کہا:

"محمود شروع شروع میں ذرا دقت کا سامنا ہوگا۔ لیکن۔ گھبرانا نہیں۔ ذرا ثابت قدمی دکھاؤ ــــ ایک دفعہ قسمت جاگ سو جاگی!"

"اچھا ــــ" وہ بڑی حیرت سے بولا۔ اور چند ہی دنوں میں نٹ پاتھ سے لگی ہوئی دکان "محمود جنرل سٹور" کا بورڈ شہر کی سب سے عظیم شاہراہ پر منور علی کی دکان کے برابر ہی ایک بڑے سے آفس میں تبدیل ہو گیا "محمود اینڈ سنز ایکسپورٹرس اینڈ امپورٹرس" یہ سب منور علی کے اثر و رسوخ سے ہوا تھا۔ پہلے ہی ہفتے اس نے شہر کے سب سے مہنگے ہوٹل میں محمود کی طرف سے ایک پارٹی دے ڈالی جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے بین الاقوامی تجارت کا "بڑا صاحب" مدعو تھا۔ اس پارٹی میں شہر کے سب ہی بڑے بڑے تاجر موجود تھے۔ منور علی نے ان تمام مشہور تاجروں سے محمود کا تعارف کرایا۔ پھر بڑا صاحب منور علی اور محمود تینوں ایک خالی میز پر آ بیٹھے جہاں باتوں باتوں میں منور علی نے بڑے صاحب سے محمود کے لئے کسی لائسنس کی منظوری کا اظہار کر دیا۔ بڑے صاحب اپنے لبوں پر ایک جھلکی مسکراہٹ لئے ہوئے بولے:

بھئی محمود صاحب! کسی روز دفتر تشریف لائیے۔ بھلا ہمارے ہوتے ہوئے آپ کو کوئی تکلیف پہنچے یہ ناممکن ہے۔ بھئی دوستوں ہی کے کام نہ آ سکے تو بیکار ہے۔

تو اس رات منور علی دیر تک اسے اپنی سوچی سمجھی اسکیم کی بابت بتاتا رہا۔

"بھئی محمود! میں نے ایک پارٹی بھی ڈھونڈ لی ہے جو لائسنس دس ہزار کی رقم نقد دے کر خرید لے گی۔ اور اس دس ہزار میں سے دو ہزار تم بہتر سمجھ سکتے ہو بڑے صاحب کے ہوں گے اور دو ہزار میرے اور باقی کے تنہا مالک تم ہو گے۔"

تب اچانک شدت سے اسے محسوس ہوا۔ تو گویا ہاتھ پاؤں ہلانے کا مقصد یہ تھا خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ پڑی۔ بیویوں کی عرق ریزی اور نگاہوں کی جھک جھک سے تو نجات ملی اور اگلے روز ہی وہ جانے کتنے ہی مستقبل کے خوش آئند سپنوں کا رنگ لے کے بڑے صاحب کے دفتر جا پہنچا ــــ اور پھر مستقل بھاگ دوڑ کی تگ و دو کے بعد اس کے ہاتھ میں منظور شدہ ۲۵ ہزار کا درآمدی لائسنس تھا جسے اس نے منور علی کے ایما پر شیخ ہاشم کے ہاتھوں حاصل ہونے کے چند ہی لمحوں بعد ۴۵ ہزار میں بیچ دیا اور یوں اس کالے دھندے سے سب کا حساب بیباق کرنے کے بعد اس کی جیبیں چھ ہزار کے نوٹوں سے بوجھل ہو گئیں۔

خوشی سے بے قابو ہو کر جب وہ گھر پہنچا تو رات گئے تک اسے نیند نہ آ سکی۔ ذرا سی محنت سے جب چھ ہزار مل گئے تھے۔ تب کاروبار بڑھنے پر تو وارے نیارے ہی ہو جائیں گے۔ اور شاید یہی خوشی تھی جو اس کی نیند کے درمیان آہنی دیوار بن کر حائل ہو گئی تھی۔ لیکن خوشی کا غلبہ اسقدر شدید تھا کہ وہ بالکل غیر محسوس طور پہلے پہر نیند اور وہ بھی گزشتہ پرسکون نیند کی اہمیت ہی کو بھلا بیٹھا۔

اچانک اس کے نیچے منہ بند دوں پر پھدکتی ہوئی بابیل پھڑ پھڑا کر اڑ گئی اور فضا میں ایک وسیع بیضوی دائرے کی شکل میں بڑی تیزی سے چکر لگانے لگی اس

پھر پھڑپھڑاہٹ سے اس کے خیالات کا سلسلہ بکھر گیا۔ لیکن چند لمحات بعد فضا میں پھر ایسے جیسے ہم آہنگی اور یکسانیت گھل گئی اور پھر وہ تھا ـــــ اور ماضی....

تب چاندنی میں وہاں بالکونی کے کٹہرے سے ٹیک لگا کر کھڑے کھڑے سے خیال آیا۔ وہ اس شب جب رات اچھی طرح بھیگ چکی تھی، وہ زندگی میں سب سے پہلی بار اپنے دوستوں کی صحبت میں بار پہنچا تھا تھوڑی تلخیں سیال کے چند پیگ حلق میں انڈیلنے کے باوجود بھی اس پر کچھ اثر نہ ہو۔ اس کے دوست اس کے چاروں طرف دائرے کی صورت میں پھیلے ہوئے ہنس رہے تھے، اپنے ہر ہر فعل سے اپنی اندرونی مسرت کا اظہار کر رہے تھے۔ لیکن وہ ان سب سے بہت دور ـــــ مستقل یہی سوچے جا رہا تھا۔ کیا یہ سب درست ہے؟ اندر ہی اندر اسے محسوس ہوا ایک بے نام سی خلش اس کا دل اپنی پوری شدت سے مسوس رہی ہے۔ تب وہ بے دلی سے اٹھ کر وہاں سے گھر چلا آیا۔ ساری خوشی یکلخت ختم ہو گئی ـــــ اور وہ سمجھ نہ سکا آج اتنی رات گزر جانے پر اسے نیند کیوں نہیں آ رہی ہے ایک بے نام سا خوف دھیمے دھیمے اس کے سینہ میں سر ابھارنے لگا۔ لیکن اس نے اپنے بڑھتے ہوئے اضطراب اور خوف کو یہ کہہ کر تسکین دے لی۔ آج زندگی ایک نئے دور میں داخل ہوئی ہے شاید پرانی زندگی پر اس نئی زندگی کے غلبے کی شدت اور جذباتی خوشیاں اسے نہیں سونے دے رہی ہیں ـــــ لیکن یہ اندر ہی اندر کوئی اس کا دل بھینچ رہا ہے۔ پچھلی راتوں سے یہ رات کتنی مختلف ہے! یہ کیسا احساس ہے جو اس کی روح کے گرد تیزی سے چھاتا جا رہا ہے؟

اور جب وہ اپنے مضمحل وجود کو بیکراں رات کے تین بجے اپنے بستر پر دراز ہوا۔ تو اسے محسوس ہوا! وہ بہت تھک چکا ہے۔ بہت بوجھل ہو گیا ہے۔ چھ ہزار کے ان نوٹوں نے اپنی پوری قوت سے اسے اپنے نیچے بھینچ لیا ہے۔ اور پھر وہ حقیقت جس کو وہ ہر لمحہ چھپانے کی کوشش کرتا آیا تھا۔ بڑے واضح انداز میں اس کے سامنے منہ پھیلائے آکھڑی ہوئی۔

"محمود ـــــ یہ دھندہ چھوڑ دو!" اس نے اس نشتر چبھونے والے احساس سے فرار پانے کو کسمسا کر کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن ضمیر کی آواز صدائے بازگشت بنکر اس کے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہی ہے۔ "محمود! یہ تم سب کیا کر رہے ہو؟ یہ زندگی عیب ہے۔ دولت کے اس انبار تلے تمہاری حقیقی خوشیاں مدفون ہیں۔ صرف آج ہی کی رات نہیں۔ تم آنے والی کئی صدیوں تک سکون سے نہ سو سکو گے! بہتر ہے اس طمع کو مار دو۔"

لیکن نہ جانے کیسے وہ ضمیر کی آواز کو خوش آئند مستقبل کے ہزاروں دلفریب پرشکوہ محلات کے عقب میں تھپک تھپک کر سلانے میں کامیاب ہو گیا۔

اور نئی زندگی کی دوسری صبح جو طلوع ہوئی تو اس میں اس کے کٹے ہوئے غم کے دبیز دھند کے تیر رہے تھے۔۔ اور ہر آنے والی پل کے ساتھ اس کی سابق پرسکون زندگی بڑھتی ہوئی دولت کی پریشانی اور فکر میں دھنستی گئی ـــــ راتوں کو اب برائے نام نیند آتی تھی..... اور بڑھتے ہوئے دنوں کے ساتھ کاروبار بھی اپنے شباب کی انتہائی منزلوں کو چھونے لگا ـــــ جانے کتنے لاکھوں کے بین الاقوامی تجارت کے لائسنس ان بڑے صاحب کے دفتر سے نکل کر اس کی گود میں سکوں کی بارش کرتے ہوئے اپنی منزلوں کی طرف بڑھنے لگے۔

اس نے دھیمے سے ایک آہ بھری ـــــ گزری ہوئی کل کے کتنے ہوئے۔ وہ سرخ سرخ گلاب چاندنی میں سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ اور سنگ مرمر کے دو فوارے کا بوجھ اٹھاتے ہوئے۔ محبت اور حسن کے دیوتا کیوپڈ کے سب اور اس کے محبت کے تیر کی انی چاندنی کی دودھیا روشنی میں چمک رہی تھی۔ اس نے ہر لمحہ ذہن میں ہجوم کرتے ہوئے ان خیالات کی رو سے بغاوت کرنا چاہی۔ وہ کامیاب بھی ہو گیا۔ لیکن یہ کامیابی وقتی تھی۔

"سیٹھ ریاض کی بیوی کسی دن شام کو یہاں آئی تھیں۔ انھیں ہمارے گھر کا معمولی فرنیچر پسند نہیں آیا اور واقعی ہمارا فرنیچر ہے بھی کتنا معمولی۔ سیٹھ ریاض کا فرنیچر تو آپ نے دیکھا ہے!" ایک روز روبی، ٹھنکتے ہوئے بولی تھی۔ لیکن اسکے ایک ایک لفظ سے اس کی آرزو کا اظہار واضح ہو رہا تھا۔ اور ان الفاظ کے پیچھے لپٹا ہوا روبی کا اشتیاق اور آرزو اس سے مستور نہ رہ سکی۔ وہ بڑی محبت سے بولا۔

"کل ہی چلنا! جس قسم کا فرنیچر چاہو آرڈر دے دینا ـــــ"

اور آنے والے ایک ہی ہفتہ میں اس کا بنگلہ چمکتے ہوئے ستر ۲۵ ہزار کے فرنیچر سے بھر گیا۔

کھیت کرتی ہوئی چاندنی کے درمیان پام اور یوکلپٹس کے پودوں کے سایہ میں اس نے اپنے ماضی کی ایک اور بھیانک شکل دیکھی ـــــ ایک منظر!

اب سے بہت پہلے ـــــ جب ایک روز وہ اپنی کمپنی کے دفتر میں بیٹھا ہوا نہ جانے کس سوچ میں غرق تھا کہ خالہ رفیعہ کا داماد منور علی جو کپڑے کا بہت بڑا بیوپاری ہونے کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا، اپنے ساتھ ایک پستہ قد سیاہ فام اجنبی کو لئے، اس کے آراستہ کیبن میں داخل ہوا۔

"وہ منور بھائی ـــــ آئیے ـــــ" وہ بڑے تپاک سے بولا لیکن اس کی نظریں اس پستہ قد اجنبی کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ نہ جانے کیوں اسے اس صورت سے بڑی وحشت محسوس ہوئی ـــــ وہ اس اجنبی کے بارے میں قیاس ہی کر رہا تھا، کہ منور علی بولا۔

"بھئی محمود ان سے ملو ـــــ یہ ہیں مسٹر کریلا وانا ـــــ میں نے ان کا ذکر تم سے اس دن کیا تھا!"

اور اس کا دل اس کے پہلو میں بڑی شدت سے دھڑکا ـــــ "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر مسٹر کریلا وانا" وہ بڑے تپاک سے بولا لیکن اس تپاک کے پیچھے

اس کے تفنع اور اضطراب کو کریلا والا بھی محسوس کئے بنا نہ رہ سکا۔ چنانچہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور سفاک چہرے پر بلا کی مسرت پیدا کرتے ہوئے بولا۔

"کیوں سیٹھ صاحب! کیا بات؟ آر یو ناٹ فیلنگ ویل ——"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں مسٹر کریلا والا ——" اسے اپنی بے وقت کی اس کمزوری پر شدید غصہ آیا۔ . . . لیکن اگلے ہی لمحہ اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ آج سے چند روز پہلے جب منور علی نے کریلا والا کا تعارف غائبانہ طور پر اس سے کرایا تھا اس وقت بھی اس کا دل شدت سے دھڑکا تھا۔

"بھئی محمود! یہ کریلا والا بڑا پھرتیلا شخص ہے، بلا کا ذہین اور مکار! اسمگلروں کا شہنشاہ کہہ تم ہے۔ اس قدر چالاک اور اثر و رسوخ کا آدمی ہے کہ پولیس کو بھی شاید ناک چنے چبوا دیتے ہیں، وہ معصوم ہو تو لگے جیسے تھک ہار کر پولیس نے اس کی جستجو ہی چھوڑ دی ہے کیونکہ عدل گو در سے لیکر بمبئی کو مبو اور چٹاگانگ تک اس کا جال بچھا ہوا ہے، اس سے معاملہ پکا ہو جائے تو بس وارے نیارے ہو جائیں گے"۔

اور وہ اپنے امنڈتے ہوئے جذبات اور ہر لمحہ سرزنش کرتے ہوئے ضمیر کی آواز کو پس پشت ڈالتے ہوئے بولا تھا۔

"ٹھیک ہے منور بھائی! آپ سے کہتے ہیں تیار ہوں، اور میری تیاری کا کیا سوال آپ نے ہی میری ماہ نائی کی ہے۔ آپ جو ٹھیک سمجھیں وہی کیجئے۔" اسے اپنی کمزوری کا علم تھا چنانچہ وہ مزید بولا تھا "آپ پہلے ہی سے سودے کی بات پکی کر کے آیئے گا، میرے سامنے نہ کیجئے گا!"

تب اس رات بھی اس کا ضمیر تڑپا تھا، لیکن اب اس نے اس کمبخت ضمیر کو سلانے کا ایک کارگر سبب تلاش کر لیا تھا۔ جب بھی اس کے ضمیر نے سرزنش کی اس نے یہ کہتے ہوئے "جب ساری دنیا ہی چار سو بیس کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ تو ہمیں سچائی و صداقت کی زندگی بسر کرنے سے کیا حاصل" دو چار پیگ تیز شراب کے پی کر اسے سلا ڈالا۔

اور اب کریلا والا اس کے سامنے تھا، چوڑی چوڑی مونچھوں والا کریلا والا، جس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے بلا کی عیاری اور ذہانت ٹپکتی تھی . . . اور وہ اپنے اندرونی ہیجان پر خارجی پھیکی سی مسکراہٹ پھیلاتے ہوئے صرف کریلا والا سے صرف اسی قدر کہہ سکا۔

"کوئی گڑبڑ تو —— نہ ہوگی؟"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں سیٹھ!" کریلا والا بڑی مکاری سے بولا۔

"تو گویا معاملہ پکا ہو گیا"

"بالکل ——!" تب اس نے منور علی سے رقم کے بارے میں پوچھا، اور دو ڈھکوں کر سو سو کے نوٹوں کی کتنی ہی گڈیاں نکال کر کریلا والا کے آگے پھیلا دیں، جنہیں اس نے بڑی ہوشیاری سے سمیٹ کر بیگ میں بھر لیا اور بڑی عجلت سے اٹھتے ہوئے بولا "سیٹھ مال دو روز میں پہنچ جائے گا"۔

اور اس روز کے بعد سے سالوں تک سو سو کے نوٹوں کی کتنی ہی گڈیاں اس کی دراز سے نکل کر کریلا والا کے بیگ میں منتقل ہوتی رہیں۔ اور ان کے عوض اسمگلنگ کا مال اس کے توسط سے مارکیٹ میں پھیلتا رہا۔

دھن کے اس بھیانک روپ کو دیکھ کر اسے ایک جھرجھری آگئی —— "اب تو کریلا والا بھی اپنی تمام مجرمانہ ذہانت کے باوجود اپنے کیفر کردار کو پہنچ چکا ہے" وہ بڑبڑایا۔

اب تو اسے جینے کا ڈھنگ آگیا تھا، لیکن جانے یہ کیسی بے نام سی خلش تھی جو اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، خوابوں میں ہر وقت اس کے دل میں کچوکے لگاتی رہتی جوں جوں اس کا بینک بیلنس بڑھتا گیا ایک بوجھ سا اس کے دل پر چڑھتا گیا۔ اور آج اسے پوری شدت سے محسوس ہوا۔ تو سال پہلے کی وہ زندگی کتنی مطمئن تھی جب نہ کوئی فکر تھی نہ کوئی بوجھ —— نہ کوئی خلش ——!

"کیا آج کی رات بھی نیند نہ آئے گی!" جیسے وہ اپنے آپ سے بولا۔

"سیٹھ محمود! تم نے جس روز سیٹھ کا یہ دم چھلا اپنے نام کے ساتھ لگایا تھا، اس روز سے آج کی رات تک تم کب سکون سے سو سکے ہو!" اسے محسوس ہوا اس کا ضمیر بڑے طنزیہ انداز میں اس کی ہنسی اڑا رہا ہے . . . . . وہ تلملا اٹھا۔

رات کی تاریکی دھیمے دھیمے چند ساعتوں بعد طلوع ہونے والے دن کی مدھم لیکن بتدریج بڑھتی ہوئی روشنی کے آگے سرنگوں ہو رہی تھی۔ ایک ایک کر کے ستاروں کی شمعیں تقریباً بجھ رہی تھیں۔ اور چاندنی دودھیا روشنی دن کے اجالے کی ہلکی ہلکی سپیدی میں گھل مل گئی تھی۔ وہ بہت بوجھل تھا۔ مضمحل سا دھیمے دھیمے چلتا ہوا کمرے میں آیا۔ اس کی بیوی بڑے اطمینان سے سو رہی تھی۔ یکایک بیوی کے اس اطمینان سے اسے اپنے اندر حسد کا جذبہ زور پکڑتا ہوا محسوس ہوا۔

یہ اطمینان مجھے کیوں میسر نہیں! ہائے! آہ!! مقدر کی ستم ظریفی ہے جس نے مجھے دولت کی زندگی کی طرف بڑھنے کی ترغیب دی۔ وہ خود میری نیند چرا کر کتنے اطمینان سے سو رہی ہے۔" اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا اور گاؤن اتار کر اپنے تھکے ہوئے نڈھال مضمحل دکھے ہوئے وجود کو بستر پر گرا دیا۔ پھر دھیمے سے بستر سے لگی الماری

سے دسکی نکالی۔ دو تین پیگ پیئے اور آنکھیں بند کر لیں۔

اگلی صبح جو طلوع ہوئی تو وہ دیر تک سوتا رہا دس بجے کے قریب جب مشرقی کھڑکیوں کے سرکے ہوئے ریشمین پردوں کے پیچھے شیشوں سے چھن چھن کر سورج کی کرنیں اس کے چہرے پر ناچنے لگیں تو ان کی ہلکی ہلکی حدت سے اس کی آنکھ کھل گئی ——— اس نے اٹھ کر گھنٹی بجائی۔ دس منٹ کے اندر ہی اندر ملازم ناشتہ کی گاڑی دھکیلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے گاؤ تکیئے سے اپنی پشت ٹیک کر کے بیٹھے بیٹھے چائے پی اور تھوڑی دیر تک خمار آلود نظروں سے ادھر ادھر بالکل خالی الذہن دیکھتے رہنے کے بعد سامنے کھڑے ہوئے نوکر نے انتہائی مختصر سی بات کی:

"اخبار ——"

اور جب اس نے اخبار کا پہلا ہی صفحہ دیکھا تو اس کی نظروں کے سامنے دبیز دھندلکے پھیل گئے۔ اندر بوجھل سی ایک دبیز سی چادر اس کے سر پر جیسے دھم سے آن پڑی۔ ناجائز مال کا ڈکلریشن فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ میں ایک دن اور چند ساعتیں ہی رہ گئی تھیں۔

بجلی کی سی تیزی سے وہ اٹھا، ٹیلیفون کے پاس پہنچ کر اس نے اپنی کمپنی کے منیجر کو گزشتہ ریکارڈ اور معتبر اسٹاف لیکر جلد سے جلد بنگلے پر پہنچنے کی تاکید کی پھر وہ پرائیویٹ روم میں گیا۔ دروازہ بند کر کے اپنی سیف کا خفیہ خانہ کھولا اور اسمگلنگ اور دیگر ناجائز ذرائع سے حاصل شدہ تمام دولت کے ریکارڈ نکالے اور ڈرائنگ روم میں آ کر انہیں تپائی پر پھیلا دیا۔

باتھ روم میں جا کر اس نے اپنے مضمحل اور جلتے ہوئے جسم کو "شاور" کی ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار کے نیچے کر دیا۔ ٹھنڈے پانی کے پڑتے ہی اس کے جسم میں پے در پے کئی جھرجھریاں آ گئیں، اور اسے محسوس ہوا، اس جسم کی گرمی کے لئے تو برف کی ٹھنڈک بھی ناکافی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اب سے نو سال پہلے تو اتنے دن چڑھے تک تو وہ اپنی دکان میں ہوا کرتا تھا "کیا زندگی ہے یہ بھی! —— کتنی بے قاعدہ کتنی بے ربط، نہ کوئی خوشی نہ کوئی مسرت، رہ رہ کر ایک پھانس سی دل میں کھٹکنے لگی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" وہ بڑبڑانے لگا

*

"منیجر!" وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوتے زور سے بولا اور منیجر عجیب اضطراری انداز میں یکلخت اٹینشن ہو گیا۔

"یس سر!"

"کپڑے کی چور بازاری سے حاصل کردہ رقم کا پورا پورا اندراج ڈکلریشن فارم میں ضروری ہے" وہ ڈکلریشن فارم منیجر کی جانب اچھالتے ہوئے بولا۔ اور منیجر اس کی اس حرکت پر حیرت زدہ رہ گیا، کپڑے کی چور بازاری اسقدر منظم اور خفیہ طریقے پر ہوئی تھی کہ قیامت تک حکومت کو اس کی خبر نہ ہو سکتی تھی، لیکن ۔ ۔ ۔ ۔

"لیکن سیٹھ صاحب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اس کا سر چکرایا۔ وہ کچھ بھی تو نہ بول سکا۔

"منیجر! —— ناجائز ذریعوں سے حاصل کی ہوئی ہر رقم کا پورا پورا اندراج ضروری ہے، میں تمہارا مطلب سمجھ گیا لیکن یہ میرا حکم ہے! ناجائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی ایک پائی بھی حساب سے نہ بچنے پائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" وہ سانس لینے کو رکا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

منیجر! ایسی دولت لے کر میں کیا کروں گا ۔ ۔ ۔ مجھے سکون چاہئے۔ مجھے نیند اور اطمینان چاہئے" وہ تقریباً چیخا ——

"لو —— یہ لو —— یہ وہ باقی حسابات اور لین دین کے کاغذات ہیں جن کی تم لوگوں کو بھی نہ لگی ہوگی"

اس کا منیجر دفتری عملے سے یوں گھور رہا تھا، جیسے اسے اس کے دماغی توازن کے بارے میں شک ہو لیکا یک اس کی آواز گونجی۔

"منیجر! جب میں یہاں آیا تھا —— لکھو، تو تین کپڑے سے تھا، یہ سب کچھ جو تم سب دیکھ رہے ہو چور بازاری اور کالے دھندے کا دیا ہوا۔ لکھو کہ اب میری بیوی کے پاس ساڑھے سات سو تولے سونے کا زیور ہے، پچھتر ہزار کا فرنیچر اور ہزاروں کی کاریں۔ ڈھائی لاکھ کا یہ بنگلہ۔ اور یہ بھی درج کرنا نہ بھولنا کہ میرا بینک بیلنس ستر لاکھ سے کم نہیں —— جس پر مختلف طریقوں سے انکم ٹیکس کی ایک پائی بھی نہیں دی گئی ہے"

اور اس کا منیجر اسے یوں گھور رہا تھا جیسے کوئی ننھا سا بچہ کسی بڑے آدمی کو بڑی مدلل گفتگو کرتے دیکھ کر کچھ بھی نہ سمجھ سکے۔ اور وہ خود یوں محسوس کر رہا تھا۔ اپنی ناجائز آمدنی کا ذکر جوں جوں وہ کرتا جا رہا تھا۔ ایک بوجھ کی ناقابل برداشت وزنی چادر دھیمے دھیمے اس کے سر سے اترتی جا رہی ہے جسے وہ ان طویل نو سالوں میں ضمیر کی کشمکش سے بیچا چھڑا کر بالکل غیر محسوس طریقے پر اپنے اوپر رکھے ہوئے تھا۔

*

سال کی آخری رات تھی ——!

اور جب اس سے چند ساعتوں بعد زمین کے بے نام کناروں کو چومتی ہوئی فلک کے قرمزی دریچوں سے جھانکتی ہوئی نئے سال کی پہلی سحر طلوع ہوگی تو اس کے جلو میں ــــ اس نے سوچا ــــ زندگی کے کتنے ہی نئے اور دل آویز رنگ ہوں گے!

شب کے ساڑھے گیارہ بجے تھے اور آنے والے آدھے گھنٹے بعد ڈکلریشن فارم بھرنے کی معینہ مدت ختم ہو جانے کی۔ پورا شہر سکوت اور خاموشی کے اتھاہ ساگر میں ڈوبا ہوا تھا۔ فضا میں ہلکی ہلکی خنکی پھیلی ہوئی تھی۔ اور روشنیوں کے اس شہر کی تمام روشنیاں جھلملا کر ایک ایک کر کے خاموش ہو گئی تھیں۔ یہاں تک کہ انکم ٹیکس آفس کے چوراہے پر کھڑا ہوا آؤٹ سائڈ ٹریفک کنٹرولر بھی سر جھکائے کسی سوچ میں غرق کھڑا تھا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی رنگ برنگی روشنیاں بھی بیٹھے بیٹھے سو گئی تھیں۔

ہر شے سو رہی تھی ــــ زندگی کے آثار مفقود تھے ــــ ایسے دے کر زندگی کی جو کچھ بھی حرارت، چہل اور ہما ہمی تھی، سب کی سب کھنچ کر آج سال کی آخری رات، انکم ٹیکس کے آفس چلی آئی تھی ــــ دور تک گہرے سناٹے اور چاند کی مدھم دودھیا روشنی میں سڑک کے کنارے دور ــــ بہت دور ــــ کاروں کی ایک لمبی قطار کھڑی تھی۔

جانے سال کے ساتھ سبھی لوگ اپنی گزشتہ زندگی کی تمام آلودگیوں کو دور پھینکنا چاہتے تھے۔

"کیو" میں کھڑے اس پر نیند کا ایک شدید غلبہ آیا اور اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو گئیں، جیسے دھیمے دھیمے بند ہونے لگیں اسے حیرت ہوئی اتنی شدت سے نیند کی خواہش اس نے آج سے پہلے کبھی اور کہیں نہیں محسوس کی۔ اس کا دل اسے بہت ہلکا محسوس ہوا وہ بڑی بے صبری سے اپنے نمبر کا منتظر تھا ــــ اور جب اس کا نمبر آیا تو وہ ــــ عجیب اضطراری انداز میں بجلی کی سرعت سے آگے بڑھا، اپنی تمام جائز و ناجائز املاک کا مجمل حساب ڈکلریشن فارم کی صورت میں آفیسر کی میز پر پھینک کر تیزی سے کاروں کی اس لمبی قطار کی طرف بھاگا، جلدی سے گاڑی نکالی اور تیزی سے گھر کی جانب ڈرائیو کرنے لگا ــــ

"آج کی رات میں سکون اور اطمینان کی نیند تو سو سکوں گا" رات کی سنسان تاریکی میں دھیمی سی مسرت سے اس کے لب ہلے۔ اور اسے محسوس ہوا ــــ شدت سے محسوس ہوا، بوجھ کی وہ ناقابل برداشت چادر اچانک اس کے ذہن اور قلب سے اتر چکی ہے۔ وہ اپنے کو بہت ہلکا محسوس کرنے لگا ــــ بہت ہلکا ــــ روئی کے نرم نرم گالوں کی طرح ــــ ڈلہوزی پہاڑوں کی چوٹیوں پر دھیمے دھیمے گرتے ہوئے برف کے بے وزن گالوں کی طرح ــــ بہت ہلکا ــــ اتنا کہ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا اسے اڑائے جا سکتا ہے۔

"آج کی رات دوسری راتوں سے کتنی مختلف ہوگی ــــ"

سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے برقی کھمبوں کی روشنی کے سائے تلے وہ کار ڈرائیو کرتا رہا ــــ اور اسے شدت سے محسوس ہوا ــــ وہ سال تک گناہ کی زندگی کے پیچھے لپٹے لپٹے ــــ سے جیسے ایک بار پھر گھناؤنی تاریکی میں بھٹکتے بھٹکتے ــــ چونکہ منزل کے نشان نظر آنے لگے ہیں ــــ چمکیلے، صاف اور واضح ــــ منزل کے نشان ــــ!!!

(اگست ۵۹ء)

چالیس سالہ مخزن

• افسانۂ بیخبر میں شعر کی یہ قراءت:

زر افشاں مانگ ہے اور سبزہ ای پیراک [illegible]

[illegible]

قومی زبان میں شعر کی یہ شکل پیش کی ہے:

[illegible]

[illegible]

عکس تحریر: سیّد قدرت نقوی

# چھپکلی کی کٹی دُم

انور سجاد

سامنے کی دیوار کا سایہ اس قدر تاریک اس لئے ہے کہ بھڑکتے آسمان میں ابلتے سورج سے دہکتی دھوپ بہتی ہے۔

اس بہتی، دہکتی دھوپ میں ایک بہت بڑا خلا ہے۔

سناٹا

تاریک، دلدوز، کبھی نہ ختم ہونے والا سناٹا جو شدید اذیت میں گرفتار، لاتعداد جانوروں، جانداروں کی چیخ پر محیط ہے۔

تاریک، دلدوز، کبھی نہ ختم ہونے والا چارپائی گھسیٹنے کی آواز یا دروازہ کھلنے بند ہونے کی چرچراہٹ پُرتشدد کہ اس سناٹے، سکوت، سکون میں اس پُرتشدد آواز کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔

وہ بان کی چارپائی پر کم سے کم جگہ گھیرے ــــ سمٹی سمٹائی بالکل ساکت لیٹی ہے اعصاب تنے ہوئے جیسے گھر میں کسی نامعلوم کونے میں پڑے ٹائم بم کے پھٹ جانے کا اندیشہ۔

جیسے اس خوفزدہ سناٹے میں پھٹتے آتش فشاں پہاڑ کے اڑ کر گرتے پتھروں کے نیچے دب جانے یا اس کے دہانے سے بہتے لاوے میں لاوا ہو جانے کی منتظر۔

بعض اوقات خاموش، دہکتی دھوپ میں پگھلتی فضا کو دیوار کے سائے ایسے تاریک کمرے کے کسی کونے کھدرے میں چھپا شدید گرمی کے باعث نیم بے ہوش جھینگر کی آخری تیکھی آواز، احساس کو سرد اور منجمد کر دیتی ہے، ہر وجود پر تنہائی منڈھ دیتی ہے اور کسی متروکہ شے کی طرح اس پُرتشدد کائنات کے حوالے کر دیتی ہے کہ جس میں ہر لمحہ کسی اذیت ناک حادثے کے رونما ہونے کا خوف ہمیشہ طاری رہتا ہے۔

کمرے کے تاریک سناٹے میں اس کو باہر سے کہیں دروازہ چرچرانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

وہ چارپائی پر اسی طرح لیٹی رہتی ہے ساکت، سمٹی سمٹائی، منتظر۔

اُٹھ کر تنگ و تاریک غلام گردش میں جھانک لینے کا عمل یا سست چہرے پر پانی کا چھینٹا دینے کے لئے نلکے کو کھولنے کی حرکت اس خلا میں قدم رکھ دینے کے مترادف ہے۔ ایک بہت ہی جرأت مندقدم۔

فضا میں معلق سناٹے میں نلکے سے پانی کا چلنا یا تنگ و تاریک غلام گردش میں جھانکنے والی نظر ایک خواہش کا مظہر ہو گی۔

ان کے سامنے التجا کا اظہار۔

جیسے کسی کریہہ شے کو چھو لیا جائے۔

جیسے چھپکلی کی تازہ کٹی دم کو تنکے سے کچوکا دے کر اُسے جھپٹتا تھراتا دیکھ کے کراہٹ محسوس ہو۔
بان کی چارپائی پر کم سے کم جگہ گھیرے — سمٹی سمٹائی، ساکت اسے یوں ہی محسوس ہوتا ہے۔ جیسے اس تاریک سائے والی دیوار کی اور وہ اسی انتظار میں بیٹھے ہیں۔
یوں جھپٹنے، تھرانے کے لئے۔

وہ اپنی چارپائی پر ہلتی تک نہیں۔ اسے یوں لگتا ہے جیسے اس کی اس صورت حال سے اس کا گرد و پیش اگر اس سے بے تعلق نہیں تو اسے قدرتی ردِ عمل جان کر مطمئن ہے۔
یہ امر یقینی ہے کہ جب کوئی اس چرچراتے دروازے کو کھولے۔
اور سیڑھیوں کو بالکل سپاٹ، غیر جذباتی بے رنگ سکون میں دیکھے۔
ایسی سیڑھیاں جن پر چڑھنے اترنے کا کوئی نشان نہیں، یاد کا کوئی نقش تک نہیں۔
اور جب کوئی تنگ دتاریک غلام گردش طے کر کے اس کمرے میں پہنچے۔
کھڑکی پر پڑے چھیدوں والے ٹاٹ کے پردے کے کسی بھی چھید سے باہر جھانک کر سامنے کے گھروں کی قطار دیکھے۔
دکانوں پر کاروبار ہوتے اور بچوں کو گلی میں آنکھ مچولی، گیڑی کاڑا یا ہٹھو کھیلتے دیکھے۔
آوارہ کتوں اور بلیوں کو ایک دوسرے سے بیگانہ بے پرواہ۔
اور بوڑھی عورتوں کو گلی کی، اُدھل جانے کی خواہشمند کنواریوں کے بارے میں آپس میں سرگوشیوں کی سکینڈل بازی میں مبتلا دیکھے۔
تو یہ امر یقینی جانو کہ جہاں تک ہو سکے گا وہ اسی طرح منتظر رہے گی۔
چارپائی پر سمٹی سمٹائی، کم سے کم جگہ گھیرے ساکت۔
اس کی سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ وہ کچھ نہ کرے

زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس احتیاط سے اٹھے کہ کوئی جاگ نہ جائے، تاریک مردہ غلام گردش اور سرد مہر سیڑھیوں کو آنکھوں میں لائے بغیر گھر سے باہر نکلے۔
گلی میں گھروں کی دیواروں کے ساتھ چلتی رہے گھوم پھر کے تازہ ہوا کو اپنے پھیپھڑوں میں سمیٹ لے۔
محض اپنے پٹھوں اور جوڑوں کو زندگی کا احساس دلانے کی خاطر، یہ جانتے بوجھے بغیر کہ وہ کہاں جا رہی ہے، کیوں جا رہی ہے۔ کہ یہی خواہش کا عدم وجود۔
اور پھر اس تاریک سائے والی دیوار کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتی کہ جس کی اور وہ تنکے کے ذرا سے چھو جانے پر چھپکلی کی کٹی دُم کی طرح تھرانے، جھپٹنے کو تیار بیٹھے ہیں، اپنے گھر لوٹ آئے۔
ان سیڑھیوں اور غلام گردش کے تاریک سرد مہر سناٹے کو نظروں میں لائے بغیر کہ جنہیں طے کرنے والوں کا وہاں کوئی نشان نہیں، یاد کا کوئی نقش نہیں
اپنے کمرے میں آئے۔
ایک بار پھر بان کی چارپائی پر لیٹ جائے۔

کم سے کم جگہ گھیرے، سمٹا سمٹائی، ساکت۔
ایک بار پھر منتظر، سناٹے میں۔
تاریک، دل دوز، کبھی نہ ختم ہونے والا سناٹا۔
اس بہتی دہکتی دھوپ میں ایک بہت بڑا خلا۔

جنوری ۱۹۷۹ء

جس طرح صحرا میں پیاسے کو سراب
آسیب ہلاک کر دیتا ہے اسی طرح ادیب اگر
شہرت کے سراب کی طرف دیوانہ وار بھاگتا
ہے تو وہ سانس لینے کے باوجود بھی تخلیقی
طور پر ہلاک ہو جاتا ہے۔

ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں
تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ایک صدی میں
حیاتِ جاوداں حاصل کرنے والے ادیبوں کو
زیادہ سے زیادہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں
پر گنا جا سکتا ہے۔ ہماری صدی ختم ہونے کو ہے
اس لئے آبِ حیات کی تلاش کی بجائے اپنی
نگاہ اور تحریر کو سنوارنا چاہیے

سلیم

عکسِ تحریر:۔ ڈاکٹر سلیم اختر

# پیاسے کو قطرہ

انور

ذہین، سنجیدہ، جفاکش، بہانہ ساز اور جھوٹا اکبر علی آدم علی یکایک اپنے مغموم چہرے کے ساتھ میرے ذہن کے پردوں پر آتا ہے اور میں غمگین ہو جاتا ہوں۔

مجھ پر اس جھوٹی بہانہ سازی کا پہلا تجربہ بالکل ناکام ثابت ہوا۔ معمول کے مطابق وہ چھ دن دفتر سے غیر حاضر رہا اور پھر آتے ہوئے اپنے گاؤں کے ایک وید کا گجراتی میں لکھا ہوا سرٹیفکیٹ لے آیا۔

میں نے کہا "تمہیں معلوم نہیں، میں گجراتی نہیں جانتا؟"

اس نے کہا: "میں اس کا انگریزی میں ترجمہ کر کے لاتا ہوں۔"

سرٹیفکیٹ کا ترجمہ یہ تھا: "میں ملک کے بیوپاری سوٹا مل کھوٹا مل کا منیم اور پربھاش پٹن کا سند یافتہ وید تصدیق کرتا ہوں کہ اکبر علی آدم علی، کلرک، ریکارڈنگ آفس، جام نگر، بیمار تھا۔ اس کو دفتر میں کام کی زیادتی کی وجہ سے ہیضہ ہو گیا تھا۔ چھ دن اس کا علاج ہوتا رہا، پیٹ پر جونکیں لگی ہونے کی وجہ سے وہ پلنگ پر سے ہل نہیں سکا اس لیے اس کو چھ دن کی چھٹی دی جائے۔"

وید راج جوشی داس تُوتی مل۔

میں نے سرٹیفکیٹ پھاڑ کر ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔

اکبر علی آدم علی بڑا ذہین کلرک تھا، اس لیے وہ اچھا کلرک نہیں تھا۔ کلرک کو ذہین کہنا اس کی بہت بڑی توہین ہے۔ کلرک میں اتنا ہی دماغ ہوتا ہے۔ جتنا سنگر مشین میں۔ ذہین کلرک وہ ہوتا ہے جو کچھ کام نہ کرے اور ثابت کر دے کہ وہ سب سے زیادہ کام کرنے والا ہے۔ جو دفتر سے غیر حاضر رہے اور پھر بھی دفتر میں موجود ہو۔ جو یہ جانتا ہو کہ دفتر کے انچارج کو خوش رکھنے کے لیے کام سے بہتر طریقے موجود ہیں۔

اکبر علی بڑا ذہین کلرک تھا۔ وہ مجھ پر بہانہ سازی کے تجربے کر کے بڑا تجربہ کار ہو گیا تھا۔ اس کو جھوٹ بولنے کا سلیقہ آ گیا تھا۔ وہ دفتر سے لمبی لمبی دن تک بلا اجازت اور بلا درخواست غیر حاضر رہنے کی عادت کو بڑے حسین پردوں میں چھپا لیتا تھا۔ اور بعض اوقات اس کے فنکارانہ انداز میں پیش کیے ہوئے جھوٹ کو سچ مان کر بڑی خوشی ہوتی تھی۔

ایک دفعہ وہ تیرہ دن دفتر نہ آیا۔ میں نے سوچا وہ سروس میں نہیں رہنا چاہتا۔ اس لیے میں نے اس کو ڈسچارج کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ گھر آیا تو دیکھا وہ باغیچے میں پودوں کو پانی دینے کے بعد زینیا کے بیج بونے کے لیے کیاریاں تیار کر رہا ہے۔ اور میرا ملازم کچن سے اس کے لیے چائے لیے جا رہا ہے۔ وہ دیر تک باغیچے میں کام کرتا رہا۔ ہم دونوں نے رات کا کھانا اکٹھا کھایا۔ اور جاتے وقت میں نے اس سے کہا "اکبر! تم دفتر سے غیر حاضر رہنے کی عادت چھوڑ دو۔"

اکبر کام چور نہیں تھا، اپنا کام بڑی محنت اور مستعدی سے کرتا تھا۔ دفتر میں کام زیادہ ہو تو رات کے آٹھ آٹھ بجے تک کام میں لگا رہتا تھا۔ دوسروں کا بھی ہاتھ بٹاتا تھا۔

ایک دن اس کو ایک خط ملا۔ خط پڑھنے کے بعد وہ میرے پاس گھبرایا ہوا آیا اور بولا:

"والد صاحب سخت بیمار ہیں، ایک ہفتے کی چھٹی چاہیئے۔"

وہ چھٹی پر چلا گیا۔

اسی دن شام کو اکبر علی کا باپ آدم علی مجھے ملنے کے لیے آیا۔ میں نے حیران ہو کر کہا "معاف کیجیے! آپ تو بیمار ہیں۔ آج اکبر علی کو آپ کا خط ملا تھا، وہ چھٹی لے کر آپ کو دیکھنے گیا ہے۔"

وہ بولے: "جی نہیں۔ میں بیمار نہیں۔ اکبر علی جھوٹا ہے۔"

اس کے بعد ہم پر کچھ عرصہ خاموشی طاری رہی۔

پھر میں نے کہا: "آپ کے لڑکے میں سب خوبیاں ہیں لیکن ایک بہت بڑا نقص ہے۔ وہ کبھی کبھی بلا اجازت دفتر سے حاضر ہو جاتا ہے۔ کیا آپ نے اس کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"بتا سکتے ہیں؟"

"جی ہاں۔ وہ ایک لڑکی کی محبت میں گرفتار ہے۔"

میں نے کہا "شادی کر دیجیے اس لڑکی سے اس کی؟"

انہوں نے جواب دیا: "مشکل ہے کیونکہ وہ ایک بازاری لڑکی ہے۔ ہمارے خاندان میں اچھی اچھی لڑکیاں ہیں لیکن وہ اس لڑکی کے سوا کسی اور سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ وہ سینما کے ہیرو کی طرح کہتا ہے کہ وہ اس لڑکی کو اس ذلیل پیشے سے نکال کر عزت کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔"

یکلخت اکبر کا وقار میری نظروں میں بڑھ گیا۔

اکبر کا باپ بولا: "میرا لڑکا اپنے خاندان کی عزت خاک میں ملانے پر تُلا ہوا ہے۔ آپ اس معاملے میں میری مدد کر سکتے ہیں؟"

میں نے کہا: "فرمائیے، میں کیا کر سکتا ہوں؟"

اس نے کہا: "آپ اسے چھٹی نہ دیں۔"

میں نے جواب دیا: "وہ اکثر ہفتے اتوار کو یہاں سے جاتا ہے اور میری اجازت کے بغیر کئی کئی دن غیر حاضر رہتا ہے۔"

اس نے کہا: "یا کم از کم دو تین ماہ تک اس کو یہاں سے نکلنے نہ دیں۔ اس دوران میں اس کی ماں اپنی لڑکی کو لے کر بمبئی جانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ پھر کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔"

میں نے کہا: "لیکن میرا خیال ہے آپ کی احتیاط بے سود ہے۔ آج کا جو خط اسے ملا ہے وہ شاید اسی لڑکی کا ہے۔ وہ اس خط کو آپ کا خط بنا کر اور آپ کی بیماری کا بہانہ کر کے مجھ سے چھٹی لینے میں کامیاب ہو گیا ہے وہ اس وقت پربھاش پٹن میں ہو گا۔"

وہ جلدی سے اپنا اٹیچی کیس اور چھتری لے کر کھڑا ہو گیا۔ "ہاں، مجھے جلدی پربھاش پٹن پہنچنا چاہیے۔ اصل میں اس لڑکی کے بمبئی چلے جانے تک مجھے پربھاش پٹن سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔"

وہ میرا شکریہ ادا کرکے رخصت ہونے لگا۔ لیکن دروازے کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ اور میرے پاس لوٹ آیا، پھر جیسے وہ کچھ یاد کرنے کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ بولا: "ہماری پچھلی ملاقات میں آپ نے پربھاش پٹن کا قلعہ دیکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، مجھے وہ قلعہ ضرور دیکھنا ہے۔"

اس نے فوراً کہا: "تو اب بہترین وقت ہے۔ موسم بھی اچھا ہے۔ اور اتفاق سے موقع بھی۔ اکبر علی وہاں موجود ہے۔ جس کے دل میں آپ کی بے پناہ محبت اور عزت ہے۔ امید ہے آپ کے اثر اور ہمارے اصرار سے وہ اپنی ضد سے باز آجائے گا۔"

"یعنی وہ اس لڑکی سے شادی کرنے کا خیال چھوڑ دے گا؟"

"اور آپ اس کو ہمارے اپنے خاندان کی قبول صورت پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کرنے پر رضامند کرلیں گے۔"

میں نے ہفتے کے دن قلعہ دیکھنے کے لیے پربھاش پٹن جانے کا پروگرام بنالیا۔ اکبر علی کا باپ آدم علی سٹیشن پر آنے کا وعدہ کرکے چلا گیا۔

ہفتے کے دن میں سفر کے تصورات میں محو تھا کہ ملازم نے اندر آکر میرے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔ وہ کوئی بات کہے بغیر جلدی جلدی کمرے کی کھڑکیاں بند کرنے لگا باہر فضا سرخی مائل سیاہ ہوگئی۔ بوگن ویلیا کے پتے سرسرانے لگے۔ پھولوں کے پودے لہلہانے لگے۔ دروازوں کے پردے ہلنے لگے۔

میں نے کہا: "کیا بات ہے حسن علی؟"

حسن علی نے جواب دیا: "بڑی سخت آندھی آرہی ہے۔"

دو گھنٹے تک بڑی سخت آندھی چلتی رہی، مکانوں کے کھپریلوں کے اڑنے اور گر کر ٹوٹنے کی صدائیں آتی رہیں، کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشے ٹوٹتے رہے، سڑکوں پر درخت اور بجلی کے کھمبے گرتے رہے، پرانے جھونپڑوں کی تاڑ کے پتوں کی چھتیں اور مٹی کی دیواریں بیٹھتی رہیں۔

شام کو جام نگر کلب میں جس کے برآمدوں کے سب کھپریل اڑ گئے تھے، ریڈیو پر معلوم ہوا کہ کاٹھیاواڑ کے ساحل پر پچھلے اڑتالیس سال میں اس سے تباہ کن طوفان نہیں آیا۔ تین سو اکیاسی جانیں تلف اور بے شمار افراد زخمی ہوئے۔ زیادہ جانیں بڑے سائز کی بادبانی کشتیوں کے ڈوبنے سے ہوئی ہیں۔ یہ کشتیاں جو ساحل کے چھوٹے چھوٹے مقامات پر روزانہ ضروریات کی اشیاء اور مسافر لے جاتی ہیں ساحل کے نزدیک جگہ جگہ الٹی ہوئی نظر آتی ہیں۔

تین دن کے بعد میں پربھاش پٹن میں ویک اینڈ گزارنے کے لیے جانے کی تیاری کرنے لگا۔ جب میں ہیڈ کلرک کو ضروری ہدایات دے رہا تھا تو پوسٹ مین نے مجھے ایک خط لاکے دیا۔ وہ اکبر علی کے باپ آدم علی کا خط تھا:

"—— میں جب واپس پربھاش پٹن پہنچا تو معلوم ہوا کہ اکبر علی اس لڑکی کو لے کر بھاگ گیا ہے۔ وہ لڑکی اپنی ماں کا سب روپیہ اور زیور ساتھ لے گئی ہے —— لڑکی کی ماں لڑکی کے لیے ماری ماری پھرتی ہے۔ ہم نے بھی ان کو ڈھونڈنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی —— بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دونوں ایک بادبانی کشتی میں سوار ہوکر ویراول بندرگاہ سے جام نگر کی بیڑی بندرگاہ کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ گرنار گڑھ کے پاس وہ طوفان سے دوچار ہوئے، اس کے بعد ان کا کوئی پتہ نہیں ملا۔"

دو تین مہینے گزر گئے۔

اکبر علی کا نام دفتر کے رجسٹر سے خارج کر دیا گیا۔ اس کی ناگہانی موت کا افسوس آہستہ آہستہ دفتر کے پلندوں کے نیچے دب گیا۔ اور پھر ایک دن یک بیک، اکبر علی میری میز کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

میرے خدا! اکبر علی! تم زندہ ہو؟"

بال اور ناخن بڑھے ہوئے، کپڑے میلے اور پھٹے ہوئے، چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی، ڈراؤنی۔ اکبر علی گردن جھکائے چپ چاپ میرے سامنے کھڑا رہا۔

میں نے کہا "بیٹھ جاؤ"۔ وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ "تمہارا ساتھی کہاں ہے؟"

وہ چونک اٹھا "ساتھی؟ کون سا ساتھی؟"

میں بولا: "تمہارا جیون ساتھی"۔

وہ بولا: "نہیں نہیں۔ میرا کوئی جیون ساتھی نہیں، میں بالکل اکیلا ہوں"۔

میں نے کہا: "اکبر علی! میں سب کچھ جانتا ہوں"۔

میں نے دراز سے اس کے باپ کا خط نکال کے اس کے سامنے پھینک دیا۔ وہ خط کو خاموشی سے پڑھتا رہا۔ خط پڑھنے کے بعد اس کے بدن پر اضمحلال کے آثار زیادہ گہرے ہوگئے۔ اس نے اپنی بائیں کہنی کرسی کے بازو پر رکھ کر بائیں ہاتھ میں اپنا چہرہ تھام لیا۔ اور دائیں ہاتھ سے تہ کئے ہوئے خط کو آہستہ آہستہ کرسی کے بازو پر مارتا رہا۔ اور آنسو ہتھیلی کے کنارے پر بہتے ہوئے ٹپ ٹپ زمین پر گرتے رہے۔

دیر تک میرے کمرے میں غمگین خاموشی چھائی رہی۔

آخر میں نے دفتر کی گھنٹی بجائی۔ چپراسی اندر آیا۔ میں نے کہا: "دو چائے لاؤ۔ اور چپیرٹری۔ اور ان لوگوں سے کہو شیشوں میں سے اندر نہ جھانکیں۔ اکبر علی ابھی باہر آئے گا"۔

اکبر علی نے اپنی جیب سے ایک گندہ سا رومال نکالا۔ اور اس سے اپنی ناک اور آنکھیں صاف کیں۔ اور پیپرویٹ کے رنگوں کو بلا توجہ اور بلا وجہ دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا "حادثہ کہاں ہوا"؟

اس نے جذبات سے بوجھل آواز میں جواب دیا "گورنار گڑھ کے سامنے"۔

"تم کیسے بچے؟"

گورنار گڑھ کے رہنے والوں نے چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے ذریعے بہت سے لوگوں کو بچا لیا"۔

"اور وہ؟"

وہ اس ڈائرکٹ سوال سے پھر گھبرا گیا۔ لیکن پھر ہمت کر کے بولا "دو مہینے گورنار گڑھ کے آس پاس اس کو تلاش کرتا رہا ہوں۔ کچھ پتہ نہیں چلا"۔

"ڈوب گئی ہوگی؟"

"کاش وہ ڈوب گئی ہو! لیکن میں ڈرتا ہوں۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اور اس کے پاس روپے اور زیورات سے بھرا ہوا ایک ڈبہ تھا"۔

"یقین نہیں؟"

گورنار گڑھ کا علاقہ بہت جرائم پیشہ علاقہ ہے۔ میں دو مہینے اس کے آس پاس صرف اس لئے پھرتا رہا ہوں کہ مجھے یقین ہو جائے وہ ڈوب گئی ہے"۔

اگست ۴۰ء

# نامکمل کہانی

مرزا ریاض

میرا خیال تھا جب یہ کہانی مکمل ہو جائے گی تب اسے لکھوں گا۔ کہانی تو ابھی مکمل نہیں ہوئی، اور جانے کب مکمل ہوگی، ہوگی بھی یا نہیں؟ البتہ مجھ پر اعصابی حملہ ہو چکا ہے اور میں ہسپتال میں زیر علاج ہوں۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے، میرا بھی یہی خیال ہے، یہ کوئی مہلک مرض بھی تو نہیں ہے، ویسے بھی مجھے یقین ہے کہ کہانی کو اپنے منطقی انجام تک پہنچنے تک میں ضرور زندہ رہوں گا۔

ڈاکٹروں کا خیال ہے مجھے پریشان نہیں رہنا چاہیئے یہی میرا علاج ہے، اتنی اہم بات تو میں بھی جانتا ہوں جو گذر چکا ہے، وہ مر چکا ہے کاش ایسا ہی ہوتا، ماضی کے گھناؤنے واقعات سے پیچھا چھڑانا اگر اتنا ہی آسان ہوتا تو زمانے میں ستر فیصد لوگ پُرسکون ہوتے، ڈاکٹروں کے مشورے بجا ہیں۔ نفسیات کی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی درست ہے، ڈیل کارنیگی کی کتاب "پریشان ہونا چھوڑیئے جینا سیکھئے"، کروڑوں دکھی انسانوں نے پڑھ رکھی ہے، مگر انسانوں کے دکھوں میں کہاں کمی ہوتی ہے کسی شاعر نے کہا ہے

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب — چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

اتنے پٹے ہوئے شعر کی شدت کا احساس آج ہوا ہے، صرف ان لوگوں کو ہو سکتا ہے، جن کے لئے ماضی ایک NIGHTMARE بن گیا ہو، ایک ڈراؤنا خواب، سنتے آئے تھے کہ خواب ہمیشہ سہانے ہوتے ہیں۔

میرے سرہانے لبریم اور ویلیم پڑی رہتی ہیں، ان نشہ آور ادویات کے استعمال سے سو جاتا ہوں، عارضی سکون مل جاتا ہے، ورنہ جاگتی زندگی میں پھر سے وہی اذیت دل و دماغ پر مسلط ہو جاتی ہے اور واقعات جونکیں بن کر میرا خون چوسنے لگتے ہیں۔

میرے اعصاب کمزور ہو گئے ہیں اور اسی لئے جذبات اور محسوسات میں شدت پیدا ہو گئی ہے میں نے سوچا مجھے وہ سب کچھ اب کہہ ہی دینا چاہیئے جو ایک عرصے سے بوجھ بنا ہوا ہے، کہانی کے اختتام کا میں آخر کب تک انتظار کر سکتا ہوں؟ میں یہ کہانی اس لئے نہیں لکھ رہا کہ خود رحمی کا شکار ہوں یا کسی شاہکار کہانی کو جنم دینا چاہتا ہوں۔۔ میں تو محض اپنے ذہنی تناؤ اور جذباتی کھچاؤ کو کم کرنا چاہتا ہوں اتنی لمبی تمہید پڑھنے کے بعد عین ممکن ہے کہ آپ اس سے صد درجہ مایوس ہوں، اس لئے کہ یہ نہ تو روایتی محبت کی کہانی ہے اور نہ نصابی اخلاقیات کی۔ مگر شاید ایسی بات بھی نہیں ہے، میں کوئی نقاد نہیں جو فیصلہ دوں!

ناصر میرا ماتحت تھا، وہ دراز قد، خوش لباس، اور مؤثر شخصیت رکھتا تھا، دفتری آداب سے واقف، بات کرنے کا شعور اور دوسروں پر اثر ڈالنے کا ڈھنگ اسے آتا تھا، اس کا باپ، پولیس میں تھانیدار تھا، اور دادا پولیس ہی میں ہیڈ کانسٹیبل ریٹائر ہوا تھا، پہلی نظر میں ناصر نہایت خوشگوار اثر ڈالتا تھا، میں نے ناصر کے اپنے دفتر میں تبدیل ہو کر آنے کی مخالفت کی تھی، ایک تو اس لئے کہ جہاں وہ ملازمت کرتا تھا وہاں اس کی شہرت اچھی نہ تھی، اور دوسری وجہ یہ تھی کہ جس شخص کو اس کی جگہ تبدیل ہو کر جانا تھا، وہ ایک شریف النفس

تجربہ کار اور بڑی لگن سے کام کرنے والا تھا، اور دو سال بعد ریٹائر ہونے والا تھا۔ اس نے بڑے جتنوں سے تنگیاں ترشیاں کاٹ کر دو کمروں کا ایک مکان بنوا لیا تھا، اس کی دو بڑی بیٹیاں بیاہنے کے لائق ہو گئی تھیں، اور ان کے رشتے بھی اسی شہر میں طے ہو چکے تھے۔ باقی تین لڑکے بھی زیر تعلیم تھے۔ بیوی ذیابیطس کی مریضہ تھی، ان لوگوں کو جہاں تبادلے کے بعد جانا تھا، وہ ایک دور افتادہ علاقہ تھا، جہاں قابل ڈاکٹر تو درکنار، کوئی چھوٹا سا ہسپتال بھی نہ تھا، ایک معمولی سی ڈسپنسری ضرور تھی، جہاں نزلہ زکام، معدہ اور ملیریا کے کیپسولوں کے علاوہ کوئی دوا نہ ملتی تھی۔

ناصر کو ملازمت کرتے ہوئے ابھی چار برس سے زیادہ نہیں ہوئے تھے وہ جس سیٹ پر سے کام کرتا تھا، وہ ایک نہایت اہم اور sensitive سیٹ تھی۔ اسے بطریق احسن چلانے کے لئے بڑے فہم و فراست اور دفتری سوجھ بوجھ کی ضرورت تھی، دفتر میں یہ پوسٹ کلیدی اہمیت رکھتی تھی اور اسے حاصل کرنے کے لئے لوگ بڑی تگ و دو کرتے اور بڑے اونچے لوگوں کی سفارشیں لے کرتے تھے، یہاں تک کہ حکام بالا بھی اس میں خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔ جتنی یہ پوسٹ کلیدی تھی اتنے ہی اس میں بدنام ہونے کے مواقع بھی تھے، اس بات کا خیال کرتے ہوئے میں نے ناصر کو اس سیٹ پہ نہ لگایا، وہ ایک ایسا نوجوان تھا۔ جس کے سامنے روشن مستقبل کے وسیع امکانات موجود تھے، جسے ابھی ترقی کی منازل بڑی احتیاط سے طے کرنا تھیں، اس کا ایک بھی عاجلانہ اور غلط قدم اس پہ ترقی کی ساری راہیں مسدود کر سکتا تھا، ایک دو ملاقاتوں میں یہ تو میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کے عزائم بلند ہیں اور مقاصد عظیم، وہ اپنی ساری صلاحیتیں کلرک رہ کر تباہ نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لئے وہ دفتر کے دوسرے لوگوں سے اپنے آپ کو الگ رکھتا تھا روایتی کلرکوں سے اسے نفرت تھی، اور وہ Ambitious تھا زندگی میں کوئی اعلیٰ منصب حاصل کرنے کی آرزو رکھتا تھا، اس کی یہ خواہش قابل قدر تھی، اور اس کا جذبہ قابل تحسین، چنانچہ میں اسے دفتری غلاظتوں سے دور رکھنا چاہتا تھا۔

مگر ناصر کو میرا یہ فعل پسند نہ آیا، اس سیٹ سے وہ الگ ہونا نہ چاہتا تھا یہ اس کے جذبۂ انا کو کسی قدر ٹھیس لگی تھی، میں نہیں کہہ سکتا، بہر حال وہ میرے پاس احتجاج کرنے آیا، اس کے چہرے پہ بے چینی تھی۔ میں نے مشفقانہ انداز میں اسے سمجھانا چاہا، دفتری اونچ نیچ، اور کیریر کو نقصانات پہنچنے کے احتمالات، مگر وہ میری باتوں سے مطمئن نہ ہوا، بلکہ ایک دو موقعوں پہ تو تلخ کلامی پہ اتر آیا تھا جو میرے لئے حیران کن بلکہ ناقابل یقین تھی، میرا خیال نہیں تھا کہ وہ اس سیٹ پر کام کرنے کے لئے اتنا بیتاب ہوگا، اس کے جانے کے بعد میں نے اپنے فیصلے کے بارے میں بہت غور کیا۔ بالکل غیر جانبداری اور کسی بھی تعصب کے بغیر، اور مجھے اپنے اس اقدام کے بارے میں کسی قسم کے شک کا احساس نہ ہوا، بات استحقاق کی تھی، موزونیت کی تھی، حالانکہ میں اسے نہ صرف پسند کرنے لگا تھا، بلکہ دوسروں کے مقابلے میں ہر لحاظ سے بہتر سمجھتا تھا!

سرکاری ملازمت کا میرا یہ چھبیسواں سال تھا اور اسے کرشمہ سمجھیں، میری فہم و فراست کا اعجاز یا پھر اللہ کا کرم کہ کبھی کسی پریشان کن صورت حالات سے دوچار نہ ہوا تھا، چھوٹی موٹی شکایات تو دفتر میں ہوتی رہتی ہیں۔ عملے کے دلوں میں رنجشیں بھی ہوتی ہیں، جن کا کبھی وہ اظہار کر بھی دیتے ہیں، اور نہیں بھی کرتے۔ آپس میں چشمکیں بھی چلتی ہیں جنہیں نظر انداز کر دینا ہی اچھا ہوتا ہے، اور فراخدلی سے معاف کر دینا بھی مفید رہتا ہے، ویسے بھی میں کوئی ایسا سخت گیر اور محتسب قسم کا افسر بھی نہیں ہوں، بلکہ خطاؤں سے درگزر کرنا میرا عام وطیرہ رہا ہے۔

شاید اسی لئے میرے دفتر میں آج تک کوئی ایسی سنگین situation پیدا نہیں ہوئی تھی۔ جو دوسرے دفتروں میں عام

طور سے ہوتی رہتی ہیں، میرے درجے کے افسر جو دوسرے شعبوں کے سربراہ ہیں ایسے موقعوں پر مجھ سے مشورے طلب کرتے اور اس پہ عمل کر کے سرخرو ہوتے تھے اور از راہ مذاق TRbute پیش کرتے کہ بھئی تمہارا دفتر تو تمہاری سلطنت ہے، تم اس کے بے تاج مگر با اختیار بادشاہ بلکہ شہنشاہ ہو، باقی رہا تمہارا عملہ۔ تو وہ ہے تمہاری وفادار فوج، وفادار اور قابلِ اعتماد۔ نہ صرف یہ کہ میرے عملے کے لوگ میرا حد درجہ احترام کرتے تھے بلکہ میرے سینئر افسران بھی مجھ پہ بھروسہ کرتے تھے۔

اور ملازمت کا سارا فخر یہی ہے کہ عزت و آبرو قائم رہے، جو مجھے حاصل تھی میرا ماتحت عملہ مطمئن تھا، اور میرے دفتر کا کام خوش اسلوبی سے چل رہا تھا، خود ستائی کی بات، اب چل ہی نکلی ہے تو ایک دو باتیں اور بھی کرتا چلوں خوشامد، افسروں کی کمزوری ہوتی ہے، کم از کم ہمارے ملک میں بد قسمتی سے ہے، میں ایک افسر بھی ہوں اور انسان بھی ہوں لہٰذا اسی کمزوری میں مبتلا ہوں، مگر بحیثیت انسان ریاکاری سے نفرت کرتا ہوں، زندگی کے ہر شعبے میں ——— خوشامد ریاکاری کے بغیر جنم نہیں لے سکتی اور ریاکاری سے میری نفرت اتنی شدید ہے کہ میں نے کسی حد تک خوشامد پہ قابو پا لیا ہے۔ جب کبھی کوئی میرا ماتحت، یا کوئی سائل ورضرورت مند میری خوشامد کرتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے میرے کان مروڑ رہا ہو۔ اور کان مروڑے جانے کا عمل بظاہر پُر لطف مگر اصل میں بہت تکلیف دہ ہوتا ہے میرے ایک سکول ماسٹر یوں کان مروڑتے تھے جیسے انہیں مروڑ رہے ہیں۔

ناصر اس واقعے سے پہلے ایک دفعہ میرے گھر پہ آ چکا تھا، اس کی خوبرو اور حسین بیوی بھی اس کے ساتھ تھی مٹھائی ساتھ لے کر آئے تھے، میں نے اس پہ مہربانی کی تھی تو اس نے بڑی خوش گفتاری سے مجھے یہ یقین دلایا تھا کہ میں اس کا افسر ہی نہیں۔ اور بزرگ بھی اور دونوں لحاظ سے قابلِ احترام اس سے پہلے کبھی میرے کسی ماتحت نے ایسے جذبات کا اظہار نہ کیا تھا، مجھے اس بات کی بہت خوشی ہوئی تھی، اس لمحے جانے کیوں مجھے، اور میری بیوی کو بیٹے کی کمی کا شدید احساس ہوا تھا۔

ناصر میرے کمرے سے رخصت ہوتے وقت مجھے اپنے فیصلے پہ نظرِ ثانی کرنے کے لئے کہہ گیا تھا، مگر میں اس پہ قائم رہا۔ مجھے پتہ چلا کہ ناصر نے دفتر میں چند لوگوں کی موجودگی میں مجھے گالیاں دی ہیں، مجھے اس کا رنج ہوا تھا گالیوں کا کوئی جواز نہ تھا اور اگر جواز ہوتا بھی گالیاں دینا تہذیب و شائستگی کے منافی بات تھی، افہام و تفہیم کے لئے میں نے اسے اپنے پاس بلایا مگر وہ ملنے سے کتراتا رہا، پھر ایک دن میرا اس کا سامنا ہو گیا، میں نے اس بارے میں اس سے پوچھا، تو وہ صاف مکر گیا۔ بلکہ مجھے ہدایت کرنے لگا کہ افسر کو کانوں کا کچا نہیں ہونا چاہیئے اور پھر اس نے بتایا کہ آفس میں شر پسند لوگ موجود ہیں، جو ہمارے قریبی تعلقات کو پسند نہیں کرتے اور یہ کہ وہ لوگ میرے خلاف بری باتیں کرتے ہیں غلیظ باتیں، لہٰذا مجھے ان سے ہوشیار رہنا چاہیئے میں اس کی باتیں سن کر بھونچکا سا رہ گیا۔

میرے دفتر میں میرے کئی معتقدین تھے۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جنہیں کبھی دانستہ یا نادانستہ طور پہ میں نے تنگ کیا ہو، ان کی خلافِ قاعدہ باتوں پر سرزنش بھی کی ہوگی، بس یہی ایک بات ہے جو میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے یعنی دفتری قاعدے ضابطگی کو برداشت نہیں کر سکتا، اس لئے کہ یہ میرا نجی معاملہ نہیں ہوتا، قوم اور ملک کا معاملہ ہوتا ہے، عزت و آبرو کے مٹ جانے کا معاملہ ہوتا ہے، ایسے موقعوں پہ میرا رویہ سخت سے سخت تر ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ایسے عناصر میرے دفتر میں ضرور موجود ہوں گے۔ مگر بیشتر لوگ ایسے تھے جن پر میرے احسانات تھے، اور وہ ایسے لوگ تھے جو احسان فراموش نہیں ہو سکتے، اور یہ کہ آج تک کسی فرد نے میرے خلاف کوئی شکایت نہ کی تھی اس لئے ناصر کا یہ بات کہہ دینا میرے لئے انتہائی حیرت کا باعث بنی تھی۔

پہلے میں نے اس کے کام پر نظر رکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی، مگر اس کی باتوں پر مجھے شک گذرا، اس نے میرے جان نثاروں پر ازام لگایا تھا، کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ ہم میں آویزش پیدا کرنا چاہتا ہو، اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے مجھے ذلیل کرنا چاہتا ہو۔ اس خیال نے مجھے چوکنا کردیا، اور تھوڑے ہی دنوں میں مجھے معلوم ہوگیا کہ ناصر دفتری فرائض میں مسلسل غفلت اور لاپروائی برت رہا ہے، اور چھوٹی موٹی بے ضابطگیاں کرتا رہتا ہے۔ کبھی وقت پر نہیں آتا۔ اور دفتر کا وقت ختم ہونے سے پہلے چلا جاتا ہے جتنا وقت دفتر میں گذارتا ہے زیادہ تر باہر کے دوستوں کے ساتھ کینٹین میں چائے پیتے اور گپ شپ میں گذارتا ہے، بغیر چھٹی کی درخواست کے غیر حاضر ہو جاتا ہے، سینیر سٹاف کی پرواہ نہیں کرتا، اپنے کام میں بہت کم دلچسپی لیتا ہے، البتہ اسی سیٹ کے متعلقہ کلرک کے ساتھ ساز باز کرتا رہتا ہے، اور اپنی مرضی کے مطابق اس سے کام لیتا رہتا ہے۔ اس نے یہ بات آج تک مجھے اس لئے نہ بتائی تھی کہ ناصر، میرے ساتھ اپنے نہایت قریبی تعلقات کا چرچا ہر وقت کرتا رہتا تھا یہاں تک کہ رشتے داری کا ڈھونگ بھی رچا رکھا تھا، یعنی میری بیوی، اس کی حقیقی خالہ تھی۔ اور پھر جب کبھی یہ حربہ کام نہ آتا تو دھمکی دیتا، دھمکیاں دینا تو اس کی عام عادت تھی، کسی سیاسی شخصیت کا حوالہ دیتا اور کبھی کسی غنڈے سے ذلیل کروانے کا خوف دلاتا، غرض یہ کہ دفتر کے لوگ اس سے اچھے خاصے خوفزدہ تھے اور اسی خوف، اور عزیزداری کے ناطے میرے تک اس کی شکایات نہ لاتے تھے، بلکہ یہ سب کچھ بتانے کے بعد منت کرتے تھے کہ ناصر کو کچھ نہ بتایا جائے۔

کبھی میرے دفتر میں محبت اور بھائی چارے کا ماحول تھا اور اب خوف و ہراس کی فضا۔ دفتر کی ہم آہنگی بری طرح سے متاثر بلکہ مکدر ہو رہی تھی ناصر کو سمجھنے میں مجھ سے کس قدر غلطی ہوئی تھی بہر حال کوئی قدم اٹھانے سے پہلے پھر میں نے یہی مناسب سمجھا تھا کہ اس سے بالمشافہ بات کروں، جب وہ مجھ سے ملا، تو اپنے ہر قول اور فعل سے منحرف ہوگیا، اس کے چہرے پر نہ کوئی گھبراہٹ تھی اور نہ کوئی فکر بتہ اس نے مجھے فکرمند کردیا تھا، اس سے محتاط رہنے کی ضرورت تھی، وہ کوئی معمولی شخص نہ تھا۔

ایک بات کا مجھے پختہ یقین ہوگیا تھا کہ ناصر خود ایک بے چین نوجوان ہے، اور مجھے بھی چین سے بیٹھنے نہیں دے گا، خود بے سکون ہے اور دوسروں کو بھی سکون سے رہنے نہیں دے گا، اس کی بے سکونی کی وجہ یہ تھی کہ وہ زندگی میں چھوٹا اور کمتر بن کے رہنا نہ چاہتا تھا اس کے باپ کی آمدن اگرچہ خاصی تھی۔ مگر کنبہ زیادہ تھا، چار بھائی اور تین بہنیں، ان میں سے دو بھائی تو باقاعدہ لفنگے تھے اور باپ کی حیثیت کو اپنی لوٹ کھسوٹ کے لئے استعمال کرتے تھے، باپ گرچہ شریف شخص تھا، مگر گھر کے اخراجات بہر حال پورے کرنا اس کے فرائض میں تھا۔ ناصر نے ایک امیر گھرانے میں شادی کرلی تھی، یہ شادی کیسے ہوئی تھی، اس کے پیچھے جھوٹ اور فریب کی ایک لمبی داستان تھی۔ سسرال والوں نے ایک کار بھی جہیز میں دی تھی، جسے استعمال کرکے ناصر دوسروں پر اپنی برتری ظاہر کرتا تھا، یہی نہیں بلکہ اسے برقرار رکھنے کے لئے اس نے لاء کی کلاسز میں داخلہ لے رکھا تھا، اس کا خیال تھا کہ قانون کے میدان میں وہ اپنے جینئس کا پوری طرح اظہار کرسکتا ہے، اس کی شخصیت کے یہ روشن پہلو تھے، قناعت کرکے بیٹھ جانا، زندگی اور اس کی جد وجہد کی توہین کرنا ہے مگر اس کے کردار کا دوسرا رُخ اتنا ہی تاریک تھا، حد درجہ مغرور تھا، دوسروں کو اپنے سے حقیر جانتا تھا خود غرض تھا اور اپنی اغراض کے حصول کے لئے انتہا تک پہنچنے کے لئے تیار ہوتا، بزدل تھا، سامنے ہوتا تو آنکھیں ملا کے بات نہ کر پاتا، باہر جا کر کھلم کھلا گالیاں دیتا، مگر پوچھنے پر صاف مکر جاتا، اس لئے کہ ریاکار تھا، مجھے اپنی وفاداریوں اور خلوص کا یقین دلاتا، مگر میرے خلاف سازشیں کرتا، میرے ماتحتوں کو اکساتا۔ منافق تھا، اس لئے خود پیچھے رہتا، دوسروں کو آلۂ کار بناتا، کمزوروں کو اپنی طاقت کا نشانہ بناتا، اور اپنی کامیابی کے لئے ہر قسم کے جائز اور ناجائز

ہتھکنڈے استعمال کرتا۔ دولت کی ہوس اس کے کردار میں نمایاں تھی، اور غالباً اسی لئے وہ اس اسیٹ۔ کے لئے اس قدر خواہش رکھتا تھا کہ جس کے نہ ملنے پر وہ میرا دشمن ہو گیا تھا، اور اب اسی دشمنی کو بڑھا رہا تھا۔

دفتر میں میرے خلاف پروپیگنڈہ مہم شروع کر رکھی تھی، اپنے رفیقانِ کار جن سے ملنا جلنا بھی پسند نہ کرتا تھا، ان میں بیٹھ کے تقریریں کیا کرتا۔ کہتا کوئی ادنیٰ کوئی اعلیٰ نہیں، کسی نے پہلے سروس حاصل کر لی، کوئی بعد میں آگیا، کسی کو تنخواہ چند روپے زیادہ مل گئی، اور کسی کو کم، کسی نے رزقِ حرام کما لیا اور کسی نے رزقِ حلال۔ لوگوں کی نظروں میں بڑا کون ہے اور خدا کی نظروں میں چھوٹا کون؟

اس کی باتیں مدلل تھیں، منطقی تھیں، سچی تھیں مگر وہ ان باتوں سے مجھے نشانہ بنانا چاہتا تھا حالانکہ میرے پہ منطبق نہ ہو سکتی تھیں، میری زندگی ان آلودگیوں سے پاک تھی، بے داغ تھی اور زمانہ اس بات کا گواہ تھا۔ مگر وہ مایوس ہونے والا نہ تھا۔ پکی دھن کا پکا تھا، اور اپنے لئے جو راہ اس نے اختیار کر لی تھی، بڑی ثابت قدمی سے اس پہ چل رہا تھا۔ سچ کو سچ تو سارا زمانہ کہہ دیتا ہے۔ مگر سچ کو جھوٹ میں بدل دینا، اور لوگوں کو اس جھوٹ کا یقین بھی دلا دینا، اسے پروپیگنڈہ کہتے ہیں۔ اور اسی کا نام ذہانت ہے آج گر دنیا یقین نہیں کرتی تو کل کرے گی اور کہے گی کہ عزیز اللہ بیگ فراڈ نکلا۔

اس کی عیاری جسے وہ ذہانت کہتا تھا، کا زہر آہستہ آہستہ کام کر رہا تھا میں نے محسوس کر لیا تھا کہ دفتر کے کچھ لوگ مجھ سے کھچے کھچے رہنے لگے ہیں، میرے احکامات کو ٹالنے لگے ہیں اور میرے بارے میں مختلف قسم کی افواہیں پھیلاتے ہیں اور یہ کہ ان کے دلوں میں میرے لئے جو عزت و احترام کے جذبات تھے، ان کی شدت میں کمی آتی جا رہی ہے، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس خلیج کو پاٹنے کے لئے کون سی تدابیر اختیار کروں، جو میرے اور میرے ساتھیوں کے درمیان ناصر نے پیدا کر دی ہے، اپنی پریشانیوں کو ساتھ لے کر میں اپنے گھر میں داخل ہوتا، بیویاں تو نجومی ہوتی ہیں، ان سے کب کوئی بات چھپائی جا سکتی ہے، کیسے چھپائی جا سکتی ہے، وہ تو باطن کا علم رکھتی ہیں، باطن کا صحیح علم۔

سو میں نے اس بھاگوان کو سب کچھ کہہ سنایا وہ تو جیسے پہلے ہی غالباً جانتی تھی، بھڑک اٹھی، ناصر کا نام لے کر اسے بے نقط سنائیں، اللہ کا شکر ادا کیا کہ ہمارا کوئی بیٹا نہیں ہے، اس نے مجھے کوئی سخت قدم اٹھانے کا مشورہ بھی دیا۔

اتنا کچھ ہونے کے باوجود بھی ناصر سے میری براہِ راست کوئی لڑائی نہ ہوئی تھی، کم سے کم میری طرف سے کچھ نہ ہوا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی سالانہ ترقی کے لئے درخواست دی تو میں نے اس کی پُرزور سفارش کر دی، قانون کے امتحان کے لئے ایک مہینے کی رخصت طلب کی۔ میں رکاوٹ نہ بنا، اور اس کے کسی بھی خلافِ قاعدہ بات پر آج تک اس کی جواب طلبی نہ کی تھی، جس سے وہ اور بھی شیر ہو گیا تھا۔ دفتر کے لوگوں نے میرے کمزور رویّے کے طعنے بھی دے دیئے اور کہا کہ جب "وکٹ" ہی مضبوط نہ ہو، تو ڈسپلن کیسے قائم رکھا جا سکتا ہے مجھے نا اہل کے خطابات بھی ملے، میرے اس رویّے سے باقی سٹاف کے دلوں میں بددلی بھی پیدا ہوئی، طرح طرح کی باتیں میرے بارے میں سوچی گئیں مگر میں ناصر کے کیریئر کی راہ میں حائل ہونا نہ چاہتا تھا، اسے میری فیاضی کہئے یا بزدلی؟

میرا یہی خیال تھا کہ وہ میرے مستحسن سلوک سے ضرور متاثر ہو گا اور اپنی اصلاح کرے گا مگر اس نے مجھے بہت مایوس کیا۔ وہ محاذ آرائی کو طول دیتا چلا گیا، یہاں تک کہ میرے دفتر کا سارا ڈسپلن ختم ہو کے رہ گیا، اور افسرانِ بالا تک بھی یہ بات جا پہنچی۔

ان ہی دنوں سالانہ رپورٹیں بھیجنے کا وقت آگیا، وہ فوراً خبردار ہوا اور کئی دفعہ میرے گھر پہ اپنی بیوی سمیت آیا تحائف بھی لایا جو

ہم نے قبول نہ کئے۔ اس نے اپنی صفائی میں بہت کچھ کہا، اور ملاقاتوں میں وہ پہلے جیسا مودب اور پہلے سے بڑھ کر سعادت مند اور تابع فرمان نظر آیا، میرے جذبات سے بھی کھیلا، اور میری خوشامدیں بھی کیں، مجھے محسن گردانا اور اپنے آپ کو خطا کار اور یوں معافی کا خواستگار ہوا، مگر وہ مجھے قائل نہ کر سکا اس دفعہ مجھ پہ اس کا جادو نہ چل سکا، اور پھر معاملہ میرا تو نہ تھا دفتر کا تھا، حکومت کا تھا اور اس معاملے پہ کسی قسم کی سودے بازی، مفاہمت و درگذر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا! اس کی باتوں میں آ کر بالفرض محال اگر میں اس کے حق میں رپورٹ بھی دے دیتا۔ تو میں بے ضابطگی کا مرتکب ہوتا جس کے لئے میں کبھی اپنے آپ کو معاف نہ کر پاتا۔

کچھ عرصے تک تو وہ پُرامن رہا وہ ایک مثالی خادم سرکار بنا رہا، مگر جوں ہی خراب رپورٹ اسے ملی تو وہ، یک دم مشتعل ہو گیا اور بڑے ہی زبردست طریقے سے ردِّ عمل کا اظہار کیا، یہ رپورٹ اس کے لئے غیر متوقع تھی، اس کا خیال تھا کہ وہ مجھ پر اپنی بے گناہی ثابت کر چکا ہے مگر یہ رپورٹ تو اس کی انہی سوچوں اور مکروہ عزائم پہ بم بن کے گری، تھوڑی دیر کے لئے تو اس کی سمجھ میں نہ آسکا کہ کیا ہو گیا ہے، اور اسے اب کیا کرنا ہوگا، میں نے رپورٹ بہت سوچ سمجھ کر اور پوری ذمہ داری سے لکھی تھی اور لکھنے سے پہلے اس کی سابقہ رپورٹیں بھی دیکھ چکا تھا ان میں بھی "سرخ اندراجات" کہیں کہیں تھے جن کا اسے علم نہ تھا کیونکہ وہ اسے آج تک CONVEY نہیں ہوئے تھے، اس نے ایسا چکر چلا دیا تھا، چکر چلانے کا وہ ماہر تھا، اور اگر اسے معمولی سا شک بھی ہوتا تو وہ، اتنا ہوشیار تھا کہ میری رپورٹ کو بھی دفتری غلام گردشوں میں گم کرا دیتا، وہ اپنی معمولی سی غفلت کی مار کھا گیا، ایسے غیر محتاط لمحات UNGAURDED MOMENTS انسان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں، میں اپنی جگہ مطمئن تھا، مگر وہ یوں مار کھانے والا نہ تھا، ان چند دنوں میں وہ کوئی STRATEGY تیار کرتا رہا تھا۔

ایک دن دفتر پہنچا تو سیکرٹری صاحب کا چپراسی میرا منتظر تھا، مجھے بہت جلد بلایا گیا تھا۔

کیا چکر ہے؟ میں نے راستے میں اس سے دریافت کیا۔

"معلوم نشتہ" پٹھان چپراسی نے جواب دیا۔

سیکرٹری صاحب کا موڈ بدلا ہوا تھا، کرسی پہ بیٹھنے کی مہلت بھی نہ دی اور ایک کاغذ میرے ہاتھ میں تھما دیا، جسے پڑھ کر میرا رنگ فق ہو گیا اور زمیں میرے پاؤں تلے سے کھسک گئی۔ اختلاجِ قلب ہونے لگا، میری حالت دیکھ کر انہوں نے بیٹھنے کے لئے کہا۔

یہ سب کیا ہے؟

انہوں نے بڑے افسوس سے پوچھا

"سازش"!

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

مگر اس پر تمہارے عملے کے تقریباً سارے لوگوں نے دستخط کئے ہیں، ایسے لوگ بھی ہیں جو برسوں سے تمہارے ساتھ کام کر رہے ہیں، اور جن کی خدمات کی تم ہمیشہ تعریف کرتے رہتے ہو۔ ان میں سے بعض کو تم نے ترقیاں بھی دلوائی ہیں۔

میں کچھ نہ کہہ سکا، کہہ بھی کیا سکتا تھا؟

آپ اس وقت جائیں، ہم پھر کسی وقت بات کریں گے، آپ اس کا تحریری جواب تیار رکھیں۔

واپس آیا تو میرے رفیقانِ دفتر مجھے یوں گھور رہے تھے جیسے میں کسی سنگین جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے رنگوں ہاتھوں پکڑا گیا ہوں، ان میں سے کچھ ایسے چہرے بھی دکھائی دیے، جن پر ایک ہمدردانہ کرب تھا۔

میں نے اپنی کرسی پر اپنے آپ کو گرا دیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے زندہ درگور ہو گیا ہوں، میرے کمرے کی ہر شے گویا میرا تمسخر اڑا رہی تھی، میرے حواس مختل ہوئے جا رہے تھے ایک عجیب سی نیم دیوانگی کا عالم تھا، کبھی دھاڑیں مار کر رونے کو جی چاہتا، اور کبھی بے اختیار قہقہے لگانے کو۔

دفتر کا وقت ختم ہو گیا تھا، تمام لوگ چلے گئے تھے، میرے پاس کوئی بھی شخص کسی کام کے لئے نہیں آیا تھا، چپڑاسی دور ہی رہا تھا، یا الٰہی۔ میں سوچ رہا تھا، یہ کیا ہو گیا ہے؟ ایک دم سے سب کے سب لوگ نظریں بدل گئے ہیں، کیا میں واقعی مجرم ہوں؟

میں سر نہوڑائے بیٹھا تھا کہ، اختر کمرے میں داخل ہوا، دفتر بند ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے، اور وہ ان دو گھنٹوں میں دو دفعہ میرے گھر ہو آیا تھا، وہ بہت خوفزدہ سا نظر آ رہا تھا، اس نے جلدی جلدی یہ بتایا کہ درخواست پر زبردستی سب سے دستخط لیے گئے ہیں گھروں پر جا کر، جنہوں نے انکار کیا، ان کی کنپٹیوں پر ریوالور رکھے گئے۔ ناصر کے دونوں بھائی بھی اس کے ساتھ تھے۔

اختر نے کہا کہ باقی تفصیلات وہ رات کو گھر پر آ کے بتائے گا، اگر کہیں اسے ناصر نے یہاں دیکھ لیا تو اس کی خیر نہیں۔

کئی دوسرے رفیقوں نے اس بات کی بعد میں توثیق کر دی، مگر وہ لوگ اس درخواست کے خلاف زبانی یا تحریری کسی قسم کا بیان دینے کے لئے تیار نہ تھے، ناصر نے انہیں کئی طرح سے ڈرایا دھمکایا ہوا تھا، اور یہ لوگ مفلوک الحال بے سہارا اور بے وسیلہ تھے ان کا خوف جائز تھا۔

میں نے من و عن پوری تفصیلات سیکرٹری صاحب کو سنا دیں "ایسے شخص کو یہاں کیسے رکھا گیا ہے" انہوں نے پوچھا، اور مجھے حوصلہ دے کر رخصت کیا۔ میرا خیال تھا اب سیکرٹری صاحب اس کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھائیں گے اور بہت دل گذر جانے کے بعد بھی کچھ نہ ہوا، اس عرصے میں ویسے بھی حالات پُرسکون رہے ناصر نے دو مہینوں کی رخصت لے رکھی تھی، اسے مقابلے کا امتحان دینا تھا۔ قانون کا امتحان وہ پاس کر چکا تھا، چھٹی پر جانے سے پہلے اس نے اپنی سالانہ رپورٹ میں "خراب ریمارکس" کے حذف کئے جانے کے سلسلہ میں ایک درخواست دی تھی، یہ درخواست میرے توسط سے نہیں دی گئی تھی، بلکہ بالا بالا۔ میرے خلاف سخت جھوٹے الزامات عائد کئے گئے تھے، اس کی یہ درخواست مختلف دفتری مراحل طے کرتے کرتے میرے پاس comments کے لئے پہنچ گئی تھی۔

امتحان سے فارغ ہو کر وہ دوبارہ پر ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا تھا وہ باخبر تھا کہ آج کل میں میں اپنے comments لکھنے والا ہوں مگر اس ضمن میں وہ مجھے نہیں ملا۔ اس لئے کہ اب وہ دوسری راہ پر چل نکلا تھا۔ محاذ آرائی کو چھوڑ کے "ہاؤ ڈاؤن وار" کا اعلان کر چکا تھا، اس کی یہ کھلی جنگ ایک نہتے اور کمزور شخص کے ساتھ تھی جس کے پاس کوئی قوت نہ تھی، نہ خاندانی ثروت، نہ سیاسی اثر و رسوخ اور نہ سرکاری اعانت، ایک عملے کے لوگ جن سے اولاد کی طرح محبت کی تھی، وہ بھی مددگار نہ بن سکتے تھے۔ اسی لئے کہ ناصر کے ہتھکنڈوں سے دہشت زدہ تھے۔

پہلے صدمے سے ابھی پورے طور پر سنبھلنے نہ پایا تھا کہ ایک درخواست میرے دفتر میں متعلقہ وزیر کے سخت احکامات کے ساتھ پہنچی! اس درخواست میں میرے خلاف ایک کیس میں پانچ ہزار روپے رشوت کے طور پر لینے کا الزام تھا، اس کیس کا تعلق سی سیٹ سے تھا جس کے لئے ناصر اب تک پریشان تھا، یہ درخواست ایک ٹھیکیدار کی طرف سے دی گئی تھی۔ یہ ٹھیکیدار وہی تھا، جو ناصر کا بے حد قریبی دوست تھا، اور جس کے لئے ناصر اکثر متعلقہ کلرک سے سفارشیں کیا کرتا تھا، اس ٹھیکیدار نے ناصر کے بیشتر اخراجات

اپنے ذمے لے رکھے تھے۔ یہ ضرب پہلی ضرب سے زیادہ کاری تھی پہلی کارروائی نے مجھے ذہنی دھکا پہنچایا تھا میرا قلبی سکون برباد کیا تھا اور موجودہ فعل نے مجھے زمانے بھر میں ذلیل و رسوا بھی کر دیا تھا، اس لئے کہ یہ خبر اخباروں میں بھی چھپ گئی تھی۔

مجھے میری بیوی نے باز رکھنا چاہا، دوستوں نے بھی سمجھایا، میرے حلقے کے چند ایک مخلص رفیقوں نے مجھے مشورہ دیا کہ اس کے بارے میں اب جو بھی comments لکھنے والا ہوں، وہ اُس کے حق میں لکھوں، ورنہ انہوں نے بتایا کہ اس نے قسم کھا رکھی ہے، کہ وہ میرا جینا محال کر دے گا، مجھے صفحۂ ہستی سے مٹا دے گا، میں نے بھی بہت سوچا، مگر اس کے حق میں اپنی رائے نہ بدل سکا۔

مگر پھر ایک دم خاموشی چھا گئی، وہ دفتر میں تھوڑی دیر کے لئے آتا، casually تھوڑا بہت کام کرتا، اور چلا جاتا۔ اس کی مصروفیات اپنے کیریئر کے لئے مجتمع ہو رہی تھیں اور اس عرصے میں بھی وہ میرے خیال سے غافل نہیں رہا، اپنے نئے کیریئر کے لئے اس سالانہ رپورٹ کا ٹھیک ہونا اس کے لئے نہایت اہم اور از بس ضروری تھا لہٰذا اس نے فوجداری عدالت میں میرے خلاف ایک مقدمہ دائر کر دیا، تھا، جس کی ضمانت کے لئے مجھے کچہریوں کے چکر کاٹنے پڑے تھے، میری بیوی کہتی تھی جانے اس کے انتقام کی آگ کب ختم ہوگی، اور میں سوچتا تھا، کیسا انتقام، کس سے انتقام، کس جرم کا انتقام؟

مقابلے کے امتحان میں بھی وہ کامیاب ہو گیا، اُس نے دوسری پوزیشن حاصل کی تھی، جسے حاصل کرنے کے لئے اس نے کیا کچھ نہ کیا تھا، میں اس کی قابلیت کے بارے میں جانتا تھا، اس میں اتنی اہلیت اور استعداد ہرگز نہ تھی۔ مگر اس کا مقابلہ قابلیت کا مقابلہ نہ تھا، اور وہ کامیاب ہوا تھا، کیسے نہ ہوتا! امتحانی مرکز میں مددگار اس کے ساتھ باقاعدگی سے جاتے تھے۔ پھر وہ ممتحن کے پیچھے بھاگتا رہا، کسی کو سفارش پہنچائی۔ باپ کو ساتھ لے کر اسے ایک مفلوک الحال شخص ظاہر کر کے کہیں منت سماجت کی، کسی جگہ رشوت دی اور کسی کو ڈرایا دھمکایا۔

بہرحال اس کا سفینہ کنارے سے لگ چکا ہے جب کہ میرا سفینہ بیچ منجدھار ہے، اس نے جاتے وقت کہا تھا کہ وہ ساری زندگی مجھے آرام و سکون سے نہ بیٹھنے دے گا، سو اب جانے کتنا عرصہ مجھے کچہریوں کی خاک چھاننا ہوگی۔ کامیابی کے بعد کئی دنوں تک وہ میرا تمسخر اڑاتا رہا تھا، اور اس کے خلاف لکھی گئی رپورٹ جانے کہاں گم ہو چکی تھی۔

وہ ایک اہم مقام پر تعینات ہے ملازمت کرتے ہوئے اسے اب چار سال ہو چکے ہیں اور میں اسی سال ریٹائر ہو رہا ہوں۔ دن رات لوگ اسے سلام کرتے ہیں، اور اس کی انا کو تسکین ملتی ہے اس کی ساری خواہشات ایک ایک کر کے پوری ہو رہی تھیں۔ خستہ حال موٹر کی بجائے اب اس کے پاس ایک نئی قیمتی موٹر کار ہے، اور میں ابھی تک سہراب سائیکل پر دفتر آتا جاتا ہوں، وہ سترھویں گریڈ کا افسر ہے اور میں انیسویں گریڈ میں کام کر رہا ہوں۔ اس کی ایک شاندار کوٹھی لاہور میں زیر تعمیر ہے۔ اور میں چند مہینوں بعد سرکاری رہائش گاہ چھوڑ کر جانے کہاں کرایے کا مکان ڈھونڈتا پھروں گا۔؟

میرا خیال تھا یہ کہانی مکمل ہو جاتی تو اسے لکھتا میرے ادیب دوست کہتے ہیں کہ اوّل تو یہ کہانی ہی نہیں ہے اور اگر مان ہی لیا جائے کہ یہ کہانی ہے تو پھر مکمل بھی ہے۔

مگر میرا اب بھی یہ خیال ہے کہ یہ کہانی ادھوری ہے۔ کب مکمل ہوگی؟

شاید۔

مگر کون جانے —— مکمل ہوگی بھی یا نہیں!

مارچ ۱۹۶۹ء

# کپاس کہانی

مسعود اشعر

"کل رات بھر جاگتی رہی؟"

"پیٹ خراب ہوگا؟"

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔ میرے اس بیہودہ مذاق کا اسے جواب دینا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ خاموش رہی اور نظریں نیچی کئے چائے بناتی رہی۔ شاید اُسے بُرا لگا تھا اس کے چہرے سے کچھ ایسا ہی ظاہر ہو رہا تھا۔ میرے مذاق پر اس نے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ چائے کے جس کپ میں وہ چمچہ ہلا رہی تھی اس میں وہ اتنے غور سے دیکھ رہی تھی جیسے چائے کے پار اسے کچھ نظر آرہا ہو۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اس نے تو ایک بار بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا جب سے میں آیا تھا وہ مسلسل کسی اور جانب ہی دیکھ رہی تھی میں جو قریب قریب روزانہ اس سے ملا کرتا تھا کبھی اس کے دفتر میں، کبھی اس کے یا اپنے گھر، اس روز پورے سولہ دن بعد اس سے مل رہا تھا۔

"میں سیریس ہوں۔" اس نے چائے کا کپ میری طرف بڑھاتے ہوئے اتنی خشک اور سوکھی سنجیدگی کے ساتھ کہا کہ میں ڈر گیا۔

"اوہ... آئی ایم سوری" میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کڑوی کسیلی سنجیدگی پر کس ردِ عمل کا اظہار کروں۔

"جب سے تم گئے ہو، میں برابر سوچ رہی ہوں۔" اس نے اپنی نظریں اور بھی نیچی کر کے کہنا شروع کیا۔ "کل رات اچانک احساس ہوا کہ میں تو تم سے...... میرا مطلب ہے، میں تمہیں —" وہ ٹھہری، میری طرف ایک نظر ڈالی اور جلدی سے کہہ ڈالا "I mean, I love you"

"that's better" میرے منہ سے بے اختیار یونہی نکل گیا شاید میں سنجیدگی کے اس حصار کو توڑنا چاہتا تھا کیونکہ اگر میں یہ نہ کہتا تو گلا پھاڑ کر ہنسنا شروع کر دیتا لیکن میرا ہنسنا شاید اس کا موڈ اور بھی خراب کر دیتا۔ اس لئے یہ بے ساختہ جملہ ہی اس وقت موزوں معلوم ہوا۔ اسے کیا ہو گیا تھا!؟ — "دیکھو نا۔ اگر یہی بات تم اُردو میں کہتیں تو خاصی گھٹیا اور بازاری سی معلوم ہوتی۔ "مجھے تم سے محبت ہے" کیسی گندی اور غلیظ بات لگتی ہے۔ انگریزی نے اس کے معنی ہی بدل دیئے۔ اسے عزت اور وقعت مل گئی۔ اگر تم پہلے ہی انگریزی کا سہارا لے لیتیں تو تمہیں یوں اٹک اٹک کر اور ہکلا ہکلا کر یہ مذاق نہ کرنا پڑتا۔"

"یہ مذاق نہیں ہے، میں سیریس ہوں dammit" اس مرتبہ اس زور سے اس نے مجھے ڈانٹا کہ میں واقعی ہل گیا۔ مگر میں اسے سیریس نہیں دیکھ سکتا تھا اس لئے میں نے بھی اسی زور سے کہا

"میں بھی سیریس ہوں"

دراصل ایسے اعلان میں پہلے بھی سن چکا تھا — اپنے بارے میں نہیں، دوسروں کے بارے میں اس لئے میں جانتا تھا کہ یہ سب وقتی جوش ہے جس طرح دوسروں کے بارے میں اعلان جلد ہی اپنی شدت کھو دیتے ہیں اسی طرح یہ اعلان بھی اپنی موت آپ ہی مر جائے گا۔ مگر اس وقت خواہ مخواہ اس کا اتنا سنجیدہ ہونا مجھے اچھا نہیں لگا

اس لئے میں نے محض بات کو طول دینے کے لئے اپنا بیان جاری رکھا —

"گالی اپنی زبان میں ہی گالی محسوس ہوتی ہے۔ دوسری زبان میں جو چاہے کہہ لو — وہ شدت اور وہ کراہت ہی محسوس نہیں ہوتی مثلاً ہمارے ایک دوست ہیں میں نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ غصّے میں کھول رہی تھی، ابھی تک ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی، شاید کچھ کہنا چاہتی تھی اس لئے میں نے اپنی آواز زیادہ بلند کر لی — کسی نے آج تک ان صاحب کی زبان سے اُردو یا پنجابی میں کوئی گندی بات نہیں سنی۔ لیکن انگریزی میں نہایت بے تکلفی کے ساتھ ایسی ایسی چیزوں کے نام لے دیتے ہیں کہ اگر ان کی اپنی زبان میں اس کا ترجمہ کر دیا جائے تو وہ سن کر بے ہوش ہو جائیں۔"

"میری بات سنو۔" اس نے طیش میں آکر سامنے رکھی مونگ پھلیوں کی طشتری میرے اوپر پھینک دی۔ "یقین نہیں آرہا ہے میری بات کا؟" شــــــ

وہ سرخ ہو رہی تھی ــ

"یقین آرہا ہے جبھی تو آرام سے بیٹھا ہوں یقین نہ آتا تو اب تک اُچھل کر چھت سے اُلٹا لٹک رہا ہوتا۔"

"نہ کرو یقین۔" اب وہ واقعی افسردہ ہو گئی شاید غصہ اسے بیکار لگا تھا وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی باہر لان میں آتی سردیوں کی نرم گرم دھوپ پھیلی تھی اور ایک تنہا مور گھاس پر چونچیں مارتا پھر رہا تھا۔

"کپاس کہانی سُنی ہے تم نے؟" میں نے موقع سے فائدہ اُٹھایا۔ کمبخت موڈ ہی ٹھیک نہیں ہو رہا تھا اس کا۔

"کپاس کہانی؟" یہ بے ساختہ ردِ عمل تھا اس کا۔

"ہاں کپاس کہانی۔"

"کیسی کپاس کہانی؟؟" اس نے ماتھے پر پھر بل ڈالے۔

"کیسی کپاس کہانی، کیسی کپاس کہانی کیا کرتی ہو، کپاس کہانی سنو گی؟" میں نے اور چھیڑا۔

"تم کبھی سیریس نہیں ہو سکتے۔ بکتے رہو۔" یہ کہہ کر وہ جانے لگی۔ مگر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔

"بات تو سنو۔" وہ بیٹھ گئی مگر مجبوراً۔ "بچپن میں ہم یہ کھیل کھیلا کرتے تھے۔ جب کسی کو چڑانا ہوتا تو اس سے کہتے کپاس کہانی سنو گے؟ وہ کہتا۔ سناؤ۔ تو ہم کہتے سناؤ، سناؤ کیا کرتے ہو، کپاس کہانی سنو گے، وہ کہتا۔ ہم نہیں سُنتے، تو ہم کہتے۔ ہم نہیں سُنتے۔ ہم نہیں سُنتے کیا کرتے ہو، کپاس کہانی سنو گے۔ اور یہ سلسلہ اتنا لمبا چلتا کہ سننے والا بچہ رونے لگتا یا طیش میں آکر لاتوں اور گھونسوں سے سنانے والے پر پل پڑتا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب یہ ہے کہ ابھی تو تم نے صرف مونگ پھلیوں کی پلیٹ ماری ہے۔ کپاس کہانی سن کر شاید تم لاتوں اور گھونسوں پر بھی اتر آؤ ــ اور شاید میں یہی چاہتا ہوں!" غیر شعوری طور پر "you are impossible" اس نے یہ بات غصے میں کہی تھی لیکن اس میں اتنی شدت نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اب وہ کچھ سوچ رہی ہے۔ کوئی اور ہی بات اب وہ میری طرف دیکھ رہی تھی لیکن جیسے وہ میرے چہرے پر کچھ تلاش کر رہی ہو۔ جیسے وہ اپنے کسی خیال کی تصدیق یا تردید چاہتی ہو۔

اس کی یہ خاموشی اور اس کی نظریں مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھیں اس لئے میں نے پھر بولنا شروع کر دیا۔ اب میں اس سے نظریں چرا رہا تھا اور کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا تھا اس سے پیٹھ موڑ کر ــ "تمہیں حیرت ہوگی بچپن کی یہ کہانی اب ایک زمانے بعد گارسیا مارکیز کی ایک کہانی پڑھتے ہوئے یاد آئی۔ میں تو حیران رہ گیا۔ لاطینی امریکہ میں بھی کپاس کہانی سنائی جاتی ہے بالکل ہماری طرح۔ وہ لوگ اسے capon story کہتے ہیں۔ پتہ نہیں یہ کیپون ہے یا کاپون۔ بہرحال ہے کپاس کہانی۔ ہو سکتا ہے یہ اسپین کی روایت ہو؛ اور یہ بھی پتہ نہیں کہ اسپین سے ہمارے ہاں آئی یا ہمارے ہاں سے اسپین گئی۔ مجھے تو مارکیز نے دوبارہ یاد دلائی......"

اب میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ اندر جا چکی تھی۔ خفتے میں، طیش میں؟ یا صدمے میں؟ میں اپنا خوف مٹانے اور کسی کشمکش سے بچنے کے لئے اپنے بیان میں ایسا کھویا تھا کہ اس کے اندر جانے کا پتہ ہی نہیں چلا۔

میں پریشان ہو اٹھا۔ مگر اس کے اعلان سے نہیں اس کی افسردگی اور اس کی شدید سنجیدگی سے ــ اب تک وہ دوسروں کے لئے اور دوسروں کی وجہ سے پریشان ہوا کرتی تھی اور اپنی ساری پریشانیاں میری جھولی میں ڈال دیتی تھی۔ مجھے وہ ایسا اندھا کنواں سمجھتی تھی جس میں جو چاہو اور جب چاہو ڈال دو، کسی کو کچھ نظر ہی نہیں آئے گا۔ اور میں نے اپنا یہ رول پوری فراخدلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کر رکھا تھا۔ اب یہ پہلی بار تھی کہ اس نے مجھے پریشان کرنا چاہا تھا اور میری وجہ سے خود پریشان ہونے کی کوشش کی تھی۔

کوشش میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اس کے بارے میں یقین اور وثوق کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کب وہ کیا کہہ دے؟ کیا اعلان کر دے؟ یا کیا کر گزرے؟ کوئی نہیں جانتا تھا۔ بلکہ شاید وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔

اس سے میری ملاقات بھی عجیب انداز میں ہوئی تھی۔ بیرون ملک جانے والے ایک گروپ میں میرے ساتھ وہ بھی شامل تھی۔ اتفاق سے جہاز میں اسے میرے برابر والی سیٹ ملی۔ اگر راستے کے اسٹاپ اوور بھی شامل کر لئے جائیں تو قریب قریب چوبیس گھنٹے کی فلائٹ تھی۔ ائیر پورٹ پر ہی رسمی تعارف ہو چکا تھا۔ ساتھ ساتھ بیٹھے تو باتیں بھی شروع ہو گئیں

یونہی اِدھر اُدھر کی باتیں کوئی خاص بات نہیں۔ وہ ایک ٹریولنگ ایجنسی میں تھی اور ہماری طرح ائیرلائنز کی مہمان خاص کے طور پر جا رہی تھی۔ دنیا دیکھ چکی تھی۔ انگلینڈ اور کینیڈا میں خاصہ وقت گزارا تھا چنانچہ مختلف ملکوں اور مختلف دنیاؤں کی باتیں ہوتی رہیں۔ مگر ایک فاصلے کے ساتھ۔ وہی فاصلہ جو نئے ملنے والوں کے درمیان ہوتا ہے۔

ہم DC-10 کی درمیان والی اگلی نشستوں پر تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد کہنے لگی "اگر آپ بُرا نہ مانیں تو دس پندرہ منٹ کے لئے جہاز کی سیر کر آئیں میں تھوڑی دیر لیٹنا چاہتی ہوں۔ دوپہر کو سونے کی بُری عادت ہے۔"

"گویا آپ قیلولہ فرمائیں گی؟" میں نے مذاق کیا اور کھڑا ہو گیا

"جی میں قیلولہ فرماؤں گی۔" اس نے میرے انداز کی نقل کی اور دونوں نشستوں کے درمیان کا بازو اوپر اٹھا کر لیٹ گئی۔ جُوتے وہ پہلے ہی اتار چکی تھی۔

اتنے لمبے چوڑے جہاز میں دس پندرہ منٹ گھوم پھر کر گزارنا کونسا مشکل کام ہے جبکہ اپنے جاننے والے بھی کئی ہوں۔ چنانچہ میں دس پندرہ منٹ کے بجائے پورے پون گھنٹے لوگوں سے گپیں مار کر لوٹا تو وہ بیٹھی اپنے دائیں ہاتھ والے امریکی سے باتیں کر رہی تھی۔

میرے ساتھ یہ پہلی بے تکلفی تھی۔ لیکن یہ بے تکلفی تو کسی کے ساتھ بھی کی جا سکتی تھی۔ بھلا کون رد کرتا ایک خوش شکل اور بے تکلف خاتون کی درخواست۔ لیکن اصل بے تکلفی مجھے اس وقت محسوس ہوئی جب منزل پر پہنچنے کے بعد دوسری صبح ہم سب ایک چارٹرڈ بس پر شہر کی سیر کو نکلے۔

میں پہلے ہی بس میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بعد میں آئی اور سب سے ہیلو ہیلو کرتی میرے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

"جنم جنم کا ساتھ ہو گیا ہے اپنا تو۔" اس نے بیٹھتے ہی کہا۔

میں نے ذرا سا پیچھے ہٹ کر اس کے صاف شفاف چہرے کو دیکھا۔ "مطلب سمجھتی ہیں آپ اس کا؟"

"کیوں؟ کیا بہت بُری بات ہے یہ؟ میں نے تو انڈین فلموں میں سنا ہے۔"

میں ہنس پڑا۔ پھر میں نے مطلب بتایا تو وہ بھی خوب ہنسی پھر تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بڑی رازداری کے ساتھ کہنے لگی: "پلیز، آپ میری ایک بات مانیں گے؟"

"جی فرمائیے۔" میں نے شوں لڑی دکھائی۔

"آپ میرے ساتھ رہیے گا پلیز۔"

"جنم جنم؟" میں نے اسے چھیڑا۔

اس نے کھلے دل سے قہقہہ لگایا۔ "مذاق کی بات نہیں میں سچ کہہ رہی ہوں۔ آپ ان لوگوں کو نہیں جانتے۔ میں بہت سفر کر چکی ہوں ان لوگوں کے ساتھ۔ سفر میں ہر آدمی رومینٹک ہو جاتا ہے۔ کوئی عورت ذرا بے تکلفی کے ساتھ بول لے تو اسّی نوے سال کے بزرگ بھی سمجھنے لگتے ہیں کہ عاشق ہو گئی ہے سالی۔"

"یہ آپ نے اچھا کہا۔"

"ہاں اور کیا۔ آپ لوگ تمام لڑکیوں کو اپنی سالی ہی تو سمجھتے ہیں نا۔"

"آپ لوگوں سے کیا مراد ہے؟" میں نے نقلی غصہ دکھایا۔

"ارے یہی سب لوگ۔"

"اور لوگ سمجھتے ہوں گے۔ ہمارے ہاں تو کہاوت ہے۔ جتنے کالے سر والے سب اپنے باپ کے سالے۔"

اس مرتبہ اس نے اس زور کا قہقہہ لگایا کہ ساری بس ہماری طرف متوجہ ہو گئی حتیٰ کہ موٹی گردن والے نیگرو ڈرائیور نے بھی سامنے آئینے سے ہمیں دیکھنے کی کوشش کی۔

"کسی سے ڈر لگتا ہے؟" جب اس کا قہقہہ تھما تو میں نے سوال کیا۔

"یہی سمجھ لیجئے۔"

"اچھا؟! ..." میں نے شرارت سے اس کی آنکھوں میں جھانکا "مجھ سے ڈر نہیں لگتا؟!"

"آپ سے؟" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور ہنسی

"آپ میری مردانگی کی توہین کر رہی ہیں؟" میں نے بات بڑھانے کے لئے چھیڑا۔

"توہین، مائی فٹ ـ میں تو آپ کی مردان . . . . کیا کہا تھا آپ نے؟"

"مردانگی۔"

"ہاں وہی۔ میں تو آپ کی مردانگی کا سہارا لے رہی ہوں۔"

"بہرحال آپ میری توہین کر رہی ہیں" مجھے اور کوئی بات نہیں سوجھ رہی تھی۔

"اچھا چلئے توہین ہی سہی۔ مگر پلیز، میرے ساتھ رہیئے۔"

بعد میں معلوم ہوا یعنی اس نے ہی بتایا کہ وہ ایک بڑے افسر سے ڈرتی تھی جو اس گروپ میں شامل تھے اور موقع بے موقع اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ ان افسر کو ناراض بھی نہیں کر سکتی تھی کہ ان سے بڑا بزنس ملتا تھا۔

اس سفر میں رومینٹک ہونے کے بہت سے موقعے آئے لیکن کبھی وہ طرح دے گئی کبھی میں ٹال گیا۔ یا شاید ایسے موقع آئے ہی نہ ہوں، محض میرا خیال ہی ہو کیونکہ اس کے بعد ہمارے تعلقات بڑھتے ہی چلے گئے۔

واپسی پر بھی اس سے ملاقاتیں ہوتی رہیں بلکہ تعلقات میں گہرائی اس کے بعد ہی آئی۔ اس کا دفتر میرے راستے میں تھا۔ آتے جاتے جب جی چاہتا پہنچ جاتا، گرم گرم کافی پیتا اور چٹ پٹی باتیں سنتا پھر ہم دونوں مل کر لوگوں کی چغلیاں کھانے لگے غیبت کرنے لگے اور ایسی باتیں ایک دوسرے کو بتانے لگے جو صرف بہت زیادہ قریبی تعلقات پر ہی بتائی جاتی ہیں۔ لیکن بہت زیادہ قربت سے تو وہ گھبراتی تھی!؟ شروع شروع میں، میں نے بھی بہت زیادہ قریب جانے کی کوشش کی تھی لیکن بہت جلد پتہ چل گیا تھا لیکن بہرحال اس کی کافی اور اس کی باتیں مجھے عزیز تھیں۔

شاید اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کے ساتھ کس سطح کے تعلقات رکھے، اسی لئے وہ پریشان رہتی تھی کبھی کبھی تو وہ اتنی پریشان ہو جاتی کہ رونے لگتی، سچ مچ آنسوؤں سے رونے لگتی۔ جب اس نے دوسروں کے لئے میرے سامنے رونا شروع کیا تو مجھے احساس ہوا کہ دراصل میں نے اسے سر رکھ کر رونے کے لئے کندھا فراہم کیا ہے۔ وہ میرے کندھے پر سر رکھ کر روتی ہے اور اپنے دل کی بھڑاس نکالتی ہے۔ جس فراخدلی سے وہ قہقہے لگاتی اسی کھلے دل سے وہ روتی بھی۔ بالکل فضول اور بیکار سی باتوں پر رو پڑتی اور آنسا روتی کہ بور کر دیتی۔

ایک دن اس بات پر رو رہی تھی کہ سلمان کسی کلچرل شو میں اسے ساتھ لئے بغیر چلا گیا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی وہ ایسی حرکتیں کر چکا تھا۔ اور اسے خوب پتہ تھا بلکہ یہ بھی پتہ تھا کہ وہ کس کے ساتھ گیا ہے۔ ہاں سلمان اس کا بہت پرانا اور بہت گہرا دوست تھا مجھ سے پہلے کا اور مجھ سے بھی زیادہ قریب لیکن سلمان نے ہی مجھے بتایا تھا کہ اس سے پہلے کوئی اور بھی ایسا ہی قریب رہا تھا۔

سلمان اور دوسرے دوستوں کی طرح اس کے گھر میں بھی مجھے قبول کر لیا گیا تھا اس کے گھر کا ماحول بھی اس کی طرح بے تکلف اور آزادانہ تھا۔ اس کی والدہ، اس کے بھائی، اس کی بھابیاں سب امریکہ اور یورپ کی سیریں کر چکی تھیں اور کسی قسم کے توہمات کا شکار نہیں تھیں۔ اس کے والد جن کا انتقال ہو چکا تھا۔ یورپ میں ہی رہے تھے، والدہ کی زیادہ عمر بھی وہیں گزری تھی۔ اس گھر میں اس کے دوستوں کا استقبال اس طرح کیا جاتا جیسے وہ پورے گھر کے دوست ہوں۔ میری سب سے دوستی ہو گئی تھی۔ اس کی ماں تو مجھ سے یہ بھی پوچھ چکی تھیں کہ آخر ان کی بیٹی شادی کیوں نہیں کرتی، مجھے حیرت بھی ہوئی تھی کہ ایسا سوال مجھ سے کیوں کیا جا رہا ہے، لیکن شاید یہ سوال اس کے تمام دوستوں سے کیا گیا تھا کیونکہ اس کے بعد پھر یہ سوال نہیں دہرایا گیا۔ البتہ خود اس نے مجھ سے ایک دن سوال کر لیا۔

خدا جانے کیا بات ہو رہی تھی کہ اس نے اچانک پوچھا "تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟"

"تم سے جو ملاقات نہیں ہوئی تھی" میں نے مذاق کیا۔

"مذاق کی بات نہیں، سچ بتاؤ کیا بات تھی؟"

"یہی سوال میں تم سے بھی کر سکتا ہوں، تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ کہ تم مجھ سے چھوٹی ہو۔"

"میری تو جانے دو" اس نے 'میری' پر بہت زیادہ زور دیا۔ "ابھی تو اب تک سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کس اُلو کے پٹھے سے شادی کروں"

"یعنی ہمیشہ ہی اتنے بہت سے اُلو کے پٹھے تمہارے امیدوار رہے ہیں؟"

"ہاں ہمیشہ ہی" اس نے ہنسنے کی کوشش کی مگر اس کے ہونٹوں نے ہنسی کا ساتھ نہیں دیا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس حقیر فقیر کا کوئی چانس نہیں ہے۔ ہم تو ہر روز نئے سے نیا سوٹ پہن کر۔ نئی سے نئی خوشبو لگا کر اور اُلٹے سیدھے بال بنا کر آپ کے در پر حاضر ہوتے ہیں کہ شاید کبھی اس پریشاں یا افتادہ بندے پر بھی آپ کی نظر پڑ جائے......؟"

"اُفوہ، اتنی موٹی اُردو نہ بولو، یہ بھی بتاؤ تم نے شادی کیوں نہیں کی؟ پینتیس سال کے تو ہو گئے ہو تم؟ مجھ سے پورے تین سال بڑے ہو۔"

"ہاں، صرف تین سال بڑا ہوں تم سے۔" "نہ جانے کیوں میں بھی سنجیدہ سا ہو گیا۔ "اصل میں مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا کہ کب میں تیس کا ہوا اور کب پینتیس سال کا ہو گیا۔ یہی سوچتا رہا کہ ذرا ٹھہر کے شادی کریں گے۔"

"میرے ساتھ کچھ اور ہوا۔ جب تک یورپ میں رہی ماں باپ کی ہر پسند سے انکار کرتی رہی۔ یہاں آئی تو پہلے بھائیوں کا کوئی رشتہ پسند نہیں آیا مجھے۔ اب میں......" وہ خاموش ہو گئی۔

"اب تمہیں کوئی پسند نہیں آتا۔" میں نے اس کا جملہ پورا کیا۔

اس نے فوراً میری بات کا جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر سوچتی رہی پھر ایسے بولی جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی ہو۔ "ہاں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا......"

اب مجھے اس پر غصہ آیا۔ اس نے یہ کیا پاکھنڈ بنا رکھا ہے۔ اتنے دوست ہیں اس کے اور اتنے قریبی دوست۔ ان میں سے کئی ایک کے بارے میں ہر دوسرے دن افواہ بھی اڑتی ہے اب اس نے شادی کی۔ اب کی اور پھر میرے ساتھ وہ کیا ڈرامہ کھیل رہی ہے؟ خیر، مجھے کیا، میری بلا سے۔ میں کون سا سیریس ہوں اس کے ساتھ...!!

اس واقعہ کے تیسرے ہی دن اس کا فون آیا کہ فوراً آجاؤ۔

"تمہیں معلوم ہے سلمان کیا کر رہا ہے؟" اس نے میرے بیٹھنے سے پہلے ہی بات شروع کر دی۔

"کیا کر رہا ہے؟" میں حیران ہوا کہ انہیں سلمان کے بارے میں بات کرنے مجھے اچانک بلایا ہے۔ سلمان کے متعلق تو کسی وقت بھی بات کی جا سکتی تھی۔

"آج کل ہر شام وہ اس چڑیل کے گھر گزارتا ہے۔" وہ غصے میں سرخ ہو رہی تھی۔

"یہ لفظ تم نے کہاں سے سیکھا، چڑیل؟" میں نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے بات کا رخ بدلا۔ "اور وہ چڑیل تو تمہاری پیاری سہیلی ہے۔"

"پیاری سہیلی، مائی فٹ۔" اس نے دانت پیسے۔

"اب تم جو چاہو کہو، اس میں بھی قصور تمہارا ہی ہے۔"

"میرا کیا قصور ہے؟"

"تم نے ہی ان دونوں کو اتنا قریب آنے کا موقع دیا بلکہ تم نے ہی یہ سب چلایا تھا کہ......؟"

"ہاں ہاں، میرا ہی قصور ہے سارا۔" اس نے جھلا کر میری بات کاٹی۔ "مگر سلمان بھی تو اتنا DEMANDING ہے۔"

"کیا DEMANDING ہے وہ؟ تم سے شادی کرنا چاہتا تھا نا؟ اور تم نے اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے اس چڑیل کے ساتھ اسے الجھا دیا۔ اب روتی کیوں ہو؟"

"سلمان بڑا کمینہ ہے، گھٹیا انسان ہے۔ اُلو کا پٹھا ہے" وہ بولے گئی۔ اس کے پاس میری بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ آہستہ آہستہ رو رہی تھی۔

میں نے بھی اسے رونے دیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ جب خوب رو چکی تو بولی۔ "تم اسے سمجھا نہیں سکتے؟ وہ ایک گھر برباد کر رہا ہے۔ اس چڑیل کا ہسبنڈ ہے۔ دو بچے ہیں" یہ بات اس نے اتنی معصومیت اور اتنے بھولپن سے کہی تھی کہ مجھے ہنسی آگئی۔ مگر جلدی سے میں نے اپنا سر جھکا لیا۔ اس نے دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی۔ لیکن اس کا رونا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ پھر اسے یہ احساس تو ہونا چاہیئے کہ جو خطرناک کھیل وہ کھیلتی ہے اس میں چوٹ تو لگتی ہی ہے۔ اس لئے میں نے جی کڑا کر کے کہہ دیا۔

"تم خود بھی تو یہ ریس کھیلتی ہو۔ پہلے کسی کو اپنے قریب لاتی ہو جب وہ بہت زیادہ قربت چاہتا ہے تو فوراً اسے کسی چڑیل کے حوالے کر دیتی ہو۔ اور خود کسی اور کی طرف متوجہ ہو جاتی ہو۔ اور جب وہ بھی......"

"STOP IT" - اس نے چیخ کر کہا اور کھڑی ہو گئی۔ "نکل جاؤ یہاں سے۔ ابھی اسی وقت نکل جاؤ" وہ غصے میں بھری کھڑی تھی اور تھر تھر کانپ رہی تھی۔

اس وقت میرا وہاں سے چلا آنا ہی مناسب تھا اگر اس وقت میں ٹھہر جاتا تو شاید ہمارے تعلقات ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتے۔ وہ غصے میں تھی لیکن مجھے بالکل غصہ نہیں آرہا تھا۔ مجھے اس پر رحم آرہا تھا، ترس آرہا تھا اس پر۔

اس کا مسئلہ کیا تھا؟ وہ کس کشمکش کا شکار رہتی تھی؟ میں جانتا تھا خوب جانتا تھا۔ لیکن اس روز پہلی بار میں نے اسے آئینہ دکھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ ہر شخص کو

اپنے حصار میں لانا چاہتی تھی۔ لیکن ایک خاص فاصلے تک۔ جب بھی کوئی شخص وہ فاصلہ وہ حد پھلانگنے کی کوشش کرتا یکدم وہ پیچھے ہٹ جاتی۔ اگر بہت پسندیدہ آدمی ہوتا تو اسے کسی اور کے حوالے کر دیتی ورنہ آہستہ آہستہ اسے اپنے حصار سے باہر دھکیل دیتی۔ اور کون شخص تھا جو اس کے دائرے میں داخل ہونے کے بعد بہت زیادہ قربت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتا تھا؟! اس لئے اس کے ملنے والوں میں ہر شخص اپنی اپنی باری پر اس کے حصار کے باہر اندر ہوتا رہتا تھا۔ صرف میں شاید مستثنےٰ تھا؟ کیونکہ ابھی تک حصار سے باہر دھکیلے جانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ شائد میں نے بہت زیادہ قرب حاصل کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ ۔؟! شاید، شاید ۔

اس نے جن دوستوں کو اپنی دوسری سہیلیوں کے حوالے کیا تھا وہ بھی اس کے حصار سے باہر نہیں گئے تھے۔ انہوں نے دونوں طرف تعلق رکھا تھا لیکن سلمان ذرا آگے نکل گیا تھا۔

اس لئے وہ پریشان تھی۔

جب اس نے مجھے اپنے گھر سے نکالا تھا اس وقت اس کا غصہ اتنا شدید تھا کہ اگر سلمان سامنے ہوتا تو اس کا سر پھوڑ دیتی۔ ساتھ ہی میرا بھی لیکن میرا وہاں سے چلا آنا میرے حق میں فائدہ مند رہا۔

دوسری صبح گھر پر ہی فون آگیا۔ "کیا کر رہے ہو؟"

"جھک مار رہا ہوں۔" میں خوش تھا کہ اس کا موڈ ٹھیک ہے۔

"کب آ رہے ہو؟"

"کہاں؟"

"میرے آفس اور کہاں؟" "میں آفس جا رہا ہوں۔"

"ضروری ہے؟"

"بہت ضروری ہے۔"

غصے اور جھگڑے کا کوئی ذکر نہیں۔ میں خوب ہنسا خوب قہقہے لگائے۔ اکیلے ہی اکیلے آفس میں کوئی کام نہیں تھا۔ صرف وہ شرمندگی مٹانا چاہتی تھی۔ بہت شرمندہ تھی۔

سلمان اور اس چڑیل کا قصہ زیادہ دیر نہیں چلا وہ جلد ہی واپس آگیا کہ اسے واپس ہی آنا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے اس نے سجدۂ سہو کر لیا۔" ایک دن میں نے پوچھ لیا۔

"کیا؟" وہ سمجھی نہیں۔

"سلمان سیدھے راستے پر آگیا ہے؟" میں نے اپنی بات کا ترجمہ کیا۔

"ہونہہ ....." اس نے بُرا سا منہ بنایا۔ "کیا سمجھتا ہے وہ اپنے آپ کو؟!"

میں اس بات کی وضاحت تو چاہتا تھا لیکن خاموش رہا۔ شاید سلمان واپسی کا معاوضہ چاہتا تھا۔ خدا معلوم۔!!

اس شام معلوم ہوا کہ کرنل صاحب بھی واپس آگئے ہیں۔ کرنل صاحب، سلمان سے بھی پہلے کے دوست تھے۔ جب میں نے اس کے پاس جانا شروع کیا تو کرنل صاحب کیپٹن کے عہدہ پہ تھے لیکن لوگ انہیں اس وقت بھی کرنل صاحب ہی کہتے تھے۔ کرنل صاحب اس کے بہت قریب تھے۔ بلکہ کرنل صاحب کے ساتھ اس کی شادی کی افواہیں بھی اڑتی رہتی تھیں پھر نہ جانے کیا ہوا کرنل صاحب کسی اور کے ساتھ قربت کا کھیل کھیلنے لگے۔ شاید ان کے ساتھ بھی سلمان والا کھیل کھیلا گیا تھا۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ کرنل صاحب ٹرانسفر ہو کر دوسرے شہر چلے گئے۔ اور پھر ہم لوگ جیسے انہیں بھول گئے۔ اب کرنل صاحب واپس آگئے تھے۔ اسی طرح کنوارے اور اسی طرح گندے لطیفے سناتے۔ البتہ اب وہ اُس کی طرف کچھ زیادہ ہی سنجیدگی کے ساتھ توجہ دے رہے تھے۔ سلمان بھی کچھ کم سنجیدہ نہیں تھا۔ میں یہ سب تماشہ دیکھ رہا تھا۔

"کرنل صاحب کی انٹری تو پھر اسی زور شور سے ہوئی ہے۔" میں نے ایک دن یونہی کہہ دیا۔

"تمہیں کیسے معلوم؟" اس نے جیسے میرا سوال میرے منہ پہ دے مارا۔

"سامنے نظر آ رہا ہے۔"

"اپنی عینک کا نمبر بدلوا لو۔" میں اور بھی جھینپ گیا۔

یہ اس سے آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا۔ میں اس کی طرف جا ہی نہ سکا۔ کئی مرتبہ سوچا بھی کہ راستے میں ٹھہر کر ہیلو ہیلو کر لوں لیکن کوئی نہ کوئی کام کوئی

معروفیت ایسی آڑے آئی کہ میں شہر ہی نہ سکا۔ اس نے بھی فون نہیں کیا۔ یا کیا تو میں نہ مل سکا۔ پھر میرا کراچی کا پروگرام بن گیا۔ وہاں سے لوٹا تو اسلام آباد جانا پڑا۔ اسی بھاگ دوڑ میں پورے سولہ دن گزر گئے۔

اس روز بھی دوپہر کی خلاصی سے آیا تھا۔ رہا نہ گیا شام کو ہی اس کے گھر پہنچ گیا۔

وہ اکیلی تھی۔ بالکل اکیلی۔ والدہ اور دوسرے لوگ کہیں گئے ہوئے تھے۔ خاصہ سنجیدہ چہرہ بنایا ہوا تھا۔ یہ بھی نہیں پوچھا کہ میں اتنے دن کہاں رہا؟

"بیٹھو میں چائے لاتی ہوں" کہا اور اندر چلی گئی۔ بہت دیر اندر رہی۔ واپس آئی تو چائے کی ٹرے ساتھ تھی۔ میں نے بات کرنے کی کوشش کی تو کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے چائے بناتی رہی پھر اچانک ہی اعلان کر دیا۔

"کل رات بھر جاگتی رہی۔"

اس نے یہ اعلان کیا اور میں نے اسے کپاس کہانی سنائی کہ میں اس کی بات کا اعتبار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں ایسا اعلان سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں ایسے اعلان کی توقع ہی نہیں کر سکتا تھا۔

لیکن جب وہ طیش میں اٹھ کر اندر چلی گئی اور چائے کا گھونٹ میرے حلق میں اٹکا تو محسوس ہوا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔ وہ سنجیدہ ہے اور پہلی بار میرے بارے میں بھی سنجیدہ ہے۔

اور مجھے ڈر لگا۔ واقعی ڈر لگا۔ وہ کیا چاہتی ہے؟ شادی!! مجھ سے شادی؟!! دوستی تو ٹھیک ہے مگر شادی؟! اور اُس کے ساتھ؟؟!

اور اُس رات میں نے ویلیم ۱۰ کی دو گولیاں کھائیں پھر بھی جاگتا رہا اور اپنے آپ کو کپاس کہانی سناتا رہا۔

کپاس کہانی سنو گے؟ ہوں ہوں کیا کرتے ہو۔ کپاس کہانی سنو گے؟

اپریل ۸۸ء

چالیس سالہ مخزن

"جعفر وہ بات پوچھو جو تمہیں معلوم نہ ہو، جو جانتے ہو وہ کیوں پوچھتے ہو"

اس پر جعفر اقبال ہنس پڑا اور ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں یار عبداللہ مجھے معلوم تو ہے میں تو یونہی کہہ رہا تھا اور تم ناراض ہو گئے ہو"

"نہیں، مجھے تمہارے سوال نے نہیں، الفاظ نے نہیں بلکہ لہجے نے ناراض سا کر دیا ہے"

"کیوں لہجے میں کیا خاص بات تھی؟"

"وہی خاص بات تھی جو نہیں ہونی چاہیے تھی"

"اچھا اب ذرا کھل کر بیان کرو"

"لیکن یہ سب مجھے با دل نخواستہ کرنا پڑے گا"

"کیوں"

"عاقل را اشارہ کافی است"

عکس تحریر:۔ اعجاز احمد فاروقی

# کھارے پانی کا بندہ

منیر احمد شیخ

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب نانی اماں حج سے واپس لوٹ کر صحن میں پیڑھی پر جم کر بیٹھ جاتیں اور رسولِ پاکؐ کی گلیوں کے لمبے قصّے چھیڑ دیتیں۔ پھر جب کوئی صحن کے فرش پر پانی سے بھری ہوئی بالٹیاں دھڑا دھڑ اُنڈیلنے لگتا تو نانی اماں پانی کو اس طرح بے تحاشا بہتا ہوا دیکھ کر ہونٹوں پر انگلی رکھ کے بڑی دُکھ بھری آواز میں کہتیں۔ "پانی کو اس بے دردی سے نہ بہاؤ، عرب شریف میں تو لوگ قطرے قطرے کو ترستے ہیں۔ تمہیں پانی کی کیا قدر ہے۔"

نانی اماں کا یہ دُکھ سن کر میں گہری سوچ میں ڈوب جاتا اور اُٹھتے بیٹھتے یہ تجویز میرے ذہن میں بار بار آتی کہ کوئی ایسا سبب بنے کہ میں رسولِ پاکؐ کے وطن جا کر گھر گھر پانی کے نلکے لگا دوں اور میرے نبیؐ کی زبان بولنے والے اور ان کے جیتے جاگتے رج رج کے پانی پئیں اور اپنے صحنوں میں بیٹھ کر خوب نہائیں دھوئیں۔ میں ان دنوں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا اور نانی اماں کلکتے سے مدینے اونٹوں پر سوار ہو کر سفر کرتی تھیں ان کا قافلہ پندرہ دنوں کی طویل مسافت کے بعد ریتلے سمندروں میں سے گزرتا رسولِ پاکؐ کے در پر پہنچا۔ نانی اماں بتلاتیں کہ کئی مرتبہ رات کے اندھیرے میں ان کے قافلے پر قزاق حملہ آور ہوتے اور قافلے کا سب ساز و سامان لُوٹ کر لے جاتے اور زادِ راہ سے بھی محروم کر دیتے، مگر حُبِّ رسولؐ ان کے سفر کے عزم کو ذرا بھر کمزور نہ کرتی اور مدینے کی گلیوں کی دلکشی کسی طور کم نہ ہو پاتی۔

عرب شریف کے گھروں میں نلکے لگانے کی خواہش کا اظہار ایک روز میں نے اپنی ماں سے کیا تو اس نے بتایا کہ نبی پاکؐ کی سرزمین تو ریتلی ہے اور اس میں سے پانی نکالنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ دو دو سو فٹ زمین کھودیں تو بہت نیچے کہیں جا کر پانی کا گماں ہوتا ہے۔ انہیں دنوں میں نے خواب میں کئی مرتبہ دیکھا کہ میں ربڑ کی بڑی سی ٹیوب۔ میں ہوا بھر کے اس پہ بیٹھا سمندر کے راستے مدینے کی طرف جا رہا ہوں اور میرے ہاتھ میں نلکے والی مشین ہے۔ یہ خواب ایک مرتبہ نہیں، کئی مرتبہ دکھائی دیتا اور جب میری آنکھ کھلتی تو نہ رسولِ پاکؐ کی گلیاں ہوتیں اور نہ ہی میرے ہاتھوں میں نلکے والی مشین۔ مجھے اپنی بے بسی پر بہت رونا آتا۔ مجھے خدا پہ سخت غصّہ آتا کہ وہ اس پاک سرزمین پر کیوں مینہ نہیں برساتا۔ خدا کو اتنی سائنس بھی نہیں آتی کہ وہ وہاں مینہ برسا سکے؟

اور اُنہی دنوں غلام حسین پنڈ جنڈیالے باغ والے جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں میں نے عالم لوہار سے جوڑی کی سنگت میں مرزا صاحباں سُنی اور گاؤں کے مولوی صاحب کا وعظ سُنا۔ جمعہ کی نماز سے پہلے ہم نے مسجد میں کھوئی میں سے بوکے بھر بھر کے سقاوے پانی سے لبالب بھر دیئے۔ پانی کا بوکا نکالنے کے بعد ہمیں لگتا کہ ہر بوکے کے ساتھ ہمیں جنت میں ایک مرلہ زمین الاٹ ہو رہی ہے۔ غسل وسل کرنے کے بعد جب جمعے کا وعظ مبارک شروع ہوا تو مولوی صاحب نے وعظ کے درمیان ایک مقام پر فرمایا:

"لو! اب ایک نئی بات سننے میں آئی ہے۔ یہ سائنس دان آج ہمیں ایک نئی بات سنانے لگے ہیں۔ یہ ہمیں بتلا رہے ہیں کہ مینہ کیسے برستا ہے؛

سونے کا پانی چڑھ گیا ہے اور ان کی چمک آنکھوں کو چندھیا دیتی ہے۔

اور میں نے جب سے عرب شریف میں پانی نکالنے کی فکر میں پریشان رہا اس کے اپنے صحن کے نلکے کا پانی کھارا ہو گیا۔ اب یہ نہ گلے سے نیچے اترتا ہے اور نہ میل نکالتا ہے۔ میں نے مستری کو بلوا کے کہا کہ یہ پانی اب ہمارے کسی کام کا نہیں رہا۔ اس نے مشورہ دیا کہ اگر میٹھے پانی تک پہنچنا ہے تو بور اور گہرے جاؤ۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ عرب شریف میں غیر لوگ زمین کے نیچے بہت گہرے چلے گئے تو سونا لے کے باہر آ گئے اور مجھے یقین نہیں کہ میں اپنی زمین میں دُور تک اُتر گیا تو کیا مجھے پانی کا قطرہ بھی ملے گا یا نہیں! خدا یا مجھے غصہ آنا بند ہو گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ خدا نے ساتھ اماں کی سائنس بھی فیل ہو گئی۔ نہیں نہیں مسجد کے میاں جی نے تو کہا تھا کہ رحمت کے پیچھے تو کوئی سائنس نہیں ہوتی

ہاں مجھے یاد آیا کہ اماں یہ بھی کہا کرتی تھیں کہ حشر کے روز ہم اپنے جیسوں کے ساتھ ہی اُٹھائے جائیں گے۔

تو پھر ٹھنڈی کھوئی والا سائیں اکتارے کے ساتھ اُٹھے گا۔

اور رانجھا ہیر کے ساتھ۔

اور میں؟ جو بچپن سے پانی والی مشین ہاتھوں میں تھامے عرب شریف جانے کے خواب دیکھتا رہا۔ میں کس کے ساتھ اُٹھایا جاؤں گا؟

حضرت صاحب یا مولوی صاحب آج اگر زندہ ہوتے تو میں ان سے پوچھتا: میاں جی! یہ بتلایئے کہ جو اس جہان میں کھارا پانی پیتے پیتے مر گیا کیا اُسے اُس جہان میں میٹھا پانی پینے کو ملے گا؟ آپ کی سائنس کیا فرماتی ہے۔ بیچ اس مسئلے کے؟"

مارچ ۸۶ء

تیرے لہجے میں جواب رد و بدل لگتا ہے
اس کے پیچھے کوئی سرگرم عمل لگتا ہے

تو نے کس رُت میں مری شاخوں سے جھولے باندھے
ایسے موسم میں تو اشجار کو پھل لگتا ہے

مختار حسین کھرل

عکس تحریر:۔ مختار حسین کھرل

# آشوبِ چشم

ڈاکٹر سلیم اختر

"مکھی کی بظاہر دو آنکھیں نظر آتی ہیں لیکن یہ دو آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی آنکھوں کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی آنکھیں مختلف زاویوں سے بڑی آنکھوں میں لگی ہوتی ہیں اور ان ہی کی بدولت مکھی آگے پیچھے دائیں بائیں چاروں طرف دیکھ سکتی ہے اور یوں اپنے نادیدہ دشمن سے محفوظ رہتی ہے۔"

کمال ہے! اس نے حیرت زدہ ہو کر کتاب رکھ دی۔ مکھی ایسی مخلوق کو اتنی زیادہ آنکھوں سے نوازا گیا اور ہم انسان ـــــ اشرف المخلوقات کو محض دو آنکھوں پر ٹرخا دیا گیا۔ ہمیں زیادہ آنکھوں کی ضرورت ہے کہ مکھی کو؟ کیا صرف مکھی ہی کو نادیدہ دشمن سے محفوظ رہنے کا حق حاصل ہے؟ گندگی کی اس پوٹ کو تو آنکھوں کے بغیر ہونا چاہیئے تھا اور اس کے برعکس ہم انسانوں کی آنکھیں ایسی ہوتیں کہ پیچھے بھی دیکھ سکتے۔ پھر سوچا اگر نہ دیکھیں تو سامنے کی آنکھیں بھی کس کام کی!

اس نے آنکھیں بند کر کے سر کرسی کی پشت پر ٹکا دیا۔ آنکھیں بند کیں تو اسے آنکھوں کے بارے میں کچھ اور بھی یاد آیا۔ وہ کئی دنوں سے یہ دیکھ رہا تھا کہ کچھ لوگوں کی آنکھیں پیشانی کی بجائے سر کے پیچھے جا لگی ہیں یہ عجیب سا احساس تھا اور یوں لگتا گویا کار تو اندھیرے راستہ پر جا رہی ہو اور پچھلے بمپر پر ہیڈ لائٹس روشن ہوں۔

آنکھ بطورِ عضو پیشانی ہی پر نظر آتی یعنی پلکیں بھی ہیں۔ ان کے پیچھے آنکھ کی پُتلی بھی حرکت کرتی نظر آتی۔ آنکھ جھپکتی دکھائی دیتی۔ سب کچھ ایسے ہی تھا جیسے ہونا چاہیئے لیکن پھر بھی سطر آنے پر بھی نہ نظر آنے کا گریز یا احساس جیسے ہانٹ کرتا رہتا۔ یوں لگتا جیسے آنکھ میں کوئی تنکا پڑ گیا جو نہ نظر آتا ہے اور نہ نکلتا ہے عجیب سی رڑک تھی!

کہیں میری آنکھیں بھی تو پیچھے نہیں جا لگیں؟ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور فوراً ہاتھ سے سر کی پشت ٹٹولی اور پھر مطمئن ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن پھر بھی اندیشہ ہی رہا، ہو سکتا ہے آنکھ گردن پر بالوں کے اندر چھُپ گئی ہو لہٰذا مزید اطمینان کرنے کو آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آنکھیں دیکھیں۔ بلاشبہ آنکھیں اپنے مقام پر ہی تھیں پھر سوچا کہیں آنکھوں کا نظر آنا بھی فریبِ نگاہ نہ ہو کہ صحرا میں آنکھوں والا ہی سراب دیکھتا ہے اور اندھا پرندہ کبھی دام میں نہیں پھنستا۔

چند دن قبل تک وہ آنکھوں کے جال میں پھنسا تھا لہٰذا بے دیکھے آزاد اور مسرور زندگی بسر کرتا تھا۔ ہوا یہ کہ وہ دوست کے پاس بیٹھا اس کی سیاسی گفتگو سن رہا تھا۔ یہ بہت مشہور اخبار کا مدیر تھا اور اس کے اداریوں پر ایمان لانے والوں کی تعداد لاکھوں سے بھی تجاوز کرتی تھی۔ گفتگو کے دوران وہ ٹیلی فون کرنے کو مڑا تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ مدیر کی آنکھیں گُدی پر لگی تھیں۔ اس نے حیرت سے آنکھیں جھپکا کر غور سے دیکھا تو واقعی اس کی آنکھیں پُشت پر تھیں۔ کمال ہے! اس نے حیرت سے سوچا یہ اداریہ

کیسے لکھ لیتا ہے۔ کیا اداریہ لکھتے وقت سامنے کی چیزوں کی طرف پُشت کر لیتا ہے:

"ارے تمہاری آنکھیں ۔ ۔ ۔ ۔ "

"کیا ہوا میری آنکھوں کو؟" اس نے عینک اُتار کر پوچھا۔

"یہ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ۔ ۔ ۔ ۔ "

"کیا میرے پیچھے لگا رکھی ہے؟"

"وہ ـــ پیچھے کیا ہے؟"

"پیچھے کُرسی ہے دیوار ہے۔"

وہ اسے ٹکر ٹکر دیکھتا رہ گیا اب بھلا اتنے بڑے اخبار کے، اتنے نامور مدیر کو وہ یہ کیسے بتائے کہ اس کی آنکھیں تو پیشانی سے کہیں دور منتقل ہو چکی ہیں۔ وہ عزیز دوست ہیں لیکن غالباً وہ یہ بات تو نہ سُن سکے گا اور نہ ہی تسلیم کر سکے گا پھر بیکار اپنا مذاق اڑوانے کا کیا فائدہ؟

"بولتے کیوں نہیں؟"

"کچھ نہیں یار ـــ ایسے ذرا تم سے مذاق کر رہا تھا۔"

"تم ایسے چغد ہو کہ ڈھنگ سے مذاق بھی کرنا نہیں آتا۔"

اس پر وہ جل کر بولا "تمہاری آنکھیں پیچھے لگی ہیں۔"

"ہا ہا ہا!" اس کا قہقہہ اخبار کے دفتر میں یوں گونجا جیسے اجڑے اہرام میں گزشتہ زمانوں کی ہنسی!

"میں نہ کہتا تھا کہ تم اتنے چغد ہو کہ تمہیں ڈھنگ سے مذاق بھی نہیں آتا۔" وہ پھر زور سے ہنسا۔

ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا اس نے عینک اُتار کر رومال سے آنکھیں پونچھیں، وہ فوراً اُٹھ کر اس کی پُشت کی طرف گیا تو دیکھا کہ پُشت کی آنکھوں میں ہنسی کے آثار نہ تھے۔ اس نے زچ ہو کر سوچا، میں انگلیاں چھو کر اسے پُشت کی آنکھوں کا احساس کراتا ہوں، اس نے جب پلک نہ جھپکنے والی آنکھوں میں دونوں انگلیاں گاڑدیں تو اسے یقین تھا کہ انگلیوں کے سرے اس کی پتپچاتی پتلیوں سے چھوتے ہیں۔

وہ چڑ کر بولا "ابے یہ میرے بال کیوں کھینچ رہے ہو۔"

"ہائیں! تمہیں کچھ نہیں محسوس ہو رہا؟"

"بال کھینچو گے تو ضرور محسوس ہوگا۔"

"بس؟"

"اور ـــ کیا؟"

جب وہ خفیف سا ہو کر جا رہا تھا تو اسے یقین تھا کہ پُشت کی آنکھ نے شرارت سے آنکھ ماری ہے!

کمال ہے اتنا بڑا اخبار! اتنا بڑا اداریہ نگار!

دو تین دن بعد اپنے پروفیسر دوست سے ملاقات ہوئی جو لائبریری سے بھاری بھرکم کتابیں بغل میں دابے نکل رہا تھا۔

یہ ادب کا بہت بڑا نقاد تھا۔ تنقیدی مقالات ملک کے مقتدر ادبی جرائد میں طبع ہوتے تھے۔ حضرت علامہ اقبال اس کا محبوب موضوع تھا۔ ان دنوں علامہ کے فلسفہ میں نگاہ کے موضوع پر مقالہ لکھ رہا تھا۔ پروفیسر نقاد بڑے جوش سے بتا رہا تھا کہ کن کن نظموں میں حضرت علامہ نے آنکھ کی تشبیہات اور استعارات استعمال کئے ہیں جبکہ اس نے تو یہ گنتی بھی کر رکھی تھی کہ تمام کلامِ اقبال میں نگاہ کا لفظ کتنی مرتبہ استعمال ہوا۔ مگر وہ اُلجھا اُلجھا سا تھا کیونکہ اس کی بھی پُشت پر آنکھیں تھیں اور اسے بھی پیشانی کی آنکھوں کے بے مصرف ہونے کا احساس تک نہ تھا۔ وہ بڑے جوش سے اسے بتا رہا تھا۔

"ایک بہت بڑی اقبال کانفرنس منعقد ہونے والی ہے اس میں بڑے بڑے اقبال شناس آ رہے ہیں۔ مجھے بھی بلایا ہے۔"

"تو یہ سب کتابیں۔ ۔ ۔ ۔؟"

"ہاں! اسی مقالے کے لئے ہیں ــــ یہ جمالیات کی ہیں یہ نفسیات کی اور یہ کانٹ اور نطشے کے افکار ہیں۔"

"مگر تم انہیں پڑھو گے کیسے؟"

"اندھا ہوں کیا؟"

"تو پھر۔ ۔ ۔ ۔؟" پیشانی کی آنکھیں خشمگیں تھیں۔

"تمہاری آنکھیں تو پُشت پر ہیں۔"

جی ــــ WHAT اس نے سر کی پُشت پر ہاتھ مارا اور پھر ہنس کر بولا "یار! کوئی ڈرامہ کرنا تو تم سے سیکھے۔"

"نہیں تو"

"وہ زور سے ہنستا ہوا بولا۔ آخر کو ہو نا افسانہ نگار۔"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ اب محجوب سا تھا۔

"ان دنوں ٹی وی کے لئے کوئی پلے لکھ رہے ہو ــــ؟"

"ٹی وی والے آنکھوں کی تھیم پر ایک ڈرامہ سیریز شروع کر رہے ہیں۔ مجھے بھی کہا تھا لیکن میں شاید لکھ نہ پاؤں۔"

"کیوں؟"

"مجھے تو آنکھیں ہر ٹھیک مقام پر نظر نہیں آتیں۔"

پروفیسر نے مصنوعی شفقت سے اس کا گال تھپتھپایا اور کہا:

"بیٹے! آنکھوں کا علاج کرا ڈالو۔"

اور اپنی اس بات سے وہ اتنا محظوظ ہوا کہ دیر تک ہنستا رہا اور ہنستا ہوا ہی رُخصت ہوا۔

اس کے بعد سے وہ اس کھوج میں رہا کہ کس کی آنکھ کہاں لگی ہے۔ گو ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تو نہ تھی تاہم پُشت پر آنکھ والے بھی نظر آ جاتے تھے۔

ایک بہت بڑا لیڈر ایک عظیم الشان جلسے میں اپنے زورِ بیان سے لاکھوں اعصاب میں زیر و بم پیدا کر رہا تھا۔ مہمان خصوصی ایک بہت بڑا اہل اور تھا۔ سامنے کرسیوں پر ملک کی دیگر مقتدر سیاسی شخصیات تھیں مگر اس کی آنکھیں یہ دیکھ کر پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ ان سب کی پُشت پر لگی آنکھوں میں خفیہ مذاکرات بھی ہو رہے تھے۔

وہ سخت خوفزدہ رہنے لگا کہ میری آنکھیں بھی پُشت پر منتقل نہ ہو جائیں چنانچہ ہر وقت سر ٹٹولنے کی عادت پڑ گئی تھی اور پھر خدا کا شکر ادا کرتا کہ ابھی تک وہ سامنے والی آنکھوں سے ہی دیکھ رہا ہے. لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا کیونکہ پُشت پر آنکھوں والوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ رکشا والا ٹریفک میں بڑی مہارت سے رکشا نکالے جا رہا تھا لیکن آنکھیں پُشت پر تھیں۔ سینما ہال میں فلم بینوں کی اکثریت پُشت پر آنکھیں لئے بیٹھی تھی۔ سپاہی چالان کر رہا تھا مگر آنکھیں پُشت پر تھیں۔ یونیورسٹی میں طلبا کا جمّ غفیر دیکھا مگر آنکھیں ان کی پُشت پر ہی نظر آئیں۔ سوچتا ہمارے اخبارات کو کیا ہو گیا ہے انتڑیوں کی بیماری کی خبریں تو چھاپ رہے ہیں لیکن آنکھوں کی اس پُراسرار بیماری کا کوئی تذکرہ نہیں۔ کیا یہ خاموشی کی سازش ہے یا آنکھوں پر معدہ کو فوقیت حاصل ہے؟

ایک رات اس پریشانی میں نیند نہ آئی۔ اس نے اوندھی لیٹی بیوی کی چٹیا پکڑ کر اُٹھائی تو اس کی آنکھیں بھی پُشت پر نظر آئیں۔ وہ دہشت زدہ ہو کر کمرہ سے نکل بھاگا۔

صبح اُٹھ کر بیوی بولی "تمہاری آنکھیں خراب ہو رہی ہیں"

"کیوں؟"

"بس! مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے تمہاری آنکھوں میں کچھ خرابی ہو"

"خرابی اس لئے کہ یہ پُشت پر نہیں؟"

"کیا کہہ رہے ہو" وہ حیرت سے بولی۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں" مگر اسے معلوم تھا کہ اسے کچھ محسوس نہ ہو گا جب اسے کچھ محسوس نہ ہو گا تو پھر وہ کیسے ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

وہ کھڑی اسے گھورتی رہی تھی "اگر یہ تمہارا کوئی پرائیویٹ مذاق ہے تو میں اس کا مطلب نہیں سمجھ سکی"

"کچھ نہیں! کچھ نہیں!!" وہ پیچھا چھڑانے کو بولا۔

"تو پھر چلتے ہو؟"

"کہاں؟"

"ڈاکٹر کے پاس ـــ اور کہاں؟"

"مگر . . . ."

"جان! تمہیں احساس نہیں مگر تمہاری آنکھیں واقعی خراب ہیں"

وہ اسے حقیقتِ حال سے آگاہ کرنا چاہتا تھا مگر یہ بھی جانتا تھا کہ پیشانی کی آنکھوں کے درمیان حقیقت کا مفہوم بدل جاتا ہے لہٰذا بے کار کی چخ چخ ہے. بچنے کے لئے بیوی کا کہا مان لیا اور سوچا ہو سکتا ہے میری ہی آنکھیں خراب ہوں جو مجھے سب کی پُشت پر آنکھیں نظر آتی ہیں لیکن جب آئی سپیشلسٹ کی آنکھیں بھی پشت پر نظر آئیں تو بھاگا ہراساں ہو کر۔

شہر میں اکثریت اب پُشت پر آنکھوں والوں کی تھی اور یہ یا اس ایسے چند اور غریب الوطن لگتے تھے۔ اور اس دن تو انتہا ہو گئی. اس کے رشتہ دار کے بیٹا ہوا تھا۔ یہ سب مبارکباد دینے گئے۔ بڑا پیارا بچہ تھا، گول مٹول سا، موٹے موٹے اور لمبے لمبے

گال اور سر پر سنہری بالوں کا تاج! پہلا شاک تو اسے یہ لگا کہ گھر کے تمام افراد کی آنکھیں پشت پر تھیں لیکن اس وقت تو گویا ہلہ دولت کا جھٹکا لگا جب اس نے بچہ کو گود میں لیا تو پشت پر دو ننھی منی معصوم آنکھیں پائیں۔

شہر میں اب ہر شخص کی آنکھیں پشت پر جا پہنچی تھیں۔ بیوی کے بعد اولاد کی آنکھیں بھی پشت پر دیکھیں تو تنہائی کے عذاب کا احساس ہوا۔ سڑک پر جاتا تو پشت پر لگی آنکھوں کے ہجوم میں خود کو گم شدہ بچہ کی طرح محسوس کرتا۔ تمام زندگی کا نظام پشت کی آنکھوں پر چل رہا تھا ایک وہ ہر تھا جو اپنی آنکھوں کے عذاب میں مبتلا تھا۔

ایک دن کمرہ بند کر کے رویا، خدایا! اگر یہ کوئی نائٹ میئر ہے تو اب اسے ختم کر دے اور مجھے دیکھنے کے اس عذاب سے چھٹکارا دلا اگر میں مر چکا ہوں اور یہ جہنم ہے تو مجھے آنکھوں کے اس جہنم سے نکال کر آگ والے جہنم میں ڈال دے۔ میں آنکھوں والا ہوں اندھوں سے بدتر ہوں۔ خدایا! میری آنکھیں چھین لے، مجھے اندھا کر دے مجھے اپنی ان بے معنی آنکھوں کے عذاب سے نجات دلا۔ تب اس کی آنکھوں سے ساون بھادوں برسے۔ یوں رو کر اور آنکھوں کو کسی مصرف میں لا کر اسے قدرے سکون کا احساس ہوا۔

وہ آزردہ سا سر جھکائے بیٹھا تھا کہ میز پر اسے مکھی نظر آئی۔ اس نے پہلی مرتبہ گندگی کی اس پوٹ کو رشک سے دیکھا، یقیناً مکھی انسان سے افضل ہے کہ ایک آنکھ میں کئی آنکھیں رکھتی ہے یہی نہیں بلکہ ان سب سے کام بھی لیتی ہے۔ آ! میری جان! میرے قریب آ! میرے پہلو میں آجا! وہ پیار بھری سرگوشیوں میں اسے بلا رہا تھا لیکن اگلے لمحہ مکھی اُڑ چکی تھی۔

اب یہ سب ناقابلِ برداشت تھا۔ جب دوبارہ رو کر بھی سکون نہ پایا تو چھری لے کر آنکھیں نوچ ڈالیں۔

(ستمبر ۷۸ء)

گھر میں ہی رہتا ہے، نظر میں نہیں رہتا
اک سنگ اگر دستِ ہنر میں نہیں رہتا

جانا ہے کہاں اور ٹھہرنا ہے کہاں پر
کچھ بھی تو مجھے یاد سفر میں نہیں رہتا

گہناتا ہے جب عظمتِ انساں کا ستارا
انساں خود اپنی بھی نظر میں نہیں رہتا

سید امداد ہمدانی

عکس تحریر:۔ سید امداد ہمدانی

# پائلٹ

رضیہ فصیح احمد

"باجی، باجی ـــــ باجی دیکھئے۔"

اُس نے ماؤ کو نظر انداز کرکے اُوپر سے آتے والی زیادہ پُرشور آواز کی سمت دیکھنا شروع کیا۔ ہری پٹی اور سفید جسم والا ہوائی جہاز بہت نیچے، بہت ہی نیچے گویا اُن کے سروں پر سے اڑتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی رفتار سست تھی مگر نیچا ہونے کی وجہ سے گھن گرج بہت تھی۔ وہ بڑے اتار سے آہستہ آہستہ گزرا۔ ایسا معلوم ہُوا جیسے سیدھا سامنے والے پہاڑ سے جا کر ٹکرا جائے گا۔ اور جب ذرا نزدیک پہنچا تو بالکل ایسا محسوس ہُوا جیسے وہ پہاڑی پر بنے ہوئے سفید اور سبز رنگوں والے مکان کے دروازے میں گھستا چلا جائے گا لیکن جب وہ گزرا تو وہ مُنہ پھاڑے دیکھتی رہ گئی۔ جہاز پہاڑ کے بلند ترین درختوں کی بلند ترین چوٹیوں سے بھی اُوپر گزر گیا تھا۔

اس کے غائب ہو جانے کے بعد وہ دفعتاً دل پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئی۔ واحد! ـــ یہ ضرور واحد ہو گا۔"

نجمہ نے لکھا تو تھا: "واحد پائلٹ ہو گیا ہے۔ اس کی روٹ ... سے ... ممکن ہے تمہاری طرف سے تو اس کا جہاز جاتا ہو گا۔" ہاں اُسے معلوم تھا کہ اس روٹ کا جہاز اسی طرف سے جاتا ضرور ہے۔ اُس نے اکثر باہر بیٹھے ہوئے جہاز گزرتے دیکھے تھے مگر وہ سب یہاں سے بہت دُور وادی کے بیچوں بیچ پہاڑی کے پس منظر میں سفید کبوتروں کی طرح چلتے نظر آتے تھے مگر یہ تو عین اس کے سر پر سے گزرا تھا۔ واحد کو زیادہ سے زیادہ اُن کا علاقہ ہی معلوم ہو گا مگر یہ کیسا اتفاق تھا کہ وہ بالکل اس کے گھر اُوپر سے گزرا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ اس وقت دُوربین لگائے دیکھ رہا ہو اور اُس نے مجھے اُوپر کی طرف نظریں اٹھائے دیکھ لیا ہو۔

وہ سارا دن بڑی بشاش رہی۔ بار بار کسی انجانی خوشی کا نغمہ اَن جانے میں ہی اُس کے ہونٹوں پر تیر جاتا۔ رات کو سونے سے پہلے چپکے سے اپنے کمرے میں لگے ہوئے کیلنڈر میں آج کے دن پر سُرخ نشان کھینچا اور بستر پر لیٹ کر جہاز کی مدھر خیالی آواز سنتی رہی۔

کیلنڈر پر لگائے ہوئے سُرخ نشان والے دن کے انتظار میں وہ ابھی پوری طرح کھلنے بھی نہ پائی تھی کہ ایک دن اچانک پھر وہی جہاز بالکل اسی طرح، اُوپر سے گزرا۔ وہ گھر کے اندر بیٹھی تھی۔ آواز سُنتے ہی وہ لپک کر باہر آئی اور غیر شعوری طور پر زور زور سے ہاتھ ہلانے لگی۔ ماؤ اور رانی پہلے سے یہی کر رہے تھے اِس لئے اُنہوں نے اس کی اس حرکت کو محسوس نہیں کیا۔ جب جہاز اس پہاڑی کو بالکل اسی خواب ناک انداز میں پار کر گیا تو وہ اپنی اس حرکت پر شرمندہ سی ہوئی مگر دل میں مسرت کی ہلکی سی لہر بھی تھی۔ کیا معلوم واحد نے دیکھ ہی لیا ہو ـــ!!

باقی دن پھر ہوائی جہاز کی مدھر گھر گھر اس کے حواسوں پر جلترنگ سا بجاتی رہی۔ ہائے اللہ! بالکل ہمارے گھر پر سے ـــ! کیا کسی دن ایسا بھی ہو گا کہ واحد کوئی لفافہ جس کے اندر اس کی تصویر ہو گی، یا گلاب کے پھولوں کا گلدستہ یا کوئی رومال اُوپر سے پھینک دے گا جس پر "ڈبلیو" کڑھا ہو گا۔ اگر ایسا ہو تو کتنا اچھا ہے۔ اور جب اُس کا اس خیال کی خوبصورتی سے دل بھر گیا تو اس کے مضحکہ خیز پہلو بھی سامنے آنے

لگے ۔ تو بلندی سے لفافہ اور رومال نہ جانے کہاں جا پہنچے گا ۔ اور پھولوں کی ہڈیاں پسلیاں تک چُور چُور ہو جائیں گی اور پھر وہ کیسے کر سکتا ہے جب کہ اس کے اور ہمارے گھر کی خاندانی لڑائی ہے نجمہ بھی تو جینے دو جینے میں کسی اور سہیلی کے پتے پر میرے نام ایک خط بھجوا دیتی ہے ۔ تو کیا میں صرف اس جہاز کو تکتی رہوں گی خود اُسے کبھی نہ دیکھ سکوں گی ۔ نہیں وہ ضرور کچھ نہ کچھ کرے گا ۔ کیا یہ اس کے خلوص کی نشانی نہیں تھی کہ گھر کا صحن اس کے قدموں پر حرام تھا اس گھر کی فضا کو اس نے اپنے اُوپر حلال کر لیا تھا ۔ کاش یہ بڑے دلوں کے اخلاص کو سمجھ لیتے ۔ اور پھر وہ سوچ کر پریشان ہوتی رہی کہ وہ امّی اور ابّا کو کس طرح بتائے کہ یہ واحد ہے جو ہر ہفتے اپنی موجودگی کا احساس دلانے ، اپنی حیثیت منوانے ، خوشامد کے طور پر اس گھر کا طواف کرنے آتا ہے تاکہ جب وقت آئے تو اُس کے ابّا امّی اس کی وفاؤں کو یاد رکھیں اور انکار نہ کر دیں ۔ واحد کا یہ اصرار یہ طواف کتنا بلند تھا ۔ اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا ، اُس کو نوکروں کے ذریعے گھر سے نہیں نکلوایا جا سکتا تھا ۔ اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ گھر والے گھر پر نہیں ہیں ! وہ آتا تھا اور " مجھے یاد رکھنا " " مجھے یاد رکھنا " کہتا ہوا سر سے گذر جاتا تھا اور وہ اُسے یاد رکھتی ۔ اس سہانی آواز کے انتظار میں جیتی تھی جس کا کوئی دن کوئی وقت مقرر نہیں تھا مگر جو ہفتے میں ایک بار ضرور سنائی دیتی تھی وہ پُورا جہاز اور اس جہاز کا ایک ایک حصہ تصویر کی طرح اس کی نظروں میں سما گیا تھا ۔ یہاں تک کہ جہاز کے شناختی نشان بھی اکثر تنہائی میں اس کی آنکھوں کے سامنے تیرا کرتے ۔

اور آخر ایک دن یہ راز اس کی برداشت سے باہر ہو گیا ۔ جب وہ جہاز بُردباری ، بلند آہنگی سے سر پر سے گزر گیا تو اس نے جھک کر مانو کے کان میں کہا " جانتے ہو اس جہاز میں کون ہے ؟ "

" ہاں آدمی " —— مانو نے پاگل پن سے کہا ۔

" آدمی نہیں ! واحد —— واحد بھائی تمہارے ، جو لاہور میں رہتے تھے نا ہمارے گھر کے پاس ۔ شام کو سفید پتلون قمیص پہن کر ٹینس کھیلنے جایا کرتے تھے ۔ بڑے بڑے کالے کالے بال تھے جن کے گردن تک اور بڑی بڑی کالی کالی آنکھیں تھیں جن کی ... "

" ہاں جو ہمیں ٹافی دیتے تھے کبھی کبھی —— " مانو کو یاد آیا ۔

" وہی وہی —— وہ ہوتے ہیں اس جہاز میں ۔ "

" اچھا ۔ وہ کیا کر رہے ہیں اس جہاز میں ؟ "

" اسے چلا رہے ہیں "

" ہیں ! باجی وہ اُسے چلا رہے ہیں ! "

" ہاں —— " اس دن مانو کو اپنے راز میں شریک کر کے وہ بے حد خوش تھی ۔ اس کا دل چاہا وہ یہ بھی اُگل دے ۔ " وہ میری ہی خاطر ادھر سے گزرتے ہیں " ۔ " اتنے نیچے ، بڑے ہمت والے ہیں وہ ۔ میں نجمہ کو لکھوں گی " واحد سے کہنا اتنے نیچے جہاز نہ لایا کریں ۔ مجھے ڈر لگتا ہے " ۔ " پھر وہ خیالات کے ریلے میں بہنے لگے اگر جہاز اُوپر سے گزرا تو اسے آواز کس طرح آئے گی ۔ اُسے کیسے پتہ چلے گا کہ واحد آیا تھا ۔ اگر واحد نے اُسے باہر کھڑا نہ دیکھا تو اسے افسوس ہوگا مگر کچھ بھی ہو وہ ضرور لکھے گی کہ واحد سے کہنا اتنے نیچے جہاز نہ لایا کریں ۔ نجمہ یہ جملہ واحد کو سنائے گی ۔ وہ مُسکرائے گا آنکھوں کی جوت بڑھ جائے گی پھر وہ بال پیچھے پھینک کر سیٹی سی بجائے گا اور اگلی دفعہ —— اگلی دفعہ شاید اس کا جہاز اس سے بھی نیچے اُترے گا ، اس سے بھی نیچے ۔

کئی دن سے موسم شام کو یکایک خراب ہو جاتا تھا ۔ مغرب کی طرف سے ایکا ایکی گہرے گہرے بادل اُٹھتے اور گھٹا ٹوپ ہو جاتا ۔ پھر

ان میں سے نیلے نیلے رنگ کی خوف ناک سی بجلی چمکتی جو شیشوں والے کمرے سے ہوتی ہوئی اندر تک در آتی اور اس کے بعد اتنے زور کی کڑک کہ دل لرز کر رہ جاتا۔ کچھ دیر یہ تماشا ہوتا اور پھر یکایک بوندیں پڑے بغیر ہی اولے گرنے شروع ہو جاتے، دھڑ دھڑ دھڑ دھڑ، اولوں کے ساتھ بجلی کی چمک، بادل کی گرج خوف کئی گنا بڑھ جاتا۔ آج اس قسم کے موسم کو یہ چوتھا دن تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اچھی خاصی دھوپ تھی۔ مانو اور رانی دونوں بچے امّی سے پوچھ کر سیر کے لیے چلے گئے۔ یکایک موسم خراب ہو گیا تو امّی، اور ان کی تسلّی کے لئے ابّا بھی برآمدے میں آ کھڑے ہوئے۔ بجلی کے ڈر کے باوجود وہ ذرا آگے آ کر پگڈنڈی پر مانو اور رانی کو دیکھنے گلاب کی باڑھ پر جھک گئی۔ دفعتاً وہی جانی پہچانی آواز آئی۔ اس نے گھبرا کر اُدھر دیکھا، ہری پٹی اور سفید جسم والا ہوائی جہاز اسی متانت اور وقار سے چلا آ رہا تھا۔ مشرق کی طرف سے پہلے سے بھی نیچے جیسے مغرب کی طرف سے اٹھتے ہوئے دھواں دھار بادلوں کو چیلنج کر رہا ہو۔

"جانے کون پگلا ہے، اس موسم میں اتنے نیچے جا رہا ہے۔" امّی مانو اور رانی کو بھول کر اپنے اُوپر دیکھنے لگیں۔ وہ تو پہلے سے ہی اُوپر دیکھ رہی تھی، اس کا ایک ہاتھ تھوڑا سا اُوپر اُٹھا ہوا تھا جیسے وہ اس موسم میں اتنے نیچے آ جانے پر احتجاج کر رہی ہو۔ ابّا بھی اُدھر ہی دیکھ رہے تھے، ہمیشہ کی طرح گھر میں گھستے گھستے جیسے وہ ارادہ بدل کر اُوپر سے گزر گیا اور پہاڑ کے پیچھے نظروں سے اوجھل ہو گیا اور پھر ایک زور کا کڑاکا ہوا۔

"اللہ رحم!" امّی نے دونوں ہاتھوں سے کان بند کر لئے "کتنے زور کی کڑک ہے۔"

"یہ کڑک نہیں دھماکا ہے، ابھی یہ جہاز کریش ہو گیا وہ دھواں دیکھ رہی ہو۔"

اس لمحے بالکل اسی لمحے موٹے موٹے اولے برسنے لگے۔ نہیں معلوم اس نے ابّا اور امّی کے ان جملوں کا کتنا حصّہ سنا، یہ معلوم ہوا جیسے کسی نے تیز برچھے کی انی اس کے سینے میں اتار دی ہو وہ جھونک کھا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔

پورے طور پر ہوش میں آنے سے پہلے اس کے کانوں میں کسی کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ "دل کی بہت کمزور ہے، اُدھر بجلی کڑکی، اُدھر جب زور کا دھماکا ہوا، بس یہ غش کھا کر گر پڑی، بارہ گھنٹے سے بے ہوش ہے۔"

اور اس وقت پورے ہوش میں آ کر جیسے کسی نے برچھے کی انی دوبارہ اس کے دل میں پیوست کر دی تو جہاز کا کریش محض وہم نہ تھا!

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ باتیں کرنے والے شاید برآمدے میں تھے، کمرہ خالی تھا۔ اس نے کروٹ بدلی، تو اخبار ہاتھ میں لئے سامنے سے گزرتا اس کو ہوش میں دیکھ کر اندر آ گیا۔

"باجی، باجی دیکھئے کل کے کریش کی تصویر اس میں آئی۔ پائلٹ کی تصویر بھی ہے اور اس کے بیوی بچّوں کی بھی ۔۔۔!"

"بیوی بچّوں کی ۔۔۔۔" وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ یہ کل کے کریش کی تصویر تھی۔ جہاز پہاڑیوں میں گرا ہوا، زمین پر ڈھیر کی شکل میں پڑا تھا۔ پائلٹ کی تصویر بھی تھی، ایک چھ فٹے قد آور جوان کی تصویر جس کے چھوٹے چھوٹے بال تھے اور جو بیوی اور دو بچّیوں کے ساتھ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ حادثے کی خبر میں لکھا تھا۔ پائلٹ کی بیوی کا گھر حادثے کی جگہ سے صرف چند فرلانگ دُور تھا!

اس نے ایک گہرا لمبا سانس لیا۔ وہ واحد نہیں تھا۔ اُس کا دل چاہا اسی وقت اُٹھ کر وضو کرے اور سجدۂ شکر بجا لائے کہ وہ واحد نہیں تھا۔ مگر اس وقت برچھے کی انی پھر اس کے دل میں چبھی۔

تو وہ واحد نہ تھا جو ہر ہفتے ان کے گھر کے اُوپر سے گزر کرتا تھا۔ وہ کوئی اور تھا۔ وہ کوئی اور کیوں تھا!

( اکتوبر ۶۴ء )

# قالین بننے والے

الطاف فاطمہ

ایک اینٹ کی دیواروں والے دالان نما کمرے کی طوالت کے مقابل یہاں فراخی معدوم ہے۔ یہاں سے وہاں تک تنی ہوئی چوبی "تور" پر گول رنگے لپیٹے ہوئے اُدھورے قالین کے آگے تختہ ہے اور تختے پر آسن جمائے چھوٹے چھوٹے اجسام کی رنگتوں میں تدریجی فرق اور اختلاف ہے اور کہتے ہیں کہ بنیادی رنگ فقط دو ہیں؛ "سیاہ" اور "سفید" لیکن رنگوں کی کثرت اور ان کا اختلاف ہی اس طویل دالان نما کمرے کا نمایاں وصف ہے ستار کے تاروں کی طرح تنے ہوتے "تانی" کے سفید دھاگوں کی دیوار کے چھدرے پن پر بے شمار رنگوں کی جھلکیں لرز رہی ہیں۔

اور ستار کے تاروں جیسے کسے ہوتے اڈے یعنی تانی کے سفید دھاگوں والی دیوار کے اُس طرف ایک بھید ہے اور آگے ایک طلسمات کا عالم۔

یہ دنیا طلسمات کی دنیا ہے۔ یہ دالان نما کمرہ مصری اہراموں کی سی سیلن اور تعفن میں ملفوف ہے۔ یہ دیواریں، یہ تور، یہ اڈا، اور کرنیل سے نیم برہنہ جسم، اس طلسمات میں گُم ہو چکے ہیں اور اپنے آپ میں سو چکے ہیں اور اب یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ حرکت کس چیز کو ہے اور جمود کس پر طاری ہے اور حرکت فقط ایک چیز سے عبارت ہے۔ وہ ہے رنگوں پر شٹل کی تیزی سے لپکتی ہوئی انگلیاں، اور انگلیوں کی تاریخ قدیم اور دلچسپ ہے۔ انگلیاں بہت سی قسم کی ہوتی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔

یعنی وہ انگلیاں جو مصر کے بازار میں کٹ گئیں وہ انگلیاں جنہوں نے چاند کو دو نیم کیا۔ وہ انگلیاں جنہوں نے خشک چوب اور خشک پوست کے ساتھ مسیحائی کی اور آوازِ دوست کو پالیا۔

اور پھر وہ انگلیاں جو ان سب پر اٹھیں اور ہمیشہ اُٹھیں گی۔

اور اب یہ انگلیاں ہیں جو بہتے اور پھسلتے ہوتے رنگوں پر شٹل کی سی تیزی سے لپکیں اور ان کے خفیف سے خفیف فرق کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس طلسمات کے عالم میں بڑی اور زندہ قوت یہ انگلیاں ہیں جو اپنی ذات سے آنکھ بھی ہیں اور ذہن بھی۔

اور اس سے بڑی طلسمات اور کیا ہو گی کہ اجسام گونگے اور بہرے ہو چکے۔ ان چھپی عقلوں پر پردے پڑ گئے تو انگلیاں بروئے کار آئیں انہوں نے دیکھا، سُنا اور عجوبوں کو جنم دیا۔ اس طلسمات کو فقط ایک آواز برقرار، اور بروئے کار رکھتی ہے تنے ہوئے سفید دھاگوں کی چھدری دیوار کے عقب سے آتی ہوئی آواز۔

"اک فیروزی دو مشکی چار حالی، اگلا سفید ہے۔ پھر اک مشکی لے ست حالی اک پنج حالی ایکے ہے۔ دو حالی ایکے چار حالی اک پٹا فیر دو حالی مشکی دانواکم ....." آواز کھنچی اور پھر اس نے توقف کیا ہے۔

"آہو جی!" انگلیاں پکاری ہیں۔

ہاں یہ آواز انگلیوں کی آواز ہے۔

مگر وہ پردے کے پیچھے والی آواز جس کی سنگیت پر انگلیاں ناچتی اور عجوبے جنم لیتے ہیں ایک بھید ہے۔ یہ آواز نہ معلوم کب سے جاری ہے اور کب تک انگلیوں پر حکمرانی کرے گی۔ یہاں سے وہاں تک گئی ہوئی تور پر قالین کا مکمل کیا ہوا حصہ لپٹتا رہے گا۔ در سفید تانی پر لرزتے بے شمار رنگوں پر چلتی ہوئی انگلیاں شکار گاہ کا نقشہ مکمل کرتی رہیں گی نہیں معلوم پس پردہ اُبھرنے والی یہ آواز کب سے قالینوں پر شکار گاہیں تیار کروا رہی ہے اور کب تک۔

یہ کب سے "اور کب تک" ہی تو تحقیق، تلاش اور مقالوں کو جنم دیتی ہے اور مقالے اندازوں، قیاسوں اور بیانات کا کتنا بھس بھرا مجموعہ ہوتے ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں سے کتنے اندازے، کتنے قیاس اور کتنے بیانات حق، خلوص اور صحت پر مبنی ہوتے ہیں، چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ قالین اور ان پر تیار کی ہوئی شکار گاہیں زندہ اور ٹھوس حقیقتیں ہوتیں اور ان پر لکھے گئے مقالے، بیانوں، اندازوں اور قیاسوں کے مجموعے۔

پھر بھی میں شکاگو سے چل کر یہاں اس لئے آیا ہوں کہ ایشیا کی قالین بافی پر تحقیقی مقالہ لکھوں۔

اور مجھے اپنے مقالے کے عنوان پر اعتراض ہے،

"ایشیا کی قالین بافی"!

مگر قالین تو ایشیا ہی میں تیار ہوتے ہیں اور ایشیا کے قالینوں میں شکار گاہیں شروع سے بنتی چلی آئی ہیں۔ سفید دھاگوں کی تنی ہوئی چادر سا تانی اور اس تانی کی دیوار پر لرزتے ہوئے یہ تمام رنگ بنوں کے آنادتیروں، چیتوں، وحشی گھوڑوں، سرنوں اور چیتلوں کی ڈاروں کو قالینوں میں مقید کر لیتے ہیں۔

اور تم نے قالینوں کے شیر دیکھے ہیں؟

حلیم، بے بس و بے حرکت اور بے حس، اور اسی کا نام تو طلسمات ہے۔ اس ساری طلسمات کی کنجی موٹے قد آور یک چشم استاد کے ہاتھ میں ہے۔

اور اب ستار کے تاروں کی طرح کسی ہوئی تانی کی سفید دھاگوں والی چھدری دیواروں کے اس طرف کا راز فاش ہوا چاہتا ہے۔

استاد کے ہاتھوں میں گز بھر لمبا پیلا کاغذ ہے اور کاغذ پر بنے ہوئے گول بیضوی نشانات خالی بھی ہیں اور اس کے بطن میں نقطے بھی موجود ہیں۔ کبھی ایک اور کبھی ایک سے زیادہ گول اور بیضوی نشانات کے بین بین، متوازی اور غیر متوازی خطوط اور کبھی فقط اوپر تلے دیئے ہوئے نقطے پیلے، کھردرے اور غیر جاذب کاغذ پر سیاہ روشنائی سے بنائے نقش جادو کے منتر یا سفلی علوم کے نقش معلوم پڑتے ہیں۔ یشیا کی بعض قوموں کے نزدیک سفلی عمل کرنے والا کافر اور زندیق ہے۔

اور بعض قوموں نے سفلی عمل کو فروغ دیا ہے۔

اب میں سوچ رہا ہوں کہ میری فکر، سوچ اور تحقیق کا یہی انداز رہا تو ایشیا کی "قالین بافی" پر میرا تھیسس کبھی مکمل نہیں ہوگا۔

مصری اہراموں کی طرح سیلی ہوئی عجیب سی بُو میں بسا ہوا دالان نما کمرہ۔ نیم تاریکی کے عالم میں سفید دھاگوں کی دیوار کے پیچھے استاد ہے اور اُستاد کے پیچھے دو لوہے کی سلاخوں والی چھوٹی سی تنگ کھڑکیاں اور ان کے دروازوں کے بجائے اور ناتراشیدہ پٹ کھلے ہیں۔

ایک دو تین چار پانچ ۔ یہ گنتی دس پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ تور کے آگے نکلے ہوئے مضبوط تختے پر سجے ایک ہی انداز اور نشست پر جمے ہوتے یہ دس مجسمے دیوتاؤں کی طرح کائنات اور اس کے متعلقات سے بے نیاز اور لاتعلق، اور یہ تمہارا آذر کدہ!

نہیں معلوم کہ اب میں کس سے مخاطب ہوں، مگر خیر آذر کدے کے بُت قطعی جامد اور سنگین تھے اور ان اجسام کے فقط ایک حصے میں

حرکت باقی ہے۔ یہ انگلیاں تخلیق کے عمل میں مصروف ہیں لیکن اس تخلیق کا ان اجسام اور سانس کے آپ سے کیا تعلق ہے . . . . اور یہ انگلیاں روزِ حساب کس کے خلاف گواہی دیں گی اس لئے کہ ان کا آپ ان کے فعل و عمل پر قادر نہیں۔

شکاگو سے آنے والے تحقیق کے طالب علم کا ذہن منتشر اور سرگرداں ہے۔ اس کا ذہن اور قدم جکڑے سے جا رہے ہیں۔

اُف شکار گاہوں کی یہ طلسمات!

پانچ اس طرف اور چار اس طرف اور ان پانچ اور چار کے درمیان کالی آنکھوں اور سنہرا پن لئے ہوئے بالوں والا لڑکا شہیدوں اور گیانیوں کے سے انہماک سے براجمان ہے۔ سر رنگ اور سر سدا مکمل طور پر اس کی گرفت میں ہے۔ اس کی انگلیاں سبز رہی ہیں اور آنکھیں مسکین۔

ان دیکھی آواز گونجی ہے۔

"فیرشت حالی ود اُریب نال اِک طوطی رتّیے؟"

"آہو جی!"

تھرکتی انگلیاں، ان دیکھی آواز "آہو جی" کی یہ صدا اسی سب کا نام سنگیت ہے۔

سنگیت جس میں طبلے والا طنبورے والے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سر ہلاتا ہے اور گائیک اپنے اشارے اور گلے سے سنگت کرتا ہے۔

اس تمام عمل کا نام سنگیت ہے۔ ایک جشنِ موسیقی میں اس کے دوست نے سرگوشیوں میں کہا تھا:

سنگیت کے بنا راگ جنم نہیں لیتے۔

اور سنگیت کے بغیر شکار گاہیں بھی جنم نہیں لیتیں۔ کوئی ایک بار ان ساری سنگتوں کو توڑ پھوڑ کر دیکھے تو سہی ایک نامعلوم سی آہ اس کے وجود میں تلملانے لگی تھی۔

ارے! یہ لڑکا۔ اور اس کے تو باپ دادوں سے ہنرمندی چلی آتی ہے۔ انہوں نے چنار کے تنوں سے ٹیک لگا کر الوان تیار کئے اور ایک ایک الوان کئی کئی پشتوں نے مکمل کی ہے۔ ان کی آنکھیں بہہ گئیں۔ اس گھرانے کی انگلیوں میں تو جادو ہے جادو۔

موٹا استاد دھاگوں کی چھدری دیوار کے اس طرف بھدے سے اسٹول پر بادشاہوں کی سی اکڑ اور کلہ اور جبڑا لئے بڑے فخر سے بول رہا ہے۔

استاد اس کے ہاتھوں میں سیاہ بھدے نقوش والا پیلا پیلا بدنما کاغذ ہے۔ اس نے کاغذ کی طرف اشارہ کیا ہے،

"یہ جی شکارگاہ کا نقشہ ہے۔" استاد قالین بافی کے محقق کی پیشوائی کے لئے کھڑا تک نہ ہوا۔

"یہ تم نے بنایا ہے؟" اس نے الٹ پلٹ کر کاغذ کو دیکھا، جس پر کسی جانور کا کان تک نظر نہیں آ رہا۔

"یہ جی، میرے منشی نے بنایا ہے۔ اس کے گھرانے میں باپ دادوں سے نقشے بنائے جاتے ہیں۔ بہت استاد لوگ ہوئے ہیں اُنکے ہاں؟"

"اور تمہاری ہر چیز باپ دادوں سے چل رہی ہے۔ نسلوں اور پشتوں کا یہ چکر ہی تو محقق کو دیوانہ کر دیتا ہے، مگر لوگ کہتے ہیں نسلوں اور پشتوں کے وسیلے سے تحقیق کا کام آسان ہو جاتا ہے؟"

لیکن یہ دُبلا پتلا مسکین لڑکا! پشتوں سے اس کے باپ دادوں نے الوانیں تیار کی ہیں اور شاید ماں کے گھرانے نے اخروٹ کی لکڑی پر نقش و نگار بنائے تھے۔

خدا کی مار! ان باریک اور پیچیدہ کام کرنے والوں پر، اور ایشیا کے قالین بافو تمہارے ہاتھ کیوں نہ قلم ہوئے!

اس کا دل چاہتا تھا کہ ایشیا کے ان تمام قالینوں کے درمیان اپنے تھیسس کو رکھ کر آگ لگا دے اور پھر وہ سب کے سب اندلس

کے ذخیرۂ علوم کی طرح ہفتوں اور مہینوں چلتے رہیں!

اور یہ ہنزور لڑکا: شاید پشتوں ہی سے اس کے گھرانے میں چہرے مسکین، آنکھیں مظلوم اور انگلیاں سنہری چلی آرہی ہیں۔ اس نے عداوت سے لڑکے کی طرف دیکھا ہے اور اپنی ڈائری میں کچھ نوٹ کرنے لگا ہے۔

بس۔ اس کی انگلیاں ہی تو کام کی ہیں۔ باقی تو یہ کچھ..... اس نے اپنے دماغ کو انگلی سے ٹھونکا ہے: جی پچھ اس کا مائنڈ کریک سا ہے!
بس جی اس کی انگلیاں رکیں اور دماغ چلا!"

استاد بلا وجہ ہی ہنس پڑا ہے۔

اور اس لڑکے کا مائنڈ واقعی کریک ہے۔ اس کے ہاتھ رکے اور دماغ چلا۔ یہ خالی بیٹھتا ہے تو اسے ہر طرف مکڑیاں نظر آتی ہیں اور مکڑ تو اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔

اور یہ باتیں تمالین باتی کی تحقیق سے قطعی تعلق نہیں رکھتیں، اس لئے ان کا ذکر بھی فضول ہے۔

استاد باتوں میں لگ گیا ہے اور لڑکے کی نظریں دالان نما طویل کمرے کے کونے سے جا لگی ہیں جہاں ایک بڑی مکڑی جالا تن رہی ہے۔

یہ مکڑی اس کے ہوش و حواس پر مسلط ہوتی جا رہی ہے۔ وہ مکڑی سے ڈرتا ہے۔ کئی مرتبہ تو بے ہوش ہو چکا ہے۔ پاخانے کے کونے کی تنہائی میں جالا تنی مکڑی کو گھورتے جاؤ تو وہ آپ سے آپ آدمی سے مشابہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گول گول آنکھوں اور پیپے سے جسم والا ننھا سا انسان آس پاس کی ہر چیز کو مستقل اپنے جالے کی لپیٹ میں لئے چلا جا رہا ہے۔

لیکن شکاگو سے آنے والے محقق کے پاخانوں کے کونوں میں مکڑیاں جالے نہیں تنا کرتیں۔

مگر یہ لڑکا کئی مرتبہ مکڑی کے ڈر سے بے ہوش ہو چکا ہے۔

اور اب وہ لگاتار مکڑی کو گھورے چلا جا رہا ہے۔ اس کے تن بدن پر جالے سے رینگ رہے ہیں۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا ہے وہ بہت خوف زدہ ہے۔ اتنا کہ اس کا خوف ختم ہو گیا اور اس نے نگینوں تاگوں کو برابر کرنے والی لوہے کی قینچی اٹھا کر مکڑی کی طرف پھینکی ہے جو اچٹ کر پردیسی کے کندھے پر جا لگی ہے۔ کانا استاد اچانک ہی کھڑا ہو گیا ہے۔ اس نے لڑکے کو بہت سے طمانچے لگائے ہیں۔

اور اب لڑکے کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے۔ شاید جالا تنتی ہوئی مکڑی کی خوف کی انتہا نے اس کو بے جگر کر دیا ہے۔

اور یہ محقق کا ایک اور قیاس ہے۔

"کانا، سالا عیبی!" وہ بڑبڑاتا ہوا دالان نما کمرے کی چوکھٹ پر جا بیٹھا ہے۔

کانا، یک چشم، ایشیائی لوگوں کے نزدیک منحوس اور عیبی ہوتا ہے اس لئے کہ وہ چیزوں اور زندگی کے فقط ایک رخ پر نظر رکھتا ہے مگر کچھ لوگ تو دو آنکھیں رکھ کر بھی ایک ہی رخ کو دیکھتے ہیں اور یہی ان کی پالیسی قرار پاتی ہے۔

مگر ان باتوں کا تو میری تحقیق سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

پردیسی محقق نے اپنے آپ کو بری طرح سرزنش کی ہے اور دالان نما کمرے سے نکل گیا ہے۔

"اک فیروزی دو مشکی چار حالی اگلا سفید ہے فیر، دو۔"

اس نے اپنی ایک آنکھ سے نقشے کو گھورا ہے۔ دو ترچھے متوازی خطوط کے پہلو میں پانچ کا ہندسہ اور اس کے پہلو میں دو اوپر تلے نقطے۔

اور یہ علامت ہے حالی کی۔ اس نے پھر سے آواز لگائی: "چار حالی۔ اگلا سفید ہے فیر، دو حالی۔"

آج وہ بار بار رُکا ہے اور اُس نے نقشے کو غور سے دیکھا ہے یوں جیسے اس کی سنگیت ٹوٹ رہی ہو۔ اور یہ اس کی قالین بافی کی تاریخ میں پہلا اتفاق ہے۔ اس کا ذہن بار بار بھٹکا ہے۔

"یا داتا گنج بخش! یہ میری شکارگاہ پوری کروائیو تو ایسا کروں۔ ایسا کروں کہ سب دیکھیں!" اس نے دھاگوں کی چدری دیوار کے ساتھ بیٹھے بیٹھے ایک عجیب اور مبہم منت مانی اور جانے پہچانے چہرے کو دیکھ کر مُسکرایا ہے اور پھر وہ ٹوٹی پھوٹی زبان میں استاد سے مخاطب ہو گیا ہے استاد کو مطلق پرواہ نہیں کہ ایشیا کی قالین بافی پر سیر حاصل مقالہ لکھا جاتے وہ تو فقط اپنے آپ کو اور نامکمل شکارگاہ کو، جو ایران توران سے آنے والے اس کے باپ دادا بناتے چلے آئے تھے نمایاں کرنے کا خواہشمند ہے۔

وہ تور کے آگے آسن جماتے ان لڑکوں کو بھی سامنے لانے کا قائل نہیں جن کی انگلیوں نے اس شکارگاہ میں بے شمار شیر، چیتے، مور، چیتل مقید کر دیئے۔

"ایک دو تین چار . . . تو" پردیسی نے چپکے چپکے لڑکوں کی تعداد کو گنا ہے۔ چار اور پانچ کے درمیان آسن جماتے وہ لڑکا موجود نہیں اور کونے میں کھڈی بدستور جالا تن رہی ہے۔

"اور وہ کہاں ہے تمہارا وہ پُشتینی ہنرمند" اس نے سوچا اور پھر ٹوٹی پھوٹی زبان میں اس کی عدم موجودگی کا سبب دریافت کیا ہے۔

"جی وہ گیا۔ بے کار ہو گیا" اس نے تاسف سے ہاتھ ہلانے کے باوجود ظاہر کیا ہے کہ اس کو اس کی پرواہ نہیں۔

"یہ قالین بک گیا جی" اس نے بات کاٹی۔

"کس نے خریدا؟"

"ایک انگریج نے" اس نے بڑی تمکنت سے اپنا شیر کا سا جبڑا پھیلایا ہے "بڑی بڑی مشیناں لا چھڈیاں پر ایس ورگا قالین کدی اتار ہی نہ سکے۔ مشین تو پھر مشین ہوتی ہے نا"

اب وہ بے نیازی سے نقشہ پھیلانے لگا ہے۔

"وہ تمہاری مشین کدھر گئی؟"

"کون جی؟" وہ تجاہل عارفانہ کے طور پر چونکا ہے۔

"وہی لڑکا!"

"وہ تو جی بے کار ہو گیا۔ اُس کی انگلیاں ہی ختم ہو گئیں"

"ارے کیسے؟"

"اجی کوئی بات نہیں ہوئی، غریب مسکین بچہ تھا۔ ماں بیوہ سے دق کی ماری۔ سارے ہی اُس کو دباتے تھے۔ وہ سب کی ہی تابعدار تھی۔ پر اب دن رات کے روگوں نے اُسے جھلی کر دیا ہے۔ کسی نہ کسی سے جھگڑتی رہتی ہے کئی دن کی بات ہے جھگڑا بہت بڑھ گیا تو یہ بھی پہنچ گیا۔" "میں نے بولا تھا تا کہ اس کا ماتھڈ کریک ہے، بس پٹ گیا۔ بہت گستاخی کی۔ اوناں نے بھی کہیں نہیں مارا، بس انگلیاں ہی کچل کر رکھ دیں اُس کی۔ ذرا سا تو ہے ہی، پھر کوئی حمایتی بھی نہ تھا جی۔ بے کس کو تو حمایتی کا ہی آسرا ہوتا ہے۔ بڑا افسوس ہوا۔ لڑکے کو خاموش ہو جانا چاہیے تھا۔"

"یہ کیسی بات ہوئی، کانا استاد بہت حیران ہے۔" وہ ماں کا والی وارث جو ہوا۔ ماں کی حمایت تو کرتا ہی ہوئی، اور بات یہ بھی ہے

لوگ اس سے حسد بھی کرتے تھے۔ بڑا لڑتے تھے جی۔"

اچانک ہی اس کی آواز موٹی ہوگئی۔

"بڑا ہنر سیکھ رہا تھا وہ جی، اور اُس کی انگلیوں میں تو جادو بھرا تھا۔ انگلیاں تھیں کہ مشین۔"

اور اس دن تو تم نے کہا تھا کہ مشین تو بس مشین ہی ہوئی۔

پردیسی نے سوچا، مگر چُپ رہا ہے۔

اُستاد نے اپنی اکلوتی آنکھ اِدھر اُدھر چلائی اور پھر کہنا شروع کیا ہے۔

"اور جی میں نے بڑی مدد کیتی اس کی۔"

یہاں پر کانے استاد کی آواز پھر بھاری ہوگئی ہے۔ "دس روپیہ ہفتہ، ایک گلاس دودھ روز۔"

"اچھا تم دودھ بھی دیتے ہو ان لڑکوں کو؟"

پردیسی محقق نے اپنی ڈائری میں نوٹ کیا۔

"تو اور کیا جی۔ دودھ تو بڑی نعمت ہے۔ جس کو دودھ دوگے وہی تمہاری گودی میں آگرے گا۔ اور کس واسطے ماں کے گوڈوں تلے جنت آگئی ہے۔ اسی دودھ کی خاطر۔" اپنی دُھن میں اُس نے نقشہ ایک بار پھر اٹھالیا ہے اور شاید پردیسی نے اس مخصوص قسم کے قالین پر جو شکارگاہ کے نقشے پر تیار کیا جا رہا ہے، اپنی تحقیق مکمل کرلی ہے۔

میں نے اپنی اس تحقیق کے سلسلے میں فارسی پڑھی، تاجیک اور اُزبیکی، سمرقند و بخارا گیا۔ اصفہان، کوئٹہ اور قصّہ خوانی کے بازار میں قالینوں کی منڈیاں دیکھیں، روندیں گھسنے کی خاطر بازاروں میں پھیلائے ہوئے قالین وران پر سے گزرتے ہوئے قالین بافوں اور قالین خریدنے اور فروخت کرنے والوں کے قافلے، قالینوں کے انباروں سے اٹا اٹ خیموں میں بڑی تمکنت سے وزرانوں بیٹھے الف لیلوی داڑھیوں اور پگڑیوں والے تاجر، سچی چینی کے پھولدار سرخ اور نیلے روسی چائے دانوں اور تانبے کے نقشین سماواروں میں بھبکتی چائے اور کھنکتے فنجانوں کے تمام پس منظر کو اپنے ذہن میں سمیٹا اور یہاں پر آکر شاید میری تحقیق مکمل ہوئی۔ جبکہ میں خود اس تانی پر لرزتے رنگوں میں سے ایک تار کو بھی اِدھر سے اُدھر نہیں گزار سکتا۔

اور میری یہ انگلیاں کتنی بے ہنر ہیں۔ اس نے بغور اپنی مخروطی اور صحت مند انگلیوں کو دیکھا ہے اور ان انگلیوں کو یاد کیا ہے جن میں پشتوں کا جادو بھرا تھا جن کی پشت پر خوب صورت اور محیر العقول الوانیں، شالیں اور اخروٹ کی لکڑی پر اُبھرے نفیس و نازک نقش تھے۔ وہ انگلیاں، جن کے گم ہو جانے پر استاد کو نقشہ بولتے وقت روانی کی کمی بار بار محسوس ہو رہی ہے اور میں خوش ہوں قالین بُننے والو کہ تمہاری سنگیت میں سے ایک سنگت اور بچھڑی۔

پہلے تم نے ان چناروں کو گم کیا جن کے تنوں سے ٹیک لگا کر تمہارے آباد اجداد نے الوانیں اور شالیں تیار کیں تم اپنے چیلے، بد وضع اور طلسماتی نقشے ہاتھوں میں اٹھائے اِدھر سے اُدھر بھٹکتے پھرے.... اور اب خیر میں خوش ہوں کہ میرا تھیسس مکمل ہے اور اب تم اپنی نامکمل شکارگاہ کو بہرحال پورا کر ہی لوگے۔

پردیسی دالان نما کمرے سے باہر نکل آیا ہے اور نیلی مرسیڈیز میں بیٹھ رہا ہے اور اس نے دیکھا ہے کہ وہ نیم برہنہ چھوٹا سا جسم آپ اپنے طور پر مکمل ہے اس کا سیدھا ہاتھ جو پلاسٹر میں ہے گلے کے ساتھ لٹکے رومال میں جھول رہا ہے۔ دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوتی لکڑی

سے وہ لوہے کے ایک بڑے پہیئے کو گردش دے رہا ہے۔ کھڑکی کی سلاخوں سے کود کر باہر آتی ہوئی منھی ہوئی گونجیلی آواز یہاں سے وہاں تک سنائی دے رہی ہے۔

"فیر سات حالی دو اُریب نال اک طوطی رنگے۔ فیر اک اریب اک مشکی نال گلابی پھر گیارہ حالی اک رنگے۔"

"آہو جی۔" چھوٹی چھوٹی سی بے حقیقت آوازوں کا کورس باہر آیا اور لوہے کا یہ پہیہ لڑکے سمیت گلی کے نکڑ سے غائب ہو گیا۔

جون ۱۹۶۶ء

تنقید سانس لینے کی طرح ناگزیر ہے، یہ ایک مبہم جملہ ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب نے اٹھا کر اس کو بالکل دوسری طرف موڑ دیا اور انتہا پسندانہ انداز ہی میں سہی، لیکن اسے نفسیاتی اور علمی مسائل کی طرف متوجہ کرایا۔ انہوں نے ریلیٹ کے قول کو اس کے سیاق و سباق سے الگ کر کے جس طرح پیش کیا ہے وہ غور طلب ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:-

"تنقید ایک فطری نعمت اور بیش بہا دولت ہے، اتنی ہی فطری اور بیش بہا جتنی کہ بینائی یا گویائی کی نعمت ہے بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ۔ لیکن بینائی یا گویائی ہی کی قدر و قیمت کو ہم پوری طرح کب پہچانتے ہیں؟ عام طور پر تو لوگوں نے بس فرض سا کر لیا ہے کہ ہاں یہ چیزیں بھی ہیں حالانکہ یہ چیزیں بھی اتنی ہی ناگزیر ہیں جتنی کہ نفس کی آمد و شد ہمارے لئے ناگزیر ہے۔ اصل یہ ہے کہ ان نعمتوں کی فطریت اور ناگزیری نے ان کی حقیقی قدر و قیمت اور حیثیت و منزلت کو ہماری نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔ بچہ اپنی آنکھوں کو استعمال کرتا ہے اور ان کا استعمال خود بخود ہی سیکھتا ہے۔ اس کی قوت گویائی نشوونما پاتی ہے تو اس کی نشوونما بھی تقریباً آپ سے آپ ہوتی ہے۔ اس میں ایک بات یہاں اور جوڑ لیجئے کہ بچے کی تنقیدی صلاحیت و استعداد بھی اسی طرح بالکل فطری اور طبعی انداز سے خود بخود بڑھتی اور ابھرتی ہے۔ یہ صلاحیت بڑی دھیمی رفتار سے ابھرتی ہے اور بالکل غیر مرئی ہوتی ہے۔ اگرچہ ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جہاں ہم اسے دیکھ بھی سکتے ہیں کہ فرق و تمیز کی صلاحیت بچے کے اندر صاف نمایاں ہے مثلاً دو کھلونے اس کے سامنے رکھ دیجئے پھر دیکھئے ان میں سے ایک کو وہ پسند کرے گا اور دوسرے کو صاف رد کر دے گا۔"

عکس تحریر:- سید احتشام حسین

# بے موسم کا پھل

فہیم اعظمی

باہر دھوپ تیز تھی۔ سایہ تھا مگر اُس سے دور۔ درختوں کے پتے زرد۔ جھاڑیاں کچھ سوکھی اور سفید اور کچھ ہری پتوں سے ڈھکی ہوئی تھیں لیکن وہ بھی سوکھنے اور سفید ہونے کا انتظار کر رہی تھیں۔ سوکھے پتوں کے اندر بہت کچھ تھا۔ سایہ، ہریالی، ترو تازگی، خوشبو مگر اُن کے اندر کون جھانکتا ہے۔ سب اوپر دیکھتے اور چلے جاتے تھے۔ انہوں نے نہ تو ٹکسٹ بک پڑھی تھی بوٹنی (BOTANY) کی ظاہری باتوں کو جانتے تھے۔ اوپر سے دیکھتے تھے اور سمجھ جاتے تھے کہ پودے مر چکے ہیں اور اُن کا دوسرا جنم صرف رُت بدلنے کے بعد ہی ممکن ہے۔

وہ یہی سوچتا ہوا دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد اُسے ایک پودا نظر آیا۔ اُسے ایسا لگا جیسے وہ آواز دے رہا ہو "میرے قریب آؤ۔ میں بھی تمہاری طرح ہوں رُت گذر چکی ہے لیکن میں اب تک اُس کے اثر میں ہوں۔ دیکھو میری ہری پتیاں اور میرے پھول۔ کیا خیال ہے؟"

وہ پودے کے قریب چلا گیا اور اُسے غور سے دیکھا۔ اُسے یہ جاننے میں دِقّت ہو رہی تھی کہ یہ کونسا پودا ہے۔ اُس کے ساتھ پودے کی کسی ایک صنف کو منسلک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کبھی اُس کی پتیاں گلاب جیسی نظر آتی تھیں، کبھی موتیا جیسی، کبھی کیکٹس کے اندر سے پُر آب اور اوپر سے سوکھے پتے کا گمان ہوتا تھا۔ کبھی نرگس کی خود پسندی نظر آتی تھی کبھی زینیا کی ہر دل پسندی۔ پھر اُس نے اُس کی شاخوں کو دیکھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اُن پر دھوپ کا کوئی اثر نہ تھا۔ ہری بھری، نازک، سیدھی، لہراتی ہوئی، صاف، درشفاف۔ پھر اُس نے اُس پر لگے ہوئے پھولوں کو دیکھا۔ کوئی پھول مکمل نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اُس کی پنکھڑیاں ایک دوسرے سے الگ ہو چکی ہیں اور اُن میں یک رنگی بھی نہ تھی۔ کچھ پنکھڑیاں گلابی، کچھ چمپائی، کچھ ہارسنگھاری، کچھ سوسنی، کچھ نرگسی اور کچھ آدھی سُرخ اور آدھی سفید۔ اُس نے اپنی آنکھیں ملنی شروع کیں اور ہر بار آنکھیں مل کے پودے، پتوں، شاخوں اور بکھرے ہوئے پھولوں کو غور سے دیکھتا رہا لیکن اُن میں کوئی تبدیلی نظر نہ آئی۔ بس ایسا لگتا تھا کہ کوئی آواز اُس کے کانوں میں آ رہی ہے جیسے کوئی کہہ رہا ہو "ہاں ہاں، تم صحیح جگہ پر آ گئے ہو۔ ہم خود تمہارے قریب آنا چاہتے تھے۔ ہمیں یقین تھا تم ضرور آؤ گے۔ تم مرجھائی ہوئی جھاڑیوں سے ڈرو گے نہیں۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کوئی تمہارا منتظر ہے۔ قریب آؤ۔" اُسے ہنسی آ گئی اور اُس کے غیر منطقی خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ اُس نے سوچا "یہ آواز" اور ہر طرف خاموشی تھی۔ اُس نے سوچا "یہ پودا" اور اُسے اپنے چاروں طرف پودے دکھائی دیئے، موسم زدہ، بے آب، جھلسے ہوئے بے پھل، بے پھول۔ یہ سوچ کر وہ آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ کسی نے اُسے پیچھے سے آواز دی "دیکھو منطق کی دنیا میں یہی ہوتا ہے۔ مگر جو تم دیکھ رہے ہو وہ حقیقت نہیں ہے۔ یہ منظر نقلی ہیں۔ اِس کے پیچھے کی حقیقی دنیا کو دیکھو جو زندہ ہے اور جس پر موسم کا اثر کبھی نہیں ہوتا۔"

ایسا لگا جیسے غیر شعوری طور پر اُس کے نطق میں کسی نے الفاظ بھر دیئے ہوں۔

"لیکن اس پر تو موسم کا اثر ہے؟"

"ضرور ہے، مگر تم جو آ گئے۔"

"میں کیا کروں؟"

"اسے سیراب کرو۔"

اُس کے قدم رُک گئے۔ جیسے کسی جادوگر نے خطِ حصار کھینچ دیا ہو۔ وہ اُس سے نکل نہیں سکتا تھا۔ وہ پودہ پھر اُس کے سامنے تھا۔ بالکل پہلے کی طرح، کئی رنگ کا، کئی روپ کا۔ وہ اُسے کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ اُس کی صنف شاید اُس کے علم میں ایک نیا اضافہ تھا۔ لیکن اُس کے احساسات پر وہ آخری جملہ چھایا ہوا تھا۔ 'اِسے سیراب کرو'۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک طرف چل پڑا۔ جھاڑیوں اور درختوں کے جھنڈ سے نکل کر وہ ایک پگڈنڈی پر آ گیا۔ بہت ہی ناہموار پگڈنڈی جسے لوگ عرصے سے استعمال کر رہے تھے لیکن کسی کو اُس کے گڑھے اور ٹیلے پاٹنے کی توفیق نہ ہوئی تھی۔ ابھی وہ پگڈنڈی کی ناہمواری۔ بے نام پودے کی سیرابی اور اپنی غیر ارادی جستجو کے بوجھ تلے اپنی وجودی فکر میں مبتلا تھا کہ کہیں سے آواز آئی۔

"کے سَرا سَرا"

وہ وہیں رُک گیا۔ اُس نے پھر غور سے سُنا۔ عجیب درد تھا اُس آواز میں۔ اُس نے سوچا یہ تو بہت پرانی آواز ہے۔ ہزاروں سال پرانی۔ شاید خطِ استوا پر کھڑے ہو کر پہلے آدمی نے آسمان کو دیکھا تھا اور یہی آواز دی تھی۔ جب سے یہ سینہ بہ سینہ۔ کتاب بہ کتاب، صحیفہ بہ صحیفہ، داستان بہ داستان، کہانی بہ کہانی۔ قلم بہ قلم۔ تاریخ بہ تاریخ سنائی دیتی رہی ہے۔ یہ کلیشے ہے مگر ایسا کلیشے جسے اِنحرافی اور انقلابی بھی ختم نہ کر سکے۔ شاید اِس لئے کہ یہ آدمی کے وجود کا حصہ ہے۔ ایک کا مپلیکس۔ وہ اُس آواز کی سمت کھنچتا چلا گیا۔ اُسے پگڈنڈی کے کنارے ایک آدمی نظر آیا، موسم گزیدہ، مردم رمیدہ، دل کبیدہ، رُو کشیدہ، وہ سر جھکائے بیٹھا تھا اور اُس کے منہ سے وہی کلیشے نکل رہا تھا۔ 'کے سرا سرا'۔

"کون ہو تم؟ کیا میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں؟"

اُس نے سر اُٹھا کر غمگیں نگاہوں سے دیکھا۔

"پہلے تمہارے دوسرے سوال کا جواب نہیں۔"

"اور پہلے سوال کا؟"

"تم کیوں جاننا چاہتے ہو؟"

"بس یونہی، فطری تجسس، ہمدردی، ہم آہنگی، تم آدمی ہو نا۔"

"ہاں۔ اب تو آدمی ہوں۔"

"اب کیوں؟"

"پہلے کچھ اور تھا اور آدمیت کی سرحد کے باہر چلا گیا تھا اور لافانی ہونے کی خواہش تھی۔"

"یہ تو کوئی بات نہیں، ہر آدمی میں یہ خواہش ہوتی ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"نسل کشی، آواگون، مسوزنگ باشیت، اوراق، الفاظ، امر کہانی، کچے گھڑے، ریت کا طوفان، انا الحق، شہادت، جن، بھوت، پریاں، سانپ کی سو سالہ زندگی، شبرات کا حلوہ، تاج محل، مقبرے۔

اور کیا کیا بتاؤں تمہیں۔"

"میرا طریقہ دوسرا تھا ڈائرکٹس ایکٹس (DIRECTUS ACTUS)"

"یہ کون سی زبان ہے ؟"

"لاطینی"

"تمہیں لاطینی آتی ہے ؟"

"اگر نہ آتی تو میں 'کے سرا سرا' کیسے کہتا ؟"

"وہ تو کلیشے ہے ۔"

"نہیں ۔ اس کی دائمی افادیت ہے ۔ کٹماایس آئے ۔ (KTema es aei)"

"اور یہ کون سی زبان ہے ؟"

"یونانی"

"تمہیں ساری زبانیں آتی ہیں ؟"

"ہاں ۔ اسی لئے میں امر ہونا چاہتا تھا ۔"

"اچھا اب بتاؤ ۔ کون ہو تم ؟"

"سکندر ذوالقرنین ۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور ایک طرف کو جانے لگا ۔ پھر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا ۔

"اور تم کون ہو اور کہاں جا رہے ہو ؟"

"دوسرے سوال کا جواب پہلے اور پہلے سوال کا جواب ضروری نہیں کیونکہ میں ایک معمولی آدمی ہوں ، اور امر بننا نہیں چاہتا ہوں ۔ ــــ ...."

"میں جانتا ہوں ۔ تم جھوٹ بولتے ہو ۔ تمہیں بھی وہی چاہیئے اِلکزیر (ELIXIR)"

"وہ کیا ہوتا ہے ؟"

"تم پہلے بتاؤ ۔ مٹی کو سونا بنانا ہے ؟"

"نہیں بے موسم کے پھول کھلانا ہے ۔"

"اچھا تم اس پگڈنڈی کے پار ۔ درختوں سے ہوتے ہوئے پہاڑ کے نیچے اتر جاؤ مگر ۔ نو ۔ جب میں نہیں حاصل کر سکا تو تمہیں کیسے ملے گا ؟"

"تم نے تو اپنے لئے حاصل کرنا چاہا تھا نا ۔ میں تو دوسروں کے لئے لینے جا رہا ہوں ۔ مجھے ضرور ملے گا ۔ بس تم نے راستہ بتا دیا ، تمہارا شکریہ ۔"

'کے سرا سرا' کی ایک اور دلگیر آواز آئی ۔ وہ پگڈنڈی پار کر چکا تھا اور ایک خوبصورت جھیل کے کنارے کھڑا تھا ۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا ۔ جانی پہچانی زمین ، جانی پہچانی فضا ۔ پھر اسے جھاڑیوں کے اوٹ سے کچھ آوازیں سنائی دیں ۔ بہت ہی سریلی آوازیں ۔ لیکن اسے ان آوازوں سے کیا کام ۔ وہ تو اس وقت ایک مقصد کا اسیر تھا اور جمالیات کی متنوع شکلوں کو پہچاننا نہیں چاہتا تھا ۔ اس نے جھیل سے پانی نکالا اور چلنے ہی والا تھا کہ اسے کئی خوبصورت لڑکیاں نظر آئیں جو اس کی راہ میں حائل تھیں اسے دیکھ کر انہوں نے ایک ہنسا سا قہقہہ لگایا ۔ اسے کچھ عجیب سا محسوس ہوا ۔ اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کے لئے اس نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا ۔

"وہ جنگل ہے نا۔ پہاڑی کے اُس طرف۔ وہاں ایک پودہ ہے۔ میں جھیل سے پانی لینے آیا تھا۔ اُس پودے میں پھول کھلانے کے لئے۔"
لڑکیوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ پھر سب نے ایک ساتھ ہنسنا شروع کیا۔ ایک لڑکی نے آگے بڑھ کر کہا۔
"میں تمہارے قریب آجاؤں۔"
"مگر کیوں؟ کیا یہ جھیل تمہاری ہے؟"
"ہاں۔ مگر کوئی بات نہیں۔ اس جھیل سے بہت سے لوگ پانی لیتے ہیں۔ مگر لوٹ کر کوئی نہیں آتا۔"
"مگر میں تو پھر آؤں گا۔ مجھے پھول جو کھلانے ہیں۔ اُس جنگل میں جو پودا ہے نا....
"یہاں کوئی جنگل نہیں ہے۔ تمہیں دھوکا ہوا ہے۔ یہاں تو سب باغ ہی باغ ہیں۔"
"مگر وہ پودہ۔ اُس میں پھول کھلانے ہیں۔"
"موسم تو گذر گیا۔"
"مگر میں بے موسم کا پھول کھلانا چاہتا ہوں۔" اُس نے میں پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اُس لڑکی نے پھر دوسری لڑکیوں کی طرف دیکھا اور سب کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
"میں تمہارے قریب آجاؤں۔"
"آجاؤ۔ مگر مجھے بے موسم کا پھول کھلانا ہے۔ اس لئے...."
"اسی لئے تو میں تمہارے قریب آنا چاہتی ہوں۔ میں اُسی کو پسند کرتی ہوں، جو مجھ سے دور جانا چاہتا ہے کیونکہ یہ روٹین نہیں ہے۔"
"اچھا آجاؤ۔ مگر مجھے جانا ہے۔ اُس پودے میں پانی دینے کے لئے۔"
"ضرور جاؤ۔ یہ بھی روٹین نہیں ہے۔ بے موسم کا پھول کھلانا روٹین سے انحراف ہے اور اسی لئے میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔"
لڑکی قریب آگئی تھی۔

"تم آؤ گے نا؟"
"ویسے میں عام طور سے بھیڑ سے گھبراتا ہوں مگر اس جھیل پر ضرور آؤں گا۔
سکندر ذوالقرنین نے کہا تھا کہ یہ آبِ حیات ہے مگر تم لوگ کون ہو۔ اور یہ کون سی جگہ ہے۔
"یہ تو تمہیں بعد میں معلوم ہوگا، جب پھول کھل جائے تو یہاں ضرور آنا۔ میں تمہیں یہیں ملوں گی۔ اسی جھیل کے کنارے۔"
"تم پانی نہیں پیو گے؟"
"نہیں۔ میں اَمر نہیں بننا چاہتا۔ میں تو اُس بے موسم کے پھول کو اَمر بنانا چاہتا ہوں۔"
وہ پانی لے کر پلڈرسے سے پاس آیا اور اُس میں پانی ڈالے۔ وہ روز جھیل پر جاتا تھا اور پانی لاتا تھا مگر اُسے وہ لڑکی بھی نظر آتی رہی اور جب اُس پودے میں پھول کھلا تو اُس میں طرح طرح کے پھولوں کا رنگ تھا۔ ایسا پھول جو کسی ایک نام سے نہیں جانا جاسکتا تھا، وہی جو ہی چمپئی سوسنی۔ نرگسی، زیبا، ور کنول کی ملی جلی پتیاں اور رنگ، بالکل نرالی تخلیق۔ اُسے یاد آنے لگا کہ اُس نے کہا تھا۔
"پھول کھلنے کے بعد صرف خواب نہ دیکھتے رہ جانا۔ یاد رکھنا تمہیں واپس آنا ہے۔ عمل کرو گے نا، اپنے وعدہ پر۔"
"ہاں وعدہ۔" اُس کی زبان سے خود بخود نکلا۔ "میں وعدہ ضرور پورا کرتا ہوں۔"

وہ پھر جھیل کے کنارے کھڑا تھا۔ پریم سے اُگایا ہوا بے موسم کا پھول اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی نہیں تھا پھر جھیل کے پانی میں موجوں کے اُبھرنے کی آواز آئی وہ ساحل پر آگئی۔

"تم جل پری ہو؟"

"نہیں صرف پری ہوں، جل اور تھل میرے لئے دونوں برابر ہیں۔"

یہ کہ کر وہ جھاڑیوں کی اوٹ میں چلی گئی اور جب وہ پھر سامنے آئی۔

تو اُس کے بے موسم کے پھول کی طرح اُس کے جسم پر کئی رنگ کے کپڑے تھے۔ اُن رنگوں کو کوئی نام نہیں دیا جاسکتا تھا۔ سُرخ، ہرا، آسمانی، نیلا اور وہ بہت خوبصورت نظر آرہی تھی۔ وہ قریب آگئی۔

"پھول لائے ہو؟"

"ہاں۔ دیکھو نا۔ یہ جھیل کے اَمر جل سے سینچے ہوئے پودے کا پھول ہے۔ تم جانتی ہو اس کا نام؟"

"اس کا کوئی نام نہیں۔ یہ اَمر پھول ہے۔"

ایک لمحہ کے لئے خاموشی ہوگئی۔ وہ ہنستی رہی اور کچھ کہتی رہی۔ اُس نے کچھ نہ سُنا۔ صرف اُسے دیکھتا رہا اُس نے کہا۔

"کہاں کھو گئے؟"

اور اُسے ایسا لگا جیسے وہ کسی گہری نیند سے جاگ گیا ہو۔

"ہاں۔ یہ پھول"

"اسے میرے جوڑے میں لگا دو۔"

"مگر تمہارے جوڑے میں پہلے ہی پھول لگا ہوا ہے۔"

"ہاں۔ مگر یہ روٹین ہے۔ موسم کا پھول جسے میں عادتاً لگاتی ہوں۔ تمہارا پھول نیا ہے اور بے موسم کا، بے نام، اَمر پھول۔"

"تمہیں کیوں پسند ہے؟"

"اس لئے کہ ہم سب روٹین سے ہٹنا چاہتے ہیں۔ جدّت کے خواہاں ہیں، مگر ہم اپنے آپ سے جھوٹ بولتے ہیں۔ ہمارے اوپر برسوں کا بوجھ ہوتا ہے، رشتوں کا، دولت کا، آسودگی کا، معاشرے کا اور سچ اُس کے نیچے دبا ہوتا ہے، جھوٹ کا سہارا ضروری ہوتا ہے، موسمی باتیں، موسمی کپڑے، موسمی پھول ہماری زندگی کی روٹین ہے اور میں۔ میں تمہاری طرح روٹین توڑنا چاہتی ہوں۔ بے موسم کا پھول لگا کر۔"

"تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔"

وہ ہنسی۔ بہت ہی دلفریب اور دلکش ہنسی۔ اُس میں طنز بھی تھا اور پیغام بھی۔ نئی رُت کا پیغام۔ پھر اُس نے کہا۔

"میرا نام مونیکا ہے۔"

"مونیکا! جس نے وشوامتر کی تپسیا خراب کی تھی۔"

"وشوامتر کی تپسیا خراب ہونے کی کہانی جھوٹی ہے۔"

پریم تپسیا کو سپھل کرتا ہے، اُسے خراب نہیں کرتا، آؤ، میرے جوڑے میں پھول لگا دو۔"

"اور جب وہ پھول لگانے کے لئے بڑھا تو اُس کے ہوش و حواس باقی نہ رہے

بجلی چمکی، پھر بارش ہوئی۔ آبِ نیساں کی پہلی بارش جو جھیل کی سیپیوں میں گئی اور اُس کا منہ کھل گیا۔ اُس میں سے موتی جھانکنے لگا، اور وہ بانس میں گئی اور بنس لوچن پیدا ہوا، اور خوشبو پھیلی، اُس نے کہا۔

"تمہیں تنکنلا چاہیئے؟"

"نہیں، مجھے صرف مونیکا چاہیئے۔"

وہ پھر پودے کو پانی دے رہا تھا۔ اُس نے بے موسم کے کئی پھول کھلائے اور جھیل کی طرف گیا مگر راستے مسدود ہو چکے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ پہاڑی بہت اُونچی ہو گئی ہے۔ وہ اُس پرسے گذر نہیں سکتا تھا۔ وہ واپس آگیا اور پھر نجانے کہاں گیا۔ ایک دردناک آواز جنگل اور وادی میں صدیوں تک گونجتی رہی۔

"کیے سراسرا!"

لیکن اُسے سننے والا کوئی نہ تھا۔

جولائی ۱۹۸۷ء

مگر نرم رنگین شاخوں پہ یہ جھولتی نرم رنگین چڑیاں
کرّہ کی سرحدوں کے کرخت پاسبانوں
کو چھو کر گزرتی ہواؤں کے آزاد جھونکے
کھلی کھیتیوں میں کھلے آسماں کے تلے، کچھ کھلے سانس لینے کی مُہلت
بڑوں کی لڑائی کے باوصف، آپس میں شیر و شکر رہنے والے یہ بچے
لڑکپن کے ساتھی سے —— (جو کچھ بھی نہیں بن سکا) —— مل کے دل کا دھڑکنا
کوئی دُکھ بھری داستاں پڑھ کے آنکھوں میں آجانے والے یہ آنسو
یہ حسّاس شاخوں پہ حسّاس پھولوں کا انجام سے بے خبر ہو کے کھلنا
یہ کچھ نوجواں دوستوں کا صباح و مسا
احمقانہ، مگر بے غرض مل کے کُلنا
خداوندِ عالم کے قدموں میں
اپنے تھکے ہارے ماتھے کو رکھ کر
شکر گزار ہونے کا احساس ہونا

عکسِ تحریر: خورشید رضوی

# دردِ افزوں سہی

ام عمارہ

ناجیہ میری جان! اب چپ بھی ہو جاؤ پیاری! کیا تم نے ان نرگسی کٹوروں کی ساری شراب ضائع کر دینے کی قسم کھائی ہے جنھیں تمھارے محبوب نے ساغرِ شراب اور بادۂ گلابی سے تشبیہ دی ہے اور جن کے بارے میں وہ اب تک کہتا رہا ہے کہ ناجیہ کی آنکھیں تو ایسی ہیں جیسے کنول کی پنکھڑیوں پر بھونرے بیٹھے ہوں۔

اور ذرا سوچو تو جب اسے پتہ چلے گا کہ ناجیہ نے اپنی آنکھیں رو رو کر خراب کر لی ہیں اور اب وہ آنکھیں اپنی تمام دلکشی کھو چکی ہیں تو یقین جانو اُسے بہت رنج ہو گا۔ کیونکہ اسے تمھارے ساتھ تمھاری آنکھیں بھی بہت پیاری ہیں۔

ہاں ہاں، یہ ٹھیک ہے کہ اب یہ آنکھیں اس کی نہیں ہو سکیں گی۔ لیکن پیاری میں سچ کہتی ہوں (کم از کم میرے خیال میں) تمھارے محبوب کا پیار بھونرے کا نہیں جو پھول سے اس کا طالب ہو بلکہ اس کا پیار تو بلبل کا ہے، لیکن بھئی بلبل کا پیار سچا سہی لیکن اس کی تشبیہ پرانی اور روایتی ہے، اور میں اسے کسی نئی چیز سے تشبیہ دینا چاہتی ہوں، اس لئے ڈیر، تم ذرا چپ ہو کر کوئی نئی تشبیہ سوچنے میں میری مدد کرو، اچھا تو تم کہہ رہی ہو کہ مارے غم کے میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے اور اور میرے دماغ میں کسی نئی چیز کے سوچنے کی صلاحیت نہیں۔ خیر بھئی مت سوچو لیکن تم مجھے بھی تو سوچنے کی مہلت نہیں دے رہی ہو۔ سوچو تو میری جان!! میں تمھیں کب سے کہہ رہی ہوں کہ آخر یہ صرف تمھارے ہی ساتھ تو نہیں ہوا۔ بلکہ ہمارے اس فرسودہ معاشرے میں تو ہمیشہ سے ایسا ہوتا آیا ہے۔

مت روؤ بھئی، مت روؤ!! اب میرا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ اگر تم اسی طرح روتی رہیں تو میرے سوچنے کی تمام تر صلاحیتیں یکدم مفقود ہو جائیں گی۔

اور پھر یہ کوئی ایسا غم بھی تو نہیں جیسے ہمارے آس پاس یہ ہزاروں غم جو بکھرے پڑے ہیں کبھی تم نے ان کے بارے میں بھی سوچنے کی کوشش کی۔ آخر ان دکھوں کی بھی تو کوئی وجہ ہو گی۔ آؤ نا پیاری ہم اپنا غم بھلا کر ان بے شمار غموں کے بارے میں سوچیں جو ہمارے اردگرد بکھرے ہیں۔ کیا کہا؟ تمھیں ان دکھوں کے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں کیونکہ تمھیں اپنا ہی غم بہت ہے؟ لیکن ڈیر تمھارا غم تو یہی ہے نا کہ تمھیں تنویر سے الگ کیا جا رہا ہے اور یہ تمھارے لیے بہت کٹھن ہے۔

مگر سوچو تو اس کے سوا تمھاری امی بیچاری کر بھی کیا سکتی تھیں۔ تمھارے علاوہ اور کوئی دوسرا سہارا بھی تو ان کا نہیں تھا جس کا وہ آسرا کرتیں۔ وہ تو ایسا کرنے پر مجبور تھیں۔ ان کو تمھارے علاوہ ارشد، حامد اور نازیہ کا بھی تو خیال ہے، جن کے لئے تمھارے ابو کچھ بھی نہیں کر گئے۔ اس لئے اگر تمھاری امی نے تمھیں تنویر سے منسلک کرنے کی بجائے اس سے الگ کر دیا تو کیا بے جا ہے؟ تمھیں تو اپنی اس قربانی پر خوش ہونا چاہیئے جس سے تمھارے معصوم بہن بھائی کا بھلا ہو۔ تو تم کہہ رہی تھیں کہ تم اتنی بہادر نہیں ہو کہ اپنی خوشی دوسروں کی

ضرورت پر قربان کر کے خوش رہ سکو۔" لیکن میری جان! اب رونے سے کیا فائدہ، جبکہ تم اچھی طرح جان رہی ہو کہ بات اپنے قابو سے نکل چکی ہے۔ اب تو تمھیں خوش ہی رہنا چاہیئے۔ سنو تو بھئی ـــ میری طرف دیکھو نا ـــ میں کیا کہہ رہی ہوں ـــ اونہہ ـــ تم تو بس روئے جا رہی ہو۔ میری کچھ سنتیں ہی نہیں ـــ دیکھو تو ـــ آخر اسی بلڈنگ میں تمہارے فلیٹ کے ارد گرد بہت سے ایسے لوگ بھی بستے ہیں جو تم سے کہیں زیادہ دکھی ہیں لیکن پھر بھی وہ اپنے آپ کو خوش و خرم رکھنے کی کوشش کرتے رہیں۔ تمہاری طرح رو رو کر اپنے دکھوں کا اعلان نہیں کرتے۔

اسی جانے سے ایجنٹ اور اس کی بیوی کو لے لو نا جو تمھارے فلیٹ کے بعد والے میں رہتے ہیں۔ کتنے عجیب ہیں وہ۔ اس کی بیوی کے خمیدہ لبوں پر ہمیشہ ایک کرب پنہاں رہتی ہے۔ بتاؤ تو تم نے آج تک یہ سوچا کہ آخر وہ بار ہا اتنی اداس کیوں رہتی ہے اور ایک اداس مسکراہٹ اس کے چہرے پر کیوں رقصاں رہتی ہے جب کہ اس نے تمہیں بتایا تھا کہ اس کا شوہر کبھی اس کا محبوب بھی رہ چکا ہے۔ لیکن وہ آج اپنے محبوب کے ساتھ زندگی گذار کر بھی کیوں خوش نہیں ہے۔ بظاہر تو کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی لیکن جہاں تک میرا خیال ہے اقتصادی بدحالی نے ان کی محبت کی کمر توڑ دی ہے کیونکہ جب کل میں تمہارے کمرے میں تھی تو ان کی گفتگو کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس لیے کہ وہ اس کمرے میں گفتگو کر رہے تھے جو تمہارے کمرے سے ملا ہوا ہے اور ان کی آواز اتنی بلند تھی کہ انسان ان کی ساری باتیں سننے پر مجبور ہو جائے۔ اس کی بیوی ایک ساری کا تقاضا کر رہی تھی جس کے لانے کا وعدہ ایک ہفتہ قبل کر چکا تھا لیکن اس کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ جارجٹ کی ایک معمولی سی ساری لا کر اپنی بیوی کو خوش کر سکتا۔

اور اب اس کی محبوبہ یا بیوی جو کہو اس سے بدگمان ہوتی جا رہی ہے کہ اب وہ اس سے ویسی محبت نہیں کرتا ہے جیسی پہلے کیا کرتا تھا۔ اس کی بیوی یہ نہیں سوچتی کہ اس کا محبوب سیدھا سادا سا ایجنٹ ہے جو اس کے لیے جان تو دے سکتا ہے لیکن اس کی نت نئی فرمائشیں پوری نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ ایک محبوب نہیں بھائی بھی ہے۔ اور صرف بھائی ہی نہیں، بیٹا بھی ہے اور بیک وقت بیٹا، بھائی اور محبوب بننے کے لئے کسی کی ایجنسی کافی نہیں اور اسی لیے وہ بہت ساری چیزیں جان بوجھ کر بھول جاتا ہے اور اس کی بیوی اس سے بدگمان ہوتی جا رہی ہے کہ وہ اس سے اتنا پیار نہیں کرتا جتنا کہ پہلے کرتا تھا۔ بقول تمھارے بار ہا ان دونوں کی ان بن ہو جاتی ہے اور وہ ہفتوں ایک دوسرے سے روٹھے رہتے ہیں اور اس درمیان اس کی خوبصورت بیوی مسلسل پریشان اور روٹھی سی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے لبوں کی وہ اداس مسکراہٹ کہیں کھو جاتی ہے اور وہ بھی اداس اداس رہتا ہے اور پھر جب وہ آپس میں میل کر لیتے ہیں تو جیسے ان کی زندگی میں بہار آ جاتی ہے۔ وہ چہکنے لگتے ہیں لیکن چہکنا بھی ان کا گھڑی دو گھڑی کا ہوتا ہے۔

اور پھر وہی اداسی وہی خاموشی ان کے درمیان تیرتی رہتی ہے تو کیا سچ مچ وہ اپنی بیوی کو اب نہیں چاہتا ہے۔ نہیں بھئی یہ بات نہیں ہے، وہ اب بھی اسے چاہتا ہوگا۔ وہ ان خوابوں کو جو (شادی سے پہلے اس نے دیکھے ہوں گے) اپنی زندگی میں سمو کر اسے خوشگوار سے خوشگوار تر بنا دینا چاہتا ہوگا۔ لیکن موجودہ بدحالی اس کی خوشگوار زندگی اور محبت کی دنیا میں ایک مسلسل عذاب بن کر شامل ہو چکی ہے، جس کی بدولت وہ خوش و خرم رہنے کی کوشش کرتے ہوتے بھی خوش نہیں رہ سکتا۔ سوچو تو یہ ان دونوں کے لئے کتنے صدمے کی بات ہے کہ وہ ایک دوسرے کے قریب رہتے ہوئے بھی خوش نہیں ہیں۔ اور اسے کتنا دکھ ہوتا ہوگا جب وہ یہ دیکھتا ہوگا کہ اس کی بیوی کے لبوں پر مسکراہٹ کی جگہ ایک نہ مٹنے والی کراہ قبضہ جمائے ہوئے ہے۔ دیکھو تو ڈیر! وہ کتنے دکھی ہیں۔ اگرچہ بظاہر ان کا کوئی دکھ نہیں ہے۔ لیکن حالات نے انھیں دکھی بنا دیا کیوں؟ میں سچ کہہ رہی ہوں نا۔ اسی طرح ہو سکتا تھا کہ تم بھی اپنے محبوب کے ساتھ خوش نہ رہ سکتیں کیونکہ تم بھی اس ایجنٹ کی بیوی سے کچھ کم عقلمند نہیں ہو، اور یہ صرف تم پر ہی موقوف نہیں، اس قسم کی سب لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ کیا ـــ؟ اوہ ـــ کوئی بات نہیں۔ میں جیسی بھی ہوں۔ لیکن ہوں تو تم لوگوں سے مختلف۔ یہ تو ماننا ہی پڑے گا۔ بہرحال میں کہتی ہوں بھئی کہ تم

سچ مچ نیّر کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی تھیں کیونکہ وہ بھی ایک معمولی انسان ہے جو تمھارا محبوب ہے۔ اپنی امی کا پیارا بیٹا ہے اور شیما کا پیارا پیارا بھیا ہے اور صرف ایک سو بچاس روپے حاصل کرتا ہے جو اس کے اپنے اخراجات کے لئے مشکل سے کافی ہوتے ہیں۔ کیا کہا ؟ "تم اس کے ساتھ ہر حال میں خوش رہ سکتی تھیں"! اتنی جذباتی مت بنو! تم جانتی ہو نا ؂

کہ زندگی کے تقاضے خیال و خواب نہیں

اور تم اپنی ضروریات تو نہیں بھلا سکتی تھیں۔ تمہیں ان کو پورا کرنے کی خواہش ہوتی ہی اور جب بیچارا نیّر کسی مجبوری کی بنا پر تمھاری فرمائشیں پوری کرنے سے قاصر رہتا تو تم اداس ہو جاتیں کہ تمہارا محبوب اب تم سے ویسی محبت نہیں کرتا جیسی پہلے کرتا تھا اور تم بدگمان ہو جاتیں اور یہ بدگمانیاں دن بدن ترقی کرتی رہتیں۔ یہاں تک کہ تمہارے درمیان بدگمانیوں کی ایک بڑی خلیج حائل ہو جاتی جیسی کہ اس ایجنٹ اور اس کی بیوی کے درمیان حائل ہے، لیکن تم یہ بھلا کاہے کو سوچتیں کہ نیّر ایسا کرنے پر مجبور رہے۔ اس کے سامنے تمہاری خواہشوں کے علاوہ چند ایسی ضرورتیں بھی ہیں جنکے تقاضے اسے تمہاری خواہشوں پہ ترجیح دینے پر مجبور کرتے ہیں۔ اگرچہ اسے یہ سوچ کر افسوس بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ بیوی کی معمولی سی خواہش بھی نہیں پوری کر سکا مگر تم تو بس یہی سوچتیں کہ نیّر اب تم سے ویسی محبت نہیں کرتا جیسی پہلے کرتا تھا۔

تم کہہ رہی ہو کہ مجھے کیا پتہ کہ تم یہ سب کچھ نہیں سوچتیں، تو پیاری یہ تو مجھے اسی وقت پتہ چل گیا تھا جب مجھے معلوم ہوا کہ تم نے یہ سنکر کہ تمہیں عبید کے ساتھ منسلک کیا جا رہا ہے اپنی امی کے خلاف احتجاجاً رونا شروع کر دیا۔ میں تو پہلے ہی سے جانتی ہوں کہ تم جذباتی ہو اور جذبات کی رو میں بہہ جانا تمہاری پرانی عادت ہے۔ بس تمہیں عبید کے بارے میں خبر ملی اور تم نے واویلا مچا دی۔ یہ ٹھیک ہے بھئی کہ یہ چیز تمھارے لیے ناقابل برداشت ہے اور تمھاری امی ایک طرح سے تم پر ظلم کر رہی ہیں۔ ہاں! ہاں!! یہ بھی ٹھیک ہے کہ وہ تمھاری معصومیت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ لیکن گڑیاں بہت سی مجبوریاں ایسی بھی انسان پر آ پڑتی ہیں کہ وہ بے بس ہو جاتا ہے اور جائز و ناجائز کچھ بھی نہیں دیکھتا۔

مثلاً ایک بہت بھوکے انسان کے سامنے روٹی کا ٹکڑا پھینک دو اور پھر دیکھو کہ وہ آنکھ بند کر کے روٹی پر کیسے جھپٹ پڑتا ہے، بالکل اسی طرح تمھاری امی نے کیا ہے اور انھوں نے جو بھی کیا مجبوریوں کے تحت کیا اور اسی بہتے پر کیا کہ نجمہ یقیناً بہت آسانی سے برداشت کر سکتی ہے۔ ارے نہیں بھئی! مجھے تمھاری امی نے اپنی وکالت کرنے نہیں بھیجا ہے بلکہ میں تم سے خود کہہ رہی ہوں کہ آنسوؤں کی بارش کو روک کر ذرا ٹھنڈے دل سے کچھ سمجھنے کی کوشش کرو کہ آخر تمھاری امی نے ایسا کیوں کیا اور وہ کونسی وجہ تھی جس نے انھیں ایسا کرنے پر مجبور کیا۔ تم کہتی ہو کہ وہ نیّر کو ناپسند کرتی ہوں گی، اس لیے انھوں نے ایسا کیا؟ درحقیقت ایسا نہیں ہے میری بنو، ایک حد تک تمہاری امی نے ضرورتوں کے تحت تمہیں نیّر سے الگ کر دیا ہے کیونکہ انھیں تمھاری خوشی کے ساتھ ساتھ تمھارے بہن بھائی کا مستقبل بھی عزیز تھا۔ جب انہیں تمھاری خوشی منظور تھی تو نیّر کو پسند اور ناپسند کرنے کا ذکر بیکار ہے جیسا کہ انھوں نے بتایا وہ بارہا سوچا کرتی تھیں کہ انہیں نیّر کے ساتھ بیاہ دیں گے لیکن حامد، ارشد اور نائیرہ کی زخیز جانیں ان سے اپنے نشوونما کے بارے میں بار بار کہہ رہی تھیں کہ "اگر تم نے ناجیہ کی خواہش پوری کر دی تو ہمارا کیا بنے گا۔ "ابو" تو جاتے ہوئے کچھ بھی نہیں کر گئے ہیں۔ اگر تم آپا کی خوشی کا خیال نہ کرو تو ان کی بدولت ہمارا مستقبل بھی سنور سکتا ہے، کیونکہ عبید بھائی کافی دولت مند ہیں اگرچہ تمھاری امی نے ان سوالوں کو پسِ پشت ڈالنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن حالات نے انہیں پریشان بنا رکھا تھا اور وہ ان مستقل تقاضوں کو جو سوتے جاگتے ان کے دماغ میں سوئیاں سی چبھتے رہتے تھے، باوجود کوشش کے بھی ان سے منہ نہ موڑ سکیں، جنھیں سوچ سوچ کر وہ کھل کھل جاتی تھیں۔ پھر انھوں نے ایک فیصلہ کر لیا اور تم ہو کہ اس فیصلے کو سن کر بے سوچے سمجھے روئے جا رہی ہو۔ اور میں ہوں کہ تمھارے ساتھ مستقل مغزماری کر رہی ہوں

تم تو بس ایک ہی رٹ لگائے جا رہی ہو "امی نے مجھ پر ظلم کیا ہے ، میں انھیں کبھی معاف نہیں کر سکتی ۔" میں کہتی ہوں ناجیہ تم پر تو وہی مثال صادق آتی ہے کہ "ساری رام کہانی کہہ سنائی پھر سیتا کس کی جورو ۔" اگر تمھاری امی نے ظلم بھی کیا اور بے بس ہو کر ۔ انھوں نے صرف تمھاری خوشی پر تین جانیں قربان کرنے کی بجائے اگر تمھاری خوشی ان تین زندگیوں پر قربان کر دی تو کیا غلط کیا ۔

اب تم کہہ رہی ہو کہ "امی نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا ۔ مجھے کوئی شکایت نہیں ۔" لیکن تم اب تک روئے جا رہی ہو ۔ سنو تو بہن ۔ ۔ ۔ آخر کب تک تم یونہی روتی رہو گی ۔ دیکھو تو ڈیر ! ۔ ۔ ۔ تمھیں سمجھاتے سمجھاتے میرا حلق سوکھ گیا ۔ اوہ تمھیں افسوس ہے کہ نیر کہے گا کہ ناجیہ نے بیوفائی کی ، وہ تم سے بدگمان ہو جائیگا اور آزردہ ہو کر تم سے پھر کبھی نہیں ملے گا ؟ مگر ڈارلنگ ! عنقریب شادی کے بعد تو اس سے ملنے کا سوال ہی تمھارے لیے بیکار ہے اور تمھاری بے وفائی کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ کبھی بھی تمھیں بیوفا نہیں کہے گا ، کیونکہ میرے خیال میں (کم از کم) نیر تمھاری طرح جذبات کی رو میں بہہ جانے والا انسان نہیں اور زندگی کے مقدس اور اہم مسائل کو اچھی طرح سمجھتا ہے ۔ اگر وہ یہ سب کچھ سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو اب سے کتنے ہی دن پہلے جب تمھارے ابو زندہ تھے اور نیر ایک ٹائپسٹ کی بجائے اپنے کالج کا ہونہار طالب علم تھا تو تم سے شادی کر کے اپنا گھر ونده بسائے رہتا ۔ لیکن اس وقت اس کے سامنے کچھ ایسے حل طلب مسائل تھے جنھوں نے اس وقت اسے شادی کرنے کی اجازت نہیں دی اور وہ تمھاری طرف انتظار بھری نظروں سے دیکھتا رہا ۔ اور اب جبکہ وہ ایک سو پچاس روپے کا ٹائپسٹ ہو چکا ہے اور کسی حد تک تم سے شادی کرنے کے لیے تیار بھی ہے تو تم لوگوں کی حالت اس لائق نہیں ہے ۔

وہ بھی حالات کا خدم رہ چکا ہے اور جانتا ہے کہ زندگی کے تقاضے بہت اہم ہوتے ہیں اور کسی قیمت پر بھی انھیں پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا اسی لیے وہ تم سے بدگمان نہیں ہو گا کیونکہ تم لوگوں کی حالت اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے ۔

تم ٹھیک کہہ رہی ہو کہ اس واقعہ سے تمھاری زندگی مجسم درد ہو جائے گی اور اس درد کی وجہ سے اس میں ایک نہ جانے والی تلخی آجائے گی لیکن ناجیہ میری پیاری یہ تو تم اچھی طرح جانتی ہو ناکہ دوسری صورت میں بھی بہت سے غموں کا سامان ہے اور شاید اس درد کی صلاحیت بھی مٹ جائے ۔ مفلس کا علاج بھی تو کرنا ہے ؎

درد افزوں سہی ناقابلِ درماں ہی سہی

۱۲ دسمبر ۵۵ء

میرے عہد کے آدمی (الہ آباد)

تم جو گوشے میں پتھر لیے اب بھی بیٹھے ہوئے ہو<br>
میرے عہد کے آدمیو<br>
بیٹھ کر کاٹ پٹ میں<br>
جو مہلک ہیں دن سے<br>
وقت کے ساحتی دائرے میں<br>
اُڑے جا رہے ہو

ح ۱۸

عکسِ تحریر: عزیز حامد مدنی

چالیس سالہ مخزن

# بابا نورا

ذکاء الرحمٰن

آج سے ایک سال پہلے میں نے یہ باغیچہ بابا نورا سے ٹھیکے پر لیا تھا۔ بابا نورا اس چھوٹے سے گاؤں کا ایک چھوٹا سا زمیندار تھا۔ اس باغیچے سمیت اس کی پچیس ایکڑ زمین تھی، جس کو وہ خود ہی کاشت کرتا تھا۔

یہ باغیچہ، جو امرود اور سنگترے کے آٹھ دس پیڑوں، اور قلمی آم کے ایک درخت پر مشتمل ہے، گاؤں سے چار فرلانگ کے فاصلے پر ہے اور یہ گاؤں ہارون آباد کا ایک نواحی گاؤں ہے۔ مجھے یہ گاؤں بہت پسند ہے۔ شیشم اور سرس کے درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں چھپے ہوئے اس گاؤں کی فضاؤں میں خوشبوؤں اور رنگوں کی ایک دنیا آباد ہے۔ اس کی ہواؤں میں نغموں کا کیف لرزاں رہتا ہے۔ اس کی مٹی سے گیتوں کے چشمے اُبلتے ہیں اور اس کے ارد گرد کا علاقہ چاند نگر کی وادیوں سے زیادہ حسین ہے۔ اس گاؤں کے گبروؤں کی رگوں میں بجلیاں انگڑائیاں لیتی ہیں، یہاں کے بوڑھوں کے وقار پر ریت کے بلند قامت ٹیلے اپنی سنجیدگیاں قربان کرتے ہیں، یہاں کی مٹیاروں کے رخساروں پر شفق پھولتی اور لبوں کے کنجوں سے مسکراہٹوں کی صبحیں طلوع ہوتی ہیں۔

میں اس گاؤں میں ایک سال پہلے آیا تھا۔ میں خوابوں اور حقیقتوں کی کہانیاں لکھنے والا ایک کہانی کار، جب مغربی پاکستان کے ایک پتھریلے شہر کی سڑکوں پر ٹھوکریں کھاتے کھاتے عاجز آگیا تو پھر ایک دردمند انسان کا دامن تھامے اس گاؤں میں آگیا۔ وہ دردمند انسان ہارون آباد کا رہنے والا تھا اور وہ مجھے دسمبر کی ایک یخ بستہ رات کو لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر ملا تھا۔ اس رات مجھے سونے کے لئے کوئی جگہ نہیں ملی تھی اور تین دن سے ایک کھیل بھی اُڑ کر منہ میں نہ گئی تھی۔ میں نے اپنے ادھڑے ہوئے کوٹ کی جیبیں ٹٹولیں تو نجانے کس زمانے کے بچے کھچے تین آنے ہاتھ آگئے۔ ایک آنے کے میں نے بھنے ہوئے چنے خرید لئے اور بقیہ دوآنی کا ایک پلیٹ فارم ٹکٹ خرید کر اسٹیشن میں داخل ہو گیا، اور لوہے کے ایک ننگے بنچ پر دراز ہو کر نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کسی مضبوط ہاتھ نے مجھے جھنجھوڑا

"بھائی صاحب، ذرا اُٹھ کر بیٹھو۔ مجھے یہ گٹھڑی رکھنی ہے۔"

"یار میرے پاس اور کچھ تو نہیں رہا، اب خدا کے لئے نیند تو مجھ سے نہ چھینو۔" نیند کے عالم میں میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"کوئی بات نہیں بھائی صاحب، ذرا مل جُل کر بیٹھ جائیں گے ہم مسافر آدمی ہیں، کونسا ساری عمر یہاں بیٹھے رہنا ہے۔ دراصل تھرڈ کلاس کا ڈبہ اسی بنچ کے سامنے آکر رہے گا۔ بھیڑ بڑی ہوتی ہے، چڑھنے میں ذرا مشکل کا سامنا ہوتا ہے۔ ورنہ کبھی تکلیف نہ دیتا۔" وہ میلی آواز تھی جس میں ہمدردی اور مروت کی آمیزش تھی۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے ایک گھٹیا سی سگریٹ

میتی کی اور میرے حالات پوچھنے لگا۔ تم کون ہو؟ کیا کرتے ہو؟

تمہارے پہلے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا سے کتائے ہوئے ہو ـــــ وہ اسی قسم کے سوالات کرتا رہا۔ لہجے میں سچائی اور خلوص کی گرمیں تھیں، چہرے پر محبت کی جھلک تھی اور میری گھائل روح نہ معلوم کتنے طویل زمانے سے محبت کے اسس مرہم کی متلاشی تھی س نے ہمدردی کے چند مزید کلمات کہے اور بتایا کہ وہ ہر دوسرے تیسرے مہینے لاہور آتا ہے لیکن تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا۔ چونکہ لاہور شہر ایک ایسی جگہ ہے جہاں آدمی مشین کا ایک پرزہ ہو کر رہ جاتا ہے اس لئے یہاں آنا نہیں چاہتا، مگر وہ کیا کرے۔ عزیزداری ہے اور پھر کاروبار ایسا ہے کہ یہاں آئے بغیر چارہ نہیں ـــــ بس پھر کیا تھا میرے زخموں کے ٹانکے کھل گئے اور میں نے اپنا ایک ایک گھاؤ اس کے سامنے عریاں کر دیا۔ میں نے اس کے سوالوں کے پیالے ان اشکوں سے بھر دیے جو اب تک نوک مژہ پر آ کر خشک ہو جاتے تھے اور بہتے نہ تھے کہ ان موتیوں کی آب کو پرکھنے کا پورے شہر میں ایک بھی جوہری نہ تھا۔ اس نے کہا۔

"میرے ساتھ ہارون آباد چلو۔ میرا اپنا کاروبار تو اتنا وسیع نہیں ہے کہ تمہاری خاطر خواہ مدد کر سکوں۔ لیکن وہاں سے ایک قریبی گاؤں میں میرا چچا رہتا ہے۔ زمینداری کرتا ہے۔ ایک مربع زمین ہے اس کی اپنی ـــ تمہارے لئے نہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔ گاؤں میں رہو گے تو کچھ اتنا زیادہ خرچ نہ ہوا کرے گا۔ موج کرو گے"

اور میں نے سوچا کہ یہ شخص، جو زندگی میں آج پہلی بار مجھے مل رہا ہے اور ابھی تک جس کے نام سے بھی میں ناآشنا ہوں، ہارون آباد میں کپڑے کا ایک چھوٹا سا سوداگر ہے۔ اور سوداگری عموماً جذبات کو کھڑکھڑاتے نوٹوں میں دفن کر دیتی ہے لیکن اس شخص میں کس قدر خلوص ہے۔ کتنی ہمدردی ـــــ کتنی محبت ہے جس سرزمین کی فضا میں تاجروں کے دلوں پر بھی روپے کی میل نہ جمنے دیتی ہوں۔ جہاں سوداگروں کے ذہن بھی مادی آلائشوں سے پاک رہتے ہوں، وہ سرزمین واقعی فردوس کا ٹکڑا ہوگی۔ وہاں کام نہ ملے، نہ سہی۔ روٹی نہ ملے، کوئی پرواہ نہیں لیکن انسان تو ملیں گے اور میں نے اسی رات فیصلہ کر لیا کہ میں اس مشعل بردار مسافر کے ہمراہ تاریک وادی کو عبور کر کے صبح کی منزل کی طرف کوچ کر جاؤں گا۔ اس مسافر نے دس روپے میں میرا ٹکٹ خریدا اور پھر ہم اس شہر سے بہت دور نکل آئے۔ روزگار کی گردش کے مارے سورج کو منزل لیل و نہار کا راستہ معلوم ہو گیا تھا اور وہ مسافر اس منزل لیل و نہار کا پہلا سنگ میل تھا۔

اور پھر یوں ہوا کہ میرے خواب سچے ثابت ہوئے۔

وہ خزاں کا ایک گرد آلود دن تھا۔ درختوں کی ٹہنیاں ننگی تھیں اور کھیت سنسان پڑے تھے لیکن مجھے زندگی میں پہلی بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ خزاں بہار کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ ہارون آباد کی وہ خزاں بھی مجھے بڑی حسین معلوم ہو رہی تھی۔ اس دن میں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا۔ میں سوچ رہا تھا ان درختوں کی عریانی بھی ملبوس ہے۔ اور ان ویران کھیتوں کا سناٹا بھی نقیب بہاراں ہے ـــــ اور اسی دن کپڑے کے اس سوداگر کے بوڑھے چچا، بابا نورا نے اپنا یہ چھوٹا سا باغیچہ دو سو روپے سالانہ کے عوض میرے حوالے کر دیا۔ ٹھیکے کی پہلی قسط اس کے بھتیجے نے میری طرف سے پیشگی ادا کرنا چاہی، لیکن بابا نورا نہ مانا۔

"ارے یہ سود سے بازیاں اپنے گاہکوں کے ساتھ کرنا۔ میں بیوپاری نہیں، زمیندار ہوں۔ اگر یہ کاکا تیرا بیلی ہے تو میرا ویسا ہی بھتیجا ہوا۔ جیسا تو ہے مجھے معلوم ہے کہ اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ یہ بیچارہ شہری آدمی، اس کا پیسوں سے کیا تعلق۔ ان کی جیب تو ہمیشہ خالی رہتی ہے یوں چاہے یہ کتنی ہی ٹیپ ٹاپ بنائے رکھیں۔ ـــــ کیوں کاکا، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"جی بجا ارشاد ہوا" میں نے نہایت سعادت مندی سے جواب دیا۔

تھوڑی دیر تک بابا نورا خاموش رہا۔ پھر اپنی سرخ سرخ آنکھوں کو زمین پر گاڑے، اور موٹے سے ڈنڈے کو دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ میں منتقل کر کے اور اس کو زمین پر ہولے ہولے مارتے ہوئے کہنے لگا۔

"میں یہ باغیچہ تجھے ڈیڑھ سو روپے سال میں دے دیتا۔ پر تیری چاچی نہیں مانے گی اور وہ بھی پکی ہے یہ جو آم کا درخت ہے نا، یہ قلمی درخت ہے اور بہت پھل دیتا ہے اور پھر یہ کہ تجھے اس پھل کو بیچنے کے لئے کوئی فکر نہیں کرنی پڑے گی۔ بیوپاری خود تیرے پاس آئیں گے۔ تو دو سو روپے تو سنگتروں اور امرودوں سے ہی کمائے گا اور اس آم کے درخت کا پھل ہر سال سو روپے میں بکتا ہے۔ اب کے امید ہے، زیادہ کا بکے گا۔"

میں نے سر اٹھا کر آم کے درخت کو دیکھا — ہم اس وقت اسی کے نیچے کھڑے تھے — سیاہی مائل سبز ہے بڑے گھیر کا مضبوط تنا، کچھ اٹھی ہوئی اور کچھ جھکی ہوئی، پتلی اور موٹی شاخیں، جو بیحد شاداب اور رس بھری دکھائی پڑتی تھیں، اور ان گنجان پتوں اور شاخوں میں گیت گاتی چڑیاں۔

میں نے تمام معاملے پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ بابا نورے نے ایک طرف اشارہ کر کے وہ کٹیا دکھائی جو باغیچے کے عین درمیان تھی اور جس میں مجھے رہنا تھا۔ اس کے بعد بابا نورا میرے لئے گاؤں سے بستر اور چارپائی لینے چلا گیا۔ اس کا بھتیجا کچھ دیر تک وہاں کھڑا مجھ سے خوش گپیاں کرتا رہا، پھر وہ بھی مجھ سے رخصت ہو کر تبیغے میں واپس اپنے گھر چلا گیا اور میں آم کے اس درخت تلے تنہا کھڑا اپنی اس نئی زندگی کے بارے میں سوچنے لگا۔

میں کہاں سے چلا تھا اور کہاں آ گیا تھا۔

اس نئی زندگی کا آغاز تو ہو چکا تھا، لیکن انجام کی خبر نہیں تھی سردی بڑھتی جا رہی تھی اور میں دونوں ہاتھ اٹھائے دعا مانگ رہا تھا کہ "یا خدا ......" اور اس سے آگے مجھے یاد نہیں کہ میں نے کیا کہا ...... معاً دور کسی کھیت سے کسی منچلے کسان کی شوخ آواز ابھری۔

"گندل نوں ہتھ پا دیں ذرا سوچ کے        نی کیہڑی این توں ساگ توڑ دی۔"

اس گیت میں مچلتی زندگی نے مجھے احساس دلایا کہ میری دعا آسمان کے پٹ کھول کر بارگاہ الٰہی میں مستجاب ہو گئی ہے اور ساتھ ہی میرے ذہن میں ایک خیال کا کوندا لپکا کہ میں اس خیال میں تھا کہ درختوں کی درمیانی جگہوں میں سبزیاں کاشت کروں گا، اس کٹیا کے عقب میں ایک چھوٹا سا مرغی خانہ تعمیر کروں گا، اور جب کچھ روپیہ جمع ہو جائے گا تو آم کے اس گھنے درخت کے سائے تلے بیٹھ بیٹھے مزے سے حسن، امید اور اُجالے کی کہانیاں لکھا کروں گا۔

اور جب بابا نورا میرے لئے بستر، چارپائی اور دودھ لے کر آیا تو میں اپنے دل میں یہ اٹل فیصلہ کر چکا تھا کہ گر مرا تو اسی زمین کو میرے لئے اپنا دو گز ٹکڑا دینا پڑے گا۔

میں نے اور بابا نورے نے مل کر کٹیا میں پلنگ بچھایا۔ اس کے بعد میں نے دودھ پیا اور گرم بستر میں گھس گیا۔ باہر کھیتوں پہ رات جھک آئی تھی اور بابا نورا میری پائنتی بیٹھا اپنی جوانی کی البیلی کہانیاں سنا رہا تھا۔

راگی پرندے درختوں پر ڈالی ڈالی پھدک رہے تھے اور گاؤں کی طرف سے دودھ بلونے کی مدھم مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔

میں نے کیکر کے ایک درخت سے مسواک کاٹی اور دانت صاف کرتے ہوئے جب میں نے کھیتوں کی طرف دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ سرما کا قافلہ کوچ کرنے کو ہے۔ میں جلدی سے آم کے درخت کے قریب گیا۔ اس کی شاخوں میں کاسنی رنگ کے چمکیلے اور سنئے پتے پھوٹ رہے تھے۔ کچھ شاخیں بھی خشک ہو کر ٹوٹ گئی تھیں اور ان کی جگہ جگہ نازک کونپلیں نمودار ہو رہی تھیں میرے لبوں پہ مسکراہٹ کی روشنی جگمگا اٹھی اور ایک سبز طوطا میرے سامنے سے ٹیں ٹیں کرتا ہوا گزر گیا۔ میں نے ہوا میں بھرپور سانس لیا اور ساتھ والے کھیت کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا حال ہے کاکا!" کھیت سے بابا نورا نے پکار کر پوچھا۔ "السلام علیکم بابا جی" میں نے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔ میں غور سے بیلوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جسم پر گوشت کی مضبوط تہیں، جن میں ہل کھینچتے ہوئے لرزش پیدا ہوتی تھی گردنوں میں لکڑی کے طوق اور گھنٹیاں چوڑے چمکیلے سیاہ سُم جو کھیت کی نرم مٹی میں دھنس رہے تھے۔ بڑے بڑے چربی سے بھرے ہوئے کوہان، جن کا گوشت جلدی جلدی چلنے سے کبھی ادھر ڈھلک جاتا اور کبھی اُدھر سیاہ چمکتی ہوئی آنکھیں، اور بھاپ اڑاتے ہوئے نتھنے۔۔ ان کے پیچھے، ان کو ہنکاتا ہوا بابا نورا ان سے کچھ کم محنت نہیں کر رہا تھا۔ اس کے چہرے کی جھریاں سمٹ گئی تھیں، ماتھے پر پسینے کے ننھے منے قطرے چمک رہے تھے اور وہ ہلکے لوہے کے پھل سے زمین کی تہیں الٹا رہا تھا۔ مٹی کاٹتے ہوئے ہل کی سرسراہٹ نیچے کی تہہ سے نکلنے والی خالص مٹی کی بھینی بھینی مہک اور اس پہ بابا نورے کے ہنکارے —— ہے، ہے ۔۔۔۔ ہیر، ہیر:۔۔۔۔" مجھے یوں لگا جیسے میں دیہاتی پس منظر کے ساتھ ایک کہانی لکھ رہا ہوں۔

"ادھر آجا کاکا، وہاں کیوں کھڑا ہے" بابا نورے نے مجھے آواز دی۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب چلا گیا۔

"ہل چلانا ہے؟" اس نے پوچھا۔

پہلے تو میں نے ہچکچاہٹ کا اظہار کیا، لیکن چند لمحوں کے بعد ہل کی ہتھی میں نے دائیں ہاتھ میں تھام لی۔ بابا نورے نے ٹچکارا اور بیل چل پڑے۔

"ادنے دبا کر رکھ ہتھی کو۔ بیلوں کی ٹانگیں بھی زخمی نہ ہوں، ہل زمین میں گہرا بھی جائے، اور ہتھی پر قابو بھی رہے۔"

بابا نورا چلا چلا کر مجھے ہدایات دیتا رہا۔ میں ہتھی کا توازن قائم نہ رکھ سکا اور پھر نرم مٹی میں میرا پاؤں یکبارگی ایسا دھنسا اور میں یوں تیورا کر گرا کہ دن میں تارے ہی تو نظر آ گئے۔ یہ دیکھ کر بابا نورے نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ میں خود بھی ہنسنے ہی کو تھا کہ میں نے ایک آواز سنی۔

"یہ لے ایک مجھری میں پانی ہے اور دوسری میں لسّی۔"

میں چونک کر اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا —— اسے دیکھ دیکھ کر میری آنکھیں پتھرا رہی تھیں اور ہونٹ کانپنے لگے تھے —— اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے —— جیسے —— کیا بتاؤں —— آپ نے کبھی —— لیکن ٹھہریئے میں سوچ رہا تھا کہ آخر یہ کون ہو سکتی ہے —— اس کا جسم ایک ایسے بوڑھے درخت کی مانند تھا جس کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہوں اور جس کے تنے کو دیمک نے چاٹ لیا ہو۔ ناک جیسے لکڑی سے بنائی گئی ہو اور آنکھیں، جیسے دور کہیں خلاؤں میں چراغ بجھ

رہے ہوں ـــــ وہ دونوں چنگیریں بابا نورا کے قریب رکھ کر مزید ایک لفظ کہے بغیر واپس چلی گئی۔

"یہ چاچی ہے۔؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے بابا نورے سے پوچھا۔ مجھے تعجب اس بات پر تھا کہ جب وہ آئی تھی تو بابا نورا گھبرا کر خاموش ہو گیا تھا اور اسی لمحے اس نے میرے وجود کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ہاں یہی ہے۔" اس نے لاپرواہی سے جواب دیا اور پھر مجھے لسی پینے کی دعوت دینے لگا۔ میں خاموش ہو رہا۔ معاً مجھے یاد آیا کہ باغیچے میں ہل چلانا ضروری ہے، چونکہ میں وہاں سبزیاں اگانے کا ارادہ کر رہا تھا۔

"چاچا! میں باغیچے میں سبزیاں کاشت کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے بات چھیڑی

"کاکا! تیری چیز ہے جو مرضی چاہے کاشت کر۔"

"لیکن اس کے لئے وہاں ہل چلانا ضروری ہے۔"

"وہ میں چلا دوں گا۔ یہ تھوڑا سا کام ہے۔ اس کو ختم کر کے وہاں لگ جائیں گے۔ اس میں کونسی بات ہے۔" بابا نورا نے جواب دیا۔

اور کھیت کا کام ختم کرنے کے بعد بابا نورا تمام دن باغیچے میں ہل چلاتا رہا۔

آخر وہ دن بھی آ گیا، جب پھلوں کے بیوپاری میرے پاس آئے اور میں نے سنگترے اور امرود اڑھائی سو روپے میں فروخت کر دیئے۔ اتنے ڈھیر سارے نوٹ میں شاید زندگی میں پہلی بار دیکھے تھے۔ میں بہت خوش تھا۔ میں نے بابا نورا کو بھی کچھ روپے دینے چاہے۔

"میں کھانا بھی آپ کے ہاں کھاتا ہوں۔ ہل تو میں ویسے ہی چلا نہیں سکتا، لیکن مجھے کچھ تو مدد کرنی چاہیئے نا۔"

"اوئے نئیں اوئے کاکا، میں تجھے غیر تو نہیں سمجھتا۔ یہ پیسے اپنے پاس رکھ۔ تیری اپنی پہلی کمائی ہے، کام آئے گی تیرے،

میں شرمندہ سا ہو گیا اور روپے مجھے واپس لینے پڑے

گزشتہ کئی دنوں سے میرے ذہن میں ایک خوبصورت سی کہانی کا پلاٹ گھوم رہا تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ آج کہانی لکھ ہی لوں۔ کوئی اور کام تو ہے نہیں۔ میں ابھی کہانی لکھنے بیٹھا ہی تھا کہ بابا نورا آ گیا۔

"کاکا! ایک بات ہے۔"

"کیا چاچا۔؟"

"تیری چاچی بیمار ہے۔ روز بڑے ڈاکدار سے ٹیکے لگوانے پڑتے ہیں۔ آج بھی جانا ہے۔ ٹیکے لگوانے، لیکن تیری چاچی نے مجھے ابھی ابھی بتایا ہے کہ پیسے ختم ہو گئے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے جیب سے دو روپے نکال کر اسے دے دیئے

وہ کچھ دیر تک کھڑا رہا۔ پھر جانے لگا۔ یکایک مجھے کچھ خیال آیا۔

"چاچا یہ تین روپے اور لے جاؤ۔ دو روپوں میں ٹیکے کا کام نہیں چلے گا۔"

اس نے وہ تین روپے بھی لے لئے اور چلا گیا۔ لیکن آم کے درخت کے قریب پہنچ کر اس نے مجھے آواز دی۔

"اوئے کاکا!"

میں ہڑبڑا کر جاگ گیا۔

"کیا بات ہے چاچا؟"

"یہ دیکھ" اُس نے آم کا ایک نیا نو ملایا پتہ توڑ کر مجھے دکھاتے ہوئے کہا "اب کے انشاء اللہ بہت پھل آئے گا۔ لیکن حفاظت کی ضرورت ہے۔ بہت لاڈ ہے مجھے اس درخت سے... لیکن اب تو بھی تیرا درخت ہے۔"

یہ کہہ کر وہ خاموشی سے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس کے بعد میں نے بابا نورے اور اس کی بیوی کو بہت کم کہیں دیکھا۔ میں اپنے کام سے پوری طرح واقفیت حاصل کر چکا تھا۔ جتنے پیسے میں چاہتا تھا، اتنے مجھے مل جاتے تھے۔ زیادہ کی مجھے تمنا نہیں تھی۔ اب میں نے ایک ملازم بھی رکھ لیا تھا۔ اور تمام کام اس کے سپرد کر کے میں سارا سارا دن کہانیاں لکھا کرتا۔

ایک بابا نورا مجھ کو اپنے کھیت کی دیوار پر مل گیا۔ ابھی ہم کھیت کی منڈیر پر کھڑے ہی تھے کہ اس کی بیوی آ گئی۔ بابا نورے نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کسّی زمین پر پھینک دی اور اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمودار ہو گئے۔ مجھے اس کی بیوی کے چہرے سے جو گنے کی چوسی ہوئی پور کی مانند تھا، وحشت ہوتی تھی۔ وہ اکثر مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھا کرتی تھی۔ وہ مجھے اس جادوگرنی کی طرح خوفناک معلوم ہوتی تھی جو کالا علم پڑھنے کے بعد کسی تاریک گپھا میں آباد ہو کر تعویذ گنڈے کا کاروبار شروع کر دیتی ہو۔ اس لمحے بھی اس نے مجھے بڑی غضبناک نظروں سے دیکھا۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ وہ کچھ کہے بغیر چلی گئی۔ بابا نورا بھی مردہ قدم اٹھاتا ہوا اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

آم کا درخت بور سے لد چکا تھا پورا باغیچہ اس کی خوشبو کی آغوش میں تھا۔ سورج کی تپش میں شدت آ چکی تھی۔ چند دنوں میں یہ ننھی ننھی کیریوں کے گچھوں میں بدل جائے گا پھر یہ کیریاں بڑے بڑے شیریں آموں کا روپ دھاریں گی — زرد زرد سرخ سرخ ......اور پھر......

"کاکا"

میں نے چونک کر پیچھے دیکھا تو بابا نورا کھڑا تھا۔

"چاچا...."

"ہاں"

"کیا بات ہے چاچا؟"

"بات کیا بتاؤں کاکا، وہ تیری چاچی کہتی تھی کہ آموں کا موسم آنے والا ہے اور میرا لڑکا بھی چھٹی پر آ رہا ہے، وہ پولیس کا سپاہی ہے اور آج کل جیر پور ٹالی والے کے تھانے میں تعینات ہے۔ اس کو آم کا اچار بہت پسند ہے۔ اس لئے تیری چاچی نے کہا ہے کہ بیس سیر کچے آم مل جائیں تو بہت اچھا ہو تو جانتا ہے کاکا، کہ ماؤں کو بیٹوں کی بڑی چاہ ہوتی ہے۔"

"چاچا، ابھی تو امبیاں تیار ہونے میں ایک مہینہ لگے گا۔ دوسرے یہ کہ آم کا یہ درخت قلمی ہے۔ قلمی آموں کا اچار کون ڈالتا ہے اور پھر بیس سیر آم اچار ڈالنے کے لئے لے گئے تو میرے پاس کیا بچے گا؟"

"ہاں، تو ٹھیک کہتا ہے کاکا۔" بابا نورے نے کہا اور پھر خاموشی سے چلا گیا۔

تب یوں ہوا کہ جب گرما کی ایک صبح کو میں نیند سے بیدار ہو کر کٹیا سے باہر نکلا تو ایک کڑیل جوان کو باغیچے میں گھومتے پایا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبی سی چھڑی تھی اور وہ بڑے اطمینان سے آم کا بور جھاڑنے میں مصروف تھا۔

"ادے کون ہے تو..... یہ کیا کر رہا ہے؟" میں چیل کی مانند اس نوجوان پر جھپٹا۔

"تو کون ہے؟ چل اپنا کام کر۔" اس نے درشتی سے جواب دیا۔

"بتاؤں تجھے کہ میں کون ہوں؟" اور یہ کہہ کر میں نے اس کے ہاتھ سے چھڑی چھین لی۔ وہ بھوکے شیر کی طرح میری طرف لپکا۔ سوچ کر رک گیا اور مجھے گالیاں دیتا ہوا کھیتوں کی طرف نکل گیا۔

بابا نورا مجھے کئی دنوں سے نہیں ملا تھا اس کی بیوی البتہ کبھی کبھی کھیتوں میں چلتی پھرتی دکھائی دے جاتی تھی۔ بابا نورا پتہ نہیں کہاں چلا گیا تھا۔

ایک شام میں مرغیوں کو دانہ ڈال رہا تھا کہ بابا نورا آ گیا۔ اس کا چہرہ بڑا مضمحل ہو رہا تھا اور اس کا جسم ٹوٹ سا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں میں نے ایک عجیب سا زرد غبار دیکھا۔ پہلے وہ آم کے درخت کی طرف دیکھتا رہا۔ جس کی شاخیں اب رسیلے آموں کے بار سے جھک گئی تھیں اور پھر کہنے لگا۔

"کاکا، ایک بات ہے۔ اگر تو برا نہ مانے۔"

"کہو چاچا، برا ماننے کی بھلا کیا بات ہے۔"

وہ تیری چاچی کہتی تھی کہ ٹھیکے کی رقم بڑھا دی جائے۔ دو سو روپے بہت کم ہیں۔ اب کے سال آم کا پھل بھی بہت زیادہ ہے۔"

"کتنی رقم بڑھانے کے لئے کہا ہے چاچی نے؟"

"پچاس روپے۔ اور اس طرح ٹھیکے کی رقم ڈھائی سو روپے ہو گی۔"

میں نے چپ چاپ یہ اضافہ منظور کر لیا۔ میں بابا نورا کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا چہرہ ایک لحظے کو روشن ہو گیا۔ اور وہ اپنے کھیتوں کو پانی لگانے چلا گیا۔

آدھی رات گزر چکی تھی۔ آسمان کے تھال میں کسی نے ستاروں کے موتی انڈیل دیئے تھے۔ میں گرمی کی وجہ سے کنویں کے باہر سو رہا تھا۔ یکایک میرے کانوں میں ایسی آواز پڑی جیسے کوئی خشک پتوں پر چل رہا ہو۔ میں نے آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا کچھ دکھائی نہ دیا۔ میں پھر سو گیا۔ کچھ دیر کے بعد مجھے پھر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اب کے میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب چاند بھی نکل آیا تھا اور پورا ماحول چاندنی کی ٹھنڈی پھواروں میں نہا رہا تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جو ادھر ادھر دیکھا تو آم کے درخت کے قریب دو سائے حرکت کرتے نظر آئے۔ میں نے چارپائی سے چھلانگ ماری اور ایک ہی جست میں وہاں پہنچ گیا۔ کچھ دیر کے لئے نظروں کو اعتبار نہ آیا۔ لیکن جو کچھ دیکھا وہ ایک حقیقت تھی۔ بابا نورے کی بیوی اور وہی نوجوان دونوں بڑے اطمینان سے آم توڑ توڑ کر ٹوکروں میں بھرنے میں مصروف تھے۔ کچھ ٹوکریاں بھر رہے تھے، اور کچھ وہ بھر چکے تھے۔

مجھے آگ ہی تو لگ گئی لیکن میں نے انہیں کچھ نہ کہا۔

صبح اٹھ کر میں سیدھا بابا نورے کے پاس گیا۔

"میں چاہتا ہوں کہ گاؤں چھوڑ جاؤں۔ جس طرح پہلے ٹھوکریں کھاتا رہا ہوں، اسی طرح اب بھی ٹھوکریں کھا لوں گا۔ لیکن اس قسم کی حرکتیں مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتیں۔" اور میں بابا نورا کے سامنے رو پڑا۔

بابا نورے کے دانت بھنچے ہوئے تھے اور بڑی مشکل سے آنسوؤں کو ضبط کر رہا تھا۔

"آئندہ ایسا نہیں ہو گا کاکا۔" اس نے صرف اتنا کہا۔ اور پھر خاموشی سے گھر میں گھس گیا۔

اور اگلی صبح یہ سن کر مجھے زمین و آسمان گھومتے ہوئے محسوس ہوئے کہ گاؤں میں دو قتل ہو گئے ہیں اور قاتل بابا نورا ہے

# دوسری کہانی

یونس جاوید

چاندنی میں نہائی ہوئی اس خنک رات کو گاؤں سے آدھ میل دور، بیریوں کے جھنڈ کے پاس چاچا عمرے کے ڈیرے پہ پڑا ہو کھاٹ سامنے میں ہمسے کی وجہ سے گوبر کا ڈھیر معلوم ہوتا تھا۔ بیریوں کے گہرے گہرے سائے اس کے اوپر سے ہوتے ہوئے جوہڑ کے کنارے تک چلے گئے تھے۔ کھاٹ کے نیچے ڈبو گنڈری بنا سو رہا تھا اور اس سے کچھ دور بانکی چھپر کے بندھی تھی اور چھپر کے بالکل سامنے چاچا عمرا تنہا اپنی جھونپڑی میں بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔

گھاس پھونس کی اس چھوٹی سی جھونپڑی کا چھپر سر کا ہوا تھا اور چاندنی کی ایک چھوٹی سی تہہ، اندر بچھی ہوئی پرالی پر بچھی تھی۔ چاچے نے اپنا موٹا کھیس ڈھیل کر کے از سر نو کس کر لیا، اور چلم میں پڑی ہوئی آگ کریدتے ہوئے پھونک ماری۔ پھونک مارنے سے تھوڑی سی راکھ بھی اڑی اور چاندنی میں یوں تیرنے لگی جیسے دور کہیں برف گر رہی ہو۔

چاچا حقے کے ہلکے ہلکے کش لیتا رہا اور کچھ سوچتا رہا۔ پھر کچھ دیر بعد جب ڈبو بھونکتا ہوا کھاٹ کے نیچے سے نکل آیا۔ بانکی ہنہنائی تو چاچا چونک کر کھڑا ہو گیا اور حقے کی نے گھما کر اسے بڑی احتیاط سے ایک کونے میں رکھنے کے بعد جھونپڑی کے دروازے پر آ گیا۔ دور جوہڑ کے کنارے کنارے کوئی جوان گھوڑی پر جھک کر پوری رفتار سے چلا آ رہا تھا۔ ٹاپوں کی آواز بڑی دھیمی تھی اور گھوڑی کے پیچھے اٹھنے والی گرد دھند معلوم ہو رہی تھی۔ بیریوں کے قریب آ کر جب سوار نے رخ جھونپڑی کی طرف پھیرا تو چاچا دروازے سے ہٹ کر اندر آ گیا۔

سوار نے عین جھونپڑی کے سامنے پہنچ کر گھوڑی روکی۔ تو وہ پچھلی ٹانگوں پر کھڑی ہو گئی اور اس کا سایہ کانپتا ہوا جھونپڑی کے اندر تک آ گیا۔ گھوڑی سنبھالنے کے بعد سوار نے اتر کر اسے ایک درخت سے باندھ دیا اور خود کھانستا ہوا جھونپڑی میں آ گیا۔ چاچا اس وقت تک چارپائی پر بیٹھ کر حقے کی نے پر بوجھ ڈال چکا تھا۔

"جلدی پلٹ آئے ہو سردارے!" چاچے نے کش لئے بغیر سوار کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہوں" پھیکی آواز میں سردارا بڑبڑایا۔ پھر پرالی کو اکٹھا کر کے اس کی ایک موٹی سی تہہ بنائی اور اس پر بیٹھ کر بولا۔

"چیچا مجھے چودھریوں کی بیٹھک ہی میں مل گیا تھا۔"

"کوئی پنچائیت تھی کیا؟" چاچے نے ابھی تک حقے کا کش نہیں لیا تھا۔

"نہیں" سردارا ایک بار پھر مری ہوئی آواز میں بولا "جیرے اور رحیلے کی منگنی تھی۔"

"کون رحیلا؟ نبی بخش ذیلدار کا!"

"ہاں، وہی" سردارے نے بڑی دھیمی آواز میں کہا۔ اور کچھ دیر خاموش رہا۔ جب چاچا نے حقے کی نے اس کی طرف گھمائی تو اس

نے ہلکا سا کش لے کر کہا۔ "وہ منگنی تو خیر کل ہوئی تھی، گر آج بانٹا گیا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"کس بات کی سمجھ؟ کچھ کھول کر بیان کرنا۔" چاچا تجسس بھری نگاہوں سے اس کی طرف مسلسل دیکھتا رہا۔ مگر سردار نے جواب دینے کے بجائے گردن پوری طرح جھکالی۔

چاچا جب دو تین کش لے چکا تو اسے احساس ہوا کہ اس کی بات کا جواب نہیں دیا گیا۔ وہ پہلے سے تند لہجے میں بولا۔

"منگنی تو جیراں اور چھیلے کی ہوئی ہے۔ تو کیوں گونگا بن رہا ہے؟ تجھے تو اس منگنی پر خوش ہونا چاہیئے کیا ہوا، گر اب چھیلے سے تمہاری دوستی نہیں رہی۔ تھا تو تیرا ہی یار بچپن کا ساتھی۔ ویرہ تو اس کی منگنی۔"

"کون کس کا ویر ہے چاچا" سردارا بات کاٹ کر بولا۔ "میں اس کا ویر ہوں نہ وہ میرا۔ پہلے اندر سے وہ میرا دشمن تھا۔ اب کھلے طور پر میں اس کے خون کا پیاسا ہوں۔"

چاچا کچھ دیر منتظر رہا کہ سردارا اپنی بات مکمل کرے گا۔ مگر جب سردارا کچھ نہ بولا تو چاچا تنگ آکر کہنے لگا۔

"کچھ بول تو سہی۔ کیا آئیں بائیں شائیں کر رہا ہے۔ جیجا کہاں ہے اور سردارا گردن گھما کر جھونپڑی سے باہر تکنے لگا۔

چاند بیریوں کے اوپر سے ہو کر جوہڑ کے کنارے اُگے ہوئے کھجور کے درخت میں اٹک سا گیا تھا

اور چاندنی میں گاؤں، سمندر کے کنارے بنے ہوئے ریت کے گھروندوں کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے چاند کو گھورتے ہوئے ہاتھ حقے کی نے کی طرف بڑھائے اور وہ ایک کش لینے کے بعد بولا "وہ بھی آجائے گا۔ میں اسے راستے میں خود چھوڑ آیا ہوں۔ گوری تھکی ہوئی تھی نا۔ دونوں کا بوجھ اٹھا کر چل نہیں سکتی تھی۔"

وہ چپ ہوا تو سناٹے کی چادر پھر تن گئی۔ البتہ جب دونوں میں سے کوئی حقے کا کش لیتا تو سناٹا مجروح سا ہو جاتا کتنی ہی دیر وہ گم سُم بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ سرکے ہوئے چھپر میں سے جھانکتی ہوئی چاندنی بھی آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگی۔ جب سردارا آیا تھا تو جھونپڑی کے اندر گز بھر چاندنی پھیلی ہوگی۔ اب آدھی بھی نہ رہ گئی تھی۔

یکایک ڈبو غراتا ہوا کسی جنگلی بلی کے پیچھے بھاگا تو دونوں باہر دیکھنے لگے۔ پھر سردارا چپ چاپ اٹھا اور دروازے تک آکر ادھر اُدھر دیکھنے کے بعد واپس آگیا اور بولا "جیجا آرہا ہے شاید۔"

چاچے حمرے نے اپنی خشخشی داڑھی کھجاتے ہوئے نگاہیں جھونپڑی سے باہر جما دیں۔

تھوڑی دیر بعد جیجا اندر آگیا۔ اس نے سر پہ کوئی موٹا کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ ایک ہاتھ میں کھونٹا تھا۔ اور دوسرے میں کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز تھی جب وہ اندر آکر چارپائی پہ بیٹھ گیا تو چاچے نے کہا۔ "آ بھئی جوان۔ کتنی دیر سے تیری ہی راہ دیکھ رہے ہیں۔ لائے ہو نا۔"

کیوں نہیں۔ آج تو سردارے کو بھی توڑ ہے۔ کیوں ویری؟" اس نے آخری جملہ سردارے کی طرف رُخ پھیر کر کہا۔

سردارا کچھ بھی نہ بولا۔ جیجے نے کاغذ میں لپٹی ہوئی چیز چاچے کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ "اصلی کیکر کی ہے اپنے ہاتھوں سے کیکر کی جڑیں ڈال کر بوتل دبائی تھی۔ میں تو پیوؤں گا۔ نہیں تم دونوں موج میلہ مناؤ۔"

"وہ خیر یہ تو ہوا۔" چاچے نے بوتل پرالی کی گٹھڑی میں اڑستے ہوئے کہا۔ "اس کو کیا ہو گیا ہے۔ میری سمجھ میں تو نہیں آرہی اس کی بات۔"

"بات تیری سمجھ میں آ بھی نہیں سکتی۔" جیجا حقے کا پہلا کش لے کر بولا۔ "پھر بھی سُن لے۔ باتیں تو اس جوان سے تو ہر روز پھاپھی کی سنتا ہے۔ حالانکہ وہ بھی کب کی بیاہی جا چکی ہے۔ مگر نئی کہانی تو تم نے سنی ہی نہیں۔ دیکھو نا۔" چارپائی کے سامنے بیٹھ کر اس نے چاچا کو

پوری طرح متوجہ کر لیا۔" اب اگر ہم سے نہ چھپاتا۔ تو یہ رشتہ بھی ہاتھ سے جا سکتا تھا۔"

"رشتے کی بات نہیں۔" پہلی بار سردارا اتنی اونچی آواز میں بولا "بات تو اس ضد کی ہے جو میرے اور تھیلے کے درمیان چلی آ رہی ہے۔ کل تک تھیلا تھا۔ آج شہر سے لوٹا ہے تو محمد طفیل ہو گیا ہے۔"

"کس بات کی ضد؟" چاچے نے سردارے کو سانس لینے کی مہلت دیئے بغیر پوچھا۔

"جیراں کو بیاہ لانے کی ضد اور کون سی؟ میں ضدی تو نہیں ہوں۔ دعویٰ بھی اس لئے کر بیٹھا کہ جیراں مجھے دل و جان سے چاہتی ہے۔ میں نے اس سے کبھی بات نہیں کی تو کیا ہوا۔ مائی طالعاں نے مجھے صاف بتا دی تھی کہ جیراں تو اب تیرے ہی گُن گاتی ہے ورنہ ضد کس بات کی۔؟"

"پھر؟" چاچا تجسس بھری آواز میں بولا۔

"پھر تمہیں کیا بتاؤں۔ میں بھی تو ایسی ہی لڑکی چاہتا تھا جو صرف مجھے چاہے میری ہو کر رہے۔ ورنہ گاؤں میں لڑکیوں کا کال تو نہیں ہے۔ چودھری کے گھر مائی طالعاں کے ذریعہ بات چیت ہو رہی تھی۔ جانے یہ تھیلا شہر سے ایک دم کیسے آن ٹپکا۔ خبر ہی نہیں تھی اس کے آنے کی۔ جیجے کی طرف گیا ہوں۔ تو راستے میں بڑی حویلی کے پاس چودھری کی بیٹھک میں ٹھٹھے مذاق کی باتیں سن کر معلوم کیا تو شرم سے پانی پانی ہو گیا۔"

"تو ہوا کیا؟" بیچا بیچ میں بول پڑا "تو تو یوں کر رہا ہے۔ جیسے تیری رستی بستی بیوی کو بھگا لے گیا ہو تھیلا۔ تو آج بول آدھی زبان سے۔ تھیلے کی بہن بیاہ دوں تجھے۔ دس گھماؤں زمین کا، کیلا مالک ہے، تو روتا کیوں ہے؟"

"تو بات نہیں سمجھا بیجے۔ خود تو بیچ میں بول پڑتا ہے۔ سن تیرے مولا نے چاہا تو جیراں کو بیاہ کر نہ لے جا سکے گا۔ تھیلا بھی ور کر جیراں کی ڈولی لے گیا تو اسی دن تمہیں بھی میرے جنازے کو کندھا دینا ہوگا۔ ارے پاگل! جوانوں کی بھری محفل میں قول دے کر آیا تھا۔ کیا منہ لے کر جاؤں گا سب کے سامنے؟"

سردارے نے حقے کی نے اپنی طرف کھینچی۔ منہاں کو ہاتھ میں لیا اور مٹی کے دہانے پر ہونٹ جما کر کش لینے لگا۔

کچھ دیر تینوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر سردارا فیصلہ کن انداز میں کھڑا ہو کر بولا "ذرا کی ذرا بانگ لے جا رہا ہوں۔ گھوڑی صبح سے بہت چلی ہے تھکی ہو گی۔"

"بانگ سو جائے جا تو۔ پر اس وقت جا کدھر رہا ہے اور پھر اس کا کیا بنے گا؟" چاچے نے بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آخری حملہ کیا۔

"میر پور تک جاؤں گا۔ گھنٹے بھر میں واپسی ہو گی۔ تب تک تم شغل کرو سمجھ لیں آیا۔" سردارے نے چٹکی بجائی۔

"جانا ہی کتنی دور ہے۔ میر پور زیادہ سے زیادہ دو مربعے ہو گا۔" اس نے جھونپڑی سے نکلتے ہوئے کہا اور بانگ کھول کر اس کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔

فضا میں بانگ کی ٹاپیں ابھریں پھر آہستہ آہستہ معدوم ہو گئیں۔

رات کے تیسرے پہر جب سردارا لوٹ کر ڈیرے پہنچا تو چاند مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ سردی سے بچنے کے لئے اس نے کان اور منہ کپڑے سے اچھی طرح لپیٹ رکھے تھے۔ یہ بانگ کا تیکھا پن تھا کہ وہ اس قدر جلد لوٹ آیا تھا۔

جب وہ جھونپڑی کے سامنے پہنچا تو بانگی قدم قدم چل رہی تھی۔ اس بار نہ گوری ہنہنائی نہ ڈبو غرایا۔ بس گہرا سناٹا چھایا رہا۔ بڑی پھرتی سے اس نے بانگی سے اتر کر اسے کھونٹے سے باندھا اور جھونپڑی میں چلا آیا۔

جیجا اور چاچا پرانی پرانی پر اٹے ترچھے سو رہے تھے۔ بوتل پر ابھی تک چاچے کا ہاتھ تھا۔

سردارے نے گھبرا کر جیجے کی پنڈلی پر آہستہ سے ٹھوکر ماری۔ اس کا خیال تھا کہ دونوں شراب پی کر نشے میں پڑے ہیں۔ مگر جب وہ چاچا پر جھکا تو اس کے ہاتھ کے نیچے بھری ہوئی بوتل دیکھ کر اسے کچھ تسلی ہوئی۔

اس نے دونوں کو باری باری جھنجھوڑ کر جگایا۔ دونوں کچھ دیر اپنی اپنی آنکھیں ملتے رہے۔ پھر جب ان کی آنکھوں میں روشنی اور تجسس ایک ساتھ امڈے، تو وہ سردارے کی طرف گہری نظروں سے دیکھنے لگے۔ سردارے نے آہستہ آہستہ کھیس کی بکل کھولی۔ اور دونالی بندوق نکال کر دونوں کے سامنے رکھ کر مسکرانے لگا۔

"یہ کیا ہے؟" چاچے نے سوئی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ٹھیلے کی تقدیر!" سردارا ایک دم سنجیدہ ہو کر بولا۔

چاچا پہلے تو چپ چاپ سردارے کی طرف گھورتا رہا پھر اٹھ کر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ٹھیلے کی تقدیر کے ساتھ کھیلتے ہوئے تو اپنی جوانی کے ساتھ ہی کھیل رہا ہے۔ دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارنے سے عمر لمبی نہیں، چھوٹی ہوتی ہے۔ پھر دس گھماؤں زمین بیچ کر تم اگر بچ بھی گئے تو کیا وہ زندگی زندگی ہوگی؟"

"تو کیا جانے چاچا" سردارا پھر بولا۔ "چودھری کی لڑکی سے منگنی کرا کے اس نے میرے جسم میں انگارے بھر دیئے ہیں۔ اپنے سر میں سات چولہوں کی راکھ اڑتی محسوس کرتا ہوں۔ مرد کے لئے یہ کوئی چھوٹی بات نہیں۔ ایک بار تو ضامن علی پٹواری کے بھرے ڈیرے پر ہم نے ایک دوسرے کو بھڑک مار کر مقابلے میں آنے کی دعوت بھی دی تھی۔ اصل بات تو جیرا کی تھی۔ مرنے مارنے کی بات ہوتی تو بھری محفل سے اس طرح نہ لوٹتا۔ لاش ہی آتی۔ اب ہر محفل میں اس کی شیخی سن کر شرم کے مارے گردن جھکا لینے سے یہ بہتر نہیں کہ ہم میں سے ایک نہ رہے۔ وہ تو خیر سوچتا ہی سوچے گا۔ میں کیوں نہ اس کا خون پی کر کلیجہ ٹھنڈا کر لوں؟ چودھری بھی تو یاد کرے گا۔"

سردارے نے جیجے کی طرف دیکھ کر کہا۔ "مائی صاحباں سے تھوڑی سی بات کر کے بھی رات بھر میں بدل گیا۔ اب دیکھوں گا نا۔ کیسے گھر بستا ہے ٹھیلے کا!"

سردارا خاموش ہوا تو چاچے نے کھنکار کر بولنے کے لئے زمین ہموار کی مگر سردارے نے اس کی کھانسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً کہا۔

"چاچا! زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اُسے اگر میرے ہاتھ سے اور مجھے پھانسی سے مرنا ہے تو کون روک سکتا ہے ہم دونوں کو! ویسے تو فکر نہ کر۔ سردارا کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا۔ انتظام پورا ہے تیری دعا سے۔ بستے گا۔ تو سر دھنے گا۔" سردارے نے زمین سے بندوق اٹھا کر چارپائی کے پائے کے ساتھ کھڑی کر دی۔ "یہ بندوق میرپور جا کر دُتے ماچھی سے لایا ہوں۔ بغیر لائسنس کی ہے۔ فائر تو ہوگا اس بندوق سے اور پھر مقدمہ چلے گا نا۔ سن رہا ہے نا میری بات؟ غور سے سن۔ مقدمے میں اپنی بندوق پیش کروں گا۔ سمجھا!"

چاچا بے ساختہ بولا۔ "جس کی نالی نیچے سے پھٹی ہوئی ہے۔" "اس کی تو ہر کل خراب ہے۔ وہی نا؟" چاچے کی بات سے متصل جیجے نے کہا۔

"ہاں وہی۔ مگر تم کیا جانو اس چکر کو؟ چھ سال سے اس ناکارہ بندوق کا ٹیکس دے رہا ہوں۔ بات بتانے کی نہیں مگر یاروں کی منڈلی میں جانے کیوں راز اُچھل اچھل کر حلق کی طرف آنے لگتے ہیں۔ تو بات اتنی ہے کہ اس زنگ آلود بندوق کا لائسنس بنوایا ہی اس غرض سے تھا اور پھر گاؤں کے برتن میں ہر چند کچے ہی سہی مگر جب ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ تو شہر کے پکے برتنوں کی طرح خوبصورت شور پیدا نہیں کرتے بلکہ دونوں میں سے ایک ٹوٹ جاتا ہے۔ مجھ رہے ہو نا میری بات! ایسی کچھ سوچ کر میں نے اس کا لائسنس بنوایا تھا کہ جب دو برتن ٹکرا جائیں اور میرے مقابلے کا برتن ٹوٹ جائے تو بچنے کے لئے ایک راستہ باقی رہے۔ یعنی فائر تو کروں گا ڈاتے ماچھی کی بندوق سے اور عدالت میں یہ پیش ہو گی۔ عدالت اتنی پاگل تو ہے نہیں کہ اس کباڑ کھائی بندوق کو دیکھ کر مجھے پھانسی دے دے، ہوں!

مردارا خاموش ہوا تو کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی چاند جھونپڑی کے اوپر سے ہو کر دوسری طرف اس حد تک نکل گیا تھا کہ جھونپڑی کا سایہ، چھپر تلے بندھی بائکی کے قدموں کو چھونے لگا تھا۔ سناٹا اتنا گہرا تھا کہ گاؤں میں اذان دینے والے مرغے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ کچھ دیر تینوں یوں چپ بیٹھے رہے جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ پھر چاچا اپنے لمبے لمبے سفید بالوں کی ایک لٹ شہادت کی انگلی کے گرد لپیٹتے ہوئے بولا "ساری بات تو جوانی کی ہے، جوانی جس کسی پر آئی ہے اُجھ دے لے گئی ہے۔ جب میں جوان تھا تو تو شاید دودھ پیتا بچہ ہو گا۔ عجیب سرور اور نشہ سا رہتا تھا ہر وقت منڈلی بیٹھتی تو رات بھر دوسروں سے لڑنے کا پروگرام بنتا۔ خون تھا نا رگوں میں خواہ مخواہ لڑنے کو جی چاہتا تھا۔ کبھی کبھی جب کوئی بھی لڑنے پر آمادہ نہ ہوتا تو جی کرتا اونچے اونچے درختوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اکھیڑ دوں۔" چاچا منہال کو ہاتھ سے چھوڑ پرالی کو تے پر لپیٹنے لگا۔ "تم جانو جب جوانی اتنی بے قابو ہو۔ تو اس کی لگام ضروری ہے۔ لگام ایسی ہو کہ دل خود قبول کرے۔ میری اس منہ زور جوانی کی لگام مجھے نوری کے ہاتھ میں نظر آئی پہلے دن تو میں نے اسے یونہی نظر انداز کر دیا۔ مگر جب کچھ دنوں بعد اس نے مجھے دیکھ کر ناک چڑھائی اور منہ پھیرا تو یہ لگام ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے دل کو تسلی دی کہ مذاق کر رہی ہے۔ مگر شاید یہ مذاق نہ تھا۔ اس کی ہر حرکت سے پتہ چلتا تھا کہ وہ مجھ سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی۔ کیا کیا جتن نہ کئے ہوں گے۔ میں نے ململ کی قمیض پہن پہن کر پوس ماگھ کے مہینوں میں پھرا ہوں۔ بھرے چوپال میں مینی پکڑنے کے بہانے سے نور بخش دھوبی کے بیٹے کا انگوٹھا توڑ دیا اور پھر ایک بھاگتے چور کے پیچھے چھوی لے کر اس وقت بھاگا جب سارا گاؤں منہ دیکھ رہا تھا۔ چور کے پاس دیسی پستول تھا نا۔ مگر ان سب باتوں کا مطلب نوری کے دل کو پھیرنا تھا میں چاہتا کہ نوری کسی طرح اس اندھی جوانی کی لگام بن کر میرے گلے سے آ لگے۔ مگر اس نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور پھر اسی طرح بالکل تمہاری طرح، میں بھی نفرت کے شعلوں میں جل کر محبت جیتنے نکلا۔ مگر ہار گیا تم نے دتے ماچھی سے بندوق مانگی ہے اور اپنے بچاؤ کے لئے سب منصوبے بنائے ہیں۔ مگر میں اکیلا، بغیر کچھ سوچے سمجھے، اس آگ میں کود پڑا۔ رات کو اپنے ڈیرے سے گاؤں واپس آ رہا تھا۔ ان دنوں میرا ڈیرا گاؤں کی پرلی جانب ہوتا تھا۔ جہاں آج کل چکلے کے کھیت ہیں۔ خیر پرانی چکی کے موڑ پر مجھے نوری ایک درخت کے نیچے کھڑی ہوئی دکھائی دی۔ اس وقت اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ جی میں آیا چیخیں مارتی ہوئی کو اٹھا کر بھاگ جاؤں سیدھا ڈیرے۔ مگر میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ سب مجھے تو وہ اس وقت کانچ کی بنی ہوئی لگتی تھی۔ اسی لئے میں نے ہاتھوں میں نرمی پیدا کر کے اس کی طرف بڑھایا۔ مگر آہٹ پا کر وہ یوں چونکی جیسے گولی چلی ہو۔ اور پھر خوف سے وحشی ہرنی کی طرح اتنی تیز بھاگی کہ کھالی بھی نہ پھلانگ سکی اور بری طرح گر پڑی۔ اس نے ایک بار تو اٹھنے کی کوشش کی مگر یوں ہانپ کر رہ گئی جیسے پاؤں میں من من لوہا بندھا ہو۔ میں اپنی قسمت پر مسکرانے ہی والا تھا کہ جیرا ایک تیز ٹیکی گھوڑی کو بھگاتا ہوا چکی کے موڑ سے یوں آ پہنچا جیسے پہلے سے چھپا بیٹھا ہو۔ میرے قریب آ کر اس نے صرف میری طرف گھور کر دیکھا اور جلدی سے گھوڑی سے اتر کر

نوری کو اٹھلنے لگا۔ میری طرف اس لئے نہ بڑھا ہوگا کہ میرے ہاتھ میں چم چم کرتی چھوی تھی۔ نوری اٹھی اور اس کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ مجھے تو اس وقت اپنے کپڑے بھی آگ کے بنے ہوئے لگے۔ ہتھیلیوں پر پسینہ آ گیا۔ کان شائیں شائیں کرنے لگے اور بات کی تہہ تک پہنچنے میں مجھے ذرا بھی دیر نہ لگی۔ پہلے ہی سے مجھے جیرے پہ شک تھا کہ وہ ہر روز شام کے بعد گھوڑی پر بیٹھ کر اکیلا ڈیرے کی طرف کیوں جاتا ہے۔ جیرا ایک منٹ تک چپ چاپ مجھے گھورتا رہا اور پھر اوپر تلے دو تین موٹی موٹی گالیاں دے کر غصے سے ہانپنے لگا۔ تھا تو وہ بھی اونٹ جتنا جوان اور کم میں بھی نہ تھا۔ چھوی پاس نہ بھی ہوتی تو مقابلہ کئے بغیر کبھی نہ جاتا۔ مگر میں نے گالیوں کا جواب گالیوں سے دینے کے بجائے کہا۔ کیوں حرام موت مرتا ہے؟ گھوڑی پر بیٹھ اور گاؤں بھاگ جا۔ وہ میری اس بات پر اور بھی بپھر گیا اور زمین سے ایک بڑا سا ڈھیلا اٹھا کر پوری طاقت سے میرے سر پہ دے مارا۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش تو بہت کی۔ مگر مجھے ڈھیلا آن ہی لگا۔ سر پہ لگتے ہی دو من چکر سے آ لئے۔ غصے بھرے ناگ کی طرح میں نے چمکتی ہوئی چھوی سے جیرے پہ بھرپور وار کیا۔ مگر وہ اس کا کندھا چھوتی ہوئی نوری کے سینے میں اترگئی۔ میں نوری کو نہیں مارنا چاہتا تھا۔ لیکن جب میں نے چھوی اس کے سینے سے باہر کھینچی اور خون کا دھارا بہہ نکلا۔ تو اس وقت مجھے اس کے مرنے کا ذرہ بھر بھی افسوس نہ ہوا۔ بلکہ میں نے اس پر دوسرا وار کر کے اسے جلدی ٹھنڈا کر دیا تھا۔ جیرا زخمی کندھے پر ہاتھ رکھے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر میں نے اس پر دوسرا وار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ خبر نہیں کیوں۔ مگر مجھے یاد ہے کہ میں نے ڈر کر نہیں بلکہ اپنی مرضی سے اس پر دوسرا وار نہیں کیا تھا۔"

"پھر؟" چاچا ایک لحظہ کے لئے چپ ہوا تو جیجا اور سردارا کل دار کھلونوں کی طرح پھڑک کر بول پڑے۔

"پھر کیا۔ جیرے کی گھوڑی سامنے کھڑی تھی۔ میں اس کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر چک نمبر ۸ بھاگ گیا۔ مگر جانے کیسے صبح ہوتے سے تھوڑی دیر پہلے مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ پانچ چھ روز میں وہ وہ خبریں اڑی ہیں۔ گاؤں میں کہ پہلے ان کی بھنک بھی نہ پڑی تھی۔ سارا گاؤں کہتا پھر رہا تھا کہ نوری ہر روز جیرے کو ملنے جایا کرتی تھی اور جب دونوں کو جیرے نے دیکھ لیا۔ تو دونوں جوانوں کی ٹھن گئی۔ بعض لوگوں کا خیال یہ تھا کہ نوری کا قاتل جیرا ہے۔ جب نمبردار کے ساتھ ماں جیناں مجھے حوالات ملنے آئی تو اس نے مجھے ایسی ایسی باتیں بتائیں کہ میں تلملا کر رہ گیا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ نوری پرانی چکی کے موڑ پہ تمہاری راہ دیکھنے جایا کرتی تھی۔ ورجیرا اس پہ مرتا تھا ورنہ اس نے تو کبھی جیرے سے بات بھی نہ کی تھی۔ میں نے سب کی باتیں کان لگا کر سنیں اور خاموش رہا۔ حتیٰ کہ میں نے اپنی صفائی میں کچھ کہا نہ نوری کے خلاف۔ چپ چاپ جیل چلا گیا۔ معلوم نہیں میں نے ایسا کیوں کیا۔ جانے وہ کونسی شے تھی جو اندر ہی اندر مجھے جیل جانے پر اکسا رہی تھی۔ سات سال جیل میں سڑا۔ میں نوری کو سمجھو۔ اتنی لمبی قید اور اس کی صعوبتیں جھیلنے کے بعد اور پھر آج چوبیس برس کے بعد بھی وہ مجھے اسی طرح یاد آ رہی ہے۔ وہی معصوم کانچ کی بنی مورتی نوری جو پرانی چکی کے موڑ پر چھپ کر مجھے دیکھا کرتی تھی۔ یوں لگتا ہے جیسے میں نے کوئی ایسا گناہ کیا ہے جس کا داغ میں پھانسی کی سزا پا کر بھی نہیں دھو سکتا۔ میں نے اکثر اسے خواب میں دیکھا ہے۔ وہ محبت کرتی تھی نا۔ مجھ سے نہ ہی جیرے سے ہی سہی کسی ایک کے لئے تو اس کے دل میں محبت تھی۔ مجھے بعض اوقات ان خیالوں سے اس قدر وحشت ہوتی ہے کہ دل کا زخم ہرا ہو جاتا ہے۔ جیسے میں نے گلال جیسے چہرے والی معصوم نوری کو نہیں بلکہ زہر میں بجھی ہوئی تلوار اپنے کلیجے میں بھونک دی ہو۔ دن کو رات کو سوتے جاگتے اس نے میرا دامن کھینچا ہے۔ آدھی آدھی رات کو اکثر مجھے جگا جگا کر رلایا ہے۔ یہ کیسی عورت تھی۔ میں نہیں کہہ سکا۔ میں نے اسے قتل بھی کیا تھا کہ اس کی یاد میں تڑپا بھی ہوں۔ میری روح کو کسی وقت بھی چین نہیں ملا۔"

"جیرے کا کیا بنا؟" جیجا سوئی سوئی آواز میں بولا۔

"میرے جیل سے واپس آنے تک وہ یہ گاؤں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔" چاچا موٹے کھیس کے کونے سے اپنی نم آلود آنکھوں کو خشک کرتے ہوئے۔ جھونپڑی کا چھپر سرکا کر باہر نکل گیا تو صبح کا ہلکا نور اندر آنے لگا۔ جیجا اور سردارا چپ چاپ جہاں بیٹھے تھے وہیں لیٹ گئے دونوں نے کسی سے کوئی بات نہ کی۔ صرف ایک بار جیجے نے اٹھ کر چھپر کو جھونپڑی کے دہانے پر جما دیا اور پھر لیٹ گیا۔

پورنماشی کی رات سے پہلے کر چاند کی بیس تک گاؤں بھر میں وہ ڈھولک بجی ہے کہ کچی کومل کنواریوں کے دل بھی شادی بیاہ کے تصورات میں ڈوب ڈوب گئے کسی نے لال جوڑا چھنکا کر، ہونٹوں پر اجلی مسکراہٹ سجائی ہے تو کسی نے سرخ سرخ آنچل کمر کے گرد لپیٹ کر پورے آنگن میں پاؤں تھرکائے ہیں۔ جیراں چودھری کی بیٹی نہ ہوتی تو مرغی کی طرح ڈربے میں بند کر کے سسرال پہنچا دی جاتی مگر وہ تو چودھری جلال کی بیٹی تھی۔ اس کی شادی قریب کیا آگئی تھی، سر پر بہار لگ رہا تھا سب کو سلامت کی دکان کی کناری اور کرن دو دن میں پھیل کر چھوٹی بچیوں کے دوپٹوں سے الہڑ جوانیوں کے لہنگوں تک جا پہنچی تھی۔ شادی سے دو دن پہلے جب رات کو بڑ کے پرانے درخت کے نیچے بچھی ہوئی بے شمار چارپائیوں پر بیٹھے جیراں اور تھیلے کا نکاح ہو گیا اور چھواروں کی بارش شروع ہو گئی تو سردارا اندھیرے سایوں میں سے ہوتا ہوا چاچا عمر کے ڈیرے آپہنچا۔ اس وقت چونکہ وہ نکاح کو ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا تھا۔ اس لئے اس کے کان سرخ اور آنکھیں وحشیوں جیسی ہو رہی تھیں۔ چاچا کلف لگی سفید پگڑی کو سر پر جا چکا تو اسی طرح بندھی بندھائی پگڑی کو اتار کر کھونٹی پر لٹکا کر بولا، "نکاح ہو گیا خیر سے تیری جیراں کا!"

سردارا اس وقت یہ بات سننے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس نے عجیب بڑی بڑی آنکھوں سے چاچے کی طرف دیکھا اور پھر منہ پھیر لیا۔

جب چاچا عمر نے دوبارہ بغیر کچھ کہے اس کا کندھا ہلایا تو وہ تقریباً روتے ہوئے بولا "نکاح ہی ہوا ہے، ڈولی تو نہیں اُٹھ گئی۔ اور سردارا مر گیا ہے کیا؟" پھر جب چاچے نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تو وہ خود ہی چاچے عمر کی طرف بڑی تمکنت سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"برات پرسوں جا رہی ہے چراغ جلتے ہی چل پڑے گی۔ ڈتے ماچھی سے بکی میں مانگ لوں گا۔ وہ ذرا تیکھی گھوڑی ہے۔ بانکی پر جیجا ہوگا، اور اگر دلا رضامند ہو گیا تو اسے اپنی گھوڑی پر بٹھا کر ساتھ لے لوں گا۔ ان دونوں کو ساتھ لے جانے سے فائدہ یہ ہے کہ یہ میرے آگے آگے رہیں گے اور وہ دوسرے گھوڑیوں والے جوانوں کو تھیلے کے قریب نہ آنے دیں گے۔"

سردارا اس بات کے انتظار میں چپ ہو کر چاچے کی طرف دیکھنے لگا کہ شاید وہ کوئی مشورہ دے گا۔ مگر جب چاچا سردارے کی طرف ہر بڑ ہر بڑ دیکھنے لگا تو سردارے نے خود ہی موضوع بدل دیا اور بولا "سو رہا ہوتا تو شادی سے پہلے ہی ایک بار مل جاتا۔ لیکن وہ تو اندر سے نکلتی ہی کو نہ تھا۔ رات رات بھر گلیوں میں چھپ کر بیٹھا ہوں کہ مل جائے، مگر شاید میرے ارادوں کو بھانپ چکا ہے وہ۔ کیوں چاچا؟"

چاچا ابھی جواب دینے کے لئے کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ جیجا بھاگتا ہوا اس زور سے سامنے کی کھولی پھلانگ آیا کہ بانکی ہڑ بڑا کر کھڑی ہو گئی۔ سانس برابر کئے بغیر وہ سردارے کی طرف منہ کر کے بولا۔

"سردارے۔ اِتھیلا!"

"کہاں؟" چاچا اور سردارا ایک ساتھ بولے۔

سالیوں میں باندھ دیا اور پنجوں کے بل چلتا ہوا حاجی گل محمد کے اجڑے ہوئے سنسان ڈیرے کی سمت بڑھنے لگا۔ ڈیرا کیا تھا چار دیواری سی تھی۔ اس کے ساتھ ایک شکستہ سا کمرہ تھا۔ چار دیواری سے باہر آموں کے گھنے گھنے درخت تھے۔ وہ درختوں کے تنوں کے ساتھ لگ لگ کر دیوار تک پہنچا۔ یہاں تک کہ آخری کونے میں کھڑی، دو کچی اینٹوں کا چبوترا آ گئے۔ چبوترے پر چڑھ کر اس نے آہستہ آہستہ سر کو دیوار سے اونچا کیا اور ایک لمحے تک وہ اندھیرے میں سانس روکے کھڑا رہا۔ اس نے تھیلے کو دیکھ تو لیا تھا۔ مگر اسے دیکھ کر مطمئن ہونے کی بجائے سُن ہو کر رہ گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ اپنے پاؤں برف میں دھنستے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ مگر اب اسے سردی کا مطلق احساس نہیں رہا تھا۔ جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے پر وہ چبوترے سے نیچے اتر آیا۔ اس کے ذہن میں ایک لفظ ابھرا۔ تھیلا پھر ایک اور لفظ۔ جیراں۔ یہ دونوں الفاظ ابھرے، ناچے اور گڈمڈ ہو گئے!

وہ پہلی مرتبہ تھیلے کی تلاش میں آیا تھا۔ تھیلے کے ساتھ رات کے گہرے سناٹوں میں بیٹھی ہوئی جیراں کو دیکھ کر اسے ایک بار تو یقین ہی نہ آیا۔ دوسری بار پھر اس نے ہمت کر کے چبوترے کی طرف قدم بڑھایا تو اس میں اوپر چڑھنے کی سکت نہ تھی۔ وہ کچھ دیر چپ چاپ زمین پر کھڑا رہا۔ بندوق کو بائیں ہاتھ میں تھام کر چبوترے پر قدم رکھا اور بغیر کچھ سوچے اس کے اوپر چڑھ گیا۔ اور کسی خاص وقت کا انتظار کئے بغیر بندوق اٹھا کر سالیوں کی شست لی۔

اسی اثنا میں جیراں تھیلے کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "کتنے بے صبر ہو تم، دو دن بھی انتظار نہ کر سکے۔ پرسوں تو میں تمہارے پاس چلی ہی آتی۔"

تھیلا اس کے جواب میں کھلکھلا کر ہنسا تو سردارے نے بندوق نیچے کر لی اور ان کی باتیں سننے لگا۔

تھیلے نے جیراں کے قریب ہو کر اس کے کانوں میں دمکتے ہوئے جھمکوں کو آہستہ سے کھینچا اور بولا۔ "چھپ چھپ کر ملنے میں جو مزہ ہے وہ تو تمہیں ہمیشہ کے لئے پا لینے میں بھی نہیں۔" جیراں کچھ نہ بولی

"بول، جس وقت تو گھر سے نکلی ہو گی" تھیلا پھر بولا۔ "تو کتنا مزہ آیا ہو گا؟"

"خاک! جیراں ٹھنکتی ہوئی کہنے لگی "مفرور آں، دو چاچی کے پاؤں کو مہندی لگا کر یونہی بہانے سے نکل ہوں۔ ورنہ وہ میرے ساتھ آتیں اب بھی جیناں ساتھ آئی ہے۔ پر انہیں کیا پتہ کہ جیناں میری پکی سہیلی ہے۔" جیراں مسکرائی "بڑی اچھی ہے بیچاری، سب عورتوں کے پاؤں میں مہندی لگا کر باہر نکلنے کی ترکیب بھی اسی نے بتائی تھی۔"

مگر تم تو اکیلی آئی تھیں۔" تھیلا گھبرا کر بولا۔

"اکیلی کیسے آ سکتی تھی جی؟ جیناں کے ساتھ آئی ہوں۔

جیناں کے ساتھ، چاچے نورے کے کنوئیں پر جو باڑہ ہے نا۔ وہاں کھڑا کر آئی ہوں اسے۔ بس تو جلدی بول، کیا کہنا ہے۔"

"کہنا کیا تھا۔" تھیلا اس کے بالوں کو چھوتے ہوئے بولا۔ "بس سگائی کی مبارک دینی تھی۔"

"کیوں کہو۔ خواہ مخواہ تنگ کیا ہے مجھے۔"

"اری پگلی تو نہیں۔ برسوں کی محبت اور انتظار کے بعد آج تمہیں پایا ہے۔ ساری محنت وصول ہو گئی ہے مجھ کو بھی خوشی بھی آج محسوس کر رہا ہوں۔ پہلے تو ملاقات پر خوشی کے بجائے دکھ ہوا کرتا تھا۔ سوچتا تھا، ممکن ہے تمہیں اور کوئی چھین کر لے جائے۔"

"اور کون؟" جیراں نے بات کاٹ دی۔

"بڑی بھولی ہو۔ جیسے کچھ جانتی ہی نہیں۔" تھیلا برجستہ بولا۔ "کتنے ہی اگلوں سے تمہیں جیت کر لایا ہوں۔ سو آرسے ہیں تو شرط

بھی لگ گئی تھی۔ پھر دین محمد دار کا۔ اور بھتوجی ذیلدار کا۔ ان کے بارے میں تو تو خود بھی جانتی ہے۔ کیا کچھ نہ کیا ہو گا۔ ان کمبختوں نے۔"
"لیکن سردارا تو ان جیسا نہیں۔" جیراں نے فوراً کہا۔ "اگر اسے معلوم ہوتا کہ میں ٹکوری بن کر بچپن سے تمہیں پوج رہی ہوں تو وہ کبھی شرط نہ لگاتا۔"

"ہاں۔" تھیلا آہستہ سے بولا۔ "آدمی مل گردے کا ہے اور یاروں کا یار۔"

سردارے کا نئی بنی ہوئی چارپائی کی طرح تنا ہوا بدن یک لخت ڈھیلا پڑ گیا جیسے کسی نے ایکا ایکی دوائن کھینچ لی ہو۔ اس کے ہاتھوں میں لرزش آ گئی اور جسم میں بھرے ہوئے انگاروں پر برف کی تہہ جم گئی ہو۔ اس کا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور کندھے پر جمی ہوئی بندوق پہلو پر لٹک آئی تھی۔ بندوق کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے اس نے اپنی انگلیوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی پوروں کو یوں آنکھوں پہ رکھ لیا جیسے نہ رکھتا تو وہ پتھر بن جاتیں۔ چند لمحوں کے بعد تھیلے نے گھوڑی کی ٹاپوں کی آواز سُنی جو سناٹے کو چیرتی چلی جا رہی تھی۔
وہ بھاگ کر چاردیواری سے باہر آیا۔ میر پور جانے والی پگڈنڈی پر کوئی گھڑسوار سرپٹ اڑا چلا جا رہا تھا۔

اگست ١٩٦١ء

عکس تحریر: حمید اختر

# بچے اور بارود

محمد منشا یاد

'بی بی آپ کا نام ؟'

'کیا ۔ ذرا بلند آواز میں کہو۔'

'کیا آپ اونچا سنتی ہیں ؟'

'ہاں جی ۔ بہت دنوں سے لگی ہوں ۔'

'کیا پہلے ٹھیک سنائی دیتا تھا؟'

ہاں ساری آوازیں سن لیتی تھی ۔ جہاں ہمارا گھر تھا ۔ وہاں بہت درخت تھے ۔ درختوں پر سارا دن کبوتر، کوے، فاختائیں، چڑیاں اور طوطے بولتے رہتے ان کی رنگا رنگ آوازوں سے عجیب سماں بندھا رہتا۔ ہمارے گھر کے پاس ایک آبشار تھی ۔ بارہ مہینے بہتی رہتی ۔ جب بھی پیچھے پہاڑوں پر بارش ہوتی یا برف پگھلتی اس کا شور بڑھ جاتا ۔ میں روٹی پکاتی ، جھاڑو دیتی ، بکری دوہتی ، اس کی آواز سنتی رہتی ۔ اُس کی آواز میں ذرا سی تبدیلی بھی آتی تو مجھے گھر بیٹھے پتہ چل جاتا کہ پانی کا کتنا بڑا سیلاب آیا ہے ۔ میرا مرد کھیتوں میں ہل چلاتا تو مجھے اس کی آہٹ سے پتہ چلتا رہتا ۔ اب وہ کھیت کے کس حصے میں ہے ۔ وہ جنگل میں لکڑیاں کاٹنے جاتا تو مجھے گھر بیٹھے اس کے کلہاڑے کی آواز سے اندازہ ہوتا رہتا اب وہ تھک گیا ہے اور اسے قہوے کی ضرورت ہے ۔ رات کو کمرے میں کہیں چوہا حرکت کرتا تو میری آنکھ کھل جاتی ۔ میرا بیٹا کبھی کبھی مجھے تنگ کرنے کے لئے دبے پاؤں آتا اور اچانک ہو کر کے مجھے ڈرانا چاہتا ۔ تم جانتی ہو بیٹی ماں کا دل تو بچے کے ساتھ بندھا ہوتا ہے ۔ اس کا ہر پاؤں میرے دل پر پڑتا مجھے اس کے آنے کا اندازہ ہو جاتا مگر میں اس کا دل رکھنے کے لئے جھوٹ موٹ ڈر جاتی جس پر وہ خوش ہو کر زور زور سے ہنسنے لگتا ۔

'آپ کب سے اونچا سننے لگی ہیں ؟'

'اب تو بہت دن ہو گئے بیٹی ۔ دھماکوں کی آوازیں سن سن کر کانوں کے پردے پھٹ گئے ہیں ۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہے ۔ سننے کے لئے اور رہ ہی کیا گیا ہے ۔'

'کیا آپ کو یاد ہے جنگ کب اور کیسے شروع ہوئی تھی ۔'

مجھے تو اتنا یاد ہے بیٹی ۔ ہم امن چین سے رہتے تھے ۔ ہمارا چھوٹا سا گھر تھا ۔ تھوڑے سے کھیت تھے مگر ہم خوش تھے اور مطمئن تھے اللہ نے ہمیں چاند سا بیٹا دیا تھا ۔ ہمارے پاس دو گدھے تین بیل ، تین بکریاں اور بہت سی مرغیاں تھیں ۔ ہاں ایک بلی بھی تھی ۔ بڑی پیاری ۔ میرے بیٹے سے بڑی مانوس تھی ۔ رات کو اس کے بستر میں گھس کر سو جاتی ۔ ایک بار

"آپ جنگ کے بارے میں بتا رہی تھیں"

"ہاں بیٹی ـــــ میں نے بالکل ٹھیک بتایا ہے۔ ہماری کسی سے لڑائی تھی نہ دشمنی۔ اگر ہمارا کوئی جانور کسی دوسرے کے کھیتوں میں چلا جاتا تو ہم معافی مانگ لیتے۔ کسی دوسرے کا مویشی ہمارے کھیت میں گھس آتا تو ہم معاف کر دیتے۔ کوئی اور تنازعہ ہوتا تو ہم مل بیٹھ کر نپٹا لیتے۔ ہم اپنی اور اپنے بچوں کی ہی نہیں، سب کے مال و عیال کی خیر چاہتے تھے۔ کسی دوسرے کو خوش اور خوشحال دیکھ کر حسد کی آگ میں نہیں جلتے تھے۔ ہم نے لڑائی جھگڑے اور دشمنی کی ساری راہیں بند کر دی تھیں۔ لیکن یہ لڑائی؟ ـــ یہ تو بیٹی کہیں باہر سے آئی۔ کہیں اوپر سے نازل ہوئی۔ پتہ نہیں اس کے کیا اسباب تھے۔ کون سچا تھا اور کون جھوٹا کون حق پر تھا اور کون گنہگار ـــ ہم غریب لوگوں کو کیا معلوم بس یہیں تو اتنا پتہ ہے بیٹی ـــ ایک دن دھماکے کی آواز سنائی دی اور سارے پنچھی دانہ دنکا چگنا اور چہچہانا بھول گئے۔ فضا میں شگوفوں کی خوشبو کی جگہ بارود کی بو پھیل گئی۔ اس سے پہلے کبھی ہوائی جہاز گزرتا تھا تو میرا بیٹا بھاگ کر کسی ٹیلے یا چھت پر چڑھ جاتا اور اڑتے ہوئے ہوائی جہاز کو دیکھ کر خوش ہوتا مگر دھماکوں کی آواز سن کر اور یہ جان کر کہ یہ دھماکے ہوائی جہازوں نے اگلے ہیں، وہ سہم گیا اور ہوائی جہاز کی آواز سن کر بدکنے لگا۔ بھاگ کر سب سے پہلے ان خندقوں میں گھس جاتا جو ہم نے بڑے بوڑھوں کی ہدایت پر گھروں کے قریب کھود دی تھیں۔

"سنا ہے آپ کے میاں نے نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے جان دی۔"

"میں سمجھی نہیں بیٹی۔ ذرا اونچا بولو۔"

"آپ کے میاں کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔"

"اچھا اچھا ـــ بس بیٹی اچھا آدمی تھا۔ محنتی اور جاندار۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ بیٹے سے اسے بہت محبت تھی۔ کام کاج سے لوٹتا تو سب سے پہلے اسی کا پوچھتا۔ چوم چوم کر اس کے گال سرخ کر دیتا۔ کہتا تھا۔ اسے پیار کر کے ساری تھکاوٹ اتر جاتی ہے۔ اور وہ اسے پڑھانا لکھانا چاہتا تھا۔ اسے بڑا آدمی بنانا چاہتا تھا وہ پانچ سال کا ہوا تو ہم نے اسے بڑے گاؤں کے سکول میں داخل کر دیا۔ شروع شروع میں وہ خود اسے کندھوں پر بٹھا کر سکول لاتا لے جاتا تھا پھر وہ ہم عمروں کے ساتھ خود آنے جانے لگا مگر اسے اس کی بڑی فکر رہتی۔ ذرا دیر ہو جاتی تو بے چین ہو جاتا۔ بچوں سے سبھی محبت کرتے ہیں۔ بیٹی مگر میرا میاں تو جیسے اپنے بیٹے کا عاشق تھا۔ وہ تھا بھی بڑا خوبصورت، بھولا بھالا سا مگر اچھی چیزیں بڑے لوگوں کے پاس زیادہ دیر نہیں رہتی ہیں۔ ہم برے تھے بیٹی کیونکہ ہم اس کی حفاظت نہ کر سکے۔ اسے تو ہمارے گھر میں پیدا ہی نہ ہونا چاہیئے تھا۔ وہ تو شکل و صورت سے ہی کسی اور دنیا کی مخلوق نظر آتا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا۔ وہ کسی دوسری قوم قبیلے یا ملک میں پیدا ہو جاتا۔"

"میں آپ کے میاں کی شہادت کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔"

ہاں بیٹی۔ وہ شہید ہو گیا۔ شہید ہی سمجھو۔ جب لڑائی طول پکڑ گئی اور آدمیوں کی کمی ہو گئی تو اسے بھی پکڑ کر لے گئے۔ مگر اسے بل چلانا آتا تھا۔ بندوق نہیں اور لڑائی جھگڑے سے تو اسے بہت ہی وحشت ہوتی تھی۔"

"مگر میں نے سنا ہے اس نے نہایت جرأت کا مظاہرہ کیا اپنے جسم کے ساتھ بم باندھ کر دشمن کے ٹھکانے میں گھس گیا۔"

"میں نے بھی سنا ہے بیٹی۔ ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔"

"آپ نے اتنا عرصہ اس کے ساتھ گزارا ہے۔ آپ کچھ اس کے بارے میں تفصیل سے بتائیں۔"

"میں کیا بتا سکتی ہوں بیٹی۔ انسان کو بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔ میں تو اسے اس حیثیت سے جانتی تھی کہ اس نے کبھی چیونٹی تک کو ہلاک

نہیں کیا۔ میں نے تو اُسے کبھی کسی مویشی کو مارتے پیٹتے بھی نہیں دیکھا۔ ہوسکتا ہے بھرتی کے بعد اس میں تبدیلی آگئی ہو لیکن مجھے اتنا ضرور یقین ہے وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنے محبوب بیٹے کو چھوڑ کر کیسے مرنا چاہتا تھا۔

"تو کیا اس وقت آپ کا بیٹا زندہ تھا؟"

"ہاں — اس وقت وہ بالکل سلامت تھا۔ یہ تو بہت بعد کی بات ہے۔ جب جوان آدمی نہیں ملتے تھے اور بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو بھرتی کیا گیا"

"کیا آپ کے بیٹے کو بھی بھرتی کیا گیا تھا؟"

"بھرتی ہی سمجھو بیٹی — ایک دن سکول سے واپس آیا تو کہنے لگا کہ اگلے روز اس کے سکول کا معائنہ کرنے بڑے افسر آرہے ہیں اس لئے استاد نے ہدایت کی ہے کہ صاف ستھرے کپڑے پہن کر آنا۔ میں نے اس کی حجامت بنوائی۔ ناخن کاٹے۔ نہلایا دُھلایا اس کے سر میں خوشبودار تیل لگایا اور اچھے اچھے کپڑے پہناکر رخصت کیا۔ آہ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ مجھ سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ رہا ہے اگر مجھے ذرا سا بھی شبہ ہوتا تو میں اسے کبھی نہ جانے دیتی۔ اسے لے کر کہیں دُور چلی جاتی کسی غار میں پناہ لیتی یا پاتال میں چھپ جاتی"

"اچھا تو وہ سکول سے واپس نہ آیا؟"

"ایک وہی نہیں اور بھی بہت سے بچے واپس نہ آئے۔ میں نے بتایا نا — جوان آدمیوں کی سخت کمی ہوگئی تھی۔ انہوں نے بوڑھوں، عورتوں اور بچوں سے یہ کمی پوری کرنا چاہی"

"کیا بچے بھی بندوقیں چلاتے تھے؟"

"ان کے ذمے اور طرح کے کئی کام تھے۔ بندوقچیوں کو اسلحہ بارود فراہم کرنا۔ ان کا سامان اٹھانا۔ دشمن کی نقل وحرکت کی خبر دینا اور پیغام رسانی کرنا۔ لیکن میرا بچہ۔"

"آپ کے بچے کی ڈیوٹی تھی؟"

"دشمن جس علاقے سے پسپا ہوا تھا وہاں اُس نے جگہ جگہ بارودی سرنگیں بچھادی تھیں۔ باقاعدہ فوج آگے بڑھنے سے پہلے بچوں کو آگے بھیج کر معلوم کرتی تھی کہ وہاں بارودی سرنگیں تو نہیں ہیں۔ میرے بیٹے کا ایک ساتھی جو بُری طرح زخمی ہوگیا تھا۔ بتایا تھا کہ ان دونوں کی ریس لگوائی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ جو بچہ دوڑ کر پہلے واپس آئے گا اُسے انعام دیا جائے گا۔ وہ دونوں اس بات سے بے خبر کہ وہ زمین جوان کے لئے پھل پھول اور اناج اُگاتی تھی۔ اس میں بارود بو دیا گیا تھا، بھاگتے رہے۔ میرا بیٹا بہت تیز دوڑتا تھا ہمیشہ دوڑوں میں اوّل آتا تھا۔ وہ اس روز بھی آگے نکل گیا اور ساری سرحدیں پار کرگیا"

"مجھے آپ کے دُکھ کا اندازہ ہے"

"تمہیں کیسے اندازہ ہوسکتا ہے۔ بیٹی۔ کسی کو بھی اندازہ نہیں ہوسکتا۔ صرف وہی ماں میرا دکھ مان سکتی ہے۔ جس کا ایک ہی بیٹا ہو اور اسے بارودی سرنگوں سے اَٹی زمین پر دوڑایا جارہا ہو"

آپ ٹھیک کہتی ہیں لیکن ہم سب بارودی سرنگوں پر چل پھر رہے ہیں، پتہ نہیں کب کون جگہ سے اُڑ جائے۔ اچھا آپ کا بہت بہت شکریہ۔ کیا آپ بہنوں کے نام کوئی پیغام دینا چاہتی ہیں؟

"ہاں — میری دنیا کی تمام بہنوں سے اپیل ہے کہ جب تک پہلے بچنے ہوئے خونریزیوں سے باز نہ آجائیں۔ بچے پیدا کرنا چھوڑ دیں"

اپریل ۸۶ء

فرخندہ لودھی

پیار کا کیا پتہ چلتا ہے؟ کب ہو؟ کس سے اور کیسا ہو؟ یہ تو نشہ ہے کہ چڑھے تو یوں لگے ہو گیا، کچھ ہو گیا...

بیگم صاحبہ ماشاء اللہ دُودھوں نہاتی، پوتوں کھیلتی تھیں۔ گھر میں کس چیز کی کمی تھی؟ ہر شے وافر۔ اس وافر کا مصرف ہی جان کا روگ ہو گیا۔ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں پال پوس کر بڑا کر چکی تھیں۔ بچے اپنی اپنی جگہ ذمہ دار اور سمجھ دار تھے۔ اُن کا سب سے چھوٹا بیٹا زندہ ہوتا تو وہ بھی اب تک آٹھ نو برس کا ہوتا۔ چھوٹی بیٹی نجمی کے لاڈ پیار ایک عرصے تک چلتے رہے، لیکن وہ بھی سیانی ہو چکی تھی۔ بیگم کے میاں خاں صاحب ادھیڑ عمر کی انتہائی مصروف زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس عمر میں نہ تو اُن کے پاس پاگل کئے رکھنے والے جذبات تھے اور نہ ہی بڑھاپے کی مایوسیاں اور پچھتاوے۔ چالو مشین کی طرح ہر پُرزہ ٹھیک اور عادی تھا۔

بیگم صاحبہ کو گھر کا کام اب کام نہ لگتا تھا۔ یوں بھی خاں صاحب اچھے عہدے پر فائز تھے۔ اردلیوں، چپڑاسیوں اور چوکیداروں کی کمی نہ تھی، ہر کام کے لئے ہاتھ باندھے حاضر، بیکار پڑی جماہیاں لیتی رہتیں۔ پڑھی لکھی تھیں، لیکن اب کتابوں میں کیا رکھا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتیں: "جوانی کیا گئی، جینے کا مزا جاتا رہا"

ایک روز انہوں نے اچانک جانے کس خیال کے تحت نوکروں کو جمع کیا۔ اور اچھا خاصا لیکچر دیتے ہوئے کہا:

"جاہلو! تمہاری آئندہ نسلیں بھی جاہل ہی مریں گی۔ تم نوکر ہو۔ تمہارے بچے بھی برتن ہی مانجھیں گے اور ہنڈیا چاٹیں گے"۔۔۔ نوکروں نے جواب دیا:

"جناب ہماری قسمت میں یہی لکھا ہے۔ کیا کریں؟ گھوڑے اور گدھے بوجھ نہ ڈھوئیں تو بھوکے مر جائیں"۔

بیگم صاحبہ کو اُن کے اس احمقانہ جواب پر نہایت غصہ آیا۔ گویا انہیں شکست ہو گئی ہو۔

"جیو بھائی جیو۔۔۔ ہماری جیئے بلا"

"بھلا کوئی بہتر زندگی کا راستہ خاک سجھائے۔ جب کہ لوگ اُس پر چلنا قانونِ فطرت کی نفی کرنے کے مصداق سمجھتے ہیں"۔۔۔ وہ بیٹھی بڑبڑائے جاتی تھیں کہ خاں صاحب آئے۔ بیوی کا حال چال پوچھا تو پھٹ پڑیں۔ اپنی ذات کے اظہار کا خیال تھا یا اصلاحِ قوم کا جذبہ کہ انہوں نے ایک اسکول کھولنے کی اسکیم میاں کے سامنے پیش کی۔ خاں صاحب بیوی کا دل بہلائے رکھنا چاہتے تھے۔ بولے: "بیکار ذہن شیطان کا گھر ہوتا ہے۔ بس غریب پروری شروع کر دو، یہ ایک ایسا کام ہے جو کبھی بھی ختم ہونے کا نام نہیں لے گا۔ مشغلے کا مشغلہ، ثواب کا ثواب"۔

بیگم تو پہلے ہی تہیہ کئے بیٹھی تھیں۔ غریب والدین کو آمادہ کرنے میں بھی دیر نہ لگی۔ ہفتے کے اندر اندر گھر کے پچھلے آنگن میں دو تین درجن بچے تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جمع تھے۔

برآمدے کی سیڑھیوں پر بچے بیٹھ جاتے اور بیگم صاحبہ سامنے کرسی ڈالے آنکھوں پر عینک چڑھائے بوڑھی استانیوں کی طرح ہاتھ میں چھڑی پکڑے سبق رٹوایا کرتیں۔ بچے تختیوں کی جگہ کچا فرش استعمال کرتے اور قلموں کے بجائے شہادت کی انگلیاں۔۔۔ لکھائی کا پیریڈ شروع ہوتا تو بچے زمین پر یوں رینگنے لگتے جیسے کیڑے۔ قاعدے اور دوسری ضروریات کی چیزیں بیگم صاحبہ نے خاص اپنی جمع شدہ پونجی سے خریدیں۔ پانی کے لئے کورے مٹکے رکھوا دیئے گئے۔ گھنٹی کی جگہ ٹین کا

کنستر لٹکا دیا گیا جسے بچے وقت بے وقت کھڑکاتے تو بیگم صاحبہ کا پارہ چڑھ جاتا اور دل مسرت اور طمانیت سے یوں بھر جاتا جیسے وہ صرف یہی کام کرنے کے لئے دنیا میں تشریف لائی ہیں۔

ان ڈھیر سارے بچوں میں بعض کند ذہن تھے یا اپنے گھر کے ماحول کی وجہ سے پڑھائی میں دلچسپی نہ لیتے تھے۔ بعض اوسط درجے کا ذہن رکھتے تھے۔ بیگم صاحبہ کسی کے ساتھ تخصیص نہ برتتی تھیں۔ لگن اور پیار سے پڑھاتیں۔ انعام اور مٹھائی کا لالچ بھی دیتیں، لیکن تین سالہ ہمایوں نے اُن کے جی کو اپنی طرف یوں کھینچ لیا تھا جیسے وہ اُن کا اپنا بچہ ہو۔ چھوٹا سا ذہین، سانولا صحت مند ہمایوں کچھ ایسا دلکش تھا کہ بیگم صاحبہ کی نظریں اکثر اُسی پر جمی رہتیں۔

"توبہ ہے قدرت کیسے کیسے موتیوں کو مٹی میں رول دیتی ہے۔" وہ گھر والوں کے سامنے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتیں پیار کی پرکھ کا انحصار کچھ عمر پر نہیں۔ بعض لوگ بڑھاپے تک اس رمز کو نہیں سمجھ سکتے اور کچھ بچپن ہی میں اس کا شعور رکھتے ہیں۔ ہمایوں اگرچہ چھوٹا سا تھا، مگر محبت بھری نگہ کو پہچانتا تھا۔ پھر بڑے گھر کی آسودگی، بیگم صاحبہ کے ساتھ ایسا مانوس ہو گیا کہ دن بھر گھر کا رُخ نہ کرتا۔ وہ پچکار دُلار کر کے بھیجتیں یا سو جاتا تو کوئی اٹھا کر لے جاتا۔ لیکن دوسری صبح گیٹ پر ننھے منے ہاتھوں کی دستک ہوتی۔ "اماں جان دروجہ کھولیے — آگیا ہوں۔"

ماتا بیگم کے سارے حواسوں کو چوکا دیتی اور وہ گیٹ کھولنے کے لئے لپکی چلی جاتیں۔

چھونے سے میلے کرتے کا کھلا گریبان، پشت کی طرف ڈھلکا ہوا۔ آگے سے دامن اٹھا ہوا۔ ننگو منگو سا ہمایوں گیٹ کھلنے کا انتظار کر رہا ہوتا۔ بیگم کو دیکھتے ہی فوراً ماتھے پر ہاتھ رکھ دیتا۔

"پھلام اماں جان۔" بیگم صاحبہ جھوٹ موٹ چونکتیں۔

"ارے — تو اتنی صبح — اور تو جانگیہ کیوں نہیں پہنتا رے — ننگو منگو۔" وہ ہنستے ہوئے اس کا بازو کھینچتی اندر لے جاتیں۔

جب بیگم صاحبہ تلاوتِ کلام پاک کر رہی ہوتیں۔ ہمایوں کچھ دیر چپ چاپ سنتا رہتا۔ پھر کلام پاک کے اوراق کو انگلی سے چھونے کی کوشش کرتا تو بیگم صاحبہ ہولے سے ہاتھ جھٹک دیتیں۔ "گندے ہاتھ ہیں بیٹے۔" پھر وہ گندے ہاتھ دُھلوانے کے لئے لوگوں کو جگاتا پھرتا۔

"باجی! اٹھئے نا — آپا جاگو بھی دن ہو گیا — ابّو چھوٹے ہیں ہا ہا۔"

بھائی جان کے پلنگ کے قریب جا کر وہ ابّو کا مذاق اُڑاتا — جھوٹی نیند کے نشے میں کوئی ادھ کھلی آنکھ سے دیکھتا تو ہمایوں جھٹ سے "پھلام" داغ دیتا۔ اپنی پیاری باتوں سے اُس نے گھر کے تمام افراد کے من موہ لئے تھے۔ عفت آپا نے جو انگریزی ادب کی طالبہ تھیں اس ننگے پیارے بچے کا نام "کیوپڈ" رکھ دیا۔ اب سارا گھر اسے کیوپڈ کہتا۔

ہمایوں کے گھر میں اس طرح گھل مل جانے سے بیگم صاحبہ کو یوں لگتا جیسے اُن کا چھوٹا بیٹا نعمان واپس آگیا ہو جس کے لئے تنہائی میں بیٹھ کر وہ آنسو بہایا کرتی تھیں۔

بچوں کا اسکول جیسا تیسا چل نکلا تھا بیگم صاحبہ مصروف رہتیں۔ اُن کی مصروفیات میں ہمایوں کا کتنا حصہ تھا انہیں معلوم نہ تھا۔ وہ ایک محبوب ذمہ داری تھی کہ سب خوشی خوشی نبھاتے۔ عفت آپا یونیورسٹی سے لوٹتیں تو کبھی خالی ہاتھ نہ آتیں۔ بھائی جان بازار سے کھلونا نہ لا سکتے تو کاغذوں اور تیلیوں سے پھرکیاں، جہاز اور جانے کیا کیا بنا کر دیتے رہتے۔ اور باجی نجمی اپنی سلائی، رنگائی، دھلائی کے سارے ارمان ہمایوں پر پورے کرتیں۔ گھر بھر کے کپڑوں میں سے بچے ہوئے ٹکڑے خوب کام آرہے تھے۔ وہ مختلف رنگوں کے ٹکڑوں کو ملا جلا کر لباس کے نئے نئے ڈیزائن ایجاد کرتیں۔ ہمایوں کے سڈول بدن پر ایسے پھبتے کہ سب داد دیتے۔

نجمی نے ہمایوں کو کیوپڈ سے "کوپی" کہنا شروع کیا تو سب لوگ ہمایوں کو یکسر بھول گئے۔ کوپی پیارا اور مختصر نام تھا جو خود کوپی کو بھی پسند تھا۔ وہ بڑے فخر سے لوگوں کو بتاتا۔ "میں کوپی ہوں — پیار کا تیر چلانے والا دیوتا۔" یہ بات اُسے عفت آپا نے اچھی طرح رٹا دی تھی۔

غریب بستی کے لوگ کوپی کو دولتمند گھرانے کا لاڈلا دیکھ کر جلتے تھے۔ بیگم کو طرح طرح وسوسے اور وہم ستانے لگے۔

انہوں نے کوپی کی ماں سکینہ کو بلا کر کہا کہ اگر وہ پسند کرے تو بچہ مستقل اُن ہی کے گھر میں رہے۔ وہ اُسے اپنے بچوں کی طرح پالیں پوسیں گی اور پڑھا لکھا کر نوکر کروا دیں گی۔ سکینہ کو اور کیا چاہیئے تھا۔ اک ذرا ماں کی مامتا کی جا بہ ہرنے کیلیے کو تلپٹ کیا۔ اُسے تسلی تھی کہ بچہ ہمیشہ آنکھوں کے سامنے رہے گا۔ اور اس کی زندگی بھی بن جائے گی۔

کبھی کبھی جانے کیوں چھوٹے چھوٹے لقمے بنا کر کوپی کے منہ میں ڈالنے کے لئے سکینہ کا جی تڑپ اٹھتا۔ اس کے اور بھی چار چھ بچے تھے، لیکن کوپی آٹھویں دسویں روز اُن سے ملنے کے لئے آتا تو وہ اُسے ٹھونس ٹھونس کر دال روٹی کھلاتی۔ وہ مزے مزے سے کھائے جاتا۔ شام کو واپس جاتا تو کپڑے میلے اور پیٹ میں زیادہ کھانے کی وجہ سے اینٹھن ہوتی۔ بھائی جان ڈاکٹر تھے، گھر پر علاج معالجہ کر لیتے۔ اس روز کی بک بک سے تنگ آکر بیگم صاحبہ نے نیا حکم جاری کیا کہ سکینہ اپنے تمام بچوں کو ملانے کے لئے لے آیا کرے۔ جس دن سکینہ بچوں سمیت آتی تو برآمدے میں چارپائیاں ڈال دی جاتیں اور دال بھات کی دعوت ہوتی۔ بہن بھائی جانے لگتے تو کوپی تھوڑی دیر کے لئے چُپ سا ہو جاتا۔ سکینہ حسرت بھری نظریں ڈال کر چل دیتی۔ بیگم صاحبہ سے یہ نظریں برداشت نہ ہوتی تھیں۔ ایک دن اُن سے رہا نہ گیا تو انہوں نے سکینہ کو سمجھاتے ہوئے کہا :

"دیکھو بی بی اگر تو اپنے بچے کی بہتری چاہتی ہے تو تھوڑی سی جذبات کی قربانی دینی پڑے گی۔"

"اچھا بیگم صاحب۔"

سکینہ بظاہر مسکراتی ہوئی رخصت ہوئی، مگر اُس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے خیال میں بیگم صاحبہ کا جی ہمیشہ غوطے کھاتا رہا۔

رفتہ رفتہ کوپی کو اپنے گھر والے اور ماحول بھولتے گئے۔ اب وہ ذرا سی بھی گندگی برداشت نہ کرتا تھا۔ مزاج کے خلاف کوئی بات ہوئی، ضد کرنے لگا۔ اسکول کے دوسرے بچوں سے اپنے آپ کو الگ اور ارفع سمجھتا۔ کیونکہ اس کے پاس رنگ برنگی بش شرٹیں، نئے نئے سوٹ اور بوٹ، سوئٹر اور خوبصورت ٹوپیاں تھیں ـــ اسکول کے معاملات میں وہ اچھا خاصا بیگم کا مددگار ثابت ہو رہا تھا۔ ہاتھ میں چھڑی پکڑے، اِدھر اُدھر بھاگتے بچوں کو گھیر لاتا اور ان کی مُنّی مُنّی شکایتیں بھی کرتا ـــ بچے اس سے دبتے تھے۔ بعض جی دار موقع پا کر چھوٹے سے کوپی کی اچھی طرح مرمت کر چھوڑتے۔ وہ روتا چیختا بیگم صاحبہ کے پاس آتا۔ وہ بچوں کی ماؤں کو بلواتیں اور رعب سے کہتیں۔

"اپنے لڑکوں کو سمجھاؤ ـــ میں تو سب کا بھلا چاہتی ہوں۔ کوپی بچہ ہی ایسا ہے۔ خود پیار لیتا ہے۔"

ایک ماں نے چمک کر کہا : "اپنا اپنا نصیب ہے بیگم صاحبہ! آپ نے اُسے گود لے لیا ہے تو اپنے بچوں کی طرح اچھے اسکول میں بھجواؤ نا۔"

عورت کی اتنی بات بیگم صاحبہ کے سینے کو چھیدتی چلی گئی۔ اب خلوص سے زیادہ انا کا سوال تھا۔ وہ اپنے پیار کو نیچا نہ دیکھنا چاہتی تھیں۔ اچھے اسکول میں داخلے کے لئے تگ و دو شروع ہوئی۔ ہزار کوششوں اور سفارشوں سے انگریزی اسکول میں سیٹ مل گئی۔ اب کوپی بڑے ٹھاٹھ سے بھائی جان کے ساتھ اسکوٹر پر بیٹھ کر پڑھنے جاتا۔ نئے اسکول میں کوئی نہ جانتا تھا کہ اس کا باپ پھیری والا ترکاری فروش ہے اور اُس کی ماں لوگوں کے گھروں میں برتن مانجھتی ہے اور اُس کے ڈھیر سارے بھائی بہن نہایت ندیدے، کمزور، زرد رُو اور گندے ہیں۔ بات بے بات گالیاں دیتے اور لڑتے ہیں۔ کوپی تو صاف ستھرا صحت مند بچہ تھا اور پھر آنکھوں میں فرشتوں کی سی معصومیت اور قناعت ـــ اور ایک دلفریب مسکراہٹ، کہ آسودہ حالی کی شاہد تھی۔ دمکتی رنگت کہتی تھی، کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ وہ اپنی عمر کے مطابق آدابِ مجلس بھی سیکھ گیا۔ میز کرسی نہ ہو تو اُسے کھانے کا مزہ ہی نہ آتا۔ بڑوں کے درمیان نہایت تمیز اور سلیقے سے بیٹھتا اٹھتا اور بات چیت کرتا۔ نجمی اُس کی اتالیق تھی اور ہمجولی بھی۔ وہ اُس کی بات مانتا بھی تھا اور ٹالتا بھی۔

کوپی کچھ سمجھ دار ہوا تو خاں صاحب نے اچھے علاقے میں نیا گھر بنوا لیا۔ بھائی جان نے وہاں اپنا کلینک کھول لیا۔ نجمی کا کالج بھی اسی طرف پڑتا تھا اور کوپی کا اسکول بھی۔ اس کے علاوہ جب سے انہوں نے کوپی کو گود لیا تھا۔ غریب طبقہ در پردہ اُن کے خلاف ہو گیا تھا۔ عورتیں تو برملا کہا کرتیں : "کیا لال جڑے تھے جو کرے ہیں۔"

ضد میں آکر، ایک ایک کر کے، لوگوں نے اپنے بچّوں کو بیگم صاحبہ کے اسکول سے اٹھالیا۔ پہلے گلیوں میں آوازہ پھرتے، بیگم کی ٹیں تو ٹوٹی۔

غریبوں اور جاہلوں میں محبت اور نفرت دونوں وقتی جذبے ہوتے ہیں۔ غور و فکر اور ریاکاری کے نہ ہونے کے باعث کوئی جذبہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہتا۔

خاں صاحب نے اس علاقے سے اپنا ڈیرہ اٹھا کر اپنا بھلا کیا۔ نئے گھر میں جانے سے سب کو فائدہ ہوا پر سکینہ کو یوں لگتا تھا جیسے زندگی کی کچھ سانسیں کم ہو گئی ہیں۔ خاں صاحب کی کوٹھی کیا خالی ہوئی سکینہ کی گود خالی ہو گئی۔ اتنے بچوں کی ماں، سکینہ، کوپی کے لئے کوکھ پکڑ کر رہ گئی۔ روتی تھی اور یاد کرتی تھی۔ اُس کا میاں بھی ایک دو روز چپ سادھے رہا۔ سکینہ کی اداسی ختم نہ ہوئی تو تنگ آکر اُس نے بیوی کو دو چار لگائیں اور کہا:

"جولڑکا مر جاتا تو کیا کر لیتی۔ بھلے لوگ اُس کی زندگی بنانا چاہتے ہیں اور تیری ممتا موڑا ہی نہیں لیتی — جا — جا کر لڑکے کو واپس لے آ۔"

ہفتہ عشرہ بعد کوپی ملنے کے لئے آتا تو سکینہ کھوج کھوج کر پوچھتی "تو باجی والے کمرے میں مسہری پر ہی سوتا ہے نا؟ تجھے میز پر ہی کھانا کھلاتے ہیں نا! اور تو کار میں اسکول جاتا ہے"!

بیگم صاحبہ کے سلوک میں کہیں بھی تو ڈھیل نہ تھی۔ یونہی آتے جاتے کوپی سیانا ہو گیا۔ سکینہ کو اُسے واپس لانے کی کبھی ہمت نہ ہوئی۔

بارھویں سال میں قدم رکھ کر بچے زقندیں بھرنے لگتے ہیں۔ کبھی جوانی کا احساس ہوتا ہے، کبھی بچپن کا — من مانی کرنے کو جی بے قرار رہتا ہے۔ گھر سے باہر کی دنیا میں تحقیق و دریافت کے لئے طبیعت مچلتی ہے۔ اور وجود کے اندر چونکا دینے والی دنیائیں جنم لیتی ہیں۔ بچے چاہتے ہیں کہ لوگ ان کے نئے وجود کو جلدی تسلیم کر لیں۔ اپنی ذات آزمانے اور منوانے کے مواقع کچھ گھر سے باہر ہی میسر آسکتے ہیں۔

کوپی اس عمر کو پہنچا تو اُسے قید و بند سے آزاد ہونے کے کئی مواقع تھے۔ سکینہ کے گھر میں ہر قسم کی نازیبا حرکات کی جا سکتی تھیں، جہاں چاہے، جس طرح چاہے اُٹھے بیٹھے؛ آئے جائے، گالی دے یا برائی کرے، کوئی نہ ٹوکتا تھا۔ چھٹی کے روز ملنے کے لئے آتا تو اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے اُس کے پَر اُگ آئے ہیں اور پنجرے کی تیلیاں کمزور پڑ گئی ہیں۔ وہ انھیں توڑنا چاہے تو کسی وقت بھی توڑ سکتا ہے۔ یہاں ہر وقت گھرکیاں دینے والی باجی جی نہ تھیں۔

"دیکھو، یونیفارم بدلو، پھر کھانا ملے گا — امّی یہ گندے لڑکوں کے ساتھ کھیلتا ہے۔ امّی اس نے میرا نیل پالش کاغذوں پر لیپ کر پھول بنائے ہیں۔ وغیرہ۔" نہ ہی عفت آپا تھیں کہ ساتھ چلتے ہوئے کہیں:

"تمیز سے چلو۔ راستہ دیکھ کر چلو۔ یہ کبوتر، یہ پتنگ ایک دن ضرور تیرا ایکسیڈنٹ کروائیں گے۔"

ماں کے گھر میں تو وہ پتنگ لوٹتا لوٹتا، گلیاں، بازار، جوہڑ اور کوڑے کے ڈھیر، سب اپنے پاؤں سے پامال کر دیتا۔ اور اُسے کوئی روک نہ سکتا تھا۔ بھائی جان اسکول کا کام نہ کرنے پر 'کان کھنچائی' کرنے یہاں نہ آتے تھے۔ سکینہ کے گھر کی فضا کھلی اور آزاد تھی۔ اُدھر ہمسائیاں سکینہ کو یقین دلاتی رہتیں:

"بہن اپنا خون ہی اپنا ہوتا ہے۔ پڑھا لکھا رہے ہیں تو اپنے فائدے کو۔ روٹی، کپڑے پر پڑھا لکھا غلام کیا بُرا؟"

سکینہ اَن پڑھ اور غریب تھی جو بیٹے کو پیدا ہوتے ہی 'لکشمن داس' سمجھتی تھی۔ اس کے دوسرے دو لڑکے تنوروں پر روٹی برتن پکڑانے پر ملازم ہو گئے تھے۔ وہاں وہ کھانا بھی کھاتے اور دس روپے ماہوار ماں کو بھی لا کر دیتے۔ سکینہ اُن پر اعتماد کرتی تھی۔ اُن کے مقابلے میں کوپی نازوں میں پلا، بگڑا ہوا چھوکرا تھا۔ کبھی ماں کے لئے کوئی تحفہ وغیرہ لے بھی آتا تو سکینہ کا دل خوش نہ ہوتا۔

اِدھر بیگم صاحبہ کے گھر میں کوئی چور گھس آیا تھا۔ چھوٹے موٹے کپڑے، لڑکیوں کی زیبائش کی چیزیں، پن، پنسلیں، آئے دن کوئی نہ کوئی چیز غائب ہوتی۔ شروع شروع میں کسی کو بھی اندازہ نہ ہوا، لیکن جب تواتر سے چوریاں ہونے لگیں تو

گھر کے ملازمین سے پوچھا گیا۔ ڈرایا، دھمکایا اور تنخواہ کاٹنے تک کی دھمکیاں دی گئیں۔ چیزیں گم ہونے کا تسلسل تو نہ ٹوٹا البتہ وقفے لمبے ہونے لگے۔ کوپی پر کوئی بھی شک کرنے کو تیار نہ تھا۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ کوپی پر الزام لگانا گناہ خیال کرتا۔ بیگم کے منہ سے بات نے نکلنا چاہا بھی تو انہوں نے روک لی، گویا بھرے بازار اپنی توہین کا اعتراف کرنے کا اُن میں یارانہ تھا۔ پھر کوپی کے لئے اتنے برسوں سے پلا ہوا پیار کا پودا اتنی پکی جڑیں پکڑ چکا تھا کہ شبہ کی آنچ اُسے جھلسا تو سکتی تھی جڑ تک جلا نہ سکتی تھی۔

کوپی اب گھر سے دن دن بھر غائب رہتا۔ کوئی پوچھتا تو بے تکا سا جواب دیتا یا بسورنے لگتا اور بیگم کا جی اُبل آتا۔

"اسے ہے اس عمر میں لڑکے ایسے ہی کرتے ہیں۔ ٹھیک ہو جائے گا۔"

وقت گزرتا گیا۔ بیگم صاحبہ بچوں کے بیاہ شادیوں کے چکر میں پڑ گئیں۔ اب کوپی کی عمر سترہ برس تھی اُس نے میٹرک پاس کر لیا تھا اور بیگم صاحبہ سوچ رہی تھیں کہ اُسے کالج میں داخل کروا دیں۔ عفت آپا شادی کے بعد بچوں والی ہو گئی تھیں۔ بھائی جان پسند کی لڑکی کے خیال میں اب تک کنوارے بیٹھے تھے۔ پنجی نے کسی کو پسند کر کے فیصلہ بھی دے دیا تھا منگنی ہو چکی تھی۔ مہمان نوازیاں زوروں پر تھیں —— آنا جانا، مہمان، ملنے والے —— پنجی ہر وقت مصروف رہتی۔ وہ اب کوپی کے ساتھ کم سے کم بحث کرتی اور کوپی اپنے آپ کو تنہا تنہا محسوس کرتا۔

پنجی کے ساس سُسر آئے ہوئے تھے۔ وہ گھبرائی گھبرائی گھر کے کاموں میں لگی ہوئی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے قسم قسم کے کھانے تیار کر کے سجائے لگائے۔ آخر میں خود بننے سنورنے لگی تو منگنی کی انگوٹھی غائب —— !

اتنے ارمان بھرے دن میں شگون کی انگوٹھی گم ہو جائے۔ لوگوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ دبی دبی بازپرس ہوئی۔ پنجی کی ساس کے کان میں بھنک پڑی تو وہ چیخ اُٹھیں۔

"کوپی سے پوچھو —— اس عمر میں بچوں کو ایسی لت پڑ جاتی ہے —— پوچھ لینے میں کیا حرج ہے!"

کوپی نے بڑی بی کو یہ کہتے سنا تو منہ پھلائے گھر سے چلا گیا۔ اس کے اس طرح چلے جانے پر سب افراد پریشان تھے انہیں بڑی بی سے شرمندگی بھی تھی اور اُن پر غصہ بھی آ رہا تھا۔

گھر کو ایک مسلسل اور بوجھل قسم کی خاموشی نے گھیر لیا۔ کوئی بھی ایک دوسرے سے کھُل کر بات نہ کرتا تھا۔ رات کے کھانے پر بھی مزیدار گفتگو نہ ہو سکی۔ کسی نے بھی خوشگوار موضوع چھیڑنے کی کوشش نہ کی۔ میز پر کوپی کی جگہ خالی تھی۔ اُس کی غیر موجودگی کا سب کو احساس تھا۔ وہ دیر تک اس کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ حتیٰ کہ رات کا ڈیڑھ بج گیا۔

نیند ابھی کچی پکی تھی۔ باہر کے کمپاؤنڈ کا گیٹ زور سے کھڑکا۔ بیگم صاحبہ دوپٹہ سنبھالتیں، اللہ اللہ کرتی اٹھیں۔

"پر یہ کوپی کے ہاتھوں کی دستک تو نہ تھی —— وہ تو آہستہ سے بجاتا ہے۔"

بیگم سوچتی اور قیاس لگاتی چلیں۔ گھر کے تمام افراد، نوکر چاکر جاگ اٹھے تھے۔ بتیاں روشن ہو گئیں —— بیگم نے باہر جھانک کر دیکھا۔ کئی مرد کھڑے تھے۔

"پولیس ——"

بیگم صاحبہ کا جی دھک سے رہ گیا —— اسی اثنا میں اُن کا بیٹا دیوانوں کی طرح چیختا اندر داخل ہوا۔

"امّی امّی —— کوپی مر گیا —— اُس نے خودکشی کر لی امّی!"

پھر کیا تھا۔ آن کی آن میں گھر میں کہرام مچ گیا۔

کوپی کا خط پڑھ کر سب نے مان لیا کہ اُس نے خودکشی کی ہے۔ اُس کی لاش دیکھ کر سب کو یقین تھا کہ وہ مر گیا —— لیکن یہ کوئی نہ جان سکا کہ وہ کیوں مر گیا —— کیوپڈ کا تیر اُلٹا کیوں چل گیا؟

اکتوبر ۱۹۷۸ء

انور عنایت اللہ

عورت چاہے کہیں کی بھی ہو، ہوتی بڑی ظالم چیز ہے۔ اچھے بھلے آدم زاد کو گھن چکر بنا دیتی ہے۔ مسز اس نے امجد میاں کو بھی لو لو بنا دیا۔

شادی سے پہلے وہ سیدھے سادے معقول نوجوان تھے۔ قدرے دل پھینک تھے اس لیے بہت جلد پھنس گئے۔ شادی کے بعد حسین اور جوان ہم سفر کی جستجو تو تمام ہوئی لیکن ایک عدد مناسب گھر کی تلاش شروع ہو گئی کیونکہ بیگم امیر گھر کی لاڈلی تھیں اور فلیٹ کی زندگی کے تصور ہی سے ان کا دم گھٹتا تھا۔ کراچی میں معقول گھر بھی اسی طرح عنقا ہیں جس طرح حسین شکلیں۔ اس لیے بڑی جدوجہد کے بعد انہیں قابلِ برداشت کرائے پر دو کمروں کا گھر ملا جو ایک منزلہ تھا اور بڑی عمدہ جگہ واقع تھا۔ اس کا ایک سرا تو بند جیل کھنڈ سوسائٹی میں تھا اور بقیہ حصہ عدم آباد میں۔

ان کے اس پرسکون محلّہ کا نام عدم آباد اس لیے مشہور ہوا تھا کہ یہاں کی ساری آبادی کراچی کے سب سے آباد و روشن اور پھیلتے پھولتے قبرستان کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ امجد میاں کی شادی کو صرف پانچ ہفتے ہوتے تھے۔ اسی لیے میاں بیوی میں بڑا پیار تھا۔ ابتدائے عشق تھا۔ ان کا دفتر میں بالکل جی نہ لگتا۔ چھٹی ہوتے ہی تیر کی طرح گھر آتے اور دوسرے ہی دن دفتر جانے کے لیے برآمد ہوتے۔ جمعہ کو تو وہ گھر ہی میں بند رہتے۔ موسم خراب ہوتا تو فوراً چھٹی لے لیتے۔

اس دن بھی موسم کچھ اچھا نہیں تھا۔ صبح سے گھنیرے بادل چھائے ہوتے تھے لیکن کسی نے یہ نہیں سوچا تھا کہ شام تک یہ بادل کیا گل کھلائیں گے۔ امجد میاں ابھی دفتر ہی میں تھے کہ یکایک بارش شروع ہو گئی پھر دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی خلافِ معمول جھکڑ چلنے لگے، جو پلک جھپکتے طوفان کا روپ اختیار کر گئے۔ محلے والے گھروں میں دبک گئے۔ اس لیے کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ وہ اونچا لمبا اور گھنا درخت کیسے گرا۔ اس کے گرنے کی آواز سب نے سنی۔ گھبرا کر کھڑکیوں تک گئے تو سمجھ میں نہ آیا کہ دل کو دہلانے والی وہ عجیب آواز کس کی تھی۔ جب سر سبز و شاداب درخت کو امجد میاں کے گھر پر بیٹھے دیکھا تو حیرت سے ان کے منہ کھلے رہ گئے۔

دراصل یہ درخت سڑک کے کنارے، ماسٹر نورالدین کے گھر کی چار دیواری سے قریب کھڑا تھا۔ خدا جانے کیا ہوا کہ یہ اچانک جڑ سے اکھڑ گیا۔ یوں جیسے کسی دیو نے غصہ میں تلملا کر اکھیڑ کر اسے زمین پر ڈال دیا ہو۔ حسنِ اتفاق سے وہ ماسٹر کے گھر پر گرنے کے بجائے، سڑک کی دوسری طرف امجد میاں کے اکلوتے گھر پر کچھ اس طرح گرا کہ سڑک رک گئی اور ان کے گھر کا صدر دروازہ بند ہو گیا۔ اب نہ کوئی اندر سے باہر آسکتا تھا اور نہ باہر سے اندر جا سکتا تھا۔

ان واقعات سے بے خبر امجد میاں اپنے دفتر کی کھڑکی میں کھڑے بارش سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ان کے دل میں بڑے حسین خیالات بیدار ہونے لگے اور فوراً انہیں اپنی نئی نویلی دلہن کا حکم یاد آگیا۔ صبح دفتر آنے سے پہلے فریدہ نے بڑے پیار سے کہا تھا کہ اگر بارش شروع ہو جائے تو وہ چھٹی لے کر گھر آ جائیں۔ تین بج چکے تھے۔ گھنٹہ بھر بعد چھٹی ہونے والی تھی۔ ایسے میں بھاگ نکلنا انہیں کچھ اچھا نہ لگا۔ وہ بڑی بے چینی سے چھٹی کا انتظار

کرنے لگے۔

باہر بارش، امجد میاں کے اضطراب سے بے خبر یوں ہی ہوتی رہی۔ گھنٹہ بھر بعد تو اور تیز ہو گئی۔ ایسے میں باہر نکلنا ناممکن تھا۔ اس لیے مجبوراً وہ بھی اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح آفس میں ٹھہر گئے۔ اور کی طرح انہیں سواری کی فکر نہیں تھی کیونکہ سسرال سے حسین اور جوان بیوی کے علاوہ، انہیں ایک عدد موٹر سائیکل بھی ملی تھی۔

خدا خدا کر کے سوا پانچ بجے بارش رک گئی تو امجد میاں، سیلاب زدہ سڑکوں کی پروا کیے بغیر نکل کھڑے ہوئے۔ تمام سڑکوں پر ٹخنوں سے اوپر پانی بہہ رہا تھا۔ بعض جگہ تو گھٹنوں گھٹنوں پانی تھا۔ لیکن امجد میاں کسی نہ کسی طرح تقریباً سوا چھ بجے عدم آباد پہنچ گئے۔ جوں ہی وہ اپنی گلی میں داخل ہوئے ان کے ہوش اڑ گئے۔ سڑک پر بیٹھے ہوئے درخت دیکھ کر سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کم بخت کہاں سے آ گیا۔ پھر انہیں اپنے گھر کا صدر دروازہ بھی کہیں نظر نہ آیا تو وہ موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے درخت کی طرف دوڑے۔ انہیں دیکھتے ہی ماسٹر نورالدین نے انہیں آواز دی۔ اپنے قریب بلایا اور تسلی دی کہ ان کا گھر محفوظ تھا۔ صرف فی الحال آنا جانا ممکن نہیں تھا لیکن وہ بھی تھوڑی دیر کی بات تھی۔

"گھبرایئے نہیں امجد صاحب۔ کمال دین نے میونسپلٹی والوں کو ٹیلی فون کر دیا ہے وہ لوگ آ ہی رہے ہوں گے۔ وہ آ جائیں تو گھنٹہ بھر میں راستہ صاف ہو جائے گا —— چلئے اتنی دیر تک آپ ہمارے یہاں منہ ہاتھ دھولیں چائے بھی تیار ہو گی۔" ماسٹر صاحب نے بڑے خلوص سے دعوت دی۔

موسم کی وجہ سے امجد میاں کو چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ اس لیے انہوں نے ماسٹر صاحب کی پیش کش قبول کر لی۔ ورنہ راستے میں کئی بار ان کا ہاتھ منہ دُھل چکا تھا۔ ہر آنے جانے والی موٹر بس اور ٹرک نے بڑی محبت سے ان کا منہ دُھلوایا تھا۔ اس سڑک پر اب خاصی بھیڑ لگ گئی تھی۔ اس میں بعض ایسے بھی تھے جو خالص تفریح کی تلاش میں گھر سے نکلے تھے۔ بعض ایسے تھے جو اس علاقے میں نو وارد تھے۔ جا کہیں اور رہے تھے لیکن یہاں بھیڑ دیکھ کر چلے آتے تھے۔ ان میں سے ایک بزرگ امجد میاں کی ہمدردی میں بولے۔

"اندر جانے کے لیے پچھلا دروازہ کیوں نہیں استعمال کرتے؟"

یہ سُن کر کمال دین بولے "یہ کیسے کر سکتے ہیں؟ ہمارے گھروں میں پچھلا دروازہ ہے کہاں؟ یہ سارے مکان تو ایک دوسرے کی پیٹھ سے پیٹھ لگائے کھڑے ہیں۔"

ان کی یہاں دو بتیوں کی دوکان تھی۔ اگلے انتخابات میں وہ عوام کی نمائندگی کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ اس لیے ہر وقت قوم کی خدمت میں لگے رہتے۔ ان کا جواب سن کر امجد میاں کو محلّے والوں پر غصہ آ گیا۔ کمبختوں نے پیسہ بچانے کی خاطر کتنی بڑی حماقت کی تھی۔

"اچھا تو یہاں ایک ہی دروازہ ہوتا ہے!"

کسی دوسرے مہربان نے درخت کی دوسری طرف سے حیران ہو کر کہا۔ امجد میاں کو صرف ان کی آواز ہی سنائی دی۔ شکل نہ دیکھ سکے کیونکہ وہ غالباً پستہ قد تھے اور ان دونوں کے درمیان یہ کم بخت گھنا درخت پڑا تھا۔

"چلئے امجد صاحب —— چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔" ماسٹر صاحب نے ان کا شانہ چھوتے ہوئے کہا۔ "چائے پی لیں تو چھت سے اپنی دلہن سے بات کر لیجئے گا۔ صرف ذرا چیخنا پڑے گا۔"

ان کا گھر دو منزلہ تھا۔ امجد کو یہ تجویز پسند آ گئی اور وہ ان کے ساتھ چلے گئے۔

سات بج گئے لیکن وہاں بھیڑ کم نہ ہوئی کیونکہ درخت کے دونوں طرف لوگ جوق در جوق تماشہ دیکھنے آنے لگے۔ صورتِ حال کا ہر پہلو سے جائزہ لیا جانے لگا اور ہر قسم کے مشورے، ایک دوسرے کو دیکھے بغیر، دونوں طرف سے دیئے جانے لگے۔ اس کے باوجود درخت جوں کا توں سڑک

دو کے پڑا رہا۔ بارش رک گئی تھی لیکن اندھیرا بڑھ گیا تھا کیونکہ درخت نے گرتے ہوئے بجلی کے تمام تار توڑ دیے تھے۔

اس صورت حال سے بے خبر امجد میاں ماسٹر صاحب کے ساتھ ان کے ڈرائینگ روم میں پہنچے اور وہاں لالٹین جلتی دیکھی تو ان کا سر چکرا گیا۔ انہیں فوراً یاد آیا کہ ان کے یہاں لالٹین تھی اور نہ موم بتیاں۔ خدا جانے فریدہ کس حال میں ہوگی۔ اُسے تو اندھیرے سے بڑا ڈر لگتا تھا۔ ان کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا اور انھوں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

"کیا سارے محلے کی بجلی چلی گئی؟"

جی ہاں ــــ لیکن تھوڑی دیر کی بات ہے، امجد صاحب کمال دین نے بجلی والوں کو بھی فون کر دیا ہوگا۔"

ماسٹر نورالدین نے ایک بار پھر انہیں تسلی دی اور گرم چائے کی پیالی ان کی طرف بڑھائی۔ اتنے میں یکایک باہر شور مچا سن کر یہ لوگ کھڑکی تک گئے اور نیچے دیکھنے لگے۔ ایک ٹرک ابھی ابھی آکر رکا تھا اور محلے والوں اور ٹرک ڈرائیور کے درمیان چیخ چیخ کر گفت و شنید ہو رہی تھی۔ یہ کانفرنس تھوڑی دیر جاری رہی۔ اس سے پہلے کہ یہ پتہ چلتا کہ موضوع بحث کیا تھا، ٹرک دوبارہ اسٹارٹ ہوا اور بدبو دار دھواں اڑاتا چلا گیا۔ کسی نے سڑک پر سے ماسٹر کو پہچان لیا اور چیخ کر کہا۔

بڑی دھاندلی ہے صاحب۔ میونسپلٹی والے تھے۔ کہہ رہے تھے یہ علاقہ ان کے تحت نہیں آتا۔ دوسرے سرکاری ادارے کے تحت آتا ہے۔ اس لیے وہ درخت کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ ہماری مصیبت کی پروا کئے بغیر چلے گئے!"

"آپ لوگ اُس دوسرے ادارے کو کیوں نہیں فون کرتے؟" امجد نے چیخ کر یوں کہا جیسے اُن لوگوں نے اپنی ذمہ داری برتنے میں کوتاہی برتی تھی۔

"کمال دین نے پہلے اُن ہی کو فون کیا تھا" جواب ملا وہ کہتے ہیں یہ کام ان کا نہیں، بندھیل کھنڈ سوسائٹی کا ہے!"

یہ سن کر ماسٹر صاحب نے منہ بنایا اور آہستہ سے کہا۔ "وہ بھلا کیا کرے گی۔ اس نے تو پانچ سال سے ٹیکس ادا نہیں کیا ہے!" ان کی یہ بات امجد میاں کو بہت نامعقول معلوم ہوئی اور انہوں نے فوراً کہا۔

عدم آباد والوں کو فون کروائیے نا ــــ ان لوگوں نے تو ٹیکس ادا کیا ہوگا!"

"کیا تو ہے لیکن دراصل یہ سڑک بڑی متنازع فیہ ہے" ماسٹر صاحب نے جواب دیا۔ پھر امجد کے چہرہ کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ ان کی سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آئی ہے اس لیے آسان اردو میں مزید وضاحت کی۔

"دراصل آج تک یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ اس سڑک کی دیکھ بھال کون کرے ــــ بندھیل کھنڈ والے یا عدم آباد والے ــــ چھوڑیے اس جھگڑے کو ــــ چلیے چائے پیجیے ــــ یہ پیالی تو ٹھنڈی ہو گئی ہوگی۔ میں اور منگواتا ہوں!" یہ کہہ کر انہوں نے اپنے بیٹے کو آواز دی امجد میاں کو تو چائے سے زیادہ اپنی دلہن کے قرب کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ کاش وہ اس کا حکم مان کر دوپہر ہی کو آ جاتے تو اس وقت کم از کم وہ وہاں تنہا نہ ہوتی۔ خدا جانے بے چاری کس حال میں تھی۔

"کیوں بھئی ــــ بجلی والوں کو فون کروایا؟" ماسٹر صاحب نے یکایک اپنے بیٹے کو آتے دیکھ کر پوچھا تو امجد میاں ہوش میں آ گئے۔

"کئی بار کہا تھا لیکن گھنٹہ بھر سے انگیج مل رہا ہے لگتا ہے ریسیور اٹھا کر نیچے رکھ دیا ہے!"

صاحبزادے نے ٹھنڈی چائے کی کیتلی اور سرد پیالیاں اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

"چلو چھٹی ہوئی" ماسٹر صاحب فوراً بولے۔ "لگتا ہے آج کچھ نہ ہو سکے گا!" انہوں نے اطمینان سے سگریٹ سلگاتے ہوئے بڑی

نامعقول بات کی جو تیر کی طرح امجد میاں کے سینے پر پیوست ہوگئی ۔

وہ شام امجد میاں کے لیے قیامت بن کر آئی ۔ زندگی میں پہلی بار انہیں فراق کی تڑپ کا احساس ہوا ۔ دنیا کے ہر رفاہی ادارے کے خلاف آہستہ آہستہ ان کے ذہن میں نفرت کی آگ بھڑک اٹھی اور وہ اندر ہی اندر بل کھاتے ہوئے ماسٹر صاحب کے یہاں بے بس بیٹھے رہے ۔ باہر یوں ہی موسم خراب رہا اور سارا علاقہ تاریکی میں ڈوبا رہا ۔ جب رات خاصی گزر گئی اور نہ بارش رکی نہ بجلی آئی اور نہ کسی نیم سرکاری یا فرقی ادارے نے وہ کم بخت درخت کاٹ کر امجد میاں کے لیے راستہ کھولا تو ماسٹر نورالدین صاحب نے ضد کر کے انہیں کھانا کھلایا اور صبر اور ہمت سے کام لینے کی تلقین کرتے ہوئے ان کے لیے اپنے مہمان خانے میں بستر لگوا دیا جو سیڑھیوں سے ملحق تھا ۔ ٹھیک دس بجے انہیں دولہا کی طرح وہاں پہنچا کر ، شب بخیر کہنے کے بعد وہ چلے گئے ۔ صرف فرق یہ تھا کہ دولہا میاں کی دلہن غائب تھی اور وہ سڑک کی دوسری طرف ایک ایسے گھر میں تنہا قید تھی جو تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور جسے ایک ذلیل ، بے رحم ، کم بخت درخت نے جن کی طرح دبوچ رکھا تھا ۔

اُس رات امجد میاں کو بستر کانٹوں کا لگا ۔ تاریک کمرہ ۔ گنگناتے ہوئے مچھر ، ہلکی سی خنکی ، قمیص پتلون کی بندش اور تباہ کن تنہائی ـــــ سب نے مل کر اُن کی نیند اڑا دی ۔ باہر سناٹا چھائی تھی کیونکہ محلّے کے جیالے نوجوانوں نے کسی دین کی رہبری میں ، درخت کے دونوں طرف سڑک پر بہت بڑے بڑے پتھر رکھ دیے تھے تاکہ آنے جانے والوں کو پتہ چل سکے کہ آگے رستہ بند ہے ۔ ویسے بھی بارش کی وجہ سے ہر جگہ ٹریفک برائے نام تھا ۔

امجد میاں خدا جانے کب تک بستر پر کروٹیں بدلتے رہے ۔ جب کسی کروٹ چین نصیب نہیں ہوا تو اٹھ کر دستی گھڑی دیکھی ۔ اس کی روشن سوئیاں دو بجا رہی تھیں ۔ عام حالات میں بھی سڑک ویران ہو جاتی تھی ۔ اس خیال کے ساتھ ہی معاً ان کے ذہن میں ایک اور خیال آیا کیوں نہ اپنے گھر میں داخل ہونے کی کوشش کی جائے آخر درخت کے پتوں شاخوں نے تو راستہ روک رکھا تھا ۔ کوشش کی جائے اور لگن سچی ہو تو کوئی بات بھی ناممکن نہیں ۔ جب وہ یہاں اتنے پریشان ہیں تو بیچاری فریدہ کا کیا حال ہوگا ؟ وہ تو آدھی پاگل ہو چکی ہوگی ۔

اس خیال نے انہیں بھی تقریباً پاگل کر دیا ۔ کھڑکی سے دیکھا تو سڑک پر دونوں طرف انہیں کوئی نظر نہ آیا ۔ بارش رک گئی تھی اور دائیں طرف آسمان پر چاند بادلوں میں سے نکل کر اپنی جھلک دکھانے کے لیے تڑپ رہا تھا ۔ موقع بڑا مناسب تھا ۔ چنانچہ انہوں نے جلدی سے جوتے پہنے اور چُپ چاپ سیڑھیوں سے اتر کر سڑک پر آ گئے ۔ دھندلکے میں درخت کی گھنی شاخیں عجیب ڈراؤنی لگ رہی تھیں ۔ لیکن انہیں ہر حالت میں فریدہ تک پہنچنا تھا ۔ اس لیے ہمت کر کے وہ آگے بڑھے اور بڑی مشکل سے درخت کے تنے پر ـــــ چڑھ گئے ۔ لیکن جونہی آگے قدم بڑھایا ، پاؤں پھسلا اور اتنی بُری طرح سے پتوں اور شاخوں میں گھسے کہ ، اس کے شور سے خود ان کا دم نکل گیا ۔ اس کے ساتھ ہی درخت کی کسی مضبوط ڈالی نے ! انہیں آن دبوچا اور چیخنا شروع کیا ـــــ چور ـــــ چور چور ۔"

اسی کے جواب میں اڑوس پڑوس کے گھروں سے بھی ایسا ہی نامعقول شور بلند ہوا ـــــ چور ـــــ چور ـــــ جانے نہ پائے ـــ پکڑو ـــ دھر لو ـــــ مارو ـــــ مارو ۔"

دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے لوگ ہاتھوں میں لالٹین اور لاٹھیاں لے کر آن دھمکے ۔ ان میں بچے بھی تھے اور عورتیں بھی ۔ ماسٹر صاحب بھی تھے ۔ ان کے ہاتھ میں تو دونالی بندوق تھی ۔

جب کسی کی لالٹین قریب آئی تو امجد میاں نے پہچان لیا کہ انہیں دبوچنے والا محلّہ کا چوکیدار شمروز خان تھا ۔ انہیں پتوں میں سے

ہوہان باہر نکالا گیا ... بھی پہچان لیا کہ بھیگی قمیض اور کیچڑ میں لتھی پتلون میں امجد میاں تھے، اس محلّے کے نہایت شریف نوجوان جن کے گھر پر یہ کمبخت درخت گرا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی ان کی پڑوسن بیگم بولاس چیخیں۔

آپ جا کہاں رہے تھے امجد صاحب ؟ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ آپ کی بیگم کو بارش سے پہلے ان کی بھاوج ساتھ لے گئیں۔ مجھ سے کہہ گئی تھیں کہ آپ کو اطلاع دے دوں ــــ ویسے آدھی رات کو آپ آ کہاں سے رہے ہیں ؟"

"جہنم سے" امجد میاں نے گال پر سے کیچڑ صاف کرتے ہوئے جھنجھلا کر فوراً جواب دیا۔ اس کے ساتھ سب نے چونک کر انہیں یوں دیکھا جیسے یقین نہ آ رہا ہو کہ وہ ایک معزز اور معتبر خاتون سے ایسی بدتمیزی بھی کر سکتے ہیں۔

میں نے کہا تھا نا ؟ عورت بڑی ظالم چیز ہے۔ اچھے بھلے آدم زاد کو الّو بنا دیتی ہے !

دسمبر ۷۷ء

آنکھ اور اداس ہو گئی کہ دل اور مطمئن؟
میں نے بہت احتیاط کی کہ مہمان خانے کا دروازہ کھلا رہ جائے
میرے لئے
کہ اسکی خواب گاہ میں اسکے خواب رکھ آؤں
جو چینی جھیل کے نیچے بہنے والے آنسوؤں کو دریا سے دور
رکھتے ہیں کہ دریا کا پانی نمکین نہ ہو جائے
اور شہر کی ہوا سیٹی بجاتی بانسری کی عمر سے گزر جائے
تم نے کیسے اسکے بیان اٹھا لیا
کہ وہ میرے خواب دیکھ کر جاگ جائے؟ نسرین انجم بھٹی

عکس تحریر:۔ نسرین انجم بھٹی

# گٹھڑی

عفراء بخاری

یہ اس کے گناہوں کی گٹھڑی تو نہ تھی کہ وہ اس سے آنکھیں چرائے شرمسار ہو رہی تھی۔

اُس نے اب گٹھڑی کو اپنی آنکھوں کے سامنے سے ہٹا دیا تھا۔ مگر اُس کے باوجود اُسے اطمینان نصیب نہیں ہو سکا تھا۔ وہ گٹھڑی گویا اس کے تصوّر میں گڑ گئی تھی، اور وہ بغیر دیکھے ہی اُسے دیکھ رہی تھی، اور اپنے کام میں مصروف بار بار جھنجلا رہی تھی۔

کبھی سوچتے سوچتے اس کا چہرہ غصے سے تمتما جاتا، گال لال ہو جاتے اور اُس کا جی چاہتا وہ، وہ چیخ بلند آواز میں سوچے۔

"اسے یوں ذلیل کرنے کا حق نوشابہ کو ہرگز نہیں پہنچتا تھا۔ اس نے کھلے طور پر اس کی ہتک کی تھی۔ اور اس ہتک کا احساس اسے پھونکے ڈال رہا تھا۔ کیا وہ ایسی ہی گئی گذری ہو چکی ہے؟"۔؟ مگر دوسرے لمحے جب وہ اپنی بے بسی پر غور کرتی تو اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ڈھلک پڑتے۔

"ٹھیک تو ہے لوگ جو کچھ دیکھیں گے وہی سمجھیں گے" ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھتے پونچھتے چولہے کی سیاہی بھی اُس کے چہرے پر مل گئی تھی۔ ننھے پپو نے کھیل سے سر اُٹھا کر ماں کی طرف دیکھا تو بھولپن سے ہنس کر بولا۔ 'امی جی کا منہ کالا'

وہ اپنی پریشان کن سوچوں میں بے خبر بیٹھی چونک گئی۔ اس نے گہری اور عجیب نظروں سے پپو کی طرف دیکھا۔ اور اسے محسوس ہوا جیسے یہ آواز پپو کے منہ سے نہیں خود اُس کے اندر سے نکلی تھی۔ اس کا دل کٹ کر رہ گیا اور وہ منہ پھیر کر بلک پڑی۔ عاقبت کی خبر خدا جانے مگر اس دنیا میں تو وہ واقعی روسیاہ ہو چکی تھی۔ وہ اس کالک لگے منہ کو کس کس سے چھپائے گی۔ اس کا دل نہ چاہا کہ اُٹھ کر منہ دھوئے مگر کچھ دیر بعد جب اس نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو وہ اسے اس قدر بھیانک لگی کہ اس نے فوراً غسل خانے میں جا کر منہ دھو ڈالا۔

"خدا بھی بڑا بے نیاز ہے"۔ اس نے کسی صابر و شاکر انسان کی طرح آخرکار ٹھنڈا سانس بھر کر سوچا۔

ابھی کچھ دیر پہلے نوشابہ آئی تھی۔ اور وہ اسے دیکھتے ہی کھِل اٹھی تھی۔ نوشابہ اندر آئی۔ اور اس نے وہ گٹھڑی صحن میں بچھی چارپائی پر رکھ دی۔ بغیر کچھ پوچھے بغیر کچھ سوچے۔ اس نے اپنے اندر فرحت محسوس کی تھی اور اس وقت نوشابہ اسے نیکی کے فرشتے کی طرح اچھی لگی تھی۔ گٹھڑی کو کھول کر دیکھنے کی کمزور سی خواہش ہی اس کے اندر پیدا ہوئی تھی، مگر یہ بھی اچھا ہوا کہ اس نے یہ احمقانہ حرکت نہ کی اور قدرے بُردباری سے کام لے کر ہنستی کھلکھلاتی نوشابہ کے ساتھ کمرے کے اندر چلی گئی۔

نوشابہ ہونٹوں پر بڑی مربیانہ مسکراہٹ لئے کرسی پر آتنگے پن سے بیٹھ گئی۔ جو اُسے اُس وقت بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ کیونکہ خود نوشابہ بھی اُسے اُس وقت محبت اور اخلاص کی پوٹ نظر آ رہی تھی۔ بار بار اسے خیال آ رہا تھا کہ نوشابہ اچھی ہے۔ بہت اچھی ہے سب بہنوں کو بس ایسا ہونا چاہیئے۔ ایک بار تو اس کے جی میں آئی تھی کہ وہ اپنے اتنے اچھے جذبات کا اظہار کر دے مگر یہاں پھر اُس نے عقل سے کام لیا اور فقط اظہار نیازمندی سے کام لیتی رہی، "کیا کھاؤ گی"۔ اس نے پوچھا:

"ٹھنڈا منگواؤں"؟

"نہیں اس وقت خواہش نہیں"

"چائے"

"ہائے یہ بھی کوئی چائے پینے کا وقت ہے"۔ "اچھا تھوڑی سویاں بناتی ہوں کچھ تو ہو"۔ "نہیں بھئی اس وقت تو کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہتا" "کھانا کھالو پھر" آخر اس نے کھسیانے پن سے کہا" دراصل دال پکا رکھی ہے اس لئے پوچھ نہیں رہی تھی"۔

نوشابہ مسکراتی رہی۔

"آج ناغہ ہے نا"۔ اس نے خود ہی شرمندگی مٹانے کو کہا۔

"اچھا بھئی ہمیں تو ناغے کا پتہ نہیں چلتا۔ ایک دن پہلے گوشت منگوا کر فریج میں رکھ دیتے ہیں۔ دوسرے دن مچھلی یا مرغی پک جاتی ہے، میرے بچے تو دال کے نام سے بھاگتے ہیں۔ اپنے لئے کبھی کبھار ماش کی بگھاری دال بنوا لیتی ہوں"۔ ہاں بچوں کی یہی دقت ہے۔ میرے بچوں کو بھی دیکھو دال کے نام پر کیسے ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ مگر مجبوری ہے۔ فریج خرید تو لوں مگر مکان میں گنجائش کہاں ہے۔ پہلے مکان کا بندوبست ہو جائے تو پھر خریدوں"۔

"ہاں یہ تو ہے"۔ نوشابہ بڑی فراخدلی سے مسکرا رہی تھی اور اس کے ملے ہوئے متبسم ہونٹوں پر اب اسے بندھی ہوئی گٹھڑی کا گمان گزر رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے کی خوش کن بے تکلفی میں خود بخود ایک تکلف سا نمودار ہو گیا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی خوشیوں کا کوئی کنگرہ چپکے سے گر پڑا ہے اور اس کی آواز کھوکھلی ہوتی جا رہی ہے۔

"اچھا میں چلتی ہوں"۔ نوشابہ نے ٹانگ پر سے ٹانگ اتاری تو وہ کچھ اور بجھ سی گئی۔

"بیٹھو ابھی تو آئی تھیں۔ بچوں کے بارے میں کچھ بتایا نہیں کیسے ہیں"۔

"دونوں ٹھیک ٹھاک ہیں"۔

"انہیں بھی ساتھ لے آتیں"۔

"کسی دن لاؤں گی اس وقت جلدی تھی۔ آج بڑے دنوں بعد پکچر کا پروگرام بنا ہے"۔

"مگر پکچر میں تو ابھی بہت وقت پڑا ہے"۔

"ہاں اس سے پہلے کچھ شاپنگ بھی کرنی ہے۔ سردی آ رہی ہے۔ بچوں کے لئے گرم کپڑے وغیرہ خریدنے ہیں تم جانو ایک سال پہلے کے بنے کپڑوں کو تو وہ ہاتھ نہیں لگاتے"۔

"یہ تو ہے"۔ اس کی آواز قطعی خشک ہو چلی تھی۔ نوشابہ چلی گئی۔ مگر نہ وہ کیوں اچانک مرجھا کر رہ گئی تھی۔ یہ بات تو واضح تھی کہ وہ اب خوش نہ تھی مگر اب وہ کیوں اور کس وجہ سے خوش نہ تھی۔ اس نے اپنا بھرم رکھنے کو سفید جھوٹ بولے تھے۔ مگر پھر بھی وہ مطمئن نہ ہو سکی تھی۔ وہ کھوئی کھوئی سی کمرے میں چیزوں کو بے مطلب ایک جگہ سے دوسری جگہ پر رکھتی پھری۔ پھر اچانک اسے باہر سے بابی کی آواز آئی۔

"امی اس گٹھڑی میں کیا ہے"؟

وہ گویا کسی ناخوشگوار خواب سے بیدار ہو گئی۔ وہ تیزی سے باہر آئی اور چیل کی طرح جھپٹ کر گٹھڑی بابی کے ہاتھ سے لوٹ لی۔ پھر وہ اسی تیزی سے اندر آئی اور گٹھڑی کو بڑے ٹرنک میں دھکیل دیا۔ اس کا دل بڑے بے تکے پن سے دھڑک رہا تھا۔ آخر ہوا کیا تھا اس کے جذبات اس قدر ڈانوا ڈول کیوں ہو رہے تھے وہ گم سم سی باورچی خانے میں آئی۔ اور دال بگھارنے لگی۔ عین اس وقت ایک پڑوسن اندر آئی۔ اور لمبی سی "سوں" کے بعد بولی۔ واہ بھئی تمہاری پکائی دال کا جواب نہیں۔ ایسی خوشبو اڑاتی ہو کہ آدمی کو دور سے کھینچ لاتی ہے۔ محلے میں ایک وہ نعیم کی ماں ہے، گوشت کوئی ایسا منتر پڑھ کر بھونتی ہے کہ برہمن کی بیٹی مسلمان ہو جائے اور دال پکانے میں تم ایسا کمال کسی دوسرے کو حاصل نہ ہو گا"۔ اس تعریف سے خوش ہونے کی بجائے اس کا دل کچھ اور سنجیدہ ہو گیا مہینے کے آخری دن تھے اور مسلسل چھ دن سے دال پک رہی تھی۔ بگھار کی نامراد خوشبو ضرور سبھوں کی ناکوں تک پہنچتی ہو گی۔ مگر اب کیا بھی کیا جا سکتا تھا۔

پڑوسن ایک پاؤں دہلیز پر رکھ کر کھڑی ہو گئی تھی اس نے کھسیانے پن سے پڑوسن کی طرف دیکھا اور بولی "آج ناغہ تھا نا۔؟"
پڑوسن اس کی معذرت کو ان سنا کر کے بولی:
"ابھی نوشابہ کی آواز آئی تھی چلی گئی کیا۔؟"
"ہاں اُسے کچھ شاپنگ کرنا تھی۔ سردی آ رہی ہے بچوں کے لئے کچھ گرم کپڑے وغیرہ خریدنے تھے۔"
"ہاں بہن سردی تو واقعی آ رہی ہے۔ ایک بارش ہو گئی تو گرم کپڑوں کی ڈھنڈیا پڑ جائے گی۔ چلو پھر ہم بھی کسی روز بازار چلیں۔"
"ضرور چلتی مگر میں نے بچوں کے کپڑوں اور دادن کے لئے نوشابہ کو پیسے دے دیئے ہیں۔ اُسے ان چیزوں کی بڑی پہچان ہے۔"
"تمہیں تو چار پانچ سو کا خرچہ پڑ جائے گا۔" "ہاں بہن ہر سال یونہی ہوتا ہے اب بچوں کو ننگا تو پھرا نہیں سکتے۔ اِدھر بچے ایسے نخریلے ہیں کہ پرانا کپڑا دیکھ کر ٹھنکنے لگتے ہیں۔ گرمی آئے یا سردی آئے یہ فالتو خرچ اٹھانا ہی پڑتا ہے۔ بچے بھی ماشاء اللہ ایک پلٹن کے برابر ہیں۔" "اتنے بچوں کے ساتھ پانچ چھ سو میں کہاں پوری پڑتی ہے۔ گلبرگ میں زمین لے رکھی ہے۔ وہاں مکان بن جائے تو کرائے سے تو نجات ملے۔ سوچتی ہوں دو کمرے کھڑے کر کے چلے جائیں پھر آہستہ آہستہ بنتا رہے گا مگر پہلے تو گیراج بنانا پڑے گا۔ بس اسی خیال میں ہوں کہ کہیں سے کھلا پیسہ ہاتھ آ جائے تو کام شروع کروائیں، اس سال نہیں تو اگلے سال تو انشاء اللہ اپنے مکان میں چلے جائیں گے۔"
پڑوسن ہوں ہاں کئے بغیر مسکرا دی گویا یہ کہانی بہت پرانی اور کئی بار کی سنی سنائی تھی۔
پڑوسن چلی گئی تو اس کی آنکھیں پھر چھلک پڑیں آج تو اس کی آنکھیں سچ مچ دریا بہانے پر آمادہ تھیں۔ مگر بچے اسکول سے آنے شروع ہو گئے تھے۔ اس نے آنکھیں پونچھ لیں اور کٹوریوں میں دال نکالنے لگی۔
دسترخوان پر جب سب بچوں کو بٹھا چکی تو اس کی نظریں دیر تک بچوں کے چہروں کو ٹٹولتی رہیں۔
کسی کے چہرے پر بھی کسی طرح کا بُرا تاثر موجود نہ تھا۔ گویا سب کچھ معمول کے عین مطابق تھا۔ حالات نے بچوں کو کیسا قانع بنا دیا تھا۔ خوش ہونے کی بجائے اسے دکھ ہوا، اگر اس وقت کوئی بچہ منہ بسور دیتا یا دال کی کٹوری فرش پر پٹخ دیتا تو اسے یقیناً بڑی خوشی ہوتی کہ ابھی بچوں میں بُرے بھلے کی تمیز باقی ہے۔ بچوں کو یوں حالات کا عادی ہو جانا چاہیئے تھا۔ اس کے ذہن اور جذبات پر مایوسی کی کہر سی چھا گئی۔

نوشابہ اور اس میں ایک سال کا فرق تھا دونوں کی شادی بھی ساتھ ساتھ ہوئی۔ یہ قسمت کی بات تھی کہ نوشابہ کی شادی ایک کماتے پیتے گھرانے میں ہوئی۔ اس کے دو بچے تھے اور وہ ایک مطمئن اور خوشحال زندگی بسر کر رہی تھی۔
اس کے شوہر کی بھی تنخواہ معقول تھی اگر تھوڑی سی دوراندیشی سے کام لیا جاتا تو وہ بھی ایک خوشحال گھرانے کی بنیاد رکھ سکتی تھی۔ مگر ہوا یوں کہ شہر دینا کے چار پانچ سال مزے سے گذارنے کے بعد جو بچوں کا تانتا بندھا تو سفید پوشی کی قلعی بگڑ کر رہ گئی۔ اور اب تو ان کی حالت اس قدر پتلی ہو چکی تھی کہ مہینے کے آخر میں کچھ نہ کچھ اُدھار ضرور چڑھ جاتا۔ اور آج نوشابہ نے تو اسے گویا ذلت و رُسوائی کی کیچڑ میں دھکیل دیا تھا۔

اپنی بے بسی پر آنسو بہانے کے بعد اسے ایک بار بھی پھر نوشابہ کی ذہنیت پر غصہ آنے لگا تھا۔ آخر اس نے اُسے سمجھا کیا تھا۔ وہ اتنی بھی گئی گذری نہیں کہ لوگ اس کی ہتک کرنے پر تُل جائیں۔ اور ایسی حرکتیں کریں کہ کل کو اس کے معصوم بچوں کو دوسروں کے طعنے سننے پڑیں۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کی سوچیں آ رہی تھیں اور اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اس بے عزتی کو نوشابہ تک لوٹا کر رہے گی۔ ساری بات چار سو روپوں کی تھی۔ اتنی معمولی رقم کے لئے وہ دوسروں کی نظروں میں کیوں ہیٹی ہو۔ اتنی رقم یقیناً کہیں نہ کہیں سے حاصل کی جا سکتی تھی۔ کیا وہ اتنا بھی نہیں کر سکتے۔ کوشش سے کیا حاصل نہیں ہو سکتا اگر یہ رقم مل جائے تو سردیوں کی فکر سر سے اُتر جائے۔ تین چار سو کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔ وہ آج

ضرور ان سے بات کرے گی۔ ایک تو وہ ایسے سُست آدمی ہیں دوسرے لوگ ہاتھ پاؤں مارتے ہیں کئی ذرائع سے پیسہ کماتے ہیں مگر انہیں تو بس ایک کام آتا صبح سے شام تک دفتر میں سر مارا اور ہر ماہ وہی لگی بندھی تنخواہ ہتھیلی پر دھر کر بے فکر ہو گئے۔ کہیں اور سے چار پیسے پیدا کرنے کی کبھی توفیق نہ ہوئی۔ لیکن اس بار خواہ کچھ ہو جائے انہیں تین چار سو کی فالتو رقم کہیں نہ کہیں سے ضرور پیدا کرنی پڑے گی۔ ورنہ اس وقت تک چین سے بیٹھنے نہ دوں گی۔ رقم ملنے کے امکانات پر غور کرنے کی بجائے وہ اخراجات کا حساب لگانے لگی۔ دو دو سوئٹر کچھ کپڑے اور جوتے بس اتنی رقم میں ضروریں پوری ہو جائیں گی۔ اس سوچ نے اس کے بوجھل دل اور ذہن کو ہلکا ہلکا کر دیا، وہ یوں اطمینان سے اٹھی جیسے ساری مشکلیں حل ہو گئی ہوں۔

اس نے بچوں کی طرف غور سے دیکھا جن کے دُبلے اور زرد چہروں پر محرومی اور شکایت کی بجائے قناعت اور صبر کی چھاپ تھی۔ اور اس کا دل ایک بار پھر بلبلا سا گیا۔ پچھلے کئی دنوں سے دُودھ بند تھا۔ اور چھوٹی بچی روٹی اور چاول سے بہلنے میں نہ آتی تھی۔ وہ ہر وقت دودھ کے لئے ہلکان ہوتی اور اس کی جان میں چمٹی رہتی، تنگ آ کر وہ اسے بے تحاشا پیٹتی۔

اس وقت وہ روٹی کا سوکھا ٹکڑا منہ میں دبائے اُسے چوس رہی تھی، یہ بھی ایک دن دوسرے بہن بھائیوں کی طرح اپنی محرومیوں کی شکایت کرنا بھول جائے گی۔ اس نے بچی کو گود میں اٹھا کر اس کا منہ چوما اور اپنے ہاتھ سے اس کے بکھرے بالوں کو سنوارا اور یوں اطمینان محسوس کیا جیسے اچھے دن بس آیا ہی چاہتے ہوں جیسے کے محض تصور میں بھی کس قدر قوت ہے کہیں سے رقم مل جانے کی توقع نے اسے مسرور کر دیا تھا۔ اب زندگی اتنی پھیکی اور مشکل نہ رہی تھی۔

اُس دن اس نے سارے بچوں پر خصوصی توجہ دی اور اندھیرا ہوتے ہی انہیں بستروں میں تھپک کر سلا دیا۔ اس دن وہ ہمہ تن شوہر کی منتظر تھی۔ اس کا شوہر معمول سے قدرے دیر میں آیا۔ اُس کے تھکے ماندے چہرے کو دیکھ کر اس کی ممتا اُبل پڑی۔

ہائے بے چارے دن بھر بھوکے پیاسے کیسے کام کرتے ہوں گے۔ جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں ادھر دفتر اتنا دور، وہ جلدی سے گلاس میں ٹھنڈا پانی لے آئی پانی پی کر اور لباس تبدیل کرنے کے بعد اس کا شوہر غسل خانے میں گیا تو وہ جلدی سے کھانا نکال لائی اس کا شوہر اُس کے خلاف معمول مستعدی پر حیران ضرور تھا۔ مگر اس نے حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ سر جھکائے نوالے نگلتا رہا

اور وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی جب بیاہ ہوا تو یہ چہرہ کتنا خوبصورت اور بھرا بھرا تھا۔ رنگ کیسا صاف تھا۔ مگر اب تو جیسے کسی نے چہرے پر دھول بکھیر دی تھی۔ وہ پہلے والی بات نہ رہی تھی۔ آج کئی دنوں کے استعمال شدہ بلیڈ سے شیو بنانے کی وجہ سے چہرے پر کئی جگہ خراش آ گئی تھی۔ صبح وہ محض چند آنوں کے لئے شوہر سے جھگڑ کر اُسے بُرا بھلا کہتی رہی تھی۔ اور اتنے زور زور سے چیخی تھی کہ اس کی آواز ضرور پڑوسیوں نے سن لی ہو گی۔ وہ بھی کسی وقت بالکل دیوانی ہو جاتی ہے۔ اسے یوں تو نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ اب اسے اپنی اس حرکت پر ملال اور افسوس ہو رہا تھا۔ یوں لڑنے جھگڑنے سے کیا دکھ کٹ جاتے ہیں مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ وہ بھی کیسی احمق ہے۔ اب وہ ایسا کبھی نہیں کرے گی بلکہ باہمی مفاہمت میں اپنے دُکھوں کا مداوا ڈھونڈے گی۔

رات کو بجلی بند کر کے جب وہ لیٹے تو اس نے آہستہ آہستہ گفتگو کا آغاز کیا۔

"سردی آ رہی ہے۔ پچھلے دو سال سے بچوں کے لئے کچھ نہیں بنوا سکے۔ اب کے مجھے کہیں سے تین چار سو کی رقم ضرور لا دیجئے گا۔ بس اتنے میں سب ٹھیک کر لوں گی۔"

"تین چار سو"۔ اس کا شوہر حیرت سے کسمسایا۔ آج دن بھر سگرٹ نہیں پیا صبح کند بلیڈ سے شیو بنایا۔

"سن رہے ہیں"۔

"ہوں"۔

ہوں سے کام نہیں چلے گا۔ یہ رقم میں لے کر چھوڑوں گی آج تک کبھی کوئی فرمائش نہیں کی۔ قسم کھاؤ کبھی دوسری عورتوں کی طرح تنگ کیا اب دیکھنا ہے آپ میری اس پہلی فرمائش کا کوئی احترام کرتے ہیں یا نہیں آپ کو میری جان کی قسم میرا مردہ دیکھیں جو میری بات نہ مانیں۔ بس تین چار سو کہیں سے لا دیں۔ یہ رقم کوئی اتنی بڑی بھی نہیں کیوں چپ ہو گئے ہیں"

اس کا شوہر دم بخود لیٹا سوچ رہا تھا۔ تین چار سو پیدا کرنا گویا پہاڑ سے دودھ نکالنا ہے۔ یہاں تو کسی کا مردہ دیکھنے کا حوصلہ بھی نہیں ہے کیونکہ مُردہ دیکھ کر مردے کو ٹھکانے بھی لگانا پڑتا ہے اور اس میں بھی خاصی رقم خرچ ہوتی ہے۔ مگر اس بے وقوف کو آج ہوا کیا ہے "۔؟

شوہر کی خاموشی سے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اب وہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔

"بس زندگی میں ایک بار فرمائش کی اور انہوں نے چُپ سادھ لی۔ میری قسمت خراب ہے۔ آخر یہ معمولی رقم کیا آپ کے لئے بہت بڑی ہے کہ اس کے حصول کے خیال سے آپ خاموش ہیں۔ نہ ہوں نہ ہاں کچھ تو کہئے کیا ہمارے بچے پاگل گئے گذرے ہیں کہ آپ انہیں ننگے پھرتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ میری بات سن رہے ہیں۔"؟

اس کا شوہر گھبرا گیا اس نے اندھیرے میں اسے نظروں سے ٹٹولا۔ پھر بولا۔

"نہیں۔ نہیں بھئی ایسی کوئی بڑی رقم نہیں ہے کوشش کروں گا کہیں سے مل جائے۔"

"کوشش نہیں وعدہ کیجئے۔"

"وعدہ"۔

"ہاں ہاں وعدہ چند دنوں کے اندر رقم دلوا دینے کا وعدہ"

"اچھا بھئی وعدہ ہی سمجھو۔"

اس کا دل کھِل اُٹھا ناز سے بولی

"ہائے کیسا ڈھیلا ڈھالا وعدہ ہے پکا وعدہ کیجئے۔"

اس کے لہجے کے اطمینان اور شگفتگی پر اس کے شوہر کو ہنسی آ گئی۔

"آج یہ کیسی احمقانہ باتیں کر رہی ہے۔ آخر ہوا کیا کسی نے کیا پھونک دیا کان میں۔ کیا واقعہ پیش آیا۔ اچھی طرح جانتی ہے۔ اُس کے غریب شوہر کے لئے یہ رقم ہرگز معمولی نہیں ہے پھر بھی جانے کس وہم میں پڑی ہے احمق کہیں کی۔" مگر یوں سوچنے کے باوجود جب اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"بالکل پکا وعدہ لو اب خوش ہو جاؤ۔" تو اس نے اپنے دل میں فرحت محسوس کی۔ جیسے رقم حاصل کرنا واقعی کوئی مشکل بات نہ ہو۔ اسے خود اپنے الفاظ پر یقین سا آ گیا۔ ساری مشکل حل ہو چکی تھی۔ بہت دنوں بعد میٹھی اور گہری نیند آ گئی۔

صبح وہ بہت جلد اُٹھی۔ ناشتہ تیار کیا۔ پہلے شوہر کو پھر بچوں کو کھلایا پلایا۔ پھر بچوں کے سر پر ہاتھ پھیر کر انہیں سکول رُخصت کیا۔

اس وقت اسے سارا گھر محبت شفقت ہمدردی سکون اور خلوص کی نعمت سے بھرا بھرا لگ رہا تھا۔

شوہر جب سائیکل تھامے باہر نکلنے لگا تو اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"آج انتظام ہو جائے گا نا"؟

اس کا شوہر مسکرا دیا۔

اب اتنی جلدی تو نہ ڈالو ایک ہفتے کے اندر ضرور کوئی نہ کوئی انتظام کر دوں گا۔

"ٹھیک ہے"

اس نے کسی اطاعت گذار بیوی کی طرح کہا۔ ابھی سردی بھی کونسی آ گئی تھی۔ کمروں میں ہلکے کپڑے اوڑھ کر سونے کا موسم

تھا اور سوئٹر پہننے کا موسم تو حقیقت میں ابھی ایک ماہ بعد آنے والا تھا۔ بہت دن پڑے تھے۔

گھر میں ایک سکون سا پھیلا رہنے لگا تھا۔ لڑائی جھگڑے یکسر موقوف ہو چکے تھے۔ وہ دھیمی اور میٹھی آواز میں بات کرتی، اور گھڑی گھڑی بچوں کے منہ چوما کرتی۔ ان کی لڑائیاں بڑی خوش اسلوبی سے نپٹاتی اور رات کو دونوں میاں بیوی سونے سے پیشتر کچھ دیر گفتگو ضرور کرتے۔ گفتگو کے دوران دبی دبی ہنسی کی آواز بھی ابھرتی رہتی۔

روپوں کا ذکر اس دوران کسی نے ایک دوسرے سے نہیں کیا تھا۔

دونوں خاموش اندر اپنے اپنے طور پر مطمئن تھے۔ اس رات اچانک زور کی آندھی چلی اور بارش کے ساتھ موٹے موٹے اولے گرے۔ اور صبح ہوتے ہوتے ٹھٹھری پیدا کر دینے والی سردی ہو گئی بادل بھی چھائے ہوئے تھے۔

صبح وہ صندوق کھولے دیر تک پرانے رنگ اڑے سویٹروں کو آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہی۔ بڑے بچوں کے سوئٹر پھر بھی بہتر حالت میں تھے۔ مگر چھوٹے بچوں کے سویٹروں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ کیونکہ وہ ایک کے بعد دوسرے بچے تک پہنچے تھے۔ اس نے خاموشی سے ٹرنک میں سے بندھی ہوئی گٹھڑی نکالی۔ اسے کھولا۔ گٹھڑی رنگ برنگے بالکل ایک ایک سال بنے ہوئے سوئٹروں اور گرم کپڑوں سے بھری ہوئی تھی، وہ دیر تک انہیں الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔ اس کا شوہر بھی پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ بچے بھی گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اور للچائی نظروں سے سویٹروں کو تک رہے تھے۔ اچانک اس نے نظریں اٹھا کر شوہر کی طرف دیکھا۔

شوہر کی نظروں میں ایک سوال تھا۔

"نو شابہ لائی تھی"۔ وہ جذبات سے خالی سرد آواز میں بولی۔

"بالکل نئے ہیں"۔

"ہاں واقعی بالکل نئے معلوم ہوتے ہیں"۔ اس کے شوہر نے ہاں میں ہاں ملائی اور ایک سوئٹر ہاتھ میں لے کر اسے دیکھا۔

جونی بولا۔ "امی یہ نیلا میں لونگا"۔

روبی بولی۔ "یہ سرخ والا مجھے دے دیجئے کیسا اچھا کالر لگا ہے"۔

"ریڈی میڈ ہے نا"۔ ایک اور بچی نے کہا اس نے خاموشی سے سب بچوں کو سوئٹر پہنا دیئے۔ جب بچے اسکول اور شوہر دفتر چلا گیا تو وہ دیر تک پلنگ پر مُردے کی طرح بے سدھ پڑی چھت کو تکتی رہی۔

وہ بندھی ہوئی گٹھڑی کھل گئی تھی۔ اور اس کی حماقتوں اور ناعاقبت اندیشیوں کا بھید فاش ہو چکا تھا۔ یہ تو سچ مچ اس کے گناہوں کی گٹھڑی تھی۔ مگر ان گناہوں کی سزا اس کے بھولے بھالے معصوم بچوں کو بھگتنا پڑ رہی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ ایک پچھتاوے کے ساتھ اس نے سوچا اور۔ آنسوؤں کے دو موٹے قطرے اس کے رخساروں پر لڑھک آئے۔

دسمبر ۶۸ء

سچ ہے رونا اور چلانا آپ ہی بھرنا مرا کام ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں رونے اور چلانے سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اجڑ جوئی ڈومنی اور پڑھاں کو جب تمیسے رہ سکتے ہیں؟

شمس الرحمن فاروقی

عکس تحریر:۔ ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی

# ایک تعزیتی کتاب پر غیر تحریری تاثرات

رشید امجد

موت تو دوپہر کے قریب ہوئی تھی لیکن بعض رشتہ داروں کی آمد میں تاخیر کی وجہ سے اسے دوسرے دن صبح دفن کرنے کا فیصلہ کیا گیا، اسے اس فیصلہ پر کوئی اعتراض نہیں تھا، ویسے بھی جانے کی ایسی جلدی نہ تھی، اس لئے وہ چپ چاپ اس چارپائی پر پڑی رہی، جس کے چاروں طرف رشتہ دار اور محلہ کی عورتیں جمع تھیں، ان میں سے بعض رو رہی تھیں اور بعض رونے کی اداکاری کر رہی تھیں،

روتے روتے اچانک گہری خاموشی چھا جاتی، پھر چند لمحوں بعد باتوں کا سلسلہ چل نکلتا، مختلف باتیں — گھروں کی سیاست، مہنگائی، بہو کی شکایتیں، بیٹوں کی بے مروتیاں، ساس کا ظالمانہ رویّہ، خاوند کی بے اعتنائی، بزدلی — وہ خود ان بکھیڑوں سے گزری تھی لیکن دوسرے سے یہ باتیں سن کر عجیب طرح کی بیزاری محسوس ہو رہی تھی — باتوں کا سلسلہ، نہ ختم ہونے والا سلسلہ — دفعتاً کوئی نئی وارد ہوتی، روتے اور بین کرتے اندر آتی تو باتوں کی رسی ٹوٹ جاتی، کچھ دیر رونے، بین کرنے کی آوازیں پھر گہری خاموشی، گفتگو کا سلسلہ دوبارہ چل نکلتا، — یہ تماشا دوپہر سے ہو رہا تھا اور اب شام ہونے کو آئی تھی،

اس نے سوچا — "چلو ایک رات کا قصہ ہے، صبح تو میں نے چلے ہی جانا ہے۔"

لیکن شام کو جب کسی نے گھر والوں کو مشورہ دیا کہ لاش کو محفوظ رکھنے کے لئے برف کی سلیں منگوا لی جائیں تو اس کے کان کھڑے ہوئے، کوئی اور موقعہ ہوتا تو وہ مشورہ دینے والے کو آڑے ہاتھوں لیتی، زندگی بھر اس کا دبنگ پن سارے خاندان میں مشہور رہا تھا، لوگ اس کے سامنے سے بھی بچ کے نکلتے تھے اور کوئی اس کے فیصلے کے خلاف دم مارنے کی جرأت نہیں کرتا تھا، لیکن اب بے بسی کا یہ عالم تھا کہ وہ کروٹ بھی نہیں بدل سکتی تھی، سارا جسم، ساری توانائیاں ساتھ چھوڑ گئی تھیں، بس ایک احساس باقی تھا کہ وہ سب کچھ سن اور محسوس کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر میں برف کی سلیں آ گئیں اور اس کے چاروں طرف لگا دی گئیں، آس پاس بیٹھی عورتیں کچھ کچھ دور ہو گئیں۔ ان کے لئے دہکتے کوئلوں کی انگیٹھیاں آ گئیں۔ ٹھنڈک آہستہ آہستہ اس کے نیچے رینگنے لگی اور دھیرے دھیرے اس کے سارے بدن پر پھیلتی چلی گئی۔

انگیٹھیوں کی نرم ملائم حدت نے محفل میں غنودگی کی کیفیت پیدا کر دی، کچھ عورتیں اٹھ کر چلی گئیں اور وہی رہ گئیں جنہوں نے رات گزارنا تھی۔ ان کے لئے کمبل اور لحاف آ گئے۔ ٹھنڈک اب اس کے سارے وجود پر رقص کر رہی تھی اور انتہائی بے چینی کے عالم میں اس کا جی بار بار کروٹ لینے کو چاہ رہا تھا، لیکن بدن جسم عاری ہو چکا تھا — باقی تو اب سبھی تھے، کوئی بھی دیکھ اور محسوس نہیں کر رہا تھا، اس کی بڑی بیٹی بھی سر جھکائے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

اس نے غصہ سے سوچا — "دیکھو اسے بھی احساس نہیں کہ صبح تک یہ ٹھنڈک میرا کیا حشر کرے گی۔"

بیٹی نے ماں کی اس بات کو محسوس نہیں کیا۔ وہ سر جھکائے اپنی سوچوں میں گم تھی، ماں کی اچانک موت نے اسے بے حال کر دیا تھا۔ اس گھر میں اب اس کا کون تھا، اسے خیال آیا — اب کون مجھے پوچھے گا؟ ایک ماں تھی کہ دو دن نہ آؤ تو کسی کو بلانے بھیج دیتی تھی، میرے بچوں اور خاوند کا کیسے خیال رکھتی تھی، اصرار کر کے کھلاتی تھی، ہر موقع پر بڑھ چڑھ کر دیتی، اور چپکے چپکے تو کیسے کیسے مدد کرتی تھی، اسی لئے تو بھابیاں کہتی تھیں کہ اس گھر میں میرا راج چلتا ہے، بس اب راج ختم ہو گیا، سارا کھیل ہی ختم ہو گیا۔ اب ان کا جو جی چاہے کریں گی — اس نے سر اٹھا کر بڑی بھاوج کو دیکھا، جو کچھ فاصلہ پر بیٹھی تھی — کیسی مکار بنی بیٹھی ہے، زندگی بھر میری ماں کی برائیاں کرتی رہی۔ وہ تو میری ماں ہی دبنگ تھی ورنہ اس نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ شروع شروع میں تو ناراض ہو کر گھر جا بیٹھی تھی، لیکن جب ماں ٹس سے مس نہ ہوئی اور بھائی نے بھی کہہ دیا کہ جو ماں کہے گی وہی ہو گا تو خود ہی واپس آ گئی، لیکن اس نے کبھی ماں کو ماں نہیں سمجھا، ہمیں تو ہمیشہ نفرت سے دیکھتی رہی، مگر اسے جرأت نہیں ہوئی، بڑی مسکین بنی پھرتی ہے لیکن مجھے معلوم ہے، اندر سے تلملاتی تھی کہ ماں مجھے اور میرے بچوں، خاوند کو اتنی اہمیت کیوں دیتی ہے، مگر اب تو سب ختم ہو گیا، اب اسی کا راج چلے گا، اب میں بھلا کیسے دندناتی ہوئی یہاں

سدُن گی، چلو میرا بھی کیا ہے، اصل مسئلہ تو چھوٹی دلہن کا ہے، اس کا کیا بنے گا۔ اس کے ناز نخرے اب کون اٹھائے گا۔ وہ تو ہے بھی بڑی بھولی، سات سے آتی ہیں، منہ پھٹ، جو منہ میں آئے کہہ دے گی، اس کا اب کیا ہوگا، یہ تو اسے نوکرانی بنا کر رکھ دیں گی —— ہائے اللہ اس کا کیا ہوگا ——

اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے چیخ نکل گئی، آنسو رو کے نہیں رُکتے تھے۔ پاس بیٹھی ایک بوڑھی عورت نے اسے دلاسا دیا —— "بیٹی صبر کر"

بڑی بہو ج نے اس کی چیخ سُن کر سر اُٹھایا —— "حرام زادی کیسے بلک بلک کر رو رہی ہے۔ ہاں ہاں کیوں نہ روئے، اس کی بادشاہت جو ختم ہوگئی ہے۔ بھلا کیسے دندناتی ہوئی آتی تھی اور مجھے کس کس طرح اس کی خوشامد کرنی پڑتی تھی۔ اب دیکھوں گی کیسے آتی ہے اس گھر میں، اور اس کے بچے کیسے چیزیں توڑتے ہیں، اور اس کا وہ لاٹ صاحب، یہ نہیں کھانا، وہ نہیں کھانا، اب دیکھوں گی —— نہیں کھانا تو جہنم میں جائے، جہنم میں تو پہلے ہی بھیج دیتی لیکن یہ میرے میاں ہی نکھٹو ہے، کیسے میں کیسے میری منتیں کرتا ہے لیکن ماں کا سامنا ہوتے ہی گھگھیانے لگتا ہے۔ بزدل کہیں کا، اور یہ عورت —— اس نے کیسا کیسا ظلم نہیں کیا مجھ پر، اب دیکھوں گی اس کے ایک ایک رشتہ دار کو، اور اس چہیتی کو، کیسے روتے جا رہی ہے، اور یہ چھوٹی بہو، میسنی ہمیشہ مجھے کاٹنے کی فکر میں رہتی ہے، اسے بھی دیکھ لوں گی، اب میں ہی تو اس گھر کی بڑی ہوں، ایک ایک سے نمٹ لوں گی، خدا کا شکر ہے جان تو چھوٹی ہے لیکن یہ کم بخت چپ ہی نہیں ہوتی اب مجھے بھی آنسو بہانے پڑیں گے —— اس نے زور سے دھاڑ ماری —— "امی جی"

پاس بیٹھی ایک عورت نے اسے بھی دلاسہ دیا — "صبر بیٹی صبر — اب تو ہی اس گھر کی بڑی ہے"

اس جملے نے اسے گرم نرم لمس سے آشنا کیا اور وہ دلاسہ دینے والی کے کندھے پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔

ذرا دور بیٹھی چھوٹی بہو نے بڑی بہو اور بڑی نند کی چیخیں سُنیں تو وہ بھی زور سے چیخی —— "ہائے پیاری امی" —— اور دل ہی دل میں وہ دونوں کو کوسنے لگی — کم بخت چپ ہی نہیں ہوتیں، لیکن کوئی بات نہیں یہ ہوشیاری کا وقت ہے، ذرا سی بے احتیاطی سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دے گی اس نے کن انکھیوں سے بڑی بہو کی طرف دیکھا —— بڑی آئی افسوس والی، ساس کی زندگی میں تو میں نے اسے آگے نکلنے نہیں دیا، اوپری خوش خلقی سے سارے گھر کو پیچھے لگائے رکھا، ساس سمجھتی تھی میں اس کی بڑی خیر خواہ ہوں، اس کی بیٹی کو جو ہر وقت گلے لگائے رکھتی تھی، اس کے بچے میرے تو سارے کھلونے توڑ جاتے، اٹھ کر لے جاتے تو میں ایک لفظ بھی نہیں بولتی تھی۔ لیکن اندر سے تو کڑھتی تھی —— کرن کم بختوں سے کب جان چھوٹے گی ہر کسی کو نیچا دکھانے کے لئے میں نے کیا کچھ نہیں کیا، بڑا من مارا ہے اپنا، لیکن اب ہوشیاری کا وقت ہے، شروع ہی سے ایک پالیسی بنانا پڑے گی ورنہ یہ مجھ پر سوار ہو جائے گی، خیر دیکھ لوں گی، پہلے اس بڑھیا کو تو نکلنے دو، دو چار دن تو ماتم رہے گا ہی، پھر دیکھوں گی —— میں کوئی دودھ پیتی بچی تو نہیں ذرا گڑبڑ کی تو دیکھ لوں گی، اور یہ بڑی نند اس سے بھی نمٹ لوں گی، بہت نخرے سہہ لئے اس کے، اس کے بچے کتنے بدتمیز ہیں اور وہ اس کا لاٹ صاحب میاں، اسے کوئی چیز پسند ہی نہیں آتی، اب دیکھوں گی —— اور یہ چھوٹی نند اسے تو میں دبا لوں گی —— پہلے تو میں اسے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کروں گی، لیکن ہے بڑی منہ پھٹ جو منہ میں آئے بکواس کر دیتی ہے۔ خیر تو یہ بعد کی بات ہے۔ فی الحال تو مجھے یہ ظاہر کرنا ہے کہ ساس کی موت کا سب سے زیادہ غم مجھے ہی ہے، یہ سوچتے ہی اس نے ایک زوردار دھاڑ ماری اور زمین پر لوٹ پوٹ ہوگئی —— "ہائے امی —— پیاری امی"

دو تین عورتیں اس کی طرف بڑھیں —— "بچی صبر —— بیٹی صبر" اور ان میں سے ایک نے سوچا —— "یہ تماشا تو ساری رات ہی ہوتا رہے گا، ابھی تو پوری رات پڑی ہے"

ذرا فاصلے پر بیٹھی ایک قریبی رشتہ دار نے لحاف ٹانگوں پر گھسیٹتے ہوئے کن انکھیوں سے وقت دیکھا اور سوچا —— "کیا بے وقت مری ہے، ذرا سویرے مرجاتی تو شام تک جنازہ ہو جاتا، اس رات بھر کی خواری سے تو بچ جاتے"

ایک اور قریبی رشتہ دار نے کوئلے کریدتے ہوئے سوچا —— "زندگی بھر بہوؤں کے لئے عذاب بنی رہی اور جاتے جاتے ہمیں عذاب میں ڈال گئی، اب جاگو ساری رات اور مرو اس سردی میں"

ان سب سے الگ، ایک کونے میں سب سے چھوٹی بیٹی بس اندر ہی اندر روتے جا رہی تھی، اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اچانک یہ کیا ہوگیا ہے بس ایک ہی احساس تھا کہ کسی نے اس کے سر سے آسمان کھینچ لیا ہے۔

وہ یہ سب دیکھ اور سُن رہی تھی —— کچھ کرنے، بولنے اور کہنے کا وقت گزر چکا تھا، برف کی سلوں میں وہ بھی برف کی سل بنی جا رہی تھی۔

"صبح کب ہوگی — مجھے کب اس ٹھنڈک سے نجات ملے گی"

لیکن کسی نے اس کا سوال نہیں سُنا، سب اپنے اپنے خیالوں، سوچوں اور منصوبوں کے دائروں میں ڈبکیاں کھا رہے تھے۔

# دھوپ دروازے

مظہر الاسلام

وہ بیٹھی کتاب پڑھ رہی ہے۔ اسے کچھ خبر نہیں کہ اس کے اِردگرد کیا ہو رہا ہے۔ میں نے آج تک کسی کو بھی اتنے انہماک سے کتاب پڑھتے نہیں دیکھا۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ اسے کتاب پڑھتے کتنے سال ہو گئے ہیں لیکن وہ دن آج بھی بڑے کمرے کی دیواروں سے جھانکتا ہے جہاں وہ بیٹھی کتاب پڑھ رہی ہے۔ اس کمرے کے دو دروازے ہیں جن میں سے ایک اندر کی طرف اور ایک باہر کی طرف کھلتا ہے۔ چاروں طرف ہلکے رنگوں کے نرم آرام دہ اور قیمتی صوفے پڑے ہیں۔ ان پر اگر چڑیا بھی بیٹھ جائے تو وہ اندر دھنس جاتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے بہت سے لوگ ابھی ابھی ان پر سے اُٹھ کر گئے ہیں۔ باہر کی طرف کھلنے والے دروازے کے ساتھ والے صوفے پر وہ بیٹھی کتاب پڑھ رہی ہے۔ عقب میں مینٹل پیس پر پورے کھلے ہوئے پھول گلدان کی مٹی پر دوہرے ہو رہے ہیں۔ قریب ہی ڈیکوریشن کی غرض سے دو چھوٹے چھوٹے جہاز آمنے سامنے پڑے ہیں۔ اوپر ایک تصویر میں ایک بڑا جہاز اُڑنے کے لئے تیار کھڑا ہے۔ اگر غور سے کچھ دیر مسلسل تصویر کی طرف دیکھیں تو انجنوں کی آواز کانوں میں انگلیاں رکھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ بالکل سامنے پکاسو کی ایک ڈرائنگ ہے جس میں لڑکی کا چہرہ کبوتر کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ بنا ہوا ہے۔

جہاں وہ بیٹھی کتاب پڑھ رہی ہے۔ اس کے قریب بائیں طرف میز پر بہت سے خط بکھرے ہوئے ہیں۔ جو کئی سالوں سے اسی طرح بند پڑے ہیں اور اب انہیں دیکھ کر یوں احساس ہوتا ہے جیسے وہ لفظوں اور خواہشوں کی چھوٹی چھوٹی قبریں ہوں۔ جن پر صرف میری نظریں فاتحہ پڑھتی ہیں —— میں اب بھی اس کی ڈاک لا کر وہاں رکھ دیتا ہوں اور میز پر لفظوں کی ایک نئی قبر کا اضافہ ہو جاتا ہے —— ہر بار میں خط بڑے تجسس بھرے انداز میں میز پر پھینکتا ہوں کہ شاید وہ چونک کر اٹھالے۔ لیکن وہ تو کتاب سے آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ یہ تو صرف خطوں کی بات ہے۔ پچھلے سال گھر میں آگ لگ گئی۔ شعلے گھنٹوں ایک کمرے سے دوسرے کمرے اور پھر چھت پر چڑھ کر ناچتے رہے۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیاں پانی اور گیس کی مدد سے آگ پر جھپٹتی رہیں۔ آدھا شہر جمع ہو گیا۔ لوگوں نے آگ کے گرد گھیرا ڈال لیا اور گھر کے سامان کو شعلوں سے چھین چھین کر محفوظ جگہ پر پہنچاتے رہے۔ کان فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کی گھنٹیوں اور لوگوں کی آوازوں کی صلیب پر پرو دئے گئے لیکن وہ اطمینان سے بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔

وہ بہری نہیں۔ سب کچھ سنتی ہے لیکن اس کی کمزوری ہے وہ صرف آنکھوں سے ہی نہیں بلکہ اپنے سارے وجود کے ساتھ کتاب پڑھنے کی عادی نہ ہوتی تو کئی باتیں اس کی توجہ ہٹا سکتی تھیں۔ جب چھوٹا بیٹا امتحان میں فیل ہو گیا تو ٹیچر نے اس کی رپورٹ میں لکھا کہ بچے کو توجہ کی ضرورت ہے تو میں نے غصے میں سارا گھر سر پر اُٹھا لیا۔ اس وقت بھی وہ بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ محال ہے جو اس پر ذرہ برابر بھی اثر ہوا ہو۔ کبھی کبھی تو یقین ہی نہیں آتا کہ وہ ایسی ہو سکتی ہے لیکن اس میں شک والی بات کون سی ہے۔ سب کچھ صاف اور سامنے ہے۔ اسے

تو کسی بات کی پروا ہی نہیں بچے اور میں اب بھی ہر روز صبح کے ناشتے، دوپہر اور رات کے کھانے پر اس کا انتظار کرتے ہیں، لیکن وہ کتاب پڑھتی رہتی ہے۔ اس کی پلکیں، بلب کے گرد منڈلاتے ہوئے پتنگے کے پروں کی طرح حرکت کرتی ہیں اور سانسوں کی آواز گہرے اور شوخ رنگوں والی تتلی کی طرح میرے کمرے میں رکھی گھڑی کی ننگی سوئیوں پر بیٹھی رہتی ہے۔ اکثر جب وہ کتاب پڑھ رہی ہوتی ہے تو میرا جی چاہتا ہے اس سے رشتہ توڑ دوں۔ ایسے تعلق کا کیا فائدہ کہ ایک جگہ بستے ہوئے کبھی برسوں ملاقات نہ ہو اور ہو تو اور بات بھی نہ ہو سکے۔ لیکن پھر یہ سوچ کر ارادہ بدل دیتا ہوں کہ کہیں کتاب کی بے حرمتی نہ ہو اور کوئی یہ سمجھ بیٹھے کہ میں کتاب کا دشمن ہوں۔ مجھے خود کتابیں اچھی لگتی ہیں۔ ان لوگوں کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہے جو میرے ساتھ گفتگو کر چکے ہیں۔ کتاب کے علاوہ رشتہ نہ توڑ سکنے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ وہ گاہے بگاہے خواب میں میرے پلنگ کی پائنتی پر بیٹھ کر میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی ہے اور آنکھیں میرے بدن پر رکھ کر غصّے کا سارا زہر چوس لیتی ہے۔ صبح اٹھتے ہی میں ننگے پیر بڑے کمرے کی طرف بھاگتا ہوں کہ شاید۔ ۔ ۔ ۔ لیکن وہ صوفے کے کونے میں بیٹھی کتاب پڑھ رہی ہوتی ہے۔

پچھلے سال دسمبر میں سردی زوروں پر تھی ٹھنڈی ہوا گریبان کھولے پتنگ لوٹنے والے بچوں کی طرح بوکھلائی پھرتی تھی۔ جسم گرمی اور حدت کو ترس رہے تھے۔ میں اسے دفتر سے فون کر کر کے تھک گیا۔ فون کی گھنٹی دہائی دیتی رہی مگر اس نے ایک نہ سنی۔ اسی شام میں بیکری سے ڈبل روٹی خرید رہا تھا کہ میری ملاقات اپنی ایک کلاس فیلو سے ہو گئی تو باتوں کی انگیٹھی پر ہاتھ تاپتے تاپتے ہم گھر آ گئے۔ اس کے ننھے ننھے قہقہوں اور جاندار باتوں سے گھر کی اداسی کنارے لگ گئی لیکن وہ پھر بھی یونہی بیٹھی کتاب پڑھتی رہی۔ میرا خیال تھا کہ اس لڑکی کی آواز سن کر وہ بھاگی بھاگی ہماری طرف آئے گی۔ مگر دو گھنٹوں میں ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا حتیٰ کہ جب میں اپنی کلاس فیلو کے ساتھ بڑے کمرے کے سامنے سے گزرا تو میری کلاس فیلو اس کے دوپٹے کا پلو دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ اس نے قدرے احتیاط سے جھک کر اسے دیکھا اور ایک ایسے سوال کی تلخی میں ڈوب گئی جو اس کے چہرے پر لکھا گیا۔ لیکن وہ مجھ سے پوچھ نہ سکی۔ اگر وہ یہ سوال پوچھ لیتی تو میرا اور اس کا بوجھ ہلکا ہو جاتا اور ہم پھر سے اجنبی نہ بنتے۔

وہ جب میرے ساتھ پڑھتی تھی اس وقت بھی اسے سوال چھپانے کی عادت تھی اور اسی لئے اب تک اس کی البم میں بہت سے اَن پوچھے سوال لگے ہوئے ہیں۔ اس دن مجھے زیادہ افسوس اس بات کا ہوا کہ اس نے کتاب سے نظر اٹھا کر میری کلاس فیلو کو دیکھا تک نہیں ـــ چلو یہ تو ایک معمولی بات تھی۔ وہ تو اس دن بھی بیٹھی کتاب پڑھتی رہی جب میں دفتر میں تھا اور بچے سکول میں۔ چور اس کے سامنے گھر کا سامان سمیٹتا رہا لیکن اس نے کتاب نہیں چھوڑی۔ برسوں میں جمع کیا ہوا اثاثہ یوں لٹتے دیکھ کر تو غیروں کو بھی ترس آ جاتا ہے۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی جب میں گھر لوٹا تو خالی مکان میرے سینے سے لگ گیا۔ میں نے چیخ میں بٹے ہوئے انداز میں اس سے شکوہ کیا لیکن اس نے میری بات سُنی اَن سُنی کر دی۔

میرے اللہ توبہ ـــ میں کدھر جاؤں، کیا کروں۔ مجھے لگا جیسے میں پاگل ہو جاؤں گا لیکن میرے دماغ کی نسیں بڑی مضبوط ہیں۔ جبھی تو میں اسے اتنے سالوں سے برداشت کر رہا ہوں۔

ایک دن تو میں نے اس کی موت کو اس وقت روک لیا جب صرف چند لمحوں کی بات تھی۔ گھر میں سانپ نکل آیا۔ جب میں گھر پہنچا تو وہ سانپ اسے ڈسنے کی لذت کے نشے میں صوفے کی پشت پر کمپونہ ہو کر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے بڑے بیٹے کی ہاکی سے اسے نیچے گرا دیا اور اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیا۔ وہ اطمینان سے بیٹھی کتاب پڑھتی رہی۔ بس صرف کتاب کا ایک ورق پلٹا اور اس کی آنکھیں ننھی

رنگدار چڑیوں کی طرح دُم میں ہلا ہلا کر ایک لفظ سے دوسرے لفظ پر پھُدکنے لگیں۔

میں نے تہیہ کر لیا کہ اب اس کی طرف توجہ نہیں دوں گا۔ آئندہ چاہے کچھ ہو جائے، اسے کسی مسئلے میں شریک نہیں کروں گا۔ واقعی بعد میں میں نے ایسا ہی کیا۔ اس دوران کتنے موسم بدلے، آندھیاں چلیں، طوفان گھر کی بنیادیں کھودنے کی کوشش میں بھی لگے رہے۔ لیکن میں نے کبھی اس کی توجہ کتاب سے ہٹانے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ ایک بار اس کا فون آیا تو ہولڈ کروا کر اسے دُور سے آواز دی، تمہارا فون ہے۔ حسبِ معمول وہ فون سننے کے لئے نہیں اٹھی۔

میز پر رسیور اب بھی کریڈل سے نیچے پڑا ہے، معلوم نہیں ہولڈ ہے یا منقطع ہو چکا ہے۔ لیکن میں اس کے قریب اس لئے نہیں جاتا کہ ہو سکتا ہے وہ ابھی تک ہولڈ ہو اور کہیں مجھے پھر اسے بلانے کے لئے آواز نہ دینی پڑے — اور اب تو ٹیلی فون ہولڈ کروائے ہوئے بھی سال سے اُوپر ہونے کو ہے۔ میں نے بھی نہیں اُٹھانا، خود ہی اُٹھائے گی — میں نے تو اس کی پروا کرنا چھوڑ دی ہے۔

چھوٹی بچی نے اسے بہت مِس کیا۔ کافی عرصہ تک میں اسے بہلاتا رہا، اس کی گڑیوں کے لئے گھر بنایا، ربن خریدے، اچھے اچھے فراک سلوائے، چھوٹے چھوٹے پلاسٹک کے برتنوں میں اس کے ساتھ چائے پی۔ اُسے کہانیاں سنائیں مگر وہ پھر بھی بیمار پڑ گئی، ایسی کہ علاج سے بھی ٹھیک نہ ہوئی اور آخر ایک دن صبح اس کی ننھی مُنّی گردن میں سانس ٹوٹنے کی آواز یوں آئی جیسے تسبیح ٹوٹ گئی ہو اور اس کے دانے بکھر گئے ہوں، میں چیخ کر اس سے لپٹ گیا۔ دوسرے بچے بھی مُنّی کے گرد جمع ہو گئے، کہرام مچ گیا۔ ارد گرد کے گھروں سے عورتیں چادریں اور برقعے سنبھالتی ہوئی آ گئیں — قیامت کا ذکر چلا، چیخیں اُبھریں اور ڈوبیں — سب کچھ آنسوؤں سے بھیگ گیا لیکن وہ خشک اور بے اثر بیٹھی کتاب پڑھتی رہی۔

چالیس سالہ مخزن

کئی سالوں کا رُکا ہوا غصہ میرے جسم کو اس کی طرف دھکیلنے لگا میں نے چاقو لیا اور ہراتا ہوا اس کی طرف بڑھا لیکن میں تین چار قدم بڑھا ہوں گا کہ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ اعلان ہوا . . . . . جہاز روانگی کے لئے تیار ہے۔ چور نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے کتاب بند کر کے ٹوکری میں رکھی اور اُٹھ کر لاؤنج سے باہر نکل گئی، لیکن میں ابھی تک لاؤنج میں بیٹھا ہوں کیونکہ میرا جہاز جانے میں ابھی خاصا وقت ہے۔

(جولائی ۱۹۷۸ء)

تخلیق کو بسا اوقات معاوضہ کے ترازو میں بھی تولا جاتا ہے — لیکن یہ واضح کر دیا جاتا ہے — کہ فن اپنا معاوضہ صرف سکوں کی ہی صورت میں وصول نہیں کرتا۔ زیادہ تر فن کو پرکھنے والے ہی نہیں ملتے — نہایت اعلیٰ درجہ کا فن بھی تو نہیں لوگوں کو پرکھنے کے لیے پیش کر دیا جاتا ہے۔ جو عام درجہ کا فن پرکھنے کی عادت بنا کر بیٹھے ہیں۔ ان کے تاثر imagination کی کمی ہوتی ہے۔ اور وہ ایک محدود نظریۂ فن کی بنیاد پر اپنا کام چلاتے ہیں — اکثر ایسی صورت میں ادب کو اس کا پارکھ قارئین میں مل جاتا ہے — جو اپنی زندگی میں کم و بیش اسی ذہنی سفر کا تجربہ رکھتا ہے۔ جیسا کہ اعلیٰ درجہ کا فن کار —

عکسی تحریر۔ مسز فریدہ ریگاشی

غلام محمد

پہلا شخص چیختا شور مچاتا خواب سے ایکا ایکی بیدار ہوا۔ وہ لگا تیز تیز ہانپنے۔ پھنکارتا ہوا سیاہ ناگ جس نے اسے لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے سینے پر نہ تھا۔ وہ پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ تپائی سے اس نے ٹھنڈے پانی کا گلاس اٹھایا۔ اس کا حلق ایسا سوکھا تھا کہ اس میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ غٹاغٹ اس نے ٹھنڈا پانی پی لیا۔

اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ بے انتہا خوفزدہ نظر آتا تھا۔

دوسرے شخص کی آنکھوں میں نیند بھری تھی۔ اس نے اپنی نیند بھری آنکھوں سے دو بارہ یہ منظر دیکھا اور دوبارہ اس نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ اور وہ دوبارہ سو گیا۔ ایک بار پھر وہ اپنے مدھر خوابوں میں بہتا ہوا اسی مقام پر پہنچا جہاں اس کا خواب شیریں ٹوٹا تھا۔ سلہٹ کے پادر پر نہایت خوش رنگ پرندے سینکڑوں کی تعداد میں بیک وقت اترے۔ وہ پادر کے صاف و شفاف، آئینے کی مثال پانی پر ہوتے ہوئے اپنی کشتی چلا رہا تھا۔

پادر کا پانی اونچے پہاڑوں سے اترتا ہے اور بڑے وسیع و عریض علاقے پر ایک جھیل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ دوسرے شخص نے یہ دیکھا کہ خوش رنگ پرندے پادر کے پانی پر تیرتے ہیں۔ پانی اتنا ٹرانسپیرنٹ کہ نیچے پانچ فیٹ پانی تلے بے قرار دوڑتی، چھپتی مچھلیاں اسے صاف نظر آ رہی تھیں۔ اور وہ بہت محظوظ ہو رہا تھا۔ اور پرندوں کی خوش آہنگ چہچہاہٹ اسے فضا میں بانسری بجاتی اور کانوں میں رس گھولتی محسوس ہو رہی تھی۔ معاً پہلا شخص جو چند ثانیے قبل ٹھنڈا پانی پی کر سو گیا تھا۔ نیند میں پھر شور مچانے لگا۔

وہ اپنے ہاتھ پاؤں ایک عالم اضطراب میں بستر پر مار رہا تھا۔ وہ تڑپ رہا تھا۔ پسینے میں وہ شرابور تھا۔

اب کے دوسرے شخص نے اٹھ کر اس کی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اور انتہائی محبت سے اس نے پکارا "اے میرے عزیز۔ میرے ہمسفر"!

ہائیں؟۔ پہلے شخص نے اپنی خوابیدہ آنکھیں کھولتے ہوئے پوچھا۔ وہ لوگ کہاں گئے۔ کیا ہوئے؟ اس پر ایک لرزہ طاری تھا۔ وہ بے خوف ہو کر گردو پیش اپنی آنکھیں پھاڑ پھاڑ دیکھتا تھا۔ اور حیران ہوتا تھا۔

"کون لوگ؟"۔

وہی لوگ جو اتنی دیر اپنے چمکتے ہوئے تیز چھرے لئے مجھے گھیرے ہوئے تھے۔

دوسرے شخص نے بڑی محبت سے کہا "تم خواب دیکھ رہے تھے میرے عزیز"!

"خواب ــــ"؟

پہلا شخص بڑی سرعت سے اٹھ بیٹھا تھا۔ اس نے انتہائے کار یہ اطمینان کر لیا۔ اور اسے یقینِ کامل ہو گیا کہ وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے پہلے یہ دیکھا کہ جونہی اس نے اپنے گھر سے قدم نکالا تھا۔ ایک سیاہ ناگ جو اس کے دروازے پر بیٹھا ہوا تھا۔ پھنکارتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ سیاہ ناگ قد و قامت میں اس کے برابر ہی تھا۔ اس کا پھن اس کے چہرے کے برابر تھا۔ اور بالکل سرخ تھا۔ اس کی زبان شعلوں کی مانند لق لق منہ سے نکلتی تھی۔ ریحہ میں ناگ نے اسے لپیٹ لیا۔

دوسرے ہی لمحہ وہ زمین پر اور سیاہ ناگ اپنا سینہ دراپنا سرخ پھن کھولے پھنکارتا اس کے سینے پر بیٹھا ہوا تھا۔

پھر وہ کیا دیکھتا ہے کہ عجیب و غریب ہیئت کے لوگ۔ ان کی ہیئت یوں کہ ان میں سے کسی پاؤں پر عین ناف کے مقام پر چہرے تھے اور باقی دھڑ غائب اور معلق

ایک آنکھ پیشانی پر۔ کسی کے چہرے پر پاؤں۔ ہاتھ بھینس کے لمبے لمبے۔ کسی کے چھ اور کسی کے آٹھ آٹھ ہاتھ تھے۔ وہ چاروں طرف سے اپنے اپنے ہاتھوں میں تیز خنجر لئے اسے بڑی بے رحمی سے گھیرتے ہیں۔

وہ بے کسی میں مدد، مدد پکارتا تھا۔ چیختا تھا۔ دوڑتا بھاگتا تھا۔

"اے میرے رفیق۔ دوسرے شخص نے بدستور ہمدردی سے دریافت کیا۔ تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے۔ اور کس لئے تم اس اضطراب میں مبتلا ہو"؟

"پتہ نہیں۔"

"پھر۔ دوسرے شخص نے نہایت خلوص سے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ سو جاؤ۔"

"نہیں۔"

"کیوں نہیں۔ دوسرے شخص نے کہا۔ رات گہری ہو چکی ہے۔ تڑکے اٹھنا شروع ہے کس نے کہ سفر ہمارا مقدر ہے۔"

پہلے شخص نے اقرار کیا "سفر ہمارا مقدر ہے۔"

"سو جاؤ۔"

"نہیں۔ اس نے قدرے اعتماد سے کہا۔ یہ رات بھی دیگر راتوں کی طرح یونہی گزر جائے گی۔"

"کیوں، پہلے بھی ایسا ہوتا تھا کیا؟"

"ہوتا تھا۔ اس نے اعتراف کیا۔ اور کہا۔ میری راتیں میری آنکھوں میں کٹتی ہیں۔ اور نیند سے مجھے ایک خوف آتا ہے۔"

"نیند سے خوف آتا ہے؟"

"ہاں پہلا شخص کہتا رہا۔ نیند سے مجھے خوف آتا ہے۔"

دوسرے شخص نے بہت لاچار ہو کر سوچا۔ نیند۔ غشی اور موت عام طور پر نجات کی یہی تین صورتیں ہوتی ہیں۔

نیند آ جاتے سے۔ اس کی بابت تئیں اس نے تشریح کی۔ نیند آ جائے۔ تو تھکن اور گھٹن سے چند گھنٹوں کے لئے انسی نیند میں نجات ملتی ہے۔

آدمی کسی اندوہناک حادثے کی زد پر آ جاتا ہے۔ تو غشی میں اسے درد سے چھٹکارا ملتا ہے۔

موت، وہ سوچتا گیا۔ موت سے وجود کی جملہ اذیتیں جاتی ہیں۔ اور ایسا نہ ہو تو زندگی کس قدر بھیانک ہو جاتی

اے میرے عزیز، میرے رفیق۔ میرے ہمسفر۔

کیا۔؟

تمہیں نیند سے خوف کیوں آتا ہے۔

نجانے کیوں، پہلے شخص نے کہا۔ آنکھ لگتی نہیں کہ میری روح کو اذیت پہنچتی ہے۔

تم سو جانے کی کوشش کرو۔

نہیں نہیں ـــ اب کے اس نے بے پناہ خوفزدہ ہو کر کہا۔ میں نہیں سوؤں گا۔ میں نہیں سو سکتا۔

"اب کے ویلیم کے دس ملی گرام کھاؤ۔"

"دس ملی گرام؟"

"ہاں پورے دس ملی گرام۔"

اس گفتگو سے تیسرے شخص کی نیند میں بھی بہت خلل پڑا۔ وہ بہت متحیر ہوا۔ مگر اس نے کچھ نہ کہا۔ اس نے اپنی جگہ سے جنبش نہ کی۔ وہ تقریباً اپنا سانس روکے، دم سادھے پڑا رہا۔ اور اس نے اول تا آخر پہلے دوسرے شخص کی تمام باتیں پوری توجہ سے سنیں۔ یہ تاثر اس نے کسی طور ان میں سے کسی پر نہ ڈالا۔ کہ وہ بھی نیند میں خلل پڑنے سے بیدار ہوا ہے اور ان کی گفتگو وہ سن رہا ہے۔ اور سے بڑی حیرت ہو رہی ہے۔

کچھ دیر کے بعد تیسرے شخص نے یہ دیکھا کہ پہلا شخص دس ملی گرام ویلیم کھا لینے کے بعد گہری نیند سو چکا ہے۔ اور وہ بظاہر اتنے ہی سکون اور اطمینان سے سو رہا ہے جتنے شوق

لیکن وہ نہاں سے دوسرا شخص اپنے خوابوں میں سہرے کے حسین پس منظر میں بادلوں کے خوش رنگ پرندوں کو اترتے اور تیرتے دیکھ رہا ہے۔ اور ان کی خوش آہنگ چہچہاہٹ اس کے کانوں میں رس گھول رہی ہے۔ اور وہ انجوائے کر رہا ہے۔

وہ دونوں سوتے ہیں بظاہر ایک جیسے نظر آرہے ہیں۔

مگر ؟۔

ایک سوال تیسرے شخص کے ذہن میں ابھرا۔ اس نے یکلخت سوچا "کیا وہ دونوں اندر سے بھی ایک جیسے ہیں جس طور وہ اُوپر اُوپر نظر آتے ہیں"؟

نیند۔

غشی۔

موت۔

پتہ نہیں اس نے الجھ کر سوچا۔ اور سوچ کر وہ الجھا۔ کسے خبر ہے کہ اندر سے کس کی روح پر کیا گذرتی ہے۔ حالانکہ بظاہر نیند، غشی اور موت میں سبھی ایک جیسے نظر آتے ہیں۔

تب، اکائی تیسرے شخص نے انتہائی بے چارگی سے یہ سوچا اور اپنی آنکھیں، اس نے فوراً موندیں۔ کہ ہر شخص ایک ہی کیفیت میں ایک دوسرے سے جدا اپنی اپنی جگہ ایک جزیرہ ہے جو ناقابل تسخیر ہے۔ اس پر کیوں اپنی نیند اڑائی جائے۔

ابرڈ ــ اس نے تھک کر زیر لب کہا۔ پھر وہ سوگیا۔

اگست ۸۶ء

ہمارے عہد کا ہر شاعر اور دانشور اس استبداد اور اسکے سرچشموں کا ادراک رکھتا ہے۔ اسکے بارے میں رویے بھی بڑے واضح ہیں۔ ایک رویہ مفاہمت اور حلقہ بگوشی کا ہے جس کے صلے میں آج کے درباروں کو خلعتیں اور شہرتیں ملتی ہیں۔ دوسرا رویہ فرار اور مسائل سے چشم پوشی کا ہے۔ کبھی باطن کے خلیفے سے آنکھیں ڈھانپ کر منظر کو خود سے روپوش کرلیا، کبھی رومان کا رنگین کمبل مار کر فقیری کرلی۔ تیسرا رویہ انکار و اقرار کا ہے۔ اور یہ رویہ آدرش کا پرچم اور مستقبل کا علم بلند رکھنے کا رویہ ہے۔ اس راہ و روش کا پہلا مقام احتجاج سے عبارت ہے

عکس تحریر:- آفتاب اقبال شمیم

# پانچ لفظوں میں جامِ جہاں نما

اعجاز احمد فاروقی

"عبداللہ آج کل کیا کر رہے ہو؟"

"ہاں تو یار عبداللہ آج کل کیا کر رہے ہو؟"

"اچھا تو آج کل کیا کر رہے ہو؟"

"کیا کرتے ہو، ان دنوں کیا کر رہے ہو؟"

"عبداللہ آج کل آپ کیا کر رہے ہیں؟"

عبداللہ گذشتہ کئی ایک دنوں سے یہی ایک جملہ مسلسل سُن رہا تھا اور سُن کر اس کا جواب بھی دے رہا تھا۔ اوّل اوّل تو اس نے محسوس نہیں کیا تھا لیکن اب کچھ کچھ محسوس کر رہا تھا کہ اس جملے میں کیا کیا کچھ پوشیدہ ہے اور جو کچھ اس میں پوشیدہ تھا وہ اب اس پر بھاری پڑ رہا تھا اس سے وہ بور ہو رہا تھا اور بیزار ہو رہا تھا۔ ایک بے نام سی بیزاری اور اکتاہٹ، دھیما دھیما سا چڑچڑاپن، اس کی خواہش کو مہمیز کر دیتا کہ کاش ایسا ہو جائے کہ آئندہ وہ یہ جملہ ہی نہ سُنے، ورنہ یہی، اس کا جواب اس پر واجب الادا قرض ہو جائے۔ عبداللہ محسوس کر رہا تھا کہ پُرسانِ حال جب یہ پوچھتا ہے کہ عبداللہ کیا کر رہے ہو تو اس کے ساتھ وہ کچھ بتاتا بھی ہے کچھ جتلاتا بھی ہے اور وہی جو اسے بیزار کر رہا تھا اور اس کی اندرونی کلبلاہٹ کا گراف اُوپر اُوپر لے جا رہا تھا۔ عبداللہ کو پہلی مرتبہ اس کا احساس شاہ نواز سے مل کر ہوا تھا۔

شاہ نواز: "او ہو! عبداللہ یار ہم بڑے زمانے کے بعد ملے ہیں، کیا کر رہے ہو آج کل؟"

عبداللہ: "ہاں ہم آخری بار ۱۹۵۸ء میں ملے تھے، اب تو ۱۹۸۰ء چل رہا ہے۔"

شاہ نواز: "ہاں یار ستائیس برس ہو گئے ہیں۔"

عبداللہ: "ہاں بھئی، پتہ نہیں چلا اور اتنا ڈھیر سا وقت گزر گیا ہے۔"

شاہ نواز: "ہاں اس وقت مجھے آرمی میں کمیشن ملا تھا اور تم نے ایم۔ اے کر لیا تھا۔"

پھر باتوں باتوں میں شاہ نواز نے ایسی ڈنڈی ماری کہ گفتگو کا موضوع اس کا بنگلہ، فرنیچر، کراکری، قالین، جھاڑ فانوس وغیرہ ہو کر رہ گیا۔ عبداللہ اس غیر مطلوبہ اور لایعنی سلسلۂ گفتگو سے بیزار ہو گیا، اُکتا گیا۔

عبداللہ از خود اپنے پُرانے اور ہم جماعت دوست شاہ نواز سے ملنے آیا تھا جو اس وقت بریگیڈیئر تھا۔ وہ بلاشبہ عبداللہ سے بڑے تپاک کے ساتھ ملا تھا اور بڑی خاطر تواضع بھی کی تھی لیکن جب عبداللہ، شاہ نواز کے پاس دو گھنٹے کا وقت گزار کر رخصت ہو

رہا تھا تب ایک میلا میلا کڑوا کڑوا سا احساس بھی اس کے رخت سفر میں شامل تھا۔ اس میں یہ بات بھی شامل تھی کہ اس کے تینوں بیٹے امریکہ میں زیرِ تعلیم تھے اور ان سب کے سہارے اس نے عبداللہ کو یہ جتلانے کی کوشش کی تھی کہ پروفیسر ہونا تو کوئی معنی نہیں رکھتا۔

"عبداللہ! آج کل کیا کر رہے ہو؟"

اس سوالیہ جملے میں یہ بات چھپی ہوئی تھی کہ عبداللہ تم جھک مار رہے ہو۔

عبداللہ کو شاہ نواز سے ملنا ہی جھک مارنا محسوس ہوا۔

اور ایسی ہی ایک جھک مارنے کا احساس اسے جعفر اقبال سے مل کر ہوا۔ جو نہ صرف اس کا بچپن کا دوست ہی تھا بلکہ ہم محلہ اور ہم جماعت بھی تھا اور اس وقت اس کا شمار شہر کے سرکردہ وکیلوں میں ہوتا تھا۔ جعفر اقبال کو معلوم تھا کہ عبداللہ پروفیسر ہے، پھر بھی از راہِ کلام پوچھ ہی بیٹھا۔

"عبداللہ آج کل کیا کر رہے ہو؟"

"جعفر وہ بات پوچھو جو تمہیں معلوم نہ ہو، جو جانتے ہو وہ کیوں پوچھتے ہو؟"

اس پر جعفر اقبال ہنس پڑا اور ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں یار عبداللہ مجھے تو معلوم ہے میں تو یونہی کہہ رہا تھا اور تم ناراض ہو چلے ہو؟"

"نہیں، مجھے تمہارے سوال نے نہیں، الفاظ نے نہیں بلکہ لہجے نے ناراض سا کر دیا ہے۔"

"کیوں لہجے میں کیا خاص بات تھی؟"

"وہی خاص بات تھی جو نہیں ہونی چاہیئے تھی۔"

"اچھا اب ذرا کھل کر بیان کرو۔"

"لیکن یہ سب مجھے بادلِ نخواستہ کرنا پڑے گا۔"

"کیوں؟"

"عاقل را اشارہ کافی است"

اس کے عبداللہ نے عاقل کو یہ اشارے دیئے، طنزیہ لہجہ مزاحیہ لہجے سے مختلف ہوتا ہے، دبنگ لہجہ، متکبرانہ لہجے سے مختلف ہوتا ہے، خوشامدانہ لہجہ، عاجزانہ لہجہ سے مختلف ہوتا ہے، اور عاجزانہ لہجہ، مظلومانہ لہجے سے مختلف ہوتا ہے، مظلومانہ لہجہ، مریضانہ لہجے سے مختلف ہوتا ہے۔ مریضانہ لہجہ، مایوسیانہ لہجے سے الگ ہوتا ہے اور یہ لہجہ ہی ہوتا ہے جو کہیں تو الفاظ کو شیریں اور کہیں تیکھا، کہیں کڑوا اور کہیں زہریلا کہیں مبہم اور کہیں ذو معنی، کہیں پُر اسرار اور کہیں بے اثر کر دیتا ہے۔

اس تمہید کے بعد عبداللہ، جعفر اقبال کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس کے لہجے کا وہ کون سا رنگ تھا جو اُسے کھٹک گیا تھا، کہ جعفر اقبال کے کچھ موکل آ گئے اور سلسلۂ گفتگو ایسی جگہ آ کر ٹوٹ گیا، جہاں اسے ٹوٹنا نہیں چاہیئے تھا۔ اس پر عبداللہ بور تو ضرور ہوا تاہم آدابِ مجلس کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے خاموش ہو گیا اور جعفر اقبال کو موکلوں نے مصروف کر لیا۔

عبداللہ واپسی پر مسلسل یہی سوچتا رہا کہ جب جعفر اقبال اس سے پوچھ رہا تھا کہ عبداللہ آج کل کیا کر رہے ہو تو یہ پوچھتے ہوئے اس کے چہرے کے تاثرات تیزی کے ساتھ بدلے تھے اور لہجے میں ایک لرزش اور تشویش کچھ اور افسانہ سنا رہی تھی جیسے وہ کہہ رہا تھا

کہ عبداللہ میں تو ایک نامور وکیل ہوں میری شہرت بڑی بسیط اور عریض ہے تم نے پروفیسر ہو کر کوئی ایسا کارنامہ تو انجام نہیں دیا جس نے تم کو مجھ سے زیادہ مشہور کر دیا ہو۔ تم کوئی ایسی چیز تو نہیں بن گئے جو مجھ پر فوقیت رکھتی ہو۔ ایسے ہی اضطرابات اس کے لہجے میں جمع تفریق ہو رہے تھے۔

اس گھڑی عبداللہ کو احساس ہوا کہ لوگ جب یہ پوچھتے ہیں کہ آج کل کیا کر رہے ہو؟ تو وہ محض کچھ پوچھتے ہی نہیں بلکہ کچھ بتاتے بھی ہیں کچھ پوچھتے ہی نہیں کچھ چھپاتے بھی ہیں، کچھ پوچھتے ہی نہیں کچھ تفتیش بھی کرتے ہیں، کچھ پوچھتے ہی نہیں بلکہ یہ ٹوہ لگانے کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ عملاً ان کے کسی کام آسکتا ہے یا نہیں وہ اس سے فیض یاب ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ وہ کچھ پوچھتے ہی نہیں بلکہ اپنے کسی اندرونی اضطراب اور خوف کو بہلانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ کچھ پوچھتے ہوئے کچھ لینا چاہتے ہیں، کچھ پوچھتے ہوئے تولنا چاہتے ہیں، کچھ پوچھتے ہوئے کوئی ایک گمنام سی بازی جیتنا چاہتے ہیں۔

عبداللہ کو اندازہ ہوا کہ اس سوال کے جوابات تو ایک رنگ برنگا گلدستہ بنا رہے ہیں۔ عبداللہ اس گلدستے کو سونگھتا رہا۔ تب اُسے اسی سلسلۂ خیال میں سلیم ہاشوانی یاد آیا۔

اس وقت عبداللہ کراچی میں تھا۔ سلیم ہاشوانی اس کا ایک طالب علم تھا اور ایک لاپرواہ قسم کا طالب علم تھا جو بعد میں ایک ہوشیار اور کایاں کاروباری آدمی ثابت ہوا۔ ایک دن عبداللہ کی اس سے ایک دعوتِ ولیمہ میں ملاقات ہو گئی۔ ہاشوانی اپنے پرانے اُستاد سے بڑی گرم جوشی اور تپاک سے ملا اور علیک سلیک کے بعد پہلی ہی بات یہ کی۔

"سر آپ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟"

"بھئی میں وہیں ہوں جہاں تھا اور پڑھا رہا ہوں۔"

عبداللہ نے محسوس کیا کہ ہاشوانی یہ جواب سُن کر کچھ بجھ سا گیا ہے اور اس کا جوشِ ملاقات بھی کچھ دھیما پڑ گیا ہے۔ بعد کی گفتگو سے عبداللہ کو معلوم ہوا کہ ہاشوانی کے خلاف عدالت میں ایک مقدمہ چل رہا تھا اور وہ کسی سفارش کے لئے بہت مضطرب تھا۔ عبداللہ کی ذات میں بھی اس نے سفارش کی ٹوہ لگانے کی کوشش کی تھی۔ سوال پوچھتے وقت وہ پُرجوش تھا اور مفید مطلب جواب نہ پا کر مایوس سا ہو گیا تھا۔ اس پرانی یاد نے عبداللہ کو بدمزہ تو کیا تاہم اُسے یاد کرا دیا کہ لوگ یہ پوچھتے وقت کہ کیا کر رہے ہو، اور کیا کچھ پوچھتے ہیں۔

گزرتے وقت کے ساتھ عبداللہ کے ذہن پر ایک کائی سی جم رہی تھی اور یہ کائی اس روز بھی جب اس کی ملاقات کائے سے ہوئی۔ کالیا بھی اس کا بچپن ہی کا دوست تھا۔ نام تو اس کا یونس تھا لیکن اپنی رنگت کی وجہ سے اس کا نام کالیا مشہور ہو گیا تھا۔ ان دنوں کالیا کباڑیے کی دکان کر رہا تھا اور بہت خوشحال تھا۔ عبداللہ کہیں دکان کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ کائے نے اسے پہچان لیا۔

"یار عبداللہ اتنے دنوں سے کہاں تھے؟"

"میں کراچی میں تھا۔"

"کراچی میں!"

"ہاں یار، یونس کراچی میں تھا وہاں پروفیسر تھا اب ریٹائر ہو گیا ہوں۔"

"اور اب؟"

"اب یہیں راولپنڈی میں ہوں۔"

"تو پھر آج کل کیا کر رہے ہو؟"

یہ جملہ سُن کر پھر عبداللہ کے اندر ایک دھماکہ سا ہوا مگر اس بار وہ بکھرا نہیں، ٹوٹا پھوٹا بھی نہیں۔ یونس نے جس انداز اور جس لہجے میں یہ سوال پوچھا تھا وہ تو اپنے اندر ایک اور ہی جہان لیئے ہوئے تھا۔ یونس کے سوال میں نہ کوئی استہزا نہ تھا نہ کوئی اپنے اور عبداللہ کے تقابل کی کوئی کوشش تھی بلکہ اس کا لہجہ ایک اپنائیت کا رنگ لئے ہوئے تھا، عبداللہ کو وجدانی طور پر احساس ہوا جیسے یونس کہہ رہا ہو، یار عبداللہ اتنی مدت کے بعد آئے ہو اور وہ بھی ریٹائر ہو کر۔ تو اب کوئی پریشانی تو نہیں ہے، کوئی تنگی ترشی تو نہیں۔ دیکھو عبداللہ کوئی بات چھپانا نہیں، دل دُکھانے والی حرکت نہ کرنا۔

یونس کے لہجے کی اپنائیت اور سوز دردی نے عبداللہ کو ہرا بھرا کر دیا۔ اس کے ذہن پر جمی ہوئی کائی پھٹ گئی اور وہ ہلکا پھُلکا ہو گیا۔ اگر اس کی یونس سے ملاقات نہ ہوتی تو ایک جہانِ معنی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہی رہتا جو اب اوجھل نہیں رہا تھا۔ یہ یونس کا اس پہ احسان تھا اس کا احساس عبداللہ کو تو تھا لیکن یونس کو نہیں تھا۔

سنا ہس عبداللہ کو اس بات کا احساس ہو رہا تھا ایک انجانے طور پہ ہر ایک، ایک ہی سوال پوچھتے ہوئے، اپنی اوقات بتا رہا تھا، اور یہی تجربہ اس کے لئے کڑوا اور کسیلا تھا۔

ایک دن وہ گھر سے بال کٹوانے کے لئے نکلا تو اُسے کریم جان بہت یاد آیا اس کی دوکان کا نام بھی جان ہیر کٹنگ سیلون تھا اس نے برسوں بال یہیں کٹوائے تھے۔ کریم جان بال بہت عمدہ اور چہرے کی مناسبت سے کاٹتا تھا اُس سے بال کٹوانے والے اس سے بہت خوش رہتے تھے۔ جان کی دکان پہ پہنچ کر وہ دنگ رہ گیا اب وہاں کوئی ہیر کٹنگ سیلون نہیں تھا بلکہ نہایت اعلیٰ کراکری کی اعلیٰ دوکان تھی۔ تاہم اس کا مالک وہی کریم جان تھا اس کا چہرہ اور خوش پوشاکی اس کی خوشحالی کی گواہی دے رہے تھے دوکان میں لاکھوں روپے کا سامان تھا۔

عبداللہ کو کریم جان بڑے جوش و خروش سے ملا۔

عبداللہ صاحب میں دوبئی چلا گیا تھا اٹھارہ برس تک وہیں رہا اب تین برس سے یہاں ہوں، اور یہ دوکان کر لی ہے۔ دو مکان بھی بنا لئے ہیں، موٹر بھی خرید لی ہے۔ اگر آپ بھی دوبئی چلے گئے ہوتے تو بڑے مزے میں رہتے اور آپ آج کل کیا کر رہے ہیں؟ رہائش کہاں ہے؟ اسی مری روڈ والے مکان میں یا کوئی نیا مکان بنا لیا ہے؟ یاد پڑتا ہے کہ آپ تو شاید کراچی چلے گئے تھے، اب کیا کر رہے ہیں؟

کراکری والا کریم جان، استرے، قینچی کنگھی والے کریم جان سے بہت مختلف تھا اور عبداللہ محسوس کر رہا تھا، اُس کے سوال میں بھی عبداللہ کے لئے ایک طعنہ پوشیدہ تھا۔ اس کا ذائقہ عبداللہ کے لئے کوئی نئی چیز نہیں تھا اور جب وہ کریم جان سے مل کر رخصت ہوا تو وہ بور اور متأسف تھا۔ اُس وقت اُس نے تیز اور تلخ چائے پینے کی خواہش محسوس کی۔

ہوٹل میں اسے سیّد سلیم احمد مل گیا جو سی۔ ایس۔ پی تھا اور اپنی بے میل دیانت داری کے طفیل کسی محکمے میں بھی جم کر کام نہیں کر پایا تھا وہ سنکی یا قنوطی تو نہیں ہوا تھا تاہم متأسف ضرور تھا کہ اس کے ساتھ محکمہ در محکمہ ایک ہی جیسا سلوک ہوا تھا۔ محکمہ در محکمہ اس نے کرپشن کو روکنے کی اپنی سی کوشش کی تھی جو اسے بہت مہنگی پڑی تھی اور کرپٹ افسروں اور ماتحتوں نے اُلٹا اسی کا ناطقہ بند کر دیا تھا پھر بھی اسے کوئی بھی کرپٹ تو نہیں کر سکا تھا تاہم اس نے مٹھی بھر افراد کو کرپشن سے باز کر لیا تھا۔ اس نے عبداللہ سے پوچھا۔

"ہاں تو پروفیسر عبداللہ آج کل کیا کر رہے ہو؟"

سیّد سلیم احمد کا لہجہ بہت عجیب تھا عبداللہ نے محسوس کیا جیسے وہ کہہ رہا ہو۔

"عبداللہ! میں نے تو بہت کچھ کرنا تھا، بہت کچھ کر کے دیکھ لیا، کچھ بھی نہیں ہوا۔ کاش کچھ ہو جاتا تو میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت خیال کرتا تاہم فرض میں کوتاہی نہیں کی، تاہم تم کیا کر رہے ہو:"

اس لہجے نے عبداللہ کے ذہن پر طاری یبوست کو ختم کر دیا۔ سلیم احمد اسے ایک خوش قسمت مظلوم معلوم ہوا۔ اُس کی بُجھی ہوئی طبیعت میں ایک ترنگ آگئی۔ سلیم احمد نے اُسے "تم کیا کر رہے ہو" کے سوال کے سہارے، ایک نئی جہت سے روشناس کرا دیا تھا۔

عبداللہ نے محسوس کیا کہ اس پانچ لفظی سوال نے اسے ایک جامِ جمشید عنایت کر دیا ہے ایک ایسا جامِ جمشید جس میں وہ لوگوں کے باطن کی ایک جھلک دیکھ لیتا ہے، کوئی جھلک اسے بدمزہ کرتی ہے، کوئی جھلک اسے شاداں و فرحاں کرتی ہے کوئی جھلک اُسے کاٹنے کو دوڑتی ہے کوئی جھلک اسے ہوشیار کرتی ہے۔ اس جامِ جمشید میں وہ بہت کچھ دیکھ رہا تھا اور بہت کچھ سیکھ رہا تھا۔

ایک دن یہی جامِ جمشید دیکھتے دیکھتے نہ جانے عبداللہ کو کیا ہوا کہ عبداللہ کے جی میں بے اختیار آیا کہ اُن تمام لوگوں کو کہیں یکجا کرے اور پھر ان سے پوچھے۔

تم سب یہ کیا کر رہے ہو ؟
یہ تم سب کیا کر رہے ہو؟
تم سب یہ کیا کر رہے ہو؟

(فروری ۶۸۷)

وہ اک چراغ جو بامِ ہوا پہ رکھا ہے
ہمارے دل نے بھروسہ خدا پہ رکھا ہے
لبوں پہ حرفِ تمنا لکھا ہیں جانِ قبول
دیا امید کا دستِ دعا پہ رکھا ہے
دل و نظر کا زیاں تھا سو ٹال رکھا ہم نے
وضعداری کے غرضِ ہوا پہ رکھا ہے

عکس تحریر۔ عالمتاب تشنہ

# گمشدہ مسافروں کی گاڑی

احمد داؤد

گاڑی کسی وقت بھی اسٹیشن پر پہنچ سکتی ہے۔ تب مسافروں کا ہجوم منتظر لوگوں کی آنکھوں کو تسکین بخشے گا۔

منتظر آنکھیں سلاخوں سے باہر پھیلی بے ترتیب چھتوں کو ٹٹولتی ہیں۔ اندھیری رات میں وہ دھیا دھواں تیز سیٹی اور کتوں کی پکار آنے والے مسافروں کا ہراوّل دستہ ہے

منتظر آنکھیں سلاخوں کی قیدی ہیں اور کھلی کھڑکی سے آتی ہوا انہیں سہلاتی ہے۔ اُمید بندھاتی ہے، گلیاں سنسان، چوروں سے بے نیاز کر چور زمانے بیتے قرونِ وسطیٰ کے اندھیرے میں تحلیل ہوگئے ہیں اب چوروں کا دور نہیں کہ گھر خالی ہیں دلوں کی طرح، اجاڑ کارنس اور لفظوں کی تاثیر سے بے نیاز کتابوں کی طرح صرف انتظار کرتی آنکھیں ہیں جو اسٹیشن پر آنے والی گاڑی کی راہ میں پھیلی ہیں۔

وہ آنے والے مسافروں کا منتظر ہے

۔ بد وضع بڑے بڑے بکسے اٹھائے پگڑیوں والے ہچکنے باروں میں گرد چپسلنے ڈبوں میں چلم پیتے، نسوار کھاتے مسافر۔ سوٹ میں ملبوس شہری، خوبصورت بریف کیس اٹھائے کلائی سے بندھی نفیس گھڑی سے وقت دیکھتے بے وقتے مسافر، ٹائی کی شکن درست کرتے ہوئے بابو نیند میں مندھی آنکھیں اد تھکے جسم والی عورتیں جگراتے سے مجبور، یہاں ملاپ اور جدائی کے کردار آنے والے مسافر ہیں، جن کی راہ میں بچھا کھڑکی نے رنگتا سلاخوں سے پرے دیکھ رہا ہے۔

وہ سب اس کے پُراسرار شہر کے باسی ہیں۔!

اسٹیشن کافی دور ہے صرف اس کی نحیف بتیاں کسی بچھڑے ہوئے انجن کی چھک چھک یا کبھی کبھی سودا بیچنے والی کی آواز رات سیاہ گلیشیئر سے نمودار ہوتی ہے۔ تب منتظر آنکھوں کے سامنے جگنو چمکتے ہیں وہ انہیں پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہے اور آگے سلاخیں ہیں جن سے باہر اس کی کھلی ہتھیلیوں کے کناروں سے رات پھسل پھسل جاتی ہے۔

سنسان گلی میں ہوا کا ایک بوتا پھیرا آیا ہے، وہ آنے والے مسافروں سے توجہ ہٹا کر گلی میں جھانکتا ہے، دن بھر بچوں کے قدموں تلے رُندھی گلی سسکیاں بھر رہی ہے چاروں طرف کباڑ بکھرے پڑے تھے پھٹا ہوا فٹ بال ٹوٹی ہاکیاں کانچ کی گولیاں، پٹولے پلاسٹک کے ٹوٹے برتن اور اخبار کے تازہ ضمیمے ہوا کی رسی سے بندھے گلی میں کھڑکھڑاتے ہیں وہ ان کے دائرے میں جھومر ڈالتا، ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتا ہے سلاخوں سے جکڑی آنکھیں، ان باغوں کی تلاش میں ہیں جہاں اس کا بچپن گذرا،

کھلے میدان اور باغوں کے درخت کہاں گئے ــــ ؟ کس نے سوال کیا؟

میدانوں میں پلازہ اور مارکیٹیں بن گئی ہیں اور درخت فرنیچر کے کام ......

"بکواس مت کرو جواب دو"

یہ تابکاری اثرات کا کیا دھرا ہے "

ہوا میں تابکاری پھیل رہا ہے کھلی کھڑکی سے باہر نکلے ہاتھ کی کمزور ڈھلوانوں پر نیوٹرون جھول رہا ہے۔ کسی لمحے بھی دھماکہ ہو سکتا ہے اور مسافروں کو لانے والی گاڑی خالی آئے گی۔

" سنا ہے کہ نیوٹرون بم سے آدمی ختم ہو جاتا ہے باقی ہر شے سلامت رہتی ہے "

آدمی کے علاوہ باقی شے کیا ہے؟"

" باقی کانچ کی گڑیاں، پتلے، ٹوٹی ہاکیاں، اخبار کے ایڈیشن "

" تمہارا دماغ تو خراب نہیں بھلا اتنی آسانی سے نیوٹرون کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے "

اچھا بس ــ کوئی اور بات کرو "

اور بات تو آنے والے مسافر ہی کریں گے۔ اپنے گاؤں کی باتیں، گندم کی فصل کیسی رہی؟ دستو لوہار کی کھوتی نے کس کا کھیت خراب کیا، گاؤں میں کوئی ہیر پیدا ہوئی کہ نہیں۔

کہتے ہیں کہ جب کبھی ہیر کا ظہور ہوتا ہے تو ایک وارث شاہ جنم لیتا ہے۔

" ارے یار ــ اب تو ہیر جوانی سے پہلے ہی دفن کر دی جاتی ہے" اور وارث شاہ فلم کے گانے لکھتا ہے یا ہوٹلوں پہ پکھیاں مار کے چائے بناتا ہے۔

" واقعی "

" ہاں ہاں "

" تیری تو مت ماری گئی ہے کوئی اور بات کر "

کوئی اور بات تو آنے والے مسافر کریں گے "

سوٹ میں ملبوس خوبصورت چمکیلے چمڑے والے بریف کیس اٹھائے نفیس گھڑیوں سے ٹائم دیکھتے بانکے ناموں کے بوجھ تلے دبے بابو، پروموشن ڈیموشن کے قیدی پنشن خورے بوڑھی ہوتی بچیوں کے بابل، دن بھر کی خبروں سے خوفزدہ مسافر، بلند سے موندھی آنکھوں والے بچے، لڑتی بھڑتی عورتیں اپنے بچپن، اپنے پٹولوں کی باتیں سنائیں گی مگر کب ــ؟ گاڑی کب آئے گی! سلاخوں سے باہر پھیلی آنکھیں گاڑی کی تیز سیٹی پہ الارہ کھاتیں دھوئیں کے نرم ستونوں سے بغلگیر ہوتیں پٹڑیوں پہ بکھر جاتی ہیں۔

" ارے یار یہ تو مال گاڑی کی سیٹی ہے چلو واپس "

آنکھیں واپس سلاخوں کے اندر کمرے میں بیٹھے منتظر بشر کی پیشانی تلے دبک جاتی ہیں۔

" اوہو ــ یہ مال گاڑی سارا مال کہاں لے جاتی ہے آج کل تو لوگ کم سفر کرتے ہیں اور مال زیادہ سفر کرتا ہے "

بھئی مال باہر بھی تو جاتا ہے تجارت بھی کرنی ہوتی ہے نا دوسرے ملکوں سے۔

" واپس یہ ڈبے خالی آتے ہیں "

"نہیں یار — سوئیاں اور جہاز لاتے ہیں"

"گندم اور کپاہ دے کر"

"بالکل — یار جمائیاں مت لو یہ سٹیشن ہے تمہارا گھر نہیں۔ پولیس والے شبہ میں دھر لیں گے"

"یار گاڑی کب آئے گی میں تو بور ہو گیا ہوں"

"بس چپ چاپ بیٹھو — آ جائے گی"

سیٹی کی گونج اور اسٹیشن کے پتھریلے میلے فرش سے اٹھتی باتوں کی سیلن بوٹوں کی چاپ کے جلو میں اس تک آتی ہے۔ سلاخوں پہ زنگ لگاتی ہے۔ وہ ہاتھ اندر کر کے تھکی آنکھوں کو سہلاتا ہے اور بڑبڑاتا ہے — لوگ یہ لوگ آہستہ آہستہ دبی زبان میں گفتگو کیوں نہیں کرتے ان کی باتوں کے شور سے آنے والے مسافر تنگ ہوں گے۔

اس نے گہری سانس لے کر اسٹیشن کی طرف گھورا۔

"یار گاڑی کب آئے گی"

"تمہارے کسی مہمان نے آنا ہے"

"مہمان سے بھی زیادہ — ہاں اور بھائی آ رہی ہیں۔ مگر تم؟"

"میرے بھی اپنے آ رہے ہیں مسافر سارے ہی اپنے ہوتے ہیں۔ ارے ساڑھے چار بج گئے۔ چلو بابو سے پتہ کرتے ہیں گاڑی کا"

سلاخوں کے باہر پھیلی بے ترتیب چھتیں، دور پرے اسٹیشن کی بتیاں اور نیچے گلی میں ردی چیزوں کی بکھری ڈھیریاں نالیوں کے کنارے پڑی گندگی اور سحری کا ابھرتا ستارہ آنے والے مسافروں کا ہراول دستہ ہے، منڈیوں کی منڈیروں کے مزدور، ریڑھیوں اور دودھ والوں کی آوازیں اذان کی صدا اور کسی پرندے کی حمد، آنے والے وقت کا آئینہ ہیں۔

"اُف اللہ کتنی خاموشی ہے"

گاڑی جانے کے بعد اسٹیشن قبرستان کی طرح خاموش ہو جاتا ہے۔

"لیکن گاڑی تو ابھی آئی ہی نہیں۔ بابو کیا کہتا ہے"

"اسے خود پتہ نہیں اس کا اپنا بیٹا آ رہا ہے"

"گاڑی تو کئی گھنٹے لیٹ ہے"

"مگر اب تو صبح ہو رہی ہے۔ انتظار کریں یا چلیں"

"انتظار — میں تو کئی دن سے آ رہا ہوں"

"کیا مطلب — ؟"

"ہاں"

"میں خود — کئی دن — کئی رات — یار کہیں ہم — ؟"

"چپ رہو کل پھر آ جائیں گے"

سلاخوں سے باہر پھیلی چھتوں پہ بے اثر زخمی سحر کی دھمی سرخی پر پھیلاتی ہے، پرندوں کے واویلے اور جاگتے شہر کے لشت

پھر لوگوں کی حرکتوں کا شور، گلیاں آباد ہونے لگتی ہیں آواز کا ریوڑ اس کی جانب بڑھتا ہے۔ اسٹیشن پہ گاڑی کھڑی ہے اندر سے سامان باہر پھینکا جا رہا ہے۔ حقے جوتیاں ڈائجسٹ بستر بند اور پانی بھری صراحیاں مگر پانی پینے والے کہاں ہیں؟

پانی پینے والے کہاں ہیں؟

بیمار سنا ہے کہ نیٹرون کے استعمال سے ختم ہو جاتا ہے باقی ہر شے سلامت!

وہ سلاخوں کے خلا سے باہیں نکال کر پھیلاتا ہے، منتظر آنکھیں کھلے بازو اور ہتھیلیاں مسافروں کی تلاش میں ہیں۔

اگست ۸۰ء

میرے ساتھ ایک عجیب حادثہ متصادم ہے کہ میں
عملی طور پر انسانیت کی محبت میں شدت سے مبتلا ہوں
اور انسانیت کے شرف کے لئے بہت کچھ لکھتا ہوں۔ اس کے
دکھ درد کا برملا اظہار کرتا ہوں اور اس پر ہونے والے ظلم اور زیادتیوں
کے صرف احتجاج کرتا ہوں، لیکن آدمی مجھے اچھے نہیں لگتے۔ میرے
اردگرد رہنے بسنے والے لوگ، میرے دوست میرے بہن بھائی میرے
عزیز میرے ہمعصر، میں ان کو پسند نہیں کرتا اور ان پر کڑی
نکتہ چینی کرتا رہتا ہوں۔ جو انسان میرا ہم خیال نہیں وہ مجھے ایک
آنکھ نہیں بھاتا۔ جو میرا ہم خیال نہیں اس سے میں گفتگو کرنے پر
بھی آمادہ نہیں ہوتا ـــــ میں کیا کروں اور کس سے کہوں اور کون میری
دستگیری کرے کہ مجھے "انسانیت" سے، یعنی اس لفظ سے،
میرا مطلب ہے انسانیت کی ابسٹریکشن سے تو والہانہ عشق ہے
لیکن اس کی زندہ اکائیوں سے آڑے وقت میں میں ان کی کوئی مدد
نہیں کر سکتا۔ ان پڑھ، جاہل اور ناخواندہ انسان تو مجھے انسان
ہی نہیں لگتے اور میں میرلقی کی طرح ان سے بات کرنے کو بعض اوقات
خیال کرتا ہوں، اس پر بھی میں انسانیت سے ٹوٹ کر پیار کرتا
ہوں اور انسانیت کا جھنڈا لے کر چل رہا ہوں۔

اب میں اس تضاد سے نکل جانا چاہتا ہوں اور کوئی
میری مدد نہیں کرتا۔ ادھر باہر نکلنے کے سارے راستے بند ہیں
میں ادھر ہی انسانیت کی تجرید سے پیار کر کر کے ختم ہو رہا ہوں۔

اشفاق

عکس تحریر:- اشفاق احمد

# کاروانِ دل کا

[illegible] تبسم

قد، ملّاں کا بانس کی طرح لمبا، جسم کھپاچ کی طرح ڈیلا پتلا اور بید کی طرح لچکدار واقع ہوا تھا، رنگ سیاہ فام تارکول کی طرح چمکدار، چیچک کے داغ سارے چہرے پر پھیلے ہوئے پھلکی جیسی ناک، چھوٹی چھوٹی چتیاں جیسی آنکھیں، بڑے بڑے بسوڑے دانت اور موٹے موٹے ہونٹ رات برات بچے دیکھ لیں تو سچ مچ بھوت پریت سمجھ کر ڈر جائیں، عمر بھی ساٹھ کے آس پاس ہوگی آواز ایسی نحیف جیسے کوئی سات کنوؤں کے اندر سے بول رہا ہو اور چلتا یوں تھا کہ جیسے اب گرا کہ جب۔

ملّاں میرے بھنگی کا نام ہے جو روزانہ صبح صبح صفائی ستھرائی کے لیے صرف اس لئے آجاتا ہے کہ باورچن سے لڑ جھگڑ کر دو پیالے چائے پی لے بچے کھچے ٹوسٹ کے ٹکڑے اپنے پیٹ کے دوزخ میں بھرے اور اگر رات کا بچا کھچا دال سالن رکھا ہو تو اُسے بھی پیٹ کا ایندھن بنالے، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس چمرخی جسم میں اتنی چیزیں وہ کیونکر بھر لیتا ہے اور پھر بھی اس قدر نحیف و نزار ہے کہ دیکھ کر ڈر لگتا ہے کہ کہیں تیز ہوا کا جھونکا اُسے تنکے کی طرح اڑا کر نہ لے جائے، میں نے جب بھی اس اندیشے کا اظہار کیا ہے میری باورچن نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ "صاحب یہ کہیں اڑ کر جانے والا ہے گا نہیں کسی ڈش، پلیٹ یا پیالے میں پڑا ملے گا"

اصل میں میری باورچن شروع ہی سے ملّاں سے جلتی ہے۔ بہت دنوں تک تو وہ اس کوشش میں لگی رہی کہ اسے کسی طرح چلتا کردے اور اس کی جگہ اور کسی بھر تیلے بھنگی کو نوکر رکھوا دے کہ وہ تڑ پڑ اپنا کام کرے اور اپنا رستہ ناپے تاکہ میرے باورچی خانے کے باقیات الصالحات کی وہ بلاشرکتِ غیرے حق دار بن سکے میری باورچن ہے تو بڑے کلّے ٹھلّے کی تندرست و توانا عورت جو یہاں آنے سے پہلے متعدد غیرملکیوں کی کُک رہ چکی ہے مگر اب بیوگی کی زندگی جو پہاڑ کی طرح سخت ہے کاٹے نہیں کٹتی چونکہ اکلوتی لڑکی کے شوہر کے گھر ٹکڑے توڑنا پسند نہیں کرتی تھی اس لئے میرے پاس ملازمت کر رہی ہے، میری ہمیشہ سے یہی مرضی رہی ہے کہ ملّاں کو کچھ نہ کہا جائے بلکہ جو کچھ ہو سکے اس کے ساتھ نیک سلوک ضرور کیا جائے لہٰذا طوعاً و کرہاً وہ اسے برداشت کر رہی ہے۔

ملّاں کا طریقۂ کار یہ ہے کہ میرے بنگلے کا گیٹ کھلتے ہی فوراً گھر میں نازل ہو جاتا ہے۔ باورچن کا خیال ہے کہ وہ گیٹ سے لگا ہوا سو رہا ہوتا ہے، جیسے ہی دودھ آتا ہے۔ تو ملّاں آوازیں دے دے کر اور چیخ چیخ کر جھونپڑی میں سوئی ہوئی باورچن کو جگاتا ہے اور اخبار لئے ہوئے سیدھا میرے کمرے میں آتا ہے، اگر جاگ رہا ہو تو نہایت ادب سے مگر خوشامدانہ انداز میں "گڈ مارننگ" کہہ کر اپنے بانس جیسے قد کو رکوع کی حد تک جھکاتا ہے اور پچھلے قدموں چلتا ہوا کمرے کے باہر چلا جاتا ہے اور اخبار سائڈ ٹیبل پر رکھ دیتا ہے اگر میں سو رہا ہوں تو آواز پیدا کئے بغیر اخبار میز پر رکھ چلا جاتا ہے، کبھی کبھار جب میں برآمدے میں پڑی ہوئی آرام کرسی پر نیم دراز حالت میں پڑا ہوں تو قریب آکر زمین پر بیٹھ جاتا ہے اور دھیرے سے کہتا ہے۔

"صاحب جی، کیا بات ہے؟"

اگر میرے جواب میں ذرا بھی اشتفات پاتا ہے تو فوراً کوئی نہ کوئی ڈکھڑا لے کر بیٹھ جاتا ہے کبھی اپنی بستی کا کوئی تازہ واقعہ سناتا ہے تو کبھی سیاست میں ٹانگ اڑانے کے لئے بیٹھ جاتا ہے اس کی سیاست بازی سے کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ وہ باقاعدہ اخبار پڑھتا ہے۔ پڑھنے کے نام پر تو وہ الف کے نام بے بھی نہیں جانتا مگر اخباری تصاویر ضرور دیکھتا ہے اور جب دیکھتا ہے تو خوب غور سے دیکھتا ہے اور پھر اپنی سمجھ کے حساب سے رائے بھی ضرور قائم کرتا ہے مثلاً اگر کسی سیاست دان کی تصویر کے آس پاس کوئی کوریلے یا بن مانس کی تصویر نظر آ جائے تو ملاں یہ رائے قائم کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتا ہے کہ فلاں سیاست دان کو چیت کر دیا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فلم ایکٹرس کے آس پاس بن مانس کی تصویر ہو تو فوراً یہ نتیجہ اخذ کرلے گا کہ ایکٹرس آدم زاد کے جنگل سے نکل کر بن مانس کی محبت کی اسیر ہوگئی یا بن مانس نے ایکٹرس سے اظہارِ عشق کر دیا، عموماً اس قسم کی باتوں کا ذکر وہ میری باورچن سے کیا کرتا ہے جو بے حد زچ ہوتی ہے اور ہزاروں لعنتوں کے طوق ہمہ وقت ملاں کے گلے میں ڈالا کرتی ہے حد یہ ہے کہ کبھی کبھار اسی جھاڑو سے اُسے مارتی بھی ہے مگر ملاں پٹ پٹا کر یوں سیدھا ہو جاتا ہے جیسے کسی نے گرد جھاڑ دی ہو اور پھر اس سے توسٹ مکھن اور پنیر کے بچے کھچے ٹکڑوں کی فرمائش کرنے لگتا ہے۔

ملاں چھوٹی چھوٹی چوریوں پر یقین رکھتا ہے، مثلاً اگر بہت سی ریزگاری پڑی ہو تو سگریٹ بیڑی بھر کے پیسے چن لینا وہ اپنا حق سمجھتا ہے میرے سگریٹ کیس سے کبھی کبھار ایک آدھ سگریٹ اڑا لینا اس کے نزدیک کوئی جرم نہیں ہے مگر اس کے علاوہ آپ ہزار کیا لاکھ روپیہ بھی رکھ دیجئے کیا مجال کہ ملاں آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ لے، اصل میں ملاں بہت قناعت پسند واقع ہوا ہے۔ ہزار دو لاکھ کی کوئی گنتی اس کی لغات میں نہیں ہے ایک بار ایک نہایت پھوہڑ اور بدسلیقہ خاتون میری مہمان بنیں اور اپنی قیمتی سونے کی زنجیر باتھ روم کے ٹب کے پاس رکھ کر بھول گئیں اور سارے گھر کو سر پر اٹھا لیا، غریب کی جورو سب کی بھابھی سمجھ کر بے چارے ملاں پر بپھر گئیں اور اُسے خوب آڑے ہاتھوں لیا اور اس مبینہ چور پر جو جو مظالم توڑے جا سکتے تھے انہوں نے خوب خوب توڑے جب مجھے اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو بہت دُکھ ہوا، دُکھ اس کا نہیں ہو کہ زنجیر کھو گئی دُکھ اس کا ہوا کہ بے چارے ملاں کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا گیا تھا جب کہ سونے کی زنجیر کا کوئی مصرف اس کی لغت میں موجود ہی نہ تھا اور جب میں نے ملاں کی وکالت کی اور خاتون سے کہا کہ وہ خود سوچیں کہ وہ کہاں کہاں گئیں اور کیا کیا، کیا تو انہیں نہانے کا خیال آیا فوراً باتھ روم میں گئیں اور زنجیر اٹھا لائیں۔ اس بات کی تو ہماری باورچن بھی قائل ہے کہ ملاں چور نہیں ہے دغا باز ضرور ہے اور اس کی دغا بازی کھانے پینے کی بچی کھچی چیزوں ریزگاری کے پیسوں اور چند سگریٹوں تک محدود ہے۔

ملاں کے آگے پیچھے کوئی ہے نہیں، نہ شادی نہ بیاہ، نہ عشق نہ محبت، جورو نہ جاتا مشکل یہ ہے کہ اللہ میاں سے بھی کوئی اس کا ناطہ نہ تھا نہ اُسے مسجد میں دیکھا نہ اُسے مندر میں نہ بودھوں کے پگوڈا میں نہ سکھوں کے کلیسا میں حالانکہ اس کی بستی میں اور اس کی برادری میں مسیحی عقائد کے لوگوں کی ریل پیل ہے خود میری باورچن مسیحی ہے اور بات بے بات سینے پر کراس بنایا کرتی ہے یسوع مسیح کی قسمیں کھاتی ہے بائیبل کے حوالے دیتی ہے اتوار کو چرچ ضرور جاتی ہے گرجا میں کوئی سپیشل سروس ہو تو حتی الامکان ضرور پہنچتی ہے مگر ملاں کو مطلقاً کسی بات کا احساس بھی نہیں ہوتا، نہ احساسِ زیاں نہ خیالِ سود، بس وہ جس رو میں بہہ رہا ہے مزے سے بہہ رہا ہے۔۔۔۔۔ نے غم وزد نے غم کالا۔

کہتے ہیں ایک بار جوانی میں کوئی پادری ملّاں کو ولائت لے گیا تھا مگر وہاں بھی اللہ کے اس بندے کے شب و روز میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی اور نہ حالتِ زار میں موصوف نے ترمیم قبول فرمائی، جیسے گئے تھے ویسے ہی آ گئے جیسے سوکھے ساون ویسے ہرے بھادوں ۔

خرِ عیسیٰ اگر بمکہ رود، چو بیاید ہنوز خر باشد

کی ضرب المثل غالباً موصوف کے لیے وضع ہوئی ہے وضعداری میں مطلقاً فرق نہ آیا نہ لگا لوگوں نے ایک صبح اچانک یہ دریافت کیا کہ موصوف اپنی بستی میں مزے سے بیٹھے رہے ہیں۔ پتہ ایوچھا کب آئے کیسے آئے کوئی جواب نہیں غالباً ملّاں جب گیا تھا تب بھی وہ کب گیا تھا، کوئی اس کا جسم لے گیا تھا سو وہ جسم بھی روح سمیت واپس آ گیا، جیسے بچھڑا ہوا بچہ ماں کی آغوش میں پہنچ کر چین محسوس کرتا ہے اسی طرح بستی میں واپس پہنچ کر یہی احساس اسے بھی ہوا تھا موصوف پادری کے ساتھ چونکہ رہے تھے۔ لہٰذا کچھ ناقص فقرے انگریزی کے چن لائے تھے وہی وقتاً فوقتاً استعمال کر لیا کرتے تھے جتنی ضرورت کفایت کی تھی اتنے ہی گنتی کے لفظ بولتے تھے۔ پادری غریب کو جانے ان حضرت کے بارے میں کیا مغالطہ ہوا تھا اور کس لمحے یہ کشف ہوا تھا کہ آپ بھی کچھ صاحبِ کرامت ہیں کیونکہ سوچ کا استغراق، دنیا سے بے نیازی اور دنیا والوں کی طرف سے کم التفاتی ہر کس و ناکس میں کہاں پائی جاتی ہے مگر جب موصوف کے شب و روز کا اس کے قریب سے مطالعہ کیا ہوگا تو پتہ چلا کہ یہ بے حسی ہے جو موصوف کا فطری جوہر ہے۔ اسی بے حسی نے اُسے ان دیہاروں پہنچایا تھا۔

میں ملّاں کو جب کبھی روپے ڈیڑھ روپے کی ریزگاری پکڑا دیتا اور ایک آدھ سگریٹ دے دیتا تو بس اس کی عید ہو جاتی آس پاس کہیں میرے قدموں میں بیٹھ کر پاؤں دابنے اور قدم گرگی کے طرآرے بھرنے لگتا، اس کے ہاتھوں میں وہ قوت آ جاتی کہ ناقابلِ بیان تھی، بلکہ یوں سمجھئے کہ ان ہاتھوں کے لمس کی زبان اس کے دلی انبساط و نشاط کی کیفیات مجھ پر آشکار کر دیتی۔ مجھے یقین ہے کہ ایسے کسی لمحے کے حصول کے لیے اگر میں ملّاں کو ہزاروں اور لاکھوں روپیہ بھی دے دوں تو وہ کوڑے کا ڈھیر سمجھ کر لات مار دے گا، کیونکہ ہزار اور لاکھ کی متاع اس کے لئے بے معنی ہے۔ فی زمانہ یقین نہیں آتا کہ ایسے لوگ بھی پیدا ہو سکتے ہیں کہ ایسے بے نیاز ہیں، مگر اس بے نیازی میں عدم واقفیت کا عنصر بھی شامل ہے۔ بے نفسی کا بھی اور قناعت کا بھی۔

ایک روز باتوں باتوں میں میں نے ملّاں سے پوچھا، "تو نے کبھی محبت بھی کی ہے۔"

ملّاں بہت شرمایا، مگر آنکھوں میں چمک ایک لمحے کو آ کر غائب ہو گئی اور اس نے اقرار میں گردن ہلا دی، جب میں نے محبت کی داستان سننے کا شوق ظاہر کیا تو اس کی آنکھوں میں مٹیالے اور کیچڑ زدہ آنسو آ کر ٹھہر گئے اور پھر کچھ کہے سنے بغیر وہ چلا گیا باورچن نے بہتیرا پکارا، رات کے سالن اور ناشتے کے ٹوسٹ اور مکھن کا مژدہ بھی سنایا، مگر ملّاں نے پلٹ کر رسید بھی نہ دی۔ باورچن کو بہت حیرت ہوئی میرے پاس آ کر بولی، کیا بات ہے سر، کیا آپ نے ملّاں کو نوکری سے جواب دے دیا؟

"نہیں تو،" میں نے اس کی حیرت میں اور بھی اضافہ کر دیا تو باورچن خود کلامی کے انداز میں بولی۔

"پھر کیا بات ہے، ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ ملّاں ٹوسٹ اور مکھن کو یوں چھوڑ کر چلا گیا ہو۔"

باورچن کے اس طرح سپر انداختہ ہونے سے محظوظ ہو کر میں نے خوش دلی سے ایک سوال داغا۔

"تم نے کبھی محبت کی ہے؟"

"یس سر،" ادھیڑ عمر کی باورچن یکدم گھبرا گئی، جلدی سے سینے پر کراس بنا کر کنفیشن کے انداز میں بولی: "کی ہے سر۔"

میں نے کہا "یہ سوال میں نے ملّاں سے کیا تھا جس کے جواب میں وہ رو دیا اور روتا ہوا چلا گیا۔"

"ہائے! وہ تلملا کر بولی، "چوٹ کھایا ہوا ہے شاید سر - بے چارہ چہ چہ چہ!"

اس واقعے کے بعد پھر کبھی میں نے تو ملّاں سے اس موضوع پر بات کی اور نہ اسے زچ کیا۔ کچھ دنوں سے ملّاں کچھ کھویا کھویا سا رہتا تھا ایک غیر ملکی خاندان کا ذکرِ خیر بڑے جوش و خروش سے کیا کرتا تھا، اچانک ملّا کے چہرے پر فکر و تردد کے جو نشانات پیدا ہوئے تھے غائب ہوگئے اور ان کی جگہ ایک فرح ناک طمانیت اور آسودگی نے لے لی۔ یہ کوئی معمولی بات تو نہ تھی ملّاں کی زندگی کا غیر معمولی حادثہ تھا جس کی بجا طور پر مجھے کھوج ہوتی، مگر میں اس بات میں کمال احتیاط سے کام لے رہا تھا کہ مبادا کوئی بات ملّاں کے مزاج کے خلاف نہ گزرے اس کے ساتھ ہی ایک تغیّر اور بھی ہوا کہ میری بادرچن یوں تو جب کبھی ٹوسٹ مکھن دیتی ملّاں بھوکوں کی طرح ٹوٹ پڑتا مگر اب ٹوسٹ اور مکھن لے کر فوراً باہر چلا جاتا۔ یہ دونوں باتیں کوئی معمولی نوعیت کی باتیں نہ تھیں ایک روز میں پائپ میں تمباکو بھر رہا تھا اور آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر مزے سے تمباکو نوشی کا لطف اٹھانا چاہتا تھا کہ میں نے ٹوسٹ اور مکھن لئے ہوئے ملّاں کو باہر لپکتے ہوئے دیکھا، پھر۔۔۔ میں گیٹ سے کھٹ سے وہ باہر ہوگیا۔ میں بھی دبے پاؤں گیا اور گیٹ کے پاس کھڑا ہوگیا، باہر دیکھا تو ایک ریشمی پپّی مزے سے مکھن اور ٹوسٹ اڑا رہا تھا اور دم ہلا رہا تھا اور ملّاں مزے سے اُسے یوں تک رہا تھا جیسے ماں دن بھر کے تھکے ماندے بچے کو کھانا کھلا کر پنکھا جھل کر آسودگی محسوس کرتی ہے، میں دبے پاؤں چلا آیا اور ملّاں کو خبر نہ ہونے دی۔

کچھ روز کے بعد میں نے ملّاں سے کہا۔ مجھے ایک خوبصورت ریشمی پپّی کی ضرورت ہے تمہیں کچھ معلوم ہو تو بتانا۔ ملّاں نے ہاں یا نہ میں کوئی جواب نہ دیا چپکا اٹھا اور باہر نکل گیا، دبے پاؤں باہر گیا، دیکھا تو ملّاں ریشمی پپّی کو دبوچ کر اور بھینچ بھینچ کر پیار کر رہا ہے اور اسی طرح دبوچے دبوچے اسے لے جانے لگا جیسے یہی اس کی واحد متاع ہو اور جیسے اس پر میں ڈاکہ ڈالنے چلا ہوں، معاً اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو وہ سہم گیا، "نہیں نہیں، صاحب جی یہ پپّی میں آپ کو نہیں دے سکتا" اور وہ جس قدر تیزی سے دوڑ لگا سکتا تھا اس نے لگا دی اور رفو چکر ہوگیا۔

مگر دوسرے دن، میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب برآمدے میں پپّی مزے سے دُم ہلا رہا تھا اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کر رہا تھا البتہ ملّاں کا کہیں دور دور تک پتہ نہ تھا میں نے بادرچن کے ذریعے اِدھر اُدھر معلوم کرایا مگر بے سود، معاً میری نگاہ پنیری کے پچھواڑے پڑی، ملّاں بیٹھا رو رہا تھا، مجھے دیکھ کر اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور میرے قدموں میں ڈھیر ہو کر سسکیاں بھرنے لگا۔

"مجھے معاف کر دیں صاحب جی مجھے معاف کر دیں، میں نے پپّی کو دینے سے انکار کیا تھا آپ تو میرے مائی باپ ہیں۔ آپ کے گھر تو یہ پپّی سب سے زیادہ خوش رہ سکتا ہے ٹوسٹ مکھن دودھ دہی پنیر گوشت سب کچھ کھا سکتا ہے میرے پاس کیا ہے میں خود آپ کے در کا کتا ہوں اپنا پیٹ کاٹ کر کب تک کھلاؤں گا؟"

میں نے اُسے اپنے قدموں سے اٹھایا، تو وہ بلک بلک کر اور تڑپ تڑپ کر رو رہا تھا، اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں میں نے کہا،

"ملّاں تم بھی میرے رہوگے اور پپّی تمہارے پاس رہے گا۔"

وہ بولا، "صاحب جی، آپ کو پتہ نہیں، پپّی کو میں نے بچایا ہے۔ اسے گولی ماردی گئی تھی، میں اُسے چُرا لایا؟" وہ پپّی کے قریب بیٹھ گیا اور اپنے کالے کلوٹے موٹے موٹے بھدے ہاتھ کی انگلیوں کو اس کے نرم نرم سپید سپید برف جیسے رُوئیں کے ریشم میں ڈبو دیا ننھے منے کتے کے سُرخ سُرخ منہ سے زبان باہر نکلی اور اس ہاتھ کو محبت سے چاٹنے لگی جس میں زندگی کا پیغام موجود تھا، کتے کے اس اظہارِ تشکر کو سمجھ کر دوسرے ہاتھ سے اس کے منہ کو اوپر اٹھا کر ملّاں بولا، اس کی آنکھوں کو دیکھیں صاحب جی۔ کتنی خوبصورت ہیں،

پتہ ہے صاحب جی! اس کے مالک مالکن ولایت واپس جا رہے تھے صاحب میم صاحب سے بولا کل بچی کو گولی مارنا ہے، یہ کمبخت تو ہمارے پاس بھی رہتا ہے بس جی، میں نے اُسے رات چرا لیا۔"

"تم نے اچھا کیا ملّاں، ایک قیمتی جان بچائی۔"

"کیسے ہوتے ہیں یہ لوگ صاحب جی، جب تک جی چاہا، پیار کیا، جی بھر گیا تو گولی مار دی۔"

"خود غرض، مطلبی اور بیوقوف" میں نے کہا اور باورچن کو بلا کر دودھ منگا کر اپنے ہاتھ سے بچی کو پلایا، جاتے وقت ملّاں کے ساتھ بچی کو روانہ کر دیا۔ دوسرے روز سے ملّاں اور بچی دونوں میرے گھر ساتھ ساتھ آنے لگے اور میرے پس خوردہ راشن پر گذر بسر کرنے لگے اور مگن رہنے لگے مگر چرخِ کج رفتار غریب ملّاں کی اتنی خوشی بھی دیکھ نہ سکا، ایک رات جب ملّاں اپنے گھر میں سویا ہوا تھا اس ننھی منی خوبصورت سی جان کو کوئی چرا کر لے گیا بہت دنوں تک ملّاں دیوانوں کی طرح بچی کو تلاش کرتا رہا، شہر کے کوچے کوچے کو چھان ڈالا، بستی بستی کو کھنگال ڈالا مگر گم ہونے والی چیزیں کہاں ملا کرتی ہیں بے چارہ صبر و شکر کر کے بیٹھ رہا اور سابقہ معمول کے مطابق زندگی گذارنے لگا۔ البتہ کبھی کبھار بچی کو خواب میں دیکھتا تو اس کا ذکر مجھ سے یا میری باورچن سے ضرور کرتا، اور غالباً ہماری تواضع کا تقاضا یہی تھا کہ ان خوابوں کو سکون اور دلجمعی سے سن کر یا تو خاموش ہو جائیں اور یا ایک آدھ کلمۂ خیر کہہ دیں کہ زخم پر مرہم کا کام کرے۔

کہتے ہیں کہ وقت بڑے سے بڑے اور گہرے سے گہرے زخم کو بھی مندمل کر دیتا ہے۔ بچی کی جدائی کا زخم بھی بھرنے لگا۔ یا یوں سمجھئے کہ زندگی کی نت نئی مصروفیتیں اور دلچسپیاں کچھ اس طرح پے در پے پیدا ہونے لگیں کہ بچی کا تصور ماند پڑنے لگا یوں بھی ملّاں کچھ ایسا نرم دل اور رقیق القلب واقع ہوا تھا کہ کوئی نہ کوئی اُلجھن کوئی نہ کوئی واقعہ اسے اپنی طرف ضرور کھینچ لیتا، چنانچہ میرے پڑوس میں ایک ملک سے ہجرت کر کے آنے والا خاندان ملّاں کی دلچسپی کا مرکز بن گیا جس ملک سے اس کنبے نے ہجرت کی تھی وہاں ایک غیر ملکی طاقت کے اشارے پر خونیں ڈراما کھیلا گیا۔ ہزارہا افراد مارے گئے سینکڑوں گھر جل کر خاکستر ہو گئے بستیاں بمباری سے مسمار ہو گئیں کتنی مائیں بچوں سے محروم ہو گئیں کتنے بچے ماں باپ کے پیار سے محروم ہو گئے کتنی سہاگنیں اپنے شوہروں سے سدا کے لئے جدا کر دی گئیں۔ ملّاں ان غمزدہ لوگوں کی زبان نہیں سمجھتا تھا، ہر ایک کا منہ تکا کرتا تھا مگر بہتے ہوئے آنسوؤں اور رستے ہوئے زخموں کی صرف ایک ہی زبان ہوتی ہے جسے دُکھے ہوئے دل خوب سمجھتے ہیں ان بلا کشوں کا صرف اتنا قصور تھا کہ انہیں اپنی ہی آبائی بستیوں سے بے دخل کیا گیا تھا، انہیں امن پسندوں کے درمیان رخنہ قرار دیا گیا تھا۔ ملّاں فوراً ان کا ہمدرد بن گیا اور تن من دھن سے ان کی خدمت بجا لانے لگا، اس تندہی سے کام کرنے کے سبب میرے کاموں سے غفلت اور کوتاہی بھی برتنے لگا جس پر مجھے دُکھ تو ہوتا مگر اس کی افتادِ طبع کو سمجھ کر صبر کرنا پڑتا خیال تھا کہ جلد یہ بھوت ملّاں کے سر سے اس کنبے کا بھوت بھی اتر جائے گا اور پھر اپنے معمول کے مطابق وہ سارے کام انجام دینے لگے گا مگر ایک صبح میری باورچن نے اچانک یہ دریافت کیا کہ ملّاں بنگلے کے گیٹ پر اونگھنے کے بجائے لفٹ رائٹ کر رہا ہے اور فوجی انداز سے پریڈ کے قواعد بجا لا رہا ہے۔ بے چاری سمجھی کہ پاگل ہو گیا ہے دوڑی دوڑی میرے پاس آئی اور بولی "سر ملّاں تو پاگل ہو گیا، وہ تو پریڈ کر رہا ہے" میں نے جا کر دیکھا تو سچ مچ اس ہڈیوں کے ڈھانچے میں جو نیا جوش و خروش اور نیا ولولہ دوڑ رہا تھا اور خود وہ نئے پناہ گزین پڑوسی کے اس کے حرکات و سکنات دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے پناہ گزین کنبے میں ایک تو ادھیڑ عمر ماں تھی جو دن بھر کام کاج میں جتی رہتی تھی دو نوجوان لڑکے تھے زید اور خالد ایک نوجوان لڑکی تھی لبنیٰ، اپنے خالی اوقات میں تینوں کے تینوں فوجی مشقوں کی تربیت حاصل کرتے تھے۔ اور جن جن داؤ پیچ کی مجاہدوں کو ضرورت ہوتی وہ سب داؤں ایک دوسرے کو سکھاتے تھے انہیں دیکھ دیکھ کر ملّاں پہ یہ رنگ چڑھا تھا چنانچہ اپنے ہی گُر ملّاں کو

کرتے دیکھ کر وہ اسے مسخرہ سمجھ کر ہنس رہے تھے جب جوش ٹھنڈا ہوا اور باورچن کے پاس آکر پس خوردہ طلب کیا تو وہ ہنس کر بولی، کیا تو بھی جنگ کرنے جارہا ہے!

ملّاں بولا "ہاں جارہا ہوں!"

ایک روز مجھے مطالعے میں مستغرق پاکر دبے پاؤں میرے پاس آیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا ــــــ "صاحب جی یہ فلسطین کہاں ہے۔"

ملّاں نے فلسطین کے بارے میں شاید زندگی بھر کچھ نہ سنا تھا نہ اس کے جغرافیہ کی خبر تھی اور نہ اس کی تاریخ سے واقف تھا جب میں نے مختصراً سمجھایا تو اس پناہ گزین کنبے کے بارے میں سارے واقعات اور معاملات اس کے ذہن میں آئینہ ہوگئے اور اسی کے ساتھ ساتھ محاذِ جنگ پر جانا چاہتا تھا۔ اس بات کا اظہار اس نے اشاروں سے کیا بھی، بار بار کیا مگر ہر بار وہ تینوں کے تینوں اس کے حرکات و سکنات مسخرے پن کے سوا اور کچھ نہ سمجھ سکے ایک رات اچانک وہ تینوں غائب ہوگئے اور اپنے مشن پر خفیہ طور پر روانہ ہوگئے جس کا بہرحال اندازہ کیا جا سکتا تھا، مگر ملّاں کو جب اُن کے چلے جانے کا علم ہوا تو روتا پیٹتا سوا کنبے کی بزرگ خاتون کے قدموں میں جاکر ڈھیر ہوگیا، میری باورچن کا بیان ہے کہ جب اُسے قدموں سے اُٹھایا گیا تو اس کی روح اپنے قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

(جولائی ۱۹۷۰ء)

لکھا ہے خزاں کا عہد نامہ
اک اک ورقِ گلاب پڑھ لے

یوں غور سے چھت نہ دیکھ محسن
اچھی سی کوئی کتاب پڑھ لے

عکسِ تحریر:- محسن احسان

# دھوپ چہرہ

مرزا حامد بیگ

شام اُداس ہے۔

شروع نومبر کی بلاوجہ اُداس اور اکیلا کر دینے والی شام۔

کچھ دیر پہلے میں بستر میں اُونگھ گیا تھا۔ نیم روشن کمرے میں لیٹے ہوئے میرا چہرہ مغرب کی سمت کھلنے والی کھڑکی کی جانب تھا۔ میں جب اٹھا ہوں تو اُس سرمئی اُداسی نے اپنا بھرپور وار کیا ہے۔

میرے دروازے پر گرے ہوئے سوکھے پتوں کے ڈھیر لگے ہیں اور دروازے سے لپٹی ہوئی بیلیں چار جانب سے بڑھتی چلی آتی ہیں۔

میں ایک مدت سے اس کمرے میں اکیلا ہی ہوں لیکن اس اکیلے پن میں کئی سالوں بعد ایسی ہی کوئی شام اُداس کر جاتی ہے۔

سبھی شام کا کچھ ٹھیک نہیں۔ معمول کے دنوں میں یکایک جانے کب اس کھڑکی تک آ جائے۔ آج پھر یہی کچھ ہوا۔

میں بستر پہ اُونگھ گیا تھا اور جب جاگا ہوں تو کمرے کی کھڑکی میں یہ شام جھکی ہوئی تھی۔ میں اداس اور اکیلا، کھڑکی کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔

اب میرا چہرہ اس کھڑکی میں جمی ہوئی اُداس خنک شام کو چھو رہا ہے۔

باہر صحن میں کوئی نہیں اور یہ پاگل ہوا جانے کہاں سے اتنے پتے اڑا کر لے آئی ہے۔ میں کھڑکی کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوں

یہ سب بلاوجہ ہے، یا محض اس وجہ سے کہ میں بستر پر اُونگھ گیا تھا اور لیٹے ہوئے میرا چہرہ مغرب کی سمت کھلنے والی کھڑکی کی جانب رہ گیا تھا۔

یہ دن بھی کچھ ایسے ہیں اور وہ جنونی ہوا، جو خاموش صحن میں چکر کھا رہی ہے یا ایک وجہ اور ہے:

لیکن یہ ان دنوں کی بات ہے جب موسموں کا گزرتے ہوئے وقت کا، اور اس جنونی ہوا کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ میری ان سے شناسائی اس کھڑکی میں جھکی ہوئی شام نے کروائی ہے۔

وہ میرا لڑکپن تھا اور یہ کمرہ ——

اس سامنے والے دروازے پہ چق پڑی تھی، اور صحن خاموش تھا اور ایسی ہی اداسی ہر طرف پھیل گئی تھی۔

یہی دن تھے، ہوا میں خنکی بڑھی ہوئی تھی اور میں نے اپنے نیچے سے دوسوتی کھینچ کر اپنے شانوں پہ ڈال لی تھی۔

ناگاہ دروازے کی چق پہ زور پڑا تھا، اور جب میں نے گھوم کر دیکھا ہے تو وہ کھڑی تھی۔ اُس نے دونوں بازو دروازے کی چوکھٹ تک پھیلا رکھے تھے اور چق کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔

وہ بہت دنوں بعد نظر آئی تھی۔ صحن میں کوئی نہیں تھا اور میں کمرے میں اداسی کا پھیلاؤ دیکھ رہا تھا۔

"جانی، مجھے اندر بلا لو۔"

اس نے اسی طرح کھڑے کھڑے آہستہ سے کہا، اور میں اُسے تکتا رہ گیا۔

ہم دونوں ایک مدت سے، سب سے چھپ کر، گلیوں میں دیواروں اور دروازوں کے پیچھے دن میں کئی کئی بار ملتے رہے تھے۔

اور وہ مجھے دیکھ کر جی رہی تھی۔ یہ اُس نے کہا تھا۔

وہ دیوانوں کی طرح ملتی تھی۔ بس چلی آتی تھی، بلا جھجک، سب سے بچ بچا کر اور میں حیران رہ جاتا تھا۔

وہ حیران کر دینا جانتی تھی اور میں ہمیشہ اُسے تکتا رہ جاتا۔

وہ چق کے پیچھے کھڑی تھی، ہوا کے ساتھ اُس کے سوکھے سیاہ بال اُڑ رہے تھے اور اُس کے اُٹھے ہوئے دونوں بازو دروازے کی چوکھٹ تک پھیلے ہوئے تھے۔

میں دروازے تک آیا۔

"جانی"

اُس نے پھر کہا! اور اُس نے اوپر اُٹھے ہوئے دونوں بازو چھوڑ دیئے۔ وہ میرے گلے میں جھول گئی تھی۔ اُس نے اپنا چہرہ جھکا رکھا تھا اور وہ ہلکے ہلکے کانپ رہی تھی۔ میں نے اس کا چہرہ اوپر اُٹھایا۔

اُس کے چہرے پر، اس کے کانپتے ہوئے بازوؤں پر زردی پھیلی ہوئی تھی۔

"جان، دیکھو ـــــ اس شام کو کیا ہو گیا ہے۔"

اس کی آواز بہت دور سے آئی ـــــ پھر اس کے ہونٹ دھیرے دھیرے ہلتے رہے۔

اس شام ہوا میں خنکی بڑھی ہوئی تھی اور اس کے پاؤں میں کچھ نہیں تھا۔ وہ بہت دیر تک میرے دونوں شانوں سے نیچے آئی ہوئی بانہوں کے سہارے کانپتی رہی تھی، پھر اس نے کہا تھا:

"جانی، میں چھپ جاؤں گی، تم مجھے ڈھونڈنا"

میں چپ کھڑا رہا تھا۔

وہ دھیرے دھیرے پیچھے ہٹنے لگی اور اس نے کہا،

"چلو ایک دوسرے کو تلاش کریں ــ تم میرے دل میں چھپنا، میں تمہیں بہت جلد ڈھونڈ لوں گی۔"

میں چپ اُسے تکتا رہا۔ میں اُس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ اتنی جلدی کیوں کر رہی ہے۔

وہ مجھ سے بہت چھوٹی تھی، جبکہ میں سترہ برس کا تھا۔ میرا کالج میں پہلا سال تھا اور امتحانات ہو رہے تھے۔

اور وہ مجھ سے چھپ گئی۔ میں نے اُسے چھپنے کو دل میں جگہ نہیں دی تھی اور باہر ڈھونڈنا بہت دشوار تھا۔

وہ کہیں اور چلی گئی تھی اور میں نے اُسے ڈھونڈنا نہیں چاہا۔ بس میں اسے مل لیتا تھا اور اس کی باتوں کے جواب میں چپ رہتا تھا!

اور میرے امتحانات ہو رہے تھے۔

میں اُسے بھول گیا، میرے دروازے پر پتوں کے ڈھیر لگتے گئے اور میں مغرب کی سمت چہرہ کئے اُونگھتا رہا۔

ایک دن، جبکہ میں اُسے پوری طرح بھول چکا تھا، ایسی شام کو۔ ۔ ۔ ۔

میں نے آپ کو بتایا، کہ ایسی شام کا کچھ ٹھیک نہیں۔

اس روز بھی یہی ہوا، میں بستر پر اُونگھ گیا تھا اور جب آنکھ کھلی ہے تو صحن کے بچھے ہوئے پتوں پر سہج سہج قدم دھرتا، کوئی چل رہا تھا۔ پھر وہ میرے کمرے کی طرف آیا۔ اس وقت تک میں پوری طرح جاگ گیا تھا۔

میں نے دیکھا کہ چق کے پیچھے، ایک سایا جھجکتا ہوا، ٹھہر ٹھہر کر آگے بڑھا اور چق کے ساتھ جُڑ کر کھڑا ہو گیا پھر اس نے اسی طرح کھڑے کھڑے سرگوشی کی،

"مجھے پہچانا؟"

لیکن میں تو سب کچھ بھول چکا تھا۔

اور اگر میں بھولا نہیں تھا تو، جو میرے سامنے کھڑی تھی، کون تھی؟

میں نے بہت سوچا،

لیکن وہ تو مجھ سے بہت چھوٹی تھی اور جو مجھ سے اتنی چھوٹی ہو، اتنی جلدی بوڑھی کیسے ہو سکتی ہے۔

میں دروازے تک آیا

یہ جو میرے سامنے تھی، اس کے سامنے کے دانت بھی کم تھے یا شاید مجھے ایسا محسوس ہوا تھا اس کی آنکھیں ویسی کالی نہیں تھیں، ان میں سفیدی اُتر آئی تھی۔

مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

سامنے کھڑکی میں ٹھٹکی ہوئی شام اندر بہتی ہوئی ہر طرف بھر گئی تھی۔

میں نے دیکھا کہ وہ کھڑی ہوئی دھیرے دھیرے کانپ رہی ہے۔

اس کے پاؤں میں کچھ نہیں تھا۔

بس یہی دن تھے۔ ہوا میں خنکی بڑھی ہوئی تھی۔

میں نے اپنے نیچے سے دوسوتی کھینچ کر اس کے شانوں پر ڈال دی۔

میں نے دیکھا کہ وہ دعائیں دے رہی ہے۔ میں نے اسے بیٹھنے کو کہا لیکن وہ اسی طرح کھڑی کانپتی رہی۔

اس کے شانوں سے نیچے آتی ہوئی باہیں کانپ رہی تھیں۔

میں نے اس سے پوچھا کہ اُسے کیا ہو گیا ہے۔

وہ بوڑھی ہو گئی ہے۔

اس کی آنکھیں ویسی کالی نہیں ہیں یا شاید وہ مجھ سے چھپ گئی تھی، تا کہ میں اُسے ڈھونڈوں۔

میں نے اُس سے کہا "کوئی بات کرو۔"

اس کے ہونٹ دیر تک کانپتے رہے پھر بولی،

"باہر بہت تیز دھوپ ہے۔"

میں اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کھڑکی کی جانب گھوم گیا ، جہاں سے خنک شام بہتی ہوئی ندر آرہی تھی ۔

"تم نے مجھے پہچانا ؟" اس کی آواز دُور سے آئی ۔

پھر وہ اپنے شانوں سے نیچے آتی ہوئی دوسوتی سنبھالتی ، مجھے دعائیں دیتی صحن میں نکل گئی ۔

میں نے کہا ناکر وہ حیران کر دینا جانتی تھی ۔

صحن میں جہاں کچھ نظر نہیں آرہا تھا ، جنونی ہوا ، اُسے جانے کہاں سے کھینچ لائی تھی ۔

صحن میں وہ ایک لمحے کے لئے ٹھہری اور پھر دروازے سے لپٹی ہوئی بیلوں کو احتیاط سے ہٹاتی ہوئی باہر نکل گئی ۔

وہ ایسی ہی ایک خنک شام تھی اور میرے دروازے پر گرتے ہوئے پتوں کے ڈھیر لگ رہے تھے ۔

(جولائی ۷۸ء)

تحقیق کی بنیادی شرط میلانِ طبع ہے ۔ لگن ، محنت ، وسعتِ مطالعہ ، ماخذ پر مضبوط گرفت وغیرہ تحقیق کی اضافی خوبیاں ہیں ، لیکن طبعی میلان کے بغیر یہ خوبیاں بے معنی ہیں ۔

محمد اکرام چغتائی

پچاس سالہ مخزن

عکس تحریر :— محمد اکرام چغتائی

# سائبان کا قرض

تاج رئیسانی

نیند میں گزرے لمحوں کی مدت کا احساس کسی خواب آور دھند کی طرح اُس کے روئیں روئیں میں پھر سے جاگنے کی خواہش اُکسانے لگا تھا مگر رات بھر گہرے خمار میں ڈوبا ہوا بہی ایئر کنڈیشنڈ گاڑی کی آرام دہ سیٹ پہ سوتے سوتے بھی وہ تھک چکا تھا۔ جاگتے ہی اُس کے ذہن میں پڑاؤ ڈالے خانہ بدوش سی سوچوں کے قافلے میں ایک بے ترتیب سی بے تابی جیسے دوڑ گئی۔ اُسے یاد آیا قبیلیوں کے کھنڈر سے جسموں پہ صدیوں پُرانی تہذیب اُسی حالت میں جیسے منجمد سی تھی۔ اُسے ایک لمحے کو ترس آیا تو اس نے سوچا تہذیب کا صدیوں کسی ایک نقطہ پر دانستہ منجمد کر دینا بھی قیامت کی نشانیوں میں سے ایک ہونا چاہیئے تھا۔ خانہ بدوشوں کے کم سن چرواہے کے قحط زدہ مویشیوں کی بھوکی نظریں خزاں کی برفانی سی ہواؤں میں اُڑتے اِکا دُکا سیاہ پڑ جانے والے پتّے کا تعاقب کرتی ہوئی اُسے اپنا جسم نوچتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ وہ کم سن چرواہا اب بھی اس کی سوچوں کے آس پاس کسی گوشے میں کھڑا سیٹیاں بجا کر سدھائے ہوئے مویشیوں کے اسرار کو مزید پُراسرار بنا رہا تھا۔ چرواہے کے کُتّے کی دُم اور کان کٹے ہوئے تھے۔ اسی لئے وہ کچھ زیادہ موٹا ہو گیا تھا۔ اس کی غرّاہٹ میں ایک تنبیہ تھی، جھکڑوں سے لرزتے خیموں کی طنابیں ٹوٹنے کا اندیشہ اُسے ایک ازلی اور ابدی زوال کے کرب کی جھلک دکھا رہا تھا جو اُسے اپنے تمام یورپین دوستوں اور ان خانہ بدوشوں کے درمیان انسانیت کا واحد دُکھ تھا۔

ایک ہلکے سے تساہل سے آنکھیں کھول کر اس نے برابر کی سیٹ پہ سوئی اپنی امریکن بیوی کی طرف دیکھا جس کے ملائم سے ہونٹوں تلے دبے ہلکے سے اُبھار کے سکوت سے بھی اُسے زوال کا وہی کرب پھُوٹتا ہوا محسوس ہوا اور پھر ایک خوفزدہ سے جذبے نے جیسے اُسے یہ سمجھا دیا کہ سب کچھ مشترک ہی تو تھا سب منفرد کی تلاش میں نکل کر بہک گئے۔ کائنات اتنی انجان شاید نہ ہوتی اگر بے نام تشکیک میں اُلجھے لوگ ایک دوسرے کو پہچاننے کے سراب سے بھٹک کر اپنے آبائی سیارے تک پہنچنے کا راستہ نہ بھُول گئے ہوتے۔ گمنام نسلوں کا یہ المیہ آنے والی بے نام نسل کو منتقل ہو جائے گا کہ ہم کون ہیں؟ اپنے ساتھ جنّت جیسے ایک معاشرے کا خواب لانے والے اس نامانوس سیارے پہ گھُٹ گھُٹ کر ایک خوف زدہ کر دینے والا خواب بن جائیں گے۔

ایک گہری سانس کے ساتھ اس نے انسان کے آبائی سیارے کی تلاش پہ اُکسانے والی سوچیں فضا میں پھُونک دیں اور اپنی امریکن بیوی کو جگانے کے لئے اس نے ہمیشہ کی طرح ایک مانوس سی نرمی سے اس کے ہونٹوں پہ اپنی انگلیاں پھیریں۔ نشہ ایک نئے خمار کے ساتھ اس کی رگوں میں دوڑ کر اُسے خوابیدہ بیوی سے زیادہ بیدار سا کرنے لگا۔ اُس نے گویا پوروں کا ذائقہ بدلنے کی خاطر اپنی انگلیاں بیوی کے ہونٹوں سے ہٹا کر اس کے سنہری بالوں میں پھیلا دیں۔ جن میں ایک بے چین سی حرارت بھاپ کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے سردی کا اندازہ کرنے کی خاطر باہر کی سمت دیکھنے کو نظریں اٹھائیں۔ گاڑی کے تمام شیشوں پہ برف کی دبیز تہہ جم چکی تھی۔ اسے کل شام راستے میں ملنے والا وہ بوڑھا ساربان یاد آیا جس نے اُسے سرحد پار سے آنے والے اُن مہاجرین کی خیمہ بستی کا راستہ بتایا تھا جن کے لئے وہ ایک بین الاقوامی ادارے کی جانب سے امدادی سامان لے کر آیا تھا۔ ساربان نے راستہ بتانے کے ساتھ ہی اُسے آنے والی برفباری کی شدت سے خبردار کیا تھا تو اُسے ایک لمحے میں ہی اپنے والدین اور قبیلے کے دوسرے بزرگ یاد آ گئے تھے۔ جن کے درمیان وہ جوان ہوا تھا اور دس بارہ برس قبل ملازمت کی غرض سے باہر چلا گیا تھا۔ مہاجرین کی بے سر و سامانی اور برف باری کے خیال سے اس نے کئی گھنٹے بغیر کسی آرام کے اپنی گاڑیوں کے قافلے کو مسلسل سفر کرنے پہ مجبور کیا تھا اور کل رات جب وہ قدرے تاخیر سے خیمہ بستی کے قریب پہنچا تھا تو اس نے یوں سرخوشی کے سے انداز میں گاڑی کا میوزیکل ہارن بجانا شروع کر

دیا تھا جیسے اس کی سانسوں کی ننھی سی آنچ سے ہی سائبریا تک تمام برف پگھل دی ہو ـــــ اُسے یقین سا ہونے لگا تھا کہ نیکی کے لئے سی ذرہ سی کوشش بھی شاید اُسے دیوتاؤں کی عظمت کے راز سے آشنا کر دیتی ہے۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا گاڑی سے ٹکرا کر اُس کی سوچوں کو توڑ گیا۔ اُس نے پھر اپنی بیوی کو دیکھا۔ مگر وہ جواب میں بس ایک لطیفے کو دھیرے سے کہہ کر خواب آلود سی آواز میں جانے کیا بڑبڑانے لگی۔ مگر اُسے گمان ہونے لگا۔ شاید اس کی بیوی پھر اپنے بدن پہ تتلی کے پر سجائے خوشی کی مدد سے اس کے لئے تاروں کے کنول چن رہی ہوگی۔

وہ ایک سگریٹ سلگا کر گاڑی سے اُترا۔ سڑک کے کنارے کھڑی سامان سے لدی گاڑیوں کی سی قطار کسی پگڈنڈی کی طرح ساکت تھی۔ اس کی گاڑی سے ذرا پیچھے مقامی حکومت کی پناہ گزینوں کی وزارت کے سربراہ کی گاڑی کھڑی تھی جس کا ڈرائیور پریشان سا برف پر ٹہل رہا تھا۔ سامنے خیمہ بستی کے گردان نظر آ رہے تھے۔ بستی کو جانے والے رستے پہ برف پھیلی ہوئی تھی جس پہ کسی بچے کے قدموں کے نشان کسی دیوتا کی ہتھیلی کی لکیروں پہ اُبھرے تل کی سی طرح کا تاثر دے رہے تھے۔ اُس نے اپنے ہلکے کوٹ کے بٹن بند کئے۔ جیب سے سفید چمڑے کے دستانے نکال کر چڑھائے سگریٹ کے ہلکے کش لیتے ہوئے اس نے غور کیا۔ ہر چیز بالکل ویسی ہی لگ رہی تھی، جیسی اس نے اس وقت دیکھی تھی۔ جب وہ ایسے ہی بستی نما ایک شہر سے ملازمت کے لئے امریکہ روانہ ہوا تھا ـــــ اسے بے چینی سی ہونے لگی ـــــ اس نے سوچا جب تک مقامی وزارت کے افسر اعلیٰ باہر آئیں وہ مہاجرین کے کسی سرکردہ آدمی سے بات چیت ہی کر لے۔

سامنے مہاجرین کی خیمہ بستی میں برف سے ڈھکے جسموں میں زندہ روحیں سی لرز رہی ہوں گی ـــــ وہ یہی سوچتے ہوئے چلتا رہا بستی کے قریب پہنچ کر اس نے دیکھا، برف میں کپکپاتی ایک سفید ایک پاؤں پہ کھڑی، اپنا سر ڈھلکتے پروں میں چھپائے جیسے امن کے قتل کا ماتم کر رہی تھی ـــــ ایک کنارے سے دور سے کچھ بچے ایک لکڑی سے برف کھرچ کر ایک گیلی جھاڑی اکھاڑنے کی کوشش کرتے ہوئے منہ سے بھاپ اُگل رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں اور ناک سے بہتا پانی ہونٹوں اور گالوں پہ لکیریں سی بنا رہا تھا وہ ذرا آگے بڑھا تو اُسے تین چار آدمی ایک کاریز میں جھانکتے نظر آئے ـــــ قریب سے گزرتے ایک بچے نے اُسے بتایا کہ وہ اسی کاریز سے پینے کے لئے پانی حاصل کرتے ہیں، اور رات کسی وقت ایک کتا کاریز میں گر کر مر گیا ہے۔ جسے نکالنے کے لئے وہ لوگ وہاں جمع ہیں۔ ایک خیمے کے قریب سے گزرتے ہوئے اُسے خیمے کے اندر سے کچھ عورتوں کے رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ جلد ہی اس نے معلوم کر لیا کہ ایک معصوم بچہ رات سردی سے ٹھٹھر کر مر گیا ہے۔ جسے دفنانے کے لئے مرد اسی کاریز سے پانی لاتے گئے ہیں۔

اس کا جی چاہا کہ وہ اپنی تمام تر قوتوں سے ان طاقتوں کی نفی کر دے جنہوں نے ان مظلوم انسانوں کے پیروں سے زمین کے مس کا تحفظ چھین کر جیسے ان کے پاؤں کاٹ دیئے ہوں ـــــ ـــــ ـــــ وہ شاید اس سے زیادہ افسوسناک حادثے بھی دیکھ لیتا۔ لیکن خیمہ بستی میں یوں کسی غیر آدمی کے آزادانہ گھومنے پھرنے کی خبر سن کر بستی کا ادھیڑ عمر سرکردہ بوڑھا اس کے پاس آ گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی بوڑھے کو گرم کپڑوں، کمبل اور کھانے پینے کی مدد پہنچ جانے کی خوشخبری سنا دی ـــــ پھر اس کے کہنے پہ بستی کے لوگ مرے ہوئے کتے اور بچے کو بھول کر گاڑیوں کی سمت دوڑ پڑے۔

تھوڑی سی دیر میں وہ بوکھلا گیا کہ ضابطے کی کارروائی کیسے ہو سکے گی ـــــ لیکن وہ کرتا بھی کیا ـــــ پناہ گزینوں کی وزارت کا افسر اعلیٰ ابھی تک نشے کی خوشبو اوڑھے سو رہا تھا۔ البتہ اس کی بیوی جاگ چکی تھی اور اپنے میگزین کے لئے مہاجرین کے تاثرات ریکارڈ کرنے کی تیاری کر رہی تھی ـــــ لیکن باہر اعصاب کو کاٹتی ہوئی سی گور تیج سے بچنے کی خاطر انہوں نے فیصلہ کیا کہ گاڑی کے اندر ہی بستی کے چند منتخب لوگوں کو بلا کر اُن کے تاثرات ریکارڈ کریں ـــــ اس نے باہر دیکھا ـــــ بستی کی جانب سے ایک بڑھیا اپنے سر کی چادر کپکپاتے ہاتھوں پہ سجائے انہیں جیسے دعائیں دیتی ہوئی یوں ان کی جانب بڑھ رہی تھی گویا بڑھیا آزادی کے یادگار مجسمے کی مانند ساکت ہو اور زمین ان کی سمت دوڑ رہی ہو۔ بڑھیا کی بھاپ اُگلتی آواز میں کبھی نہ ختم ہونے والی مسرتوں کی دعاؤں کے ارتعاش سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ زندگی کے تمام کرخت رویوں کے لئے بھی بہت نرم سے لفظ یوں استعمال کر رہی تھی گویا وہ ہمیشہ سے زندگی کے تھکا دینے والے کھیل میں خوش فہمی کی طرح بس اسی لفظ اور سوچ کا سرمایہ ہی جمع کر رہی ہے۔ بڑھیا کے خاموش ہوتے ہی اس نے بڑھیا کا دل جیتنے کی خاطر کہا۔

کائنات کی ہر شے بالآخر ایک روز اپنی فطرت کے انبار اُٹھائے وقت کی عدالت میں پہنچ جاتی ہے اور شاید وہ آنکھ وقت کی عدالت کی سب سے سچی گواہ ہے جس کے کینوس پر گزری نسل کی تاریخ اور آنے والی نسل کی راہیں ہوں۔

اس کی بات سُن کر جانے کیوں اس کی بیوی اپنا بایاں کان لیمنا خن سے بڑی نازکی سے کھُجاتے لگی۔ اس نے بڑھیا کے چہرے کی طرف دیکھا۔ جس کی جھُریوں میں پریشانی کی تحریر لکھی تھی گویا کہہ رہی ہو۔

"بیٹا! ــــ اس زمین کے سنگ ہزاروں کا ذرہ ذرہ حملہ آور لٹیروں کے قدموں سے زخمی ہوتا رہا ہے۔
اگر کبھی یہ پتھر اور پہاڑ بول پڑے تو ہر جانب سسکیوں کا نوحہ گونجنے لگے گا۔ ہم نے سُنا تھا زمین پہ
آنے والے ہر ذی روح کی پہلی سانس سے پہلے اس کے لئے بہت سی نعمتیں اُتاری جاتی ہیں۔ ــــ
لگتا ہے یہ بات بس سننے کی ہے ــ دیکھنے کی نہیں۔"

بڑھیا خاموش تھی پھر نہ جانے کیوں سسکنے لگی۔ اُس کی بیوی نے روتی ہوئی بڑھیا کی بہت سی تصویریں بنا ڈالیں تو اس نے بڑھیا کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ماں! ــــ ساری دنیا آپ کے ساتھ ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ جب آپ لوگوں نے ہجرت کی تو آپ کے وطن کی حالت کیا تھی۔"

"وطن"! ہم تو صدیوں سے اسی وطن میں رہ رہے ہیں ــــ اور تم کس ہجرت کی بات کر رہے ہو بیٹا؟"

اس نے چونک کر بڑھیا سے دوبارہ پوچھا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ جب آپ لوگوں کے لئے اپنے گھروں میں رہنا مشکل کر دیا گیا اور مہاجرین سرحد پار کر کے اس طرف آنے لگے . . . "

بڑھیا ایکدم اس کی بات کاٹ کر کہنے لگی۔

"مہاجرین! بیٹا ــــ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے ــــ شاید تم نے ہمارے قافلے کی حالت دیکھ کر ہمیں مہاجر سمجھا ــــ لیکن ہم مہاجر نہیں ہیں۔ سرحد پار سے آنے والے لوگ تو سڑک کے اُس طرف اُن بنگلوں میں رہ رہے ہیں۔ جہاں پچھلی بہار میں میدان تھا ــــ اور ہمارے قافلے نے پڑاؤ ڈالا تھا۔"

اس نے یہ سنتے ہی ایک جھٹکے سے ٹیپ ریکارڈر بند کر دیا اور پریشانی سے سوچنے لگا۔ اس کی انسان دوستی کی خواہش نے ایکدم اُسے اتنا یقین دلا دیا کہ اس نے محض ٹھٹھرتے لوگوں کو بچانے کی خواہش میں اتنی بڑی غلطی کر لی کہ خانہ بدوشوں کے قافلے کو مہاجرین کی خیمہ بستی سمجھ لیا۔

اس کی بیوی نے حقیقت جانتے ہی قبائلیوں کو گاڑیوں سے سامان اُتارنے سے روک دیا تھا ــــ جو اِدھر اُدھر بکھرے بھوکے کووں کی طرح گاڑیوں کی جانب دیکھ رہے تھے۔ پگڈنڈی پہ تھکی تھکی سی بستی کو لوٹتی بڑھیا کو دیکھ کر اُسے ساری دنیا کے وہ رسمی جملے یاد آنے لگے جن کی گونج قدم قدم پہ اُسے توانائی دیتی رہی تھی۔

"ساری دنیا آپ کے ساتھ ہے"

اُسے خیال آیا سب کچھ جھوٹ ہے، یہ دنیا شاید جھوٹ پہ قائم ہے۔ اس کی بیوی اب بھی خانہ بدوشوں سے سامان واپس لینے پہ بضد تھی کیونکہ اس غلطی سے نہ صرف اُن کی ملازمت خطرے میں پڑ گئی تھی بلکہ ان کی پالیسی بھی ایک پریشان کُن سوال بننے لگی تھی ــــ وہ محسوس کرنے لگا جیسے اس کا جسم بول رہا ہو ــــ کھلونے نہیں جانتے کہ کھیلنے والا کیا کھیل رہا ہے۔ لیکن سُورج کے سفیر یہ سب کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ انسان کی بین الاقوامی انجمن کتنی بڑی ہے۔ لیکن سچے جذبوں سے بھرپور انسان کی ذات کی انجمن عمل کے وقت اتنی وسیع ہو سکتی ہے کہ کئی انجمنوں کو سمیٹ لے اس لئے قدروں کو زندہ رکھنے کے لئے امداد سیاست کو نہیں زندگی کو ملنی چاہیئے۔ اس نے اپنی آواز ٹیپ کرنے کے بعد بیوی پہ الوداعی سی نظر ڈالتے ہوئے اس سے کہا۔

برف کے یہ سائبان جو دس سال پہلے صرف میری زمین کا حُسن تھے ــــ میں نہیں سمجھ سکا۔ میں اپنے سائبان کا قرض چُکانے کا خود ذمہ دار ہوں۔
تم اپنی ملازمت بچانا چاہو تو ساری ذمہ داری مجھ پہ ڈال دینا۔

پھر وہ دھیرے دھیرے خانہ بدوشوں کی بستی کی جانب چلنے لگا۔ اچانک برف کا ایک نرم سا گولہ اس کی گردن سے ٹکرا کر اس کے وجود پہ بکھر گیا۔ اس نے مُڑ کر دیکھا ــــ اس کی بیوی کے ہاتھ میں برف کا ایک گولہ تھا جسے چُومتے ہوئے وہ دوسرے ہاتھ سے خانہ بدوشوں کو گاڑیوں سے سامان اُتارنے کا کہہ رہی تھی ــــ اور اس کے ہاتھ کا سفید دستانہ برف کی طرح چمک رہا تھا۔

# گھمن گھیر

پروین عاطف

تت نت اتت۔ کھڑکی میں سے پھر وہی کڑک بیٹ جیسی آواز آئی۔ اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔۔ اسد کا دل کانپ گیا۔ جھلی آج پھر اس کے تعاقب میں تھی۔ اس سے پہلے وہ بڑی بڑی چھلانگیں بھر کر نکل جاتا۔ کوڑے کرکٹ کی بھری بھرائی چنگیر اس کے سر پر آ رہی۔ اس نے کھسیانہ ہو کر اپنے ارد گرد بکھرے چھلکوں اور مٹی کو دیکھا۔ بچے اس کی حالت زار پہ زور زور سے یوں تالیاں بجا رہے تھے۔ جیسے ہنومان کا تماشا ہو۔ اوپر کھڑکی میں کھڑی جھلی کے نرخرے سے خوشی اور جوش کی وہی پھٹی پھٹی آوازیں نکل رہی تھیں جو وہ کسی کو بے بس کر کے نکالا کرتی تھی۔ اسے شدید غصہ آیا . . . . .

"عجیب دھات کے زمانے کے بے حس لوگ بستے ہیں میرے چاروں طرف۔ مجھے غلاظت میں یوں لت پت دیکھ کر کسی کے ماتھے پہ بل تک نہیں پڑا۔ پھر چھوٹی چھوٹی بچیوں نے اپنی چُنیوں کے رسے بٹ کر اس کے ارد گرد بھاگ بھاگ کر کھیلنا شروع کر دیا "کوکلا چھپاکی جمعرات آئی اے جیہڑا پچھے ویکھے اوہدی شامت آئی اے"

یہ سارا قصبہ آہستہ آہستہ محبوس کر کے مار دے گا مجھے ایسا کبھی نہیں ہوگا، میں جھلی کا مزید پاگل پن برداشت نہیں کروں گا۔ وہ بوجھل بھاری قدموں سے آہستہ آہستہ گلی کی نکڑ پر اپنے کوارٹر کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہا تھا، اگر میرا خود غرض باپ دوسری شادی کر کے میری لاغر ماں کے کندھوں پہ ہم پانچ بہن بھائیوں کا بوجھ یوں اچانک ڈال کر پورے گھر کے لئے زندگی کا دائرہ تنگ نہ کر دیتا تو یونیورسٹی سے نکلتے ہی محکمہ آبپاشی کی اُجاڑ نوکری کرنے سے پہلے میں اپنے مستقبل کے بارے میں کئی ناپ تول کرتا . . . . پر زندگی میں ایسی گھڑی کا کوئی وقت متعین نہیں ہوتا۔ جب یک ہی جھٹکے سے کئی زندگیوں کے تانے ٹوٹ کٹ کر آپ کی آنتوں سے بندھ جائیں پھر آپ کا کوئی سانس بھی آپ کی اپنی ملکیت نہ رہے۔ گھر کے ایسے ہی ہنگامی پیچ و خم کی وجہ سے اسد کو جرنیلی سڑک سے دس میل اندر کچی سڑک پر پندرہ سولہ سو کی آبادی کے اس چھوٹے سے قصبے میں نہر کے محکمے کی نوکری کو جھولی میں ڈالنا پڑا تھا۔ پر یہاں آتے ہی اسے احساس ہوا کہ میلوں میں اس قصبے کا فاصلہ جرنیلی سڑک پہ شاں شاں کرتی زندگی سے صرف دس ہی میل دور تھا۔ لیکن چھوٹی اینٹ کے برسوں پرانے تنگ تنگ مکان . . . . گلی گلی کے منہ پہ لکڑی کے کرم خوردہ محرابی دروازے، ڈیوڑھی ڈیوڑھی اندھے کنویں، صحنوں میں لگے زنگال شدہ ہینڈ پمپ نلکے اور رہن سہن کا انداز اسے صدیوں پیچھے لے گیا۔ یوں لگتا تھا ماضی میں کسی لمحے اچانک کسی حادثے کے تحت، وقت کی ریت اس قصبے میں پہنچ کر اپنے مدار سے آپ ہی آپ بند ہو گئی تھی۔ پھر لمحوں کا جمود تارکول کے سیاہ لیپ کی طرح لوگوں کے رہن سہن اور سوچ کے انداز پہ یوں چھا گیا کہ اب زمانہ کوئی بھی قیامت کی چال چل جائے ان میں تبدیلی پیدا ہونا ممکن نہ تھی۔ اب تو ان کی بیشتر زندگی اسی جدوجہد میں گزر رہی تھی کہ باہر سے آ کر کوئی ان کی روایات پہ ڈاکہ نہ ڈال جائے۔ اسد کا خیر مقدم بھی اسی

لیے کیا گیا تھا کہ اس کا تعلق پانی کے محکمے سے تھا اور پانی ان کے کھیتوں کی شہ رگ میں بہتا وہ سُرخ خون تھا جس کے بغیر زندگی کا آگے بڑھنا ناممکن تھا۔

دراصل قصبہ صندل پور مغلوں کی ایک چھوٹی سی چھاؤنی ہوا کرتی تھی۔ دلّی سے کشمیر جاتے وقت مغل بادشاہ ہمیشہ یہاں پڑاؤ ڈالا کرتے تھے۔ پھر زمین نے اچانک کروٹ بدلی اور مغلوں کی عظمت پاتال میں چلی گئی۔ انگریزوں نے جنہیں مغلوں کی شان و شوکت سے ازلی دشمنی تھی، جرنیلی سڑک بھی ایسے راستوں پر بچھا دی جہاں حتی الامکان مغلوں کی عظمت کے نشان وقت کے ساتھ ساتھ آپ ہی معدوم ہو جائیں۔ صندل پور کے لوگوں کی تکڑی بھی جرنیلی سڑک سے دس میل دُور چھپ جانے کی وجہ سے اسی طرح کٹ کر تنگ ہو گئی تھی۔ وہاں جاتے ہی پوسٹ ماسٹر اسمٰعیل کی نیم پاگل بیٹی اسد کے اعصاب پر سوار نہ ہو جاتی تو شاید شہر کی چکا چوند زندگی سے دور وہاں فطرت کے قریب رہنے سے اسے سکون مل جاتا۔ پر قصبے میں جاتے ہی نیم کی گولی جیسے تنگ سر اور کالی مرچوں جیسی گول گول آنکھوں والی تند تند نظریں بکھیرتی اسمٰعیل پوسٹ ماسٹر کی نیم پاگل بیٹی کے منجمد ذہن میں اسد کو دیکھتے ہی پتا نہیں بجلی کی کون سی لہریں تڑپنے لگیں موقع دیکھتے ہی اس نے گلی کے کونے میں نصب خرابی در و ترے کے پیچھے سے ایسا کنکر اٹھا کر اسد کے ماتھے پر دے مارا کہ خون کے دو گول فوّارے چھوٹ پڑے۔ ۔ ۔ ۔ لوگ حیران تھے کیونکہ اسمٰعیل پوسٹ ماسٹر کی نیم پاگل بیٹی تا جی اجنبیوں کو دیکھ کر ہمیشہ چوہے کی طرح بل میں گھس جایا کرتی تھی۔ اجنبیوں پر دست درازی کرنے سے ہمیشہ اس کی جان جاتی تھی۔ پر اسد کو کنکر مارنے کے بعد خون کی چھوٹی چھوٹی دھاریں دیکھ کر وہ یوں بیکر پھریاں کھا رہی تھی جیسے گھڑی کا ندتوں سے کسا ہوا الارم آپ ہی آپ کھل جائے۔ نفرت اور غصے کے تیز ریلے اسد کے خون میں سنسنانے لگے۔ اس کا جی چاہتا تھا اسی لمحے وہ جبلی کے بدصورت جیوے کو پاتال میں پھینک آئے۔ کچھ لوگوں نے انسانی ہمدردی کے تحت اس کے ماتھے کا خون صاف کیا۔ محبت سے بات بھی کی پر باقی لوگ سرسری نظر سے سارا منظر دیکھ کر یوں وہاں یوں چلے گئے جیسے ساری بات سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اسی شام وہ ماتھے پر ہاتھ رکھے نمبردار کے گھر گیا نمبردار نے اسے دیکھتے ہی رنگیل پایوں والے پلنگ پر نیا کھیس بچھاتے ہوئے کہا:

"بسم اللہ جی آیاں نوں باؤ جی۔ کیسے آنا ہوا۔ میں تو خود حاضر ہونا چاہتا تھا۔ دھن بھاگ صندل پور کے آپ یہاں رہنے کو آئے۔ بڑی مشکلات تھیں پانی کی ہمیں۔ ۔ ۔ ۔ سُنا ہے باؤ جی بڑی نہر اسی سال مکمل ہو جائے گی۔ بڑی نہر کا پانی مل جائے سونا ہی سونا بکھر جائے گا صندل پور کے کھیتوں میں۔ نصیب سنور جائیں گے مولیسے قصبے میں آپ آرام سے تو ہیں ناں باؤ جی"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آنے جانے والوں کا جو سواگت پاگل لڑکی کرتی ہے چوہدری جی اس سے تو جیسا آرام ملتا ہے وہ میرے ماتھے کے گھاؤ سے ظاہر ہے۔ ۔ ۔ ۔ باقی رہا پانی کا معاملہ تو پاگل لڑکی گر اسی طرح چُپ کرو کرتی رہی تو نہر کھلنے سے بہت پہلے مجھے یہاں سے چلے جانا پڑے گا۔ شہر میں پاگلوں کو یوں کھلا چھوڑ کر لوگوں کی زندگیاں تلخ کرنے کی اجازت کبھی نہیں دی جاتی چوہدری جی۔ وہاں ایسے لوگوں کو ہمیشہ پاگل خانے بھیج دیا جاتا ہے۔ اسد نے پڑھے لکھے انداز میں مشورہ دیا۔

چوہدری نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اپنی آنت اگر گل جائے تو کاٹ کر پھینکی تو نہیں جاتی باؤ جی۔ وہ پاگل لڑکی اسمٰعیل پوسٹ ماسٹر کی ساری عمر کی کمائی ہے۔ پھر ہم تو یہ سمجھ کر صبر شکر کر لیتے ہیں کہ اسمٰعیل کی دھی اللہ کی طرف سے قصبے کے لوگوں کی آزمائش ہے۔ رب کی طرف سے آئی آزمائش سے کنی کترانا مسلمان کا شیوہ نہیں۔ آپ کو جو تکلیف ہوئی ہے اس کی میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ جوان بیٹی کا سہم بڑا جان لیوا ہوتا ہے جی۔ ہم اسمٰعیل کا دکھ اور بانٹ بھی کیسے سکتے ہیں وہ بے چارہ بے قصور تو یوں ہی شاہ دولے شاہ صاحب کے بیوں کا ماما، گن گن دن پورے کر رہا ہے۔

اسد کو چوہدری کے فرسودہ فلسفے کی کوئی سمجھ نہ آئی۔ چوہدری نے اسے بٹر بٹر دیکھتے ہوئے آپ ہی آپ کہانی سنانا شروع کر دی۔

"اسمٰعیل پوسٹ ماسٹر کے گھر کی دیواروں میں جب شادی کے برسوں گزر جانے کے بعد بھی بنجر زمین کی طرح بچے کے بغیر دراڑیں پڑنے لگیں تو بڑی بوڑھیوں کے کہے سُنے اس کی بیوی خالی جھولی لے کر شاہ دولے شاہ صاحب کے مزار پر چلی گئی۔ آپ تو جانتے ہیں کہ شاہ دولے شاہ صاحب بے اولادوں کو کبھی نامراد نہیں بھیجتے، پر پہلا بچہ ہمیشہ باباجی کے مزار کی نذر کرنا پڑتا ہے۔ بھوک پیاس سے ہونٹوں پر پیپڑیاں جمی ہوں تو پہلا نوالہ توڑ کے دوسرے کی نذر کرنے کے لئے پیروں کا حوصلہ چاہیئے۔ اسمٰعیل کی بیوی کی چھاتیوں میں ممتا کا رس پڑا تو وہ دیوانی ہوگئی۔ اس نے سوچا اتنے بڑے شاہ دولہ کو اتنی معمولی عورت کی نذر کی کیا پرواہ کہ باباجی کے مزار پر روز چڑھاوے چڑھتے ہیں۔

ایک بچہ نذر نہ ہونے سے کیا فرق پڑ جائے گا۔ بس باؤجی بچی تو جو پاگل بے سری پیدا ہوئی سو ہوئی۔ بچی کی پیدائش کے فوراً بعد اسمٰعیل کی بیوی خود سر سے پاؤں تک یوں سے نیلے تھو تھے جیسی ہوگئی جیسے سنگ چور ڈس گیا ہو۔ دیکھنے والے توبہ توبہ کر اُٹھے۔ تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ بچی پر بھی اب تو اللہ نے بڑا رحم و کرم کر دیا ہے۔ پیدا ہوئی تو زبان باہر کو لٹکی ہوئی اور ڈھیلے اُلٹے۔ . . . سب سے انوکھی بات جس نے سب کو حیران کیا وہ یہ کہ جس دن سے پیدا ہوئی ہے کسی نے اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے چوہدری نے سرگوشی کے انداز میں کہا، دراصل باؤجی یہ لڑکی کوئی اور ہی مخلوق ہے۔ انسان تو آج تک دھرتی پہ ایسا ہوا ہی نہیں جس کی آنکھ میں آنسو نہ ہو۔

بابا شاہ دولے شاہ ویسے بھی ذرا جلالی طبیعت کے ہیں۔ . . . . . اسمٰعیل بڑا دُکھی ہے۔ گھر بھی اجڑا اور اولاد بھی سینے کا پھوڑہ بُرا نہ ماننا باؤجی ہم لوگوں میں ابھی تک شہر والوں کی طرح اپنے اپنے دکھ اور اپنے اپنے سُکھ اکیلے سمیٹنے کا رواج ہی نہیں پڑا۔ پھر وہ تو ہے بھی شاہ دولے شاہ کی امانت۔ ہم اسے کچھ نہیں کہہ سکتے، ہم مجبور ہیں۔"

اسد نے چوہدری کی غیر حقیقی باتوں سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا، سب آپ لوگوں کے وہم ہیں۔ وہ بالکل دوسرے پاگلوں جیسی پاگل ہے۔ اسمٰعیل سے ہمدردی کرنی ہے تو فوراً پاگل خانے بھیج دیجئے۔ آپ ہی آپ ٹھیک ہو جائے گی۔ سب انتظام میں کرائے دیتا ہوں . . . .

توبہ توبہ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں باؤجی۔ چوہدری نے سہم کر کہا آٹھ نو سال کی عمر میں کھیلتے کھیلتے تاجی نے مسجد کی کھوئی میں گوبر ڈال دیا تھا۔ مسجد کے مولوی نے تھپڑ مار دیا۔ اگلی صبح کھوئی کے پاس مولوی یوں برف ہوا پڑا تھا جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ ہٹا کٹا مولوی راتوں رات پھڑک کر ختم ہو گیا۔ کسی نے آج تک اس کی موت کا بھید ہی نہیں پایا۔ آپ ہمارے مہمان ہیں، خیر سے آئیں خیر سے جائیں۔ جلی نصیبوں جلی بھی قصبے کی بیٹی ہے۔ بیٹی جیسی بھی ہو پھینکی نہیں جاتی اس روز چوہدری کے لہجے کے دُکھ اور سچائی نے اسد کی زبان تو بند کر دی پر نفرت کا اس بھانبڑ کو کوئی نہ بجھا سکا جو جبلی کے گولی نما سر اور تھوکیں بکھیرتے دھانے کو دیکھ کر اس کے جسم میں جل اُٹھتا تھا۔ . . . وہ یہ بھی جان گیا تھا کہ قصبے والے اگر جبلی کی اذیت ناک شخصیت کے ارد گرد سے اسرار اور مافوق الفطرت کا تانا بانا ادھیڑ دیں تو اسمٰعیل اور اس کی بیٹی کا قصبے میں رہنا ناممکن ہو جائے گا۔

اور ایسا کرنے سے قصبے کی پُرانی روایتوں کے تار تار ہو جانے کا ڈر تھا۔ اس لئے جبلی کے لئے قصبے کے چاروں چک جہانگیر تھے۔ وہ جب چاہے جہاں چاہے راہ چلتے کو دھکا دے کر گرا دے۔ اپنے بلے بلے بے جان ناخنوں سے منہ چھیل کر چل دے یا غلاظت کا ٹوکرا اٹھا کر کسی بے گناہ کے سر دے مارے . . . کوئی روک نہیں سکتا تھا، سب کھسیانی ہنسی ہنس کر اپنا اپنا پنڈا سہلاتے چل دیتے تھے ایسے میں جبلی کے گلے سے پھٹے بانس جیسی فاتحانہ کیں کیں سُن کر اسد کو بار بار شک پڑتا تھا کہ وہ سب کچھ جانتی ہے، سب کچھ جانتی ہے پتا نہیں کیوں اسے یقین تھا کہ اس کے گدڑ مڈ تحت الشعور میں نفرتوں اور محبتوں کو پہچان لینے کا کوئی بیرومیٹر ضرور موجود ہے۔ ورنہ وہ اسد کو دیکھ

کر یوں تڑپ تڑپ نہ جاتی جیسے دل مرچوں سے اٹھ کر آئی ہو۔ ۔ ۔ ۔ اسے دیکھتے ہی بیٹھی ہوئی ہوتی تو کھڑی ہو جاتی، کھڑی ہوتی ریٹ بھنگنا شروع کر دیتی۔ ایک بار وہ صرف اس کے گھر کے دروازے کے پاس سے گزرا تو دہلیز میں کھڑے کھڑے جھلی نے یوں چیخنا شروع کیا۔ جیسے کوئی کند چھری سے کاٹ رہا ہو۔ قصبے والے مبہوت تھے انہیں اس نرم رو بابو کے رویے میں کوئی ایسی قابل اعتراض بات نظر نہ آتی تھی جس سے وہ جھلی کی بے طرح بے چینی کا اندازہ لگا سکیں۔ وہ یہ بالکل نہیں سمجھ سکتے تھے کہ ان دونوں کے اعصاب دراصل ایک دوسرے کو پامال کرنے کی کوشش میں پسے ہوئے شیشے میں لتھڑی ڈور کی طرح تن کر ٹوٹ رہے تھے۔ وہ نہر پر کام کے لئے جاتا تو اکھڑا اکھڑا سا رہتا۔ مال کو خط لکھے کئی کئی روز گزر جاتے۔ جھلی کی بے طرح توجہ امر بیل کی طرح اس کے وجود کے ارد گرد لپٹی جا رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ جھلی اسے دیکھ کر جتنا بھی انگاروں پہ لوٹتی پر کسی نہ کسی طرح ایسی جگہ ضرور پہنچ جاتی جہاں سے اسد کا گزر ممکن ہو۔

تنور والی ماسی برکتے کی سبب جیسے گالوں والی الہڑ بیٹی تارا اسد کو گاؤں آتے ہی اپنے آپ آنکھوں میں چھپا بیٹھی تھی۔ ۔ ۔ ۔ وہ کام سے آتے جاتے جب ماسی برکتے کی ڈیوڑھی میں کھڑا ہو کر آواز لگاتا، گول گپیئے ماں کے تنور سے مرے لئے گرم روٹیاں لگوا کے لا دے تو تارا کے انگ انگ میں تارے سے جگمگانے لگتے، اور جب وہ گرم روٹیاں لگوا کر کودتی پھلانگتی اسد کے کان کے پاس جا کر آواز لگاتی، روٹی حاضر ہے باؤجی۔ تو تارا کے وجود سے نکلتی کچنار کی کچی کلی ایسی مہک اسد کے نتھنوں کو بوجھل سا کر دیتی۔ اس کی موجودگی سے سارا ماحول معطر سا ہو جاتا۔ اس کا جی چاہتا جب تک وہ قصبے میں ہے اس کے سارے کام تارا ہی کیا کرے۔ پر اسد کو اس بات کی سمجھ نہیں آتی تھی کہ تارا جب بھی اس کے گھر سے کوئی کام کر کے نکلے جھلی گلی کی کسی نکڑ پہ کھڑی ایسی آوازیں کیوں نکالنا شروع کر دیتی ہے جیسے گلے پہ کوئی کند چھری پھیر رہا ہو۔

ایک روز تارا اسد کے لئے دودھ لینے گجروں کے ڈیرے جا رہی تھی۔ جھلی نے اپنے سوکھے سوکھے بدنما بازوؤں میں اسے یوں دبوچ لیا۔ جیسے آلنے سے گرا بوٹ۔ غصے میں ہمیشہ جھلی کے بارہ ہاتھ نکل آیا کرتے تھے۔ وہ تو رکھا گجر اگر آگے بڑھ کر پورے زور سے جھلی کو پرے نہ دھکیل دیتا تو شاید تارا اس کے وحشیانہ ہاتھوں میں مسل کر لیر لیر ہو جاتی۔

ایک روز برکھا رم جھم برس رہی تھی۔ نہر کا منہ کھلنے میں تھوڑے دن رہ گئے تھے۔ ۔ ۔ ۔ گاؤں والے پانی کی خوشی میں پکی لیچی کی طرح رس سے تڑخے جا رہے تھے۔ اسد زیادہ وقت نہر کی پٹڑی پہ رہتا تھا۔ تارا روز دوپہر کو ماں کے تنور سے بیسنی روٹی پکوا کر اسد کے لئے نہر پر لے جاتی تھی۔ ۔ ۔ ۔ اس روز تارا موتیئے کے گجرے سجائے جنگلی کبوتری کی طرح ٹھمک ٹھمک کر چلی جا رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسد مبہوت سا دیکھ رہا تھا۔ پتا نہیں خدا شہر سے زیادہ گاؤں کے نزدیک کیوں رہتا ہے۔ اس نے ننھی ننھی بوندیوں میں ٹھکیں مارتی تارا کو لہریں لیتی دیکھ کر سوچا پھر اچانک جھاڑی میں سے لمبے لمبے ناخنوں والا سوکھا سا ایک ہاتھ تارا کی طرف بڑھا اور اسے کھینچ کر جھاڑی کے اندر لے گیا۔ ۔ ۔ ۔ تارا کی فلک شگاف چیخ سے اسد کی انتڑیاں گچھا سی ہو گئیں۔ ۔ ۔ ۔ ایک ہی چھلانگ میں وہ جھاڑی کے اندر جا پہنچا۔ تارا لہولہان پڑی تھی۔ جھلی کیں کیں کرتی مستی میں بھاگی جا رہی تھی۔

نفرت کے گھناؤنے عفریت لمبی لمبی زبانیں لٹکائے یاجوج ماجوج کی طرح اسے اندر سے چاٹنے لگے۔ اگر وہ قصبہ چھوڑ کر چلا نہ گیا تو شاید اس کی ذات دھجیاں دھجیاں ہو کر بکھر جائے گی، اسد نے سوچا۔ تارا دنوں پہ پڑ گئی۔ گاؤں والے بے بسی سے چپ چاپ ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے۔ اسد کے لئے وہ جگہ چھوڑ دینے کا فیصلہ کرنے کے مشکل ترین دن تھے۔ ۔ ۔ ۔ تارا کے زخمی ہو جانے کے بعد وہ بارش کے سنجار کی طرح ہر دم توڑ پھوڑ کا منتظر رہنے لگا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نہر کی تکمیل سے اچانک اس کا جی اُچاٹ ہو گیا تھا کئی کئی روز اس نے کمرے میں بند رہنا شروع کر دیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ تارا کے بیمار

بڑھ جانے سے تنہائی کے جوار بھاٹے چاروں طرف ٹکلیں مارنے لگے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب وہ وہاں نہیں رہے گا ۔ اس نے فیصلہ کر لیا ۔ وہ بڑی خون آشام شام تھی ۔ رنگ تہہ دار لہروں کی صورت میں یوں بہہ رہی جیسے جہنم کا منہ کھل گیا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ چھوٹی اینٹ کے تنگ مکانوں کی چھتوں پہ مٹیالے گدھ سر نہوڑائے کسی آن ہونی کے انتظار میں خاموش بیٹھے تھے ۔ تنور والی ماسی برکتے کے گھر انہوں نے ڈیرے ڈال لئے تھے ۔ اس دوپہر روٹیاں پکا کر اُٹھی تو لوگوں کا کہنا تھا گرمی سے تیورا کر گری اور تنور کی بھبھل میں جھلس کر ختم ہو گئی ۔ ۔ ۔ مال کے بعد تایا کے گھر میں بس بیلے کے سوا کچھ نہ رہا ۔ غصے سے اسد کی ہڈیاں کڑکڑا رہی تھیں ۔ غصہ اور بے بسی کئی بار مستقبل کے راستوں کی دھول ہٹانے میں بڑی مدد دیتے ہیں ۔ وہ اس قصبے میں ایک دن بھی اور نہیں گزارے گا ۔ اس نے فیصلہ کر لیا ۔

اچانک جھلسی ہوئی مٹی کا ایک تیز ریلا کھٹ سے اندر آیا اور مٹی کے تیل کے کچھ قطرے تیزی سے فضا میں بکھر گئے ۔ اس نے اکڑوں ہو کر دہلیز سے باہر جھانکا ۔ آندھی میں جھلسا ہوا جھلی کا خاک آلود ہیولے کانپتے ہاتھوں سے اسد کے گھر کے چاروں طرف مٹی کے تیل کا چھڑکاؤ کئے جا رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ نیم کی گولی جیسا اس کا تنگ سر کندھوں پہ بیقراری سے یوں ڈول رہا تھا جیسے پلاسٹک کے سستے گڈے کی تار ٹوٹ گئی ہو ۔ ۔ ۔ ۔ بھدک بھدک کر چاروں طرف تیزی سے ٹین انڈیلنے سے یوں لگ رہا تھا خود انگارے پر لوٹ رہی ہو ۔ ۔ ۔ ۔ اسد جی ہی جی میں ہنسا ۔ ۔ ۔ ۔ فیصلے کی گھڑی آن پہنچی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ یہ مجھے جلا کر بھسم کرنا چاہتی ہے ۔ اس نے سوچا "D-DAY"

قصبے کا (PSEUDO) تقدس مافوق الفطرت ! ہونہہ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر ایکا ایکی اس کے جسم میں راکٹ پھٹنا شروع ہو گئے ۔ ۔ ۔ ۔ جھلی کی کالی مرچوں جیسی بے نور آنکھیں لاٹوؤں کی طرح تیز تیز گھوم رہی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ وہ تیل کا ڈبہ بغل میں دابے گھٹنوں کے بل اندر داخل ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ بہت سے عنابی سانپ اسد کے جسم سے نکل کر فضا میں بکھر گئے ۔ ۔ ۔ ۔ اسے ہاتھ لگانے کے تصور سے اس کا جی مالش کر رہا تھا ۔ پھر نفرت کے اتنے بھبکے نے اس کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو پاش پاش کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔ جھلی کا باسی سبزی جیسا بدرنگا جسم کھری چارپائی پہ رسیوں میں جکڑا پڑا تھا ۔ اسد نے لیکر کے کانٹوں کا گچھا اُٹھا کر منہ میں ڈال لیا ۔

چھتوں پہ بیٹھے اُداس گدھ لُو کے بھبھاکوں سے جُھلس کر آپ ہی آپ جانا شروع ہو گئے ۔ سارا گاؤں ماسی کے اکڑے ہوئے جسم کو دفنانے کے بعد بابا گدڑی والے کے عرس پہ نہر کی پٹڑی چلتا نہر کے پار چلا گیا تھا ۔

اسمٰعیل پوسٹ ماسٹر کی مافوق الفطرت بیٹی کے مقدس وجود کو شیش ناگ ڈس رہے تھے ۔ زہر کو زہر کاٹ رہا تھا ۔

پھر پتا نہیں کیا ہوا ۔ جھلی کی بے نور آنکھوں میں روشنی کے کوندے سے لپکنے لگے ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا بچہ جیسا ڈھیلا جسم سکڑ سکڑ کر جوان ہونا شروع ہو گیا ۔ اسد کو یوں لرزے آنے شروع ہو گئے جیسے گردے میں لیس پڑ گئی ہو ۔ ہر انسان کے دل کے اندر بچپن کے چھوٹے چھوٹے خوف ، انجانی ، انہونی چیزوں کے تجسس چھوٹے چھوٹے مقفل صندوقوں میں بند پڑے رہتے ہیں ۔ انہیں کھول دینے سے بے سکونی سی پھیل جاتی ہے ، وہ گھبرا گیا تھا ۔ پتا نہیں اس نے کس انہونی کا قفل کھول دیا تھا ۔ اس تیرہ و تار فضا میں وہ ایک پل بھی نہیں رہے گا ۔ اس نے لپک کر اپنا اٹیچی کیس اٹھا لیا ۔ ۔ ۔ ۔

دروازے کے پاس جاتے جاتے اس نے مڑ کر دیکھا ۔ جھلی کے گلے سے عجیب گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ایک پل رُکا ۔ اس نے غور سے دیکھا جھلی کی پیدائشی خشک آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے بہہ رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے جا رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ جھلی کی وہ آخری نظر برسوں اسد کا پیچھا کرتی رہی ۔ ۔ ۔ کیونکہ ایسا تشکر اس نے پھر کبھی کسی حساس اور ذہین آنکھ میں کبھی نہیں دیکھا تھا ۔ ۔ ۔ ۔

(اکتوبر ۷۸ء)

# کہانی چلتی رہتی ہے

طارق جامی

کھٹ کھٹ، کھٹاک، کھٹ کھٹ ـــــ دائیں ہاتھ کی میز پر ٹائپ مشین چل رہی تھی اور وہ ہولے ہولے کسی ورندو میں بہتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اس کی سوچ کا پکھیرو پر کھولتا تھا اور اڑان اسے کہیں سے کہیں لے جاتی تھی۔ صبح سے شام تک، بعض اوقات دفتر میں وہ کوئی کام نہیں کر پاتا تھا اور اگر رات کو سوتے سوتے اس کی سوچ کا در وا کسی راہ پر کھل جاتا تو دنیا جہان کی سیاحت اسے سورج نکلنے تک آنکھ لگنے کا موقع نہ دیتی۔

آج پھر دہی ہو ـــــ کھٹ کھٹ کھٹاک کی کلک پرانے دس سال پرانا منظر یاد آ گیا۔ وہ سب لوگ کتنے رہا کرتے تھے۔ ایک گھر، ایک جگہ اور بیچ کی دیوار ہونے کے باوجود دو دو بھائیوں کی وہ ایک ہی گھر میں رہتی تھی الگ گھر، اپنا اپنا آنگن ہونے کے باوصف درمیان والی طاقی، آنگن اور کمروں کی تعمیر کے لیے نئی کا نشان تھی۔ یہاں بیٹھے ہیں تو یہیں کھانا کھا لیا گیا، یہیں پڑ کر سو رہے۔ وہاں گئے تو کھانا وہیں لگا اور سونے کی جگہ بھی وہیں بن گئی۔ ثمینہ اور رفیعہ، بہنیں نہیں، بہنیں۔ کرم اور خورشید، بھائی بعد میں پہلے یار بیلی۔ عمر زادوں، ساتوں، کیمروں کی جیسی بھرتی اور دونوں بھائیوں کے یک جان ہونے کی مثال خاندان ہی میں معروف رہتی۔ بستی اور شہر کے رشتہ داروں کے لیے بھی باعثِ رشک تھی۔

وہ دن پھر کیوں نہیں آتا؟ کب سے بارش اتری تو سخت گرم دوپہر کے بعد موسم ٹھنڈا ٹھار ہو گیا۔ چچا جان نے کہا: آج اچھا موقع ہے۔ لڑکیاں ہمیشہ سکول کی خانہ داریوں میں اوّل آنے کے دعوے کرتی۔ رہتی ہیں، کیوں نا آج پکوڑوں کا ٹیسٹ دکھا جائے۔ ثمینہ اور رفیعہ نے الگ الگ بیسن گھولا۔ اپنے اپنے کرتبوں سے مصالحے ڈالے اور تھوڑی ہی دیر میں دو چولہوں پر شوں شوں کا شاعرہ شروع ہو گیا۔ گھنٹہ نہ گزرا ہو گا کہ پکوڑیوں کے "پور" "تر" "تر" کے چیٹ کے پاتال تک اترنے لگے۔ ادھر ثمینہ کو کہا جاتا ابھی نمک کم ہے۔ ادھر رفیعہ کو پیاز کچی رہ جانے کی "چپ" دی جاتی۔ بس سبھی کھانے میں معروف، وہ دونوں غریب بیس گھولتے اور پکوڑے تلتی کے آدھی ہو گئیں۔ پر کسی منہ پر تعریف کا ایک حرف نہ آتا تھا ـــــ وہ دن پھر کیوں نہیں آتا؟

ٹھنڈی سانس بے ساختہ نکل گئی، شاید کوئی دن پھر لوٹ کر نہیں آتے۔ دن گزر جاتے ہیں تو پھر کہاں سے آئیں۔ خود آدمی بھی ویسا نہیں رہتا۔ بے شک ہر روز ایک جیسی بات ہو مگر پھر بھی وہ بات نہیں ہوتی۔ جیسی کل تھی۔ میں شاید یونہی ان دنوں کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں جو گزر گئے ہیں۔ کہانی شاید ایسے ہی بنتی ہے۔ روز نئی کہانی کہاں سے آئے اور شاید ہر روز ایک ہی کہانی دوبارہ آ کھڑی ہوتی ہے یا پھر ایک ہی کہانی چلتی رہتی ہے۔ دن بدل جاتے ہیں۔ کیلنڈر دیوار سے اتر جاتے ہیں، پر وہاں جو نیا کیلنڈر لگا دیا جاتا ہے، وہ بھی وہی ہوتا ہے۔ بس تصویر، منظر یا رنگ نیا ہوتا ہے۔ شاید اس تصویر کو بدل کے ہم اپنے آپ کو کوئی دلاسہ دیتے ہیں، ورنہ نئے اور پرانے کیلنڈر میں کیا فرق ہوتا ہے؟

کھٹ، کھٹاک ـــــ ٹائپ مشین جلدی جلدی کام کر رہی ہے اور اس پر لگے کاغذوں کے صفحے کھٹ کھٹ ربن کے نیچے رنگین ہوتے جا رہے ہیں۔ لکھے دن لکھتا چلا جا رہا ہے۔ لفظ لکھے جا رہے ہیں، ایک جیسی بات، ایک ہی رنگ میں، پھر بھی صفحہ بدل رہا ہے ـــــ کھٹ کھٹ، کھٹاک ـــــ آہا چسکا۔

نو ۔ ماہ ۔ اب تم بھی گوٹ نہیں گز رسکتے! ـــــ خورشید کی آواز، کل کی بات کی طرح اس کے کانوں میں جاگ رہی ہے۔ وہ چاروں لوڈو کھیل رہے تھے۔ رفیعہ، ثمینہ اور خورشید اسے خوب تنگ کر رہے تھے۔ سب کی گوٹیں اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالے بیٹھی تھیں۔ اس زمانے میں اس کھیل میں

تھوڑی بہت بے ایمانی بھی چل جاتی تھی۔ پھر اس بے ایمانی پر جو جھگڑے ہوتے تھے اس کا مزہ کیسا تھا؟ ابّا تو ان باتوں کو کبھی پسند نہ کرتے تھے۔ پر چچا جان بچوں کے ساتھ بچے بن کر اس بے ایمانی کا عجیب و غریب فیصلہ کرتے تھے۔ کافی دیر تو وہ خود بھی ساتھ مل جاتے تھے اور پھر کھیل ختم کر کے اور سب کو خوش کر کے اٹھتے تھے۔ پر آج چچی جان ہمارے لئے غصّہ اور نفرت کا پہاڑ کیوں بن گئے ہیں؟

اُس کی ہر کیوں کا جواب اُسے ایک اور پرانے منظر کی یاد تازہ کرا دیتا تھا، ایک سال اوپر، ایک کلاس اوپر پیچھے کی کوئی بات۔ بچپن میں نئی کتابیں خریدنے کا شوق کتنی خوشیوں سے جنم لیتا تھا۔ میری جماعت کے بعد کتابیں ثمینہ کے کام آتی تھیں۔ اس سے اگلے برس وہی کتابیں دوبارہ رفیعہ کو مل جاتی تھیں اور پھر ان میں سے بچی کھچی کتابیں اگلے ہی سال واپس خورشید کے پاس چلی جاتی تھیں —— اب ہر برس ہمارے بچے نئی نکور کتابیں لیتے ہیں اور پھر وہ بھی پورا سال نہیں چلتیں۔ ایک دو بار گم ہوتی ہیں یا پھر پھٹ جاتی ہیں۔

دس روپے کا نوٹ ایسے ہی پھٹ گیا تھا۔ میں نے کھینچا مگر ثمینہ نے نہ چھوڑا اور یوں آدھو آدھ ہو کے دس روپے کے نوٹ نے دو خاندانوں کو گنوا کر ڈالا۔ اُس دن سے پہلے یہ ایک خاندان کہلاتا تھا مگر اب دو خاندان! کمیٹی ثمینہ نے ڈالی تھی۔ پر مجھے پہلی کمیٹی دینے کا وعدہ کر کے دس روپوں کا نوٹ مجھ سے جھپٹ لیا۔ یوں نوٹ لیتے ہی کہنے لگی۔ میں نے تو یونہی سب کو پہلی کمیٹی کا جھانسہ دے کر سب سے پیسے وصول کر لئے ہیں۔ بھلا کمیٹی ڈالنے والا بھی دوسروں کو پہلی کمیٹی دیتا ہے۔ بس میں نے نوٹ کھینچا اور نوٹ کے دو ٹکڑے! ابّا کو تو جیسے آگ لگ گئی۔ انہوں نے نہایت سخت لفظ استعمال کئے۔ چچی جان نے جو اباّ بات کر کے معاملہ بہت ہی بڑھا لیا۔ طاقی بند ہوگئی۔ آنگن الگ۔ کمرے الگ —— کھانا پینا علیحدہ ہوگیا۔

پر پہلی بات یہی نہ تھی —— اس سے پہلے باتیں جمع ہوتی رہی تھیں۔ اس کا آغاز عجیب انداز میں ہوا۔ اہم بات یہ تھی کہ ابّا مزاج کے بہت سخت تھے، اُدھر چچی کو بھی تحمل چھو کر نہ گیا تھا۔ کسی بات کا اُدھار نہ رکھتی تھیں۔ ابّا کو غصّہ کم آتا تھا مگر جب ایک بار ناراض ہو جاتے تو پھر پکڑ میں نہ آتے تھے۔ ایک دن امّاں سے چچا جان نے بات چلائی۔ امّاں بولیں بچّو! مجھے تم سے کون زیادہ ہے؟ دونوں ایک دوسرے کا حال جانتے ہیں۔ چھوٹوں بڑوں کو چھوڑو۔ گھروں کے رشتے ایسے جُڑ جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کی پردہ پوشی ہم نہ کریں گے تو ہمیں کس نے پوچھنا ہے؟ —— ابّا کو اس بات پر قطعی کوئی اعتراض نہ تھا۔ بھائی کا گھر اپنا آنگن۔ امّاں ٹھیک کہتی تھیں۔ جو خود بیٹھ مہندی گھولیں گے، آپ مل کے جھمرڈ لیں گے۔ پر چچی کو یہ گانٹھ پسند نہ آئی۔ کُھل کے تو نہ کہہ سکیں۔ پر جس دن دس روپے کا نوٹ پھٹا۔ اس کی بھی باری آگئی —— دونوں طرف سے وہ تلخ کلامی اور بدزبانی ہوئی کہ امّاں اور چچا کے ہاتھ جوڑنے، پاؤں پڑنے —— کسی کام نہ آئے اور طاقی بند ہوگئی، اور دونوں صحنوں کی آگ ٹھنڈی ہوئی۔

ویگن میں وہ بُری طرح سے پھنسا بیٹھا تھا —— پر اُس کے دل و دماغ کو ایسی کوئی بھی جگہ اپنے سفر پر جانے سے نہیں روک سکتی تھی۔ ویگن اور کہانی ایک ساتھ چل رہے تھے۔ مگر یہ کہانی کونسی نئی تھی۔ پہلے لوگوں کے دن رات بھی تو اس کہانی سے الگ نہ رہے تھے۔ پھوپھی تمنّا کی بات کیوں ٹوٹی تھی۔ ماموں منظور کو حاجی باراتی سے کیوں بدلا گیا تھا اور ان کے سسرال جن کی بیٹی ڈولی میں بیٹھنے والی تھی، کیوں صرف انتظار کرتے رہے اور کسی نے انہیں یہ اطلاع تک نہ کی کہ اب منظور حسین کی بارات نہیں آئے گی۔ آخر کیوں؟ —— ہر وقت کوئی نہ کوئی بگڑی کیوں رہتی ہے، کوئی باپ اتنا سخت مزاج کیوں ہوتا ہے؟ —— یہ کہانی کب سے چلی آرہی ہے، ہمارے بعد بھی کب تک یہ ایسے ہی چلتی رہے گی۔ ہم خود اس کہانی کے کردار کب بنیں گے؟ آخر ہمیشہ اس کہانی میں کردار باہر سے کیوں آجاتے ہیں؟ —— اس کی ہر کیوں کا جواب، ایک اور کیوں پر جا پڑتا تھا۔ کہانی ختم نہ ہو پاتی!

طاقی بند ہونے سے پہلے اُس نے سُنا کہ مائی صغراں کے تئیں پر چچی نے کسی سے کہا ہے کہ ہم اپنی ثمینہ کا رشتہ فلاں نوابوں کے ہاں کر رہے ہیں، ہم نے نہیں دینی اس کو ڈیٹے کو! —— ابّا تک بات پہنچانے والوں نے ذرا دیر نہ کی۔ انہوں نے بھی کھڑکی کے پاس جا کر زور سے کہا۔ ہم نے بھی نہیں لینی یہ مینکو! حالات ایسے بگڑے کہ امّاں اور چاچا کے سانس سوکھتے گئے اور آخر طاقی بند ہوگئی۔

جھٹکا دے کر اُس نے دروازہ کھولا اور بڑی مشکل سے وہ ویگن سے نکلا۔ گھر پہنچا تو اس کی بیوی نے آلو مرغی پکا رکھے تھے۔ اس رات بھر اسے دن نکلے تک نیند نہ آئی۔ پہلے ثمینہ کی منگنی ہوئی۔ پھر آخر طاقی کے اُس پار وہ کسی نواب زمیندار کی بہو بن کر رخصت ہوگئی۔ ادھر ابّا نے بھی جھٹ

ایک اُونچا خاندان ڈھونڈ نکالا اور جھٹ پٹ اُس کی شادی نذیراں سے کردی ـــ دونوں کی اونچی چھلانگیں چاروں شانے چت پر ختم ہوئیں۔ زیادہ دن نہ گزرے جو نواب در محمد کی بیٹی روٹھ کر میکے جا بیٹھی اور ثمینہ بھی روتی دھوتی اپنے گھر واپس آ بیٹھی۔ دونوں نواب ناموں کے زیادہ اور مربعوں کے کم تھے۔ ثمینہ کا میاں بالکل اَن پڑھ اور جاہل تھا، گھر کا ماحول بالکل اُجڈ اور گھر کے لوگ شہریوں پر ٹوک ٹوک کرنے کے سوا کچھ نہ جانتے تھے۔ ادھر اکرم کی بیوی کا باپ صرف ڈیڑھ مربعے کا مالک تھا اور نوابی بطور تخلص نذیراں کو کام کرنا آتا تھا نہ وہ کام کرنے کی عادی تھی آخر اکرم کے باربار اصرار پر اُس نے کھانا بنایا بھی تو مرغی میں آلو ڈال دیئے۔ اُس دن اکرم رو دیا۔

اب یہ رونا بیکار ہے۔ زندگی یونہی گزرے گی۔ ثمینہ اپنے میکے بیٹھی رو رہی ہے اور میں یہاں اپنے گھر میں نذیراں کے ساتھ رہنے کے باوجود نذیراں کے ساتھ نہیں ہوں۔ گھروں کے بیچ طاق بند ہے۔ ہم اس طاق کو نہیں کھول سکے پر رفیعہ اور خورشیدا بھی اس طاق کو کھولنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ اگر اُن کی باری پر بھی یہ طاق بند رہی تو پھر یہ کہانی کبھی ختم نہیں ہوگی۔ یونہی چلتی رہے گی ـــ میں آج ہی ماموں حافظ کے پاس جا کر ہاتھ جوڑ کر التجا کروں گا کہ خدا کے لئے اس کہانی کے کرداروں کو طاق پار کرنے دیا جائے اور کہانی کو اس کے فطری آغاز اور درست ڈگر سے گزرنے دیا جائے!

جولائی ۸۶ء

خوشی کی بات نہ کر اِن اُداس لوگوں سے
یہ سادہ لوگ ہیں، رکھتے ہیں آس لوگوں سے
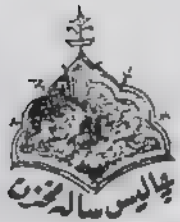
زمیں سفر میں ہے، اپنی جگہ ہے کون یہاں
سہارا مانگنا کیا بے اساس لوگوں سے

ستارے ٹوٹتے رہتے ہیں، بجھتے رہتے ہیں
تو کیا امید ستارہ شناس لوگوں سے

ـــ صابر ظفر

عکس تحریر: ـ صابر ظفر

# کالی اُنگلی

انور ممتاز

ساری دنیا میں ایک پیرس ہے اور پیرس میں ایک شانزالیزے اور شانزالیزے میں سب کچھ ہے۔ پھر میں کسے ڈھونڈ رہا ہوں؟ مجھے کس کی تلاش ہے؟

اس دے سائڈ کافے کی دیواریں پلاسٹک کی بنی ہوئی ہیں۔ ان میں سے شانزالیزے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نظر آ رہا ہے۔ خوبصورت کاریں چمکدار سڑک پر تیرتی ہوئی گزر رہی ہیں۔ ملک ملک کے سیاح اپنے کندھوں سے کیمرے لٹکائے حسین عورتوں کے بازوؤں میں بازو ڈالے ہشاش بشاش ٹہلتے پھر رہے ہیں۔ حسین عورتوں کے حسین لباسوں میں حسین جسم نظر آ رہے ہیں۔ شانزالیزے ایک دلہن کی سج دھج کے ساتھ میرے سامنے ہے۔ پھر میں کیوں بے تاب ہوں؟ میں کیا دیکھنا چاہتا ہوں؟

اور اگر اس دے سائڈ کافے کی پلاسٹک کی دیواروں میں سے میں کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ تو یہاں کیوں بیٹھا ہوں؟ میں کتنا بے وقوف ہوں۔

اور میرے پاس سیزن کے لئے انٹروڈکشن لیٹر ہے۔ میں اس کو ڈھونڈنے کے لئے کیوں نہیں چلا جاتا؟ آج صبح جب میں یک بک شاپ سے پیرس گائیڈ بک خرید رہا تھا، تو ایک نیلی آنکھوں والی دلفریب عورت نے مجھے کہا تھا "میں آپ کے لئے گائیڈ بک سے زیادہ مفید ثابت ہوں گی مجھے اپنے ساتھ لے چلئے" میں نے اُسے "تھینک یو" کیوں کہا۔ وہ میرے لئے یقیناً گائیڈ بک سے زیادہ مفید ثابت ہوتی، اور میں اس دے سائڈ کافے کے شور میں تنہائی محسوس نہ کرتا۔

میں بہت دیر سے اس میز پر تنہا بیٹھا ہوں۔ کتنی دیر تک اس میز کے اِردگرد پڑی ہوئی تین خالی کرسیاں میری غمگسار بنی رہیں۔ اب دو کرسیاں کافے کے دوسرے گاہکوں نے میری اجازت سے لے لی ہیں۔ اب میرا تنہائی کا احساس زیادہ گہرا ہو گیا ہے۔ میرے دو خاموش دوست مجھ سے جدا ہو گئے ہیں۔ اب صرف ایک خالی کرسی میرے سامنے سے اٹھا کر کیوں نہیں لے جاتا؟

او میرے خدا! میں سمجھ گیا۔ اس کرسی پر کوئی نہیں بیٹھے گا۔ میں سفید قوموں کی دنیا میں ہوں۔ میں کالی قوم کا فرد ہوں۔ سفید قومیں ترقی یافتہ ہیں، کالی قومیں پسماندہ۔ سفید قومیں حاکم ہیں، کالی قومیں غلام۔ یہ کرسی خالی رہے گی۔ اس کرسی پر کوئی نہیں بیٹھے گا۔

اے میرے خدا! اس کرسی پر کوئی سفید قوم کا نمائندہ نہ بیٹھے۔ سفید قوموں کے نمائندے سیاہ قوموں کے نمائندوں سے بہتر نہیں ہیں۔ سیاہ قوموں کے نمائندے سفید قوموں کے نمائندوں سے بہتر انسان ہیں۔ سفید قوموں کے نمائندے اپنے وطن کی محبت کے ثبوت میں ہیروشیما پر ایٹم بم پھینک دیتے ہیں، سیاہ قوموں کے نمائندے اپنے وطن کی محبت میں اپنے خون کا آخری قطرہ بھی پیش کر دیتے ہیں۔ اے میرے خدا! اس خالی کرسی پر کوئی سیاہ فام انسان آ کر بیٹھے۔ مجھے کسی کالی قوم کے فرد کی تلاش ہے۔ میں شانزالیزے کی دلکش فضا میں کسی کالے بدصورت انسان کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ مجھے دے سائڈ کافے کی پلاسٹک کی دیواروں میں سے سب کچھ نظر آتا ہے، لیکن کوئی کالا آدمی نظر نہیں آتا۔

کوئی الجیریا کا کالا باشندہ میرے سامنے بیٹھا ہو تو میں اُسے کہوں: "اپنے وطن پر اپنے خون کا آخری قطرہ بھی قربان کر دو۔ اپنے وطن کے لئے خود مٹ جانا اپنے وطن کے لئے دوسروں کو مٹانے سے بہتر ہے۔ مٹ جاؤ، اپنے وطن کی آزادی پر قربان ہو جاؤ۔"

کوئی میرا سیاہ فام ہم وطن اس کرسی پر بیٹھا ہو تو میں اسے ایک خوش خبری سناؤں۔ میں اسے بتاؤں کہ پاکستان گیارہ سال کی صبر آزما مدت کے بعد سیاستدانوں کے خود غرض پنجوں سے آزاد ہو گیا ہے، وزارتوں اور اسمبلیوں کو توڑ دیا گیا ہے، ملک میں مارشل لاء کا نفاذ ہو گیا ہے اور تمام ملک میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی ہے۔

کاش میرے سامنے کوئی کالا آدمی بیٹھا ہو!

یکایک ایک کالی انگلی میری نظروں سے ٹکرائی۔ کالی انگلی خالی کرسی کی بیک پر نمودار ہوئی، پھر اُس کے پیچھے خوبصورت سیاہ لباس میں ملبوس ایک خوبصورت سفیدفام عورت نمودار ہوئی اور اس نے کالی انگلی سے کرسی کی طرف اشارہ کر کے مجھے کہا،
"کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟"
میں اُس کو غور سے دیکھنے لگا۔ سفید عورت! سیاہ لباس! کالی انگلی! یا خدا اب کیا کروں!

میں نے کہا،
"تشریف رکھئے۔"
وہ تعارف کرانے کے لئے بولی: "میں زی زدلین کریر ہوں۔ میرے دوست مجھے زینا کہتے ہیں۔ میں یونیورسٹی میں آرٹ کی سٹوڈنٹ ہوں۔"
میری روح نے اُسے خوش آمدید نہ کہا۔ میری زبان نے بداخلاقی گوارا نہ کی۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور جب دیر تک کوئی بات نہ سوجھی تو میں نے خاموشی کی بدمزگی سے بچنے کے لئے کہا،
"غالباً آپ سوسن میکفرسن کو تو نہ جانتی ہوں گی۔ وہ بھی یونیورسٹی میں آرٹ کی سٹوڈنٹ ہیں۔"
"اوہ! سوسی! خوب جانتی ہوں۔ سوسی کو سب جانتے ہیں۔"
"میرے پاس اس کے باپ کا خط ہے۔"
"میں ملا دوں گی سوسی سے آپ کو۔"
"آپ کیا پئیں گی؟ شمپین؟"
"جی نہیں۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں۔"
میں کھسیانا ہو گیا۔ اس کے جواب میں روکھا پن تھا۔ جیسے وہ میری بات سے ناراض ہو گئی ہے۔ چند لمحوں کے بعد مجھے اس کے لہجے میں غرور اور بدتہذیبی بھی محسوس ہونے لگی۔ میں نے اپنے اردگرد دیکھا۔ دوسری میزوں پر بھی کرسیاں خالی تھیں۔ پھر وہ میرے سامنے آ کر کیوں بیٹھ گئی ہے اور اس کی گفتگو کا آغاز تو بالکل عام لڑکیوں جیسا تھا۔

اس نے اپنا ہینڈ بیگ کندھے سے اتار کر میز کے دائیں کونے میں رکھ دیا اور کتاب بائیں کونے میں۔ پھر اس نے کتاب کو بائیں کونے سے اٹھا لیا اور اس کو دائیں کونے میں رکھ کر اس کے اوپر ہینڈ بیگ رکھ دیا۔ پھر وہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئی اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولی:
"آپ کیا کھائیں گے؟"
میرا خیال تھا کہ وہ اب مجھ سے کوئی بات نہ کرے گی اور میرا بھی اس سے بات کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس کے اچانک سوال سے میں بوکھلا گیا اور یہ کچھ عجیب بات بھی تھی۔ ہوٹلوں میں پیشکش ہمیشہ مرد کی طرف سے ہوتی ہے۔ مجھے پوچھنا چاہئے تھا آپ کیا کھائیں گی؟ لیکن میں تو پوچھ چکا تھا۔ فیشن کے مطابق پینے کے بارے میں پوچھا جاتا ہے۔ میں نے بوکھلا کر جواب دیا:
"جی، میں ــــــ میں کچھ نہیں کھاؤں گا ــــ"
وہ جلدی سے میری بات کاٹ کر بولی: "میں ہوسٹل سے کبھی کبھی نکلتی ہوں۔ جب نکلتی ہوں، تو پینے کے لئے نہیں، کھانے کے لئے۔ ہوسٹل کے کھانوں سے اُکتائے پڑے ہیں ہم لوگ۔ کبھی کبھی چینج کے طور پر باہر کھانے میں لطف رہتا ہے۔ آپ کھا چکے ہیں؟"
میں سراسیمگی کے عالم میں بولا: "جی نہیں۔"

وہ چلائی: "گارسان، گارسان۔"

گارسان (بیرا) آ گیا۔

"دو پلیٹ پوٹیٹو چپس اینڈ فش!"

میرے چہرے پر احتجاج کے آثار دیکھ کر وہ جلدی سے بولی: "مجھے تلے ہوئے آلو اور روسٹ کی ہوئی مچھلی بہت پسند ہے۔ اگر میں آپ کو آرڈر دینے کی اجازت دے دیتی تو آپ پوٹیٹو چپس اور فش کی بجائے فرانس کے مشہور پُر تکلف کھانوں کا آرڈر دیتے۔ مجھے پُر تکلف کھانوں اور شرابوں

سے نفرت ہے۔ آلو اور مچھلی غریبوں کا کھانا ہے، میں غریب ہوں۔ اس سے زیادہ پیش نہیں کر سکتی۔"

میں نے کہا: "میڈم، میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے اجازت دیجئے۔"

اس نے فوراً موضوع بدل دیا: "مجھے میڈم کا لفظ پسند نہیں۔ آپ مجھے زیزا کہہ سکتے ہیں لیکن مجھے زیزا کہتے ہوئے آپ کو کوئی رومانٹک احساس نہیں ہونا چاہئے۔ زیزا بڑا آرٹسٹک لفظ ہے۔ اس میں حروف اور آواز رنگوں کے امتزاج کی طرح ایک دوسرے میں تحلیل ہو گئے ہیں۔ مجھے کوئی زیزا کہتا ہے تو میں محسوس کرتی ہوں میں ایک آرٹسٹ ہوں۔ اور زیزا میری تخلیق۔ آپ مجھے زیزا کہئے، میں دیکھنا چاہتی ہوں آپ کی آواز میں موسیقی ہے یا نہیں۔"

اب مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ زیزا ایک دلچسپ اور ذہین لڑکی ہے، عام لڑکیوں سے مختلف۔ اس لئے میری بات میں میرے جذبات شامل ہو گئے۔

میں نے کہا: "زیزا، مجھے اجازت دیجئے، میں آپ کے لئے لنچ کا آرڈر دوں۔"

لیکن بیرا دو پلیٹ پوٹیٹو چپس اور فش لے کر آ گیا اور ہم کھانے میں مشغول ہو گئے۔

کچھ دیر تک ہم چپ چاپ آلو اور مچھلی کھاتے رہے۔ پھر وہ بولی:

"جب میں ہوسٹل سے باہر آتی ہوں تو کسی سے ملنا پسند نہیں کرتی۔ اکیلی رہنا چاہتی ہوں۔ ہوسٹل کی شور شرابے کی زندگی سے باہر نکل کر کچھ عرصہ بالکل تنہا اور خاموش رہنے کو دل چاہتا ہے۔ میں مردوں کے ڈانس اور سینما کے پروگراموں کو بڑی حقارت سے ٹھکرا دیتی ہوں۔"

میں نے پریشان ہو کر کہا: "زیزا، مجھے افسوس ہے میں آپ کی تنہائی کی لذتوں میں مخل انداز ہو رہا ہوں۔"

اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں: "لیکن جب کبھی مجھے کسی سیاہ قوم کا فرد نظر آ جاتا ہے، تو میرا سر احترام سے جھک جاتا ہے اور میں اسکی تعظیم کے لئے اس کے پاس چلی جاتی ہوں۔"

میں حیران ہو گیا: "زیزا، کیا آپ اس بات کی وضاحت کر سکتی ہیں؟"

وہ ہنس پڑی: "اس بات کی وضاحت نہایت ضروری ہے۔ سنا ہے سفید عورتیں نیگرو اور دوسری کالی نسل کے مردوں کو بہت پسند کرتی ہیں۔ آپ کو میری بات سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔"

میں بھی ہنس پڑا۔

"میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں ایک آرٹسٹ ہوں اور رنگوں سے حسن کی تخلیق میرا کام ہے۔ عجیب بات ہے کہ مجھے رنگوں میں سب سے زیادہ کالا رنگ پسند ہے۔ یقیناً کالے رنگ کو تمام دوسرے رنگوں کی ملکہ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ یہ رنگ سب سے افضل ہے۔ میرے رنگ بڑے گہرے ہوتے ہیں۔ میں ہر رنگ میں کالا رنگ شامل کر دیتی ہوں۔ میرے سٹوڈیو میں ایک پورٹریٹ ہے جس کو پینٹ کرنے میں میں نے اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دی ہیں۔ وہ تصویر میری نمائندہ پینٹنگ ہے، وہ میرا ماسٹر پیس ہے، اس میں ایک جوانمرد کا سیاہ فام چہرہ ہے۔ سیاہ فام چہرے کے پیچھے گہرے سرخ خون کا سمندر ہے، خون کے سمندر میں حرکت اور قوت کا طوفان ہے۔"

میں مرعوب آواز میں بولا: "زیزا، کیا مجھے اس ماسٹر پیس کو دیکھنے کا شرف حاصل ہو سکتا ہے؟"

"آپ منوسی کو ملنے جائیں گے۔ ہم دونوں ایک ہی سٹوڈیو میں کام کرتی ہیں آپ وہاں پینٹنگ بھی دیکھ سکیں گے۔"

زیزا نے یہ فقرے جلدی جلدی کہے۔ جیسے اس کو میری قطع کلامی پسند نہیں آئی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی: "یہ پورٹریٹ پینٹ کرنے کے بعد مجھ پر ایک بہت بڑی حقیقت کا انکشاف ہوا۔ میرا تخیل وسیع ہو گیا اور کالا رنگ میرے سٹوڈیو سے نکل کر دنیا کی کالی قوموں کی حدود تک پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ سیاہ رنگ سفید رنگ کے پیروں کے نیچے پڑا سسک رہا ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ سیاہ رنگ میں حرکت اور قوت پیدا ہوئی اور وہ سفید رنگ کی غلامی سے آزاد ہونے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اب جہاں بھی میں کسی سیاہ قوم کے فرد کو دیکھتی ہوں، میرا سر احترام سے جھک جاتا ہے اور میں اس کی تعظیم کے لئے اس کے پاس چلی جاتی ہوں۔"

میں نے زیزا کی سیاہ انگلی اور اس کے سیاہ لباس کو دیکھتے ہوئے کہا،

"تھینک یو، زیزا"

آلو اور مچھلی ختم ہو گئی۔ کوفی آ گئی۔ زیزا نے کوفی بناتے ہوئے کہا: "میرا خیال ہے آپ الجیریا کے باشندے ہیں۔ آپ کا ملک آزادی کے لئے لڑ رہا ہے۔ میری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔"

میں نے کہا: "جی نہیں۔ میں الجیریا کا باشندہ نہیں ہوں۔ میرے ملک کا نام پاکستان ہے۔"

وہ جلدی سے بولی: "میں جانتی ہوں۔ میرے والد وہاں ۱۹۳۷ء میں سفیر تھے۔ بڑا اچھا ملک ہے پاکستان۔ انگلش میں اس کو انڈیا کہتے ہیں۔"

میں ہنس پڑا۔ "انگلش میں جس ملک کو انڈیا کہتے ہیں، وہ ہندوستان تھا۔ پاکستان ۱۹۴۷ء میں ایک نیا ملک وجود میں آیا ہے اور ۱۹۴۷ء ہی میں ہم نے انگریزوں کی حکومت سے آزادی حاصل کی۔"

وہ کسی قدر کھسیانی ہو گئی اور اپنے کھسیانہ پن کو چھپانے کے لئے بلند آواز میں بولی۔

"او — لا، لا۔ آپ کا ملک آزاد ہو گیا ہے۔ مبارکباد!"

ہم کچھ دیر خاموشی سے کوفی پیتے رہے۔ میں زیزا کے بارے میں کچھ زیادہ جاننے کا متمنی تھا۔ لیکن مجھے ذاتی سوالات کرنے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔ آخر میں نے براہِ راست سوالات کرنے کی بجائے دوسرے طریقوں سے اس کے بارے میں معلومات کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے کہا:

"آپ مجھے فرانسیسی لڑکی معلوم نہیں ہوتیں۔"

وہ فرانسیسی لڑکی کے الفاظ پر کچھ چیں بجبیں ہو گئی اور بولی:

"میں ایک جرمن لڑکی ہوں۔ مجھے تعجب ہے آپ اندازہ نہ لگا سکے۔"

"مجھے یقین تھا کہ آپ فرانسیسی لڑکی نہیں ہیں۔ آپ کی سطح عام لڑکیوں سے بہت بلند ہے۔"

"دنیا میں صرف جرمن لڑکیوں نے عورت کے بنیادی وقار کو بلند کیا ہے۔ عورت کو مرد کے برابر کی حیثیت دینے کی صدائیں ہر ملک سے اٹھی ہیں۔ لیکن اس جدوجہد میں کامیابی صرف جرمن لڑکیوں کو حاصل ہوئی ہے۔ صرف جرمن لڑکیوں پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ عورت دنیا کو حسن و عشق کی داستانوں سے سجانے کے لئے پیدا نہیں ہوئی۔ انسان کی سوسائٹی میں عورت کا سب سے اہم رول حسن و عشق نہیں ہے۔ عورت کا رول انسانی سوسائٹی کی تشکیل میں حسن و عشق سے بہت بلند ہے۔ حسن و عشق عورت کی منزل نہیں۔ دنیا کا غم دوست کے غم سے زیادہ اہم ہے۔ ملک کے مسائل محبوب کی محبت سے زیادہ اہم ہیں۔ ملک کے مسائل محبوب کی محبت سے زیادہ دلکش ہیں۔ حسن و عشق کی داستان میں عورت مرد کے سامنے ایک ذیلی حیثیت اختیار کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ حسن و عشق عورت کو ایک گڑیا اور ایک کھلونا بنا کر مرد کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں اور اس طرح عورت مرد کے برابر کی حیثیت سے زندگی کے بیشتر حقوق سے محروم ہو جاتی ہے۔ صرف جرمن لڑکیوں نے اس حقیقت کو پہچانا ہے۔ اور میں ایک جرمن لڑکی ہوں۔"

میں بہت مرعوب ہو گیا۔ میری زبان بند ہو گئی۔ لیکن میں تو زیزا کے زندگی کے حالات جاننا چاہتا تھا۔ جو کچھ اس نے بتایا ہے وہ تو مجھے اسی وقت معلوم ہو گیا تھا جب اس نے میری شمپین کی پیشکش ٹھکرا دی تھی۔

میں چپ بیٹھا رہا

وہ بھی چپ بیٹھی رہی

پھر اس نے اپنی کالی انگلی کوفی کپ کے ہینڈل میں ڈالنے کے لئے آگے بڑھائی۔ میں نے کہا:

"آپ اپنی کالی انگلی کے بارے میں کچھ بتا سکیں گی؟"

اس نے کوفی کپ کے ہینڈل سے اپنی کالی انگلی نکال لی اور میز پر کہنی رکھ کر اس کو میری آنکھوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اور بولی:

"میری کالی انگلی کے پیچھے میرا سفید ہاتھ ہے۔ میرے سفید ہاتھ کے پیچھے میرا سنگ مرمر جیسا بازو ہے اور میرے سنگ مرمر جیسے بازو کے پیچھے میرا دودھ جیسا بدن ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سفید انگلی سفید ہونے کے باوجود کالی ہو سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سفید قوموں کی قسمت سفید ہونے کے باوجود کالی قوموں کی قسمت جیسی ہو سکتی ہے۔ میرا پیارا ملک جرمنی ادبار کی اسی گہرائی میں ہے جہاں الجیریا ہے۔"

غضب ہو گیا۔ اس کی نیلی نیلی بو جیسی خوبصورت آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں نے جلدی سے کہا:

"زیزا، تم آرٹسٹ ہو۔ تم بہت بڑی آرٹسٹ ہو۔"

اس نے میری بات نہ سُنی۔ اپنی بات کرتی رہی

"لیکن میری کالی انگلی اگر کالی قوموں کی قسمت کی یاد دلاتی ہے۔ تو یہ کالے رنگ کی اوگرا نڈیل سیاہ دشمن کی بھی یاد دلاتی ہے۔ یہ اس سیاہ فام پورٹریٹ کی یاد بھی دلاتی ہے جس کے خون کے سمندر میں حرکت اور قوت کا طوفان ہے اور جس کو اس کالی انگلی نے خود بنایا ہے۔"

میں ہمہ تن گوش بیٹھا رہا۔ میں نے داد دینی بھی مناسب نہ سمجھی۔ ایسا نہ ہو اُس کی مُوڈ بگڑ جائے اور اُس کی روانی میں فرق آجائے۔

میری توقع کے خلاف اس نے اپنی کہانی شروع کر دی۔

"جب ۱۹۴۷ء میں آپ کا ملک آزاد ہوا، میں قید میں تھی۔"

میں نے اُس کو اکسانے کے لئے خواہ مخواہ حیرت کا اظہار کیا۔

"آپ قید میں؟ کیوں؟ کہاں؟"

"آئرن کرٹن کے پیچھے۔ روس کے فولادی پردے کے اندر مشرقی برلن میں۔ میں، میرا بھائی، میری ماں، میرا باپ۔ میرا باپ فورجن سروس میں تھا۔ ہمارے فیوہرر ہٹلر کو میرے باپ پر بڑا اعتماد تھا۔ اس نے میرے باپ کو بڑے بڑے اہم غیر ملکی مشنوں پر بھیجا۔ اسی سلسلے میں وہ ۱۹۳۷ء میں انڈیا گیا۔ پچھلی جنگ کے دوران میں میرا باپ فیوہرر کا دایاں بازو بن گیا۔ بدقسمتی سے جرمنی جنگ میں ہار گیا۔ برلن تقسیم کر دیا گیا۔ ہمارا خاندان مشرقی برلن میں آگیا۔ میرا بھائی فیوہرر کی فوج کا بڑا ہونہار افسر تھا۔ ہمارے سارے کنبے کو جیل میں پھینک دیا گیا۔ اور ہمارے گھر پر قبضہ کر لیا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد مجھے اور میری ماں کو رہا کر دیا گیا۔ میں اُس وقت بارہ تیرہ سال کی تھی۔ میری ماں ایک ہوٹل میں ملازم ہو گئی اور ہمیں سیڑھیوں کے نیچے ایک خلا میں رہنے کی جگہ مل گئی۔ ایک دن میری ماں ہوٹل کی سیڑھیاں دھو رہی تھی کہ ہوٹل کے سامنے دو لاشیں آئیں۔ وہ میرے باپ اور بھائی کی لاشیں تھیں! میرے بھائی کی کنپٹیوں میں گولی ایک طرف سے دوسری طرف نکل گئی تھی۔ اور خون کا نوں، آنکھوں اور ناک پر بہتا ہوا کپڑوں پر گر کر جم گیا تھا۔ میرے باپ کے سر کے پیچھے گولی نے کھوپڑی کو توڑ کر ایک انچ قطر کا گول سوراخ کر دیا تھا۔ میری ماں اور میں ایک ہفتہ تک دھاڑیں مار مار کر روتے رہے۔ پھر ہوٹل میں رہنے والے میری ماں کے ساتھ ہمدردی اور دوستی کا سلوک کرنے لگے۔ میری ماں اور میں اکثر ہوٹل کے کسی مہمان کے ساتھ ڈنر، ڈانس، یا سینما میں چلے جاتے۔ لیکن زیادہ تر میں اکیلی گھر پر رہتی اور میری ماں آدھی آدھی رات تک واپس نہ آتی مجھ اکیلی کو بڑا ڈر لگتا۔ لیکن میں کیا کر سکتی تھی۔

"ایک دن ہوٹل میں ایک مہمان آکر ٹھہرا۔ اس کے بال لمبے تھے۔ سر چھوٹا اور منہ بنا ہوا فرنچ کٹ داڑھی سے اور بھی لمبا ہو گیا تھا۔ اس کی کنپٹیوں کے بال سفید تھے، گال خشک اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں۔ اس کی عینک کے موٹے موٹے شیشوں میں سے اس کی آنکھوں کے ڈھیلے موٹے موٹے اور ڈراؤنے نظر آتے تھے۔ اس کا نام البرٹ بکواسو تھا۔"

میں چونک پڑا۔

"کون البرٹ بکواسو؟ یہاں کی فرنچ فائن آرٹس اکیڈمی کا پرنسپل؟"

"جی ہاں۔ وہ وہاں روس کی دعوت پر اپنی تصویروں کی نمائش کرنے گیا تھا۔ میں نے اُس کے حلیے کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اس کو نہ بھولئے۔ اس کا آنے والے واقعات سے بڑا تعلق ہے۔"

میں نے کہا: "نہیں، یہ حلیہ بھولنے والی چیز نہیں۔"

"پروفیسر البرٹ بکواسو میری ماں کا بہت گہرا دوست بن گیا۔ وہ اکثر میری ماں کو کئی کئی گھنٹوں کے لئے باہر لے جاتا اور میں گھر پر کئی ڈرا کرتی۔ ایک دن میری ماں کہیں گئی ہوئی تھی۔ پروفیسر البرٹ بکواسو آیا۔ اس کے بعد جو واقعات پیش آنے والے ہیں، ان کو بتانے سے پہلے آپ کی یادداشت تازہ کرنا چاہتی ہوں۔

میں نے کہا:

"جی۔ کہیئے۔"

"آپ کو یاد ہے میری عمر اس وقت کتنی تھی؟"

"بارہ تیرہ سال۔"

"اور آپ کو پروفیسر البرٹ بکواسو کا حلیہ یاد ہے؟"

"جی ہاں۔"

"پروفیسر البرٹ بکواسو اندر آیا میں اس کے پیروں پر گر پڑی۔ اور گڑگڑا کر بولی: پروفیسر بکواسو، مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے مجھے یہاں سے لے جاؤ۔ مجھے اپنی بیوی بنا لو۔ مجھے یہاں بہت ڈر لگتا ہے۔" پروفیسر بکواسو کچھ دیر مجھے حیرت سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے مجھے اپنے پیروں سے اٹھا کر اپنی گود میں لے لیا۔ اور بہت پیار کیا۔ دوسرے دن میں سیڑھیوں میں کھیل رہی تھی۔ پروفیسر بکواسو اور میری ماں اندر بیٹھے تھے۔ میری ماں نے مجھے آواز دی۔ میں اندر گئی۔ جونہی میں نے اندر قدم رکھا، میری ماں اور پروفیسر بکواسو زور زور سے ہنسنے لگے۔ میری ماں نے کہا: "زیزا تم پروفیسر بکواسو کی بیوی بننا پسند کرتی ہو؟" میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ میں شرم کے مارے زمین میں گڑ گئی۔ میری ماں اور پروفیسر بکواسو نے ایک اور قہقہہ مارا اور دیر تک ہنستے رہے۔ پھر میری ماں نے پروفیسر بکواسو سے کہا: "البرٹ، تم ٹھیک کہتے ہو، زیزا یہاں بے حد ناخوش ہے اور کسی نہ کسی بہانے اس ماحول سے نکل جانا چاہتی ہے۔ اس کی مدد کرو۔ میں ممنون ہوں گی۔" پھر جس دن پروفیسر بکواسو واپس آنے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی تصویروں کا بڑا صندوق کھولا۔ کچھ تصویریں نکال کر میری ماں کو دے دیں۔ اور ان کی جگہ مجھے بٹھا کر صندوق کو قفل لگا دیا۔ اور میں پیرس آ گئی۔"

بیرا بل لے کر آ گیا۔ میرے بہ اصرار منع کرنے کے باوجود زیزا نے دونوں بل ادا کر دئے اور سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں نے کہا۔

"زیزا، میں نے آپ کو کالی انگلی پر کچھ روشنی ڈالنے کے لئے کہا تھا۔"

"سٹوڈیو میں آپ کو شوسی سے ملنا ہے۔ اور اگر آپ کے پاس وقت ہوا تو مجھے آپ کو اپنا ماسٹر پیس دکھانا ہے۔"

ہم کیفے سے باہر آ گئے۔

میرے اصرار کے باوجود اس نے ٹیکسی سے انکار کیا۔ اور ہم پیدل سائن کی طرف چل پڑے۔

سائن کے پل کو عبور کر کے اور تھوڑی دور دائیں کنارے پر چل کر ہم یونیورسٹی پارک میں داخل ہو گئے۔ یونیورسٹی پارک میں گھاس کی مخمل بچھی ہوئی تھی، پھولوں کی پریاں ناچ رہی تھیں، ہوا کے جھونکے خوشبو بکھیر رہے تھے اور یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیاں مغربی پارکوں کی آزاد محبت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دریائے سائن شرم کے مارے پانی پانی ہوا جا رہا تھا اور شام چار بجے کا سورج مغرب کی گہرائیوں میں غرق ہونے کے لئے بھاگا جا رہا تھا۔

زیزا نے کہا:

"غور سے دیکھو، یہ ہماری تہذیب کا قبرستان ہے۔"

میں نے کہا:

"مجھے شرم آ رہی ہے۔"

اس نے کہا:

"شرمانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ ہماری زندگی کی سینما سکوپ فلم ہے جب ہماری بیٹیاں، بہنیں، مائیں اور بیویاں رات کو سینما ہالوں میں جا کر بڑی جرأت سے ایسی فلمیں دیکھ آتی ہیں، پھر آپ دن کو زندگی کی یہ فلم دیکھنے سے کیوں شرماتے ہیں؟"

میں نے کہا:

"زیزا، جلدی اپنے سٹوڈیو کو چلیے۔"

"لیکن ذرا ٹھہریے۔ اس سیب کے درخت کے نیچے دیکھیے۔ وہ جہاں پانی کا فوارہ موتی بکھیر رہا ہے اور گلاب کے پھولوں کا تختہ مہک رہا ہے۔"

میں نے طوعاً و کرہاً ادھر دیکھا۔

وہ بولی:

"یہ شوسی ہے۔"

میری چیخ نکل گئی

"سوسن؟"

"سوسن میکفرسن"

دونوں کے ہونٹ ملے ہوئے تھے، دونوں کے چہرے جذبات سے مسخ ہو گئے تھے، دونوں ایک نہایت مکروہ منظر پیش کر رہے تھے۔ میں بھاگ پڑا۔

"زنیرا، مجھے سوسن سے نہیں ملنا، خدا کے لئے اپنے سٹوڈیو میں چلو۔"

سٹوڈیو سادہ سا گندہ سا تھا۔ گرد و غبار اور بے ترتیبی تھی۔ فریم کی ہوئی تصویریں دیوار کے ساتھ ایک دوسرے کے سہارے رکھی ہوئی تھیں۔ میں ایزل کے پاس چلا گیا۔ ایزل پر زنیرا کے تاریخی ہیرو کی تصویر چڑھی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ کالا تھا۔ اس کے ماتھے پر سیاہ رنگ کی لکیریں تھیں۔ اس کو پہچاننا مشکل تھا۔ وہ الہ دین کا دیو معلوم ہوتا تھا۔

زنیرا بھی ایزل کے پاس آ گئی۔ اس نے اپنی کالی انگلی کو اپنے ہیرو کے ماتھے کی سیاہ لکیروں پر پھیرا اور کھوئے کھوئے انداز میں بولی:

"میرا ہیرو"

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔

"پروفیسر بکواسو کو میرے ہیرو سے نفرت ہے، میں اس کی تصویر پینٹ کر رہی تھی۔ وہ اندر آیا۔ کینوس پر میرے ہیرو کی تصویر دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے کینوس کو ایزل سے اتار کر زمین پر پٹخ دیا۔ اور اس کو پیروں سے مسل مسل دیا۔ اور اس کے اوپر کھڑا ہو کر چلانے لگا: اُس ذلیل کتے نے ایک مقدس سرزمین کو اپنے ناپاک پیروں سے روند ڈالا۔ اس جاہل انسان نے میرے سٹوڈیو کو جلا کر خاک کر دیا۔ یہ خونخوار بھیڑیا میری اکیڈیمی میں داخل نہیں ہوگا! میں غصے سے دیوانی ہو گئی۔ میں نے چلا کر کہا: پروفیسر بکواسو، اپنی بکواس بند کرو، اور دروازے کی طرف بھاگی۔ دروازے کے پاس کھڑی ہو کر میں نے کہا: اگر میرا ہیرو اکیڈیمی میں داخل نہیں ہو سکتا تو میں بھی یہاں نہیں رہ سکتی اور میں نے باہر نکلتے ہوئے زور سے دروازہ جھٹکے کے ساتھ دے مارا۔ میری انگلی دروازے میں آ گئی اور کالی ہو گئی۔"

میں نے کہا:

"لیکن زنیرا تو یہیں ہے۔ اور اس کا ہیرو بھی ایزل پر ہے۔"

"میں جا رہی تھی۔ پروفیسر بکواسو میرے کمرے میں آیا۔ اور میرے پیروں پر گر گیا۔ اور گڑ گڑا کر بولا: زنیرا تمہیں یاد ہے۔ تم چھوٹی سی تھیں۔ تم نے میرے پیروں پر گر کر کہا تھا: 'مجھے تم سے محبت ہے' وہ ایک مذاق تھا لیکن میں مذاق نہیں کروں گا۔ زنیرا، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے تم سے محبت ہے، تمہارے خوابوں کا دیوتا ایزل پر آ گیا ہے اور زنیرا یہاں سے کہیں نہیں جا سکتی۔"

کالی انگلی کا راز کھل گیا۔

اب مجھے زنیرا کا ماسٹر پیس دیکھنا تھا۔

میں نے کہا:

"زنیرا، میں آپ کا ماسٹر پیس دیکھنے کے لئے بے قرار ہوں۔"

زنیرا ایک کونے میں گئی۔ وہاں سے مخمل کے غلاف میں چھپی ہوئی پینٹنگ اٹھا لائی۔ اس کو بڑے احتیاط سے مخمل کے غلاف میں سے نکالا۔ اور تصویر کو ایزل پر رکھ دیا۔ اور مجھے آواز دے کر بولی:

"یہ ہے میرا ماسٹر پیس!"

میں ایزل کے سامنے گیا۔

اور خوشی سے نعرے کے انداز میں چلایا: "ٹیپو سلطان!"

سیاہ فام خون کا سمندر تھا۔ حرکت اور قوت کا طوفان تھا۔

میرا سر احترام سے جھک گیا۔ میں آہستہ آہستہ پینٹنگ کی طرف بڑھا۔ اور میں نے انتہائی تعظیم سے ٹیپو سلطان کے ماتھے کو بوسہ دیا۔
پھر میں نے اسی احترام اور تعظیم کے جذبات کے ساتھ زیزا کو مخاطب کیا:
"محترمہ، آپ ایک عظیم آرٹسٹ ہیں۔"
اس نے جواب دیا: ——— "تھینک یو!"
میں نے کہا: "محترمہ، کیا آپ میری ایک تمنا پوری کر سکتی ہیں؟"
"کیا؟"
"کیا آپ مجھے اس ہاتھ کو چومنے کی اجازت دیں گی جس نے ٹیپو سلطان جیسا شاہکار پیدا کیا ہے؟"
زیزا نے اپنا ہاتھ میرے سامنے کر دیا۔
میں نے ادب سے جھک کر زیزا کی کالی انگلی کو چوم لیا۔

جولائی ۵۹ء

"دیکھنے کی عادت تو اپنی اپنی ہوتی ہے۔ کیا پتہ کون کیسے دیکھتا ہے؟"
آنکھوں والے اونچے اونچے پہاڑوں کو جن کی چوٹیاں برف میں چھپی رہتی ہیں اور چھوٹے چھوٹے دریاؤں کو
جو تنگ گھاٹیوں میں بہتے ہیں شعور پیدا ہوتے ہیں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تخلیق نہ ہونے میں پہاڑوں کی چبھن محسوس
کرتے ہیں اور یہ شعور ان کے دلوں میں تلاطم پیدا کرتا ہے۔ دوسری طرف آنکھوں سے محروم یہ اندھے لوگ ہیں جنہوں نے
ساری دنیا کو اپنے اندر آباد کر رکھا ہے۔

عکس تحریر:۔ ڈاکٹر انور سدید

# خون

ضیا بٹ

برتنوں کی قطار تھوڑی دیر ہی قائم رہی اور پھر گاہکوں نے دوسرے سے پہلے دودھ لینے کی کوشش شروع کر دی جب عمر دین دُودھ کی آخری بالٹی لایا تو ایک ہڑبونگ مچ گئی ملک شہاب الدین نے باقی ماندہ گاہکوں پر اچٹتی نگاہ ڈال اور اپنی مرضی کے گاہکوں کو دودھ دینا شروع کر دیا صرف تین چار گاہکوں نے سارا دودھ لے لیا اور پاؤ یا آدھ سیر دودھ مانگنے والے مُنہ دیکھتے رہ گئے۔

عمر دین فارغ ہو کر اپنے چھوٹے بھائی کرم دین کے پاس آ بیٹھا جو بی اے کا طالب علم تھا عمر دین نے کیپسٹن کا پیکٹ نکالا اور سگریٹ کا سُلگا کر لمبا کش لگایا اس کے سگریٹ پینے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ کسی بڑی ذمہ داری سے بطریق احسن عہدہ برآ ہُوا اور اپنے آپ کو خود ہی داد دے رہا ہو کرم دین بگڑے موڈ میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ملک شہاب الدین تخت پوش کے نیچے سے نکالے نوٹوں کی گنتی کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی نمایاں تھی کیونکہ آج نوٹوں کی تعداد معمول سے زیادہ تھی۔

"یہ بہت زیادتی ہے۔ ایک ہمیں دودھ نہیں ملا اور دوسرے ہمارے برتن بھی غائب ہیں۔" تین چار آدمی بہ یک زبان عمر دین سے مخاطب ہوئے وہ حیرانی کی حد تک پریشان تھے۔

عمر دین نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا اور دھواں مُنہ سے ایک ساتھ باہر نکالا۔ اس کی نگاہیں ان تین چار آدمیوں کے چہروں پر تھیں لیکن اُس کا ذہن صورتِ حال سے متعلق سوچ رہا تھا۔ ابھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ ملک شہاب الدین نوٹوں کے ہاتھ میں دبائے پاس آ کر بولا۔ "میں آپ لوگوں کے برتنوں کو پہچانتا ہوں، آپ میرے روز کے گاہک ہیں۔ لیکن جب ہم دودھ دوہنے علی الصبح اُٹھے، اس وقت آپ لوگوں کے برتن قطار میں نہیں تھے عید کا تہوار ہے معلوم ہوتا ہے کوئی چور ہمارے جاگنے سے پہلے ہی برتن اٹھا کر چلتا بنا۔ اب سوائے صبر کے کیا کیا جا سکتا ہے۔" پھر وہ ان لوگوں کا ردِ عمل جانے بغیر اپنے دونوں بیٹوں سے مخاطب ہُوا۔ "چلو بھائی تیاری پکڑو۔ نماز کا وقت قریب ہے۔"

ایسی نماز کا کیا فائدہ جو پانی ملا دودھ بیچنے کے بعد پڑھی جائے ایسے دنوں کا کوئی تہوار ہو تو وہ چیزیں سستی فروخت کرتے ہیں۔ ہم نہ صرف دودھ مہنگا بیچتے ہیں بلکہ اس میں پانی کی ملاوٹ بھی زیادہ کر دیتے ہیں۔" کرم دین نے عمر دین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بکواس مت کرو۔ تمہیں نہیں معلوم کہ جب شروع شروع میں لالہ شہر آیا تھا تو اس نے خالص دُودھ بیچنے کی کوشش کی تھی لیکن ان شہریوں نے الزام لگانا شروع کر دیا کہ ہم لوگ دودھ میں سنگھاڑوں کا آٹا ملاتے ہیں۔ جب تھوڑی مقدار میں پانی کی ملاوٹ کی تو کسی نے کوئی اعتراض نہ کیا البتہ فوڈ انسپکٹر نے چالان کا مطلب دیا۔ ماہانہ لگا کر اُس کا مُنہ بند کیا تو سینیٹری انسپکٹر نے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ دو دفعہ چالان بھگتنے کے بعد دو سیر دودھ روزانہ مفت دینے پر معاملہ طے ہو گیا۔ دودھ میں پانی نہ ملائیں تو بیگار کیسے پوری کریں تو صرف دودھ بیچتے ہیں۔ باقی ضروریاتِ زندگی تو بازار سے خریدتے ہیں۔ تمہارا خیال ہے۔ ہمیں سستی اور خالص ملتی ہیں۔ اور پھر اگر تہوار پر لوگ زیادہ دام دے دیتے ہیں۔ تو تمہیں کیا تکلیف ہے؟" عمر دین نے جواب دیا۔

"یہی تکلیف ہے کہ ہم سب ایک دوسرے کا گوشت نوچ رہے ہیں۔ بُرائی کا مقابلہ کرنے کی بجائے خود اس میں شریک ہوجاتے ہیں۔"

"نظریہ اور عمل میں بڑا فرق ہے۔ تعلیم سے فارغ ہوکر جب عملی زندگی میں آؤ گے تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔ میں نے بھی جب شروع شروع میں بطور بکنگ کلرک کام کیا تو بڑی ایمانداری دکھانی چاہی۔ لیکن جب دیکھا کہ ٹکٹوں کی کھڑکی سے باہر کھڑے ہر سپاہی کو حصہ دینا ہی پڑتا ہے اور اپنے انچارج کو مطمئن کرنے کے لئے ایمانداری کی بجائے چند روپوں کی زیادہ اہمیت ہے تو میں مسافروں سے ہر ٹکٹ پر تھوڑا تھوڑا زیادہ کرایہ لینے پر مجبور ہوگیا۔ ورنہ نہ صرف نوکری مشکل ہوجاتی بلکہ تمہاری پڑھائی اور بچوں کی کفالت میرے لئے مصیبت بن جاتی۔" عمردین نے غصے سے کہا۔

"تعلیم نے اس کا دماغ خراب کردیا ہے۔ یہ گاؤں ہی اچھا تھا جہاں چوہدری نے اس کا سر صرف اس لئے منڈوا دیا تھا کہ آٹھویں کے امتحان میں اوّل آنے پر اُسے سلام کرنے نہیں گیا تھا۔ وہ ٹھیک کہتا تھا کہ اُسے مزید مت پڑھاؤ پریشانی کا باعث بنے گا اسی کا رویّہ ہمیں گاؤں سے نکلنے کا موجب بنا۔ وہ زندگی اُسے راس نہیں آتی۔ ہمیں نصیحتیں کرتے ہم محسوس نہیں کرتا حنت ہے۔ ایسی تعلیم پر جو بڑے چھوٹے کی تمیز ہی ختم کردے۔" ملک شہاب الدین نے دخل دیتے ہوئے کہا۔

چھ سال پہلے سر منڈانے کا واقعہ کرم دین کی نظروں میں گھوم گیا۔ اور ماضی میں ہونے والی بے عزتی کا احساس زیادہ شدت کے ساتھ اس کے ذہن میں اُبھرا۔ وہ بے اختیار بولا۔

"گاؤں میں چوہدری مجبوروں کو ان کا خون چُوس چُوس کر اور ہم شہر میں پانی پلا پلا کر مارتے ہیں۔"

ابھی باپ بیٹوں میں تکرار جاری تھی کہ لمبی سرخ راکٹ غصے سے بھرا ہوا آیا اور بڑے رعب دار انداز میں بولا۔

"ملک میرا دودھ کہاں ہے؟"

"کوئی دودھ لینے آیا ہی نہیں۔" ملک شہاب الدین نے جواب دیا۔

"جھوٹ بکتے ہو۔ میں خود تمہارے تخت پوش پر برتن رکھ گیا تھا۔"

"پھر کوئی چرسی آپ کا برتن بھی اٹھا لے گیا۔ تین چار برتن دوسروں کے بھی غائب ہیں۔"

"میں کچھ نہیں جانتا مجھے برتن چاہیئے اور دودھ بھی اور ہاں کل سے تمہیں دودھ ڈیرے پہنچانا ہوگا۔"

"آج کی معافی چاہتا ہوں۔ کل سے دودھ ڈیرے پہنچ جایا کرے گا اور برتن بھی پہنچا دوں گا۔"

"معافی وافی کچھ نہیں۔ اپنے استعمال کے لئے رکھا دودھ مجھے دو۔"

"تم کہاں کے چوہدری ہو۔ دودھ نہ آج مل سکتا ہے۔ اور نہ کل سے ڈیرے پہنچے گا جس نے لینا ہو خود آ کر لے۔ برتن صرف تمہارا گم نہیں ہوا۔ اور اس میں ہمارا قصور بھی کوئی نہیں۔" کرم دین نے دخل دیتے ہوئے کہا۔

"یہ بُلبُل کون ہے بڑا چڑھ چڑھ کر بول رہا ہے۔" لمبا راکٹ نے ملک شہاب الدین کی طرف غصے سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پہلوان میرا بیٹا ہے۔ ابھی بچہ ہے اس کی بات کا بُرا مت مانو۔ جیسا آپ کہیں گے ویسا ہی ہو جائے گا۔" ملک شہاب الدین نے جواب دیا۔

"جیسا تم کہو گے ویسا نہیں ہوگا۔ جاؤ اپنا راستہ لو۔" کرم دین بولا۔

"میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔" لمبا راکٹ کرم دین کی طرف بڑھا۔ دونوں گتھم گتھا ہوگئے اور دیکھتے ہی دیکھتے کرم دین نے لمبا راکٹ کو بدرو میں دھکا دے دیا۔ لمبا سر سے لے کر پاؤں تک گارے سے بھرا بڑی مشکل سے بدرو سے باہر نکلا اور بھاگتا ہوا وہاں سے غائب ہوگیا۔

"یہ تم نے کیا ظلم کیا ہے۔ کس سے ٹکرا گئے ہو۔ جانتے ہو یہ کون ہے۔" ملک شہاب الدین نے غصے اور گھبراہٹ بھری آواز میں کہا۔

"اُس کا باپ بستہ الف کا بدمعاش ہے، بڑا بھائی بستہ ب میں ہے، اور خود بھی ہسٹری شیٹر ہے۔ تم ضرور کوئی مصیبت ہمارے لیے کھڑی کرو گے۔"

کرم دین رو رہا تھا۔

"آپ اب اپنے مکان کے اندر چلے جائیں۔ کچھ نہیں معلوم یہ بدمعاش کیا کر گزرے۔" جمع شدہ محلہ دار مشورہ دے رہے تھے۔

لوگوں میں چہ میگوئیاں جاری تھیں۔ ملک شہاب الدین اور عمر دین ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے انہیں قائل کر رہے تھے کہ سارا قصور بھارکٹ کا ہے۔ کرم دین غصے میں بھرا ہوا جانے ہجوم میں کہاں غائب ہو گیا۔ باپ اور بڑے بیٹے کی نگاہیں ابھی اس کو تلاش ہی کر رہی تھیں کہ بھارکٹ ہاتھ میں پستول لے للکارتا ہوا پہنچا اور کہنے لگا "او ملک کہاں ہے بُھتیل۔ اُسے گھر سے باہر نکالو، ورنہ تم سب کو گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔"

محلے داروں میں بھگدڑ مچ گئی۔ دریں اثنا ایک ڈنڈا شدید ضرب کے ساتھ بھارکٹ کے پستول والے ہاتھ پر لگا اور پستول زمین پر گر پڑا۔ بودو سرے ہی لمحے راکٹ کے سینے پر تان کر بولا "یہ بدمعاشی، بدمعاشوں میں ہی کرو یہاں نہیں چلے گی۔ بتاؤ کتنی گولیاں تمہارے سینے کے پار کروں۔" بھارکٹ بالکل ایک بے بس شہری کی طرح خاموش کھڑا تھا۔

"کرم دین جانے دو۔" عمر دین نے بلند آواز سے کہا۔

"بیٹا ہمارا ہمسایہ ہے۔ درگزر کرو۔" ملک شہاب الدین نے التجا کی۔ بھارکٹ نے نگاہیں نیچی کر لیں اور بازو ڈھیلے چھوڑ دیئے۔

"بس۔ جاؤ جانے دیا۔ آئندہ اِدھر کا رخ مت کرنا۔"

کرم دین نے پُر اعتماد نفرت کے ساتھ پستول بھارکٹ کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

بھارکٹ نے نہایت جابرانہ انداز میں پستول کو زمین سے اٹھایا اور پھر آناً فاناً کرم دین پر یکے بعد دیگرے تین فائر کر دیئے۔ کرم دین خون میں لت پت زمین پر گر پڑا۔ بھارکٹ بھاگ گیا۔ اِدھر اُدھر بھاگے محلہ دار کرم دین کی لاش کے اردگرد پھر جمع ہو گئے۔

دسمبر ۱۹۷۸ء

فلسطین

میرا نام تعاقب کرتا ہے اور میرے ساتھ رہتا ہے

فلسطین میری تقدیر ہے

مجھ سے باہم ہو، مجھے رواج دو

میں فلسطین ہوں

میرے خیالات میرے نام کو دہراتے ہیں

میں فلسطین ہوں

عکس تحریر:- احمد سہیل

# دائرہ

کہکشاں ملک

پنڈی میں سردی بھی تو ایسے پڑتی تھی کہ گالوں میں چھید ڈال دیتی۔ اچھا بھلا اُجلا اُجلا، نرم نرم چہرہ لیراں لیراں ہو جاتا تھا۔ ہاتھوں کی طرف مارے شرم کے دیکھا کب جاتا تھا بالکل بطخ کے پنجے بن جاتے تھے۔ اور پھر جہاں رسوئی تھی وہ تو بس نام کی رسوئی تھی کسی زمانے میں اُس کے صدیق ماموں کو پنسلوں کی فروخت سے منافع ہوا تھا سو وہ اُن کے لیے ٹین کی دو چادریں لے آئے بس انہی چادروں کو بلیوں کے اوپر ایک دوسرے سے جوڑ کر چھت ڈال دی تھی اور نیچے ماں نے چوکا سا بنا دیا تھا۔ چاروں اور سے شاں شاں کرتی ہوا گزرتی۔ گرمیوں میں تو خیر اچھا بُرا وقت گزر جاتا پر سردی آتے ہی رسوئی میں جانے کا نام سن کر ہی کپکپی لگ جاتی۔ ایسے میں صبح صبح صحن کے دروازے کی لوہے کی کنڈی جب زور زور سے کھٹکتی تو آنے والے کا مقصد پہلے سے جانتے ہوئے، اُس کا جی چاہتا کہ یہ صحن اور یہ رسوئی چھوڑ کر کہیں دُور۔ بہت دُور ایسی جگہ چلی جائے جہاں یہ آواز ـــــ "مولانی جی ـــ میت ہو گئی ہے۔ غسل کا سامان لے کر وہاں آ جائیے" اُسے بالکل رسائی نہ دے۔ اس آواز نے اُس کے بچپن کی ساری خوشیاں چھین لی تھیں۔ اتنی سخت ٹھنڈ میں رسوئی میں جا کر ایلومنیم کے بڑے سے پتیلے میں پانی گرم کرنا پڑتا۔ میت کو غسل دینے سے پہلے اُس کی اماں پہلے خود غسل کرتی۔ اُسے غسل کرنے کا کہتی۔ سفید موٹی ململ کا دوپٹہ خود بھی اوڑھتی اور اُسے بھی اوڑھنے کو کہتی۔ پھر دونوں ماں بیٹیاں میت والے گھر پہنچ جاتیں۔ پیچھے پیچھے صدیق ماموں دو کورے گھڑے، دو سقاوے۔ بیری کے پتے، صابن کی ٹکیہ، نہلانے کا تختہ مشک کافور، گلاب کے پھول اور ہار، روئی کے پھاہے، اور خون نکلنے کے خدشے کے تحت پٹیوں کا بنڈل لئے آ رہے ہوتے۔ میت والے گھر میں مار دھاڑ مچی ہوتی۔ بین کی آوازیں بوکھلا کر رکھ دیتیں۔ وقفے وقفے کے ساتھ سینہ پیٹنے اور چیخنے چلانے کی آوازوں سے دل دہل جاتا۔ ماں کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر ماتم والے گھر کی کوئی بوڑھی لپک کر سامنے آتی اور اماں کا ہاتھ پکڑ کر عزاداروں کی صفوں کو چیرتی ہوئی ٹھیک میت کے سرہانے اونچی چوکی پہ بٹھا دیتی۔ اُس کی اماں مشین کی طرح شروع ہو جاتی "بہنو، بیبیو، بیٹیو یہ مقام رونے کا نہیں، سوچنے کا ہے۔ سوچو ہم سب نے ایک دن ایسے ہی چپ چاپ لیٹ جانا ہے۔ پھر یہ سارے رشتے ناطے، دعوے اور مال کچھ کام نہیں آئیں گے۔" پھر پتہ نہیں وہ کلمہ شریف کا ورد شروع کر دیتی اور پڑھتی ہی رہتی۔ ماں کا اثر کئی بار زائل ہوتا۔ عورتیں اپنی باتوں میں مشغول ہو جاتیں مگر اُس کی اماں کا نعرۂ حق انہیں پھر کلمے کی طرف لے آتا۔ پھر میت کے غسل کا مرحلہ آتا۔ ماں اُسے زور سے آواز دیتی۔ وہ میت کی چارپائی کا سرا تھام کر اُسے جائے غسل تک پہنچانے میں مدد دیتی وہ لوگ جو کچھ دیر پہلے میت کی محبت میں سینہ پیٹ پیٹ کر بےحال ہو رہے ہوتے۔ میت کے کپڑے اُترتے دیکھ کر بھاگ اُٹھتے۔ بہت کم گھروں میں ایسا ہوتا کہ غسل کے دوران گھر کا کوئی فرد ماں کا ہاتھ بٹاتا۔ مگر اُس کی ماں تو ہر میت پر والہ و شیدا ہونے لگتی۔ کلمے پڑھتی ہوئی بڑی پریت کے ساتھ میت کو تختے پہ ڈالتی۔ دونوں گھڑوں میں انگلی ڈبو کر پانی کے مناسب گرم ہونے کا اندازہ لگاتی۔ گلاب کے ہاروں کو گھڑے کے گرد لپیٹ کر تازہ رکھنے کی کوشش کرتی۔ وہ یہ سب کام بڑے اطمینان سے کرتی تھی۔ اُس کے چہرے پر اُس لمحے میں عجیب سی روشنی لہراتی سی محسوس ہوتی تھی۔ قمیض کے بازوؤں کو کہنیوں سے اوپر چڑھا کر وہ میت کو نہلانا شروع کر دیتی تھی۔ ہر عضو کی طہارت کے ساتھ دعائیں اور کلمات پاک کا ورد کرتی تھی۔ بیچ بیچ میں اُسے اپریشن میں مشغول سرجن کی طرح کبھی اپنی کسی قینچی کبھی روئی، کبھی ہاتھ سے چھوٹ کر دور گرنے والی صابن کی ٹکیہ پکڑانے کا اشارہ دیتی جاتی۔ اور ساتھ غسل کے آداب اور تفصیل بتاتی جاتی۔ اُسے اس سارے عمل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اُسے اپنی ماں کا میت کا بناؤ سنگھار کرنا، بالکل نہیں بھاتا تھا۔ سرخ گلابوں کی پتیاں سجا کر جب وہ دروازہ کھول کر میت کی ڈولی لانے کا اشارہ کرتی تو وہ مشک کافور کی ٹھنڈی د زردانی سی بُو سے بھاگ کر گھر آ جاتی۔ اُس کی ماں یہ کام اللہ کی خوشنودی کے لئے کرتی تھی۔ مگر پھر بھی لوگ اُسے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق جوڑے اور روپے نذر دیتے تھے۔ اور چالیس روز تک برابر میت کے ایصال ثواب کے لئے کھانا آتا رہتا تھا۔ اُس کے ابا ریڑھی لگاتے تھے۔ گرمیوں میں مسجد کے باہر سکنجبین کے گلاس بیچتے تھے۔ اور سردیوں میں اُسی کمیٹی کے پرائمری سکول کے باہر مونگ پھلی اور چنے بیچتے تھے جہاں وہ پڑھنے کے لئے جاتی تھی۔ اُسے اپنے ابا کے ریڑھی لگانے، رات رات بھر کھانسنے اور ہر تیسرے روز اوجھڑی پکوانے پر غصہ نہیں آتا تھا۔ اُس کے ابا بہت اچھے تھے۔ اُسے کبھی کچھ نہیں کہتے تھے۔ اُس کے پڑھنے نہ پڑھنے پر انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لے دے کے وہ دو ماں بیٹی ہی تو تھیں۔

گھر کے ایک کمرے میں وہ تینوں اور دوسرے میں صدیق ماموں رہتے تھے۔ اُن کی بیوی جانے کب کی مر چکی تھی۔ دو شادی شدہ بیٹے تھے جو الگ رہتے تھے۔ صدیق ماموں کی بھی اُسی سکول کے ساتھ چھوٹی سی کاپیوں پنسلوں کی دکان تھی۔ اُسی کی آمدنی سے باہر کسی نانبائی کے پاس دوپہر شام دال روٹی کھا لیتے تھے۔ البتہ صبح اُن کے ساتھ ہی ناشتہ کرتے تھے مگر ناشتے میں چائے اور پراٹھے کے پیسے وہ باقاعدگی سے ادا کرتے تھے۔ ہاں اگر برسات کی جھڑی میں باہر جانا مشکل ہوتا یا کوئی کھانا اُس کی ماں زبردستی کھلا دیتی تو انکار نہیں کرتے تھے۔ ان کے ہاں رات کا کھانا اکثر باہر ہی سے آتا تھا۔ اُس کے ہوتے ہوئے محلے میں سردی گرمی میں کوئی نہ کوئی چل بستا۔ سرپوش سے ڈھکا مختلف کھانوں کا طشت کنڈی کھٹکنے پر اُس کی اماں لے ہی لیتی تھی۔ مگر یہ سب کچھ اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ ماں اُسے روز سمجھاتی: "دیکھو بیٹی میت کو نہلانا بڑے ثواب کا کام ہے۔ قبر سے رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ دھوکا فریب لوٹ کھسوٹ سب سے دل بھر جاتا ہے"۔ "مگر اماں۔ مجھ سے قبرستان میں میٹھے کر پلاؤ نہیں کھایا جاتا" وہ چیخ کر کہتی۔ "دیکھو بیٹی۔ مر کر کوئی ختم تو نہیں ہو جاتا۔ یہ تو پردہ اُٹھنے کی بات ہے۔ ایک موڑ ہے۔ اس میں دوسرے کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ بیٹی ـــــ آج نہیں تو کل مجھے بھی تو ضرورت پڑنا ہے" اُس کی ماں کتنے پیار سے سمجھاتی۔ مگر اُس نے تو جیسے تہیہ کر رکھا تھا وہ کبھی بھی ماں کے کام کو آگے نہیں بڑھائے گی۔ اُس نے بارہا اپنی ماں کو بتایا کہ سکول میں لڑکیاں اُسے ملوانی کہہ کر چھیڑتی ہیں۔ مگر اُس کی ماں ہنس پڑتی اور کہتی، ارے ملوانی کہنے میں کیا بُرائی ہے۔ چورنی تو نہیں کہتیں۔ اُسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اماں کو کیسے سمجھائے کہ چورنی ملوانی کے مقابلے میں کتنا بہتر نام ہے۔ اس لئے اُس نے اس موضوع پر گفتگو ہی چھوڑ دی۔ اب اُس کی دلچسپی کا مرکز جہاں زیب تھا جو جانے اچانک کیسے اُن کی ٹھہری ہوئی اور ساکن سمندر جیسی زندگی میں ہر روز لہر کی طرح داخل ہو گیا تھا۔ وہ اُس کی مرحوم مامی کا بھانجا تھا۔ پولی ٹیکنیکل کالج کھلنے کی بنا کر گوجر خان سے آ گیا تھا۔ وہ کہنے کو تو ہوسٹل میں رہتا تھا مگر صبح و شام وہیں نظر آتا تھا۔ بجلی کی مصنوعات کے بارے میں معلومات اور تربیت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اُس نے اُسے بھی اپنانے کا پروگرام پکا کر لیا تھا۔ وہ تربیت کے فوراً بعد مشرق بعید کے ایک مالدار ملک میں بلا لیا گیا جہاں اُس نے پانچ سال تک خوب دولت کمانے کے بعد اپنا وعدہ نبھاتے ہوئے اُسے سر سے پاؤں تک سونے میں لاد کر نہ صرف اپنی دلہن بنایا بلکہ اپنے ساتھ اُسی ملک میں دوبارہ لے گیا جہاں وہ پہلے سے زیادہ اہم عہدے پر فائز ہو گیا تھا۔

اب پورے بیس برس کی طویل مسافری کے بعد دونوں چار عدد ذہین اور خوش مزاج بچوں کے ہمراہ وطن لوٹے تھے۔ اُس کی اماں ابا اور ماموں میں سے کوئی بھی باقی نہیں تھا۔ جہاں زیب نے پرائیویٹ ڈیلنگ معرفت فوراً ہی اسلام آباد کے ایک تازہ تازہ آباد سیکٹر میں پانچ بیڈز والی کوٹھی مبلغ تیس لاکھ میں خرید لی۔ چار چھ ماہ میں وہ بیگم مسز جہاں زیب کی دوستی اڑوس پڑوس میں خاصی مستحکم ہو گئی۔ اُس کے گھر کے عین سامنے ممی کا بنگلہ تھا۔ ممی کی وجہ سے شہرت بہت سی خصوصیات تھیں۔ بڑی وجہ تو ممی کا جگت ممی ہونا تھا چھوٹے بڑے، ڈاکیہ، دودھ والا، اخبار والا، بجلی کا میٹر چیک کرنے والا، چندہ لینے والے، وہ سب کی ممی تھی۔ دوسری وجہ ممی کا سابق سٹار ہونا تھا۔ وہ یادگار کردار ادا کر چکی تھیں۔ میس (MASS) میڈیا والے اب بھی انہیں مہمان خصوصی کے طور پر بلاتے تھے۔ اور آج کل ممی کی وجہ شہرت اُن کی مارننگ واک تھی۔ اسلام آباد کی خنک اور شہابی صبح میں وہ جاگر پہن کر فیصل مسجد تک دوڑتی ہوئی جاتی تھیں اور اُسی تیز رفتاری کے ساتھ واپس آتی تھیں۔ ساتھ میں پاپا بھی ہوتے تھے۔ مگر لوگوں کو فقط ممی سے پیار تھا۔ ٹھیک دس بجے ممی بہترین فیشن کے لباس اور زیورات سے سج دھج کر اپنے شادی دفتر میں جاتی تھیں۔ وہاں سے ٹھیک ایک بجے واپس آتی تھیں۔ پاپا اتنی دیر میں ایپرن لگائے بہترین ڈشیں تیار کرتے تھے۔ صفائی وغیرہ کے لئے نوکر بھی تھے۔ واپسی پر ممی اپنی فاکسی میں پھل فروٹ بھی لاتی تھیں۔ لنچ کے بعد دونوں آرام کرتے تھے۔ مگر ممی ایک دو گھنٹے کے لئے دفتر اور پاپا لائبریری چلے جاتے۔ واپسی پر دونوں اکٹھے ہی آتے۔ ممی جمعہ ہفتہ دو چھٹیاں کرتی تھیں۔ انہی دنوں میں ممی کا بیٹا اور بہو جو دوسرے سیکٹر میں رہتے تھے ملنے کے لئے آتے تھے۔ مسز جہاں زیب کو بیٹے بیٹا اسلام آباد میں ممی پاپا کی زندگی کا انداز عجیب سا لگا۔ اُسے یہ سُن کر بھی حیرت ہوئی کہ ممی کی ایک اور ذاتی کوٹھی کا کرایہ خود اُن کا بیٹا ہے۔ جو سرکاری گھر پر باقاعدگی سے اپنی ماں کو ادا کرتا ہے۔ بیٹے کا اپنا بنگلہ کسی اور افسر نے سرکاری طور پر لے رکھا ہے۔ ممی کی ایک بیٹی بھی تھی جو اپنے میاں کے ساتھ سوڈان میں تھی۔ ممی کی دنیا میں رشتے ناطے ریت رواج اور پیار محبت کی بندشوں کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اُس نے کبھی بھولے سے بھی اپنے ساس ہونے کا حق نہیں جتایا گیا تھا۔ بس اچھے شہری کی طرح سب ہو آپس میں مل بیٹھتی تھیں۔

مگر ہوا یوں کہ ایک صبح ممی جب سیر کے لئے تیز تیز قدموں سے فیصل مسجد جانے والی سڑک پر پہنچیں کہ اچانک رت جگا منا کر آنے والے اور نشے میں دھت ایک امیرزادے نے اپنی نئی ٹیوٹا ممی کے اوپر سے گذار دی۔

ممی بیچاری پھسی پھسی ہو گئی۔ پتہ نہیں کیسے اٹھا کر گھر لایا گیا۔ فوراً ہی بڑی مہارت کے ساتھ ممی کی میت کو سفید چادروں میں لپیٹ کر نیچے کے کمرے سے استقبالیہ کے ایک کونے میں پلنگ پر ڈال دیا گیا۔ حادثہ ہوئے پانچ چھ گھنٹے ہو چکے تھے مگر بے وے کے مسز جہاں زیب، ممی کی بہو اور برتن دھونے والی مائی کے علاوہ کوئی بھی نہیں تھا کہ جو صبح سے وہاں بیٹھا ہو لوگ آتے تھے۔ استری شدہ جوڑوں کی کریز کا خیال رکھتے ہوئے چاندنی پر چند منٹ دو زانو ہو کر بیٹھتے۔ ممی کی بہو کے ہونٹوں سے اِنّا للہ کی ٹیپ آن ہو جاتا وہی جملے وہی حادثہ کی تفصیل، وہی راہگیروں کی مدد اور آخر کار ہال میں لا کر لٹانے پر بات ختم ہو جاتی۔

اتفاق سے اُس روز جمعہ تھا نماز ظہر کے بعد جنازہ لے جانے کا اعلان کیا گیا تھا کوئی گھنٹہ بھر باقی تھا۔ مگر غسل کا پروگرام جوں کا توں تھا سارے سیکٹر میں کوئی غسل دینے والی بی بی ہی نہیں تھی۔ ممی کی بہو جس سیکٹر میں رہتی تھی وہاں بھی اطلاع بھیجی گئی تھی مگر تاحال کسی ملوانی بی کے آنے کی خبر نہیں تھی۔ انسانوں کی بستی میں ابھی تک موت نے ہار نہیں مانی تھی۔ لوگوں نے زندہ رہنے کے لئے کیسے کیسے جتن کئے تھے۔ کیا کیا خواب گاہیں تھیں! کیا کیا ڈاکٹر نہ پلازہ تھے! مگر کمبخت موت کو دیکھو مارنے کے کیسے ڈھنگ ایجاد کر لئے تھے۔ یہاں کیا نہیں تھا، ہر روز پارٹیاں ہوتی تھیں۔ قوالیاں رات رات بھر جاری تھیں۔ کیا یہ تھا موت کو پارٹی یا قوالی سے نہیں ٹالا جا سکتا! بول جوں ممی کی بہو ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے پر اشتیاق سے جاتی تھیں اور پھر ناامید ہو کر لوٹتی تھیں توں توں مسز جہاں زیب کے اندر کھُد بُد تیز ہو جاتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اُس کی ماں کا ہیولا ممی کے پلنگ کے گرد گھوم رہا ہے۔ اُس کی ماں کی آواز اُسے صاف سنائی دے رہی ہے،

"بیٹی آج نہیں تو کل تمہاری باری بھی آئی دھری ہے"

چنانچہ اس دفعہ جب ممی کی بہو مایوس ہو کر میّت کے قریب بیٹھیں۔ تو اُس نے کہا،

"آیئے ہم میّت کو جائے غسل تک لے چلیں۔ میں غسل دینا جانتی ہوں۔"

مارچ ۸۷ء

میں شاعر ہوں وطن کا اور وطن کے گیت گاتا ہوں
وطن کے ذرّے ذرّے کو میں آنکھوں سے لگاتا ہوں

مثالِ سبزۂ پامال ہے گو زندگی میری
مگر میں فصل تو بن کر زمیں پر لہلہاتا ہوں

بظاہر وہ دیا ہوں جو ہے زینت طاقِ نسیاں کی
مگر بجھتا ہے جب سورج تو میں ہی جگمگاتا ہوں

عکس تحریر۔ اکبر حمیدی

# شناخت

اختر امان

شناختی کارڈ بنوانے کیلئے اس نے تیسری مرتبہ فارم پُر کر کے جمع کرایا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ اس مرتبہ اس کا شناختی کارڈ ضرور بن جائیگا۔ پہلے دو مرتبہ اس نے شناختی کارڈ کے لئے فارم پُر کر کے جمع کرایا تھا لیکن ہر دفعہ اس کا فارم غلط خانہ پری کی بنا پر اسے واپس کر دیا گیا تھا۔ وہ سوچتا کہ شاید کوئی غلطی اس کی یادداشت کی وجہ سے ہو جاتی تھی۔

اصل میں اس کی یادداشت زیادہ اچھی نہ رہی تھی۔ جب ایک دفعہ دریا میں طغیانی آئی تھی تو اس کے کنارے پر آباد کچی آبادیوں کے مکین تیز و تند لہروں کی زد میں آ گئے تھے۔ سارے کے سارے گھر سیلاب کی بپھری لہریں ایک ہی ہلّے میں بہا لے گئی تھیں۔ آدمی، عورتیں، بچے بکریاں، بھیڑیں، گائیں بے بس تنکوں کی طرح بہہ گئے تھے۔ حکومت کی طرف سے کافی احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے باوجود سیلابی لہروں کے ہاتھ دراز تھے اور انھوں نے بیسیوں افراد کی زندگیوں کو زہریلے سانپ کی طرح ڈس لیا تھا۔ اسی تباہ کن سیلاب میں اس کا گھر بھی بہہ گیا تھا۔ اس کی ماں بھی سیلاب کی لہروں کی بھینٹ چڑھ گئی تھی، مگر وہ اتفاقاً بعض دوسرے لوگوں کی طرح زندہ بچ نکلا تھا۔ دریا کی غضبیلی لہروں نے اس کو اپنے توانا بازوؤں میں اونچا اٹھا کر اتنی زور سے زمین پر پٹخ دیا تھا کہ وہ زمین پر گرتے ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ لہریں تو اس کو مرا ہی سمجھ کر چھوڑ گئی تھیں، وہ جانے کتنی دیر تک یونہی بے ہوش پڑا رہا تھا۔ اُسے اس کا کچھ پتہ نہ تھا۔ لیکن جب اسے ہوش آیا تو اس کے سامنے سیلاب کی تباہ کاریوں کے المناک منظر دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ دریا کی تند لہروں نے کچے گھروں کے مکینوں کے ساتھ وہی سلوک کیا تھا جو لہریں اب تک کچے گھروں کے مکینوں کے ساتھ کیا کرتی تھیں۔ سیلاب، تیز و تند لہریں . ایک مرتبہ سیلاب کی تباہ کاری کے بعد پھر کچھ اور لوگ ان لہروں کے آگے سینہ سپر ہو جاتے اور اسی جگہ اپنے نئے کچے مکان تعمیر کر لیتے۔ اس نے دیکھا کہ لہروں کا شور دم توڑ چکا تھا اور اس کے سامنے گرے ہوئے کچے مکان، بکھرے ہوئے برتن، چارپائیاں، ٹوٹے ہوئے کھلونوں کی طرح بکھرے پڑے تھے اور یوں بھی لگتا تھا جیسے کسی شریر بچے نے کنارے پر بنے ہوئے ریت کے گھروں کو لات مار کر بے دردی سے توڑ دیا ہو۔ . . . کچھ دیر بعد جب وہ اس المناک منظر کو دیکھ کر اپنی یادداشت کی گمشدہ تختی پر دھندلے لفظوں کی عبارتیں پڑھنے کی کوشش کرنے لگا تو پوری کوشش کے باوجود سوائے چند دھندلے چہروں کے اُسے کچھ یاد نہ آ رہا تھا۔ باپ کا چہرہ جو ١٩٦٥ء کی جنگ میں شہید ہو گیا تھا۔ ایک بڑا بھائی جو ١٩٧١ء میں مشرقی پاکستان میں کہیں لاپتہ ہو گیا تھا۔ اور اب ماں . لہریں ..... دریا کی پُرشور لہریں اور آسمان پر گرجتے بادل ..... اب وہ تنہا تھا۔ اُسے کچھ یاد نہ آ رہا تھا..... اس نے گیلی زمین سے اپنا سر ہاتھ اٹھا کر سر کو چھوا تو اس کے گیلے ہاتھ پر جما ہوا خون لگ گیا.. . جب وہ گرا تھا تو اس کے سر پر چوٹ بھی آ گئی تھی ...... وہ اس حالت میں بیٹھا سارے ماحول سے پیار رشتہ جوڑنے اور سارے منظروں کو اپنی آنکھ کی پتلیوں میں اتارنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس دوران امدادی کارروائی کرنے والے لوگ بھی وہاں پہنچ گئے اور اس کو بعض دوسرے لوگوں کے ساتھ طبی امداد بہم پہنچانے ہمراہ لے گئے۔

وہ جب کچھ روز بعد تندرست ہوگیا تھا تو اُسے امدادی کیمپ والوں نے دو جوڑے کپڑوں کے اور کچھ راشن دیکر فارغ کر دیا تھا اور کیمپ سے فارغ ہوتے وقت کیمپ کے انچارج نے اس سے پوچھا "تم کون ہو ..... میرا مطلب ہے تمہارا نام کیا ہے؟" اس نے اپنا نام یاد کرنے کی بہت کوشش کی تھی مگر اُسے صحیح طور پر کچھ یاد نہ آ رہا تھا ...... کیمپ کے انچارج نے سمجھا شاید صدمے کی وجہ سے سکتے کا شکار ہو گیا ہے یا قوتِ گویائی سے محروم ہو گیا ہے ... پھر اُس نے اس سے اشاروں سے باتیں کرنے کی کوشش کی تھی جس پر اُس نے جواب دیا تھا "نہیں ... گونگا نہیں ہوں ... میں بول سکتا ہوں۔" کیمپ والوں نے پھر اپنا سوال دہراتے ہوئے کہا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟ تمہیں کہاں پر جانا ہے؟ تمہارا ٹھکانہ کہاں پر ہے تاکہ تمہیں وہاں پہنچا دیا جائے۔" اُس نے سوالیہ انداز میں پوچھا تھا ...

ٹھکانہ ...... ؟ میں تمہاری طرح ایک آدمی ہوں۔ تم مجھے کسی نام سے بھی پکار لو ...... میں آدمی ہوں انسان ... یہی میرے خیال میں میرا نام ہے .. کہاں رہتا ہوں .. مجھے کچھ پتہ نہیں پھر کیمپ انچارج نے سوال کیا "کیا تمہارے سارے عزیز سیلاب کی نذر ہو گئے تھے .. ہاں بتاؤ! تمہارے پاس شناختی کارڈ ہے۔ شناختی کارڈ وہ کیا بلا ہوتی ہے؟" وہ حیرت سے بولی، اس پر کیمپ انچارج نے ہنستے ہوئے کہا تھا "شناختی کارڈ .. جس سے تمہاری شناخت ہو سکے .... تم کون ہو، تمہارا نام کیا ہے؟ تمہارے ماں باپ کون ہیں؟ ... تمہارا علاقہ کون سا ہے؟ . نہیں . نہیں . مجھے کسی چیز کا کچھ پتہ نہیں۔

اُس کو سانپ کی طرح پھنکارتی لہروں اور آسمان پر گرجتے ہوئے بادلوں کی آوازیں پھر سنائی دینے لگیں .... پھر دھندلے دھندلے چہرے اُس کی آنکھوں کے سامنے سے اوجھل ہونے لگے . اور پھر وہ کیمپ انچارج کے سوالوں سے گھبرا کر کیمپ والوں کی امداد کے بغیر ہی نکل کھڑا ہوا تھا اس کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اُس نے کہاں جانا ہے .. کس کے پاس جانا ہے . وہ چلتا رہا کبھی کسی سایہ دار درخت تلے سو رہتا، کبھی لیٹ جاتا، کبھی بے معنی سوچوں کے ویرانوں میں گھومتا رہتا .. لیکن جب اس مسافت کے دوران کیمپ والوں کی طرف سے دیا جانے والا راشن ختم ہو گیا تو اس نے اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے اِدھر اُدھر کام کرنا بھی شروع کر دیا تھا .. کبھی اینٹیں اٹھانے پر لگ جاتا ... کبھی سڑکوں کی تعمیر کے لیے پتھر کوٹنے لگ جاتا . اس دوران کئی دنوں کے بعد کسی ضرورت کے تحت کسی نے اُس سے سوال کیا تھا . "تمہارے پاس شناختی کارڈ ہے؟" اور اس نے ایک مرتبہ پھر بغیر سوچے سمجھے جواب دے دیا تھا کہ "نہیں" پھر اس سے جو آدمی ملتا اس کے دل کو دھڑکا سا لگ جاتا کہ کہیں یہ وہی سوال نہ کر بیٹھے کہ، "تمہارے پاس شناختی کارڈ ہے؟ پھر اس نے ایک دفعہ جھجکتے جھجکتے کسی سے اس کے بارے میں پوچھ ہی ڈالا تھا کہ "شناختی کارڈ کیا ہوتا ہے؟ کیا یہ میرے لئے بے حد ضروری ہے ..... مجھے یہ کہاں سے ملے گا؟ کتنی رقم کا ملے گا؟ پھر میں اس کا کیا کروں گا؟ جب اس کو یہ بتایا گیا کہ "تمہیں شناختی کارڈ بنوانے کے لئے ایک فارم پُر کرکے دینا ہوگا، تصویر بنانا ہوگی اور پھر .... ایک دفعہ ایک ریکروٹنگ ایجنٹ نے اُسے بات سمجھانے کی خاطر یہ بھی کہہ دیا تھا کہ "اگر وہ شناختی کارڈ بنوائے تو اس کا پاسپورٹ بھی بن جائیگا اور پھر اس کو کسی دوسرے ملک بھی بھجوا دیا جائے گا .... جہاں سے وہ ڈھیر سارا روپیہ کما سکے گا .... مگر ریکروٹنگ ایجنٹ کی اس تجویز سے کہیں زیادہ یہ بات اس کے دل کو بھا گئی تھی کہ اگر خدانخواستہ کہیں کوئی حادثہ پیش آ جائے یا کوئی اور غیر معمولی واقعہ وقوع پذیر ہو جائے تو شناختی کارڈ کی موجودگی اس کے لیے بیحد مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کو یہ ساری باتیں پورے طور پر سمجھ میں تو نہ آ سکیں مگر اس کے باوجود اس نے شناختی کارڈ بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا .... مگر ......

اس سلسلے کے بعد جب اُس نے تیسری مرتبہ فارم پُر کر کے شناختی کارڈ بنوانے کے لئے جمع کروایا تھا تو رجسٹریشن آفس کے متعلقہ کلرک نے ایک نظر اُس پر ڈالی تھی اور دوسری نظر فارم پر۔ اور پھر فارم اُس کے حوالے کر دیا تھا ..... اس نے پوچھا کیا یہی کارڈ ہے؟ کلرک نے کہا، "نہیں تمہارا فارم غلط پُر ہوا ہے۔ اس میں ٹھیک اندراج کر کے لاؤ؟"

اُس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا "کیا غلطی ہے؟"

غلطی! یہ کیا لکھا ہے۔ اس خانہ میں لکھنا تھا ... اپنے گھر کا مکمل پتہ۔ کلرک کی بات پر اس نے کہا "مکمل و مستقل پتہ گھر کا؟" ..... وہ تو میں نے لکھا ہے۔ یہی کہ زیرِ آسمان رہتا ہوں۔ ... کیا یہ پتہ ہے؟ کلرک نے کچھ تلخی سے کہا تو وہ بھی جلد ہی بول پڑا "ہاں! تو ٹھیک لکھا ہے۔ میرا کوئی مکمل اور مستقل پتہ نہیں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ .... جہاں پر مزدوری مل جاتی ہے وہیں پاؤں سکیڑ کر پڑ رہتا ہوں ......

مگر ابھی وہ اپنی بات بھی مکمل نہیں کر پایا تھا کہ کلرک نے فارم اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور کہا، جب تک اپنے گھر کا پتہ درج نہیں کرو گے شناختی کارڈ نہیں بن سکے گا۔"

اُس نے بڑی بیچارگی سے کہا، کوئی گھر نہ ہو تو کیا کارڈ نہیں بن سکتا ....." "ہرگز نہیں .....! اور پھر کلرک نے منہ پھیر لیا اور دوسرے لوگوں سے فارم وصول کرنے لگ گیا۔

شناختی کارڈ بنوانے کے لئے پہلی مرتبہ جب اس کا فارم مسترد کیا گیا تھا تو وہ بے حد مایوس ہوا تھا۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ شناختی کارڈ نہیں بنوائے گا۔ خواہ اس کی شناخت ہو یا نہ ہو ..... ؟ لیکن کئی لوگوں نے اسے کہا کہ شناختی کارڈ بنوا ہی لو اس کی قدم قدم پر ضرورت پڑے گی اور ویسے بھی کسی کو کیا پتہ تم کون ہو؟ کہیں پکڑے نہ جاؤ ..... اس پر اس نے ایک ٹھیکیدار کے منشی سے فارم پُر کرانے کے لیے رابطہ قائم کیا۔ ٹھیکیدار نے منشی کو ہدایت کر دی کہ اس بیچارے کا پتہ میری معرفت لکھ دینا اور فارم میں باقی خالی جگہیں اس سے پوچھ کر پُر کر دینا ..... منشی نے حسب الحکم فارم کے مطابق اس سے سوال کرنے شروع کر دیئے۔ بعض سوالوں کے جواب جو اُسے پہلا فارم پر کرتے وقت یاد نہیں رہے تھے وہ اس کو اب یاد آ رہے تھے اور بعض سوالوں کے جواب دوسرا فارم پُر کرتے وقت بھول گئے تھے مثلاً منشی نے فارم کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس سے پوچھا کہ تم کون سے شہر کے رہنے والے ہو؟ تو وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اسے اس سوال کی سمجھ نہ آئی تھی۔ البتہ اس کو یوں لگا جیسے اس کے لاشعور میں کوئی کھڑکی اچانک کھل گئی ہے اور اس نے اپنی آنکھوں کے آگے پرائمری جماعت میں پڑھی گئی کتاب کے ورق پھڑپھڑاتے ہوئے دیکھے تھے۔ منشی نے پھر سوال دہرایا "تم کونسی جگہ کے رہنے والے ہو" تو اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی۔ جیسے اُسے کوئی سبق یاد آ گیا ہو۔ اس نے فوراً کہا "پاکستان ... منشی نے حیرت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور اسی کے الفاظ دہرا دیئے "پاکستان"۔ منشی نے ایسے ہی لکھ دیا ... منشی نے پھر پوچھا ضلع کونسا ہے؟ اُس نے پھر جوش سے کہا "پاکستان" ..... منشی نے پھر پوچھا "صوبہ کونسا ہے"؟ پاکستان ......

منشی نے حیرت سے کہا "شہر پاکستان" .. تم نے جیسے کہا میں نے ٹھیکیدار کی ہدایت کے مطابق ویسا ہی لکھ دیا مگر تمہارا فارم اب بھی قابلِ قبول نہ ہوگا۔

اس نے رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی حرارت محسوس کی تھی اور کہا تھا "فارم کیوں قابلِ قبول نہ ہوگا .... ضرور ہوگا۔ اور پھر وہ منشی کے ہاتھ سے فارم لیکر رجسٹریشن آفس کی طرف بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ جب اس کی باری آئی تھی تو اس نے بڑی بے تابی سے فارم کلرک کی طرف بڑھا دیا تھا۔ اُس نے ایک نظر فارم پر ڈالی اور پھر فارم اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا "غلط اندراج ہے۔ فارم ٹھیک پُر کر کے لاؤ" اس نے پریشان ہو کر پوچھا کیا

مطلب ہے اس میں . . کلرک نے اسی ہی دلہجہ میں بات کرتے ہوئے کہا "شہر علاقہ صوبہ . . سب کے سب خانے غلط پُر کئے ہیں . . صوبہ پنجاب ... ضلع لاہور . علاقہ لکھا چاہیئے تھا . . یہ سب غلط ہے .... پھر اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا کہ کیا لاہور اور پنجاب . پاکستان نہیں ہیں تو پھر کیا ہیں . . میرے نزدیک تو علاقہ، ضلع، صوبہ . سب پاکستان ہے، سب پاکستان . .

کلرک نے چیخ کر کہا "پاکستان ملک ہے . . . تم صوبہ کی بات کرو . . ضلع کا لکھو . . شہر بتاؤ . . . محلہ . . . ؟

اُس نے زور دے کر کہا "میں نے فارم میں صحیح معلومات دی ہیں تم ان معلومات کو مانتے کیوں نہیں ؟

اس پر رجسٹریشن آفس کے کلرک نے چڑ کر اُس کا فارم ہاتھ میں دینے کی بجائے کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور ہوا اس فارم کو تیزی سے اپنے ساتھ اڑا لے گئی ۔ اور وہ اڑتے ہوئے فارم کو پکڑنے کے لیے اُس کے پیچھے بھاگ پڑا اور نہ جانے کب تک بھاگتا رہا دوسری طرف رجسٹریشن کلرک کی طرف سے مسترد ہوا تھا تو اس نے پہلے کی نسبت کچھ مختلف ردِّ عمل کا اظہار کیا تھا ۔ وہ مایوس ہونے کی بجائے شناختی کارڈ بنوانے کے لیے زیادہ پُرعزم تھا اور اس نے تمام پریشانیوں کے باوجود شناختی کارڈ بنوانے کا ارادہ کر لیا تھا ۔

اُس نے تیسری مرتبہ فارم ٹھیک ٹھاک پُر کیا ۔ اس نے رجسٹریشن آفس کے کلرک کی باتیں بھی ذہن میں رکھیں ۔ منشی کی باتوں پر بھی غور کر لیا تھا اور فارم کو نئے سرے سے پُر کر کے تیسری مرتبہ رجسٹریشن آفس میں جمع کرا دیا تھا ۔ لیکن اس مرتبہ فارم جمع کرنے والا کوئی دوسرا کلرک تھا کلرک نے اس کا فارم دیکھے بغیر رکھ لیا تھا اور اس کو رسید دیکر ایک ہفتہ بعد شناختی کارڈ لے جانے کو کہا تھا ۔ اب اسے امید پیدا ہو چکی تھی اور ایک ہفتہ گذرنا دشوار ہو رہا تھا اس نے بڑے اضطراب اور بے چینی کی حالت میں وہ دن گذارے ، جس روز اس کو شناختی کارڈ ملنا تھا تو اس روز وہ مزدوری کرنے بھی نہیں گیا تھا بلکہ سیدھا رجسٹریشن آفس چلا گیا تھا مگر وہاں جا کر اُسے پتہ چلا کہ اس روز تو سرکاری دفاتر بند ہوتے ہیں ..... وہ بیحد مایوس ہوا ۔ پھر ایک اور دن اس نے بڑی بے چینی سے گذارا اور اگلے روز علی الصبح رجسٹریشن آفس چل گیا ۔ وہ وہاں سب سے پہلے پہنچا تھا لیکن دفتر کھلنے سے بہت پہلے شناختی کارڈ بنوانے والوں کی قطار بیحد لمبی ہو گئی تھی ۔ کچھ دیر بعد رجسٹریشن آفس کی کھڑکی کھلی . . . اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا . . اُس نے ہاتھ آگے بڑھایا اور رسید کلرک کے حوالے کر دی . . . . آج کی ڈیوٹی پہ پہلے والا کلرک ہی موجود تھا ۔ کلرک رسید پیکر کاغذ دیکھنے لگا اور پھر کچھ دیر بعد پھر کھڑکی کے سامنے آیا اور اس کی طرف دیکھ کر زور سے قہقہہ لگایا . . . وہ بیحد خوش ہوا کہ شاید اس کا کارڈ بن گیا ہے . . . .

اس نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا ۔

"میرا کارڈ" . .

کلرک نے کہا "اب پھر غلط پُر ہوا ہے ۔"

اس کا جیسے کلیجہ نکل گیا ہو . . . اس نے سوچا شاید اس کی یادداشت اسے پھر دھوکا دے گئی ہے ..... اس نے بیتابی سے پوچھا "کیا غلطی ہے ؟" اس پر کلرک نے کہا "تمہارے باپ کا کیا نام ہے" . . . ؟ وہ سوچنے لگا . کیا نام ہے . . کیا نام ..... اور پھر کہنے لگا "جو اس فارم پر لکھا ہے . . . ؟

فارم پہ ؟ کلرک نے طنزیہ انداز میں کہا "تم نے اپنے والد کے نام کے خانے میں لکھا ہے "قائداعظم محمد علی جناح"

وہ تیزی سے بول پڑا "ہاں ! بالکل ... وہی میرا باپ ہے ۔ قائداعظم کا کوئی بیٹا نہیں تھا . . . . اور تم . . قائداعظم کے بیٹے ..... کلرک نے اس کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا . . . .

وہ اس بات پر کلرک سے اُلجھ پڑا، "تم سے کس نے کہا قائد اعظم کا کوئی بیٹا نہیں وہ کتنے کروڑوں بچوں کا باپ ہے۔ میں بھی ان میں سے ایک ہوں..... تم..... تم میرا شناختی کارڈ نہیں بنانا چاہتے..... تاکہ میری شناخت نہ ہو سکے.....!

کلرک نے لمبی قطار میں کھڑے لوگوں کو متوجہ کرتے ہوئے کہا "دیکھو! اس کا حلیہ دیکھو.....! دو ٹکے کا آدمی! کہتا ہے بس قائد اعظم کا بیٹا ہوں..... جاہل..... ان پڑھ۔

قطار میں کھڑے سب لوگوں نے اس کی طرف دیکھ کر طنزیہ انداز میں کہا، قائد اعظم کا بیٹ.....! یہ کوئی پاگل ہے.. پاگل..... اور سب نے زور دار قہقہہ لگایا۔ اور کلرک نے اس کا فارم ایک دفعہ پھر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

اکتوبر ۱۹۷۸ء

آج کل کوئی نظریہ ساز بھی ناسٹلجیا سے وہ معنی منسوب نہیں کرتا جو سترھویں
صدی کے فوجی ڈاکٹروں نے بیان کئے تھے۔ پھر بھی ناسٹلجیا اور گھر واپسی کی خواہش میں
کوئی نہ کوئی تعلق ضرور موجود رہا ہے۔ طبی شعبے سے نکلنے کے بعد "گھر" کے معنی بھی بدل
گئے ہیں اور اب وہ مادی عدم پر الفردوس یا اجتماعی ماضی کے کسی واقعی یا نام نہاد
خوش گوار لمحے کا استعارہ بن گیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ناسٹلجیا کو اب بیماری
قرار دینے کا رواج نہیں رہا بلکہ تعصبات کے مورخ اور استاد اکثر اوقات طنزیہ
لہجے میں یہ حوالہ دیا کرتے ہیں کہ سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں اسے باقاعدہ
بیماری سمجھا جاتا تھا۔

عکس تحریر:۔ قاضی جاوید

# سستی سیندور اور سائے

خادم مرزا

چاروں اور پہاڑوں سے گھرے ہوئے صحرا میں شام کچھ پہلے ہی ہو گئی تھی۔ سورج کے پہاڑوں کی اوٹ میں جاتے ہی لمبے اور نوکیلے سائے یوں بڑھنے لگے تھے، جیسے مغرب کی اور سے کسی بہت بڑے عفریت کی فوج پاکر بس دوڑے چلے آ رہے ہوں ـــ صحرا میں پھیلی ہوئی ریت کی سسکیاں اور تڑپتے ہوئے سایوں کی سانس کی آواز سے خوف زدہ ہو کر بیوی نے چلتے چلتے خاوند کی کلائی دونوں ہاتھوں سے تھام لی۔ خاوند ایک لمحے کے لئے رکا اور بیوی کے چہرے پر ایک بھرپور نظر ڈالی جو پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی اس کے گرد سے اٹے ہوئے زرد چہرے پر پہاڑ کی چوٹیوں سے اترتی ہوئی شفق کی سرخی اندھیروں سے چھپتی پھر رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے اسے احساس ہوا جیسے بیوی کی مانگ کا سب سیندور اس کے چہرے پر پھیل کر کوئی سوال کر رہا ہے۔ آپ سے آپ اس کے کندھے کسی ان کہے بوجھ کے احساس تلے جھکتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ اس نے بیوی کی مسوں پر پھیلے ہوئے پسینے کے قطروں کو انگوٹھے کی پور سے چھوا اور پھر پوری قوس پر پھیلے ہوئے قطروں پر انگوٹھا پھیرتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر جمی ہوئی پپڑی کو تر کرنے لگا۔

"بس اب دو قدم کا فاصلہ ہے۔" خاوند نے دور جیسے کسی گہرائی میں ڈوبتے ہوئے کہا اور بیوی نے کسی داخلی کیفیت کا ایک بڑا سا گھونٹ بھرا۔ اس گھونٹ کے حلقوم میں اترنے کی آواز کے ساتھ ہی اس نے آنکھیں کھول دیں اور کوکھ کو سنبھالتے ہوئے خاوند کے پیچھے ہو گئی۔ ٹیلے کی چوٹی پر پہنچ کر بیوی نے سب سے پہلے نیچے صحرا میں اپنی جھگی کی اور دیکھا۔ جو آگ وہ سلگا کر آئی تھی۔ اس سے اٹھتے ہوئے دھوئیں میں گھری ہوئی جھگی یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے کھجور کا کوئی بڑا سا ٹھنٹھ سلگ رہا ہو۔ بکریوں کے ممیانے اور کتے کے بھونکنے کی آواز سے نیچے سارے میں پھیلی ہوئی کسی دہشت کا احساس ہو رہا تھا اس نے گھبرا کر خاوند کی طرف دیکھا جو دور نیچے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی راہ کو گھور رہا تھا۔ اس کے بال اس کی بے ترتیب پگڑی سے باہر نکلے ہوئے تھے اور داڑھی دھول سے اٹی ہوئی تھی اس کے بھرے بھرے کندھے کسی مضبوط عزم کے بوجھ سے کچھ زیادہ نمایاں دکھائی دے رہے تھے اور ان شانوں سے اٹھتی ہوئی کسی عمیق جذبے کی بو جیسے صدیوں کی مسافتوں کی تھکن کے احساس کے ساتھ مل کر سرمئی رنگ میں ڈھل کر اس کے چہرے پر پھیل رہی تھی۔ بیوی نے اپنی آنکھیں خاوند کی آنکھوں پر مرکوز کر دیں۔ خاوند کی آنکھوں میں چمک بتدریج بڑھ رہی تھی اور وہ یوں محسوس کرنے لگی جیسے اس کی آنکھوں میں کوئی روشنیوں کا سیلاب امڈا چلا آ رہا ہو۔ اچانک خاوند کے مضبوط بدن نے ایک جھرجھری لی، جیسے وہ کسی ناگوار تاثر کو جھٹکنا چاہتے ہوں۔ پھر کسی شدید جذبے کے بوجھ سے جیسے جھکنے لگے ہوں بیوی کی آنکھیں اور زیادہ پھیل گئیں جیسے وہ سہمے ہوئے وقت کو اس بے بس اور مجبور لمحے کو اپنی کوکھ میں منتقل کر لینا چاہتی ہو۔

خاوند ایک جھٹکے کے ساتھ پلٹا مگر اس کے چہرے پر مکمل سکون تھا۔

"جلدی جلدی، لشکر آ رہا ہے۔"

بیوی نے ایک جھٹکے کے ساتھ کلائی میں پڑی ہوئی پہنچیوں کو حرکت دی اور سر سے لٹکی ہوئی چادر کو دائیں کلائی پر لپیٹتے ہوئے خاوند کے بازو کو تھام لیا اور دائیں ہاتھ سے اپنے پیڑو کو اوپر کی طرف دھکیلتے ہوئے جل تو جلال تو کے ڈگ کے ہچکولے میں اس کے ہونٹ خاوند کے چوڑے شانوں سے بھڑ گئے۔ نیچے مشرق سے انگاروں کی ایک چھوٹی سی قطار مغرب میں ڈوبتے ہوئے سورج کی شہ پر نمودار ہو رہی تھی جو تیزی سے چلتے چلتے اچانک ایک جھاڑی کی اوٹ میں رک گیا صحرا میں روتی ہوئی جھیلوں کی سی آوازیں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ بکریوں کی ممیاتی ہوئی ممیاہٹ سے سناٹے میں ایک عجیب اداس اداس کھلبلی سی مچی ہوئی تھی اور کتا جیسے جنگلی سور کی بو سے چونک کر جذبۂ تحفظ کے تحت وقتے وقتے کے ساتھ بھونک جاتا تھا۔ بیوی جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھتے ہی اپنی چڑھی ہوئی سانسوں کو اندر زور زور سے کھینچنے لگی جیسے وہ بکھری ہوئی قوت کو جمع کر لینا چاہتی ہو۔

ستاروں کی قطار اب نیچے صحرا میں سامنے آگئی تھی۔ وہ پانچ بڑے خاکستری ٹرک تھے جن کے پہیوں سے کچلی ہوئی ریت دھوئیں کی کرنوں کی صورت میں پہاڑوں کی سمت بڑھ رہی تھی، جیسے صحرا کی روح کسی آنے والے جشن میں چٹانوں کو شرکت کی دعوت دے رہی ہو۔ اس ہنگامے میں آس پاس بسیرا لینے والا کوئی پرندہ جب بے چینی سے اپنے پر پھڑپھڑاتا اور مضطرب ہو کر آوازیں نکالتا تو یہ سب عمل دل کی دھڑکن کے ساتھ صاف سنائی دے رہا تھا اور سارے میں پھیلے ہوئے اسرار کا رنگ کچھ اور گہرا ہو جاتا۔

پانچوں ٹرک جنگل سے کوئی تین سو گز کے فاصلے پر رک گئے۔ بیوی نے اپنے دونوں نتھنے جلدی جلدی سانس لیتے ہوئے پھڑکائے، صحرا میں پٹرول کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ متلی محسوس کرنے لگی جیسے اس بساندھ کو پھیلانے والے یہ ٹرک اس کے سینے پر دھرے ہوں، خاوند نے گردن پھیر کر بیوی کی طرف دیکھا جو پھٹی پھٹی حیران اور معصوم نگاہوں سے خاوند کی طرف دیکھ رہی تھی۔ "آج رات ہم جنگل میں نہیں جا سکیں گے۔" خاوند نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں" بیوی نے بدستور خاوند کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہیں بھوک بھی لگی ہوگی؟" خاوند نے خجالت سے کہا۔

"ہمارے آدمی بھی اناج لے کر نہیں پہنچے وہ ضرور کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔" خاوند کہتا چلا گیا "اور اگر وہ لشکر کی نظر سے بچنے کے لئے تھل کا راستہ اختیار کر چکے ہیں تو اللہ ان کا نگہبان ہو، خدا کرے ان کے مشکیزے سلامت ہوں ورنہ ———"

"ورنہ کیا؟" بیوی نے گھبرا کر اپنے دونوں ہاتھ خاوند کے بازو پر رکھتے ہوئے گویا سوال کیا اور پھر خود ہی کسی گمبھیر سوچ میں گم ہو جاتے ہوئے کہنے لگی "ہاں تھل تو سسی کا ہے جہاں کوسوں پانی کا نشان نہیں وہاں تو پرندے بھی اڑتے ہوئے اپنے پروں کو جھلسا کر گر پڑتے ہیں۔"

"تم سو جاؤ" خاوند نے گھبرا کر موضوع بدلتے ہوئے کہا اور اپنے سر سے پگڑی اتار کر بیوی کے بائیں پہلو کے ساتھ رکھتے ہوئے دوبارہ بولا۔

"اسے سر کے نیچے رکھ لو"

بیوی نے ایک عجیب اندازِ دلربائی کے ساتھ پگڑی پر ہتھیلی کو مضبوطی سے گاڑ دیا اور وہ محسوس کرنے لگی، جیسے اس کے کانوں کی لویں تک پھڑپھڑا رہی ہیں۔ نیچے صحرا میں ریت کے کراہنے کی آواز سے سارے میں پھیلا ہوا سناٹا زیادہ گمبھیر زیادہ المناک ہو رہا تھا۔

دور لشکر کے آدمیوں کی بڑبڑ آوازیں وقفے وقفے کے بعد اسے بدصورت بنا رہی تھیں، شام گہرا گئی تھی اور لشکریوں کے دھندلے دھندلے سائے تھیلوں میں ریت بھر رہے تھے۔ بیوی یوں محسوس کرنے لگی جیسے صحرا میں حدِ نگاہ تک سب آٹا پھیلا ہوا ہے جو بڑھتے ہوئے سایوں کے رنگ میں خاکستری ہو گیا بالکل امریکن آٹے کی طرح، وہ دیر تک نیچے دیکھتی رہی اور بیلچوں کی کربیہ دھار سے ٹکراتی ہوئی ریت کی سسکیاں سنتی رہی اب اسے اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہو رہا تھا اور ہونٹ چلتے ہوئے ——— جیسے لشکریوں نے سب ریت اس کے حلق میں بھر دی ہو ———

اس کی آنکھوں میں جھونک دی ہو۔

آس پاس سارے میں اندھیرا پھیل چکا تھا اب صرف بھوتوں کی سی آوازوں ہی سے نیچے بونوں کے فنا کے رقص کا احساس ہو سکتا تھا فضا میں پھیلی ہوئی آوارگی کی لہریں جب جسم سے ٹکراتیں تو روئیں روئیں کے تخیل میں نیچے بدبودار خون سے بنی ہوئی صورتیں پھیلتی چلی جاتی تھیں، بیوی نے ایک کراہ کے ساتھ پگڑی پر سر ٹکا دیا۔ اور پھر بے چینی سے کولہوں کے پہلو بدلنے لگی۔

"کیوں کیا بات ہے۔" خاوند نے پلٹ کر بیوی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میرا دل گھبرا رہا ہے۔" بیوی نے بے چینی سے آسمان پر نظریں جماتے ہوئے جواب دیا۔

"دراصل تم بھوکی ہو، میں چپکے سے نیچے جا کر جگی سے کچھ لے آتا ہوں۔" خاوند نے مضطرب ہو کر کہا۔

"گوشت مجھ سے نہیں کھایا جائے گا پہلے ہی متلی ہو رہی ہے۔"

بیوی نے گویا خاوند کو ٹالتے ہوئے جواب دیا اور پھر کہنے لگی۔

"نیچے اترنا کچھ عقلمندی نہ ہوگی میرے منہ میں خاک اگر کچھ ہو گیا تو——"

"کچھ ہو نہ ہو مگر ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔" خاوند نے جذبات سے ڈولی ہوئی آواز میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا "ہم کسی سے بھیک تو نہیں مانگتے ہم اپنے ہی پہاڑوں کی پیشانی کا عرق اپنی ہی زمین پر بکھری ہوئی اوس اپنے ہی مساموں سے رستا ہوا پسینہ چاٹ کر زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ اور اس حق سے ہمیں کوئی باز نہیں رکھ سکتا ہم اپنے کہرے کی چادر میں لپٹے ہوئے ہیں۔ ہمارے ناموس کو ہماری اپنی روایت نے ڈھانپا ہوا ہے کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں مرد کی ازلی ذمہ داریوں کو فراموش کر دوں اور تمہیں اپنے سامنے بھوک سے تڑپتا ہوا دیکھوں۔" اور وہ اٹھ کھڑا ہوا اسے اپنے جذباتی ہونے کا احساس ہو چلا تھا۔ اس نے تسلی کے لئے اپنا ہاتھ اٹھ کر بیٹھی ہوئی بیوی کے سر پر رکھ دیا اور ملائم آواز سے کہنے لگا "تم گھبراؤ مت، لشکر جگی سے خاصے فاصلے پر ہے اس اندھیرے میں انہیں کیا خبر ہوگی میں تمہارے لئے پنیر کے چند بچے کھچے ٹکڑے اور پانی لے آتا ہوں۔" اور پھر وہ اپنی انگلیوں سے بیوی کے سر کو سہلاتے ہوئے نیچے اترنے لگا۔ بیوی دم بخود بیٹھی دیکھ رہی تھی ایسی نظروں سے جو بڑھتے ہوئے مرد کے عزم کے حسن کو جیسے صدیوں سے پہچانے ہوئے ہو اور اس کی نگاہیں ان قدموں کی خوبصورت چاپ کو چوم رہی ہوں خاوند بیوی کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا وہ دیر تک پھیلی ہوئی تاریکی میں گھورتی رہی اس کے سینے سے دھک دھک کی آواز یوں آ رہی تھی جیسے پتھر لڑھک رہے ہوں—— پھر اچانک اس کا دل ایک ریلے کے ساتھ اس کی آنکھوں اور کانوں میں چڑھ آیا—— اور سارے میں پتھر لڑھکنے لگے سائیں سائیں کرتی ہوئی آوازیں اس کی کنپٹیوں کے ساتھ سے گزر گئیں۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر تیزی سے دوبارہ جھاڑی کی اوٹ میں اوندھے منہ لیٹ گئی اور دیر تک لیٹی رہی خوف سے زندگی نے اس کے پیٹ میں کھلبلی مچا دی تھی۔ بھوک سے بلکتی ہوئی جان کی لاتوں سے گویا اس کی پسلیاں چرمرا اٹھی تھیں۔ اب نیچے ٹرکوں کے یکے بعد دیگرے سٹارٹ ہونے کی آوازیں آ رہی تھیں اور سارے میں پٹرول کی بو پھیل چلی تھی۔ پیٹ کے نیچے ایک نوکدار پتھر کی چبھن سے اس نے پہلے کروٹ بدلی پھر سر اٹھا کر دیکھا اور پھر یک لخت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ جیسے کسی خیال نے اسے کاٹ کھایا ہو، ٹرک روانہ ہو چکے تھے اس نے پتھرائی ہوئی نظروں سے چاروں اور دیکھا اور پھر جھوم کر اٹھ کھڑی ہوئی وہ اتنی خوف زدہ تھی جیسے یونہی بے ارادہ اپنے آپ کو ٹیلے سے نیچے لڑھکا دے کہ اسے اپنے پہلو میں ایک میٹھے دھچکے کا احساس ہوا۔ اس نے جھک کر کلائیوں میں پہنی ہوئی پہنچیوں کے ایک اداس چھناکے کے ساتھ خاوند کی پگڑی اٹھائی۔

جب اس نے ریت کے گھروندے سے سر اٹھایا تو پتوں کی لاش خاک میں اتر چکی تھی۔ اس کے خشک چہرے اور پلکوں پر آنسوؤں کی پرچھائیاں

بلک رہی تھیں۔ جب اس نے اپنے گالوں سے کملائی ہوئی ریت کو جھاڑا تو نکلتے ہوئے سورج کی مدھم مدھم روشنی میں اس کی بیوگی کو سفید دیو کی طرح صبح نمودار ہو رہی تھی۔ اس نے جھگی کی طرف دیکھا جس کی جلتی ہوئی آگ سرد ہو چکی تھی۔ پھر جیسے ریت میں بکھری ہوئی نعمتوں کو اس نے اپنی نظروں سے ٹٹول کر اپنے کندھوں پر ڈال لیا اور دور شمال میں پہاڑوں کی اور چل نکلی، دن بھر گزرے ہوئے لمحات کی راکھ اس کی آنکھوں میں تیرتی رہی اور شام کو جب وہ اوپر ایک بلند سرخ چوٹی کے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھی تو ایک لمبی دلدوز چیخ کے بعد اس نے دیکھا اس کا بچوں اس کی گود کی پوری مٹھاس کو محسوس کرتے ہوئے ایک معصوم مسکراہٹ کے ساتھ سویا ہوا ہے۔

جولائی ۵۸ء

سرور پہلے پہل ڈھاکے کے مشاعرے میں شرکت کے لیے آئے تو ڈھاکے کے اربابِ ذوق کو اپنی شخصیت، اپنی شاعری اور اپنی آواز کا گرویدہ بنا کر واپس چلے گئے۔ بعد میں غالباً ۱۹۵۳ء میں جب وہ ڈھاکے کے مشاعرے میں آئے تو پھر وہ یہیں کے ہو رہے۔ ڈھاکے میں ان کے ٹھہرنے کی صورت یہ نکلی یا نکالی گئی کہ انہیں انجمن ترقیٔ اردو مشرقی پاکستان کا آفس سیکریٹری بنا دیا گیا۔ یہ ایک چھوٹی سی ملازمت تھی مگر اس زمانے میں ان کے گزارے کے لیے کافی تھی۔

عکس تحریر: نذیر صدیقی

# ایک بار پھر*

محمود احمد قاضی

—اسے وہاں سے نکالا گیا تو اس کے پاس کھونے کے لئے سوائے اس کے اپنے ننگے تنومند جسم کے اور کچھ نہ تھا (اور ظاہر ہے یہ جسم ان کے لئے ایک بے کار سی شے تھی، مگر خوش قسمتی سے ستر ڈھانپنے کے لئے اس کے پاس اس کے دو مضبوط ہاتھ موجود تھے (ہاتھ ضرور موجود تھے لیکن اگر وہ ان سے ستر ڈھانپنے کا کام لیتا تو پھر دوسرے کام کیسے کرتا مثلاً خوراک تلاش کرنا، کھجلانا، ناک صاف کرنا وغیرہ ——— تو اس نے ستر پوشی اس کے لئے اب یوں بھی بے معنی ہو چلی تھی کہ وہ اس وقت ایک صحرا میں تھا اس لمبے چوڑے صحرا میں کہیں کہیں صحرائی جھاڑیاں تھیں جن کے اردگرد سے ریت ہٹا کر وہ بوقتِ ضرورت ان کی جڑوں میں چھپے پانی کو ڈھونڈ نکالتا تھا تاکہ زبان سوکھا چمڑا نہ بنے مگر بھوک ——— اب وہ ان جھاڑیوں کے کانٹے تو نگلنے سے رہا۔

وہ بستی جس سے اسے نکالا گیا تھا اس کی جنم بھومی تھی اس کی مٹی میں اس کا جنم ہوا وہیں وہ ایک قد آور جسم کڑیل پیکر میں ڈھلا۔ اسی بستی کے چمن زاروں اور سبزہ زاروں سے روحانی اور جسمانی غذا میسر آئی اسی بستی کی وادیوں میں اس نے بھیڑ بکریاں چرائیں۔ ان کے دودھ سے بھرے تھنوں سے خود بھی سیراب ہو اور دوسرے لوگوں کی پیاس بھی بجھائی اور یہیں ایک گوشے میں سکون، تحمل اور بردباری کے ساتھ وہ ایک جھونپڑے میں زندگی بسر کرتا تھا۔ اردگرد سارے میں اس کی دانش کے چرچے تھے لوگ باگ اس کے مشوروں پر کان دھرتے تھے وہ ان کی سنتا تھا اور انہیں اپنی سناتا تھا لوگوں اور اس کے درمیان ایک طرح کی COMMUNICATION تھی، بھروسہ تھا، اعتبار تھا، دلجوئی اور محبت کو وہ ہر وقت دوسروں میں بانٹتا رہتا تھا اسے کسی کے ساتھ اور کسی کو اس کے ساتھ شکایت نہ تھی ایک طرح سے مفاہمت، دریگانگت کی مہک سارے میں پھیلی ہوئی تھی کیونکہ وہ اسی بستی کے وجود کا حصہ تھا اس لئے وہ مرنا بھی یہیں چاہتا تھا—مگر اس کی ان غیر معمولی طور پر اترنے والے گھمنڈی خبیثوں اور بھڑ بونجوں سے بنی نہیں جو اسی بستی میں سے تھے مگر

جھگڑا بہت معمولی تھا مگر بڑا بھی

انہوں نے کہا

خوشی صرف ہمارے لئے

اس نے کہا

خوشی سب کے لئے

انہوں نے کہا

دکھ ہمارے لئے نہیں

اس نے کہا
دکھ کسی کے لئے بھی نہیں

تو اس بستی میں جہاں سب اس کی دانش کو مانتے تھے اور خوش رہتے تھے ان فسادی بھڑ بھونجوں نے اپنی طاقت اور گھمنڈ کے زعم میں اس کی دانش سے انکار کیا اور پھر انہوں نے آہستہ آہستہ بستی کے لوگوں کی راحتوں کو غارت کرنا شروع کیا پھر انہوں نے لوگوں کی مسرت اور خوشی پر دن دہاڑے ڈاکے ڈالے اور اپنے کوٹھوں کو اس چھینی ہوئی مسرت اور خوشی سے بھر لیا اور دکھ کے کانٹے ساری بستی میں بکھیر دیئے۔ اور یوں اس بستی کے مکینوں کی روحیں لہولہان ہو گئیں۔

یہ بھلا مانس اور دانش مند ان کے احکامات کو نہ ماننے کے جرم میں پہلے محبوس ہوا پھر اپنے جھونپڑے یعنی راحت کدے سے بے دخل ہوا اور آخر میں وہی بستی بدر ہوا اور اس طرح

وہ زمین اس پر تنگ ہوئی جو اس کی جنم بھومی تھی وہ لوگوں کے خوف سے زرد چہروں کے درمیان سے یوں نکلا کہ اب اس کے پاس مزید کھونے کے لئے اس کے اپنے ننگے آبنوسی جسم کے سوا کچھ نہ تھا۔

اور اب وہ اس لمبے چوڑے صحرا میں اپنے ریت ریت بدن کے ساتھ چل رہا تھا ــــ وہ جب کبھی ہنستا تو اس کے منہ سے ریت جھڑتی روتا تو اس کی آنکھوں سے ریت بہتی۔

رات کے پچھلے پہر صحرائی ٹھنڈ میں اپنے سکڑتے سمٹتے بدن کو ریت میں دفن کئے وہ پڑا تھا کہ اس کے نتھنوں میں ایک مانوس بو گھسی تو وہ چونکا پھر کچی نیند سے جاگا تو اسے اپنے منہ پر منہ رکھے پایا

تُم

اس نے اپنی تھوتھنی اور زور اور محبت اور گرمجوشی سے اس کے منہ پر رگڑی تو یہ اٹھ بیٹھا تو آؤ ــــ خوش آمدید ــــ ایک سے دو بھلے مگر بھلے مانس ــــ بھلا میرے ساتھ تم یہ کشٹ کیوں کاٹو گے۔

وہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

اس نے اسے پیار سے پچکارا اور اپنے قریب کر لیا اور اس کے جسم کی گرمی سے اپنے جسم میں اُترتی ٹھنڈ کے حملے کو کم کیا

بھلے مانس ــ مجھ کو تو انہوں نے رد کر دیا پھر تم ــ

وہ اس کے سوالات کو در خورِ اعتنا نہ سمجھ کر آگے بڑھ گیا پھر آسمان کی طرف منہ کر کے بُری طرح گُرلایا اب یہ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

یہ نئے دن کا آغاز ہے

سورج کی تمازت ــــ دونوں کے جسم گرمی سے بھاپ ہو رہے تھے

ہانپتے، کانپتے ــــ بھوکے پیاسے وہ خاموشی سے چل رہے تھے کہ ایک آہٹ نامعلوم نرم سی محبت بھری آہٹ نے انہیں چونکایا

انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا

وہ پپڑی جمے ہونٹوں کے ساتھ زخمی پاؤں اور تھکا جسم لئے ان کے قریب آ گئی۔

تو تم بھی ــــ مگر کیوں؟

انہوں نے مجھے روندا ــــ مجھ پر تھوکا اور ادھر بھگا دیا کہ شاید ان کے نزدیک میں بھی تمہارے جرم میں برابر کی شریک تھی حالانکہ جب وہ تمہیں فردِ جرم پڑھ کر سنا رہے تھے تو میں نے قریب سے گزرتے ہوئے تمہارے دکھ میں صرف ایک آہ بھری تھی۔

ٹھیک ــــ تو اب تم، میں اور یہ کتا

کتا نہیں ــــ جاندار کہو ــــ زندگی کا ساتھی کہو UNCONFORMIST, کہو

شکریہ ــ شکریہ اس تصحیح کا ــــ شاید میں اکیلا ہونے کی وجہ سے کچھ بوکھلا یا ہوا ہوں اب تم دونوں بھلے مانس میرے ساتھ ہو تو شاید میں کچھ زیادہ طاقتور ہو جاؤں گا۔

وہ ہنسا

تم دونوں کا شکریہ

وہ تینوں چلتے رہے پھر بہت سی تلخ راتوں اور گرم دنوں کے بعد ان کے راستے میں ایک جنگل آن پڑا ــ ہرا بھرا ــ ہیبت سے پُر ــ اپنے اندر ایک گونج لئے ــ ایک بڑا وسیع جنگل جو رنگ رنگیلے پروں والے پرندوں سے اٹا پڑا تھا ــ مرد نے ایک درخت کی شاخ توڑ کر اس کو نوکیلا بنایا پھر اس سے ایک پرند شکار کیا اور اسے ان تینوں نے آپس میں بانٹ لیا ــ پھر کئی درختوں کی مضبوط شاخوں کو توڑ کر ایک جھونپڑا بنا لیا ــ مرد اور عورت جھونپڑے میں چلے گئے تو وہ جیسے عرف عام میں کتا کہا جاتا ہے اپنی ڈیوٹی پر آ گیا

کچھ بھیگے کچھ سوکھے، کچھ میلے کچھ چمکیلے مہینوں اور سالوں کے بعد مرد اور عورت کے بیٹے کڑیل جوان بن گئے تو وہ دونوں اپنے سفید بالوں میں ہاتھوں کی انگلیوں سے کنگھی کرتے ان کی طرف دیکھ کر مسکراتے اور اپنے تیسرے ساتھی یعنی اس NONCONFORMIST کتے کو ایک مٹی کے ڈھیر کے نیچے دفن دیکھ کر رنجیدہ ہو گئے ان کے بیٹے بڑے زیرک شکاری تھے اس لئے خوراک اب ان کے لئے کوئی مسئلہ نہ تھی ــــ ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ جھونپڑا بھی تھا ــ سکھ کی فراوانی تھی مگر پھر بھی مرد سوچتا

مجھے اب اپنی زمین کی طرف لوٹنا چاہیئے

عورت سوچتی

میں بھی دنیا کی ہوں اس لئے مجھے بھی وہیں ہونا چاہیئے.

بیٹوں کے ساتھ صلاح مشورے کے بعد انہوں نے واپسی کا سفر شروع کیا

پھر وہ تیزی کے ساتھ اپنے راستے میں پڑتے صحرا کو عبور کر گئے.

وہ جب بستی کے قریب پہنچے تو ان کی بستی آگ کا گولہ تھی ـــــ طاقت اور عرور کے نشے میں جن نا عاقبت اندیشوں نے اس بستی کو اس خستہ حالی میں تبدیل کیا تھا ان کے خلاف اقدام کرنے سے پہلے انہوں نے سوچا

تدبیر کے بغیر ہم کامیاب نہ ہوں گے

پھر انہوں نے تدبیر کی ـــــ چار چوبیرے موجودات کی سیاہ چادر کو انہوں نے چالاکی اور ہوشیاری سے تار تار کیا اور اُن پر ـــــ اُن مردودوں پر شب خون مارا جب انہوں نے ان مجرموں پر غلبہ پالیا تو بستی کے لوگوں نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا اور اپنی محبت بھری بانہیں اُن کے لئے کھول دیں

بیٹوں نے بستی کا نظم و نسق سنبھالا اور تب انہوں نے اس دانشمند شخص سے جو کہ ان کا باپ بھی تھا کہا

خوشی صرف ہمارے لئے کہ دکھ ہمارے لئے نہیں

اس نے جواب دیا

خوشی سب کے لئے کہ دکھ کسی کے لئے بھی نہیں

جھگڑا بہت معمولی تھا مگر بڑا بھی

بیٹوں نے اپنی ماں اور باپ دونوں کو نافرمان ٹھہرایا اور بستی سے نکل جانے کا حکم دیا

وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ایک بار پھر بستی سے نکل پڑے ہیں

نہیں ایک بار پھر اُس تپتے صحرا کو عبور کرنا ہے اور ایک بار پھر...... .

دسمبر ۸۶ء

چالیس سالہ مخزن

ناول کا انگریزی ترجمہ AUNT JULIA & THE SCRIPTWRITER کے نام
سے چھپا تو اسے نقادوں نے حالیہ برسوں کا انتہائی اہم ادبی واقعہ
قرار دیا۔ یوسا نے [illegible] اسی انداز
میں ایسے کئی مسائل پر گفتگو کی ہے جو تیسری دنیا کے ادبی
منظر نامے پر اہمیت رکھتے ہیں۔ یوں یہ [illegible] کہ ناول ہمارے لیے توجہ طلب
بھی ہے اور معنی خیز بھی۔

آصف فرخی

عکس تحریر:۔ آصف فرخی

# چھوٹے قد کی قبر

فریدہ حفیظ

ماں کہتی تھی سوتے بچے پر سے مت کودو اس کا قد چھوٹا رہ جائے گا۔

مگر قد تو بڑھتا رہتا ہے۔ میں جان بوجھ کر یہی دیکھنے کے لئے سوتے بچوں پر سے کود جایا کرتی تھی۔

مگر بچے بڑے ہو جاتے تھے پھر ماں کیوں یہ کہتی تھی۔

میں جب سوتے بچے پر سے چھلانگ لگاتی، تو دل میں ایک بے نام سا ڈر در آتا کہ چھلانگ پوری نہ لگی تو۔۔۔ تو میری سمجھ میں یہ بات بہت دنوں بعد آئی کہ قد چھوٹا کیوں رہ جائے گا۔

اور سونے والوں کی بستی میں ایک چبوترے پر بیٹھے بیٹھے مجھے اچانک احساس ہوا کہ وہ ایک بچے کی قبر ہے۔۔۔ چھوٹے قد کی قبر۔ کوئی اس پر سے کود گیا ہوگا اور چھلانگ پوری نہیں لگی ہوگی۔ میرے سارے جسم میں جھرجھری دوڑ گئی۔ جی متلانے لگا اور آنکھوں کے سامنے پیلے اور سیاہ رنگ گڈمڈ ہونے لگے اور جسم پر بہت سے بچھو چلتے ہوئے محسوس ہوتے۔ کالے اور پیلے۔ اور یہ خیال آتے ہی کہ میں قبرستان میں ہوں، میں خوف سے قبریں پھلانگتی بھاگ کھڑی ہوئی۔

اور اس گنجان سڑک پر آنکلی، جس کے چوراہے سے چار سے زیادہ سڑکیں کہیں جاتی تھیں اور گھوم پھر کر واپس آجاتی تھیں۔ روشنیوں کے رنگ تھے اور رنگ برنگی اشیاء سے سجی دکانیں مگر دکانوں میں کوئی نہیں تھا۔ نہ خریدار نہ دکاندار۔ اور تب ہی ایک جلتی بجھتی روشنیوں والی کار میرے پاس آکر رکی اور اس لمبی سی کار میں سے وہ اتری تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ قدموں میں رلتا دوپٹہ اور ہاتھوں میں ایک مریل سا بچہ۔ جیسے اس پر سے کوئی کود گیا ہو۔

پھر مجھے یوں لگا جیسے میں اس بچے کو جانتی ہوں۔ مگر یہ عورت کون تھی۔۔۔ یہ بچہ اس کے ہاتھوں میں بجتا نہیں تھا۔ یہ تو بالکل اس بچے جیسا تھا۔ جسے میں قبرستان آنے سے پہلے دور ان کھیتوں میں چھوڑ آئی تھی، جہاں پیلی سرسوں پھولی تھی اور میری جیسی بہت ساریاں سروں پر پھولدار چادریں ڈالے کھیتوں کی منڈیروں پر سے گذرتے ہوتے پچھلی بیساکھیوں اور بسنت رتوں کے گہواروں کو یاد کر کے غمناک ہوگئی تھیں یوں لگتا تھا جیسے سرسوں کھیتوں میں نہیں ہمارے چہروں پر پھولی ہو۔ ہم نے گندم کی سنہری بالیوں کے گٹھے گٹھے مضبوط ہاتھوں میں تھمائے تھے۔ اور خوش تھیں کہ ہماری کوٹھریاں دانوں سے بھر جائیں۔ ہم نے کتنے ہی گیت لہک لہک کر گائے تھے۔

اللہ میاں نے دانوں سے کوٹھری بھر دی تھیں مگر جب ہم کوٹھریوں کے دروازے کھولتے تو ان میں دانے نہ ہوتے اور سفید چوہے ناچتے نظر آتے ایسا ہر بار ہونے لگا تھا۔ ہر بار جب ہم گٹھے مضبوط ہاتھوں میں تھما دیتیں تو خوشی خوشی ان کوٹھریوں کو چل دیتیں جو دانوں سے بھر گئی تھیں مگر جب دروازے کھلتے تو سفید چوہے ادھر ادھر بھاگ جاتے اور دانے ہمارے بچوں کے چہروں پر نکل آتے۔ اس روز جب سرسوں پھولی

تھی اور گندم کے پودے ابھی بالشت بھر زمین سے بلند ہوئے تھے۔ آسمان بسنتی پتنگوں سے بھر گیا تھا تو جانے مجھے کیوں سرسوں کے ہر پھول میں ایک مریل بچے کا چہرہ نظر آ رہا تھا اور میں گھبرا کر قبرستان میں جا بیٹھی تھی۔

اور میری ماں کہتی تھی۔ سوتے بچوں پر سے مت کودو، پتہ نہیں جن بچوں کے چہرے مجھے سرسوں میں نظر آئے تھے ان پر سے میں کودی تھی یا سفید چوہے۔

اسی لئے میں نے اسے کہا کہ اس کے مریل بچے پر سے ضرور کوئی کودا ہوگا۔

تو اس کی سمجھ میں میری بات نہیں آئی تھی۔ ظاہر ہے اس کا بچہ تو اونچے جنگلے کے درمیان سوتا ہے۔ اڑن کھٹولے جیسے۔ میرے بچے کی طرح کھیت کی منڈیر پر نہیں ہوتا کہ کوئی انجانے میں اس پر سے کود نہ جائے۔

تو پھر اس بچے پر سے کون کودا تھا۔

مگر اس نے مجھے بڑی حیرت میں ڈال دیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس کا بچہ بھوکا ہے۔

کیا تمہاری کوٹھی میں بھی سفید چوہے ناچتے ہیں۔

کیا — ؟ تم کیا کہہ رہی ہو، میرا بچہ بھوکا ہے۔

میں نے حیران ہو کر اس لمبی کار کو دیکھا جس کی چکنی سطح پر گال رکھنے کو جی چاہتا تھا۔ میں نے اس کے ریشمی ملائم کپڑوں کو چھونا چاہا جو گلاب کی پنکھڑی کی طرح ملائم تھے۔

میرا بچہ بھوکا ہے۔ میری چھاتیوں میں دودھ نہیں ہے۔ اس نے اپنا سینہ ننگا کر کے مجھے دکھایا۔

اُف اللہ میں سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ وہاں چھاتیوں کی بجائے دو گڑھے تھے اور ان میں ہزار پائے پنجے گاڑھے بیٹھے تھے۔ میں نے ڈر کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھا تو بھری ہوئی چھاتیوں میں سے دودھ کے فوارے بہہ نکلے۔ اتنا سارا دودھ، لاؤ بچہ مجھے دو میں دودھ پلا دوں۔

نہیں نہیں — اس نے مجھے حقارت سے دیکھا۔

میں تم سے اس کے عوض کچھ نہ لوں گی میں تو بچے کو روز دودھ پلا دیا کروں گی۔

اوہ یہ دودھ نہیں، وہ — اس نے ایک دکان کی طرف اشارہ کیا جہاں بے شمار ڈبے اوپر تلے ڈھیروں کی صورت میں رکھے تھے۔ ان ڈبوں پر صحت مند گول مٹول بچوں کی تصویریں بنیں تھیں۔

یہ دودھ — میں تو سمجھی تھی کہ یہ دودھ صرف اصلی دودھ میں ملانے میں کام آتا ہے۔ ہمارے گاؤں کا گوجر بھی دودھ شہر لے جا کر بیچتا ہے جب اس کی بھینس بھاگ جاتی ہے — اور دہی جمانے کے کام بھی آتا ہے لیکن اس کا ذائقہ بڑا عجیب ہوتا ہے۔ پچھلے سال جب سیلاب آیا تھا تو گاؤں میں انہوں نے بہت سارا دودھ تقسیم کیا تھا۔ جو ہم سے گوجر سارا خرید کر لے گیا۔

اوہ پاگل یہ دودھ تو بہت قیمتی ہے۔ تھیلوں والا خیراتی دودھ۔

اچھا — میں نے حیرت سے اس دودھ کو دیکھا جو میری چھاتیوں سے بہہ بہہ کر زمین پر لکیریں بنا رہا تھا اور مٹی میں سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھنے لگی تھی، خوشبو اس مریل سے بچے کے نتھنے میں گئی تو اس نے زبان نکال کر بلکنا شروع کر دیا۔ جانے اس میں اتنی جان کہاں سے آ گئی تھی۔ وہ میری گود میں آنے کے لئے ہمکنے لگا۔ مگر اس عورت نے اسے بڑی مضبوطی سے تھام رکھا تھا اور اسے چھوڑنے کے لئے بالکل تیار نہ تھی۔

دیکھو دودھ بہہ رہا ہے۔ ضائع ہو رہا ہے، لاؤ اسے میں پلا دوں۔ میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں لوں گی۔ حیرت ہے تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا لوگ دودھ پلانے والیاں ڈھونڈا کرتے تھے۔

تم جانے کیا بک رہی ہو۔ مجھے اپنے بچے کے لئے دودھ چاہیئے جو بہت دنوں سے بازار سے غائب ہو گیا ہے اور میرا بچہ دودھ کے لئے تڑپ رہا ہے۔

اچھا دودھ بھی غائب ہو جاتا ہے۔ ہم نے تو آٹا غائب ہوتے دیکھا ہے۔ جب گاؤں کی کوٹھریوں میں سفید چوہے دوڑنے لگے تو بازار سے آٹا غائب ہو گیا۔ بہت لمبی لائن لگتی ہے صبح سے شام ہو جاتی ہے تب ملتا ہے مگر ویسا نہیں ہوتا جیسا ہماری گندم کی سنہری بالیوں کا ہوتا ہے اس نے ابھی کہا تھا نا کہ دودھ بازار سے غائب ہو گیا ہے۔ ابھی تو اس نے دکھایا ہے مجھے۔ ڈھیروں دودھ کے ڈبے، یہ عجیب سی عورت تھی۔ شاید اُسے نظر نہیں آتا۔ دکانوں میں ڈھیروں دودھ کے ڈبے تھے۔ دودھ زمین پر بہے جا رہا تھا۔ بے چاری دیکھ بھی نہیں سکتی تھی، مگر بچہ بھی مجھے نہیں دیتی تھی۔ اسے تو کچھ نظر نہیں آتا میں خود ہی دکاندار سے مانگ کر اسے دے دوں۔ میں دکان کی طرف آئی وہ بھی میرے ساتھ چلی آئی اور ڈبوں کے ڈھیر کی طرف بڑھی اور دکاندار کو دیکھنے لگی، مگر وہ کہیں بھی نظر نہ آیا۔ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ ایک ڈبہ اٹھا ہی لوں، شاید وہ آجائے میں نے ڈبہ اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اس نے لپک کر میرا ہاتھ کھینچ لیا۔ عجیب عورت ہے۔ اب اسے سب کچھ نظر آنے لگا ہے مجھے ہاتھ بھی لگنے نہیں دیتی۔ مجھے تو صرف اُس بچے کا خیال تھا۔

میں نے پھر ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ چیخ کر بولی۔ اندھی ہو گیا۔ دیکھتی نہیں سانپ ہیں۔

سانپ — کہاں — میں خوف سے سہم گئی۔ وہ دیکھو!

ہاں سانپ تھے ہر ڈبے پر ایک سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا — اتنے ڈھیر سارے سانپ۔ جتنے ڈبے اتنے سانپ۔

میرے اندر جیسے دودھ بننا بند ہو گیا۔ شاید خوف کے مارے سوکھ گیا تھا اور عجیب سا شور سنائی دینے لگا تھا۔

یہ کیسا شور ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، بازار میں سوکھے دودھ کے ڈبوں کی دکانوں کے سامنے چمکیلی کاروں، سکوٹروں اور ٹیکسیوں کی قطاریں لگی تھیں اور مریل بچوں کو تھامے مائیں دودھ کے ڈبوں کی طرف بڑھتی تھیں، مگر ڈبوں پر سانپوں کے پہرے دیکھ کر پلٹ جاتی تھیں۔ ان کے سینوں میں گڑھے تھے جن میں ہزار پائے پنجے گاڑے بیٹھے تھے۔ اور ماؤں کا سارا دودھ پی گئے تھے اور بچے جس دودھ کے عادی تھے ان پر سانپوں کا قبضہ تھا۔ وہ سانپ بھی عجیب تھے اور ان کی زبانیں بھی لمبی تھیں اور وہ بات بھی کر سکتے تھے۔ اور ہاں یہ بھی تو کہتی تھی کہ تہہ خانوں میں جہاں خزانے صدیوں تک ڈھیروں کی صورت میں جمع ہوتے رہیں ان پر سانپ آکر بیٹھ جایا کرتے ہیں اور کسی کو خزانے کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے۔ یہ سانپ بھی ڈبوں پر اسی طرح بیٹھے تھے جیسے خزانے پر بیٹھے ہوں اور وہ کہہ رہے ہیں کہ دودھ تمہاری کھالوں کے عوض ملے گا۔ ہاں ہماری کھالیں نوچ لو لیکن ہمیں دودھ دے دو۔ ہمارے بچے بھوک کے مر رہے ہیں۔ بے شک ہمارا خون لے لو۔

خون نہیں چاہیئے۔ خون کی بھری بوتلیں بڑی سستی مل جاتی ہیں۔ سُرخ یا سفید جیسا چاہو سستے داموں خرید لو۔ کھالیں نہیں ملتیں۔ جب تک ہم گاہکوں کی کھالیں نہ نوچ کھائیں ہم ان ڈبوں سے نہیں ہٹ سکتے۔

اور وہ بڑا دہشت ناک منظر تھا۔ سانپ ان عورتوں کی کھالیں نوچ رہے تھے۔ کھالیں ایک چرچراہٹ کے ساتھ انچ انچ ادھڑتی چلی جا رہی تھیں۔ سفید اور گندمی بدنوں پر چھوٹی شریانیں ابھر آئی تھیں اور خون رس رس کر بڑے بڑے دھبوں میں پھیلتا جا رہا تھا اور سخت اذیت میں مبتلا مائیں دودھ کے ڈبوں پر جھپٹ رہی تھیں اور بچے بھوک سے چلّا رہے تھے۔ لہولہان مائیں انچ انچ ادھڑنے کے بعد گوشت کے سرخ تودوں میں تبدیل ہو گئی تھیں اور ہاتھوں میں ڈبے تھامے یوں چل رہی تھیں جیسے قبروں میں سے ایسے مُردے نکل آئے ہوں جن کی کھالوں کو کیڑوں نے چاٹ لیا ہو اور ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ ڈبے جو ان کے ہاتھوں میں تھے ان کے ڈھکنے کھول سکیں۔

ستمبر ۷۹ء

# ایک گمشدہ آدمی کی حکایت

مظفر اقبال

سفر سے واپسی پر اُس نے شہر کو خالی پایا۔ کئی دن تک بازاروں اور گلیوں میں بھٹکنے کے بعد ایک شام وہ شہر کے نواح میں اس عورت کے گھر جا پہنچا جو غیب کا علم جانتی تھی اور گمشدہ افراد کو تاش کے پتّوں میں ڈھونڈ لیتی تھی۔

"تمہارے جانے کے بعد" عورت نے چائے بناتے ہوئے کہنا شروع کیا: "وہ گونگا ہو گیا تھا۔ تم کہاں چلے گئے تھے؟"

"وقت کے پار" اس نے جواب دیا۔

"وقت کے پار کیا ہے؟"

(ماں نے، اس نے یاد کیا، روانگی کے آخری لمحوں میں یہی سوال پوچھا تھا لیکن ان دنوں مجھے اس کا جواب معلوم نہ تھا۔)

"وقت"۔ اس نے لمبے سفر سے واپس آنے والوں کی طرح جواب دیا۔

"ایک روز میں اس کے گونگے پن سے تنگ آ گئی اور پوچھ بیٹھی: 'تم کب تک خاموش رہو گے'؟ صبح جب میں سو کر اٹھی تو وہ جا چکا تھا۔"

وقت کے پار اُترنے پر اُسے علم ہوا کہ راستے کی گہری کھائیوں میں آدم خور رہتے تھے اور اُن میں سے ایک نے اُسے قید کر لیا ہے۔

قید کے ابتدائی دنوں میں وہ ایک قدیم شہر کی فصیل پر پہنچا۔ شہر کا نام "یاد" تھا۔ محافظوں نے اُسے بتایا کہ اس ازلی شہر میں داخل ہونے والوں کو واپسی کا ارادہ موت کے پاس گروی رکھنا پڑتا ہے۔ اُن دنوں اس کی یاد پر ایک پاگل عورت کے قہقہے کا قبضہ تھا۔ پاگل عورت کا قہقہہ موت کے پاس گروی رکھ کر وہ شہر میں داخل ہو گیا۔

اندھے آدمی سے بیاہے جانے پر اس کی عورت عالی ظرفی کے امتحان کا پرچہ لئے اُس تک پہنچی "میرا آدمی آنکھوں سے اندھا ہونے کے سبب شہرِ سماعت میں رہتا ہے"۔ عورت نے اپنا قہقہہ واپس مانگتے ہوئے کہا۔

امتحان میں فیل ہونے کے خوف کے باعث اُس نے پاگل عورت کا قہقہہ لوٹاتے ہوئے یہ پوچھنا بھی مناسب نہ سمجھا کہ اس کے پاگل پن کا علاج کس نے کیا ہے۔

دوسرے دن موت کی رتھ پر شہر بدر کئے جانے والوں میں وہ بھی شامل تھا۔

رتھ سوار نے اُسے شہرِ افسوس میں لے جا پھینکا۔ اُن دنوں شہر کا موسم بہت سرد تھا اور اس کے گونگے پن میں صرف یخ آندھیوں کی آواز گونجتی تھی۔ وہ دن بھر برف پر پھرتا رہتا اور رات آنے پر منجمد دریا کے کنارے جا بیٹھتا۔

نئے سال کی پہلی رات شہرِ افسوس کی ملکہ نے اُسے بُلا بھیجا۔ سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی ملکہ شہرِ یاد کی زبان سے نابلد تھی۔ نئی زبان سیکھنے کے ابتدائی دنوں میں اُسے علم ہوا کہ مختلف زبانوں کا ماہر ہونے کے لئے جس کشادگی کی ضرورت ہوتی ہے وہ ابھی اس کی گرفت میں

نہ آئی تھی۔ شہر بدر کر دیئے جانے کے خوف سے اُس نے اپنی زبان ترک کر دی۔ نئی زبان سیکھنے میں بہت وقت گزر گیا۔

”میں دراصل تمہاری اجنبی زبان پر مَر مِٹی تھی۔“ ایک دن نیلی آنکھوں والی نے ادا سے کہا۔ ”اب میں دیکھتی ہوں کہ تم اپنی زبان بھول چکے ہو۔“

شہر بدر کر دیئے جانے کے بعد اس نے زبانوں کے علم سے پناہ چاہی، کلام ترک کیا اور شہرِ خوف میں داخل ہوا۔

نئے شہر کی رگوں میں تو دوڑتی تھی۔ سائے کی تلاش میں وہ ایک بوڑھے آدمی تک پہنچا جو روزِ اوّل سے اس شہر میں رہ رہا تھا۔ بوڑھا معاش کی یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر تھا اور اس کی آنکھوں میں وقت ٹھہر چکا تھا۔ وقت کی اس یکجائی سے متاثر ہو کر وہ بوڑھے سے دوستی کر بیٹھا۔

دوستی کی اوّلین گرم جوشی نے اُسے اس حقیقت سے بے خبر کیے رکھا کہ بوڑھا وقت چوری کرنے کا گُر لے کر پیدا ہوا تھا اور اس نے اپنی عمر پہلے خوف تک پہنچنے اور اسے فتح کی کوشش میں خرچ کی تھی (اور ناکام رہا تھا) بوڑھے کو اب انسانوں سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی لیکن نوجوان کی آنکھوں میں اسے وقت کے ایک بہت بڑے ذخیرے کی یافت کا امکان نظر آیا اور اس نے دوستی پر کوئی اعتراض نہ کیا۔

ایک روز، جب اُن کی دوستی پر کئی موسم گزر چکے تھے، بوڑھے نے اس کا سارا وقت چرا لیا۔

وقت سے بچھڑنے پر وہ ایک ریگستان میں پہنچا۔ پانی کی تلاش میں وہ تغیر بکف موسموں اور اجنبی ملکوں کے ناآشنا شہروں میں سرگرداں رہا، اس نے ریت کے گھر بنائے اور آسمان کی چھت تلے سویا۔ خوابوں میں وہ پاگل عورتوں کے ساتھ ہم وصل ہوا اور ایسے واقعات سے گزرا، جو کتابوں میں درج نہیں کیے جاتے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ایک صبح وہ ایک آئینہ بکف جزیرے پر جا اُترا۔

جزیرے پر اسے ایک ہم شکل شبیہ نظر آئی۔ شبیہ کے تعاقب میں چلتے چلتے وہ کئی موسموں اور ارادوں سے گزر کر بالآخر اپنے شہر واپس آ پہنچا۔

غیب کا علم رکھنے والی عورت نے تاش کے پتے کھولے اور دیر کے بعد بولی: ”وہ ایسے دروازوں سے بھاگ نکلا تھا، جن پر قفل لگے تھے:

گھر پہنچ کر اُس نے دروازوں کو مقفل کر دیا۔ کئی زمانوں کے بعد اس کی ہم شکل شبیہ اس کے خواب میں ظاہر ہوئی۔ اس کے چہرے پر نامعلوم دریافتوں کا خزانہ رقم تھا۔ وہ سو کر اُٹھا تو دروازوں کے قفل ٹوٹ چکے تھے لیکن اس عرصے میں اس کی ماں مر گئی تھی اور شہر کی زبان بدل گئی تھی۔

مئی ۸۶ء

[illegible] صاحب نے نادر کے خط میں [illegible] دیکھ کر اسے
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

عکس تحریر:- خواجہ حمید الدین شاہد

# ایک شیر کی ڈائری کے چند اوراق

طارق محمود

پنجرے کی پچھلی دیوار کا دروازہ کھول کر اس شخص نے گوشت کی ران دھم دھم سے نیچے پھینک دی۔ بھوک خوب چمک چکی تھی۔ گوشت بھی تازہ تھا۔ کسی تنومند بچھڑے کا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بس پیٹ کی آگ بجھانے میں جُت گیا۔ گوشت خوری سے فارغ ہوا تو اپنی لمبی زبان ہونٹوں پر پھیری۔ مجھے اونگھ سی آنے لگی۔ آنکھیں موندیں اور جسم پھیلا کر فرش پر لیٹ رہا۔ پھر کچھ شور ہوا۔ میں چونکا آنکھیں گھما کر دیکھا کچھ لوگ جنگلے کے قریب کھڑے مجھے تک رہے تھے۔ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن اب تو روٹین سی بن گئی تھی۔ میں انگڑائی لے کر اٹھا۔ اپنے بھاری بھرکم جسم کو سنبھالا اور مختصر سے پنجرے کا چکر لگانے لگا۔ میں سر جھکائے گھوم رہا تھا۔ اور کان کھڑے کے لوگوں کی بے معنی باتیں اور قہقہے سن رہا تھا۔ پھر میں جنگلے کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ لوہے کی سلاخوں میں سے سامنے کا منظر دیکھنے لگا۔ سڑک کی دوسری طرف پنجروں میں چھپی ڈالیوں پر رنگ برنگے نیلے پیلے پرندے خوب چہک رہے تھے۔ ساتھ ہی پنجرے میں ایک چمپنزی نے ادھم مچا کر رکھا تھا۔ بچے سنگترے، مالٹوں کی قاشیں اس کی طرف پھینکتے اور وہ آگے بڑھ کر دبوچ لیتا۔ بچے زور زور سے تالیاں بجاتے پھرتے۔ لوگ راہ چلتے چلتے میرے پنجرے کے قریب آکر رُکتے میری ایک نظر سے ان کا سانس رُکنے لگتا۔

اس پنجرے میں میری طبیعت اُچاٹ رہتی۔ جگہ بہت ہی تنگ تھی اور میرا ٹہلنے کو جی چاہتا۔ پھر ایک روز وائلڈ لائف کا ایک ڈیلی گیشن چڑیا گھر دیکھنے آیا۔ سامنے سبزہ زار میں نقشوں اور چارٹوں کی مدد سے انہیں چڑیا گھر کی توسیع کے پروگرام سے آگاہ کیا گیا۔ کچھ ہی روز میں توسیع کا کام شروع ہو گیا۔ میرے پنجرے کی عقبی دیوار سے ایک رستہ بنایا گیا۔ سامنے میدان کے گرد بلند جنگلا نصب کر دیا گیا۔ اس وسیع احاطے میں ایک مصنوعی جھیل کا اہتمام بھی کیا گیا۔ اب میں پنجرے کی عقبی دیوار سے کھلے میدان میں نکل آتا۔ ہلکی پھلکی جستیں لگاتا۔ گرمی کی شدت میں جھیل میں کود گیا۔ میدان کے اردگرد آہنی جنگلوں کے ساتھ ایک ہجوم جمع رہتا۔ جو مجھے دیر تک تکتا رہتا۔ میں اکثر سوچتا چڑیا گھر کی فصیل سے باہر کیسا ماحول ہوگا۔ اس کمپاؤنڈ سے باہر جب میں زرق برق لباس میں ملبوس لوگوں کا سوچتا تو میرے دل میں باہر کی دنیا دیکھنے کا خیال انگڑائیاں لینے لگتا۔ کاش میں باہر کی دنیا دیکھ سکتا۔ یہاں تفریح طبع کے لئے آنے والوں لوگوں کے چہرے پر بشاشت اور رونقیں دیکھ کر میں اس ماحول سے باہر بکھری خوشیوں کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ میں نے ہمیشہ انسان کو بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا۔ ویسے بھی انسان اور ہماری برادری کا زمانہ قدیم سے ایک ایسا رشتہ چلا آ رہا تھا۔ جس پر ڈھیروں صفحات لکھے جا سکتے تھے۔ ہمارے مابین کئی مشترکہ قدریں پائی جاتیں۔ اعتماد کی فضا برسوں سے قائم تھی۔ کبھی کبھار نجی سطح پر آویزش کی صورت بھی پیدا ہو جاتی لیکن اجتماعی سطح پر قدر دانی کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔

مجھے کوئی بھی یہ پوچھ سکتا تھا۔ یہ کیسی قدر دانی؟ مجھے تو چڑیا گھر میں بند کر دیا گیا تھا۔ یہ کیسے تعلقات تھے۔ لیکن میں تو اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ انسان نے چڑیا گھر بھی تو آخر بنانا تھا۔ اس کی تفریح طبع کے لئے اتنی قربانی تو دینا تھی۔ بالکل جیسے کبھی کبھار انسان بھولے بھٹکے سے شیر کی تفریح طبع کا سامان بن جاتا۔ انسان کا میں شروع سے معترف ہوں۔ اور انسان بھی تو میری نسل کا معترف ہے۔ لوگ ہنسی خوشی اپنے بچے کا نام "شیر خان" رکھ لیتے ہیں۔ آخر وہ اپنے بچے کا نام "بھیڑیا خان" بھی رکھ سکتے ہیں۔ حالانکہ میرے اور بھیڑیے کے چیر پھاڑ کے انداز میں کچھ خاص فرق نہیں۔ اسی طرح کبھی کسی شخص نے کسی کا نام لومڑ نہیں سنا ہوگا۔ اگرچہ لومڑ ایک عقل مند معاملہ فہم جانور ہے۔ سماعت جیسی نام کی کوئی خاتون بھی شاذ ہی دکھائی دیتی ہے۔ ایک شیر ہی ایسا جانور ہے۔ جس کے نام پر لوگ ہنسی خوشی اپنے بچوں کا نام 'شیر دل' رکھ لیتے ہیں۔

چڑیا گھر میں شائقین تقریباً ہر جانور کے ساتھ مذاق کرتے۔ ہاتھی کے منہ میں گنے ٹھونستے۔ بندر کی بہت چھل اُچھل دیتے۔ زیبرے پر پھبتیاں کستے۔ لیکن میرے جنگلے کے قریب مؤدب کھڑے ہو جاتے تحیر آمیز نظروں سے مجھے دیکھتے۔ ایک روز جب پنجروں کی زور و شور سے صفائی کی جا رہی تھی۔ تو مجھے یوں لگا جیسے عملے کا آدمی میرے پنجرے کا دروازہ بند کرنا بھول گیا۔ میرے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ میں نے چپکے سے دروازے کو سرکایا اور باہر نکل آیا۔ کسی نے بھی اس بات کا نوٹس نہ لیا۔ اور میں نظریں بچاتا چڑیا گھر کے صدر

دروازے سے باہر نکل آیا۔ دربان نے شاید مجھے پہچانا ہی نہ تھا۔ سڑک کے دو رویہ سرسبز درخت ان کے پار بلند اونچی عمارتیں۔ فٹ پاتھ پر پیدل چلتے لوگ میرے قریب سے تیز رفتار کاریں گزر رہی تھیں۔ کاروں میں سوار لوگ مسکرا کر دیکھتے۔ میری طرف ہاتھ ہلا کر گزر جاتے۔ مجھے اس مانوسیت سے عجب لطف آنے لگا۔ قریب ہی ایک بس آ کر رکی۔ میں نے جسم اکٹھا کیا اور بس میں سوار ہو گیا کنڈکٹر باری باری سب کو ٹکٹ دے رہا تھا۔ مجھے کچھ پریشانی سی ہوئی۔ میرے پاس تو پیسے بھی نہیں تھے۔ میری حیرت کی انتہا ہی نہ رہی کنڈکٹر نے دور سے میری طرف مسکرا کے دیکھا لیکن ٹکٹ کاٹنے کا تردد ہی نہ کیا۔ میری بس عزت رہ گئی۔

میں نے سامنے سیٹ کے اوپر، اچٹتی نظر سے دیکھا وہاں ایک مقولہ درج تھا۔ "گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک روز کی زندگی بہتر ہے۔" میرا سینہ خوشی سے پھولنے لگا۔ میں کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھنے میں محو ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد جونہی بس کی رفتار کم ہوئی۔ میں چپکے سے نیچے اتر آیا۔ اور شہر کے پررونق علاقے کی طرف چل پڑا۔ رہ میں جا بجا خوانچہ فروشوں کی بھیڑ تھی۔ کہیں دیسی گنے کی رو نکل رہی تھی اور کہیں گاجر کا تازہ جوس گلاسوں میں انڈیلا جا رہا تھا۔

اس وقت میں ایک پرانی وضع کے سینما گھر کے قریب سے گزر رہا تھا۔ دیواروں کے ساتھ بڑے سائز کے رنگ برنگے بورڈ سجے تھے۔ کوئی دھڑکی توڑ فلم چل رہی تھی۔ میرے دل میں فلم دیکھنے کا خیال مچلا۔ میں برآمدے سے ہوتا ڈریس سرکل کا دروازہ سرکا کر اندر گھس گیا۔ خاصی بساند تھی۔ تماش بین ہر سین پر بے تحاشا ہڑبونگ مچا رہے تھے۔ پھر ہنسی قہقہوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل پڑتا۔ پردہ سکرین پر ہیرو جونہی گلا پھاڑ کر چیخنے چلانے لگتا سینما بین منہ میں انگلیاں گھما کر ہا.... ہا.... ہا کی بلند آوازیں نکالتے۔ میں نے پچھلی نشستوں پر نظر گھما کر دیکھا۔ نیم تاریکی میں مجھے پچھلے محروم طبقے کے مزدور پیشہ مرد اپنی بیویوں کے ساتھ جڑے فلم کے مزے لوٹتے دکھائی دیئے۔ فلم کا ہیرو جسے سب "شیر بچہ" پکارتے عجیب بے ہنگم انداز میں اچھل کود رہا تھا۔ ایک موٹی تازی خاتون کو گیند کی طرح فضا میں اچھالتا کبھی اپنے بازوؤں میں بھینچ لیتا۔ کبھی اس کا بازو مروڑتا۔ میرے کان چونکے۔ جب "شیر بچہ" نے اس موٹی تازی گٹھڑی نما ہیروئین کو "شیرنی" کہہ کر پکارا۔ "شیر کبھی ڈنڈ گھماتا اور کبھی گھاس چرتا۔ پھر شیرنی نے پردہ سکرین پر اخلاق باختہ حرکات شروع کیں تو میں مارے شرم کے منہ چھپائے نظریں چرائے سینما ہال سے باہر نکل آیا۔

میں وہاں سے ہوتا۔ بھیڑ کو چیرتا ایک جلسہ گاہ میں پہنچا۔ بہت بڑا ہجوم تھا۔ کوئی جلسہ تھا۔ میں نے سٹیج پر ایک نظر دیکھا ایک دبلا پتلا شخص جس کی گردن کی ہڈی باہر کو ابھری ہوئی تھی۔ بلند آواز سے تقریر کر رہا تھا۔ اس کی گول چشموں والی عینک ناک پر بار بار پھدکتی۔ وہ پنجوں کے بل ٹانگیں اینٹھے ہوا میں گھونسے برساتا۔ مجمعے کی حالت عجیب تھی۔ نعرے بازی زور و شور سے جاری تھی۔ "جیوے جیوے شیر جیوے" میں نے اپنے گرد نظر دوڑائی پھر سٹیج کی سمت دیکھا۔ وہ بدستور لہک لہک کر جھول رہا تھا۔ اور جوش خطابت میں اس کا جسم اینٹھ رہا تھا۔ پھر وہ ہوا میں گھونسے برسانے لگے۔ ایک کونے سے زوردار نعرے لگنے شروع ہو گئے۔

فیقا ساڈا شیر اے ، باقی ہیرا پھیری اے

"کون فیقا!" میں نے مجمعے میں ایک شخص کو ٹہوکا مارا۔ "وہ سامنے۔ جانتے نہیں!" اس نے غصیلی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "اگر تمہاری لاعلمی کا یہی حال ہے تو جیالے کارکن تمہاری تکہ بوٹی کر دیں گے!" میں نے لمحہ بھر کے لئے سٹیج کی طرف دیکھا۔ اگر فیقا شیر تھا۔ تو پھر میں کیا تھا۔ فیقے کی صورت دیکھ کر مجھے جھرجھری سی آنے لگی۔

اب میں اندرون شہر کے بیرون دروازے پر واقع ایک اکھاڑے میں پہنچ گیا۔ وہاں لنگوٹ کسے دو پہلوان داؤ پیچ لڑا رہے تھے۔ چارپائی پر ایک لاغر وجود جس کے پسلیوں کی بہتات تھی۔ کراہ رہا تھا۔ یہ ہمارے "شیر علم گیٹ" ہیں۔ ایک لحیم شحیم شخص شیر علم گیٹ کو سہارا دے کر سردائی کا گلاس پلانے لگا۔ پھر اس کی کمر کے پیچھے تکیہ رکھ دیا۔ ایک مالشی نے سرسوں کا تیل ہتھیلی پر انڈیلا اور "شیر علم گیٹ" کی پتلی پنڈلیوں کو دونوں ہاتھوں سے تھپتھپانے لگا۔ "بھئی شیروں والی کیا بات ہے!" مجھ سے آخر رہا نہ گیا۔ مالشیے نے مجھے عجب انداز سے گھورا "خلیفہ جی جوانی میں ایسی قینچی چلاتے کہ لوگ دنگ رہ جاتے۔ خلیفہ جی کا دھوبی پٹڑا بھی کمال ہوتا!" "حیرت" میں بڑبڑایا "قینچی! دھوبی پٹڑا۔ ایسا شخص حجام اور دھوبی تو ہو سکتا تھا۔ شیر کیسے ہو سکتا تھا۔ میں نے دل میں سوچا۔ "لیکن خلیفہ جی میں شیروں والی کیا بات رہ گئی ہے!" میں بظاہر اس نحیف وجود کو تسلیم کرنے سے عاری تھا۔ -

بادشاہو! شیر شیر ہوتا ہے خواہ بوڑھی ہڈیاں ہی کیوں نہ رہ جائیں۔ مالشیے نے بتیسی نکالی۔ میں وہاں سے دُم سمیٹے چل پڑا۔

میں ایک بار پھر ٹھنڈی سڑک پر گھوم رہا تھا۔ دفعتاً لوگوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ خوف و ہراس کی فضا میں لوگوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ بھئی لوگ کیوں بھاگ رہے ہیں میں نے قریب بھاگتے ایک شخص سے پوچھا۔

"تمہیں نہیں معلوم!" اس کے چہرے کی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔

"نہیں بھائی۔!"

"شہر میں شیر آگیا ہے۔"

"شیر! کہاں ہے شیر؟"

"یہیں کہیں ہے! سنا ہے سڑک پر نکل آیا ہے۔" وہ رک کر بولا "کیا تمہیں شیر سے ڈر نہیں لگتا!"

"نہیں تو!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"بہت بہادر لگتے ہو۔ واقعی شیر سے نہیں ڈرتے۔!"

"شیر تو میں خود ہوں۔" میں نے اس کی حیرت دور کرنے کی کوشش کی۔

"تم شیر ہو!!!" وہ بے ساختہ ہنسا۔

"کیوں تمہیں کوئی شک ہے۔" مجھ سے نہ رہا گیا۔

"کیا شیر کی شکل ایسی ہوتی ہے۔" اس نے چلتے چلتے مجھے ہاتھ سے چھو دیا۔

"تو اور کیا۔!"

"تم تو جنگلی ہی لگتے ہو۔" اس نے پھبتی کسی۔ مجھے اس پر بڑا غصہ آیا۔ تمہیں میری طاقت کا اندازہ نہیں۔ میں نے اسے نوکدار پنجے دکھائے اور اس شخص کے جسم میں گاڑ دیئے وہ بے اختیار قہقہے لگانے لگا۔ سخت جان تھا یا تو میرے ناخن کند ہو چکے تھے۔ یا پھر اس شخص کی کھال بہت سخت ہو چکی تھی۔ میں قدرے جھینپ گیا۔ اس نے بڑی سرعت سے جیب میں سے ایک تیز دھار شے نکالی ہوا میں لہرائی اور میرے کولہے میں پیوست کر دی۔ میں درد کی شدت سے تلملا اٹھا میرے کولہے میں سے خون رسنے لگا۔ میں نے گردن گھما کر اپنا زخم چاٹا۔ "تم لوگ اتنے وحشی ہو۔ خون بھی کر دیتے ہو۔"

"خون۔ خون کرنا تو ہمارے لئے بڑی معمولی بات ہے۔" وہ پھر ہنسا "تم نے آج کا اخبار نہیں پڑھا۔ شہر میں قتل کی تین وارداتیں ہوئی ہیں۔ لگتا ہے تم جاہل اور ان پڑھ ہو اخبار پڑھنا بھی نہیں جانتے۔" میں نے خاموشی میں عافیت جانی اور تیز تیز قدموں سے اس کے ساتھ چلنے لگا۔ فضا میں کچھ فائر ہوئے۔ میں گولی کی آواز سنتے ہی دہل گیا۔ لیکن اس شخص کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ گولی کی آواز سے میری نظریں دھندلا گئیں۔ اور مجھے برسوں پرانا وحشت ناک منظر یاد آ گیا۔ جب گھنے جنگل میں چند ہم جو سفاک شکاریوں نے کچھار کے باہر میرے باپ کو گولیوں کا نشانہ بنایا تھا۔ اب برسوں بعد ایسی ہی آواز سن رہا تھا۔ میرا جسم خوف اور غصے سے کپکپانے لگا۔ میری آنکھوں میں انسان کے خلاف غصہ اور نفرت عود کر آئی۔ لیکن میں نے یہ سوچتے ہوئے غصے پر قابو پا لیا کہ کہیں میں بھی گولی کا نشانہ نہ بن جاؤں۔

ہم دونوں جائے حادثہ کے قریب پہنچ گئے۔ وہاں ایک ہجوم تھا۔ خون میں لت پت وجود بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ نقاب پوش گن پوائنٹ پر تجوری کھلوا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ مالکوں نے جب مزاحمت کی کوشش کی تو گولیاں داغ دیں۔ "آٹومیٹک رائفل کا برسٹ تھا۔" اس شخص نے ایکسائیٹڈ ہو کر کہا۔

"آٹومیٹک!" وہ کیا شے ہے۔

"تم تو مجھے بالکل جنگلی لگتے ہو۔" وہ جھنجھلا کر بولا۔ "آٹومیٹک نہیں جانتے۔ آٹومیٹک رائفل!"

"آٹومیٹک! میں نے صرف تھری ناٹ تھری کا نام سنا ہے۔"

"اسے کون تھری ناٹ تھری کو لوڈ کرتا پھرے۔ آٹومیٹک رائفل رانی ہے رانی۔ ایک سیکنڈ میں اڑتیں گولیاں داغتی ہے۔ پھلجھڑی ہے پھلجھڑی!" اس نے میرے علم میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "شیر آگیا۔ شیر آگیا!" لوگ پھر چیخنے اور بھاگنے لگے۔ میں بھی بھاگ رہا تھا۔ سب بھاگ رہے تھے۔

لوگ شیر کے ڈر سے بھاگ رہے تھے اور میں گولی کے خوف سے بھاگ رہا تھا۔ "کمال ہے آٹومیٹک رائفلوں کے ہوتے ہوئے بھی شیر سے ڈرتے ہو۔" میں نے پھر اس سے سوال کیا۔ "تم سمجھتے کیوں نہیں درندہ بہرطور درندہ ہوتا ہے۔!" وہ شخص ہاتھ میں چھرا لہرائے مسلسل بھاگ رہا تھا۔

"لیکن تم اس چھرے سے شیر کا کام تمام کر سکتے ہو۔" میں نے احتیاطاً اس کے ارادے کو بھانپنے کی کوشش کی۔

"بکواس مت کرو۔ فضول باتوں میں وقت مت ضائع کرو۔ بھاگ جاؤ ورنہ شیر تمہیں ہڑپ کر جائے گا!" اس نے غصے سے مجھے گھورا۔

شیر آگیا۔ شیر آگیا۔ لوگ شیر کے خوف سے بھاگ رہے تھے۔ میری آنکھوں میں چمک عود آئی۔ میں نے اپنی پوری قوت کو جمع کیا اور زور سے دہاڑا اور جستیں بھرنی شروع کر دیں کچھ ہی دیر بعد میں ٹھنڈی سڑک کے پاس ایک فصیل کے باہر کھڑا تھا۔ پھر میں زور دار جست لگا کر اندر پہنچ گیا۔ دم ہلاتا اپنے پنجرے کے پاس کھڑا تھا۔ جیسے کہ ماتھ

سر رگڑنے لگا۔ میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملاتے۔ کیوریٹر نے مجھے غصیلی نظروں سے دیکھا۔ اٹنڈنٹ نے چھڑی سے ٹہوکا مارا۔ یہیں ٹھہرو!

"کیوں"؟ میں نے احتجاجی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

تمہارے خلاف ایفی شینسی اینڈ ڈسپلن رولز کے تحت کارروائی کا آغاز ہو چکا ہے۔

"کارروائی؟"

"ہاں۔ تم نے چڑیا گھر کا ڈسپلن توڑا ہے!"

"میں نے!"

"ہاں تمہیں چارج شیٹ کا جواب دینا ہوگا۔"

"میرا جواب! جناب میرا جواب یہی ہے کہ میں نے انسان سے ذرا مانوس ہونے کی کوشش کی تھی۔ مایوس ہوکر واپس آگیا ہوں۔!!"

میرے خلاف سمری پروسیڈنگ مکمل ہو گئیں۔ اور فیصلہ کیا گیا کہ سزا کے طور پر مجھے سات روز پنجرے سے باہر رکھا جائے گا۔ یہ حکم سنتے ہی میرے جسم میں کپکپی کی لہر دوڑ گئی۔

اگست ۸۶ء

سرد مگر حسّیت ہاتھ
تاریکی پر لپٹی دبیز پٹیاں اتارتے ہیں
ایک ایک کرکے
میں اپنی آنکھیں کھولتا ہوں تو ~~[illegible]~~ یہ احساس ہوتا ہے
جیسے میں ابھی تک زندہ ہوں
اسی زخم کے بیچ جو ابھی ہرا ہے

عکس تحریر:- ظہیر راجہ

# عذابوں کا پُل صراط

فردوس حیدر

عبادات کو معمول بنا کر اترانے والیاں فکرمند تھیں کہ اگر لڑکی پاگل ہوگئی تو کیا ہوگا۔ وہ اسے رونے پر آمادہ کرتی رہیں اور اسے یاد کرانے کی کوشش کرتی رہیں کہ ماں مرچکی ہے اور موت پر کھُل کے رونے سے ذہنی توازن برقرار رہتا ہے۔

"لڑکی تیری ماں مرگئی ہے۔" کسی ایک نے بلند آواز میں کہا۔

ہُش لڑکی نے انگلی سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا

"دیکھو ماں کے ہونٹ ہل رہے ہیں۔ وہ کچھ کہہ رہی ہے۔"

"آہ . . . بے چاری لاوارث بچی" گاؤں کی عورتیں ایک ایک کرکے اس کے گرد جمع ہورہی تھیں۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ لڑکی کی ماں اچانک کیسے مرگئی اور اب اس لڑکی کو پاگل ہونے سے کیسے بچایا جائے۔

باپندی سے آستانے پر حاضری دینے والیاں پریشان تھیں اگر لڑکی پاگل نہ ہوئی تو کیا ہوگا۔ وہ لوگ جو بے سہارہ جاتے ہیں۔ ان کا دامن کتنی محرومیوں سے بھر دیا جاتا ہے۔ ان کی راہوں میں کتنے کانٹے آپ ہی آپ اُگ آتے ہیں۔ مکمل ہوش و حواس میں اس پل صراط کو کیسے عبور کرے گی۔ انھیں ملال تھا کہ لڑکی کو رُلانے کے جتن کئے جارہے ہیں۔

"ماں کہتی ہے" لڑکی نے ماں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "مجھ میں مروم جیسی روٹیوں کی سیری اور راحت کی کثرت نہ تھی۔ میں نے ہمیشہ محتاج کی دستگیری کی اور مکروہات سے دُور رہی۔ پھر بھی مجھ پہ ملامتوں کے تیر برسے اور اسیری کے شب و روز طویل ہوئے۔"

"لڑکی تیری ماں مرچکی ہے۔" اسے رُلانے کی کوشش جاری رہی لیکن لڑکی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ سب لوگوں سے بے نیاز ماں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی اور بولتی رہی۔

"سنو — ماں کہتی ہے مجھ پہ اسیری کے شب و روز طویل ہوئے اور ان ہی دنوں میں سے کسی ایک دن میں نے ایک بچی کو جنم دیا۔ کوئی بھی اس کی ناف کاٹنے اسے غسل دینے اور کپڑوں میں پیٹنے کے لیے تیار نہ ہوا کہ وہ ملعون قرار پائی:

"لڑکی تیری ماں . . . . ."

"ہُش میری ماں نہیں مرسکتی۔ اسے ایسا دورہ اکثر پڑتا ہے۔ گھنٹوں گُم سُم پڑی رہتی ہے۔ پھر خود بخود باتیں کرتی ہے اور گھنٹوں باتیں کرتی رہتی ہے اور اُٹھ کے بیٹھ جاتی ہے۔"

عورتیں جانتی تھیں کہ اس مرتبہ لڑکی کی ماں کبھی اُٹھ کے نہ بیٹھ سکے گی۔ لیکن لڑکی کو یاد کرنا دشوار ہوگیا تھا۔ جب وہ اسے رُلانے کے تمام جتن کرکے مایوس ہوگئیں تو اپنے اپنے مرنے والوں کو یاد کرکے رونے لگیں۔

کرمونائی حویلی کے آنگن میں واویلا کرتی ہوئی عورتوں سے دُور بیٹھا پورے سین کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکی کی باتیں بچپنہ نہیں لیکن ان باتوں کو عام لوگوں سے مخفی رکھنا لازمی تھا۔ کم از کم وہ یہ ہی سمجھتا تھا۔ "اک چپ تے سو سُکھ" اس نے اپنا سبق دہرایا اور اسے وہ دن یاد آیا جب بابا شاہ نے فضل دین کو پناہ دی تھی اور چند ہی دنوں میں اپنی چرب زبانی اور عبادت سے بابا شاہ اور ان کی بیٹی کا دل جیت لیا تھا۔ اس نے کئی بار اشاروں میں فضل دین کے بارے میں بابا شاہ کو آگاہ کرنا چاہا۔ اُنھیں بتانا چاہا کہ وہ زہرہ بائی کے کے ہاں جاتا ہے لیکن بابا شاہ نے موقع نہیں دیا۔ یا شاید خود اس میں حقیقت سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ تھی۔ فضل دین سے ٹکر لینے کا حوصلہ نہ تھا وہی فضل دین جس کی شاطرانہ چال سے زہرہ بائی قتل کے کیس میں ملوث ہو گئی۔ وہی فضل دین جس نے ملکہ سے شادی کرتے ہی بابا شاہ کا پتہ کاٹ دیا۔

صبح جب زہرہ بائی اپنی جوان بیٹی کے ساتھ حویلی میں داخل ہوئی تھی تو وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ اپنی موت کا پروانہ لے کر آئی ہے۔ چائے پیتے ہی زہرہ بائی کا اپنی بیٹی کی جانب دوڑنا اور اسے کچھ کہنے سے پہلے پھڑک کے مرجانا اس کی سمجھ میں آگیا تھا۔ چائے بنا کر لانے اور برتن اُٹھا کر لے جانے کے وقفے میں دونوں کے درمیان آپس میں جو بھی گفتگو ہوئی اس کے لئے ٹوٹے جوڑ کر کہانی بنانا آسان تھا۔ وہ فضل دین کی رگ رگ سے واقف تھا اور لہجے کا اتار چڑھاؤ کیا رنگ اختیار کرے گا اسے اندازہ تھا۔ مرتے وقت بابا شاہ نے اسے کہا تھا "سزا اور جزا کا اختیار صرف خدا کو ہے" وہ اسی انتظار میں تھا کہ فضل دین کو سزا ملے گی لیکن برسوں بعد زہرہ بائی کو سزا مل گئی۔ زہرہ بائی جو عمر بھر سزا بھگتتی رہی اور فضل دین نے شاہ جی کا رُوپ دھار لیا اور اب وہ ایسی قوت بن چکا تھا کہ پہاڑ حوصلہ بھی اس کے سامنے ریزہ ریزہ ہو جاتا۔

"مجھے زہرہ بائی کی موت کا سبب بتا دینا چاہیئے" اس کے اندر سے وعدہ معاف گواہ نے سر اٹھایا تو اچانک صغراں اس کے سامنے آگئی۔

"بے بے بلا رہی ہے" صغراں نے پیغام دیا "زردے کا رنگ لا دو۔"

"بہت دیر ہو گئی" اس نے سوچا "بابا شاہ ٹھیک کہتے تھے خدا دیکھ رہا ہے، سزا اور جزا اسی کا کام ہے۔"

"ابا زردے کا رنگ لا دو" صغراں نے ایک بار پھر ماں کا پیغام دیا۔

"برسوں سے جو کچھ بھی ہو رہا ہے ہونے دیا جائے۔ میں کیوں کچھ کہوں کرے کوئی اور بھرے کوئی شاید دُنیا کا انصاف یہ ہی کہتا ہے — لیکن خدا . . . خدا تو دیکھ رہا ہے۔"

"ابا کیا سوچ رہا ہے۔"

لڑکی کا قبول صورت ہونا اور حویلی میں داخل ہوتے ہی اپنی ماں کی رفاقت سے محروم ہو جانا میری بیٹی کے حق میں اچھا ہے" اس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔

"ابا . . . چاول پکنے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں کمیتوں کی بیٹیوں کو بار بار کپڑے استری کرتے اور بٹن لگانے کے بہانے بلانا کیا رنگ لا سکتا ہے۔"

"ابا . . . . "

"میری بیٹی" اس کے دل پہ پڑا بھاری پتھر آپ ہی آپ کھسک گیا "صغراں کا نعم البدل مل گیا۔"

لڑکی کہہ رہی تھی۔

سنو ماں کہتی ہے مجھ پہ عطر چھڑکنے والا، مجھے زردوزی لباس پہنانے والا اور مجھے بیش قیمت زیورات سے آراستہ کر کے دوسروں

کے حوالے کرنے والا میرا اپنا تھا اس کے باوجود بھی میں نے اسے اپنا خداوند مانا۔"

کرمو کو یاد آیا فضل دین زہرہ بائی کے ہاں جاتا تھا تو وہ کسی دوسرے سے نہ ملتی ۔۔ لیکن فضل دین کے اصرار پر خاص خاص لوگوں کے لئے محفل سجاتی ۔ وہ خاص لوگ بقول فضل دین کے بزنس پارٹنر تھے ۔ اس نے ان خاص لوگوں کے بارے میں اس زمانے میں کبھی کچھ سوچا نہ تھا وہ فضل دین کا مقربِ خاص تھا اور اس کا کام فضل دین کی ہاں میں ہاں ملانا تھا۔

"صغرا کے ابا چینی بھی لا دو" وہ بیوی کی آواز پر چونکا۔

"ہوں . . . . زردے کا رنگ لا دو ۔ چینی لا دو" وہ چڑ گیا "میں یہاں سے نہیں جا سکتا ۔ بابا شاہ کے بعد اب یہاں پر زردے اور حلوے کی دیگیں پکتی رہتی ہیں کوئی عبادت کی فکر نہیں کرتا ، نماز روزے غائب اور . . . جا خود بازار سے لے آ سودا۔"

"آج آپ کو کیا ہو گیا ہے" صغرا نے حیرت سے باپ کو دیکھا۔

اس سے پہلے کہ بیگماں کچھ کہتی وہ ٹھٹھک کے کھڑی ہو گئی۔

"شاہ جی . . . . شاہ جی آ رہے ہیں" اس نے شوہر کو اشارہ کیا۔

سبز چوغے میں ملبوس شاہ جی کرمو کے قریب آ کے رُک گئے۔

آنگن گاؤں کی عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔

کرمو نے غصے سے اپنا پاؤں زمین پر پٹخا "چور بھی چوری کرتا ہے تو آس پاس کے سات گھر چھوڑ دیتا ہے۔" اس نے دل ہی دل میں فضل دین کو ماں بہن کی گالیاں دے کر تسکین حاصل کر لی۔ ٹھوکر مرغیوں کے ٹوکرے کو لگا اور بند مرغیاں آزاد ہو کے ادھر اُدھر بھاگنے لگیں۔ سُرخ کلغی والے سفید مرغ نے اذان دینے کے لئے پر پھڑپھڑائے ۔۔۔ شاہ جی نے روتی کُرلاتی عورتوں کی جانب دیکھا اور پیار سے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

"کرمو تمہارے پاس مرغیاں زیادہ ہو گئی ہیں کیا؟" شاہ جی نے پوچھا۔

"حضور کا اقبال بلند ہو" کرمو نے دونوں ہاتھ اپنی بغلوں میں دبا لئے اور برسوں پرانا رٹا ہوا جملہ دُہرایا۔

"ہمارا مرغا بڑا لنگڑا ہے جی" صغرا نے ہنستے ہوئے کہا "سب مرغیاں انڈے دیتی ہیں۔"

"اچھا!" شاہ جی نے بغور صغرا کو دیکھا "تو بڑی سیانی ہو گئی ہے . . . ."

"ہی . . . . ہی . . . . ہی"

کرمو کو یوں سب کا ہنسنا بہت بُرا لگا ۔ "میت رکھی ہے" اس نے بیوی کو ڈانٹا۔

"ہائے ختم شریف کے لئے زردے کی دیگ پکنی ہے" بیگماں چونکی "چل صغرا میرے نال بازار" لڑکی کہہ رہی تھی۔

"ستو ماں کہتی ہے میرے ہاتھ وہ ہاتھ نہیں جو دوسروں کو ایذا پہنچاتے ہیں ۔ میری زبان وہ زبان نہیں جو صرف جھوٹ بولتی ہے اور زہر گھولتی ہے پھر بھی مجھے گدھوں کے حوالے کر دیا گیا۔"

کرمو کو یاد آیا ۔ زہرہ بائی کے ہاں جانے والے سب فضل دین کے خاص لوگ تھے اور ان ہی خاص لوگوں میں سے کسی ایک کے قتل کا پلان خود فضل دین نے بنایا تھا اور زہرہ بائی کو اس میں ملوث کر دیا تھا ۔۔۔ "ہوں" اس نے اپنے سر کو جھٹکا ۔ "برسوں پرانی باتیں یاد کرنا اچھا نہیں ۔" اس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔

"شاہ جی آگئے" عورتوں نے اپنی اپنی نشستیں درست کیں۔

"ملکہ" شاہ جی اپنی بیوی سے مخاطب ہوئے "اس لڑکی کا سر دوپٹے سے ڈھانپ دو اور مراقبے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

ملکہ کو یوں محسوس ہوا جیسے حویلی کی دیواریں ہل رہی ہیں اور موت کی سرد لہر سارے جسم میں پھیل گئی ہے۔ وہ مرنے والی کو نہیں جانتی تھی اور مرنے کا سبب بھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن اس کے نیلے ہونٹ اور تیزی سے رنگ بدلتا ہوا چہرہ کچھ کہہ رہا تھا۔ لڑکی کی باتیں اس کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ پھر بھی اسے یوں محسوس ہوا تھا کہ نیلے ہونٹ کچھ کہہ رہے ہیں۔ نیلا بدن کانپ رہا ہے وہ دہشت زدہ ہو کر کانپنے لگی بالکل اس طرح جیسے بچپن میں ایک مرتبہ بھائی کے ساتھ موت کا کنواں دیکھنے گئی تھی اور اندر جھانکتے ہی لکڑی کی تھرتھراتی دیوار پر موٹر سائیکل چلاتے ہوئے دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔

"اگر سوار کا ہاتھ چھوٹ جائے تو کیا ہوگا؟" اس نے ڈرتے ڈرتے بھائی سے پوچھا تھا۔

"اصل مسئلہ توازن برقرار رکھنا ہے۔" بھائی نے نہایت اطمینان سے جواب دیا تھا۔ "انسان کی موت صرف اس وقت ہوتی ہے جب توازن بگڑ جائے۔"

سوار نے دونوں ہاتھ چھوڑ کر موٹر سائیکل چلائی تو اس نے مارے خوف کے آنکھیں بند کر لیں۔ اس رات وہ دہشتِ موت سے کانپتی رہی اور نیم بے ہوشی کے عالم میں سوار کو موت کے کنویں سے بچانے کے جتن کرتی رہی۔ اگلے دن اس کا بھائی سڑک پار کرتے ہوئے ٹرک کے نیچے آکر ہلاک ہو گیا تو اس پر انکشاف ہوا موت کا کنواں ہر جگہ موجود ہے۔

ملکہ نے آسمان کی جانب نگاہ اٹھائی۔ چیلیں منڈلا رہی تھیں۔ پھر اس کی نگاہ آنگن کے اس کونے میں جا ٹھہری جہاں لکڑی کا تختہ، مشک کافور، بالٹی میں گرم پانی اور کفن کا سفید کپڑا رکھا تھا۔ میت کو کفنانے کی تیاری مکمل تھی۔

"زندگی اسی کا نام ہے" اس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ "ساری عمر ٹریفک سے بچتے ہوئے سڑک پار کرنے کی سعی میں گزر جاتی ہے۔" پھر بھی اسے حویلی کی دیواریں ہلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ لڑکی کی باتیں، موٹر سائیکل سوار کی یاد، آسمان پر منڈلاتی ہوئی چیلیں اور کفنانے دفنانے کا سامان اس کے ذہن میں ہلچل مچا رہے تھے۔

لڑکی کہہ رہی تھی۔

"سنو ماں کہتی ہے میری بچی کا جنم جیل کی سلاخوں میں اس لئے ہوا کہ میں نے کم ظرف کو اپنا مالک مانا اور اس کے پہلوٹھی کے بچے کو سب کچھ جانا۔"

ملکہ نے اپنے شوہر کی جانب دیکھا وہ اطمینان سے مسند پر بیٹھا اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔

"لڑکی کی ماں تخلیق کے لمحوں سے دوچار ہوئی تو اس کے دامن میں عذاب گھڑیاں سمٹ آئیں۔" اس نے سوچا "یا پھر اس کا سبب کچھ اور تھا۔" اس نے بغور شاہ جی کا چہرہ دیکھا۔۔۔ جیسے سبب جاننا چاہتی ہو۔

کمرہ ہونے شاہ جی کے چہرے پر بدلتے ہوئے رنگوں کو دیکھا، پہلے سیاہی مائل نیلا، پھر زرد اور پھر جلد ہی سرخ۔

"اللہ ہو" شاہ جی کا نعرہ بلند ہوا۔ "پہلے گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھو پھر سورۃ فاتحہ اور سورۃ اخلاص پڑھو اور آنکھیں بند کر کے اپنے اپنے مرشد کا تصور کرو۔ جس کا کوئی مرشد نہیں جس کا کوئی مرشد نہیں فی سبیل اللہ۔ فی سبیل اللہ" شاہ جی کی ہدایات جاری ہوئیں۔

"زہرہ بائی کی آمد کی اطلاع پر بھی شاہ جی کے چہرے کے رنگ اسی تیزی سے بدلے تھے" کرمو نے سوچا۔

"لڑکی کی ماں کی موت کا سبب کچھ بھی ہو لڑکی بے سہارا رہ گئی ہے ۔" ملکہ نے دکھ سے سوچا شام آنگن میں دھیرے دھیرے اُتر رہی تھی ۔

مرغیاں خود بخود اپنے ٹھیئے پر جا بیٹھیں، بند ہونے کے لئے۔ عورتیں آنکھیں بند کر کے درود شریف پڑھنے لگیں ۔

لڑکی حیرت زدہ سب کو دیکھنے لگی۔

"لڑکی تیری ماں کو سانپ نے ڈس لیا ہے" شاہ جی کی جلالی آواز سارے گھر میں پھیل گئی ـــــ ملکہ کو ایک بار پھر حویلی کی دیواریں ہلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ موت کے کنوئیں کی مانند ـــــ وہ دہشتِ موت سے کانپنے لگی۔

"سانپ . . . ." کرمو کے اندر ایک بار پھر وعدہ معاف گواہ نے سر اُٹھایا "میں جانتا ہوں زہرہ بائی کو کس سانپ نے ڈسا ہے۔ میں سب کچھ جانتا ہوں، سب کچھ"۔

"بے بے بلا رہی ہے" صغرا کی آواز آئی "دیگ چولہے پر رکھ دو" وہ خاموشی سے اُٹھ کے صغرا کے ساتھ ہو لیا۔

"اللہ ہو۔ اللہ ہو" عورتوں کی آوازوں کے ساتھ اب مردوں کی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ ورد ختم ہوا تو مرنے والی کے لئے دعائے مغفرت ہوئی۔ لڑکی سب باتوں اور سب آوازوں سے بے نیاز اسی جگہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ الفاظ مزید بے ربط اور بے معنی ہوتے جا رہے تھے ۔

"جنازہ تیار ہے" اطلاع ملی اور عورتوں نے ایک بار پھر بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔ جنازہ اُٹھا کر لے گئے تو عورتیں ایک ایک کر کے رخصت ہوئیں۔ کلمۂ شہادت کی آواز آہستہ آہستہ دور ہوتی گئی ـ مکمل سناٹا چھا گیا۔

ملکہ نے لڑکی کی جانب دیکھا۔ اس کے ہونٹ اب بھی ہل رہے تھے۔ کچھ کہہ رہے تھے لیکن آواز نہ تھی، وہ کچھ سمجھ گئی تھی، یا شاید کچھ نہ سمجھی تھی، فیصلہ کرنا دشوار ہو رہا تھا۔

"اصل مسئلہ توازن برقرار رکھنا ہے" موت کا کنواں اور بھائی کی آواز ہم آہنگ ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔

"میری بیٹی آ میرے گلے لگ جا" وہ لڑکی جانب بڑھی ـ اور اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے۔ لڑکی بے اختیار ملکہ کے گلے لگی اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

(ختم شد)

اس کے بچے حاشیے میں چلا جاتا ہے — آپ اپنے فیصلوں اور سوچوں کا سارا بوجھ منتقل کر دیتے ہیں اپنے کرداروں اور ناولوں کے ذہنوں میں — ہم تجارت پیشہ لوگوں کے دماغوں میں جو ہر وقت [illegible] رہتا ہے — آپ اس سے محفوظ ہیں — ہمیں تو نہ جانے کتنی سلیپنگ پلز کھانی پڑتی ہیں ہر رات اس شور کو کم کرنے کے لیے —

عکس تحریر :- آغا ناصر

# پُل صراط

نوشابہ نرگس

پتہ نہیں چیزوں نے معنی و مفہوم تبدیل کرنے کا عمل کب شروع کیا تھا۔ بس اچانک ہی محسوس ہوا تھا کہ لفظوں کے معنی وہ نہیں رہے۔ درمیان سے لفظ غائب ہو جائیں تو خاموشی ایک نیا مفہوم اختیار کر لیتی ہے۔

"یہ بات تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ وہ مفہوم نیا ہے ۔۔؟"

"ہاں میں یقین سے کہہ سکتی ہوں ۔ یہ جھوٹ بولنے کے لئے مجھے بڑی طاقت صرف کرنی پڑی پھر بھی میرا اعلان ان کے کانوں تک نہیں پہنچا۔"

"ضرور پہنچا ہوگا ۔!"

"نہیں یہ بات بھی میں یقین سے کہہ سکتی ہوں اور اس سچ کے لئے مجھے طاقت صرف نہیں کرنی پڑی۔ اگر اس نے یہ بات سنی ہوتی تو میرے جھوٹ کا رنگ اس کے چہرے پر ضرور نظر آ جاتا۔ اس کے چہرے میں یہی تو خوبی ہے کہ ہر جذبہ بالکل الگ ہو جاتا ہے۔"

"تم اسے بخوبی سمجھتی ہو۔ میں تو اس بات سے سخت پریشان ہو جاتا ہوں۔"

"تمہاری پریشانی کی اصل وجہ یہ نہیں ہے بلکہ تمہاری پریشانی یہ ہے کہ ۔۔۔۔ ان رنگوں میں وہ رنگ نہیں ہوتا جو تمہیں شرمندگی سے بچالے۔"

"بکواس ہے تم کیا جانو ۔۔ تم میرے بارے میں کیسے رائے دے سکتی ہو؟"

"سچ کہتے ہو ۔ میں تمہیں واقعی نہیں جانتی۔ مگر اتنا جان لو پھر تمہیں کوئی نہیں جانتا۔"

"دعویٰ کر رہی ہو ۔۔!"

"یہی سمجھ لو ۔۔!"

"بہت نامعقول ہو ۔۔ غلط باتیں اتنے یقین سے کہہ دیتی ہو۔"

اتنی حیرتوں کے بعد تو آدمی کو پاگل ہو جانا چاہیئے۔

سارا جھگڑا اس بات پر تھا کہ وہ شخص اسے ایسی جگہ لے آیا تھا جہاں بھانت بھانت کے لوگوں کا ہجوم تھا مگر وہ خود وہاں نہیں تھا۔ پریشانی تو یہی تھی کہ وہ کبھی وہاں نہیں ہوتا ۔۔ پھر وہ اسے وہاں کیوں لے آیا ۔؟ اسے اس بھیڑ میں چھوڑ کر آخر وہ کہاں چلا جاتا ہے! اسے سخت غصہ آتا ہے اس کی عادت پر ۔۔ کتنی بار اس کا جی چاہا کہ وہ یہاں سے بھاگ جائے۔ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر ۔ بس بھاگتی چلی جائے ۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہ جب بھی قدم بڑھانے کا ارادہ کرتی ہے وہ ایک دم آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیتا ہے۔ اس وقت اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے قریب ہی کھڑا تھا ۔۔ کہیں بھی نہیں گیا تھا۔ وہ شرمندہ ہو جاتی ہے ۔۔ ویسے اسے اس بات پر بھی غصہ آتا ہے کہ اتنے بہت سے لوگوں میں وہ اتنی تنہا کیوں ہو جاتی ہے۔ اس کے سامنے سے ہٹتے ہی جیسے سارا منظر بھائیں بھائیں کرتے سناٹے میں تبدیل ہو جاتا ہے ۔۔۔

ایک دم اکیلے ہو جانے کا احساس بچوں کی طرح خوفزدہ کر دیتا ہے۔ وہ فیصلہ کر لیتی ہے، اب کبھی اس کے ساتھ نہیں آئے گی۔ پھر نہ جانے کیا ہو جاتا ہے۔ یاد ہی نہیں رہتا کہ قوسِ قزح کے یہ سارے رنگ جو اس کی مٹھی میں نظر آ رہے ہیں محض کیمرہ ٹرک ہے۔

"جب میں چھوٹی سی تھی تو سوچا کرتی تھی۔ اگر ہم پاؤں پلنگ سے نیچے نہ اتاریں تو ہمیں چوٹ نہیں لگ سکتی۔"

"پھر کیا ہوا۔۔؟" اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں آگے جھک کر کہا۔

"پھر کچھ بھی نہیں ہوا۔ اب سوچتی ہوں کہ اس یقین کے بعد میرا پلنگ پر ٹھہرنا مشکل ہو گیا تھا۔ پاؤں نیچے اتارتے ہی میں نے برسوں کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔" یہ بات اس نے زور سے نہیں کہی تھی۔

"تو تم دنیا دیکھنے کے لئے پلنگ سے نیچے اتر گئیں۔" اس کی آنکھوں میں ابھی تک مذاق اڑانے والی مسکراہٹ تھی۔

"نہیں۔ دنیا کو اگر پلنگ پر میرے چاروں طرف ڈھیر کر دیا جاتا تو بھی میں نیچے ضرور اترتی۔ میری طبیعت ہی ایسی تھی۔ مجھ سے نچلا بیٹھا ہی نہیں جاتا تھا۔ اماں کا خیال تھا۔ اسی لئے مجھے چوٹیں زیادہ لگتی تھیں۔"

"اچھا پھر تم بڑی ہو گئیں؟"

"ہاں۔ پھر میں نے کبھی اپنے آپ کو چھوٹا نہیں دیکھا۔"

"کیا عمر تھی اس وقت تمہاری؟"

"عمر۔ عمر کا اندازہ مہینوں اور برسوں سے تو نہیں لگایا جا سکتا۔"

"تم نے انگڑائی لی اور میز کے نیچے اپنے آپ کو پھیلا لیا۔"

"بہت تھک گئے ہو۔ ہاں تم کیا کہہ رہی تھیں۔۔؟"

"کچھ نہیں۔۔!" تمہاری مشکل یہ ہے کہ تم RISK کے بغیر زندگی کو محسوس کرنا چاہتے ہو۔ دودھ پی کر بڑے ہونے میں بہت دن لگتے ہیں تم نے دشوار راستہ چنا ہے۔ پگڈنڈیاں ہمیشہ شارٹ کٹ نہیں بنتیں۔

یہ باتیں مجھے اس سے کہہ دینی چاہئیں۔

میں ایک نئے ارادے سے تمہاری طرف بڑھتی ہوں۔ مگر تم اطمینان سے وہ گیت گنگنا رہے ہو جسے تم نے اس دن یونہی ٹیپ کر لیا تھا۔ لوگ شاید اسی لئے تم پر رشک کرتے ہیں۔ مگر میں کہتی ہوں کہ اپنے آپ کو نارمل رکھنے میں بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔

"یہ تم اس کی زبان بننے کی کوشش کیوں کرنے لگی ہو۔ کچھ اپنے بارے میں بھی تو کہا کرو۔"

"اپنے بارے میں۔۔!" اس نے حیران ہو کر دیکھا۔ اپنے بارے میں جس زبان کی ضرورت ہے وہ مجھے کبھی نہیں ملے گی۔"

"کیا آنکھیں بھی زبان کی طرح گنگ ہو جاتی ہیں؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"پتہ نہیں۔۔" تم نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کی کوشش کی، اور ہمیشہ کی طرح ناکام ہو گئے۔ بس یہی تو ایک چیز ہے جس پر قابو پانا تمہیں اب تک نہیں آیا۔

میں پھر وہیں کھڑی ہوں اور وہ غائب ہے حسبِ عادت۔ ارادے کے بغیر میں پھر یہاں کیسے آ گئی۔ شاید مجھے بھی سوتے میں چلنے کا مرض ہو گیا ہے۔

"لوگ کہتے ہیں نیند میں چلنے والوں کا کچھ نہیں بگڑتا۔ بالکل محفوظ رہتے ہیں۔ لیکن اگر ایسے وقت انہیں کوئی ٹوک دے تو۔۔؟"

"بڑی خطرناک بات ہوتی ہے۔ ایسا کبھی نہیں کرنا چاہئے۔ مذاق میں بھی نہیں۔"

"اتنا سنگین مذاق ۔ کون کسی کا راستہ روکتا ہے ۔ اسی لئے تو وہ بہت مطمئن ہے ۔ اسے پریشان ہونے کی ضرورت بھی کیا ہے ۔ وہ کون سا نیند میں چل رہا ہے ۔ اس کی عادت ہی عجیب ہے ۔ آنکھیں کھول کر سوتا ہے در آنکھیں بند کر کے جاگتا ہے ۔"

دیوار نے پھر میرا راستہ روک دیا ۔

"یہ دیوار پہلے سے یہاں تھی یا ۔"

"کوئی جن لا کر رکھ گیا ۔" اس نے قہقہہ لگایا ۔

"دیکھو نا اگر پہلے سے یہ دیوار یہاں ہوتی تو میں اس کی طرف کیوں آتی !"

پھر وہ سوچ میں پڑ گئی ۔ ہر راستہ کا اختتام اس دیوار پر ہوتا ہے ۔ ہمیشہ وہ نئے ارادے سے سفر کا آغاز کرتی ہے اور ہمیشہ اسی دیو کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے ۔ کہیں ایسا تو نہیں ، نئے راستے کے دھوکے میں وہ بار بار اسی راہ پر آ جاتی ہو ۔ ضرور یہی ہوگا ۔ ورنہ علم ہے : بھوت تو یہ سب کرنے سے رہے ۔

"تو تم جنوں اور بھوتوں کی قائل بھی ہو ۔" اس نے پھر قہقہہ لگایا وہ یونہی اس کا مذاق اڑاتا ہے ۔ اب اسے بھی غصہ آ گیا ۔ ٹھیک ہے وہ سے آئندہ کوئی بات نہیں کہے گی ۔ اس کے سامنے بیٹھ کر سوچے گی بھی نہیں کہ وہ اس کی سوچ بھی اتنی آسانی سے پڑھ لیتا ہے ۔ جبھی تو نے اب تک اس سے کچھ نہیں کہا ۔ مگر ہو سکتا ہے وہ جان گیا ہو کہ وہ یہ کہنے آئی ہے کہ اس دیوار نے اس کے خوابوں کا راستہ روک لیا ہے ۔ یہی بات ہے اسی لئے وہ مسلسل اتنی دیر سے اس کا مذاق اڑا رہا ہے ۔

"سنو تم نے اس دیوار کے بارے میں پڑھا ہے جسے یاجوج ماجوج چاٹتے رہتے ہیں ۔ اگلی صبح جب وہ اس دیوار کو توڑ کر دوسری طرف نکل جانے کا یقین لے کر بیدار ہوتے ہیں تو دیوار پہلے ہی کی طرح ہموار نظر آتی ہے تو شاید تم اس دیوار کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گی ۔ کہ تم تو یاجوج ماجوج کی سی استقامت بھی نہیں رکھتیں ۔ سنا تم نے ۔ تم تو قدم بڑھائے بغیر پورے ایک جنم کا فاصلہ طے کر لینا چاہتی ہو ۔

"فاصلے ذہنوں کی قربتوں سے مٹتے ہیں ۔" ایک عجیب سے لمحے میں تم نے کہا تھا اور میں نے یقین کر لیا تھا ۔

غلط باتوں پر یقین کر لینے کی بری عادت ہمیشہ میری نیندیں ضرور خراب کرتی ہے ۔

"اور تمہیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ باتیں صحیح نہیں ہیں ؟"

اس نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا ۔ وہ کہنا چاہتی تھی میرا المیہ ہی تو ہے کہ مجھے ہر بات کا پتہ چل جاتا ہے ۔ میں جانتی ہوں کہ یہ جو مجھے نظر آتا ہے صحیح نہیں ہے ۔ اور وہ جو کچھ مجھے نظر آتا ہے صحیح نہیں ہے ۔ اور وہ جو اس لمحہ میں نے دیکھا تھا ۔ خواب تھا ۔ ہمیشہ کیطرح صرف خواب ۔

میں نے اپنے کمرے میں قدم رکھا تو ایک عجیب سی ٹھنڈک نے مجھے جکڑ لیا ۔ قبر میں بھی ایسی ہی بے جان سی ٹھنڈک ہوگی ۔ میں نے گھبرا کر باہر چھلانگ لگائی ۔ مگر چوکھٹ نے پاؤں پکڑ لئے ۔ باہر گہرا اندھیرا تھا ۔ اور راستہ گم تھا ۔

چاہے کچھ ہو میں اس دیوار کے دوسری طرف ضرور دیکھوں گی ۔ میری طبیعت ہی ایسی ہے ۔ مجھ سے اب بھی نچلا نہیں بیٹھا جاتا ۔ اور اسی لئے شاید مجھے اب بھی چوٹیں لگتی ہیں ۔

بوسیدہ دیوار میں اینٹیں جگہ جگہ سے کھڑی ہوئی ہیں ۔ اس پر چڑھنا کوئی ایسا مشکل کام بھی نہیں ۔ اکھڑی ہوئی اینٹوں کے سوراخوں میں پاؤں رکھ کر دیوار پر چڑھنا شروع کر دیتی ہوں ، بعض اینٹیں اپنی جگہ سے کھسک رہی ہیں ۔ بعض ایک دوسرے کے سہارے سے اٹکی ہوئی

ہیں۔۔۔۔ ذرا سی غلطی جان لیوا بن سکتی ہے۔ بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔۔ خوف سے میری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔۔ خستہ دیوار۔۔ جا بجا اُکھڑا ہوا پلستر اور نکلتی ہوئی اینٹیں جانے کہاں غائب ہو گئیں۔ پُل یاد رہ گیا۔

"پُل۔۔" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"ہاں۔۔ بچپن میں ایک ہی تو پسندیدہ کھیل تھا۔ چھوٹے چھوٹے دریا کھود کر پُل بنانا۔ پُل بنانے کے شوق میں ہم باغ کی کچی زمین پر ندیاں کھودا کرتے تھے۔"

سوچتی ہوں ہم ساری زندگی پُل صراط پر رہتے ہیں۔۔ زور زور سے تالیاں بجتی ہیں۔

"BRAVO"۔۔ کوئی میرے قریب سے چیختا ہے۔ میں گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی ہوں۔

دیوار ختم ہو گئی۔ اب میں دوسری طرف دیکھ سکوں گی۔ "ہوشیاری سے۔۔ سنبھل کر" بہت سی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔۔ دوسری طرف دیکھنے کے بجائے میری آنکھیں میرے قدم پکڑ لیتی ہیں۔ خوف سے میری گھگھی بندھ جاتی ہے۔۔۔ تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے باریک صراط پر پاؤں جما کر کوئی کتنی دیر گزارہ سکتا ہے۔؟

میں دوسری طرف کبھی نہیں دیکھ سکوں گی۔

مارچ ۷۹ء

عمل کو [illegible] زندگی کو [illegible] خدا کو بھی [illegible] اہمیت [illegible]
کسی [illegible] مطلق خدا پر [illegible] اعتقاد [illegible] زندگی کا [illegible]
کو [illegible] کے خلاف [illegible] اپنے [illegible] راستہ پر [illegible] کے برخلاف
[illegible] خدا کے حکم کے مطابق [illegible] زندگی کو بھی تابع کرنا چاہتا ہے [illegible]
[illegible] کرتا ہوں ۔۔۔۔ [illegible] ایک [illegible] ہیں اور [illegible]
کے خلاف [illegible] ۔۔۔۔ [illegible] خدا [illegible] کر سکتا ؟

عکس تحریر: شہزاد منظر

# تیز دھوپ میں کھلا گلاب

راشد جاوید احمد

کتا زور زور سے بھونک رہا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ارسطو کے نظریۂ حکومت کا بغور مطالعہ کر سکوں لیکن شور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ میں نے مشو سے کہا کہ جا کر پتہ کرے کہ معاملہ کیا ہے۔ واپس آ کر اُس نے مجھے بتایا کہ سڑک پر ایک عورت بکریاں چرا رہی ہے اور بکریاں ہمارے گھر کے باہر والے لان میں گھس آئی ہیں۔ مجھے باغبانی سے از حد دلچسپی ہے اور عجیب ہے ہم دوسرے شہر میں اپنا بڑا گھر چھوڑ کر آئے ہیں۔ میں اسی چھوٹے سے لان میں اپنی دلچسپی کا سامان پیدا کر لیتا ہوں۔ نئی کالونیوں اور جدید بستیوں میں دس دس مرلے کے گھروں میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ میرے جیسا شخص اپنا شوق بطریقِ احسن پورا کر سکے۔ میرے دوستوں نے باغبانی سے میری دلچسپی دیکھ کر میرا نام نباتاتی مریض رکھ چھوڑا ہے۔

اگرچہ مشو نے بکریوں کے لان میں گھس آنے کا جو نقشہ پیش کیا تھا۔ وہ میرے غصے کو آخری درجے پر پہنچانے کے لئے کافی تھا۔ تاہم ارسطو کا پیش کردہ نظریۂ حکومت بھی غیر دلچسپ نہیں تھا۔ میں نے کتاب میں بک مارک رکھا اور کمرے سے باہر نکل کر ٹیرس پر آ گیا۔ بکریاں اگرچہ اب لان میں نہیں تھیں تاہم وہ قریب ہی تھیں اور یقیناً ایک مرتبہ پھر ہلّہ بول سکتی تھیں اور جو میں نے غور سے دیکھا تو میرے پورچولاکا کے چار پودے تو بالکل ہی غائب تھے۔ میں جنگلے پر کھڑے کھڑے اس عورت پر برس پڑا۔ وہ اپنے اوڑھیے میں نہ جانے کیا بڑبڑا رہی تھی جو کتّے کے بھونکنے کی مسلسل آواز کی وجہ سے سنائی نہیں دے رہا تھا۔ آخر مجھے نیچے ہی آنا پڑا۔ عورت پھٹے پرانے سرخ اور نیلے رنگ کے پیوند لگے کپڑوں میں ملبوس۔ دوپٹے اور جوتے سے بے نیاز سڑک پر سنبھلا مار کے بیٹھی تھی۔ دھوپ کی حدت سے اُس کا رنگ سیاہی مائل سرخ تھا۔ اُس کے گلے میں گِلٹ کا بنا ہوا بھدا سا نیکلس، کانوں میں پیلے رنگ کے جھمکے اور ناک میں اسی رنگ کی بلاق تھی۔ اُس کی کلائیوں کی ہڈیاں مضبوط تھیں اور اس امر کی گواہ بھی کہ وہ زیرِ تعمیر عمارتوں میں اینٹیں ڈھوتی اور بیلچہ چلاتی ہے۔

مجھے اپنے قیمتی پودوں کے ضائع ہونے کا اتنا رنج تھا کہ میں اپنے آپ پر قابو نہ پا سکا۔

"کچھ معلوم ہے تمہیں ــــ تم نے کتنا نقصان کر دیا ہے میرا ــــ ؟"

"کیا ہوا ہے ــــ ذرا بکریوں نے منہ مار لیا ہے ــــ"

"یہ ذرا ہے ــــ پورے چار پودے غائب کر دیئے ہیں اور تم کتنی ڈھٹائی سے ذرا کہہ رہی ہو ــــ"

"اللہ اور دے گا ــــ آخر بے زبان بکریوں نے بھی تو کچھ کھانا ہے ــــ"

اُس کی یہ منطق سُن کر تو میں اور آگ بگولا ہو گیا۔

"بکریوں نے کھانا ہے تو میں نے کیا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ اُن کا دودھ تم بیچتی ہو ــــ مجھے کوئی حصّہ تو نہیں دیتی ہو ــــ"

"ایمان سے ــــ یہ میری نہیں ہیں ــــ مجھے تو ان کو چرانے پر پانچ روپے روز ملتے ہیں ــــ"

مجھے نہیں معلوم پانچ ملتے ہیں یا دس ــــ تم نے کم از کم میرا ستر روپے کا نقصان کر دیا ہے اور اوپر سے باتیں الگ بنا رہی ہو ــــ جو میں اپنا کتا کھلا چھوڑ دیتا تو بکریوں سمیت تمہیں بھی پھاڑ کھاتا ــــ"

"ہاں ہاں ــــ چھوڑ دو ہم پر کتّے اب یہی تو کسر رہ گئی ہے ــــ تم بھرے ہوئے پیٹ والے ہو ــــ پیسے والے ہو ــــ تمام خالی جگہیں تم لوگوں نے خرید کر پلاٹ بنائے ہیں ــــ ہم پر اب کتّے بھی چھوڑو گے ــــ ذرا روٹی کا آسرا ہے وہ بھی چھین لو گے ــــ"

بک بک کرتی وہ اٹھی اور بکریوں کو پتلی سی چھڑی سے ہانکتی ہوئی ہماری گلی سے باہر نکل گئی۔ میں اس وقت سخت غصے میں تھا۔ دراصل میں نے بڑی محنت سے پہلے پنیری تیار کی تھی۔ پھر کافی انتظار کے بعد انہیں الگ الگ کیاریوں میں لگایا تھا اور اب اُن پر پھول آئے ابھی دو دن ہی ہوئے تھے کہ بکریوں نے دن کے وقت شب خون مارا تھا۔ میں نے لان کا جائزہ لیا تو وہاں نہ صرف چار پودے ہی غائب تھے بلکہ بکریوں کی یلغار سے گارڈینیا کی باڑھ بھی ایک جگہ سے ٹوٹ چکی تھی۔ البتہ گل نافرمان کا کمزور سا پودا ان حملہ آوروں سے بچ گیا تھا۔ میں نے فوراً قریب پڑی اینٹیں اٹھائیں اور پودے کے گرد چن دیں۔

سہ پہر کی چائے تیار تھی اور میری بیوی مجھے چائے کے لئے بلا رہی تھی۔ میں نے ہاتھ دھوئے اور اوپر آ کر چائے پینے لگا۔ ہم میاں بیوی اس سلسلے میں خوش قسمت ہیں کہ ایک دوسرے کے موڈ کو فوراً پہچان لیتے ہیں۔ اس نیک خاتون نے میرا غصہ کم کرنے کے لئے ادھر اُدھر کی باتیں چھیڑ دیں اور میں بھی ارسطو کے نظریہ حکومت کی ورق گردانی کرنے لگا ___ میری نظریں تو کتاب پر تھیں۔ لیکن ذہن ابھی تک ضائع ہونے والے پودوں میں اٹکا ہوا تھا۔ مجھے وہ عورت، اس کا لباس اس کی مضبوط کلائیاں، اس کا مادرزاد ننگا بچہ اور اس کے طنز بھرے تلخ اور کرخت سے بھرپور الفاظ رہ رہ کر یاد آ رہے ___ بھرے ہوئے پیٹ والے ___ پیسے والے ___ بے وقوف عورت اتنا بھی نہیں جانتی کہ یہ میرا اپنا گھر نہیں بلکہ کرائے کا ہے اور میاں بیوی محنت و مشقت کی زندگی گزار رہے ہیں ___ مجھے اُس کی بے وقوفی اور سادگی پر ترس آنے لگا ___ پھر مجھے دیگر مزدور پیشہ عورتوں کے ساتھ ساتھ ملازمت پیشہ خواتین کا خیال آیا ___ مجھے اپنے دفتر میں کام کرنے والی خواتین کا خیال آیا کہ میں اُن کا کتنا احترام کرتا ہوں۔ بات بے بات شکریہ ادا کرنا ___ خوش مزاجی سے پیش آنا ___ اُن کے نقطۂ نظر کا ممکن حد تک احترام کرنا ___ آخر میں یہ سب کیوں کرتا ہوں ___ کیا میں دفتر میں ایک خول چڑھائے رکھتا ہوں ___ نہیں ___ ہرگز نہیں ___ میں اس بات پر پوری طرح یقین رکھتا ہوں کہ اس میل ڈومی نینٹڈ معاشرے میں عورت، مرد کی نسبت کہیں زیادہ جبر کا شکار ہے۔ میں نے ہمیشہ عورت کو اپنے جیسا انسان ہی جانا ہے اور اُسے کبھی جنس یا کمتر جنس کے حوالے سے نہیں دیکھا۔ میں اپنی بیوی کی ہر رائے کا احترام کرتا ہوں۔ ایک رفیق کی مانند اُس کی مدد کرتا ہوں۔ حتیٰ کہ جب وہ تھکی ہاری دفتر سے گھر آتی ہے اور میں اُس کے آنے سے پہلے پہنچ جاؤں تو بسا اوقات برتن وغیرہ بھی دھو دیتا ہوں لیکن اُس بکریاں چرانے والی عورت کی ذرا سی لاپرواہی پر میں کیوں، تنا سخیا ہو گیا۔ کیا یہ جبلی پن ہے ___ سوچوں تو کیا میں اکیلا اتنے بڑے دیوڑ کو قابو میں رکھ سکتا ہوں۔ کیا میں اُس عورت کی جگہ اپنی ماں، بہن، بیوی، بیٹی یا کسی دوست کو تصور کر سکتا ہوں میرے ذہن کی رو اسی طرف رواں ہے اور ارسطو کا نظریۂ حکومت وہیں رہ گیا ہے۔ میں نے کتاب بند کر دی ہے اور سگریٹ سلگا لیا ہے۔ اُس عورت کے ساتھ کیا گیا مکالمہ بار بار میرے ذہن میں آ رہا ہے۔ میرا ضمیر ملامت کر رہا ہے ___ میرا خیال ہے کہ مجھ سے زیادتی ہو گئی ہے ___ میرا خیال ہے کہ مجھے اُس سے معافی مانگنی چاہیے ___ کل یا پھر اگلے چھٹی کے دن جب وہ نظر آئے گی تو میں اُس سے معافی مانگ لوں گا

سہ پہر کا وقت ہے۔ چھٹی کا دن ہے۔ کتا زور زور سے بھونک رہا ہے۔ میں نیچے آتا ہوں۔ گیٹ کھول کر باہر نکلتا ہوں ___ وہی عورت ہے ___ میں اپنے آپ میں ہمت نہیں پاتا ___ بس میں لان کے اس کونے پر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ جہاں سے میرا خیال ہے کہ بکریاں آ سکتی ہیں ___ میں انہیں روک لوں گا۔ "فکر نہ کرو بابو ___ میرا دھیان ہے اس طرف" ___ عورت اپنے اوڈ لہجے میں کہتی ہے اور گوڑے کرکٹ سے بھری زمین پر پتھلا مار کر بیٹھ جاتی ہے۔ اس کی وہی ننگا بچہ دودھ پیتا ہے اپنے مہندی لگے ہاتھوں سے اُس کے سر سے جوئیں نکال رہی ہے۔ میں حیران و ششدر وہیں کھڑا رہ جاتا ہوں۔

جولائی ۸۶ء

شہروں نے انسانی تاریخ میں سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ دنیا کی تاریخ دراصل شہروں کی تاریخ ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کی تاریخ ہے جو شہروں میں رہتے تھے۔ ریاست، سیاست، مذہب، آرٹ، ادب، سائنس ان سب کا تعلق شہروں سے ہے۔ بڑے بڑے مفکروں و دانشوروں کا تعلق بھی شہروں سے رہا۔ چاہے وہ دیہات میں پیدا ہوئے ہوں مگر ان کا ذہنی نشوونما شہروں میں ہوئی۔ لہٰذا یہ شہروں کے نمائندے رہے۔

عکس تحریر:۔ ڈاکٹر مبارک علی

# اصحابِ ضعف

ظفر نیازی

اور پھر ایک دن وہ آگیا جب بستی میں کوئی کسی سے خوف نہیں کھاتا تھا کیونکہ بستی کے سبھی لوگ اُس ایک سے بڑے کا خوف کھاتے تھے جو ان میں سے نہیں تھا۔

لوگ اب مل بیٹھتے تھے اور اِدھر اُدھر کی ہانکنے کے بعد اس مسئلے پر بھی سوچنے لگتے تھے کہ یہ خوف کیسا ہے جو سب کے حصے میں برابر آیا ہے۔ نوجوان سوچتے اس کا تدارک کیا جائے اور بوڑھے جو کہ وقت کے بہاؤ کے ساتھ بہتے بہتے وقت کی سی عادت اپنا چکے تھے اس صورتِ حال پر خاموش رہتے وہ یہ سوچ کر خاموش تھے کہ وقت کا بہاؤ انہیں پھر کسی ایسے موڑ پر لے ہی آئے گا جہاں خوف کی حدیں ختم ہو رہی ہوں گی اور ان حدوں سے پرے وہ ڈرانے والا خود ہی ٹکرا کر مر جائے گا۔

اس پہلی رات کو چھوٹے بڑے سب جمع تھے۔ اِدھر اُدھر کی ہانکنے کے لئے کوئی موضوع نہ تھا وہ سب خاموش بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھ کر اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ کسی شادی کے موقع پر جمع ہوتے ہیں کہ کوئی مر گیا ہے" اور آخر کار ایک نوجوان بول اٹھا۔ "یہ بستی سحر زدہ ہے آؤ یہاں سے بھاگ چلیں۔ وہ جس کے ہاتھوں ہم تنگ ہیں۔ جب یہاں آئے گا بستی کی گلیاں سنسان اور کھلیانوں کو ویران پا کر غم و غصّہ سے مر جائے گا۔ ہمارے پاس اس سے بڑھ کر اس کا کوئی علاج نہیں۔

یہ سن کر چند نوجوانوں نے تائید میں سر ہلائے۔ بڑے بوڑھے بالکل خاموش بیٹھے رہے۔

ایک اور نوجوان، نوجوانوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔۔ یہ بوڑھے ہمارے بزرگ بھی ہیں اور ہمارا ماضی بھی۔ ماضی حال سے زیادہ دانا ہوتا ہے۔۔ لیکن ماضی کی طرح یہ خاموش رہتے ہیں۔۔ اس پر ہمیں غصّہ کیوں نہیں آتا۔

بوڑھے یہ سن کر بھی خاموش رہے۔

ایک اور نوجوان بولا ۔۔ ہمیں غصّہ اس لئے نہیں آنا چاہئے کہ یہ بزرگ ہم سے سمجھدار ہیں۔ ان کی خاموشی میں بھی معنے ہوتے۔۔ یہ جو بات بھی سوچتے ہیں، وہ ہماری بہتری میں ہوتی ہے۔۔ انہوں نے اب تک جو بھی وقت گذارا ہے، وہ ہمارے لئے گذارہ ہے۔

اپنی تعریف سُن کر ان بوڑھوں میں سے ایک پھوٹ پڑا اور کہنے لگا۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔۔ ہم اپنا وقت گزار چکے اور جو تھوڑا بہت وقت گزرنا ہے وہ بھی تمہارے ساتھ گذرنا ہے ۔۔ لیکن تم یہ بستی چھوڑ کر جانا چاہو تو ہم تمہارے ساتھ نہیں جائیں گے۔ ہم رستوں میں تمہارے پاؤں کی زنجیر بنے رہیں گے ۔۔۔ اور پاؤں میں نہ ٹوٹنے والی زنجیر ہو تو بھاگنے کی بجائے ایک جگہ ٹِک جانا زیادہ مناسب ہے۔

ایک اور بوڑھا بولا۔۔۔ ہاں ہاں نوجوانو ۔۔ میرا یہ بھائی سچ ہی تو کہتا ہے ۔۔ اب تو ہم تمہارے کندھوں کا بوجھ ہیں۔ ہم تمہیں راہ دکھاتے ہیں۔ ہم بے شک اُلٹے سیدھے تجربوں کو بنیاد بنا کر تمہیں نیکی بدی بھلائی بُرائی کی راہ دکھانے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اس

کے بدلے میں ہم تمہارے کندھوں پر سواری کرتے ہیں۔

یہ سن کر ایک نوجوان بولا۔ ہمارے کندھے اتنے مضبوط اور کشادہ ہیں ـــ اور تمہارا بوجھ پھول سے بھی کم ہے ـــ تم ہماری آنکھوں پر پلکوں کی مانند ہو ـــ لیکن وہ لٹکتی تلوار جو ہمیں نظر نہیں آتی ـــ اور جو کہیں ہوا میں معلق ہے ـــ اور ہم جس کے خوف سے لاچار ہیں جبھی ـــ کچھ تدبیر اس کی سوچو ـــ یہ سن کر ایک بوڑھا بولا۔ ایسی کوئی تدبیر ہمارے ذہن میں ہوتی تو ہم بوڑھے نہ ہوتے ـــ اور اب ہم اس کے بارے میں مزید سوچنا بھی نہیں چاہتے کہ وقت کے محدود سے کھیل میں ہم نے دیکھ لیا ہے ـــ ایک خوف جاتا ہے تو دوسرا آجاتا ہے بالکل ویسا ہی، بلکہ اس سے کچھ بڑھ کر ـــ ہم اب وقت کے لامحدود ہونے کے انتظار میں ہیں ـــ وہ پہلا نوجوان بولا ـــ وقت کا اتنا انتظار کون کرے ـــ اس محدود وقت میں ہی ہم نے جینا ہے۔ ہم نے مرنا ہے ـــ آؤ کیوں نہ یہ بستی چھوڑ چلیں ـــ کہ محدود وقت میں وہ خوف تو مرنے سے رہا [illegible] ی بوڑھا بولا ـــ یہ بستی ہماری ہے ـــ اور ہم یہ بستی نہیں چھوڑ سکتے ـــ کہ بستی میں رہنا ہماری مجبوری ہے ـــ ایک نوجوان بولا ـــ یہ مجبوری کیوں ہے ـــ؟

وہی بوڑھا بولا ـــ مجبوری یہ ہے کہ اب ہم نے مرنا ہے۔ اور انڈا دیتے وقت مرغی جس طرح ڈابک کی طرف دوڑتی ہے، انسان مرنے کے دن قریب پاکر اپنی بستی کی طرف دوڑتا ہے۔ اور ہم چاہتے ہیں ـــ ہماری قبریں اسی مٹی سے ہی تعمیر ہوں جس سے ہماری زندگی پیدا ہوئی تھی ـــ یہ مٹی ہماری ہے ـــ اس مٹی سے ہمیں ہماری نوجوانی اور ہمارے بچپن کی بُو بھی آتی ہے ـــ کسی دوسری جگہ ہم دفن کر دیئے گئے تو نامانوس مٹی پاکر ہماری ہڈیاں بھی نہیں گلیں گی اور گدھ ہماری لاشیں نوچتے پھریں گے ـــ

ایک نوجوان جس کی آنکھوں کی کچھ زیادہ ہی تھی، کہنے لگا ـــ تمہیں اپنے مرنے کا خیال ہے اور ہم جینے کی تلاش میں ہیں ـــ ہم کہیں بھی جاکر نئی بستیاں بسائیں گے ـــ اور مٹی تو کہیں کی بھی ہو ـــ پاؤں کے چند بوسے پاکر جسموں کی ساری خوشبو جذب کر لیتی ہے اور نامانوس نہیں رہتی ایک بوڑھا جو بڑی دیر سے خاموش بیٹھا تھا یہ سن کر بولا ـــ لیکن اے نوجوان ـــ ذرا یہ بھی تو بتا ـــ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جب کہیں جاکر کوئی نئی بستی بسے گی۔ ساتھ میں خوف کی معلق تلوار وہاں نہیں آپہنچے گی۔

یہ سن کر نوجوان خاموش ہو گئے اور بوڑھے اور بھی گہری سوچوں میں گھر گئے

اور پھر تند و تیز سورج نکل آیا ـــ سب کو سب کی شکلیں عجیب و غریب سی نظر آنے لگیں اور وہ اُٹھ کر ادھر ادھر جاگے ـــ اور اپنے اپنے کام کاج میں جُت گئے۔

اور پھر جب رات ہوئی ـــ سب سائے ایک سے ہو گئے تو چھوٹوں بڑوں کا "کٹھ" ہوا ـــ صبح تک وہ پھر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے اور وہ تیز دھوپ پاکر پھر اِدھر اُدھر جاگ کر اپنے اپنے کام کاج میں جُت گئے ـــ کتنی ایسی راتیں آتی رہیں ـــ اور کتنے ایسے دن گزرتے رہے بوڑھے مرتے رہے ـــ نوجوان بوڑھوں کی جگہ لیتے رہے اور بچے نوجوانوں کی ـــ یہ سلسلہ جاری رہا۔

اور پھر ایک رات نئے نوجوانوں نے نئے بوڑھوں سے تنگ آکر کہہ ہی دیا ـــ ہمیں اس کا کوئی حل بتاؤ ـــ اور بوڑھے خاموش رہے۔

بستی میں کسی کو کسی سے خوف تو پہلے بھی نہیں تھا اور اب تو نوجوانوں نے بوڑھوں کا احترام کرنا بھی چھوڑ دیا۔ اور پھر ایک رات جب سارے لوگ اکٹھے بیٹھے تھے۔ ایک نوجوان تند و تیز لہجے میں پکارا ـــ اے بزرگو کیا تم نے ایسی بستیوں کے خواب کبھی نہیں دیکھے تھے جہاں گردنوں پر، خوف کی معلق تلوار نہ ہو۔

بوڑھے یک زبان بولے ہم نے خواب دیکھے تھے ـــ نوجوان بولے ـــ تو پھر تم لوگوں نے خوابوں کے لئے کیا کیا تھا۔ بوڑھوں نے کہا ـــ ہم نے وہ خواب اپنے بزرگوں کو سنائے تھے ـــ بزرگ یہ سن کر ہمیں سمجھاتے تھے اور ہم ان کی بات مان لیا کرتے تھے۔

نوجوان بولا ـــــ اور اگر ہم تمہاری بات نہ مانیں تو کیا تم ہم سے ناراض نہ ہو گے۔

بوڑھے بولے ـــــ ناراض ہونے کی سکت ہم میں نہیں، البتہ ہمیں دکھ ضرور ہو گا۔

نوجوان بولے ـــــ اور ہماری یہ حالت دیکھ کر تمہیں دکھ تو اب بھی ہوتا ہے کہ ہماری حالت تو تم جانتے ہی ہو اور ہمارا انجام بھی تمہیں کچھ مختلف نظر نہیں آتا ہے۔

بوڑھے بولے ـــــ ہاں دکھ تو اب بھی ہوتا ہے لیکن ہم ایک طرح کے دکھ کے عادی ہو گئے ہیں۔ نئے دکھ جھیلنے کے لئے ہمیں نئی عادت ڈالنا پڑے گی جس کا تصور اذیت ناک ہے ـــــ اور مشکل بھی

نوجوان بولا ـــــ لیکن تمہیں اس بات کی ضد کیوں ہے کہ جب تم مرو، تمہاری ہڈیاں اسی مٹی میں گھلیں۔

بوڑھے بولے ـــــ ہمارے بزرگ بھی یہی چاہتے تھے اور وہ بہت دانا تھے۔ ہم ان کی اس روایت انحراف نہیں کر سکتے۔

نوجوان بولا ـــــ لیکن اے بزرگو، ہمیں اس انحراف کی اجازت دو ـــــ کچھ نئے طرز کا دکھ بھی جھیلو۔ شاید اس میں مزا بھی ہو۔

ایک بوڑھا متوحش انداز میں چیخا ـــــ تو کیا، تم یہ بستی چھوڑ جاؤ گے۔

نوجوان بولا ـــــ ہاں ـــــ اور تمہیں بھی ساتھ لے جائیں گے ـــــ تم نہ آئے تو تمہیں چھوڑ کر بھی چلے جائیں گے ـــــ یہ ہمارا فیصلہ ہے۔

نوجوان یک زبان ہو کر بولے ـــــ ہاں ہاں۔ یہ ہمارا فیصلہ ہے۔

ایک بوڑھا بولا ـــــ لیکن جانا کہاں ہے؟

تند لہجے والا نوجوان بولا ـــــ ہم بے سمت سفر کریں گے۔

ایک بوڑھا اٹھ کھڑا ہوا اور دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر کہنے لگا ـــــ ٹھیک ہے ٹھیک ہے ـــــ لیکن منزل کا تعین پہلے سے ہونا چاہیئے۔

نوجوان بولا ـــــ ہم جہاں بھی جائیں ـــــ ہماری منزل بستی ہو گی ـــــ یہی بستی ـــــ جو ہماری بھی ہے اور ہماری نہیں۔

بوڑھے نے سوال کیا ـــــ تم اس بستی کی تلاش میں کن راستوں سے ہو کر جاؤ گے۔

نوجوان بولے ـــــ متعین منزل اور بے سمت کارواں کا راستہ ایک ہی ہوتا ہے۔

بوڑھا بولا ـــــ نہیں ـــــ نوجوانو سنو۔ ہر بستی کو دو راستے جاتے ہیں۔ ایک راستہ وہ جو کہ بلندیوں سے ہوتا ہوا پستی کی طرف آتا ہے اور دوسرا پستیوں سے بلندی کی جانب ہے۔

ایک نوجوان بولا ـــــ ہم اتھاہ پستیوں میں ہیں۔ اس لئے ہم بلندیوں کی جانب سے ہو کر اس بستی کی جانب آئیں گے۔

یہ بات سن کر ایک فلسفی بوڑھا پکارا ـــــ وہ جو پستی سے بلندی کی طرف سفر کرتے ہیں ان کا کوئی ماضی نہیں ہے ـــــ ان کا ماضی سیاہیوں میں دفن ہے ـــــ لیکن مستقبل انہی کا ہے ـــــ اور وہ جو بلندی سے پستی کی طرف آتا ہے اس کا ماضی بلند ضرور ہو گا لیکن اس کا مستقبل اندھے غاروں کے سوا کچھ بھی نہیں۔

یہ سن کر ایک غلغلہ سا مچ گیا ـــــ کوچ کے ارادے ہونے لگے ـــــ بوڑھے دعائیں دینے لگے۔

اور جب پہلا کارواں چلنے کو تھا ـــــ تو ایک لڑکا جس کی مسیں بھیگ چلی تھیں اور جو سفر کے شوق میں دعا مانگنے سے پہلے ہی نکل کھڑا ہوا تھا ہانپتا کانپتا آیا ـــــ اور کہنے لگا ـــــ ہم نے جو راستہ منتخب کیا ہے وہ اس بستی کو واپس نہیں آتا۔

یہ سن کر بوڑھے شل ہو کر رہ گئے۔

نوجوانوں کے اٹھتے قدم رکنے لگے۔

اور وہ لڑکا گمٹ دوڑتا بستی سے نکل گیا۔

اگست [illegible]

# پُتلیاں

سلیم آغا قزلباش

اُس کی موت لوگوں کے لئے ایک معمّہ بن گئی تھی۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ بظاہر وہ بالکل بھلا چنگا تھا' ہر چند کہ اُس عمر میں پہنچ کر اُسے اب آرام کرنا چاہیے تھا' اگرچہ سٹھ سال کی عمر میں آدمی اتنا زیادہ بوڑھا بھی نہیں ہوتا کہ ہر معاملے میں دوسروں کا دستِ نگر ہو جائے۔ وہ صبح باقاعدگی سے میل دو میل ہوا خوری کرتا' وقت پر سوتا وہ وقت پر جاگتا' ابھی اس کے لئے پرہیزی کھانا بھی تیار ہونا شروع نہیں ہوا تھا' اور یہ بڑی خوش آیند بات تھی کیونکہ جب کسی کے لئے پرہیزی کھانا تیار ہونے لگ جائے تو اس کا رشتہ یک بیک زندگی کی عام رفتار سے کٹ جاتا ہے۔ چولہے پر چڑھی کھنے کی تنگ دیگچی دیگر اہلِ خانہ سے انقطاع کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ زندگی آہستہ آہستہ ایسے شخص کی اشیاء کو نجس سمجھ کر پیچھے ہٹنے لگتی ہے' جیسے وہ کسی چھوت کے مرض میں مبتلا ہو۔ خود اُس کے ساتھ ایسا کوئی المیہ تو نہیں ہوا تھا۔ البتہ ایک اندرونی دکھ اُسے دیمک کی طرح اندر سے چاٹ رہا تھا' جس کے آثار اس کے بدن پر ابھر آنے والی رگوں اور شکنوں کی صورت میں دیکھے جا سکتے تھے۔ یہ دکھ اس کی جائیداد کا پیدا کردہ تھا۔ جس رفتار سے اُس کا اندر گل سڑ رہا تھا' اُسی رفتار سے اُس کی جائیداد کے وارث مکھیوں کی طرح اس کے گرد بھنبھنانے لگے تھے۔ اور یہ بھنبھناہٹ روز بروز بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ وہ پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا یعنی وہ مر گیا۔ مگر یہ کسی بھوکے ننگے شخص کی موت نہیں تھی جسے اتنی آسانی سے نظر انداز کر دیا جاتا۔ سوسائٹی میں اس کا ایک مقام تھا۔ زیادہ اونچا نہ سہی مگر تھا ضرور۔ اُس کی موت کا علم بھی بڑے ڈرامائی انداز میں ہوا۔ اس کا بیٹا' بیٹی' بہو داماد' بیوی ناشتہ کرنے میں مصروف تھے کہ گھر کا ملازم دوڑا دوڑا آیا اور ہانپتے کانپتے ہوئے انہیں اطلاع دی کہ شیخ صاحب اپنے بستر پر پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے ہیں۔ یہ سنتے ہی ان سب کے چہرے کچھ دیر کے لئے ہر قسم کے تاثر سے تہی ہو گئے مگر وہ جلد ہی سنبھل گئے اور پھر ان میں سے ہر ایک نے حسبِ توفیق حزنیہ تاثرات اپنے اپنے چہرے پر مل لئے۔ کسی نے بھی ڈاکٹر کو بلانے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اُسی لمحے ایک نامعلوم سے خوف نے اندر ہی اندر اُن سب کو ٹھونگے مارنے شروع کر دیئے تھے۔ وہ خوف آنے والے مسائل کے بارے میں سوچنے سے پیدا ہوا تھا یا اُن کے اندر کی کسی خلش کی بنا پر جاگ اٹھا تھا۔ اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بہر حال' انہوں نے ناشتہ کی میز پر ہی اگلا قدم اٹھانے کا پروگرام مرتب کر ڈالا۔ دوپہر تک مرحوم کے دوست احباب اور دور نزدیک کے رشتہ دار اکٹھے ہو گئے' لیکن مرحوم کی ماں ابھی تک نہیں پہنچی تھی ـــــ ماں کہ جس کی موجودگی کے بغیر بیٹے کو سپردِ خاک کرنا مشکل ہوتا ہے۔ دوسری طرف مرنے والے کی آنکھیں کسی کتاب کی طرح کھلی ہوئی تھیں اور لگتا تھا' جیسے اصل حقیقت کو پلک جھپکنے میں آشکار کر دیں گی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ کسی دور یا نزدیک کے رشتہ دار کو ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اُس کی کھلی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے بند کرتا۔ یوں بھی زندگی بھر تو وہ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا تو کجا' اُس سے دو کمرے ہو کر بھی کچھ کہتے ہوئے ڈرتے تھے' اب بھلا وہ اُس کے جسم کو کیسے چھو سکتے تھے! البتہ اُس کی پُراسرار موت پر چہ میگوئیاں مسلسل ہو رہی تھیں۔ ایک ضعیف العمر رشتہ دار خاتون نے یہ بات کہہ کر وہاں پر موجود سبھی لوگوں کو خوفزدہ کر دیا کہ :۔

"اللہ جنت نصیب کرے میری دادی' ماں کہا کرتی تھیں کہ جو شخص کسی کی اچانک موت کا سبب بنتا ہے اس کی تصویر مرنے والے کی آنکھوں کی پتلیوں میں جم کر رہ جاتی ہے۔" یہ بات سن کر وہاں پر موجود سب لوگوں کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے' اور اُن کے چہروں سے یہ محسوس ہوا کہ ان میں سے ہر کوئی ایک دوسرے سے آنکھیں چرانے لگا ہے۔ تب مرنے والے کے چھوٹے بھائی کے دل میں تجسس پیدا ہوا کہ دیکھیں مرحوم کی آنکھوں میں کس قاتل کی تصویر ہے۔ سو اُس نے ہمت کی اور میت کے سرہانے آ کر کھڑا ہو گیا اور پھر جھک کر بھائی کی کھلی آنکھوں میں دیکھا' معاً اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اُسے وہاں اپنی ہی تصویر نظر آئی اور تیر کی طرح یہ خیال اس کے دل میں پیوست ہو گیا کہ اُس نے اپنے بڑے بھائی کو قتل کیا ہے۔ صرف بندوق یا پستول نہیں داغی' باقی جو کچھ اُس سے

بن پڑا اُس نے کر ڈالا۔ وہ بھائی جس نے باپ کی وفات کے بعد اسے باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی، اس کی تعلیم، آرام و آسائش کا پورا پورا خیال رکھا تھا، مگر اس نے دوسروں کے بہکاوے پر اپنے اسی بھائی کو ذہنی صدمہ پہنچایا تھا اور فیکٹری کے ایک معمولی حصّے کی وجہ سے بڑے بھائی کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا تھا۔ وہ پھر سالہا سال کچہریوں اور تھانوں میں اُسے کھینچتا رہا تھا، محض اپنی جھوٹی اَنا کو تسکین پہنچانے کی خاطر! پھر جب وہ مقدمہ ہار گیا تو بڑے بھائی نے اس کو گھر بلا کر فیکٹری کا وہ حصّہ اس کے نام منتقل کر دیا۔ اس وقت وہ مارے شرم کے آنکھیں اُٹھا کر دیکھنے سے بھی معذور تھا۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد اس کے اندر چھپے ہوس کے پھیر ناگ نے دوبارہ شوکریں بھرنا شروع کر دیں۔ وہ ایک دن اُس سے آبائی مکان میں اپنے الگ حصّے کا بھی دعویٰ کر دیا حالانکہ وہ بڑے بھائی کے ساتھ بہ آسانی ایک چھت تلے زندگی بتا سکتا تھا۔ اُس کے خیال میں اسی حرکت نے اُس کے بڑے بھائی کے دل کو سخت دھچکا پہنچایا تھا۔ اور وہ اندر ہی اندر گھلنے لگا تھا اور اب وہ اُس کے سامنے مرا پڑا تھا۔ اُسے بھائی کو چھونے کا حوصلہ نہ ہوا، اور وہ اپنے دل پر ایک بھاری بوجھ اُٹھائے پیچھے ہٹ گیا بولا: "مجھے کچھ نظر نہیں آیا!"

چند لمحوں کے بعد مرنے والے کے بیٹے نے سوچا خدا جانے ابا جی کی موت کا ذمہ دار کون ہے! مجھے ہمت کر کے ان کی کھلی آنکھوں میں دیکھنا چاہیے۔ ڈرتے جھجکتے وہ باپ کی لاش کے قریب جا کھڑا ہوا، اور جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ دوسرے ہی پل اُسے وہاں اپنا پریشان حال چہرہ تکتا ہوا دکھائی دیا اور پھر یکایک اُسے اپنی نگاہوں کے سامنے اُن نافرمانیوں، اور من مانیوں کے بہروپئے یکے بعد دیگرے اُبھرتے ڈوبتے دکھائی دیئے جو اُس نے اب تک کی تھیں۔ پہلی نافرمانی کا مظاہرہ تو اس نے ایک بازاری عورت سے شادی رچا کر کیا تھا۔ اس کا باپ یہ دھچکا بمشکل سہہ سکا تھا، کئی مہینے وہ صاحبِ فراش رہا تھا۔ دوسری نافرمانی اس نے یہ کی کہ اپنی بیوی کے بہکاوے میں آ کر بہت سے نارَوا مطالبات کر ڈالے اور جب باپ نے معذوری کا اظہار کیا تو اُس سے اُلجھ پڑا۔ نوبت بدکلامی تک جا پہنچی۔ آخری وار تو اس نے بڑا اوچھا کیا تھا ــــ فیکٹری کے مزدوروں کو باپ کے خلاف خوب بھڑکایا اور فیکٹری بند کرا دی۔ یہ چند روز پہلے کا واقعہ تھا، اُس کے نزدیک یہی باپ کی موت کا اچانک سبب بنی تھی ـــ اس نے سرنفی میں ہلایا اور یہ کہتے ہوئے پیچھے ہٹ آیا کہ مجھے آنکھوں میں کچھ دکھائی نہیں دیا۔

چند لمحوں کے لیے ہر طرف سناٹا چھا گیا، پھر آہستہ آہستہ کھسر پھسر ہونے لگی۔ اس بار مرنے والے کی بیٹی نے ہمت کی اور دوپٹے کے پلّو سے آنکھیں پونچھتی ہوئی باپ کی نعش کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ اُس نے ذرا جھک کر باپ کی آنکھوں میں جھانکا تو اُسے بھی وہاں اپنی تصویر مرتسم نظر آئی۔ یکبارگی اس کے چہرے کا رنگ کورے لٹھے کی طرح سفید ہو گیا اور ساتھ ہی اس کے دماغ کے پروجیکٹر پر اس کی منہ زوریوں کی ریل سی چل پڑی۔ اس نے ماں باپ کو بتائے بغیر یونیورسٹی میں ایک ہم جماعت پارسی لڑکے سے سول میرج کی تھی۔ یہ صدمہ اس کے باپ کو پاش پاش کر گیا تھا۔ اس کے بعد باپ نے سالہا سال بیٹی سے کلام تک نہ کیا۔ آہستہ آہستہ بول چال کی نوبت تو آ گئی لیکن بیٹی کے ساتھ شفقت اور محبت کا رشتہ استوار نہ ہو سکا۔ پھر جب اس کا شوہر سمگلنگ کے ایک کیس میں ملوث ہوا اور بیٹی نے اپنے باپ سے ایک خطیر رقم مہیا کرنے کا فوری مطالبہ کیا تاکہ رشوت دے دلا کر معاملہ رفع دفع کیا جا سکے۔ مطالبہ سن کر باپ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا مگر وہ بولا نہیں، بس اندر ہی اندر روتا رہا۔ یہ واقعہ کوئی ہفتے عشرے پہلے کا تھا اور اُس کے خیال میں یہی صدمہ اُس کے باپ کی اچانک موت کا اصلی سبب بنا تھا۔ یکبارگی جیسے وہ ایک ڈراؤنے خواب سے بیدار ہو کر خود میں لوٹ آئی۔ اُس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر تھوک نگل کر جیسے خود سے کہا: "ان آنکھوں میں اب کیا رہ گیا ہے!"

اتنا کہہ کر روتی ہوئی اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی، اور دوپٹے کے پلّو سے دوبارہ اپنی آنکھیں پونچھنے لگی۔ کافی دیر تک وہاں پر موجود کسی نے کوئی بات نہ کی اور پھر مرنے والے کی بیوی اپنی جگہ سے اُٹھی اور شوہر کے سرہانے آ کر بیٹھ گئی۔ وہ بھی ڈر رہی تھی، قدرے توقف کے بعد اس نے جھک کر شوہر کی آنکھوں میں دیکھا تو آنسو اس کی پلکوں پر رک گئے جیسے ڈر گئے ہوں۔ یکایک اس کا سر زور سے چکرایا اور اس کی آنکھوں میں دُھند اور سیاہی بھر گئی۔ پھر ہولے ہولے اس سیاہی میں تصویریں سی بننے لگیں۔ اُسے خیال آیا کہ عمر بھر اپنے شوہر کو اُس نے کتنی ذہنی اذیتیں پہنچائی تھیں۔ شادی کے کچھ ہی مدت بعد اُس نے اپنی ماں کے ورغلانے پر اپنے شوہر کو مجبور کیا تھا کہ وہ اپنے والدین سے الگ ہو جائے اور کوئی علیحدہ کاروبار شروع کر دے۔ اس مسئلہ پر اس کی اپنے شوہر سے کئی بار تُو تُو میں میں ہوئی تھی اور بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تھی۔ الگ گھر بسانے کی ضد پوری کرنے کے بعد اس نے مختلف فلاحی اور رفاہی انجمنوں کی رکنیت اختیار کر لی، اور گھر کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ ہر وقت سہیلیوں، دعوتوں، میٹنگوں اور کانفرنسوں میں اُلجھی رہتی، شوہر کے روکنے ٹوکنے پر آسمان سر پر اُٹھا لیتی۔ دونوں بچوں کو اس نے مکمل آزادی دے دی تھی۔ کیونکہ اس کے خیال میں روکنے ٹوکنے سے بچوں کی شخصیت مسخ ہو جاتی ہے۔ پھر اُسے اپنی اس زیادتی کا خیال آیا جو اس کے نزدیک اس کے شوہر کو روگ بن کر لگ گئی تھی، اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے کھا گئی تھی۔ ہوا یوں کہ ایک دن اس کی ساس اپنے بیٹے کو دیکھنے اتفاق سے ایسے وقت آئی جب وہ گھر پر موجود نہیں تھا۔ بچے

تو وہ یونہی ساس سے دھیرے دھیرے بے معنی باتیں کرتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد کسی معمولی بات پر اس سے الجھ پڑی اور بیٹھی کر اس کی بے عزتی کر دی۔ چنانچہ وہ بیٹے کی واپسی کا انتظار کئے بغیر ہی واپس چلی گئی۔ شام کو جب اس کے شوہر کو نوکروں کی زبانی اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ یہ واقعہ کوئی ایک ماہ پہلے پیش آیا تھا اور اس کے خیال میں یہی اس کی موت کی بنیادی وجہ تھا۔ تب کسی نے یا ت جی سے سرگوشی میں پوچھا "کچھ نظر آیا بیگم صاحبہ" اس نے چونک کر سرگوشی کرنے والے کی جانب دیکھا اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر سر آہستگی سے نفی میں ہلا دیا اور چپ چاپ اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئی۔

اچانک باہر شور سا اٹھا۔ مرنے والے کی ماں آگئی تھی اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ ایک دو عورتوں نے اسے سہارا دینے کی کوشش بھی کی لیکن اس نے کسی کا سہارا نہ لیا اور ہمت کر کے خود ہی اپنے بیٹے کی نعش پر جھک گئی۔ اس وقت اس کے چاندی جیسے سفید بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں مسلسل رونے سے سوجی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر تک وہ ایک ٹک اپنے بیٹے کو دیکھتی رہی۔ پھر اس کے سرہانے آکر بیٹھ گئی۔ جھک کر بیٹے کے چہرے کو دیکھا تو یکایک جیسے دریا کا بند ٹوٹ گیا اور بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بیٹے کے چہرے پر گرنے لگیں۔ ماں کے آنسوؤں سے بیٹے کا چہرہ تر ہو گیا حتیٰ کہ اس کی کھلی ہوئی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ تب وہاں پر موجود لوگوں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا کہ ماں کے آنسوؤں سے مرنے والے کی پلکیں بھیگ کر بوجھل ہوئیں اور پھر اس کی آنکھوں کی پتلیوں پر بھاری پردوں کی طرح گرتی چلی گئیں۔

جون ۸۴ء

آئینہ در مقابلے میں خالدہ حسین سے وہ روشنی بھی

دیکھی ہے جس سے لگتا ہے کہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

خالدہ حسین [illegible]

کے بعض اجزاء کے حوالے سے انہوں نے خالدہ حسین کو [illegible] سند عطا کر دی ہے

عکس تحریر:- سہیل احمد خان

# پہچان کی جستجو

عذرا [illegible]

بند پلکیں الگ ہوئیں تو سورج کی سیدھی کرنیں پپوٹوں میں گھس آئیں۔ حیرانی سے میں نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی۔ کمرے پر سکوت طاری تھا تنہائی کے جان لیوا احساس سے بچنے کے لئے میں نے ریڈیو آن کر دیا۔ شور سے کمرے کے در و دیوار کپکپانے لگے اور ذہن کے دریچے کھل اٹھے۔

"میں کون ہوں؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ میں کس صدی میں جی رہی ہوں"

"اور یہ دنیا کیا ہے؟"

ادلتے بدلتے دن رات ـــــ گھٹتے بڑھتے صبح و شام ـــــ یہ سب کیا ہے ـــــ کیسے ہے اور کیوں تھا ـــــ چمکتے دمکتے چاند ستارے زمین و آسماں کی لامحدود وسعتیں ـــــ اڑتے بادل ـــــ امڈ امڈ کر آتی گھٹائیں ـــــ پانی کے برستے قطرے ـــــ یک میں ایک پیوست، جیسے مالا میں پروئے گئے موتی ـــــ کھلتے مہکتے ـــــ محض ایک دن کی زندگی پر مسکراتے رنگا رنگ پھول ـــــ اپنی خوشبو تا کرن کی طرف پلٹ جانے والے ـــــ تنا ـــــ ہیولا نہی بقا کی طرف گامزن ـــــ یہ کیسا مسئلہ حیات ہے ـــــ نا سمجھ میں آنے والا ـــــ گھبرا کر میں باہر نکل آئی ـــــ اچانک میں نے محسوس کیا کہ میں کہیں کھو گئی ہوں۔ یہ یوں یکایک گمشدگی پر میں حیرت زدہ رہ گئی۔ میں نے خود کو تلاش کرنا چاہا مگر بے سود ـــــ میں اپنی گمشدگی کا اعلان کرنا چاہتی تھی ـــــ چیخ چیخ کر دنیا کو بتا دینا چاہتی تھی ـــــ لوگو! سنو کہ میں کھو چکی ہوں ـــــ مجھے میری تلاش میں مدد دو ـــــ ٹھہرو! میرے اندر سے کسی نے پکارا ـــــ میں نے رک کر سوچا ـــــ پاگل خانے کی اونچی دیواریں میرے ارادے میں حائل ہو گئیں ـــــ مگر یہ دنیا تو پورے کی پوری پاگل خانہ ہے ـــــ پھر؟ تو کیا یہ سچ ہے کہ میں چرا لی گئی ہوں ـــــ پر مگر چوری کی رپٹ درج کرانے پر رپٹ لکھانے والا خود مجرم ٹھہرتا ہے ـــــ اکثر یونہی دیکھنے میں آیا ہے۔ مجھے یاد آیا ـــــ ایک دفعہ جب میرے باپ کے گھر چوری ہوئی تھی اور گھر کا سب قیمتی سامان رات کی تاریکی میں کوئی سمیٹ لے گیا تھا اور وہ قیمتی سامان تھا ہی کیا ـــــ پکانے ریندھنے کے برتن ـــــ پہننے اوڑھنے کے کپڑے اور بس ـــــ میرے باپ نے تھانے میں رپٹ درج کرائی اور خوش ہو کر اس کے برتنوں پر اس کا نام کندہ ہے وہ چوری کا سامان تلاش کرنے میں پولیس کو آسانی رہے گی۔ مگر ایک ہفتے تک تفتیشی افسروں کو کھلانے پلانے کے بعد بھی جب چوری برآمد نہ ہو سکی تو میری ماں بازار سے مٹی کی ہنڈیاں لے آئی کہ چولہے کے لئے مٹی بے مصرف تھی۔ آگ میں تپ کر سونا کندن بنتا ہے اور مٹی ـــــ یہ بیک کر اپنا مول گھٹا دیتی ہے مگر یہاں تو مسئلہ یہ تھا کہ پولیس کو قیمتی مشروبات پلانے کے لئے میرے پاس پیسہ نہیں تھا ـــــ میں تہی دستی پر میں خشک آنسو بہا کر رہ گئی ـــــ تلاش ابھی نامکمل تھی اور اپنی تلاش میں چلتے چلتے میرے پاؤں دکھنے لگے تھے۔

کمرہ میں ابھی اجلاس جاری تھا۔ اسٹیج پر کھڑا ایک چھوٹے ناٹے قد کا آدمی آزادیٔ نسواں پر دھواں دھار تقریر کر رہا تھا ـــــ میرے ذہن کے پردے پر ایک مدقوق چہرہ ابھرا ـــــ لعن طعن کا طوق گلے میں لٹکائے ـــــ جونکوں کی طرح اپنے جسم سے بچے چمٹائے ـــــ گود میں بچہ، پیٹ میں بچہ، رینگتا بچہ ـــــ بسورتا بچہ ـــــ سختیاں سہتا اور گالیاں سنتا وہ مدقوق چہرہ میرے ذہن کے افق پر پھیلتا چلا گیا میرے

چالیس سالہ محنت

کان بج اٹھے۔ "میرے میاں سوشلسٹ لیڈر ہیں" اس نے بچے کی ناک سے بہتی رینٹھ اپنے دوپٹے کے پلو میں سمیٹ کر مجھے بتایا۔

"آزادیٔ نسواں" ان کا خاص موضوع ہے۔ کئی کتابیں لکھ چکے ہیں" اس نے اپنے گال پر پڑے نیل کو سہلا کر کہا۔

"یہ چوٹ ؟"

"بڑے لوگوں کے کاموں میں مداخلت کا نتیجہ ــــ" وہ بولی۔

"میں تو اس کی بیوی ہوں نا ــــ

وہ عورت بھی کہیں گم ہو چکی تھی اور اس کا ذہن اس کی کھوج سے ماورا ہو چکا تھا۔ یہاں اس خطے میں ہر عورت اپنی پہچان کھو چکی ہے اور اس پر اس کے باپ، دادا، بھائی اور شوہر کے نام کی مہر ثبت ہے ــــ میرا سر چکرا گیا۔

چھوٹے ناٹے قد کا آدمی بدستور زور شور سے تقریر کرتا رہا۔ میں نے بے بسی سے نگاہیں اٹھائیں۔ ہر چہرہ یہاں اجنبی تھا اور جو چہرے میری پہچان کی گرفت میں آ رہے تھے انہوں نے اجنبیت کے موٹے نقاب اوڑھ رکھے تھے۔ گھبرا کر میں باہر نکل آئی اور خود کو انسانوں کے بہتے سمندر میں چھوڑ دیا۔ چہروں کے سیلاب میں میں ایک تنکے کی مانند بہنے لگی۔ ہنستے مسکراتے چہرے ــــ منہ لٹکائے بسورتے چہرے ــــ عجلت اور جلد بازی سے گھبرائے ہوئے پریشان چہرے ــــ پھر ایک بھولا بسرا چہرہ میرے سامنے آن لٹکا۔

"اُستاد کا درجہ والدین کا سا ہوتا ہے" میں نے کہا۔

"کس زمانے کی بات کرتی ہیں آپ؟ وہ ڈھٹائی کے ساتھ اطمینان سے بولا۔

میں جب بچہ تھی اور تختی بغل میں مار کر پہلی بار مدرسے گئی تھی تو ماں نے کہا تھا۔

"بیٹا استاد کو باپ کی طرح تعظیم دینا" میں نے آج تک ویسا ہی کیا اور ویسے ہی کیا مگر تم . . . . سوچو میں تمہاری اُستاد ہوں اور پھر تم سے بڑی ــــ" میں نے اُسے سمجھایا۔

"بڑے مرد چھوٹی عورت سے بیاہ کر سکتے ہیں تو بڑی عورت چھوٹے مرد کو قبول کیوں نہیں کر سکتی بھلا ــــ؟" وہ بحث پر اُتر آیا۔

"مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے میڈم"

"ہونہہ محبت ــــ محبت کس قدر فرسودہ لفظ ہے۔ میں نے محبت کے نام پر جسموں کا نیلام دیکھا ہے۔ روحوں کا سودا ہوتے سنا ہے۔ محبت ــــ ایک مقدس جذبہ ہے۔ مگر جب تک یہ بتیس دانتوں تلے رہے۔ لبوں سے پھسلا اور یہ لفظ بکاؤ مال بنا ــــ جذبے کے تقدس کو مجروح نہ کرو میرے پیارے شاگرد ــ"

اور پھر وہ چہرہ اُداسیوں کے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا اور دوسرا چہرہ تن کر سامنے آگیا۔ مگر مسائل کی صلیب پر تو ہر چہرہ لٹکا تھا۔ میں نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور مڑا تڑا کاغذ اپنے اور دوسرے چہرے کے روبرو لے آئی۔

"راحیلہ بی بی ــ!"

سچ بتلاؤں۔ خط لکھنا بھی ایک تخلیقی عمل سمجھتا ہوں۔ آپ کے اُوپر تلے تین چار خط ملتے ہیں۔ ہر خط کے پس منظر میں جذبات کی خوبصورت جھلکیاں ہیں۔ میں عمر کے اس حصے میں ہوں جہاں اپنے جذبات کے آگے بند باندھنا پڑتے ہیں اور باہر سے آنے والے جذبات کے آگے فصیلیں کھڑی کرنا ہوتی ہیں۔ آپ کی زندگی شاید ایک چہار دیواری تک محدود ہے۔ ہم تعلقات کے سمندر میں موجود ہیں۔ دوستی کے نام پر، محبت کے نام پر، خلوص کے ناتے سے اتنے چرکے کھائے ہیں، اتنے رنگ روپ دیکھے ہیں کہ انہیں دہرانے کا یارا نہیں رستم ظریف لوگوں نے ہمیں ایک شجر سایہ دار مان رکھا ہے۔ لوگ ستاتے ہیں، وقت گزارتے ہیں اور آگے چل پڑتے ہیں ــ مجھے معاف کیجئے۔ آپ کے خلوص کا تفصیل سے جواب لکھوں گا۔ مجھے آپ کے جذبے کا احترام ہے ــ مگر ــــ خدانخواستہ آپ کو دکھی کرنا مقصود نہیں تھا۔ برسوں سے میری روایت یہی رہی ہے کہ میں تعلقات توڑنے میں کبھی پہل نہیں کرتا۔ زیادتی بھی سہہ لیتا ہوں، ستم بھی جھیل لیتا ہوں۔ آپ خوش رہا کریں۔ اپنے مسائل کو سلجھائیں۔ کسی کے لئے ناحق آنسو بہانا

ہیں۔ یہ زندگی کا سرمایہ ہے۔ محبتوں کی امانت ہے۔ ہم ایسے لوگ شام کے تاروں کی طرح ہوتے ہیں۔ پل دو پل اُبھرے، پھر ڈوب گئے۔ خدا آپ کو مستقل اور مستحکم خوشیاں دے — سائے تو سائے ہی ہوتے ہیں۔ دھواں تو بہرحال فضاؤں میں تحلیل ہونے کے لئے ہوتا ہے۔ ایسی آگ روشن کریں جو آپ کو عمر بھر کی حدت اور حرارت دے سکے۔ راکھ کریدنے سے بھلا کیا فائدہ؟

ہاں! یہ سچ ہے کہ ہم اپنی خواہشوں کے اسیر ہوتے ہیں۔ یہی خواہشات دکھی کرتی ہیں، یہی قتل کرتی ہیں۔ آپ تو کم از کم ان سے دامن بچالیں۔

مڑے تڑے کاغذ کو مٹھی میں بھینچ کر میں نے پھر جیب میں اڑس لیا۔ پیروں کے چھالے پھوٹے تو تکلیف کی شدت میری سوکھی آنکھوں میں نمی لے آئی۔ اذیت کا احساس جاگا تو مجھے گھر یاد آیا۔ مگر گھر اور اس کی ویرانی میری اُجڑی روح کو مزید ریزہ ریزہ کر گئی۔ سورج نے اپنی منور کرنیں سمیٹیں اور دور مشرق میں کہیں جا چھپا۔ مغرب میں شام کا روشن تارا جھلملانے لگا۔ مگر شام کے تاروں کا کیا ہے۔ ابھی ابھرے، ابھی ڈوبے۔ بس پل دو پل۔ میں اپنی گمشدگی پر ہراساں، گھر کے ایک کونے میں چھپی بیٹھی تھی اور شام کے تارے کے گرد ستاروں کا مدہم مدہم ہجوم لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے سانس روک لیا اور ساکت ہو کر اپنی ذات میں سمٹ کر اپنی کھوج کرنے لگی۔ شاید میں مل ہی جاؤں — شاید۔

جولائی ۸۶ء

ہم

صرف ایک بار کسی کو تلاش کرتے ہیں

اور

ہر بار اپنے آپ کو کھو دیتے ہیں

عکس تحریر۔ رفعت سعید

# تھکی ہوئی شام سے مکالمہ

ایم ایم ادیب

پہلے پاؤں یا شاید پہلے وہ اپنا سر کھڑکی کے رستے کمرے میں داخل کرتی ہے اور اُس کی دھوپ کی مٹھیوں میں بند نبضیں رفتہ رفتہ آزاد ہونے لگتی ہیں۔

سڑک کی دوسری جانب کھڑا مداری اپنے کم سن بچے کی مدد سے دھیرے دھیرے، تھکے تھکے ہاتھوں سے اپنی پٹاری اور دیگر سامان سمیٹنے میں معروف ہے۔

گذشتہ کئی برس سے اُس کے اس سامان میں رتّی بھر اضافہ یا کمی نہیں ہوئی، سب میلے کچیلے رنگوں کی اُدھڑے کناروں والی پٹاریاں، اتنے ہی عرصے سے پیٹ بھر خوراک نہ کھانے والے نیم مُردہ سانپ اور اِن سب پر مستزاد مُٹھی بھر ہڈیوں پر مشتمل وہ بچہ جس کے دیکھنے کا سب سے پُرکشش لمحہ وہ ہوتا ہے جب وہ اپنے بوڑھے مداری باپ کے پیچھے چلتے ہوئے کانوں سے ہاتھ ہٹا کر بازو اُس کے کولہوں کے گرد گھمانا شروع کر دیتا ہے اور مجمع میں کھڑے سارے لوگ تالیاں پیٹ پیٹ کر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ اُسے اِس عمل پر خوب داد دیتے ہیں۔

کمرے سے باہر اس کی پوری کائنات مداری کا یہی "پٹہ" ہے، جس میں اُس نے بھانت بھانت کے لوگوں اور سینکڑوں بھلی بُری عادات کے بچوں سے آشنائی حاصل کی ہے، لیکن یہ دائیں جانب کا منظر ہے۔

کمرے کی بائیں جانب کی کھڑکی اور منظر پیش کرتی ہے۔

اندھیرے کا قافلہ شام کی سرمئی بدن پر تیز رفتاری کے ساتھ چڑھائی کرنے میں معروف ہے۔

اُدھڑی ہوئی سڑک کے کنارے کھڑے ٹنڈ منڈ درختوں میں چیختی پاگل ہوا، پہلے ببول کی جھنگاڑ شاخوں میں گتھی جھولداری کی طنابیں توڑتی ہے، پھر بھُوسے کے فرش پر ٹھٹھری بیٹھی ادھیڑ عمر عورت کے وجود کو آرے کی طرح چیرنے لگتی ہے۔

اور وہ اس کوشش میں ہے کہ اپنا جسم اپنے کالے مرس بچوں کو اوڑھا دے، مگر اُس کا بدن ان تمام بچوں کے لئے ناکافی ہے۔

اس کی ماں نے جب اس کھڑکی سے پہلی بار یہ منظر دیکھا تھا تو بے حد محظوظ ہوئی تھی کیونکہ اُس وقت چیتھڑوں کے اس خیمے میں پڑی عورت کے جسم کا پھیلاؤ اتنا تھا کہ اُس نے اپنے سارے بچے آسانی کے ساتھ اپنے حجم میں محفوظ کر لئے تھے۔

اور تیز ہوا کے نوکیلے ہاتھ اُس کے وجود پر ایک خراش بھی نہ ڈال سکے تھے، مگر اب ـــــ اُس نے ایک دھماکے کے ساتھ کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر دیئے۔

"بے حس، گندہ جذبوں والی ماں۔"

"کالے مرس بچوں کا جسم نوچنے والی تیز ہوا۔"

"مداری"

"اُس کی پٹاریاں"

"نیم مُردہ سانپ"

"کھانے کی ہر چیز پر ندیدوں کی طرح ٹوٹ پڑنے والا بچہ"

"اور ہر روز تماشا دیکھنے والے رنگ برنگے لوگ۔"

خوف سے اس کا چہرہ پیلا پڑ جاتا ہے، اور وہ کمرے کے چاروں کھونٹ میں اپنا آپ تلاش کرنے لگتا ہے۔

شروع شروع کے دنوں میں اُسے اپنی گمشدگی کے وہم نے ستایا، پھر گمان کے بھیے سائے ہر لمحہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ اور پھر اُس نے خود کو اندیشوں اور وسوسوں کے حصار میں محسوس کرنا شروع کر دیا۔

اور آخرکار اُس نے بےخوابی کی پوشاک اُوڑھ کر اپنے کمرے کی دیواروں پر بےیقینی کے جالے کاتنے شروع کر دیے۔

کبھی کبھی کھڑکی کے رستے اندر جھانکنے والے درختوں کی شاخوں پر جھومتے موسمی بیماریوں کے نشان زدہ پتوں پر اس کی نظر پڑتی تو اُسے یوں لگتا جیسے اس کے وجود کو چھو کر ہی یہ اس حالت کو پہنچے ہوں۔

اور وہ نقصان دہ کیڑے کی شکل اختیار کر کے گمان کے سب کھیتوں اور کھلیانوں میں شک کے بیج بوآتا۔

"ہونہہ"

اُس نے ایک جھرجھری سی لی اور واپس اپنی جُون میں آگیا۔

"بڑی عجیب سی بیماری ہے ڈاکٹر صاحب ۔۔۔ اور اب تو بہت پُرانی بھی ہو چکی ہے۔"

"کیا جی؟"

ڈاکٹر نے ایک لمبی جی ۔۔۔ کے ساتھ اپنی سوچ کا دائرہ توڑا اور تأسف میں گُھلی نظروں سے اس کی اور دیکھنے لگا۔

ساتھ بیٹھے ہوئے مریض نے قدرے ضبط کے ساتھ تین چار بار پہلو بدلا۔ اور بےاختیار اُٹھ کر باہر کی طرف جانے لگا۔

"ٹھہریئے! میں انہیں فارغ کرتا ہوں"

ڈاکٹر کے لہجے میں تحیّر اور جھٹکے کا ملا جلا تاثر نمایاں ہوتا ہے۔ اور وہ بھی کونج کرنے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے۔

ہوا کے زور سے بائیں طرف کی کھڑکی کے دونوں پٹ کھڑاک سے کُھل جاتے ہیں۔ اور وہ ہوا کی زد میں آئی جھولداری کو انہماک کے ساتھ دیکھنے لگتا ہے۔

چرڑ، چرڑ، کی خوف و ہراس پھیلانے والی آوازیں،

تنے ٹوٹ ٹوٹ کر جھولداری کے اِردگرد گرنے لگتے ہیں۔

اور اس کی آنکھیں ایک ہی نقطے پر مرکوز ہیں، ایک ہی لمحے کی منتظر ہیں۔

لو، ساعت اور پل ۔۔۔ دھڑام سے ایک شاخ جھولداری کے اوپر گرتی ہے۔

"صدائیں ہوا نگل لیتی ہے"

"اگر تم کبھی سامنے والی جھونپڑی میں رہنے والے بچوں کے ساتھ کھیلے تو میں تمہیں سخت سزا دوں گی۔"

ماں کی زہریلی باتوں کے تیر اُس کی رحم دلی کی رگوں کو ٹھنڈا کر دیتے ہیں

مداری کا ادھ مُوا بچہ جب توڑ کر کا نچ اپنی ہتھیلی پہ رکھے "پیڑ" میں کھڑے لوگوں سے اپنی زندگی کی بھیک مانگتا ہے۔

"سب فنکار بندہ ہے جی ۔۔۔ مداری کا بچہ ۔۔۔!"

ایک تماشائی اپنے ساتھ کھڑے ایک متحیّر آدمی کے کان میں سرگوشی کرتا ہے۔

اور وہ اپنی پہلو کی جیب میں پڑے اکلوتے ایک روپے کے نوٹ کو اور مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے۔

"ٹھہریئے ٹھہریئے ۔۔۔! میں اِس کی مدد کرتا ہوں۔"

وہ کھڑکی سے کُود پڑتا ہے

سب تماشائی اُس کی سمت چلے جاتے ہیں۔

"مختلف آوازیں، متضاد آرائیں۔"

خالی پِڑ میں کھڑا مداری کا بیٹا کانچ فضا میں اُچھال دیتا ہے،

باپ کی آنکھوں میں اُتری بےچارگی اُس سے برداشت نہیں ہوتی۔

چالیس سالہ مخزن

بوجھل بوجھل قدموں سے ہجوم غفیر کو چیرتا ہوا اُس تک پہنچتا ہے۔

"باؤجی! تم نے چھلانگ ہی لگائی تھی تو تھوڑی دیر بعد ہی لگا لیتے، ہماری روزی روٹی پہ لات تو نہ مارتے"

مداری کے بیٹے کی آواز پر پورا ہجوم ایک زوردار قہقہہ لگاتا ہے۔

درد کی میٹھی میٹھی ٹیسیں صدا بننے سے پہلے ہجوم رفتہ رفتہ منتشر ہو جاتا ہے۔

اور اُس کی آخری نوک بھی تھکی ہوئی نڈھال شام کے ساتھ گھنے درختوں کے درمیان چیختی پاگل ہواؤں میں تحلیل ہو جاتی ہے۔

فروری ۸۶ء

[illegible]

علی تنہا

عکس تحریر:۔ علی تنہا

THE "FUNOON" MONTHLY

REGD. L. NO 7579

Phone No. 69580